تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

تالیف

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

(۱۸۳۲-۱۸۹۰ء)

تصحیح و تنقیح و نظرثانی

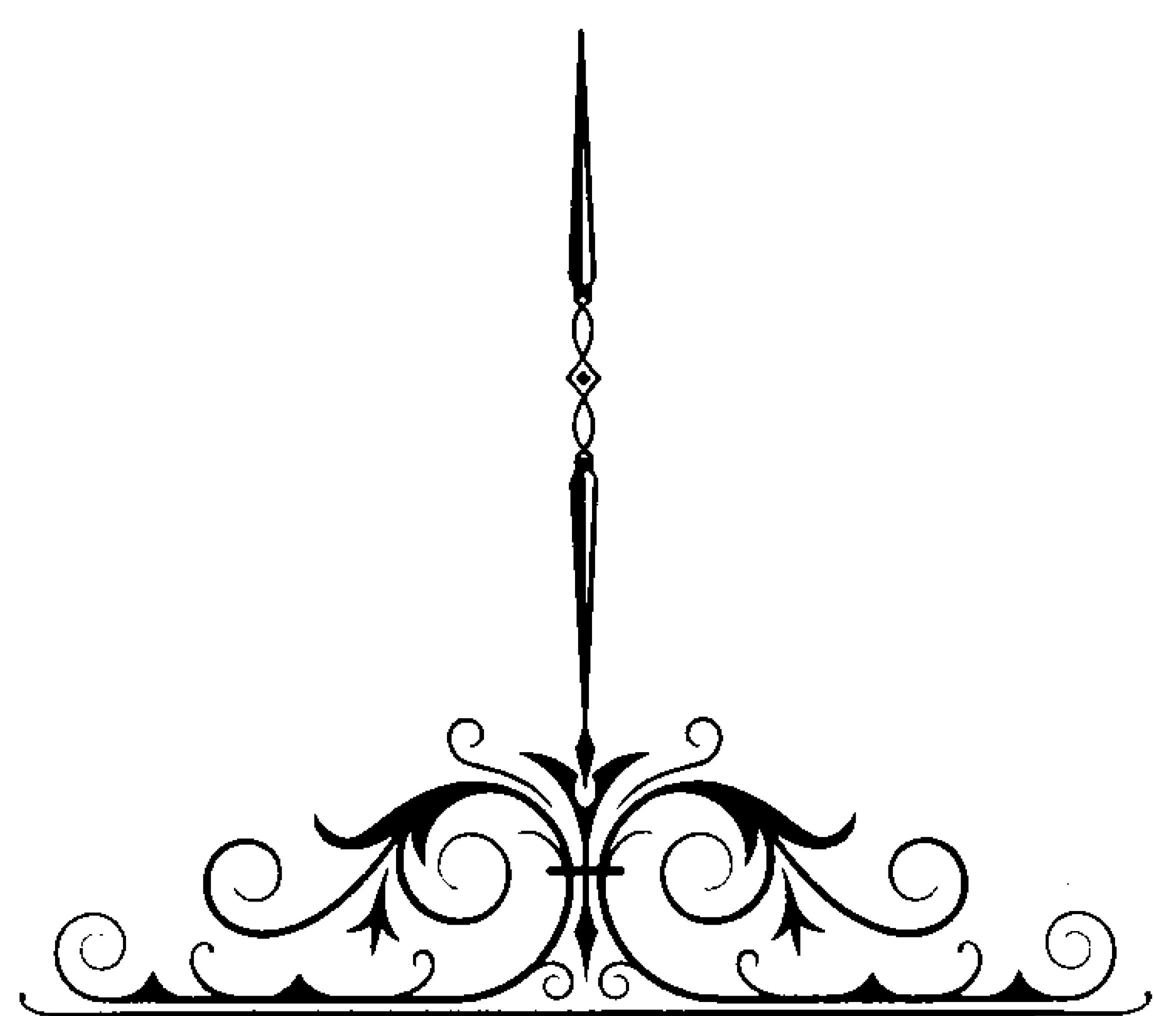
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف | حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

تسہیل: محمد یحییٰ قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد دوم

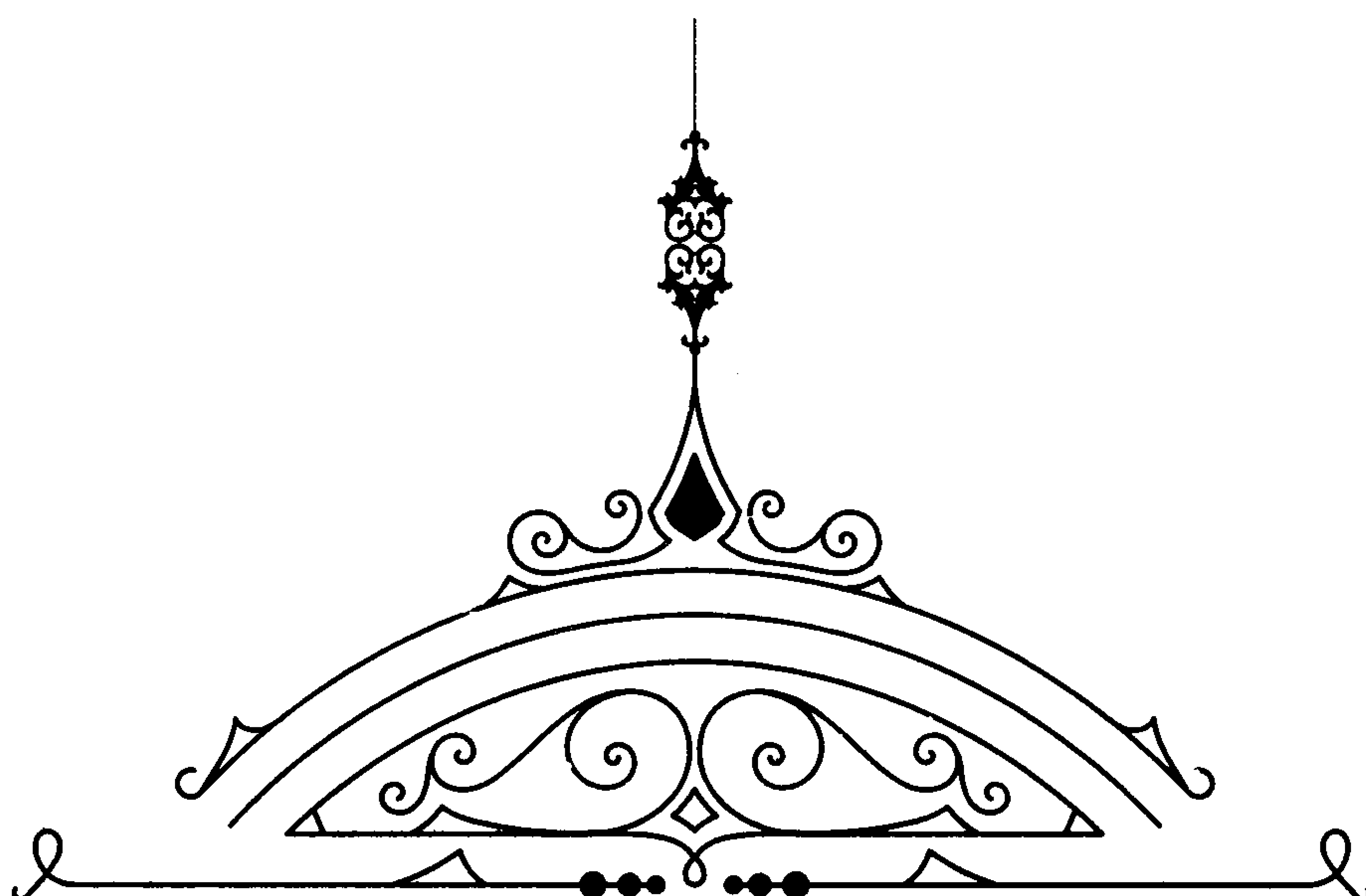
دار ابی الطیب للنشر و التوزیع

مکتبہ قدوسیہ

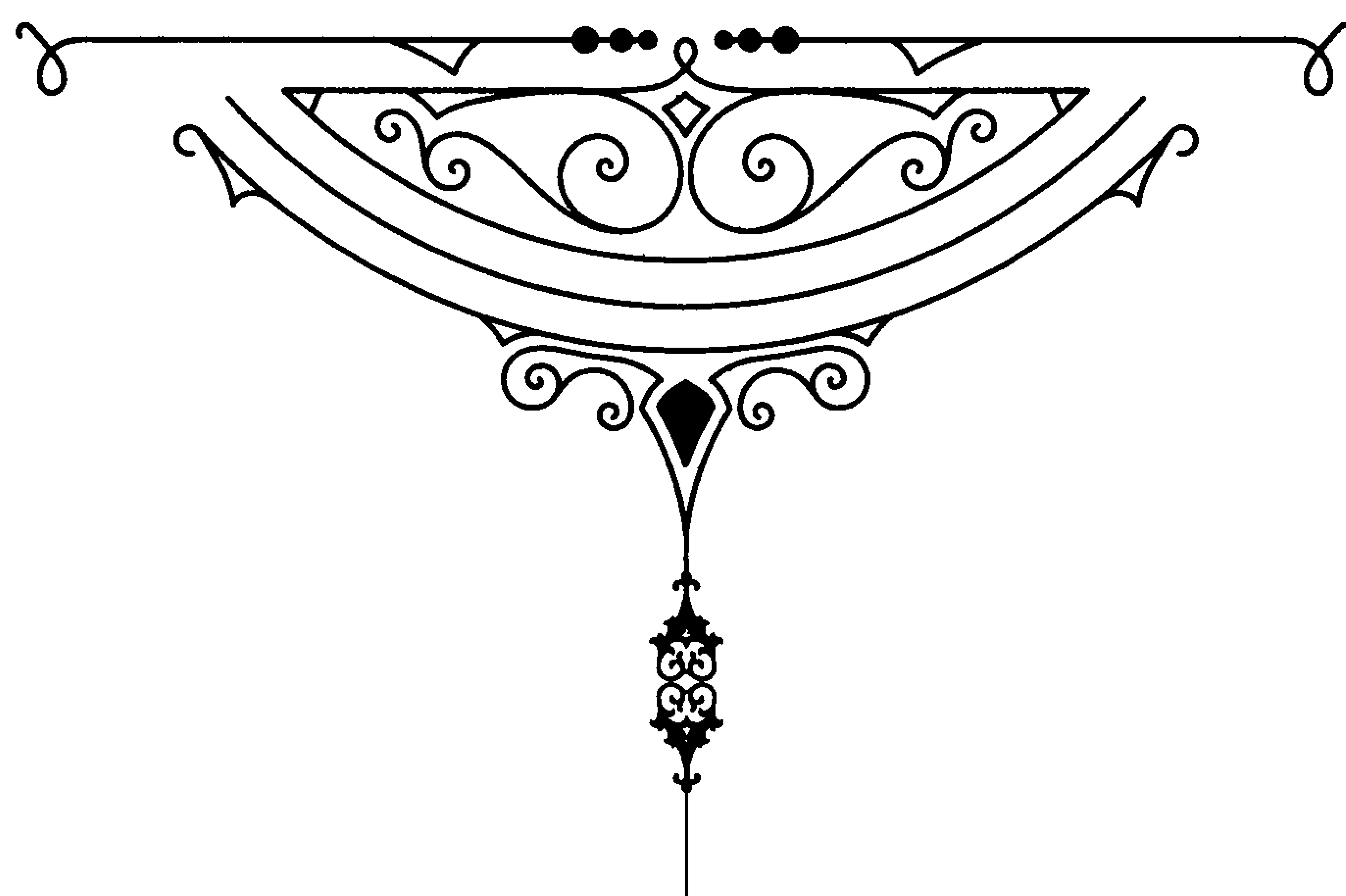


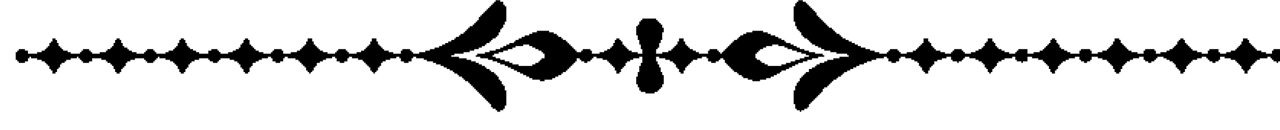
تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان



بسم الله الرحمن الرحيم





نام کتاب: ________ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ________ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

قیمت: ________

طبع اول: ________ جنوری 2018ء



دار ابی الطیب للنشر والتوزیع | گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ
055-3823990

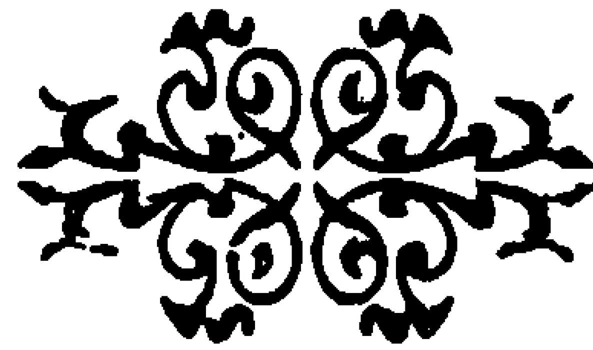
بیت السلام پرنٹنگ پریس

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

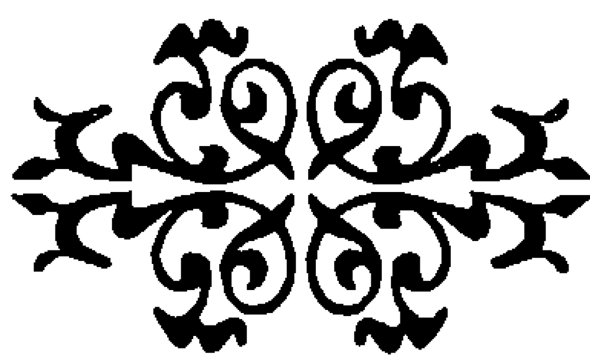
Tel: +92-42-37361371, 37320422 Mob: +92-321-9350001 ,0320-6666123

@bait.us.salam1@gmail.com www.bait-us-salam.com facebook.com/baitussalambookstore

فہرست



فہرست مضامین



بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاثرات

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام علىٰ سيد الأنبياء والمرسلين، وعلىٰ آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين، أما بعد:

برِصغیر پاک و ہند میں قرآنِ مجید اور حدیثِ نبوی سے تعلق جوڑنے میں جن حضرات نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں، ان میں ایک یگانہ روز شخصیت حضرت نواب صدیق حسن خاں والیِ بھوپال بھی تھے، جنھوں نے یہاں حفظِ حدیث کی طرح ڈالی اور اس پر گراں قدر انعام دینے کا اعلان کیا۔ فتح الباری کا نسخہ پہلے چھے سو روپے میں خریدا، پھر ۱۳۰۰ھ میں پچاس ہزار روپے خرچ کر کے اسے مطبع بولاق مصر سے شائع کرانے کا اہتمام کیا۔

اندازہ کیجیے، آج سے تقریباً ۱۳۷ سال قبل یہ خطیر رقم آج کے حساب سے پچاس لاکھ سے کہیں زیادہ بنتی ہے۔ اسی طرح پچیس ہزار روپے علامہ شوکانی کی ''نیل الاوطار'' پر اور ''تفسیر ابن کثیر مع فتح البیان فی مقاصد القرآن'' (مصنفہ حضرت نواب صاحب) پر بیس ہزار صَرف کیے۔ بلوغ المرام کی عربی اور فارسی میں شرح لکھی، مختصر صحیح مسلم کی شرح ''السراج الوهاج'' اور ''التجريد الصريح لأحاديث الجامع الصحيح'' للعلامہ ابی العباس احمد بن عبد اللطیف کی شرح ''عون الباري'' لکھی۔ ان کے علاوہ حدیث اور علوم الحدیث سے متعلق عربی، اردو، فارسی میں بتیس کتابیں لکھیں اور ان سب کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

قرآنِ مجید فرقانِ حمید کی دو عظیم الشان تفسیریں لکھیں، ایک: ''فتح البيان في مقاصد القرآن'' عربی زبان میں جو دس جلدوں پر مشتمل ہے، جس کی تکمیل پر عظیم الشان دعوت کی، جس پر پچیس ہزار روپے خرچ ہوئے۔[1] دوسری: ''ترجمان القرآن بلطائف البيان'' اردو زبان میں، جو پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ ''تذكير الكل بتفسير الفاتحة و أربع قل'' اردو میں، ''نيل المرام من تفسير آيات الأحكام'' عربی زبان میں، ''إكسير في أصول التفسير'' اور ''إفادة الشيوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ'' فارسی زبان میں اور ''فصل الخطاب في فضل الكتاب'' اردو میں لکھی۔ ان کے علاوہ تمام علومِ دینیہ سے متعلق دو سو سے زائد تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف صرف برصغیر ہی کے اہلِ علم نے نہیں، عرب مشائخ نے بھی کیا ہے، جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔

حضرت مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی رحمہ اللہ نے انھیں ان کی انھی خدمات کی بنا پر تیرھویں صدی ہجری[2] کے

---

[1] التاج المكلل (ص: ۳۷۰، ط: دار المصر)

[2] علامہ عبدالحی الکتانی نے بھی انھیں محدث ڈیانوی کے حوالے سے چودھویں صدی کا مجدد لکھا ہے۔ (فهرس الفهارس: ۲/ ۱۰۵۷) مگر یہ صحیح نہیں، عون المعبود میں تیرھویں صدی کا مجدد ہی لکھا ہے۔

مجددین میں شمار کیا ہے۔ (عون المعبود: ٤/ ١٨٢) اسی طرح مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ نے بھی انھیں "إشاعة السنة" کی جلد (٦) میں مجدد قرار دیا، جو بعد میں "إبقاء المنن" کے آخر میں شاملِ اشاعت کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو یہ بات ناگوار گزرے، مگر یاد رہے کہ شیخ راشد بن علی الحنبلی التعامی نے بھی انھیں مجدد قرار دیا ہے۔ چناں چہ حضرت نواب صاحب کو اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "ألا وإني وأنا وأصحابي الآن نعتقد: إنك مجدد هذا القرن" (التاج المكلل، ص: ٥٢٧)

یہی بات شیخ محمد بن عبد اللہ بن حمید (امام الحرم المکی الشریف، المتوفی: ١٢٦٥) نے بھی کہی ہے، جیسا کہ "السيد صديق حسن القنوجي آراؤه الاعتقادية و موقفه من عقيدة السلف" (ص: ٧) للدکتور اختر جمال لقمان میں اور "دعوة الأمير العالم صديق حسن خان" لعلی بن احمد الاحمر (ص: ٦٦) میں مذکور ہے۔

حال ہی میں حضرت والا جاہ نواب صدیق حسن مرحوم کی اردو میں تفسیرِ قرآن جو "ترجمان القرآن بلطائف البیان" کے نام سے ہے، تقریباً ایک سو سال بعد دوبارہ بڑے اہتمام سے "دار ابی الطیب" گوجرانوالہ سے طبع ہونا شروع ہوئی ہے، جس کی جلد اول ایک ہزار تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مجلد اول نہایت آب و تاب سے شائع ہوئی ہے اور اپنی ظاہری ومعنوی خوبیوں سے مالا مال ہے جو سورۃ الفاتحہ، البقرہ اور آلِ عمران کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ اب اس کی دوسری جلد بھی قارئین کے ہاتھوں میں ہے جس میں سورۃ النساء، المائدہ اور الانعام کی تفسیر ہے۔

"ترجمان القرآن" کی طباعت کن مراحل سے گزر کے قابلِ اشاعت قرار پائی، اس کی ایمان افروز تفصیل مفسرِ قرآن فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف۔ حفظه الله و متعنا الله بطول حياته۔ کے گوہر بار قلم سے جلد اول کے آغاز میں مرقوم ہے۔ تفسیر میں احادیث کی تخریج نے اسے دو چند مفید بنا دیا ہے، جہاں کہیں کوئی تشنگی محسوس ہوئی، حواشی میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

"دار ابی الطیب" کے کار پرداز فضیلۃ الاخ الشیخ حافظ شاہد رفیق حفظہ اللہ اور ان کے سبھی معاونین، اور سب سے بڑھ کر اس ادارے کی سرپرستی کرنے والے ہمارے دیرینہ مہربان محترم مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ اور جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی، کویت کی لجنۃ القارۃ الہندیہ کے رئیس فضیلۃ الشیخ المحترم ابو خالد فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ کے ہم بے حد شکر گزار ہیں جنھوں نے "ترجمان القرآن" کی اشاعتِ نو کا اہتمام کیا۔ اس مبارک خدمت پر ہم انھیں تہ دل سے مبارک دیتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس کی تکمیل کی جلد از جلد توفیق عطا فرمائے اور اس مبارک عمل کو ان تمام حضرات کے لیے اجرِ عظیم کا باعث اور خواندگان کے لیے ہدایت وراہنمائی کا ذریعہ بنائے۔ آمین

(مولانا) ارشاد الحق اثری۔ عفي عنه۔

٢٦/محرم الحرام ١٤٣٩ھ = ١٧/اکتوبر ٢٠١٧ء

سورۃ النساء

سورت نساء کا شانِ نزول اور فضائل:

اس سورت میں ایک سو چھتر آیتیں ہیں۔ یہ ساری سورت مدینہ میں نازل ہوئی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: البتہ اس کی ایک آیت مکہ میں فتح کے سال عثمان بن طلحہ حجبی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی جو یہ ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ [النساء: ٥٨]۔ نقاش نے ذکر کیا ہے کہ یہ سورت مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت اتری۔ امام علقمہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کا شروع مکہ کا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: پہلا قول صحیح ہے، کیوں کہ صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب سورت نساء اتری تو اس وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، یعنی میرا بیاہ ہو چکا تھا۔[1]

اس میں علما کا کوئی اختلاف نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بنا (زفاف) مدینہ میں کیا۔ جو شخص اس سورت کے احکام کو بہ خوبی سمجھ لے گا، وہ جان لے گا کہ یہ سورت مدنی ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ مدینہ میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا قول بھی یہی ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب حبس (وحی میں انقطاع) نہیں ہے۔[4]

امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سورت نساء میں پانچ آیتیں ایسی ہیں جن کے عوض مجھے دنیا وما فیہا کے ملنے سے بھی خوشی نہیں ہوگی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴾ [النساء: ٤٠] ”بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا ﴾ [النساء: ٣١] ”اگر تم بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں روکا جاتا ہے تو ہم تمھاری (چھوٹی چھوٹی) برائیاں تم سے دور کر دیں گے اور تمھیں عزت کی جگہ میں داخل کریں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٧٠٧) [2] تفسیر القرطبي (٥/ ١) [3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٨٤)

[4] المعجم الکبیر (١١/ ٣٦٥) اس کی سند میں ”عیسیٰ بن لہیعہ“ اور ”عبداللہ بن لہیعہ“ ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ٢٧٣)

﴿لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨] ”بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ﴾ [النساء: ٦٤] ”اور اگر بے شک وہ لوگ جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، آپ کے پاس آتے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے بخشش طلب کرتا تو وہ یقیناً اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا پاتے۔“ نیز فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [النساء: ١١٠] ”اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا۔“

امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: یہ اسناد صحیح ہے، اگر عبدالرحمٰن نے اپنے باپ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سنا ہو، کیوں کہ اپنے باپ سے ان کی سماعت میں اختلاف ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے عبدالرزاق رحمہ اللہ کی روایت اس طرح ہے کہ سورت نساء کی پانچ آیتیں ایسی ہیں جو مجھ کو ساری دنیا سے زیادہ محبوب ہیں: ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ [النساء: ٣١] ”اگر تم بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں روکا جاتا ہے تو ہم تمھاری (چھوٹی چھوٹی) برائیاں تم سے دور کر دیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا﴾ [النساء: ٤٠] ”اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ٤٨] ”بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، اس نے جھوٹ گھڑا اور بڑے گناہ کا کام کیا۔“ نیز فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [النساء: ١١٠] ”اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا۔“[2]

پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح نقل کیا ہے کہ سورت نساء میں آٹھ آیتیں ہیں، وہ اس امت کے لیے اس چیز سے بہتر ہیں جس پر سورج نکلا اور غروب ہوا۔ پہلی آیت یہ ہے: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ [النساء: ٢٦] ”اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے (یہ معاملات) کھول کر بیان کرے اور تمھیں تم سے پہلے کے نیک لوگوں کی راہ پر چلائے اور تم پر توجہ دے، اور اللہ خوب

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٣٤)

[2] پانچویں آیت سورۃ النساء کی یہ آیت (١٥٢) ہے۔ دیکھیں: تفسير الصنعاني (١/ ١٥٥) تفسير الطبري (٨/ ٢٥٦۔ ٢٥٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے، اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔'' دوسری آیت یہ ہے: ﴿ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٢٧] ''اور اللہ تم پر توجہ دینا چاہتا ہے، اور وہ لوگ جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم (حق سے) بہت دور ہو جاؤ۔''

تیسری آیت یہ ہے: ﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴾ [النساء: ٢٨] ''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارا بوجھ ہلکا کر دے اور انسان بہت کمزور پیدا کیا گیا ہے۔'' پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق مذکورہ بالا پانچ آیتیں بیان کیں، یہ سب آٹھ ہوئیں۔[1]

سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — رُكُوْعَاتُهَا ٢٤ — اٰيَاتُهَا ١٧٦

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر کے ان دونوں سے مرد اور عورتیں کثرت سے پھیلا دیے۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم آپس میں سوال کرتے ہو، اور رشتے توڑنے سے ڈرو، بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے ①

تقویٰ اختیار کرنے، تخلیق سے نصیحت حاصل کرنے اور صلہ رحمی کرنے کا حکم:

یعنی ایک آدم سے حوا بنائی، پھر ان سے سارے لوگ پیدا کیے۔ رشتوں سے خبردار ہونا یہ ہے کہ آپس میں بدسلوکی نہ کرو۔ اللہ نے اس آیت میں مخلوق کو ڈرنے کا حکم دیا۔ ڈرنا یہ ہے کہ صرف اللہ کو پوجیں، کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کریں۔ پھر اپنی قدرت سے آگاہ فرمایا کہ دیکھو ہم نے کس طرح آدم کو بنا کر پھر حوا کو بنایا۔ آدم سو رہے تھے، حوا ان کی بائیں پسلی سے نکلیں، جاگ کر دیکھا تو بہت پسند آئیں۔ وہ حوا سے اور حوا ان سے مانوس ہو گئیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ عورت مرد سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے اس کی حاجت اور خواہش مرد میں ہے۔ مرد مٹی سے پیدا ہوا ہے، اس لیے اس کی حاجت مٹی میں ہے۔ لہٰذا تم اپنی بیویوں کو روکے رکھو۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

---

① تفسیر الطبري (٨/ ٢٥٧) اس کی سند میں انقطاع اور ضعف ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں ''صالح مری'' ضعیف راوی ہے۔

② تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٥٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔

میل ہر عنصر بود سوئے مقر اصلیش جذبۂ حق ست سر شورش مستانہ ام

''ہر چیز کی رغبت اپنی اصل قرار گاہ کی طرف رہتی ہے۔ میری مستانوں جیسی بے قراری کا راز جذبہ حق ہے۔''

صحیح حدیث میں مروی ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، پسلی کا سب سے بلند حصہ زیادہ ٹیڑھا ہے، تو اگر اس کو سیدھا کرنا چاہے گا تو توڑ ڈالے گا اور اگر برتنا چاہے گا تو برتاؤ کرتے رہو، اس میں تو کجی رہے گی۔[1] یہ جو فرمایا ہے کہ ان سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اقطارِ عالم میں آدم و حوا سے بہت سے مرد و زن نکالے۔ ان کی قسموں، صفتوں، رنگ و زبان کے اختلاف کے باوجود ان کو منتشر کیا، پھر ان کا لوٹایا جانا اور اکٹھے ہونا اللہ ہی کی طرف ہوگا۔ پھر کہا کہ تم اللہ سے ڈر کر اللہ کی اطاعت کرتے رہو۔

امام ابراہیم، مجاہد اور حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی جس طرح تم یوں کہتے ہو: ''أَسْأَلُكَ بِاللّٰهِ وَبِالرَّحِمِ''[2] ''میں تجھے اللہ اور رشتے داری کا واسطہ دے کر مانگتا ہوں۔'' امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: مدعا یہ ہے کہ اس اللہ سے ڈرو جس کے ساتھ تم عقد و عہد کرتے ہو اور رحم سے ڈرو، یعنی قطع رحمی نہ کرو، بلکہ نیکی اور صلہ رحمی سے پیش آؤ۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، مجاہد، حسن اور ربیع رحمہ اللہ وغیرہم کا قول ہے۔ کسی نے لفظِ ارحام کو زیر سے پڑھا ہے: ''أي: تَسَاءَلُوْنَ بِاللّٰهِ وَبِالْأَرْحَامِ'' امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔[3]

''رقیب'' نگہبان کو کہتے ہیں جو سارے احوال و اعمال کی نگرانی اور خبر داری کرتا ہے۔ جس طرح فرمایا ہے: ﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ [المجادلة: ٦] ''(اور اللہ) ہر چیز پر گواہ ہے۔'' حدیث صحیح میں مروی ہے: ''تو اللہ کی عبادت کر، گویا تو اسے دیکھتا ہے، اور جو تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔''[4] یہ معاملہ مراقبۂ رقیب کے ساتھ ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ انسان کی اصل ایک باپ اور ایک ماں سے ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے پر مہربانی اور عنایت کریں اور ضعیفوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ترغیب دیں۔

صحیح مسلم میں سیدنا جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب مضر قبیلے کے لوگ چمڑے پہنے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، یعنی فقیر اور عریاں ہو کر پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ ظہر کے بعد خطبہ پڑھا، خطبے میں سورت نساء کی پہلی یہی آیت تلاوت کی، پھر کہا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴾ [الحشر: ١٨] ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور (ہر) شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے۔'' پھر صدقہ کرنے پر اُبھارا تو کسی نے دینار دیا، کسی نے درہم، کسی نے ایک صاع گیہوں، کسی نے ایک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٦٨)
[2] تفسير الطبري (٧/ ٥١٩)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٥٣۔ ٨٥٤) تفسير ابن كثير (١/ ٥٨٥)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨، ٩)

صاع کھجور۔[1] (الحدیث) اسی طرح اس حدیث کو احمد اور واہلِ سنن نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے خطبۂ حاجت میں روایت کیا ہے، اس میں مزید یہ ہے کہ پھر تین آیتیں پڑھیں، ان میں سے ایک یہی سورت نساء کی آیت ہے۔[2]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ﴾ میں اس جگہ ''ناس'' سے مراد وہ بنی آدم ہیں جو اس خطاب کے وقت موجود تھے، یعنی اہلِ مکہ مخاطب ہیں، نیز ان میں وہ بھی داخل ہیں جو اُن کے بعد بہ دلیل خارجی یعنی اجماع موجود ہوں گے۔ کیوں کہ وہ بھی انہی احکام کے ساتھ مکلّف ہیں جن کے ساتھ موجودہ بنی آدم مکلف ہیں۔ حنابلہ کے نزدیک بالمشافہہ خطاب (براہِ راست خطاب) ان لوگوں کو بھی شامل ہوتا ہے جو شرعی تکلیف کے درجے کو ابھی نہیں پہنچے ہوتے، تاکہ وہ سارے لوگ بھی ان کی صف میں شامل ہو جائیں جو قیامت تک پیدا ہوں گے، یا وہ خطاب بطورِ تغلیب ہے، یعنی حاضرین کی غالب اکثریت کو مخاطب کیا ہے جس میں غیر موجود بھی شامل ہیں، جس طرح ﴿ اِتَّقُوْا رَبَّكُمُ ﴾ میں مردوں کو عورتوں پر غالب رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ اس بدیع طرز پر پیدا کرنا اللہ سے ڈرنے کا ایک بہت بڑا داعیہ ہے، تاکہ اللہ کے عذاب کا سبب بننے والی چیزوں سے بچیں اور یہ نعمتِ الٰہی کے کفران پر ایک بڑی ڈانٹ ہے۔ آدم اور حوا سے لوگوں کا نکالنا بھی قطع تعلقی سے احتراز کرنے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، تاکہ لوگ حقوقِ اخوت میں کسی طرح کا خلل نہ کریں۔ حوا کو آدم سے اس طرح پیدا نہیں کیا جس طرح اولاد آباء سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے حوا آدم کی بیٹی یا بہن ہونے کے حکم میں نہیں۔

امام کعب، وہب اور ابن اسحاق رحمہم اللہ نے کہا کہ حوّا کی پیدائش جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ پیدائشِ حوا جنت میں تھی، جبکہ آدم بہشت میں داخل ہو چکے تھے۔[3] پھر نفس اور زوج مذکور سے بہت سے مرد و عورت پھیلائے۔ پھر کہا: اللہ سے ڈرو، جس کی تم قسم کھاتے ہو یا جس کی تعظیم کرتے ہو یا جس کے نام پر تم دیتے ہو یا جس کا نام لے کر تمھارے کچھ لوگ مانگتے ہیں۔

پھر اَرحام کا ذکر کیا، یعنی ارحام کی محبت کو قطع کرنے سے بچو، کیوں کہ قطع رحمی اکبرالکبائر ہے اور صلہ رحمی ہر خیر کا دروازہ ہے۔ صلہ رحمی سے عمر بڑھتی ہے، رزق میں برکت ہوتی ہے۔ قطع رحمی ہر شر کا سبب ہے، اسی لیے تقوائے رحم

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٧)

[2] مسند أحمد (١/ ٣٩٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٩٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (صحيح أبي داود: ٦/ ٣٤٤)

[3] تفسير الخازن (١/ ٤٧٣)

کو تقویٰ اللہ سے ملایا ہے۔ یہ صلہ رحمی لوگوں کے مختلف ہونے کے ساتھ مختلف ہوتی ہے، کبھی صلہ احسانِ رحم کے طور پر ہوتا ہے، کبھی خدمت کے طور پر، کبھی حاجت پوری کرنے کے ساتھ، کبھی مکاتبت کے ساتھ (مالک اور غلام کا لکھ لینا کہ اتنا مال ادا کر دے تو غلام آزاد ہے) اور کبھی حسنِ عبارت کے ساتھ۔ یہ اس وقت ہے جب لفظِ ارحام کو زیر کے ساتھ پڑھا جائے لیکن اگر اسے پیش کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ معنیٰ ہیں کہ ارحام کا صلہ کرو۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ارحام پر زبر اغراء (ترغیب) کے لیے جائز ہے۔[1] ارحام تمام قریبی رشتہ داروں کا نام ہے، محرم ہوں یا غیر محرم، اس میں اہلِ شرع اور اہلِ لغت میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ہبہ کرنے کے بعد واپس مانگنے کی ممانعت کو محرم کے ساتھ خاص کیا ہے، حالاں کہ وہ اس کے معنوی عموم کے قائل ہیں، لہٰذا اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صلہ رحمی واجب ہے اور قطع رحمی حرام۔[2] اس بات میں بہت سی احادیثِ صحیحہ آئی ہیں۔ شیخین نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رحم عرش سے لٹکتا ہے اور کہتا ہے، جو کوئی مجھ کو ملا دے، اللہ اس کو ملا دے اور جو کوئی مجھ کو کاٹے، اللہ اس کو کاٹے۔[3] قرابت کو رحم اس لیے کہتے ہیں کہ قریبی رشتہ دار آپس میں ایک دوسرے پر رحم اور مہربانی کرتے ہیں۔ رقیب حافظ کو کہتے ہیں، جو چھپا کھلا جانتا ہے اور مراقب کو کہتے ہیں، جس کی نظر معاملات کی تحقیق میں تیز ہوتی ہے۔[4]

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝۴

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو، اور اچھے مال کو برے مال سے نہ بدلو اور تم ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ، بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے ② اور اگر تمھیں ڈر ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کی بجائے ان عورتوں میں سے جو تمھیں اچھی لگیں، دو دو، تین تین اور چار چار سے نکاح کر

---

① تفسير أبي السعود (٢/ ١٣٩)
② تفسير القرطبي (٥/ ٦)
③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٥)
④ فتح البيان (٣/ ٩-١١)

لو، پھر اگر تمھیں ڈر ہو کہ تم انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی سے (نکاح کرو) یا اپنی ملکیت کی لونڈیوں سے (ازدواجی تعلق رکھو) یہ زیادہ قریب ہے، اس بات کے کہ تم ناانصافی نہیں کرو گے ③ اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دو، پھر اگر وہ اپنی مرضی سے تمھیں کچھ مہر چھوڑ دیں تو تم اسے شوق سے کھا سکتے ہو ④

موضح القرآن کا بیان:

جس لڑکے کا باپ مرجائے تو اس کے بڑوں کو حکم ہے کہ اس کے مال میں ہاتھ نہ ڈالیں، اور اس کو تبدیل نہ کریں، بلکہ احتیاط سے رکھیں اور جب لڑکا بالغ ہو تو اس کے حوالے کریں۔ پھر فرمایا کہ اگر تمھارا خیال ہو کہ یتیم لڑکی سے نکاح کریں گے تو اس کا حق ادا نہیں کریں گے، کیوں کہ اس کا حق مانگنے والا کوئی نہیں تو اور عورتیں بہت ہیں، کچھ کمی نہیں۔ ایک مرد کے لیے دو بھی، تین بھی اور چار بھی جائز ہیں، اس سے زیادہ جمع کرنا جائز نہیں، کیوں کہ اتنے میں انصاف کرنا مشکل ہے تو زیادہ میں کب ہو سکے گا۔ اس قدر بھی جب کرو کہ جان لو کہ انصاف سے رہو گے، نہیں تو ایک ہی کافی ہے یا اپنی لونڈی کافی ہے۔ جس کی کئی عورتیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ کھانے، پہننے اور لینے دینے میں سب کو برابر رکھے۔ رات کے رہنے میں برابر کی باری باندھے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو قیامت کے دن اس کا آدھا بدن گھسٹتا چلے گا۔[1] حکم دیا کہ مومن عورت کا پورا مہر خوشی سے ادا کرو، اگر وہ خوشی سے کچھ چھوڑ دے تو جائز ہے۔ موضح القرآن میں اسی طرح لکھا ہے۔

یتیموں کے مال کی حفاظت کا حکم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دیتا ہے کہ یتیموں کو ان کا پورا مال دے دو، جب وہ بالغ ہو جائیں۔ تم اس مال کو کھاؤ نہ اپنے مال میں ملاؤ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ﴾ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: تو رزقِ حرام کے لیے جلدی نہ کر، اس سے پہلے کہ تیرے پاس رزقِ حلال آئے جو تیری تقدیر میں لکھا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: لوگوں کا حرام مال اپنے حلال مال سے نہ بدلو۔ یعنی تمھارا حلال مال ہے، یتیموں کا مال تم پر حرام ہے، لہٰذا تم اس حلال کو اس حرام سے تبدیل نہ کرو۔

سعید بن مسیّب رحمہ اللہ اور امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: یعنی دبلا دے کر موٹا نہ لو۔ امام ابراہیم نخعی اور امام ضحاک رحمہما اللہ نے کہا: زیف (نکما) دے کر جیّد (عمدہ) نہ لو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: موٹی بکری مالِ یتیم سے لے کر اس کے بدلے دبلی بکری رکھ دیتے، کھرا دینار لے کر اس کے بدلے کھوٹا دینار دیتے اور کہتے کہ بکری کے بدلے بکری اور دینار کے عوض دینار ہو گیا۔

یہ جو فرمایا کہ ان کا مال اپنے مال میں نہ ملاؤ، اس کا مطلب امام مجاہد، سعید بن جبیر، ابن سیرین، قتادہ، مقاتل بن حیان، سدی اور سفیان بن حسین رحمہم اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کے مال کو اپنے مال میں ملا کر سارا مال نہ کھاؤ۔[2]

① دیکھیں: مسند أحمد (۲/ ۲۹۵) سنن أبي داود (۲۱۳۳) ② تفسیر الطبري (۷/ ۵۲۵۔ ۵۲۶) تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸۵۵۔ ۸۵۶)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ حوبِ کبیر یعنی عظیم گناہ ہے۔① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ حوبِ کبیر سے مراد اثمِ کبیر ہے۔ اس روایت کی سند میں ''محمد بن یونس کدیمی'' ضعیف ہے۔② امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن، ابن سیرین، قتادہ، مقاتل بن حیان اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ حوبِ کبیر سے اثمِ کبیر مراد ہے۔ ابو مالک، زید بن اسلم اور ابوسنان رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔③

سنن ابوداود میں ایک حدیث مروی ہے: «اِغْفِرْ لَنَا حُوبَنَا وَخَطَايَانَا»④ ''(اے اللہ!) ہمارے گناہ اور خطائیں معاف کر دے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو ایوب! «إِنَّ طَلَاقَ أُمِّ أَيُّوبَ كَانَ حُوبًا» ''اُمِ ایوب کی طلاق بہت بڑا گناہ ہے۔''⑤ (رواہ ابن مردویہ) امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا کہ حوب سے مراد اثم ہے۔ انس بن سیرین رحمہ اللہ کی روایت یہ ہے کہ ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ اُم ایوب کو طلاق دے دے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ طَلَاقَ أُمِّ أَيُّوبَ لَحُوبٌ فَأَمْسِكْهَا» (رواہ ابن مردویہ) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ اُم سلیم رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ طَلَاقَ أُمِّ سُلَيْمٍ لَحُوبٌ» وہ رک گیا۔⑥ (رواہ ابن مردویہ) مطلب یہ ٹھہرا کہ یتیموں کے اموال کو اپنے مال میں ملا کر کھا جانا اثمِ عظیم اور خطائے کبیر ہے، لہٰذا اس بڑے گناہ سے بچتے رہو۔⑦

مہر کے بغیر یتیم لڑکی سے نکاح کی ممانعت:

پھر فرمایا: جس کے پاس کوئی یتیم لڑکی ہو اور وہ اس بات سے ڈرے کہ اس کو مہرِ مثل نہیں دے گا تو پھر یہ چاہیے کہ اس کو چھوڑ کر کسی اور عورت سے نکاح کر لے، کیوں کہ عورتیں بہت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کچھ تنگی نہیں کی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ایک شخص کے پاس ایک یتیمہ تھی، اس کا ایک کھجور کا درخت تھا، وہ شخص اس کو نہیں دیتا تھا، اس یتیمہ کے پاس کچھ نہیں تھا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا﴾ ایسا گمان ہے کہ وہ یتیمہ اس عذق (کھجور کا درخت) اور اس شخص کے مال میں شریک تھی۔⑧ (رواہ البخاری)

---

① تفسیر الطبري (٧/ ٥٣٠) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٨٥٧) اس کی سند حسن ہے۔
② تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٨٦) ③ تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٥٦)
④ سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٨٩٢) اس کی سند میں ''زیادۃ بن محمد انصاری'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ٥٤٢٢)
⑤ المعجم الکبیر (١٢/ ١٩٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفیه یحییٰ بن عبد الحمید الحماني وهو ضعیف" (مجمع الزوائد: ٩/ ٤٢٤)
⑥ مستدرك الحاکم (٢/ ٣٣٠) اس کی سند میں ''علی بن عاصم'' ضعیف راوی ہے اور گزشتہ روایت مرسل ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٦٦٠٦)
⑦ تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٨٦) ⑧ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٩٧)

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اس آیت کے کیا معنیٰ ہیں؟ کہا: اے بھانجے! مراد یتیمہ ہے، جو کسی ولی کی گود میں ہو، اس کے مال میں شراکت رکھتی ہو، ولی کو اس کا مال و جمال اچھا لگتا ہو، وہ چاہے کہ اس سے بیاہ کر لے اور اس بیچاری کو دوسری عورتوں کے مثل مہر نہ دے اور انصاف نہ کرے، اسی لیے اللہ نے ان کو یتامیٰ سے نکاح کرنے سے منع فرما دیا، مگر اس صورت میں جائز ہے کہ انصاف کریں اور ان کو دوسری عورتوں کے مثل مہر دیں۔

پھر فرمایا کہ ان کے علاوہ جو اور عورتیں پسند آئیں اور اچھی لگیں، ان سے نکاح کر لو، یعنی ان یتیم لڑکیوں ہی پر کیوں اٹکا ہوا ہے۔ عروہ رحمہ اللہ نے کہا: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ لوگوں نے اس آیت کے نزول کے بعد فتویٰ چاہا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ﴾ [النساء: ١٢٧] ''اور (اے نبی!) لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔'' دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ ﴾ [النساء: ١٢٧] ''اور تم چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو۔'' یعنی بغیر مہرِ مثل دیے۔ علاوہ ازیں اس یتیمہ سے بے رغبتی ہے جو قلیل المال و الجمال ہو، اس لیے ان کو ان یتامیٰ سے نکاح کرنے سے منع کیا، جن کے مال اور جمال میں انھیں رغبت ہو، مگر عدل و انصاف کے ساتھ ان کے ساتھ نکاح کی اجازت ہے، کیوں کہ کم مال اور جمال والیوں سے وہ بے زار تھے۔[1]

بیک وقت صرف چار بیویاں رکھنے کی اجازت اور زیادہ سے ممانعت:

پھر فرمایا: ان یتامیٰ کے علاوہ جن سے چاہو نکاح کرو، خواہ دو، خواہ تین، خواہ چار، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ [الفاطر: ١] یعنی بعض فرشتوں کے دو پر ہیں، بعض کے تین اور بعض کے چار۔ فرشتوں میں اس سے زیادہ پر ہونے کی نفی نہیں ہے، کیوں کہ اس سے چار سے زیادہ کی دلیل بھی ملتی ہے، لیکن مردوں کے لیے چار سے زائد بیویوں کی ممانعت موجود ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور علما نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ احسان اور شکر کا مقام ہے، اگر چار سے زیادہ کا جمع کرنا جائز ہوتا تو اللہ ذکر فرماتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اللہ کی طرف سے واضح کر دی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے لیے چار ازواج کو اکٹھا کرنا جائز نہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول علما کے درمیان مجمع علیہ ہے۔ ہاں شیعہ کا ایک گروہ کہتا ہے کہ چار سے زیادہ نو تک بھی جمع کرنا درست ہے اور بعض نے کہا: خاص تعداد مقرر نہیں۔ بعض نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے تمسک کیا ہے کہ آپ نے چار سے نو تک کو جمع فرمایا۔ جس طرح صحیح بخاری میں مروی ہے۔[2] بخاری کی بعض

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٩٨) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٠)

روایات میں آپ کی گیارہ بیویاں مذکور ہیں۔[1] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ عورتوں سے نکاح کیا، تیرہ پر داخل ہوئے، گیارہ آپ کے نزدیک فراہم رہیں، جب وفات پائی تو نو موجود تھیں۔ علما کے نزدیک یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے، امت اس میں شریک نہیں۔[2]

وہ احادیث جو چار کی اباحت پر مبنی ہیں، آگے آئیں گی۔ سالم سے حدیث میں مروی ہے کہ غیلان بن سلمہ ثقفی مسلمان ہوا تو اس کے پاس دس عورتیں تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے چار کو اختیار کر لو (اس نے ایسا ہی کیا)۔ جب عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عہد ہوا تو اس نے اپنی باقی عورتوں کو بھی طلاق دے دی، اپنا مال اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا، جب یہ خبر عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انھوں نے کہا: میں گمان کرتا ہوں کہ شیطان نے استراقِ سمع (آسمانوں سے خبر چوری کرتے وقت) کے دوران میں تیرے مرنے کی خبر سنی اور وہ خبر تیرے دل میں ڈال دی کہ شاید تیری زندگی اب تھوڑی ہے۔ اللہ کی قسم ہے تو اپنی عورتوں سے رجوع کر اور اپنا مال واپس لے، ورنہ میں ان عورتوں کو تیرا وارث بنا دوں گا اور حکم دوں گا کہ تیری قبر کو ابو رغال کی قبر کی طرح سنگسار کریں۔[3] (رواه أحمد و هكذا رواه الشافعي والترمذي وابن ماجه و الدارقطني و البيهقي وغيرهم في طرق من الحفاظ عن معمر بإسناده مثله إلى قوله ”اختر منهن أربعاً“ و باقي الحديث في قصة عمر من أفراد أحمد)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”وَهِيَ زِيَادَةٌ حَسَنَةٌ وهِيَ مُضَعَّفَةٌ لِمَا عَلَّلَ بِهِ الْبُخَارِيُّ هٰذَا الْحَدِيْثَ فِيْمَا حَكَاهُ عَنْهُ التِّرْمَذِيُّ؛ حَيْثُ قَالَ بَعْدَ رِوَايَتِهِ: سَمِعْتُ الْبُخَارِيَّ يَقُوْلُ: هٰذَا الْحَدِيْثُ غَيْرُ مَحْفُوْظٍ وَالصَّحِيْحُ مَا رَوَى شُعَيْبٌ وَ غَيْرُهُ عَنِ الزُّهْرِيِّ، حُدِّثْتُ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِيْ سُوَيْدِ بْنِ الثَّقَفِيِّ أَنَّ غَيْلَانَ بْنَ سَلَمَةَ فَذَكَرَهُ. قَالَ الْبُخَارِيُّ: وَإِنَّمَا حُدِّثْتُ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رَجُلًا مِنْ ثَقِيْفٍ طَلَّقَ نِسَاءَهُ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ: لَتُرَاجِعَنَّ نِسَاءَكَ أَوْ لَأَرْجُمَنَّ قَبْرَكَ كَمَا رُجِمَ قَبْرُ أَبِيْ رِغَالٍ، وَهٰذَا التَّعْلِيْلُ فِيْهِ نَظَرٌ“ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ. یہ اضافہ عمدہ ہے، مگر ضعیف ہے، کیوں کہ ترمذی کے بقول امام بخاری نے اس کو معلل قرار دیا ہے۔

اس کو عبدالرزاق رحمہ اللہ نے معمر سے، معمر نے زہری سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اسی طرح مالک اس کے راوی ہیں۔ زہری سے مرسلاً ابوزرعہ نے کہا: ”هُوَ أَصَحُّ“ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا: ”وَ رَوَاهُ عُقَيْلٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ بَلَغَنَا عَنْ عُثْمَانَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِيْ سُوَيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَزِيْدَ“ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا: ”وَهٰذَا وَهْمٌ إِنَّمَا هُوَ الزُّهْرِيُّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِيْ سُوَيْدٍ بَلَغَنَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَذَكَرَه“ پھر امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا: ”وَ رَوَاهُ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٥) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٨٧)

[3] مسند أحمد (٢/ ١٤) الأم للشافعي (٧/ ٥٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٥٣) سنن الدارقطني (٣/ ٢٧١) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١٨٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٢٠١)

يُونُسُ وَ ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي سُوَيْدٍ" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "وَهٰذَا كَمَا عَلَّلَهُ الْبُخَارِيُّ وَالْإِسْنَادُ الَّذِي قَدَّمْنَاهُ مِنْ مُسْنَدِ الْإِمَامِ أَحْمَدَ رِجَالُهُ ثِقَاتٌ عَلٰى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ ثُمَّ رَوَى مِنْ غَيْرِ طَرِيقِ مَعْمَرٍ، بَلْ وَالزُّهْرِيِّ، قَالَ الْبَيْهَقِيُّ: بِإِسْنَادِهِ عَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ غَيْلَانَ بْنَ سَلَمَةَ كَانَ عِنْدَهُ عَشْرُ نِسْوَةٍ وَأَسْلَمْنَ مَعَهُ فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَخْتَارَ مِنْهُنَّ أَرْبَعًا" [1] (هكذا أخرجه النسائي في سننه)

امام احمد رحمہ اللہ کی اسناد یہ ہے: "حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ وَ مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَا حَدَّثَنَا مَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ ابْنُ جَعْفَرٍ فِي حَدِيثِهِ أَنْبَأَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ غَيْلَانَ بْنَ سَلَمَةَ" (الحديث منه) ابوعلی بن السکن رحمہ اللہ کہتے ہیں: "تَفَرَّدَ بِهِ سَرَارُ بْنُ مُجَشِّرٍ وَهُوَ ثِقَةٌ، وَكَذَا وَثَّقَهُ ابْنُ مَعِينٍ، قَالَ أَبُو عَلِيٍّ: وَكَذٰلِكَ رَوَاهُ السَّمَيْدَعُ بْنُ وَهْبٍ عَنْ سَرَارٍ.

امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا: "وَرُوِينَا مِنْ حَدِيثِ قَيْسِ بْنِ الْحَارِثِ أَوِ الْحَارِثِ بْنِ قَيْسٍ وَ عُرْوَةَ بْنِ مَسْعُودٍ الثَّقَفِيِّ وَ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ يَعْنِي حَدِيثَ غَيْلَانَ بْنِ سَلَمَةَ" دلیل یہ ہے کہ اگر چار سے زیادہ کا جمع کرنا جائز ہوتا تو نبی مکرم ﷺ غیلان کے لیے دس کی دس ساری عورتیں جائز فرما دیتے، کیوں کہ وہ سب مسلمان ہوگئی تھیں۔ لہٰذا جب چار کو روکنے اور باقی کو چھوڑنے اور جدا کرنے کا حکم دیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی حال میں بھی چار سے زیادہ کا جمع کرنا درست نہیں ہے اور جب یہ حکم دائمی ٹھہرا تو پھر شروع میں تو اور زیادہ صحیح ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.[2]

دوسری حدیث امام ابو داود اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے بطریق محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، اس نے حمیصہ بن شمردل سے روایت کی ہے، ابن ماجہ نے بنت شمردل کہا ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے کہا: بعض شمرذل ذال کے ساتھ کہتے ہیں، شمرذل قیس بن حارث سے راوی ہیں۔ سنن ابو داود کی دوسری روایت میں حارث بن قیس مروی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ عمیرہ اسدی نے کہا: میں اسلام لایا تو میرے پاس آٹھ عورتیں تھیں۔ میں نے نبی مکرم ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ان میں سے چار کو اختیار کرلو۔"[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "وَهٰذَا الْإِسْنَادُ حَسَنٌ وَهٰذَا اخْتِلَافٌ لَا يَضُرُّ مِثْلُهُ لِمَا لِلْحَدِيثِ مِنَ الشَّوَاهِدِ" "یہ حسن سند ہے اور اس طرح کا اختلاف مضر نہیں، کیوں کہ اس حدیث کے شواہد موجود ہیں۔" تیسری حدیث۔ نوفل بن معاویہ دیلی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں مسلمان ہوا تو میرے پاس پانچ عورتیں تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١٧١) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٨٧۔ ٥٨٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٥٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٢٩٥)

کہا کہ جو چار عورتیں تو چاہے اختیار کر لو اور پانچویں کو جدا کر دے۔ میں نے اس کی طرف قصد کیا جو صحبت میں زیادہ قدیم تھی اور جو بڑھیا بانجھ ساٹھ برس سے میرے ساتھ تھی، میں نے اس کو طلاق دے دی۔[1] (رواہ الشافعي في مسندہ)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”فَهٰذِهِ كُلُّهَا شَوَاهِدُ لِحَدِيْثِ غَيْلَانَ كَمَا قَالَهُ الْبَيْهَقِيُّ“[2] انتہیٰ.

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں زیرِ تفسیر آیت: ﴿ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ ... الخ﴾ کے تحت یہ لکھا ہے کہ یہ تقویٰ پیدا کرنے کی ابتدا ہے۔ یتامیٰ کو اس لیے مقدم کیا ہے کہ ان کے حال پر کمال عنایت ظاہر ہو۔ ارحام سے ان کی وابستگی پائی جائے۔ یہ خطاب سرپرستوں کے ساتھ ان کو بھی ہے جن کے حق میں وصیت کی گئی ہو۔ یتیم وہ ہے جس کا باپ نہ ہو۔ شرع میں یہ لفظ غیر بالغ کے لیے خاص ہے، اس لفظ کا ان پر مال سپرد کرتے وقت اور بالغ ہونے پر جو اطلاق کیا گیا ہے، وہ ان کے سابقہ حال کے اعتبار سے مجازاً ہے، یا یتامیٰ سے حقیقی معنی مراد ہیں اور مال دینے سے ان کو روٹی کپڑا دینا مراد ہے، جو ولی اور وصی ان کو دیتے ہیں نہ کہ سارا مال دینا۔

یہ آیت دوسری آیت کے ساتھ مقید ہے، جو اس طرح ہے: ﴿ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ﴾ [النساء: ٦] ”پھر اگر تم انھیں سمجھ دار پاؤ تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو۔“ اس صورت میں یتیم کا صرف بلوغت کو پہنچ جانا، مال کو اس کے حوالے کرنے کو جائز نہیں کرتا، جب تک کہ اس میں رشد نہ پایا جائے۔

اس جگہ خبیث سے مراد یتیم کا مال ہے، اگرچہ وہ جید کیوں نہ ہو، کیوں کہ وہ حرام ہے۔ طیب سے مراد ولی کا مال ہے، کیوں کہ وہ حلال ہے، اگرچہ ردی ہو۔ جاہلیت کے کام سے منع کیا کہ یتیموں کا اچھا مال لے کر اس کے عوض ردی مال نہ دو، کیوں کہ جاہلیت والے اس کام کو برا نہیں سمجھتے تھے، یا یہ معنیٰ ہیں کہ تم ان کا مال اس طرح نہ کھاؤ کہ اپنا مال جمع رکھو کہ وہ مال تمھارے لیے حرام ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ آیت زیرِ تفسیر: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ﴾ میں جس چیز سے منع کیا گیا، وہ مالوں کو خلط ملط کرنا ہے، یعنی یتیموں کے مال کو اپنے مال میں ملا کر نہ کھاؤ، یہ ایک دوسرے منکر کام سے ممانعت ہے، جو وہ کرتے تھے، ملانے سے ممانعت، باوجودیکہ بغیر ملائے کھانا بھی حرام ہے، اس لیے فرمایا کہ یتیم کے مال کو غنی ہونے اور ضرورت مند نہ ہونے کے باوجود کھانا اور بھی زیادہ برا ہے۔ لہٰذا یہ قید اس کی برائی کے لیے ہوئی اور جب یہ قید اسی لیے لگائی گئی تو جو شخص اس کے برعکس مفہوم کا قائل ہو تو اس کو صرف مال کھانے کا جواز لازم

---

[1] مسند الشافعي (١/ ٢٧٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ دیکھیں: إرواء الغلیل (٢/ ٢٩٥)

[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٨٨)

نہیں آ تا۔ یہ امام کرخی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

پھر خلطِ مال (مال کو ملانا) جس کا اوپر ذکر کیا گیا، اس آیتِ کریمہ سے منسوخ ہوگیا: ﴿ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ﴾ [البقرۃ: ۲۲۰] ''اور اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہن سہن اکٹھا رکھو تو وہ تمھارے بھائی ہی ہیں۔'' کسی نے کہا: حرفِ ﴿ اِلٰى ﴾ بہ معنی ''مع'' ہے، یعنی ان کا مال اپنے مال کے ساتھ نہ کھاؤ، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے، مالِ یتیم کا کھانا یا بدلنا دونوں بڑے گناہ ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غطفان کا ایک آدمی تھا، اس کے پاس اس کے بھتیجے کا بہت سا مال تھا، جب وہ بالغ ہوا اور اس نے اپنا مال مانگا تو چچا نے نہ دیا، وہ جھگڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، اس پر یہ آیت اتری۔[1] ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: اہلِ جاہلیت عورتوں اور چھوٹے بچوں کو وارث نہیں بناتے تھے، جو بڑا ہوتا وہ سارا مال لے لیتا، اس لیے میراث میں سے اس کا حصہ طیب تھا اور جو زیادہ لیا وہ خبیث ہے۔[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے یتیمہ سے نکاح کا حکم بیان کیا کہ اگر اس کے حق میں تم انصاف کرو اور پورا مہر دو تو بیاہ کرو، ورنہ نہ کرو۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ خِفْتُمْ ﴾ بہ معنی ''أَيْقَنْتُمْ'' ''تمھیں یقین ہو'' ہے۔ کسی نے کہا: بہ معنی ''ظَنَنْتُمْ'' ''تمھیں گمان غالب ہو'' ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ حذاق نے یہی معنی لیے ہیں، یعنی جس کے گمان میں یہ غالب ہو کہ وہ یتیمہ کے ساتھ عدل کرنے میں کمی کرے گا تو چاہیے کہ اس یتیمہ کو چھوڑ دے اور کسی اور عورت سے بیاہ کرلے۔[3] ﴿ مَا طَابَ ﴾ سے مراد حلال عورتیں ہیں، اس لیے کہ حرام عورتیں طیب نہیں ہوتیں۔

لفظِ ﴿ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا: ان الفاظ میں قیاس جائز ہے۔ کسی نے کہا: نہیں، بلکہ سماع پر مقصور ہیں۔ پہلا قول کوفیوں اور امام ابو اسحاق وغیرہ کا ہے۔ دوسرا قول بصریوں کا ہے۔ اس طرح کے گیارہ الفاظ سنے گئے ہیں۔ آیت چار عورتوں سے زیادہ کی حرمت پر دلیل ہے، کیوں کہ ساری اُمت کو خطاب ہے، جو ہر نکاح کرنے والے کو پہنچتا ہے کہ اس عدد میں سے جو چاہے اختیار کرے۔ جس طرح کوئی ایک جماعت سے کہے کہ تم اس مال کو بانٹ لو اور وہ مال ہزار درہم ہو۔ لہٰذا یہ بات مسلم ہے، جبکہ تمام مقسوم کا ذکر کریں یا اس کی جگہ معین کر دیں، لیکن اگر مطلق ہے، جس طرح یوں کہیں کہ ان دراہم کو تقسیم کر لو اور مراد مکسوب (حاصل کیا گیا) ہو تو یہ معنی ٹھیک نہیں ہوں گے۔

لہٰذا یہ آیت دوسرے باب سے ہے نہ کہ پہلے باب سے۔ حالاں کہ اگر کسی نے ایک قوم سے جو بہت زیادہ ہیں اور معین مال کو تقسیم کرتے ہیں، یوں کہا کہ تم اس مال کو دو دو، تین تین، چار چار درہم کر کے بانٹ لو، پھر ان میں سے بعض نے دو دو درہم لیے اور بعض نے تین تین اور بعض نے چار چار تو یہ معنی عربی ہوئے۔ یہ بات معلوم ہوئی کہ جب کوئی یوں کہتا ہے: ''جَاءَنِيْ الْقَوْمُ مَثْنٰى'' یعنی میرے پاس قوم سے دو دو آدمی آئے اور وہ ایک لاکھ تھے تو

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸۵٤) [2] تفسیر الطبري (۷/ ٥۲٦) [3] تفسیر القرطبي (٥/ ۱۲)

اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ دو دو آدمی اس کے پاس آئے۔

اسی طرح یہ قول: ”جَاءَنِي الْقَوْمُ ثُلٰثُ وَرُبٰعُ“ ہے۔ سب کو خطاب کرنا ویسا ہی ہے جیسے ہر ایک کو خطاب کرنا۔ اس صورت میں آیتِ کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک فرد تم میں سے اس عورت سے نکاح کرے جو عورتوں میں سے اس کو پسند آئے اور خوش لگے، دو دو، تین تین، چار چار۔ یہی لغتِ عرب کا مقصد ہے۔ لہٰذا آیت اس بات کے خلاف دلیل ہے جس پر عامۂ مفسرین نے استدلال کیا ہے۔ آیت کا آخری حصہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے: ﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ﴾ کیوں کہ یہ خطاب اگرچہ سب کو ہے، مگر بہ منزلہ خطاب کے ہر فرد کو ہے۔

چار عورتوں سے زیادہ کی حرمت..سنت کی روشنی میں:

پس زیادہ بہتر یہ ہے کہ چار عورتوں سے زیادہ کی حرمت پر سنت سے استدلال کریں نہ کہ قرآنِ کریم سے۔ جس نے آیتِ زیرِ تفسیر سے واؤ جامعہ کی وجہ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نو عورتوں سے نکاح جائز ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ تم ان اعداد کے مجموعے سے نکاح کرو تو اس کا یہ استدلال عربی معانی سے جہالت کی بنا پر ہے۔ اگر یوں کہا ہوتا کہ ”اِنْكِحُوا اثْنَتَيْنِ وَثَلَاثاً وَّأَرْبَعًا“ تو ایک بات بھی تھی، لیکن جب عدل کا صیغہ آیا اور مذکور الفاظ معدولہ ٹھہرے تو یہ معنی ٹھیک نہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے واؤ جامعہ ذکر کیا، صرف ﴿ اَوْ ﴾ تخییر کے لیے ہی نہیں فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعدادِ مذکورہ سے صرف ایک عدد جائز ہے نہ کہ اس کے سوا کوئی اور، نیز قرآنی نظم کی یہ مراد نہیں ہے۔ غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اوپر گزر چکی ہے، اس کے پاس دس عورتیں تھیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِخْتَرْ مِنْهَا أَرْبَعاً)) دوسرے الفاظ یہ ہیں: ((أَمْسِكْ مِنْهُنَّ أَرْبَعاً وَفَارِقْ سَائِرَهُنَّ)) ”ان میں سے چار رکھ لے اور باقی سب کو چھوڑ دے۔“ یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ کئی طرق سے مروی ہے۔

دوسری حدیث نوفل بن معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کے پاس پانچ عورتیں تھیں، اس سے بھی یہی فرمایا کہ ((أَمْسِكْ أَرْبَعًا وَفَارِقِ الْأُخْرىٰ)) تیسری حدیث سیدنا قیس بن حارث اسدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس کے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں، اس سے کہا: ((اِخْتَرْ مِنْهُنَّ أَرْبَعاً وَخَلِّ سَائِرَهُنَّ)) [1] (أخرجه ابن ماجه و النحاس في ناسخه)

یہ سب حدیثیں پہلی حدیث کی شاہد ہیں، جس طرح امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ حکم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ مملوک (غلام) دو عورت سے زیادہ جمع نہ کرے۔ [2] ”فِي بَعْضِ التَّفَاسِيرِ هُنَا خَلْطٌ وَخَبْطٌ تَرَكْنَاهُ لِأَنَّهُ تَطْوِيلٌ بِلَا طَائِلٍ، وَحَسْبُكَ مِنَ الْقَلَادَةِ مَا أَحَاطَ بِالْعُنُقِ“ [3] ”یہاں بعض تفاسیر میں بہت سا خلط اور پراگندگی ہے، جس کو ہم نے چھوڑ دیا ہے، کیوں کہ وہ بے فائدہ بحث ہے اور ہار گردن میں جتنا پورا آجائے، اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔“

---

[1] ان تمام روایات کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] سنن البيهقي الكبرىٰ (۷/ ۱۵۸) [3] فتح البيان (۳/ ۱۲۔ ۱۸)

حاصل مدعا یہ ہوا کہ قرآن شریف سے عربی زبان کے لفظی ومعنوی محاورے کے مطابق یہ بات نکلتی ہے کہ دو دو، تین تین، چار چار عورت سے ایک بار نکاح کرنا جائز ہے۔ یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ چار سے زیادہ سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، یہ عدمِ جواز اگر ثابت ہوتا ہے تو سنتِ مطہرہ سے نکلتا ہے اور سنت کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔ سنت میں اگر چہ بہ نظرِ الفاظ وطرق ایک طرح کا ضعف وکلام ہے، جس کا بیان اوپر گزر چکا، لیکن مجموع طرق سے حسن لغیرہ ہونا پایا جاتا ہے۔ ایسی حدیث بھی لائقِ استدلال ہوتی ہے۔

پھر اجماعِ ملت اور ائمہ اربعہ کا اتفاق بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے کہ چار عدد سے زیادہ جائز نہیں۔ پھر اجماعِ صحابہ نے اس کو ایک اور رونق تازہ بخشی، اس لیے ان اسباب کے باوجود صحیح یہی ہے کہ ایک وقت میں چار عورتوں سے زیادہ نکاح میں جمع نہ کرے۔ حلال وحرام کے درمیان میں مشتبہات ہوتے ہیں، مومنوں کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے کاموں کو چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ جو مشتبہ امر سے بچتا ہے، وہ اپنے دین وآبرو کو بچا لیتا ہے اور جو چراگاہ کے نزدیک پھرتا ہے، وہ قریب ہے کہ اس کے اندر جا پڑے اور اس میں پھنس جائے۔ واللہ أعلم.

انصاف نہ کر سکنے کے خوف سے ایک پر اکتفا کرنا:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تمھیں ڈر ہو کہ تم بیویوں کے درمیان ان کے نان ونفقہ، پہناوے اور سکونت وغیرہ کے معاملے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو تم نہ دو کرو نہ تین نہ چار، بلکہ ایک ہی بیوی پر قناعت کرو۔ اس میں ڈرنے والے شخص کو ایک سے زیادہ عورتوں سے منع کیا ہے، یا لونڈی پر اکتفا کرو، گو وہ عدد میں زیادہ ہوں، کیوں کہ ان کے حقوق آزاد بیویوں کے حقوق کی طرح نہیں ہوتے۔ مراد دائیں ہاتھ کی ملکیت (ملک یمین) کے طریق سے ہے نہ کہ طریقِ نکاح سے۔

اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ مملوکات کا وراثت کی تقسیم میں کوئی حق نہیں ہے، کیوں کہ اس کو عدمِ عدل سے بچانے کے لیے ایک زوجہ کے برابر ٹھہرایا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ جس کو عدمِ عدل کا ڈر ہو، وہ ایک ہی پر اکتفا کرے یا لونڈیوں پر قناعت کرے، کیوں کہ ان میں تقسیم واجب نہیں ہے، لیکن مستحب ہے۔ جس نے تقسیم کی تو اچھا کیا اور جس نے نہ کی تو کوئی حرج نہیں۔[1] یہ صرف چار سے یا ایک ہی سے نکاح کرنا یا ملکِ یمین کا رکھنا عدمِ جور (ظلم کا نہ ہونا) سے قریب تر ہے۔ مفسرین کا یہی قول ہے۔

امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ یہ عدمِ ضلالت سے قریب تر ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ یہ اس بات سے زیادہ نزدیک ہے کہ تمھارے عیال زیادہ نہ ہوں۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ معنی شافعی کے

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٥٨٨)

سوا اور کسی نے نہیں کیے۔ مگر زید بن اسلم اور جابر بن زید رحمہ اللہ بھی اسی معنی کی طرف گئے ہیں اور وہ دونوں ائمہ اسلام میں سے ہیں۔ وہ اور امام شافعی رحمہ اللہ قرآن کی ایسی تفسیر ہرگز نہیں کریں گے جس کے لیے عربیت میں کوئی گنجایش نہ ہو۔ بلکہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کسائی اور ابو عمر دوری اور ابن الاعرابی رحمہم اللہ سے بھی یہی معنی بیان کیے ہیں۔

امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا کہ امام شافعی رحمہ اللہ لغتِ عرب کے ہم سے زیادہ عالم تھے۔ دوری رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حمیر کی لغت ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: امام شافعی رحمہ اللہ کا قول خود ایک حجت ہے، کیوں کہ وہ ایک فصیح عرب مرد تھے۔ طلحہ بن مصرف رحمہ اللہ نے کہا: ''أَنْ لَّا تُعِيْلُوْا'' پڑھا ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ کے لیے دلیل ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ ''إِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً'' سے ماخوذ ہے۔ عرب کہتے ہیں: ''عَالَ الرَّجُلُ يَعِيْلُ عَيْلَةً إِذَا افْتَقَرَ'' لیکن اس تفسیر میں نظر ہے، اس لیے کہ اگر آزاد عورتوں (بیویوں) سے عیال کی کثرت کا خوف ہے تو اسی طرح یہ خوف لونڈیوں کی تعداد میں بھی ہے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اگر تو ڈرے کہ چار میں عدل نہ کر سکے گا تو تین کر، ورنہ دو، ورنہ ایک۔ پھر اگر ایک میں بھی عدمِ عدل کا ڈر ہو تو لونڈی کر، یہی امام ربیع رحمہ اللہ کا قول ہے۔[3]

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: عدل سے مراد مجامعت اور محبت میں برابری کرنا ہے،[4] مگر اس میں نظر ہے، کیوں کہ حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: «هٰذَا قَسْمِيْ فِيْمَا أَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا لَا أَمْلِكُ»[5] ''یہ اس کے مطابق تقسیم ہے جس کا میں مالک ہوں اور جس کا میں مالک نہیں، اس پر تو مجھے ملامت نہ کرنا۔'' مراد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ﴿ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ﴾ [النساء: ۱۲۹] ''تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ اپنی تمام بیویوں میں ہر طرح عدل کرو، گو تم اس کی کتنی ہی خواہش کرو۔'' اسی طرح مساوات شب باشی میں ہے نہ کہ صحبت میں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ملکِ یمین سے مراد لونڈیاں ہیں۔[6]

صحیح قول جمہور کا ہے کہ ''لَا تَعُوْلُوْا'' بہ معنی ''لَا تَجُوْرُوْا'' ''ظلم نہ کرو'' ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ﴿ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴾ کے معنی ہیں: ''أَنْ لَّا تَجُوْرُوْا'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا: ''أَنْ لَّا تَمِيْلُوْا'' امام مجاہد، ابو رزین، ابو مالک اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: ''أَنْ لَّا يَكْثُرَ مَنْ تَعُوْلُوْا'' امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا: ''أَنْ لَّا تَفْتَقِرُوْا''[7]

---

[1] تفسير القرطبي (٥/ ٢١۔ ٢٢) فتح البيان (٣/ ١٩)
[2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٨٩)
[3] تفسير الطبري (٧/ ٥٣٦۔ ٥٣٩)
[4] تفسير الطبري (٧/ ٥٤٨)
[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٤٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٤٣) اس روایت کا مرسل ہونا صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ٨١) البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم میں عدل کرنا کئی ایک صحیح احادیث میں مروی ہے۔
[6] تفسير الطبري (٧/ ٥٤٨)
[7] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦٠)

حق مہر کا مسئلہ:

پھر ازواج کو یا اولیا کو یہ خطاب فرمایا کہ تم عورتوں کا مہر بطورِ قرض (براہ تدیّن) دے دو یا بطورِ فرض یا دل کی خوشی سے یا بطورِ وجوب۔ یہ سب لفظِ ﴿ نِحْلَةً ﴾ کے معنی ہیں۔ پھر اگر ازواج کو خطاب ہے تو مراد وہ عورتیں ہیں جن سے نکاح کیا ہے، اور اگر خطاب اولیا کو ہے تو مراد قرابت والیاں ہیں، جن کے مہر ان کے ازواج سے لے کر اولیا نے اپنے قبضے میں رکھے ہیں۔ جاہلیت کے زمانے میں ولی اپنی قریبہ کا مہر لے لیتا تھا، اس کو کچھ نہیں دیتا تھا۔ مگر آیت کے ظاہر کے مطابق پہلے معنی زیادہ بہتر ہیں۔ اکثر اہلِ علم اسی پر ہیں، کیوں کہ اس آیت سے پہلے بھی ازواج ہی کو خطاب تھا۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کا مہر شوہر پر واجب ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: اس پر اجماع ہے۔ علما کہتے ہیں کہ مہر کی زیادتی کی کوئی حد نہیں، قلیل میں اختلاف ہے۔[1] پھر اگر بیویاں مہر کا کچھ حصہ اپنی خوشی سے شوہروں کو ہبہ کر دیں تو اس کا کھانا جائز ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی بغیر تنگ کیے ہوئے یا فریب کے۔[2] اسی لیے یہ بات ہے کہ سارے مہر کا ہبہ کرنا جائز نہیں ہے، یہی لیث رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ کسی نے کہا: بلکہ سب کا ہبہ کرنا بھی جائز ہے، کیوں کہ اس جگہ "من" بیان کے لیے ہے، تبعیض (اس کا کچھ حصہ) کے لیے نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ نِحْلَةً ﴾ سے مراد مہر ہے۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: فریضہ ہے۔ امام مقاتل، قتادہ اور ابن جریج رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ مراد طے شدہ فریضہ ہے۔[4] ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: کلامِ عرب میں ﴿ نِحْلَةً ﴾ واجب کے معنی میں آتا ہے، یعنی عورت سے اس کے لیے ایک شے واجب کیے بغیر نکاح نہ کرو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے یہ لائق نہیں کہ کسی عورت سے صداقِ واجب (واجب حق مہر) کے بغیر نکاح کرے اسی طرح حق مہر جھوٹ موٹ بھی مقرر نہیں کرنا چاہیے۔[5] ان کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ مرد کو دل کی خوشی کے ساتھ عورت کا مہر ادا کرنا چاہیے، جس طرح منیحہ یا نحلہ (تحفہ) کو خوش ہو کر دیتا ہے، اسی طرح مہر کو بھی بہ طیب خاطر دے۔ پھر اگر وہ عورت مہر مقرر ہو جانے کے بعد اپنی خوشی سے اس کا کچھ حصہ ہبہ کر دے تو اس کو خوشی سے کھائے کہ یہ حلال اور طیب ہے۔

اس لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا ... الخ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) سو لفظ ﴿ طِبْنَ ﴾ اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر پر مہر کا لینا اس وقت حلال ہوتا ہے جب وہ اپنی خوشی اور خوش دلی سے دیں

---

[1] تفسیر القرطبي (٥/ ٢٤) [2] تفسير الطبري (٧/ ٥٥٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦٢) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسير الطبري (٧/ ٥٥٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦١) اس کی سند حسن ہے۔
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦١) [5] تفسير الطبري (٧/ ٥٥٣)

نہ کہ صرف ایسے الفاظ سے دیں جن سے خوش دلی ثابت نہیں ہوتی، اس لیے جب کوئی ایسی بات معلوم ہو جس سے خوش دلی ظاہر نہ ہو تو وہ مہر شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگا، اگرچہ وہ منہ سے نذر اور ہبہ کے الفاظ ہی کیوں نہ ادا کرے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں اس لحاظ سے دلیل کس قدر قوی تر ہے کہ ان الفاظ پر اعتبار نہیں ہو سکتا جو عورتوں سے صادر ہوتے ہیں اور جن سے مرد کو ملکیت کا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی عقلیں ناقص اور اُن کی قوتِ ادراک کمزور ہوتی ہے اور انھیں جلد ہی رام کیا جا سکتا ہے۔ عورتوں کا طبقہ ذرا سی رغبت دلانے اور ڈرانے دھمکانے سے کسی کے حق میں ہو جاتا ہے۔[1]

غرض یہ کہ جب کوئی عورت اپنے مہر میں سے کچھ شوہر کو دے اور دل کی خوشی سے دے تو شوہر کو اس کا کھانا اور اس مال سے ہر طرح کا فائدہ اُٹھانا جائز اور حلال ہے اور تمام شائبوں سے پاک ہے۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: تم میں جب کوئی بیمار ہو تو اپنی عورت سے تین درہم مانگ کر شہد لے اور اس میں آسمان کا پانی ملا دے، یہ ﴿هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ شفائے مبارک ہے۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: کوئی شخص اپنی بیٹی کا بیاہ کرتا تو اس کا مہر خود لے لیتا۔[2]

اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع کیا، فرمایا: عورتوں کا مہر انہی عورتوں کو دے دو تم نہ لو۔ نبی کریم ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! "مَا الْعَلَائِقُ بَيْنَهُمْ" قَالَ: «مَا تَرَاضٰى عَلَيْهِ أَهْلُوْهُمْ»[3] "ان کے درمیان قابلِ کفایت مقدار کیا ہے؟ فرمایا: جس پر ان کے گھر والے راضی ہو جائیں۔"[4] (رواه ابن أبي حاتم عن عبدالرحمن بن البيلماني)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے خطبہ پڑھا، تین بار کہا: ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ [النور: ٣٢] "اور تم اپنے بے نکاح مردوں، عورتوں کے نکاح کر دو۔" ایک آدمی نے پوچھا: "مَا الْعَلَائِقُ بَيْنَهُمْ؟" فرمایا: «مَا تَرَاضٰى عَلَيْهِ أَهْلُوْهُمْ» (رواه ابن مردويه) اس کا ایک راوی "ابن البیلمانی" ضعیف ہے۔ پھر اس کی سند میں انقطاع بھی ہے۔[5]

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ

[1] فتح القدير (١/ ٦٨٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦١ ـ ٨٦٢) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦١ ـ ٨٦٢)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦١) یہ روایت مرسل ہے اور "عبدالرحمٰن بن بیلمانی" ضعیف راوی ہے۔
[5] تفسير ابن كثير (١/ ٥٨٩ ـ ٥٩٠) اس کی سند میں "عبدالرحمٰن بن بیلمانی" ضعیف راوی ہے۔ نیز اس کا سماع سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت نہیں ہے۔

يَكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا
فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا
عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۶﴾

اور تم اپنے وہ مال نادان لوگوں کے سپرد نہ کرو جو اللہ نے تمھارے لیے گزر بسر کا ذریعہ بنائے ہیں، البتہ ان میں سے انھیں کھانے اور پہننے کے لیے دو۔ اور ان سے اچھی بات کہو ⑤ اور تم یتیموں کی جانچ پرکھ کرو، یہاں تک کہ وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم انھیں سمجھ دار پاؤ تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو، اور تم ان کے مال حد سے بڑھ کر اور جلدی کرتے ہوئے اس خیال سے نہ کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (اور اپنا حق مانگیں گے)۔ اور جو (سرپرست) مال دار ہو، وہ (یتیم کا مال کھانے سے) بچے، اور جو غریب ہو وہ جائز طریقے سے (اس کا مال) کھا سکتا ہے، پھر جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرو تو ان پر کسی کو گواہ ٹھہرا لو، اور اللہ حساب لینے والا کافی ہے ⑥

بے عقلوں پر اُن کے مالوں میں تصرف کرنے پر پابندی:

یعنی لڑکا بے عقل ہو تو اس کا مال اس کے حوالے مت کرو، اس کا خرچ اس میں سے چلاؤ اور جب بالغ و عاقل ہو، تب مال حوالے کرو، لیکن بات معقول کہو، یعنی کہو کہ تسلی رکھو مال تیرا ہے ہمارا نہیں، ہم تیری خیر خواہی کرتے ہیں۔ پھر فرمایا: یتیم کا مال اپنے خرچ میں نہ لاؤ، مگر اس کو رکھنے والا محتاج ہو تو خدمت کے مطابق لے لے۔ جس وقت باپ مرے تو پنچایت کے روبرو یتیم کا مال امانت دار کو سونپ دیں، جب یتیم بالغ ہو جائے تو اس کے مطابق حوالے کرے، جو خرچ ہوا، وہ سمجھا دے اور اس وقت بھی شاہدوں کو دکھا دے۔ موضح القرآن میں اسی طرح ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع کیا ہے کہ بے عقل کو اموال کے خرچ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ مالوں کا تجارت میں خرچ کرنا ایک ذریعہ معاش ہے، اسی لیے یہ اخذ کیا ہے کہ بیوقوفوں کو مال خرچ کرنے سے روک دینا چاہیے۔ یہ روکنا کئی طرح سے ہوتا ہے، کبھی لڑکپن کی وجہ سے، کیوں کہ کم سن بچہ مسلوب العبارۃ ہوتا ہے، یعنی اس کو بات چیت کرنے کا صحیح سلیقہ نہیں ہوتا، کبھی جنون کی وجہ سے ہوتا ہے، کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ متعلقہ یتیم کو عقل اور دین کی کمی کی وجہ سے مال خرچ کرنا نہیں آتا اور کبھی غربت کی وجہ سے کہ ہر طرف سے قرض نے گھیر لیا ہے اور جو مال موجود ہے، وہ قرض ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، جب قرض خواہ مطالبے کے لیے اکٹھ کریں گے اور حاکم سے اس کا مال رکوانے کی درخواست کریں گے تو حاکم اس کو خرچ کرنے سے روک دے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ اَلسُّفَهَآءَ ﴾ سے مراد تیرے بیٹے اور تیری عورتیں ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام حکم بن عیینہ، حسن اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: یتامٰی ہیں۔ امام مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا: عورتیں ہیں۔[2] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں، سوائے ان کے جنھوں نے اپنے قیم (سربراہ) کا کہا مانا۔[3] (رواه ابن أبي حاتم و رواه ابن مردويه مطولاً)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''سفہاء'' خادم ہیں اور وہ شیاطین الانس ہوتے ہیں۔[4] فتح البیان میں ہے کہ یہ خطاب اولیا کو ہے کہ جو لوگ (عورت اور بچے) فضول خرچ ہیں ان کو اپنا مال نہ دو۔ یعنی مال کو سفیہ اور غیر بالغ کے حوالے کرنا جائز نہیں۔ اس جگہ ''سفہاء'' سے مراد یتامٰی ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول سب سے اچھا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ سفہاء سے مراد چھوٹی اولاد ہے کہ اگر مال ان کے ہاتھ میں دیا جائے گا تو برباد کر کے خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد عورتیں نہیں ہیں، اس لیے کہ عرب سفایہ یا سفیہات بولتے ہیں نہ کہ سفہاء۔[5]

مگر میں کہتا ہوں کہ سفہاء کا اطلاق تغلیباً عورتوں پر ہو سکتا ہے۔ جس طرح فرمایا ہے: ﴿ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴾ [التحريم: ١٢] ''اور وہ (مریم) فرماں برداروں میں سے تھی۔'' حاصل یہ ٹھہرا کہ جس کو نفع و نقصان کی تمیز نہیں اور نقصان کی وجوہات کا اندازہ نہیں ہے اور وہ کم سمجھ ہے، وہ خواہ عورتیں ہوں یا بچے یا مرد، مال ان کے سپرد نہ کرے۔ یہ مال معاش کو قائم کرنے والا ہے جس سے حالات کی اصلاح ہوتی ہے۔

کم عقلوں پر معروف کے مطابق خرچ کرنے کا حکم:

پھر فرمایا کہ ہاں اس مال سے ان کو کھلاؤ پلاؤ، یعنی جن کا روٹی کپڑا تم پر لازم ہے، جیسے بیٹے بیٹیوں اور اُن جیسے دوسرے۔ ان کو اس میں سے نان ونفقہ اور پہننے کے کپڑے وغیرہ دو، اور اگر مراد یتیموں کے اموال ہیں تو یہ مطلب ہوا کہ اس مال میں تم تجارت کرو، تاکہ نفع حاصل ہو، ان کو جوان ہونے تک روٹی کپڑے پر رکھو۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ بے عقلوں کو مال نہ دیا جائے۔ جمہور اسی کے قائل ہیں، مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بالغ عاقل پر حجر (تصرف کی پابندی) نہیں ہوتا۔ نیز یہ آیت قرابت کے لیے خرچ کرنے کے وجوب پر دلیل ہے، اس مسئلے میں اختلاف مشہور ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٧/ ٥٦٢۔ ٥٦٣) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٥٦٣)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٥٦٣) اس کی سند میں ''علی بن یزید'' اور ''عثمان بن ابی العاتکہ'' ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٩٦١)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦٣) تفسير ابن كثير (١/ ٥٩٠) [5] فتح القدير (١/ ٦٨٥) فتح البيان (٣/ ٢٣)

بے وقوفوں اور عورتوں کو مالی امور کا نگران بنانے کی ممانعت:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو جو مال دیا ہے اور اس کو تیری معیشت ٹھہرایا ہے تو وہ مال اپنے بیوی بچوں کے حوالے نہ کر، پھر تو ان کا دست نگر ہوگا، لیکن مال کو روک کر اصلاح کر اور خود تو اُن کو روٹی کپڑا دے اور ان کے لیے محنت کر۔[1] سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تین آدمی اللہ سے دعا کرتے ہیں، ان کی دعا قبول نہیں ہوتی، ایک وہ مرد جس کی بیوی بد اخلاق ہے اور وہ اس کو طلاق نہیں دیتا۔ دوسرا وہ شخص جس نے اپنا مال کسی بے وقوف کو دیا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوٰلَكُمُ ﴾ اور تیسرا وہ شخص جس کا قرض کسی پر آتا ہے اور اس نے گواہ نہ کرلیا۔[2]

قولِ معروف کا مفہوم:

اس جگہ قولِ معروف سے مراد نرم بات ہے، جس سے دل خوش ہو جائے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی نیکی اور صلہ رحمی میں اچھی بات کہے۔[3] کسی نے کہا: یوں دعا دے: "بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكُمْ وَحَاطَكُمْ وَصَنَعَ لَكُمْ"، کسی نے کہا کہ اچھا وعدہ کرے، یعنی یوں کہے کہ تیرا مال میرے پاس ہے، میں اس پر امین ہوں، جب تو بالغ و راشد ہوگا تو میں وہ مال تجھ کو دے دوں گا۔ باپ بیٹے سے کہے کہ میرا مال تجھی کو ملے گا، تُو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا مالک ہوگا یا اس کے مثل کوئی اور ایسی بات کہے، جس سے ان کے دل خوش وخرم ہو جائیں اور وہ اسبابِ رشد میں کشش وکوشش کریں۔ ظاہر آیت یہ ہے کہ جس پر یہ قولِ جمیل صادق آئے، اس میں وہ مراد ہے۔ اس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اہل و اولاد اور زیرِ کفالت یتامیٰ کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئے۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں بہتر وہ ہے، جو اپنے اہل کے ساتھ بہتر ہے اور میں تم میں سے اپنے اہل کے ساتھ بہتر ہوں۔"[4]

امام حضرمی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک شخص نے اپنا مال اپنی بیوی کو دے دیا تھا، اس نے اس مال کو بے جا خرچ کیا، اس پر یہ آیت اتری کہ تم اپنے مال سفہاء (بے عقلوں) کو نہ دو۔[5] امام ابن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: مراد یتامیٰ اور عورتیں ہیں۔[6] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: مراد مالِ یتیم ہے، جو تیرے پاس ہے، وہ مال تو اس کو نہ دے، ہاں اس پر خرچ کر، جب

---

[1] تفسیر الطبري (٧/ ٥٧٠) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦٤) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٧/ ٥٦٤) امام حاکم رحمہ اللہ نے اس روایت کو مرفوعاً بیان کیا ہے۔ (مستدرك الحاكم: ٢/ ٣٣١، السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ١٨٠٥)

[3] تفسیر الطبري (٧/ ٥٧٢۔ ٥٧٣)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٩٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣١٤)

[5] تفسیر الطبري (٧/ ٥٦٤)

[6] تفسیر الطبري (٧/ ٥٦٠)

تک کہ وہ بالغ ہو۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت عائلہ یعنی اہل وعیال کے ساتھ اور اس کے ساتھ احسان کرنے کو شامل ہے، جو اپنی کفالت میں ہے، وہ احسان عملاً روٹی کپڑا دے کر اور اچھا کلام اور حسنِ اخلاق کر کے کیا جائے۔[2]

یتیموں کو آزمانے اور سمجھدار ثابت ہونے پر اُن کا مال ان کو دینے کا حکم:

پھر فرمایا: تم یتیموں کو آزماؤ، یعنی دیکھو کہ ان کو مال خرچ کرنے کا سلیقہ حاصل ہوا یا نہیں، جب ان کے اخلاق کی شرافت اور مال کو خرچ کرنے کے سلسلے میں ان کی سمجھ داری معلوم ہو تو ان کی عمرِ نکاح کو پہنچ جانے پر ان کا وہ مال ان کے سپرد کر دو۔ کسی نے کہا کہ یہ آزمایش اس طرح سے ہوتی ہے کہ تھوڑا سا مال دے کر کہے کہ اسے خرچ کر۔ پھر دیکھے کہ اس نے کس طرح خرچ کیا ہے، اسی طرح تھوڑا سا مال دے کر کہ لڑکے یا لڑکی کو کہے کہ اس مال سے گھر کا خرچ چلاؤ، پھر دیکھے کہ انھوں نے گھر کا بندوبست کیسا کیا ہے، یہ اولیا کو خطاب ہے۔ امتحان لینا ولی پر واجب ہے۔

بلوغت کا معیار:

یہ آیت سیدنا ثابت ابن رفاعہ رضی اللہ عنہ اور ان کے چچا کے حق میں اتری ہے۔ بلوغِ نکاح سے مراد بلوغِ احتلام ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفٰلُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ ﴾ [النور: ٥٩] ''اور جب تم میں سے لڑکے (اور لڑکیاں) بلوغت کی حد کو پہنچ جائیں۔'' بلوغ کی نشانیوں سے ایک تو (زیرِ ناف) بالوں کا اُگنا ہے، دوسری پندرہ سال کا ہونا۔ امام مالک اور ابو حنیفہ رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے، جس کو احتلام نہیں ہوا، اس کو بلوغ کا حکم نہیں ہے، مگر سترہ برس کے بعد۔ یہ علامات لڑکے اور لڑکی دونوں کو شامل ہیں۔ لڑکی کی بلوغ کی خصوصیت حبل (پیدا کرنے کی صلاحیت) اور حیض ہیں۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ نکاح سے مراد حلم (بالغ ہونا) ہے۔[4] جمہور علما کا قول یہ ہے کہ لڑکے میں بلوغ کبھی احتلام سے ہوتا ہے کہ خواب میں کچھ ایسا دیکھے، جس سے وہ پانی نکلے، جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔

سنن ابی داود میں سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احتلام کے بعد یتیمی نہیں ہے اور نہ مکمل دن اور رات تک خاموشی کوئی خاموشی ہے۔[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ تین سے قلم اٹھا لیا گیا ہے: ایک بچہ یہاں تک کہ محتلم ہو اور سویا ہوا یہاں تک کہ جاگے اور دیوانہ یہاں تک کہ ہوش میں آئے۔[6] ایک تو علامتِ بلوغت یہ ہے۔ دوسری علامتِ بلوغت بعض کے نزدیک یہ ہے کہ بچہ پندرہ برس پورے کرے۔ یہ پندرہ سال سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے ماخوذ ہیں، جو صحیحین میں مروی ہے کہ میں

---

[1] الدر المنثور (٢/ ٤٣٣) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٩٠) [3] فتح القدير (١/ ٦٨٦)
[4] تفسير الطبري (٧/ ٥٧٤_ ٥٧٥) [5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٧٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٠٩)
[6] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٢/ ٤)

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اُحد کے دن حاضر ہوا اور میں چودہ سال کا تھا، آپ ﷺ نے مجھ کو اجازت نہ دی۔ پھر مجھے خندق کے دن پیش کیا گیا اور میں پندرہ سال کا تھا، اس وقت مجھ کو اجازت دے دی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو جب یہ حدیث پہنچی تو انھوں نے کہا: صغیر اور کبیر کے درمیان یہ فرق ہے۔[1]

تیسری علامتِ بلوغت زیرِ ناف بال ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس بات میں اختلاف ہے کہ شرم گاہ کے گرد اُگنے والے سخت بال بلوغت کی دلیل ہیں کہ نہیں؟ اس بارے میں تین قول ہیں۔ تیسرے قول میں مسلمانوں کے بچوں کے درمیان فرق کیا ہے کہ ان کے لیے یہ بال احتمالِ معالجہ کے سبب سے بلوغت کی دلیل نہیں۔ ہاں اہلِ ذمہ کے بچوں کے لیے وہ بلوغت کی دلیل ہیں، کیوں کہ اس کے سبب سے ان پر جزیہ لگانے کی جلدی نہیں کی جاتی، پس معالجہ نہ ہوا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ سب کے حق میں بلوغت کی علامت ہیں، کیوں کہ یہ اُگنا ایک فطری عمل ہے، سب لوگ اس میں برابر ہیں۔ معالجے کا احتمال بعید ہے۔ سنتِ صحیحہ اسی پر دلالت کرتی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ پر قریظہ کے دن پیش کیے گئے، آپ نے حکم دیا، دیکھو کس کے بال نکل آئے ہیں، جس کے بال تھے، وہ مارا گیا، جس کے نہیں تھے، وہ چھوڑ دیا گیا۔ میں ان میں تھا، جن کے بال نہیں اُگے تھے، مجھ کو بھی چھوڑ دیا گیا۔[2] (وقد أخرجه أهل السنن الأربعة بنحوه وقال الترمذي حسن صحيح) یہ اس لیے ہوا تھا کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بنو قریظہ کے حق میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ ان کے جواں مردوں کو قتل کیا جائے اور بچوں کو قید کیا جائے۔ ایک لڑکے نے اپنے شعر میں ایک لڑکی پر زنا کی تہمت لگائی تھی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دیکھو اس کے بال اُگے ہیں یا نہیں؟ دیکھا تو اُگے نہیں تھے، اس پر حد موقوف رکھی۔[3]

رُشد کی تفسیر اور بلوغت اور رُشد کی شرط:

پھر فرمایا کہ اگر تم ان میں ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کو دے دو۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ رشد سے مراد دین میں صلاحیت اور مال کی حفاظت کرنے کا احساس ہے۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ ائمہ سے بھی مروی ہے۔[4] فقہا نے بھی ایسے ہی کہا ہے کہ جب لڑکا بالغ ہوگیا، دین اور مال کی اصلاح کرنے والا ہوگیا تو اس کے مال کو روکنا نہیں چاہیے، ولی کے ہاتھ میں جو اس کا مال ہے، وہ اسے سونپ دینا چاہیے۔ فتح البیان میں اس طرح ہے کہ رشد سے مراد عقل و دین میں اصلاح ہے یا خاص عقل میں۔ امام شعبی رحمہ اللہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٦٨)

[2] مسند أحمد (٤/ ٣١٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٨٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٤١) مستدرك الحاكم (٣/ ٣٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ٥٨) تفسير ابن كثير (١/ ٥٩١)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦٥۔ ٨٦٦)

نے کہا کہ جب تک یتیم کا رُشد معلوم نہ کر لیا جائے، اس وقت تک اس کو مال نہیں دیں گے، اگر چہ وہ بوڑھا کیوں نہ ہو جائے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: گو سو برس کا ہو جائے۔

جمہور علما کہتے ہیں کہ رُشد بلوغت کے بعد ہی ہوتا ہے، پھر اگر بلوغت کے بعد بھی راشد نہ ہوا تو مالی تصرف پر پابندی اس سے زائل نہیں ہوگی۔ ہاں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ آزاد بالغ پر کچھ روک نہیں ہے، گو وہ سب لوگوں سے زیادہ فاسق اور سخت قسم کا فضول خرچ ہی کیوں نہ ہو۔ امام نخعی اور زفر رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے،[1] لیکن قرآنی نظم و ضبط بہ ظاہر اس طرح ہے کہ یتامیٰ کا مال انھیں صرف بلوغت کے بعد دیا جائے، یعنی جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں اور اس حد کے ساتھ بھی رُشد معلوم ہونے کی قید لگائی گئی ہے، پس ہر دو امر کا جمع ہونا لازمی ہے۔ یتامیٰ کو بلوغت سے پہلے ان کا مال سپرد نہیں کیا جائے گا، اگر چہ ان کا رشد ظاہر ہو۔ اسی طرح بلوغت کے بعد اس وقت تک ان کا مال نہیں دیا جائے گا، جب تک ان کا رشد معلوم نہ ہو۔ رشد سے مراد رُشد کی وہ قسم ہے، جو مال کو خرچ کرنے کا حسنِ نظم اور فضول خرچی سے بچنے کے متعلق ہے، تاکہ وہ اس مال کو فضول اور غلط جگہ پر خرچ نہ کرے یا رکھ نہ چھوڑے۔ اس لیے جب رُشد معلوم ہو تو پھر مال ان کے سپرد کرنے میں دیر نہ لگائے۔[2]

یتیموں کے مال میں بے جا تصرف سے ممانعت:

پھر اللہ تعالیٰ نے اولیا کو اس بات سے منع کیا کہ وہ یتامیٰ کا مال کسی ضروری حاجت کے بغیر کھا جائیں۔ لغت میں اسراف: بلاحق فضول خرچی اور حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ نضر بن شمیل رحمہ اللہ نے کہا کہ سرف تبذیر (بے جا خرچ کرنا) کے معنی میں آتا ہے۔[3] بِدَار کے معنی جلدی کرنا اور شتابی کرنا ہے، یعنی ان کے بالغ ہونے سے پہلے ان کے مال کو جلدی جلدی نہ اڑا دو، اس ڈر سے کہ کہیں وہ جوان ہو جائیں تو پھر وہ مال تمھارے ہاتھ نہیں لگے گا۔ غنی پر یتیم کا مال کھانا مردار اور خون کی مثل ہے، یہ امام شعبی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ آیت کہ "جو کوئی غنی ہو، وہ اس مال سے بچے" یتیم کے مال کے حق میں اتری ہے اور یہ آیت کہ فقیر دستور کے مطابق کھائے" یتیم کے ولی کے حق میں آئی ہے، جو اس کو رکھتا اور پالتا ہے، اگر محتاج ہو تو حاجت کے مطابق اس میں سے کھائے، ورنہ اس کے مال کو بڑھائے۔[4]

یتیم کے غریب نگران کے لیے تصرف کی حدود:

مقدارِ معروف کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، ایک جماعت نے کہا کہ مراد قرض ہے، یعنی ضرورت کے وقت ادھار لے اور جب میسر ہو تو ادا کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، عبیدہ سلمانی، ابن جبیر،

---

[1] تفسير القرطبي (٥/ ٣٧) [2] فتح البيان (٣/ ٢٧)
[3] تفسير القرطبي (٥/ ٤١) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦٨، ٨٦٩)

شعبی، مجاہد، ابو العالیہ، مقاتل، اوزاعی اور ابو وائل رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام نخعی، عطا، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ فقیر پر معروف کے مطابق جو کچھ کھایا گیا، اس کی قضا نہیں ہے، جمہور فقہا بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] قرآن کے ظاہری نظم سے بھی یہی بات زیادہ واضح ہے، کیوں کہ فقیر کے لیے کھانے کا جواز بغیر قرض کے مشروع ہے۔

معروف سے مراد وہ ہے، جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے۔ یتیموں کے مال سے عیاشی نہ کریں، کھانے پینے اور پہننے کے لیے فضول خرچی نہ کریں، بلکہ صرف فاقے کو دور کرنے اور معمولی پوشاک پر کفایت کریں۔ امام عطا اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ انگلیوں کے کناروں سے کھائے، یعنی اسراف نہ کرے، لباس کتان نہ پہنے اور نہ جبہ اوڑھے، صرف بھوک مٹائے اور ستر چھپائے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: جو کوئی دستور کے مطابق درخت سے کھجور کھائے، مویشی کا دودھ پیے تو اس پر کچھ قضا نہیں ہے۔

رہا سونا چاندی سو اس کو ہاتھ نہ لگائے، اگر اس میں سے کچھ لے لے گا تو اس کا لوٹانا واجب ہوگا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ معروف یہ ہے کہ جانور پر سواری کرے، خادم سے خدمت لے، لیکن مال میں سے کچھ نہ کھائے۔ اہلِ علم کی دوسری قوم نے کہا کہ مال میں سے انتظام اور کام کی اُجرت کے مطابق لے لے تو اس پر کچھ قضا نہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور اہلِ علم کی ایک جماعت کا یہی قول ہے،[2] مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت کو آیتِ کریمہ: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ [النساء: ۱۰] ''بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ جلد دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔'' نے منسوخ کر دیا۔[3]

اس آیت میں یتیموں کے اولیا کو خطاب ہے، جو یتیموں کے مفادات کا تحفظ کرنے والوں کے قائم مقام ہیں، جیسے: باپ، دادا اور اُن دونوں کے وصی (جانشین)۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس آیت سے یتیم مراد ہے، یعنی اگر وہ غنی ہے تو اس پر توسیع چاہیے، مال سے احتراز کرے اور اگر فقیر ہے تو اس پر خرچ حاصل مال کے مطابق ہے، لیکن یہ قول نہایت ساقط ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ فقیر زائد دودھ اور زائد خوراک سے لے اور تن ڈھانپنے سے آگے تجاوز نہ کرے۔ اگر اس کو فراخی میسر آجائے تو قضا لازم آئے گی اور اگر تنگ دست رہے تو کچھ نہیں ہے۔[4] سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں نے اللہ کے مال پر اپنے آپ کو یتیم کے ولی کے طور پر کر رکھا ہے اگر مستغنی ہوا تو عفاف کیا، (یعنی

---

[1] تفسير القرطبي (٥/ ٤١۔ ٤٢) [2] تفسير البغوي (٢/ ١٦٨۔ ١٦٩)

[3] الناسخ و المنسوخ للنحاس (١/ ٢٩٥۔ ٢٩٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[4] سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ٥) الدر المنثور (٢/ ٤٣٦)

کچھ نہ لیا) اور اگر محتاج ہوا تو دستور کے مطابق لیا، جب آسودگی ہوئی تو ادا کر دیا۔[1] (أخرجه البيهقي)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک شخص نے نبی مکرم ﷺ سے پوچھا: میرے پاس مال نہیں ہے اور یہ یتیم ہے؟ فرمایا: اپنے یتیم کے مال میں سے فضول خرچی کے بغیر اور بلاضرورت خرچ کرنے سے باز رہ، مال دار بننے کے لیے نہ لے اور اس طرح سے بھی نہ لے کہ اپنا مال بچا لے اور اس کا خرچ کر دے۔[2] (رواه أحمد و أبو داود و النسائي و ابن ماجه و ابن أبي حاتم) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فقہا نے کہا ہے کہ فقیر کے لیے جائز ہے کہ دو صورتوں میں سے جو کم ہو، وہ کھائے یا اُجرت کے مثل یا ضرورت کے مطابق، پھر جب آسودہ ہو تو واپس کر دے۔ بعض نے کہا ہے کہ واپس نہ کرے، کیوں کہ اس نے اپنی اُجرت کے بدلے کھایا ہے اور وہ فقیر تھا۔ اصحابِ شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہی صحیح ہے، کیوں کہ آیت میں کھانا بغیر لوٹانے کے جائز رکھا ہے۔[3]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ میں یتیم کو کس بات پر ماروں؟ فرمایا: جس بات پر تو اپنی اولاد کو مارتا ہے، تو اپنے مال کو اس کے مال سے نہ بچا اور اس کے مال سے مال دار نہ بن۔[4] (رواه ابن حبان) دوسرا قول یہ ہے کہ بدلہ دے، اس لیے کہ یتیم کا مال خطرے پر ہے جو حاجت کے وقت جائز ہوا ہے اس کا بدلہ دینا چاہیے جس طرح حاجت کے وقت لاچار کے لیے کسی غیر کا مال کھانا بھی جائز ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ معروف سے مراد قرض ہے،[5] سلف کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ نہ کھائے، مگر جب مضطر (مجبور) ہو، جیسے کہ مردار کی طرف مضطر ہوتا ہے، پھر اگر کھا لیا تو اس کی قضا دے۔[6]

یتیم کی سمجھداری محسوس کرنے کے بعد گواہوں کی موجودگی میں اس کا مال واپس کرنا:

پھر اللہ تعالیٰ نے اولیا کو یہ حکم دیا کہ جب یتیم بالغ ہو جائے اور اس کا رشد معلوم ہو تو اس کو اس کا مال گواہوں کی موجودگی میں دے، تاکہ مال لینے کے بعد اس کو انکار کی گنجایش نہ رہے۔ ظاہر قرآنی نظم مال واپس کرتے وقت گواہی کو مشروع کرتا ہے یہ قبلِ رشد کے خرچ کرنے اور سارا مال رشد کے بعد یتیم کو دینے پر شامل ہے اور یہ حکم ارشادی ہے نہ کہ واجب۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حساب لینے والا کافی ہے۔ اس میں یتامیٰ کے ولیوں کے لیے وعید ہے کہ اگر وہ

---

(1) سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ٤) الدر المنثور (٢/ ٤٣٦)

(2) مسند أحمد (٢/ ٢١٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٧٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧١٨) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٤٩٧)

(3) تفسير ابن كثير (١/ ٥٩١)

(4) صحيح ابن حبان (١٠/ ٥٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه معلىٰ بن مهدي وثقه ابن حبان وغيره وفيه ضعف و بقية رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٨/ ٢٩٨)

(5) تفسير الطبري (٧/ ٥٨٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٦٩) اس کی سند حسن ہے۔ (6) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٠)

مال پورا نہیں دیں گے، کچھ کمی کریں گے یا کھا گئے ہیں اور حساب نہیں دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ لے گا۔ اسی لیے صحیح مسلم میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں تجھ کو ضعیف دیکھتا ہوں اور تیرے لیے وہی بات چاہتا ہوں، جو اپنے لیے چاہتا ہوں تو دو آدمیوں پر بھی حاکم نہ ہو اور یتیم کے مال کا والی نہ ہو۔[1]

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰

مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے، اس مال میں جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، (یہ چھوڑا ہوا مال) تھوڑا ہو یا زیادہ، اس میں ہر ایک کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے (7) اور جب تقسیم کے وقت حاضر ہوں (دور کے) رشتہ دار، یتیم اور مسکین تو انھیں بھی اس میں سے کچھ دے دو، اور ان سے اچھی بات کہو (8) اور لوگوں کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ مرتے وقت اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑ جائیں تو انھیں ان کے بارے میں کتنی فکر ہوگی، چناں چہ انھیں اللہ سے ڈرنا چاہیے اور سیدھی بات کہنی چاہیے (9) بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ جلد دہکتی آگ میں داخل ہوں گے (10)

وارث بنانے اور تقسیم کے وقت غیر وارث حاضرین کو کچھ دینے کا حکم:

موضح القرآن میں ہے کہ کفر کی رسم میں عورت کو وارث شمار نہیں کیا جاتا تھا، اب عورت کو بھی وراثت کا حصہ دیا گیا۔ پھر فرمایا: جس وقت میراث تقسیم ہو اور برادری کے لوگ جمع ہوں تو جن کو حصہ نہیں پہنچتا اور وہ قرابت دار ہیں یا یتیم یا محتاج ہیں تو کچھ کھلا کر رخصت کرو اور بات معقول کہو، یعنی سخت جواب نہ دو اور اگر توقع زیادہ کریں تو عذر

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۲۶)

کرو۔ پھر کہا: پیٹھ کے پیچھے اس کی اولاد کے حق میں زیادتی نہ کرو، اپنے اوپر قیاس کرو کہ اگر ہماری اولاد پیچھے رہ جائے تو ہم کیا کریں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا کہ مشرک لوگ مال بڑے مردوں کو دیتے عورتوں اور بچوں کو وارث نہیں ٹھہراتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا: تم سب اللہ کے حکم میں اصل وراثت میں برابر ہو،[1] اگرچہ اللہ کے فرض کیے ہوئے حصے میت کی قرابت یا زوجیت یا ولاء کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کیوں کہ ولاء ایک لحمہ (تعلق) ہے، لحمۂ نسب کی طرح۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: اُم کجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ کے پاس آئی اور کہا: یا رسول اللہ! میری دو بیٹیاں ہیں، ان کا باپ مرگیا ہے، ان کے پاس کچھ بھی نہیں، اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری۔[2] (رواہ ابن مردویہ) میراث کی حدیث دونوں آیات کے حوالے سے بھی آئے گی۔ واللہ أعلم.

اس آیت کے محکم یا منسوخ ہونے کے متعلق اقوال:

میراث کی تقسیم کے وقت جن ذوی القربیٰ کا ذکر کیا ہے، یہ وہ رشتہ دار ہیں جو میت کے وارث نہیں ہیں، یا یتیم اور مسکین ہیں جن کو میت کے ترکے میں سے کچھ دینا چاہیے۔ ابتداے اسلام میں یہ چیز واجب تھی یا مستحب۔ پھر اختلاف ہوا کہ اب منسوخ ہے یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔[3] ان کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''هِيَ قَائِمَةٌ يُعْمَلُ بِهَا''[4] ''یہ محکم ہے اور اس پر عمل ہوتا ہے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہ اہلِ میراث پر واجب ہے، جس کے ساتھ ان کا جی خوش ہو۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا ابوموسی، سیدنا عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم، امام ابو العالیہ، شعبی، حسن، ابن سیرین، سعید بن جبیر، مکحول، ابراہیم نخعی، عطا بن ابی رباح، زہری، یحییٰ بن معمر رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے کہ یہ آیت واجب ہے۔[5] امام ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبیدہ رحمہ اللہ وصیت کے ولی ہوئے، پس ایک بکری ذبح کر کے اس آیت والوں کو کھلائی اور کہا کہ اگر یہ آیت شریف نہ ہوتی تو یہ بکری میرے مال میں سے تھی۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ عروہ رحمہ اللہ نے سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ کے مال میں سے تقسیم کے وقت کچھ دیا۔ امام زہری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حق واجب ہے، جس کے ساتھ جی خوش ہو۔ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ امر وصیت کے ساتھ ہے۔ ان کو عبداللہ بن عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸۷۲)
[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۹۳) اس کی سند میں ''ابراہیم بن ہراسہ'' ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۸/ ۸)
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۳۰۰)
[5] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸۷۵)

باپ کی میراث تقسیم کی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زندہ تھیں۔ گھر میں کسی مسکین اور قرابت والے کو نہ چھوڑا، مگر باپ کی میراث سے کچھ نہ کچھ ان کو دیا۔

پھر آیت زیرِ تفسیر: ﴿ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى ﴾ پڑھی، جب اس کا ذکر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہوا تو انھوں نے کہا: کچھ ٹھیک بات نہیں ہوئی، یہ اس کا کام نہیں تھا، یہ تو وصیت پر موقوف ہے۔ یہ آیت وصیت میں آئی ہے، یعنی میت کو چاہیے کہ ان کو اس بات کی وصیت کر جائے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے[2] اور اس سے بعد والی آیت اس کی ناسخ ہے۔[3] یہ حکم فرائض کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ پھر اللہ نے فرائض اتارے تو ہر حق والے کو اس کا حق دلوایا تو صدقے کو اس مال میں رکھا گیا، جو فوت ہونے والے نے متعین کر دیا تھا۔[4] (رواہ ابن مردویہ) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میراث کی آیت نے اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ ہر انسان کا حصہ والدین اور اقربین کے ترکے سے مقرر ہو گیا، وہ خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔[5]

سعید بن المسیب رحمہ اللہ بھی منسوخ ہونے کے قائل ہیں، کہتے ہیں کہ آدمی جو مال چھوڑ جاتا تھا، اس کی تقسیم کے وقت اس میں سے یتیم، فقیر، مسکین اور ذوی القربیٰ کو دیا جاتا تھا، یہ بات فرائض سے قبل تھی، پھر وراثت کے احکام نے اس کو منسوخ کر دیا، اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کا حق دے دیا۔ میت کے مال میں وصیت باقی رہی۔ اہلِ قرابت میں جس کو چاہے اس کے لیے وصیت کر جائے۔ امام عکرمہ ابی الشعثاء، قاسم بن محمد، ابو صالح، ابو مالک، زید بن اسلم، ضحاک، عطا خراسانی، مقاتل بن حیان اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔[6]

جمہور فقہا اور ائمہ اربعہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہاں ایک نہایت عجیب قول اختیار کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب میت کے مال کی وصیت کے مطابق تقسیم کے وقت میت کے ناتے والے حاضر ہوں تو ان کو اس میں سے کچھ دینا چاہیے اور یتامیٰ و مساکین سے معقول بات کہہ دے۔[7] ان کی طویل و مکرر عبارت کا یہ مفہوم ہے۔ مگر اس میں نظر ہے۔

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٥) ② تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٩٤) اس کی سند میں ''ابو صالح اور محمد کلبی'' ضعیف راوی ہیں۔

③ تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٩٤) اس کی سند میں ''اسماعیل بن ابراہیم مکی'' ضعیف راوی ہے۔

④ تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٣)

⑤ تفسیر ابن أبي حاتم (٨٧٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

⑥ تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٥۔ ٨٧٦) ⑦ تفسیر الطبري (٨/ ١٢۔ ١٣)

تقسیم کے وقت حاضرین کی دل جوئی کرنا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ قسمت سے مراد وراثت کی تقسیم ہے۔[1] یہی اکثر سلف کا قول ہے، اسی بنیاد پر اس آیت کے معنی ہیں نہ کہ ابن جریر رحمہ اللہ کے مسلک پر، بلکہ مطلب یوں ہے کہ جب قریبی رشتے دار، جو وارث نہیں ہیں، اور یتامیٰ اور مساکین بہت زیادہ وراثت کے مال کی تقسیم کے وقت حاضر ہوں اور ان کا جی اس مال میں سے کسی کی خواہش رکھتا ہو اور وہ دیکھیں کہ اس کو بھی اور اس کو بھی اس مال میں سے مل رہا ہے اور وہ خود نااُمید ہیں، ان کو اس شے میں سے کوئی چیز نہیں ملتی ہے تو اللہ پاک نے جو رؤف رحیم ہے، یہ حکم دیا کہ وسط مال میں سے کچھ بچا کھچا ان کو بھی دیے دیا کرو، کیوں کہ یہ ان کے ساتھ احسان کرنا اور ان پر صدقہ ہے اور ان کی شکستگی کا توڑ ہے، جس طرح فرمایا ہے: ﴿ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٤١] ''ان کا پھل کھاؤ جب وہ پھل لائیں اور ان کی کٹائی اور چنائی کے دن اس (اللہ) کا حق دے دیا کرو۔'' اور اُن لوگوں کی مذمت کی، جو چھپ کر مال اُٹھا لے جاتے ہیں، اس ڈر سے کہ کہیں محتاج اور فاقہ کش لوگوں کو پتا نہ چل جائے، جس طرح کہ باغ والوں کے بارے میں خبر دی ہے کہ انھوں نے اس بات پر قسم کھائی تھی کہ ''علی الصبح'' یعنی رات کو ہی اُٹھ کر باغ کا پھل کاٹ لائیں اور یہ کہا کہ کہیں آج کے دن تمھارے پاس کوئی مسکین نہ آ جائے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو برباد کر دیا: ﴿ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴾ [محمد: ١٠] ''اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزائیں ہیں۔'' سو جو کوئی اللہ کے حق کا انکار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ملک عزیز میں اس کو عقاب فرماتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں مروی ہے کہ جس مال میں صدقہ مل گیا، اس کو برباد کیا،[2] یعنی صدقہ نہ دینا، مال کے مٹ جانے کا سبب بنتا ہے۔[3]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ آیت: ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ ﴾ میں اللہ تعالیٰ نے فرض حصے کی مقدار کو مجمل رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے بیان میں اس کے خطاب کے وقت سے تاخیر کرنا جائز ہے۔ حنفیہ بھی اس کے قائل ہیں۔ فرض وہ ہے جس پر واجب سے زیادہ تاکید کی گئی ہو یا اس کا سونپنا یقینی ہو، کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہ ہو۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر وارث اپنے حصے سے اعراض کرے تو وہ حق اعراض کرنے سے ساقط نہیں ہوتا۔[4] (قاله البيضاوي)

پھر تقسیم کرنے والوں کو چاہیے کہ جب مال کی تقسیم کے وقت ناتے والے وغیرہ حاضر ہوں تو تقسیم سے پہلے ان

---

(1) تفسير الطبري (٨/ ١٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

(2) سنن البيهقي الكبرىٰ (٤/ ١٥٩) اس کی سند میں ''محمد بن عثمان'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٠٦٩)

(3) تفسير ابن كثير (١/ ٥٩٣۔ ٥٩٥) (4) تفسير البيضاوي (٢/ ١٥١)

کو کچھ بطورِ رضخ یعنی تھوڑا سا عطیہ دے دے۔ جس نے کہا کہ یہ آیت محکم ہے، اس کے نزدیک ندب (استحباب) کے لیے امر ہے۔ بعض نے کہا: منسوخ ہے۔ پہلا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے، کیوں کہ آیت میں جن کا ذکر قرابت کے لیے ہے، وہ غیر وارث ہیں، وارثین میں سے نہیں ہیں کہ میراث کی آیت ناسخ ٹھہرے۔ ہاں اگر ان ناتے والوں کو وارث ٹھہرایا جائے تو نسخ کے لیے ایک وجہ ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ یہ عطیہ غیر وارث قریبی رشتے دار کے لیے اتنی مقدار میں واجب ہے، جس پر تمام وارث خوش ہوں۔ اس کے حقیقتاً یہی معنی ہیں، قرینے کے بغیر ندب کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے،[1] مگر لوگوں نے اس پر عمل کرنے میں کاہلی وسستی کی۔[2]

﴿ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴾ میں یتامیٰ کے اولیا سے خطاب ہے، جب کہ ورثا چھوٹے ہوں، یعنی تینوں مذکورقسم کے لوگوں سے اچھی بات کہو، جس میں عطیہ پر احسان رکھنا یا ایذا دہی نہ ہو یا بالکل نہ دینے کا کوئی مناسب عذر کرلو۔ پھر اوصیا (جن کو وصیت کے ذریعے ولی مقرر کیا گیا) کو یہ خطاب کیا اور وعظ فرمایا کہ تم ان یتیموں سے، جو تمھاری پرورش میں ہیں، وہی برتاؤ کرو، جو تم اپنے بعد اپنی اولاد سے چاہتے ہو۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: یہ خطاب اس کو ہے جو بیمار کی عیادت کے لیے آتا ہے اور وصیت کے وقت حاضر ہوتا ہے، یا وارثوں کو حکم ہے کہ وراثت کی تقسیم کے وقت جو اقارب، یتامیٰ اور مساکین حاضر ہوں، ان کے ساتھ شفقت کریں کہ تم خیال کرلو اور تصور کرو کہ اگر وہ حاضر ہونے والے تمھاری اولاد ہوتے اور تمھارے بعد ان کی طرح ضعیف اور عاجز ہوکر رہ جاتے تو کیا تم ان کا محروم رہنا جائز رکھتے، یا یہ مومنین کو حکم ہے کہ وارثوں کا خیال کریں اور وصیت میں فضول خرچی نہ کریں۔[3] مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ایک گروہ نے کہا: ﴿ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ سے سارے لوگ مراد ہیں، سب کو حکم دیا ہے کہ یتیموں اور لوگوں کی اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں، اگرچہ وہ ان کی پرورش اور گود میں نہ ہوں۔

---

[1] الدر المنثور (٢/ ٤٤٠)

[2] یہی بات راجح ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ وہ قریبی رشتے دار اس دل جوئی کے مستحق ہیں، جو غربت اور بے کسی کے شکار ہوں، لیکن مورث نے ان کے لیے وصیت نہ کی ہو، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسی قسم کی صورتوں کے لیے ایک ثلث (تہائی) مال کی وصیت کا حق رکھا ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں اس حقِ وصیت سے مجرمانہ حد تک غفلت برتی جاتی ہے، جیسے یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ ہے۔ وہ بلاشبہ شرعی وارثوں میں سے تو نہیں ہے، لیکن دادا کے عدمِ وصیت کی وجہ سے ان کی سخت دل شکنی ہوتی ہے کہ چچا، تایا تو وراثت میں حصہ لے لیتے ہیں اور یہ یکسر محروم رہتے ہیں۔ یہ احساسِ محرومی ان کے لیے سخت جانکاہ ہوتا ہے۔ اگر ایک تہائی مال میں سے ان کو بھی دے دیا جائے تو یہ یتیم پوتوں کی محرومی کا بہترین حل اور آیت زیرِ تفسیر کا بھی مصداق ہے۔ اسی لیے مصر میں یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ دادا اگر وصیت نہ کرے، تب بھی اس کے مال میں تہائی حصہ پوتوں وغیرہ کو دیا جائے۔ ہمارے معاشرے کے لوگوں کو بھی چاہیے کہ مذکورہ صورت میں وہ یہ حقِ وصیت ضرور استعمال کریں۔ اسی کے عدمِ استعمال سے اسلام کی بدنامی ہوتی ہے اور ہو رہی ہے۔ [ص۔ ی]

[3] تفسير البيضاوي (٢/ ١٥٢)

دوسری جماعت نے کہا کہ وہ لوگ مراد ہیں، جو موت کے وقت میت کے پاس حاضر ہوتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا ہے۔ قولِ سدید سے یہ مراد ہے کہ وہ اللہ اور لوگوں کے حقوق کے بارے میں مخلص رہیں۔ اسی طرح عزیز و اقارب میں وصیت کرنے اور مال میں فضول خرچی نہ کرنے اور ورثہ کی حرمت کے بارے میں اخلاص کا برتاؤ رکھیں، جس طرح انھیں اپنے ورثاء پر اپنے بعد محتاجی کا خوف ہوتا ہے کہ کہیں وہ بھیک نہ مانگتے پھریں۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ ہیں جو اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرتے ہیں، ان کو اس بات کی یاد دلانا کہ وہ اپنی جان کے لیے کچھ وصیت کر جائیں، مستحب امر ہے۔ دوسرے وہ ہیں جن کے وارث ضعیف اور مفلس ہوتے ہیں، ان کو احتیاط اور مال جمع کر کے چھوڑنے کی طرف بلانا مستحب ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ تفصیل صحیح ہے۔[1]

وصیت میں عدل:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں ہے جو مرنے سے پہلے ایسی وصیت کر جاتے ہیں جو وارثوں کے لیے مضر ہوتی ہے۔ دوسرے نے سنا کہ وہ ایسی وصیت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس سننے والے کو حکم کیا کہ وہ اس کو سیدھا کرے، اس کو اللہ سے ڈرائے اور صحیح طرف لائے، اس کے وارثوں پر ویسی ہی نظر ڈالے، جیسی اپنے وارثوں پر ان کے حقوق کے ضائع ہونے کے خوف سے نظر ڈالنا درست سمجھتا ہے۔[2] یہی امام مجاہد رحمہ اللہ اور اکثر سلف کا قول ہے۔

وصیت کی مقدار:

صحیحین میں مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سعد بن ابی وقاص کے پاس آئے، اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں مال دار ہوں، ایک بیٹی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے، کیا میں اپنے مال کا دو تہائی صدقہ کر دوں؟ فرمایا: نہیں۔ کہا: آدھا؟ فرمایا: نہیں۔ کہا: ایک تہائی؟ فرمایا: ہاں، تہائی، یہ تہائی بہت ہے۔ پھر فرمایا: تو اگر اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ جائے گا تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج چھوڑ جائے، وہ لوگوں سے بھیک مانگیں۔[3] صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر لوگ تہائی سے آنکھ بند کر لیں اور چوتھائی کی طرف ہوں تو کیا اچھا ہو، اس لیے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «اَلثُّلُثُ، وَالثُّلُثُ كَثِيْرٌ»[4] "ایک تہائی، ایک تہائی بھی بہت ہے۔"

فقہا نے کہا ہے کہ اگر میت کے ورثا غنی ہوں تو میت کو مستحب ہے کہ پوری ایک تہائی کی وصیت کرے اور اگر فقرا ہوں تو مستحب ہے کہ تہائی سے کم کر دے۔ کسی نے کہا کہ اس جگہ "تقویٰ اللہ" سے مراد یتامیٰ کے مال کو

---

[1] تفسیر القرطبي (٥/ ٥٢) فتح البيان (٣/ ٣٠۔ ٣٣)

[2] تفسیر الطبري (٨/ ١٩) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٧) اس کی سند حسن ہے۔

[3] صحیح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٩)

بے دریغ خرچ کرنے سے اللہ سے ڈرنا ہے کہ اس کو کھانے اُڑانے سے ڈرو۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی قول ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول حسن ہے، اس کی تائید اس تہدید (ڈراوے) سے بھی ہوتی ہے، جو اس کے بعد مالِ یتیم کو بطورِ ظلم کھانے پر آئی ہے، یعنی جس طرح کا معاملہ تو اپنے بعد اپنی اولاد کے ساتھ چاہتا ہے، لوگوں کی اولاد کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کر، جب تو ان کا والی ہو۔[2]

یتیم کا مال کھانے والے کے لیے شدید وعید:

پھر یہ فرمایا کہ جو کوئی یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتا ہے، وہ آگ کھاتا ہے، قیامت کو وہ مال اس کے پیٹ میں آگ ہو جائے گا، سچ ہے جو آگ کھائے گا، وہ انگارے ہی نکالے گا۔ صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، کہا: وہ کیا ہیں؟ فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، حرام جان کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، لڑائی کے دن بھاگ جانا، پاک دامن غافل مومن عورتوں کو تہمت لگانا۔[3]

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے معراج کی رات کیا دیکھا؟ فرمایا: مجھ کو اللہ کی ایک بڑی مخلوق کے پاس لے جایا گیا، وہ بہت سے آدمی تھے، ہر آدمی کا ہونٹ اونٹ کے ہونٹ کی طرح تھا، اس پر بہت سے لوگ مقرر تھے، جو اس کا جبڑا اُکھاڑتے تھے، پھر ایک آگ کا پتھر اُٹھا کر اس کے منہ میں ڈالتے تھے، وہ پتھر اس کے نیچے سے باہر نکلتا، وہ آدمی چیختا چلاتا تھا، میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ کہا: یہ وہ لوگ ہیں، جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں، یہ تو آگ کھانے والے ہیں، اب آگ میں گھسیں گے۔[4] (رواه ابن أبي حاتم)

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یتیم کا مال کھانے والا قیامت کے دن اس طرح اُٹھے گا کہ اس کے منہ اور کان اور ناک اور آنکھوں سے آگ کا شعلہ نکلتا ہوگا، جو کوئی اس کو دیکھے گا، پہچان لے گا کہ یہ یتیم کا مال کھانے والا ہے۔[5]

سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ ایک قوم قیامت کے دن اپنی قبروں سے نکلے گی، ان کے منہ آگ سے بھڑکتے ہوں گے، کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کون لوگ ہیں، فرمایا: تو نے نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا﴾[6] (رواه ابن مردويه و ابن أبي حاتم) ابن مردویہ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: «أُحَرِّجُ مَالَ الضَّعِيفَيْنِ: اَلْمَرْأَةِ وَالْيَتِيمِ» یعنی میں تم کو ان دوضعیفوں کے مال سے بچنے کی وصیت کرتا ہوں: ایک عورت، دوسرا یتیم۔[7]

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٢٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٩٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٩) اس کی سند میں "ابو ہارون عبدی" سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم: ٥٤٥٩)

[5] تفسير الطبري (٨/ ٢٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٩)

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٧٩) اس کی سند میں "نافع بن حارث اور زیاد بن المنذر" سخت ضعیف راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٤٥٨)

[7] سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٧٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠١٥)

آگ کھانے کا مفہوم:

فتح البیان میں ہے کہ اکلِ نار (آگ کھانے) سے مراد وہ چیز ہے، جو آگ کا سبب ہوتی ہے، مسبب کو سبب سے تعبیر کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اب عن قریب قیامت کو آگ نگلیں گے، یہ مجازاً ہے۔ بعض نے کہا: ان کے پیٹ آگ کے برتن ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کے لیے آگ پیدا کرے گا، جس کو وہ اپنے پیٹ میں کھائیں گے۔ یہ حقیقت ہے، حقیقت کے ہوتے ہوئے مجاز کی کیا ضرورت ہے، اس جگہ فقط مال کو کھانے کا ذکر کیا ہے، حالاں کہ مال ضائع کرنے اور ایسے تمام اخراجات، جو مالِ یتیم کو تلف کرتے ہیں، اُن کے بارے میں یہی حکم ہے اس لیے کہ تمام قسم کے اخراجات کی تعبیر اکلِ مال کی ہی ہے، کیوں کہ مال کا بڑا مقصود یہی کھانا ہوتا ہے۔

﴿سَعِيْرًا﴾ بھڑکتی ہوئی چنگاری کو یا آتشِ افروختہ کو کہتے ہیں۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت مشرکوں کے لیے ہے، کیوں کہ وہ یتیموں کو وارث نہیں کرتے تھے، ان کا مال کھا جاتے تھے۔[1] میں کہتا ہوں: گویا بات دراصل ایسی ہی تھی، مگر لفظ کی عمومیت کو لینا چاہیے نہ کہ خصوصیتِ سبب کو، پس جو مسلمان کسی یتیم کا مال ناحق طریقے سے کھا جائے گا، اپنے تصرف میں لائے گا، اس کا حکم بھی یہی ہے کہ اس نے آگ کھائی، اب وہ جلد آگ میں بیٹھے گا۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ
فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ
وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا
تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ
اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ
مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ
لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۱

اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے، پھر اگر (دو یا) دو سے زیادہ عورتیں ہی ہوں تو ان کے لیے ترکے میں دو تہائی حصہ ہے، اور اگر ایک ہی (لڑکی) ہو تو اس کے لیے آدھا (حصہ) ہے، اور اس (مرنے والے) کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے ترکے میں

[1] تفسير الطبري (٨/ ٢٧) فتح البيان (٣/ ٣٣، ٣٤)

چھٹا حصہ ہے، اگر اس کی اولاد ہو۔ اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کا وارث ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے۔ اور اگر اس (مرنے والے) کے (ایک سے زیادہ) بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ (یہ تقسیم) اس کی وصیت پر عمل یا قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے، تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون نفع کے لحاظ سے تم سے زیادہ قریب ہے۔ (یہ تقسیم) اللہ کی طرف سے مقرر ہے، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے ⑪

میراث کی تقسیم اور حصے داروں کے حصوں کا ذکر:

موضح القرآن میں ہے کہ اس آیت میں اولاد اور ماں باپ کی میراث کی تقسیم کا ذکر ہے، اگر ملے ہوئے ہیں، یعنی مرد اور عورت تو مرد کا دُگنا حصہ ہے اور عورت کا ایک حصہ اور اگر فقط عورتیں ہیں تو ایک کو آدھا مال اور زیادہ ہوں تو دو تہائی مال برابر بانٹ لیں اور ماں کا حصہ اگر میت کی اولاد ہے یا ایک سے زیادہ بہن بھائی ہیں تو چھٹا حصہ اور اگر دونوں نہیں تو ایک تہائی اور باپ کا حصہ اگر میت کی اولاد ہے تو چھٹا حصہ اور اگر اولاد نہیں تو عصبہ ہوا اور میت کا مال اول اس کے کفن دفن میں لگایئے، جو کچھ بچے وہ اس کے قرض میں لگایئے، پھر جو کچھ بچے تو اس کی وصیت میں ایک تہائی تک لگایئے، اس کے بعد میراث کے حصے ہیں اور اُن حصوں میں عقل کا دخل نہیں، وہ حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں، وہ سب سے دانا تر ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ اور اس کے بعد والی آیت اور وہ آیت جو اس سورت کا خاتمہ ہے، آیات علمِ فرائض ہیں، علمِ فرائض انھی تین آیتوں اور اس بارے میں جو حدیثیں آئی ہیں، ان سے مستنبط ہے۔ وہ حدیثیں ان تینوں آیات کی تفسیر کے مثل ہیں، ہم ان حدیثوں کو اس جگہ ذکر کریں گے۔ رہی مسائل کے بارے میں تقریر اور ان کے اختلاف کا بیان اور اس بارے میں ائمہ کرام کی دلیلیں اور حجتیں تو ان کی جگہ کتبِ احکام ہیں۔

علمِ فرائض سیکھنے کی ترغیب:

علمِ فرائض سیکھنے کے لیے ترغیب آئی ہے اور اُن میں یہ فرائض بہت اہم ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ علم تین ہیں، ان کے علاوہ فضل ہے: آیتِ محکمہ، سنتِ قائمہ یا فریضہ عادلہ۔[1] (رواه أبو داود و ابن ماجة) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: تم فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، وہ آدھا علم ہے، جو بھلا دیا جاتا ہے اور پہلی چیز ہے، جو میری اُمت سے چھین لی جائے گی۔[2] (رواه ابن ماجه) اس کی اسناد میں ضعف ہے، اس جیسی حدیث

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٤) اس روایت کی سند میں "عبدالرحمٰن بن زیاد" اور "عبدالرحمٰن بن رافع" ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٣٨٧١)

② سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧١٩) اس روایت کی سند میں "حفص بن عمر" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم: ٢٤٥١)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ [1] اور سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، [2] لیکن ہر ایک میں نظر ہے۔ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا کہ فرائض کا نام آدھا علم اس لیے ہوا کہ عموماً سارے لوگ اس میں مبتلا ہیں۔ [3]

آیت کا سببِ نزول:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنی سلمہ میں پیدل جا کر میری عیادت کی، مجھ کو بے ہوش پایا، پانی منگوایا، وضو کیا، پھر مجھ پر چھڑکا، جب مجھے ہوش آیا، میں نے کہا: مجھے کیا حکم ہے کہ میں اپنے مال کا کیا کروں؟ اس پر یہ آیت اتری۔ [4] (وكذا رواه مسلم و النسائي و رواه الجماعة كلهم) امام احمد کے نزدیک سببِ نزول میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری حدیث اس طرح آئی ہے کہ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: اے اللہ کے رسول! یہ دونوں سعد کی بیٹیاں ہیں، ان کا باپ آپ کے ساتھ جنگِ اُحد میں شریک تھا اور شہید ہوا۔ اس کے چچا نے ان دونوں کا سارا مال لے لیا ہے، کچھ بھی نہیں چھوڑا، ان کا نکاح نہیں ہو سکتا جب تک ان کے پاس کچھ مال نہ ہو۔ فرمایا: اللہ اس بارے میں حکم دے گا۔ اس پر یہ آیتِ میراث اتری۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چچا کو بلا کر فرمایا کہ سعد کی بیٹیوں کو دو ثلث اور اُن کی ماں کو ایک ثمن (یعنی آٹھواں حصہ) دے دو اور جو بچے وہ تیرا ہے۔ (وقد رواه أبو داود و ابن ماجه) ترمذی نے کہا: "لَا يُعْرَفُ إِلَّا مِنْ حَدِيثِهٖ" [5]

ظاہر یہ ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی پہلی حدیث اس سورت کی آخری آیت کے سببِ نزول کے بارے میں آئی ہے۔ کیوں کہ اس وقت سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی بہنیں تھیں، بیٹیاں نہیں تھیں۔ میراث کلالہ کی تھی، لیکن ہم نے اس جگہ حدیثِ مذکور کو بخاری کے اتباع میں ذکر کیا ہے، کیوں کہ انھوں نے اس حدیث کو اس جگہ روایت کیا ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس آیت کے سببِ نزول کے زیادہ مشابہ ہے۔ [6] والله أعلم.

---

[1] سنن النسائي، الكبرىٰ (٤/ ٦٣) اس کی سند میں "سلیمان بن جابر" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ١٠٣)

[2] سنن الدارقطني (٤/ ٨٢) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی سند میں "عطیہ عوفی" ضعیف راوی ہے۔ (فتح الباري (١٢/ ٥) سنن الدارقطنی کے مطبوعہ نسخے میں مذکورہ روایت کی سند میں تصحیف ہے۔ "زکریا بن عطیہ عن ابی سعید" کے بجائے "زکریا عن عطیہ عن ابی سعید" صحیح ہے۔

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ٢٠٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٨٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٩٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٢٨)

[5] مسند أحمد (٣/ ٣٥٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٩٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٢٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٦/ ١٢١۔ ١٢٢)

[6] تفسير ابن كثير (١/ ٥٩٦۔ ٥٩٧)

اصل میراث میں مرد وعورت برابر ہیں:

یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو اولاد کے حق میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا دوہرا حصہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جاہلیت والے ساری میراث مردوں کو دیتے تھے، عورتوں کا کوئی حصہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے اصل میراث میں سب کو برابر رکھا، حصے کی کمی بیشی اور بات ہے۔ مرد کا دوہرا حصہ رکھا، اس لیے کہ مرد محتاج ہوتا ہے، محنت مزدوری کر کے روزی بہم پہنچانے والا، تجارت کے لیے تگ و دو کرنے والا، کمائی کرنے والا اور مشقت کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے یہ مناسب ہوا کہ مرد کو عورت کی نسبت دوگنا حصہ دیا جائے۔

اللہ ماں سے بھی زیادہ رحیم ہے:

بعض دانا بزرگوں نے آیت: ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ﴾ سے یہ استنباط کیا ہے کہ مخلوق پر اللہ کا رحم، اولاد پر والدہ کے رحم سے زیادہ ہے، کیوں کہ والدین کو اولاد کے حق میں وصیت کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اُن کے ساتھ والدین سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ جس طرح صحیح حدیث میں مروی ہے کہ ایک قیدی عورت سے اس کا بچہ علاحدہ کرلیا گیا تھا، وہ قیدیوں میں اپنے بچے کو تلاش کرتی پھرتی تھی، جب اس کو پایا تو اسے اپنے سینے سے لگایا، دودھ پلایا۔

نبی اکرم ﷺ نے اصحاب رضی اللہ عنہم سے فرمایا: تم اس کو دیکھتے ہو، کیا یہ اپنے بچے کو باوجود قدرت کے آگ میں ڈالے گی؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: «اَللّٰهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا»[1] "اللہ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ رحیم ہے جتنی یہ اپنے بچے کے لیے رحیم ہے۔" امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس جگہ روایت کیا ہے کہ مال اولاد کا ہوتا تھا اور وصیت والدین کے لیے تھی، اللہ تعالیٰ نے جتنا چاہا منسوخ کر دیا۔ مرد کے دو حصے رکھے۔ ماں باپ کا چھٹا اور تہائی حصہ، بیوی کا آٹھواں اور چوتھا حصہ، خاوند کا آدھا اور چوتھا حصہ۔[2]

اس حکم پر لوگوں کی ناگواری:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے فرائض اُتارے، مرد، عورت اور ماں باپ کا حصہ مقرر کیا تو سب یا بعض لوگوں کو ناپسند ہوا، کہنے لگے: عورت کو چوتھائی یا آٹھواں حصہ اور دختر کو نصف اور چھوٹے لڑکے کو حصہ ملتا ہے، حالاں کہ ان میں سے کوئی لڑتا نہیں ہے نہ غنیمت لاتا ہے، سوتم اس آیت پر چپ رہو، شاید رسول اللہ ﷺ اس بات کو بھول جائیں یا ہم کچھ کہیں، اس پر حکم بدل دیں۔ پھر نبی کریم ﷺ سے عرض کی کہ بیٹی کو باپ کے ترکے کا نصف دیا جاتا ہے۔ وہ نہ گھوڑے پر سوار ہو نہ قوم سے لڑے، بچے کو میراث ملتی ہے، وہ کسی کام

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٠٢)

میں نہیں آتا۔ جاہلیت میں وہ لوگ اسی طرح کرتے تھے کہ میراث مقاتل (لڑنے والے) کو دیتے اور اس کو جو اولاد میں سب سے بڑا ہوتا۔ اس پر آیت زیرِ تفسیر اتری۔[1] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير)

بیٹیوں کا انفرادی حالت میں حصہ:

پھر فرمایا: اگر دو سے زیادہ عورتیں وارث ہوں تو انھیں دو ثلث (دو تہائی) ملیں گے۔ کسی نے کہا: اس جگہ لفظ فوق زیادہ ہے، مراد دو عورتیں ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ قرآن پاک میں کوئی زیادہ چیز بے فائدہ نہیں ہے۔ اگر یہ لفظ زائد ہوتا تو "فَلَهُمَا" ہوتا نہ کہ "فَلَهُنَّ"۔ دو بیٹیوں کو دو ثلث دینا، اس سورت کی آخری آیت سے ماخوذ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کے لیے دو ثلث کا حکم دیا ہے۔ سو جب دو بہنیں دو ثلث کی وارث ہوئیں تو دو بیٹیوں کا دو ثلث کا وارث ہونا زیادہ صحیح ہوگا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اوپر گزر چکا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی دو بیٹیوں کو دو ثلث دینے کا حکم دیا تھا۔[2] لہٰذا اس بات پر قرآن و حدیث دلیل ہیں۔ نیز جب یہ کہا کہ اگر ایک ہو تو اس کے لیے آدھا ہے، پس اگر دو بیٹیوں کو نصف ملتا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے لیے حکم فرماتا، سو جب ایک کے لیے حکم دیا تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ دو بیٹیاں حکمِ ثلثاء (دو ثلث) میں ہیں۔ والله أعلم.

والدین کا حصہ۔ پہلی صورت:

والدین کا وراثت میں حصہ کئی طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ اولاد کے ساتھ شامل ہوں، اس حال میں ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر میت کی صرف ایک بیٹی ہے تو اس کو آدھا اور والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، پھر باپ باقی چھٹا حصہ عصبہ ہونے کے سبب سے لے گا۔ اس صورت میں اس کے لیے فرض اور تعصیب دونوں جمع ہوئے۔

دوسری صورت:

دوسری صورت یہ ہے کہ ماں باپ میراث کے ساتھ منفرد ہوں، ماں کو ایک تہائی ملے باقی باپ کو تعصیبِ محض کے سبب سے۔ اس صورت میں باپ کو ماں سے دوگنا ملے گا کہ وہ دو تہائی ہوئے، پھر اگر والدین کے ہمراہ زوج یا زوجہ ہے تو زوج (شوہر) نصف اور اگر زوجہ ہے تو وہ ایک چوتھائی لے گی۔

ماں کے حصے میں تین اقوال:

پھر علما نے اختلاف کیا ہے کہ اس کے بعد ماں کا کیا حصہ ٹھہرے گا اور وہ کیا لے گی، اس میں تین قول ہیں: ایک

---

[1] تفسیر الطبري (٨/ ٣٢) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٨٢) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

یہ کہ وہ باقی کا ایک تہائی لے گی، دونوں صورتوں میں یعنی زوج ہو یا زوجہ۔ اس لیے کہ وہ باقی گویا والدین کی نسبت سے جمیع میراث ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے ماں کے لیے بہ نسبت باپ کے آدھا حصہ رکھا ہے، لہٰذا ماں باقی کا ایک تہائی لے گی اور دو تہائی باپ کو ملے گا۔ یہ سیدنا عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح ترین روایت یہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ یہی فقہائے سبعہ وائمہ اربعہ و جمہور علما کا قول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ماں اس آیت کی عمومیت کے سبب سے سارے مال کا تہائی لے گی: ﴿ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ﴾ کیوں کہ یہ آیت عام تر ہے، اس سے کہ اس کے ساتھ زوج یا زوجہ ہو یا نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک روایت میں اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور شریح و داود ظاہری رحمہم اللہ اس کے قائل ہیں۔ امام ابو الحسین ابن اللبان بصری رحمہ اللہ نے کتاب "الإيجاز في علم الفرائض" میں اسی کو اختیار کیا ہے، مگر اس میں نظر ہے، بلکہ یہ قول ضعیف ہے۔ کیوں کہ ظاہر آیت اس صورت میں ہے کہ ماں باپ دونوں تمام ترکہ میں اکٹھے ہیں اور اس جگہ زوج یا زوجہ اپنا فرض لیں گے، جو باقی رہے گا، وہ گویا سارا ترکہ ہے، اس کا ایک تہائی ماں لے گی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مسئلہ زوجہ میں خاص طور پر ماں سارے مال کا ایک ثلث لے گی، کیوں کہ زوجہ چوتھائی حصہ پائے گی، کیوں کہ وہ چوتھائی بارہ میں سے تین ہوتا ہے اور ماں ایک تہائی لے گی اور وہ ثلثِ اربعہ ہے، پس باپ کے لیے اس میں سے پانچواں حصہ بچا رہا۔ رہا مسئلہ زوج کا تو وہ باقی ثلث لے گا، تاکہ زوجہ ماں باپ سے زیادہ نہ پائے، اگر ثلث مال لیتی، اس صورت میں یہ مسئلہ شش حصہ کا ہوا۔ زوج کو آدھا ملا جو تین حصے ہوتے ہیں، ماں کو باقی ثلث ملا جو ایک حصہ ہے، اس کے بعد جو بچا وہ باپ کو ملے گا، وہ دو حصے ہیں۔ یہ قول ابن سیرین رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے اور پہلے دو قول سے مرکب ہے اور یہ بھی ضعیف ہے۔ صحیح وہی پہلا قول ہے۔ واللہ أعلم.

تیسری صورت:

تیسری صورت میں ماں باپ کا میت کے بھائیوں کے ساتھ ملے جلے ہونا ہے، خواہ وہ ماں باپ سے ہوں یا باپ سے یا ماں سے کہ وہ باوجود باپ کے کسی چیز کے وارث نہیں ہوتے ہیں۔ ہاں اس صورت میں ماں کے حاجب ہوتے ہیں، یعنی اس کو ایک تہائی سے چھٹے حصے کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہوتے ماں کا چھٹا حصہ ہے۔ پھر اگر باپ کے علاوہ ماں کے سوا اور کوئی وارث نہ ہو تو باپ باقی لے گا اور دو بھائیوں کا حکم اس مذکورہ عورت میں جمہور کے نزدیک بھائیوں کے حکم کی طرح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: "اَلْأَخَوَانِ تُسَمّٰی إِخْوَةً"[1]

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بجائے زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۹۹)

''دو بھائیوں کو بھی اِخْوہ کہا جاتا ہے۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مسئلے کو ایک علاحدہ جزء میں لکھا ہے۔ امام ابو قتادہ رحمہ اللہ نے بھی یوں ہی کہا ہے۔[1]

پھر فرمایا: اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، یعنی ان بھائیوں نے اس کی ماں کو نقصان پہنچایا ہے، وہ وارث نہیں ہوں گے۔ ہاں ایک بھائی اس کی ماں کا ثلث میں حاجب نہ ہوگا، ایک سے زیادہ بھائی ہوں گے تو حاجب ہوں گے۔ اہلِ علم خیال کرتے تھے کہ بھائیوں کا ماں کے ثلث مال کے لیے حاجب ہونا اس لیے ہے کہ ان کے نکاح اور نفقہ کا والی باپ ہے نہ کہ ماں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ کلام حسن ہے، لیکن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے باسنادِ صحیح مروی ہے کہ ان کے نزدیک وہ سُدُس (چھٹا حصہ)، جس کے ماں سے حاجب ہوئے ہیں، انھی کو ملے گا، مگر یہ قول شاذ ہے۔ (رواه ابن جرير بلفظ: الذي حجبته الأخوة لأم لهم إنما حجبوا أمهم عنه ليكون لهم دون أبيهم) پھر ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول جمیع اُمت کے مخالف ہے۔[2]

قرض وصیت پر مقدم ہے:

یہ جو فرمایا کہ مرنے والا جو وصیت کر گیا یا قرض چھوڑ گیا، اس کی تفسیر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس طرح لکھی ہے کہ علمائے سلف و خلف نے اجماع کیا ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہے۔ گہری نظر ڈالنے سے یہ بات آیتِ کریمہ کے مضمون میں ثابت ہوئی ہے۔ سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا: تم یوں پڑھتے ہو: ﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض ادا کرنے کا حکم وصیت سے پہلے سے فرمایا ہے اور اعیان بنی الام وارث ہوتے ہیں نہ کہ بنی العلّات۔ آدمی اپنے بھائی کا وارث ہوتا ہے، جو ایک ماں باپ سے ہے نہ کہ اس بھائی کا جو صرف باپ کی طرف سے ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم اس حدیث کو نہیں پہچانتے، مگر حارث سے مروی حدیث میں بعض اہلِ علم نے کلام کیا ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: لیکن وہ فرائض کے علم کا حافظ اور حساب کتاب کا متھم تھا۔[4] واللہ أعلم.

میراث کا حصہ مقرر ہے:

زیرِ تفسیر آیت کے آخری حصے کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے آبا اور ابنا کا حصہ مقرر کیا ہے، اصل میراث میں سب کو برابر رکھا ہے، دستورِ جاہلیت اور ابتدائے اسلام کی کارروائی کے برخلاف کہ مال بیٹے کو ملتا تھا اور وصیت ماں باپ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٨٣) [2] تفسير الطبري (٨/ ٤٥) تفسير ابن كثير (١/ ٥٩٨۔ ٥٩٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧١٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٦/ ١٠٧)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٥٩٩)

کے لیے ہوتی تھی۔ اب دونوں کے لیے ان کے حال کے مطابق حصہ مقرر کیا گیا ہے، کیوں کہ آدمی کو کبھی دنیوی اور اُخروی یا دونوں فوائد اپنے باپ سے حاصل ہوتے ہیں نہ بیٹے سے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھارے باپ اور بیٹے تم کو معلوم نہیں کہ نفع کے لحاظ سے کون تمھارے قریب تر ہے، یعنی جس طرح نفع کی توقع ایک سے ہے، ویسی ہی دوسرے سے بھی ہے، اسی لیے دونوں کا حصہ مقرر کیا اور اصل میراث میں دونوں قسم کو برابر کیا ہے اور میراث کی یہ تفصیل جو ہم نے ذکر کی اور بعض کو دوسرے بعض سے زیادہ دلوایا ہے، یہ اللہ کا فرض، حکم اور فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے ہر چیز کو اس کی جگہ میں رکھتا ہے، علیم ہے ہر کسی کو وہی دیتا ہے، جس کا وہ مستحق ہے۔ اسی لیے یہ کہا ہے کہ اللہ خبردار حکمت والا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جو آیت: ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ ... الخ﴾ میں اجمالاً تھا، وہ اس آیت: ﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ ... الخ﴾ میں تفصیلاً ہے۔ یہ آیت "بِطُولِهَا" ارکانِ دین میں سے ایک رکن ہے۔ احکام کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے، اُمہاتِ آیات سے ایک اُم ہے، اصولِ اسلام سے ایک اصل ہے، کیوں کہ یہ اہم علم فرائض پر مشتمل ہے۔ یہ علم اجلِ علوم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تھا، ان میں اکثر مناظرات اسی علم میں رہا کرتے تھے۔ اس علم کی فضیلت میں بہت سی احادیث آئی ہے۔ اس آیت میں اولاد کے ذکر سے شروع کیا ہے۔ کیوں کہ اولاد میت کے وارثوں میں سے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ وصیتِ اولاد سے مراد ان کے بارے میں وصیت کرنا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: اولاد کی اولاد مجازاً نہ حقیقتاً اولاد میں داخل ہے۔ حنفیہ نے کہا: لفظ اولاد حقیقتاً اولاد کی اولاد کو شامل ہے، جبکہ اولاد صلبی نہ ہو۔ اس میں اختلاف نہیں کہ اولاد کی اولاد میراث میں بنین (بیٹوں) کی طرح ہیں، جبکہ بنین موجود نہ ہوں۔ اختلاف اس میں ہے کہ لفظِ اولاد، اولاد کی اولاد پر دلیل ہے یا نہیں، پھر اولاد میں کافر اولاد بھی شامل ہے، مگر سنت نے اس کو میراث سے باہر نکال دیا۔ اسی طرح قاتلِ عمد بھی داخل ہے، مگر سنت و اجماع نے اس کو خارج کر دیا۔

مخنث کی وراثت:

اسی طرح خُنثیٰ (مخنث) بھی داخل ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ خنثیٰ وارث ہوتا ہے، پیشاب کرنے والی جگہ کے اعتبار سے۔ اگر دونوں جگہ سے پیشاب کرتا ہے تو جونسا بَول (پیشاب) سابق ہے (پہلا ہے) وہی معتبر ہے اور اگر سابق کے بغیر دونوں راہ سے یکساں پیشاب کرتا ہے تو نصف حصہ ذکر کا اور نصف حصہ انثیٰ کا پائے گا اور کسی نے کہا کہ ہر دو حصے میں سے کم تر پائے گا، یعنی انثیٰ کا حصہ۔ یہ یحییٰ بن آدم رحمہ اللہ کا

قول ہے۔ یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[1] آیت زیرِ تفسیر اس بات کی ناسخ ہے، جو ابتدائے اسلام میں تھی کہ وراثت معاہدے و ہجرت و نکاح کے مطابق ہوتی تھی۔ علما نے اس امر پر اجماع کیا ہے کہ جب اولاد کے ساتھ ایسا شخص ہوگا، جس کے لیے ایک فرض مسمیٰ (متعین) ہے تو پہلے اس کا فرض دیں، پھر جو مال بچے گا، اس میں سے مرد کا دوہرا حصہ ہے، اس کی دلیل حدیثِ صحیحین ہے۔

بلفظ «أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا أَبْقَتِ الْفَرَائِضُ فَلِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ»[2] "پہلے اصحابِ فرائض کو ان کا حصہ دو، پھر جو بچے تو وہ قریب ترین مذکر (عصبہ) کو دو۔" مگر جبکہ کوئی ساقط ان کے ہمراہ ہو، جیسے کئی بھائی ایک ماں سے، پھر مرد کے لیے دوہرا حصہ اس وقت ہے کہ عورتیں بھی ہوں اور اگر صرف مرد ہیں تو ساری میراث انھی کی ہے۔ ایک انثیٰ (عورت) کو نصف، دو یا زیادہ انثیٰ ہوں تو دو ثلث ملیں گے۔ مرد کی تخصیص سے اس کی عورت پر فضیلت ثابت ہوئی، اگرچہ جہت میں دونوں مشترک ہیں۔

تعصیب کا فائدہ یہ ہے کہ عاصب جب اکیلا ہوگا تو سارا مال لے گا۔ قرآن کا ظاہری نظم یہ ہے کہ تین یا زیادہ بیٹیوں کا حصہ دو ثلث ہے اور دو بیٹیوں کا فرض بیان نہیں کیا، اس لیے اہلِ علم نے ان کے حصے میں اختلاف کیا ہے۔ جمہور نے کہا: جب صرف دو بیٹیاں ہوں بیٹے نہ ہوں تو ان کا حصہ دو ثلث ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بلکہ نصف ہے۔[3] جمہور نے دوسری آیت میں لفظِ "أُخْتَيْنِ" "دو بہنیں" پر قیاس کیا ہے۔ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے بارے میں حدیث جمہور کی حجت ہے[4] اور اگر ایک ہی بیٹی ہے تو اس کا حصہ نصف ہے اور ماں باپ کا حصہ سدس ہے۔

دادا کی وراثت:

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دادا کو بہ منزلہ باپ کے رکھا ہے۔ کسی صحابی نے ان کے ایامِ خلافت میں ان سے اختلاف نہیں کیا، وفات کے بعد اختلاف کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، ابن زبیر، سیدہ عائشہ، سیدنا معاذ بن جبل، ابی بن کعب، ابو الدرداء، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم، امام عطا، طاؤس، حسن، قتادہ، ابوحنیفہ، ابو ثور، ابو اسحاق رحمہم اللہ کا قول سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول کے موافق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی دلیل سے ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ﴾ [الحج: ٧٨] "اپنے باپ ابراہیم کے دین کی (اتباع کرو)۔" وقولہ: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ [الأعراف: ٢٧] وقولہ ﷺ: «اِرْمُوْا يَا بَنِيْ إِسْمَاعِيْلَ»[5] "تیر پھینکو اے بنی اسماعیل!"

سیدنا علی مرتضی، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کا مذہب دادا کی وراثت کا ہے، بھائیوں کے ساتھ جو

---

[1] تفسير القرطبي (٥/ ٦٥۔ ٦٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٥)
[3] تفسير القرطبي (٥/ ٦٣) [4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٤٣)

ایک ماں باپ سے یا صرف باپ سے ہوں۔ اس کا حصہ بھائیوں کے ساتھ ثلث سے کم نہیں ہوتا اور نہ ذوی الفروض کے ہمراہ سُدُس (چھٹا حصہ) سے کم ہوتا ہے۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ، امام مالک، اوزاعی، ابو یوسف، محمد اور شافعی رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا کہ دادا اور بھائیوں کے درمیان سدس تک مشترک ہے، سدس سے کچھ بھی کم ذوی الفروض وغیرہم کے ہمراہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کا قول ہے، اسی طرف ایک گروہ گیا ہے۔ جمہور نے کہا کہ دادا بھائی کے بیٹوں کو ساقط کرتا ہے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تقسیم میں برادر زادوں کو برادر کی طرح رکھا ہے۔[1]

دادی کا حصہ:

علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ دادی کا حصہ سدس ہے، جبکہ میت کی ماں نہ ہوگی، اگر ماں ہوگی تو ساقط ہوجائے گا۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ باپ ماں کی ماں کو ساقط نہیں کرتا جدہ کی وراثت میں، جبکہ اس کا بیٹا زندہ ہو اس میں اختلاف ہے۔ سیدنا زید بن ثابت، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: وارث نہ ہوگی۔ امام مالک، ثوری، اوزاعی، ابوثور رحمہم اللہ اور اصحاب الرائے کا بھی یہی قول ہے۔ سیدنا عمر، عبداللہ بن مسعود اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ باوجود بیٹا ہونے کے وارث ہوگی۔ امام شریح، جابر بن زید، شریک، احمد، اسحاق اور ابن منذر رحمہم اللہ وغیرہم کا مذہب بھی یہی ہے۔[2]

﴿اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ ولد کا اطلاق ذکر اور انثیٰ دونوں پر ہوتا ہے، لیکن جب اولاد کے ساتھ اکیلا ذکر موجود ہو یا ان میں سے مونث کے ساتھ ہو تو جد کو ثلث ہی ملے گا اور اگر موجود مونث ہے تو جد کو سدس ملے گا، ازروئے فرض کے اور ماعدائے سدس میں وہ عصبہ ہوگا۔ فوت شدہ بیٹے کی اولاد کا حکم میت کی اولاد کے مثل ہوگا۔

ماں کو تیسرا حصہ ملنے کی صورت:

جمہور کے نزدیک ماں کو ترکہ کا ثلث صرف اسی وقت ملے گا، جب میت کا سوائے ابوین (ماں باپ) کے کوئی وارث نہ ہو۔ اگر ابوین کے ہوتے ہوئے احد الزوجین ہوں گے تو ماں کو صرف ثلث ملے گا۔ زوجین میں سے جو موجود ہیں، ان کے بعد ماں کا ترکے میں سے چھٹا حصہ ہے، اگر اس کے ہمراہ باپ بھی موجود ہے۔ اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ سدس کی طرف ماں کے حاجب دو بھائی ہوں تو وہ تین یا زیادہ بھائیوں کے قائم مقام ہیں۔ اس بات پر بھی اجماع ہے کہ حجبِ اُم میں دو یا زیادہ بہنیں دو بھائیوں کے مثل ہیں۔

قرض کی ادائی اور وصیت کا نفاذ مقدم ہے:

یہ حصے قرض کو ادا کرنے اور مال کے ایک تہائی میں وصیت کے نفاذ کے بعد تقسیم ہوتے ہیں، جو ان دونوں امور کے میراث سے پہلے ذکر کرنے کا مقصد ہے۔ اسی لیے وصیت کو قرض پر مقدم کیا ہے، آیت میں دی گئی ترتیب

[1] تفسير القرطبي (٥/ ٦٨)
[2] تفسير القرطبي (٥/ ٧٠)

کے برعکس۔ ورنہ قرض وصیت پر مقدم ہے، اس کے سوا اس کی اور وجوہات بھی ذکر کی ہیں۔ یہ وصیت آیتِ کریمہ کے الفاظ: ﴿غَيْرَ مُضَآرٍّ﴾ کے ساتھ مشروط ہے۔ پھر کہا: تم نہیں جانتے کہ آبا اور ابنا میں تمھارے لیے کون زیادہ قریب ہے، دعا وصدقہ کے نفع سے، جس طرح حدیث میں مروی ہے: «أَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْ لَهُ»[1] ''یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: کبھی بیٹا افضل ہوتا ہے، باپ کی شفاعت کرتا ہے۔[2] بعض مفسرین نے کہا ہے: اگر بیٹے کا درجہ آخرت میں بلند ہوتا ہے تو وہ اللہ سے سوال کرتا ہے کہ اس کے باپ کو اس سے ملا دے اور اگر باپ کا درجہ زیادہ بلند ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے بیٹے کو ملنا چاہتا ہے۔ بعض نے کہا کہ مراد دنیا اور آخرت کا نفع ہے۔[3]

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهٗٓ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوْٓا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝١٢

اور تمھاری بیویوں کے ترکے میں تمھارا آدھا حصہ ہے، اگر ان کی اولاد نہ ہو، پھر اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے ترکے میں تمھارا چوتھا حصہ ہے۔ (یہ تقسیم) ان کی وصیت پر عمل یا قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی اور اگر تمھاری اولاد نہ ہو تو تمھارے ترکے میں تمھاری بیویوں کا چوتھا حصہ ہے، پھر اگر تمھاری اولاد ہو تو تمھارے ترکے میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔ (یہ تقسیم) تمھاری وصیت پر عمل یا قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی اور اگر

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣١) [2] تفسير القرطبي (٥/ ٧٥) [3] فتح البيان (٣/ ٣٥۔ ٤١)

وہ آدمی جس کا ورثہ تقسیم کیا جا رہا ہو، اس کا بیٹا ہو نہ باپ، یا ایسی ہی عورت ہو۔ اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ پھر اگر ان کی تعداد اس سے زیادہ ہو تو وہ سب ایک تہائی حصے میں شریک ہوں گے۔ (یہ تقسیم) اس کی وصیت پر عمل یا قرض ادا کرنے کے بعد (ہوگی) جبکہ وہ کسی کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو۔ یہ اللہ کی طرف سے تاکید ہے، اور اللہ خوب جاننے والا، بڑے حوصلے والا ہے⑫

میاں بیوی اور بہن بھائی کی وراثت:

موضح القرآن میں ہے کہ یہاں تک مرد عورت کی میراث بیان فرمائی۔ عورت کے مال میں مرد کا آدھا حصہ ہے، اگر عورت کی اولاد نہیں اور اگر اس مرد سے یا اور سے اولاد ہے تو مرد کو چوتھائی، اور اسی طرح مرد کے مال میں عورت کو چوتھائی، اگر مرد کی اولاد نہیں ہے اور اگر اولاد ہے تو عورت کا آٹھواں حصہ ہر قسم کے مال میں وہ نقد یا جنس، سلاح یا زیور یا حویلی یا باغ ہو۔ باقی عورت کا مہر میراث سے الگ ہے، قرض میں داخل ہے۔ پھر بھائی بہن کی میراث بیان فرمائی۔ لہٰذا باپ اور بیٹے کے ساتھ بھائی بہن کو کچھ نہیں ملتا، جب باپ بیٹا نہ ہو تب بھائی بہن کو ملتا ہے۔ بھائی بہن تین طرح کے ہیں: سگے، جو ماں باپ میں شریک ہوں، سوتیلے جو باپ میں شریک ہوں یا اخیافی جو ماں میں شریک ہیں۔

یہ میراث جو یہاں بیان ہوئی تیسری قسم کے بہن بھائیوں کی ہے، ایک کو چھٹا حصہ اور زیادہ کو تہائی۔ ان میں مرد عورت کو برابر ملتا ہے، پہلی دو قسم کے بھائی بہن مثل اولاد کے ہیں، جب باپ اور بیٹا نہ ہو تو پہلے سگے، وہ نہ ہوں تو سوتیلے۔ اس سورت کے آخر میں ان کی میراث کا بیان ہے، اور یہ فرمایا کہ وصیت پہلے ہے جب اوروں کا نقصان نہ کیا ہو۔ نقصان کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ مال کی تہائی سے زیادہ وصیت کر کے مرا، کیوں کہ وصیت تہائی تک جاری ہے زیادہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ جس کو میراث کا حصہ ملے گا، اس کو اپنی طرف سے رعایت کر کے کچھ اور دلوا کر مرا، یہ معتبر نہیں۔ اگر سب وارث راضی ہوں تو یہ دونوں وصیتیں قبول رکھیں، نہیں تو نہ رکھیں۔

یہ پانچ قسم کی میراث ہے جو بیان کی گئی ہے، یہ حصہ داروں کی ہے اور ان کے سوا اور قسم کے وارث ہیں جن کو عصبہ کہتے ہیں، ان کا حصہ نہیں، اگر حصہ دار نہ ہو تو سب مال عصبہ لے لے اور دونوں ہوں تو حصہ داروں سے جو بچے وہ عصبہ لے لے اگر کچھ نہ بچے تو کچھ نہ لے۔ عصبہ اصل تو وہ ہے جو مرد ہو عورت نہ ہو اور عورت کا واسطہ نہ رکھے۔ اس کے چار درجے ہیں: اول درجے میں بیٹا اور پوتا ہے، دوسرے درجے میں باپ اور دادا، تیسرے درجے میں بھائی اور بھتیجا اور چوتھے درجے میں چچا اور چچا کا بیٹا یا پوتا۔ ایک درجے میں اگر کئی شخص ہوں تو جو میت سے

قریب ہو، وہ مقدم ہے، جیسے پوتے سے بیٹا، بھتیجے سے بھائی مقدم ہے، پھر سوتیلے سے سگا مقدم ہے۔ باقی اولاد اور بھائیوں میں مرد کے ساتھ عورت بھی عصبہ ہے اوروں میں نہیں۔

اگر دونوں قسم کے وارث نہ ہوں تو تیسری قسم ذوالرحم ہے، یعنی ایسی قرابت والے جس میں عورت کا واسطہ ہے اور حصہ دار نہیں، یعنی نواسا اور نانا، بھانجا اور ماموں، خالہ اور پھوپھی اور ان کی اولاد، ان کا حساب بھی عصبہ جیسا ہے۔ موضح القرآن کا کلام تمام ہوا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے آیت زیرِ تفسیر کے بارے میں اس طرح تقریر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مردو! تمھارے لیے اس چیز کا نصف ہے، جو تمھاری بیویاں اولاد کے بغیر چھوڑ کر مری ہیں، اگر اولاد ہے تو تم کو ترکے کا چوتھا حصہ وصیت یا قرض ادا کرنے کے بعد ملے گا۔ اوپر گزر چکا کہ قرض وصیت پر مقدم ہے، پھر وصیت ہے، پھر میراث ہے۔ علما کے درمیان اس امر پر اجماع ہے اور بیٹوں کی اولاد کا حکم، اگرچہ اسفل ہوں، صلبی اولاد کا حکم ہے، یعنی پوتا پوتی بیٹا بیٹی کے مثل ہیں۔[1] پھر کہا کہ بیویوں کو تمھارے ترکے سے چوتھائی ہے تا آخر۔ اس چوتھائی یا آٹھویں حصے میں ایک اور دو یا تین یا چار بیویاں سب برابر شریک ہیں۔

کلالہ کی تفسیر:

کلالہ اکلیل سے مشتق ہے۔ اکلیل وہ چیز ہے، جو ہر جانب سے سر کو چھپالے، سر کو گھیرنے والی ہو۔ اس جگہ کلالہ سے مراد حواشی ہیں نہ کہ اصول اور فروع، جو وارث ہوتے ہیں۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ کلالہ کیا ہے؟ کہا: میں تو اپنی رائے سے کہتا ہوں، اگر ٹھیک ہوا تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر چوک گیا تو شیطان کی طرف سے ہے، اللہ اور رسول دونوں اس سے بَری ہیں۔ کلالہ وہ ہے کہ نہ اس کے اولاد ہو نہ والد۔ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ والی ہوئے، کہا: میں شرماتا ہوں کہ میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس رائے میں مخالفت کروں، جو انھیں نظر آئی۔[2] (رواہ ابن جریر وغیرہ)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میں عہدِ عمر رضی اللہ عنہ کا آخری فرد ہوں، میں نے ان کو سنا، وہ کہتے تھے: بات وہی ہے، جو میں نے کہی، یعنی ”اَلْكَلَالَةُ مَنْ لَّا وَلَدَ لَهٗ وَلَا وَالِدَ“[3] یہی سیدنا علی، عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا قول بھی ہے۔ امام شعبی، نخعی، حسن، قتادہ، جابر بن زید، حکم رحمہ اللہ، اہلِ مدینہ، اہلِ کوفہ اور اہلِ بصرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ فقہائے سبعہ و ائمہ اربعہ و جمہور سلف و خلف، بلکہ جمیع جمہور کا بھی یہی قول ہے، کئی ایک اہلِ علم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٠٠)

[2] تفسیر الطبري (٨/ ٥٣۔ ٥٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٨٧) اس کی سند صحیح ہے۔

اس کے خلاف بھی مروی ہے، یعنی کلالہ وہ ہے، جس کی اولاد نہ ہو، مگر صحیح وہی پہلا قول ہے۔ شاید راوی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد کو نہیں سمجھا۔[1]

اس سے مراد کہ میت کا بھائی یا بہن ہو، یہ ہے کہ ایک ماں سے ہو، جس طرح بعض سلف کی قراءت میں آیا ہے: "وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ مِنْ أُمٍّ" سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔[2] سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی طرح تفسیر فرمائی ہے۔ اس صورت میں ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے، اگر زیادہ ہوں گے تو وہ سب ثلث میں شریک ہیں۔ ماں کی طرف کے بھائی بقیہ ورثہ کے لیے کئی طرح سے مخالف ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ماں کے ہمراہ وارث ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے مرد اور عورتیں میراث میں برابر ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ صرف اس صورت میں وارث ہوتے ہیں، جب ان کا میت مورث کلالہ ہو۔ پس باپ، دادا اور پوتے کے وارث نہیں ہوں گے۔ چوتھے یہ کہ تہائی سے زیادہ نہیں پائیں گے، گو ان کے مرد اور عورتیں زیادہ ہوں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ ہے کہ ماں زاد بہن بھائی کا ورثہ آپس میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ مرد کے لیے دوہرا اور عورت کے لیے اکہرا۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: میں نہیں جانتا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا ہو، جب تک کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم نہ کر لیا ہو۔ یہ وہی آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ﴾[3] (آیت زیرِ تفسیر)

مسئلہ مشترکہ میں علما کا اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ زوج و اُم ہو یا جدہ اور دو ولد اُم اور ایک یا زیادہ ولد ابوین۔ اس صورت میں قولِ جمہور کے مطابق زوج کو نصف، اُم یا جدہ کو سدس ولدِ اُم کو ثلث ملے گا، اس میں ولد الاب والام مشترک طور پر باہم شریک ہوں گے، وہ اخوۃ الام ہیں۔ یہ مسئلہ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں واقع ہوا تھا، انھوں نے زوج کو نصف، اُم کو سدس دیا اور ثلث اولادِ الام کو دلوایا تو اولادِ ابوین نے بھی اپنے آپ کو پیش کیا اور حصے کا مطالبہ کیا تو اُن کو اُن کے ساتھ شریک کر دیا۔ تشریک سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔

امام سعید بن مسیّب، قاضی شریح، مسروق، طاؤس، ابن سیرین، نخعی، عمر بن عبدالعزیز، ثوری اور شریک رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام مالک، شافعی اور ابن راہویہ رحمہم اللہ کا یہ مذہب ہے۔ ہاں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان کے درمیان شریک نہیں کرتے تھے، بلکہ ثلث اولادِ الام کو دلاتے تھے۔ اولاد الابوین کو کچھ بھی نہیں دیتے تھے، کیوں کہ وہ عصبہ ہیں اور حالت یہ ہے کہ یہی سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مشہور ہے۔ امام شعبی، ابن ابی لیلی، ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد بن حسن، حسن بن زیاد، زفر بن ہذیل، امام احمد،

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٠٠) [2] تفسیر الطبري (٨/ ٦٢) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٨٨)

یحییٰ بن آدم، نعیم بن حماد، ابو ثور اور داود بن علی ظاہری رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ اسی کو ابو الحسین بن اللبان فرضی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''الإیجاز'' میں اختیار کیا ہے۔[1]

وصیت میں ضرر پہنچانے سے اجتناب:

﴿ غَيْرَ مُضَآرٍّ ﴾ کی شرط اس لیے ہے کہ وصیت کا طریقہ عدل پر ہونا چاہیے نہ کہ تنگ کرنے، ظلم اور زیادتی کرنے کے لیے کہ بعض وارثوں کو محروم کرے یا ان کا اللہ کے مقرر کردہ حصے سے کم کر دے یا بڑھا دے، کیوں کہ جو کوئی کسی کو تکلیف پہنچانے کے لیے کوشش کرتا ہے، وہ دراصل اللہ کے حکم اور شریعت میں ضد کرتا ہے۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ وصیت میں اضرار (ضرر پہنچانا) کبیرہ گناہ ہے۔ (رواہ ابن أبي حاتم و ابن جریر) سنن نسائی نے اس خبر کو موقوفاً روایت کیا ہے۔ مرفوع روایت کی سند میں امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے ابو حفص بصری رحمہ اللہ کو شیخ کہا ہے، مگر امام علی بن مدینی رحمہ اللہ اس کو مجہول بتاتے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ صحیح یہی ہے کہ موقوف ہے،[2] اسی لیے ائمہ نے اس بات میں دو قول میں اختلاف کیا ہے کہ وارث کے لیے (وصیت کا) اقرار کرنا صحیح ہے یا نہیں۔ ایک یہ ہے کہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ مظنہ تہمت (مقامِ تہمت) ہے اور صحیح حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کا حق دے دیا، وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔[3] امام مالک، احمد، ابو حنیفہ اور شافعی رحمہم اللہ قولِ قدیم میں اسی طرف گئے ہیں، قول جدید میں صحیح کہا ہے۔ طاؤس، حسن اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ اسی کو امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح میں اختیار کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت کی کہ ان کی بیوی فزاریہ اس کو نہ کھولے، جس کے دروازے بند کیے گئے ہیں (یعنی انھوں نے جو وصیت کر رکھی ہے)۔

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا اقرار اس وجہ سے جائز نہیں ہے کہ اس سے ورثہ کے ساتھ بدگمانی ہوتی ہے۔ حالاں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم گمان سے بچو بے شک گمان بڑی جھوٹی بات ہے اور اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ تم امانتیں اہلِ امانات کو ادا کر دو۔ سو نہ وارث کو خاص کیا نہ غیر وارث کو،[4] پس جبکہ اقرار صحیح اور نفس الامر کے مطابق ہوگا تو اس میں یہ اختلاف جاری ہے اور جب بعض ورثا کو زیادہ دینے اور بعض کو نقصان پہنچانے کے لیے حیلہ اور وسیلہ ہو تو وہ بالا جماع اور آیتِ کریمہ: ﴿ غَيْرَ مُضَآرٍّ ﴾ کی رو سے حرام ٹھہرے گا۔[5]

---

① تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦٠١)

② تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸۸۸) تفسیر الطبري (۸/ ٦٥) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ۳۲۰) تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦٠١) اس کی سند میں ''ابو حفص عمر بن مغیرہ'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعیفة (٥٩٠٧)

③ سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۸۷۰) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۱۲۰) سنن النسائي، رقم الحدیث (۳٦٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۷۱۳) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۱۷۸۹)

④ صحیح البخاري (۳/ ۱۰۰۸) ⑤ تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦٠١۔ ٦٠٢)

فتح البیان کا بیان:

اس جگہ فتح البیان کا بیانِ فاتح یوں ہے کہ ﴿اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ﴾ سے مراد ولدِ صلب ہے یا ولد الولد مرد ہو یا عورت، اس پر اجماع ہے۔ پھر ولد کے موجود ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی زوج کا ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے، اہلِ علم نے اس بات میں اختلاف نہیں کیا کہ زوج کو ولد نہ ہونے کی صورت میں نصف اور ولد ہونے کی صورت میں ایک چوتھائی ملتا ہے، گو وہ ربع سافل کیوں نہ ہو (یعنی بیٹا بیٹی نہ ہو، لیکن پوتا پوتی یا اس سے نیچے اولاد ہو)۔ وصیت مذکور میں ولد الابن (پوتا) ولد میں شامل ہے۔ بیویوں کی وراثت میں خاوندوں کے حصے کا بیان ہے۔

پھر بیویوں کا حصہ اپنے شوہروں کے ترکے میں سے بیان ہوا کہ ان کے لیے، کتنی ہی کیوں نہ ہوں، وہی ربع ترکہ ہے، اگر اس سے یا غیر سے اولاد نہ ہو، اور اگر اولاد ہے تو پھر ثمن (آٹھواں حصہ) ملے گا، یہ حصہ ولد کے ہمراہ ہے اور ولد نہ ہونے کی صورت میں ایک زوجہ، زوجات سے حصہ مذکور کے ساتھ منفرد ہوگی اور ایک سے زیادہ بیویاں اس حصے میں بلا اختلاف شریک ہیں۔ یعنی ایک زوجہ کو ربع یا ثمن ملے گا۔ اسی طرح اگر چار ہیں تو وہ بھی اس ربع یا ثمن میں شریک و حصہ دار ہوں گی۔ ولد کا اطلاق ذکر و انثیٰ دونوں پر آتا ہے، اس حکم میں ولد و ولد الابن و ولد البنت میں کچھ فرق نہیں، خواہ ولد زوجہ سے ہو یا غیر زوجہ سے۔

کلالہ کا بیان اوپر ہو چکا کہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک اس سے وہ شخص مراد ہے، جس کا نہ بیٹا ہو نہ باپ۔ صاحبِ کتاب العین، ابو منصور لغوی، ابن عرفہ، قتیبی، ابو عبید اور ابن الانباری رحمہم اللہ کا یہ قول ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ اجماع ہے اور اس اجماع کو بہت سے لوگوں نے بیان کیا ہے۔ سلیمان جمل رحمہ اللہ نے کہا کہ کلالہ کی تفسیر میں یہ احسن قول ہے۔ سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "اَلْكَلَالَةُ مَنْ لَّمْ يَرِثْهُ أَبٌ أَوِ ابْنٌ أَوْ أَخٌ فَهُوَ عِنْدَ الْعَرَبِ كَلَالَةٌ" ''جس کا باپ، بیٹا یا بھائی وارث نہ ہو، وہ عرب کے ہاں کلالہ ہوتا ہے۔''

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا کہ تفسیر کلالہ میں اخ (بھائی) کا ذکر ابو عبیدہ کے سوا کسی نے نہیں کیا۔ یہ شرط غلط ہے۔[1] امام طبری رحمہ اللہ نے کہا کہ ٹھیک بات یہ ہے کہ کلالہ وہ وارث میت ہے، جو نہ بیٹا ہو نہ والد۔ کیوں کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرا وارث نہیں ہوگا مگر کلالہ تو کیا میں سارے مال کی وصیت کروں؟ فرمایا: نہیں۔[2] سمین نے کہا ہے کہ اس آیت میں لوگوں کے اقوال میں اشکال اور اضطراب کی وجہ سے بڑی طویل بات ہو سکتی ہے۔

---

[1] التمهيد (٥/ ١٨٦ـ ١٨٧) تفسير القرطبي (٥/ ٧٦ـ ٧٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩١، ٣٧٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٦، ١٦٢٨) تفسير الطبري (٨/ ٦٠)

پھر کہا کہ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کلالہ یا تو میت موروث ہے یا ورثہ یا مال موروث یا ارث یا قرابت۔ لیکن زیادہ اچھا قول وہی ہے، جو ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر عورت موروثہ والد اور ولد سے خالی ہو اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا، اگر زیادہ ہوں گے، مثلاً: دو بھائی ہیں یا دو بہنیں یا بھائی اور بہن ملے جلے ہیں تو وہ اسی ثلث میں شریک رہیں گے۔

اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ مرد عورت کے مثل ہے، جبکہ بہن بھائی ایک ماں سے ہوں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تہائی میں شریک رکھا ہے، ذکر کو انثیٰ پر فضیلت نہیں دی۔ جس طرح بنین واخوۃ ابوین یا اب واحد (بیٹوں، ماں باپ کی طرف سے بھائیوں یا ماں یا باپ میں سے کسی ایک کی طرف سے بھائی) میں ذکر کیا تھا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: یہ اجماع ہے۔[1] آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جب مسئلہ کامل ہو جائے گا تو ایک ماں سے بھائی ابوین کے بھائیوں یا اب واحد پر مقدم ہوں گے، اس مسئلہ کا نام حماریہ ہے۔

اس کی صورت اوپر گزر چکی ہے، اس کی تائید میں یہ صحیح حدیث ہے: «أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ»[2] امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس مدعا پر آیت و حدیث کی دلیل کو رسالہ مستقلہ میں ثابت کیا ہے۔ اس کا نام "المباحث الورية في المسائل الحمارية" رکھا ہے۔ آیتِ کریمہ: ﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ بہ ظاہر سارے مال کی وصیت کے جواز پر دلیل ہے، لیکن سنتِ صحیحہ نے اس کو تہائی مال کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔

صحیحین میں سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: «اَلثُّلُثُ، وَالثُّلُثُ كَثِيْرٌ»[3] سو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ثلث سے زیادہ وصیت نہیں کرنی چاہیے، ثلث سے کم کرنا جائز ہے۔ پھر قید عدمِ اضرار بیان فرمائی، یہ قید وصیت اور دین دونوں کی طرف راجع ہے۔ پس ایسے اقراراتِ دَین یا وصیتیں، جن سے منع کر دیا گیا ہے یا ایسے اقرار و وصایا جن کا مقصد سوائے وارثوں کو نقصان پہنچانے کے اور کچھ نہیں، باطل اور مردود ہیں، وہ جاری کرنے کے لائق نہیں ہوتے، نہ ثلث سے نہ اس سے کم سے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس بات پر اجماع ہے کہ وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔[4] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی ستر برس تک اہلِ خیر کے سے کام کرتا ہے، پھر جب وصیت کرتا ہے تو اپنی وصیت میں ظلم کرتا ہے، اس کا خاتمہ عملِ بد پر ہوتا ہے، وہ دوزخ میں جائے گا اور کوئی آدمی ستر برس تک اہلِ شر کا سا کام کرتا ہے، پھر اپنی وصیت میں عدل کر جاتا ہے تو اس کا خاتمہ عملِ خیر پر ہوتا ہے، وہ جنت میں

---

[1] تفسير القرطبي (٥/ ٧٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٥)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٨) [4] تفسير القرطبي (٥/ ٨٠)

داخل ہوگا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم چاہو تو اس آیت کو پڑھو: ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٣﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [النساء: ١٣۔ ١٤] ''یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا، اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے آگے نکلے گا تو اللہ اسے آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔''[1] (رواہ أحمد و عبد بن حمید و أبو داود و الترمذي و حسنه و ابن ماجه و البیهقي) اس کی سند میں ''شہر بن حوشب'' ہے، ''شہر'' میں کلام ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں: جس نے اپنے وارث کی میراث قطع کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کی میراث قطع کرے گا۔[2] (رواہ ابن ماجه) صحیحین وغیرہما میں سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے: «إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ»[3] ''تم اپنے ورثا کو مالدار چھوڑ کر جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑ کر جاؤ کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔'' سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے تم پر تمھارے تہائی مال کا صدقہ کیا، تاکہ تمھاری نیکیاں زیادہ ہوں، یعنی وصیت میں۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔[4]

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ کہیں لوگ اپنی آنکھیں تہائی سے چوتھائی کی طرف بند کرلیں، کیوں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تہائی بہت ہے۔[5] سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ثلث وسط ہے نہ کم نہ زیادہ۔[6] سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اگر خُمس (پانچواں حصہ) کی وصیت کروں تو یہ مجھ کو اس بات سے زیادہ محبوب ہے کہ میں رُبع (چوتھے حصے) کی وصیت کروں اور اگر میں ربع کی وصیت کروں تو یہ مجھے محبوب تر ہے اس سے کہ میں ثُلث (تیسرے حصہ) کی وصیت کروں اور جس نے ثلث کی وصیت کی اس نے کچھ نہ چھوڑا۔[7]

---

1. مسند أحمد (٢/ ٢٧٨) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٨٦٧) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢١١٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٧٠٤) سنن البیهقي الکبریٰ (٦/ ٢٧١) راجح قول کے مطابق ''شہر بن حوشب'' کی روایت حسن ہے۔
2. سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٧٠٣) اس روایت کی سند میں ''عبدالرحیم بن زید العمی'' اور ''زید العمی'' ضعیف راوی ہیں۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ٥٧٢٣)
3. صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٢٣٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٢٨)
4. مصنف ابن أبي شیبة (٦/ ٢٢٦) سنن الدارقطني (٤/ ١٥٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغلیل: ٦/ ٧٦۔ ٧٧)
5. صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٥٩٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٢٩)
6. مصنف ابن أبي شیبة (٦/ ٢٢٦) اس کی سند صحیح ہے۔
7. مصنف ابن أبي شیبة (٦/ ٢٢٧)

اس ارشاد میں کہ "یہ اللہ کی طرف سے وصیت ہے"، اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرائض کو اتنی تفاصیل کے ساتھ اپنے بندوں کو بطورِ وصیت فرمایا ہے اور بندے کی ہر وصیت جو اللہ کے مقرر کردہ فرائض سے تجاوز کرے، وہ اللہ کی وصیت کے ساتھ مسبوق ہے، یعنی اللہ کی وصیت سے وہ منسوخ ہے، جیسے وہ وصیتیں، جن کے تحت بعض وارثوں کو بعض پر فوقیت دی جائے یا کسی وجہ سے ان میں ضرار کا عنصر پایا جاتا ہے۔[1]

آیت زیرِ تفسیر میں وصیت کا لفظ اس بات کا مشروع ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ احکامِ فرائض بڑے اہم امور ہیں۔ یہی حکم قرآن و حدیث کے تمام وصایا کے بارے میں ہے، اس بارے میں عربی زبان میں ایک مستقل رسالہ بعض أعزہ۔حفظه الله و سلم۔ نے لکھا ہے۔ اس میں وہ تمام وصایا جمع کیے ہیں، جو کتاب وسنت میں آئے ہیں یا بعض مشائخ کاملین نے فرمائی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ وصیتوں کے بارے میں احکام بھی شامل کیے ہیں، تاکہ فقہ الحدیث میں آسانی ہو۔ وللہ الحمد.

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا، اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے ⑬ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے آگے نکلے گا تو اللہ اسے آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ⑭

حدود اللہ سے تجاوز پر وعید:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی یہ فرائض اور ان کی مقداریں، جو اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے لیے میت سے ان کے قرب کے مطابق یا میت کی طرف ان کے ضرورت مند ہونے کے مطابق مقرر کی ہیں، یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان سے تجاوز کرنا منع ہے۔ اسی لیے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے اور بعض ورثا کو نہ زیادہ دیتا ہے، بعض کو حیلہ اور وسیلہ بنا کر اور نہ کم دیتا ہے، بلکہ ان کو اللہ کے حکم و فریضہ اور قسمت پر چھوڑ دیتا ہے، وہ شخص جنتی اور کامیاب ہوگا اور جس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل ڈالا، اللہ سے ضد کی، اللہ کی تقسیم پر راضی نہ ہوا، وارثوں کو کم وبیش

[1] فتح البیان (۳/ ۴۲۔ ۴۸)

دے گیا یا بالکل محروم رکھا، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر کے جہنم میں داخل کرے گا۔

امام ابو داود نے "بَابُ الْإِضْرَارِ بِالْوَصِيَّةِ" میں شہر بن حوشب کے طریق سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ مرد یا عورت ساٹھ برس تک اللہ کی اطاعت بجا لاتے ہیں۔ پھر ان کو موت آتی ہے، وہ وصیت میں ضرر پہنچا جاتے ہیں، ان کے لیے آگ واجب ہو جاتی ہے۔ پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آیتِ شریف: ﴿ مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ ﴾ سے ﴿ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ ﴾ تک پڑھی۔[1] (وهكذا رواه الترمذي و ابن ماجه من حديث أشعث و أكمل به وقال الترمذي حسن غريب و سياق الإمام أحمد أتم وأكمل) سیاقِ مذکور وہی ہے، جو اس آیت سے پہلے گزر چکا ہے۔

حد کا مفہوم:

فتح البیان میں ہے کہ «تِلْكَ» ان احکام کی طرف اشارہ ہے، جو مالِ یتامیٰ، وصایا، نکاح اور وراثت کے بارے میں پہلے گزر چکے ہیں۔ ان کا نام حدود اس لیے رکھا کہ ان سے آگے بڑھ جانا اور ان سے زیادتی کرنا جائز نہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت میں اس جگہ معصیت سے مراد شرک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی تقسیم سے راضی نہ ہونا اور اُن سے بغاوت کرنا حد ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ وراثت کی تقسیم کا انکار کرنا حد ہے، جب کفر کیا تو اس کا حکم دوسرے کافروں کے حکم کی طرح آگ میں ہمیشہ رہنا ہے، اگر مرنے سے پہلے توبہ نصیب نہ ہوئی اور جب مر گیا اور وہ اسی حال پر مصر اور قائم تھا تو وہ آگ میں ہمیشہ رہنے والا ہوگا۔ اس صورت میں یہ آیت معتزلہ کی دلیل نہیں بن سکتی کہ نافرمانی کرنے والے اور فاسق اہلِ ایمان آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔[2]

علمِ فرائض کی اہمیت:

فرائض کے بارے میں علم حاصل کرنے اور علم سکھانے کے لیے ترغیب دینے کے لیے حدیثیں مروی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ تم فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، میں ایک شخص مرنے والا ہوں اور یہ علم جلد مقبوض (ختم) ہو جائے گا، فتنے ظاہر ہوں گے، یہاں تک کہ دو آدمی فریضے کے بارے میں اختلاف کریں گے اور ان کو کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا، جو اس بارے میں حکم دے۔[3] (أخرجه الحاكم والبيهقي وأخرجاه عن أبي هريرة رضي الله عنه) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ فرائض کو سیکھو اور سکھاؤ کہ وہ آدھا علم ہے اور میری اُمت سے سب سے پہلے یہی علم فراموش ہونے والا ہے۔ (أخرجه ابن ماجة والدار قطني)

---

[1] اس کی تخریج گذشتہ آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسير الخازن (١/ ٤٩٥)

[3] مستدرك الحاكم (٤/ ٣٦٩) شعب الإيمان (٢/ ٢٥٣) اس کی سند میں "سلیمان بن جابر" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ١٠٣)

ان دونوں کے الفاظ یہ ہیں: «هُوَ أَوَّلُ عِلْمٍ يُنْسىٰ وَهُوَ أَوَّلُ شَيْئٍ يُنْزَعُ مِنْ أُمَّتِي»[1] اس علم کے سیکھنے اور سکھانے کی ترغیب کے بارے میں صحابہ وتابعین کی ایک جماعت سے کثیر تعداد میں آثار روایت کیے گئے ہیں۔ یہ علم قدر ومنزلت، شرف اور فضل کے لحاظ سے أعظم علوم ہے، ارکانِ شریعتِ حقہ میں سے ایک رکن ہے، فروعِ ملتِ صادقہ سے ایک اہم فرع ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شروع کے دور کی ایک اہم مشغولیت اسی علم کا حاصل کرنا تھا۔ وہ اس کے فروع اور اصول میں ہمیشہ کلام کرتے۔ اس علم کی اگر اور کچھ فضیلت نہ ہو تو یہ بزرگی کیا کم ہے کہ فرائض کی تقسیم کو خود اللہ پاک نے اپنے ذمہ لیا ہے، اپنی مقدس کتاب میں اس کو بیان کیا، خود متولی تقسیم ہوا ہے، پیغمبر اور غیر پیغمبر کے حوالے نہیں کیا۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے سیکھنے اور سکھانے پر آمادہ فرمایا، ترغیب دی، شوق دلایا۔

ماہرینِ فرائض کی قلت:

لیکن مدتِ دراز سے یہ علم فراموش ہو گیا ہے۔ جس طرح مخبرِ صادق نے فرمایا تھا کہ وہ سب سے پہلے بھلا دیا جائے گا، چھین لیا جائے گا، سو یہ نبی آخر الزمان کا معجزہ ہے کہ جیسا کہا تھا، ویسا ظہور میں آیا۔ اس علم کے جاننے والے علما میں ایک سو میں ایک دو بھی نظر نہیں آتے۔ پھر اگر کوئی جانتا بھی ہے تو اُمت نے تو اس پر عمل کرنا مدت سے بالکل ترک کر دیا ہے، گویا اس کو منسوخ سمجھ لیا ہے۔ إنا للہ۔ پھر اگر ہزار میں ایک کو تقسیمِ میراث کا حوصلہ ہوتا ہے تو وہ قواعدِ فقہ اور رائے وغیرہ پر چلتا ہے، اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کو دریافت کر کے عمل نہیں کرتا۔

اصل ماخذ کتاب وسنت ہے:

علما نے اس علم کے ایسے تخاریج نکالے ہیں، جن کی سند سوائے رائے محض کے کچھ نہیں ہے، حالاں کہ محض رائے اس قابل نہیں ہوتی کہ کسی کتاب میں لکھی جائے، کیوں کہ ہر عالم کی رائے جدا ہوتی ہے، ہر صاحبِ رائے کا اجتہاد علاحدہ ہوتا ہے، جب دلیل نہ ہوئی تو بعض کا اجتہاد بعض پر حجت نہیں ہو سکتا ہے، تجھ کو تو اسی قدر بیان کافی ہے جو کتاب وسنت میں مروی ہے، اور جب ایسی مشکل پیش آئے کہ اس کا صریح حکم قرآن وحدیث میں نہیں ہے تو پھر تو خود اجتہاد کر، اگر علم رکھتا ہے، جیسا کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کی دلیل ہے،[2] ورنہ پھر مجبوری سے اکابرِ صحابہ کے فیصلوں پر عمل کر۔

فرائض ایک نظر میں:

قرآن وحدیث میں محدودہ حصے یہ ہیں: نصف (آدھا)، ربع (چوتھا)، ثمن (آٹھواں)، ثلثان (دو تہائی)،

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧١٩) سنن الدارقطني (٤/ ٦٧) اس روایت کی سند میں ''حفص بن عمر'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٣٨٧١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٨٨١)

ثلث (ایک تہائی)، سدس (چھٹا) ان کی تفسیر بہ خوبی اوپر گزر چکی ہے۔ سنتِ صحیحہ میں یوں مروی ہے کہ ابتدا اصحابِ فرائض، یعنی مقرر کیے ہوئے حصوں کے حق داروں سے کرے، جو باقی بچے وہ عصبہ کا ہے۔ بہنیں بیٹیوں کے ہمراہ عصبہ ہوتی ہیں، پوتی کا حصہ بیٹی کے ہمراہ دو ثلث پورا کرنے کے لیے سدس ہے۔

اسی طرح علاتی بہن کا سگی بہن کے ساتھ چھٹا حصہ ہے۔ علاتی وہ جو باپ کی طرف سے ہو۔ فقط دادی کے لیے ایک ہو یا کئی، سدس ہے، جب ماں نہ ہو، اور دادا کے لیے سدس ہے، جب کوئی ساقط کرنے والا نہ ہو اور اگر ہو جیسے باپ تو پھر دادا کو کچھ نہیں ملے گا اور بیٹے یا پوتے یا باپ کے ہوتے ہوئے بھائیوں اور بہنوں کے لیے مطلقاً میراث نہیں ہے۔ دادا کے ہوتے ہوئے ان کی میراث میں اختلاف ہے۔ بھائی بیٹوں کے ہمراہ وارث ہوتے ہیں، مگر اخیافی بھائی، جو فقط ماں کی طرف سے ہوں اور سگے بھائی کے ہوتے ہوئے علاتی بھائی، جو فقط باپ کی طرف سے ہو، ساقط ہو جاتا ہے۔

رحم والے ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں، وہ بیت المال پر مقدم ہیں۔ تزاحم فرائض میں عول ہوتا ہے، یعنی تنگی کے وقت حصہ مقررہ پر ثلث یا سدس کا بڑھا دینا۔ ملاعنہ کا بیٹا وارث نہیں ہوتا اور زانیہ کا بھی نہیں، مگر اپنی ماں اور اس کی قرابت کا اور اس کے عکس، یعنی عورت مذکور ان کی وارث ہے، اور بچہ اس وقت تک وارث نہیں ہوتا، جب تک وہ آواز نہ نکالے یا روئے نہیں۔ مملوک کی میراث آزاد کرنے والے کے لیے ہے، لیکن عصبات سے ساقط ہو جاتی ہے۔ مقررہ حصہ والوں کے بعد جو کچھ بچے گا، وہ آزاد کرنے والے کا ہے۔ دو دین والوں کے درمیان میراث نہیں ہے۔ اسی طرح قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوتا۔ ولاء کا بیچنا یا ہبہ کرنا حرام ہے۔ یہ سب سنتِ صحیحہ سے ثابت ہوا ہے۔[1] وللہ الحمد.

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝۱۵ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۱۶

اور تمھاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں، تو تم ان پر اپنے میں سے چار مرد گواہ ٹھہرا لو، پھر اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے (15) اور تم میں سے جو دو مرد بے حیائی کا کام کریں، تو ان کو ایذا دو، پھر اگر وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کرو۔ بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے (16)

[1] فتح البیان (۳/ ۴۹۔ ۵۱)

زانیہ کو محبوس رکھنے کا حکم اور اس کی منسوخی:

یہ حکم زنا کے بارے میں فرمایا کہ چار مرد مسلمان گواہ چاہییں، پھر ابھی حد نازل نہ فرمائی صرف وعدہ کیا، سورت نور کے اول میں حد نازل ہوئی۔ پھر کہا: اگر دو مرد بدفعلی کریں، ان کا حکم بھی اس وقت مجمل ایذا دینا فرمایا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ جب کسی عورت کا زنا کرنا بینہ عادلہ (عادل گواہی) سے ثابت ہو جاتا تو وہ گھر میں بند رکھی جاتی باہر نکلنے نہ دی جاتی یہاں تک کہ مرجاتی۔ اس جگہ سبیل سے مراد اس حکم کا ناسخ ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ زنا کا یہی حکم تھا یہاں تک کہ اللہ نے سورۂ نور اتاری اور اس حکم کو جلد (کوڑے لگانا) یا رجم (سنگسار کرنا) کے حکم سے منسوخ کر دیا۔ اسی طرح امام عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن، عطا خراسانی، ابوصالح، زید بن اسلم اور ضحاک رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ یہ امر متفق علیہ ہے۔[1]

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اترتی تو اس کا اثر پڑتا، تکلیف ہوتی، چہرہ متغیر ہو جاتا۔ ایک دن اللہ تعالیٰ نے وحی اُتاری، جب وہ کیفیت دور ہوگئی تو فرمایا: مجھ سے لے لو، اللہ نے ان کے لیے راہ نکال دی، ثیب (شوہر والی) ساتھ ثیب (شادی شدہ مرد) کے بکر (کنواری) ساتھ بکر (کنوارے) کے۔ ثیب کے لیے سو کوڑے اور سو پتھر کی مار ہے، کنوارے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کے لیے شہر سے نکالنا ہے۔[2] (رواه أحمد و مسلم و أصحاب السنن) مسند طیالسی میں عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: «أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ عُرِفَ ذٰلِكَ فِيْ وَجْهِهٖ فَلَمَّا أَنْزَلَتْ: ﴿ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴾ وَ ارْتَفَعَ الْوَحْيُ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: خُذُوا قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا: اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جِلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ، وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جِلْدُ مِائَةٍ وَرَجْمٌ بِالْحِجَارَةِ»[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت نقل کی ہے: «خُذُوْا عَنِّيْ خُذُوْا عَنِّيْ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا: اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جِلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ، وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جِلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ»[4] (وكذا رواه أبو داود مطولًا من حديث الفصل بن دلهم ثم قال: وليس هو الحافظ كان قصابا بواسط) ان دونوں حدیثوں کا ترجمہ وہی ہے، جو اوپر ہو چکا۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «اَلْبِكْرَانِ يُجْلَدَانِ وَيُنْفَيَانِ

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٧٤) تفسير ابن كثير (١/ ٦٠٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٠) مسند أحمد (٥/ ٣١٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤١٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٣٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٢٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٥٠)

[3] مسند الطيالسي (١/ ٧٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٨/ ١٠)

[4] مسند أحمد (٣/ ٤٧٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤١٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٨/ ١٠)

وَالثَّيِّبَانِ يُجْلَدَانِ وَيُرْجَمَانِ وَالشَّيْخَانِ يُرْجَمَانِ» امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ سورت اتری تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا حَبْسَ بَعْدَ سُوْرَةِ النِّسَاءِ»[2] (رواہ الطبراني) یعنی زانیہ کو گھر میں بند رکھنے کا حکم باقی نہ رہا، بلکہ منسوخ ہوگیا۔ امام احمد رحمہ اللہ اسی حدیث کے مقتضاء کی طرف گئے ہیں، یعنی ثیب زانی کو کوڑے اور رجم دونوں سزائیں ملنی چاہییں۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ثیب زانی کے لیے صرف رجم کی سزا ہے کوڑوں کے بغیر۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ماعز اور غامدیہ رضی اللہ عنہما اور دو یہودیوں کو رجم کیا تھا، اس سے کوڑے لگانا ثابت نہیں ہوا، لہٰذا کوڑے لگانا واجب اور حتمی نہیں، بلکہ منسوخ ہے، یعنی ان کے قول پر۔[3] والله أعلم.

فتح البیان میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ زانیہ عورت کو گھر میں بند رکھا جاتا تھا، اگر مرگئی تو مرگئی اور زندہ رہی تو رہی، یہاں تک کہ سورت نور اتری: ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النور: ٢] ''چناں چہ زانیہ عورت اور زانی مرد، ان دونوں میں سے ہر ایک کو تم سو کوڑے مارو، اور اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین (پر عمل کرنے) کے معاملے میں تمھیں ان دونوں (زانی اور زانیہ) پر قطعاً ترس نہیں آنا چاہیے اور مومنوں میں سے ایک گروہ ان دونوں کی سزا کے وقت موجود ہونا چاہیے''، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک راہ نکال دی، اب جو کوئی کچھ کرے گا، کوڑے لگا کر چھوڑ دیا جائے گا۔[4]

بعض اہلِ علم سے ایک روایت یہ بھی آئی ہے کہ کوڑوں کے ساتھ حبس اور ایذا دونوں باقی ہیں، کیوں کہ ان کے درمیان کچھ تعارض نہیں، بلکہ جمع ممکن ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے، کیوں کہ لفظ: ﴿ فَاَمْسِكُوْهُنَّ ﴾ گھروں میں ان کو ایک حد تک روکنے کی دلیل ہے، وہ حد موت ہے۔ یا کوئی راستہ نکالنا اور یہ سبیل مجمل تھی، جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مجھ سے لے لو، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے راہ نکال دی ہے، بکر کو ساتھ بکر کے سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی اور ثیب کو ثیب کے ساتھ سو کوڑے اور رجم ہے۔[5] (رواہ مسلم عن عبادة) تو یہ حدیث آیتِ مجملہ کے بیان میں ہوگئی نہ کہ اس کی ناسخ۔ مترجم کہتا ہے کہ یہ تو ممکن ہے، لیکن حدیث «لَا حَبْسَ»[6] کا

---

(1) تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٠٣) اس کی سند میں ''عمرو بن عبدالغفار'' سخت ضعیف راوی ہے۔
(2) المعجم الکبیر (١١/ ٣٦٥) اس کی سند میں ''عیسیٰ بن لہیعہ'' اور ''عبداللہ بن لہیعہ'' ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة: ٢٧٣)
(3) تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٠٣) (4) المعجم الکبیر (١١/ ٨٧)
(5) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٩٠) (6) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کیا جواب ہے کہ وہ آیت کے منسوخ ہونے پر صریح دلیل ہے؟

ضمیر ﴿ يَأْتِيٰنِهَا ﴾ سے مراد فحاشی ہے اور فحاشی زنا اور لواطت دونوں کو شامل ہے۔ مفسرین نے دونوں قول لیے ہیں، مگر دوسرا قول راجح ہے۔ ﴿ وَالَّذَانِ ﴾ سے تغلیباً زانی اور زانیہ مراد ہیں۔ کسی نے کہا: پہلی آیت خاص عورتوں کے حق میں ہے۔ محصنات ہوں یا غیر محصنات اور دوسری آیت خاص مردوں کے حق میں ہے۔ تثنیہ اس لیے ہے کہ مرد خواہ محصن ہو یا غیر محصن حکم ایک ہی ہے۔ سو عورتوں اور مردوں کی سزا ستانا اور ایذا دینا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یوں ہی مروی ہے۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس کو امام مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کر کے مستحسن کہا ہے۔ امام سدی اور قتادہ رحمہما اللہ کا یہ قول ہے کہ پہلی آیت نساءِ محصنہ عورتوں کے حق میں ہے۔ اس میں محصن مرد بھی شامل ہیں، دوسری کنواری عورت اور کنوارے مرد کے حق میں ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے،[2] مگر امام نحاس رحمہ اللہ نے تضعیف کی ہے اور یہ کہا ہے کہ مونث کی مذکر پر تغلیب بعید ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس قول کے معنی مکمل ہیں، مگر آیت کا لفظ اس معنی سے تنگی کرتا ہے۔ کسی نے کہا: امساک زانیہ عورت کے لیے تھا نہ کہ مرد کے لیے، اس لیے امساک میں صرف عورت کا ذکر کیا، پھر ایذا میں دونوں کو جمع کیا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ عورت محبوس رکھی جاتی تھی اور ایذا دونوں کو دی جاتی تھی۔[3] ایذا سے مراد جھڑکنا، شرم دلانا یا سخت سست کہنا، درشتی کرنا، زبان سے برا کہنا، جوتوں سے مارنا۔ ایک قوم نے کہا کہ ایذا حد کے ساتھ منسوخ ہے، ایذا حبس وغیرہ ہے، اگر مراد زنا ہے یا لواطت۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مفعول بہ رجم نہیں کیا جاتا، اگرچہ محصن ہو، بلکہ کوڑے اور جلا وطنی کافی ہے۔ فاعل کو رجم کیا جاتا ہے، اگر محصن ہے۔ لیکن ضمیر کے تثنیہ ہونے کی دلیل سے لواطت زیادہ ظاہر ہے۔ تابعین کی ایک جماعت نسخ کی قائل ہے، پھر ان کے توبہ کر لینے اور اصلاح کر لینے پر ان سے اعراض کرنے کا حکم فرمایا۔ یہ حکم ابتدائے اسلام میں حد کے نزول سے پہلے تھا۔ اب کنوارے کو کوڑے مارنا کتابِ عزیز کے حکم کے مطابق اور ثیب اور محصن کا رجم کرنا سنتِ مطہرہ کی نص سے ثابت ہو چکا ہے، کیوں کہ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ماعز رضی اللہ عنہ کو رجم کیا اور وہ محصن (شادی شدہ) تھا۔[4]

---

[1] الناسخ والمنسوخ للنحاس (١/ ٣٠٧۔ ٣٠٨) [2] تفسير الطبري (٨/ ٨٣)

[3] تفسير القرطبي (٥/ ٨٦، ٨٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٣٨) صحيح مسلم (١٦٩٢) تفسير القرطبي (٥/ ٨٦۔ ٨٧) فتح البيان (٣/ ٥٢۔ ٥٤)

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ
ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰٓئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ
اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّـَٔاتِ حَتَّىٰٓ
إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْـَٔانَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ
وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰٓئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

اللہ تو صرف ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، چناں چہ اللہ ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے، اور اللہ بہت جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے (17) اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برے کام کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آ جائے تو وہ کہتا ہے: بے شک اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہی ہوتے ہیں، ان لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے (18)

توبہ کی قبولیت کی آخری حد اور وقت:

یعنی جب موت کا یقین ہو چکا اور آخرت نظر آنے لگی، تب توبہ قبول نہیں، اس سے پہلے مسلمان کی توبہ قبول ہے اور کافر اگر گناہ سے توبہ کرے تو وہ گناہ معاف نہیں ہوتا، مگر جو مسلمان ہو کر مرے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی توبہ قبول ہے، جو جہالت سے برا کام کرتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے، اگرچہ روح قبض کرنے والے فرشتے کو دیکھنے کے بعد ہو، مگر غرغرہ سے پہلے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے: جس نے خطا سے یا جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، وہ جاہل ہے، یہاں تک کہ گناہ سے باز آئے۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ذکر کرتے تھے کہ بندہ جو گناہ کرتا ہے، خواہ عمداً ہو یا خطأً وہ جہالت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر شخص جو اللہ کی معصیت کا کام کرتا ہے، وہ اس کام کے کرتے وقت جاہل ہوتا ہے، یہی بات امام عطا بن رباح رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جہالت سے مراد برا کام کرنا ہے۔[1] پھر کہا: قریب سے مراد ملک الموت کا دیکھنا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: جو موت سے ادھر ہے، وہ قریب ہے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا: جب تک صحت میں ہے قریب ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: جب تک غرغرہ نہیں ہے قریب ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "اَلدُّنْيَا كُلُّهَا قَرِيبٌ"[2]

---

(1) تفسیر الطبري (٨/ ٨٩۔ ٩٠) (2) تفسیر الطبري (٩٣۔ ٩٤) تفسیر ابن كثیر (١/ ٦٠٤)

ایک بہت بوڑھا آدمی ایک بزرگ کے پاس آیا، کہا: میں توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اس کو شیخ فانی دیکھ کر کہا: تو بہت دیر بعد آیا۔ اس نے جواب دیا کہ جو مرنے سے پہلے آیا، وہ بعید نہیں ہے، قریب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے، جب تک کہ غرغرہ نہیں لگا۔ (رواہ أحمد و الترمذي و ابن ماجه) امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی دوسری مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ نہیں ہے کوئی بندہ کہ مرنے سے ایک ماہ پہلے توبہ کرے، مگر قبول کرتا ہے، اللہ اس سے بھی کم، یعنی موت سے ایک دن یا ایک ساعت پہلے اس کی توبہ کو اور اس کے اخلاص کو جان لیتا ہے، پھر وہ توبہ قبول کرتا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جس نے مرنے سے ایک سال یا ایک ماہ یا ایک جمعہ یا ایک دن یا ایک ساعت پہلے توبہ کی، اس کی توبہ قبول ہوئی۔

ایوب رحمہ اللہ نے کہا: میں نے پوچھا کہ اللہ تو یوں فرماتا ہے: ﴿ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ ﴾. کہا: میں تو تجھ سے وہ کہتا ہوں، جو میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔[3] (رواه أبو داود الطيالسي) عبدالرحمٰن بن بیلمانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ چار صحابی جمع ہوئے، ایک نے کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے، فرماتے تھے کہ بے شک اللہ بندے کی مرنے سے ایک دن پہلے کی گئی توبہ قبول کرتا ہے۔ دوسرے نے کہا: یہ تو نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ کہا: ہاں، کہا: میں نے یوں سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ موت سے آدھا دن پہلے قبول کرتا ہے۔ تیسرے نے کہا تو نے یہ سنا ہے؟ کہا: ہاں، کہا: میں نے یوں سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ مرنے سے ایک پہر پہلے قبول کرتا ہے۔ چوتھے نے کہا: تو نے یوں سنا ہے؟ کہا: ہاں، کہا: میں نے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے، جب تک اس کی جان غرغرہ نہ کرے۔[4] (رواه أحمد و سعيد بن منصور قريباً منه)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ فرمایا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے، جب تک اس کو غرغرہ نہیں لگا۔[5] (رواه ابن مردويه) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حسن سے مرسلاً بطورِ بلاغ روایت کیا ہے کہ اللہ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے، جب تک کہ غرغرہ نہیں لگا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ

[1] مسند أحمد (٢/ ١٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥٣) صحيح الجامع (١٩٠٣)

[2] المعجم الكبير (١٢/ ٤٤٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه يحيىٰ بن عبد الله البابلتي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٣٢٥)

[3] مسند الطيالسي (١/ ٣٠١) ان الفاظ کے ساتھ روایت مسند الطیالسی میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بجائے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس کی سند میں "ایوب" مجہول راوی ہے۔

[4] مسند أحمد (٣/ ٤٢٥) اس کی سند میں "عبدالرحمٰن بن بیلمانی" ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير ابن كثير (١/ ٦٠٥) اس کی سند میں "عمران بن عبدالرحیم" ضعیف راوی ہے۔

نے کہا کہ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے یہ مرسل حسن ہے۔ اسی طرح ابو ایوب رحمہ اللہ سے بھی مرسلاً مروی ہے۔[1] اسی کے مثل سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[2] سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابلیس نے کہا: اے رب! مجھ کو تیری عزت کی قسم! میں ان کو ہمیشہ بہکاؤں گا، جب تک ان کے بدن میں ان کی جان ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: مجھ کو بھی میری عزت اور جلال کی قسم ہے کہ میں ہمیشہ ان کی مغفرت کروں گا، جب تک کہ وہ استغفار کرتے رہیں گے۔[3] (رواہ أحمد)

درِ توبہ کا بند ہونا:

یہ حدیثیں اس بات پر دلیل ہیں کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کی اور وہ زندگی کی اُمید رکھتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے، وہ علیم و حکیم ہے۔ ہاں اگر زندگی سے نا اُمیدی ہوگئی ہے اور فرشتے کو آنکھ سے دیکھ لیا ہے اور جان حلق میں آگئی ہے اور سینہ تنگ ہوگیا ہے اور روح حلقوم کو پہنچ گئی ہے، نفس کو غرغرہ لگ گیا ہے، نفس حلقوم کے کنارے پہنچ گیا ہے تو اب توبہ قبول نہیں، اب تو اتنی دیر ہوگئی: ﴿ وَلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴾ [صٓ: ٣] ”وہ فرار و خلاصی کا وقت نہ تھا“ صادق آ گیا۔

اسی لیے یہ فرمایا کہ ان کی توبہ نہیں ہے، جنھوں نے برے کام کیے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی ایک کو موت آ کر حاضر ہوگئی، کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں، یہ ویسی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٨٤۔ ٨٥] ”چناں چہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو انھیں ان کے ایمان (لانے) نے کوئی نفع نہ دیا، یہی اللہ کا طریقہ ہے، جو اس کے بندوں میں گزرا اور اس (عذاب کے) موقع پر کافروں نے خسارہ اُٹھایا“ یا جس طرح کہ اہلِ ارض کے لیے توبہ قبول نہ ہونے کا حکم کیا ہے، جبکہ سورج کا مغرب کی طرف سے نکلنا دیکھ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ﴾ [الأنعام: ١٥٨] ”جس دن آپ کے رب کی بعض نشانیاں آجائیں گی تو کسی ایسے شخص کا ایمان لانا اسے فائدہ نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا، یا اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا۔“

---

[1] تفسیر الطبري (٨/ ٩٦)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] مسند أحمد (٣/ ٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٤)

توبہ ہا را نفس باز پسیں دست ز دست　　　　بیخبر دیر رسیدے در محمل بستند

”وہ توبہ (کرنے والوں) کو واپسی رجوع بہت جلد نصیب ہوتا ہے۔ (توبہ سے) بے خبر دیری کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے اسی حالت میں روک لیے جاتے ہیں۔“

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ توبہ علی الاطلاق قبول نہیں ہوتی، بلکہ بعض کی قبول اور بعض کی نا قبول ہوتی ہے۔ نظم قرآنی اسی کی وضاحت کرتا ہے۔ کسی نے کہا: توبہ کا قبول ہونا اللہ کے فضل و رحمت پر موقوف ہے۔ کسی نے کہا: توبہ کا قبول کرنا اللہ پر واجب ہے، یہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ پر بہت سے واجبات لگائے ہیں، ان سب میں ایک توبہ کو قبول کرنا بھی ہے۔ اہلِ معانی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ پر یہ وجوب کسی اور کے کہنے سے نہیں ہے، بلکہ خود اس نے اسے اپنی جان پر واجب کیا ہے، وہ جو چاہے کرے۔ اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ توبہ کرنا مومنوں پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ [النور: ۳۱] ”اور اے مومنو! تم مجموعی طور پر اللہ سے توبہ کرو۔“ جمہور کہتے ہیں کہ توبہ بعض گناہ سے اور بعض سے نہ مانگنا صحیح ہے۔ معتزلہ اس میں مخالف ہیں۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ ارشاد کہ توبہ ان کے لیے ہے، جو نادانی کی وجہ سے گناہ کر بیٹھتے ہیں مومنوں کے حق میں ہے۔[1] امام ضحاک اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اس جگہ جہالت سے مراد عمد ہے۔[2] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ جہالت یہ ہے کہ عارضی اور فنا ہو جانے والی لذت کو پائیدار اور باقی رہنے والی لذت پر اختیار کرتے ہیں۔[3] کسی نے کہا کہ عقوبت کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ ابن فورک رحمہ اللہ کا یہی قول ہے، مگر امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔[4] قریب سے مراد موت کا حاضر ہونا یا فرشتوں کو دیکھ لینا ہے یا نفس کی مغلوبیت ہے، جو نافرمانی کے فعل اور غرغرہ کے وقت کے درمیان کی مدت ہے، گو سالہا سال کی ہو۔ اس کو قریب اس لیے کہا ہے کہ ہر آنے والی چیز قریب ہوتی ہے۔ کسی نے کہا: مطلب یہ ہے کہ گناہ کے زمانے کے قریب ہی توبہ کر لیتے ہیں، اصرار نہیں کرتے (گناہ پر قائم نہیں رہتے)۔

غرغرہ یہ ہے کہ پتلی چیز بیمار کے منہ میں ڈالیں، وہ اس کو حلق میں ایرے پھیرے، مگر پیٹ کے اندر نہ اترے نہ اسے نگل سکے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے، جب روح حلقوم میں پہنچ جاتی ہے۔ کسی نے کہا: غرغرہ روح کا حلق میں اٹک جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کمالِ رحمت اور معافی کے طور پر وعدہ فرمایا کہ ہم ایسے جاہلوں کی توبہ قبول کر لیتے ہیں، جو جلد

---

[1] الدر المنثور (۲/ ۴۵۸)　[2] تفسیر الطبري (۸/ ۹۰۔ ۹۱)
[3] معاني القرآن للزجاج (۲/ ۲۹)　[4] تفسیر القرطبي (۵/ ۹۲)

توبہ کر لیتے ہیں، یعنی غرغرے سے پہلے۔ کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے معلوم کر لیا ہے کہ اس نے اس معصیت کو شہوت اور جہالت کے غلبے سے کیا ہے، اس لیے اگر توبہ کرے گا اور جلد رجوع کرے گا تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔

گناہ اور کفر پر مرنے والوں کی توبہ قبول نہیں:

پھر فرمایا: جن کی موت آ گئی اور وہ برے کام کرتے رہے، ان کی توبہ لائقِ توجہ نہیں ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت اہلِ نفاق کے حق میں اتری ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان سے مراد اہلِ شرک ہیں۔[1] امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا: مسلمان مراد ہیں، کیوں کہ اس کے بعد کفار کا ذکر کیا ہے۔[2] موت کے حاضر ہونے سے مراد موت کی علامات کا حاضر ہونا ہے اور بیمار کا حالتِ سیاق تک پہنچنا مراد ہے، یعنی غرغرے کا وقت ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ اس وقت نہ گناہ گار کی توبہ قبول ہوتی ہے نہ کافر کا ایمان مقبول ہوتا ہے۔

کہا ہے کہ صرف موت کا قریب ہونا توبہ کے قبول ہونے سے مانع نہیں ہوتا، بلکہ توبہ کی قبولیت میں مانع جو حالات ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ پھر کسی طرح بھی دنیا کی طرف لوٹنا ممکن نہیں رہتا، اس لیے فرعونَ لعین کی اس وقت کی توبہ اور ایمان جب اس کو غرق ہونے کا ادراک ہوا مقبول نہ ہوا اور نہ ان کی توبہ قبول ہے جو کافر رہ کر مرتے ہیں۔ آخرت میں عذاب دیکھ کر توبہ کرنا چاہیں گے وہ توبہ کب قبول ہو سکتی ہے۔

امام ابوالعالیہ نے کہا کہ یہ آیت اہلِ شرک کے حق میں ہے۔ امام ربیع رحمہ اللہ کا یہی قول ہے،[3] حالاں کہ ان کے لیے توبہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ ان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ موت کے حاضر ہو جانے کے وقت توبہ کی عدمِ قبولیت کے بیان کو بطورِ مبالغہ کے پیش کیا جائے، ورنہ ایسے وقت میں توبہ کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ نہ ان کی توبہ نہ ان کی توبہ۔ ان کے لیے تو دردناک عذاب ہے۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ کافر جب کفر و شرک پر مرتا ہے تو ندامت اور توبہ اس کو کچھ نفع نہیں دیتی نہ اس سے کوئی فدیہ مقبول ہوتا ہے، گو وہ زمین بھر کر مال کیوں نہ دے۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ اللہ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے اور اس کو بخش دیتا ہے، جب تک کہ پردہ میں نہ پڑے۔ پردہ پڑنا کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ جان نکلے اور وہ مشرک ہو۔[5] (رواہ أحمد) اسی لیے یہ کہا کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[6] اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٠٠۔ ٩٠١)
[2] تفسير الطبري (٨/ ١٠١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٠١)
[4] فتح البيان (٣/ ٥٥۔ ٥٨)
[5] مسند أحمد (٥/ ١٧٤) اس کی سند میں ''اسامہ اور عمر بن نعیم'' مجہول راوی ہیں۔ البتہ اس سے سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت (جو کہ زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے) مستغنی کرتی ہے۔
[6] تفسير ابن كثير (١/ ٦٠٦)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا
تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ
بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ
فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾
وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا
فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ
تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا
غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے لیے حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ، اور تم انھیں (اس مقصد سے) نہ روک رکھو کہ تم نے انھیں جو مہر دیا ہو، اس کا کچھ حصہ واپس لے لو، مگر اس صورت میں (انھیں روکنا جائز ہے) اگر وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں اور تم ان کے ساتھ اچھے طریقے سے گزر بسر کرو، پھر اگر تم ان کو ناپسند کرو تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بہتری کر دے ⑲ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو، اور تم نے ان میں سے کسی کو بہت سا مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کرتے ہوئے واپس لو گے؟ ⑳ اور تم مہر میں سے کیسے واپس لو گے، حالاں کہ تم ایک دوسرے سے ملاپ کر چکے ہو اور ان عورتوں نے تم سے پختہ عہد لیا ہے؟ ㉑ اور جن عورتوں سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہو، ان سے تم نکاح نہ کرو، مگر جو پہلے گزر گیا، سو گزر گیا، بے شک یہ بے حیائی کا کام، ناراضی کی بات اور برا طریقہ ہے ㉒

موضح القرآن کا بیان:

اس آیت میں دو حکم ہیں: ایک یہ کہ میت مرجائے تو اس کی عورت اپنے نکاح کی مختار ہے۔ میت کے بھائیوں کو اپنی زور آوری سے اسے اپنے نکاح میں لے لینا جائز نہیں اور نہ ان کو نکاح سے روکنا جائز ہے کہ عاجز ہو کر جو کچھ میت نے اس کو دیا تھا، وہ پھر آجائے، البتہ غیر شرعی بات سے ان کو روکنا جائز ہے۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ عورتوں سے تحمل کے ساتھ گزران کرے۔ اگر ان میں بعض چیز ناپسند ہو تو شاید کچھ خوبی بھی ہو۔ بدخو کے ساتھ بدخوئی

نہ چاہیے۔ پھر فرمایا: جب مرد عورت تک پہنچا تو اس کا تمام مہر لازم ہوا، اب بغیر اس کے چھوڑے نہیں چھوٹتا اور عہد گاڑھا بھی ہے کہ شرع کے حکم سے عورت مرد کے قبضے میں آئی ہے۔ پھر باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کو حرام فرمایا، مگر جو ہو چکا، یعنی کفر کے زمانے میں اس کا پرہیز نہ کرتے تھے، سو اسلام کے بعد وہ گناہ نہ رہا، آگے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ موضح القرآن کا بیان ہے۔

زبردستی عورت کا وارث بننے کی تفسیر:

بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان میں جب کوئی مرد مرجاتا تو اس کی بیوی کے حق دار اس کے اولیا ہوتے۔ اگر کوئی چاہتا، اس سے نکاح کر لیتا اور اگر چاہتے کسی اور سے نکاح پڑھا دیتے اور چاہتے تو اسے بٹھا رکھتے۔ اہلِ زن کی نسبت وہی اس کے زیادہ حق دار ٹھہرتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[1] (هكذا ذكره البخاري و أبو داود و النسائي و ابن مردويه و ابن أبي حاتم) امام ابو داؤد کے نزدیک سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مرد ذی قرابت عورت کا وارث ہوتا تھا، اس کو روکتا، یہاں تک کہ مرجائے یا مہر لوٹا دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو رد کیا۔[2] تیسری روایت یہ ہے کہ جب جاہلیت میں کسی عورت کا شوہر مرجاتا تو کوئی مرد آکر اس پر کپڑا ڈال دیتا، وہی مرد اس کا حق دار ٹھہرتا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔[3]

چوتھی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کوئی مرد مرجاتا اور بیوی چھوڑ جاتا، اس پر اس کا کوئی دوست کپڑا ڈال دیتا تو وہ لوگوں سے ممنوع ہو جاتی۔ اگر خوبصورت ہوتی تو خود اس کو بیاہ لیتا، اگر بدصورت ہوتی تو یہاں تک روکتا کہ وہ مرجاتی، پھر اس کا وارث بنتا۔[4] پانچویں روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ مدینہ میں جب کسی مرد کا کوئی دوست مرجاتا تو وہ آکر اپنا کپڑا اس کی عورت پر ڈال دیتا، اس کے نکاح کا وارث ہو جاتا۔ سوا اس کے اور کوئی اس سے نکاح نہ کرتا، وہ اس کو یہاں تک روکتا کہ وہ اس کو کچھ فدیہ دیتی، اس پر یہ آیت آئی۔[5]

زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ جاہلیت میں اہلِ یثرب میں جب کوئی شخص مرجاتا، اس کی عورت کا وہی وارث ہوتا، جو اس کے مال کا وارث ہوتا، وہ اس کو بند کر کے رکھتا، یہاں تک کہ اس کا وارث ہو یا جس سے چاہے اس کا نکاح کر دے۔ اہلِ تہامہ (مکہ کے نزدیک ایک مقام) میں مرد عورت سے برا برتاؤ کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کو طلاق

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٠٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٠٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٩٠) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (صحيح أبي داود: ٦/ ٣٢٥)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٦٠٧)

[4] تفسير الطبري (٨/ ١٠٩) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٠٢) اس کی سند حسن ہے۔

[5] تفسير الطبري (٨/ ١٠٨) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

دے دیتا اور یہ شرط کر لیتا کہ وہ نکاح نہ کرے، مگر اس شخص سے جس سے یہ چاہے، یہاں تک کہ وہ اس مال سے، جو اس کو ملا تھا، فدیہ دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس حرکتِ بے برکت سے منع فرمایا۔

جاہلیت کی رسمِ بد:

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب ابو قیس بن اسلت مر گیا، اس کے فرزند نے چاہا کہ اس کی عورت سے نکاح کرے، یہ کام جاہلیت میں کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم و ابن مردویہ)

امام عطا رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ جاہلیت میں جب کوئی مرد عورت چھوڑ کر مر جاتا، اُس کے گھر والے اس عورت کو اس بچے پر روک رکھتے، جو اُن میں ہوتا، اس پر یہ آیت آئی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: آدمی جب مرتا تو اس کا بیٹا اس کی بیوی کا زیادہ حق دار ہوتا، اگر چاہتا اس سے نکاح کر لیتا، اگر اُس کے پیٹ کا نہ ہوتا (یعنی اس کا حقیقی بیٹا نہ ہوتا) اور اگر چاہتا تو اپنے بھائی یا بھتیجے سے نکاح کر دیتا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت ابو قیس کے قصے میں اُتری ہے۔[2] غرض کہ آیت شامل ہے، جاہلیت کے اس سلسلے کے تمام افعال کو جو کسی بھی قسم کے کیوں نہ ہوں۔

عورتوں کو ضرر پہنچانے سے ممانعت:

روکنے کی ممانعت سے یہ مراد ہے کہ تم ان کو زندگی میں نقصان نہ دو کہ وہ تنگ آ کر پورا مہر یا اس کا کچھ حصہ یا اپنا بعض حق چھوڑ دیں اور قہر زدہ اور لاچار ہو جائیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ کوئی عورت کسی شخص کے پاس ہو اور وہ اس کی صحبت سے ناخوش ہو، اس کا مہر اس پر آتا ہے۔ یہ اس کو ضرر پہنچائے، تاکہ وہ مہر فدیہ میں دے دے، اس سے منع فرمایا ہے۔ یہی قول امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہ کا ہے، اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ ابن بیلمانی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ دو آیتیں ہیں: ایک امرِ جاہلیت کے حق میں اتری ہے اور دوسری امرِ اسلام میں۔ امام ابن مبارک رحمہ اللہ نے کہا کہ عورتوں کا زبردستی وارث بننا جاہلیت میں تھا اور بلا وجہ نکاح کرنے سے روکنا اسلام میں ہے۔[3]

﴿ فٰحِشَةٌ مُّبَيِّنَةٌ ﴾ کی تفسیر:

﴿ بِفٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت زنا مراد لیتی ہے۔ یعنی جب عورت زنا کرے تو تجھے حق پہنچتا ہے کہ اس سے وہ مہر واپس لے لے جو تو نے اس کو دیا ہے اور یہاں تک تو اس کو تنگ کرے کہ وہ مہر چھوڑ کر خلع کر لے، جس طرح سورت بقرہ میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۰۲۔ ۹۰۳) [2] تفسیر الطبري (۸/ ۱۰۶) [3] تفسیر الطبري (۸/ ۱۱۱۔ ۱۱۳)

افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴾ [البقرة: ۲۲۹]
''اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم انھیں جو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو الا یہ کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت فدیے میں وہ مال دے (کر خلع حاصل کر لے۔) یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو تم ان سے آگے نہ بڑھو، اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں، وہی ظالم ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ فاحشہ مبینہ سے مراد بدخوئی اور نافرمانی ہے۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت زنا، نافرمانی، بدخوئی اور بدزبانی وغیرہ کو شامل ہے،[2] یعنی یہ سب حرکات تنگ کرنے کو جائز کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے حق سے بے زار ہو جائے، سب کا سب یا بعض حق چھوڑ دے اور علاحدگی اختیار کر لے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول جید ہے۔[3] واللہ أعلم.

عورتوں کو روکے رکھنے کی تفسیر:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی سابقہ روایات اس بات کی مقتضی ہیں کہ یہ سارا حال جاہلیت کے دور کا ہے، لیکن مسلمانوں کو بھی اسلام میں اس کام کے کرنے سے منع کیا ہے۔ عبدالرحمن بن زید رحمہ اللہ نے کہا: عضل قریش مکہ میں تھا۔ مرد کسی شریف عورت سے نکاح کرتا، جب اس سے موافقت نہ آتی تو اس کو اس شرط پر جدا کر دیتا کہ وہ کسی سے اس کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے۔ پھر گواہ لا کر یہ شرط لکھوا لیتا، جب کوئی نکاح کا پیغام دینے والا آتا اور وہ عورت کچھ دے کر اس کو راضی کر لیتی، تب اس کو اجازت دیتا ورنہ بند رکھتا۔ یہ اس آیت کے معنی ہیں: ﴿ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت اس عضل کے مثل ہے، جس کا ذکر سورت بقرہ میں آیا ہے۔[4]

حسنِ معاشرت اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

معروف معاشرت کا یہ مطلب ہوا کہ تم بیویوں سے اچھی بات کہو، جہاں تک ہو سکے، اچھا برتاؤ کرو، اچھی شکل اور ہیئت سے زندگی گزارو، جس طرح کا برتاؤ ان کا اپنے ساتھ چاہتے ہو، ویسا ہی برتاؤ تم ان کے ساتھ بھی رکھو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ﴾ [البقرة: ۲۲۸] ''اور دستور کے مطابق عورتوں کے لیے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے لیے عورتوں پر ہیں۔'' اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ((خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ

[1] تفسیر الطبري (۸/ ۱۱۶۔ ۱۱۷) تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۰۴)
[2] تفسیر الطبري (۸/ ۱۱۸)
[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۶۰۸)
[4] تفسیر الطبري (۸/ ۱۱۲۔ ۱۱۳)

لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيْ»[1] ”تم میں سے بہتر وہ ہے، جو اپنے اہل کے لیے بہتر ہو اور میں تم سب سے اپنے اہل کے لیے بہتر ہوں۔“ نبی مکرم ﷺ کے اخلاق میں سے ایک یہ بات تھی کہ آپ جمیل العشرہ (اچھی صحبت رکھنے والے) دائم البشر (ہنس مکھ) تھے۔ اپنے اہل سے خوش طبعی کرتے، مہربانی برتتے، اخراجات میں اضافہ فرماتے، ہنسی دل لگی کرتے۔

ایک دفعہ محبت کے اظہار کے لیے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: مجھ سے دوڑ لگائی، میں اُن سے آگے نکل گئی، یہ بات اس وقت کی تھی، جب میں کم موٹی تھی۔ پھر دوبارہ دوڑ لگائی، جب کہ میں موٹی ہوگئی تھی تو آپ ﷺ آگے بڑھ گئے اور فرمایا: «هٰذِهِ بِتِلْكَ»[2] (یہ پچھلی دوڑ کا بدلہ ہے) اسی طرح جس کی باری ہوتی، اس کے گھر میں تمام ازواج کو جمع کر کے بعض اوقات شام کا کھانا تناول فرماتے۔ پھر ہر ایک بیوی کھانا کھا کر اپنے اپنے گھر چلی جاتی۔ اپنی بیویوں کے ساتھ ایک کپڑے میں سوتے۔ چادر اُتار کر فقط ازار میں خواب فرماتے۔

عشا کی نماز کے بعد گھر میں آ کر سونے سے پہلے بیوی سے کچھ بات چیت کرتے، تاکہ موانست (باہمی اُنس) حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب: ٢١] ”یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے۔“ کتبِ احکام میں رسول اللہ ﷺ کی اپنی عورتوں کے ساتھ رہنے اور معاشرت کی تفصیل دی گئی ہے۔[3] پھر فرمایا کہ باوجود کراہت کے، اگر تم ان کو روکے رکھو گے اور صبر کرو گے تو یہ دنیا و آخرت میں باعثِ خیرِ کثیر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ خیر یہ ہے کہ شاید اولاد عطا ہو اور اس بچے میں خیرِ کثیر ہو۔[4] صحیح حدیث میں مروی ہے کہ کوئی مومن کسی مومنہ سے دشمنی نہ رکھے، اگر اس کی کوئی عادت اسے ناپسند ہو تو کوئی دوسری عادت پسند ہوگی۔[5]

بیوی تبدیل کرنے کے لیے پہلی سے حق مہر واپس لینے کی ممانعت اور زیادہ حق مہر کی دلیل:

پھر یہ فرمایا کہ اگر عورت کو بدلنا چاہے تو جو مہر پہلی عورت کو دیا ہے، گو وہ بہت سا مال کیوں نہ ہو، اس کو واپس نہ لے، یہ آیت بہت سا مال مہر دینے کی دلیل ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مہر کی کثرت سے منع کیا تھا۔ کہا: عورتوں کے مہر میں گرانی نہ کرو، اگر یہ بات دنیا میں بزرگی کی علامت ہوتی یا اللہ کے نزدیک تقوے کی علامت ہوتی تو اس پر سب سے زیادہ عمل کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہوتے۔ آپ ﷺ نے تو اپنی کسی بیوی یا بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں کیا تھا۔ آدمی عورت کے مہر میں مبتلا ہو کر اس کا دشمن ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تیرے سبب

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٧٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣١٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٧٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٠٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣١)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٠٨۔ ٦٠٩) [4] تفسير الطبري (٨/ ١٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٠٥) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٦٩)

سے مشکل ومحنت میں پڑا۔ (رواه أحمد و أهل السنن) ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ①

حافظ ابو یعلی رحمہ اللہ نے مسروق رحمہ اللہ سے یہ روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھے اور کہا: اے لوگو! تم نے عورتوں کے مہر میں بہت اکثار کیا (اضافہ کیا)، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں مہر چار سو درہم یا اس سے کم کا ہوتا تھا۔ اگر اس اکثار میں کچھ اللہ کا تقویٰ یا کوئی کرامت ہوتی تو تم ان سے سبقت نہ کر سکتے۔ اب میں نہ دیکھوں کہ کسی آدمی نے چار سو درہم سے زیادہ عورت کا مہر مقرر کیا ہے۔ پھر منبر سے نیچے اترے، ایک قریشی عورت سامنے آئی اور کہا: امیر المومنین! کیا تم نے لوگوں کو منع کیا کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کریں؟ کہا: ہاں، کہا: تم نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا نازل کیا ہے؟ پوچھا: کیا؟ کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ﴾ کہا: "اَللّٰهُمَّ غُفْرًا كُلُّ النَّاسِ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ" "اے اللہ! معاف کر دے، سارے لوگ عمر سے بڑے فقیہ ہیں!" پھر منبر پر آ کر کہا: اے لوگو! میں نے تم کو چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع کیا تھا، اب جو جتنا مال چاہے دے۔ امام ابو یعلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں کہ یوں کہا: "فَمَنْ طَابَتْ نَفْسُه فَلْيَفْعَلْ" "جس کا نفس خوش ہو تو وہ ایسا کرے" اس حدیث کی اسناد جید ہے۔ ②

اس اثر کی دوسری روایت کے الفاظ ابو عبدالرحمٰن سلمی رحمہ اللہ سے اس طرح ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم عورتوں کے مہر میں گرانی نہ کرو۔ ایک عورت نے کہا: اے عمر! بات یوں نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وآتيتم إِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا مِنْ ذَهَبٍ" سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت اسی طرح ہے: "فَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک عورت نے عمر سے جھگڑا کیا، وہ جیت گئی۔ ③ یہ اثر اور طرح پر بھی مروی ہے، اس میں انقطاع ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم وہ مہر عورت سے کس طرح لے سکتے ہو، حالاں کہ تم اس کے پاس جا چکے ہو، وہ تمھارے پاس آ چکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور سدی رحمہم اللہ نے کہا کہ اس جگہ افضاء سے مراد جماع ہے۔ ④

لعان کی صورت میں حق مہر کا مسئلہ:

صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاعُن سے فارغ ہو کر مُتلاعِنین سے فرمایا کہ اللہ جانتا ہے کہ تم

---

① مسند أحمد (١/ ٤٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٠٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١١٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٤٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [إرواء الغليل: ٦/ ٣٤٧]

② سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٢٣٣) المطالب العالية (٨/ ٩٤) اس کی سند میں "مجالد بن سعید" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٣٤٧۔ ٣٤٨)

③ مصنف عبد الرزاق (٦/ ١٨٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی رحمہ اللہ کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٣٤٨)

④ تفسير الطبري (٨/ ١٢٦)

میں سے ایک جھوٹا ہے، کوئی تم میں سے توبہ کرنے والا ہے؟ تین بار یوں ہی فرمایا۔ مرد نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے میرا مال ملے، یعنی جو اس عورت کو مہر میں دیا ہے۔ فرمایا: تجھ کو مال نہیں ملے گا، اگر تو سچا ہے تو وہ استحلالِ فرج کے عوض گیا اور اگر تو جھوٹا ہے تو وہ مال اور بھی زیادہ تجھ سے دور تر ہو گیا۔[1]

سیدنا نضرہ رضی اللہ عنہ نے ایک کنواری لڑکی سے، جو پردہ نشین تھی، نکاح کیا، ناگاہ وہ زنا سے حاملہ ثابت ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ سے آ کر کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا مہر دے دے اور دونوں میں تفریق ڈال دی، عورت کو کوڑے لگائے گئے۔ فرمایا: بچہ تیرا غلام ہے، مہر مقابلہ بضع، یعنی شرم گاہ کے عوض ہے۔[2] (رواه أبو داود وغيره) اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ﴿ وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾.

میثاقِ غلیظ کی تفسیر:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے نزدیک میثاقِ غلیظ سے مراد عقدِ نکاح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ مراد اِمساکِ بمعروف یا تسریحِ باحسان ہے (یعنی معروف کے مطابق روکنا یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا)۔ اسی طرف امام عکرمہ، مجاہد، ابو العالیہ، حسن، قتادہ، یحییٰ ابن ابی کثیر، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ بھی گئے ہیں۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: مراد یہ قول ہے: "أَخَذْتُمُوْهُنَّ بِأَمَانَةِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ" "تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا اور اللہ کے کلمے کے ساتھ ان کی شرم گاہوں کو حلال کیا۔" کلمہ خطبۂ نکاح کا یہی تشہد ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو شبِ معراج میں یہ بھی کہا تھا: "وَجَعَلْتُ أُمَّتَكَ لَا تَجُوْزُ لَهُمْ خُطْبَةٌ حَتّٰى يَشْهَدُوْا إِنَّكَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ"[3] (رواه ابن أبي حاتم) "میں نے تیری امت کے لیے قرار دیا ہے کہ ان کا کوئی خطبہ جائز نہیں، حتی کہ وہ یہ گواہی نہ دیں کہ تو میرا بندہ اور رسول ہے۔" سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے خطبہ حجۃ الوداع میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوْهُنَّ... الخ»[4] (رواه مسلم) "عورتوں کی خیر چاہو...۔"

باپ کی بیوی سے نکاح کی حرمت:

پھر اللہ پاک نے باپوں کی بیویوں کو بیٹوں پر آبا کی عظمت اور احترام کی وجہ سے حرام فرمایا۔ صرف نکاح کی بنا پر وہ عورت بیٹے پر حرام ہو جاتی ہے، اس پر اجماع ہے۔ ایک انصاری نے کہا: جب ابوقیس بن اسلت مر گئے اور وہ انصار میں بہت صالح تھے۔ ان کے بیٹے قیس نے ان کی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا، اس نے کہا: میں تو تجھے بیٹے کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٩٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣١) یہ روایت مرسل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ٢/ ٢١٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٠٨_ ٩٠٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)

طرح گنتی ہوں اور تو اپنی قوم میں صالح ہے، لیکن میں رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتی ہوں۔ پھر آ کر کہا کہ ابوقیس مرگئے، نبی اکرم ﷺ نے ان کو اچھا کہا۔ اس نے عرض کی کہ ان کا بیٹا قیس مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور اپنی قوم میں صالح ہے، میں اس کو بیٹے کی طرح جانتی ہوں، آپ کیا حکم فرماتے ہیں؟ کہا: اپنے گھر جا۔ پھر یہ آیت اتری: ﴿ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ آیت ابوقیس رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری ہے۔ ان کی بیوی کا نام ضمرہ تھا۔[2] کسی نے کہا: فاختہ بنت اسود کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ سہیلی رحمہ اللہ نے خیال کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرنا معمول تھا۔ اسی لیے ﴿ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ﴾ فرمایا ہے۔ جس طرح اختین (دو بہنوں) کے جمع کرنے میں بھی یہی کلمہ ارشاد کیا ہے۔

کنانہ بن خزیمہ نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا، اس سے نضر بن کنانہ پیدا ہوئے۔ حالاں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: «وُلِدْتُ مِنْ نِكَاحٍ لَا مِنْ سِفَاحٍ»[3] ''میری پیدائش نکاح سے ہوئی، زنا سے نہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ ان میں یہ بات جائز تھی، وہ اس کو نکاح سمجھتے تھے نہ کہ سفاح۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اہلِ جاہلیت اللہ کے حرام کو حرام جانتے، مگر باپ کی بیوی اور دو بہنوں کو جمع کرنے کو حلال سمجھتے تھے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ اسی طرح امام عطا اور قتادہ رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے۔[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: لیکن جو قصہ کنانہ کا سہیلی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، اس میں نظر ہے۔[6] واللہ أعلم.

باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کی شناعت اور ایسا کرنے والے کی سزا:

غرض کہ اس اُمت میں ہمہ وقت ایسا نکاح حرام، نہایت درجہ قبیح اور نا قابلِ قبول ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو فاحشہ، مقت اور برا راستہ فرمایا اور کہا کہ تم فواحش کے نزدیک بھی نہ جاؤ، وہ کھلے ہوں یا چھپے اور کہا: پاس نہ جاؤ زنا کے کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے، اس جگہ لفظِ مقت، یعنی بغض زیادہ کیا۔ یعنی فی نفسہٖ ایک امرِ کبیر ہے، اس کا انجام بیٹے کا باپ سے بغض ہے، کیوں کہ غالب یہ ہے کہ جو کوئی کسی عورت سے نکاح کرتا ہے تو اس کے پہلے شوہر کو دشمن رکھتا ہے، اسی طرح بیٹا باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کے بعد باپ کا دشمن ہو جائے گا، اسی سبب سے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٠٩) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١٦١) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز سند میں ''اشعث بن سوار'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (٨/ ١٣٣)

[3] المعجم الكبير (١٠/ ٣٢٩، سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١٩٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٣٢٩)

[4] الروض الأنف (١/ ٣٧٩) [5] تفسير الطبري (٨/ ١٣٢۔ ١٣٥) [6] تفسير ابن كثير (١/ ٦١١)

اُمہاتِ مومنین اُمتِ اسلام پر حرام ہیں، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ اُمت کے باپ کی طرح ہیں، آپ کی بیویاں ساری اُمت کی مائیں ہیں، بلکہ نبی اکرم ﷺ کا اُمت پر حق باپ کے حقوق سے بھی بہت بڑا ہے باجماع امت، بلکہ آپ ﷺ کی محبت تمام لوگوں کی محبت پر مقدم ہے۔ صلوات اللہ وسلامه عليه۔

امام عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ نے ﴿مَقْتًا﴾ کے معنی یوں کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کام پر دشمنی رکھتا ہے۔ ﴿وَسَآءَ﴾ کے معنی ہیں: چلنے والے کے لیے برا راستہ ہے۔[1] جو کوئی اس کے بعد اس راستے پر چلے گا، وہ دین سے مرتد ہو جائے گا، اس کو قتل کریں گے، اس کا مال بیت المال میں بطورِ فئی داخل کیا جائے گا۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے چچا یا ان کے ماموں کو رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کی طرف بھیجا تھا، جس نے اپنے باپ کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کیا تھا کہ اس کو قتل کر دے اور اس کا مال لے لے۔[2] (رواه أحمد و أهل السنن)

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مجھ پر میرے چچا حارث بن عمیر گزرے، ان پر ایک نشان تھا۔ میں نے کہا: اے چچا! تم کو رسول اللہ ﷺ نے کدھر بھیجا ہے، کہا: ایک مرد کی طرف جس نے اپنے باپ کی بیوی کو اپنی بیوی بنایا ہے، مجھ کو حکم ہے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔[3]

مسئلہ:

اس عورت کی تحریم پر علما کا اجماع ہے، جس سے باپ نے نکاح یا مِلک یا شبہ کے ذریعے سے وطی (مجامعت) کی ہے۔ اس عورت کے بارے میں اختلاف ہے، جس سے مباشرت بہ شہوت کی ہے، مگر جماع نہیں کیا یا جس چیز کا دیکھنا حلال نہ تھا، وہ دیکھی ہے، اگر وہ عورت اجنبی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ بھی حرام ہے۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ''ترجمہ خدیج حمصی مولیٰ معاویہ'' میں ذکر کیا ہے کہ اس نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے ایک سفید، خوبرو، لونڈی خرید کر بھیجی، وہ ننگی تھی۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس سے متاع جاریہ کو چھوا۔ پھر کہا: یہ بہت اچھی ہے، اگر میرے پاس متاع ہوتی، اس کو یزید بن معاویہ کے پاس لے جاؤ۔ پھر کہا: نہیں ربیعہ بن عمرو حرسی کو بلاؤ۔ وہ فقیہ تھے، آئے۔ اس نے کہا: یہ جاریہ میرے پاس ننگی آئی ہے، میں نے اس کے یہ اعضاء دیکھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو یزید کے پاس بھیج دوں۔ کہا: ایسا نہ کرو، یہ اس کے لائق نہیں ہے۔ کہا: تم نے اچھا کہا، پھر حکم دیا کہ عبداللہ بن مسعدہ فزاری کو بلاؤ، وہ بہت سخت گندم گوں تھے۔ کہا: اس لونڈی کو لے جاؤ اپنی اولاد کو گورا چٹا بناؤ۔ یہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩١٠)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٩٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٥٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٦٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٣١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٠٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٨/ ٢٣)

[3] مسند أحمد (٤/ ٢٩٢) اس کی سند میں ''اشعث بن سوار'' ضعیف راوی ہے۔

فزاری وہ ہیں کہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحب زادی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تھا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کو پال کر آزاد کر دیا تھا۔ پھر وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ پر رہا کرتا۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا بیان تمام ہوا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں آیتِ باب کی تفسیر اس طرز پر کی ہے کہ اس آیتِ شریفہ میں عورتوں کی وراثت سے زبردستی سے منع کیا ہے، ان کے عضل سے بعض مال واپس لینے سے منع کیا ہے۔ اولیا کو خطاب ہے اور بعض نے کہا: شوہروں کو خطاب ہے کہ ان کو برے طریقۂ معاشرت (یعنی سختی) سے اس طمع کے ساتھ نہ رکھو کہ وہ تنگ آ کر مہر کا کچھ حصہ چھوڑ دیں۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[3] ہاں اگر وہ بے حیائی کرے تو بھی ولی کو جائز نہیں کہ وہ اسے بند رکھے، تا کہ اس کا مال لے سکے، اس پر اُمت کا اجماع ہے، بلکہ شوہر کو یہ حق پہنچتا ہے، لیکن قابلِ ترجیح یہ بات ہے کہ پہلا خطاب اولیا کو ہے۔

دوسرا خطاب شوہروں کو ہے، جس نے اس کے برعکس کہا وہ متعسف (ظالم) ہے، بلکہ زیادہ قابلِ ترجیح یہ بات ہے کہ یہ دونوں خطاب اہلِ اسلام کو ہیں کہ تمھارے لیے یہ دونوں باتیں صحیح نہیں، اگر وہ بدکاری کریں تو تم ان سے کچھ لے کر خلع کر لو۔ معروف معاشرت سے مراد وہ بات ہے جو شریعت میں معروف و مشہور ہے اور گھر والوں میں معمول اور دستور ہے۔ یہ خطاب بھی شوہروں کو ہے یا سب مسلمانوں کو مگر یہ عشرت شوہروں کے حالات خوشحالی، تنگ دستی، رفاقت و رضاعت کے مختلف درجوں کے پیشِ نظر مختلف ہوتی ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: معاشرت سے مراد مخالطت ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: اس میں تصحیف ہوئی ہے۔ اصل لفظ مخالقت ہے۔[4] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: عورت کا تجھ پر یہ حق ہے کہ اس کے ساتھ اچھی مصاحبت رکھو، اس کو دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا وغیرہ فراہم کرو۔[5] پھر اگر تمھیں اس کی کوئی بات کسی سبب سے بری لگے، سوائے بے حیائی اور بدخوئی کے، تو کیا عجب ہے کہ بالآخر وہ کراہت دور ہو جائے اور وہ وحشت محبت میں بدل جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا ذرا سی ناخوشی و کراہت پر نفرت نہ کرو، بلکہ صبر کرو۔ قریب ہے کہ اس صبر سے خیرِ کثیر مل جائے۔ صحبت گہری ہو، اولاد پیدا ہو یا مراد یہ ہے کہ جب کراہت کے باوجود صبر کیا، خرچ کیا، اچھا برتاؤ رکھا، اللہ تعالیٰ سے ثواب چاہا تو دنیا میں اچھی شہرت حاصل ہوئی اور آخرت میں بڑا ثواب حاصل ہوا۔ یہ خیرِ کثیر ہے۔ قنطار سے مراد مالِ کثیر ہے۔ آیت مہر زیادہ رکھنے پر دلیل ہے۔

---

[1] تاریخ دمشق (١٢/ ٢٣٨۔ ٢٣٩) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦١١۔ ٦١٢) [3] تفسیر القرطبي (٥/ ٩٥)

[4] تفسیر الطبري (٨/ ١٢١۔ ١٢٢) الدر المنثور (٢/ ٤٦٥) [5] الدر المنثور (٢/ ٤٦٥)

پھر مہر واپس لینے سے منع کیا۔ کسی نے کہا: یہ آیت محکم ہے۔ کسی نے کہا: منسوخ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے پیش نظر: ﴿ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴾ [البقرة: ٢٢٩] ”اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم انھیں جو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو الا یہ کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت فدیے میں وہ مال دے (کر خلع حاصل کر لے۔) یہ اللہ کی حدیں ہیں، سوتم ان سے آگے نہ بڑھو، اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں، وہی ظالم ہیں۔“

زیادہ صحیح یہ ہے کہ دونوں آیتیں محکم ہیں۔ وہاں سورت بقرہ میں مراد مختلعہ (خلع لینے والی) ہے اور یہاں غیر مختلعہ۔ کسی نے کہا: آیت کے معنی یوں ہیں کہ اگر سوئے معاشرت شوہر کی طرف سے ہو اور وہ طلاق دینا چاہے تو اس کو صحیح نہیں کہ اس کے مہر سے کچھ بھی لے اور اگر عورت کی طرف سے نافرمانی یا بدخوئی وغیرہ ہو تو شوہر کو لینا درست ہے۔ امام کلبی اور ہروی رحمہ اللہ نے کہا: اِفضا یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک لحاف میں ہوں، جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ فراء کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ افضا مرد و عورت کا تخلیہ ہے، اگرچہ جماع نہ کیا ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، شافعی اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا: افضا سے مراد جماع ہے،[1] لغت میں اصل افضا بہ معنی مخالطت ہے۔ عہدِ غلیظ سے مراد عقد ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب نکاح کرتے تو کہتے: ”نَكَحْتُكِ عَلٰى مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ إِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ“[2] ”میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی بنیاد پر تیرے ساتھ نکاح کرتا ہوں کہ معروف کے مطابق روکے رکھنا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا۔“ پھر اللہ تعالیٰ نے آبا کی بیویوں سے نکاح حرام فرمایا، اس حرکتِ بے برکت پر بہت زیادہ سخت تنبیہ اور ممانعت کی، تاکہ آیندہ کے لیے محرمات کے نکاح کا یہ طریقہ رواج نہ پاسکے، کیوں کہ وہ اس تعاطی (معمول بنانے) پر مصر تھے اور یہ بات معلوم ہے کہ مصاہرت سے چار عورتیں حرام ہو جاتی ہیں: ایک باپ کی بیوی، دوسرے بیٹے کی بیوی، تیسری ساس اور چوتھی بیوی کی بیٹی۔ ان چاروں میں صرف نکاح کی وجہ سے حرمت واقع ہو جاتی ہے، اگرچہ دخول نہ ہو۔ مگر ربیبہ (بیوی کی سابقہ شوہر سے بیٹی) کہ وہ حرام نہیں ہوتی، مگر اس شرط سے کہ اس کی ماں سے دخول ہوا ہو۔

یہ بات آیات سے واضح ہوتی ہے، کیوں کہ دخول کی قید اللہ تعالیٰ نے فقط ربیبہ میں فرمائی ہے۔ بیٹے کا اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کو تین صفتوں سے یاد فرمایا ہے: ایک فاحشہ ہونا، یہ مرتبہ عقلی لحاظ سے اس کی

---

[1] تفسير القرطبي (٥/ ١٠٢) [2] مصنف ابن أبي شيبة (٣/ ٤٦٣)

قباحت ظاہر کرتا ہے۔ دوسری صفت مقت ہے، اس سے شرعی لحاظ سے اس کی قباحت ظاہر ہوتی ہے اور تیسری صفت سُوء السبیل ہے، یہ معاشرتی قباحت کا مرتبہ ہے۔ جس میں یہ تمام مراتب جمع ہوئے، سمجھو کہ وہ قباحت کے بہت بڑے مرتبے میں واقع ہے۔[1]

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٢٣﴾

تم پر حرام کی گئی ہیں تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور تمھاری بھتیجیاں اور تمھاری بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں، اور تمھاری بیویوں کی مائیں اور تمھاری وہ سوتیلی بیٹیاں جو تمھارے ہاں پرورش پائیں اور ان عورتوں کے پیٹ سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہو، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمھارے صُلبی بیٹوں کی بیویاں اور تمھارا دو بہنوں کو جمع کرنا (بھی حرام ہے) مگر جو پہلے گزر گیا سو گزر گیا۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿23﴾

سات حرام ناتے:

موضح القرآن میں ہے کہ سات ناتے حرام فرمائے: ایک ماں، اس میں نانی اور دادی داخل ہے، یعنی جو عورت اس شخص کی جڑ ہے۔ دوسری بیٹی، اس میں نواسی اور پوتی داخل ہے، یعنی جو اس کی شاخ ہے۔ تیسری بہن۔ چوتھی بھتیجی۔ پانچویں بھانجی، یعنی جو اس کے ماں باپ میں ملتی ہے۔ چھٹی پھوپھی۔ ساتویں خالہ یعنی جو ماں باپ سے اوپر ملتی ہے، بشرطیکہ بلاواسطہ ملتی ہو اور جو واسطے سے ملے، وہ حلال ہے، جیسے پھوپھی کی بیٹی۔ دودھ کے دو ناتے فرمائے: ماں اور بہن، اس میں اشارہ ہے کہ ساتوں ناتے اس میں بھی حرام ہیں۔ سسرال کے چار ناتے فرمائے: عورت کو مرد کی جڑ اور شاخ اور مرد کو عورت کی جڑ اور شاخ، مگر شاخ جب حرام ہے کہ نکاح کے بعد صحبت بھی ہوئی ہو اور جڑ فقط نکاح

[1] فتح البیان (۳/ ۵۹۔ ٦٧)

سے حرام ہے۔ دودھ سے بھی یہ چار ناتے حرام ہوئے، لیکن دودھ پینا وہ معتبر ہے کہ اُسی عمر میں پیے، بڑی عمر میں پینا معتبر نہیں۔ اس جگہ ناتا سگا اور سوتیلا اور اخیافی سب برابر ہے اور دودھ میں بھی سوتیلا ناتا معتبر ہے۔

اس کے بعد دو بہنوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا۔ اس اشارے سے معلوم ہوا کہ ساتوں ناتوں کا جمع کرنا حرام ہے اور سسرال کے ناتوں میں جمع کرنا حرام نہیں ہے۔ آخر میں نکاح بندھی عورت حرام فرمائی، یعنی ایک کے نکاح میں ہے تو ہر کسی کو اس کا نکاح حرام ہے، مگر یہ کہ اپنی مِلک ہو جائے۔ اس کی صورت یہ کہ کافر مرد اور عورت میں نکاح تھا، وہ عورت قید میں آئی، جس کو پہنچی اس کو حلال ہے۔ دودھ کا ناتا یا سسرال کا مرد کو اپنی لونڈی سے ہے تو مِلک میں بھی اس کی صحبت حرام ہے۔ یہ جو فرمایا کہ تمھارے بیٹوں کی عورتیں، جو تمھاری پشت سے ہیں، یعنی لے پالک کو بیٹا نہ جانو، کسی بھی حکم کے تحت وہ بیٹا نہیں۔

شادی کی چار شرائط:

جو عورتیں حرام فرما دیں، ان کے سوا سب چار شرطوں سے حلال ہیں: اول یہ کہ طلب کرو، یعنی زبان سے ایجاب و قبول درمیان آئے۔ دوسرے یہ کہ مال دینا قبول کرو، یعنی مہر۔ تیسرے یہ کہ قید میں لانے کی طرح ہو، مستی نکالنے کی نہ ہو، یعنی ہمیشہ کے لیے وہ عورت اُس مرد کی ہو جائے، اُس کے چھوڑے بغیر نہ چھوٹے، یعنی مدت کا ذکر نہ آئے کہ مہینے تک یا برس تک، اس سے متعہ حرام ٹھہرا۔[1] چوتھی شرط سورت مائدہ میں فرمائی اور یہاں بھی لونڈیوں کے نکاح میں آگے فرمائی ہے کہ چھپی یاری نہ ہو، لوگ گواہ ہوں، کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں۔

پھر فرمایا جو عورت کام میں آئے، اس کا مہر پورا دینا پڑا۔ کام میں آئی، یعنی صحبت ہوئی یا خلوت ہوئی، اب کسی طرح مہر نہیں چھوٹتا۔ جب تک کام میں نہیں آئی تو اگر مرد چھوڑ دے تو آدھا مہر دے اور اگر عورت ایسا کام کرے کہ نکاح ٹوٹ جائے تو سب مہر اُتر گیا۔ پھر فرمایا کہ مہر مقرر کرنے کے بعد جو دونوں اپنی خوشی سے بڑھا دیں یا گھٹا دیں تو وہ بھی معتبر ہے۔ موضح القرآن کا بیان تمام ہوا۔

ابدی اور غیر ابدی حرام رشتوں کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ ان تمام محارم کا ذکر کرتی ہے جو نسب سے حرام ہیں اور نسب کے تابع ہیں، جیسے: رضاع یا سسرال۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ تم پر سات عورتیں نسب سے اور سات

---

[1] مروجہ حلالہ بھی اس لیے ناجائز اور ملعون کام ہے کہ اس میں یہ شرط یا نیت ہوتی ہے کہ چند راتوں کے بعد میں اس کو طلاق دے دوں گا، تاکہ یہ زوجِ اول کے لیے حلال ہو جائے۔ اس طرح یہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ گو علمائے احناف اس کے انعقاد کے قائل ہیں۔ حقیقت میں یہ حلالہ بھی شیعوں کے متعے کی طرح حرام ہے۔ [ص۔ ی]

سسرال سے حرام ہیں، پھر یہ آیت پڑھی۔[1] جمہور علما نے لفظ ﴿ بَنَاتُكُمْ ﴾ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جو زانی کے پانی، یعنی منی سے پیدا ہوئی ہے، وہ اُس زانی پر حرام ہے، کیوں کہ لفظِ قرآن عام ہے اور وہ اس کی بیٹی ہے تو اس عموم میں داخل رہے گی۔ امام ابوحنیفہ و مالک و احمد رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے اس کا کچھ جواز نقل کیا گیا ہے، کیوں کہ وہ شرعی بیٹی نہیں ہے۔ سو جس طرح بنتِ زنا آیتِ کریمہ: ﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ... ﴾ میں داخل نہیں ہے اور وہ بالاجماع وارث نہیں ہوتی، اسی طرح اس آیت میں بھی داخل نہیں ہے۔[2] واللّٰه أعلم.

دودھ سے حرام کرنے کی مقدار اور مدت:

پھر حقیقی ماں اور دودھ کی ماں کا ایک ہی حکم رکھا۔ صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ رضاعت اس کو حرام کرتی ہے، جس کو ولادت حرام کرتی ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ رضاعت سے حرام ہے وہ جو نسب سے حرام ہے۔[3] بعض فقہا نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جو نسب سے حرام ہے، وہ رضاعت سے حرام ہے، مگر چار صورت میں اور بعض نے کہا ہے کہ چھے صورت میں، جو کتبِ فروع میں مذکور ہیں، مگر تحقیق یہ ہے کہ کوئی چیز رضاعت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ کیوں کہ بعض صورتوں کا مثل نسب میں بھی پایا جاتا ہے اور بعض صورتیں سسرال کی طرف سے حرام ہوتی ہیں تو پھر حدیث پر ہرگز کوئی شے وارد نہیں ہوسکتی۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَ بِهِ الثِّقَةُ.

پھر ائمہ نے حرام کرنے والی رضاعت کی تعداد میں اختلاف کیا ہے۔ کچھ ادھر گئے ہیں کہ اس آیت کی عمومیت کی وجہ سے صرف رضاع سے حرمت ہوجاتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر اور زہری رحمہم اللہ کا مذہب بھی اسی طرح ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ تین دفعہ دودھ پلانے سے کم تعداد، حرام نہیں کرتی۔ کیوں کہ صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا تُحَرِّمُ الْمَصَّةُ وَلَا الْمَصَّتَانِ» یعنی ایک بار یا دو بار کا چوسنا حرام نہیں کرتا۔ ام الفضل رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «لَا تُحَرِّمُ الرَّضْعَةُ وَلَا الرَّضْعَتَانِ» دوسرے الفاظ اس طرح ہیں: «لَا تُحَرِّمُ الْإِمْلَاجَةُ وَلَا الْإِمْلَاجَتَانِ»[4] (رواہ مسلم). یہی امام احمد، اسحاق، ابو عبید اور ابو ثور رحمہم اللہ کا مذہب ہے اور یوں ہی سیدہ عائشہ، ام الفضل، سیدنا علی، ابن الزبیر رضی اللہ عنہم، امام سلیمان بن یسار اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ سے مروی ہے۔

دوسروں نے کہا ہے کہ پانچ رضعات سے کم میں تحریم نہیں ہوتی۔ صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قرآن میں یوں اُترا تھا: "عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَّعْلُوْمَاتٍ يُّحَرِّمْنَ" پھر وہ خمس رضعات سے منسوخ ہوگیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۱۱) اس کی سند صحیح ہے۔ [2] تفسیر ابن كثير (۱/ ٦١٢)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۰۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٤٤٥) [4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٤٥٠۔ ۱٤٥۱)

نے وفات فرمائی اور قرآن میں اسی طرح پڑھا جاتا تھا۔[1] (وروىٰ عبد الرزاق عنها نحو ذلك) سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا کے بارے میں حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو حکم دیا کہ ابو حذیفہ کے مولیٰ سالم کو پانچ رضعات پلا دے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جس کسی کو اپنے پاس آنا چاہتیں، اس کو فرماتیں کہ وہ پانچ رضعات پی لیے۔[2]

امام شافعی اور اصحابِ شافعی اسی طرف گئے ہیں۔ پھر ضروری ہے کہ رضاعت مذکور چھوٹی عمر، یعنی دو برس سے کم عمر میں ہو۔ اس مسئلے میں جمہور کے قول پر کلام سورت بقرہ میں گزر چکا ہے۔[3] پھر اس میں اختلاف ہے کہ آیا نر کا دودھ بھی مُحرم ہے یا نہیں۔ جمہور ائمہ اربعہ وغیرہم کا قول یہی ہے کہ محرم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ رضاع ماں کے ساتھ مختص ہے، فقط ناحیہ باپ کی طرف منتشر نہیں ہوتا۔ بعض سلف کا قول یہی ہے۔ کتاب الاحکام الکبیر میں اس مسئلے کی تحریر ہے۔[4]

ساس کی حرمت اور ربیبہ کی حرمت:

بیوی کی ماں یعنی ساس صرف اس کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرتے ہی حرام ہو جاتی ہے، خواہ اس سے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ رہی ربیبہ جو بیوی کی بیٹی ہے، وہ حرام نہیں، یہاں تک کہ اس کی ماں سے دخول کیا ہو، پھر اگر ماں کو دخول سے پہلے طلاق دے دی تھی تو اس کی بیٹی سے آیتِ باب کے مطابق نکاح کرنا جائز ہے اور یہ حکم ربائب کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعض نے یہ سمجھا ہے کہ ضمیر اُمہات اور ربائب کی طرف لوٹتی ہے، معنی یہ ہیں کہ نہ ماں نہ بیٹی، صرف عقد کرنے سے ایک دوسری پر حرام نہیں ہے، جب تک کہ اُس سے دخول نہ کر لے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا: ایک آدمی نے ایک عورت سے نکاح کیا، پھر اُس کو دخول سے پہلے طلاق دی، اب اُس عورت کی ماں سے بیاہ کر سکتا ہے؟ کہا: ہاں، وہ بمنزلہ ربیبہ ہے۔ (رواه ابن جرير) اسی طرح سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی اس کو "لَا بَأْسَ بِهٖ" کہا ہے۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب عورت مر گئی اور اس کی میراث لی تو مکروہ ہے کہ اُس کی ماں پر خلیفہ ہو۔ ہاں اگر دخول سے پہلے طلاق دے دی ہے تو نکاح کر سکتا ہے، اگر چاہے نکاح کر لے۔[5]

بکر بن کنانہ نے کہا ہے کہ اس کے باپ نے طائف میں اس کا نکاح ایک عورت سے کر دیا تھا، کہا: میں نے اس سے جماع نہیں کیا، یہاں تک کہ میرا چچا اُس کی ماں کو چھوڑ کر مر گیا اور وہ ماں بڑی مالدار تھی۔ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا اور اُس حال سے خبر دی، کہا: ہاں تو اُس کی ماں سے نکاح کر لے۔ پھر سیدنا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٢) مصنف عبد الرزاق (٧/ ٤٦٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٣) مسند أحمد (٦/ ٢٧٠)

[3] سورة البقرة [آيت: ٢٣٣]

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٦١٣)

[5] تفسير الطبري (٨/ ١٤٤۔ ١٤٥)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا، کہا: نکاح نہ کر، میں نے باپ سے ذکر کیا، انھوں نے سیدنا معاویہ کو لکھا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہیں کرتا تو جان تیرا کام، عورتیں بہت ہیں، سو نہ منع کیا اور نہ اجازت دی۔ آخر باپ نے اُس کی ماں سے انکار کیا، میرا نکاح اس سے نہ پڑھایا۔[1] ابن الزبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ربیبہ اور ماں برابر ہیں، کچھ ڈر نہیں ہے، اگر عورت سے دخول نہیں کیا ہے،[2] مگر اس کی اسناد میں ایک مبہم راوی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امہات و ربائب سب میں ارادۂ دخول کیا گیا ہے۔[3] شافعیہ میں صابونی رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بھی یوں تھا، پھر اُس سے رجوع کیا۔ جمہور علما اس پر ہیں کہ ربیبہ ماں کے ساتھ عقد سے حرام نہیں ہوتی، بخلاف اُم کے کہ وہ صرف عقد سے حرام ہو جاتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب مرد نے دخول سے پہلے طلاق دی یا مرگئی تو اس کی ماں حلال نہیں، وہ مبہم ہے اس کے ساتھ نکاح کو مکروہ جانا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عمران بن حصین رضی اللہ عنہم، امام مسروق، طاؤس، عکرمہ، عطا، حسن، مکحول، ابن سیرین، قتادہ اور زہری رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[4] ائمہ اربعہ وفقہاے سبعہ و جمہور فقہا کا قدیماً اور حدیثاً یہی مذہب ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.[5]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شخص کا قول درست ہے، جس نے کہا ہے کہ ام مبہمات میں سے ہے، کیوں کہ اللہ نے اس کے ساتھ دخول کو شرط نہیں کیا، جس طرح ربائب کی امہات کے ہمراہ شرط کیا ہے، حالاں کہ یہ بھی حجت کا اجماع ہے کہ متفق علیہ میں اس کے خلاف جائز نہیں ہے۔ اس بارے میں ایک غریب خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے، مگر اُس کی اسناد میں نظر ہے، اس قول کی صحت پر حجت کا اجماع اس بات سے مستغنی ہے کہ اس کی صحت پر غیر سے استشہاد کیا جائے۔[6]

ربیبہ حرام ہے خواہ آدمی کی زیرِ پرورش ہو یا نہ ہو:

جمہور کہتے ہیں کہ ربیبہ حرام ہے، خواہ مرد کی گود میں ہو یا نہ ہو۔ یہ خطاب ﴿فِيْ حُجُوْرِكُمْ﴾ کا خارج مخرج غالب ہے، اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ [النور: ۳۳] ”اور تمھاری لونڈیاں اگر پاک دامن رہنا چاہیں تو تم دنیاوی زندگی کا سامان تلاش کرنے کی خاطر انھیں بدکاری پر مجبور نہ کرو۔“

صحیحین میں مروی ہے کہ اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری بہن بنت ابی سفیان سے نکاح کرلو۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٦/ ٢٠٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩١٢) [3] مصنف ابن أبي شيبة (٣/ ٤٨٤)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩١١) [5] تفسير ابن كثير (١/ ٦١٤) [6] تفسير الطبري (٨/ ١٤٦)

مسلم کی روایت میں ہے کہ کہا عزۃ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: کیا تو اس کو پسند کرتی ہے؟ کہا: ہاں، میں ہی آپ کے پاس کچھ اکیلی نہیں ہوں اور سب سے بہتر یہ ہے کہ خیر میں میری بہن شریک ہو۔ فرمایا: وہ میرے لیے حلال نہیں ہے۔ کہا: میں نے سنا ہے کہ آپ بنت ابی سلمہ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا: بنت اُم سلمہ! کہا: ہاں۔ فرمایا: اگر وہ میری ربیبہ میری گود میں نہ ہوتی تو بھی مجھ پر حلال نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔ مجھ کو اور ابوسلمہ کو ثویبہ نے دودھ پلایا ہے، تم اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو مجھ پر پیش نہ کرو۔

صحیح بخاری کی دوسری روایت یوں ہے: اگر میں اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح نہ کرتا تو بھی وہ مجھ پر حلال نہ ہوتی۔[1] غرض کہ مجرد ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کو حرمت کی اصل ٹھہرا کر حرمت کا حکم دیا۔ ائمہ اربعہ وفقہائے سبعہ و جمہور خلف وسلف کا یہی مذہب ہے۔ کسی نے یہ کہا ہے کہ ربیبہ صرف اسی وقت حرام ہے، جب وہ آدمی کی گود (پرورش) میں ہو۔ اگر نہ ہوگی تو حرام نہیں ہے۔ مالک بن اوس رحمہ اللہ نے کہا کہ میری عورت مرگئی، اس سے اولاد تھی، مجھے نہایت رنج ہوا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، کہا: کیسے ہو؟ میں نے کہا: عورت مرگئی، کہا: اُس کی بیٹی ہے، کہا: ہاں طائف میں ہے، کہا: تیری حُجر (گود) میں تھی، میں نے کہا: نہیں، وہ طائف میں رہتی تھی، کہا: اس سے نکاح کر لے، میں نے کہا: اللہ کا فرمان کہاں گیا: ﴿ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ ﴾ (زیرِ تفسیر آیت) کہا: وہ تو تیری گود، یعنی حجر میں نہیں تھی۔[2] اس اثر کی اسناد قوی وثابت ہے۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تک شرطِ مسلم پر۔ لیکن یہ قول غریب ہے۔ داود ظاہری رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب اسی طرف گئے ہیں۔ امام رافعی رحمہ اللہ نے مالک رحمہ اللہ سے بھی اس کو حکایت کیا ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ہم سے ہمارے شیخ ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے اس مسئلے کو شیخ امام تقی الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر عرض کیا تھا، انھوں نے مشکل سمجھ کر اس میں توقف کیا۔ ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ حُجُوْرِكُمْ ﴾ کے معنی ہیں: "بُيُوْتِكُمْ". باقی رہی وہ ربیبہ جو مِلک یمین میں ہو (یعنی لونڈی ہو) سو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں پسند نہیں کرتا کہ دونوں ساتھ ہی ساتھ موطوء ہوں[3] (یعنی حاجت پوری کی جائے)۔ اس اثر کی سند منقطع ہے۔

قیس رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: کیا مرد عورت اور اس کی بیٹی سے وقاع (جماع) کر لے، جو مملوک ہیں، کہا: ان دونوں کو ایک آیت نے حلال کیا اور دوسری آیت نے حرام کیا اور میں ایسا کام نہیں کرتا۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا کہ علما کے درمیان اس بات میں اختلاف نہیں کہ یہ کسی کے لیے درست نہیں کہ وہ عورت اور اس کی بیٹی سے مِلک یمین میں وطی کر لے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو نکاح میں حرام کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨١٣-٤٨٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٩)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩١٢) [3] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١٦٤)

فرمایا: ﴿ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اور مِلک یمین اہلِ علم کے نزدیک نکاح کے تابع ہوتی ہے، مگر وہ روایت جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آئی ہے، لیکن اس پر ائمہ فتویٰ میں سے کسی کا عمل نہیں ہے اور نہ اُن کے تابعین میں سے کسی کا عمل ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دخترِ ربیبہ اور اُس کی نواسی نکاح کے لیے درست نہیں، اگرچہ کتنے ہی بطنوں سے نیچے کو جائے۔

دخول کی تفسیر:

اسی طرح امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے: ﴿ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ﴾ سے مراد "نَكَحْتُمُوْهُنَّ" ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی ایک علما کا یہی قول ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دخول یہ ہے کہ عورت مرد کے پاس بھیجی جائے، وہ اس کو کھولے ٹٹولے، اس کے دونوں پاؤں کے بیچ میں بیٹھے، کہا: اگر یہ بات عورت کے گھر میں کر لے، کہا: دونوں برابر ہیں۔ یہ دخول اس کی بیٹی کو اس مرد پر حرام کر دیتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ مرد کو عورت سے خلوت کرنا اس کی بیٹی کو اس مرد پر حرام نہیں کرتا، جب کہ اس عورت کو اس نے مسیس و مباشرت سے قبل طلاق دے دی ہے یا اُس کی شرم گاہ کی طرف شہوت سے نظر کرنے سے پہلے اسے طلاق دے دی۔ یہ اجماع اس بات پر دلیل ہے کہ دخول کے معنی "اَلْوَصُوْلُ إِلَیْهَا بِالْجِمَاعِ" (جماع) کے ہیں۔[2]

حقیقی بیٹے کی بیوی حرام ہے، منہ بولے بیٹے کی نہیں:

اصلاب کی قید سے معلوم ہوا کہ ادعیاء (منہ بولے بیٹے) کا یہ حکم نہیں ہے۔ جاہلیت میں متبنّٰی کرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴾ [الأحزاب: ۳۷] "پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کر دیا، تاکہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح) میں کوئی حرج نہ رہے، جب وہ ان سے (اپنی) حاجت پوری کر لیں اور اللہ کا حکم تو (پورا) ہو کر ہی رہتا ہے۔"

امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب زید کی بیوی سے نکاح کیا تو مشرکوں نے مکہ میں کچھ کہا، اس پر آیت زیرِ تفسیر اُتری اور فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ﴾ [الأحزاب: ٤] "اور نہ اس نے تمھارے لے پالکوں (منہ بولے بیٹوں) کو تمھارے (حقیقی) بیٹے بنایا ہے۔" نیز یہ ارشاد کیا: ﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ ﴾ [الأحزاب: ٤٠] "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔"[3] حسن اور محمد رحمہما اللہ نے کہا یہ آیتیں مبہمات ہیں: ﴿ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ ﴾ اور ﴿ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ امام طاؤس، ابراہیم،

---

[1] الاستذکار (٥/ ٤٨٦) [2] تفسیر الطبري (٨/ ١٤٨) تفسیر ابن کثیر (١/ ٦١٥) [3] تفسیر الطبري (٨/ ١٤٩۔ ١٥٠)

زہری اور مکحول رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مبہمات کے معنی یہ ہیں کہ مدخولہ اور غیر مدخولہ سے عام ہیں۔ صرف نکاح سے حرام ہوتی ہے۔ یہ بات متفق علیہ ہے۔[2]

سوال رضاعی بیٹے کی بیوی کیوں حرام ہے؟ جس طرح جمہور کہتے ہیں اور بعض نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، حالاں کہ وہ اس کی صلب سے نہیں ہے۔

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے تحت: «يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»[3]

بیک وقت دو بہنوں سے نکاح کی حرمت:

پھر فرمایا کہ تم پر دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ اسی طرح مِلکِ یمین میں، مگر جو معاملہ جاہلیت میں ہو چکا، وہ معاف ہے، یعنی گزشتہ را صلوات۔ اب دو بہنوں کا اکٹھا کرنا درست نہیں، کیوں کہ ''مِمَّا سَلَفَ'' سے مستثنیٰ ہے۔ جس طرح فرمایا ہے: ﴿ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ﴾ [الدخان: ٥٦] ''وہاں وہ موت (کا مزہ) نہ چکھیں گے، سوائے پہلی موت کے۔'' یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اب وہ ہرگز اس میں موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔ علما، صحابہ و تابعین و ائمہ دین نے قدیماً و حدیثاً نکاح میں دو بہنوں کو اکٹھا کرنے کی حرمت پر اجماع کیا ہے، جو اسلام لایا اور اس کے نیچے دو بہنیں ہو تو اس کو اختیار ہے کہ ایک کو رکھے، دوسری کو طلاق دے دے۔ لامحالہ یوں ہی کرے۔

فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اسلام لایا، میرے پاس دو بہنیں تھیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ ایک کو طلاق دوں۔ (رواه أحمد وأهل السنن) ترمذی میں روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ اختیار کروں دونوں میں سے جس کو چاہوں، پھر کہا یہ حدیث حسن ہے۔ اس کو ابن ماجہ نے بھی دوسری اسناد سے روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ابو خراش رعینی رحمہ اللہ فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میرے پاس دو بہنیں تھیں، جن سے میں نے جاہلیت میں نکاح کیا تھا۔ فرمایا: جب تو واپس جائے تو ایک کو طلاق دے دے۔[4]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہ ابو خراش وہی ضحاک بن فیروز دیلمی ہو یا کوئی اور ہو۔ ابن مردویہ میں دیلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کے الفاظ یہ ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے نیچے دو بہنیں ہیں۔ فرمایا: جس کو تو چاہے طلاق دے دے۔ یہ ضحاک دیلمی رضی اللہ عنہ یمن کے ان امرا میں سے تھے، جنھوں نے اسود عنسی متنبی ،لعنه الله، کو قتل کیا تھا۔[5]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩١٣) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦١٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٥٠٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٤٥)

[4] مسند أحمد (٤/ ٢٣٢) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٢٤٣) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١١٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٩٥١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ مزید دیکھیں: صحیح أبي داود (٧/ ١٢) إرواء الغلیل (٦/ ٣٣٤)

[5] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦١٦)

رہا مِلک یمین میں دو بہنوں کو جمع کرنا، تو یہ بھی آیت کی عمومیت کے پیشِ نظر حرام ہے۔ کسی نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ پوچھا تھا، انھوں نے مکروہ رکھا۔ سائل نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "وَبَعِيرُكَ مِمَّا مَلَكَتْ يَمِينُكَ" یعنی تیرا اونٹ بھی تو تیری مِلک یمین میں سے ہے۔[1] جمہور اور ائمہ اربعہ وغیرہم سے بھی اسی طرح مشہور ہے۔ اگرچہ بعض سلف نے اس میں توقف کیا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے یہی مسئلہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا، کہا: "أَحَلَّتْهُمَا آيَةٌ وَّحَرَّمَتْهُمَا آيَةٌ وَّمَا كُنْتُ لِأَصْنَعَ ذٰلِكَ". (ایک آیت نے دونوں کو حلال کیا اور ایک آیت نے دونوں کو حرام کیا میں یہ کام نہیں کرنے والا) وہ باہر نکلا ایک اور صحابی ملے، اُن سے پوچھا، انھوں نے کہا: اگر میں حاکم ہوتا اور کسی کو یہ کام کرتے پاتا تو اس کو سزا دیتا۔ امام ابن شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں خیال کرتا ہوں، وہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر کہا کہ سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے بھی یوں ہی منقول ہے۔[2]

ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کتاب "الاستذکار" میں لکھا ہے کہ قبیصہ نے کنایہ کیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا نام نہ لیا، کیوں کہ وہ عبدالملک بن مروان کا ہمنشیں تھا۔ اُن پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ذکر گراں گزرتا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ لونڈیوں سے وہ حرام ہے، جو آزاد عورتوں سے حرام ہے، مگر عدد۔ سلف کے ایک گروہ نے وہی کہا ہے جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "مِنْهُمُ ابْنُ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما" لیکن ان پر اختلاف کیا ہے۔

فقہائے امصار وحجاز وعراق میں سے کسی ایک نے بھی اس طرف توجہ نہ کی اور نہ مشرق وشام ومغرب ہی میں سے کسی نے التفات کی۔ مگر جو شخص ان کی جماعت سے مختلف ہوا اتباع ظاہر اور نفی قیاس کر کے اُس نے البتہ اس چیز پر عمل چھوڑ دیا، جس پر ہم نے اور فقہا کی جماعت نے اجماع و اتفاق کیا ہے کہ مِلکِ یمین میں وطی کے لیے جمع بین الاختین حلال نہیں، جس طرح نکاح میں درست نہیں ہے۔ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ نکاح اور مِلکِ یمین کا حکم ان تمام محرماتِ مذکورہ میں یکساں ہے۔ نظر بھی اور قیاس بھی اسی کو چاہتا ہے کہ جمع اختین و امہاتِ نساء و ربائب کا جمہور کے نزدیک ایک ہی حکم ہو۔ "وَهُمُ الْحُجَّةُ الْمَحْجُوجُ بِهَا عَلٰى مَنْ خَالَفَهَا وَشَذَّ عَنْهَا"[3] (قالہ ابن عبد البر) "وہ حجت ہیں جس کے ساتھ مخالف پر حجت قائم کی جاتی ہے۔"

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩١٤) [2] الموطأ (٢/ ٥٣٨۔ ٥٣٩) [3] الاستذکار (٥/ ٤٨٧، ٤٨٨)

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

اور تمھارے لیے شادی شدہ عورتیں بھی حرام ہیں سوائے ان لونڈیوں کے جن کے تم مالک ہو۔ (یہ) اللہ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے، اور ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں، وہ تمھارے لیے حلال کر دی گئی ہیں (شرط یہ ہے) کہ تم اپنے مال (مہر) کے بدلے انھیں حاصل کر کے ان سے نکاح کرو اور تمھاری نیت بدکاری کی نہ ہو، پھر جن سے مہر کے عوض تم فائدہ اٹھاؤ، انھیں ان کے مقرر کیے ہوئے مہر دے دو، اگر تم مہر مقرر کر لینے کے بعد اس (میں کمی بیشی) پر راضی ہو جاؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے (24)

آزاد شادی شدہ عورت سے نکاح کی حرمت:

پھر فرمایا کہ تم پر پرائی شادی شدہ عورتیں حرام ہیں، جن کا نکاح بیاہ ہو چکا ہے، مگر مِلک یمین، جن کو تم قید کر لائے ہو وہ استبرائے رحم (حمل سے پاک ہونے کی یقین دہانی) کے بعد تم پر حلال ہیں۔ آیت زیرِ تفسیر اسی بارے میں اُتری ہے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے اوطاس کے دن کچھ قیدی عورتیں پائیں، ان کے شوہر تھے، ان سے جماع کرنا پسند نہ کیا، ان کے شوہروں کے ہونے کے باوجود ان سے جماع کی بابت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اس پر یہ آیت اتری، اس وقت ہم نے ان شرمگاہوں کو حلال کیا۔[1] (رواہ أحمد و هكذا رواه الترمذي والنسائي وابن ماجه و مسلم وغيرهم) یہ کئی طریق سے صحاح اور سنن میں آئی ہے، حسن صحیح ہے۔ وَاللہ أعلم. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت خیبر کے قیدیوں کے حق میں اُتری ہے۔[2]

کیا لونڈی کو بیچنا طلاق ہے؟

بعض سلف نے کہا کہ لونڈی کا بیچنا اس کے شوہر کی طرف سے اُسے طلاق ہے۔ اس کو عمومِ آیت سے لیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ لونڈی کو بیچنا طلاق ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۵۶) مسند أحمد (۳/ ۷۲) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۱۶) سنن النسائي (۳۳۳۳)

[2] المعجم الكبير (۱۲/ ۱۱۵)

﴿مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾[1] (زیرِ تفسیر آیت)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ اس طرح ہیں کہ جب لونڈی فروخت کی جائے اور اُس کا شوہر ہو تو اس کا سید اس کی قیمت لینے کا زیادہ حق دار ہے۔ یہی امام قتادہ، ابن المسیب رحمہ اللہ، سیدنا ابی بن کعب، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا قول بھی ہے کہ "بَيْعُهَا طَلَاقُهَا". "اس کو بیچنا ہی اس کی طلاق ہے" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ لونڈی کی طلاق اس کو بیچنا، آزاد کرنا، ہبہ کرنا، براءت کرنا، شوہر کا طلاق دینا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لونڈی کا خاوند موجود ہے، پھر اُس کو فروخت کر دیا، یہی اس کی طلاق ہوئی۔[2] یہی سلف کا قول ہے۔ جمہور قدیماً اور حدیثاً اس کے برخلاف ہیں، وہ لونڈی کے بیچنے کو طلاق نہیں کہتے، کیوں کہ مشتری (خریدار) بائع (بیچنے والے) کا نائب ہے۔

بائع (بیچنے والے) نے اس سامان کو اپنی ملکیت سے خارج کیا ہے اور اس کو بیچ دیا، حالاں کہ وہ اس سے مسلوب ہے۔ سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث جو صحیحین میں مروی ہے، اُس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اعتماد کیا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ رضی اللہ عنہا کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ اُس کا نکاح اس کے خاوند مغیث سے فسخ نہیں ہوا تھا، بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کو اپنے نکاح کو فسخ کرنے یا باقی رکھنے کا اختیار دیا، اس نے فسخ کو اختیار کیا۔[3]

یہ قصہ مشہور ہے۔ لہٰذا اگر لونڈی کو بیچنا طلاق ہوتا، جس طرح سلف نے کہا ہے تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار نہ دیتے، جب اختیار دیا تو یہ نکاح کے باقی رہنے پر دلیل ہے اور آیت سے مراد مسبیات (جنگ میں لونڈی بنائی گئی عورتیں) ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ محصنات سے عفائف (پاک دامن) مراد ہیں کہ وہ حرام ہیں، جب تک کوئی نکاح، گواہان، مہر اور ولی کے ذریعے ان کی عصمت کا مالک نہ ہو جائے، ایک ہو یا دو یا تین یا چار۔ امام ابو العالیہ اور طاؤس سے اسی طرح منقول ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ اور عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چار کے سوا محصنات حرام ہیں، مگر مِلک یمین۔[4]

مذکورہ عورتوں کے علاوہ دیگر عورتوں سے نکاح کی حلت:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تم پر اللہ کی کتاب ہے، یعنی چار کا ہونا۔ تم اس کو لازم پکڑو، حدودِ کتاب سے باہر نہ نکلو۔ اللہ کی شریعت کو فرض و لازم سمجھو۔ امام عطا و سدی رحمہ اللہ نے کہا: "كِتَابَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ يعني الْأَرْبَعَ" ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی "مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ". پھر فرمایا کہ جو ان محارم کے علاوہ ہیں، وہ تمھارے لیے حلال ہیں۔ امام عبیدہ و سدی رحمہ اللہ نے کہا: "مَا وَرَآءَ" سے "مَا دُوْنَ الْأَرْبَعِ" (چار سے کم) مراد ہیں، مگر یہ قول بعید

---

(1) تفسیر الطبري (٨/ ١٥٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

(2) تفسیر الطبري (٨/ ١٥٥۔ ١٥٨)

(3) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٩٧٩۔ ٤٩٨٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٠٤) (4) تفسیر الطبري (٨/ ١٥٩)

ہے۔ صحیح وہی ہے جو عطا رحمہ اللہ نے کہا، یعنی محارمِ مذکورہ کے علاوہ حلال ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ" یعنی "مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ"[1] (زیرِ ملکیت) جس نے جمع بین الاختین (دو بہنوں کو اکٹھا کرنا) کو حلال کہا ہے، اس کی دلیل یہی آیت ہے، جیسے یوں کہا ہے: "أَحَلَّتْهُمَا آيَةٌ وَّحَرَّمَتْهُمَا آيَةٌ"، پھر کہا کہ تمھیں اختیار ہے کہ تم اپنے مال سے چار بیویاں اور جتنی چاہو لونڈیاں حاصل کرو، مگر شرعی طریقے سے۔ اسی لیے فرمایا ہے: ﴿ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾.

حق مہر کی فرضیت:

پھر کہا کہ ان کو ان کا مہر دو یعنی استمتاعِ فرج (شرم گاہ سے لطف اندوز ہونا) کے عوض، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾ [النساء: ٢١] "اور تم مہر میں سے کیسے واپس لو گے، حالاں کہ تم ایک دوسرے سے ملاپ کر چکے ہو اور ان عورتوں نے تم سے پختہ عہد لیا ہے؟" اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ﴾ [النساء: ٤] "اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دو۔" اور اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق: ﴿ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا ﴾ [البقرة: ٢٢٩] "اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم انھیں جو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو۔"

نکاحِ متعہ کا بیان اور اس کی حرمت:

اس آیت کے عموم سے نکاحِ متعہ پر استدلال کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائے اسلام میں یہ متعہ مشروع تھا، پھر بعد میں منسوخ ہوگیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور علما کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے کہ پہلے مباح تھا، پھر منسوخ ہوا، پھر مباح ہوا، پھر منسوخ ہوا، دو بار۔ دوسروں نے کہا ہے کہ کئی بار۔ اَوروں نے کہا ہے کہ ایک ہی بار مباح ہو کر منسوخ ہوگیا، پھر مباح نہ ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، ابی بن کعب رضی اللہ عنہم، سعید بن جبیر و سُدی رحمہم اللہ اس طرح پڑھتے تھے: "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ إِلٰى أَجَلٍ مُسَمًّى فَآتُوْهُنَّ اجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً". امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت نکاحِ متعہ کے حق میں اُتری ہے،[2] لیکن جمہور اس کے برخلاف ہیں۔ عمدہ بات وہ ہے جو امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں آئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن نکاحِ متعہ سے منع فرمایا اور پالتو گدھوں کے گوشت سے بھی منع فرمایا۔[3]

اس حدیث کے الفاظ کتاب الاحکام میں مقررہ ہیں۔ صحیح مسلم میں ربیع بن سبرہ بن معبد جہنی عن ابیہ سے مروی

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ١٧٠۔ ١٧٢) [2] تفسير الطبري (٨/ ١٧٦۔ ١٧٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٧)

ہے کہ اُس نے نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ فتح مکہ کے دن جہاد کیا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! میں نے تم کو استمتاعِ نساء (متعہ) کی اجازت دی تھی اور اب اللہ نے اس کو حرام کر دیا، قیامت کے دن تک، جس کسی کے پاس اُس میں سے یعنی زنانِ متعہ سے کوئی شے ہو، وہ اُس کو چھوڑ دے اور جو کچھ تم نے دیا ہو، اس میں سے کچھ نہ لو۔[1] صحیح مسلم کی ایک روایت میں یوں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد حجۃ الوداع کے دن فرمایا۔[2]

﴿ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم فَاٰتُوهُنَّ اُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) جس نے اس آیت کو نکاحِ متعہ پر اجلِ مسمی (مقررہ وقت) تک محمول کیا ہے، اس نے کہا کہ تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ مدتِ متعہ گزر گئی، یہ کہ مدت بڑھانے پر راضی ہو جاؤ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ جب مدت ختم ہوگئی تو اب اُس پر کوئی پابندی نہیں، وہ اس مرد سے آزاد ہے، اُس پر لازم ہے کہ اپنے رحم کا استبراء کرے اور دونوں کے درمیان میراث نہیں ہے، لہٰذا ایک دوسرے سے وارث نہیں ہوگا۔ دوسروں نے کہا کہ جب مہر مقرر کر دیا اور عورت نے مرد کو اس مہر سے بَری کیا یا بعض سے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔ اس بارے میں حضرمی رحمہ اللہ نے کہا کہ لوگ مہر مقرر کرتے تھے، پھر کوئی مفلس ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ مقرر ہو جانے کے بعد اگر عورت کچھ مہر چھوڑ دے تو وہ مرد کے لیے جائز ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تراضی یہ ہے کہ پورا مہر اس کو دے دے، پھر اس کو اختیار ہے کہ رہے یا جدا ہو جائے۔[4]

فتح البیان کی روشنی میں عمومی تفسیر:

فتح البیان کا تفسیری بیان آیتِ باب میں اس طرح ہے کہ اللہ پاک نے اس آیت میں عورتوں کا حلال اور حرام ہونا بیان فرمایا ہے۔ سات نسب سے حرام کی ہیں، چھے رضاعت اور سسرالی رشتے سے۔ سنتِ متواترہ نے دو اور ملا دیں، ایک عورت اور اُس کی پھوپھی کو جمع کرنا، دوسرے بھانجی اور اس کی خالہ کو جمع کرنا۔ اس پر اجماع ہو چکا ہے۔ وہ سات جو نسب سے حرام ہیں، وہ یہ ہیں: ① مائیں ② بیٹیاں ③ بہنیں ④ پھوپھیاں ⑤ خالائیں ⑥ بھتیجیاں ⑦ بھانجیاں اور جو سسرالی رشتے اور رضاعت سے حرام ہیں، وہ یہ ہیں: ① رضاعی مائیں ② رضاعی بہنیں ③ ساسیں ④ پچھلے خاوند سے بیوی کی بیٹیاں ⑤ بہوئیں ⑥ دو بہنوں کو جمع کرنا۔ یہ سب چھے ہیں۔ ساتویں، منکوحات آباء (باپوں کی منکوحہ عورتیں) آٹھویں، عورت اور اس کی پھوپھی کو یا خالہ کے ساتھ بھانجی کو جمع کرنا۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب محکم متفق علیہ ہیں، ان میں سے کسی ایک کے ساتھ نکاح کرنا باجماع جائز

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٦)
[2] صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کے الفاظ نہیں ملے۔ البتہ مسند احمد (٣/٤٠٤) میں مروی ہیں۔
[3] تفسير ابن الطبري (٨/ ١٨٠۔ ١٨١)
[3] تفسير الطبري (٨/ ١٨١) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٢٠) اس کی سند حسن ہے۔

نہیں ہے، مگر ان عورتوں کی بیٹیاں حلال ہیں، جن سے دخول نہیں کیا ہے، کیوں کہ جمہور سلف کا مذہب یہ ہے کہ بیٹی سے عقد کرنے پر اُس کی ماں حرام ہو جاتی ہے اور اس کی بیٹی، اس کی ماں کے ساتھ دخول کی صورت میں حرام ہوتی ہے۔[1]

کشاف میں کہا ہے کہ علما نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اُمہاتِ نساء (ساسیں) مبہم ہیں نہ تحریمِ ربائب (پچھلے خاوند کی بیٹیاں)۔ ظاہر کلام یہی ہے،[2] لیکن اجماع کا دعویٰ قابلِ اعتبار نہیں ہے، ایک جماعت کے اختلاف کی وجہ سے جن کا ذکر ہو چکا۔ پھر لفظ اُمہات میں اصولِ امہات (ماں سے اوپر نانی اور دادی آخر تک) اور لفظ بنات میں فروع بنات (بیٹی سے نیچے پوتی اور نواسی آخر تک) داخل ہیں، کتنی ہی عالی (اوپر تک) یا سافل (نیچے تک) ہو۔ اخوت کا لفظ سگی بہن پر اور اس پر جو فقط ماں یا باپ کی بیٹی ہو صادق آتا ہے۔ عمہ ہر اس عورت کا نام ہے جو باپ یا دادا کی شریک ہو، دونوں اصل یا ایک اصل میں اور کبھی عمہ ماں کی طرف سے ہوتی ہے، جیسے نانا کی بہن۔ خالہ ہر اُس عورت کا نام ہے جو دونوں اصل یا ایک اصل میں ماں کی شریک ہے اور کبھی خالہ باپ کی طرف سے ہوتی ہے، جیسے دادی کی بہن۔ بنت الاخ ہر اُس عورت کا نام ہے جس سے بھائی کی ولادت کا واسطہ اور مباشرت ہو، اگرچہ دور پڑے، اسی طرح بنت الاخت کا حال ہے۔

امہاتِ رضاعت کا لفظ مطلق آیا ہے، مگر دو سال کے ساتھ مقید ہے، مگر سالم مولیٰ ابی حذیفہ کے اِرضاع (دودھ پلانے) کے قصے کے پیشِ نظر ظاہر نظمِ قرآنی یہ ہے کہ رضاع کا حکم ثابت ہے، کیوں کہ لغتاً و شرعاً رضاعت کے نام کا یہی مطلب ہے، لیکن اس کو پانچ مرتبہ دودھ پلانے کے ساتھ مقید کرنا احادیثِ صحیحہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ اس کی تحقیق شرح منتقیٰ میں ہے۔ رضاعی بہن وہی ہے، جس کو تیری ماں نے تیرے باپ کا دودھ پلایا ہے، خواہ تیرے ہمراہ وہ دودھ پلایا ہو یا اس کے ہمراہ جو تجھ سے پہلے یا تیرے بعد تیرا بہن بھائی ہے۔ پھر سنت نے بنات و عمات و خالات و بنات الاخ کو بھی رضاعی بہن کے ساتھ ملا دیا اور فرمایا: ''حرام ہے رضاعت سے جو حرام ہے نسب سے۔''[3] (رواہ الشیخان) ماں کی طرف سے تیری بہن وہ ہے جس کو تیری ماں نے کسی اور مرد کا دودھ پلایا ہے۔ ربیبہ وہ ہے جو کسی دوسرے مرد سے تیری بیوی کی بیٹی ہو۔

دخول سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے، لیکن بات یوں ہے کہ دخول کے معنی میں شرعاً لغتاً نظر کرنا چاہیے، اگر لفظ دخول جماع کے ساتھ خاص ٹھہرے تو پھر اسے لمس (چھونے) یا نظر وغیرہ کے ساتھ ملانے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر اس کے معنی جماع کو بھی شامل کرتے ہیں، اس طرح کہ جس میں کسی طرح کا استمتاع ہو، اُس پر یہ لفظ صادق ہے تو پھر تحریم کی اصل وجہ وہی ٹھہرے گی۔ علما کا اس پر اجماع ہے کہ جس سے بیٹے نے عقد کیا، وہ باپ پر

[1] تفسير القرطبي (٥/ ١٠٦) [2] تفسير الكشاف (١/ ٥٢٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٧)

حرام ہے اور جس سے باپ نے عقد کیا، وہ بیٹے پر حرام ہے۔ یکساں خواہ نکاح کے ساتھ وطی ہو یا نہ ہو۔ اس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ ﴾ [النساء: ٢٢] اس فرمان کی روشنی میں: ﴿ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) عقدِ فاسد میں فقہا کا اختلاف ہے کہ آیا وہ تحریم کا باعث ہوتا ہے یا نہیں۔

امام ابن منذر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن سب علمائے امصار کا، جن سے علم محفوظ ہے، اس بات پر اجماع ہے کہ جب ایک مرد نے نکاحِ فاسد سے کسی عورت سے وطی کی تو وہ عورت اس کے باپ و بیٹے پر، بلکہ اجداد پر حرام ہوگئی۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ لونڈی خرید کر اُس سے عقد اس لونڈی کو باپ بیٹے عاقد پر حرام نہیں کرتا، ہاں اگر لونڈی خرید کر لمس کیا ہے یا بوسہ لیا ہے تو حرام ہوجائے گی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس میں اختلاف کیا گیا ہو، لہٰذا اس تحریم کا تسلیم کرنا واجب ہے، ہاں اگر اس کی تحریم میں نظر سے اختلاف ہے تو وہ لونڈی اس اختلاف کی وجہ سے جائز نہیں ہوگی۔ اس کے خلاف کسی ایک صحابی سے بھی ثابت نہیں ہے۔[1]

رہی رضاعی بیٹے کی عورت، سو جمہور کا مذہب یہ ہے کہ وہ اُس کے باپ پر حرام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس پر اجماع ہے، اگرچہ وہ صُلبی بیٹا نہیں ہے اس کی دلیل یہ حدیث ہے: «يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»[2] اگرچہ آیت کے مفہوم کا تقاضا ایسی بہو کے حلال ہونے کا ہے۔ اس میں اختلاف نہیں کہ اولاد کے بارے میں حکم خواہ وہ کتنی ہی نیچے جائے، ان کی بیویوں کو ان کے آبا پر صُلبی بیٹوں کی طرح حرام کرنے ہی کا ہے۔

وطیِ زنا کی صورت میں حرمت کا مسئلہ:

وطیِ زنا میں علما کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے تحریم ہوتی ہے یا نہیں۔ اکثر اہلِ علم کا یہ قول ہے کہ جب مرد نے ایک عورت سے زنا کیا تو اس زنا کے سبب سے اُس کا نکاح اُس سے حرام نہیں۔ اسی طرح اگر ساس سے یا جورُو کی بیٹی سے زنا کیا ہے تو عورت اس پر حرام نہیں ہوگی، حد کا قائم کرنا کافی ہوگا۔ اسی طرح جس عورت سے یا اُس کی بیٹی سے زنا کیا ہے، اس کی ماں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ زنا مقتضی تحریم ہے۔ اصحابِ رائے بھی اسی طرف گئے ہیں، جمہور کی دلیل یہ ہے کہ زنا کے طور پر وطی کی جانے والی کا امہاتِ نساء یا حلائل ابناء سے ہونا صادق نہیں آتا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی نے ایک عورت سے زنا کیا، پھر چاہتا ہے کہ اُس سے یا اس کی لڑکی سے نکاح کر لے؟ فرمایا کہ حرام حلال کو حرام نہیں کرتا۔[3] جو لوگ تحریم کے قائل ہیں، ان کی دلیل قصۂ جریج ہے، جو صحیح میں ہے کہ غلام سے پوچھا تیرا باپ کون ہے، اُس نے کہا: فلاں راعی،[4] غرضیکہ اُس لڑکے

---

[1] تفسير القرطبي (٥/ ١١٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٥)

[3] المعجم الأوسط (٥/ ١٠٤) سنن الدارقطني (٣/ ٢٦٨) اس کی سند میں ''عثمان بن عبدالرحمن زہری'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٨٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٠)

نے اپنے آپ کو اپنے باپ زانی کی طرف نسبت کیا، لیکن یہ دلیل ساقط ہے۔ دوسری دلیل یہ حدیث ہے کہ اللہ اُس مرد کی طرف نظر نہیں کرتا، جس نے کسی عورت کی شرمگاہ اور اس کی بیٹی کی شرمگاہ کی طرف دیکھا۔[1] یہاں حلال حرام میں کچھ فرق نہیں کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صرف ان دلیلوں کے ساتھ مشروط ہے، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حرام حلال کو حرام نہیں کرتا۔

کیا لواطت (عملِ قومِ لوط) تحریم کا باعث ہے؟:

پھر لونڈے بازی (عملِ قومِ لوط) میں اختلاف کیا گیا ہے کہ آیا مقتضی تحریم ہے یا نہیں۔ ثوری رحمہ اللہ نے کہا کہ جس بچے سے قومِ لوط والا عمل کیا، اس کی ماں اُس پر حرام ہوگئی۔ یہی احمد کا قول بھی ہے کہ جب اپنی عورت کے بیٹے یا باپ یا بھائی سے لونڈے بازی کی تو وہ عورت اُس پر حرام ہوگئی۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا کہ جب کسی لڑکے سے قومِ لوط والا عمل کیا اور اُس لڑکے سے کوئی دختر پیدا ہوئی تو یہ لونڈے باز اُس سے نکاح نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ مدخول بہ کی بیٹی ہے۔[2] لیکن ان سب اقوال میں ضعف اور سقوط ہے، جو اس بات کے قائلین سے کہ وطیِ حرام سے تحریم واقع ہو جاتی ہے، درجہ بدرجہ پیدا ہوا ہے، کیوں کہ جس شبہے سے انھوں نے لونڈے بازی کو تحریم کا سبب سمجھا ہے، وہ اس امر کو ثابت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

دو لونڈی بہنوں کو اکٹھا کرنے کا مسئلہ:

جمع بین الاختین از مِلک یمین کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ پہلے گزر چکا ہے، ہر طرف ایک گروہ گیا ہے، لیکن اس جگہ ایک سخت اشکال ہے، یعنی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نکاح کا اطلاق فقط عقد اور فقط وطی پر آتا ہے، پھر اس میں جو اختلاف ہے کہ کون سے معنی حقیقی ہیں اور کون سے مجازی یا دونوں حقیقی معنی ہیں، وہ معروف ہے۔ لہٰذا اگر اس تحریم کو جو آیتِ کریمہ: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ﴾ میں ہے، تحریمِ عقد پر محمول کریں گے تو اللہ کے قول: ﴿وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ﴾ میں دو لونڈیوں کے جمع اور وطی کی حرمت کی دلیل نہیں ہوگی اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ﴾ آزاد اور غلام، نکاح اور ملکیت پر یکساں طور پر لاگو ہے، اس بات کو مستلزم نہیں ہوگا کہ جمع بین الاختین اور وطی و مِلک یمین میں فرق جو اس مسئلے میں خلاف کا سبب ہے، وہ اجماع کے سبب کی طرح ہو۔

ایسی جگہ میں صرف قیاس لائقِ حجت نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس قیاس کو توڑنے والے بہت سے عوامل ہیں اور اگر تحریم مذکور کو فقط وطی پر محمول کرتے ہیں تو وہ اجماع جو تمام بیانات میں تحریمِ عقدِ نکاح کے بارے میں آیت کے اول

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٣/ ٤٨٠) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١٦٩) یہ روایت موقوف ہے۔ نیز سند میں 'لیث بن ابی سلیم' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسير القرطبي (٥/ ١١٦)

تا آخر بیان ہوا ہے، وہ صحیح نہیں رہتا، اس صورت میں آیت میں جو تحریم آئی ہے، وہ عقدِ نکاح کی تحریم پر محمول ہوگی۔ پس جو شخص تحریم جمع بین الاختین کو وطی و ملکِ یمین میں بھی لاگو کرنے کا قائل ہے، وہ دلیل کا محتاج ہوگا اور یہ دلیل کہ جمہور کا قول بھی تحریم ہے، اس کو نفع نہیں دے سکتی، کیوں کہ حق کی معرفت لوگوں سے نہیں ہوسکتی، ہاں اگر کوئی ایسی دلیل ہے جو کدورت کی آمیزش سے صاف ہے تو پھر کیا پوچھنا، ورنہ اصل حل ہے۔

رہی یہ بات کہ آیت میں نکاح کو دونوں معنوں پر محمول کریں، یعنی عقد اور وطی پر تو یہ بھی درست نہیں، کیوں کہ اس میں جمع کرنا حقیقی طور پر اور مجازی طور پر لازم آتا ہے اور وہ ممنوع ہے یا معانی مشترک پر جمع کرنا لازم آتا ہے۔ لہٰذا اس میں اہلِ علمِ اصول کے درمیان اختلاف ہے، ذرا اس بات پر غور کرو اور سمجھو۔

مسئلہ:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما کا اجماع ہے کہ جب عورت کو ایسی طلاق دی ہے جس کی رجعت کا مالک ہے تو پھر اس عورت کی بہن سے نکاح نہیں کرسکتا، جب تک کہ مطلقہ کی عدت پوری نہ ہو اور اگر رجعت کا مالک نہیں ہے تو اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ نہ اُس کی بہن سے نکاح کرسکتا ہے نہ چوتھی جورُو لاسکتا ہے، جب تک مطلقہ کی عدت نہ گزر جائے۔ سیدنا علی، زید بن ثابت رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عطا، نخعی، ثوری، احمد و اصحاب الرائے رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں۔

دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ بلکہ اُس کی بہن سے نکاح کرسکتا ہے اور چوتھی جورو لاسکتا ہے، اگر طلاقِ بائن دے دی ہے۔ امام سعید بن المسیب، حسن، قاسم، عروہ بن زبیر، ابن ابی لیلیٰ، شافعی، ابو ثور، ابو عبید رحمہم اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔ ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں خیال کرتا ہوں کہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول بھی یوں ہی ہے۔ ایک روایت میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[1]

لفظِ احصان کے معانی:

لفظِ اِحصان کے معنی قرآنِ مجید میں کئی ایک آئے ہیں، ایک تزوج (نکاح) جس طرح اس آیت میں ہیں: ﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ یا جس طرح ﴿مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ﴾ میں۔ دوسرے، آزادی جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ﴾ [النساء: ۲۵] ''اور تم میں سے جو شخص آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔'' تیسرے، عفت اور پارسائی، جیسے: ﴿مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ﴾ [النساء: ۲۵] ''جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں۔'' اور اس کا قول:

[1] تفسير القرطبي (٥/ ١١٩)

﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ [المائدة: ٥] ''اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں حلال ہیں، جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔'' چوتھے معنی، اسلام جیسے ﴿ فَاِذَآ اُحْصِنَّ ﴾ [النساء: ٢٥] ''پھر جب وہ نکاح میں آ جائیں۔''[1]

اس جگہ محصنات سے سیدنا عبداللہ بن عباس، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم، ابو قلابہ، مکحول اور زہری رحمہم اللہ کی مراد وہ عورتیں ہیں، جو شوہر رکھتی ہیں، یعنی اُن سے اپنے شوہروں سے علاحدگی سے قبل نکاح حرام ہے، مگر وہ عورتیں جو جنگی قیدی بن کر تمھاری ملکیت میں آئیں، ان سے جماع کرنا تمھارے لیے حلال ہے، گو ان کے شوہر جنگ میں موجود ہوں۔ یہ وطی استبراء کرنے کے بعد ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے، یعنی سباء (جنگی قیدی بننا) قاطعِ عصمت ہے۔ امام مالک اور ابو حنیفہ رحمہما اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ محصنات سے مراد عفائف ہیں، یعنی ساری عورتیں حرام ہیں، مگر مِلکِ یمین جن کی عصمت نکاح یا شراء سے ہے۔

ایک آدمی نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا سوال کیا تھا، انھوں نے کچھ نہ کہا۔ سعید رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جانتے نہیں تھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر مجھے معلوم ہو کہ کون اس آیت کی تفسیر کرے گا تو میں اس کے پاس اونٹوں پر سفر کر کے جاؤں۔[3] امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کے معنی۔ واللہ أعلم۔ واضح ہیں، کچھ چھپے نہیں، یعنی حرام ہیں تم پر بیاہی ہوئی عورتیں، خواہ مسلمان ہوں یا کافر، مگر وہ جو اُن میں سے تمھارے ہاتھ لگیں، خواہ بطورِ سبی (قیدی) ہوں، وہ حلال ہیں، گو شوہر والیاں ہوں یا بطریقِ خریداری کہ وہ بھی حلال ہیں، اگرچہ خاوند رکھتی ہوں۔ وہ ان کا پہلا نکاح سید کے فروخت کر دینے سے فسخ ہو گیا، کیوں کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے، سبب کی خصوصیت کا نہیں۔[4] واللہ أعلم.

پھر فرمایا: تمھارے لیے وہ عورتیں جو ان کے سوا ہیں حلال ہیں۔ یہ عام اجازت اُس حدیث سے مخصوص ہے، جس میں بیوی کی پھوپھی اور خالہ کو بیوی کے ساتھ نکاح میں جمع کرنے کی حرمت آئی ہے۔[5] اسی باب سے معتدہ کا نکاح ہے اور اُس شخص کا لونڈی سے نکاح کرنا ہے، جس کے پاس آزاد عورت ہے اور جو آزاد عورت پر قادر ہے، اس کو لونڈی سے نکاح کرنا درست نہیں۔ اسی طرح جس کے پاس چار منکوحہ ہیں، اس کو پانچواں نکاح منع ہے، اسی طرح زنِ ملاعنہ،

---

[1] اس جملے میں ﴿ اُحْصِنَّ ﴾ اگرچہ نکاح کے معنی میں ہے، لیکن اس کو اسلام لانے کی مثال میں غالباً اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ اسلام لانے کے بعد ہی لونڈی میں نکاح کا احساس ہوتا ہے، ورنہ اسلام سے قبل لونڈیوں میں نکاح کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، ان کی عام روش سِفاح (زنا کاری) کی تھی۔ واللہ أعلم [ص۔ ي]

[2] تفسير القرطبي (٥/ ١٢١) [3] تفسير الطبري (٨/ ١٦٥) [4] فتح القدير (١/ ٧١٩)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٨)

ملاعن پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ بعض نے کہا: کہ اس تنبیہ کی کیا ضرورت ہے، کیوں کہ کلام تحریم ابدی میں ہے اور ان اقسام کی تحریم مؤبد (ہمیشہ کے لیے) نہیں ہے، بلکہ عارضی ہے۔ مگر ملاعنہ کہ اس کی تحریم البتہ اَبدی ہے۔

مہر کی فرضیت اور نکاحِ متعہ کی حرمت:

﴿ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ ﴾ سے مراد نکاحِ صحیح ہے۔ امام حسن اور مجاہد رحمہ اللہ نے یوں ہی کہا ہے۔[1] یعنی جن عورتوں سے تم نے شرعی نکاح کے بعد فائدہ اُٹھایا اور لذت حاصل کی، ان کا مہر دینا تم پر واجب ہوگیا۔ خواہ مسمّٰی (متعین) ہو یا مہرِ مثل، لیکن اس تفسیر پر قولِ سابق مقرر ہوتا ہے: ﴿ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ ﴾ [النساء: ٤] ''اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دو۔'' اسی لیے جمہور نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے مراد نکاحِ متعہ ہے، جو شروع اسلام میں تھا۔ آدمی کسی عورت سے ایک مقرر وقت تک نکاح کرتا ایک رات یا دو رات یا ایک ہفتہ کے لیے کپڑے یا کسی چیز کے عوض ایک مقرر وقت تک نکاح کرتا، پھر اپنا مطلب نکال کر اپنی راہ لیتا اور اس کو چھوڑ دیتا۔ یہ نکاح فتح مکہ یا حجۃ الوداع میں منسوخ ہوگیا۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی ناسخ آیتِ میراث ہے، کیوں کہ متعہ میں میراث نہیں ہوتی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا و قاسم بن محمد نے کہا کہ متعہ کا نسخ اور تحریم خود قرآن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٥۔ ٧] ''اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ، تو بلاشبہہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو شخص ان کے علاوہ (راستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں۔''

اور جو منکوحہ بمتعہ ہے، وہ نہ ازواج سے ہے اور نہ مِلکِ یمین سے،[2] کیوں کہ زوجہ کی شان یہ ہے کہ وہ کسی کی وارث اور کوئی اُس کا وارث ہو۔ ''مُسْتَمْتَعٌ بِهَا'' (جس سے متعہ کیا جاتا ہے) اس طور پر نہیں ہوتی۔ متعہ کی تحلیل اور تحریم اور منسوخی کے بارے میں احادیث کہ ایک بار منسوخ ہوا یا دو بار کتبِ سنت میں مذکور ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو جب منسوخ کرنے کا حکم پہنچا تو انھوں نے متعہ کی اباحت سے رجوع کر لیا۔ ہاں روافض کی ایک جماعت متعہ کے جواز کی قائل ہے، ان کے اقوال لائقِ اعتبار نہیں۔ بعض متاخرین نے اس مسئلے میں کلام کرنے میں اپنی جان کو تکلیف دی۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں شبہہ باطل اور جواز کے قائل لوگوں کا بخوبی رد کیا ہے۔[3] ابن العربی رحمہ اللہ

[1] تفسير الطبري (٨/ ١٧٥) [2] تفسير القرطبي (٥/ ١٣٠) [3] نيل الأوطار (٦/ ١٩٢۔ ١٩٤)

نے کہا ہے کہ عورتوں کا متعہ شریعت کے غرائب سے ہے۔ کیوں کہ شروعِ اسلام میں مباح تھا، پھر خیبر کے دن حرام ہوا، پھر غزوۂ اوطاس میں مباح ہوا، پھر اس کے بعد حرام ہوا اور حرام ہونے کا حکم مستقر ٹھہرا۔ شریعت میں قبلے کے مسئلے کے سوا اس مسئلے کی کوئی نظیر نہیں کہ اُس پر دو بار نسخ طاری ہوا، پھر مستقر ہوا۔ اس کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے۔[1]

"اُجُوْر" سے مراد مہر ہیں۔ اجر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ منفعت کا بدل ہے، عین منفعت نہیں۔ فریضہ کے معنی ہے: مُسَمَّاۃ، یعنی معین مقدار میں مہر۔ مہر متعین ہو جانے کے بعد ایک دوسرے کی رضا مندی سے مہر میں کمی بیشی اس شخص کے نزدیک جائز ہے، جو آیت زیرِ تفسیر کو نکاح شرعی کے حق میں کہتا ہے اور جمہور جو اس کے قائل ہیں کہ آیت متعہ کے حق میں ہے، ان کے نزدیک "تَرَاضِی" سے مدتِ متعہ یا استمتاع کے لیے مقررہ مال میں کمی زیادتی مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "تَرَاضِی" سے مراد مہر سے چھٹکارا حاصل کرنا اور فدیہ دینا اور اقتیاض (عوض لینا) ہے۔[2]

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

اور تم میں سے جو شخص آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، وہ تمھاری ملکیت مومن لونڈیوں میں سے کسی لونڈی سے نکاح کر لے، اور اللہ تمھارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے، تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو (تم میں برتری کا معیار صرف ایمان ہے) پس تم ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لو اور انھیں دستور کے مطابق ان کے مہر دو، جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چوری چھپے آشنا بنانے والی ہوں، پھر جب وہ نکاح میں آ جائیں اور اس کے بعد وہ بدکاری کریں تو ان کی سزا آزاد عورتوں کی سزا کا نصف ہے۔ یہ (اجازت) تم میں سے اس کے لیے ہے جسے گناہ کی راہ پر چلنے کا اندیشہ ہو اور یہ کہ تم صبر کرو، تمھارے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے (25)

---

[1] تفسير القرطبي (۵/ ۱۳۰۔ ۱۳۱) [2] فتح البيان (۳/ ۶۸۔ ۸۳)

موضح القرآن کا بیان:

فرمایا: جس میں آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو اور صبر کرنے میں ڈرتا ہو کہ کہیں اس سے حرام نہ ہو جائے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ کسی کی لونڈی سے اس کے مالک کی اجازت سے نکاح کرلے اور چھپی یاری سے منع فرمایا۔ تو نکاح میں گواہ لازم ہوئے اور جس کے نکاح میں ایک آزاد عورت ہے، اس کے لیے کسی کی لونڈی سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔ اوپر جو آدھے عذاب کا ذکر ہوا ہے، یعنی آزاد مرد یا عورت اگر نکاح سے فائدہ لے چکے، پھر زنا کرے تو سنگسار ہو اور بغیر نکاح کے زنا کرے تو سو کوڑے مارے جائیں تو فرمایا کہ لونڈیوں کو نکاح کیے پر بھی زنا کے پچاس کوڑے ہیں زیادہ نہیں، یہی غلام کا حکم ہے۔ موضح القرآن کا کلام تمام ہوا۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں کہا ہے کہ "طَوْل" سے مراد جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ وغیرہم کے نزدیک غنا اور وسعت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قدرت ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کسی لونڈی کو چاہتا ہے اور اس کے سوا غیر سے نکاح نہیں کرسکتا، محبت میں مجبور ہے تو اس کو اس سے نکاح کرنا جائز ہے، جبکہ اپنی جان کا مالک نہیں اور ڈرتا ہے کہ کہیں اُس سے حرام نہ کر بیٹھے، گو اتنا مال دار ہو کہ آزاد سے نکاح کر سکے، لیکن قابلِ ترجیح وہی پہلے معنی ہیں۔ باقی تکلف سے خالی نہیں۔ یعنی مرد کو لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، مگر اس وقت کہ وہ آزاد عورت سے مہر وغیرہ کی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے نکاح کرنے پر قادر نہ ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔

دوسری شرط آیت کے آخر میں ہے کہ یہ کام اس کے لیے ہے جو زنا سے ڈرے۔ پس فقیر کے لیے حلال نہیں ہے کہ کسی مملوکہ سے نکاح کرلے مگر اسی وقت کہ اپنی جان پر حرام کاری کا ڈر رکھتا ہو۔ اس جگہ لونڈی سے مراد غیر کی مملوکہ ہے اور اگر خود اسی شخص کی لونڈی ہو تو اس سے نکاح کرنا بالاجماع ناجائز ہے، کیوں کہ وہ اس کی مِلک میں ہے۔ حقوق میں ٹکراؤ اور اختلاف پیدا ہوگا۔ فَتَیات مُومنات کی قید سے کسی کتابی لونڈی سے نکاح کا استدلال کیا ہے۔ اہلِ حجاز اسی کے قائل ہیں۔ اہلِ عراق بھی اس کو جائز کہتے ہیں۔

یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان کو جانتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سب اللہ کے نزدیک بنی آدم ہو، اللہ کے نزدیک بڑا بزرگ وہ ہے، جو بڑا پرہیز گار ہے۔ سو تم وقتِ ضرورت لونڈیوں سے نکاح کرنے میں عار نہ کرو، کیوں کہ کبھی لونڈیوں کا ایمان آزاد عورتوں کے ایمان سے افضل ہوتا ہے۔ یہ جملہ معترضہ اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ لونڈی میں ایمان کا پایا جانا کافی ہوتا ہے، اگرچہ وہ ظاہر میں ہو۔ یہ شرط نہیں ہے کہ اُس کے ایمان کو یقینی علم کے طور پر معلوم کرلے، کیوں کہ اس پر اللہ کے سوا کسی کو اطلاع نہیں ہوسکتی۔

مساواتِ انسانی اور کنیز سے نکاح کے کچھ احکام:

﴿ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم سب نسب میں ملے جلے ہوئے ہو، کیوں کہ تم سب بنی آدم ہو، دین میں بھی متصل ہو، تمھاری سب کی ایک ملت ہے، ایک پیغمبر ہے۔ عرب کے لوگ لونڈیوں کی اولاد سے عار اور انکار کرتے تھے، ان کو ذلیل وخوار جانتے تھے۔ ''اِبْنُ الْأَمَةِ الْهِجَيْنِ'' ''لونڈی کا ذلیل بیٹا'' نام رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بات قابلِ توجہ نہیں ہے۔ تمھیں لونڈیوں سے نکاح کرنے میں ناک بھوں نہیں چڑھانا چاہیے کہ تم اور وہ نسب میں برابر ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ بعض مومنین بعض کے ہمسر ہیں۔[1] آزاد کو نہیں چاہیے کہ کنیز سے نکاح کے وقت بلندی تلاش کرے، مگر اتنا ضرور ہے کہ کنیز کے مالکان کی اجازت سے نکاح کرے، کیوں کہ کنیز کے منافع انھیں کے لیے ہیں، غیر کو ان سے بغیر اذنِ مالک کے فائدہ نہیں لینا چاہیے۔

اہلِ علم کا اس پر اتفاق ہے کہ کنیز کا نکاح اس کے سید کی اجازت کے بغیر باطل ہے، کیوں کہ اللہ نے کنیز کے نکاح کو اس کے سید کی اجازت سے مشروط کر دیا ہے۔ پھر ان کو حکم دیا کہ ان کا مہر بغیر دیر کیے ہوئے یا کمی کیے ہوئے یا تکلیف دیے ادا کر دو یا مہر کے مثل دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ کنیز اپنے مہر کی مالک ہے، سید سے زیادہ اُس کی حقدار ہے۔ یہی امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ مہر سید کو ملے گا، پھر یہ قید لگائی کہ وہ زانیات نہ ہوں، یعنی علانیہ طور پر۔ یہ شرط استحباب کے طور پر ہے۔ کیوں کہ مشہور یہ ہے کہ زوانی کا نکاح اگرچہ کنیز ہو، جائز ہے۔

خدن وہ ہے جو پوشیدہ یار ہو، عرب علانیہ زنا کو عیب جانتے تھے نہ چھپی یاری کو۔ اسلام نے اس کو رفع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ [الأنعام: ١٥١] ''اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں۔'' احصان سے اس جگہ اسلام مراد ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعینِ عظام رحمہم اللہ اور اہلِ علم کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی بات کو ظاہر کیا ہے۔ اسی کے جمہور قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا کہ احصان سے مراد بیاہ ہے۔[2]

کنیز پر حد:

پہلے قول کے مطابق کافرہ کنیز پر حد نہیں ہے۔ دوسرے قول کے مطابق بے بیاہی کنیز پر حد نہیں آتی۔ ایک قوم نے کہا کہ اس آیت میں احصان سے مراد نکاح ہے، لیکن مسلمان کنیز پر حد واجب ہے، جبکہ نکاح سے پہلے زنا کرے۔ امام زہری رحمہ اللہ سنت کی دلیل سے اسی کے قائل ہیں۔[3]

---

[1] تفسیر الخازن (١/ ٥١٠) [2] تفسیر الطبري (٨/ ٢٠١) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٢٤) اس کی سند حسن ہے۔
[3] فتح القدیر (١/ ٧٢٣)

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک کے ظاہر قول کا تقاضا یہ ہے کہ کنیز پر حد نہیں ہے، مگر نکاح کے بعد، اگرچہ وہ مسلمان ہو۔ پھر سنت نے بیاہی نہ ہونے کی صورت میں کوڑوں کا حکم دیا۔ یہ زیادتِ بیان ہے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومن کی پشت حمیٰ (سرکاری چراگاہ) ہے جو مباح نہیں ہوتی، مگر یقین کے ساتھ۔ یقین اختلاف کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر سنتِ صحیحہ میں کوڑوں کا مارنا نہ آتا۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اظہر ۔واللہ أعلم۔ اس جگہ یہی ہے کہ احصان سے مراد نکاح ہے، کیوں کہ سیاقِ اول اسی پر دلالت کرتا ہے۔ سارا سیاق مومن لونڈیوں کے بارے میں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "أُحْصِنَّ أي تَزَوَّجْنَ"۔[3]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عبید (غلاموں) کا ذکر نہیں کیا۔ حالاں کہ وہ لونڈیوں کے ساتھ بطریقِ قیاس ملے جلے ہیں اور جس طرح کنیزوں پر زنا میں نصف حد ہے، اسی طرح غلاموں پر بھی قذف (جھوٹی تہمت لگانا) اور شراب میں نصف حد ہے۔ عنت کے معنی اِثم یا زنا کے ہیں۔

کنیز سے نکاح کی تین شرائط:

غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے کنیز سے تین شرط پر نکاح مباح کیا ہے: ایک یہ کہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو۔ دوسرے زنا کا خوف ہو اور تیسرے یہ کہ لونڈی مومنہ ہو۔ اس کے باوجود اگر کنیز سے نکاح نہ کرے اور صبر کرے تو بہتر ہے، کیوں کہ اولاد رقیق (غلام) ہوتی ہے۔[4]

آزاد عورت سے نکاح نہ کر سکنے کی صورت میں لونڈی سے نکاح کی اجازت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا کہ جس کسی کو آزاد مومنہ پاک دامن عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہ ہو اور وہ زنا سے ڈرتا ہو تو وہ کنیزوں سے نکاح کر لے۔ ربیعہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طَول سے مراد ہوا (خواہش) ہے۔ یعنی کنیز سے نکاح کرے، جب اُس کی خواہش کنیز میں ہو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو بدلیل ﴿فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ برا بھلا کہہ کر رد کیا ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مومن لونڈی سے نکاح کر لے۔ یہی امام سدی اور مقاتل بن حیان رحمہما اللہ کا قول ہے۔[6] پھر اس قول کے ساتھ اعتراض کیا ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے تمھارا ایمان، یعنی وہ معاملات کی حقیقت اور پوشیدگی کا عالم ہے، تم اے لوگو! ظاہر امور پر رہو۔

غلام اور لونڈی کے لیے مالک کی اجازت کی ضرورت:

پھر سید کی اجازت کی شرط لگائی، کیوں کہ کنیز کا نکاح اس کے ولی کے بغیر صحیح نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی غلام

---

[1] التمهيد (٩/ ١٠٤) [2] تفسير القرطبي (٥/ ١٤٤) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٦٢١۔ ٦٢٢)
[4] فتح البيان (٣/ ٨٤۔ ٩٠) [5] تفسير الطبري (٨/ ١٨٣۔ ١٨٥) تفسير ابن كثير (١/ ٦٢٠) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٢١)

اپنے سید کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کرسکتا، جس طرح حدیث میں مروی ہے کہ جس غلام نے اپنے مولیٰ کے اذن کے بغیر نکاح کیا، وہ زانی ہے۔[1] پھر اگر لونڈی کی مالک کوئی عورت ہے تو اس کا نکاح وہی کروائے گا، جو اس عورت کی طرف سے نکاح کی اجازت دینے کا مجاز ہے، کیوں کہ حدیث میں مروی ہے کہ عورت عورت کا بیاہ نہ کرے، نہ خود اپنی جان کا بیاہ کرے، زانیہ وہی عورت ہے جو اپنا بیاہ آپ کرتی ہے۔[2]

پھر حکم دیا کہ کنیز کا حق مہر معروف کے ساتھ ہے، یعنی اپنے دل کی خوشی سے۔ ان کو حقیر سمجھ کر کچھ کم نہ کرو کہ وہ لونڈیاں ہیں۔[3] مملوک محصنات سے مراد یہ ہے کہ پاک دامن ہیں زنا سے حرام کاری نہیں کرتیں، اسی لیے ﴿غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ﴾ فرمایا، ﴿مُسٰفِحٰتٍ﴾ وہ زنا کرنے والی ہیں کہ جب کوئی ان سے فاحشہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ منع نہیں کرتیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مسافحات علانیہ زنا کرنے والی ہیں۔[4]

اَخْدان کا مفہوم:

اَخْدَان سے مراد اَخِلَّا (دوست) ہیں۔ یہی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، شعبی، عطا خراسانی، یحییٰ بن کثیر، مقاتل بن حیان اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں کہ اَخدان سے مراد ہے صَدِیق (دال پر زیر کے ساتھ) یعنی یار۔[5] اللہ نے ایسی لونڈیوں سے نکاح کرنے سے منع کیا ہے، جب تک کہ وہ اس حال پر ہیں۔

اِحصان کا معنی:

لفظِ ﴿اُحْصِنَّ﴾ کو بصیغہ مجہول و معروف دونوں طرح پڑھا ہے، دونوں کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، اسود بن یزید، زر بن حبیش رضی اللہ عنہم، امام سعید بن جبیر، نخعی، شعبی، زہری رحمہم اللہ اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نزدیک احصان سے مراد اسلام ہے۔[6] امام شافعی نے بھی اسی پر نص کی ہے۔ صاف لفظوں میں کہا ہے۔ پھر کہا کہ یہ ہم نے اس لیے کہا ہے کہ سنت یہی ہے اور اہلِ علم کا اجماع اسی پر ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ «إِحْصَانُهَا إِسْلَامُهَا وَعَفَافُهَا» (رواه ابن أبي حاتم) پھر کہا ہے کہ اس جگہ مراد تزویج ہے۔ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تم ان کو کوڑے مارو۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ اس میں ایک راوی مجہول ہے،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٣٣)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٢) سنن الدارقطني (٣/ ٢٢٧) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١١٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور روایت کے آخری حصے کو (زانیہ وہی ...) ''موقوف صحیح'' کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل: ٦/ ٢٤٨)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٦٢٠۔ ٦٢١)

[4] تفسير الطبري (٨/ ١٩٣)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٢٢)

[6] تفسير الطبري (٨/ ١٩٩۔ ٢٠١) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٢٣)

ایسی حدیث سے حجت قائم نہیں ہوسکتی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، طاؤس، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ احصان سے مراد تزویج ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کنیز کا احصان یہ ہے کہ کوئی آزاد مرد اُس سے نکاح کر لے۔ غلام کا اِحصان یہ ہے کہ کوئی آزاد عورت اُس کے نکاح میں آئے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ دونوں قراءت کے معنی الگ الگ ہیں، صیغۂ معروف کے معنی اسلام ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اس معنی کو مقرر رکھ کر اس قول کی نصرت فرمائی ہے۔[3] اظہر۔ واللہ أعلم۔ یہ ہے کہ اس جگہ مراد نکاح کرنا ہے، کیوں کہ آیت کی ترکیب اور سیاق کی دلالت۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ ﴾ کے مطابق اسی پر ہے۔

لہٰذا جب آیتِ کریمہ کا سیاق فَتَيَات مُؤْمِنَات میں ہوا تو یہ بات متعین ہوگئی کہ "اُحْصِنَّ" سے مراد "تَزَوَّجْنَ" ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی تفسیر کی ہے،[4] مگر دونوں اقوال پر جمہور کے مذہب پر اشکال لازم آتا ہے، کیوں کہ جمہور یہ کہتے ہیں کہ لونڈی جب زنا کرے گی تو پچاس درے مارے جائیں گے، خواہ مسلمہ ہو یا کافرہ، شادی شدہ ہو یا کنواری، حالاں کہ آیت کا مفہوم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ غیر محصنہ کنیز پر زنا کی حد نہ لگائی جائے۔ جمہور نے اس اشکال کے مختلف جواب دیے ہیں۔ جمہور کے نزدیک زبان سے کہی ہوئی بات (یعنی منطوق) مفہوم پر مقدم ہے۔

لونڈیوں کی حد:

احادیث عموماً لونڈیوں پر حد قائم کرنے کے بارے میں آئی ہیں، کیوں کہ ہم نے اُن حدیثوں کو آیت کے مفہوم پر مقدم کیا ہے۔ صحیح مسلم میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں کہا: اے لوگو! لونڈیوں پر حد قائم کرو، خواہ وہ محصنہ ہوں یا غیر محصنہ، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک کنیز نے زنا کیا تھا۔ مجھ کو حکم دیا کہ میں اس کو کوڑے ماروں۔ ناگاہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ تازہ نفاس میں آئی تھی، میں ڈرا کہ اگر اسے کوڑے مارتا ہوں تو کہیں وہ مر نہ جائے۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ فرمایا: تو نے اچھا کیا، اس کو چھوڑ دے، یہاں تک کہ وہ پاک ہو۔[5]

عبداللہ بن احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: « فَإِذَا تَعَافَتْ مِنْ نِّفَاسِهَا فَاجْلِدْهَا خَمْسِيْنَ »[6] "جب وہ نفاس سے پاک ہو جائے تو اس کو پچاس کوڑے مارنا" سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے اور اُس کا زنا ظاہر ہو تو اس پر حد لگائے، ملامت نہ کرے، پھر اگر دوبارہ زنا کرے تو پھر اس پر حد لگائے،

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۲۳) تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦٢١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے، اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[2] تفسیر الطبري (۸/ ۲۰۱۔ ۲۰۲) [3] تفسیر الطبري (۸/ ۱۹۵۔ ۱۹۸) [4] تفسیر الطبري (۸/ ۲۰۱) اس کی سند حسن ہے۔
[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۰۵) [6] مسند أحمد (۱/ ۱۳٦)

ملامت نہ کرے، پھر اگر تیسری بار زنا کرے اور ظاہر ہو تو اس کو فروخت کر ڈالے، اگرچہ بالوں کی ایک رسی کے عوض ہی کیوں نہ بیچے۔ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب تین بار زنا کرے تو چوتھی بار میں اس کو بیچ دے۔[1]

عبداللہ مخزومی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے چند نوجوانانِ قریش کے سامنے حکم دیا کہ میں ولائد اماءت کو زنا پر پچاس پچاس کوڑے ماروں۔[2] اس شخص کا دوسرا جواب، جو یہ کہتا ہے کہ غیر محصن کنیز کو مارنا حد نہیں، بلکہ تادیب ہے، یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ طاؤس، سعید بن جبیر اور قاسم بن سلام رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ داود ظاہری رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں، ان کی عمدہ دلیل آیت کا مفہوم ہے، یہ مفہوم مفاہیمِ شرط سے ہیں۔

اکثر علما کے نزدیک ایسا مفہوم حجت نہیں ہے، پس ان کے نزدیک یہ مفہوم عموم پر مقدم ہوگا۔ سیدنا ابوہریرہ اور زید بن خالد رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کنیز نے زنا کیا ہے اور وہ محصنہ نہیں ہے؟ فرمایا: اگر زنا کرے حد مارو، پھر زنا کرے پھر حد مارو، پھر زنا کرے تو ایک رسی پر فروخت کر دو۔ ابن شہاب رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کام تیسرے زنا کے بعد کرے یا چوتھے زنا کے بعد۔[3] (أخرجاه في الصحيحين) یہاں عدد کی حد مقرر نہیں کی، جس طرح محصنہ میں کی تھی، یا جس طرح قرآن پاک میں توقیت فرمائی تھی کہ ان کی حد محصنات کی حد سے نصف ہے۔ اس لیے آیات و احادیث کو بطورِ مذکور جمع کرنا واجب ہوا۔ واللہ أعلم.[4]

اس سے زیادہ صریح تر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث ہے کہ کنیز پر اس وقت تک حد نہیں ہے، جب تک وہ محصنہ نہ ہو۔ جب محصنہ ہو جائے گی تو اس پر محصنات کی حد سے نصف حد ہے۔[5] (رواه سعيد بن منصور) لیکن اس حدیث کا موقوف ہونا سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے مشابہہ ہے اور اس سلسلے میں فیصلے عیاں ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے کئی جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دونوں احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے شادی شدہ کنیز پر محمول ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں لفظِ حد بدلیلِ جوابِ ثالث بعض راویوں کی طرف سے آ گیا ہے کہ یہ حدیث دو صحابیوں کی ہے اور وہ فقط ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔ لہٰذا دو کی روایت ایک کی روایت سے زیادہ مقدم ہے۔ نیز نسائی رحمہ اللہ نے عباد بن تمیم عن عمہ سے مروی حدیث میں، جو شرطِ مسلم پر ہے، اس طرح روایت کیا

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٣)
2. الموطأ (٢/ ٨٢٧) سنن البيهقي الكبرىٰ (٨/ ٢٤٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٨/ ١٤)
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٤)
4. تفسير ابن كثير (١/ ٦٢٢)
5. المعجم الأوسط (١/ ١٥٣) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ نیز روایت کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کا موقوف ہونا راجح ہے۔ (فتح الباري: ١٢/ ١٦١)

ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب لونڈی زنا کرے تو کوڑے مارو، پھر زنا کرے تو پھر اس کو مارو، پھر زنا کرے تو پھر کوڑے لگاؤ، پھر زنا کرے تو ایک رسی پر بیچ ڈالو۔[1] چوتھے: کچھ دور نہیں کہ بعض راویوں نے لفظ حد کا اطلاق جلد (کوڑے مارنا) پر کیا ہو۔ جَلد کو حد سمجھا ہو، لفظ حد کا اطلاق تادیب پر کیا ہو، جس طرح حد کا اطلاق بیمار زانی پر کیا گیا ہے، جس کو عثکال سے مارا تھا، یعنی درخت خرما کی ایک شاخ سے، جس میں سو شاخیں تھیں یا اس شخص کو کوڑے لگانے پر جس نے اپنی بیوی کی کنیز سے اس کی اجازت سے زنا کیا، حالاں کہ یہ تعزیر تادیب ہے۔ احمد رحمہ اللہ وغیرہ سلف کے نزدیک حقیقی حد یہی ہے کہ بکر (کنواری) کو سو کوڑے مارنا اور ثیب یا لائط کو رجم کرنا ہے۔ واللّٰه أعلم.

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: "لَا تُضْرَبُ الْأَمَةُ إِذَا زَنَتْ مَا لَمْ يَتَزَوَّجْ"[2] (رواہ ابن ماجه و ابن جرير) (اگر لونڈی زنا کرے اور اس کی شادی نہیں ہوئی تو اس کو نہ مارا جائے) اس کی اسناد صحیح ہے، مگر یہ مذہب غریب ہے۔ اگر مراد یہ ہے کہ اُس کو اصلاً بطورِ حد نہ ماریں، گویا آیت کے مفہوم کو لیا ہے ان کو حدیث نہیں پہنچی اور اگر یہ مراد ہے کہ بطورِ حد نہ ماریں اور تادیباً ماریں تو یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی مثل ہوا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ قبل اِحصان آزاد کی حد کی نصف کنیز محصنہ کی حد ہے، کیوں کہ کتاب وسنت کی سو کوڑوں کی حد کی عمومیت اس کو شامل ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ [النور: ۲] "چناں چہ زانیہ عورت اور زانی مرد، ان دونوں میں سے ہر ایک کو تم سو کوڑے مارو۔"

جیسے سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث میں ہے: «خُذُوْا عَنِّيْ، خُذُوْا عَنِّيْ، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا، اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ، وَتَغْرِيْبُ عَامٍ. وَّالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ، وَّرَجْمُهُمَا بِالْحِجَارَةِ» "مجھ سے لے لو، مجھ سے لے لو، اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لیے راستہ نکال دیا ہے، کنوارے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور شادی شدہ کی سزا سو کوڑے اور رجم کرنا ہے۔" اور یہ حدیث صحیح مسلم وغیرہ میں مروی ہے۔[3]

یہ قول داود ظاہری رحمہ اللہ سے مشہور ہے، لیکن نہایت ضعف میں ہے، کیوں کہ جب اللہ نے محصنہ کنیز کو آزاد عورت کی سزا سے نصف کوڑے یعنی پچاس کوڑے لگانے کا حکم دیا تو پھر اُس کا اِحصان سے پہلے حکم احصان سے بعد سے زیادہ تر سخت کس طرح ہوگا؟ حالاں کہ ایسے امور میں شریعت کا قاعدہ اس کے برعکس ہے۔ شارع علیہ السلام سے اصحاب رضی اللہ عنہم نے پوچھا تھا کہ کنیز زانیہ غیر محصنہ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: کوڑے مارو اور سو عدد نہ کہا۔ لہٰذا اگر ایسی کنیز کا حکم ویسا ہی ہے، جیسے داود رحمہ اللہ نے خیال کیا ہے تو اصحاب کے لیے اس کا بیان کرنا واجب ہوتا۔ کیوں کہ انھوں نے

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٢٩٨) امام نسائی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد "ابو اویس" راوی کو ضعیف کہا ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیح میں ہے، جیسا کہ زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکا ہے۔

[2] تفسير الطبري (٨/ ٢٠٢) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٠)

سوال ہی اس لیے کیا تھا کہ لونڈیوں کے حق میں اِحصان کے بعد سو کوڑے لگانے کا حکم بیان نہیں ہوا تھا، ورنہ اس کہنے میں کہ وہ محصنہ نہیں ہے، کیا فائدہ تھا؟ کیوں کہ پھر محصنہ اور غیر محصنہ دونوں میں کچھ فرق نہ ہوتا اگر آیت نہ اُترتی۔ لیکن جب انھوں نے ایک حکم معلوم کر لیا تو دوسرا حکم پوچھا، اس کو نبی اکرم ﷺ نے بیان فرما دیا، جس طرح صحیحین میں مروی ہے کہ جب درود کا حکم دریافت کرنے پر آپ ﷺ نے بتا دیا، پھر فرمایا: سلام کو تم خود جانتے ہو۔[1] ایک روایت میں یوں ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ٥٦] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: سلام کو تو ہم نے پہچان لیا، اب درود کس طرح بھیجیں۔[2] (الحدیث)

اسی طرح اس سوال کا حال ہے۔ چوتھا جواب مفہومِ آیت سے ابو ثور رحمہ اللہ کا جواب ہے۔ وہ قولِ داود رحمہ اللہ سے بھی کئی وجہ سے زیادہ تر غریب ہے، کیوں کہ ابو ثور رحمہ اللہ یہ کہتے کہ جب کنیز محصنہ ہوگئی تو اب اُس پر محصنات (شادی شدہ) کی نصف حد ہے، یعنی رجم اور رجم کا نصف ہو نہیں سکتا تو پھر کنیز محصنہ کو زنا پر رجم کریں گے اور احصان سے پہلے پچاس کوڑے ماریں گے۔ ان سے آیت کو سمجھنے میں خطا ہوئی اور وہ اس حکم میں جمہور کے مخالف ہیں، بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مسلمان اس بات میں مختلف نہیں ہیں کہ لونڈی پر زنا میں رجم نہیں ہے، کیوں کہ اس پر آیت دلیل ہے کہ کنیز پر محصنات کے عذاب کا نصف ہے۔ محصنات کا الف لام عہد کے لیے ہے، مراد وہ محصنات ہیں جن کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں آیا ہے: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اور ان سے مراد بغیر کسی روک ٹوک کے فقط آزاد عورتیں ہیں اور ان کا نکاح آزاد سے ہوا ہو۔ اور نصف عذاب کے الفاظ اس بات پر دلیل ہیں کہ عذاب سے مراد وہ عذاب ہے، جس کے حصے کرنا ممکن ہے، سو وہ کوڑے مارنا ہے نہ کہ رجم کرنا۔ واللہ أعلم.

حسن بن سعید رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ صفیہ نے ایک قریشی مرد سے زنا کیا تھا، اُس سے ایک بچہ ہوا، زانی نے اُس کا دعویٰ کیا، جھگڑا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا، انھوں نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں وہ حکم دوں گا جو نبی اکرم ﷺ نے دیا تھا: « اَلْوَلَدُ لِلْفَرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ ». پھر دونوں کو پچاس پچاس کوڑے لگائے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ مفہوم سے مراد اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ کرنا ہے، یعنی لونڈیوں کا حکم، اگرچہ محصنہ ہوں، آزاد سے آدھی مقدار پر ہے، ان پر رجم اصلاً نہیں ہے، نہ نکاح سے قبل نہ نکاح کے بعد، بلکہ سنتِ مطہرہ کے مطابق ان پر دونوں حالتوں میں کوڑے لگانا ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٩٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٠٥) [2] المعجم الکبیر (١٩/ ١٢٥)

[3] مسند أحمد (١/ ١٠٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفیه الحجاج بن أرطاة وهو مدلس وبقیة رجال أحمد ثقات'' (مجمع الزوائد: ٤/ ٦٤٨) نیز اس کی اصل صحیحین میں ہے۔ صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٩٤٨) صحیح مسلم (١٤٥٧)

یہ بات صاحبِ کتاب الافصاح نے کہی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی مذکور ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس قول کو کتاب السنن والآثار میں ذکر کیا ہے، [1] لیکن لفظِ آیت کے لفظ سے بعید ہے، اس لیے ہم نے تنصیفِ حد کا استفادہ آیت سے کیا ہے، آیت کے سوا کسی اور چیز سے نہیں تو پھر اس سے اس کے علاوہ میں تنصیف کیسے سمجھی جائے گی؟ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا: مراد یہ ہے کہ احصان میں اُس پر امام حد قائم کرے گا، ایسی حالت میں سید کو حد جاری کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

یہ احمد رحمہ اللہ کا بھی ایک قول ہے، لیکن احصان سے قبل سید حد جاری کر سکتا ہے اور حد دونوں موضع میں وہی آزاد کی حد سے نصف ہے اور یہ بعید ہے، کیوں کہ آیت میں اس بات پر دلیل نہیں ہے اور اگر یہ نہ ہوتا تو ہمیں لونڈی کی سزا نصف ہونے کا علم نہ ہوتا، بلکہ اُن کا عام آیت کی سزا میں داخل ہونا، یعنی سو کوڑے اور رجم واجب آتا۔ جس طرح کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں، جو پہلے گزر چکی ہے، دلالتاً ثابت ہے کہ اے لوگو! اپنی لونڈی پر حد قائم کرو، وہ محصن ہو یا غیر محصن۔ اسی طرح پہلے بیان کی گئیں احادیث عام ہیں، ان میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی تفصیل نہیں ہے۔ اس کی دلیل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جو جمہور کی حجت ہے کہ جب اس کا زنا ظاہر ہو تو کوڑے لگائے، ملامت نہ کرے۔ [2]

خلاصۂ بحث:

آیتِ شریفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کنیز سے جب زنا واقع ہو تو اس میں کئی قول ہیں: ایک یہ کہ احصان سے قبل یا بعد پچاس کوڑے مارے۔ پھر اس کو جلا وطن کرنے میں تین قول ہیں: ایک نفی (شہر بدر کرنا) دوسرا مطلقاً عدمِ نفی، سوم نفی نصف سال اور یہ نصف نفی حرہ ہے۔ یہ اختلاف شافعی مذہب میں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نفی تعزیر ہے، اتمام حد میں سے نہیں ہے، بلکہ امام کی رائے پر ہے، اگر چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ اس میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نفی مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں، کیوں کہ یہ ان کے بچاؤ کے خلاف ہے اور مردوں اور عورتوں کی نفی کے بارے میں کچھ نہیں آیا۔ ہاں سیدنا عبادہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زانی غیر محصن کے بارے میں نفی عام اور اقامتِ حد کا حکم دیا۔ [3] (رواہ البخاري) اور یہ ایک معنی کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ معنی یہ ہیں کہ نفی سے مقصود صون (حفاظت کرنا) ہے اور یہ صون نفیِ نساء میں مفقود ہے۔ واللہ أعلم.

---

[1] معرفة السنن والآثار (١٢/ ٣٣٧) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٦٢٢ـ ٦٢٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٠)

دوسرا قول یہ ہے کہ لونڈی سے جب زنا ہو جائے تو احصان کے بعد پچاس کوڑے مارے، یہ مارنا تادیب کے لیے ہے اور کسی خاص عدد کے ساتھ محدود نہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول گزر چکا ہے کہ احصان سے قبل نہ ماریں اور اگر مراد نفی ہے تو یہ مذہب تاویل کے ساتھ ہوگا، ورنہ دوسرے قول کی طرح ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ احصان سے پہلے سو کوڑے مارے اور احصان کے بعد پچاس۔ امام داود ظاہری رحمہ اللہ سے اسی طرح پر مشہور ہے، مگر بہت ضعیف قول ہے۔ امام ابو ثور رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احصان سے پہلے پچاس کوڑے مارے اور احصان کے بعد رجم کرے، یہ قول بھی سخت ضعیف ہے۔ واللہ أعلم بالصواب۔[1]

لونڈی سے نکاح کی صورت:

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ کنیز کے ساتھ نکاح کرنا پہلے دی گئیں شرائط کے ساتھ اس شخص کے لیے درست ہے، جس کو اپنی جان سے زنا واقع ہونے کا خوف ہو، اس پر جماع سے صبر کرنا مشکل ہو اور اس وجہ سے وہ مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہو، ایسی صورت میں اس کا لونڈی سے نکاح کرنا درست ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ نکاح ترک کرے اور زنا سے بچنے کے لیے مجاہدۂ نفس بجا لائے تو یہ بہتر ہے، کیوں کہ جب لونڈی سے نکاح کرے گا اور بچے پیدا ہوں گے تو وہ سب سید کنیز کے لونڈی اور غلام ٹھہریں گے، مگر یہ کہ شوہر غریب ہو تو اس کی اولاد، امام شافعی رحمہ اللہ کے قدیم قول کے مطابق رقیق (غلام) نہیں ہوگی۔

اس آیتِ کریمہ سے جمہور علما نے لونڈی سے نکاح کرنے کے جائز ہونے کی دلیل لی ہے، اس بنا پر کہ آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت نہ ہونا اور حرام کاری کا خوف ہونا اہم بات ہے، لیکن لونڈی سے نکاح کرنے میں اولاد کا غلام ہونے اور نفس کے کمینہ ہونے کا نقصان ہے، کیوں کہ وہ آزاد عورت کو چھوڑ کر اس سے نکاح کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور حنفیہ نے ان دونوں امور کے اشتراط میں جمہور سے اختلاف کیا ہے اور اس طرح کہا ہے کہ مرد پہلے سے کسی آزاد عورت کا شوہر نہ ہو تو اس کے لیے مومنہ اور کتابیہ کنیز سے نکاح کرنا جائز ہے۔ خواہ وہ آزاد عورت کی رضا مندی کو حاصل کرے یا نہ کرے اور خواہ اس کو کسی مشکل میں پڑنے کا خوف ہو یا نہ ہو، ان کی بنیادی دلیل یہ آیتِ شریفہ ہے: ﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ [المائدۃ: ٥] أي العَفَائِفُ. سو عفائف آزاد اور لونڈیوں دونوں میں شامل ہیں اور یہ آیت عام ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نیز یہ آیت قولِ جمہور پر ظاہری دلیل ہے۔ واللہ أعلم۔[2]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٢٤)
[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٢٤_ ٦٢٥)

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝۲۷ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝۲۸

اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے (یہ معاملات) کھول کر بیان کرے اور تمھیں تم سے پہلے کے نیک لوگوں کی راہ پر چلائے اور تم پر توجہ دے، اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے 26 اور اللہ تم پر توجہ دینا چاہتا ہے، اور وہ لوگ جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم (حق سے) بہت دور ہو جاؤ 27 اللہ چاہتا ہے کہ تمھارا بوجھ ہلکا کر دے اور انسان بہت کمزور پیدا کیا گیا ہے 28

سابقہ شریعتوں کی اتباع کا مسئلہ:

یعنی بری صحبت جو آدمی کے دل کو برے کام پر لگائے اور شرع کی پابند نہ رہنے دے۔ شرع میں کسی چیز کی تنگی نہیں ہے کہ کوئی حلال کو چھوڑے اور حرام کی طرف دوڑے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم تم کو حرام حلال بتا دیں، اس سے مراد وہ امور ہیں، جو اس سورت وغیرہ میں پہلے لوگوں کی راہ سے مذکور ہیں۔ یعنی ان کے قابلِ تعریف طریقے اور محبوب و پسندیدہ شریعتوں کی پیروی مراد ہیں۔

پھر فرمایا کہ اللہ گناہوں اور محارم سے تمھاری توبہ قبول فرماتا ہے۔ وہ اپنی شریعت و تقدیر اور اپنے افعال اور اقوال میں حکمت والا ہے۔ اور یہود و نصاریٰ میں سے زانی مرد اور عورتیں جو شیاطین کے متبعین ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم حق سے پھر کر باطل کی طرف آ جاؤ۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ شریعت اور اوامر و نواہی وغیرہ میں تم سے تخفیف کرے، اس لیے پہلے دی گئی شرائط کے مطابق لونڈیوں کو تمھارے لیے مباح کر دیا ہے۔

تخفیف، اسلام کا حسن:

امام مجاہد رحمہ اللہ کا یہ قول ہے، کیوں کہ جب انسان اپنی جان، عزم و ہمت میں کمزور ٹھہرا تو اس کے لیے تخفیف مناسبِ حال ہے۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسان ضعیف پیدا ہوا ہے، یعنی عورتوں کے معاملے میں۔ امام وکیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عورتوں کے پاس انسان کی عقل جاتی رہتی ہے۔[1] موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٢٦)

کہا، جب شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ سے واپس ہو کر آپ ﷺ کا گزر اُن پر ہوا، کہ تم پر کیا فرض ہوا؟ فرمایا: مجھے ہر دن رات میں پچاس نمازوں کا حکم دیا ہے۔ کہا: اپنے رب کے پاس پھر جاؤ اور تخفیف مانگو، کیوں کہ تمھاری امت اس کی طاقت نہیں رکھے گی۔ میں نے تم سے پہلے لوگوں کو آزمایا ہے، اس سے بھی کم تر پر وہ عاجز نکلے، تمھاری امت تو آنکھ، کان اور دل میں زیادہ کمزور ہے۔ نبی اکرم ﷺ پھر گئے، دس نمازیں کم ہوئیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے۔ اسی طرح آتے جاتے رہے، یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔[1] (الحدیث)

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں کہا ہے کہ آیت زیرِ تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ تم سے پہلے مائیں، بیٹیاں اور بہنیں پہلے لوگوں پر حرام تھیں۔ اسی طرح تم پر بھی حرام ہیں، تم ان کی راہ پر چلو۔ مراد پہلے انبیا اور رسولوں کے پیروکار ہیں۔ اس جگہ شہوات سے مراد وہ چیز ہے، جو شرع میں حرام ہے۔ متبعینِ شہوات سے مراد زنا کرنے والے ہیں یا اہلِ کتاب یا خاص یہودی یا مجوسی، کیوں کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان لوگ بہنوں اور بھتیجیوں کے ساتھ نکاح کرنے میں ان کی پیروی کریں۔ مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ انسان ضعیف پیدا ہوا ہے، عاجز ہے۔ نفس پر ضبط کرنے اور شہوت کو دور ہٹانے پر قادر نہیں ہے۔ عورتوں سے تھوڑا ہی صبر کر سکتا ہے۔ اُس کے حق کو پورا کرنے اور تکلیف پر صبر کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ اس حیثیت سے وہ تخفیف کا محتاج ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اُس کے ساتھ تخفیف کا ارادہ کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ضعف سے مراد اس کی پیدایش کی اصل ہے۔ اس لیے کہ ایک ذلیل پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خواہشِ نفس اس کو اِدھر سے اُدھر مائل کر دیتی ہے۔ اس لیے وہ خواہشات کی وجہ سے ضعیف العزم ٹھہرا۔[2]

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَأْكُلُوٓاْ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَٰنًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ إِن تَجْتَنِبُواْ كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ، مگر یہ کہ آپس کی رضا مندی سے تجارت ہو، اور تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر بہت رحم کرنے والا ہے (29) اور جو شخص سرکشی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢)
[2] فتح البيان (٣/ ٩١۔ ٩٢)

اور ظلم سے ایسے (نافرمانی کے) کام کرے گا، تو اسے ہم جلد آگ میں ڈالیں گے اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے (30) اگر تم بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں روکا جاتا ہے تو ہم تمھاری (چھوٹی چھوٹی) برائیاں تم سے دور کر دیں گے اور تمھیں عزت کی جگہ میں داخل کریں گے (31)

یعنی مغرور نہ ہو کہ ہم مسلمان ہو کر دوزخ میں کیوں کر جائیں گے۔ اللہ پر یہ بھی آسان ہے۔ کبیرہ گناہ وہ ہیں جن پر قرآن میں یا حدیث میں صاف دوزخ کا وعدہ دیا، یا اللہ کا غصہ یا حد مقرر فرمائی اور تقصیر وہ کہ اس سے منع فرمایا اور کچھ زیادہ نہیں۔ موضح القرآن میں اسی طرح ہے۔

حرام کمانے سے ممانعت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ ایک دوسرے کا مال ناحق، ناجائز یا غیر شرعی کمائی کے ذریعے کھائیں، جیسے سود، جوا یا اس جیسے دیگر حیلوں سے، اگرچہ وہ شرعی حکم کی صورت میں غالباً ظاہر کیوں نہ ہوں۔ مگر اللہ تو جانتا ہے کہ اُس کا بجا لانے والا حیلہ گر ہے۔ بہانے سے ربا (سود) کھانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے کپڑا خریدتا ہے، کہتا ہے اگر تو راضی ہے تو میں اس کو لیتا ہوں، ورنہ اس کو واپس کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ایک درہم واپس کرتا ہوں۔ ایسے ہی شخص کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہوئی اور نہ قیامت تک منسوخ ہوگی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری، تو مسلمانوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع کیا ہے کہ ہم آپس کے مال باطل طریقے سے کھائیں۔ طعام سب سے افضل مال ہے، اب ہم میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ کسی کے پاس کھانا کھائے، پھر اور لوگوں کے پاس کس طرح کھائے گا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیت نازل کی: ﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ [النور: ٦١] ”اندھے پر کوئی حرج نہیں اور نہ لنگڑے ہی پر حرج ہے اور نہ مریض پر ہی کوئی حرج ہے اور نہ خود تمھی پر (کوئی حرج ہے) کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں یا اپنی ماؤں کے گھروں یا اپنے بھائیوں کے

---

(1) تفسير الطبري (٨/ ٢١٧)

گھروں یا اپنی بہنوں کے گھروں یا اپنے چچاؤں کے گھروں یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں یا اپنے ماموؤں کے گھروں یا اپنی خالاؤں کے گھروں یا (ان گھروں سے) جن کی چابیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں (کے گھروں) سے، (اس میں بھی) تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم مل کر کھاؤ یا الگ الگ، پھر جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں پر سلام کہو، (یہ) اللہ کی طرف سے بابرکت (اور) پاکیزہ تحفہ ہے، اسی طرح اللہ تمھارے لیے آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھو۔"[1] اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2]

خرید و فروخت کے لیے رضا مندی کی شرط:

پھر فرمایا کہ اموال کے کمانے میں حرام اسباب (ذرائع) اختیار نہ کرو، لیکن وہ تجارت جو جائز ہے، وہ یہ کہ وہ تجارت بیچنے اور خریدنے والے کی باہم رضا مندی سے ہو۔ تم ایسی تجارت کرو اور اُسے مال حاصل کرنے کا ذریعہ ٹھہراؤ، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾ [الأنعام: ١٥١] "اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو۔" نیز اس فرمان کے مطابق: ﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ﴾ [الدخان: ٥٦] "وہاں وہ موت (کا مزہ) نہ چکھیں گے، سوائے پہلی موت کے۔"

امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیتِ کریمہ سے اس بات کی دلیل لی ہے کہ رضا مندی کے بغیر خرید و فروخت صحیح نہیں، کیوں کہ قبولیت رضا مندی پر دلالت کرتی ہے، معاطات (لین دین) کے خلاف کہ وہ رضا مندی کی دلیل نہیں ہے اور رضا مندی ضروری ہے، جمہور نے اس کے خلاف کہا ہے۔ امام مالک، ابو حنیفہ اور احمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ جس طرح سارے اقوال رضا مندی پر دلیل ہیں، اسی طرح بعض حالات میں افعال بھی رضا پر قطعاً دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا بیع معاطات قطعاً صحیح ہے۔ پھر بعض نے کہا ہے کہ معاطات، محقرات (ان معمولی اور حقیر چیزوں) میں جس کو لوگ بیع گنتے ہیں، اس میں صحیح ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ احتیاط محققینِ مذہب سے ایک نظر ہے۔[3] واللہ أعلم.

رضا مندی کا تقاضا مجلس کے اختیار کا اثبات:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے مراد بیع ہے یا عطا، جو کوئی کسی کو دیتا ہے۔ مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ بیع باہم رضا مندی سے ہوتی ہے اور صفقہ یعنی سودا کرنے کے بعد اختیار ہوتا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ کسی مسلمان کو دھوکا دے۔[4] (رواہ ابن جریر مرسلا عن میمون بن مہران) خیارِ مجلس کا اثبات رضا مندی کے تمام ہونے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٢٦۔ ٩٢٧) ان دونوں کی اسناد حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٢٧)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٢٥، ٦٢٦) [4] تفسیر الطبري (٨/ ٢٢١) یہ روایت مرسل ہے۔

میں سے ہے، جس طرح صحیحین میں مروی ہے: «اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا»[1] ''خرید وفروخت کرنے والے دونوں افراد کو اس وقت تک اختیار ہے، جب تک ایک دوسرے سے علاحدہ نہ ہو جائیں۔'' اسی حدیث کے مقتضا کی طرف امام احمد اور شافعی رحمہ اللہ گئے ہیں اور جمہور سلف وخلف اسی پر ہیں۔

اس سے خریدنے اور سودا کرنے کے بعد تین دن تک سامان کی حالت واضح ہو جانے کے حسبِ حال اختیار کی شرط کی مشروعیت اور جواز بھی نکلتا ہے، بلکہ اگر بستی وغیرہ میں ایک سال تک کی شرط مقرر کی جائے تو جائز ہے، امام مالک رحمہ اللہ سے اسی طرح مشہور ہے۔ علما نے بیع معاطات کو مطلقاً صحیح کہا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول بھی یونہی ہے۔

اپنی جان کو قتل کرنے کی وعید:

پھر فرمایا: تم حرام چیزوں اور اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کر کے اپنی جان کو ہلاک نہ کرو کہ ناحق لوگوں کا مال کھاؤ اور اڑا دو۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات السلاسل کے سال بھیجا تھا، وہ کہتے ہیں کہ ایک سخت سرد رات میں مجھے احتلام ہوگیا، میں ڈرا کہ اگر نہاتا ہوں تو مر نہ جاؤں، میں نے تیمّم کر کے لوگوں کو صبح کی نماز پڑھا دی۔ جب ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو یہ ذکر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو! تو نے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی اور تو جنابت کی حالت میں تھا؟! میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایک ٹھنڈی رات میں احتلام ہوا تھا، میں ڈرا کہ اگر نہاتا ہوں تو کہیں مر نہ جاؤں، مجھے اللہ پاک کا قول یاد آیا: ﴿ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اس لیے میں نے تیمّم کیا، پھر نماز پڑھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیے اور کچھ نہ فرمایا۔[2] (رواه أحمد وهكذا رواه أبو داود)

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور وہ جنابت کی حالت میں تھے، جب لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس بات کا ذکر کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بلا کر پوچھا، تو انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں ڈرا کہ کہیں سردی مجھ کو قتل نہ کر ڈالے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔[3]

پھر امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس آیت کے نیچے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث لکھی ہے کہ جس نے اپنی جان کو لوہے سے قتل کیا، وہ لوہا اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ اُس کو قیامت کے دن اپنے پیٹ میں ٹھونکے گا۔ وہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٣٢)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٠٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [إرواء الغليل: ١/ ١٨١]

[3] المعجم الكبير (١١/ ٢٣٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه يوسف بن خالد السمتي وهو كذاب" (مجمع الزوائد: ١/ ٥٩٣)

جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہے گا۔ جس نے اپنے آپ کو زہر سے قتل کیا، وہ زہر اُس کے ہاتھ میں ہوگا، جس کو وہ ہمیشہ جہنم میں پیا کرے گا۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔[1] سیدنا ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو کسی شَے سے قتل کیا، وہ قیامت کے دن اسی چیز سے عذاب کیا جائے گا۔[2] (أخرجه الجماعة في كتبهم)

سیدنا جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے ایک آدمی تھا، اس کے ایک زخم تھا، اس نے چھری لے کر اپنے ہاتھ کو کاٹ دیا، لیکن خون نہ تھما، یہاں تک کہ وہ مر گیا، اللہ جل جلالہ نے کہا: میرے بندے نے اپنی جان کے معاملے میں جلدی کی، میں نے جنت کو اس پر حرام کر دیا۔[3] (رواه الشيخان) اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کوئی یہ کام سرکشی اور ظلم سے کرے گا، یعنی اس کو حرام جانتے ہوئے بھی اپنی جان پر جسارت کرے گا تو ہم اس کو آگ میں ڈالیں گے، یہ سخت قسم کی ڈانٹ اور وعید ہے، ہر عقل مند اور دانش مند کو اس سے بچنا چاہیے۔

کبیرہ گناہوں سے بچنا صغیرہ گناہوں کا کفارہ:

پھر فرمایا کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچو گے، جن سے منع کیے گئے ہو تو ہم اس اجتناب کو تمھارے صغائر (چھوٹے گناہوں) کا کفارہ کر دیں گے تم کو بہشت میں لے جائیں گے، اسی لیے فرمایا ہے: ﴿وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: جو ہمارے پاس ہمارے رب کی طرف سے پہنچا ہے، ہم نے اس جیسا نہیں دیکھا ہے۔ پھر ہم اس کے لیے اپنے تمام اہل اور مال سے نہ نکلے؟ اللہ تعالیٰ نے ہمارے صغیرہ گناہوں سے تجاوز کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾[4] اس آیتِ کریمہ کے متعلق بہت حدیثیں آئی ہیں۔

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو جانتا ہے کہ جمعہ کا دن کیا ہے؟ میں نے کہا: اس دن میں اللہ نے آپ کے باپ کو جمع کیا، یعنی آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ فرمایا: لیکن میں جانتا ہوں کہ جمعہ کا دن کیا ہے، جو شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے، پھر جمعہ کو آتا ہے، خاموش بیٹھا رہتا ہے، یہاں تک کہ نماز امام پڑھ چکے تو یہ اس کے لیے اس جمعہ اور آیندہ جمعہ کے درمیان کفارہ ہوتا ہے، جب تک وہ مقتلہ (کبیرہ گناہ) سے بچتا ہے۔ (رواه أحمد)

امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٣٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٧٧٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣)

[4] مسند البزار (١٣/ ٥١١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه الجلد بن أيوب وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ٥٨)

[5] مسند أحمد (٥/ ٤٣٩) صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٤٣)

سیدنا ابوہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے خطبے میں فرمایا کہ نہیں ہے کوئی بندہ کہ وہ پنج گانہ نماز پڑھے رمضان کے روزے رکھے اور زکات نکالے اور ساتوں کبیرہ گناہوں سے بچے، مگر اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے: «اُدْخُلْ بِسَلَامٍ» [1] ''سلامتی کے ساتھ داخل ہو جا۔''

(رواه ابن جرير وهكذا رواه النسائي والحاكم في مستدركه وابن حبان في صحيحه، قال الحاكم: صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه)

سات ہلاکت خیز گناہوں کی تفسیر:

سات کبیرہ گناہوں کی تفسیر صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یوں مروی ہے: بچو تم سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کیا ہیں؟ فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، اس جان کا قتل کرنا جس کو اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، جادو کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، لڑائی کے دن پیٹھ پھیرنا اور محصنات (پاک دامن) مومنات غافلات (بے خبر) پر زنا کی تہمت لگانا۔ [2]

دوسری روایت یہ ہے کہ سات کبائر ہیں: اِشراک باللہ، قتلِ نفس بغیر حق، اَکلِ ربا، اَکلِ مالِ یتیم یہاں تک کہ وہ بڑا ہو، بھاگنا زحف سے (میدانِ جنگ سے)، تہمت لگانا محصنات پر، ہجرت کرنے کے بعد اپنے علاقے کی طرف لوٹ جانا۔ [3] (رواه ابن أبي حاتم) ان سات کبیرہ گناہوں پر نص ان کبیرہ گناہوں کی نفی نہیں کرتی جو ان کے علاوہ ہیں، لیکن جو شخص مفہومِ مخالف کا قائل ہے، اس کے نزدیک صرف یہ سات کبیرہ گناہ ہیں، لیکن یہ موقف کمزور ہے، بالخصوص جب قرینہ غیر موجود ہو اور منطوق کلام پر دلیل موجود ہو۔ جس طرح اور حدیثوں میں ان سات کے علاوہ اور بھی کبائر آئے ہیں۔

دیگر کبیرہ گناہ:

سیدنا عمیر بن قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نو کبیرہ گناہ بتائے ہیں: والدین کی نافرمانی، بیت الحرام کو حلال کرنا۔ جو شخص ان کبائر کا ارتکاب نہیں کرتا، نماز و زکات پر قائم ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سونے کے گھر میں ہوگا۔ [4] (رواه الحاكم مطولا وقد أخرجه أبو داود، والنسائي مختصرا) اس کی سند میں ایک راوی عبدالحمید بن سنان

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٢٣٧۔ ٢٣٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٣٨) مستدرك الحاكم (٢/ ٢٦٢) صحيح ابن حبان (٥/ ٤٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٣١) مسند البزار (١٥/ ٢٤١) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٧٧)

[4] مستدرك الحاكم (١/ ١٢٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٧٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠١٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٣/ ١٥٤)

ضعیف ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ چند حدیثیں سات کبیرہ گناہوں کے بیان میں مختلف الفاظ اور طرق سے لکھی ہیں۔ شہادتِ زور (جھوٹی گواہی) کا ذکر بھی کیا ہے، اس کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔ بعض میں قتلِ ولد کا ذکر کیا ہے۔ ہمسایہ کی عورت سے زنا کا ذکر فرمایا ہے۔ کسی میں شراب پینے کا ذکر کیا ہے، اس کو ام الخبائث اور اکبر کبائر ٹھہرایا ہے۔ بعض میں یمینِ غموس (جھوٹی قسم) کہا۔ یمین صبر کا ذکر کیا ہے، کسی میں والدین کو گالی دینا کبیرہ فرمایا ہے۔ بعض میں مسلمان کی آبرو ریزی کو اکبر کبائر ٹھہرایا ہے۔ ایک گالی کے عوض دو گالی دینا کبیرہ بتایا ہے۔ دو نمازوں کو بلا عذر جمع کرنا کبیرہ کہا ہے۔ بعض میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی کو کبیرہ فرمایا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مکر سے امن کو اکبر کبائر ٹھہرایا ہے۔ کسی میں اللہ سے بدگمانی کو کبیرہ ٹھہرایا ہے۔ بعض میں پوشیدہ زنا کو کبیرہ کہا ہے۔ کسی میں وصیت میں کمی بیشی یا کسی کا حق تلف کرنے کو کبائر سے گنا ہے۔ بعض میں کہا ہے کہ غلول، یعنی خیانت کبیرہ ہے۔ ان حدیثوں میں بعض موقوف اور اکثر مرفوع ہیں، پھر بعض اقوالِ سلف کا ذکر کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال کو لکھا ہے کہ انھوں نے کہا: سات نہیں، بلکہ سترہ کبیرہ ہیں، بلکہ سات سو، مگر بات یہ ہے کہ استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ نہیں رہتا اور اصرار اور تکرار کے ساتھ کوئی صغیرہ صغیرہ نہیں رہتا۔

پھر کہا: ہر گناہ جس کو اللہ نے آگ یا غضب یا عذاب یا لعنت کے ساتھ ختم کیا ہے، وہ کبیرہ ہے، کبھی یوں کہا ہے کہ جس گناہ سے اللہ نے منع کیا ہے، وہ کبیرہ ہے۔ ایک روایت میں یوں کہا ہے کہ جس چیز سے اللہ کی نافرمانی کی ہے، وہ کبیرہ ہے۔ پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تابعین کے اقوال کو لکھا ہے۔ کسی نے سات کبائر بتائے ہیں، کسی نے زیادہ۔ مغیرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو گالی دینا اکبر کبائر سے ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”وَقَدْ ذَهَبَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الْعُلَمَآءِ إِلىٰ تَكْفِيرِ مَنْ سَبَّ الصَّحَابَةَ“ یعنی صحابہ کو برا کہنا اور ان کو گالی دینا کفر ہے۔ اس قول پر روافض کا کفر ثابت ہوا۔[2]

دشنام بمذہبے کہ طاعت باشد مذہب معلوم اہلِ مذہب معلوم

”جس مذہب میں گالی کو نیکی (ایمان) سمجھا جاتا ہے۔ ایسے مذہب اور مذہب والوں کی حقیقت معلوم ہوگئی۔“

امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں گمان نہیں کرتا کہ کوئی ایک سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دشمن رکھتا ہو اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوست دار ہو۔[3] (رواه الترمذي) میں اسی طرح کی یہ بات بھی کہتا ہوں کہ کوئی شخص سنتِ مطہرہ کا دشمن ہو اور پھر وہ محبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو، یہ نہیں ہوسکتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے بخشش کا وعدہ نہیں کیا، مگر اس شخص کے لیے جو کبائر سے بچتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم کبائر سے بچو اور سیدھے چلو اور خوشخبری لو۔[4]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٣٢) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٢٨۔ ٦٢٣٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٦٨٥) [4] تفسیر الطبري (٨/ ٢٥٥) یہ روایت مرسل ہے۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: «شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي»[1] (رواه ابن مردويه) لیکن اس کی اسناد میں سب طرق سے ضعف ہے سوائے عبدالرزاق کی روایت کے، جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے طریق سے ہے کہ وہ اسناد شرطِ شیخین پر صحیح ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو لفظ مذکور کے ساتھ حسن صحیح کہا ہے۔[2] سنن میں اس کا شاہد موجود ہے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: «أَتَرَوْنَهَا لِلْمُؤْمِنِينَ الْمُتَّقِينَ؟ لَا، وَلٰكِنَّهَا لِلْخَاطِئِينَ وَالْمُتَلَوِّثِينَ» ''تم سمجھتے ہو کہ یہ شفاعت مومنوں اور پرہیز گاروں کے لیے ہوگی؟ ایسا نہیں بلکہ یہ گناہ گاروں کے لیے ہوگی۔''[3]

کبیرہ گناہ کی تعریف:

علمائے اصول وفروع کا کبیرہ گناہ کی تعریف میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کبیرہ وہ ہے جس پر شریعت میں حد آئی ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ ہے جس پر قرآن وسنت میں مخصوص وعید وارد ہوئی ہے۔ کسی نے کچھ اور کہا۔ امام رافعی رحمہ اللہ نے کتاب الشہادات میں ذکر کیا ہے کہ کبیرہ کی تعریف میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد والوں کا اختلاف ہے۔ اسی طرح کبیرہ اور صغیرہ کے درمیان فرق میں بھی اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کبیرہ وہ معصیت ہے جو حد کی موجب ہو، یا وہ جس کے کرنے والے کے لیے کتاب وسنت میں شدید وعید آئی ہو۔ اکثر کا رجحان اسی طرف ہے، لیکن دوسرا قول زیادہ برتر ہے۔

تیسرا قول وہ ہے جو امام الحرمین نے ''ارشاد'' میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہر جرم، جس سے اس کے مرتکب کی دین کے ساتھ بے پروائی ظاہر ہو، یا رقت اور دیانت میں وہ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے۔ امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کبیرہ ہر وہ کام ہے، جس کی حرمت پر کتاب اللہ نے نص (صراحت) کی ہو اور ہر معصیت کہ اس کی جنس میں قتل کی حد یا اور کچھ سزا واجب ہو۔ اور ہر فرض جس کا حکم دیا گیا ہے، اس کو علی الفور چھوڑ دینا، اور گواہی دینے اور روایت کرنے اور قسم کھانے میں جھوٹ بولنا۔ اس کو بطورِ ضبط ذکر کیا ہے۔

مزید کبیرہ گناہ:

قاضی رویانی نے کبائر کو تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ سات تو وہی ہیں جن کا ذکر ہو چکا، باقی عمل قومِ لوط (لونڈے بازی) ہے اور مال غصب کرنا، رمضان میں افطار کرنا (روزہ چھوڑنا)، بلا عذر جھوٹی قسم کھانا، قطع رحمی کرنا، ناپ تول میں کمی کرنا، بلا عذر نماز کے مقررہ اوقات میں تقدیم وتاخیر کرنا، کسی مسلمان کو ناحق مارنا پیٹنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمداً جھوٹ باندھنا، بلا عذر شہادت کو چھپانا، رشوت لینا، مرد وعورت کے درمیان قیادت، بادشاہ کے پاس سعایت (چغلی

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧١٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٣٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٥) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٤١)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣١١) اس کی سند میں اضطراب ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٣٥٨٥)

کھانا)، زکات ادا نہ کرنا، قدرت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دینا، قرآن کی تعلیم کے بعد اس کو بھول جانا، کسی جاندار کو آگ میں جلانا، بدگوئی کی وجہ کے بغیر بیوی کو شوہر سے روکنا، اہلِ علم کی بدگوئی کرنا، جملہ قرآن کو برا کہنا، ظہار کرنا (بیوی کو ماں کہنا)، مجبوری کے سوا خنزیر کا گوشت اور مردار کھانا۔ پھر امام رافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض خصلتوں میں توقف کی گنجایش ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں نے کبائر کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں، ہمارے شیخ امام ذہبی رحمہ اللہ نے سترہ کبیرہ گنے ہیں۔[1]

میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں امام ابن حجر مکی رحمہ اللہ کی کتاب "الزواجر عن اقتراف الكبائر" بے مثل کتاب ہے۔ غالباً اس سے کوئی کبیرہ نہیں بچا۔ کبائر مذکور کی فہرست "دليل الطالب" میں لکھی گئی ہے، اس میں چار سو سے زیادہ کبیرہ گِنے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے کتابِ مذکور کی تعریف "إرشاد الفحول" میں کی ہے۔ پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ بات ٹھہری کہ کبیرہ وہ گناہ ہے، جس پر شارع علیہ السلام نے خصوصاً آگ کی وعید فرمائی ہے، جس طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے تو پھر بہت کچھ جمع ہوسکتا ہے اور جب یوں کہیں گے کہ ہر منع کی ہوئی چیز کا ارتکاب کبیرہ ہے تو پھر اور بھی کثرت سے کبائر ہو جائیں گے۔[2] والله أعلم وعِلمُه أتَمّ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا زیرِتفسیر آیت میں بیان اس طرح ہے کہ اس جگہ باطل سے وہ چیز مراد ہے جو شرع میں حرام ہے، حلال نہیں ہے۔ ناحق کو باطل کہتے ہیں، اس کی بہت سی صورتیں ہیں، جیسے: سود، جوا، غصب کرنا، چوری، خیانت، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، ممنوع خرید وفروخت۔ اَکل کا ذکر کر کے سارے تصرفاتِ باطلہ پر تنبیہ کی ہے، کیوں کہ مال حاصل کرنے کا بڑا مطلب یہی اکل (کھانا) ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنا مال باطل طریقے سے کھائے یا غیر کا کھائے، ایک ہی حکم ہے۔ اپنا اس طرح کہ نافرمانی کے کاموں میں خرچ کرے، غیر کا ظاہر ہے۔

باطل میں سارے فاسد عہد و پیمان شامل ہیں سوائے اس تجارت کے جو فریقین کی رضا مندی سے ہو، کیوں کہ تجارت باطل طریقے سے مال کھانے کی قسم نہیں ہے۔ تجارت پر نص فرمائی، لیکن معاوضات کی دوسری قسموں پر نہیں، جیسے: ہبہ، صدقہ اور وصیت، کیوں کہ اکثر اور زیادہ غالب یہی سودا ہوتا ہے۔ رزق کے اسباب غالباً اسی سے متعلق ہیں۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ آپس میں رضا مندی سے اس وقت بیع واجب ہوجاتی ہے جب بائع اور مشتری بیع کا معاہدہ کر کے الگ ہوجائیں یا ایک دوسرے سے کہے کہ تو لے لے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ امام شافعی، ثوری، لیث، ابن عیینہ اور اسحاق رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٣٦۔ ٦٣٧)
[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٣٧)

امام مالک و ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ بیع کا تمام ہونا یہ ہے کہ زبان سے منعقد ہو، خیار اُٹھ جائے، حدیث کا جواب ایسا دیا ہے جو بے فائدہ ہے۔[1] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے:«إِنَّمَا الْبَيْعُ عَنْ تَرَاضٍ»[2] ''بیع باہم رضا مندی سے ہے۔'' (رواہ ابن ماجه وابن المنذر) پھر قتلِ نفس سے منع کیا ہے کہ بعض بعض کو نہ ماریں، مگر شرعی حکم کے ساتھ ؎

بے حکم شرع آب خوردن خطاست ولے خون بفتوی بریزی رواست

''شریعت کے حکم کے بغیر پانی پینا تو غلطی ہے، لیکن فتوے کے ساتھ خون ریزی جائز ہے!''

﴿ أَنْفُسَكُمْ ﴾ اس لیے کہا کہ سارے مسلمان ایک دین رکھتے ہیں۔ گویا ایک جان کی طرح ہیں۔ نبی مکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ حجۃ الوداع میں فرمایا:«أَلَا، لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّاراً يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ»[3] ''میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگ جاؤ۔'' کسی نے کہا ہے کہ یہ ہر انسان کو خودکشی سے منع کیا گیا ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس سے اُس کی جان ہلاک ہو۔ صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرایا، پھر اپنی جان کو قتل کیا، وہ جہنم کی آگ میں ہوگا اور ہمیشہ اسی طرح گرا کرے گا۔[4] (الحدیث)

اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی جان کو معاصی سے قتل نہ کرو، یعنی ایسا کام نہ کرو، جس سے قتل کے مستحق ٹھہرو، جیسے کسی کو مار ڈالنا یا إحصان (شادی) کے بعد زنا کرنا یا حقیقتاً اپنی جان کو نہ مارو۔ اس آیت کو ان سب معانی پر محمول کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس سے کوئی مانع نہیں۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ٹھنڈے پانی سے نہ نہائیں کہ مبادا مر جائیں۔[5] اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی جانوں کو قتل کریں، اس امت پر رحم کیا گیا ہے کہ ان کو ایسی تکالیفِ شاقہ سے بچا دیا۔ پھر فرمایا کہ جو ایسا کرے گا یعنی قتلِ نفس یا باطل طریقے سے مال کھانا یا ہر ممنوعہ چیز، جو اس صورت میں مذکور ہے، اس کا ارتکاب، ظلم، حد سے تجاوز وغیرہ۔ اور ظلم کی قید سے وہ قتل نکل گیا، جو حق سے ہو، جیسے قصاص یا قتلِ مرتد یا تمام حدودِ شرعیہ یا قتلِ خطا وغیرہا۔

پھر برائیوں کو دور کرنے کے لیے کبیرہ گناہوں سے بچنے کی شرط رکھی ہے۔ کبیرہ وہ گناہ ہے، جس کی سزا عظیم ہو۔ اہلِ اصول کا اس میں اختلاف ہے، گنتی میں بھی اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سارے گناہ کبائر ہیں، صغیرہ برائے

---

[1] فتح القدير (١/ ٧٣١۔ ٧٣٢) [2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٢٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٩)

[5] مسند أحمد (٤/ ٢٠٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [إرواء الغليل: ١/ ١٨١]

اضافت کہتے ہیں، جیسے زنا کفر کی نسبت صغیرہ ہے، یا بوسہ لینا زنا کی نسبت حرام صغیرہ ہے۔ امام اسفرائینی و جوینی وقشیری وغیرہم سے اسی طرح مروی ہے۔ اس جگہ کبائر سے مراد شرک و کفر ہے، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨] یہ آیت زیرِ تفسیر آیت کے ساتھ مقید ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ کبائر جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، اس سورت میں تینتیس آیت تک ہیں۔[1] امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں کبائر کی تصریح کی ہے۔ ارشاد الفحول میں تیس دلیلیں لکھی ہیں۔ عدد میں سات سے لے کر سات سو تک اختلاف کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ غیر منحصر ہیں۔ بعض بعض سے اکبر ہیں۔ کبائر کی تعداد اور تعیین کے بارے میں بہت سی احادیث کتاب ''الزواجر'' میں مذکور ہیں۔

اوپر بیان کی گئی دلیلوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں: کبائر اور صغائر۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سورت نساء میں پانچ آیتیں ہیں، مجھے ان کے بدلے میں ساری دنیا بھی اچھی نہیں لگتی۔ علما جب ان پر گزرتے ہیں، پہچان لیتے ہیں۔ ایک یہ آیت ہے: ﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ﴾ دوسری آیت: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ﴾ [النساء: ٤٠] ''بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔''

تیسری ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٨ و ١١٦] ''بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، اس نے جھوٹ گھڑا اور بڑے گناہ کا کام کیا۔'' اور چوتھی ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ٦٤] ''اور اگر بے شک وہ لوگ جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، آپ کے پاس آتے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے بخشش طلب کرتا تو وہ یقیناً اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا پاتے۔''

اور پانچویں: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ١١٠] ''اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا۔''[2] ''مُدخَل'' سے مراد وہ مسکن ہے، جس میں داخل ہوں گے۔ یعنی جنت۔ کریم سے مراد حسن شریف مرضی ہے یا اونچا مقام ہے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (٥/ ١٥٩) [2] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٣٤) [3] فتح البيان (٣/ ٩٣ـ ٩٩)

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

اور تم اس مقام و مرتبے کی خواہش نہ کرو جس کے باعث اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مردوں نے جو کمایا اس میں ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے جو کمایا اس میں ان کا حصہ ہے اور تم اللہ سے اس کا فضل مانگتے رہو، بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿32﴾

اللہ کی بخشی ہوئی فضیلت کی تمنا کرنے سے ممانعت:

عورتوں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ کیا سبب ہے اللہ تعالیٰ ہر جگہ مردوں کو حکم فرماتا ہے، عورتوں کا نام نہیں لیتا؟ میراث میں مرد کا دوہرا حصہ ٹھہرایا؟ اس پر یہ آیت اُتری۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا تھا: اے اللہ کے رسول! مرد جہاد کرتے ہیں، ہم نہیں کرتیں، ہمارے لیے آدھی میراث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[1] (رواه أحمد عن مجاهد و رواه الترمذي وقال غريب و رواه ابن أبي حاتم وابن جرير وابن مردويه)

امام حاکم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: کیا ہم قتال نہ کریں، تاکہ شہید ہوں؟ میراث کو قطع نہ کریں؟ اس پر یہ آیت اُتری: ﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ ... ﴾ (زیرِ تفسیر آیت) پھر یہ آیت اُتری: ﴿ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ﴾ [آل عمران: ۱۹۵] ''کہ تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ کوئی مرد ہو یا عورت۔''[2] امام عکرمہ و مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اتری ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک عورت نے آکر نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ مرد کے لیے دوہرا حصہ ہے۔ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے، ہمارا حال عمل میں یہ ہے کہ اگر حسنہ بھی کریں تو نصف حسنہ ثابت ہو؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری، یعنی یہ میرا عدل ہے، میں نے ہی ایسا ٹھہرایا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ کوئی مرد تمنا نہ کرے کہ کاش اُس کے پاس فلاں کے مال و اہل کے مثل ہوتا؟ اللہ تعالیٰ نے اس ہوس سے اس کو روکا ہے اور یہ کہا ہے کہ اللہ سے اُس کا فضل مانگو۔ یہی امام حسن، ابن سیرین، عطا اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول بھی ہے۔[4] آیت شریفہ سے بھی یہی ظاہر ہے۔

اس پر یہ حدیث صحیح وارد (لاگو) نہیں ہوتی: ((لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٣٢٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٣٥) تفسير الطبري (٨/ ٢٦٢)
[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٣٥) المعجم الكبير (٢٣/ ٢٨٠) [3] تفسير الطبري (٨/ ٢٦٣) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٣٥)

يَقُوْمُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ»[1] ''صرف دو آدمیوں سے حسد کرنا جائز ہے: ایک وہ جس کو اللہ قرآن دے تو وہ دن اور رات کے مختلف حصوں میں اس کو پڑھے (تہجد میں پڑھے)۔ دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا ہو اور وہ دن رات اس کو خرچ کرے۔''

کیوں کہ یہ اس کے علاوہ چیز ہے جس سے آیت نے منع کیا ہے، کیوں کہ حدیث میں نعمت کی طرح نعمت کی تمنا کرنے کی ترغیب ہے اور آیت عین نعمتِ غیر سے ممانعت کرتی ہے۔ یہ ممانعت دنیوی اور دینی دونوں قسم کے معاملات کو شامل ہے۔ اس کی دلیل سیدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «نَزَلَتْ فِي النَّهْيِ عَنْ تَمَنِّيْ مَالِ فُلَانٍ وَفِيْ تَمَنِّي النِسَآءِ أَنْ يَكُنَّ رِجَالًا فَيَغْزُوْنَ»[2] ''یہ فلاں کے مال کی تمنا کرنے اور عورتوں کی مرد ہونے کی تمنا سے ممانعت ہے کہ وہ مرد ہوتیں تو جنگ میں شریک ہوتیں۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہر کسی کی جزا اُس کے عمل کے مطابق ہے۔ خیر کی جزا خیر ہے، شر کی جزا شر ہے۔ یہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا قول ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ مراد میراث ہے، یعنی ہر کوئی اپنے رتبے کے مطابق وارث ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے۔[4] یعنی بعض کی بعض پر فضیلت ایک حتمی امر ہے۔ تمنا سے کچھ فائدہ نہیں، ہاں مجھ سے میرے فضل کو مانگو کہ میں رب کریم وہّاب ہوں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ سے اُس کا فضل مانگو، اللہ پسند کرتا ہے کہ اُس سے مانگا جائے۔ افضل عبادت فرحت کا انتظار کرنا ہے، یعنی تنگی اور تکلیف کے دور ہونے کا۔[5] (رواه الترمذي وابن مردويه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اُس کی مہربانی مانگو۔ اللہ بہت مانگنا پسند کرتا ہے۔ بندوں میں سے اللہ کا دوست وہ ہے، جو کشادگی کو دوست رکھتا ہے۔[6] اے اللہ! تیرا یہ بندہ تجھ سے تیرے فضل و کرم کا سائل ہے، کشادگی کا منتظر ہے، تکلیف کے رفع ہونے اور غم کے دور ہونے کا انتظار کرتا ہے تو ایسے سوال کو پسند کرتا ہے، میں بھی تکلیف کے دور ہونے کو پسند کرتا ہوں تو اپنے کمال رحم و کرم سے مجھ کو میری موجودہ حالت سے نجات عطا فرما اور دین و دنیا کے دشمنوں کے ہاتھ سے نجات بخش۔ تیرے نزدیک اس سوال کا قبول کرنا کچھ بڑی بات نہیں ہے، لیکن میرے نزدیک یہ ایک پہاڑ کے برابر ہے۔ اَللّٰهُمَّ آمِيْنَ.

ان الفاظ پر غور کریں:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تمنا کرنے سے نہی کی ہے، کیوں کہ تمنا میں بھولے ہوئے حالات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، جو اللہ کا غیر پر فضل ہے، اس کی تمنا کرنا ایک طرح کی اس قسمت کے ساتھ ناپسندیدگی ہے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۰۹۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۸۱۵) [2] تفسير الطبري (۸/ ۲٦٤)

[3] تفسير الطبري (۸/ ۲٦٥) [4] تفسير الطبري (۸/ ۲٦٦۔ ۲٦۷) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۹۳٦) اس کی سند حسن ہے۔

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۵۷۱) اس کی سند میں ''حماد بن واقد'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث ٤۹۲)

[6] تفسير ابن كثير (۱/ ٦۳۸) اس کی سند میں ''حکیم بن جبیر'' ضعیف راوی ہے۔

جو اللہ نے اپنے ارادہ اور حکمتِ بالغہ کے تحت لوگوں میں جاری کی ہے۔ نیز تمنا میں ایک طرح کا اس چیز سے حسد کا اظہار بھی ہوتا ہے جس سے کسی کو محروم رکھا گیا۔ اگر ارادہ یہ ہو کہ غیر سے وہ نعمت چھن جائے یا کم ہو جائے تو یہ بعینہٖ حسد مذموم ہے جس کے بارے میں یوں فرمایا ہے: ﴿ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [النساء: ٥٤] ''کیا وہ اس پر لوگوں سے حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے؟'' اس نہی میں مسلمان بھائی کے پیغام (نکاح) کے اوپر پیغام دینا اور اس کی بیع پر بیع کرنا بھی داخل ہے، کیوں کہ یہ حسد اور ناراضی کی دعوت دیتا ہے۔[1] (قاله القرطبي)

ہاں علما نے ایسے رشک کو، جس میں غیر کے مال کے نقصان کی تمنا نہ ہو، جائز رکھا ہے۔ اس کی دلیل یہ صحیح حدیث ہے: «لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ...»۔ اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب منعقد کیا ہے: ''بَابُ الِاغْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ''[2]۔ آیت کے الفاظ کی عمومیت کا تقاضا ہے کہ تمنی حرام ہے، خواہ وہ حسد کی قسم سے ہو یا نہ ہو۔ ہاں سنت سے امورِ معینہ میں اس کا جواز ثابت ہے۔ وہ اس عموم کو خاص کرتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے غِبطہ (رشک) سے بھی منع کیا ہے، کیوں کہ شاید وہ نعمت اس کے دین یا دنیا کے لیے مفسدہ (باعثِ فساد) ہو۔

پھر فرمایا کہ ہر مرد و عورت کے لیے اس کی کمائی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثواب اور عقاب اور نیکی کے دس گنا ہونے میں مرد اور عورت برابر ہیں۔[3] صیغہ ''اِسْأَلُوا اللّٰهَ'' وجوبِ سوال پر دلیل ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے یوں ہی کہا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سوال کسی دنیاوی غرض اور کام کا نہیں ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبادت کوئی دنیاوی کام نہیں ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فضل بمعنی رزق ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ فضل سے مراد نعمت کے خزانے ہیں، جو کبھی خالی نہیں ہوتے۔[6]

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِيْبَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝۳۳

ماں باپ اور قریبی رشتہ دار جو مال چھوڑ جائیں، اس میں ہم نے ہر ایک کے لیے وارث بنائے ہیں اور جن سے تمھارا عہد بندھ چکا ہو انھیں ان کا حصہ دو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے (33)

ابتدائے اسلام کا حکم، اس کی منسوخی اور ورثا کا تقرر:

اکثر لوگ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اکیلے مسلمان ہوئے تھے، نبی اکرم ﷺ نے دو دو مسلمانوں کو آپس میں

[1] تفسير القرطبي (٥/ ١٦٣) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣) [3] تفسير القرطبي (٥/ ١٦٤)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٣٦) [5] تفسير البغوي (٢/ ٢٠٥) [6] فتح البيان (٣/ ١٠٠۔ ١٠٢)

بھائی بھائی کر دیا، وہی ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، جب ان کے اقربا مسلمان ہوئے، تب یہ آیت اُتری کہ میراث سے مراد قرابت ہے، لیکن قول کے بھائیوں سے زندگی میں سلوک رہے یا مرتے وقت کچھ وصیت کر دو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، ابو صالح، قتادہ، زید بن اسلم، سدی، ضحاک اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ اس جگہ مولیٰ سے مراد ورثا ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ ہے کہ عصبہ مراد ہیں۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب ابن العم (چچا کے بیٹے) کو مولیٰ کہتے ہیں۔[2] لہٰذا ترکہ والدین و اقربا میں میراث ہے اور جن سے عہد و پیمان ہے، ان کو بھی کچھ دو۔ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا، پھر منسوخ ہوگیا۔ اب فقط وفائے عہد رہ گیا ہے، یعنی مدد، رفادت (غریبوں کو کھانا کھلانا) اور نصیحت۔ بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح پر ہے۔[3] آیت: ﴿ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ ﴾ [الأنفال: ٧٥] ''اور (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔'' آیت زیرِ تفسیر کی ناسخ ہے۔

عقدِ ایمان سے مراد حلیف ہیں۔ حدیث میں مروی ہے: « لَا حِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ » ''اسلام میں حِلفِ جاہلیت کی طرز کا معاہدۂ تعاون نہیں۔'' یہ حدیث صحاح و سنن میں ہے۔[4] حاصل یہ ہے کہ اگرچہ حلف باقی نہ رہا، لیکن تاثیرِ حلف باقی ہے۔ عہد و پیمان کو ضرور پورا کرنا چاہیے۔ میراث نہ رہی، جس نے کہا ہے کہ حلف کے ساتھ وراثت اب بھی ہے، یہ حدیث اس کی تردید کرتی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور احمد رحمہما اللہ اسی طرف گئے ہیں، لیکن صحیح قول جمہور اور امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کا ہے کہ میراث بحلف منسوخ ہے۔ احمد رحمہ اللہ سے بھی یہی مشہور ہے۔

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے: « أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا »[5] یعنی میراث کی تقسیم اصحابِ فرائض سے کرو، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے آیتِ مواریث میں کیا ہے۔ پھر جو باقی رہے، وہ عصبہ کو دو۔ آیت میں نصیب سے مراد نصیحت و رفادت و وصیت ہے، اس کے بعد جو حلف اور معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی تاثیر نہیں رہتی۔ باقی توارث جو اس آیت کے نزول سے پہلے تھا وہ جاتا رہا۔ مال کے تیسرے حصے میں سے حُلَفا کے لیے وصیت کرنا جائز ہے یہی معروف ہے۔ اسی پر سلف نے صریح حکم لگایا ہے۔

امام ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگ متبنّٰی بناتے تھے ان کو وارث ٹھہراتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٣٧) [2] تفسير الطبري (٨/ ٢٦٩) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٢٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٢٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٩٠)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٥)

نصیب وصیت میں رکھا اور وراثت موالی کو دلوائی، وہ ذی رحم ہوں یا عصبہ۔ متبنّٰی کو میراث دینے سے انکار فرمایا۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصیب سے مراد نصرت و معونت و نصیحت ہے نہ کہ میراث۔ تو اس صورت میں آیت منسوخ ہوئی۔ یہ کوئی حکم نہ تھا کہ منسوخ ہوگیا ہو، بلکہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ حلف معقود کو پورا کرو۔ نصرت و نصیحت بجالاؤ، سو آیت محکم ہے۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے اس میں نظر ہے، کیوں کہ حلف ان میں کبھی آپس میں ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کرنے پر ہوتا تھا اور کبھی وراثت پر، جس طرح بہت سے سلف نے کہا ہے کہ مہاجر انصاری کا وارث ہوتا تھا۔ انصاری کی میراث اس کے قرابات و ذی رحم کو نہ ملتی تھی، یہاں تک کہ وہ حکم منسوخ ہوگیا۔ پھر یہ آیت کس طرح محکم غیر منسوخ ہوسکتی ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ موالی مولیٰ کی جمع ہے، مولیٰ کا اطلاق آزاد کرنے والے مددگار و چچا زاد و ہمسایہ وغیرہم پر ہوتا ہے۔ اس جگہ مراد عصبہ ہے، یعنی ہم نے ہر ایک کے لیے ایک عصبہ مقرر کیا ہے، جو اُس کا وارث ہوتا ہے۔ بقیہ فرائض میں حلیف کا اس میں کچھ حق نہیں ہے کہ وہ وارث ہوں۔ دینِ جاہلیت میں مدد اور وراثت میں دونوں پر معاہدہ اور حلف ہوتا تھا، وہ لوگ موالی الموالاۃ کہلاتے تھے۔ ایک دوسرے کی میراث میں سے نصیب، یعنی حصہ لیتے تھے۔ اسلام کے شروع میں آیت زیرِ تفسیر کی دلیل سے یہ بات ثابت رہی، یہ اس آیت کے من جملہ دو قولوں میں سے ایک قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آیت زیرِ تفسیر منسوخ ہے۔ جلالین کے الفاظ یہ ہیں کہ نصیب سے میراث میں سے ان کا حصہ مراد ہے اور وہ سدس (چھٹا حصہ) تھا، مگر منسوخ ہوگیا۔[4]

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

مرد عورتوں پر اس وجہ سے حاکم ہیں کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے ہیں، چناں چہ نیک عورتیں فرماں بردار اور خاوند کی غیر موجودگی

---

[1] تفسیر الطبري (۸/ ۲۸۰۔ ۲۸۱)
[2] تفسیر الطبري (۸/ ۲۸۸)
[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦٤١)
[4] تفسیر الجلالین (۱/ ۱۰۵) فتح البیان (۳/ ۱۰۳۔ ۱۰٤)

میں اللہ کی حفاظت سے (مال و آبرو کی) نگہبانی کرتی ہیں اور تمھیں جن عورتوں کی سرکشی کا خوف ہو، انھیں تم نصیحت کرو اور ان کو خواب گاہوں میں الگ کر دو، اور انھیں ہلکی سزا دو، پھر اگر وہ فرماں برداری کریں تو انھیں ستانے کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک اللہ بہت بلند اور نہایت بڑا ہے (34)

مرد کی عورت پر حاکمیت اور فضیلت:

یعنی اللہ تعالیٰ نے مرد کا درجہ اوپر بنایا ہے، اس لیے عورت کو اس کی فرمانبرداری کرنی چاہیے، اگر عورت بدخوئی کرے تو مرد پہلے درجے میں سمجھائے، دوسرے درجے میں جدا سوئے، لیکن اسی گھر میں، پھر آخری درجے میں مارے بھی، لیکن ایسا نہیں کہ ضرب پہنچائے۔ پھر اگر بظاہر وہ فرمانبردار ہو جائیں تو تقصیروں پر کرید نہ کرے، اللہ سب پر حاکم ہے۔ ہر تقصیر کی ایک حد ہے، مارنا آخری درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مرد عورت پر قیّم ہے، یعنی اُس کا رئیس، کبیر، حاکم اور مؤدب ہے۔ جب عورت کجروی کرے، یہ اس کو ادب سکھائے، کیوں کہ مرد عورتوں سے افضل ہیں۔ اس لیے نبوت مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ حکمرانی بھی مردوں کے ساتھ خاص ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»[1] (بخاري) ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی، جس نے عورت کو اپنا حکمران بنایا۔''

اسی طرح منصبِ قضا بھی مردوں کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اس کے علاوہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، جیسے: مہر و نان ونفقہ وغیرہ کے حقوق، جو کتاب و سنت میں آئے ہیں۔ اس لیے مرد فی نفسہٖ عورت سے افضل ہے۔ فضل و افضال میں اُس پر مقدم ہے۔ اسی سبب سے مرد کا قیّم ہونا مناسب ٹھہرا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ [البقرة: ۲۲۸] ''اور مردوں کے لیے ان پر ایک فضیلت ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ قَوّٰمُوْنَ ﴾ سے مراد امرا ہیں، یعنی عورت کو لازم ہے کہ جس امر میں اللہ نے اس کو مرد کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اس امر میں اس کی مطیع رہے۔ اطاعت یہ ہے کہ گھر والوں سے نیکی کرے۔ شوہر کے مال کی نگہبان ہو۔ یہی امام مقاتل، سدی اور ضحاک رحمہ اللہ کا قول ہے۔[2] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک عورت نبی مکرم ﷺ کے پاس آئی اور یہ شکایت کی کہ اس کے شوہر نے اس کو طمانچہ مارا ہے۔ فرمایا: قصاص چاہیے، اس پر یہ آیت اتری۔ وہ عورت بغیر قصاص کے واپس چلی گئی۔[3]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک انصاری ایک عورت کو لے کر آیا، اس نے کہا: میرا شوہر فلاں بن فلاں انصاری

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (۴۱۶۳) [2] تفسير الطبري (۸/ ۲۹۰) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۹۳۹)

[3] تفسير الطبري (۸/ ۲۹۱) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۹۴۰) یہ روایت مرسل ہے۔

ہے، اس نے مجھے مارا ہے، جس کا اثر میرے منہ پر ہے۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: اس کو مارنا نہیں چاہیے تھا، تو آیت زیرِ تفسیر نازل ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «أَرَدْتُ أَمْرًا أَرَادَ اللّٰهُ غَيْرَهُ»[1] ''میں نے ایک کام کا ارادہ کیا، لیکن اللہ نے اس کے علاوہ کا ارادہ کیا۔'' (رواه ابن مردويه) امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ اِنفاق سے مراد صداق (مہر) ہے، جو عورت کو دیا ہے۔ تو ہی سمجھ کہ اگر عورت کو تہمت لگائے گا تو لعان کرنا پڑے گا اور اگر وہ تہمت لگائے گی تو کوڑے کھائے گی۔[2]

نیک عورت کی نشانی:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿قٰنِتٰتٌ﴾ سے وہ عورتیں مراد ہیں، جو اپنے شوہروں کی مطیع ہیں۔[3] ﴿حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ﴾ کے معنی ہیں کہ شوہر کے پیچھے اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت رکھتی ہیں۔ ﴿بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ محفوظ وہ ہے جسے اللہ محفوظ رکھے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ وہ عورت بہتر ہے کہ جب تو اس کی طرف دیکھے تو وہ تجھ کو خوش کرے، جب تو اس کو کوئی حکم دے تو وہ بجا لائے، جب تو اس سے غائب ہو تو وہ اپنی جان اور تیرے مال میں تیرے لیے حفاظت کرے۔ پھر نبی مکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔[4] (رواه ابن أبي حاتم) عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: جب عورت نے پنج گانہ نماز پڑھی یا رمضان کے روزے رکھے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی، شوہر کی اطاعت کی تو اس سے کہا جاتا ہے کہ جا جنت میں جس دروازے سے تو چاہے۔[5] (رواه أحمد)

عورت کی نافرمانی اور اس کا علاج:

''نُشُوْز'' ارتفاع (بلند ہونا) کو کہتے ہیں۔ ناشزہ وہ عورت ہے، جو خاوند سے بلند ہو، شوہر کے حکم کی تارک ہو۔ اُس سے روگردان، اس سے دشمنی رکھنے والی ہو، بدخو تیز زبان نافرمان اور خودسر ہو۔ لہٰذا جب اُس سے نشوز کی باتیں ظاہر ہوں تو اس کو وعظ و نصیحت کرے۔ خاوند کی نافرمانی پر اللہ کی سزا سے ڈرائے، کیوں کہ اللہ نے بیوی پر شوہر کا حق اور بیوی پر شوہر کی اطاعت واجب کی ہے۔ عورت پر مرد کی نافرمانی کرنا حرام کیا ہے، کیوں کہ اس پر مرد کی افضلیت اور فضیلت ثابت ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ اگر میں کسی کو حکم کرتا کہ کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٦٤٢) اس کی سند میں ''محمد بن اشعث'' سخت ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٤٠)

[3] تفسير الطبري (٨/ ٢٩٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٤٠) اس کی سند حسن ہے۔

[4] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٣١) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٣٨)

[5] مسند أحمد (١/ ١٩١) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ یہ روایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ (صحيح الجامع، رقم الحديث: ٦٦٠)

کہ شوہر کو سجدہ کرے، کیوں کہ شوہر کا عورت پر بڑا حق ہے۔[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مرد نے بیوی کو اپنے بستر پر بلایا اور اُس نے انکار کیا تو فرشتے اس کو صبح تک لعنت کرتے ہیں۔[2] (رواہ البخاري) صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ جب عورت اپنے شوہر کا بستر چھوڑ کر سوتی ہے تو صبح تک اس کو فرشتے لعنت کرتے ہیں۔[3] اس لیے نشوز کے خوف کی صورت میں اسے وعظ و نصیحت کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہجر (ترکِ تعلق) یہ ہے کہ عورت سے جماع نہ کرے، ایک بستر پر سوئے، مگر پیٹھ پھیر کر۔ یہی کئی ایک مفسرین کا قول ہے۔ امام سدی، ضحاک اور عکرمہ رحمہ اللہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ بات کرنا چھوڑ دے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ پہلے نصیحت کرے، سمجھائے، اگر مانے تو بہتر ورنہ الگ سوئے، بات نہ کرے، مگر نگاہ نہ پھیرے کہ یہ اُس پر سخت تر ہوتا ہے۔ امام مجاہد، شعبی، ابراہیم، محمد بن کعب، مقسم اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہجر ہم بستری کو ترک کرنا ہے۔[4] حدیث مرفوع میں مروی ہے کہ بستر کو چھوڑ دینا ترکِ جماع ہے۔[5] معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! عورت کا ہم میں سے ایک پر کیا حق ہے؟ فرمایا: جب تو کھائے اس کو کھلائے، جب تو پہنے اس کو پہنائے، اس کے منہ پر مت مار، اس کو قبیح مت کہہ، اس کو نہ چھوڑ مگر گھر میں۔[6] (رواہ في المسند و السنن)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب وعظ و ہجران سے بھی اثر نہ ہو اور وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے تو پھر ایسی مار مار کہ جس سے ہڈی نہ ٹوٹے، گوشت نہ پھٹے، جیسے طمانچہ، نرم گھونسا مارنا یا مسواک مار دینا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا کہ اللہ سے عورتوں کے حق کے بارے میں ڈرو۔ وہ تمھارے پاس قید ہیں، تمھارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمھارے بستر پر اُس کو آنے نہ دے، جس کو تم ناپسند کرتے ہو، پھر اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی مار مارو، جو ان کے لیے غیر موثر ہو، یعنی ایسی چوٹ نہ ہو جس کا اثر ظاہر ہو۔ ان کا حق تم پر یہ ہے کہ دستور کے مطابق انھیں کھلاؤ اور پہناؤ۔[7] (رواہ مسلم)

---

① سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۱۵۹) سنن النسائي الکبریٰ (٥/ ٣٦٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغلیل (۷/ ٥٤)
② صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۰٦٥)
③ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٤۳٦)
④ تفسیر الطبري (۸/ ۳۰۲۔ ۳۰٥) تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹٤۲۔ ۹٤۳)
⑤ سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۱٤٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (صحیح أبي داود: ٦/ ۳٦۲)
⑥ مسند أحمد (٤/ ٤٤٦) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۱٤۲) سنن النسائي الکبریٰ (٥/ ۳۷۳) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۸٥۰) صحیح الترغیب والترهیب (۲/ ۱۹٥)
⑦ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۱۸) مسند أحمد (٥/ ۷۲)

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ ایسے مار جس کا اثر نہ ہو۔[1] فقہا رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ نہ کوئی عضو ٹوٹے نہ کوئی برائی یا عیب لگے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہجر کے بعد ضرب ہے، اگر ضرب سے بھی کام نہ چلے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض فدیہ حلال کیا ہے۔[2] ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی لونڈیوں کو نہ مارو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا: وہ تو شوہروں پر منہ زور ہوگئی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مارنے کا حکم دیا۔ بہت سی بیویوں نے آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا اور اپنے شوہروں کا شکوہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آلِ محمد کو بہت سی عورتوں نے آ کر گھیر لیا، وہ اپنے شوہروں کی شاکی ہیں، وہ لوگ کچھ اچھے آدمی نہیں ہیں۔[3] (رواه أبو داود و النسائي وابن ماجه)

فرمانبرداری کی صورت میں اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اگر بیوی سب جائز امور میں شوہر کے ارادے کے مطابق اطاعت کرے تو پھر اس کو مارنا یا جدا کرنا نہیں چاہیے۔ حقوقِ زوجین میں رسالہ صلاح ذات البین (نواب صاحب کی تالیف) بہت ہی نفیس کتاب ہے کہ اس جیسا کوئی اور رسالہ اردو زبان میں نہیں ہوگا۔ واللہ أعلم.

عمومی تفسیر:

فتح البیان کا بیان ہے کہ مرد عورتوں پر قوّام ہیں، یعنی جس طرح حکام و امراء رعایا کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح مرد عورت کا نگہبان ہوتا ہے، پھر اس کے علاوہ گھر بار، روٹی کپڑا دیتا ہے۔ قوّام مبالغے کا صیغہ ہے، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ مرد اصل امین ہیں اور تمام مصلحتوں اور خانگی تدابیر اور تادیب کے ساتھ اس کام میں قائم ہیں، جس طرح بادشاہ اپنی رعیت کے کاموں پر قائم و دائم ہوتے ہیں۔ یہ فضیلت مردوں کو اللہ کی طرف سے ملی ہے۔ انبیا، خلفا، سلاطین، حکام، ائمہ اور غازی سب مرد ہی ہوتے ہیں۔ عقل و دین، شہادت، جمعہ اور جماعت میں عورت سے بڑھ کر ہیں۔ مرد چار بیویاں کر سکتا ہے، عورت ایک شوہر سے زیادہ نہیں کر سکتی۔ مرد کا حصہ وراثت میں زیادہ ہے۔ طلاق و نکاح اور رجوع کرنا مرد کے ہاتھ میں ہے۔ نسب باپ کا ہوتا ہے نہ ماں کا۔ ان کے سوا اور بہت معاملات ہیں، جن میں مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔

من جملہ ان کے ایک عورتوں کے نان و نفقہ، پہناوے، رہائش و مہر وغیرہ حاجات میں اور عموماً جہاد و دیت، اخراجات خیر کی دیگر مدّوں میں مال کو خرچ کرنا ہے۔ اس آیت میں اہلِ علم کی ایک جماعت نے استدلال کیا ہے کہ جب شوہر بیوی کے اخراجات اور لباس کی فراہمی سے عاجز ہو تو اس کے نکاح کو منسوخ کرنا جائز ہے۔ امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (٨/ ٣١٦) [2] تفسیر الطبري (٨/ ٣١٤) اس کی سند حسن ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٦٠)

صالحات سے مراد نیک بخت عورتیں ہیں، جو بھلائی کے کام کرتی ہیں، مطیع ہیں، اللہ اور شوہر دونوں کے حقوق بجا لاتی ہیں۔ اپنے ستر اور شوہر کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ اُن سے یہ کام اللہ کی مدد اور توفیق سے ہوتا ہے۔ پھر شوہروں کو یہ خطاب فرمایا کہ اگر تم کو نشوز کا خوف ہو، یعنی نافرمانی کا علم ہو، یہ نشوز کبھی قول سے ہوتا ہے اور کبھی فعل سے اور کبھی دونوں سے، جیسے چلا کر بولنا، پکارنے کا جواب نہ دینا، حکم کو جلد بجا نہ لانا، بات چیت کے وقت فروتنی نہ کرنا، شوہر کے آنے پر توجہ نہ کرنا، ایسی حالت میں شوہر کو چاہیے کہ بیوی کو اطاعت اور حسنِ معاشرت کی ترغیب دے اور اللہ کے ڈر سے ڈرائے۔ مثلاً اس طرح کہے کہ اللہ سے ڈر، میرا تجھ پر بڑا حق ہے، فلاں بات کو چھوڑ دے، میری اطاعت تجھ پر فرض ہے۔ اگر نہ مانے، ضد کرے تو بستر سے جدا کر دے، یعنی پاس نہ سلائے یا صحبت کرنا چھوڑ دے یا ایک حجرے میں نہ سوئے۔ اس پر بھی اثر نہ ہو تو پھر مارے، مگر ہلکی مار۔

قرآنِ مجید کا ظاہری نظم یہ ہے کہ شوہر کے لیے بیوی کی طرف سے نشوز کے ڈر کی صورت میں ان تمام امور کا کرنا جائز ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کا حکم اسی ترتیب پر مشروع ہے، اگرچہ ظاہر میں واؤ کے ساتھ جو عطف کیا گیا، وہ ان تمام امور کے جمع ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیوں کہ ترتیبِ قرینہ سے مقام متعین ہوتا ہے۔ اور نرم طرزِ کلام ان کی اصلاح اور بہتری کے لیے ہے، تاکہ وہ اطاعت کے تحت آجائیں، اس لیے تین درجات ترتیب وار ہیں، کیوں کہ ان کا مقصد ضرر کو دور کرنا ہے، جس طرح کوئی کسی حملہ آور کے حملے کو روکتا ہے۔ پس سب سے ہلکی چیز ان میں معتبر ہوگی۔ ہجر صرف اس وقت کرے، جب وعظ و نصیحت اثر نہ کرے۔ اگر وعظ کا اثر ہو تو پھر ہجر نہ کرے۔ اگر ہجر کافی ہو تو پھر مارنے پر نہ آئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مارنا جائز ہے، اسے ترک کرنا افضل ہے۔

جمل میں کہا ہے کہ ہجر اور مارنا نشوز کے ظاہر ہونے کے ساتھ مشروط ہیں، محض گمان پر جائز نہیں۔ پھر جب عورت نے اطاعت اختیار کر لی تو اب اس کے ساتھ اپنے قول و فعل کے ساتھ کسی قسم کا ناپسندیدہ طرزِ عمل اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ انھیں محبت کی تکلیف نہ دو کہ یہ بات ان کے بس میں نہیں ہے۔ عمرو بن الاحوص رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ وہ خطبہ حجۃ الوداع میں حاضر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار رہو! عورتوں کے حق میں، وصیت خیر کو قبول کرو۔ وہ تمھارے پاس قید ہیں، تم ان سے سوا اس کے کسی چیز کے مالک نہیں کہ اگر وہ ظاہری بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کی ہم بستری چھوڑ دو اور ان کو ایسے مارو کہ وہ غیر موثر ہو۔ پھر اگر وہ کہنا مانیں تو ان پر اور راہ کی جستجو نہ کرو۔[1] (أخرجه الترمذي وصححه و النسائي وابن ماجه) عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٧٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٨٠)

روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کیا تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو اس طرح مارتا ہے، جس طرح غلام کو مارتا ہو، پھر آخر دن میں اس سے صحبت کرتا ہے؟! [1] (رواہ الشیخان وغیرھما)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ مارنے کو ترک کرنا زیادہ بہتر ہے، پھر اگر بغیر مارے گزارا نہ ہو تو ایک ہی جگہ بار بار نہ مارے اور منہ کو بچائے، کیوں کہ اس میں تمام خوبیاں جمع ہوتی ہیں اور دس کوڑے سے زیادہ بھی نہ مارے۔ بعض نے کہا ہے کہ مندیل (رومال) سے مارے، لاٹھی، کوڑے سے نہ مارے۔ غرضیکہ جہاں تک ہو سکے سزا کی تخفیف سب سے بہتر ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں بھی مروی ہے کہ مرد سے یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ تو نے اپنی بیوی کو کس بات پر مارا ہے۔ [2] (أخرجہ أبو داود) یہ کہنے میں کہ اللہ سب سے اوپر اور بڑا ہے، مردوں کے لیے یہ دھمکی ہے کہ بغیر وجہ کے عورتوں پر بغی (سرکشی) نہ کریں، کیوں کہ اللہ منتقم ہے، وہ ظالم اور باغی سے بدلہ لے گا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝۳۵

اور اگر تمھیں دونوں (میاں بیوی) میں جھگڑے کا ڈر ہو تو ایک شخص مرد کے کنبے سے اور ایک عورت کے کنبے سے منصف مقرر کرو، اگر وہ دونوں صلح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان دونوں (میاں بیوی) میں موافقت پیدا کر دے گا، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بہت علم والا، خوب خبردار ہے (35)

ناچاقی کے خدشے کے پیشِ نظر دو منصفوں کا تقرر:

پہلے یہ ذکر کیا تھا کہ اظہارِ نفرت اور نافرمانی وغیرہ بیوی کی طرف سے ہو، یہ ایک حال ہے۔ اب دوسرا حال بیان فرمایا: اگر نفرت دونوں طرف سے ہو تو اس صورت میں پنچ مقرر ہونا چاہیے۔ فقہا کہتے ہیں کہ جب میاں بیوی میں ضد آ پڑے تو حاکم ان دونوں کو کسی معتمد کی ہمسائیگی میں رہنے کا حکم دے، تاکہ وہ دونوں کا حال اور برتاؤ دیکھے، جو ان دونوں میں ظالم ہو، اس کو ظلم سے روکے، پھر اگر بات بڑھ جائے اور جھگڑا طول پکڑ جائے تو حاکم ایک ثقہ (قابلِ اعتماد شخص) عورت والوں میں سے اور دوسرا ثقہ مرد والوں میں سے بلائے، تاکہ وہ اکٹھے ہو کر دونوں کے معاملے میں غور کریں، جو مصلحت نظر آئے، یعنی دونوں میں علاحدگی یا اکٹھے ہونا، وہ بجا لائیں۔ شارع کی نظر توفیق

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٥)

[2] ان الفاظ کے ساتھ روایت سنن ابی داود میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٧) فتح البيان (٣/ ١٠٥۔ ١٠٩) اس کی سند میں "عبدالرحمٰن مسلی" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ٩٨)

(موافقت، ملاپ) کی طرف ہے، لہٰذا یوں فرمایا کہ اگر اصلاح چاہیں گے تو اللہ ملاپ کر دے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک ادھر کا مرد صالح ایک ادھر کا بلائیں، وہ دیکھیں کہ قصور کس کا ہے، اگر مرد کا ہو تو اس سے عورت کو روک دیں، مگر نفقہ دلا دیں اور اگر عورت کا ہے تو اس کو مرد کے حوالے کریں، نفقہ سے روک دیں، پھر اگر دونوں حَکَم کی رائے یہ ہو کہ تفریق ہو جائے یا جمع تو ان دونوں کا یہ حکم جائز ہے۔ پھر اگر ان کی رائے اجتماع پر ہو اور میاں بیوی میں سے ایک راضی اور دوسرا ناخوش ہو، پھر اگر ان میں سے ایک مر گیا ہے تو جو راضی تھا، وہ ناراض کا وارث ہوگا ناراض راضی کا وارث نہیں ہوگا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہم اور معاویہ رضی اللہ عنہ حکم بنائے گئے۔ معمر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو حکم بنایا تھا، ان سے کہا کہ اگر تم دونوں دیکھو کہ جمع بہتر ہے تو جمع کر دو اور اگر دیکھو کہ تفریق بہتر ہے تو جدا کر دو۔[2] امام عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا کہ ایک عورت شوہر کے ساتھ آئی، ہر ایک کے ساتھ ایک گروہ تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے دونوں میں سے ایک ایک حکم لیا، پھر دونوں حکم سے کہا کہ تم جانتے ہو کہ تم پر کیا بات لازم ہے۔ تم پر یہ بات لازم ہے کہ اگر تمھاری رائے ہو تو تم دونوں کو جمع کر دو۔ عورت نے کہا: میں اپنے نفع نقصان میں اللہ سے راضی ہوں۔ شوہر نے کہا ہے کہ میں علاحدگی پر راضی نہیں ہوں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تو جھوٹا ہے، یہاں سے نہیں جا سکے گا، جب تک کہ نفع نقصان میں اللہ کی کتاب کے ساتھ راضی نہ ہو۔[3] (رواه عبدالرزاق و ابن أبي حاتم وابن جرير)

علما نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ حکمین (دو منصف) کو یہ اختیار ہے کہ وہ جمع یا تفریق کرا دیں۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکمین اگر چاہیں تو دونوں کے درمیان ایک یا دو یا تین طلاق سے تفرقہ کر دیں۔ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکمین جمع کا حکم کر سکتے ہیں، تفریق کے لیے حکم نہیں کر سکتے۔ امام قتادہ، زید بن اسلم، احمد، ابو ثور اور داود رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ ان کا ماخذ یہ آیت ہے:

﴿ اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ﴾[4] (آیت زیرِ تفسیر)۔

اللہ نے اصلاح کا ذکر کیا، تفریق کا ذکر نہیں فرمایا۔ ہاں اگر دونوں طرف سے وکیل ہیں تو ان کا حکم جمع اور تفریق دونوں میں بلا خوف نافذ ہو سکتا ہے۔ پھر ائمہ میں اس بات پر اختلاف ہے کہ حکمین حاکم کی طرف سے مقرر

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٣٢٥۔ ٣٢٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٤٥) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسير الصنعاني (١/ ١٥٩) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسير الصنعاني (١/ ١٥٨۔ ١٥٩) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٤٥) تفسير الطبري (٨/ ٣٢٠۔ ٣٢١) اس کی سند صحیح ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٤٦) تفسير ابن كثير (١/ ٦٤٤)

کیے جائیں اور وہ حکم ہوں، اگرچہ متعلقہ میاں بیوی راضی نہ ہوں یا وہ زوجین کی طرف سے وکیل ہوں۔ جمہور پہلے قول پر ہیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ حَکَم کی شان یہ ہے کہ وہ محکوم علیہ کی رضا کے بغیر حکم کر سکتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاہرِ آیت یہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب جدید اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

دوسرا قول وہی علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ انھوں نے شوہر سے کہا تھا کہ تو جھوٹا ہے الخ۔ لہٰذا اگر وہ دونوں حکم ہوتے تو اقرارِ زوج کی ضرورت نہ ہوتی۔[1] واللہ أعلم. امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علما کا اس پر اجماع ہے کہ جب حکمین کا قول مختلف ہو تو پھر دوسرے کی بات کا اعتبار نہیں ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ جمع کرنے میں حکمین کا قول نافذ ہے، اگرچہ زوجین نے ان کو وکیل نہ کیا ہو۔ رہا تفرقہ تو جمہور کے نزدیک ان کا قول نافذ ہے، اگرچہ زوجین نے ان کو وکیل نہ کیا ہو۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اصل شقاق یہ ہے کہ ہر ایک ایک شق، یعنی ایک جانب کو اختیار کرے۔ لہٰذا جب میاں بیوی میں شقاق (جھگڑا) ہو تو ان کی رضا سے حکمین مقرر کیے جائیں۔ مخاطب امام ہے یا نائب، کیوں کہ احکامِ شرعیہ کا نفاذ انھیں کی طرف ہے یا صلحائے امت سے ہر ایک یا زوجین کو خطاب ہے۔ حکم عادل منصف مرد کو کہتے ہیں، اہل سے مراد اقارب ہیں، یعنی دونوں طرف سے ایسے شخص ہوں جو عقل و دین و انصاف رکھتے ہوں۔ اللہ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ حکمین اہلِ زوجین سے ہوں، کیوں کہ ان کا حال جو انھیں معلوم ہوگا، وہ دوسرے کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ان کی طرف کے آدمی نہ ملیں تو غیر حکم ہو سکتے ہیں، یہ اُس وقت ہے جب معاملہ مشکل ہو اور ظاہر نہ ہو سکے کہ قصور وار کون ہے اور اگر قصور وار معلوم ہے تو حق دار کا حق اس دوسرے سے دلوایا جائے گا۔ حکمین کا مقرر کرنا واجب ہے۔

اہلِ زوجین سے ہونا مستحب ہے۔ حکمین پر لازم ہے کہ جہاں تک ہو سکے اصلاح کی کوشش کریں۔ اگر ہو سکے تو بہتر، وگرنہ تفریق جائز ہے، مگر اس میں شہر کے حاکم کا حکم لینا چاہیے اور زوجین کی طرف سے فرقت کے لیے وکیل مقرر کیے جانے کے بغیر۔ امام مالک، اوزاعی اور اسحاق رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام شعبی، نخعی اور شافعی رحمہم اللہ سے بھی یوں ہی مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو جمہور سے بیان کیا ہے، کیوں کہ ﴿ فَابْعَثُوْا حَكَمًا ... الخ ﴾[3] اللہ کی طرف سے حکم ہے کہ وہ دونوں قاضی ہیں نہ کہ وکیل نہ شاہد۔

اہلِ کوفہ، عطا اور ابن زید رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ تفریق امام کی طرف سے ہے یا حاکمِ شہر کی طرف سے، حکمین کی

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٤٤۔ ٦٤٥) [2] الاستذکار (٦/ ١٨٣۔ ١٨٤) [3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٤٥)

طرف سے نہیں جب تک زوجین نے ان کو وکیل نہ کیا ہو۔ یا امام و حاکم ان کو حکم دیں، کیوں کہ وہ دونوں قاصد شاہد ہیں تفریق نہیں کر سکتے۔ آیت میں اصلاح کا ذکر ہے، تفریق کا ذکر نہیں ہے۔[1] توفیق سے یہ مراد ہے کہ اللہ زوجین کے درمیان الفت ڈال دے گا۔ ہر ایک حسنِ معاشرت اور محبت کی طرف لوٹ آئے گا۔ اللہ جانتا ہے کہ دو اختلاف کرنے والوں کے درمیان موافقت کس طرح کرائی جاتی ہے اور دو متفرق کو کیوں کر جمع کرتے ہیں۔ اس میں میاں بیوی اور حکمین کو سخت قسم کی وعید ہے کہ ناحق طریقے کا سلوک نہ کرنے دیں۔[2]

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾

اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، پہلو کے ساتھی اور مسافر کے ساتھ اپنی اور اپنی زیرِ ملکیت کنیزوں اور غلاموں سے بھی نیکی کرو۔ بے شک اللہ ہر اِترانے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا ﴿36﴾

اللہ کی عبادت، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہمسایوں کے حقوق کا خیال رکھنے کا حکم:

یعنی اول اللہ کا حق ادا کرو، پھر ماں باپ کا، پھر اُن سب کا درجہ بدرجہ، ہمسایہ قریب کا حق زیادہ ہے، ہمسایہ اجنبی کا اس کے بعد۔ قریب یعنی قرابتی برابر کا رفیق جو ایک کام میں ساتھ شریک ہو، جیسے ایک استاد کے دو شاگرد یا ایک خاوند کے دو نوکر، فرمایا: ان کے حق نہ ادا کرنے والا وہی شخص ہے، جس کے مزاج میں تکبر و خود پسندی ہے کہ کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ صرف میری عبادت کرو، کسی کو اس میں شریک نہ ٹھہراؤ، کیوں کہ خالق، رازقِ منعم اور ساری مخلوق پر ہر قسم کے حالات اور اوقات میں فضل و کرم کرنے والی وہی ایک ذات پاک ہے۔ لہٰذا وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی توحید بجا لائیں۔ عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ کریں، وہ کوئی ہو کہیں ہو۔

حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ کہا: اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ فرمایا: یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور کسی چیز کو اس کے ساتھ نہ ملائیں۔ پھر فرمایا کہ کیا تو جانتا ہے کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ یہ ہے کہ جب وہ اس طرح کریں تو

---

[1] فتح القدير (۱/ ۷۴۱) [2] فتح البيان (۳/ ۱۱۰۔ ۱۱۱)

ان کو عذاب نہ کرے۔[1] اس کے بعد وصیت کی کہ ماں باپ سے احسان کرو، کیوں کہ اللہ نے ان کو تیرے عدم سے نکل کر وجود کی طرف آنے کا سبب بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جگہ اپنی عبادت کو احسان بالوالدین کے ساتھ ملایا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ ﴾ [لقمان: ١٤] ''یہ کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر کر۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسٰنًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ''اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین سے اچھا سلوک کرو۔''

پھر والدین کے ساتھ احسان کو قریبی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کے ساتھ ملایا، مرد ہو یا عورتیں، جس طرح حدیث میں مروی ہے کہ مسکین پر صدقہ کرنا ایک صدقہ ہے اور ذی رحم پر صدقہ کرنا صدقہ اور صلہ ہے،[2] پھر یتیموں کا ذکر فرمایا، کیوں کہ ان کے لیے کوئی سنوارنے والا اور خرچ کرنے والا نہیں ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ احسان اور ان پر شفقت کرے۔ مساکین سے مراد محاویج ہیں، یعنی حاجت مند، جن کو کوئی کفایت کرنے والا نہیں ملتا، اس لیے حکم کیا کہ تم ان کی مدد کرو، جس میں اُن کا کام چلے اور اُن کی ضرورت پوری ہو۔ سورت براءت میں ۔إن شاء اللہ تعالیٰ۔ فقیر اور مسکین پر کلام آئے گا۔

پڑوسیوں کی اقسام اور ان کا حق:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جار ذی القربیٰ وہ ہمسایہ ہے، جس سے تیرا رشتہ ناتا ہو۔ جار جنب وہ ہمسایہ ہے، جو رشتہ دار نہیں ہے۔ یہی امام عکرمہ، مجاہد، میمون بن مہران، ضحاک، زید بن اسلم، مقاتل بن حیان اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول ہے۔ نوف بکالی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جار ذی القربیٰ سے مراد ہمسایہ مسلمان ہے۔ جار جنب سے یہودی نصرانی ہمسایہ مراد ہے۔ سیدنا علی اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جار ذی القربیٰ عورت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جار جنب رفیقِ سفر ہے۔[3] ہمسائے کے بارے میں وصیت پر مشتمل کئی حدیثیں آئی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو جبریل ہمسائے کے حق کے بارے میں وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ اب اس کو وارث بنا دیں گے۔[4] (رواہ أحمد والشيخان والترمذي نحوه وقال حسن غريب)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ کے نزدیک بہتر اصحاب وہ ہیں، جو اپنے اصحاب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٨٢) سنن ابن ماجه (١٨٤٤) صحيح الجامع (٣٨٥٨)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٤٨۔ ٩٤٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٢٥) مسند أحمد (٢/ ٨٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٤٣)

کے ساتھ بہتر ہوں اور ہمسایوں میں سے بہتر وہ ہے، جو اپنے ہمسائے کے ساتھ بہتر ہے۔[1] (رواہ أحمد والترمذي وقال حسن غریب) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کوئی اپنے ہمسائے کے بغیر پیٹ نہ بھرے۔[2] (تفرد بہ أحمد) مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ تم زنا کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کہا حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول نے زنا کو قیامت تک حرام کر دیا۔ فرمایا اگر مرد دس عورتوں سے زنا کر لے یہ سہل تر ہے اس پر اس سے کہ اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے۔ پھر فرمایا: کیا کہتے ہو، تم چوری کے بارے میں؟ کہا حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول نے اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔ فرمایا: اگر مرد دس گھروں میں چوری کرے، یہ اُس پر اس سے آسان تر ہے کہ اپنے ہمسائے کے گھر سے چوری کرے۔[3] (تفرد بہ أحمد)

اس حدیث کا ایک شاہد ہے۔ صحیحین میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! کون سا گناہ بہت بڑا ہے؟ فرمایا کہ تو اللہ کے برابر کسی کو کر لے، حالاں کہ اُس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ میں نے کہا: پھر؟ فرمایا کہ تو اپنی اولاد کو مار ڈالے اس ڈر سے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گی۔ میں نے کہا: پھر؟ فرمایا کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے۔[4] ایک انصاری مرد کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملاقات کے ارادے سے نکلا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں اور ایک آدمی آپ کی طرف متوجہ ہے۔ میں نے گمان کیا کہ کچھ کام ہوگا، اتنی دیر تک کھڑے رہے کہ میں نے اس طولِ قیام پر افسوس کیا، جب وہ آدمی چلا گیا۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ شخص اتنا کھڑا ہوا کہ مجھ کو آپ کے اتنی دیر کھڑا ہونے پر افسوس ہوا۔ فرمایا: تو نے اس شخص کو دیکھا؟ میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: کیا تو نے جانا کہ وہ کون تھا؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا: وہ جبریل تھے، مجھے ہمسایہ کے حقوق کی وصیت کرتے تھے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ عن قریب وہ اس کو وارث ٹھہرا دیں گے۔ پھر فرمایا: اگر تو اُن پر سلام کرتا تو وہ تجھ کو سلام کا جواب دیتے۔[5] (رواہ أحمد)

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص عوالی سے (مدینہ کے قرب و جوار کی بستیاں) آیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے، جس طرح جنازے پر پڑھی جاتی ہے، جب وہ چلے گئے تو اس شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ کون شخص تھے؟ جن کو میں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ فرمایا: تو نے ان کو

---

① مسند أحمد (٢/ ١٦٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٤٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٢٧٠)

② مسند أحمد (١/ ٥٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبایہ بن رفاعہ رحمہ اللہ کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (مجمع الزوائد: ٨/ ٣٠٦)

③ مسند أحمد (٦/ ٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٤٢)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦)

⑤ مسند أحمد (٥/ ٣٦٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٨/ ٣٠٠)

دیکھا؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: تو نے خیرِ کثیر دیکھی، وہ جبریل تھے۔ «مَا زَالَ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتّٰى رَأَيْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ»[1]

(رواه عبد بن حميد وتفرد به من هذا الوجه وهو شاهد للذي قبله)

دوسری حدیث سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح آئی ہے کہ ہمسائے تین ہیں: ایک وہ جس کا ایک حق ہے، وہ ہمسایوں میں ادنیٰ حق دار ہے۔ دوسرا وہ ہمسایہ ہے جس کے دو حق ہیں۔ تیسرا وہ ہمسایہ جس کے تین حق ہیں، وہ سب ہمسایوں سے زیادہ حق والا ہے۔ لہٰذا وہ ہمسایہ مسلمان ہے، اس کے لیے ایک اسلام کا حق ہے۔ دوسرا ہمسائیگی کا حق اور جس کے تین حق ہیں، یہ وہ ہمسایہ ہے کہ مسلمان ذو رحم ہے، اس کے لیے ایک اسلام کا حق، دوسرا ہمسائیگی کا حق اور تیسرا رحم کا حق ہے۔[2] (رواه البزار) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے دو ہمسائے ہیں، کس کو ہدیہ بھیجوں، فرمایا: جس کا دروازہ تیرے گھر سے قریب تر ہے۔[3] (رواه أحمد والبخاري)

ابن لہیعہ رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ قیامت کے دن پہلے دشمن دو ہمسائے ہوں گے۔[4] (رواه أحمد) سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: "صَاحِبِ بِالْجَنْبِ" بی بی ہے۔ یہی قول ابن ابی لیلیٰ، نخعی، حسن اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفیقِ سفر ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفیقِ صالح ہے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حضر کا ساتھی اور سفر کا ساتھی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور جماعت کے نزدیک ابن السبیل سے مراد مہمان ہے۔ امام مجاہد، امام باقر، حسن، ضحاک اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ راہ کا مسافر ہے، جس کا گزر تم پر ہوتا ہے۔[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ ظاہر یہی ہے اور اگر مہمان سے مراد راہ کا گزرنے والا ہے تو پھر دونوں کے لیے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ ابنائے سبیل (مسافروں) پر کلام۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔ سورت براءت میں آئے گا۔[6]

غلاموں (نوکروں) کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم:

﴿وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ سے مراد ارقاء (غلام) کے حق میں وصیت ہے، کیوں کہ غلام ضعیف الحیلہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے ہاتھ میں قیدی ہوتا ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ کی بابت یہ وارد ہے کہ مرض الموت میں یہ وصیت

---

1. مسند عبد بن حميد (١/ ٣٣٩) كشف الأستار عن زوائد مسند البزار (٢/ ٣٨٠) اس کی سند میں "فضل بن مبشر" ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیحین میں ہے، جیسا کہ زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکا ہے۔
2. كشف الأستار عن زوائد مسند البزار (٢/ ٣٨٠) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت مسلسل بالعلل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٤٩٣)
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٤٠) مسند أحمد (٦/ ١٧٥)
4. مسند أحمد (٤/ ١٥١) المعجم الكبير (١٧/ ٣٠٣) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٤٤)
5. تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٤٩، ٩٥٠)
6. تفسير ابن كثير (١/ ٦٤٧)

فرمائی: «اَلصَّلَاةَ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ» ''نماز کو قائم رکھنا اور اپنے مملوکوں کا خیال رکھنا۔'' اس وصیت کو بار بار فرماتے رہے، یہاں تک کہ زبان بند ہوگئی۔[1] سیدنا مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جو کھلایا تو نے اپنی جان کو وہ صدقہ ہے اور جو کھلایا اپنی اولاد کو وہ صدقہ ہے اور جو کھلایا اپنی بیوی کو وہ صدقہ ہے اور جو کھلایا اپنے خادم کو وہ صدقہ ہے۔[2] (رواه أحمد والنسائي من حديث بقية وإسناده صحيح ولله الحمد)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اپنے قہرمان یعنی داروغے سے کہا کہ تو نے غلام کو اس کا کھانا دیا؟ کہا: نہیں۔ کہا: جا کر دے دے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کو یہ گناہ کافی ہے کہ ان سے قوت (کھانا) روکے جن کا مالک ہے۔[3] (رواه مسلم) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مملوک کے لیے کھانا اور پہناوا ہے اور وہ کام کی تکلیف نہ دیا جائے مگر بقدرِ طاقت۔[4] (رواه مسلم) دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب خادم تمھارے پاس کھانا لائے تو اگر تو اس کو اپنے ساتھ نہ بٹھائے، یعنی کھلانے کو تو ایک دو لقمے اس کو دے دو، کیوں کہ اس نے اس کا حرّ و علاج (گرمی اور تکلیف) اُٹھایا ہے۔ (أخرجاه ولفظه للبخاري)

صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلا دے، اگر کھانا تھوڑا ہو تو اس کے ہاتھ میں ایک دو نوالے دے دو۔[5] سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ وہ تمھارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمھارا زیرِ دست کیا ہے، لہٰذا جس کسی کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو تو جو آپ کھائے، وہ اس کو کھلائے، جو آپ پہنے، وہ اس کو پہنائے اور اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے، جو اس پر غالب و دشوار ہو، پھر اگر تکلیف دے تو اس کی خود بھی مدد کرے۔[6] (أخرجاه)

اللہ متکبر کو پسند نہیں کرتا:

''مُخْتَال'' وہ ہے جو اپنے جی میں اتراتا، اپنے خیال میں معجب و متکبر ہے۔ ''فَخُوْر'' وہ ہے جو لوگوں پر فخر کرتا ہے، اپنے نفس میں اپنے آپ کو اُن سے بہتر سمجھتا ہے، حالاں کہ وہ اللہ کے نزدیک حقیر اور لوگوں کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مُخْتَال'' ہے۔ یعنی متکبر فخور ہے۔ یعنی جو اس کو دیا گیا ہے اس پر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ لوگوں پر اُس نعمت پر نازش کرتا ہے، حالاں کہ اللہ کی نعمت پر شکر کم ادا کرتا ہے۔ ابی رجا ہروی رحمہ اللہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٥٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٢٥٨۔ ٢٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٢٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٧/ ٢٣٧)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٣١) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٧٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٥٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٩٦)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٦٢)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٦٣)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٦١)

نے کہا ہے کہ میں نے جو کوئی بدخلق پایا، وہ مختال فخور تھا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ اور نہ پایا میں نے کوئی عاق (ماں کا نافرمان) مگر میں نے اس کو جبار شقی پایا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴾ [مريم: ٣٢] ”اور اپنی والدہ سے نیکی کرنے والا بنایا ہے اور اس نے مجھے سرکش (اور) بدبخت نہیں بنایا۔“[1]

امام مطرف رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھ کو سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث پہنچی تھی، میں ان سے ملنا چاہتا تھا۔ ملاقات ہوئی تو میں نے کہا: میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تین آدمیوں کو دوست رکھتا ہے اور تین آدمیوں کو دشمن رکھتا ہے۔ کہا: ہاں، کیا میں اپنے خلیل پر جھوٹ باندھوں گا، تجھ کو یہ خیال ہے؟ میں نے کہا: وہ تین آدمی کون ہیں، جن کو اللہ دشمن رکھتا ہے؟ کہا: مختالِ فخور، کیا تم اس کو اللہ کی کتاب میں نہیں پاتے ہو؟ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴾[2] (رواه ابن أبي حاتم) بنی الہجیم قبیلے میں سے ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے وصیت کریں۔ فرمایا: ازار لٹکانے سے بچ، کیوں کہ اسبالِ ازار (ازار لٹکانا) مخیلہ میں سے ہے اور اللہ اِترانے کو دوست نہیں رکھتا۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ کی عبادت ہر اس فعل سے عبارت ہے جس کو بندہ خالص اللہ کے لیے بجا لائے۔ اس میں سارے اعمالِ قلوب اور افعالِ جوارح داخل ہیں۔ ﴿ شَيْـًٔا ﴾ نکرہ ہے، یعنی کسی بھی چیز کو اللہ کی عبادت میں شریک نہ کرے، زندہ ہو یا مردہ، جمادات میں سے ہو یا حیوان، شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر میں اور واضح اور خفی شرک میں فرق کیے بغیر۔ احسانِ والدین سے مراد فرمانبرداری اور نرمی ہے۔ اپنی عبادت کے بعد جو یہ ذکر کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ والدین کا حق عظیم تر ہے۔ ذی القربیٰ سے مراد رشتہ دار ہیں، نزدیک ہوں یا دور یا ماں باپ کی طرف سے ذو رحم ہوں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی ہو، اس کے اثر (عمر) میں تاخیر ہو تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔[4] (أخرجه الشيخان)

پھر فرمایا کہ یتیم و مسکین سے احسان کرو۔ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ میں اور کافلِ یتیم (یتیم کی کفالت کرنے والا) جنت میں ایسے ہوں گے، جیسے سبابہ اور وسطیٰ (انگشت شہادت اور درمیان والی انگلی)۔[5] (رواه البخاري) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ بیوہ اور مساکین پر کوشش کرنے والا اللہ کی راہ میں

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٣٥٠)

[2] مسند أحمد (٥/ ١٧٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٠) المعجم الكبير (٢/ ١٥٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح“ (مجمع الزوائد: ٨/ ٣١١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٨٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١١٠٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٧) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٩٨)

جہاد کرنے والے کی طرح ہے یا ایسے قیام کرنے والے کی طرح جو تھکے نہیں یا ایسے روزے دار کی طرح جو افطار نہ کرے۔[1] (أخرجه الشيخان)

﴿ اَلْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى ﴾ سے مراد قریب کا ہمسایہ ہے، جس کا گھر پاس ہو یا نسب یا دین میں قریب ہو۔ ﴿ اَلْجَارِ الْجُنُبِ ﴾ وہ ہے، جس کا گھر دور ہو۔ آیت میں ہمسایہ کے ساتھ عمومِ احسان کی دلیل ہے، خواہ اس کا گھر قریب ہو یا دور۔ ہمسائیگی ایک قابلِ اہتمام حرمت ہے، جس کا حکم دیا گیا ہے، اس میں اُس کا رد ہے جس نے یہ گمان کیا کہ ہمسایہ وہی ہوتا ہے، جس کا گھر ملا ہوا ہو، جس کے بیچ میں کچھ حائل ہے، وہ ہمسایہ نہیں۔ یا ہمسائیگی قریب کے ساتھ مختص ہے، دور کے ساتھ نہیں۔ یا ﴿ اَلْجَارِ الْجُنُبِ ﴾ سے مراد غریب یا اجنبی ہے جس سے کوئی رشتہ نہیں۔ اہلِ علم کے درمیان ہمسائیگی کے تعین کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام اوزاعی، حسن اور زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چاروں طرف چالیس گھر تک ہمسائیگی کی حد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہمسایہ وہ ہے، جو اقامتِ نماز کی آواز سنے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک محلے والے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ ہے جو اذان سنے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جار کے معنی میں شریعت کی طرف رجوع کریں۔ اگر شرع میں مقتضی بیان ملے کہ زمین یا گھر سے اس حد تک ہمسائیگی کی حد ہے تو اس پر عمل متعین ہوگا، ورنہ لغوی معنی یا عرفِ عام کی طرف رجوع ہوگا۔

ہمسائیگی کی حد:

شرع میں نہیں آیا ہے کہ ہمسائے کے درمیان اتنی اتنی حد ہو، نہ لغتِ عرب میں یہ معنی آئے ہیں، بلکہ لغت میں جار کے معنی مجاور کے ہیں یعنی پڑوسی۔ قاموس میں کہا ہے کہ مجاور کو، شوہر کو، زن جارۂ شوہر کو، فرجِ زن کو اور ان گھروں کو جار کہتے ہیں، جو قریب ہیں۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، کہا: میں ایک محلے میں اُترا ہوں، جو مجھ سے بہت قریب ہمسایہ ہے، وہی مجھ کو سخت تکلیف دیتا ہے۔ تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم کو بھیجا کہ مسجدوں کے دروازوں پر جا کر اعلان کریں کہ چالیس گھر تک ہمسائیگی ہے۔ وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا، جس کا ہمسایہ اُس کے بوائق (شرارتوں) سے امن میں نہیں ہے۔[3]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو یہ اپنے علاوہ ہر روایت سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ لیکن امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس روایت کو حدیث کی کسی معروف کتاب کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔ وہ اگرچہ علمِ روایت میں امام ہیں، لیکن جس کو وہ بلاتخریج روایت کریں اور کسی مشہور کتاب سے نقل نہ کریں، وہ لائقِ حجت نہیں ہے۔ خصوصاً وہ اکثر واہیات (کمزور روایات) ذکر کیا کرتے ہیں، جس طرح کہ انھوں نے اپنی کتاب "التذکرة"

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٣٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٢)

[2] فتح القدير (١/ ٧٤٣) [3] تفسير القرطبي (٥/ ١٨٥)

میں بھی اسی طرح کیا ہے۔[1]

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، جس طرح ترغیب و ترہیب میں مذکور ہے۔[2] اور جامع صغیر میں امام سیوطی رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یوں ہے: «اَلْجِوَارُ أَرْبَعُوْنَ دَارًا»[3] ''پڑوس چالیس گھروں تک ہے۔'' (أخرجه البيهقي عن عائشة) امام مناوی رحمہ اللہ نے شرح میں کہا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے: «أَوْصَانِي جِبْرِيْلُ بِالْجَارِ إِلٰى أَرْبَعِيْنَ دَارًا»[4] ''مجھے جرائیل نے چالیس گھروں تک کے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت کی۔'' اور یہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ معروف وہ مرسل حدیث ہے جس کو ابو داود رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے: « حَقُّ الْجِوَارِ أَرْبَعُوْنَ دَاراً هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَأَشَارَ قُدَّاماً وَّ يَمِيْناً وَّخَلْفًا»[5] ''ہمسائیگی کا حق چالیس گھر ہیں، پھر آپ نے آگے پیچھے اور دائیں اشارہ کیا۔''

امام زرکشی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''رِجَالُهُ ثِقَاتٌ۔ وَ رَوَاهُ أَبُوْ يَعْلٰى عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ مَرْفُوْعاً بِاللَّفْظِ الْمَذْكُوْرِ''[6] لیکن اس کی سند زرکشی کے کہنے کے مطابق ضعیف ہے۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عبدالسلام بن ابی الجنوب منکر الحدیث ہے۔[7] یہ بیان امام قرطبی رحمہ اللہ کے بیان کی تائید کرتا ہے۔ واللہ أعلم.

اس کے ساتھ ضعیف حدیث رائے مجرد سے بہتر و قوی ہوتی ہے۔ اکثر محققین کے نزدیک احکام میں ضعیف حدیث پر عمل معتبر نہیں ہے۔ اسی لیے امام شوکانی رحمہ اللہ نے ہمسائیگی کی مقدار کا شرع میں تعیین کا انکار کیا ہے۔ قرآن شریف میں اس بات پر دلیل ہے کہ ایک شہر میں رہنا مجاورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [الأحزاب: ٦٠] ''اگر منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے اور مدینے میں جھوٹی افواہیں اُڑانے والے باز نہ آئے تو ہم ضرور آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے، پھر وہ آپ کے پاس اس (مدینے) میں تھوڑی مدت ہی رہ سکیں گے۔'' پس ایک شہر میں مجتمع ہونے کو جوار ٹھہرایا۔

جہاں تک جوار کے مسمّٰی میں عُرفوں کا تعلق ہے تو یہ لوگوں کے مختلف ہونے کے ساتھ مختلف ہوتے ہیں۔

---

[1] فتح القدير (١/ ٧٤٣)

[2] المعجم الكبير (١٩/ ٧٣) ضعيف الترغيب والترهيب (٢/ ٨٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه يوسف بن السفر وهو متروك'' (مجمع الزوائد: ٨/ ٣٠٩)

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ٢٧٦) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٢٦٩٨)

[4] سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ٢٧٦) اس کی سند میں ''اسماعیل بن سیف'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٧٤)

[5] المراسيل لأبي داود (١/ ٢٥٧) یہ روایت مرسل ہے۔

[6] مسند أبي يعلىٰ (١٠/ ٣٨٥)

[7] تلخيص الحبير (٣/ ٩٣) فيض القدير (٣/ ٣٧٦)

اعراف متعارفہ اور اصطلاحاتِ متواضعہ پر قرآن پاک کو محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ صاحبِ جنب وہ ہے جو پہلو سے ملائے رکھے۔ کسی نے کہا ہے کہ راستے کا ساتھی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بیوی ہے، جو ہم بستر رہتی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جو تیرے ساتھ نفع کی اُمید سے لگا رہے اور ملازم اور ساتھی بنا رہے۔[1] لیکن اگر آیتِ شریفہ کو ان تمام معانی و اقوال کا حامل کہیں تو کوئی بعید نہیں۔ بلکہ جس کسی پر یہ لفظ صادق آئے، اس کو بھی شامل ہے، جیسے: وہ شخص جو تیرے پہلو میں تحصیلِ علم یا تعلم یا کچھ کام کرنے یا رات اکٹھے رہنے یا تجارت کرنے یا اس جیسی اور ضرورتوں کے لیے بیٹھا یا کھڑا ہوتا ہے، کیوں کہ وہ تیرا ساتھی اور ہم پہلو ہے یا جو کوئی مسجد یا مجلس وغیرہ میں تیرے ساتھ نشست کرتا ہے، اس ادنیٰ ہم نشینی کے تعلق کے ساتھ جو تیرے اور اس کے درمیان ہے۔

سبیل راہ کو کہتے ہیں۔ ابن سبیل مسافر ہوا۔ مقیم پر لازم ہے کہ اُس کے ساتھ احسان کرے یا وہ شخص مراد ہے جو سفرِ حج یا غزوے میں یا صرف کسی سفر میں منقطع ہو گیا ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد مسافر ہے انقطاع کی شرط کے بغیر۔ یا اس سے مراد مہمان ہے، حدیثوں میں مہمان کی عزت و تکریم کرنے کا حکم آیا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ مہمان کی خاطر تین دن ہے۔[2] ﴿وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ سے مراد لونڈی غلام ہیں، جن کو ارقاء بولتے ہیں۔ کسی نے کہا: لفظ عام ہے، حیوانات کو بھی شامل ہے، کیوں کہ لفظ ملک یمین اُن پر صادق آتا ہے، اس لیے ہر مملوک سے احسان کرنا چاہیے، آدمی ہو یا حیوان، لیکن زیادہ بہتر اول ہے۔

احسان یہ ہے کہ طاقت سے زیادہ مشقت نہ لے، سخت کلامی سے ایذا نہ دے۔ روٹی کپڑا بقدرِ کفایت دے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری کلام یہ تھا: «اَلصَّلَاةَ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ» یعنی نماز اور لونڈی غلام کا بڑا دھیان رکھنا۔[3] ہر گز نماز نہ چھوڑنا اور مملوکوں سے احسان تمام کرتے رہنا۔ برِّ والدین، احسانِ یتامی و جار و ممالیک وغیرہ میں بہت سی احادیثِ مرفوعہ آئی ہیں، جو کتبِ سنتِ مطہرہ میں موجود ہیں۔ ان کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ناز نخرے کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ فخر اپنی جان کی تعریف کرنا اپنے مناقب کو شمار کرنا اور اپنی خوبیوں کو گننا ہے، جس طرح مخیلہ عُجب و تکبرِ نفس کو کہتے ہیں، ان دونوں خصلتوں کا اس جگہ بالخصوص ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ اختیال اور فخر کرنے والا اس بات سے عار کرتا ہے جس کی طرف اللہ نے اس کو اس آیت میں بلایا ہے، مثلاً: قریبی رشتہ دار، جو فقرا ہیں، ان سے ناک منہ چڑھاتا ہے۔ کمزور ہمسایوں کی طرف توجہ نہیں کرتا، جو متکبر ہوتا ہے، وہ لوگوں کے حقوق ادا کرنے کا خیال نہیں کرتا۔ اختیال اور تکبر کی مذمت میں جو حدیثیں مروی ہیں وہ معروف و مشہور ہیں۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٣٤٣۔ ٣٤٤)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨)
[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٩٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٦١٦)
[4] فتح البيان (٣/ ١١٢۔ ١١٧)

اِلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ
مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا
مُّهِيْنًا ۝ۚ۳۷ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ
قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝۳۸ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝۳۹

ایسے لوگ (بھی اللہ کو پسند نہیں) جو کنجوسی کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوسی کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انھیں دیا ہے، اسے چھپاتے ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے (37) اور ایسے لوگ (بھی اللہ کو پسند نہیں) جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جس شخص کا ساتھی شیطان ہو تو وہ بہت برا ساتھی ہے (38) اور ان لوگوں کا کیا جاتا، اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آتے، اور اللہ نے انھیں جو مال دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے؟ اور اللہ انھیں خوب جاننے والا ہے؟ (39)

بخیلی اور خرچ کرنے میں ریاکاری کی مذمت:

یعنی مال دینے میں بخل کرنا، جیسا اللہ تعالیٰ کے نزدیک برا ہے، ویسا ہی لوگوں کو دکھانے کے لیے دینا بھی بُرا ہے۔ قبول وہ ہے جو حق داروں کو دے، جن کا پہلے ذکر ہوا اور اللہ کے یقین سے اور آخرت کی توقع سے دے۔ اللہ فرماتا ہے کہ جو لوگ مال کو وہاں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں جہاں اللہ نے حکم دیا ہے، جیسے: برّ والدین، رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک، یتامیٰ، مساکین، جار، صاحبِ جُنب، ابن السبیل اور ممالیک سے سلوک کرنا۔ جو اپنے مال سے اللہ کا حق نہیں نکالتے، بلکہ لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں، ان کو عذاب ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کونسی بیماری بخل سے بڑھ کر ہے۔[1]

پھر کہا کہ تم کنجوسی سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا۔ اسی نے ان کو قطع رحمی کا حکم دیا، انھوں نے قطع رحم کیا۔ فجور کا حکم کیا، انھوں نے فجور کیا۔ اس حدیث کی سند ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر نہیں کی۔[2] کتمانِ فضل کے معنی ہیں کہ بخیل اللہ کے فضل و نعمت کا منکر ہے۔ اُس کا اثر بخیل پر اس کے کھانے اور لباس اور عطا اور خرچ پر ظاہر نہیں

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٢٢)

(2) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٩٨) تفسير ابن كثير (١/ ٦٤٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٢٥٥)

ہوتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ﴾ [العاديات: ٦۔ ٧] ”بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ اور بے شک وہ اس بات پر (خود بھی) گواہ ہے۔“ یعنی وہ اپنے حال اور شمائل کا گواہ ہے۔ ﴿ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴾ [العاديات: ٨] ”اور بے شک وہ مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہے۔“

یعنی مال کا بڑا دوست دار ہے۔ اسی لیے فضل کو چھپانے اور کفرانِ نعمت پر عذابِ مہین کا وعدہ فرمایا ہے اور بخیلوں کو کافر ٹھہرایا ہے۔ کفر ستر و تغطیہ (چھپانا) کو کہتے ہیں، بخیل اپنی نعمت کو چھپاتا، انکار کرتا ہے تو وہ انعام اور نعمت کا انکار کرنے والا ہوا۔ حدیث میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے پر اپنا انعام کرتا ہے تو اس بات کو بھی دوست رکھتا ہے کہ اُس نعمت کا اثر اس پر ظاہر ہو۔[1]

دعائے نبوی ﷺ میں مروی ہے: « وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِيْنَ بِهَا عَلَيْكَ قَابِلِيْهَا وَأَتِمَّهَا عَلَيْنَا »[2] ”ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر گزار، ان کے ذریعے تیری ثنا کرنے والا بنا اور انھیں ہم پر پورا کر۔“ بعض سلف نے اس آیت کو بخلِ یہود پر محمول کیا ہے کہ محمد ﷺ کی صفت کا جو علم ان کے پاس تھا، اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، بلکہ ان تعریفوں کو مخفی رکھتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کافرین کے لیے عذابِ مہین ہوگا۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام عکرمہ، سعید بن جبیر، امام مجاہد رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا قول ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں شک نہیں ہے کہ آیت اس معنی کا احتمال بھی رکھتی ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت سے مال کا بخل ظاہر ہوتا ہے، اگرچہ علم کا بخل اس میں بطریقِ اولیٰ داخل ہے۔ کیوں کہ آیت کا سیاق اقارب اور ضعیفوں پر خرچ کرنے کے بارے میں ہے۔ اسی طرح اس سے بعد والی آیت کا بھی یہی سیاق ہے کہ جو لوگ مال دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان میں مال کو روکنے والوں کا ذکر کیا ہے جو بخیل ہیں۔

پھر باذلین (خرچ کرنے والے) اور مُرائین (ریاکاری کرنے والے) کا ذکر کیا، جو دکھانے اور سنانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اپنی سخاوت پر اپنی تعریف کروانا چاہتے ہیں۔ اللہ کی ذات کو مدنظر نہیں رکھتے۔ حدیث میں مروی ہے کہ وہ تین لوگ جن سے جہنم کو سب سے پہلے سلگایا جائے گا: عالم، غازی اور سخی ہیں، جو اپنے اعمال میں ریا کرنے والے تھے۔ مال والا کہے گا کہ نہیں چھوڑی میں نے کوئی چیز کہ وہاں خرچ کرنا محبوب ہو، مگر میں نے وہاں تیری راہ میں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ کہے گا تو جھوٹا ہے، تیرا ارادہ یہ تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں۔ لہٰذا یہ بات کہی گئی۔[3] یعنی تو نے اپنا بدلہ دنیا میں لے لیا، یہی تیرا اپنے کام سے ارادہ تھا۔

---

[1] المعجم الكبير (١٨/ ١٣٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧١٢)
[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٦٩)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٥)

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تیرے باپ نے جو ارادہ کیا تھا، وہ اس کو پہنچ گیا۔[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، عبداللہ بن جدعان کا کیا حال ہے، اُس کو اس کا خرچ کرنا اور اِعتاق (گردنوں کو آزاد کرانا) کچھ نفع دے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اس نے کسی دن بھی زبان سے یوں نہیں کہا: «رَبِّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ» ''اے میرے رب! روزِ جزا میرے گناہوں کو بخش دینا۔''[2] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے ہیں۔ معلوم ہوا جس کو قیامت کا یقین نہیں ہے، اس کا کوئی عمل قبول اور نافع نہیں ہوتا۔ یہ برا کام اور اللہ کی اطاعت سے روگردانی کا کام ان سے شیطان نے کرایا ہے۔ اسی نے ان کو یہ کام اچھے کر دکھائے، ان کو قبائح بشکلِ محاسن نظر آنے لگے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس کا قرین (ساتھی) شیطان ہے، وہ برا قرین ہے۔ شاعر نے کہا: ؎

عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْئَلْ وَسَلْ عَنْ قَرِيْنِهٖ　　فَكُلُّ قَرِيْنٍ بِالْمُقَارِنِ يَقْتَدِيْ[3]

''آدمی سے نہ پوچھ بلکہ اس کے ساتھی سے پوچھ، ہر ساتھی اپنے ساتھی کی پیروی کرتا ہے۔''

؎ نخست موعظت پیر دانش این سخن ست　　کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

''دانش مند کی پہلی نصیحت یہ تھی: ناجنس اور کمینے مصاحب سے دور رہ۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان کا کیا نقصان تھا، اگر وہ اللہ پر ایمان لاتے اور طریقِ حمیدہ اختیار کرتے، ریا کاری کو چھوڑ کر اخلاص کی طرف آتے۔ دارِ آخرت میں نیکو کاروں کے لیے، جس کا وعدہ ہے، اللہ سے اس کی اُمید رکھتے۔ جہاں اللہ کی مرضی تھی، وہاں خرچ کرتے۔ اللہ کو نیتِ صالحہ و فاسدہ کا بہ خوبی علم ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ کون حسنِ توفیق کا مستحق ہے اور کون عملِ صالح کے الہام کے لائق، جس سے وہ راضی ہو، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ذلت کا مستحق اور بابِ رحمتِ لامتناہی سے دور ہٹائے جانے کا مستحق کون ہے کہ دنیا اور آخرت میں خائب و خاسر ہوگا۔ عَيَاذاً بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ شرع میں مذموم بخل سے مراد واجبات ادا کرنے سے باز رہنا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے باوجود ان بدترین خصلتوں کے وہ بات اختیار کی تھی جو اس سے بھی زیادہ قبیح تھی کہ آپ تو آپ دوسروں کو بھی بخیل بناتے ہیں۔ دوسروں کی سخاوت اور عطا کرنے کو دیکھ کر ان کا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کو نہ بڑھائے، بھلا اپنے مال میں تو اس لیے بخل کیا تھا کہ اس کے نقصان ہونے کا گمان تھا کہ خرچ کرنے سے کم ہوجائے گا اور گھٹ جائے گا۔ دوسروں کے مال میں بخل کرنا طرفہ ماجرا ہے! اس سے ان کو کیا ضرر پہنچتا ہے؟ یہ نہایت درجے کا قابلِ ملامت

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٥٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ورجاله ثقات'' (مجمع الزوائد: ١/ ٣١٧)

[2] صحیح مسلم، رقم الحديث (٢١٤)　[3] تفسير ابن كثير (١/ ٦٤٩)

اور پرلے درجے کا احمق ہے، انتہا درجے کی رقاعت (کم عقلی)، قبیح طبیعت اور برا اختیار ہے۔ أستغفر الله۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہودی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ منافقین ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لفظ اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ کافرین سے مراد اللہ کی نعمتوں کے منکرین اور اس سے روکنے والے ہیں۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو خصلتیں ہیں جو مومن میں جمع نہیں ہوتیں: ایک بخل، دوسری بدخلقی۔ (أخرجه الترمذي و استغربه)[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ریا کا ذکر فرمایا۔ یعنی پہلے ان کا ذکر جو کنجوس مکھی چوس ہیں، نہ آپ دیں نہ دوسرے کا دینا دیکھ سکیں، اللہ کی دی ہوئی چیز کو چھپائیں، یہ انتہا درجے کی تفریط ہے، ان کے مقابلے میں وہ ہیں، جو زیادتی اور فضول خرچی کرتے ہیں، مال کو دکھانے، سنانے کے لیے بے جا لٹاتے ہیں، تاکہ بڑے سخی داتا مشہور ہوں، لوگ کہیں: دیکھو! یہ کیسا سخی ہے۔ یہ اپنی تعریف سن کر پھول جائیں، لوگوں پر فخر و نازش کریں، پھر اس پر طرہ یہ کہ باوجود اس خرچ کے جس کا نقصان خود انہی پر عائد ہوتا ہے اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اللہ کی توحید اختیار نہیں کرتے۔

معاد (آخرت) کے قائل نہیں، جہاں سارے اعمال کی سزا جزا ملے گی۔ کسی نے کہا کہ یہود کے حق میں اتری ہے۔ کسی نے کہا ہے منافقین کے حق میں۔ کسی نے کہا ہے کہ مشرکینِ مکہ کے حق میں ہے۔ خواہ کسی کے حق میں اتری ہو عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہے خصوصیتِ سبب کا نہیں۔ جو اس قسم کے بخل اور اِنفاقِ ریا کا مصداق ہے، گو مسلمان ہو، آیتِ شریفہ اس کو شامل اور اس پر لاگو ہے۔ ایسے لوگوں کا ساتھی شیطان لعین ہوا کرتا ہے، جس کا ساتھی اور دوست، میل جول رکھنے والا، ہم نشین اور نزدیک ہونے والا شیطان ہوگا وہ بُرا ساتھی ہے۔ قرین کے ایک معنی وہ رسی ہے، جس سے دو اونٹوں کو باندھیں، یعنی یہاں اور آگ دونوں جگہ اس کا ساتھی شیطان ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا.

اس میں شیطان کی فرمانبرداری کی ملامت ہے۔ آخرت میں ہر کافر کے ہمراہ اس کا قرین ایک سلسلے میں بندھا ہوگا، مگر پہلے معنی زیادہ صحیح اور آیتِ شریفہ کے ظاہر کے ساتھ لگاؤ کھاتے ہیں۔ بھلا سمجھو تو یہ لوگ اگر اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آتے تو ان کا کیا نقصان تھا۔[2] جو مال اللہ نے ان کو دیا تھا، اس کو اللہ کی مرضی کی جگہ میں خرچ کرتے۔ حکم کی بجا آوری ہوتا، اللہ راضی رہتا، چیز ٹھکانے لگتی، نقصان اور وبال اور ضرر تو اب ہوا کہ مال کو اللہ کی مرضی کے خلاف بے جا خرچ کیا، کافرِ نعمت ہوئے، منکرِ آخرت ٹھہرے، دونوں جہاں سے گئے، پانڈی حلوا ملا نہ مانڈے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٦٢) اس کی سند میں ''صدقہ بن موسیٰ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة: ١١١٩)

[2] فتح البیان (٣/ ١١٨۔ ١٢٠)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے 40 پھر ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ (ﷺ) کو اس امت پر گواہ بنائیں گے؟ 41 اس دن وہ لوگ، جنھوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، خواہش کریں گے کہ کاش! انھیں زمین کے ساتھ برابر کر دیا جاتا اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے 42

اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا:

یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی طرح نقصان نہیں، آخرت کا ثواب بے شمار ہے۔ دنیا میں بھی عوض پاتا ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے قسم کھائی۔ پھر فرمایا: ہر امت اور ہر عہد کے لوگوں کے احوال اُس وقت کے پیغمبر اور معتبر نیک بختوں سے بیان کروا دیں گے، منکروں کا انکار اور اطاعت والوں کی اطاعت بیان ہوگی، تب منکر آرزو کریں گے کہ ہم انسان نہ ہوتے مٹی میں مل کر خاک ہو جاتے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی ایک پر بھی قیامت کے دن ذرہ برابر ظلم نہیں کرے گا۔ اور پورا حق بلکہ اس سے دو چند دے گا، اگر نیکی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤٧] ''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا تو ہم اسے (تولنے کے لیے) لے آئیں گے، اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے لقمان علیہ السلام کی زبان سے خبر دی کہ انھوں نے کہا: ﴿ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴾ [لقمان: ١٦] ''اے میرے (پیارے) بیٹے! بے شک اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو اور وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں اور زمین کے اندر کہیں بھی ہو تو اللہ اسے نکال لائے گا، بلاشبہ اللہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَوْمَىِٕذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ٦۔ ٨] ''اس روز لوگ الگ الگ ہو کر لوٹیں گے، تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ لہٰذا جس نے ذرہ بھر بھلائی کی، وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''[1]

صحیحین میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً طویل حدیثِ شفاعت میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کہے گا: جاؤ جس کو پاؤ کہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہے، اس کو آگ سے باہر نکال لو۔ ایک روایت میں اس طرح مروی ہے: «أَدْنٰی أَدْنٰی أَدْنٰی مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَخْرِجُوْهُ مِنَ النَّارِ فَيُخْرِجُوْنَ خَلْقًا كَثِيْرًا» پھر سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: تمھارا جی چاہے تو یہ آیت پڑھ لو: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)[2]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قیامت کے دن بندہ یا لونڈی لایا جائے گا، پھر ایک پکارنے والا سب کے سامنے پکارے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، جس کسی کا کوئی حق ہو، وہ اپنا حق لینے کے لیے آئے۔ عورت خوش ہوگی، اگر کوئی حق اس کا اپنے باپ یا ماں یا بھائی یا شوہر پر ہوگا۔ اس دن نسب نہ ہوں گے نہ وہ نسب سے پوچھے جائیں گے۔ اللہ اگر چاہے تو اپنا حق معاف کر دے گا۔ لوگوں کے حق میں کچھ بھی معاف نہیں فرمائے گا۔ لوگوں کے لیے کھڑا ہوگا۔ ایک منادی ندا کرے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، جس کسی کو اپنا حق لینا ہو، وہ آ کر لے لے۔ وہ کہے گا: اے رب! دنیا تو ہو چکی، اب میں اپنا حق کیسے پورا کروں۔ پس ان کے اعمالِ صالحہ سے حق لے کر حق دار کو اس کے مطالبے کے مطابق دیں گے۔

پس اگر وہ اللہ کا ولی اور دوست ہوگا اور ذرہ کے برابر اس کا حق زیادہ ہوگا تو اللہ اس کو دوگنا کر دے گا۔ اس ذرے کے سبب بہشت میں لے جائے گا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اور اگر بندہ بدبخت ہوا تو فرشتہ کہے گا: اے رب! اس کی ساری نیکیاں فنا ہو گئیں اور طلب کرنے والے بہت ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ان کی سیئات (برائیاں) اس کی سیئات سے ملا دو، پھر اس کو آگ میں دھکیل دو۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت اعراب کے حق میں اتری ہے۔ ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ [الأنعام: ١٦٠] ''جو شخص (وہاں) ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے دس گنا (ثواب) ہوگا۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٥٠) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٧٠٠١۔ ٧٠٧٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٣۔ ١٩٣)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٤۔ ٩٥٥) اس کی سند صحیح ہے۔ نیز یہی مضمون حدیثِ مفلس (صحیح مسلم، رقم: ٢٥٨١) میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے۔

ایک آدمی نے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! مہاجرین کے لیے کیا ہے؟ کہا: اس سے بھی افضل ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)[1] (رواه ابن أبي حاتم)

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے آیتِ کریمہ: ﴿ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا ﴾ کے بارے میں کہا کہ قیامت کے دن مشرک کے عذاب میں تخفیف کریں گے، لیکن وہ آگ سے ہرگز باہر نہیں نکلے گا۔[2] اس کے لیے صحیح حدیث سے استدلال کیا ہے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کے چچا ابو طالب آپ کی نگہبانی اور مدد کرتے تھے، آپ نے ان کو کچھ فائدہ دیا، فرمایا وہ دوزخ کے بیچ میں ہے، اگر میں نہ ہوتا تو جہنم کے نیچے کے طبقے میں جاتا۔[3]

اس حدیث کو صرف ابو طالب کے لیے خاص کہتے ہیں۔ دوسرے کفار کا یہ حال نہیں ہوگا، کیوں کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی دلیل کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کسی مومن پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کی نیکی کا بدلہ اس کو دنیا میں رزق کی صورت میں دیتا ہے اور آخرت میں اس کی جزا دے گا۔ اور کافر کو دنیا میں کھلاتا ہے، جب قیامت کا دن ہوگا تو اس کے لیے کوئی نیکی نہیں ہوگی۔[4] (رواه أبو داود الطيالسي) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، امام عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اجرِ عظیم سے جنت مراد ہے۔[5] نَسْأَلُ اللّٰهَ رِضَاهُ وَالْجَنَّةَ وَ نَعُوْذُ بِهِ مِنَ النَّار.

اجرِ عظیم کا معنی:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اللہ مومن بندے کو ایک نیکی پر دس لاکھ نیکیاں دیتا ہے۔ ابو عثمان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں حج یا عمرہ کو گیا تھا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا: مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بندے کو ایک نیکی کے عوض لاکھ نیکیاں ملتی ہیں۔ کہا: اے ابو عثمان! تم اس پر کیا تعجب کرتے ہو؟! اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ﴾ [البقرة: ٢٤٥] ''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے؟ پھر اللہ وہ مال اس کے لیے کئی کئی گناہ بڑھا دے۔''

نیز فرماتا ہے: ﴿ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴾ [التوبة: ٣٨] ''چناں چہ دنیا کی زندگی کا فائدہ تو آخرت (کے مقابلے) میں بہت ہی حقیر ہے۔'' قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، وہ فرماتے تھے: «إِنَّ اللّٰهَ يُضَاعِفُ الْحَسَنَةَ أَلْفَيْ أَلْفِ حَسَنَةٍ» (رواه أحمد وقال هذا حديث غريب) ''اللہ تعالیٰ نیکیوں کو بیس لاکھ نیکیوں تک بڑھا دیتا ہے۔'' اس کی سند میں علی بن زید بن

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٥) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٨) مسند الطيالسي (١/ ٢٦٩) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٥)

جدعان ہے، اس کے پاس مناکیر ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے دوسرے طریق سے بھی روایت کیا ہے۔[1]

قیامت کے دن ہمارے نبی کریم ﷺ کی گواہی:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت کا ہول اس کی شدت اور حشر کی حالت ایک بہت بڑا ہنگامہ ہے۔ بھلا سمجھو اس وقت کیا حال ہوگا، جس وقت ہر اُمت میں سے ایک گواہ آئے گا؟ یعنی انبیا علیہم السلام، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٩] ”اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی، اور (عملوں کی) کتاب رکھی جائے گی اور انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا عَلَیْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِیْدًا عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ﴾ [النحل: ٨٩] ”اور (اے نبی! یاد کرو) جس دن ہم ہر امت میں ان پر انہی میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، اور آپ کو ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔ اور ہم نے آپ پر ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی یہ کتاب نازل کی ہے، جو مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے۔“

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر کچھ قرآن پڑھو، میں نے کہا: آپ پر پڑھوں اور آپ پر وہ اترا ہے؟ فرمایا: ہاں میں چاہتا ہوں کہ قرآن شریف کو غیر سے سنوں۔ میں نے سورت نساء پڑھی، جب اس آیت پر پہنچا: ﴿ فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ فرمایا: «حَسْبُكَ الْآنَ» اب بس اتنا بہت ہے، ناگاہ آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔
(رواه البخاري و مسلم أيضاً من طرق متعددة و رواه أحمد)[2]

محمد بن فضالہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ بنی ظفر میں آئے۔ اس پتھر پر بیٹھے، جو آج بنی ظفر میں موجود ہے۔ آپ کے ہمراہ ابن مسعود، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما اور کئی ایک صحابی تھے۔ ایک قاری سے کہا: کچھ پڑھو۔ اُس نے پڑھا، جب اس آیت پر آیا: ﴿ فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٥٢١، ٢٩٦) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٦١) مسند احمد کی دونوں سندوں میں ”علی بن زید بن جدعان“ ضعیف راوی ہے اور تفسیر ابن ابی حاتم کی سند میں ”زیاد الجصاص“ ضعیف راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٩٧٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٠) مسند أحمد (١/ ٣٨٠)

نبی اکرم ﷺ رونے لگے، یہاں تک کہ ڈاڑھی اور ہر دو پہلو پر آنسو گرے۔ فرمایا: «يَا رَبِّ، هٰذَا شَهِدْتُ عَلٰى مَنْ أَنَا بَيْنَ أَظْهُرِهِمْ فَكَيْفَ بِمَنْ لَّمْ أَرَهُ؟» [1] (رواہ ابن أبي حاتم) ''اے رب! میں جن کے درمیان ہوں ان پر تو یہ گواہی دیتا ہوں، لیکن اس کے بارے میں کس طرح گواہی دوں گا، جس کو میں نے دیکھا ہی نہیں؟''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «شَهِيْداً عَلَيْهِمْ مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ» [2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے ''التذکرۃ'' میں ''بَابُ مَا جَآءَ فِيْ شَهَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ عَلٰى أُمَّتِهِ'' کی ذیل میں سعید بن میتب رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ کوئی دن نہیں ہے، مگر اس میں صبح و شام امت کو نبی اکرم ﷺ پر پیش کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ ان کو ان کے نام و اعمال سے پہچانتے ہیں۔ یہ آپ ﷺ کی ان پر شہادت ہے۔ اللہ فرماتا ہے: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (آیت زیر تفسیر)۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس اثر میں انقطاع ہے، اس کے اندر ایک مرد مبہم غیر مسمّٰی ہے۔ یہ ابن المسیب رحمہ اللہ کا قول ہے، مرفوع حدیث نہیں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس کو قبول کیا ہے اور اس اثر کو ذکر کرنے کے بعد یوں کہا ہے کہ اللہ پر ہر سوموار اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں اور انبیا، باپوں اور ماؤں پر اعمال جمعے کے دن پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر کہا کہ اس میں کچھ تعارض نہیں ہے۔ احتمال ہے کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ پر ہر روز پیش کیے جاتے ہوں اور جمعے کے دن دوسرے انبیا کے ہمراہ پیش کیے جاتے ہوں۔ [3]

کافروں کا موت کی تمنا کرنا:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کافر چاہیں گے، کاش! زمین پھٹ جاتی اور ان کو نگل جاتی۔ یہ چاہنا اس لیے ہوگا کہ موقف (محشر) کی ہولناکیوں کو دیکھیں گے اور جو رسوائی، ذلت اور ڈانٹ ان پر نازل ہوگی، اس کے سبب سے یہ تمنا کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ [النبأ: ٤٠] ''بے شک ہم نے تمھیں جلد آنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾ (آیت زیر تفسیر) ان کے حال کی خبر ہے کہ وہ اپنے سارے افعال کا اعتراف کریں گے اور کسی بات کو مخفی نہیں رکھیں گے۔

ایک آدمی نے آکر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے حال کی خبر دی ہے، وہ قیامت کے دن اس طرح کہیں گے: ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''اپنے پروردگار کی قسم! ہم مشرک

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٦) المعجم الكبير (١٩/ ٢٤٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ورجاله ثقات'' (الزوائد: ٧/ ٥٩)

[2] تفسیر الطبري (٨/ ٣٧٠) یہ روایت مرسل ہے۔ [3] التذکرة (١/ ٣٨٣۔ ٣٨٤) تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٥٢)

نہ تھے۔'' اور دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا یَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) یعنی ان دونوں آیتوں میں بہ ظاہر تضاد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ جب دیکھیں گے کہ جنت میں صرف اہلِ اسلام جا رہے ہیں تو کہیں گے: آؤ ہم شرک کا انکار کریں۔ اس وقت اللہ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا، ان کے ہاتھ پاؤں بول اُٹھیں گے، پھر ان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔ (رواہ ابن جریر) اس کو عبدالرزاق رحمہ اللہ نے بھی مطولاً ذکر کیا ہے۔[1] یہ اثر کئی طرح سے مروی ہے۔ سب کا حاصل یہی جواب ہے، جو اس جگہ مذکور ہوا۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں کہا ہے کہ چھوٹی چیونٹی کو یا چیونٹی کے سر کو یا رائی کے دانے کو یا ریت کے ہر ذرے کو جو سورج میں چمکتا ہے، ذرہ کہتے ہیں، مگر لغت میں پہلے ہی ایسے معنی ہیں، جو قرآنی اصطلاح پر محمول ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ ظلم نہیں کرتا نہ بہت نہ تھوڑا، نہ ذرہ برابر کسی کے ثواب میں کمی کرتا ہے نہ کسی کے عذاب میں زیادہ کرتا ہے۔ اس آیت کی اس سے پہلے کی آیت سے مناسبت ظاہر ہے۔ مضاعف حسنہ سے نیکی کے ثواب کو دوگنا کرنا ہے نہ کہ نفسِ حسنہ کو، کیوں کہ مثلاً ایک نماز کا دو نماز کرنا معقول نہیں ہوتا۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر حسنہ سیئات سے ذرہ برابر زیادہ ہے تو اللہ اس کو مضاعف کر دے گا۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر میرے حسنات، میرے سیئات سے ذرہ برابر بڑھ جائیں تو مجھ کو دنیا ومافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔[3] اللہ صاحبِ حسنہ کو اپنے پاس سے اپنے فضل وکرم سے عمل کے مقابلے میں وعدے سے زیادہ جنت دے گا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ جب اجرِ عظیم عطا فرما دے تو پھر کون اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔[4] پھر فرمایا: ان کفارِ یہود ونصاریٰ ومشرکین ومنافقین کا کیا حال ہوگا یا کفارِ قریش کا خاصتاً قیامت کے دن کیا حال ہوگا؟ یہ استفہام ملامت اور سختی کے لیے ہیں۔

ہر نبی سے اُس دن اس کی امت پر گواہی طلب ہوگی اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سارے انبیا اور تمام امتوں یا منافقین یا مشرکین یا مومنین پر گواہی طلب ہوگی۔ اس وقت کافر آرزو کریں گے کہ کاش! زمین پھٹ جاتی اور وہ اس کے اندر دھنس جاتے، پھر وہ کسی جگہ میں کوئی بات اللہ سے چھپا نہیں سکیں گے، کیوں کہ جب ان کے جسمانی اعضا اور زمان ومکان سب گواہی دیں گے تو پھر کسی سے کوئی بات مخفی رہنے کی کیا صورت ممکن ہے؟[5]

---

[1] تفسیر الصنعاني (١/ ١٦٠۔ ١٦٢) تفسیر الطبري (٨/ ٣٧٣) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے، جس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٤)

[3] تفسیر الطبري (٨/ ٣٦٠)

[4] تفسیر البغوي (٢/ ٢١٧)

[5] فتح البیان (٣/ ١٢٠۔ ١٢٢)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝43

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اس وقت نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ تم کہتے ہو، اور نہ ناپاکی کی حالت میں (نماز کے قریب جاؤ) یہاں تک کہ تم غسل کر لو۔ ہاں، اگر راہ چلتے گزر و تو اور بات ہے۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت سے (فارغ ہو کر) آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو، پھر تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کر لو اور اسے اپنے منہ اور ہاتھوں پر مل لو، بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، بخشنے والا ہے (43)

موضح القرآن کا بیان:

اس آیت میں تیمّم کا ذکر ہے۔ پہلے جو مذکور ہوا کہ کافر آخرت میں آرزو کریں گے کہ خاک میں مل جائیں۔ خاک انسان کی پیدائش ہے، اپنی پیدائش کی طرف جانا گناہوں سے بچاؤ ہے۔ اس لیے مٹی ملنے سے بھی طہارت فرمائی۔ پہلے حکم فرمایا کہ نشے میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ یہ حکم اس وقت تھا جب نشہ حرام نہیں ہوا تھا۔ لیکن نماز سے مانع ٹھہرا تھا، اب اگر نیند سے بے ہوش ہو یا مرض سے کہ اپنے منہ کا لفظ نہ سمجھے تو اس حالت کی نماز ہی درست نہیں، قضا کرے۔ پھر فرمایا کہ جنابت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ غسل نہ کر لو۔ مگر راہ چلتے، یعنی سفر میں کہ اس کا حکم آگے ہے۔

پھر فرمایا کہ اگر پانی کا عذر ہو اور طہارت ضروری ہو تو زمین سے تیمّم کر لو۔ پانی کا عذر تین صورت سے بتایا اور طہارت کا ہونا دو صورت سے: پانی کے عذر کی ایک صورت یہ کہ مریض ہو یا پانی نقصان کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ سفر درپیش ہے، پانی پینے کے لیے رکھا ہے، آگے دور تک نہیں ملے گا۔ تیسرا یہ کہ پانی موجود نہیں۔ اس تیسرے کے ساتھ طہارت کی دو صورتیں فرمائیں: ایک یہ کہ شخص قضائے حاجت کر کے آیا، وضو کی حاجت ہے۔ دوسرے یہ کہ عورت سے لگا، غسل کی حاجت ہے۔ اب تیمّم کا طریقہ یہ ہے کہ پاک زمین پر دونوں ہاتھ مارے، پھر تمام منہ کو مل لے، پھر دونوں ہاتھ مارے، پھر ہاتھوں کو مل لے، کہنی تک۔ اسی طرح موضح قرآن میں ہے۔ تیمّم کی یہ صورت مذہبِ حنفیہ کے مطابق ہے۔ صحیح میں منہ اور دونوں ہاتھوں کے لیے زمین پر ایک ہی دفعہ ہاتھوں کو مارنا آیا ہے۔ راجح یہی ہے۔

نشے اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب جانے کی ممانعت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اس سے منع کیا کہ وہ نشے کی حالت میں نماز پڑھیں۔ اس حالت میں نمازی نہ جانے کیا کہتا ہے اور جُنبی کو نماز کی جگہوں کے قریب جانے سے، جو مساجد ہیں، منع کیا۔ ہاں اگر ایک دروازے سے گزر کر بغیر ٹھہرے ہوئے دوسرے دروازے سے نکل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ حکم شراب کی حرمت سے پہلے کا ہے، جس طرح حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے اس آیت کو پڑھا: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ [البقرة: ٢١٩] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ کہہ دیجیے: دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے (کچھ) فائدہ بھی ہے اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے۔'' اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: «اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا بَيَانًا شَافِيًا» ''اے اللہ! بیان کر ہمارے لیے شافی بیان۔''

پھر جب آیتِ باب اُتری اور نبی اکرم ﷺ نے پڑھ کر سنائی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پھر وہی کہا کہ اے اللہ! بیان کر ہمارے لیے شافی بیان۔ لوگ اوقاتِ نماز میں شراب نہ پیتے، یہاں تک کہ یہ آیت اُتری: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ [المائدة: ٩٠۔ ٩١] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک شراب اور جوا، آستانے اور فال نکالنے کے تیر، سب گندے کام ہیں اور شیطان کے عمل سے ہیں، پس تم ان سے بچو، تا کہ تم فلاح پاؤ۔ بے شک شیطان چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے سے دشمنی اور بغض ڈال دے، اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟'' اس وقت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا''[1] (ہم باز آگئے)۔

آیت کے نزول کا پہلا سبب:

دوسری روایت میں ہے کہ آیتِ باب اتری، نبی اکرم ﷺ کا منادی اقامتِ صلاۃ کے وقت اس طرح پکارتا: ''لَا يَقْرَبَنَّ الصَّلَاةَ سَكْرَانُ'' ''نشے کی حالت میں کوئی نماز کے قریب نہ آئے۔'' یہ الفاظ ابو داود کی روایت کے ہیں۔[2] سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک انصاری نے کھانا تیار کر کے کچھ مہاجرین اور انصار کو بلایا، ہم نے کھایا اور شراب

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٥٤٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٥) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٠)

پی، پھر افتخار کیا، ایک آدمی نے اونٹ کا جبڑا لے کر سعد کی ناک پر مارا، ان کی ناک زخمی ہوگئی۔ یہ واقعہ شراب کی حرمت سے پہلے ہوا، اس پر آیت زیرِ تفسیر اُتری۔ اس کو مسلم و اہلِ سنن نے روایت کیا ہے۔[1]

دوسرا سبب:

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کھانا پکایا، ہم کو بلایا، شراب پلائی، نماز کا وقت آیا، فلاں شخص کو امام بنایا، اس نے یوں پڑھا: "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ" "کہہ دے اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا، جس کی تم کرتے ہو اور جس کی تم عبادت کرتے ہو ہم بھی اسی کی عبادت کرتے ہیں۔" اس پر یہ آیتِ باب اُتری۔[2] (رواه ابن أبي حاتم والترمذي وقال حسن صحيح)

امام ابن جریر کی روایت میں قاری کا نام عبدالرحمٰن آیا ہے۔[3] (رواه أبو داود و النسائي) نیز امام ابن جریر رحمہ اللہ کے دوسرے طریق میں آیا ہے کہ وہ نماز مغرب کی تھی۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کچھ لوگ شراب پی کر نماز کو آتے، شراب کی حرمت سے پہلے۔ اس پر آیت زیرِ تفسیر اُتری۔[5] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سکر سے مراد شراب نہیں ہے، سکر نیند ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سکر سے صرف نماز کے لیے حاضر ہونے کے وقت بچتے تھے، جب شراب کی حرمت آئی تو حکم مذکور منسوخ ہوگیا۔

نہی کے حکم کا مخاطب:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ سکر سے مراد شراب ہے۔ پھر کہا ہے کہ سکران کی نہی کی طرف صرف وہ لوگ متوجہ ہوئے جو خطاب کا مفہوم نہ سمجھے۔ کیوں کہ وہ حکم مجنون میں ہے۔ اس نہی کا مخاطب وہ مست ہے، جو تکلیف کو سمجھتا ہے۔[6] بہت سے اہلِ اصول نے کہا ہے کہ یہ خطاب اس کی طرف متوجہ ہے، جو کلام سمجھتا ہے نہ وہ مست کہ جو بات نہیں سمجھتا کہ اس سے کیا کہا گیا، کیوں کہ فہم شرطِ تکلیف ہے۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد سکر سے مکمل طور پر ممانعت ہو، اس لیے انھیں رات دن میں پانچ نمازوں کا حکم ہے اور شراب پینے والے سے یہ ممکن

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٨٩) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٨) صحیح مسلم کی روایت میں شانِ نزول میں زیرِ تفسیر آیت کے بجائے سورۃ المائدۃ آیت نمبر (۹۰) کے نزول کا ذکر ہے۔ البتہ تفسیر ابن ابی حاتم میں زیرِ تفسیر آیت کے نزول کا ذکر ہے۔ نیز سنن ترمذی میں روایت مختصر مروی ہے اور اس میں مذکور شاہد کا ذکر نہیں ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٢٦) یہ روایت صحیح ہے۔

[3] تفسير الطبري (٨/ ٣٧٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧١) یہ روایت صحیح ہے۔

[4] تفسير الطبري (٨/ ٣٧٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧١) اس روایت میں، سنن ابی داود اور سنن ترمذی میں مروی ہے کہ امامت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کروائی۔

[5] تفسير الطبري (٨/ ٣٧٦) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[6] تفسير الطبري (٨/ ٣٧٧۔ ٣٧٩)

نہیں کہ وہ ہمیشہ پانچ وقت کی نمازیں ان کے اوقات میں ادا کر سکے گا۔ واللہ أعلم. اس بنیاد پر یہ آیت اللہ کے اس فرمان کے مثل ہے: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمھیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔'' کیوں کہ اس میں ان کو حکم ہے کہ اسلام پر موت کے لیے تیار رہیں اور ہمیشہ اطاعت گزار رہیں۔[1]

نماز کے لیے مکمل بیداری کی شرط:

یہ ارشاد کہ ﴿ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ ﴾ نشے کی حد کے بارے میں بہترین قول ہے۔ یعنی مست وہ ہے، جو نہ جانے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ نشے والے آدمی کو قراءت میں تخلیط (خلط ملط کرنا) ہوتی ہے۔ تدبر اور خشوع نہیں ہوتا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ تم میں سے اگر کسی کو نماز پڑھتے ہوئے اونگھ آ جائے تو وہ جا کر سو جائے، یہاں تک کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ (رواه أحمد وانفرد بإخراجه البخاري دون مسلم) امام نسائی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔[2] حدیث کے بعض الفاظ میں یوں آیا ہے۔ شاید وہ استغفار کرنے کے لیے جاتا اور اپنی جان کو گالی دینے لگے۔[3]

حائضہ اور جنبی کا مسجد سے گزرنا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''جُنُب'' مسجد سے گزر جائے، بیٹھے نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، انس رضی اللہ عنہما، ابو عبیدہ، سعید بن المسیب، ابو الضحیٰ، عطا، مجاہد، مسروق، ابراہیم نخعی، زید بن اسلم، ابو مالک، عمرو بن دینار، حکم بن عتیبہ، عکرمہ، حسن بصری، یحییٰ بن سعید، ابن شہاب اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی یوں ہی مروی ہے۔[4] یزید بن ابی حبیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ انصاری لوگ تھے، جن کے دروازے مسجد میں تھے، وہ جنب ہوتے اور پانی نہ ہوتا تو مسجد میں سے نکلتے۔[5] اس قول کی حجت بخاری میں مروی حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: « سُدُّوا كُلَّ خَوْخَةٍ فِي الْمَسْجِدِ إِلَّا خَوْخَةَ أَبِي بَكْرٍ »[6] ''ابوبکر کے دروازے کے سوا مسجد کے تمام دروازے بند کر دو۔'' یہ ارشاد آخر عمر میں تھا۔

نبی اکرم ﷺ جانتے تھے کہ ابوبکر آپ کے بعد والیِ امر ہوں گے۔ اُن کا مسلمین کے مصالح اور اہم امور کی

---

① تفسير ابن كثير (١/ ٦٥٣_ ٦٥٤)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٠) مسند أحمد (٣/ ١٤٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٣)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨٦)

④ تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٦٠) ⑤ تفسير الطبري (٨/ ٣٨٤) ⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٥)

خاطر مسجد میں آنا جانا زیادہ رہے گا۔ اس لیے فرمایا کہ مسجد میں جتنے دروازے ہیں اور لوگ اس راستے سے نکل کر آتے جاتے ہیں، وہ سب بند کر دیے جائیں، سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کے کہ وہ کھلا رہے۔ یہ لفظ بھی روایت کیا گیا ہے۔ "إِلَّا بَابَ عَلِيٍّ" جس طرح بعض سنن میں آیا ہے، لیکن وہ خطا ہے۔[1] صحیح وہی ہے، جو صحیح میں ثابت ہوا ہے۔[2] (قاله ابنُ کثیرٍ)

اکثر ائمہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ جنبی کا مسجد میں ٹھہرنا حرام ہے، تاہم گزر جانا جائز ہے۔ اسی حکم میں حائضہ اور نفاس والی عورتیں بھی ہیں، مگر بعض نے ان کے مسجد میں سے گزرنے کو بھی منع کیا ہے، کیوں کہ اس سے مسجد کے آلودہ ہونے کا احتمال ہے۔ بعض نے کہا کہ مسجد کے کسی آلودگی میں ملوث ہونے کا خوف نہ ہو تو ان کے گزرنے میں کچھ حرج نہیں اور اگر خوف ہو تو نہیں گزرنا چاہیے۔

صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: مجھے مسجد سے چادر پکڑا دے، میں نے کہا: میں حائض ہوں، فرمایا: تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔[3] (وله عن أبي هريرة مثله) اس میں حائضہ کے مسجد میں سے گزرنے کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔ نفاس والی عورتوں کے بارے میں بھی وہی حکم ہے، جو حائضہ کے لیے ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں مسجد کو کسی حائض اور جنبی کے لیے حلال نہیں کرتا۔ (رواه أبو داود) امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی سند میں افلت بن خلیفہ مجہول ہے۔ لیکن ابن ماجہ نے اس کو ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے،[4] مگر ابو زرعہ کہتے ہیں کہ صحیح سیدہ عائشہ ہے۔ رہی حدیث جو ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: «يَا عَلِيُّ، لَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ يَّجْنُبُ فِيْ هٰذَا الْمَسْجِدِ غَيْرِيْ وَغَيْرُكَ»[5] (رواه الترمذي) "اے علی! میرے اور تیرے علاوہ کسی جنبی کا اس مسجد میں ٹھہرنا حلال نہیں۔" یہ حدیث ضعیف غیر ثابت ہے، اس لیے کہ سالم بن ابی حفصہ متروک اور عطیہ شیخ سالم ضعیف ہے۔[6] واللہ أعلم.

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٣٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ١١٩) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس باب کی روایات کو صحیح کہا ہے اور دونوں احادیث میں جمع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ دو دفعہ پیش آیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري (٧/ ١٤۔ ١٥)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٦٥٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨۔ ٢٩٩)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٤٥) اس کی سند میں "جسرہ بنت دجاجہ" ضعیف ہے۔ مزید دیکھیں: ضعيف أبي داود (١/ ٨٦)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٢٧) اس کی سند میں "عطیہ عوفی اور سالم بن ابی حفصہ" ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٤٠٢)

[6] تفسير ابن كثير (١/ ٦٥٥)

عبداللہ بن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ہم سنتے تھے کہ یہ آیت سفر کے حق میں ہے۔[1] احمد و اہلِ سنن میں جو حدیث سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ اس کی شاہد ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین مسلمان کے لیے پاک اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اگرچہ دس برس تک پانی نہ پائے۔ پھر جب تو پانی پائے تو اپنے بشرہ (جسم) سے مل، یہ تیرے لیے بہتر ہے۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح اس شخص کا قول ہے جس نے کہا کہ "عَابِرِيْ سَبِيْلٍ" سے راستے سے گزرنے والا مراد ہے۔ کیوں کہ اس مسافر کا حکم جو جنبی ہو اور پانی نہ پائے۔ آیت: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ ... الی آخرہ﴾ میں گزر چکا ہے۔ وہ پہلے سے معلوم ہے، اگر آیت زیرِ تفسیر میں بھی مسافر مراد ہو تو پھر آیت مذکور میں اس کا دوبارہ ذکر کرنے کا کچھ مطلب نہیں ہوگا۔[3] پس آیتِ باب کی تاویل یہ ہوئی کہ تم مسجد میں بحالتِ جنابت نہ آؤ، ہاں اس طرف سے گزر جاؤ، راہ میں نہ ٹھہرو۔ جمہور کا قول بھی یہی ہے۔

ناقص حالت میں مسجد میں داخل ہونے سے ممانعت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ آیت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ہیئتِ ناقصہ سے مسجد میں آنے سے منع کیا ہے، کیوں کہ وہ نماز کے اصل مقصد کو توڑنے والی ہے اور ہیئتِ ناقصہ، یعنی جنابت کی حالت میں نماز کی جگہ پر داخل ہونے سے ممانعت کی ہے۔ جنابت، نماز اور نماز کی جگہ سے ایک طرح سے دوری کا سبب ہے۔ غسل کی شرط ائمہ ثلاثہ کے اس مذہب کی دلیل ہے کہ جنبی کے لیے مسجد میں ٹھہرنا حرام ہے، یہاں تک کہ غسل کر لے یا اگر پانی نہ ملے یا پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو تو تیمّم کر لے۔

امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جنبی کو وضو کر کے مسجد میں ٹھہرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خود احمد اور سعید بن منصور رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ایسا کیا کرتے تھے۔ عطا بن یسار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ مسجد میں بیٹھے تھے اور وہ جنبی ہوتے، جب کہ نماز جیسا وضو کر لیتے، یہ اسناد شرطِ مسلم پر صحیح ہے۔[4]

تیمّم کو جائز کرنے والا مرض:

وہ مرض جس سے تیمّم جائز ہو جاتا ہے، وہی ہے کہ اس میں پانی کے استعمال سے کوئی عضو فوت ہو یا عیب دار ہو جائے یا صحت ہونے میں دیر ہونے کا ڈر ہو۔ بعض علما نے صرف مرض پر تیمّم کو جائز رکھا ہے۔ آیت کی عمومیت ان

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٣٨١)

[2] مسند أحمد (٥/ ١٨٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٦٦)

[3] تفسير الطبري (٨/ ٣٨٤۔ ٣٨٥)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٦٥٦)

کی دلیل ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک انصاری کے حق میں اُتری ہے، وہ بیمار تھا، اُٹھ کر وضو نہ کر سکتا تھا، نہ کوئی خادم تھا جو اس کو پانی لا دیتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آئے، اس نے ذکر کیا، اس پر یہ آیت اُتری۔[1] یہ حدیث مرسل ہے۔ سفر عام ہے، لمبا ہو یا تھوڑا کچھ فرق نہیں ہے۔ غائط کے اصل معنی یہ ہیں کہ زمین کے برابر ہو، اس جگہ غائط پیشاب پاخانہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ ''لَمَسْتُمْ'' اور ''وَلَا مَسْتُمْ'' دونوں طرح قراءت ہے۔

اس جگہ ائمہ و مفسرین کے دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد جماع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق: ﴿ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ [البقرة: ٢٣٧] ''اور اگر تم انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو جب کہ تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس (مہر) کا نصف ادا کرنا ہوگا جو تم نے مقرر کیا ہو۔ ہاں! وہ عورتیں چاہیں تو (مہر) معاف کر سکتی ہیں یا وہ شخص معاف کر سکتا ہے جس کے ہاتھ میں عقدِ نکاح ہے اور تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور تم آپس میں بھلائی اور احسان کا برتاؤ کرنا مت بھولو، بے شک اللہ تمھارے ہر عمل پر نگاہ رکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔''

لمس کی تفسیر اور اس کے ساتھ وضو کرنے یا نہ کرنے کا بیان:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد جماع ہے۔ یہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، طاؤس، حسن، عبید بن عمیر، سعید بن جبیر، شعبی و قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ کا قول ہے۔[2] امام ابن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لمس کا ذکر ہوا، پس موالی میں سے کچھ لوگوں نے کہا: جماع نہیں ہے۔ عرب میں سے کچھ لوگوں نے کہا: جماع ہے۔ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مل کر یہ بات کہی۔ کہا: تُو کس گروہ سے ہے؟ میں نے کہا: موالی سے۔ کہا: فریقِ موالی غالب ہے، لمس و مس و مباشرت جماع کے معنی میں ہے، لیکن اللہ جس چیز کے ساتھ چاہے کسی چیز کا کنایہ کرتا ہے۔[3] یہ اثر کئی طریق سے مروی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت ہوا ہے کہ انھوں ملامست کی تفسیر جماع کی ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ یہ مساس سے کنایہ ہے۔ خواہ ہاتھ سے چھوا یا کسی اور شے سے، جس نے اپنے بدن سے عورت کا بدن چھوا، اس پر وضو واجب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: لمس جماع سے کمتر ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ بوسہ مَس ہے، اس سے وضو لازم آتا ہے۔ تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ وضو کرے،[4] یعنی مباشرت و لمسِ دست بوسہ سے اور آیت کے لفظ لمس کی تفسیر آنکھ کے اشارے سے کرتے تھے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٦١) یہ روایت مرسل ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٦١)
[3] تفسیر الطبري (٨/ ٣٨٩) اس کی سند حسن ہے۔
[4] تفسیر الطبري (٨/ ٣٩٣)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بوسہ لینے سے وضو کرتے اور کہتے کہ یہ لمس ہے۔[1] عبیدہ، ابو عثمان نہدی، ابی عبیدہ، شعبی، ثابت بن حجاج، نخعی اور زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: "اَللَّمْسُ مَا دُوْنَ الْجِمَاعِ"[2] "لمس وہ ہے جو جماع کے علاوہ (بوس و کنار وغیرہ) ہے۔" سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جس نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا یا اس کو اپنے ہاتھ سے چھوا، اس پر وضو ہے، کیوں کہ یہ کام ملامست ہے، لیکن یہ بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ اپنی بیوی کا بوسہ لے کر نماز پڑھ لیتے، وضو نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان سے مختلف روایت آئی ہے، پس اگر وضو کی روایت صحت کو پہنچے تو اس کو مستحب سمجھا جائے گا۔[3]

باقی رہا مَس سے وضو کا واجب ہونا، سو یہ شافعی و شافعیہ و مالک کا قول ہے اور ایک روایت احمد رحمہ اللہ سے ہے۔ شافعی رحمہ اللہ کے حامی کہتے ہیں کہ اس آیت میں لَامَسْتُمْ وَ لَمَسْتُمْ" دونوں طرح پر پڑھا گیا ہے۔ اس کا اطلاق شرع میں مس بالید (ہاتھ سے چھونا) پر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ ﴾ [الأنعام: ٧] "پھر اس کو یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے۔"

مراد ہاتھ سے کاغذ کو ٹٹولنا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ماعز رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: «لَعَلَّكَ قَبَّلْتَ أَوْ لَمَسْتَ»[4] اور صحیح حدیث میں مروی ہے: «اَلْيَدُ زِنَاهَا اللَّمْسُ»[5] اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ کم ہی کوئی دن ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم (ازواجِ مطہرات) پر طواف نہ کرتے (چکر نہ لگاتے)، بوسہ نہ لیتے، لمس نہ فرماتے۔[6] صحیحین میں مروی ہے کہ بیع ملامست سے منع کیا۔[7] اس بیع کا مرجع بھی وہی ہاتھ سے ٹٹولنا ہوتا ہے۔ دونوں تفسیروں پر، جس طرح اس لفظ کا اطلاق ہاتھ کے ساتھ ٹٹولنے پر آتا ہے، اسی طرح جماع پر بھی آتا ہے۔ قال الشاعر ع

وَلَمَسْتُ كَفِّيْ كَفَّهٗ أَطْلُبُ الْغِنٰى

"میں نے تونگری کی طلب میں اپنے ہاتھ کے ساتھ اس کے ہاتھ کو چھوا۔"

اس جگہ اس حدیث سے بھی یہ معنی محسوس کیا جا سکتا ہے، جس کو احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، کہا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جو ایک ایسی عورت سے ملا، جس کو وہ پہچانتا نہیں تھا، اس نے اس عورت کے ساتھ ہر وہ کام کیا، جو اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے، صرف مجامعت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ﴾ [هود: ١١٤]

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٣٩٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٦١) [3] تفسير ابن كثير (٦٥٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٣٨) مسند أحمد (١/ ٢٣٨)

[5] مسند أحمد (٢/ ٣٤٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٠٤)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣٥) مستدرك الحاكم (١/ ٢٢٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٧/ ٨٥)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥١١)

''اور آپ نماز قائم کریں دن کی دونوں طرفوں (صبح وشام) اور رات کی کچھ گھڑیوں میں۔'' نبی اکرم ﷺ نے اس مرد سے کہا: وضو کر، پھر نماز پڑھ۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! کیا یہ حکم خاص اس شخص کے لیے ہے یا سب مومنین کے لیے عام ہے؟ فرمایا: «بَلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ عَامَّةً»[1] (رواه الترمذي من حديث زائدة، وقال: ليس بمتصل، و رواه النسائي عن ابن أبي ليلىٰ مرسلًا) (تمام مومنوں کے لیے عام ہے۔)

اس کو وضو کا حکم دیا، کیوں کہ اس نے عورت کو چھوا تھا، مجامعت نہیں کی تھی۔ اس کا جواب یہ دیا کہ اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا۔ پھر یہ بھی احتمال ہے کہ فرض نماز کے وضو کا حکم دیا ہو، جس طرح صدیق رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: «مَا مِنْ عَبْدٍ يُذْنِبُ ذَنْبًا وَّيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ إِلَّا غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ»[2] (الحديث) ''جو بندہ بھی کوئی گناہ کرے، پھر دو رکعتیں پڑھے تو اللہ اس کو بخش دیتا ہے۔''

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں زیادہ صحیح اس شخص کا قول ہے، جس نے ﴿لٰمَسْتُمُ﴾ کو جماع کہا ہے نہ کہ لمس کے باقی معانی مراد لیے ہیں، کیوں کہ نبی مکرم ﷺ سے صحت کے ساتھ روایت ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی بعض ازواج کا بوسہ لیا، پھر نماز پڑھی، وضو نہ کیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت یہ ہے: «كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يُقَبِّلُ ثُمَّ يُصَلِّي وَلَا يَتَوَضَّأُ»[3] (رواه ابن جرير) ''آنحضرت ﷺ وضو کرتے، پھر بوسہ لیتے، پھر نماز پڑھتے، وضو نہیں کرتے تھے۔'' دوسری روایت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیا، پھر نماز کے لیے نکلے اور وضو نہ کیا۔ عروہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: وہ آپ کے سوا اور کون ہوسکتی ہے؟ اس پر وہ ہنس پڑیں۔ (وهٰكذا رواه أبو داود والترمذي وابن ماجه)

پھر ابو داود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ثوری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمیں حبیب نے اس حدیث کی روایت عروہ مزنی سے کی ہے۔ یحییٰ قطان نے ایک آدمی سے کہا: ''إِحْكِ عَنِّي أَنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ شِبْهُ لَا شَيْئٍ'' ''مجھ سے بیان کر کہ یہ حدیث شبہ لاشی ہے۔'' ترمذی نے کہا ہے کہ میں نے بخاری کو سنا، وہ اس حدیث کی تضعیف کرتے تھے۔ حبیب بن ابی ثابت نے عروہ سے نہیں سنا۔ ابن ماجہ میں یوں ہے: ''عَنْ حَبِيْبٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا'' احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا'' یہ اس بات

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٣١٨) مسند أحمد (٥/ ٢٤٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کا سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٠٠٠) البتہ اس کی اصل صحیحین میں ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٠٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٠٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٩٥) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٦٥)

[3] تفسير الطبري (٨/ ٣٩٦)

پر نص ہے کہ مراد عروہ بن زبیر ہیں۔ یہ قول بھی اسی کا شاہد ہے: ”مَنْ هِيَ إِلَّا أَنْتِ فَضَحِكَتْ“ لیکن ابو داود کی روایت کے الفاظ ”عَنْ عُرْوَةَ الْمُزَنِيِّ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا“ ہیں۔[1] واللّٰه أعلم.

ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: «كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يَنَالُ مِنِّي الْقُبْلَةَ بَعْدَ الْوُضُوْءِ ثُمَّ لَا يُعِيْدُ الْوُضُوْءَ»[2] احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَبَّلَ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ» (رواه أبو داود والنسائي، ثم قالا لم يسمع إبراهيم التيمي من عائشة رضی اللہ عنہا)[3] ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بوسہ لیتے اور روزہ دار ہوتے نہ افطار کرتے نہ وضو۔[4] (رواه ابن جرير) زینب سہمیہ رحمہا اللہ نے کہا: «إِنَّهُ كَانَ يُقَبِّلُ ثُمَّ يُصَلِّيْ وَلَا يَتَوَضَّأُ»[5] (رواه ابن جرير) احمد نے زینب کے بعد عائشہ رضی اللہ عنہا کے نام کا اضافہ کیا۔[6]

تیمّم کا بیان:

پاک مٹی کی شرط سے اکثر فقہا نے استنباط کیا ہے کہ تیمّم صرف اس صورت میں جائز ہے کہ پانی تلاش کیا، لیکن نہ ملا تو اب تیمّم کرنا جائز ہے۔ طلب کی کیفیت کا ذکر کتبِ فروع میں آیا ہے۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ الگ بیٹھا ہے اور قوم کے ساتھ اس نے نماز نہیں پڑھی۔ پوچھا: اے فلاں! تجھ کو کس نے منع کیا کہ تو لوگوں کے ساتھ نماز پڑھتا؟ کیا تو مسلمان نہیں ہے؟ اس نے کہا: ہاں، مسلمان ہوں، لیکن میں جنابت کی حالت میں ہوں اور پانی موجود نہیں ہے۔ فرمایا: تجھ پر لازم تھا کہ پاک زمین سے تیمّم کرتا،[7] یہ کافی تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اگر تم پانی نہ پاؤ تو زمین کا قصد کرو۔ تیمّم کے معنی ہیں قصد کرنا۔ صعید وہ چیز ہے، جو روئے زمین پر ہو، اس میں مٹی، ریت، شجر، حجر، نبات سب داخل ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جنسِ تراب ہے، جیسے: رمل (ریت)، زرنیخ (سنکھیا)، چونا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فقط خاک مراد ہے۔ یہ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کا قول ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا﴾ [الكهف: ٤٠] ”وہ (باغ) چٹیل پھسلنا میدان ہو جائے۔“ یعنی چکنی پاک مٹی۔

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٩۔ ١٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٦) سنن ابن ماجه (٥٠٢) مسند أحمد (٦/ ٢١٠)
2. تفسير الطبري (٨/ ٣٩٧) اس کی سند میں ”مندل اور لیث بن ابی سلیم“ ضعیف راوی ہیں۔
3. مسند أحمد (٦/ ٢١٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨) سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابراہیم تیمی رحمہ اللہ کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔
4. تفسير الطبري (٨/ ٣٩٨۔ ٣٩٩)
5. تفسير الطبري (٨/ ٣٩٧) یہ روایت مرسل ہے۔
6. مسند أحمد (٦/ ٦٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٩٠٦)
7. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٢)

صحیح مسلم میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «جُعِلَتْ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِداً وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوراً إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَآءَ» ”ہمارے لیے ساری زمین سجدہ گاہ بنائی گئی ہے، جب ہم پانی نہ پائیں اس وقت اس کی مٹی ہمارے لیے پاک کرنے والی ہے۔“ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «وَجُعِلَ تُرَابُهَا لَنَا طَهُوراً إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَآءَ»[1] یہ اس پر دلیل ہے کہ طہوریت مقامِ احسان میں تراب کے ساتھ خاص ہے۔ اگر کوئی اور چیز پاک مٹی کے قائم مقام ہوسکتی تو اس کا ذکر آتا۔

اس جگہ طیب سے مراد حلال ہے یا وہ نجس نہ ہو، جس طرح سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: «اَلصَّعِيدُ الطَّيِّبُ طَهُورُ الْمُسْلِمِ إِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَآءَ عَشْرَ حِجَجٍ، فَإِذَا وَجَدَهُ فَلْيَمَسَّهُ بَشْرَتَهُ فَإِنَّ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّهُ» (رواه أحمد وأهل السنن إلا ابن ماجة) ”پاک مٹی (خاک) مسلمان کے لیے طہور ہے، چاہے وہ دس سال تک پانی نہ پائے، جب اس کو پالے تو اس کو اپنے جسم کے ساتھ مس کرے، یہ اس کے لیے بہتر ہے۔“ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ”وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ أَيْضاً وَ رَوَاهُ أَبُو بَكْرِ الْبَزَّارُ فِي مُسْنَدِهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ وَصَحَّحَهُ الْحَافِظُ أَبُو الْحَسَنِ الْقَطَّانُ“[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بہت پاک مٹی کھیت کی مٹی ہے،[3] اس کو ابن مردویہ نے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے۔[4]

تیمّم کی کیفیت:

پھر فرمایا کہ منہ اور ہاتھوں کو ملو، یہ اس لیے کہ تیمّم طہارت میں وضو کا بدل ہے سارے اعضا کے پاک کرنے کے قائم مقام نہیں ہے، بلکہ فقط چہرے اور دونوں ہاتھوں کا مسح ہی بالاجماع کافی ہے۔ ہاں تیمّم کی کیفیت میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب جدید میں دو ضرب سے چہرے اور دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کرنا واجب ہے، کیوں کہ ہاتھوں کا اطلاق کہنیوں، بلکہ کندھوں تک صادق آتا ہے، جس طرح وضو کی آیت میں ہے اور کبھی دونوں ہاتھوں کا اطلاق دونوں ہتھیلیوں پر ہوتا ہے، جس طرح آیتِ سرقہ (چوری) میں ہے: ﴿فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ [المائدۃ: ۳۸] پس تیمّم کا اطلاق طہوریت کے اشتراک کے سبب آیتِ وضو کے ساتھ مشروط ہوگا۔

دارقطنی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے: «اَلتَّيَمُّمُ ضَرْبَتَانِ: ضَرْبَةٌ لِّلْوَجْهِ وَضَرْبَةٌ لِّلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ»[5] ”تیمّم دو ضربیں ہیں، ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری ضرب ہاتھ کے لیے۔“ لیکن یہ حدیث

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۲۲) صحیح ابن خزیمة (۱/ ۱۳۳) صحیح ابن حبان (۴/ ۳۱۰)

[2] مسند أحمد (۵/ ۱۸۰) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۳۲) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۲۴) سنن النسائي، رقم الحدیث (۳۲۲) صحیح ابن حبان (۴/ ۱۳۵) مسند البزار (۱۷/ ۳۰۹) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۱۶۶۶، ۳۸۶۱)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۶۲) [4] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۶۶۰) الدر المنثور (۲/ ۵۵۱) اس کی کوئی سند نہیں ملی ہے۔

[5] سنن الدارقطني (۱/ ۱۸۰) اس کی سند میں ”علی بن ظبیان“ ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ۳۴۲۷)

ثابت نہیں ہے، اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں: «إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ضَرَبَ بِيَدِهٖ عَلَى الْحَائِطِ وَمَسَحَ بِهَا وَجْهَهٗ ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَةً أُخْرٰى فَمَسَحَ بِهَا ذِرَاعَيْهِ» [1] مگر اس کی اسناد میں محمد بن ثابت عبدی، بعض حفاظ کے نزدیک ضعیف ہے اور ثقات نے اس کو موقوف کہا ہے۔ امام بخاری، ابو زرعہ اور ابن عدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ موقوف صحیح ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مرفوع ہونا منکر ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی حجت یہ ہے کہ ابن الصّمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم ﷺ نے تیمّم کیا، منہ پر اور دونوں ہاتھوں پر مسح فرمایا۔[2]

ابو جہیم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی مکرم ﷺ کو دیکھا پیشاب کر رہے تھے، میں نے سلام کیا۔ آپ ﷺ نے جواب نہ دیا، جب فارغ ہوئے، کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کو دیوار پر مارا، پھر منہ کا مسح کیا، پھر دونوں ہاتھوں کو دیوار پر مار کر مرفقین (کہنیوں) تک مسح کیا۔[3] (رواہ ابن جریر) دوسرا قول یہ ہے کہ واجب مسح چہرے اور دو ہاتھوں کا کہنیوں تک دو ضربوں سے ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم قول یہی تھا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ چہرے اور دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک ایک ہی ضرب سے مسح کافی ہے۔ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے کہا: تجھ کو اتنا ہی کافی تھا، پھر ہاتھ زمین پر مارا اور پھونک کر منہ اور ہر دو ہتھیلیوں پر پھیرا۔[4] (رواہ أحمد) سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تیمّم کے بارے میں فرمایا: چہرے اور دونوں ہاتھوں کے لیے ایک ہی ضرب ہے۔[5] (رواہ أحمد)

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدیثِ بول کی رو سے پاک مٹی میں کچھ غبار ہی ہو کہ منہ اور ہاتھوں سے لگے، کیوں کہ اس میں ہے کہ دیوار کو لاٹھی سے کریدا، نیز اس آیت کی دلیل سے: ﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ ﴾ [المائدة: ٦] ''اللہ نہیں چاہتا کہ تمھیں تنگی میں ڈالے۔'' تیمّم ایک نعمت ہے، اسی لیے اس کی مشروعیت اس امت کے ساتھ خاص ہے، دوسری امتوں میں تیمّم نہیں تھا۔ صحیحین میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھ کو

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٠) اس کی سند میں ''محمد بن ثابت عبدی'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: ضعيف أبي داود (١/ ١٣٥)

[2] الأم (١/ ١١٣) سنن البيهقي (١/ ٢٠٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالرحمن بن ہرمز رحمہ اللہ کا سماع ابن الصمہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسير الطبري (٨/ ٤١٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالرحمن بن ہرمز رحمہ اللہ کا سیدنا ابو جہیم رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیحین میں ہے کہ جس میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک ہی بار ہاتھ دیوار پر مارا اور چہرے اور ہاتھوں کا مسح کیا۔ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٧) سنن النسائي الكبرىٰ (١/ ١٣٥) مسند أحمد (٤/ ٢٦٥)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٤) مسند أحمد (٤/ ٢٦٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ١/ ١٨٥)

پانچ چیزیں دی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں، ان میں ایک یہ ہے کہ زمین میرے لیے مسجد اور طہور (پاک کرنے والی) کر دی گئی ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے تیمّم کو نرمی، وسعت اور رحمت کے طور پر مشروع کیا ہے۔[2] وللّٰہ الحمد.

تیمّم کی مشروعیت کا سببِ نزول:

اس جگہ تیمّم کی مشروعیت کا سببِ نزول ہم اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ آیت زیرِ تفسیر آیتِ مائدہ سے پہلے آتی ہے، کیوں کہ اس سورت کا نزول شراب کے حتمی حرام ہونے سے پہلے ہوا ہے۔ شراب اُحد کے کچھ ہی دن بعد حرام ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بنونضیر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ مائدہ سب سے آخری سورت ہے، جو نازل ہوئی، خصوصاً اس کی ابتدائی آیات، اس لیے سببِ نزول کا ذکر اس جگہ مناسب ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہار کے گم ہوجانے کا قصہ بیان کیا، وہ ہار مستعار لیا ہوا تھا۔ اُس کی تلاش میں نماز کا وقت آ گیا، پانی نہیں تھا، لوگوں نے بے وضو نماز پڑھی، نبی اکرم ﷺ سے شکایت کی۔ اُس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ تیمّم اتار دی۔

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا ہے کہ اللہ تجھ کو جزائے خیر دے۔ واللہ! کوئی امر مکروہ (ناپسندیدہ معاملہ) تجھ پر نازل نہیں ہوتا، لیکن اللہ اس میں تیرے لیے اور مسلمانوں کے لیے خیر اور بہتری کر دیتا ہے۔[3] (رواه أحمد) اس قصے کو تفصیل کے ساتھ بخاری نے بھی روایت کیا ہے، اس میں اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «مَا هِيَ بِأَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَآ آلَ أَبِي بَكْرٍ»[4] ''اے آلِ ابوبکر! یہ تمھاری پہلی برکت نہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) میں خطاب مومنین کو ہے کفار کو نہیں۔ مراد نشے کی حالت میں نماز ادا کرنے کی ممانعت ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ مراد نماز کی جگہیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نفسِ نماز و موضعِ نماز دونوں مراد ہیں۔ نشے سے مراد نشۂ شراب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اونگھ ہے۔[5] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نیند ہے۔[6] اول صحیح ہے۔

منع کرنے سے مراد یہ ہے کہ نشے سے افاقہ ہو، کیوں کہ جب تک نشہ ہے، وہ نہیں جانتا کہ کیا کہتا ہے۔ اسی جگہ سے بعض نے کہا ہے کہ نشے کی حالت میں دی گئی طلاق غیر واقع ہے۔ یہی سیدنا عثمان اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام طاؤس، عطا، قاسم، ربیعہ، لیث، اسحاق اور ابوثور رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اسی کو طحاوی نے اختیار کیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٦٦٠۔ ٦٦١)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٧) مسند أحمد (٦/ ٥٧)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧) [5] الدر المنثور (٢/ ٥٤٦) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٥٩)

علما کا اس پر اجماع ہے کہ طلاقِ معتوہ (بے عقل شخص کی دی ہوئی طلاق) جائز نہیں۔ سکران (مدہوش) معتوہ ہوتا ہے، مُوسوس (وسوسوں کا شکار) کی طرح۔ دوسرے گروہ نے نشے والے شخص کی طلاق کو جائز رکھا ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب، معاویہ رضی اللہ عنہما اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت اور امام ابو حنیفہ، ثوری اور اوزاعی رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول مختلف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سکران کو طلاق اور قَوَدِ جراح (زخم کا بدلہ) وقتل لازم ہے۔ نکاح اور بیع لازم نہیں ہے۔

عبورِ سبیل سے اس جگہ مراد سفر ہے، یعنی سفر میں تمھارے لیے تیمّم سے نماز پڑھنا درست ہے۔ یعنی جنبی کو نماز نہیں پڑھنی چاہیے مگر غسل کے بعد، لیکن مسافر تیمّم کر لے، کیوں کہ کبھی پانی نہیں ملتا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ شخص مراد ہے، جو مسجد میں ہو کر گزرتا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ پہلے قول میں ایک وجہ سے قوت ہے کہ نماز اپنے حقیقی معنی میں باقی رہتی ہے اور ایک وجہ سے ضعف ہے۔ عابرِ سبیل سے مسافر مراد ہے، کیوں کہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب پانی نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھے۔ لہٰذا یہی حکم حاضر کا بھی ہے، جس طرح مسافر کا حکم ہے۔ اور دوسرے قول میں عابرِ سبیل کے معنی میں عدمِ تکلف کے پہلو سے قوت ہے اور نماز کو اس کی جگہوں پر محمول کرنے کے پہلو سے ضعف ہے۔ بہر حال پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ یعنی ﴿ اَنۡتُمۡ سُكٰرٰى ﴾

یہ نماز کو، مضاف کو مقرّر (پوشیدہ) تصور کیے بغیر (یعنی مواضع الصلاۃ) اس کے حقیقی معانی پر محمول کرنے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ آیت کا سببِ نزول بھی اسی کو تقویت دیتا ہے۔ اور عابری سبیل مضاف کو مقدر اور پوشیدہ ماننے کو تقویت دیتا ہے۔ اس کے سوا اور بھی تاویل کی ہے، جس میں حقیقت و مجاز جمع ہوتی ہیں۔[1] اس ممانعت کی غرض غسل کرنا ہے۔ مرض سے مراد: بدن کے اعتدال و اعتیاد سے ایسی کیفیت کی طرف خروج کرنا جس میں ٹیڑھا پن اور بے قاعدگی ہو اور وہ دو طرح پر ہوتا ہے: زیادہ اور معمولی۔

مراد یہ ہے کہ جب پانی کے استعمال سے جان کے ضائع ہونے یا نقصان پہنچنے کا خوف ہو یا کمزور بدن ہو اور پانی تک نہ پہنچ سکے یا سفر میں ہو تو تیمّم کر لے۔ یہ شرط نہیں ہے کہ اتنا سفر ہو، جس میں نماز قصر کی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ سفر قصر ہو یا قضائے حاجت سے آیا ہو یا عورت کو چھوا ہو، یعنی جماع سے یا مساس سے۔ یہ دو قراءتیں ہیں اور کسی نے کہا ہے کہ دونوں مراد ہیں۔ ہر گروہ نے یہ گمان کیا ہے کہ ملامست کے معنی میں اس کی حجت صحیح ہے، حالاں کہ یہ بات نہیں ہے۔ اس لفظ کے معنی میں صحابہ و تابعین کا بھی اختلاف تھا۔ مانا کہ ظاہر لفظ جماع میں ہے، مگر حمزہ و کسائی سے قراءت ﴿ لَمَسۡتُمُ ﴾ ثابت ہے، وہ بے شبہہ محتمل ہے۔

پھر احتمال کے ساتھ قیامِ حجت نہیں ہوسکتا۔ یہ حکم عامۃ البلویٰ (یعنی جس کے ساتھ کثرت کے ساتھ واسطہ

---

[1] فتح القدير (١/ ٧٤٨_ ٧٥٠)

پڑتا ہے) ہے اور اس کے ساتھ تکلیف ثابت ہے۔ اس لیے اُس کا اثبات محتمل سے نہیں کرنا چاہیے، پھر اُس کے مفہوم میں نزاع بھی واقع ہے، جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب سنتِ صحیحہ سے جنبی پر، جسے پانی نہ ملے، تیمّم کا وجوب ثابت ہو چکا ہے۔ اس دلیل سے جنبی اس حکم میں داخل ہوگا اور فرض کریں کہ داخل نہیں ہے تو سنت کافی ہے۔ رہا اس شخص کے لیے وضو یا تیمّم کا وجوب، جس نے اپنی بیوی کو ہاتھ سے یا بدن کی کسی چیز سے چھوا ہو، اس کے لیے اس آیت سے احتمال کے سبب سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

رہی حدیث جو سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ جماع کے سوا سب کچھ کیا تھا اور اس پر یہ آیت اُتری: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [هود: ١١٤] ''بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔''[1] اس حدیث میں محلِ نزاع کی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو وضو کرنے کا حکم دیا تھا، تاکہ نماز پڑھے، کیوں کہ نماز بغیر وضو کے نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ حدیث مذکور منقطع ہے۔ اس صورت میں اس حکم سے اصل براءت ہے۔ یہ حکم بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوسکتا، حالاں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ بوسہ لیا وضو نہ کیا۔

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ کی شرط اگر اس شرط کے بعد مرض و سفر قضائے حاجت سے آنے اور عورت کو چھونے کی طرف لوٹے تو اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ صرف مرض اور سفر تیمّم کو جائز نہیں کرتے، بلکہ ضرور ہے کہ پانی بھی نہ ملے، اس بنا پر مریض اور مسافر کے لیے تیمّم کرنا درست نہیں، مگر اسی وقت کہ پانی نہ ملے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح و مقیم بھی پانی نہ ملنے کے وقت مریض اور مسافر کے مثل ہیں تو اب مرض و سفر پر اس حکم کا کوئی فائدہ چاہیے۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ مرض پانی تک پہنچنے میں عاجزی کا احتمال رکھتا ہے۔

اسی طرح مسافر کے حق میں پانی کا نہ ملنا غالب ہے اور اگر قید مذکور آخری دونوں صورتوں کی طرف لوٹتی ہے، یعنی قضائے حاجت سے آنا اور عورت کو چھونا، جس طرح بعض مفسرین نے کہا ہے تو اس میں بھی اشکال ہے، یعنی جس پر مسافر اور بیمار کا نام صادق آتا ہے، اس کے لیے تیمّم کرنا جائز ہے، گو پانی ملے اور اس کے استعمال پر قادر ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قید پہلی دو صورتوں میں معتبر ہونے کے باوجود آخری دو صورتوں کی طرف راجع ہے، کیوں کہ اس کا وقوع نادر ہے، لیکن یہ بات نہایت ساقط ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور مالکیہ نے کہا ہے کہ شرطِ تیمّم میں مرض اور سفر کا ذکر پانی نہ پانے والے کے حق میں باعتبار اغلب کیا ہے بخلاف حاضر کے کہ اس کے حق میں پانی کا وجود غالب ہے۔ اس لیے اللہ نے اس پر نص نہیں کی۔

شریعتِ اسلام کی خصوصیت آسانی:

ظاہر یہ ہے کہ مرض ہی تیمّم کے جواز کے لیے کافی ہے، اگرچہ پانی موجود ہو، لیکن پانی کے استعمال سے اپنے

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

حال اور انجام کے نقصان کا خوف ہو۔ ضائع ہونے کے خوف کا اعتبار نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥] ''اور وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج: ٧٨] ''تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی۔'' اور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: « اَلدِّيْنُ يُسْرٌ »[1] نیز فرمایا: « يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا »[2] نیز فرمایا: « قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ »[3] ''انھوں نے اس کو مار ڈالا، اللہ ان کو مارے۔'' نیز فرمایا: « أُمِرْتُ بِالشَّرِيْعَةِ السَّمْحَةِ »[4] ''مجھے آسان شریعت کا حکم دیا گیا ہے۔''

لہٰذا جب ہم یوں کہیں گے کہ پانی کی عدمِ موجودگی کی قید تمام بیان کی ہوئی صورتوں کی طرف راجع ہے تو صرف مریض پر اس حکم کے اطلاق کی وجہ یہ ہوگی کہ اُس کو باوجود پانی کی موجودگی کے تیمّم کرنا جائز ہے، جب کہ پانی کا استعمال نقصان دہ ہو۔ اس لیے اس کے حق میں اس قید کا اعتبار اُس وقت ہوگا، جب پانی کا استعمال مضر نہ ہو، کیوں کہ صرف مرض میں، باوجود عدمِ ضرر کے، پانی کے استعمال سے عاجزی کا گمان ہوتا ہے۔ کیوں کہ بیماری کی وجہ سے ایک طرح کا ضعف لاحق ہوجاتا ہے۔ رہی مسافر پر اطلاق کی وجہ، تو اس میں شک نہیں کہ زمین میں سفر کرنا مختلف جگہوں پر پانی کی عدمِ دستیابی کا احتمال رکھتا ہے۔

تیمّم کے معنی ہیں: قصد کرنا۔ ظاہر امر وجوب ہے، اس پر اجماع بھی ہے۔ تیمّم کی تفصیل اور اس کا طریقہ سنتِ مطہرہ اور اہلِ علم کے مقالات میں مدون ہے۔ صعید روئے زمین کو کہتے ہیں، خواہ اُس پر مٹی ہو یا نہ ہو۔ خلیل، ابن اعرابی اور زجاج رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اہلِ لغت کا اختلاف نہیں ہے۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صعید وہ زمین ہے، جس میں درخت اور سبزی نہ ہو۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صعید ہموار زمین کو کہتے ہیں۔[6] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تراب کو کہتے ہیں۔ یہ حدیث کہ « جُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا الطَّهُوْرُ » ''اس کی مٹی ہمارے لیے طہور بنائی گئی ہے۔'' « وَجُعِلَ تُرَابُهَا لَنَا طَهُوْرًا »[7] صعید کے معنی کو بیان کرتی ہے یا عمومِ آیت کا مخصوص یا مقید اطلاق ہے۔

حاصل یہ کہ تیمّم ایسی مٹی سے کرے، جس سے غبار اُڑے۔ لفظ مسح ایک ضرب اور دو ضرب کو شامل ہے، دونوں کہنیوں یا دونوں کلائیوں تک ہے۔ سنتِ مطہرہ نے اس کا شافی بیان کر دیا۔ شرح منتقی میں اس مسئلے کی ساری دلیلیں مذکور ہیں۔[8] حاصل مقام یہ ہے کہ جمیع طرق سے دو ضرب والی احادیث اعتراض سے خالی نہیں ہیں۔ اگر وہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٤)
[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣٦٣)
[4] مسند أحمد (٦/ ١١٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٢٩) [5] معاني القرآن (٢/ ٥٦)
[6] تفسير الطبري (٨/ ٤٠٨) [7] ان دونوں کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [8] نيل الأوطار (١/ ٣٣٢۔٣٣٤)

صحت کو پہنچ جائیں تو ان کے ساتھ مسئلہ متعین ہو جائے گا، کیوں کہ اُن میں اضافہ ہے، پس حق یہ ہے کہ جو بخاری اور مسلم میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ایک ضرب پر تیمم کرنا آیا ہے،[1] وہی حق ہے۔ یہاں تک کہ اس مقدار سے زیادت بغیر کسی شک وشبہہ کے ثابت ہو۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: «إِنَّ الْأَحَادِيْثَ الْوَارِدَةَ فِيْ صِفَةِ التَّيَمُّمِ لَمْ يَصِحَّ مِنْهَا سِوٰى حَدِيْثِ أَبِيْ جُهَيْمٍ وَعَمَّارٍ، وَأَمَّا مَا عَدَاهُمَا فَضَعِيْفٌ أَوْ مُخْتَلَفٌ فِيْ رَفْعِهٖ وَوَقْفِهٖ وَالرَّاجِحُ عَدَمُ رَفْعِهٖ»[2] ''تیمم کے بارے میں جتنی احادیث مروی ہیں، ان میں سے صرف ابوجہم اور عمار کی حدیث صحیح ہے، ان دونوں کی احادیث کے علاوہ جتنی احادیث ہیں، وہ سب ضعیف ہیں یا ان کے موقوف اور مرفوع ہونے میں اختلاف ہے، لیکن راجح موقوف ہی ہے۔ غرضیکہ مضبوط بات انھی کی ہے، جو ایک ضرب کے قائل ہیں۔[3]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ؕ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

(اے نبی!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا؟ وہ گمراہی خریدتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ (44) اور اللہ تمھارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ دوست اور مددگار کے طور پر کافی ہے (45) یہودیوں میں سے کچھ لوگ الفاظ کو ان کے موقع محل سے پھیر دیتے ہیں اور پھر اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر سچے دین کے خلاف طعنہ زنی کرتے ہوئے (نبی ﷺ سے) کہتے ہیں: ''ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی'' اور کہتے ہیں: ''سنو! اگرچہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں کچھ سنا جائے'' اور آپ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٨) [2] فتح الباري (١/ ٤٤٤)

[3] فتح البيان (٣/ ١٢٣۔ ١٣٤)

سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں: [رَاعِنَا] یعنی ''اے ہمارے چرواہے!'' اور بے شک اگر وہ کہتے: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، اور ہماری بات سنیے اور ہماری طرف نظر کیجیے'' تو ان کے لیے بہتر اور نہایت مناسب ہوتا، لیکن اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی، چناں چہ وہ سوائے چند لوگوں کے ایمان نہیں لاتے (46)

یہود کی کجروی:

یہود کو فرمایا کہ ان کو کتاب کا ایک حصہ ملا، یعنی لفظ پڑھنے کو ملے ہیں، عمل کرنا نہیں ملا۔ لفظ ''رَاعِنَا'' بولتے تھے، اس کا بیان سورت بقرہ میں ہوا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ بات فرماتے تو جواب میں کہتے کہ سنا ہم نے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قبول کیا۔ لیکن آہستہ کہتے کہ نہ مانا، یعنی فقط کان سے سنا، دل سے نہ سنا۔ نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے تو کہتے: سن نہ سنایا جائے، ظاہر میں یہ دعا نیک ہے کہ تو ہمیشہ غالب رہے، کوئی تجھ کو بُری بات نہ سنا سکے، دل میں نیت رکھتے کہ تو بہرا ہو جائے۔ ایسی شرارت کرتے، پھر دین میں طعن کرتے، عیب لگاتے کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب معلوم کر لیتا، وہی اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا۔

گمراہی اختیار کرنے، تحریف کرنے، دین پر اعتراض کرنے اور زبانوں کو پھیرنے پر یہود کی مذمت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ یہودیوں کے حال کی خبر دیتا ہے، اُن پر قیامت تک مسلسل لعنت ہو، کہ وہ ہدایت کے عوض گمراہی خرید لیتے ہیں، اللہ کے کلام سے جو پیغمبر ﷺ پر اُتارا ہے، اس سے منہ پھیرتے ہیں اور پہلے انبیا سے، محمد ﷺ کی صفات کے بارے میں جو علم ان کے پاس ہے، اُسے تھوڑی قیمت لے کر اس ارادے سے ترک کرتے ہیں کہ اے مسلمانو! تم کو بھی سیدھی راہ سے گمراہ کر دیں اور تم بھی اس ہدایت اور علمِ نافع کو چھوڑ دو۔ لہٰذا اللہ کو تمھارے دشمن خوب معلوم ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ اُن سے تم کو ڈراتا ہے۔ اللہ اس کو کافی ہے، جو اللہ سے مدد چاہتا ہے۔

تحریفِ کلم سے یہ مراد ہے کہ کلام کے ایسے معنی کہتے ہیں، جو اس کے معنی نہیں ہیں۔ اللہ کی مراد کے خلاف تفسیر کرتے ہیں۔ ان کا یہ افترا قصداً ہے، کہتے ہیں: اے محمد! ہم نے سنا جو تم نے کہا: مگر ہم تمھارے قول کی اطاعت نہیں کریں گے۔ امام مجاہد اور ابن زید رحمہ اللہ نے یہی تفسیر کی ہے[1] اور یہی مراد ہے۔ یہ انکار بڑا کفر و عناد تھا کہ وہ اللہ کی کتاب کو سمجھ کر پھرتے ہیں، اس کام کا جو گناہ اور سزا ہے، اسے جانتے ہیں۔

﴿اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ کے معنی ہیں کہ تم سنو، ہم کیا کہتے ہیں مت سنیو۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[2] امام مجاہد اور حسن رحمہ اللہ نے کہا: ''اِسْمَعْ غَيْرَ مَقْبُوْلٍ مِنْكَ''، ''سن تجھ سے قبول نہ کیا جائے۔'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اول صحیح ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ''وَهُوَ كَمَا قَالَ'' یہ اُن کی طرف

---

[1] تفسیر الطبري (٨/ ٤٣٣)
[2] تفسیر الطبري (٨/ ٤٣٤) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر الطبري (٨/ ٤٣٤)

سے استہزا تھا۔ ﴿ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٦١] ''جن پر اللہ کی لعنت ہے۔'' پھر یہ باور کرواتے کہ ''رَاعِنَا'' سے ہماری مراد ''رَاعِنَا سَمْعَكَ'' ہے، حالاں کہ مراد رعونت تھی اور رسول اللہ ﷺ پر دشنام دہی تھی۔

اس بارے میں آیتِ کریمہ: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا ﴾ [البقرة: ١٠٤] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم (نبی سے یہ) نہ کہو: [رَاعِنَا] بلکہ یہ کہو: [اُنْظُرْنَا]۔'' کے تحت پہلے کلام گزر چکا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ان یہود کی مراد اس کے برخلاف ہے، جو زبان لپیٹ کر ظاہر کرتے ہیں۔ دین میں اعتراض کرتے ہیں، نبی مکرم ﷺ کو برا کہتے ہیں۔ پھر فرمایا: ان کے دل خیر، نیکی و بھلائی اور بہتری سے دور ہیں۔ ان کے دل میں ایمانِ نافع کا کچھ حصہ داخل نہیں ہوتا۔[1]

فتح البیان میں کہا ہے کہ تحریف کے معنی ہیں: امالہ و ازالہ کرنا۔ یعنی الفاظ کو ان کی جگہ سے دور کر کے ان کے بجائے دوسرے الفاظ رکھ دینا یا ان لفظوں کے معنی اُلٹ پلٹ کر اور طرح بیان کرنا۔ فقہا اور محدثین کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تورات میں مذکور اللہ کی حدود میں تحریف کرتے ہیں۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود نے تورات کو بدل ڈالا۔[3] اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی کہ وہ یہ کام عناد اور سرکشی سے کرتے ہیں۔ انھوں نے دنیا کو آخرت پر اختیار کیا ہے۔

ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب ''إغاثة اللهفان'' میں لکھا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ تورات کا جو نسخہ یہود کے ہاتھ میں ہے، وہ تبدیل شدہ ہے یا اس کی تاویل میں تبدیلی ہوئی ہے نہ کہ تنزیل میں۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ کُل یا اکثر تبدیل شدہ ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ تاویل میں تبدیل ہوا۔ امام بخاری و رازی رحمہما اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ تیسرے گروہ نے کہا ہے کہ تورات میں الفاظ کی کمی بیشی ہوئی ہے۔ اسی کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[4] محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ لفظی اور معنوی دونوں طرح کی تحریف ہوئی۔ یہی بات قابلِ ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انجیل کے بعض معانی و الفاظ میں تبدیلی اور تحریف کی گئی ہے، کیوں کہ انجیلوں کے چاروں نسخے مختلف ہیں۔ ''كتاب المفيد في التوحيد'' میں اس کی تفصیل ہے۔[5]

احمد فارس رحمہ اللہ نے ایک مستقل رسالے میں انجیلوں کا آپس میں ٹکراؤ اور ان کا پارہ پارہ ہو جانا جمع کیا ہے۔ اب یہ قانون ٹھہرا ہے کہ مسلمین کے جس اعتراض کا جواب نہیں دیا جا سکتا، متعلقہ انجیل کے اس قابلِ اعتراض حصے کی ترمیم کر کے وقتاً فوقتاً انجیل کے جدید نسخے چھپوا کر مشتہر کیے جاتے ہیں، مگر کیا فائدہ؟ اگر تورات و انجیل تحریف شدہ نہ ہوتی، فقط تحریف معنوی ہوتی، بلکہ بالکل تبدیل نہ ہوتی، پھر بھی اب وہ عمل کے لائق نہیں تھی۔ کیوں کہ قرآنِ کریم نے

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٦٦٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٦٥) اس کی سند حسن ہے۔ [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٦٥)
[4] إغاثة اللهفان (٢/ ٣٥١ـ ٣٦٣) [5] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (١/ ١٣٤)

پہلے تمام ادیان کو منسوخ کر دیا ہے۔ خواہ وہ قرآن سے پہلے منسوخ تھے یا نہیں تھے۔ اللہ کے نزدیک دین یہی اسلام ہے۔ اس کے سوا کوئی اور دین قابلِ قبول نہیں ہے۔ اگرچہ وہ غیر محرف ہو۔

ایمانِ قلیل سے یہ مراد ہے کہ بعض کتابوں پر ایمان لاتے ہیں، بعض کا انکار کرتے ہیں۔ کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی رسول کا انکار کرتے ہیں یا ان میں ایمان لانے والے تھوڑے ہیں، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ۔ امام زمخشری اور ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ قلیل سے مراد عدم ہے، یعنی وہ البتہ ایمان نہیں لائیں گے۔[1] واللہ أعلم.

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

اے لوگو! جنھیں کتاب دی گئی، اس (قرآن) پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا، وہ اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمھارے پاس ہے، (تم ایمان لاؤ) اس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ دیں اور انھیں پیچھے کی طرف پھیر دیں یا ان پر اسی طرح لعنت بھیجیں، جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت بھیجی تھی، اور (یاد رکھو!) اللہ کا حکم اٹل ہے (47) بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، اس نے جھوٹ گھڑا اور بڑے گناہ کا کام کیا (48)

یہودیوں کو دھمکانے کے ساتھ ساتھ ایمان قبول کرنے کی دعوت:

یعنی ایمان لاؤ اس سے پہلے کہ عذاب پاؤ، صورت بدلی جائے یا ہفتے والوں کی طرح جانور بن جاؤ، ان کا بیان سورت اعراف میں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو حکم دیا ہے کہ اُس کتابِ عظیم پر ایمان لائیں، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتری ہے اور ان بشارتوں کی تصدیق کرنے والی ہے، جو ان کی کتابوں میں ہیں، اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ہم ان کی صورت بدل دیں گے، ان کی آنکھیں ان کی پشت کی طرف ہو جائیں گی۔

یہ ﴿ فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ ﴾ کے معنی ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم ان کے منہ بگاڑ دیں گے، ان میں سماعت اور بصارت باقی نہ رہے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اس کان اور آنکھ اور ان کے درمیان کی جگہ کو ان کی پیٹھ کی طرف

[1] فتح البيان (٣/ ١٣٦_ ١٤٠)

پھیر دیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی ہم ان کو اندھا کر دیں گے، ان کے منہ ان کی پشت کی طرف ہو جائیں گے، اُس وقت وہ اُلٹے پاؤں چلیں گے اور ان کی دونوں آنکھیں گدی کی طرف ہوں گی۔[1] یہی امام قتادہ اور عطیہ عوفی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یہ عذاب اور سزا میں زیادہ بلیغ ہے۔[2]

یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے حق سے پھر جانے اور باطل کی طرف میلان کرنے کے لیے بیان کی ہے کہ وہ لوگ واضح اور روشن دلیل کو چھوڑ کر گمراہی کے راستے کی طرف رجوع کرتے ہیں، گویا پشت کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہ ویسی بات ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ۝ وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا ﴾ [یٰسٓ: ۸۔ ۹] ”بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں اور وہ (ان کی) ٹھوڑیوں تک ہیں، لہٰذا وہ سر اوپر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ہم نے ان کے آگے ایک دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار۔“ یعنی یہ ایک بُری کہاوت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہدایت سے گمراہ ہونے پر بیان فرمائی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صراطِ حق سے گمراہی کی طرف پھیر دیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی حق سے روک کر کفر کی طرف پھیر دیں، بندر بنا دیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو ارضِ حجاز سے بلادِ شام کی طرف پھیر دیا۔[3]

کعب احبار رحمہ اللہ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ:

کہتے ہیں کہ کعب احبار رحمہ اللہ نے جب یہ آیت سنی تو اسلام لے آئے۔ عیسیٰ بن مغیرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے ابراہیم کے پاس کعب احبار کے اسلام کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام لائے تھے۔ بیت المقدس میں جاتے تھے، مدینہ منورہ سے گزرے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے کعب! اسلام لے آؤ۔ کعب نے کہا: کیا تم اپنی کتاب میں یوں نہیں کہتے: ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾ [الجمعة: ۵] ”ان لوگوں کی مثال، جنھیں حاملِ تورات بنایا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اُٹھایا، اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اُٹھاتا ہے۔“ اور میں حاملِ تورات ہوں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو چھوڑ دیا، پھر وہ وہاں سے نکل کر حمص پہنچے، وہاں ایک شخص حزین سے سنا، وہ کہتا تھا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) کعب نے کہا: اے رب! میں اسلام لایا۔ یہ اس بات کے ڈر سے کہا کہ کہیں وہ اس کا مصداق نہ بن جائیں۔ پھر یمن میں اپنے گھر والوں کے پاس آئے، پھر ان کو مسلمان کر کے لائے۔[4] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم بلفظ آخر من وجه آخر)

---

[1] تفسیر الطبري (۸/ ٤٤٠) تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹٦۹) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۸/ ٤٤١) تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦٦۳۔ ٦٦٤) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹٦۹) [4] تفسیر الطبري (۸/ ٤٤٦)

وہ وجہ یہ ہے کہ ابومسلم جلیلی معلم کعب تھے۔ کعب کو رسول اللہ ﷺ پر تاخیر کرنے سے ملامت کرتے تھے، پھر اُن کو بھیجا کہ جا کر دیکھو کہ آپ وہی نبی ہیں، جن کا وعدہ کیا گیا ہے؟ کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں سوار ہو کر مدینہ میں آیا۔ ایک پڑھنے والا قرآن پڑھتا تھا، اس نے یہی آیت پڑھی، مَیں جلد پانی لے کر نہایا، اپنے منہ پر اس ڈر سے ہاتھ پھیرتا تھا کہ کہیں بگڑ نہ جائے، پھر اسلام لایا۔[1] اصحابِ سبت سے وہ لوگ مراد ہیں، جنھوں نے حیلہ کر کے ہفتے کے دن شکار کھیلا، وہ مسخ ہوگئے، بندر سؤر بن گئے، یہ قصہ سورت اعراف میں آئے گا، اللہ کا حکم ٹلتا نہیں ہے۔

توبہ کے بغیر شرک کبھی معاف نہیں ہوگا:

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اللہ اس شخص کو نہیں بخشتا جو اس سے ملا اور وہ مشرک تھا اور جو گناہ شرک سے کم درجے کے ہیں ان کو بخش دیتا ہے، مگر جس کو چاہے۔ اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک دیوان (اعمال نامے) تین (قسم کے) ہیں: ایک وہ جس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ دوسرا وہ جس میں سے کچھ نہیں چھوڑتا، تیسرا وہ جس کو نہیں بخشتا، سو وہ دیوان جس کو نہیں بخشتا، اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ ﴾ [المائدة: ۷۲] ''بے شک جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے۔'' اور وہ دیوان جس کی پروا نہیں کرتا، بندے کا اپنے نفس اور اللہ کے درمیان ظلم ہے، جیسے کوئی روزہ نہ رکھا یا نماز نہ پڑھی کہ اس کو اللہ اگر چاہتا ہے تو بخش دیتا ہے، اگر چاہتا ہے تو تجاوز فرماتا ہے اور وہ دیوان جس کو نہیں چھوڑتا وہ بعض بندوں کا بعض پر ظلم ہے، اس میں قصاص یعنی بدلا ضرور ہوگا۔[2] (تفرد به أحمد)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث ہے کہ ظلم تین ہیں: ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا۔ دوسرا وہ جس کو بخشتا ہے۔ تیسرا وہ جس میں کچھ نہیں چھوڑتا۔ لہٰذا وہ ظلم جس کو نہیں بخشتا، وہ شرک ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳] اور وہ ظلم جس کو بخشتا ہے، وہ بندوں کا ظلم ہے، اپنی جانوں پر جو ان کے اور اللہ کے درمیان ہے اور وہ ظلم جس کو نہیں چھوڑتا، وہ بعض بندوں کا بعض پر ظلم ہے۔ یہاں تک کہ بعض کا بعض سے بدلا لیتا ہے۔[3] (رواه البزار في مسنده)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: ہر گناہ قریب ہے کہ اُس

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۶۹)

[2] مسند أحمد (۶/ ۲۴۰) اس کی سند میں ''صدقہ بن موسیٰ'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ۳۰۲۲)

[3] مسند الطيالسي (۱/ ۲۸۲) مسند البزار (۱۳/ ۱۱۵) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۹۲۷)

کو اللہ تعالیٰ بخش دے، مگر وہ آدمی کہ کافر مرا، یا وہ آدمی جو کسی مسلمان کو عمداً قتل کرتا ہے۔[1] (رواه أحمد والنسائي)

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ کہتا ہے کہ اے میرے بندے! جب تک تو مجھے پوجے گا اور مجھ سے اُمید رکھے گا، میں تجھ کو بخشوں گا، جو کچھ تیرے اندر ہو۔ اے میرے بندے! اگر تو مجھ سے زمین بھر خطائیں لے کر ملے گا، اس حالت میں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا تھا تو میں تجھ سے زمین بھر مغفرت لے کر ملوں گا۔[2]

(تفرد به أحمد من هذا الوجه)

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی دوسری مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نہیں کوئی بندہ کہ لا الٰہ الا اللہ کہے، پھر اسی بات پر مر جائے، مگر جنت میں جائے گا۔ میں نے کہا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ زنا اور چوری کی ہو۔ میں نے کہا: "وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ"" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:« وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ» تین بار یوں ہی کہا۔ چوتھی بار کہا:« عَلٰى رَغْمِ اَنْفِ أَبِيْ ذَرٍّ». (گو ابو ذر کی ناک خاک آلود ہو) سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ اپنی ازار کھینچتے ہوئے باہر نکلے اور یہ کہتے تھے، گو ابو ذر کی ناک خاک آلود ہو اور جب اس حدیث کو بیان کرتے تو کہتے: "وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِيْ ذَرٍّ"[3] (أخرجاه من حديث حسين و رواه أحمد واللفظ له)

تیسری طویل حدیث میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے اس طرح مرفوعاً مروی ہے کہ فرمایا: یہ جبریل ہیں، میرے پاس آئے، کہا: جو کوئی تیری اُمت میں سے اس حالت میں مرا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے کہا: گو زنا کیا ہو یا چوری؟ کہا: گو زنا کیا ہو یا چوری۔[4] (رواه أحمد والشيخان)

صحیحین کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں آپ پر فدا ہوں، آپ حرہ کی طرف کس سے باتیں کرتے تھے؟ کیوں کہ میں سنتا تھا کہ کوئی شخص آپ کو جواب دیتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جبریل تھے، حرہ کی طرف سے میرے سامنے آ گئے، کہا: اپنی امت کو بشارت دو کہ جو اس حالت میں مرے گا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہوگا تو جنت میں جائے گا، میں نے کہا: اے جبریل! گو اس نے زنا کیا ہو یا چوری؟ کہا: ہاں، پھر میں نے کہا:« وَإِنْ زَنَا وَإِنْ سَرَقَ» (اگرچہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو) کہا: "نَعَمْ" پھر میں نے کہا: اگرچہ زنا کیا ہو یا چوری؟ کہا: ہاں، گو شراب پی ہو۔[5]

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٩٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٨٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥١١)

[2] مسند أحمد (٥/ ١٥٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤) مسند أحمد (٥/ ١٦٦)

[4] مسند أحمد (٥/ ١٥٢) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک آدمی آیا، اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! موجبات (واجب کرنے والی چیزیں) کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو مرا اور اس نے اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا، اس کے لیے جنت واجب ہوگئی اور جو مرا اور اُس نے اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کیا تھا، اس کے لیے آگ واجب ہوگئی۔[1] (تفرد به عبد بن حميد من هذا الوجه) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی دوسری مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نہیں ہے کوئی نفس جو مرے اور وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرتا ہو، مگر حلال ہوگی اس کے لیے مغفرت۔ اگر چاہے اللہ عذاب کرے، چاہے بخش دے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

امام ابویعلیٰ رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ بندے کی بخشش ہمیشہ ہوتی ہے، جب تک پردہ نہ پڑے۔ کہا: اے اللہ کے نبی! حجاب (پردہ) کیا ہے؟ فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، پھر فرمایا کہ نہیں ہے کوئی نفس کہ اللہ سے اس حالت میں ملاقات کرے کہ اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرتا ہو، مگر اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اترتی ہے۔ چاہے عذاب کرے چاہے بخشے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔[3] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَنْ مَّاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ»[4] (تفرد به أحمد) ''جو اس حالت میں فوت ہوا کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا کرتا تھا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

ابورہم واعظِ شام نے ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو سنا، فرماتے تھے کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ ان کی طرف نکلے اور فرمایا: تمھارے رب عزوجل نے مجھ کو ستر ہزار کے درمیان، جو جنت میں بغیر حساب سیدھے داخل ہوں گے اور اس خبیئہ (امرِ پوشیدہ) کے درمیان اختیار دیا ہے، جو اللہ کے پاس میری امت کے واسطے ہے۔ بعض اصحاب نے کہا: اے اللہ کے رسول! وہ بات اللہ تعالیٰ آپ سے پوشیدہ رکھے گا، پھر آپ ﷺ اندر گئے اور تکبیر کہتے ہوئے باہر نکلے، فرمایا: میرے رب نے میرے لیے ہزار کے ساتھ ستر ہزار کا اضافہ فرمایا اور خبیئہ اسی کے پاس ہے۔

ابورہم نے کہا: اے ابوایوب! تم کیا گمان کرتے ہو کہ وہ خبیئہ رسول اللہ کیا ہے؟ لوگوں نے اُس کو اپنے منہ سے کھانا شروع کیا، کہا: تجھ کو خبیئہ رسول اللہ سے کیا غرض ہے؟ ابوایوب نے کہا: اس مرد کو تم چھوڑ دو، میں تم کو اس

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۹۳) مسند عبد بن حميد (۱/ ۳۲۲) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۹۷۱)

[3] مسند ابی یعلیٰ کے مطبوعہ نسخے میں یہ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (۱/ ۲۶۶) میں اس کی نسبت ابویعلیٰ رحمہ اللہ کی طرف کی ہے۔ نیز اس کی سند میں گزشتہ روایت والی دونوں علتیں (انقطاع اور ضعف) موجود ہیں۔

[4] مسند أحمد (۳/ ۷۹) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ یہ الفاظ دیگر صحابہ کرام سے صحیحین وغیرہ میں مروی ہیں، جیسا کہ زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکا ہے۔

خبیئہ کی خبر دیتا ہوں۔ جیسا مجھ کو گمان بلکہ یقین ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا خبیئہ یہ ہے کہ جس نے اس بات کی گواہی دی کہ ’’لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ‘‘ پھر اس کی زبان نے اُس کے دل کی تصدیق کی، وہ جنت میں جائے گا۔[1] (رواہ أحمد)

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نبی مکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میرا بھتیجا حرام سے باز نہیں آتا، فرمایا: اس کا دین کیا ہے؟ کہا: نماز پڑھتا ہے، موحد ہے۔ کہا: اس سے اس کا دین مانگ لے، اگر نہ مانے تو مول لے لے، اس نے ایسا ہی کیا، وہ منکر ہوا۔ نبی کریم ﷺ کو آ کر خبر دی، کہا: میں نے اس کو دین پر بخیل پایا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔[2]
(رواہ ابن أبي حاتم)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: « مَا تَرَكْتُ حَاجَةً وَّ لَا دَاجَةً إِلَّا قَدْ أَتَيْتُ » فرمایا: « أَلَيْسَ تَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ » ’’میں نے ہر چھوٹی بڑی برائی کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو اللہ کے ایک ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی نہیں دیتا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اس سب کو مٹا دے گا۔‘‘ تین بار یوں ہی کہا، اُس نے کہا: گواہی دیتا ہوں، فرمایا: ’’فَإِنَّ ذٰلِكَ يَأْتِيْ عَلٰى ذٰلِكَ كُلِّهٖ‘‘[3] [بلاشبہ یہ (گواہی) تیری ان تمام برائیوں کو مٹا دے گی۔] (رواہ أبو یعلٰی)

ضمضم بن جوس یمامی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے یمامی! دیکھ کسی شخص سے اس طرح نہ کہنا: ’’لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ أَوْ لَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ أَبَدًا‘‘ یعنی نہ اللہ تجھ کو بخشے گا نہ جنت میں کبھی داخل کرے گا۔ میں نے کہا: اے ابو ہریرہ! یہ کلمہ تو ہر کوئی غصے میں اپنے بھائی سے کہہ دیتا ہے۔ کہا: تو مت کہہ۔ میں نے نبی کریم ﷺ کو سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے کہ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے، ایک عبادت میں بہت کوشش کرتا، دوسرا اپنے نفس پر مسرف (زیادتی کرنے والا)، یعنی گناہ گار تھا۔ دونوں میں مواخات (بھائی بندی) تھی۔ وہ مجتہد عبادت گزار دوسرے کو ہمیشہ گناہ پر دیکھتا اور کہتا: اے شخص! باز رہ، وہ کہتا: تو مجھ کو اور میرے رب کو چھوڑ دے، کیا تو مجھ پر نگہبان ہو کر آیا ہے؟ یہاں تک کہ ایک دن اُس عابد نے اس کو ایک گناہ پر دیکھا، جس کو بہت بڑا گناہ سمجھا، اس سے کہا: افسوس ہے، باز آ، اس نے پھر وہی کہا: ’’خَلِّنِيْ وَرَبِّيْ أَبُعِثْتَ عَلَيَّ رَقِيْبًا‘‘ اُس نے کہا: ’’وَاللّٰهِ! لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٤١٣) اس کی سند میں ’’ابن لہیعہ‘‘ ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٧١) المعجم الکبیر (٤/ ١٧٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وفیه واصل بن السائب وھو ضعیف‘‘ (مجمع الزوائد: ٧/ ٦١)

[3] مسند أبي یعلٰی (٦/ ١٥٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’رواہ أبو یعلٰی و البزار بنحوہ والطبراني في الصغیر والأوسط و رجالھم ثقات‘‘ (مجمع الزوائد: ١٠/ ٩١)

لَكَ، أَوْ لَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ أَبَداً“ اللہ نے اُن دونوں کی طرف ایک فرشتہ بھیجا، جس نے اُن کی جان قبض کی، وہ دونوں اللہ کے پاس جمع ہوئے۔ اللہ نے گناہ گار سے کہا: میری رحمت سے جنت میں جا، دوسرے سے کہا: تو عالم تھا یا جو بات میرے ہاتھ میں ہے تُو اُس پر قادر تھا؟ کہا: اس کو آگ میں لے جاؤ۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے کہا: اس کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں ابو القاسم کی جان ہے! اُس نے یہ ایک ایسی بات کی جس نے اُس کی دنیا اور آخرت تباہ کر دی۔[1] (رواه أحمد و أبو داود ﷫)

سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جس نے سمجھا کہ میں گناہوں کو بخشنے کی قدرت رکھتا ہوں تو میں اُس کو بخش دیتا ہوں، جب تک کہ اُس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا اور میں کچھ پروا نہیں کرتا۔[2] (رواه الطبراني) سیدنا انس ﷜ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس شخص کے ساتھ اللہ نے کسی عمل پر ثواب کا وعدہ کیا تو اللہ اس کو پورا کرتا ہے اور جس کو کسی عمل پر سزا کی وعید کی ہے، اس میں اللہ کو اختیار ہے۔[3] (تفرد به أبو بكر البزار وأبو يعلىٰ) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وعید میں تخلف جائز ہے وعدے میں نہیں ؎

وَإِنِّي إِذَا أَوْعَدْتُهُ أَوْ وَعَدْتُّهُ   لَمُخْلِفُ مِيْعَادِيْ وَمُنْجِزُ مَوْعِدِيْ

”میں جب اس کو دھمکاؤں یا وعدہ کروں، اپنی دھمکی کو آگے پیچھے کر لیتا ہوں اور اپنے وعدے کو پورا کرتا ہوں۔“

اہلِ کبائر کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے:

سیدنا عبداللہ بن عمر ﷠ کہتے ہیں کہ ہم اصحابِ نبی ﷺ کسی نفس کو قتل کرنے والے، یتیم کا مال کھانے والے، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے والے اور جھوٹی گواہی دینے والے کے بارے میں شک نہیں کرتے تھے (کہ وہ جہنمی ہیں) یہاں تک کہ یہ آیت اُتری، یعنی آیت زیرِ تفسیر، اس پر اصحابِ نبی ﷺ شہادت سے رک گئے۔[4] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير) سیدنا عبداللہ بن عمر ﷠ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہم اُس شخص کے بارے میں شک نہیں کرتے تھے، جس کے لیے اللہ نے کتاب یعنی قرآن شریف میں دوزخ کی آگ واجب کی ہے، یہاں تک کہ یہ آیت ہم پر اُتری، یعنی آیت زیرِ تفسیر۔ جب ہم نے اس کو سنا تو شہادت سے رک گئے اور معاملے کو اللہ عزوجل کے سپرد کر دیا۔[5] (رواه ابن أبي حاتم)

---

[1] مسند أحمد (۲/ ۳۲۳) سنن أبي داود، رقم الحديث (۴۹۰۱) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٤٥٥)
[2] المعجم الكبير (۱۱/ ۲٤۱) اس کی سند میں ”ابراہیم بن حکم بن ابان“ ضعیف راوی ہے۔
[3] مسند البزار (۱۳/ ۲۹۷) مسند أبي يعلىٰ (٦/ ٦٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٦٣)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۹۷۱) تفسير الطبري (۸/ ٤٥٠) اس کی سند میں ”ہیثم بن جماز“ ضعیف راوی ہے۔
[5] تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۹۷۰) اس کی سند میں ”صالح بن بشیر مری“ ضعیف راوی ہے۔

ان کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہم اہلِ کبائر کے لیے بخشش کی دعا کرنے سے رُکتے تھے، یہاں تک کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «أَخَّرْتُ شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ» یعنی میں نے اپنی شفاعت اپنی امت میں سے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے قیامت کے دن پر رکھ چھوڑی ہے۔[1] اے اللہ پاک! تو اپنے رحم و کرم سے مجھ کو بھی اُس دن اپنے رسولِ مقبول ﷺ کی شفاعت میں داخل اور شامل کر لینا، تجھ پر یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی چوتھی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب یہ آیت اُتری: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ [الزمر: ۵۳] ''اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔'' ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: ''وَالشِّرْكُ بِاللّٰهِ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ؟'' یعنی کیا شرک بھی معاف ہو جائے گا؟ نبی اکرم ﷺ نے اس سوال کو مکروہ جانا، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔[2] (رواہ ابن جریر وابن مردویہ)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آیت جو سورت تنزیل (زمر) میں ہے، وہ توبہ کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی جس نے کسی گناہ سے توبہ کی، گو وہ اس سے بار بار ہوا ہو تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ اس لیے اللہ نے یہ فرمایا کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر اسراف کیا، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، اللہ سارے گناہ بخش دے گا، یعنی بشرطِ توبہ، کیوں کہ اگر یہ شرط نہ ہو تو شرک بھی اس میں داخل ہو جائے گا اور یہ دخول صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے اس جگہ حتماً یہ فرما دیا کہ شرک بخشا نہیں جاتا، ہاں جو گناہ شرک سے نیچے ہے، وہ بخشا جا سکتا ہے۔ یعنی اگرچہ وہ گناہ والا توبہ نہ کرے، سو یہ آیت اُس آیت سے زیادہ اُمید دلاتی ہے۔[3]

شرک بہتانِ عظیم، ظلم اور کبیرہ گناہ ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جس نے شرک کیا، اُس نے بڑا بہتان باندھا۔ یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳] ''بے شک شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔'' صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کونسا گناہ بہت بڑا ہے؟ فرمایا: «أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ» یعنی اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جس نے تجھ کو پیدا کیا ہے، اس کا کوئی ہمسر ٹھہرانا بڑا گناہ ہے۔[4] عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تمھیں سب سے بڑے گناہ کے

---

[1] مسند البزار (۱۲/ ۱۸۶) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''إسنادہ جید'' (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۳۵۲) [2] تفسیر الطبري (۸/ ۴۴۹)

[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۶۶۸) [4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۲۰۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۶)

بارے میں بتاتا ہوں، وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا﴾[1] (الحديث رواه ابن مردويه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: یہ جو کہا کہ قرآن تورات کی تصدیق کرنے والا ہے، اس کے معنی ہیں کہ جو تورات میں قرآن کی تعریف تھی، اسی کے مطابق اُترا یا قصص (قصوں) ومواعید (وعدے) و دعوتِ توحید اور لوگوں کے درمیان عدل کرنے اور فواحش اور معاصی وغیرہ کی ممانعت میں تورات کے موافق ہے۔ بعض احکام اور جزئیات میں امتوں اور زمانوں کے فرق کی وجہ سے مخالفت ہے۔ یہ حقیقت میں مخالفت نہیں ہے، بلکہ عین موافقت ہے، کیوں کہ ہر ایک اپنے زمانے کی مناسبت سے حق ہے اور حکمت کا حامل ہے۔ اگر پہلے والی کتاب بعد میں نازل ہوتی تو وہ بھی بعد والے زمانے کے مطابق ہوتی اور اگر بعد میں آنے والی کتاب پہلے نازل ہوتی تو وہ بھی پہلے والے زمانے کے مطابق ہوتی۔ اسی لیے حدیث میں مروی ہے کہ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو انھیں میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔[2]

طمسِ وجوہ (چہرے مسخ کرنا) میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد حقیقت ہے کہ منہ گدی کی طرح ہوجائے، ناک، منہ، ابرو، آنکھ کچھ باقی نہ رہے۔ صورتوں اور چہروں کے خدو خال ختم ہوجائیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ منہ خف بعیر (اونٹ کی ٹاپ، قدم) کی طرح ہو جائے[3] یا مجازی معنی مراد ہیں کہ توفیق سلب ہو کر گمراہ ہو جائیں۔ ہر طرف ایک گروہ گیا ہے۔ پہلا زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ "رَدٌّ عَلَى الْاَدْبَار" کے ایک معنی یہ ہیں کہ گدی کی جگہ منہ اور منہ کی جگہ گدی آجائے۔

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ وعید ابھی پوری ہونی باقی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ قیامت سے پہلے یہ طمس اور مسخ یہود میں واقع ہو۔[4] کسی نے کہا کہ یہ قیامت کے ساتھ خاص ہے۔ یا دل اور بصیرت کا اوندھا ہوجانا مراد ہے۔ یا مدینے میں آثارِ یہود کا مٹ جانا اور اُن کا شام کی سرزمین کے علاقے اذرعات واریحا کی طرف جہاں سے وہ آئے تھے، وہاں چلے جانا ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اصحابِ سبت پر لعنت یہ تھی کہ وہ بندر اور سؤر ہوگئے تھے یا مراد نفسِ لعنت ہے کہ ہر زبان کی پھٹکار اُن پر پڑے۔ غرض کہ دو باتوں سے ایک بات کا واقع ہونا مراد ہے یعنی طمس یا لعن۔ لعنت تو واقع ہوئی، لیکن زیادہ مضبوط بات پہلی ہے، کیوں کہ اس لعنت کی تشبیہ اصحابِ سبت کی لعنت کے ساتھ دی گئی ہے۔ اللہ کا کام ضرور ہی ہوتا ہے۔

---

[1] المعجم الكبير (١٨/ ١٤٠) اس کی سند میں "سعید بن بشیر" ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔
[2] مسند أحمد (٣/ ٣٣٨) شعب الإيمان (١/ ١٩٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٦/ ٣٤)
[3] تفسير البغوي (٢/ ٢٣١) [4] تفسير القرطبي (٥/ ٢٤٥)

پھر شرک کے بارے میں حکم فرمایا، یہ کفار کے تمام گروہوں کو شامل ہے، خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں، یہ صرف اہلِ حرب کے کافروں کے لیے مخصوص نہیں ہے، کیوں کہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہا تھا، نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو، غرضیکہ ایک اللہ کے تین ٹھہرائے۔ مسلمانوں میں اس بات میں کچھ اختلاف نہیں ہے کہ مشرک جب شرک پر مرجاتا ہے تو وہ اہلِ مغفرت سے نہیں ہوتا۔ بخشش کا فضل و کرم اللہ نے ان لوگوں کے لیے ہی کیا ہے، جو شرک والے نہیں ہیں۔ اللہ کی مشیت کے تقاضے سے جو ایسے گناہ گار ہیں، جو اہلِ شرک نہیں ہیں، سو وہ اس میں شامل ہیں۔ جس کو چاہے بخشے، جس کو چاہے نہ بخشے، عذاب کرے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت نے ظاہر کر دیا کہ ہر صاحبِ کبیرہ اللہ کی مشیت میں ہے، چاہے عذاب کرے، چاہے معاف فرمائے، جب تک کہ اس کا وہ کبیرہ گناہ شرک باللہ نہ ہو۔[1]

ظاہر یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے بخشش اسی کے لیے ہوگی، جس پر اللہ کی مشیت نے اپنے فضل اور رحمت کا فیصلہ کیا ہے۔ اگرچہ اس گناہ گار سے توبہ واقع نہ ہوئی ہو۔ معتزلہ اس کو توبہ کے ساتھ مشروط کرتے ہیں، حالاں کہ آیتِ کریمہ: ﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ﴾ [النساء: ۳۱] ''اگر تم بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں روکا جاتا ہے تو ہم تمھاری (چھوٹی چھوٹی) برائیاں تم سے دور کر دیں گے۔'' اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کبائر سے بچنے والوں کی سیئات کو بخش دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے کبائر سے بچنے والوں کے گناہوں کو بخشنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اس شخص کے لیے حرام کر دیا، جو کافر مرا اور اہلِ توحید کو اپنی مشیت پر رکھا ہے، اُن کو مغفرت سے ناامید نہیں کیا۔[2] سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مَا فِي الْقُرآنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ هٰذِهِ الْآيَةِ'' ''مجھے قرآن میں یہ آیت سب سے زیادہ پسند ہے۔'' مراد آیتِ باب ہے۔[3] اثم عظیم سے مراد گناہِ کبیرہ ہے کہ اگر اُس پر مرجائے تو بخشا نہ جائے۔[4] اس آیت کی تفسیر کتاب دینِ خالص (نواب صاحب کی تالیف) میں اُس کے مولف نے خوب لکھی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۴۹ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا

[1] تفسير الطبري (۸/ ۴۵۰) [2] تفسير الطبري (۸/ ۱۰۱) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۹۷۰) اس کی سند حسن ہے۔
[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۳۷) اس کی سند میں ''ثویر بن ابی فاختہ'' ضعیف راوی ہے۔ [4] فتح البيان (۳/ ۱۴۱۔ ۱۴۴)

نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هٰٓؤُلَآءِ أَهْدٰى مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا سَبِيلًا ﴿۵۱﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۖ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيرًا ﴿۵۲﴾

(اے نبی!) کیا آپ نے انھیں نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی خود بیان کرتے ہیں، بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور لوگوں پر کھجور کی گٹھلی کے دھاگے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا 49 دیکھیے! وہ کس طرح اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں اور ان کے گناہ گار ہونے کے لیے یہی کھلا گناہ کافی ہے 50 کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ بتوں اور شیطان پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت والے ہیں؟ 51 وہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے تو اس کے لیے آپ قطعاً کوئی مددگار نہیں پائیں گے 52

یہود کی مذمت:

یہود نے نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کی اور مکہ کے مشرکوں سے متفق ہوئے۔ اُن کی خاطر بتوں کی تعظیم کی اور کہا: تمھاری راہ مسلمانوں سے بہتر ہے اور یہ سب اس بات پر حسد کی وجہ سے تھا کہ نبوت اور ریاست ہمارے سوا کسی اور میں کیوں ہوئی۔ اللہ پاک نے اسی پر اُن کو الزام دیا، ان سب آیتوں میں یہی مذکور ہے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے حق میں اُتری ہے، جب کہ انھوں نے کہا کہ ہم اللہ کے اَبنا اور اَحبا (بیٹے اور پیارے) ہیں اور یہ کہا کہ جنت میں صرف یہود و نصاریٰ جائیں گے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بچوں کو دعا اور نماز میں آگے کرتے، وہ آمین کہتے، اس خیال پر کہ وہ بے گناہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں کسی گناہ گار کو بے گناہ سے پاک نہیں کرتا ہوں۔ یہی امام عکرمہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہود کہتے تھے کہ جو بچے ہمارے مر گئے ہیں، وہ ہمارے لیے قربت کا ذریعہ ہیں، ہماری شفاعت کر کے ہم کو پاک کر دیں گے۔ اُس پر یہ آیت اُتری۔[2] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود کہتے تھے کہ ہمارے لیے گناہ نہیں ہیں، جیسے ہمارے آبا و اجداد کے لیے نہیں تھے۔ اس پر یہ آیت آئی۔[3]

---

(1) تفسیر الطبري (٨/ ٤٥٣_ ٤٥٤)

(2) تفسیر الطبري (٨/ ٤٥٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

(3) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٧٢)

ذاتی مدح سرائی کی ممانعت:

بعض نے کہا کہ اس آیت کا نزول تمادح (ایک دوسرے کی مدح سرائی کرنا) وتزکیہ کے سلسلے میں ہوا ہے۔
سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً صحیحین میں مروی ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم مدح کرنے والوں کے منہ میں خاک جھونکیں۔[1] سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو سنا کہ ایک آدمی کی تعریف کرتا تھا۔ فرمایا: تیری خرابی ہو، تونے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی۔ پھر کہا اگر تم سے کوئی اپنے یار کی مدح کرنا چاہے تو یوں کہے: «أَحْسَبُهُ كَذَا وَكَذَا»[2] (أخرجه الشيخان) ''میرے خیال (گمان) میں وہ ایسا ایسا ہے۔''

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جس نے کہا: میں مومن ہوں، وہ کافر ہے۔ جس نے کہا: میں عالم ہوں، وہ جاہل ہے۔ جس نے کہا: میں جنت میں ہوں، وہ نار میں ہے۔[3] (رواہ أحمد) یعنی آدمی کا اپنی رائے پر پسندیدگی کا اظہار کرنا بڑے ڈر کی بات ہے۔ کبھی کسی ایسی بات کا دعویٰ نہ کرے، جس میں تعریف نکلتی ہو۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: «إِيَّاكُمْ وَالتَّمَادُحَ فَإِنَّهُ الذَّبْحُ»[4] (رواہ أحمد وابن ماجه) ''تمادح (ایک دوسرے کی تعریف کرنے) سے بچو، یہ ذبح ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آدمی اپنے دین کو لے کر صبح کرتا ہے۔ پھر جب واپس لوٹتا ہے تو اس کے ساتھ کچھ دین نہیں ہوتا، کسی شخص سے ملاقات کرتا ہے، جو اس کے نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوتا، اس سے کہتا ہے: واللہ تو ایسا ہے، ویسا ہے، شاید کہ وہ جب واپس ہوتا ہے تو اس کی کوئی حاجت بھی برآمد نہیں ہوتی، حالاں کہ اس نے اللہ کو ناراض کر دیا ہے، پھر یہ آیت پڑھی۔[5] اسی لیے اللہ نے کہا کہ تزکیے کا مرجع اللہ کی طرف ہے، اُس کو امور کی حقیقتیں اور گہرائیاں بہ خوبی معلوم ہیں، ایک دھاگے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، عطا، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے سلف نے کہا ہے کہ کھجور کی گٹھلی پر جو چھلکا ہوتا ہے، اسے فتیل کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: «هُوَ مَا فَتَلْتَ مِنْ أَصَابِعَكَ»[6] [یہ وہ ہے جسے تو اپنی انگلیوں سے بٹے] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں قول

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۰۰۲)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۱۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۰۰۰)

[3] مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ان الفاظ کو امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦٦٩) نیز اس کی سند میں انقطاع ہے۔ نعیم بن ابی ہند رحمہ اللہ کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[4] مسند أحمد (٤/ ٩٢) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۳۷٤۳) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۱۱۹٦)

[5] تفسیر الطبري (۸/ ٤٥٥) [6] تفسیر الطبري (۸/ ٤٥٧۔ ٤٥٩)

ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا: ان کی افترا بندی کو تو دیکھ کہ کس طرح اپنے تزکیۂ نفوس کا دعویٰ کرتے ہیں، اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور پیارے سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں: ﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ [البقرة: ٨٠] ''آگ ہمیں گنتی کے چند دنوں کے سوا ہرگز نہیں چھوئے گی۔''

اپنے آبائے صلحا کے اعمالِ صالحہ پر بھروسا کر کے بیٹھے ہیں، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ آباء کے اعمال بیٹوں کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ﴾ [البقرة: ١٣٤] ''یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اسی کے لیے ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے ہے، جو تم نے کمایا۔'' پھر فرمایا کہ ان کی یہ خصلت ان کے کذب و افترا سے ظاہر ہے۔

جِبت اور طاغوت کا مفہوم:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جِبت جادو ہے اور طاغوت شیطان ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو العالیہ، عکرمہ، سعید بن جبیر، شعبی، حسن، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے، انھوں نے جبت کا ترجمہ شیطان بھی کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ حبشہ کی زبان میں جبت شیطان کو کہتے ہیں۔ پھر کہا کہ جبت بمعنی شرک ہے۔ پھر کہا: بمعنی اَصنام ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ کاہن کے معنی میں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جبت سے مراد حیی بن اخطب ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کعب بن اشرف ہے۔[1] امام جوہری رحمہ اللہ نے صحاح میں کہا کہ جبت ایک کلمہ ہے، جو صنم، کاہن و ساحر اور اس جیسوں پر بولا جاتا ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ طِیَرہ و عِیافہ و طرق جبت ہیں۔ پھر کہا کہ یہ کلمہ محض عربی نہیں ہے، کیوں کہ اس میں ج اور ت ایک کلمے میں اکٹھے بغیر حرف ذی لفی کے آیا ہے۔[2]

حدیثِ مذکور کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ عوف رحمہ اللہ نے کہا کہ عِیافت زجر طِیر (پرندوں کو ڈانٹنا) ہے، طرق زمین میں خط کھینچنا ہے۔[3] حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبت شیطان ہے۔ طاغوت کے معنی پہلے سورت بقرہ میں گزر چکے ہیں۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ طواغیت وہ ہیں، جن پر شیطان اترتے ہیں۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طاغوت انسان کی صورت میں شیطان ہے، جس کی طرف تحاکم کریں (فیصلہ کرانے کے لیے رجوع کریں) اور وہ صاحبِ امر ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو اللہ کے سوا معبود ہو، وہ طاغوت ہے۔[5]

پھر فرمایا کہ وہ کافروں کو مسلمانوں پر فضیلت دیتے ہیں، جہالت، دین کی کمزوری اور تورات کے ساتھ کفر کی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٧٤۔ ٩٧٥) [2] الصحاح (٢/ ٢٦٧) [3] مسند أحمد (٥/ ٦٠)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٧٦) اس کی سند حسن ہے۔ [5] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٧٦)

وجہ سے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف اہلِ مکہ کے پاس آئے، مکہ والوں نے کہا: تم اہلِ کتاب اور اہلِ علم ہو، ہمیں ہمارے اور محمد (ﷺ) کے حال کی خبر دو۔ انھوں نے کہا: تم کیا ہو اور محمد (ﷺ) کیا ہیں؟ کہا: ہم صلہ رحمی کرتے ہیں، اونٹ کی قربانی کرتے ہیں، پانی میں دودھ ملا کر پیتے ہیں، قیدی کو چھوڑتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں، محمد صُنبور (جس کی اولاد نہ ہو) انھوں نے ہمارے ارحام کو قطع کر دیا، قبیلہ غفار کے حاجیوں میں جو چور اُچکے ہیں، وہ اس کے تابع ہو گئے ہیں۔ تو کیا ہم بہتر ہیں یا وہ بہتر ہیں؟ انھوں نے کہا: "أَنْتُمْ خَيْرٌ وَّ أَهْدٰى سَبِيلًا" "تم بہتر اور زیادہ صحیح راہ پر ہو۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[1] (رواه ابن أبي حاتم) یہ اثر کئی طرح سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سلف کی ایک جماعت سے بھی مروی ہے۔ یہ گفت و شنید معرکۂ احزاب میں ہوئی تھی۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب سے یہود مراد ہیں۔ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتے تھے۔ تزکیہ تطہیر و تنزیہ (پاک کرنا اور بری چیزوں کو دور کرنا) کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہر مُزکّی کو شامل ہے، خواہ وہ حق کے ساتھ تزکیہ کرے یا باطل کے ساتھ۔ لہٰذا جو کوئی اپنی جان کا ذکر اصلاح یا عمل کی پاکیزگی یا تقویٰ اور اطاعت کی زیادتی یا اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی زیادہ کوشش کے ساتھ کرتا ہے، وہ اگر اس قسم کے لقب اختیار کرے تو وہ تزکیہ میں شامل ہے، جیسے: محی الدین، عز الدین، سلطان العارفین و ملک العلما، بحر العلوم، قاضی القضاۃ اور اس طرح کے دوسرے القاب، کیوں کہ ان چیزوں کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اللہ ہی کو خبر ہے کہ کون مُزکّی ہے، کون نہیں ہے۔ اس آیت جیسی یہ آیت ہے: ﴿ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ [النجم: ٣٢] "لہٰذا تم اپنے آپ کی پاکی بیان نہ کرو، وہ اسے (بھی) خوب جانتا ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔"

فتیل سے مراد حقیر شے ہے۔ ﴿ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴾ [النساء: ١٢٤] "اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔" مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو اپنی مدح و تعریف کیا کرتے ہیں، ان کو اس گناہ کے اندازے کے مطابق سزا ملے گی اور بال برابر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ کہتے ہیں کہ جبت اور طاغوت قریش میں دو بت تھے۔ یہود نے قریش کو خوش کرنے کے لیے ان کو سجدہ کیا اور اُن سے کہا کہ تم مسلمانوں سے بہتر ہو۔ اللہ نے ان پر لعنت کی اور فرمایا: جس کو اللہ لعنت کرتا ہے، اس کا کوئی مددگار نہیں کہ اللہ کے عذاب کو اُس سے دور کر سکے۔[3]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٧٤) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٧٠۔ ٦٧١)

[3] فتح البیان (٣/ ١٤٤۔ ١٤٧)

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ
نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ
فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ
مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ
مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

کیا (وہ سمجھتے ہیں کہ) انھیں بادشاہی کا کچھ حصہ ملا ہے؟ پھر تو وہ اس میں سے لوگوں کو تل برابر بھی نہیں دیں گے (53) کیا وہ اس پر لوگوں سے حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے؟ چناں چہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور بہت بڑی بادشاہی دی (54) تو ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لائے اور بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لانے سے باز رہے، اور ان کے لیے دہکتا جہنم ہی کافی ہے (55)

یہود کی بخیلی اور حسد:

یعنی ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کے گھر میں بزرگی دی ہے۔ اب بھی اُسی کے گھر میں ہے، جو قبول نہ کرے، وہ بے انصاف ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ استفہام، کہ ان کا ملک میں کیا حصہ ہے، انکاری ہے۔ پھر ان کے بخل کا ذکر کیا، اگر ملک میں ان کا حصہ ہوتو وہ کسی کوخصوصاً محمد ﷺ کو تل کے برابر بھی کچھ نہ دیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”اَلنَّقِيْرُ هُوَ النُّقْطَةُ الَّتِيْ فِي النَّوَاةِ“ (1) ”گھٹلی کا گڑھا۔“ اسی آیت کی طرح وہ آیت ہے: ﴿ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۰] ”کہہ دیجیے: اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس وقت تم انھیں خرچ ہو جانے کے ڈر سے ضرور روک لیتے۔“ یعنی اگر اللہ کی رحمت کا خزانہ تمھارے ہاتھ میں ہوتا تو تم خرچ ہوجانے کے ڈر سے اس کو روک رکھتے، حالاں کہ اس کے کم ہوجانے کا تصور نہیں کیا جا سکتا یہ تو تمھارا بخل ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ ﴿ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۰] ”اور انسان نہایت ہی بخیل ہے۔“ یعنی آدمی بخیل ہے۔

پھر ان کے حسد کا ذکر کیا کہ اللہ نے جو نبوت اور عظمت نبی کریم ﷺ کو دی ہے، اُس پر وہ حسد کرتے ہیں۔ یہی حسد ان کو رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے سے مانع ہے، کیوں کہ وہ عرب سے مبعوث ہوئے ہیں، بنی اسرائیل میں سے نہیں ہوئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس جگہ ناس سے مراد ہم ہیں اور لوگ نہیں۔ (2)

(1) تفسير الطبري (٨/ ٤٧٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٧٧) اس کی سند حسن ہے۔
(2) المعجم الكبير (١١/ ١٤٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وفيه يحيیٰ الحماني وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ٧/ ٦٢)

اسباطِ بنی اسرائیل ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھی، اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبوت بخشی، ان پر کتاب اُتاری، حکمت دی، ان کو بادشاہ بنایا، ان میں سے کسی نے اس انعام کو تسلیم کیا، کسی نے نہ مانا، بلکہ کفر کیا اور منہ موڑا، لوگوں کو روکا، حالاں کہ وہ انبیا اور بادشاہ انھی بنی اسرائیل میں سے تھے۔ پھر جب اُن سے اختلاف کیا تو تم اے محمد! بنی اسرائیل میں سے نہیں ہو، تم سے کیوں حسد نہ کریں گے؟

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن میں سے بعض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور بعض رکے رہے۔[1] لہٰذا ان میں جو لوگ کافر ہیں، وہ تیری تکذیب میں سخت تر ہیں اور اس ہدایت اور حق سے، جو تو ان کے پاس لایا ہے، بہت دور ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ وعید سنائی کہ ان کو آگ کی سزا ان کے کفر و عناد اور اللہ کی کتابوں اور رسولوں کی مخالفت کے لیے کافی ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس جگہ حسد کرنے والوں سے مراد یہود ہیں، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد کرتے تھے۔ اس عام سے خاص مراد ہے۔ ناس کا لفظ اس لیے بولا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ تمام خصالِ حمیدہ تھیں، جو سب لوگوں میں متفرق پائی جاتی ہیں۔ ؏

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

''جو خوبیاں سب حسینوں (نبیوں) میں پائی جاتی ہیں، آپ اکیلے ان تمام خوبیوں کے مالک ہیں۔''

فضل سے مراد نبوت و نصرت اور دشمنوں پر غلبہ ہے یا عورتوں کا حلال ہونا کہ نو بیویاں تھیں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ پھر یہود کو ان کے مسلّمات سے الزامی جواب دیا، یعنی کیا اس فضل کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دینا تمھارے لیے حسد اور تعجب کا باعث ہے کہ جس سے تم کو حسد کرنا جائز ہو؟ کیا ہم نے آلِ ابراہیم کو، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلاف اور چچا زاد تھے، ان کو سلطنت اور کتاب و حکمت نہیں دی تھی، جو ان کو انوکھی دی ہے؟ یعنی یہ فضیلت تو ان کا خاندانی شرف ہے، جو نسل در نسل اور دادا سے باپ کی طرف منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ تمھارا حسد ناحق اور ناجائز ہے۔

آلِ ابراہیم میں ایک جماعت گزری ہے، جو بادشاہت اور نبوت کی حامل تھی، جیسے داود اور سلیمان علیہما السلام، ان کو اس عظیم بادشاہت نے امرِ نبوت سے مشغول نہ کیا۔ جس نے فضل کی تفسیر زیادہ عورتوں سے کی ہے، اس نے کہا ہے کہ داود اور سلیمان علیہما السلام کے حق میں ملکِ عظیم کثرتِ نسواں تھا، کیوں کہ داود علیہ السلام کے پاس سو عورتیں اور سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک ہزار عورتیں تھیں، تین سو آزاد اور سات سو لونڈیاں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو نو بیویاں تھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد سلطنتِ سلیمان علیہ السلام ہے، اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٤٨٢) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٦٧١ـ ٦٧٢)

[3] تفسير الطبري (٨/ ٤٨٢) فتح البيان (٣/ ١٤٩ـ ١٥٠)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم جلد انھیں آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کی جگہ دوسری کھالیں چڑھا دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بلاشبہ اللہ بہت زبردست، بڑی حکمت والا ہے (56) اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے انھیں ہم جلد ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، وہاں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم انھیں گھنی چھاؤں میں داخل کریں گے (57)

کفر کی سزا اور عذاب سے جسم فنا نہیں ہوگا:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ ہم کافروں کو جہنم میں اس طرح سزا دیں گے کہ دوزخ کی آگ ان کے سارے جسم اور اجزا کو گھیر لے گی، یہ سزا اور عذاب ان کے لیے دائمی ہوگا۔ بدن کا ایک چمڑا اگر پک گیا، گل گیا، گر پڑا تو اس کے بدلے دوسرا چمڑا دیں گے، تاکہ عذاب کو چکھتے رہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب ان کی کھال جل جائے گی، تو دوسری کھال کاغذ کی طرح سفید بدل دیں گے۔[1] یحییٰ حضرمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ کافر کو سو کھال دیں گے۔ ہر کھال کے بیچ میں ایک نیا عذاب ہوگا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر دن میں ستر ہزار بار کھال پکے گی اور بدلی جائے گی۔[2] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ ایک ساعت میں سو بار تبدیل کی جائے گی۔[3] (رواه ابن مردويه والطبراني بسند ضعيف و البغوي بغير سند)

کعب رحمہ اللہ سے دوسری روایت میں ایک سو بیس بار آیا ہے۔[4] ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتاب اول میں لکھا ہے کہ کافر کی کھال چالیس گز تا چھہتر گز موٹی ہوگی، پیٹ اتنا بڑا ہوگا کہ اگر اس میں ایک پہاڑ کو رکھ دیں تو

---

(1) تفسير الطبري (٨/ ٤٨٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٨٢) اس کی سند میں ''ثویر بن ابی فاختہ'' ضعیف راوی ہے۔

(2) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٨٣)

(3) المعجم الأوسط (٥/ ٧) تفسير البغوي (٢/ ٢٣٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه نافع مولىٰ يوسف السلمي وهو ضعيف"، (مجمع الزوائد: ٧/ ٦٢)

(4) حلية الأولياء (٥/ ٣٧٥) اس کی سند میں ''نافع ابو ہرمز'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٨٩٩)

سما جائے، پھر جب آگ اُس جلد کو کھالے گی تو دوسری جلد بدل دیں گے۔[1] حدیث میں اس سے بھی زیادہ آیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ دوزخی دوزخ میں اتنے بڑے ہو جائیں گے کہ کان کی لَو سے کندھے تک سات سو برس کا راستہ ہوگا، کھال کا موٹاپا ستر گز ہوگا، دانت اُحد پہاڑ کی مثل ہوں گے۔[2] (تفرد به أحمد من هذا الوجه)

کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق ﴿سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ﴾ [إبراهيم: ٥٠] ''ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔'' جلود سے مراد ''سَرَابِيل'' ہیں، لیکن اس جگہ حقیقی معنی ترک کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔ اگرچہ جلود کا سرابیل پر اطلاق مجازاً جائز ہے۔ اسی لیے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قول کو ضعیف اور خلافِ ظاہر کیا ہے۔[3] ''عَيَاذًا بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ وَمِنْ أَهْلِهَا'' ''جہنم اور جہنمیوں سے اللہ کی پناہ!''

نیک لوگوں کا ثواب:

پھر اللہ تعالیٰ نے نیک لوگوں کا ذکر کیا کہ وہ جنت میں جائیں گے، جس کے ہر طرف اِدھر اُدھر نہریں جاری ہوں گی۔ جہاں چاہیں گے، وہاں وہ نہر بہے گی۔ وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ وہاں سے ہل کر کہیں نہیں جائیں گے نہ جانا چاہیں گے، وہاں بیویاں حیض، نفاس اور اس جیسی آلودگیوں نیز اخلاقِ رذیلہ اور صفاتِ ناقصہ سے پاک صاف ستھری ہوں گی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پلیدی اور اَذیٰ سے مطہر ہوں گی۔ یہی امام عطا، حسن، ضحاک، نخعی، ابو صالح، عطیہ اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بول و براز، حیض، نخام (بلغم)، تھوک، منی اور جننے سے پاک ہوں گی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اَذیٰ، گناہ اور چھائیوں سے۔[4] ظل ظلیل سے مراد گہرا سایہ ہے جو بہت عجیب ہو۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جنت میں ایک درخت ہے، جس کے سائے کے اندر سوار سو برس تک چلے تو پھر بھی اس کو قطع نہ کر سکے۔ وہ شجرۃ الخلد ہے۔[5] (رواه ابن جرير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کھال کی تبدیلی میں یہ نکتہ ہے کہ جلی ہوئی جلد میں احساس کم ہوتا ہے، جب جلی ہوئی کے

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٤٨٥)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٦) اس کی سند میں ''ابو یحییٰ قتات'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣٢٣) البتہ اس موضوع میں دیگر روایات صحیح ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥١۔ ٢٨٥٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧٨) مسند أحمد (٦/ ١١٦) اس کے علاوہ اور بھی صحیح روایات مروی ہیں۔

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٦٧٣) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٨٤)

[5] تفسير الطبري (٨/ ٤٨٩) اس کی سند میں ''ابو الضحاک'' راوی متفرد ہے۔ صحیحین میں ((شجرة الخلد)) کے الفاظ کے بغیر مروی ہے۔ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٧٩۔ ٣٠٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٦)

عوض بغیر جلی کھال دی گئی تو یہ اس شخص کے عذاب کی تکلیف میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ پہلی جلد ہی کو لوٹانا ہے، لیکن آیت میں تبدیل کرنے کے معنی اس مفہوم سے انکار کرتے ہیں۔ ذوقِ عذاب سے مراد عذاب کا ہمیشہ رہنا ہے، جو کبھی منقطع نہ ہو۔ خلود سے مراد، بغیر انتہا اور بلا انقطاع ہے نہ کہ وہاں قیام کی لمبائی۔ ظل ظلیل وہ سایہ ہے، جس میں گرمی اور لو نہ ہو یا درختوں اور محلوں کے سایوں کا اکٹھا ہونا یا نہ زائل ہونے والا اور ہمیشہ رہنے والا سایہ ہے۔ لفظ موصوف سے صفت کا نکالنا مبالغے کے لیے ہوا کرتا ہے، جیسے لیل الیل (گہری رات)۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سایۂ عرش ہے، جس کو زوال نہیں ہے[1] یا سایۂ جنت۔ پہلا مطلب زیادہ صحیح ہے۔[2]

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو واپس کر دو، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، بے شک اللہ تمھیں بہت ہی اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ﴿58﴾

امانت ادا کرنے اور عادلانہ فیصلہ کرنے کا حکم:

یعنی امانت میں خیانت نہ کرو اور فیصلے میں کسی کی خاطر داری نہ کرو، خواہ رشوت کے لیے خواہ کسی اور کام کے لیے۔ یہ عادتیں یہود میں بہت تھیں، اسی لیے بعض کچے مسلمان فیصلہ کروانے کے لیے نبی اکرم ﷺ کے پاس نہ آتے کہ یہ کسی کا پاس لحاظ نہیں رکھیں گے، یہود کے عالموں کے پاس جاتے کہ وہ لحاظ کریں گے۔ آگے مسلمانوں کو اس بات کا پابند فرمایا کہ جب تک ہر قضیے میں اور ہر حکم میں رسول اللہ ﷺ ہی کی طرف رجوع نہ کرو اور دل سے اُس کے حکم پر راضی نہ ہو، تب تک تم ایمان دار نہیں۔

اللہ پاک نے حکم دیا کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو۔ سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حسن حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تو امانت اسے ادا کر، جس نے وہ تجھ کو دی ہے۔ اس کی خیانت نہ کر، جس نے تیری خیانت کی ہے۔[3] (رواه أحمد و أهل السنن) یہ اللہ کے حقوق جو بندوں پر واجب ہیں، ان تمام پر شامل ہیں، جیسے نماز، زکات،

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٨٥) [2] فتح البیان (٣/ ١٥١۔ ١٥٢)

[3] ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے مسند احمد میں یوسف بن ماھک اور اہل السنن کے نزدیک سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد (٣/ ٤١٤) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٥٣٥) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٢٦٤) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٤٢٣)

روزہ، نذروں کا کفارہ وغیرہ جن پر انسان امانت دار ہوتا ہے۔ بندوں کو اس پر اطلاع نہیں ہے اور حقوقِ عباد جو بعض کے بعض پر ہیں، جیسے ودائع (ودیعت کی ہوئی چیزیں) جن میں بعض نے بعض پر امانت کا یقین کیا ہے اور اس پر کوئی گواہ وغیرہ نہیں ہے۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم امانتوں کو ادا کرو، جو کوئی دنیا میں ایسا نہیں کرے گا، اس سے قیامت کے دن وہ امانت لی جائے گی۔ جس طرح صحیح حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ چاہیے کہ حقوق اہلِ حقوق کو دے دو۔ سینگ کی بکری کا قصاص سینگ والی سے لیا جائے گا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ شہادت ہر گناہ کا کفارہ ہے، سوائے امانت کے۔ آدمی قیامت کے دن لایا جائے گا، اگرچہ اللہ کی راہ میں مارا گیا ہے، اس سے کہا جائے گا، امانت ادا کر جو تیرے پاس ہے۔ وہ کہے گا: کہاں سے دوں، دنیا تو چلی گئی؟ امانت کو شکل دے کر اس کو جہنم کے گڑھے میں ڈال دیں گے، وہ اس کو اپنے کندھے پر لادے گا، وہ اس کے کندھے سے گر جائے گی، وہ بھی اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ نیچے کو دھنستا چلا جائے گا۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ آیت نیک اور بد کے حق میں مبہم ہے۔[3] محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے کہا: دونوں کے لیے عام ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: امانت وہ ہے جس کا حکم ہے اور جس سے منع کیا گیا ہے۔[4] ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ من جملہ امانات کے ایک یہ ہے کہ عورت اپنی شرمگاہ پر مؤتمن ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس میں حاکم کا (عید کے دن) عورتوں کو وعظ کرنا شامل ہے۔[6] بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت سیدنا عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ کے حق میں اُتری ہے۔

ابو طلحہ کا نام عبداللہ بن عبدالعزی بن عثمان بن عبدالدار بن قصی بن کلاب قرشی عبدری تھا، وہ حاجب یعنی دربانِ کعبۂ معظمہ تھے، شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کے چچا زاد ہیں، جن کی نسل میں آج تک کعبۂ مکرمہ کی حجابت (دربانی) چلی آتی ہے۔ سیدنا عثمان مذکور اور خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم صلح حدیبیہ و فتح مکہ کے درمیان اسلام لائے تھے اور ان کے چچا عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ احد کے دن مشرکین کے جھنڈے کو اُٹھائے ہوئے تھے، کفر کی حالت میں مارے گئے، اس نسب پر ہم نے اس لیے آگاہ کیا ہے کہ اکثر مفسرین کو ایک کا دوسرے پر شبہہ ہو گیا ہے۔

شانِ نزول:

اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے دن کعبہ کی کنجی لے لی تو لے کر پھر

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۸۲) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۸۵) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۸۵) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۸۵) [5] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۸۶) اس کی سند صحیح ہے۔

[6] تفسیر الطبري (۸/ ۴۹۱) تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۸۶) اس کی سند حسن ہے۔

انہی کو واپس کر دی۔ محمد بن اسحاق نے غزوۂ فتح میں صفیہ بنت شیبہ سے روایت کیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ مکہ میں آئے اور لوگ مطمئن ہو گئے تو آپ ﷺ خانہ کعبہ میں تشریف لائے، سواری پر سات بار طواف کیا، سرکج کی ایک چھڑی، جو آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھی، اس سے استلام فرمایا (حجرِ اسود کو چھوا) جب طواف کر چکے، عثمان بن طلحہ کو بلا کر کعبے کی کنجی اُن سے لے کر کعبہ کا دروازہ کھلوایا، اندر گئے، وہاں کثیر تعداد میں بتوں کو پایا، اپنے ہاتھ سے ان کو توڑ کر پھینک دیا، پھر کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے، لوگ مسجد میں آپ کے لیے ٹھہرے تھے، بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کعبے کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ کہا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، صَدَقَ وَعْدَهٗ، وَنَصَرَ عَبْدَهٗ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ، أَلَا كُلُّ مَاثُرَةٍ وَدَمٍ أَوْ مَالٍ يُّدْعٰى فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ إِلَّا سِدَانَةَ الْبَيْتِ وسِقَايَةَ الْحَاجِّ» (الحديث) ”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو اکیلا اور لاشریک ہے، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی نصرت کی، تمام لشکروں کو ہزیمت دی۔ یاد رہے (جاہلیت کی) ہر یاد، خون یا مال جس کا دعویٰ کیا جائے، وہ میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہے، صرف بیت اللہ کی خدمت اور حاجیوں کو پانی پلانا باقی ہے۔“

پھر نبی اکرم ﷺ مسجد میں بیٹھے، سیدنا علی بن ابی طالب کعبہ کی کنجی لے کر سامنے کھڑے ہوئے، کہا: اے اللہ کے رسول! ”اِجْمَعْ لَنَا الْحِجَابَةَ مَعَ السِّقَايَةِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ“ ”سقایت (حاجیوں کو پانی پلانا) کے ساتھ حجابت (بیت اللہ کی کلید برداری) بھی ہمیں عطا کر دیں۔“ نبی اکرم ﷺ نے کہا: عثمان بن طلحہ کہاں ہے۔ فرمایا: اے عثمان! لے اپنی کنجی، آج کا دن وفا اور بِرّ (نیکی کرنے) کا دن ہے۔[1]

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عثمان بن طلحہ کے حق میں اُتری ہے۔ اُن سے کعبے کی کنجی لے لی تھی، پھر فتح کے دن رسول اللہ ﷺ خانۂ کعبہ میں داخل ہو کر باہر آئے، یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اور عثمان کو بلا کر وہ کنجی اسے سونپ دی۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب نبی اکرم ﷺ کعبے سے باہر نکلے، یہ آیت پڑھی، میرے ماں باپ اُن پر فدا، اس سے پہلے میں نے کبھی ان کو اس آیت کو پڑھتے نہیں سنا تھا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی کریم ﷺ جب کعبے کے اندر گئے، وہاں ابراہیم علیہ السلام کی تصویر دیکھی، ان کے ہمراہ قداح تھے، یعنی پانسے، فرمایا ان مشرکوں کو کیا ہوا ہے، اللہ ان کو قتل کرے! کہاں ابراہیم علیہ السلام اور کہاں یہ پانسے؟! پھر پانی کا ایک طشت منگوا کر ان تمام تصویروں کو اپنے ہاتھوں سے مٹا دیا اور مقامِ ابراہیم کو جو کعبے کے اندر تھا، باہر نکال کر کعبے کی دیوار سے چپکا دیا، کہا: اے لوگو! قبلہ یہ ہے، پھر باہر آ کر طوافِ بیت کیا، ایک چکر، دو چکر،

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٥/ ٧٣، ٧٤)

[2] تفسير الطبري (٨/ ٤٩١۔ ٤٩٢) یہ روایت معضل ہے۔ نیز سند میں ”حسین بن داود“ ضعیف راوی ہے۔

پھر جبریل علیہ السلام آئے، امانت ادا کرنے کا حکم لائے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشہور یہی ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں اُتری ہے۔ خواہ اس بارے میں اُتری ہو یا نہ، اس کا حکم عام ہے۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''هِيَ أَمْرُهُ لِكُلِّ أَحَدٍ''یعنی یہ حکم ہر ایک کے لیے ہے۔[1]

پھر اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ لوگوں میں انصاف سے فیصلے کرو۔ محمد بن کعب و زید بن اسلم و شہر بن حوشب رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت امراء کے حق میں آئی ہے، جو لوگوں کے درمیان حکمرانی کیا کرتے ہیں۔[2] حدیث میں مروی ہے کہ اللہ قاضی (حاکم) کے ساتھ ہے، جب تک وہ ظلم نہ کرے۔ جب وہ ظلم و جَور کرتا ہے تو وہ اس کو اس کی جان کے سپرد کر دیتا ہے۔[3] اثر میں آیا ہے کہ ایک دن کا عدل چالیس سال کی عبادت کے برابر ہے۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سَمِيْعًا بَصِيْرًا'' پڑھ کر فرمایا: «بِكُلِّ شَيْئٍ بَصِيْرٌ»[4] (رواه ابن أبي حاتم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت ادائے امانات اور اُمہات آیات سے ہے، جو بہت سے احکامِ شرع پر مشتمل ہیں، کیوں کہ ظاہر یہ ہے کہ خطاب تمام لوگوں کو شامل ہے اور تمام امانتوں کے بارے میں ہے۔ یہ خاص حکمرانوں کے لیے نہیں ہے۔ کسی آیت کا کسی خاص سبب کے لیے آنا اس کی عمومیت کے منافی نہیں ہوتا، کیوں کہ عبرت اور نصیحت لفظ کے عموم کے ساتھ ہے نہ کہ خصوصیت سبب کے ساتھ، جس طرح اصول میں مقرر ہو چکا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ اولوا الامر (حکام) اس خطاب میں بدرجہ اولیٰ داخل ہیں۔ ان پر امانتوں کا ادا کرنا، شکووں کا ازالہ کرنا اور عدل و انصاف کا اہتمام کرنا واجب ہے۔

اسی طرح سارے لوگ اس خطاب میں شامل ہیں۔ اُن پر بھی واجب ہے کہ جس کی امانت اور ودیعت ان کے پاس ہو، اُس کو ادا کریں۔ شہادت اور اخبار میں چھان بین کریں اور عدل و انصاف بجا لائیں۔ جمہور مفسرین کا مختار یہی ہے کہ یہ خطاب عام ہے۔ اسی طرف سیدنا براء بن عازب، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم بھی گئے ہیں۔ سب کا اجماع ہے کہ امانت لوٹانی چاہیے خواہ وہ امانت کسی نیک آدمی کی ہو یا کسی بدکار شخص کی۔[5] (قاله ابن المنذر)

صحیح میں مروی ہے کہ جس نے امانت میں خیانت کی اُس میں نفاق کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے۔[6] پھر عدل کا حکم فرمایا، یعنی جھگڑوں کے فیصلے اور لوگوں کو احکام دیتے وقت کتاب و سنت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، صرف

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٦٧٤، ٦٧٥) [2] تفسير الطبري (٨/ ٤٩٠) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٨٦)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨٢٦)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٨٧) اس کی سند میں ''عبداللہ بن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

[5] فتح القدير (١/ ٧٦٧) [6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨)

رائے سے فیصلے نہ کیے جائیں، کیوں کہ اس کی اجازت نہیں ہے، مگر صرف اسی وقت جب قرآن و حدیث میں اس کے بارے میں حکم نہ ملے۔ کیوں کہ عالم بالکتاب والسنہ حاکم کا اجتہاد اس وقت "لا بأس به" (اس میں کچھ حرج نہیں) ہوتا ہے جب صریح حکم موجود نہ ہو اور حاکم یہ جانتا پہچانتا ہو کہ کونسی بات حق کے زیادہ قریب ہے اور جو حاکم اس بات کو نہیں جانتا، وہ عدل کو کیا خاک سمجھے گا۔ وہ حجت کو تو سمجھتا ہی نہیں، اللہ کے بندوں میں کیا انصاف کرے گا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ امام پر حق ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور امانت کو ادا کرے، جب وہ ایسا کرے گا تو لوگوں پر حق ہے کہ اُس کی بات سنیں، اس کی اطاعت کریں، اس کا حکم مانیں اور اس کی بات کا جواب دیں۔[1]

اصل عدل یہ ہے کہ اشیا میں برابری رکھے، جو امر ظلم اور زیادتی سے خالی ہے، اس کا نام عدل ہوتا ہے۔ دو جھگڑنے والوں میں پانچ امور میں انصاف ہونا چاہیے۔ ایک داخل ہونے میں، دوسرے سامنے بیٹھنے میں، تیسرے متوجہ ہونے میں، چوتھے ان کی بات توجہ سے سننے میں، پانچویں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے میں اور نفع اور نقصان کے معاملے میں۔ حاکم پر واجب ہے کہ مدعی کا حق اس کے دعوے کے ثابت ہو جانے پر مدعا علیہ سے دلوائے۔ فیصلے سے یہی مقصود رکھے کہ حق دار کو حق پہنچ جائے۔ کسی دوسری غرض کو نزدیک نہ آنے دے۔ عادل حکمرانوں کی فضیلت میں بہت حدیثیں آئی ہیں۔ اللہ نے جو یہ نصیحت کی ہے بہت اچھی ہے، یعنی دو حکم فرمائے: ایک امانتوں کو ان کے مالکان کے سپرد کرنا، دوسرے انصاف کے ساتھ کتاب و سنت کے موافق فیصلہ کرنا۔ فیصلہ خالص رائے یا محض عقل سے، اَحبار اور رہبان کی تقلید کرتے ہوئے کسی صاف حجت اور روشن دلیل کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تمھارے حکم کو سنتا اور ادائے امانت کو دیکھتا ہے۔[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٥٩﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے (59)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور معروف میں امیر کی اطاعت:

اختیار والے بادشاہ اور قاضی اور جو کسی کام پر مقرر ہو، اُس کے حکم پر چلنا ضروری ہے، جب تک کہ وہ اللہ اور

[1] تفسیر الطبري (٨/ ٤٩٠) [2] فتح البیان (٣/ ١٥٢۔ ١٥٤)

رسول کے خلاف حکم نہ دے۔ اگر صریح خلاف چلے تو وہ حکم نہ مانیے۔ اگر دو مسلمان جھگڑتے ہیں۔ ایک نے کہا: چل شرع میں رجوع کریں۔ دوسرے نے کہا: میں شرع نہیں سمجھتا یا مجھے شرع سے غرض نہیں، وہ بے شک کافر ہوا۔ یہ موضح القرآن میں ہے۔

شانِ نزول:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن حذافہ بن قیس بن عدی رضی اللہ عنہ کے حق میں اُتری ہے، جس وقت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک لشکر خرد میں بھیجا تھا۔[1] (هكذا أخرجه بقية الجماعة وقال الترمذي حديث حسن غريب) امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا، اس پر ایک انصاری مرد کو عامل کیا۔ جب وہ لوگ باہر نکلے، وہ مردان سے کسی بات پر خفا ہوگیا اور کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو حکم نہیں دیا ہے کہ تم میری اطاعت کرو۔ کہا: ہاں، کہا: اچھا لکڑی جمع کرو، پھر آگ منگوا کر لکڑیوں کو سُلگایا۔ پھر کہا: تم کو قسم ہے، تم اس آگ میں گھس جاؤ۔ ان میں سے ایک جوان نے کہا کہ تم تو آگ سے بھاگ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گئے ہو، سو تم جلدی نہ کرو، جب تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ ملو۔ اگر وہ تم کو حکم کریں کہ آگ میں داخل ہو تو پھر تم داخل ہوجانا۔ وہ پھر کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، یہ خبر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم آگ میں داخل ہوتے تو پھر کبھی باہر نہ نکلتے۔ «إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ»[2] ''طاعت تو امرِ معروف میں ہوتی ہے'' (نہ کہ فعلِ منکر میں)۔ (أخرجاه في الصحيحين)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ مسلمان مرد پر محبوب و مکروہ بات میں سننا اور اطاعت کرنا ہے، جب تک کہ اللہ اور رسول کی معصیت کا حکم نہ کیا جائے۔ اگر معصیت کا حکم کیا جائے تو پھر نہ سمع ہے نہ طاعت۔[3] (رواه أبو داود والشيخان) سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت پر بیعت کی، ان امور میں جو خوشی والے اور جو مکروہ ہوں، تنگی اور آسانی میں، اور ہم کو اختیار کرنے پر، اور اس بات پر کہ ہم اہلِ امر سے امر کے بارے میں جھگڑا نہ کریں، مگر یہ کہ تم کفرِ بواح دیکھو، یعنی جس میں تمھارے پاس اللہ کی طرف سے صریح دلیل ہو۔[4] (أخرجاه) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سنو اور کہا مانو، اگرچہ تم پر کوئی ایسا امیر مقرر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٢٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٧٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٩٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٠) مسند أحمد (١/ ٨٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٢٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)

کر دیا جائے، جو حبشی ہو اور جس کا سر منقیٰ کے دانے کے برابر ہو، یعنی بہت چھوٹا۔[1] (رواہ البخاري)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ کو میرے خلیل نے وصیت کی کہ میں سنوں اور اطاعت کروں، اگرچہ کوئی حبشی غلام ہو، جس کے اعضا کٹے ہوئے ہوں۔[2] (رواہ مسلم) اُم حصین رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع میں یہ خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ يَقُودُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ، اِسْمَعُوْا لَهٗ وَأَطِيْعُوْا» (رواہ مسلم) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: «عَبْداً حَبْشِيًّا مَجْدُوْعًا»[3] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ عن قریب میرے بعد تمھارے ولی الامر ہوں گے۔ پس چاہیے کہ والی ہو، نیک آدمی اپنی نیکی سے اور فاجر اپنے فجور سے، تم اُن کی سنو اور ہر وہ بات مانو، جو حق کے مطابق ہو، ان کے پیچھے نماز پڑھو، اگر وہ اچھا برتاؤ کریں گے تو اس کا فائدہ تم کو اور ان کو دونوں کو ہوگا اور اگر برائی کریں گے تو تم کو اس کا فائدہ ہے اور انھیں نقصان۔[4] (رواہ ابن جریر)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ بنی اسرائیل کی سیاست انبیا کرتے تھے، جب ایک نبی مرجاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی ہوتا۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ قریب ہے کہ خلیفہ ہوں گے اور بہت ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ ہمیں کیا حکم کرتے ہیں۔ فرمایا: وفا کرو اس کی بیعت کی، جو پہلا ہو۔ ان کا حق ان کو دو۔ بے شک اللہ ان سے ان کی رعیت کے بارے میں پوچھے گا۔[5] (أخرجاه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو کوئی اپنے امیر سے ایسی کوئی شے دیکھے، جسے وہ مکروہ جانتا ہے تو چاہیے کہ صبر کرے، کیوں کہ کوئی شخص اگر جماعت کو ایک بالشت بھی چھوڑتا ہے، پھر اسی حالت میں مرجاتا ہے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے۔[6] (أخرجاه) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جس نے اطاعتِ امیر سے اپنا ہاتھ کھینچا، وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے لیے کوئی حجت نہ ہوگی اور جو کوئی مرا اور اس کے گردن میں بیعت نہیں ہے تو اس کی موت جاہلیت کی سی ہے۔[7] (رواہ مسلم)

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦١)

[2] صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٣٧)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٣٨)

[4] تفسیر الطبري (٨/ ٥٠٢) المعجم الأوسط (٦/ ٢٤٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفیه "عبد الله بن محمد بن یحیی بن عروه" وھو ضعیف جداً" (مجمع الزوائد: ٥/ ٣٩٤)

[5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٦٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٤٢)

[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٧٢٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٤٩) [7] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٥١)

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے طویل حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: «مَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ وَثَمَرَةَ فُؤَادِهِ فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الْآخَرِ»[1] (رواہ مسلم بطولہ) اس بارے میں بہت احادیث مروی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اولی الامر سے اہلِ فقہ و دین مراد ہیں۔[2] امام مجاہد، عطا، حسن اور ابو العالیہ کے الفاظ یہ ہیں کہ مراد علما ہیں۔[3] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ﴾ [المائدة: ٦٣] ''رب والے اور ان کے علما انھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟'' نیز فرمایا: ﴿ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٣، الأنبياء: ٧] ''لہٰذا تم اہلِ ذکر (اہلِ کتاب) سے پوچھ لو، اگر تم علم نہیں رکھتے۔''

صحیح متفق علیہ حدیث میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی، جس نے میرے امیر کی اطاعت کی، اُس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔[4] یہ احکام علما و امرا کی اطاعت کے لیے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تم اطاعت کرو اللہ کی، یعنی اتباع کتاب اللہ کی کرو، اطاعت کرو رسول کی، یعنی سنت پر چلو، اطاعت کرو حکم والوں کی، یعنی اللہ کی فرمانبرداری میں نہ کہ اللہ کی نافرمانی میں، کیوں کہ کسی مخلوق کی اطاعت خالق کی نافرمانی میں نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح صحیح حدیث میں گزر چکا ہے کہ «إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ»[5] عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ»[6]

اختلاف کی صورت میں کتاب و سنت سے رجوع:

امام مجاہد اور کئی ایک سلف رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ''اَلرَّدُّ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ'' سے مراد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی طرف لوٹانا ہے۔[7] یہ اللہ کا حکم ہے کہ جس شے میں لوگ تنازع کریں، خواہ وہ اصلِ دین میں سے ہو یا فروعِ دین میں سے، وہ تنازعہ کتاب و سنت کی طرف پھیرا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [الشوریٰ: ١٠] ''اور (دین کی) جس چیز میں بھی تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔'' لہٰذا جس بات کا کتاب و سنت حکم کریں اور اس کی صحت پر شہادت دیں، وہی بات حق ہے: ﴿ فَمَاذَا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٤) [2] تفسير الطبري (٨/ ٥٠٠) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٨٩) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسير الطبري (٨/ ٥٠١) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٥)
[5] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[6] مسند أحمد (٤/ ٤٢٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ورجال أحمد رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد: ٥/ ٤٠٧)
[7] تفسير الطبري (٨/ ٥٠٤)

بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ﴾ [یونس: ٣٢] ''پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟ پھر تم کدھر پھیرے جاتے ہو؟''

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو تمام جھگڑوں اور جہالتوں کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیرو۔ اپنے جھگڑوں میں انہی دونوں کی طرف رجوع کرو۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جو کوئی تنازعہ کے موقعے پر کتاب وسنت سے فیصلہ نہیں چاہتا اور ان کی طرف رجوع نہیں کرتا، وہ اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں رکھتا۔ پھر فرمایا کہ متنازعہ امور میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف فیصلہ کے لیے رجوع کرنا بہتر اور نیک انجام ہے۔ (قاله السُدي وغير واحد) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہتر جزا ہے۔[1] یہ معنی بھی قریب ہیں۔ یہاں ابن کثیر کا بیان ختم ہوتا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فتح البیان کا بیانِ فاتح یوں ہے کہ جب اللہ نے قاضیوں اور اولی الامر کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں کے درمیان حق وانصاف سے فیصلہ کریں تو اور لوگوں کو بھی یہ حکم دیا کہ وہ ان کے حکم کی اطاعت بجا لائیں۔ اللہ کی اطاعت یہی ہے کہ اُس کے اوامر ونواہی کی بجا آوری کریں۔ رسول کی اطاعت یہی ہے کہ جس بات کا اس نے حکم دیا، وہ کریں اور جس سے منع فرمایا ہے اس سے باز رہیں۔

اولوالامر سے مراد ائمہ وسلاطین وقاضی وامرائے حق وولاتِ عدل ہیں۔ جیسے خلفائے راشدین اور وہ لوگ جو اُن کے مقتدی اور پیروکار تھے اور ہر والی بولایتِ شرعیہ نہ کہ بولایتِ طاغوتیہ، اس لفظ میں داخل ہے، مراد ہر امر ونہی میں ان کی اطاعت ہے، جب تک کہ معصیت نہ ہو، کیوں کہ حدیث میں مروی ہے: «لَا طَاعَةَ لِمَخۡلُوۡقٍ فِيۡ مَعۡصِيَةِ اللّٰهِ»[3] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اولو الامر سے مراد اہلِ قرآن وعلم ہیں۔ امام مالک اور ضحاک رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ مراد اصحابِ محمد ﷺ ہیں۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے مراد اہلِ عقل ورائے ہیں۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فقہا وعلما ہیں، جو لوگوں کو دین کے علوم کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہی امام حسن، مجاہد اور ضحاک رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[5] قابلِ ترجیح پہلا قول ہے، کیوں کہ احادیث میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ائمہ اور ولاۃ کی اطاعت کی جائے، جس میں اللہ اور مسلمین کے لیے مصلحت

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٥٠٦) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٦٧٥۔ ٦٧٨)

[3] مسند أحمد (٥/ ٦٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٩)

[4] تفسير القرطبي (٥/ ٢٥٩۔ ٢٦٠) [5] تفسير البغوي (٢/ ٢٣٩)

ہے۔ پھر جب کتاب وسنت کو چھوڑا جائے تو اطاعت نہیں۔ اطاعت تو اسی جگہ واجب ہے، جہاں حق کے موافق ہے۔ عطاؒ نے کہا ہے کہ اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کتاب وسنت اور اہلِ فقہ وعلم کا اتباع ہے۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مراد سرایا ہیں، یعنی افسرانِ فوج، سپہ سالارانِ لشکر ہیں۔[2] اطاعتِ امراء میں بہت حدیثیں مروی ہیں صحیحین وغیرہما میں۔ مگر وہ اس بات کے ساتھ مقید ہیں کہ وہ اطاعت امرِ معروف میں ہو، اللہ کی معصیت میں نہ ہو۔

اولوالامر کی تفسیر اور تقلید کی مذمت:

اولو الامر کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال دو طرح کے ہیں: ایک یہ کہ امراء مراد ہیں، دوسرا یہ کہ علما مراد ہیں، لیکن دونوں کے مراد ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ مگر اس آیتِ شریفہ میں مقلدین کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے کہ امیر ہو یا عالم اس کی اطاعت اسی وقت تک ہے جب تک اس کا حکم کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے موافق ہے۔ علما نے تو خود یہ ارشاد کیا ہے کہ تقلید نہ کرو۔ ائمہ اربعہ بھی اپنی تقلید سے منع فرما گئے ہیں۔ لہٰذا ان ائمہ کی اطاعت یہی ہے کہ آدمی تقلید چھوڑ دے۔

مانا کہ بعض علما نے تقلید کی طرف اشارہ کیا ہے یا ترغیب دی تو ان کا وہ اشارہ اللہ کی معصیت کی طرف ہوا اور بنصِ رسول اللہ ﷺ ثابت ہو چکا ہے کہ معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ تقلید کی طرف اشارہ، اللہ کی معصیت کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ جو عوام الناس کو تقلید کے ساتھ تمسک کرنے کا ارشاد کرتا ہے، جنھیں حجت کو جاننے کی عقل اور نیکی اور بدی میں تمیز کی معرفت نہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ ان کو کتاب وسنت پر عمل ترک کر دینے کی راہ دکھاتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ ان پر عمل ان علما کے ذریعے سے چاہیے، جن کی تقلید کی جاتی ہے کہ جو کچھ وہ کریں، وہی اُن کے مقلد کریں اور جو وہ نہ کریں، اس کو ان کے مقلد بھی نہ کریں۔ کتاب وسنت کی طرف توجہ نہ ہو، بلکہ تقلید کی برائی یہ ہے کہ امام کی رائے کو قبول کریں، اُس کی روایت کو نہ مانیں، اُس سے کتاب وسنت کا سوال نہ کریں۔ اگر یہ سوال کریں گے تو تقلید سے باہر ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ دلیل کا مطالبہ کرتا ہے تو مقلد نہ رہا۔

امرا کی اطاعت:

جنگ وجدل کی تدابیر میں اور معاشی امور، دینی اور دنیوی بہتریوں کو حاصل کرنے اور مفاسد کو دور کرنے میں امرا کی اطاعت اختیار کرنا کچھ بعید نہیں کہ امرا کی اطاعت ان امور میں مراد ہو، جو شریعت سے نہیں ہیں۔ کیوں کہ اگر امرا کی اطاعت ان امور میں مراد ہوگی، جن کو اللہ و رسول ﷺ نے مشروع فرمایا ہے تو وہ اللہ اور رسول کی اطاعت میں داخل ہے، یہ بھی بعید نہیں کہ امرا کی اطاعت امورِ شرعیہ میں ہو۔ جیسے واجباتِ مخیّرہ اور واجباتِ کفایہ ہیں کہ جب

[1] تفسیر الطبري (۸/ ۴۹۶، ۵۰۰) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۸۸) اس کی سند صحیح ہے۔

وہ کسی واجبِ مخیّر کا حکم کریں یا واجباتِ کفایہ میں کسی شخص کے ذمے پر داخل ہونا واجب کریں تو یہ ایک شرعی امر ہے، اس میں ان کی اطاعت واجب ہے۔

اولوالامر کی جس اطاعت کا حکم اس آیت میں ہے۔ بالجملہ اس سے وہی اطاعت مراد ہے، جو احادیثِ متواترہ میں آئی ہے، جب تک کہ معصیت کا حکم نہ کریں یا شخصِ مذکور کفرِ بواح نہ دیکھے۔ یہ احادیث آیت زیرِ تفسیر کی تفسیر ہیں، تقلید نہیں ہیں، بلکہ ان امراء کی اطاعت میں آئی ہیں، جن پر جہل اور علم کے بعد جنگوں کی تدبیر، لشکروں کی سیاست، بندوں کی بہتری کو حاصل کرنے کی تدابیر میں غالب رہے۔ رہے وہ امور جو محض شرعیہ ہیں، سو کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ ان سے مستغنی ہے۔

مقلدین کے شبہات کے ازالے کے مراجع:

اس آیت کو مقلدین نے علما کی تقلید کی عمدہ دلیل ٹھہرایا تھا، جس کو اس جگہ باطل کر دیا گیا۔ اس طرح کے شبہات ان کے پاس اور بھی ہیں اور وہ دو طرح کے ہیں: ایک کسی آیت یا حدیث سے احبار و رہبان کی تقلید کے ثبوت سے استدلال۔ ان کا جواب ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب "إعلام الموقعین" میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے قولِ مفید میں مفصل دیا ہے۔ دوسرے عقلی دلائل، وہ ہرچند توجہ کے لائق نہیں ہیں، لیکن اُن کا جواب بھی کتاب "أدب الطلب" وغیرہ میں لکھا گیا ہے۔ وللہ الحمد.

تنازع کا مفہوم اور علاج:

منازعت کے معنی ہیں اینچ کھینچ کرنا۔ گویا ہر ایک شخص دو باہم متنازع میں سے دوسرے شخص کی حجت کو کھینچتا ہے۔ اس جگہ تنازع سے مراد اختلاف ہے۔ اختلاف سے مراد مجادلہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ مجتہدین کو مستقل خطاب ہے، اور اولوالامر کو بطورِ التفات، کیوں کہ یہ مراد نہیں ہے کہ اے رعایا! اگر تم اولوالامر مجتہدین سے جھگڑا کرو تو یوں کرو، اس لیے کہ مقلد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجتہد سے اس کے حکم میں اُلجھے۔[1] (قاله أبو السعود)

زیادہ بہتر وہی پہلا قول ہے۔ شَے سے مراد امورِ دین و دنیا ہیں۔ لیکن جب فرمایا کہ اُس شَے کو اللہ اور رسول کی طرف پھیرو تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ متنازع فیہ شے خاص کر امورِ دین میں سے ہے نہ کہ امورِ دنیا سے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب کسی غیر منصوص شَے میں بہ نصِ صحیح امورِ مختلف فیہا کے بارے میں جھگڑا ہو، جیسے وتر کا مستحب ہونا، عاریتاً لی ہوئی چیزوں کی ضمانت وغیرہما، تو اس شَے کو اللہ یعنی اس کی کتاب کی طرف اور رسول ﷺ یعنی رسول ﷺ کی وفات کے بعد ان کی سنتِ مطہرہ کی طرف پھیرو، کیوں کہ حیات میں رد کرنا یہی تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کر لیا جاتا۔

یہ رد الی اللہ والرسول کے معنی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ردّ کے معنی یہ ہیں کہ جس بات کو نہ جانتا ہو، اس کو یوں

---

[1] تفسیر أبي السعود (۲/ ۱۹۳)

کہے: ’’اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ أَعْلَمُ‘‘ مگر یہ ایک ساقط قول اور بارد تفسیر ہے۔ ردّ سے اس جگہ وہی معنی ہیں، جو پہلے کہے گئے یا اس جیسا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ﴾ [النساء: ۸۳] ’’حالاں کہ اگر وہ اسے رسول اور اپنے میں سے کسی ذمے دار حاکم کے حوالے کر دیتے، تو ایسی باتوں کی تہ تک پہنچنے والے اس کی حقیقت جان لیتے۔‘‘

تنازع کا کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹانا فرض و واجب ہے۔ پھر اگر اس کا حکم کتاب اللہ میں مل گیا تو اس سے لے لے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کی سنت میں جستجو کرے، اگر اس میں بھی نہ ملے تو پھر اُس کی راہ یہ ہے کہ اجتہاد کرے اور قرآن و حدیث میں سے حکم کے ملنے کے وقت یا ان دونوں میں سے کسی ایک میں مل جانے کے وقت لوگوں کی آرا کی طرف یا ہما شما کی باتوں کی طرف توجہ نہ کرے، کیوں کہ یہ ہدایت مل جانے کے بعد اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک طرح کی ضد ہے۔

آیت زیرِ تفسیر کے الفاظ: ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ ﴾ اس بات پر دلیل ہیں کہ متنازعین پر یہ لوٹانا حتمی طور پر واجب ہے اور اُس شخص کی شان سے ہے، جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہے۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو شخص اس بات کا اعتقاد نہیں رکھتا کہ کتاب و سنت کی متابعت کا حکم قرآن و احادیثِ نبویہ کے مطابق نہیں ہے، وہ اللہ اور دارِ آخرت پر ایمان بھی نہیں رکھتا۔ پھر فرمایا کہ یہ ردّ الی اللہ والرسول مرجع خیر ہے، جس کا حکم کیا گیا ہے اور بہتر انجام ہے۔

چار اصولِ شریعت کی دلیل:

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ شریعت کے اصول چار ہیں: کتاب و سنت و اجماع و قیاس۔ ان چاروں کا ثبوت اس آیت سے ہوتا ہے، اس ترتیب سے کہ کتاب و سنت کی طرف ان الفاظ سے: ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ اشارہ ہے، اس سے قرآن و حدیث کی اتباع کا وجوب ثابت ہوا۔ ﴿ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ سے یہ نکلتا کہ اجماعِ امت حجت ہے، کیوں کہ اللہ نے اطاعتِ اولی الامر کا حکم بر سبیلِ جزم (پختہ) فرمایا ہے۔ یہ امر اجتماعیت کو پہنچانے والا ہے۔ امرا سے مراد اہلِ حل وعقد ہیں، اس سے قطعاً یہ پایا گیا کہ امت کا اجماع حجت ہے۔ تنازع فی الشیٔ سے یہ نکلا کہ قیاس حجت ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ کتاب و سنت اجماع و قیاس پر مقدم ہیں۔ صرف قیاس کے سبب سے قرآن و حدیث پر عمل چھوڑ دینا جائز نہیں نہ قیاس سے اُن کی تخصیص جائز ہے، خواہ قیاس ظاہر ہو یا پوشیدہ اور خواہ اس سے قبل نص مخصوص ہو یا نہیں۔

لفظِ ﴿ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ کتاب و سنت کی اطاعت کا حکم ہے اور یہ امر مطلق ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن و حدیث کی متابعت واجب ہے، خواہ کوئی قیاسِ معارض یا مخصص ہاتھ آئے یا نہ آئے۔

اس پر رازی رحمہ اللہ وغیرہ نے نو وجوہ اور لکھی ہیں۔[1] پھر یہ کہا ہے کہ آیتِ باب اس بات پر دلیل ہے کہ ان چار اصولوں کے سوا جو ہے، وہ مردود ہے۔ کسی مکلف کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان اصولوں کے سوا کسی اور شے سے تمسک کرے۔ پس استحسان جس کے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ قائل ہیں اور استصلاح (درستی چاہنا) جس کے قائل امام مالک رحمہ اللہ ہیں۔ اگر ان الفاظ سے چار مذکور امور میں سے کوئی ایک مراد ہے تو یہ عبارت کی تبدیلی ہے، اس میں کچھ فائدہ نہیں اور اگر کوئی چیز ان چار امور کے علاوہ مراد ہے، تو یہ اقوال قطعاً باطل ہیں۔ یہی آیت ان کے باطل ہونے پر دلیل ہے۔[2]

بے شک ائمہ مجتہدین کے مقلدین غالباً اصولِ فقہ وغیرہا کی کتابوں میں اسی طرح لکھتے چلے آئے کہ اصولِ دین چار ہیں: قرآن و حدیث، اجماع و قیاس۔ قرآن و حدیث کی اصلیت ایسی چیز ہے کہ اس میں ساری امت، از اول تا آخر، میں سے کسی ایک فردِ بشر کا اختلاف نہیں ہے۔ مقلدین بھی کتاب و سنت ہی کو اصل دین بتاتے ہیں۔ فروعِ مذاہب کو انھی دو اصولوں سے مستنبط کہتے ہیں۔ گو فروع پر عمل کو واجب اور مستحب سمجھ رکھا ہے اور جہالت اور فہم کے نہ ہونے کی وجہ سے اصول پر عمل کرنے سے منع کرتے ہیں۔ غرض کہ موافق و مخالف سب کے نزدیک اصل اصیل دینِ حق و شرع اسلام یہی دو چیزیں ہیں: ایک قرآن، دوسری حدیث، تیسری چیز ان کے ساتھ نہیں ہے۔ اجماع کا ثبوت نہایت مشکل ہے، جن مسائل کو فروع کی اصل کتابوں میں اجماعی لکھا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ غالباً اہلِ علم و اجتہاد سے کوئی نہ کوئی ان مسائل میں مخالف گزرا ہے، پھر سب کا اجماع کہاں؟!

اس کے علاوہ اجماع سکوتی حجت نہیں ہوتا، ہاں اگر اجماع کے سارے شرائط بلاخلش ثابت ہو جائیں اور وہ اجماع کتاب و سنت کی نص کے مخالف و مزاحم اور متصادم بھی نہ ہو، بلکہ کسی ایک آیت یا صحیح حدیث سے مستنبط و ماخوذ ہو، تب کہیں توجہ کے لائق ہوسکتا ہے۔ انھیں دقتوں کے سبب سے امام اہلِ سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے انکارِ اجماع کیا ہے، کیوں کہ اجماع کے وجود کے امکان اور حجیت کے بارے میں جو قول ہے، اس کے بعد اُمت میں اس کا وجود نہایت مشکل میں پڑ گیا ہے۔ جس کسی مسئلے میں بظاہر اس کے کہنے والے کے علاوہ کسی کی مخالفت نہ دیکھے، اس کو اجماع کہہ بیٹھے، سو وہ کچھ حقیقت میں اجماع نہیں ہے۔ "لَا أَعْلَمُ فِيهِ خِلَافًا" ہے۔

رہا قیاس تو اگرچہ اہلِ سنت کی ایک بڑی جماعت قیاس کی منکر ہے، جیسے ظاہریہ، لیکن قولِ محقق یہ ہے کہ ﴿ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ [الحشر: ۲] "تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔" سے جوازِ عبرت و قیاس نکلتا ہے۔ قیاس کے لیے اصولِ فقہ میں شرائط ہیں۔ ان شرائط کے وجود کے بعد قیاس توجہ کے لائق ہوسکتا ہے نہ علی الاطلاق۔ پھر ان کا قیاس معتبر ہے، جو مجتہدینِ کاملین، راسخین فی العلم ہیں نہ ہر غیر مجتہد و عامی کا قیاس۔ پھر وہ قیاس لائقِ توجہ ہوتا ہے، جو جلی ہو نہ کہ خفی، وہ بھی اُس جگہ ہے، جہاں کوئی حکم نصوصِ کتاب و سنت سے کسی نص یا نص کے اشارے کی

[1] تفسير الرازي (۱۰/ ۱۱۸۔ ۱۱۹)
[2] فتح البيان (۳/ ۱۵۵۔ ۱۶۱)

دلیل سے برآمد نہیں ہوسکتا، ورنہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن و حدیث پر ہمیشہ انحصار کرنے کی توفیق بخشی ہے، فہمِ صحیح اور قلبِ سلیم عنایت کیا ہے، اس کو اقوالِ سلف صلحا و آثارِ صحابہ و تابعین و اتباعِ تابعین رحمہم اللہ پر عبور کامل حاصل ہے، اس کا اکثر وقت اسی کتاب و سنت اور علومِ اصول کی مشغولیت میں گزرتا ہے اور وہ صاحبِ نیتِ صالحہ ہے۔

وہ ہر مسئلے کا حکم قرآن و حدیث کی خاص دلیلوں یا کتاب و سنت کے عام کلیات سے قیامت تک نکال سکتا ہے۔ نہ وہ قیاسِ جلی کا حاجت مند ہے نہ قیاسِ خفی کا اور نہ ہر غبی وغوی کے قیل و قال کا نیاز مند ہے، کیونکہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ میں قیامت کے دن تک موجود اور مستقبل کے تمام واقعات کے متعلق تمام احکام موجود ہیں۔ علمائے قرآن و محدثینِ امت کو دیکھو کہ ان کے طبقات کے طبقات ہجرت کے ان تیرہ سو سالوں میں مختلف اوقات اور شہروں میں ہو گزرے ہیں، کسی کو کسی معاملے میں نہ مجرد قیاس کی ضرورت پڑی نہ خالص رائے کی۔ یہی مصحف شریف یہی صحاح و سنن و مسانید و معاجم کی کتب ہیں، جن سے اُن کا کام نکل گیا۔ غرضیکہ قرآن و حدیث سے جو بات بدلالتِ نص ثابت ہے، وہ یہی ہے کہ اصل دینِ مبین یہی دو چیزیں ہیں: قرآن و حدیث۔ کوئی تیسری اور چوتھی چیز نہیں۔

اسی لیے بعض محققین نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اجماع و قیاس کو اصولِ شریعت میں داخل کرنا بلا دلیل ہے۔ اصل اصیل تو یہی چیزیں، جن کی طرف ردّ کرنا اللہ کے حکم کے تحت، خواہ تنازع ہو یا نہ ہو، واجب ہوتا ہے۔ صیغۂ امر کا جملہ ﴿أَطِيعُوا﴾ میں وجوب کے لیے آیا ہے۔ اس طرف بہت سے فقہا اور علما گئے ہیں۔ متکلمین کا وجوب کی دلیل کی عدمِ دستیابی پر کلام کرنا محض بے سود ہے۔ یہی آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ظاہر امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اس بات میں استنباطاً و تفقہاً رداً و تعقباً بہت طویل کلام ہے۔ یہ جگہ اس کی تفصیل کے لائق نہیں ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر میں کچھ تطویل کی ہے۔ وباللہ التوفیق.

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا

وَّ تَوْفِيقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾

(اے نبی!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ بے شک وہ اس پر ایمان لائے ہیں، جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ شیطانی چیلوں سے کرائیں، حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ ایسے شیطانوں کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمراہ کر کے دور پھینک دے ⑥⓪ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا، اور آؤ رسول کی طرف، تو آپ منافقوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف آنے سے کتراتے ہیں ⑥① پھر ان کا کیا حال ہوتا ہے جب ان کے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے؟ پھر وہ قسمیں کھاتے ہوئے آپ کے پاس آ کر کہتے ہیں: اللہ کی قسم! ہم نے تو بھلائی اور صلح صفائی کا ارادہ کیا تھا؟ ⑥② یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے ان کے دلوں میں کیا ہے، لہٰذا (اے نبی!) آپ ان کی باتوں پر دھیان نہ دیں اور انھیں نصیحت کرتے رہیں اور ان سے دلوں پر اثر کرنے والی بات کہیں ⑥③

کتاب وسنت کو چھوڑ کر دوسرے سے فیصلہ کروانے والا مسلمان نہیں:

مدینہ میں ایک یہودی اور ایک منافق، جو ظاہر میں مسلمان تھا، جھگڑنے لگے۔ یہودی نے کہا کہ چل محمد ﷺ کے پاس۔ منافق نے کہا کہ چل کعب بن اشرف کے پاس، وہ یہود کا سردار تھا، آخر وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کیا۔ منافق نے باہر نکل کر کہا کہ چلو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس، وہ نبی اکرم ﷺ کے حکم سے مدینہ میں فیصلے کرتے تھے، منافق نے سمجھا کہ اسلام کی حمیت کریں گے۔ جب گئے تو اُن کے آگے یہودی نے کہہ دیا کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ہم جا چکے ہیں اور وہ مجھ کو سچا کر چکے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے منافق کی گردن ماردی، اس کے وارث نبی اکرم ﷺ کے پاس گئے اور خون کا دعویٰ کیا اور قسمیں کھانے لگے کہ ہم اس لیے گئے تھے کہ شاید صلح کرادیں، تب یہ آیتیں نازل ہوئیں اور ان کا فاروق نام تجویز فرمایا۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے اُس شخص کی مذمت ہے، جو اُس پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور دوسرے انبیائے متقدمین پر اُتارا ہے اور اس کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ جھگڑوں میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور سے فیصلہ کرائے، جس طرح اس آیت کے سببِ نزول میں آیا

① تفسير البغوي (٢/ ٢٤٢ـ ٢٤٣) البتہ ''ورثا کا نبی کریم ﷺ کے پاس آنا'' یہ الفاظ نہیں ملے۔ نیز اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

ہے، جیسا کہ گزر چکا۔ کسی نے اور کچھ کہا ہے۔ لیکن آیت اس سب سے اعم ہے، کیوں کہ ہر اس شخص کی مذمت کرتی ہے، جو کتاب وسنت سے ہٹ کر باطل سے اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کروانا چاہتا ہے۔ اس جگہ طاغوت سے یہی مراد ہے۔ فرمایا کہ تجھ سے مستکبرین کی طرح منہ پھیر لیتے ہیں، جس طرح اللہ نے مشرکین سے نقل کیا ہے: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ﴾ [البقرة: ۱۷۰] ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس (قرآن) کی پیروی کرو، جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں: (نہیں) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔''

یہ لوگ برخلاف مومنین ہیں، جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ﴾ [النور: ۵۱] ''بس مومنوں کی تو بات ہی یہ ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے، تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی، اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

منافقوں کی مذمت:

پھر اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مذمت فرمائی کہ اُن کا حال تو دیکھو کہ جب تقدیر ان کو، ان مصائب کے سبب سے جو ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں پہنچتے ہیں، تیری طرف لے آتی ہے اور وہ اُس آنے کے محتاج ہوتے ہیں، تب تیرے پاس آکر قسمیں کھاتے ہیں اور عذر کرتے ہیں کہ ہمارا غیر کی طرف جانا اور تمھارے اعدا کی طرف جا کر فیصلہ کرانا اس ارادے سے ہے کہ آپس میں سلوک اور موافقت رہے، آپس کے تعلقات نرم اور مضبوط ہوں۔ ہم اعتقاد کی بنا پر اُن کے پاس نہیں جاتے کہ ان کی حکومت کو اچھا سمجھتے ہوں، جیسا کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے قول میں خبر دی: ﴿ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴾ [المائدة: ۵۲] ''(اے نبی!) پس آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں (منافقت کا) روگ ہے کہ وہ دوڑ کر ان (یہودیوں) میں جاتے ہیں اور (ان سے) کہتے ہیں: ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی مصیبت (نہ) پہنچے، پھر قریب ہے کہ اللہ (تمھیں) فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے، تو یہ لوگ (اپنی منافقت پر) پچھتائیں گے، جسے وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ابو برزہ اسلمی ایک کاہن تھا، جب یہود کی باہم لڑائی ہوتی تو وہ حکم دیتا، کچھ مشرکین اُس کے پاس گئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت زیرِ تفسیر اتاری۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اللہ ان

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۹۹۱) المعجم الكبير (۱۱/ ۳۷۳) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ورجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ۷/ ٦٢)

منافقوں کے حال سے، اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، خوب واقف ہے۔ اس پر کوئی بات مخفی نہیں ہے، وہ ان کو اس نفاق کی جزا دے گا۔ تم اے پیغمبر! اسی پر اکتفا کرو، ان کے دل کے حال پر کچھ ملامت نہ کرو۔ ہاں ان کو نفاق سے منع کرو۔ کلامِ بلیغ اور نصیحت کے ساتھ پیش آؤ۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو ان لوگوں کے حال پر تعجب دلایا ہے، جو لوگ اس دعویٰ کے باوجود کہ وہ قرآن اور کتبِ سابقہ پر ایمان رکھتے ہیں، ایسا کام کرتے ہیں، جس سے اُن کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ وہ کام یہ ہے کہ طاغوت سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں، حالانکہ قرآن اور سابقہ کتابوں میں ان کو یہ حکم ہے کہ طاغوت کا انکار کریں۔ حلاس بن صامت، معقب بن قشیر اور رافع بن زید اسلام کا دعویٰ کرتے تھے، اُن کی قوم کے بعض مسلمانوں نے آپس کے جھگڑے میں کہا کہ چلو جاہلیت کے کاہنوں کے پاس چلیں، وہ فیصلہ کر دیں گے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

معلوم ہوا مسلمان کو اپنے معاملات کا فیصلہ کسی غیر مسلم حاکم سے طلب نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اللہ اور رسول سے ہر قضیے کا فیصلہ چاہیے۔ جو ایسا نہیں کرتے، وہ منافق ہیں، آپ بھی رکتے ہیں دوسروں کو بھی روکتے ہیں، کیوں کہ خوب جانتے ہیں کہ کتاب و سنت کا حکم صریح حق ہوتا ہے۔ اللہ اور رسول رشوت نہیں لیتے۔ ان منافقوں کا حال یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو رسول کے پاس دوڑے آتے ہیں۔ قسمیں کھا کر عذر کرتے ہیں کہ غیر کے پاس جانے سے ہمارا مطلب یہی تھا کہ آپس میں ملاپ ہو جائے، سلوک رہے اور کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا اللہ کو ان کے نفاق، حق کے ساتھ عداوت، عذر لنگ اور جھوٹ کا بخوبی علم ہے۔ اُن سے تم کو منہ پھیر لینا چاہیے، پھر یہ منہ پھیرنا قتال کی آیت سے منسوخ ہو گیا۔ قولِ بلیغ سے مراد اثر کرنے والا وعظ ہے یا ایسا کلام ہے جو رغبت، ترہیب، عذر کرنا، ڈرانا، وعدے اور وعید پر مشتمل ہو۔[2]

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿64﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿65﴾

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر بے شک وہ لوگ جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، آپ کے پاس آتے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگتے اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۶۷۸، ۶۷۹) [2] فتح البیان (۳/ ۱۶۳۔ ۱۶۵)

رسول بھی ان کے لیے بخشش طلب کرتا تو وہ یقیناً اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا پاتے (64) چنانچہ (اے نبی!) آپ کے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر آپ کے کیے ہوئے فیصلے پر ان کے دلوں میں کوئی تنگی نہ آنے پائے اور وہ اسے دل و جان سے مان لیں (65)

رسول کی فرماں برداری فرض ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رسول کی اطاعت ان پر، جن کی طرف وہ بھیجا گیا، فرض ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ کوئی اطاعت نہیں کرتا مگر میرے حکم سے، رسول کی اطاعت وہی شخص کرتا ہے، جس کو میں توفیق دیتا ہوں۔[1] اللہ کے اس قول کے مطابق: ﴿ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ﴾ [آل عمران: ۱۵۲] ''یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب تم (احد میں) اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے۔'' ''اِذْن'' سے مراد اللہ کا امر و قدر و مشیت اور ان کو ان پر مسلط کرنا ہے۔

پھر گناہ گار مومنوں سے یہ ارشاد کیا کہ جب اُن سے کوئی خطا اور عصیان واقع ہو تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر اللہ سے استغفار کریں اور نبی اکرم ﷺ سے بھی درخواست کریں کہ آپ ہمارے لیے استغفار کریں، اس سے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے گا اور اُن پر رحم اور مغفرت فرمائے گا، اس لیے یہ کہا ہے: ﴿ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴾

ایک جماعت جن میں سے ایک شخص ابو منصور صباغ ہیں، انھوں نے اپنی کتاب شامل میں حکایت مشہورہ کو عتبی سے نقل کیا ہے، عتبی نے کہا ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کی قبر کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک گنوار نے آ کر کہا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ'' میں نے کتاب اللہ میں پڑھا ہے، اللہ فرماتا ہے: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ ﴾ (آیت زیر تفسیر) سو میں آپ کے پاس آیا ہوں، استغفار کرتا ہوا اور آپ کو اپنے رب کی طرف شفیع بناتا ہوا۔ پھر اس نے یہ شعر پڑھا:

يَا خَيْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ أَعْظُمُهٗ — فَطَابَ مِنْ طِيبِهِنَّ الْقَاعُ وَالْأَكَمُ
نَفْسِيْ الْفِدَآءُ لِقَبْرٍ أَنْتَ سَاكِنُهٗ — فِيْهِ الْعَفَافُ وَفِيْهِ الْجُوْدُ وَالْكَرَمُ

''اے وہ بہترین ذات، جو یہاں دفن ہے! یہ کتنی پاکیزہ جگہ ہے، میں آپ کی قبر پر قربان جاؤں، جس میں آپ مدفون ہیں، اس میں پاک دامنی اور جود و سخا ہے۔''

یہ پڑھ کر وہ اعرابی چلا گیا۔ عتبی نے کہا کہ میری آنکھ لگ گئی، میں نے نبی اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عتبی! «اِلْحَقِ الْأَعْرَابِيَّ فَبَشِّرْهُ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لَهٗ» یعنی اس گنوار سے جا کر کہہ دو کہ

---

[1] تفسیر الطبري (۸/ ۵۱۶)

اللہ نے اُس کو بخش دیا۔[1] یہ حکایت نہ کوئی آیت ہے نہ حدیث، ایک قصہ ہے، اگر صحیح بھی ہو تو اس بات پر حجت نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی قبر کے نزدیک جا کر استغفار اور آپ سے استشفاع (شفاعت طلب) کرنا چاہیے۔ کیوں کہ آیت کا حکم نبی کریم ﷺ کے زمانۂ حیات کے متعلق تھا نہ کہ آپ کی وفات کے بعد کا، اسی لیے کتاب ''الصارم المنكي'' میں اس طرح کے استدلال کو آیتِ شریفہ سے ردّ کیا ہے اور صحتِ حکایت کا بھی انکار فرمایا ہے۔[2] والله أعلم.

نبی اکرم ﷺ کے فیصلے کو برضا تسلیم کیے بغیر کوئی مومن نہیں ہوسکتا:

پھر اللہ پاک نے اپنے نفسِ کریمہ مقدسہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ کسی کا ایمان اس وقت تک درست نہیں، جب تک کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم تمام امور میں نہ مانے۔ جو حکم نبی اکرم ﷺ نے دیا ہے، وہی حق ہے۔ باطناً اور ظاہراً اسی کی اتباع واجب ہے۔ پھر اُس حکم سے دل میں تنگی بھی نہ آئے، یعنی اگرچہ ظاہر میں مان لیا، لیکن اگر دل میں خفگی ہے تو بھی ایمان درست نہ رہا۔ ایمان اسی وقت ہے کہ ظاہر اور باطن میں اُس حکم پر راضی ہو، کسی طرح کی ناخوشی دل میں نہ آئے، یہی ﴿وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ کے معنی ہیں کہ حکمِ رسول کو بغیر ممانعت و مدافعت و منازعت قبول کرے۔ حدیث شریف میں مروی ہے: «لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ»[3] ''تم میں سے کوئی ایک بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی خواہش میری پیش کردہ شریعت کے مطابق نہ ہوجائے۔''

آیت کا شانِ نزول:

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ عروہ رحمہ اللہ نے کہا کہ زبیر رضی اللہ عنہ کا ایک مرد سے شراجِ حرہ میں جھگڑا ہوگیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے زبیر! تم پانی سینچ کر چھوڑ دو کہ تمھارا ہمسایہ پانی لے، اس انصاری مرد نے کہا: اے اللہ کے رسول! آخر یہ تمھاری پھوپھی کے بیٹے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، فرمایا: اے زبیر! پانی لے کر پانی کو روک دو کہ دیواروں تک جائے، پھر اس کو چھوڑ دو، تاکہ تمھارے ہمسائے کو ملے۔

غرضیکہ نبی کریم ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کا پورا حق دلوایا۔ انصاری کے غصہ دلانے پر آپ نے صریح حکم دیا، ورنہ پہلے ایسا حکم دیا تھا، جس میں دونوں کے لیے گنجایش تھی۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں خیال کرتا ہوں کہ یہ آیت اسی بارے میں اُتری ہے۔ (هكذا رواه البخاري) اس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح میں کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کی صورت ارسال ہے، لیکن یہ معنیً متصل ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اس کو مرسلاً روایت کیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۶۷۹) [2] الصارم المنكي في الرد على السبكي (۱/ ۳۱۴۔ ۳۲۲)

[3] شرح السنة للبغوي (۱/ ۲۱۲۔ ۲۱۳) اس کی سند میں ''نعیم بن حماد'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: ظلال الجنة (۱/ ۷)

کہا ہے کہ صحیح الاسناد ہے۔ مگر شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔ یہ بڑی تعجب کی بات ہے، جو حاکم رحمہ اللہ نے کہی، کیوں کہ حدیث مذکور بخاری میں موجود ہے اور مختلف الفاظ اور طرق سے نسائی وغیرہ میں بھی آئی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کے سارے طرق اور الفاظ تفسیر میں لکھے ہیں۔[1]

سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت زبیر بن العوام اور حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہما کے حق میں اتری ہے۔ دونوں کے درمیان پانی کے بارے میں جھگڑا ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ پہلے اعلیٰ (اونچائی والے) پھر اسفل (نیچے والے) کو پانی دیا جائے۔ یہ خبر بھی مرسل ہے، مگر اس میں انصاری کا نام مذکور ہے۔ اس کے سوا ایک غریب اثر میں اس آیت کے نزول کا ایک دوسرا قصہ آیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جھگڑا لے گئے، انھوں نے تلوار سے اُس شخص کو مارا، جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ منظور نہیں کیا تھا۔[2] وہ اثر بھی مرسل ہے اس کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف ہے۔

استغفار کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا، آپ کی زندگی میں تھا بعد میں نہیں:

فتح البیان میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا ان کی زندگی کے زمانے کے ساتھ مخصوص تھا، آپ کی وفات کے بعد آپ کی قبرِ مطہر اور مرقدِ منور کے پاس آنے کی اس آیت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے اس احتمالِ بعید کی طرف سلف و ائمۂ امت میں سے کوئی شخص نہیں گیا، نہ کوئی صحابی نہ تابعی نہ تبع تابعی۔

عمومی تفسیر:

”حَکَم“ منصف کو کہتے ہیں تو جب تک آپس کے جھگڑوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنا کر ان کے فیصلے پر راضی نہ ہوں، ایمان صحیح نہیں ہے۔ ”حَرَج“ کے معنی ہیں: حکمِ نبوی کا انکار کر کے دل تنگ ہونا یا گنہگار ہونا۔ تسلیم کے معنی ہیں، ظاہراً اور باطناً حکم کا مطیع ہونا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی جی میں کوئی شک وشبہہ نہ آئے۔[3] ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت ہر فرد کو ہر حکم میں شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو تحاکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا، آپ کی وفات کے بعد تحاکم قرآن وحدیث کی طرف ہے یا ان ائمہ وقضاۃ کی طرف ہے جو کتاب وسنت کو نظر انداز کر کے صرف اپنی رائے سے تحکیم نہیں کرتے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ”وَفِيْ هٰذَا الْوَعِيْدِ الشَّدِيْدِ مَا تَقْشَعِرُّ لَهُ الْجُلُوْدُ وَتَرْجُفُ لَهُ الْأَفْئِدَةُ“ ”اس میں ایسی سخت وعید ہے، جس کو سن کر بدن کانپ اُٹھتا ہے۔“ کیوں کہ پہلے قسم کھائی، پھر اس قسم کی تاکید حرف نفی سے کی۔ ایمان جو صلحا کا راس المال ہے، اس کی نفی فرمائی، یہاں تک کہ تحکیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہو، پھر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٣١) مسند أحمد (٤/ ٤) مستدرك الحاكم (٣/ ٤١٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤١٦). تفسير ابن كثير (١/ ٦٧٩-٦٨١)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٩٤) [3] معاني القرآن (٢/ ٧١)

اس پر بھی اکتفانہ کیا، بلکہ یہ کہا کہ اس تحکیم سے جی میں برا نہ مانے، یعنی محض تحکیم اور اذعان (تسلیم کرنا) کافی نہیں ہے، جب تک کہ تہِ دل، رضائے خاطر، طیبِ نفس اور اطمینانِ قلب سے اس انصاف نبوی پر مطمئن نہ ہو۔ پھر اس پر بھی اکتفانہ کیا۔ کامل فرمانبرداری کو شامل کیا۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاہر آیت اس بات پر دلیل ہے کہ قیاس کے ساتھ نص کی تخصیص جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول اور حکم کی تابع داری علی الاطلاق واجب ہے۔ اس سے منہ پھیر کر غیر کی طرف متوجہ ہونا ہرگز جائز نہیں۔ جیسا مبالغہ اس آیت میں ہے، وہ دیگر تکالیف میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن وحدیث کا حکم قیاس پر مقدم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ ایمان کامل نہیں ہوتا، مگر اسی وقت کہ حرج محسوس نہ کرے۔ نص کو مکمل طور پر تسلیم کر لے۔ یہ کلام نہایت قوی اور حسن ہے۔[2] والله أعلم.

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا
مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ
فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿66﴾
وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿67﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيْمًا ﴿68﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ
وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ﴿69﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿70﴾

اور اگر بے شک ہم ان پر فرض کر دیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو یا تم اپنے گھروں سے نکلو تو ان میں سے چند ایک کے سوا کوئی بھی یہ کام نہ کرتا۔ اور اگر بے شک وہ مان لیتے جس کی انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لیے بہتر اور (دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا باعث ہوتا﴿66﴾ اور تب ہم ضرور انھیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے﴿67﴾ اور ہم ضرور انھیں سیدھے راستے پر چلاتے﴿68﴾ اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے، تو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، (یعنی) انبیا، صدیقین، شہیدوں اور نیک لوگوں کے ساتھ، اور یہ لوگ اچھے رفیق ہوں گے﴿69﴾ یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے، اور اللہ کافی ہے جاننے والا﴿70﴾

اکثر لوگ حکم کی مخالفت کرتے ہیں:

یعنی مالک کے حکم میں تو جان تک دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اللہ تعالیٰ ویسے حکم فرماتا تو یہ منافق کب کر

---

[1] فتح القدير (١/ ٧٧١) [2] تفسير الرازي (١٠/ ١٣٢۔ ١٣٣) فتح البيان (٣/ ١٦٦۔ ١٦٩)

سکتے؟ یہ حکم تو نصیحت کے ہیں، انھیں پر چلیں تو نفاق جاتا رہے اور مومن ہو جائیں، اس کو غنیمت نہیں جانتے۔ نبی وہ لوگ ہیں، جن کو اللہ کی طرف سے وحی آئے، یعنی فرشتہ ظاہر میں پیغام پہنچا جائے اور صدیق وہ ہیں کہ جو وحی میں آئے، اس کا دل آپ ہی اس پر گواہی دے۔ شہید وہ جن کو پیغمبر کے حکم پر ایسا صدق آیا کہ اُس پر جان دیتے ہیں۔ نیک بخت وہ جن کی طبیعت نیکی پر پیدا ہوئی ہے تو جو لوگ ایسے نہیں ہیں، لیکن حکم برداری میں لگ جاتے ہیں، اللہ ان کو بھی ان کے ساتھ گنے گا، آگے اس کے جہاد کا ذکر ہے۔

امام ابو اسحاق سبیعی رحمہ اللہ نے کہا کہ جب آیتِ باب اتری، ایک آدمی نے کہا کہ اگر ہمیں حکم ہوتا تو البتہ ہم کرتے۔ اللہ کی تعریف ہے جس نے ہم کو عافیت دی۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ کو پہنچی، فرمایا: میری امت میں وہ لوگ ہیں، جن کے دلوں میں ایمان پہاڑوں سے زیادہ ثابت (مضبوط) ہے۔[1] (رواہ ابن جریر) امام بن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب یہ آیت آئی تو نبی اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا: ”لَوْ فَعَلَ رَبُّنَا لَفَعَلْنَا“ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «اَلْإِيْمَانُ أَثْبَتُ فِيْ قُلُوْبِ أَهْلِهٖ مِنَ الْجِبَالِ الرَّوَاسِيْ»

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ اور ایک یہودی نے فخر کیا۔ یہودی نے کہا: واللہ! اللہ نے ان پر قتل لکھا، پس ہم نے اپنی جانوں کو قتل کیا۔ سیدنا ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! اگر اللہ ہم پر بھی لکھتا تو ہم اپنی جانوں کو قتل کرتے۔ اُس پر یہ آیت اتری۔ عامر بن عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا: جب یہ آیت آئی: ﴿مَا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ﴾ نبی اکرم ﷺ نے کہا: «لَوْ نَزَلَتْ لَكَانَ ابْنُ أُمِّ عَبْدٍ مِّنْهُمْ» اگر یہ حکم اُترتا تو ابن اُم عبد ان میں سے ہوتے۔

شریح بن عبد رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آیت کو پڑھ کر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پھر فرمایا: «لَوْ أَنَّ اللّٰهَ كَتَبَ ذٰلِكَ لَكَانَ هٰذَا مِنْ أُولٰئِكَ الْقَلِيْلِ» ”اگر اللہ نے یہ فرض کیا ہوتا تو ان تھوڑے لوگوں میں یہ بھی ہوتے۔“[2] اسی لیے اللہ نے کہا کہ اگر وہ امر بجا لائیں اور جس سے منع کیا گیا، اس کو ترک کر دیں تو یہ ان کے لیے اس شے سے بہتر ہے کہ حکم کی مخالفت کریں اور جس سے منع کیا گیا اس کا ارتکاب کریں۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تثبیت سے مراد تصدیق ہے۔[3]

اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزاروں کا انعام:

اجرِ عظیم جنت ہے اور ہدایت دنیا اور آخرت میں صراطِ مستقیم ہے۔ پھر یہ فرمایا کہ جو کوئی اللہ کے امر پر عمل کرتا ہے اور اللہ کی نہی سے باز رہتا ہے، اللہ اُس کو اپنے دارِ کرامت میں ٹھہرائے گا، اس کو انبیاء علیہم السلام کا رفیق بنائے گا۔ صلحاء وہ ہیں، جن کے پوشیدہ اور علانیہ اعمال صالح ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ کوئی نبی بیمار نہیں ہوتا، مگر وہ دنیا

---

[1] تفسیر الطبري (٨/ ٥٢٦) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٩٥۔ ٩٩٦) یہ تمام روایات مرسل ہیں۔

[3] تفسیر الطبري (٨/ ٥٢٩)

اور آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے اور جس بیماری میں نبی اکرم ﷺ کا انتقال ہوا، جب ٹھسکا لگا تو آپ ﷺ کہنے لگے:«مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ... الخ» میں نے جان لیا کہ آپ کو اختیار دیا گیا۔[1] (رواہ الشیخان) یہی اس قول کے معنی ہیں، جو دوسری حدیث میں مروی ہے:«اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْأَعْلىٰ» تین بار کہا۔[2]

سببِ نزول:

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک انصاری رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، وہ غمگین تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے فلاں! تو کیوں غمگین ہو رہا ہے؟ اُس نے کہا: اے اللہ کے نبی! ایک بات میں فکر مند ہوں، پوچھا: کیا؟ کہا: ہم صبح شام آپ کی مجلس میں آتے ہیں، آپ کی صورت دیکھتے ہیں، آپ کے پاس بیٹھتے ہیں۔ کل آپ انبیا کے ہمراہ ہوں گے، مگر ہم آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے، نبی اکرم ﷺ نے کچھ جواب نہ دیا۔ جبریل علیہ السلام آئے اور یہ آیت لائے۔ نبی کریم ﷺ نے آدمی بھیج کر اُس کو یہ بشارت سنائی۔[3] (رواہ ابن جریر)

یہ اثر مرسلاً امام مسروق، عکرمہ، عامر، شعبی، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔[4] لیکن سندِ اول حسن ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک آدمی نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! آپ مجھ کو میری جان سے اور اہل سے اور اولاد سے زیادہ محبوب ہیں، میں جب اپنے گھر میں آپ کو یاد کرتا ہوں تو صبر نہیں کرتا، یہاں تک کہ آ کر آپ کو اپنی آنکھ سے دیکھ لوں، پھر جب مجھ کو اپنی اور آپ کی موت یاد آتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ جنت میں انبیا کے ساتھ ہوں گے، میں اگر جنت میں گیا بھی تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو نہ دیکھ سکوں۔ نبی کریم ﷺ نے اس کو کچھ جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت اُتری۔ (رواہ أبوبکر ابن مردویہ)

اس کو حافظ ابو عبداللہ مقدسی رحمہ اللہ نے بھی کتاب "صفة الجنة" میں لکھا ہے۔ پھر کہا: "لَا أَرىٰ بِإِسْنَادِهٖ بَأْسًا"[5] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک آدمی نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو دوست رکھتا ہوں، اپنے گھر میں آپ کو یاد کرتا ہوں، مجھ پر آپ کی جدائی شاق گزرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ درجے میں آپ کے ہمراہ ہوں، نبی اکرم ﷺ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آیت اتاری۔ (رواہ ابن جریر و ابن مردویہ أیضاً عن الشعبي مرسلاً)[6]

ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رات کو نبی اکرم ﷺ کے نزدیک سوتا تھا، ایک بار وضو اور حاجت کا پانی

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١٧١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٤٤) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١٧٤)

[3] تفسیر الطبري (٨/ ٥٣٤) یہ روایت مرسل ہے۔ [4] تفسیر الطبري (٨/ ٥٣٤۔ ٥٣٥)

[5] المعجم الأوسط (١/ ١٥٢) صفة الجنة (١/ ٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٩٣٣)

[6] تفسیر الطبری میں یہ روایت نہیں ملی ہے۔ المعجم الکبیر (١٢/ ٨٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفیه عطاء بن السائب وقد اختلط" (مجمع الزوائد: ٧/ ٦٣)

لایا، مجھ سے فرمایا: کچھ مانگ، میں نے کہا: میں جنت میں آپ کی مرافقت (ساتھ) مانگتا ہوں۔ فرمایا: بھلا کچھ اس کے سوا اور؟ میں نے کہا: بس یہی ایک سوال ہے۔ فرمایا: میری مدد کر اپنی جان پر کثرتِ سجود سے۔[1] (رواہ مسلم) اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ صرف سجدہ عبادتِ مستقلہ ہے، اس کی کثرت جنت میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت کا سبب بنے گی۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ نزل الابرار میں بھی اسی کو راجح ٹھہرایا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد نفل نماز کی کثرت ہے۔ اور اگر دونوں معنی مراد ہوں تو بھی کوئی مانع نہیں ہے۔ واللہ أعلم.

عمرو بن مرہ جہنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے اس بات کی گواہی دی کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" اور نمازِ پنج گانہ پڑھی، رمضان کے روزے رکھے۔ فرمایا: جو کوئی اس حالت پر مرے گا، وہ نبیوں، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ہمراہ ہوگا۔ قیامت کے دن اس طرح اور اپنی انگلیاں کھڑی کیں، جب تک اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرے۔[2] (رواہ أحمد وتفرد بہ) معاذ بن انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس نے اللہ کے راستے میں ہزار آیتیں پڑھیں، وہ قیامت کے دن انبیا، صدیقین، شہدا و صالحین کے ساتھ لکھا گیا اور یہ رفاقت بہت اچھی ہے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔[3] (رواہ أحمد) ترمذی کی روایت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ صدوق اور امین تاجر ان چاروں کے ہمراہ ہے۔ پھر کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔[4]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان سب سے بڑھ کر اور اعظم تر وہ بشارت ہے، جو صحیح اور مسانید وغیرہ میں بطرقِ متواترہ صحابہ کی ایک جماعت سے آئی ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ آدمی ایک قوم کو دوست رکھتا ہے اور ان کے ساتھ ملحق نہیں ہے، یعنی ان کے سے عملِ صالح اس شخص کے نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ» آدمی ہمراہ اُس کے ہے، جس کو دوست رکھتا ہے اور چاہتا ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: "فَمَا فَرِحَ الْمُسْلِمُوْنَ فَرَحَهُمْ بِهٰذَ الْحَدِيْث» یعنی جیسی خوشی مسلمانوں کو اس بات سے ہوئی کسی شے سے نہیں ہوئی۔[5] دوسری روایت میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے اس طرح کہا ہے: «إِنِّي لَأُحِبُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَأُحِبُّ أَبَا بَكْرٍ وَّعُمَرَ رضی اللہ عنہما وَأَرْجُوْا أَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُنِي مَعَهُمْ وَإِنْ لَّمْ أَعْمَلْ كَعَمَلِهِمْ»[6] (رواہ الترمذي)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٩)

[2] مسند أحمد (٣٩/ ٥٢٢۔ ٥٢٣۔ طبع: مؤسسة الرسالة) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٣٤)

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٣٧) اس کی سند میں "زبان بن فائد اور رشدین بن سعد" ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة: ٥٢٠٧)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٠٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٢٥٠١)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٣٩، ٢٦٤)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٣٩) تفسير ابن كثير (١/ ٦٨٤)

اے میرے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں بے شمار معاصی کے باوجود تجھ کو تیرے رسول، سارے انبیا، صدیقین، شہدا، صلحا، اولیا، ائمہ دین، مجتہدینِ شرح مبین اور متقین و متبعینِ کتاب وسنت کو تہہ دل سے دوست رکھتا ہوں، تمام صحابہ وا ہلِ بیتِ رسالت کا محبّ ہوں، اگر مجھ سے کوئی کام ان کا سا ہو، یا کوئی بھی عمل صالح، جو تیری مرضی کے لائق ہو، نہیں ہوا ہے اگر میرا جی کسی اچھے کام کو چاہتا ہے تو ہزار خارجی مانع مجھ کو اس سے روکتے ہیں اور فرضاً اگر کوئی عمل صالح وقوع میں آتا ہوگا تو ابنائے زمان کی طرف سے اس کی صحت وقبولیت میں صدہا رکاوٹیں واقع ہوتی ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ سچے دل اور سچی زبان سے کلمہ توحید و رسالت کی گواہی دیتا ہوں۔

شرک و بدعت سے بحسبِ قدرت وفہم خود بھاگتا ہوں، نماز روزہ ظاہری ادا کرتا ہوں، اگرچہ وہ اعمال ہزار وسوسوں اور خلل سے آلودہ کیوں نہ ہوں۔ سو اگر بفحوائے: "سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ" "میری رحمت میرے غصے پر سبقت لے گئی ہے۔" اور "إِنَّ التَّوْحِيْدَ رَأْسُ الطَّاعَاتُ" "توحید تمام نیکیوں کی رئیس ہے۔" کے تقاضے کے مطابق تو اگر محض اپنے فضل وکرم سے مجھ کو بخش دے گا اور حشر ونشر اور اپنے سامنے کھڑے ہونے کی جگہ اور نعمتوں والے گھر میں اپنے دوستوں کی ہمسائیگی نصیب کرے گا جو آیت زیرِ تفسیر میں دی گئی بشارت اور حدیثِ صحیح مذکور کے عین مطابق ہوگی تو یہ کچھ تیرے عالی اور متعالی رتبہ و درجہ سے کچھ بعید اور دشوار نہیں ہے۔ تو سچا ہے اور تیرا رسول اپنی بات کا پکا ہے۔

مجھ جیسے ایک بندۂ ناچیز معترف بخطا کا بخش دینا تیری وسیع رحمت اور بے پایاں کرم کے سامنے کیا بڑی بات ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تو میرا ایک رب ہے، جو گناہ بخشتا ہے اور توبہ قبول کرتا ہے اور اپنے عاجز بندوں سے نا اُمیدی کو پسند نہیں فرماتا، مجھ کو اُمید ہے کہ اللہ پاک مجھے بخشے گا اور مجھ کو حضور فیض معمور جناب رسالت مآب ﷺ اور خدمت انبیائے کرام وصحابہ عظام وعترتِ طاہرہ وصلحائے امت کے ساتھ قیامت کے دن دار القرار جنت میں جگہ دے گا۔ اللهم آمین ثم آمین. ؎

الٰہی واقف خیل گناہم | نویسد تا بکے عصیان پناہم
کرامت کن کرم مضمون براتے | کہ یابم از کف عصیاں نجاتے
الٰہی تا غفور اسمت شنیدم | گنہ را مست شادی مرگ دیدم

"اے میرے اللہ! تو میرے ڈھیروں گناہوں سے باخبر ہے۔ (فرشتہ) کب تک لکھے گا، میں تو گناہوں سے تیری ہی پناہ لیتا ہوں، مجھ پر کرم فرما اور اس ضمن میں ایسا پروانہ عطا فرما کہ گناہ کے نیچے سے چھٹکارا مل جائے۔ اے میرے معبود! جب سے میں نے تیرا نام "غفور" سنا ہے، گناہ کو خوشی سے موت طاری ہونے والی مستی میں دیکھا ہے۔"

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جنت والے غرفے والوں کو اپنے اوپر اس طرح دیکھیں گے، جس طرح تم چمکتے تاروں کو آسمان کے مشرقی یا مغربی کنارے پر دیکھتے ہو، ان کے یہ درجات آپس کی فضیلت کی وجہ

سے ہوں گے۔ اے اللہ کے رسول! وہ انبیا کے منازل ہوں گے، غیر وہاں کیسے پہنچے گا؟! فرمایا: «بَلٰی وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ رِجَالٌ آمَنُوْا بِاللّٰہِ وَصَدَّقُوا الْمُرْسَلِیْنَ» یعنی قسم ہے اللہ کی! وہ منازل ان لوگوں کے ہیں، جو اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے رسولوں کو سچا جانا۔[1] (أخرجه مالك والشيخان من حديث مالك واللفظ لمسلم)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں اہلِ جنت نیچے درجے والے بلند اور فضیلت والے جنتیوں کو اس طرح دیکھیں گے، جس طرح تم چمکتے ستاروں کو اُفق پر دیکھتے ہو۔ کہا کہ اے اللہ کے رسول! وہ انبیا ہوں گے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔ (رواه أحمد) حافظ ضیا مقدسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری کی شرط پر ہے۔[2] اس بارے میں طبرانی نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک طویل قصے میں ایک حبشی کی روایت کی، جس کی سند ضعیف ہے اور اُس میں غرابت اور نکارت ہے، اس لیے اس جگہ اُس کا ذکر نہیں کیا گیا۔[3]

اللہ نے فرمایا کہ یہ فضل اللہ کی طرف سے اُس کی رحمت کے سبب سے ہے، جس نے اُن کو اس کام کا اہل کیا ہے نہ کہ ان کے اعمال کے سبب سے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہدایت اور توفیق کا مستحق کون ہے۔ فتح البیان میں کہا ہے کہ اس آیت میں طریقِ تدلی (نہایت نزدیک آنا) اختیار کیا ہے کہ ہر ایک کا مرتبہ ان چار اقسام سے ایک کا دوسری سے اعلیٰ ہے۔ صدیق وہ جو بڑا سچا ہو، یہ مبالغے کا صیغہ ہے یا صدیقین سے نبیوں کی اتباع کرنے والے فضلا مراد ہیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان دونوں معنوں کے مصداق تھے۔ شہدا وہ ہیں، جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں یا وہ ہیں جو اُحد کے دن شہید ہوئے۔ پہلا معنی زیادہ صحیح ہے۔ سیدنا عمر، عثمان اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم شہدا میں داخل ہیں۔

صالحین سے مراد اعمالِ صالحہ کرنے والے ہیں، جیسے تمام صحابہ، لیکن عمومیت زیادہ بہتر ہے۔ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ رفیق سے مراد ساتھی ہے، یعنی اگرچہ ہر ایک کی جگہ اُس کے رُتبے کے مطابق علاحدہ علاحدہ ہو، لیکن جنت میں باہم ملیں جلیں گے، ایک دوسرے کو دیکھیں گے، آپس میں اُٹھیں بیٹھیں گے، بات چیت ہوگی۔ کسی نے کہا کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ثوبان رضی اللہ عنہ کے حق میں اُتری ہے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قلیل الصبر تھے۔[4]

آیت کا آخری حصہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ درجہ انھیں کسی اطاعت کے سبب سے نہیں ملا۔ یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے، جس طرح حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہرگز جنت میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣١)

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٣٩) صفة الجنة للمقدسي (١/ ٦) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٥٨)

[3] المعجم الكبير (١٢/ ٤٣٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه أيوب بن عتبة وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٧٧٧)

[4] تفسير البغوي (٢/ ٢٤٧)

داخل نہیں کرے گا۔ کہا: آپ کو بھی نہیں اے اللہ کے رسول؟! فرمایا: مجھ کو بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ مجھ کو اپنے فضل و رحمت میں ڈھانپ لے۔ اس کو شیخین نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[1] اے اللہ! تو مجھ کو بھی اپنے پردۂ فضل و رحمت سے چھپا لے، میں سخت درماندہ و عاجز و نابکار ہوں، تو ستار، غفار، شکور، صبار، رحیم، کریم، حلیم اور علیم ہے۔

رقم سپید و سیاہ من بزمین شکستہ نگاہ من ۔۔۔ چہ من و چہ قدر گناہِ من خجلم زنامِ غفورِ تو

''اپنے ہر قسم کے گناہوں کی تحریر پر مایوسی کی حد تک شرمندہ ہوں۔ اے اللہ! میری کیا حقیقت اور میرے گناہ کس قدر ہیں، تیرے نام ''غفور'' کی وجہ سے اب میں سوچنے لگا ہوں۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ
اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿71﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ
اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ
مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿72﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ
لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ
مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿73﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿74﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اپنے بچاؤ کا سامان لے لو، پھر تم الگ الگ دستوں کی شکل میں یا اکٹھے ہو کر نکلو (71) اور بے شک تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو نکلنے میں ضرور دیر کرتا ہے، پھر اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو وہ کہتا ہے: اللہ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی کہ میں ان کے ساتھ موجود نہیں تھا (72) اور اگر تمھیں اللہ کا فضل ملے، تو وہ، گویا جیسے تمھارے اور اس کے درمیان کوئی دوستی نہ ہو، ضرور کہے گا: کاش میں ان کے ساتھ ہوتا، پھر میں بڑی کامیابی حاصل کرتا (73) پھر جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی بیچ چکے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ اللہ کے راستے میں لڑیں اور جو شخص اللہ کے راستے میں لڑے، پھر وہ قتل کر دیا جائے یا غالب آجائے تو ہم جلد اسے بہت بڑا اجر دیں گے (74)

لڑائی میں احتیاط اور بچاؤ کا حکم:

یعنی لڑائی میں اپنا بچاؤ کرنا، زرہ یا سپر یا تدبیر یا ہنر سے منع نہیں کیا۔ ایسا شخص منافق ہے جو اللہ کے حکم پر نہیں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦) فتح البيان (٣/ ١٧٢۔ ١٧٤)

دوڑتا، بلکہ دنیا کا نفع مدِنظر رکھتا ہے۔ اگر لوگوں کو اُس کام میں تکلیف ہو تو اپنے الگ رہنے پر رَجھتا (خوش ہوتا) ہے اور اگر لوگوں کو فائدہ پہنچا تو پچھتاتا ہے۔ دشمنوں کی طرح حسد کرتا ہے۔ پھر فرمایا: مسلمانوں کو چاہیے کہ دنیا کی زندگی پر نظر نہ رکھیں، آخرت چاہیں اور سمجھیں کہ اللہ کے حکم میں ہر طرح نفع ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ اپنے مومن بندوں کو کہتا ہے کہ جس چیز میں دشمنوں سے ان کا بچاؤ ہو، اس کو لے لیں۔ یہ ضروری ہے دشمنوں کے مقابلے کے لیے تیاری کرنے کے لیے۔ اسلحہ، تیاری اور تعداد کی کثرت وغیرہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں نکلیں۔ ایک جماعت کے بعد دوسری جماعت، ایک فرقے کے بعد دوسرا فرقہ، ایک لڑائی کے بعد دوسری لڑائی کے لیے آئے۔ یعنی سب کے سب متفرق یا مجتمع ہو کر لڑنے کو نکلیں۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، سدی، قتادہ، ضحاک، عطا خراسانی، مقاتل بن حیان اور خصیف جزری رحمہم اللہ کا قول ہے۔[1]

جہاد سے پیچھے رہنا، منافقوں کی علامت:

مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمھارے بعض جہاد سے تخلف کرتے (پیچھے رہتے) ہیں اور لوگوں کو نکلنے سے روکتے ہیں۔ یہی امام مجاہد، ابن جریج اور ابن جریر رحمہم اللہ کا قول ہے۔[2] عبداللہ بن ابی بن سلول یہی کام کرتا تھا۔ بڑا منافق تھا۔ اللہ نے اس کے نفاق کا حال اس آیت میں مسلمین کی شکست اور فتح کی صورت میں بیان کیا کہ اگر قتل وشہادت کی نوبت آئی اور دشمن غالب ہوا تو منافق کہتا ہے کہ اچھا ہوا کہ میں بچ گیا اور اگر مسلمانوں کو فتح ملی، اللہ کی مدد، کامیابی اور غنیمت ہاتھ آئی تو اپنے حصے کے نہ ملنے پر افسوس کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تھوڑی سی دنیا کے پیچھے اپنا ایمان فروخت کرتے ہیں۔

مجاہدوں کا اجر:

پھر مجاہدوں اور غازیوں کے لیے جنت کا وعدہ فرمایا، جس طرح حدیث صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے: «تَكَفَّلَ اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ بِأَنْ تَوَفَّاهُ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ أَوْ يُرْجِعَهٗ إِلٰى مَسْكَنِهِ الَّذِيْ خَرَجَ مِنْهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيْمَةٍ»[3] یعنی مجاہد اگر مر گیا تو جنت میں جائے گا اور اگر گھر میں پھر کر آیا تو اجر یا غنیمت کا مال لے کر آیا۔ وباللہ التوفیق.

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٥٣٧) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٩٨)

[2] تفسير الطبري (٨/ ٥٣٨، ٥٣٩) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٩٩٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٧٦)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ خاص مومنین کو خطاب ہے اور انھیں کافروں کے ساتھ جہاد کرنے کا اور اللہ کے راستے میں نکلنے کا حکم ہے۔ ﴿ اِنْفِرُوْا ﴾ کے معنی ہیں: "اِنْهَضُوْا" یعنی دشمن سے جنگ کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ الگ الگ ایک لشکر کے بعد دوسرا لشکر اور خواہ اکٹھے سب کے سب ایک ہی بار نکل پڑو کہ دشمن کو ڈر ہو۔

کہتے ہیں کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہے: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ﴾ [التوبة: ٤١] "تم ہلکے (بھی) نکلو اور بوجھل (بھی)۔" اور اس آیت سے: ﴿ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [التوبة: ٣٩] "اگر تم نہیں نکلو گے تو وہ (اللہ) تمھیں دردناک عذاب دے گا۔" لیکن صحیح یہ ہے کہ دونوں آیتیں محکم ہیں۔ ایک آیت اس وقت کے حق میں ہے کہ سب لوگوں کے نکلنے کی ضرورت ہو اور دوسری اس وقت کہ بعض لوگ نکل آئیں تو بھی کافی ہیں۔ تبطیہ و ابطا کے معنی ہیں: تاخیر کرنا، مراد اہلِ نفاق ہیں، جو نکلنے میں دیر کرتے تھے اور غیروں کو بھی بیٹھے رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ مصیبت سے اس جگہ قتل، شکست یا مال کا چلے جانا ہے۔ فضل سے مراد غنیمت یا فتح ہے۔ فضل کی نسبت اللہ کی طرف کرنا اور مصیبت پہنچنے کی نسبت اللہ کی طرف نہ کرنا، یہ قرآن کا اسلوبِ بیان ہے۔ دنیا کو آخرت کے عوض بیچ دینا مومنوں کا کام ہے۔

﴿ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ ﴾ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مجاہد کو چاہیے کہ اپنی جان کو ان دو امور میں سے ایک پر مضبوط رکھے۔ شہادت و کامیابی دونوں حالت میں اس کو وافر ثواب ملے گا۔ ظاہر آیت اس بات کی مقتضی ہے کہ دونوں صورتوں میں اجرِ عظیم برابر ملے۔ اگرچہ شہادت کا اجرِ اعظم ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ اُس کے لیے ضامن ہے، جو اُس کی راہ میں صرف اُس کی راہ میں جہاد اور اُس کے رسولوں کے ساتھ ایمان اور تصدیق کے عقیدے کے ساتھ نکلا۔ وہ شخص اللہ کی ضمانت کا حق دار ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کرے یا اُسے اُس کے گھر کی طرف پھیرے، جس سے وہ نکلا ہے اجر یا غنیمت دے کر۔[1] (أخرجه الشيخان، اللفظ لمسلم)

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ
مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا
مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٧٦) فتح البيان (٣/ ١٧٤۔ ١٧٧)

لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ
الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ
ضَعِيْفًا ۝

اور (اے مسلمانو!) تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے، جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال کہ اس کے باشندے ظالم ہیں، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حمایتی بھیج، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار مقرر فرما (75) جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ طاغوت (شیطان) کی راہ میں لڑتے ہیں، چناں چہ تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو، بے شک شیطان کی چال بڑی کمزور ہے (76)

کمزوروں کو بچانے کے لیے جہاد کی ترغیب:

یعنی دو وجوہ کی بنا پر تمھارے لیے لڑنا ضروری ہے: ایک تو اللہ کا دین بلند کرنے کے لیے اور دوسرے ان مسلمانوں کی خلاصی کے لیے جو مظلوم اور بے بس ہو کر کافروں کے ہاتھوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ شہر مکہ میں ایسے لوگ بہت تھے جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے، ان کے اقربا ان پر ظلم کرنے لگے کہ انھیں اسلام سے پھیر کر پھر کافر بنا لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے مومن بندوں کو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے اور ضعفائے مکہ کو ظالموں کے ہاتھوں سے چھڑانے کی سعی کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اس جگہ ظالموں کے قریہ (بستی) سے مراد مکہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ ﴾ [محمد: ۱۳] ''اور کتنی ہی بستیاں کہ وہ آپ کی اس بستی (مکہ) سے، جس (کے باشندوں) نے آپ کو نکال دیا ہے، کہیں زیادہ طاقتور تھیں، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔''

پھر اس قریے والوں کو ظالم کہا۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ میں اور میری ماں مستضعفین میں سے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ''كُنْتُ أَنَا وَأُمِّي مِمَّنْ عَذَرَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ'' [1] پھر فرمایا کہ مومنین کا قتال کرنا اللہ کی اطاعت اور رضا مندی میں ہوتا ہے اور کافروں کا قتال کرنا شیطان کی اطاعت میں ہوتا ہے۔ پھر مومنوں کو ترغیب دی کہ تم شیطان کے دوستوں سے لڑو، شیطان کا مکر بودا (کمزور) ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ تم غالب رہو گے، وہ مغلوب ہو جائیں گے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۳۱۱، ۴۳۱۲)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں جہاد کے وجوب پر دلیل ہے، یعنی تمھارے لیے جہاد کو ترک کرنے کے لیے کوئی عذر نہیں۔ حالاں کہ مستضعفین کا حال کمزوری اور تکلیف میں اس درجے کو پہنچ گیا ہے۔ سو اللہ نے ان کی پکار سن لی۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کا ولی اور مددگار بنا دیا۔ فتح مکہ کے دن اُن کو مشرکوں کے ہاتھ سے رہائی ملی۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض مکہ سے چلے گئے، بعض فتح مکہ تک وہیں رہے۔ نبی اکرم ﷺ نے عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا والی مقرر کیا۔ انھوں نے مظلوم کا انصاف ظالم سے کیا۔[1] وہ اٹھارہ برس کے تھے۔

سبیل اللہ سے مراد اللہ کی اطاعت، اللہ کے کلمے کو بلند کرنا اور اللہ عزوجل کی رضا مندی تلاش کرنا ہے۔ اس میں مومنوں کو ترغیب دی ہے کہ تمھارا لڑنا بھڑنا اسی مقصد کے لیے ہے نہ کسی اور کام کے لیے۔ سبیلِ طاغوت سے مراد شیطان یا کاہن یا بُت ہیں۔ اس جگہ شیطان مراد ہے۔ پھر اس کے کید (تدبیر) کو ضعیف بتلایا ہے، یعنی اللہ کی مدد اور تائید کے مقابلے میں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تم جب شیطان کو دیکھو، مت ڈرو، اُس پر حملہ کرو، اس کا مکر بودا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھ کو شیطان نماز میں سامنے آتا، میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یاد کرتا اور اُس پر حملہ آور ہوتا، وہ میرے پاس سے چل دیتا۔[2] کید کہتے ہیں: بطورِ حیلہ فساد کی کوشش کرنا۔[3]

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ قِيۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِيۡقٌ
مِّنۡهُمۡ يَخۡشَوۡنَ النَّاسَ كَخَشۡيَةِ اللّٰهِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡيَةً ۚ
وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰٓى
اَجَلٍ قَرِيۡبٍ ؕ قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ ۚ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ
اتَّقٰى وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۷۷﴾ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكْكُّمُ
الۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ
يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا
هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ ؕ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ

[1] تفسير الجلالين (١/ ١١٣)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٠٣) الدر المنثور (٢/ ٥٩٣)
[3] فتح البيان (٣/ ١٧٨، ١٧٩)

هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝٧٨ مَآ اَصَابَكَ مِنْ
حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ
وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝٧٩

(اے نبی!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ تم (لڑائی سے) اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکات دو؟ پھر جب ان پر جنگ فرض کی گئی تب ان میں سے ایک گروہ کافر لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگا جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے یا اس سے بھی بڑھ کر خوف زدہ تھا۔ اور وہ کہنے لگے: اے ہمارے رب! تونے ہم پر جنگ فرض کیوں کی؟ تونے ہمیں کچھ مدت تک مہلت کیوں نہ دی؟ کہہ دیجیے: دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے اس شخص کے لیے جس نے پرہیز گاری اختیار کی اور تم پر کھجور کی گٹھلی کے دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا ⑦⑦ تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو، اور اگر انھیں کوئی بھلائی ملے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کی طرف سے ہے۔ کہہ دیجیے: یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، چناں چہ کیا حال ہے ان لوگوں کا جو بات سمجھنے کے قریب نہیں پھٹکتے! ⑦⑧ (اے انسان!) تجھے جو بھی بھلائی ملے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور تجھے جو بھی تکلیف پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ بطور گواہی کافی ہے ⑦⑨

قتال کے حکم میں تاخیر کے طلب گاروں کی مذمت:

یعنی جب تک مسلمان مکہ میں تھے اور کافر ایذا دیتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو لڑنے سے روکتا تھا، صبر کا حکم فرماتا تھا۔ اب جو حکم لڑائی کا آیا تو سمجھیں کہ ہماری مراد ملی، لیکن بعض کچے مسلمان کنارہ کرتے ہیں، موت سے ڈرتے ہیں، اللہ کے برابر آدمیوں سے ڈراتے ہیں۔ یہ منافقوں کا ذکر ہے کہ اگر تدبیرِ جنگ درست ہوئی، فتح وغنیمت ملی تو کہتے ہیں اللہ کی طرف سے ہوئی یعنی اتفاقاً بن گئی۔ نبی اکرم ﷺ کی تدبیر کے قائل نہیں ہوتے تھے اور اگر بگڑ گئی تو نبی کریم ﷺ کی تدبیر پر الزام رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ یعنی پیغمبر کی تدبیر اللہ کا الہام ہے، غلط نہیں اور بگڑے کو بگڑا نہ سمجھو، اللہ تم کو تمھاری غلطی پر سدھاتا ہے۔ اگلی آیت میں کھول کر فرما دیا کہ بندے کو چاہیے کہ نیکی کو اللہ کا فضل سمجھے۔ تکلیف اپنی تقدیر سے سمجھے، رسول پر الزام نہ رکھے۔ تقصیروں (کوتاہیوں) سے اللہ واقف ہے، وہی خبر دیتا ہے۔

مومنین ابتدائے اسلام میں جب مکہ میں تھے تو نماز وزکات کے مامور تھے، اگرچہ نصاب نہ ہو، لیکن فقرا سے

غمخواری کرنے اور مشرکوں سے عفو و درگزر کرنے کا حکم تھا کہ ایک وقت تک صبر کرو۔ دل میں جلتے تھے، چاہتے تھے کہ اگر قتال کا حکم ہو تو لڑ پڑیں، مگر اس وقت لڑنا چند اسباب سے مناسب حال نہ تھا۔ وہاں جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اسی لیے جہاد کا حکم مدینہ میں آیا نہ کہ مکہ میں۔ اس کے ساتھ جب قتال کا حکم آیا، جیسا کہ چاہتے تھے تو بعض مسلمان دشمن کے آمنے سامنے آنے سے ڈر گئے، کہنے لگے اگر جہاد کی فرضیت تھوڑی مدت تک اور نہ ہوتی تو اچھا ہوتا، جہاد میں خون ریزی، اولاد کا یتیم ہونا اور عورتوں کا بیوہ ہونا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴾ [محمد: ۲۰] ”اور جو لوگ ایمان لائے، وہ کہتے ہیں: (جہاد کے متعلق) کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی گئی؟ پھر جب کوئی محکم سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں قتال (جہاد) کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں روگ ہے کہ وہ آپ کی طرف اس شخص کی طرح دیکھتے ہیں، جس پر موت کے باعث غشی طاری ہو، چناں چہ ان کے لیے ہلاکت ہے۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی مکہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے نبی! ہم عزت میں تھے، جب مشرک تھے، جب سے ایمان لائے ہیں ذلیل ہو گئے ہیں۔ فرمایا: مجھ کو عفو کا حکم ہے، لہٰذا تم قوم سے لڑائی نہ کرو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو مدینہ میں لے آیا، قتال کا حکم دیا، لوگ باز رہے، اُس پر یہ آیت اُتری۔[1] (رواه ابن أبي حاتم والنسائي والحاكم وابن مردويه)

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن پر نماز اور زکات کے سوا کچھ فرض نہیں تھا، اللہ سے قتال کے فرض ہونے کی طلب کرتے تھے، جب فرض ہوا تو ایک گروہ اللہ کے ڈر سے بھی زیادہ لوگوں سے ڈرنے لگا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت یہود کے حق میں اُتری ہے۔[2] اللہ تعالیٰ نے کہا: متقی کی آخرت دنیا سے بہتر ہے۔ اعمال کی جزا پوری ملے گی، ایک دھاگے کے برابر ظلم نہیں ہوگا۔ اس میں اُن کو دنیا میں تسلی دی ہے، آخرت کی ترغیب دی ہے اور جہاد پر اُبھارا ہے۔

دنیا کی حقیقت:

جس نے اس آیت: ﴿ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ﴾ (آیت زیر تفسیر) کو پڑھ کر یہ کہا: اللہ اس بندے پر رحم کرے، جس نے اس آیت کے مطابق دنیاوی برتاؤ کیا۔ اول سے آخر تک ساری دنیا ایسی ہے، جیسے کوئی شخص سو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۱۰۰۵) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۰۸۶) مستدرك الحاكم (۲/ ۷۶) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير الطبري (۸/ ۵۵۰)

گیا، اُس نے خواب میں کوئی پسندیدہ چیز دیکھی، پھر آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا۔ ابومصہر اس شعر کو پڑھتے تھے ؎

وَلَا خَيْرَ فِي الدُّنْيَا لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ مِنَ اللّٰهِ فِي دَارِ الْمَقَامِ نَصِيْبٌ

فَإِنْ تُعْجِبِ الدُّنْيَا رِجَالًا فَإِنَّهَا مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّالزَّوَالُ قَرِيْبٌ

''جس کے لیے اللہ کی طرف سے دارِ مقام میں کوئی حصہ نہ ہو، اس کے لیے دنیا میں کوئی بھلائی نہیں۔
اگر تو اہلِ دنیا کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے تو یہ تھوڑا سا سامانِ زینت ہے اور زوال قریب ہے۔''

کتاب ''إدامة السكر بإقامة الصبر والشكر'' (نواب صاحب کی تالیف) میں دنیا کی مثالیں آیت و حدیث و اقوالِ سلف سے یکجا کر کے لکھی ہیں۔ کسی نے بوڑھی بدشکل عورت سے مثال دی ہے۔ کسی نے خواب و سراب سے ؎

دنیا خوابیست زندگانی در وی خوابست کہ در خواب بہ بینی آنرا

''دنیا ایک خواب کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں زندگی بسر کرنا بھی خواب ہی ہے، جسے تو خواب ہی میں دیکھتا ہے۔''

موت سے چھٹکارا نہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں ضرور مرنا ہے، ہرگز کوئی جان موت سے بچ نہیں سکتی، کیسی ہی مضبوط جگہ میں کیوں نہ ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴾ [الرحمن: ٢٦] ''ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ [العنكبوت: ٥٧] ''ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ﴾ [الأنبياء: ٣٤] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی۔''

مطلب یہ ہے کہ ہر کسی کو مرنا ہے۔ کوئی موت سے نجات نہیں پا سکتا، خواہ جہاد کرے یا نہ کرے۔ اس کے لیے حتمی طور پر ایک مدت اور وہ مقام مقرر ہے، جہاں اُس کو موت آنی ہے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب اپنے بچھونے پر مرنے لگے، کہا: میں فلاں فلاں موقف (جنگ) میں حاضر ہوا تھا، میرا کوئی عضو نہیں، جس میں کوئی زخم یا تیر نہ لگا ہو، اب میں اپنے بستر پر مرتا ہوں، نامردوں کی آنکھوں میں نیند نہ آئے؟![1]

﴿ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ سے مراد مضبوط اونچے قلعے ہیں یا بروجِ آسمان، لیکن امام سدی رحمہ اللہ کا یہ قول ضعیف ہے۔ صحیح یہی ہے کہ بڑے بڑے پتھروں والے بلند اور مضبوط قلعے مراد ہیں کہ وہ موت سے بچا نہیں سکتے۔ زہیر بن

[1] تاریخ دمشق (١٦/ ٢٧٣)

ابی سلمیٰ نے کہا ہے

وَمَنْ هَابَ أَسْبَابَ الْمَنَايَا يَنَلْنَهُ وَلَوْ رَامَ أَسْبَابَ السَّمَآءِ بِسُلَّمِ [1]

''جو موت کے اسباب سے ڈر گیا، وہ اس کو پا ہی لیں گے، چاہے وہ سیڑھی کے ذریعے ہی آسمان پر چڑھنے کی کوشش کرے!''

امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ امام مجاہد رحمہ اللہ سے ایک لمبی حکایت ذکر کی ہے، جس کا ترجمہ و خلاصہ یہ ہے کہ ہم سے پہلے ایک عورت تھی، اُس کو دردِ زہ شروع ہوا، اُس نے اپنے نوکر سے کہا: آگ لے آ، وہ باہر نکلا، ایک آدمی کو دروازے پر کھڑا دیکھا، اُس نے کہا: کیا پیدا ہوا؟ کہا: لڑکی جنی ہے۔ اُس نے کہا: سن رکھ، وہ سو آدمی سے زنا کرے گی، پھر اُس سے اُس کا ایک نوکر بیاہ کرے گا، اُس لڑکی کی موت مکڑی سے ہوگی، پھر متفکر ہو کر آیا، اس لڑکی کا پیٹ چھری سے چیر ڈالا، پھر بھاگ گیا۔ گمان کیا کہ وہ مر گئی ہوگی۔ اس کی ماں نے اُس کا پیٹ سیا، وہ اچھی ہوئی۔ جوان ہوئی کھچاؤ پر شباب پر آئی، شہر کی عورتوں سے خوبصورت نکلی، وہ آدمی جو چلا گیا تھا، وہ بحور میں داخل ہوا، بہت سا مال جمع کر کے اپنے شہر میں آیا، ایک بڑی عمر کی عورت سے کہا: میں شہر کی سب سے حسین عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: اس شہر میں فلاں عورت سے زیادہ کوئی بہتر نہیں ہے۔ کہا اچھا! میرا پیغام لے جا، وہ لے گئی۔ اُس عورت نے منظور کر لیا، جب اُس پر داخل ہوا، اس کو بہت ہی پسند کیا، اچھی معلوم ہوئی۔ اُس نے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو، تمھارا کیا حال ہے۔ اُس نے کہا: میں نے یہ کیا تھا، لڑکی کا قصہ بیان کیا، اُس نے کہا: وہ لڑکی تو میں ہی ہوں اور جہاں چھری لگی تھی، وہ جگہ دکھائی، اُس کو ثابت ہوا کہ ہاں یہ لڑکی وہی ہے۔ کہا: اگر تو وہی ہے تو دو باتیں مجھ کو بتا کہ وہ ضرور ہوئی ہوں گی: ایک یہ کہ تو نے سو مرد سے زنا کیا ہوگا، کہا: ہاں، یہ بات تو ہوئی ہے، لیکن گنتی معلوم نہیں ہے۔ کہا: وہ سو مرد ہیں۔ دوسرے یہ کہ تو مکڑی سے مرے گی۔ اس لیے ایک محل بلند تیار کیا تاکہ وہ مکڑی سے بچ جائے۔ ایک دن اچانک اس آدمی نے چھت پر مکڑی دیکھی تو اس نے عورت کو دکھایا۔ عورت نے کہا: یہی وہ مکڑی ہے، جس کا تجھے میرے بارے میں ڈر ہے۔ واللہ! اُس کو کوئی نہ مارے گا مگر میں۔ اُس کو چھت سے نیچے اُتارا، عورت نے اس کا قصد کیا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے اُس کو روند کر مار ڈالا، اُس کا زہر ناخن اور گوشت کے اندر سرایت کر گیا۔ پاؤں سیاہ پڑ گیا، ایسی حالت میں اُس کی موت واقع ہوگئی۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم اس جگہ صاحبِ حضر کا ایک قصہ ذکر کرتے ہیں، وہ ساطرون (حضر کا بادشاہ) ہے، اُس پر سابور نے حملہ کیا، یہاں تک کہ محاصرہ کر کے جتنے آدمی اُس کے اندر تھے، دو سال کے محاصرے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٠٨) تفسير ابن كثير (١/ ٦٨٧)

[2] تفسير الطبري (٨/ ٥٥٢۔ ٥٥٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٠٧۔ ١٠٠٨)

میں ان کو قتل کیا۔ عرب نے اس بارے میں اشعار کہے ہیں: جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، کہنے لگا: ''اَللّٰهُمَّ اجْمَعْ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ'' پھر یہ شعر پڑھا ؎

أَرَى الْمَوْتَ لَا يُبْقِي عَزِيزًا وَلَمْ يَدَعْ لِعَادٍ مَلَاذًا فِي الْبِلَادِ وَمَرْبَعَا
يُبَيِّتُ أَهْلَ الْحِصْنِ وَالْحِصْنُ مُغْلَقٌ وَيَأْتِي الْجِبَالَ فِي شَمَارِيخِهَا الْعُلٰى

''میں موت کو دیکھتا ہوں، وہ کسی صاحب عزت کو باقی نہیں رکھتی، نہ عاد کے لیے شہروں میں کوئی جائے پناہ چھوڑتی ہے۔ رات کے وقت جب قلعے مغلق ہوتے ہیں تو وہ ان کے پاس آجاتی ہے اور پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر بھی آجاتی ہے۔''

ابن ہشام رحمہ اللہ نے کہا کہ کسریٰ سابور ذوالاکتاف تھا، اُس نے ساطرون بادشاہ حضر کو مارا۔ ابن ہشام رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صاحبِ حضر کا قاتل سابور بن اردشیر بن بابک اول ملوک بنی ساسان ہے، جس نے ملوک طوائف کو ذلیل کر کے ملک کو اکاسرہ کی طرف پھیرا۔ رہا سابور ذوالاکتاف سو وہ اُس سے ایک طویل زمانہ بعد میں تھا۔[1] واللہ تعالیٰ أعلم.

منافقوں کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بدشگونی لینا:

اصابتِ حسنہ سے مراد رزق کی فراوانی ہے، جیسے: پھل اور زراعت اور اولاد اور اس جیسی اور چیزیں۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو العالیہ وسدی رحمہما اللہ کے اقوال کے معنی ہیں۔ اصابتِ سیئہ سے مراد پھلوں اور زراعت میں نقصان یا اولاد کی موت یا مردہ بچہ پیدا ہونا یا اور کچھ ہے۔ جس طرح ابو العالیہ وسدی رحمہما اللہ نے کہا ہے۔ پہلی بات کی نسبت اللہ کی طرف کرتے اور دوسری بات کی اضافت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے کہ یہ بلا اور آفت آپ کی اتباع اور آپ کے دین کی اقتدا سے پڑی ہے۔ جیسے قومِ فرعون کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ﴾ [الأعراف: ۱۳۱] ''پھر جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے: یہ ہمارے ہی لیے ہے اور اگر انھیں بدحالی آلیتی تو اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست ٹھہراتے۔''

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ [الحج: ۱۱] ''اور لوگوں میں سے کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے (شک) پر، پھر اگر اسے بھلائی مل گئی تو اس پر مطمئن ہو گیا، اور اگر اسے کوئی آزمائش آپڑی تو اپنے چہرے کے بل پلٹ جاتا ہے، اس نے دنیا اور آخرت میں خسارہ اُٹھایا، یہی کھلا خسارہ ہے۔''

اسی طرح وہ منافق جو ظاہر میں مسلمان بنے تھے اور حقیقتاً اسلام سے نفرت کرتے تھے، جب اُن کو کوئی شر

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۶۸۸۔ ۶۸۹) السیرة لابن هشام (۱/ ۱۹۵)

پہنچتا، اس کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف کرتے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسنہ سے مراد اولاد، جانوروں، گھوڑوں کی کثرت، حالات کی بہتری اور لڑکوں کی ولادت ہے، اس کو اللہ کی طرف سے بتاتے۔ سیئہ سے مراد مال کا نقصان ہے، اس کو نبی کریم ﷺ کے سبب سے کہتے کہ ہم نے جو اپنا دین چھوڑ کر اُن کی پیروی اختیار کی ہے۔ اس لیے اس آفت میں مبتلا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب اللہ ہی کی قضا وقدر سے ہے۔ اُس کا حکم ہر نیک و بد، مومن اور کافر پر نافذ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی حسنہ اور سیئہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ یہی امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1]

اچھائی اور برائی کی نسبت کرنے کا قاعدہ:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس قول پر جو شک و ریب، فہم کی کمی، لاعلمی، جہالت کی کثرت اور وفورِ ظلم سے صادر ہوا ہے۔ یہ فرمایا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات نہیں سمجھتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کیا اور مراد جنسِ انسان ہے، تاکہ جواب حاصل ہو کہ جو حسنہ تجھ کو پہنچا ہے، وہ اللہ کے فضل و لطف و رحمت سے ہے اور جو سیئہ پہنچا ہے، وہ تیرے نفس اور عمل کی طرف سے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ [الشوریٰ: ۳۰] ''اور تمھیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمھارے اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے (پہنچتی ہے)، اور بہت سی باتوں سے تو وہ درگزر ہی فرماتا ہے۔''

امام سدی، حسن بصری، ابن جریج اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ﴿فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ''بِذَنْبِكَ''۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے یعنی ''عُقُوبَةً لَّكَ يَا ابْنَ آدَمَ بِذَنْبِكَ'' ''اے ابن آدم! تیرے گناہ کی سزا کے طور پر۔'' پھر کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: «لَا يُصِيبُ رَجُلًا خَدْشُ عُودٍ وَّلَا عَثْرَةُ قَدَمٍ وَّلَا اخْتِلَاجُ عِرْقٍ إِلَّا بِذَنْبٍ وَ يَعْفُو اللّٰهُ أَكْثَرُ»[3] ''کسی آدمی کو کوئی خراش آئے، اس کا قدم پھسلے، اس کی کسی رگ میں کوئی کمزوری پیدا ہو تو وہ گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے اور اللہ اس سے اکثر معاف ہی کر دیتا ہے۔'' یہ قتادہ کی مرسل روایت ہے۔

لیکن صحیح میں یہ مرفوع متصل بھی آئی ہے۔ ''وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ هَمٌّ وَلَا حُزْنٌ وَلَا نَصَبٌ حَتَّى الشَّوْكَةَ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا خَطَايَاهُ''[4] ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! مومن کو کوئی دُکھ، غم پریشانی پہنچے حتی کہ کانٹا بھی چبھے تو اللہ اس کے ذریعے اس کی خطائیں مٹا دیتا ہے۔'' ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: ''فَمِنْ نَّفْسِكَ أَيْ بِذَنْبِكَ وَأَنَا الَّذِي قَدَّرْتُهَا عَلَيْكَ''[5]

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۶۸۹۔ ۶۹۰)

(2) تفسیر الطبري (۸/ ۵۵۸۔ ۵۵۹) (3) تفسیر الطبري (۸/ ۵۵۸) یہ روایت مرسل ہے۔

(4) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۳۱۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۷۳) (5) تفسیر الطبري (۸/ ۵۵۹)

مطرف بن عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا کہ تم کیا چاہتے ہو قدر سے۔ کیا تم کو وہ آیت کافی نہیں ہے، جو سورت نساء میں ہے، مراد یہی آیت باب ہے۔ پھر کہا: "وَاللّٰهِ مَا وُكِلُوْا إِلَى الْقَدَرِ وَقَدْ أُمِرُوْا وَ إِلَيْهِ يَصِيْرُوْنَ"[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نہایت قوی اور متین کلام ہے اور قدریہ اور جبریہ کے ردّ میں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم کو لوگوں کی طرف رسول کر کے بھیجا ہے، تاکہ تم اُن کو ہماری شریعت پہنچا دو اور جو امور محبوب اور پسندیدہ ہوں یا جو مکروہ ہیں، وہ بتا دو۔ اللہ اس بات پر گواہ ہے کہ اُسی نے تم کو بھیجا ہے۔[2]

فرستادۂ خاص پروردگار رسانندۂ حجتِ استوار
گراں مایہ تر تاجِ آزادگاں گرامی تر از آدمی زادگان

"آپ ﷺ اللہ کے خاص رسول ہیں۔ آپ ﷺ محکم دلیل کے پہنچانے والے ہیں۔ آپ ﷺ آزاد لوگوں کے سب سے زیاد قیمتی تاج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بنی آدم میں سب سے زیادہ مکرم و محترم ہیں۔"

عمومی تفسیر:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ آیت ﴿أَلَمْ تَرَ﴾ بقول امام مجاہد رحمہ اللہ یہود کے حق میں اُتری ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ منافقین کے حق میں اُتری ہے، جو قتال فرض ہونے سے پہلے اسلام لائے تھے۔ جب فرض ہوا تو اس کو مکروہ جانا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿وَقَالُوْا رَبَّنَا﴾ (آیت زیرِ تفسیر) سیاق کے زیادہ مشابہ ہے۔ ایسے کلام کا صحابہ سے صادر ہونا بعید ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکات کی فرضیت جہاد سے پہلے ہے۔

"بُرُوْج" سے مراد لوہے کے گھر ہیں یا قلعے۔ انعام و اکرام اور آزمایشیں سب اللہ ہی کی پیدا کردہ اور ایجاد کردہ ہیں۔ حسنہ، اللہ کا انعام ہے۔ سیۂ، آزمایش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَوَلَمَّآ أَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ﴾ [آل عمران: ١٦٥] "بھلا تمھارا کیا حال ہے جب (اُحد میں) تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ حالاں کہ (بدر میں) تم نے اس سے دگنی مصیبت کافروں کو پہنچائی تھی۔ کہہ دیجیے کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے، اس میں رسالت کا بالعموم تمام انسانوں کی طرف ہونے کا بیان ہے اور اسی جیسا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [سبا: ٢٨] "ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوش خبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔" نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الأعراف: ١٥٨] "کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔" اس سے رسول اللہ ﷺ کا منصب اور مقام ثابت ہوا، جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے۔[4]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٠٩) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٩٠) [3] تفسیر الطبري (٨/ ٥٥٠) [4] فتح البیان (٣/ ١٨٠۔ ١٨٤)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝٨٠ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَاۤىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝٨١

جس نے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے منہ موڑا تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا⑧⓪ اور منافق کہتے ہیں کہ (ہمارا کام تو) فرماں برداری ہے، پھر جب وہ آپ کے پاس سے اُٹھ کر جاتے ہیں تو رات کو ان کا ایک گروہ اس بات کے خلاف جوڑ توڑ کرتا ہے جو آپ کہتے ہیں۔ اور اللہ لکھ لیتا ہے جو وہ رات کو سازش کرتے ہیں، چناں چہ آپ انھیں جانے دیں اور اللہ پر بھروسا کریں اور اللہ کارساز کے طور پر کافی ہے⑧①

رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے:

اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے اور رسول ﷺ کی نافرمانی عین اللہ کی نافرمانی ہے، کیوں کہ رسول کوئی بات ہوائے نفس سے نہیں کہتے۔ جو کچھ کہتے ہیں، وحی سے کہتے ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: «مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَمَنْ أَطَاعَ الْأَمِيرَ فَقَدْ أَطَاعَنِي وَمَنْ عَصَى الْأَمِيرَ فَقَدْ عَصَانِي» (رواه ابن أبي حاتم) ''جس نے میری فرمانبرداری کی، اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی، جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی، جس نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔'' یہ حدیث صحیحین میں بھی مروی ہے۔[1]

پھر فرمایا کہ اگر کوئی پشت پھیرے تو تم پر کچھ نہیں تم پر تو یہی پہنچا دینا ہے۔ جو تمھارا اتباع کرے گا، وہ نیک بخت اور نجات پانے والا ہے، اتنا ہی اجر تم کو بھی ملے گا، جو کوئی تم سے پشت پھیرے گا، وہ خائب و خاسر ہوگا، تم پر اُس کا گناہ نہیں ہے، جس طرح حدیث میں مروی ہے: «وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَإِنَّهٗ لَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهٗ»[2] ''جو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتا ہے، وہ ہدایت یافتہ ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے، وہ اپنے ہی آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔''

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٥) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠١١)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٩٧) اس کی سند میں ''ابو عیاض اور عبد ربہ'' مجہول راوی ہیں۔ البتہ اس موضوع میں دوسری صحیح روایت موجود ہے۔ دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٠)

منافقوں کی بیوقوفی کا بیان:

پھر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حال سے خبر دی کہ وہ اظہار تو موافقت اور اطاعت کا کرتے ہیں، مگر جب تمھارے پاس سے باہر جاتے ہیں اور آنکھوں سے اوٹ میں ہوتے ہیں تو ایک گروہ کچھ اور ہی کہنے لگتا ہے۔ راتوں کو چھپ چھپ کر برخلاف صلاح مشورہ کرتا ہے۔ اللہ کو اُن کا یہ کام معلوم ہے۔ اللہ اُس کو لکھتا جاتا ہے۔ حفاظت کرنے والے اور لکھنے والے (فرشتے) اسی کام پر متعین اور مقرر ہیں۔ یہ اس بات کا ڈراوا ہے کہ اللہ دل کی باتوں اور بھیدوں کا عالم ہے اور وہ لوگ جو رسول کی مخالفت اور نافرمانی کے لیے تدبیریں کرتے ہیں، وہ سب اللہ کو معلوم ہیں۔

گو ظاہر میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور موافقت ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ اس کی سزا اور جزا ان کو دے گا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النور: ٤٧] ”اور وہ (منافق) کہتے ہیں: ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، اور ہم نے اطاعت کی، پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق (اطاعت سے) پھر جاتا ہے اور وہ لوگ مومن ہی نہیں۔“ پھر فرمایا کہ اے رسول! تم ان منافقوں سے درگزر کرو اور حوصلہ رکھو، ان سے منہ موڑ لو، ان کا مؤاخذہ نہ کرو نہ لوگوں پر ان کا حال ظاہر کرو اور نہ اُن سے ڈرو۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ اللہ کی دوستی اور مدد کافی ہے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ کہنے میں کہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، اس بات کا اعلان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی بزرگی اور شان اور مقام بہت بلند ہے۔ اس سے زیادہ بلندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کوئی امر و نہی نہیں کرتے، مگر وہی جو اللہ نے اُمر کیا یا نہی فرمائی۔ اگر رسول اللہ ﷺ بیان نہ فرماتے تو ہم اللہ کی فرض کی ہوئی کسی چیز کو نہ جانتے، جیسے: حج، زکات، روزہ، نماز اور نہ ان کو بجا ہی لا سکتے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ نے اطاعتِ رسول سے مسلمانوں پر حجت قائم کی ہے۔[1] اس آیت میں ان سے منہ پھیر لینے کا حکم ہے۔ اعراض کا یہ حکم اگلی آیت سے منسوخ ہے، جو یہ ہے۔[2]

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ
لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝٨٢ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ
الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ

---

[1] تفسیر الخازن (١/ ٥٦٣) [2] فتح البیان (٣/ ١٨٥)

مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ‌ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۳﴾

کیا پھر وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ یقیناً اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے (82) اور جب ان کے پاس کوئی امن یا خوف کی خبر آتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، حالاں کہ اگر وہ اسے رسول اور اپنے میں سے کسی ذمے دار حاکم کے حوالے کر دیتے، تو ایسی باتوں کی تہہ تک پہنچنے والے اس کی حقیقت جان لیتے، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند ایک کے سوا تم ضرور شیطان کے پیچھے لگ جاتے (83)

قرآن حق ہے:

یعنی مخلوق ہر حال میں اس حال کے موافق بولتی ہے۔ غصے میں مہربانی کرنے والوں کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ دنیا کے بیان میں آخرت یاد نہ آئے، آخرت کے بیان میں دنیا یاد نہ آئے۔ بے پرواؤں میں عنایت کا ذکر نہیں، عنایت میں بے پروائی کا۔ تو اس حال کا کلام سنے، دوسرے حال سے مخالف نظر آئے۔ قرآن مجید جو خالقِ کائنات کا کلام ہے، یہاں ہر چیز کے بیان میں دوسری جانب بھی نظر ہوتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہر چیز کا بیان ہر مقام میں ایک طریقے پر ہے۔ یہاں منافقوں کا ذکر تھا، اس میں بھی ہر بات پر اسی قدر الزام ہے، جتنا چاہیے۔ جماعت میں سے اُنھی پر الزام ہے جو الزام کے لائق ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ان میں سے بعض یوں کرتے ہیں۔

یعنی کہیں سے کچھ خبر آئے تو سب سے پہلے اسے سردار تک پہنچائے اور اس کے نائبین تک۔ جب وہ تصدیق کر لیں اور اُس پر بنیاد رکھیں، تب آپ اُس پر عمل کرے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو ایک قوم سے زکات لینے کے لیے بھیجا، وہ اس کے استقبال کو نکلے، اُس نے سمجھا کہ مجھے مارنے کے لیے نکلے ہیں۔ وہ لوٹ آیا اور شہر مدینہ میں مشہور کر دیا کہ فلانی قوم مرتد ہوگئی ہے۔ ابھی نبی اکرم ﷺ تک خبر نہ پہنچی تھی کہ شہر میں مشہور ہوگئی۔ اسی قسم سے ہر خبر بغیر تحقیق کے اور بغیر سردار کو خبر کیے ہوئے مشہور کرنے لگتے، وہ خبر آخر غلط نکلتی۔

یہ جو فرمایا کہ اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو سوائے تھوڑے لوگوں کے شیطان کے پیچھے لگ جاتے، یعنی اگر تربیت کے احکام ہر وقت نہ پہنچتے رہیں تو ہدایت پر کم ہی لوگ قائم رہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو حکم کیا ہے کہ قرآن میں غور کریں۔ قرآن کے معانی کو سمجھنے اور فرقانِ حمید کے اثر کرنے والے الفاظ سے اعراض نہ کریں (بے توجہی نہ کریں) اس لیے کہ یہ ایسا کلام ہے، جس میں کسی طرح کا اختلاف، اضطراب، تعارض، تناقض اور تہافت نہیں ہے۔ اور کیوں کر ہو کہ یہ اللہ حکیم وحمید نے نازل فرمایا ہے، بہتر سے بہتر اور حق سے حق بات ہے۔

اسی لیے دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ [محمد: ٢٤] ''کیا پھر وہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے یا اُن کے دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں؟''

اگر یہ قرآن کوئی گھڑی ہوئی یا بناوٹی بات ہوتی، اللہ کے سوا کسی اور نے اس کو ترتیب دیا ہوتا، جس طرح کہ جاہل مشرک اور منافق اپنے دل میں کہتے سمجھتے ہیں تو ضرور ہی اس میں اضطراب و تضاد بسیار پایا جاتا، حالاں کہ قرآن اس اختلاف سے سالم اور سلیم ہے، اللہ کے پاس سے آیا ہے، جس طرح اللہ نے راسخین فی العلم سے نقل کیا ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں: ﴿ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ﴾ [آل عمران: ٧] ''ہمارا ان (متشابہات) پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔'' یعنی خواہ محکم ہو یا متشابہ سب حق ہے، یعنی متشابہ کو محکم کی طرف لوٹایا ہدایت یافتہ ہوئے اور جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ محکم کو متشابہہ کی طرف پھیرتے ہیں، اس لیے گمراہ ہوئے۔ اسی لیے اللہ نے راسخین کی تعریف اور زائغین (جن کے دلوں میں کجی ہے) کی مذمت کی ہے۔

عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ عن ابیہ عن جدہ سے مروی طویل حدیث میں آیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآن کی ایک آیت کے بارے میں ممارات (جھگڑے) کی آوازیں بلند ہوئیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہوئے، سرخ چہرے سے باہر آئے، اُن پر مٹی پھینک کر ماری اور کہا: اے قوم! تم سے پہلے کی اُمتیں انبیا پر اسی اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ وہ بعض کتب کو بعض پر مارتے تھے۔ قرآن اس لیے نہیں اُترا ہے کہ اُس کا بعض بعض کی تکذیب کرے، وہ تو اس لیے نازل ہوا ہے کہ بعض اس کا بعض کی تصدیق کرے۔ سو جو تم اس میں سے پہچانو اُس پر عمل کرو اور جو نہ جانو اُس کو جاننے والے کی طرف پھیر دو۔[1] (رواہ أحمد) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک دن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا تھا۔ دو شخص ایک آیت میں اختلاف کر رہے تھے، ان کی آواز بلند ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّمَا هَلَكَتِ الْأُمَمُ قَبْلَكُمْ فِيْ اخْتِلَافِهِمْ فِيْ الْكِتَابِ»[2] (رواہ أحمد)

بات پھیلانے سے پہلے تحقیق کا حکم:

پھر اللہ تعالیٰ نے تحقیق سے پہلے امور میں جلدی کرنے سے منع کیا کہ کسی خبر و امر کو بغیر ثبوت کے پھیلانا نہیں چاہیے۔ شاید کہ صحیح نہ ہوں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنے مقدمہ صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: «كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ»[3] (رواہ أبو داود) ''کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بیان کر دے۔'' اس زمانے کے اردو اور فارسی وغیرہما کے اخبارات اس حدیث کے مصداق ہیں۔ اس مسئلے کی تنقیح (چھان بین) کتاب دلیل الطالب (نواب صاحب کی تالیف) میں ہے، جو مال اخبار نگاری

---

[1] مسند أحمد (٢/ ١٨١) اس کی سند حسن ہے۔ [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٦) مسند أحمد (٢/ ١٩٢)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٩٩٢)

کے ذریعے ہاتھ آتا ہے، وہ حرام ہے۔[1]

صحیحین میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیل اور قال سے منع فرمایا ہے۔[1] مراد وہ شخص ہے، جو کثرت سے لوگوں کی بات چیت کا ذکر کرتا ہے، اس کو ثابت کرنے یا اُس میں غور و تدبر کے بغیر۔ ابو داود کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ «بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ زَعَمُوْا»[2] صحیح میں مروی ہے کہ جس نے کوئی بات کہی اور وہ جانتا ہے کہ وہ بات جھوٹ ہے تو وہ بھی ایک جھوٹا ہے۔[3] اخبار نویس علما، شرفا، اہلِ بیات کی آبرو ریزی، دشنام دہی، غیبت اور بدگوئی کے لیے ہمیشہ جھوٹی اور اِدھر اُدھر کی سنی سنائی باتیں یا اپنے جی کی بنائی ہوئی خبریں درج کیا کرتے ہیں۔ بہتان باز اور غیبت کرنے والے ہو جاتے ہیں، حالاں کہ جھوٹ بولنا کبیرہ گناہ ہے، بلکہ قولِ زور (جھوٹی بات) کو شرک کے ساتھ ذکر کر کے اس کو شرک جیسا ٹھہرایا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث میں مروی ہے کہ اُن کو خبر ملی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ گھر سے مسجد میں آئے، دیکھا لوگ بھی چرچا کر رہے ہیں، صبر نہ ہوا، اجازت لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، پوچھا کہ کیا آپ نے طلاق دے دی ہے۔ فرمایا نہیں، کہا: "اَللّٰهُ أَكْبَرُ"[4] (الحدیث) یہ اس بات پر دلیل ہے کہ بغیر تحقیق کوئی خبر مشہور نہ کرے۔ مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے کہا: کیا آپ نے اُن کو طلاق دے دی ہے۔ فرمایا: نہیں، میں نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر زور سے پکار کر کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی۔ اس پر یہ آیت اُتری،[5] استنباط معدن سے نکالنے کو کہتے ہیں۔ ہر چیز کے اصل ذخیرہ سے نکالنا۔ قلیل سے مراد مومنین ہیں یا سب لوگ۔ آیت میں قیاس کے جواز کی طرف اشارہ ہے۔ (بشرطیکہ نص کے مقابلے میں نہ ہو)

فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِیْلًا ﴿۸۴﴾ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ﴿۸۵﴾ وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٤٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٩٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٩) [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٩)

بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿٨٦﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿٨٧﴾

چناں چہ (اے نبی!) آپ اللہ کی راہ میں لڑیں، آپ کو اپنی ذات کے سوا کسی کا ذمے دار نہیں بنایا گیا۔ اور آپ مومنوں کو (لڑائی پر) آمادہ کریں۔ امید ہے کہ اللہ ان لوگوں کو لڑائی سے روک دے جنھوں نے کفر کیا، اور اللہ لڑائی میں بہت سخت ہے اور سزا دینے میں بہت سخت ہے (84) جو کوئی اچھی سفارش کرے گا، اسے بھی اس کا کچھ حصہ ملے گا، اور جو کوئی بری سفارش کرے گا، اسے بھی اس کا کچھ حصہ ملے گا، اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے (85) اور جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو، بے شک اللہ ہر چیز کا خوب حساب لینے والا ہے (86) اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ ضرور تمھیں قیامت کے دن اکٹھا کرے گا، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور بات کہنے میں اللہ سے زیادہ کون سچا ہے؟ (87)

رسول کو قتال کا حکم:

کوئی کسی محتاج کی سفارش کر کے دولت مند سے کچھ دلوا دے، وہ بھی خیرات کے ثواب میں شریک ہوا اور جو کافر اور مفسد کو سفارش کر کے چھڑوا دے کہ وہ پھر فساد کرے تو وہ بھی اس فساد میں شریک ہے۔ کوئی کہے: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" تو واجب ہے کہ اگر اس کا جواب برابر دینا چاہے تو "وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ" اور جو زیادہ ثواب چاہے تو "وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" بھی کہے اور اگر سلام کرنے والے نے یہ کہا تو جواب میں "وَبَرَكَاتُهٗ" کہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ بذاتِ خود قتال کرو، اگر کوئی تمھارا ساتھ نہ دے گا تو اس کا الزام تم پر نہیں ہے۔ ہاں مومنوں کو تحریض اور ترغیب دو، انھیں بہادر بناؤ، جس طرح نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن، جب کہ آپ ﷺ صفیں برابر کرتے تھے، فرمایا تھا: « قُوْمُوْا إِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ »[1] "جنت کی طرف آؤ، جس کا عرض زمین و آسمان ہے۔"

تا جان نرود پا نکشم از سر کویت   نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

"جب تک جان نہ نکل جائے تیرے کوچے سے پاؤں نہیں کھینچوں گا۔ نامردی اور مردانگی میں ایک قدم کا فاصلہ ہی ہوتا ہے۔"

اس بارے میں بہت احادیث مروی ہیں۔ بخاری نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو اللہ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۰۱)

اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا، نماز قائم کی، زکات دی اور رمضان کا روزہ رکھا تو اللہ پر حق ہے کہ اس کو بہشت میں داخل کرے، اس نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہو یا اسی زمین میں بیٹھا رہا ہو، جس میں پیدا ہوا ہے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم لوگوں کو اس بات کی بشارت نہ دیں۔ فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیا ہے۔ ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فرق ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ سو جب تم اللہ سے مانگو تو فردوس مانگو کہ وہ افضل اور اعلیٰ جنت ہے، اس کی چھت رحمان کا عرش ہے، جنت کی نہریں وہیں سے بہتی ہیں۔[1] (وروي من حديث عبادة ومعاذ وأبي الدرداء ﷺ نحو ذلك)

اے اللہ! میں تجھ سے فردوس مانگتا ہوں۔ مجھ سے وہ کام کروا، جس سے میں اس کا مستحق بنوں۔ نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے فرمایا: جو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے رسول اور نبی ہونے پر راضی ہوا اس کے لیے جنت واجب ہوئی۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ نے خوش ہو کر کہا: پھر فرمائیے، پھر فرمایا: پھر کہا: پھر دوسری چیز جس سے اللہ بندے کو بلندی عطا فرماتا ہے، جنت کے سو درجے ہیں، ہر دو درجے کے درمیان اتنا فاصلہ ہے، جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ کہا: وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔[2] (رواہ مسلم)

پھر فرمایا کہ قریب ہے کہ اللہ کافروں کی لڑائی بند کر دے۔ یعنی آپ کے مسلمانوں کو جنگ پر اُبھارنے پر ان کی ہمتیں دشمنوں سے مقابلے کے لیے برانگیختہ ہوں۔ اسلام کے گرد و پیش سے مدافعت کریں، ثابت قدمی اور استقلال سے پیش آئیں، اللہ تعالیٰ ان پر دنیا و آخرت میں قادر ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاۡ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ﴾ [محمد: ٤] ''(حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا، لیکن (اس نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے۔''

اچھی سفارش اور بُری سفارش:

پھر اللہ نے سفارش کا حکم بیان کیا کہ اچھی سفارش میں اجر ہے، بُری سفارش میں بوجھ (گناہ) ہے۔ صحیح میں مرفوعاً مروی ہے: «اِشْفَعُوْا تُؤْجَرُوْا وَيَقْضِيَ اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهٖ مَاشَآءَ»[3] ''سفارش کرو، تمھیں اجر ملے گا، اللہ اپنے نبی کی زبان سے جو چاہے فیصلہ کروا دے۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت شفاعتوں کی شان میں اتری ہے۔ بعض بعض کی شفاعت کرتے ہیں۔[4] ''مُقِيت'' کے معنی ہیں: حفیظ۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام عطا، عطیہ، قتادہ اور مطر وراق رحمہم اللہ کا قول ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٣١، ٢٥٣٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٣٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٢٧)

[4] تفسير الطبري (٨/ ٥٨١)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معنی شہید ہے یا حیب (حساب لینے والا)۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بمعنی قدیر ہے۔[1] عبداللہ بن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقیت بمعنی واصب ہے۔[2] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بمعنی رزاق ہے۔ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہر انسان کو اس کے عمل کے اندازے سے قوت دیتا ہے۔[3] اسلام میں مماثلت (مانند ہونا) فرض ہے۔ زیادت مستحب ہے۔

سلام کا بہتر جواب دینا:

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" فرمایا: «وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ» پھر دوسرا آیا، اُس نے کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ» پھر ایک اور آیا، اُس نے کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" فرمایا: «وَعَلَيْكَ» اُس آدمی نے کہا: اے اللہ کے نبی! آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں! فلاں فلاں آئے، اُن کو آپ نے اُن کے سلام سے زیادہ جواب دیا، مجھ کو نہ دیا، فرمایا: تو نے ہمارے لیے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اُس سے بہتر یا اس کے مثل رد کرو، سو ہم نے تجھ پر رد کیا۔[4] (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ سلام میں اس صفت پر زیادت نہیں آئی ہے، اگر ہوتی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ کرتے۔

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک آدمی آیا، اس نے کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" جواب دیا، وہ بیٹھ گیا۔ فرمایا: دس ہیں۔ دوسرا آیا، اُس نے کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" اُس کو جواب دیا، وہ بھی بیٹھ گیا۔ فرمایا: بیس ہیں۔ ایک اور آیا، اس نے کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" اس کو جواب دیا، وہ بھی بیٹھ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیس ہیں۔ (رواه أحمد وأهل السنن) ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ تجھ کو اللہ کی مخلوق میں سے جو کوئی بھی سلام کرے تو اس کا جواب دے، اگرچہ مجوسی ہو، اس لیے کہ اللہ کہتا ہے: ﴿فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا﴾ (آیت زیرِ تفسیر) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿بِاَحْسَنَ مِنْهَآ﴾ مسلمانوں کے لیے ہیں۔ ﴿اَوْ رُدُّوْهَا﴾ اہلِ ذمہ کے لیے ہے۔[6]

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ١٠١٩۔ ١٠٢٠) (2) تفسیر الطبري (٨/ ٥٨٤) (3) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ١٠١٩۔ ١٠٢٠)

(4) تفسیر الطبري (٨/ ٥٨٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٢٠۔ ١٠٢١) اس کی سند میں "ہشام بن لاحق" متکلم فیہ راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٤٣٣)

(5) مسند أحمد (٤/ ٤٣٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٩٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٩١) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٠)

(6) تفسیر الطبري (٨/ ٥٨٧)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس تنزیل یعنی ترتیب میں نظر ہے، اس لیے کہ احسن سے مراد یہ ہے کہ جو لفظ اُس نے کہا ہے، اُس سے زیادہ کہو، پھر اگر وہ اس حد تک پہنچے، جو شرع میں آیا ہے تو اس کے مثل جواب دے، جس طرح حدیث متقدم میں گزر چکا ہے۔ باقی رہے اہلِ ذمہ، ان سے سلام کرنے میں پہل نہیں چاہیے، زیادہ کا کیا ذکر ہے۔

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم پر یہود سلام کریں تو وہ "اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ" کہتے ہیں تو تم بھی "وَعَلَیْکَ" کہو۔[1]

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ تم یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو اور جب تم ان میں سے کسی کو کسی راستے میں ملو تو انھیں تنگ تر راہ کی طرف مضطر کر دو (یعنی ان کے لیے تنگ راستہ چھوڑو)۔[2] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ سلام کرنا تطوع ہے (مستحب ہے) اور جواب دینا فرض ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے سب علما کا یہی قول ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، اگر جواب نہ دے گا تو گناہ گار ہوگا، کیوں کہ اُس نے اللہ کے حکم کے برخلاف کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا﴾ (آیت زیرِ تفسیر) پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ سارے اولین آخرین کو ایک زمین پر جمع کرے گا، ہر عامل کو اس کے عمل کی جزا دے گا، اللہ سے بڑھ کر کوئی اپنے وعدے اور وعید کا سچا نہیں ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، مگر مطلب یہ ہے کہ اے رسول! تم اور تمھاری امت کا ہر شخص اپنی جان سے اللہ کے راستے میں لڑے۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بہادر، شجاع اور جنگ کے تمام امور کا علم رکھتے تھے۔ اگر ایسے نہ ہوتے تو آپ کو یہ حکم بھی نہ ہوتا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے ساتھ جنگ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کی اور کہا کہ اگر کوئی اور میرے ہمراہ نہ ہوگا تو میں اکیلا لڑوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ مومنوں کو بھی ترغیب دو۔ ثواب میں ملامت نہ کرو۔ اُن کو تحیہ کے اصل معنی حیات کی دعا دینا ہے، اس جگہ مراد سلام ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے مراد چھینک کا جواب دینا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھیوں نے کہا کہ مراد ہدیہ ہے، مگر مفسرین نے اس کو فاسد کہا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ سلام سے ابتدا کرنا سنت اور پسندیدہ چیز ہے۔[5] شریعت نے سلام کے لفظ کو "حَیَّاكَ اللّٰه" پر اسی لیے اختیار کیا کہ یہ سب سے زیادہ تمام اور اچھا اور مکمل ہے۔ کیوں کہ سلام من جملہ

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٦٤) (2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٦٧)
(3) تفسير الطبري (٨/ ٥٩٠) (4) تفسير ابن كثير (١/ ٦٩٥) (5) تفسير القرطبي (٥/ ٢٩٨)

اسمائے الٰہی ہے۔ حسیب کے معنی ہیں ہر شے کا حساب لینے والا، ہر عمل کی جزا دینے والا اور ہر بندے کو کفایت کرنے والا۔ اللہ نے حشر کا ہونا لام قسمیہ سے فرمایا۔ اس آیت کا نزول منکرینِ قیامت کے حق میں ہے۔ ①

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ
اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ
فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا
فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ
وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا
الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ
حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ
شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ
يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾
سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ
كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ
وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ
حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

پھر تمھیں کیا ہوا ہے کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہو؟ حالاں کہ اللہ نے ان کے اعمال کی وجہ سے انھیں الٹا کر دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں کو ہدایت دو جنھیں اللہ نے گمراہ کیا ہو؟ اور جسے اللہ گمراہ کرے، پھر اس کے لیے آپ ہرگز کوئی راستہ نہیں پائیں گے (88) وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جس طرح کہ انھوں نے کفر کیا، پھر تم ان کے برابر ہو جاؤ، چناں چہ تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں، پھر اگر وہ (دین سے) منہ موڑیں تو تم انھیں پکڑو اور انھیں جہاں پاؤ قتل کر دو۔ اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ (89) مگر وہ لوگ (اس حکم سے

① فتح البیان (۳/ ۱۸۹۔ ۱۹۳)

مستثنیٰ ہیں) جو اس قوم سے تعلق رکھتے ہوں، جن سے تمھارا معاہدہ ہو چکا ہے یا (وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں) جو تمھارے پاس اس حالت میں آئیں کہ وہ لڑائی سے بے زار ہوں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں اور نہ اپنی قوم سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو انھیں تم پر مسلط کر دیتا، پھر وہ تم سے یقیناً لڑتے، لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور تمھارے ساتھ لڑنے سے باز رہیں اور تمھاری طرف صلح اور امن کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمھارے لیے کوئی گنجایش نہیں رکھی کہ تم ان سے لڑائی کرو ﴿90﴾ تمھیں ایک اور قسم کے منافق ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب کبھی وہ فتنے کا موقع پاتے ہیں تو اس میں کود پڑتے ہیں، چناں چہ ایسے لوگ اگر تم سے مقابلہ کرنے سے باز نہ آئیں اور تمھیں صلح اور امن کی پیش کش نہ کریں اور لڑائی سے اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم انھیں جہاں کہیں پاؤ، پکڑ کر قتل کر دو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر (ہاتھ اٹھانے کے لیے) ہم نے تمھیں کھلی اجازت دے دی ہے ﴿91﴾

اُحد سے لوٹنے والوں کے بارے میں اختلاف کرنے والوں کی مذمت:

یہاں اُن کو منافق فرمایا ہے جو ظاہر میں بھی مسلمان نہ تھے، لیکن نبیِ اکرم ﷺ سے ملاپ رکھتے اور محبت جتاتے تھے۔ اس غرض سے کہ اگر اُن کی فوج ہماری قوم پر چڑھائی کرے تو ہماری جان و مال بچ رہے۔ جب مسلمان خبردار ہوئے کہ اُن کی آمد و رفت اس غرض کے لیے ہے، دل کی محبت سے نہیں ہے تو بعض کہنے لگے: ان سے صحبت اور ملاقات ترک کر لیں، تاکہ ایک طرف ہو جائیں اور کچھ نے کہا کہ مل جائیں۔ اس سے شاید وہ ایمان لائیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہدایت اور گمراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کی فکر کرنے کی تمھیں کیا ضرورت ہے۔ باقی ایسے لوگوں سے کیسے معاملہ کرنا چاہیے، وہ آگے فرما دیا۔ یعنی جب تک تم میں نہ آئیں، تب تک ان کو بُرے بھلے میں شریک نہ کرو۔ لڑائی میں ان کو مت بچاؤ۔ اس ملنے جلنے سے ان کو لڑائی میں بچانا نہیں چاہیے، مگر دو صورت سے: یا وہ تمھاری صلح والوں کے ہم قسم ہیں، تو وہ بھی صلح میں داخل ہیں یا لڑائی سے عاجز ہو کر تم سے اس بات پر صلح کر لیں کہ نہ اپنی قوم کی طرف ہو کر تم سے لڑیں نہ تمھاری طرف ہو کر ان سے لڑیں۔ اگر وہ اپنے اس عہد پر قائم رہیں تو تم بھی اللہ کا احسان مانو کہ ہمارے لڑنے سے رُک گئے۔ پھر فرمایا کہ بعض ایسے ہیں کہ عہد بھی کر جاتے ہیں کہ نہ تم سے لڑیں نہ اپنی قوم سے، لیکن قائم نہیں رہتے، جب اپنی قوم کا غلبہ دیکھتے ہیں، ان کے رفیق ہو جاتے ہیں تو ان سے تم بھی قصور (کوتاہی) مت کرو، تمھارے ہاتھ یہ ثبوت آ گیا کہ وہ عہد پر قائم نہ رہے۔ یہ موضح القرآن میں ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے بارے میں مومنوں کے اختلاف کر کے دو گروہ ہو جانے پر نکیر فرمائی۔ اس کے سبب میں اختلاف ہے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اُحد کی طرف

نکلے، کچھ لوگ جو ساتھ آئے تھے، وہ پھر گئے۔ اصحابِ نبی اکرم ﷺ ان کے بارے میں دو گروہ ہوگئے، ایک گروہ نے کہا کہ ہم ان کو قتل کریں گے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں وہ مومن ہیں۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مدینہ پاک ہے اور وہ خبث کو اس طرح دور کرتا ہے، جس طرح بھٹی لوہے کے خبث کو دور کرتی ہے۔[1] (رواہ أحمد وأخرجاه في الصحيحين)

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے واقعہ اُحد میں ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول اس دن ایک تہائی لشکر لے کر پھر گیا، وہ تین سو آدمی تھے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سات سو آدمی رہ گئے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ ان لوگوں کے حق میں اُتری ہے، جو مکہ میں تھے، کلمہ اسلام کا پڑھتے تھے اور مدد کافروں کی کرتے تھے، مکہ سے اپنے کام کو نکلے تھے، کہنے لگے: اگر ہم کو اصحابِ محمد ﷺ ملیں گے تو ہمیں ان کا کچھ ڈر نہیں ہے۔ مومنوں کو جب یہ خبر ملی، ایک گروہ نے کہا: چلو اس طرف ان نامردوں کو چل کر قتل کریں، کیوں کہ وہ تمھارے خلاف تمھارے دشمنوں کی مدد کرتے ہیں۔ دوسرے گروہ نے کہا: سبحان اللہ! تم ان لوگوں کو قتل کرنا چاہتے ہو، جو تمھاری طرح کلمۂ اسلام کہتے ہیں۔ فقط اتنی بات پر کہ انھوں نے ہجرت نہیں کی اور اپنے گھر نہیں چھوڑے ہیں، ان کے خون اور مال کو تم حلال کرتے ہو؟ غرضیکہ وہ دو گروہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تھے، کسی ایک گروہ کو بھی منع نہ فرمایا، یہاں تک کہ یہ آیت اُتری۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

امام ابوسلمہ، عکرمہ، مجاہد، ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی اسی کے لگ بھگ روایت ہے۔ ابن سعد بن معاذ کا قول یہ ہے کہ اوس اور خزرج میں کچھ گفتگو ہوئی تھی۔ اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول کی بابت میں یہ آیت اتری، جس وقت نبی اکرم ﷺ نے قصہ اِفک میں منبر پر اُس کی طرف سے عذر کیا۔ لیکن یہ قول غریب ہے۔[4]

﴿ اَرْكَسَهُمْ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان کو رد کیا، خطا میں ڈالا۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ "اَهْلَكَهُمْ" کے معنی میں ہے۔[6] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَضَلَّهُمْ بِمَا كَسَبُوْا" کے معنی میں ہے۔[7] اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور نافرمانی اور باطل کے اتباع کی وجہ سے ایسا ہوا۔ سو جس کو اللہ گمراہ کرے، اس کو ہدایت کا راستہ کب مل سکتا ہے؟ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح گمراہ ہو جاؤ کہ تم اور وہ برابر ٹھہرو۔ ان کا یہ چاہنا ان کی تمھارے ساتھ دشمنی کی شدت اور بغض کی انتہا کے سبب سے ہے۔ اسی لیے

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٦، ١٣٨٤) مسند أحمد (٥/ ١٨٤)

(2) تفسير الطبري (٧/ ٣٧٨۔ ٣٨٠) (3) تفسير الطبري (٩/ ١٠۔ ١١) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٢٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

(4) تفسير ابن كثير (١/ ٦٩٦) (5) تفسير الطبري (٩/ ١٥) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٢٥) اس کی سند حسن ہے۔

(6) تفسير الطبري (٩/ ١٥) (7) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٢٥)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کو دوست نہ سمجھو، جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنا کفر ظاہر کر دیا۔[2] اب تم ان کو جہاں پاؤ پکڑ کر قتل کرو، کسی کو ان میں سے ولی اور نصیر (مددگار) نہ سمجھو کہ وہ تمھارے دشمنوں پر تمھاری مدد کریں گے، جب تک کہ وہ اس حالت پر ہیں۔

کس سے لڑا جائے اور کس سے نہ لڑا جائے:

پھر اللہ نے ان میں سے کچھ لوگوں کو مستثنیٰ فرمایا، یعنی مگر وہ لوگ جو ان لوگوں سے جا ملے ہیں، جن سے تمھاری صلح ہے تو ان کا حکم وہی ہے، جو ان صلح والوں کا ہے۔ یہ امام سدی، ابن زید اور ابن جریر رحمہ اللہ کا قول ہے۔[3]
سراقہ بن مالک مدلجی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ بدر اور اُحد پر غالب ہوئے، اردگرد کے لوگ اسلام لے آئے، میں نے سنا کہ آپ کا ارادہ ہے کہ خالد بن ولید کو میری قوم بنی مدلج کی طرف بھیجیں، میں نے آ کر کہا: "أَنْشُدُكَ النِّعْمَةَ" لوگوں نے کہا: چپ ہو جاؤ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کچھ نہ کہو، تو کہہ تو کیا چاہتا ہے؟ میں نے کہا: سنا ہے کہ آپ خالد بن ولید کو میری قوم کی طرف بھیجنا چاہتے ہیں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان سے مصالحت فرما لیں، اگر آپ کی قوم (قریش) مسلمان ہو جائے گی تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ اسلام میں داخل ہوں گے اور اگر آپ کی قوم مسلمان نہ ہوئی تو تمھاری قوم کے دلوں کا زور ان پر نہیں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اس کے ساتھ جاؤ، جو یہ چاہتا ہے، اُس طرح پر ان سے صلح کر لو۔ خالد رضی اللہ عنہ نے یہ صلح کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کی مدد نہ کریں اور اگر قریش اسلام لائیں تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں۔ اُس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری: ﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ ﴾[4] (آیت زیرِ تفسیر) (رواه ابن أبي حاتم وابن مردويه) ولفظه: «فَأَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ إِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَكَانَ مَنْ وَصَلَ أَيُّهُمْ كَانَ مَعَهُمْ عَلٰى عَهْدِهِمْ»[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلام کی یہ ترکیب انسب ہے۔ صحیح بخاری میں صلح حدیبیہ کے قصے کے تحت یوں آیا ہے: «فَكَانَ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّدْخُلَ فِيْ صُلْحِ قُرَيْشٍ وَعَهْدِهِمْ وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّدْخُلَ فِيْ صُلْحِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم وَأَصْحَابِهِ وَعَهْدِهِمْ» سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس آیت کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان نے منسوخ کر دیا: ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] "پھر

---

[1] تفسير الطبري (۹/ ۱۷۔ ۱۸) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۱۰۲۶) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[2] تفسير الطبري (۹/ ۱۸) [3] تفسير الطبري (۹/ ۱۹)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۱۰۶۲) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۵۸۱)

جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو۔'' [1]

﴿ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ ﴾ ایک اور قوم ہے۔ من جملہ استثناء کے، جن کو جنگ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں کہ میدانِ جنگ میں آئے، اُن کا جی نہیں چاہتا کہ وہ تم سے لڑیں یا تمھارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں، بلکہ وہ تمھارے نفع نقصان سے الگ ہیں، ہاں اگر اللہ چاہے تو اُن کو تم پر مسلط کر دے، پھر وہ تم سے جنگ کریں، لیکن یہ تم پر اللہ کی مہربانی ہے کہ ان کو تم سے روک دیا ہے، سو اگر وہ تمھارے ساتھ لڑنے سے کنارہ کشی کریں اور مسالمت (صلح) چاہیں تو تم کو بھی اُن سے لڑنا نہیں چاہیے، جب تک کہ وہ اپنی اس حالت پر موجود اور قائم رہیں۔ یہ لوگ اس جماعت کی مثل ہیں، جو بنی ہاشم میں سے مشرکوں کے ساتھ بدر کے دن آئے، جنگ میں حاضر ہوئے اور کارِہ (جنگ سے کراہت کرنے والے) تھے، جیسے: عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ، اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے سے منع کیا، فقط گرفتار کر لینے کا حکم دیا۔

یہ جو فرمایا کہ قریب ہے کہ تم دوسروں کو پاؤ گے، جو تمھارا اور اپنی قوم کا امن چاہتے ہیں، سو وہ لوگ ظاہری صورت میں مذکور قوم کے مثل ہیں، لیکن ان کی نیت اُن کی نیت سے مختلف ہے، کیوں کہ وہ ایک منافق قوم ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں، تاکہ اس حیلے سے اپنے اور اپنی اولاد کے خون اور مال کو بچا لیں۔ باطن میں کافروں سے پکی دوستی رکھتے ہیں۔ ان کا اور اُن کا معبود ایک ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٤] ''اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اور جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمھارے ساتھ ہیں ان لوگوں سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں۔'' اور یہاں یوں فرمایا: ﴿ كُلَّ مَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) یعنی فتنے میں انہماک کرتے ہیں۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ فتنے سے مراد شرک ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ مکہ میں سے ایک قوم کے حق میں اُتری ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر دکھاوے کے طور پر اسلام لاتے۔ پھر قریش کے پاس جا کر بتوں کی عبادت میں منہمک ہو جاتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہاں اور وہاں امن میں رہیں۔ اس لیے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا، اگر وہ کفار سے کنارہ کش ہو کر صلح نہ کریں۔[2] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ سلم کے معنی صلح کے ہیں، یعنی اگر وہ اپنا ہاتھ لڑائی سے نہ روکیں تو تم ان کو قید کر لو، مارو جہاں کہیں پاؤ، ہم نے تم کو ان پر ایک ظاہری حجت دی ہے۔ واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٢٦) تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٩٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٢٩)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ منافقین سے مراد عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی ہیں، جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کو اُحد کے دن چھوڑ دیا، اپنا لشکر واپس لے کر چلے آئے۔[1] اس قوم سے مراد، جس سے میثاق تھا، قریش ہیں اور وہ لوگ ہیں جو قریش سے جا ملے تھے، وہ بنو مدلج تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ خزاعہ تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ بنو بکر بن زید تھے۔ رہی وہ قوم جو یہاں اور وہاں اپنا امن چاہتے تھے، وہ اہلِ ذمہ سے تھے یا نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ ہے یا منافقین کی قوم تھی یا اسد وغطفان۔[2]

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِـيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْھَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کرے، مگر غلطی سے (ہو جائے تو اور بات ہے) اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے، اس پر ایک مسلمان غلام آزاد کرنا اور مقتول کے رشتے داروں کو خون بہا ادا کرنا لازم ہے۔ ہاں، اگر وہ لوگ معاف کر دیں (تو اور بات ہے)۔ پھر اگر وہ مقتول ایسی قوم میں سے ہو جو تمھاری دشمن ہو، جب کہ وہ خود مومن ہو تو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا لازم ہے۔ اور اگر وہ ایسی قوم میں سے ہو کہ تمھارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو چکا ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا، پھر جو شخص غلام آزاد کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ دو ماہ لگاتار روزے رکھے، یہ (کفارہ) اللہ کی طرف سے توبہ (قبول کرنے کا ذریعہ) ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، بہت حکمت والا ہے (92) اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے اس کی سزا جہنم ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اللہ نے اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے (93)

---

[1] تفسیر القرطبي (٥/ ٣٠٦) [2] فتح البیان (٣/ ١٩٤۔ ١٩٨)

قتلِ خطا کا حکم:

چوک (بھول) کی کئی صورتیں ہیں، یہاں یہ مذکور ہے کہ کافروں میں مسلمانوں کا امتیاز نہ کیا اور مار ڈالا۔ ہر طرح کے خطا کے قتل میں دو چیزیں لازمی ہیں: ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور مقدور نہ ہو تو دو ماہ کے پے درپے روزے رکھنا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی تقصیر کا تدارک ہے۔ دوسرے اس کے وارثوں کو خون بہا ادا کرنا، یہ اُن کا حق ہے۔ وہ اگر معاف کر کے چھوڑ دیں تو انھیں اختیار ہے۔ اگر اُس کے وارث مسلمان ہیں یا کافر، لیکن صلح رکھتے ہیں تو ادا کرنا واجب ہے اور اگر کافر ہیں اور دشمن ہیں تو واجب نہیں۔ حنفی مذہب میں مسلمان کا خون بہا اندازاً دو ہزار سات سو چالیس روپے[1] ہیں اور قاتل کی برادری کو تین سال کے اندر اندر دینے ہوتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مسلمان اگر قصداً مسلمان کو مار ڈالے، وہ دوزخی ہو چکا، اس کی توبہ قبول نہیں[2] اور علما نے کہا ہے کہ اس کی سزا وہی ہے، جو یہاں مذکور ہوئی، آگے اللہ مالک ہے، لیکن اگر قصاص میں مارا گیا تو سب کے قول میں پاک ہوا۔ اللہ پاک نے اس آیتِ شریفہ میں یہ فرمایا کہ کسی مومن کا اپنے مومن بھائی کو قتل کرنا کسی طرح سے درست نہیں ہے، جس طرح صحیح میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان مرد کا خون حلال نہیں، جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَإِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ" مگر تین میں سے ایک وجہ سے: جان کے عوض جان، ثیب (شادی شدہ) زانی اور دین کو چھوڑ کر جماعت سے علاحدہ ہونے والا۔[3] پھر اگر ان تینوں وجوہ میں سے کوئی شَے واقع ہو تو رعیت میں سے کسی ایک کو اس کا قتل کرنا جائز نہیں۔ یہ کام امام یا نائب امام کا ہے، اس جگہ خطا کا استثناء منقطع ہے، اس کے بہت سے شواہد ہیں۔

سببِ نزول:

سببِ نزول میں اختلاف ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ آیت ابو جہل کے بھائی عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے حق میں اُتری ہے۔ وہ اس کی ماں کی طرف سے اُس کا بھائی تھا۔ ماں کا نام اسما بنت مخرمہ ہے۔ اس نے ایک آدمی کو مار ڈالا، جس کو وہ اپنے بھائی سمیت اسلام پر اذیتیں دیتا تھا۔ وہ حارث بن یزید غامدی ہے۔ عیاش نے اس بات کو اپنے دل میں رکھا، وہ آدمی مسلمان ہو گیا، ہجرت کی۔ عیاش کو معلوم نہیں تھا، فتح کے دن اُس کو دیکھا، گمان کیا کہ وہ اپنے دین پر ہے، اُس پر حملہ کیا اور مار ڈالا تو یہ آیت آئی۔

---

[1] یہ آج سے تقریباً پونے دو صدیاں پہلے کا اندازہ ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢٣) تفسير الطبري (٩/ ٦٢۔ ٦٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٦)

عبدالرحمٰن بن زید نے کہا کہ یہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے۔ انھوں نے ایک آدمی کو قتل کیا، اس نے اس وقت کلمۂ ایمان کہا تھا، جب انھوں نے اُس پر تلوار اُٹھائی تھی، جب یہ ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا (اور آپ نے ابوالدرداء سے پوچھا) تو انھوں نے کہا: اُس نے تو اپنی پناہ کے لیے کلمہ کہا تھا۔ فرمایا: کیا تو نے اُس کا دل پھاڑ کر دیکھ لیا تھا؟ یہ قصہ صحیح میں آیا ہے، مگر ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کے نام سے۔[1]

مومن غلام آزاد کرنا:

غلام کا آزاد کرنا یا دیت کا دینا قتلِ خطا میں واجب ہے۔ یہ اُس گناہِ عظیم کا کفارہ ہے، اگرچہ خطا سے ہوا ہے۔ بردہ (غلام) کا مومن ہونا شرط ہے۔ بردہ کافر کافی نہیں ہوتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام شعبی، ابراہیم نخعی اور امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صغیر (بچہ) کافی نہیں ہے، مگر جب ایمان لانے کا قصد رکھتا ہو۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے: "فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ لَّا يُجْزِيْ فِيْهَا صَبِيٌّ" ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر وہ مسلمان ماں باپ کے درمیان موجود ہو تو کافی ہے اور اگر نہیں تو نہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ہوگا تو اس کا بطورِ کفارہ آزاد کرنا صحیح ہے، خواہ صغیر ہو یا کبیر۔[2]

عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک انصاری کالی لونڈی لایا، کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ پر ایک مومن غلام کا آزاد کرنا واجب ہوا ہے، اگر آپ دیکھیں کہ یہ مومنہ ہے تو میں اُسے آزاد کر دوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کنیز سے کہا: تو "لا الٰه إلا الله" کی گواہی دیتی ہے؟ کہا: ہاں۔ پوچھا: کیا تو گواہی دیتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ کہا: ہاں۔ پوچھا کیا تو موت کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے پر ایمان رکھتی ہے؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: اس کو آزاد کر دے۔[3] (رواه أحمد) یہ اسناد صحیح ہے۔ صحابی کی جہالت (اس کے نام وغیرہ کا علم نہ ہونا) مضر نہیں۔

موطا امام مالک، مسند شافعی، احمد، صحیح مسلم، سنن ابی داود اور نسائی میں سیدنا معاویہ بن الحکم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ کالی کنیز کو لایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کنیز سے کہا: «أَيْنَ اللّٰهُ؟» "اللہ کہاں ہے؟" اُس نے کہا: "فِيْ السَّمَآءِ" "آسمان پر ہے"۔ پوچھا: میں کون ہوں؟ کہا: "أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" "آپ اللہ کے رسول ہیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ"[4] "اس کو آزاد کر دے، یہ مومنہ ہے۔"

---

[1] تفسير الطبري (٩/ ٣٢۔ ٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٦٩٨) تفسير الطبري (٩/ ٣٥۔ ٣٣٦)

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٥١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ورجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ١/ ١٧٠)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٣٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢١٨) الموطأ (٢/ ٧٧٦) الأم (٥/ ٤٠٢) مسند أحمد (٥/ ٤٤٧)

دیت دینا:

قتلِ خطا میں دوسرا واجب قاتل اور مقتول کے وارثوں کے درمیان دیت ہے، جو وارثوں کے لیے اپنے عزیز کی محرومی کے عوض ہے۔ یہ دیت بطورِ اخماس (پانچ مختلف عمروں کے اونٹ) واجب ہوتی ہے۔ احمد و اہلِ سنن نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیتِ خطا میں بیس بنت مخاض، بیس ابن مخاض نر، بیس بنت لبون، بیس جذعہ، بیس حقہ کا حکم دیا۔ یہ نسائی کے الفاظ ہیں۔ ترمذی نے کہا: "لا نعرفه مرفوعاً إلا من هذا الوجه"[1] یہ حدیث سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔[2]

بنت مخاض (دوسرے برس میں لگی ہوئی اونٹنی)، ابن مخاض (دوسرے برس میں لگا ہوا اونٹ)، بنت لبون (تیسرے برس میں لگی ہوئی اونٹنی)، جذعہ (پانچویں برس میں لگی ہوئی اونٹنی)، حقہ (چوتھے برس میں لگی ہوئی اونٹنی)۔ یہ حدیث سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ایک گروہ سے بھی موقوفاً مروی ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ بطورِ ارباع (چار مختلف عمروں کے اونٹ) واجب ہے۔ اس دیت کا وجوب عاقلۂ قاتل پر ہے (یعنی قاتل کے وارثوں اور خاندان اور قبیلے پر) نہ مالِ قاتل میں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بات کے کسی مخالف کا مجھے علم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاقلہ پر دیت کا حکم دیا۔ یہ حدیث خاصہ میں سے ہے۔[4] یہ بات جس کی طرف امام شافعی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا، کئی حدیثوں سے ثابت ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ ہذیل قبیلہ کی دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں، ایک نے دوسری کو پتھر مارا، اس کے پیٹ کا بچہ مر گیا، جھگڑا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بچے کی دیت ایک غلام یا ایک لونڈی ہے۔ عورت کی دیت اس کے عاقلہ پر ہے۔[5] (أخرجه الشيخان) یہ اس بات کی مقتضی ہے کہ وجوبِ دیت میں عمدِ خطا کا حکم خطائے محض کے حکم کی مثل ہے، لیکن اس میں دیت شبہ عمد کے سبب بطورِ اثلاث (تین قسم کے اونٹ) واجب ہے۔

صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بنی جزیمہ کی طرف بھیجا اور اُن کو اسلام کی طرف بلایا، وہ اچھی طرح یہ لفظ نہ کہہ سکے کہ ہم اسلام لائے، یوں کہنے لگے کہ ہم صابی ہوئے۔ خالد رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کر دیا شروع کر دیا، جب یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر

---

[1] مسند أحمد (١/ ٤٥٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٨٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٣١) اس کی سند میں خشف بن مالک عن ابن مسعود مجہول راوی ہے۔ نیز حجاج بن ارطاۃ مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٠٢٠)

[2] تفسیر الطبري (٩/ ٤٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسیر الطبري (٩/ ٤٥)　[4] الأم للشافعي (٦/ ١٥٠)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٨١)

فرمایا:«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَبْرَءُ إِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ»[1] ”اے اللہ! جو خالد نے کیا، میں اس سے بری ہوں۔“ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ جاؤ ان کے مقتولین کو دیت دو اور جو مال اُن کا ضائع ہوا ہو، اس کا عوض کرو، یہاں تک کہ کوئی کتا بھی ضائع ہوا ہو تو اس کا عوض بھی دو۔[2]

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ امام یا نائب امام کی خطا کا عوض بیت المال سے دیا جائے گا۔ پھر فرمایا کہ اگر مقتول کے وارثین اپنی طرف سے دیت چھوڑ دیں اور عاقلۂ قاتل پر صدقہ کر دیں تو پھر اس کا دینا واجب نہیں ہے۔ ہاں اگر مقتول مومن تھا اور اس کے وارث اہلِ حرب کافر تھے، تو ان کے لیے دیت نہیں ہے۔ قاتل پر صرف ایک مومن غلام کا آزاد کرنا واجب ہے اور اگر اولیائے مقتول اہلِ ذمہ ہیں یا اہلِ ہدنہ یعنی صلح کے تو ان کو ان کے مقتول کی دیت ملے گی۔ اگر مومن تھا تو دیت کاملہ ہے۔ اسی طرح اگر کافر تھا، تب بھی علما کے ایک گروہ کے نزدیک یہی ہے۔ بعض نے کہا کہ کافر میں مسلمان کی دیت کا نصف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک تہائی ہے، جس طرح کتاب الاحکام میں مفصل مذکور ہے۔

غلام نہ ملنے کی صورت میں مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنا:

پھر اگر قاتلِ مومن غلام نہ پائے تو دو ماہ پے در پے روزے رکھے، درمیان میں افطار (روزے کا ناغہ) نہ کرے، بلکہ لگا تار دو ماہ تک روزہ رکھتا جائے۔ اگر بغیر کسی عذر کے، جیسے: بیماری، حیض یا نفاس ہے، افطار (ناغہ) کرے گا تو پھر نئے سرے سے روزے رکھنا پڑیں گے۔ سفر میں اختلاف ہے کہ آیا روزے چھوڑے یا نہیں۔ اس میں دو قول ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قاتل خطا کی توبہ ہے کہ اگر غلام آزاد نہ کرے تو دو ماہ کے روزے رکھے، جس کو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں، اس میں اختلاف ہے کہ وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، جس طرح ظہار کے کفارہ (بیوی کو ماں کہہ دینا) میں دیتا ہے یا نہیں۔ اس میں بھی دو قول ہیں: ایک یہ کہ دے، جس طرح ظہار کے کفارہ میں مقرر کیا گیا ہے۔ اس جگہ کفارے کا ذکر اس لیے نہیں ہوا کہ یہ جگہ ڈرانے اور خوف دلانے کی تھی، اس لیے یہاں کھانا کھلانے کا ذکر مناسب نہیں تھا کہ اس میں ایک طرح کی سہولت اور رخصت نکلتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ طعام کی طرف نہ پھر جائے، کیوں کہ اگر طعام واجب ہوتا تو حاجت کے وقت سے اس کے بیان کی تاخیر نہ ہوتی۔

قتلِ عمد پر وعید اور اس کا حکم:

پھر اللہ تعالیٰ نے قتلِ خطا کے حکم کے بعد قتلِ عمد کے حکم کا بیان فرمایا کہ عمداً قتل کرنے والا ہمیشہ کے لیے آگ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (٤٠٨٤)

[2] السيرة النبوية لابن هشام (٥/ ٩٦) دلائل النبوة للبيهقي (٥/ ١١٤۔ ١١٥) یہ روایت مرسل ہے۔

میں ہے۔ یہ اس شخص کے لیے، جو ایسا گناہِ عظیم کرے، سخت ڈراوا اور وعید ہے، جو شرک باللہ کے قریب ہے، کئی آیتوں میں ہے۔ سورت فرقان میں فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٨] ''اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اور وہ کسی نفس کو بھی جسے (مارنا) اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ناحق قتل نہیں کرتے اور وہ زنا نہیں کرتے، اور جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ گناہ کی سزا پائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٥١] ''کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں، اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں، اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو، ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے، تاکہ تم عقل سے کام لو۔''

قتل کی تحریم:

قتل کی تحریم میں بہت کثرت سے آیات اور احادیث مروی ہیں۔ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ سب سے پہلے جو فیصلہ قیامت کے دن ہوگا، وہ خون کے مقدمے میں ہوگا۔[1] ابو داود کی دوسری حدیث میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ مومن ہمیشہ آزاد اور صالح ہے، جب تک کوئی حرام خون نہیں کیا۔ جب حرام خون کیا تو ہلاک ہوا۔[2] تیسری حدیث میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کا زوال کسی مسلمان مرد کے قتل سے آسان ہے۔[3]

چوتھی حدیث میں ہے کہ اگر آسمان اور زمین والے کسی مسلمان مرد کے قتل پر اکٹھے ہوں تو اللہ ان کو اوندھے منہ آگ میں ڈالے گا۔[4] پانچویں حدیث میں ہے کہ جس نے مسلمان کے قتل میں مدد کی، اگرچہ آدھے کلمے ہی سے ہو تو وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا کہ وہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہے۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٩٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٨٧) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١٥)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٩٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١٦)

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٢٠) اس کی سند میں ''یزید بن زیاد'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٠٣)

قاتل کی توبہ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اعتقاد یہ تھا کہ مومن کو عمداً قتل کرنے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ کہتے تھے: ”هِيَ آخِرُ مَا نَزَلَ وَمَا نَسَخَهَا شَيْئٌ“ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ”لَمْ يَنْسَخْهَا شَيْئٌ“[1] تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب کسی شخص نے اسلام اور شرائع اسلام کو پہچان لیا، پھر اس نے کسی مومن کو عمداً قتل کیا تو اس کے لیے توبہ نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ”إِلَّا مَنْ نَدِمَ“ یعنی مگر وہ جو نادم ہوا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جب نابینا ہوگئے، ان کے پاس ایک آدمی نے آ کر کہا: تم اس مرد کے حق میں کیا کہتے ہو، جس نے ایک مومن کو عمداً مار ڈالا؟ کہا: ﴿فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا ... الخ﴾ کہا: بھلا اگر توبہ کر کے عملِ صالح کرے، پھر راہ پر آ جائے؟ کہا روئے اس کو اس کی ماں، بھلا اس کے لیے توبہ اور ہدایت کہاں ہے؟! قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے تمھارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے، وہ فرماتے تھے: «ثَكِلَتْهُ أُمُّهُ» ”اس کی ماں اسے گم کرے۔“ مومن کو عمداً قتل کرنے والے کا داہنا ہاتھ پکڑ کر قیامت کے دن مقتول آئے گا، اس کی رگوں سے خون بہتا ہوگا۔ عرشِ رحمان کے سامنے قاتل کا ہاتھ پکڑ کر کہے گا: اے رب! اپنے بندے سے پوچھ! اس نے مجھے کیوں قتل کیا تھا۔ قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں عبداللہ کی جان ہے۔ یہ آیت اتری، پھر کسی آیت نے اس کو منسوخ نہیں کیا، یہاں تک کہ تمھارے نبی کی روح قبض کر دی گئی۔ اس کے بعد کوئی برہان نہیں آئی۔[3]

امام احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: «لَقَدْ نَزَلَتْ مِنْ آخِرِ مَا نَزَلَ مَا نَسَخَهَا شَيْئٌ حَتّٰى قُبِضَ ﷺ وَمَا نَزَلَ وَحْيٌ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»[4] (الحديث و رواه النسائي) غرضیکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بطرقِ کثیرہ مروی ہے۔ سلف کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے، جیسے: سیدنا زید بن ثابت، ابوہریرہ، ابن عمر رضی اللہ عنہم، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، عبید بن عمیر، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ۔[5] اس بارے میں بہت احادیث مروی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ قیامت کے دن مقتول اپنے قاتل کو پکڑے ہوئے آئے گا، اپنے ہاتھ سے اُس کا سر پکڑ کر کہے گا: اے رب! اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے اُس کو قتل کیا، تاکہ تجھ کو غلبہ ہو، فرمایا: ہاں وہ میرے لیے ہے۔ دوسرا آئے گا، اپنے قاتل کو لیے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٤٢) تفسير الطبري (٩/ ٦٢۔ ٦٣)

[3] تفسير الطبري (٩/ ٦٣) احمد شاکر رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] مسند أحمد (١/ ٢٤٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٦٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٠٣١)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٣٧)

ہوئے کہے گا: اے رب! اس سے پوچھ! اس نے مجھ کو کیوں قتل کیا، وہ کہے گا: اس لیے قتل کیا، تا کہ فلاں کو غلبہ ہو۔ اللہ فرمائے گا: اس کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کا گناہ لے کر آیا ہے، پھر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، ستر برس کی راہ تک۔[1] (رواه ابن مردويه والنسائي)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ہر گناہ لگتا ہے کہ اللہ اس کو بخش دے، مگر وہ مرد جو کافر مرا یا وہ مرد جس نے دیدہ و دانستہ کسی مومن کو قتل کیا۔[2] (رواه أحمد والنسائي) ابو الدرداء کی روایت اس طرح ہے: «كُلُّ ذَنْبٍ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَغْفِرَهُ إِلَّا مَنْ مَّاتَ مُشْرِكًا أَوْ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا»[3] (رواه ابن مردويه) یہ حدیث سخت غریب ہے۔ اس وجہ سے محفوظ وہی حدیث ہے، جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس نے کسی مومن کو عمداً قتل کیا، وہ اللہ عزوجل کا کافر ہوا۔ (رواه ابن مردويه) لیکن یہ حدیث منکر ہے۔ اس کی سند میں کلام ہے۔[4] عقبہ بن مالک لیثی رضی اللہ عنہ سے طویل مرفوع حدیث میں مروی ہے: «إِنَّ اللّٰهَ أَبٰى عَلٰى مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا» تین بار یہ کلمہ فرمایا۔[5] (رواه النسائي)

جمہور اُمت کا موقف:

لیکن اُمت کے جمہور سلف اور خلف اس پر ہیں کہ قاتل کی توبہ اس کے اور اللہ کے درمیان ہو سکتی ہے۔ اگر توبہ کی اور رجوع کیا، خشوع و خضوع کیا۔ عملِ صالح بجا لایا تو اللہ اس کی سیئات کو حسنات سے بدل دے گا، مقتول کو اس ظلم کا عوض عنایت فرمائے گا۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ٦٨۔ ٧٠] ”اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اور وہ کسی نفس کو بھی جسے (مارنا) اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ناحق قتل نہیں کرتے اور وہ زنا نہیں کرتے، اور جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ گناہ کی سزا پائے گا۔ یومِ قیامت اس کا عذاب دُگنا کر دیا جائے گا، اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل و خوار رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور وہ ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو انھی لوگوں کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دے گا، اور اللہ غفور (اور) رحیم ہے۔“

---

(1) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٩٧) تفسير ابن كثير (١/ ٧٠١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٩٨)

(2) مسند أحمد (٤/ ٩٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٨٤) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١٦)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٧٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥١١)

(4) تفسير ابن كثير (١/ ٧٠٢) اس کی سند میں ”زید بن جبیرہ“ ضعیف راوی ہے۔

(5) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ١٧٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٩٨)

اس خبر کا نسخ اور اس کا مشرکین پر اطلاق جائز نہیں ہے اور اس آیت کا مومنین پر اطلاق ظاہر کے خلاف ہے۔ یہ اطلاق دلیل کا محتاج ہے۔ والله أعلم. نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الزمر: ٥٣] ''آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

یہ آیت سارے گناہوں، جیسے: کفر و شرک و نفاق و قتل و فسق وغیرہ سب کو عام ہے، ان میں سے جو کوئی شخص جس کسی گناہ سے توبہ کرے گا، اللہ اُس کی توبہ قبول فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ﴾ [النساء: ٤٨ و ١١٦] ''بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے۔'' یہ آیت تمام گناہوں کے حق میں عام ہے، سوائے شرک کے اور یہ آیت خود اس سورت میں اس آیت کے بعد اور اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی اُمید کو مضبوط کرنے کے لیے مذکور ہے۔ والله أعلم.

صحیحین میں ایک اسرائیلی کے قصے کے تحت آیا ہے کہ ایک شخص نے سو خون کیے تھے، پھر ایک عالم سے پوچھا کہ میرے لیے توبہ ہے، اُس نے کہا: تیرے اور توبہ کے بیچ میں کون حائل ہے؟ پھر اُس سے کہا: تو اس شہر کو جا جہاں لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں، وہ چلا راہ میں مر گیا، رحمت کے فرشتوں نے اُس کی جان نکالی،[1] سو جب یہ بات بنی اسرائیل میں ہوئی تو اگر اس امت میں توبہ قبول ہو سکتی ہے تو امتِ محمدیہ میں بطریقِ اولیٰ ہوگی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہم سے وہ بوجھ اور طوق جو بنی اسرائیل پر تھے، اُٹھا لیے ہیں اور ہمارے نبی ﷺ کو حنیفیہ (ایک ہی طرف راغب کرنے والا) اور سمحہ (آسان) دین دے کر بھیجا ہے۔ رہی آیتِ کریمہ: ﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا ﴾

سو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ اُس کی جزا ہے، اگر اللہ اُس کو جزا دینا چاہے۔ اس کو ابن مردویہ نے اپنی اسناد سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے،[2] لیکن صحیح نہیں، اس صیغے کے معنی یہ ہیں: ''إِنَّ هٰذَا جَزَآءُهٗ إِنْ جُوْزِيَ عَلَيْهِ'' اسی طرح ہر وعید کا حال ہے، جو کسی گناہ پر آئی ہے، لیکن کبھی اعمالِ صالحہ اس کے مقابلے میں آ کر جزائے مذکور کے ملنے سے مانع ہو جاتے ہیں۔ اصحابِ موازنہ و اصحابِ احباط (موازنہ اور ضائع ہو جانے کے قائل) کے قول پر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ''هٰذَا أَحْسَنُ مَا يُسْلَكُ فِي بَابِ الْوَعِيْدِ'' اور اس تقدیر پر کہ قاتل آگ میں داخل ہوگا، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا کہ اُس کے لیے توبہ نہیں ہے یا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٦)

[2] المعجم الأوسط (٨/ ٢٧٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه محمد بن جامع العطار وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٦٦)

جمہور کے قول پر کہ اُس کے لیے کوئی عملِ صالح نہیں ہے، جو اُس کو نجات دے۔

وہ آگ میں ہمیشہ نہیں ہوگا، بلکہ اُس کے حق میں ہیشگی کا مطلب طویل عرصے تک آگ میں رہنا ہے۔ احادیثِ متواترہ میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس کے دل میں ادنیٰ ذرے کے برابر ایمان ہوگا، وہ آگ سے باہر نکلے گا۔[1] سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں جو مروی ہے: «كُلُّ ذَنْبٍ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّغْفِرَهُ إِلَّا الرَّجُلَ يَمُوْتُ كَافِرًا أَوِ الرَّجُلَ يَقْتُلُ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا»[2] سو لفظ عسیٰ کے معنی ترجّی (اُمید رکھنا) کے ہیں، سو جب یہ ترجی ان دونوں صورتوں میں واقع ہونے والی ہوئی تو اس کا کسی ایک صورت میں بھی واقع ہونا ممکن ہوگا اور وہ مذکورہ دلائل کی بنا پر یہی قتل ہے۔ ہاں جو کافر مرا ہے، اس کی بخشش کا نہ ہونا منصوص (لازم) ہے۔

باقی رہا مقتول کا قیامت کے دن قاتل سے مطالبہ، سو وہ حقوق العباد سے ایک حق ہے، جو توبہ سے ساقط نہیں ہوسکتا۔ ان حقوق کا حق والوں کی طرف پھیرنا ضروری ہے، اس میں مقتول یا جس کا مال چوری کیا گیا، یا جس پر غیظ و غضب کیا گیا یا جس کی بدنامی کی گئی اور بنی آدم کے جملہ حقوق کے درمیان کچھ فرق نہیں، کیوں کہ اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ حقوق العباد توبہ سے ساقط نہیں ہوتے۔ توبہ کے صحیح ہونے کے لیے ان حقوق کو حقداروں کو لوٹانا ضروری ہے، اگر یوں نہ ہوگا تو قیامت کے دن اُن کا مطالبہ مقرر ہے، لیکن مطالبے کے وقوع پذیر ہونے سے اس مطالبے کا بدلہ دینے کا وقوع لازم نہیں آتا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ قاتل کے اعمالِ صالحہ ہوں، جو سب کے سب یا ان میں سے بعض مقتول کو دلا دیے جائیں، پھر اُس کو کوئی زیادہ اجر دے کر جنت میں داخل کر دیا جائے یا اللہ تعالیٰ مقتول کو اپنے فضل سے حور و محلاتِ جنت اور درجات کی بلندی یا اس جیسی عنایات کی صورت میں معاوضہ عطا فرما دے۔ واللّٰہ أعلم.

قتلِ عمد کے احکام:

عمداً قتل کرنے والے کے لیے دنیا اور آخرت میں احکام مقرر ہیں۔ دنیا میں قاتل پر ایک مقتول کے وارثوں کا تسلط (غلبہ) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا﴾ [بني إسرائيل: ٣٣] ''اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو غلبہ دیا ہے۔'' پھر وہ اولیا مختار ہیں قتل کریں یا عفو فرما دیں یا دیتِ مغلظہ (سخت) لیں بطورِ اثلاث، یعنی تیس حقے، تیس جزعے، تیس خلفے، جس طرح کتاب الاحکام میں لکھا ہے۔ ائمہ کا اختلاف ہے کہ آیا اُس پر واجب کفارہ غلام آزاد کرنا ہے یا دو ماہ کے روزے یا کھانا کھلانا ہے۔ اس میں دو قول ہیں، جس طرح قتلِ خطا کے کفارے کے بارے میں دو قول گزر چکے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ و اصحابِ شافعی اور علما کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٨٤) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١٦)

ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ ہاں اُس پر کفارہ واجب ہے، کیوں کہ خطا میں کفارات واجب ہوئے تو عمد میں بالاولیٰ واجب ہونا چاہیے۔ اس کو کفارۂ یمین غموس (قسم کو توڑنے کا) میں مطرد (پے در پے ہونے والا) کہا ہے، نماز متروکہ کی قضا میں عمداً اعتذار کیا ہے، جس طرح خطا میں اُس پر اجماع کیا تھا۔

اصحابِ احمد اور دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ عمداً قتل کرنا اس سے بہت بڑا ہے کہ اُس کا کفارہ ہو سکے، اسی طرح یمینِ غموس لیکن ان دونوں صورتوں کے درمیان اور عمداً نمازِ متروکہ کے درمیان کوئی راہ نہیں ہے، کیوں کہ وہ قضائے متروکہ کو عمداً واجب کہتے ہیں، جس کا مذہب یہ ہے کہ قتلِ عمد میں کفارہ واجب ہوتا ہے، اس کی حجت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے: «قَالَ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ نَفَرٌ مِّنْ بَنِي سُلَيْمٍ فَقَالُوْا: إِنَّ صَاحِبَنَا قَدْ أُوْجِبَ، قَالَ: فَلْيُعْتِقْ رَقَبَةً يُفْدِيْ اللّٰهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِّنْهَا عُضْوًا مِّنْهُ مِنَ النَّارِ»[1] (رواہ أحمد) ''رسول اللہ ﷺ کے پاس بنوسلیم کے کچھ افراد آئے اور کہنے لگے: ہمارے ایک آدمی پر جہنم واجب ہوگئی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف سے ایک غلام آزاد کرو، اللہ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کے ہر عضو کو آگ سے آزاد کر دے گا۔''

اس روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «أَتَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِيْ صَاحِبٍ لَّنَا قَدْ أُوْجِبَ، قَالَ: أَعْتِقُوْا عَنْهُ يُعْتِقِ اللّٰهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِّنْهُ عُضْوًا مِّنَ النَّارِ»[2] (رواہ أبو داود والنسائي) روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں: «أَتَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِيْ صَاحِبٍ لَّنَا قَدْ أُوْجِبَ، يَعْنِي النَّارَ بِالْقَتْلِ، فَقَالَ: أَعْتِقُوْا عَنْهُ... الخ»[3] اس سے معلوم ہوا کہ قتلِ عمد میں، جس کے سبب جہنم کی آگ واجب ہو جاتی ہے، کفارہ آیا ہے، وہ کفارہ یہی ایک غلام کا آزاد کرنا ہے۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا کلام تمام ہوا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا آیتِ باب کی تفسیر کے بارے میں بیانِ فاتح اس طرح ہے کہ یہ نفی ﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ ﴾ بمعنی نہی ہے اور نہی تحریم کی مقتضی ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﴾ [الأحزاب: ٥٣] ''اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا دو۔'' پس اگر یہ نفی اپنے معنی پر ہوتی تو خبر ٹھہرتی، پھر یہ لازمی ہوتا کہ کبھی کسی مومن کا مومن کے ہاتھ قتل ہونا نہ پایا جاتا۔ قتلِ خطا تو اس طرح ہوتا ہے کہ ارادہ تو

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٠٧) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٦٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ١٧٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٦٤) ان تینوں روایتوں کی اسناد میں ''غریف بن عیاش دیلمی'' مجہول راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٩٠٧) البتہ گردن (غلام یا لونڈی) آزاد کرنے کے عمومی ثواب کے بارے میں یہ روایت صحیحین میں مروی ہے۔ صحیح البخاري، رقم الحديث (٢٣٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٠٩)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٧٠٣۔ ٧٠٤)

کسی اور کا کیا تھا، مثلاً: شکار یا درخت کا، مگر تیر کسی کو جا لگا یا ایسی چیز سے مارا، جس سے غالباً قتل نہیں ہوتا۔ سو ایسے قتل کا کفارہ بیان کیا ہے۔

﴿ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ﴾ سے مراد وہ غلام ہے، جو ایمان کو سمجھتا اور نماز پڑھتا ہے۔ جمہور کے نزدیک اندھا اور لنگڑا صحیح سالم کے مثل نہیں ہے۔ لنگڑا اور کانا اکثر کے نزدیک کافی ہے۔ دیت وہ مال ہے، جو مقتول کے خون کے عوض دیا جاتا ہے۔ ورثۂ مقتول اور دیت کی قسمیں اور تفاصیل سنتِ مطہرہ میں بیان کر دی گئیں ہیں۔ دیت کی مقدار کے بارے میں حدیثیں مروی ہیں۔ دیتِ خطا، دیتِ شبہ عمد، دیتِ مسلم اور دیتِ کافر میں فرق ہے۔ یہاں ان کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہلِ مقتول کا قاتل سے دیت کو معاف کر دینا، اُس کا نام صدقہ اس لیے رکھا ہے کہ ترغیب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مقتول کے ورثا دیت معاف کر دیں تو بہتر ہے۔ اُس وقت اس کا ادا کرنا ضروری نہیں ہوگا۔

﴿ فَإِنۡ كَانَ مِن قَوۡمٍ ... الخ ﴾ (آیتِ باب)۔ یہ اس مومن کا مسئلہ ہے، جس کو مسلمان کفار کے شہر میں مار ڈالیں، وہ انھیں میں تھا، مگر مسلمان ہو کر اُس نے ہجرت نہیں کی تھی، مسلمانوں نے اس گمان پر کہ وہ اسلام نہیں لایا ہے، اپنے باطل دین پر قائم ہے، اُس کو قتل کر ڈالا تو اس صورت میں اُس قاتل پر دیت واجب نہیں ہے۔ ایک مومن غلام کا آزاد کرنا کافی ہے۔ دیت کے ساقط ہونے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس لیے کہ مقتول کے اولیا کافر ہیں، دیت میں ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مقتول کی حرمت تھوڑی تھی، کیوں کہ ایمان لا کر اُس نے ہجرت نہ کی، کیوں کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمۡ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيۡءٍ ﴾ [الأنفال: ۷۲] ''اور جو لوگ ایمان لے آئے، مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی، ان کی دوستی سے تمھیں کوئی غرض نہیں۔'' بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ ''اس کی دیت بیت المال کے لیے واجب ہے۔''

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مقتول اس قوم سے ہو، جن سے معاہدہ ہو، خواہ وہ وقتی معاہدہ ہو یا دائمی، جیسے: اہلِ ذمہ تو اس کے قتل پر دیت لازم ہے۔ وہ دیت مقتول کے اولیا کو، جو اس کے وارث ہیں، دی جائے گی۔ یہ دیت مومن کی دیت کا تیسرا حصہ ہے۔ مقتول اگر یہودی ہے یا نصرانی ہے اور دو ثلث عشر ہے، اگر مجوسی ہے اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو دو ماہ لگاتار روزے رکھے، اگر ایک دن بھی روزہ نہ رکھے گا تو پھر جمہور کے نزدیک نئے سرے سے روزے رکھنا پڑیں گے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ''تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ'' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت سے درگزر کیا، اس طرح کہ خطا میں کفارہ مقرر رکھا۔[1] قتلِ عمد میں علما کا اختلاف ہے۔ امام عطا اور نخعی رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ قتلِ عمد وہ ہے، جو تیز چیز سے ہو، جیسے: تیغ، خنجر، نیزہ یا اُس چیز سے جس سے موت واقع ہو جاتی ہے، جیسے: بھاری پتھر، لکڑی وغیرہما۔[2]

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۱۰۳٦)
[2] تفسیر القرطبي (٥/ ۳۲۹)

جمہور نے کہا کہ ہر قاتل کا قتل کرنا قتل ہے، جبکہ وہ لوہے، پتھر یا عصا وغیرہ سے قتل کا ارادہ کرے۔ بعض اہلِ علم نے یہ قید لگائی ہے کہ ایسی چیز سے ہو جو عادتاً قاتل ہوتی ہے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ قتل تین قسم کے ہوتے ہیں: قتلِ عمد، شبہ عمد اور خطا۔ اس پر بہت سی دلیلیں دی گئی ہیں، جن کو اس جگہ بیان کرنا ضروری نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یوں نہیں، بلکہ قتل کی دو ہی قسمیں ہیں: قتلِ عمد اور قتلِ خطا۔ کیوں کہ قرآنِ مجید میں بھی یہی دو قسمیں آئی ہیں، اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ قرآن مجید کا دو قسم پر اکتفا کرنا تیسری قسم کے ثبوت کی نفی نہیں ہے، جو سنتِ مطہرہ سے ثابت ہوا ہے۔ واللہ أعلم.

آیت جزائے جہنم میں مومن قاتل کے حق میں سزا کی سختی بیان فرمائی ہے۔ ایک یہ کہ اس بڑے گناہ کی وجہ سے جہنم کا حق دار بن جاتا ہے۔ پھر اس آگ میں ہمیشہ رہے گا۔ یہ دوسری جزا ہے۔ پھر اس پر اللہ کا غصہ اور غضب ہوگا، یہ تیسری سزا ہے۔ پھر اللہ کی لعنت ہے۔ یہ چوتھی سزا ہوئی۔ پھر اس کے لیے عذابِ عظیم ہے۔ دوسری قسموں کے عذاب کی نسبت یہ پانچویں سزا ہوئی۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا سختی ہوگی۔ کوئی وعید اس وعید اور ڈراوے کی مثل نہیں ہو سکتی۔

قاتلِ عمد کی توبہ میں علما کا اختلاف ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب توبہ کے قبول نہ ہونے کا روایت کیا گیا ہے۔[1] جمہور توبہ کی قبولیت کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ [هود: ١١٤] ”بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾ [الشورىٰ: ٢٥] ”اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ ﴾ [النساء: ٤٨ و ١١٦] ”اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَإِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ ﴾ [طٰهٰ: ٨٢] ”اور بے شک میں بہت بخشنے والا ہوں اس کے لیے جو توبہ کرے۔“

یہ بھی کہا ہے کہ سورت نساء کی اس آیت اور سورت فرقان کی آیت کا جمع کرنا ممکن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اُس کی جزا جہنم ہے، مگر جس نے توبہ کی۔ اس جگہ سبب، یعنی قتل اور موجب، یعنی سزا کی وعید اکٹھے ہیں۔ دوسری دلیل سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے۔ صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے کہ تم اس بات پر مجھ سے بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے اور کسی جان کو قتل نہ کرو گے جو حرام ہے، مگر حق سے۔

پھر فرمایا: « فَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَسَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ »[2] ”جس نے ان میں سے کسی چیز کا بھی ارتکاب کیا اور اللہ نے اس پر پردہ ڈالا تو وہ اللہ کے اختیار میں ہے،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣١٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)

چاہے اس کو معاف کر دے، چاہے اس کو عذاب دے۔'' تیسری دلیل صحیح مسلم وغیرہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس شخص کے حق میں مروی حدیث ہے، جس نے سو قتل کیے تھے۔[1] امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، احناف اور شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جان بوجھ کر قتل کرنے والا مشیتِ الٰہی میں داخل ہے توبہ کی یا نہ کی۔ شرح منتقیٰ میں ہر ایک فریق کے ساتھ دینے والوں کو واضح کیا ہے۔[2] فتح القدیر میں لکھا ہے کہ حق یہ ہے کہ توبہ کا دروازہ کسی گناہ گار کے لیے بند نہیں ہے، بلکہ جو کوئی اس کا ارادہ کرے تو اس کے لیے کھلا ہوا ہے، جب چاہے اس دروازے میں داخل ہو۔[3]

تفاوت است میان شنیدن من و تو   تو بستنِ در و مَن فتحِ باب مے شنوم

''میرے اور تیرے سننے میں بڑا فرق ہے۔ تو دروازے کے بند ہونے اور میں دروازے کے کھلنے کی آواز سنتا ہوں۔''

شرک سے بڑھ کر اور سخت تر کون سا گناہ ہوگا؟! اُس کو تو توبہ الی اللہ مٹا دیتی ہے۔ مشرک کا دامِ شرک سے نکلنا اس سے قبول کر لیا جاتا ہے۔ پھر کسی اور گناہ کی کیا حیثیت ہے؟ کیوں کہ وہ سب اس شرک سے کم تر ہیں۔ قتلِ عمد بھی گو ایک بڑا گناہ ہے، مگر شرک سے کمتر ہے۔ لیکن قتلِ عمد سے توبہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قتل کا اعتراف کر لے اور اپنی جان کو قصاص کے لیے سونپ دے، اگر واجب ہو یا دیت دینا تسلیم کرے، اگر قصاص واجب نہ ہو اور قاتل غنی ہو اور کل یا بعض کو تسلیم کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ باقی رہی صرف قاتلِ عمد کی توبہ اور اُس کا پکا ارادہ کہ وہ دوبارہ ایسا کام نہیں کرے گا اور اگر کرے تو اعتراف کرے گا اور اپنے آپ کو قصاص کے لیے سپرد کر دے گا۔ تو ایسے شخص کی توبہ کی قبولیت پر ہم یقینِ کامل نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔ اپنے بندوں کے درمیان اُس دن، جس دن میں وہ اختلاف کرتے تھے، وہ فیصلہ کر دے گا۔

معتزلہ نے اس آیت کو اس بات پر دلیل ٹھہرایا ہے کہ فاسق ہمیشہ آگ میں رہے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا نزول یمن کے ایک کافر کے حق میں ہوا ہے، جس نے ایک مسلمان کو قتل کیا تھا، اُس کا نام مقیس بن ضبابہ ہے۔ اس صورت میں یہ آیت مخصوص ہوئی یا یہ معنی ہیں کہ جس نے کسی مسلمان کو حلال سمجھ کر قتل کیا، حالاں کہ وہ کفر ہے، تو اس کے لیے آگ میں ہمیشگی ہوگی۔

امام ابو مجلز رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''جَزَآءُهٗ فَإِنْ شَآءَ اللّٰهُ أَنْ يَّتَجَاوَزَ عَنْ جَزَآءِهٖ فَعَلَ''[4] ''یہ اس کی سزا ہے، اگر اللہ چاہے تو اس سزا سے تجاوز کر جائے۔'' امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمیشگی ابد تک کی متقاضی نہیں، بلکہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٦) ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

[2] نيل الأوطار (٧/ ١١٩۔ ١٢٤) [3] فتح القدير (١/ ٧٩٣) [4] مصنف ابن أبي شيبة (٥/ ٤٣٤)

اس کے معنی زیادہ دیر تک ٹھہرنا ہے،[1] لیکن اس میں نظر ہے۔ صحیح احادیث میں شفاعت سے تمام موحدین کا جہنم میں سے نکلنا آیا ہے۔[2] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاہر ہے کہ مراد کسی مومن کو قتل کر دینے پر سخت عذاب، اس کا خوف اور بہت بڑی دھمکی ہے۔

اس سے مراد یہ نہیں کہ توبہ بھی قبول نہ ہوگی۔ حقیقتاً ابو السعود کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔[3] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ اللہ پر وعید کا خلاف جائز ہے، اگرچہ وعدہ کا خلاف ممتنع ہو۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے: «مَنْ وَّعَدَهُ اللّٰهُ عَلٰى عَمَلِهٖ ثَوَابًا فَهُوَ مُنْجِزٌ لَّهٗ وَمَنْ أَوْعَدَهٗ عَلٰى عَمَلِهٖ عِقَابًا فَهُوَ بِالْخِيَارِ»[4] ''اللہ تعالیٰ نے جس کے ساتھ کسی عمل کا ثواب دینے کا وعدہ کیا ہو، وہ اس کو پورا کرتا ہے اور جس کو اس کے عمل پر سزا کی دھمکی دے تو اس کو اختیار ہوتا ہے۔''

تحقیق یہ ہے کہ اس اصل پر کوئی فرع (شاخ) نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ اُس کی جزا یہ ہے یہ تو نہیں فرمایا کہ یہ جزا اُس کو دی جائے گی۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ: ٤٠] ''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔'' اگر یہ بات ہوتی کہ ہر سیہ کی جزا سیہ ہوا کرتی تو آیتِ کریمہ ﴿وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ [المائدة: ١٥] ''اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔'' اس کے معارض ہوتی۔[5]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اللہ کے راستے میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو شخص تمھیں سلام کرے تو اس کے متعلق یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں۔ تم دنیاوی زندگی کا سامان چاہتے ہو، تو اللہ کے پاس (تمھارے لیے) بہت سے مالِ غنیمت ہیں۔ تم اس سے پہلے خود بھی اس حالت میں مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، لہٰذا معاملے کی تحقیق کر لیا کرو۔ بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے (94)

---

[1] تفسير البيضاوي (٢/ ٢٣٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣)

[3] تفسير أبي السعود (٢/ ٢١٧)

[4] مسند أبي يعلىٰ (٦/ ٦٦) المعجم الأوسط (٨/ ٢٤٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٦٣)

[5] فتح البيان (٣/ ١٩٩۔ ٢٠٦)

آیت کا شانِ نزول:

نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک بستی پر مسلمانوں کی فوج پہنچی، وہاں ایک مسلمان تھا، جو اپنے مویشی کنارے کر کے کھڑا ہوا تھا، اُس نے مسلمانوں کو سلام کیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ اپنی غرض سے مسلمانی جتلاتا ہے، اُس کو مارا اور اس کے مویشی چھین لیے۔ اُس پر یہ آیت اُتری۔ یہ جو فرمایا کہ تم پہلے ایسے ہی تھے، یعنی دنیا کی غرض سے خونِ ناحق کرنے والے تھے، لیکن مسلمان ہو کر یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ یا تم ایسے ہی تھے، یعنی کافروں کے شہر میں رہتے تھے، مستقل حکومت نہیں رکھتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ بنی سلیم کے ایک آدمی کا گزر نبی کریم ﷺ کے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہوا، وہ بکریاں چراتا تھا۔ اُس نے ان کو سلام کیا، انھوں نے کہا کہ اس نے ہمیں سلام اس لیے کیا ہے کہ ہم سے پناہ پکڑے اور بچ جائے، اُس کو جا کر مار ڈالا۔ غنیمت نبی اکرم ﷺ کے پاس لائے تو یہ آیت اُتری۔ (رواہ أحمد والترمذي وقال: هذا حديث حسن صحيح)

اس بارے میں اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے بھی روایت مروی ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، مگر شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔[1] (رواہ ابن جرير، وقال: هذا خبرٌ عندنا صحيح سنده) ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے نزدیک اس میں علتیں ہوں۔ کسی نے کہا کہ یہ آیت محکم بن جثامہ کے حق میں آئی ہے۔ کسی نے کہا کہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے حق میں اُتری ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن جریر کا یہ کلام غریب ہے اور کئی وجہ سے مردود ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "عَرَضَ الدُّنْيَا" سے مراد غنیمت ہے۔[3] پھر کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ جب کوئی مومن آدمی کفار قوم میں اپنا ایمان مخفی رکھتا ہو، پھر وہ اس ایمان کو ظاہر کرے اور تو اُس کو مار ڈالے تو بھی تو مکہ میں ایسا ہی تھا کہ اس سے پہلے اپنا ایمان مخفی رکھتا تھا۔ اس کو بخاری نے معلقاً مختصراً ذکر کیا ہے، مگر بزار کے نزدیک مطولاً اور موصولاً بھی مروی ہے۔[4]

پھر فرمایا کہ اللہ کے پاس اس غنیمت سے بہتر ہے، جس کے لیے تم نے ایک مسلمان کو مار ڈالا اور اس کے سلام علیک کرنے پر اُس پر مصانعت (چاپلوسی) کی تہمت لگائی۔ اللہ کے پاس جو رزقِ حلال ہے، وہ اُس کے مال سے بہتر ہے، تم بھی اس سے پہلے اسی طرح پر تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ ﴾ [الأنفال: ٢٦] "اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔" سعید بن جبیر رحمہ اللہ

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٢٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٣٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٢٥٦) تفسير الطبري (٩/ ٧٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٧٠٥) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣١٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٧٢) مسند البزار (١١/ ٣١٧)

نے کہا ہے کہ یعنی تم بھی پہلے اپنا ایمان مشرکوں میں چھپاتے تھے، جس طرح اس چرواہے نے چھپایا تھا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی یہی معنی اختیار کیے ہیں۔[1] اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے قسم اُٹھائی کہ اب کسی کو اس کے بعد نہیں ماروں گا، جو لا الٰہ الا اللہ کہے گا۔[2] ﴿ فَتَبَيَّنُوْا ﴾ تاکید ہے اس پر جو گزر چکا۔ اللہ کا واقف ہونا سخت ڈراوا اور وعید ہے۔

فتح البیان میں ہے کہ ''ضَرْبٌ فِي الْأَرْضِ'' سے مراد تجارت یا جنگ وغیرہما کے لیے سفر ہے۔ ''تبیّن'' کے معنی ہے: تامل کرنا۔ کسی نے اس صیغے کو تثبت سے بھی پڑھا ہے۔ ﴿ فَتَبَيَّنُوْا ﴾ یہ تحقیق کرنا سفر اور حضر دونوں میں واجب ہے۔

سلام؛ اسلام کی علامت ہے، نیز بلا تحقیق جلدی کرنے کی ممانعت:

قتل کے سلسلے میں سفر کا اس جگہ ذکر صرف اس لیے ہے کہ آیت کے نزول کا سبب بھی سفر ہی میں تھا۔ سلام کو سلم بھی پڑھا ہے۔ معنی ایک ہی ہیں، یعنی تابعداری یا دونوں کے معنی اسلام کے ہیں یا سلام بہ معنی تحیت ہے۔ اس میں مسلمانوں کو اس بات سے ممانعت کی گئی ہے کہ جب کافر کوئی ایسی بات کہے، جس سے اس کے اسلام کی دلیل مل سکے تو مہمل نہ چھوڑیں، یہ نہ کہیں کہ پناہ لینے کے لیے یا تقیے کی غرض سے کہتا ہے، بلکہ خوب ٹھونک بجا لیں۔

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے کسی کافر کو لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد قتل کیا تو وہ اس کے عوض مارا جائے گا، کیوں کہ اُس کا خون اور مال کلمۂ طیبہ کہنے کی وجہ سے معصوم ہو چکا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جو قتل ایسے شخص سے ساقط ہو گیا، وہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے تاویل کی تھی، یہ گمان کیا تھا کہ جو اس کلمے کو ہتھیار کے خوف سے کہتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہوتا اور نہ اُس کا خون اور مال معصوم ہوتا ہے، بلکہ اس کو یہ کلمہ اطمینان اور امن کی حالت میں کہنا چاہیے تھا۔ اسلام کے کلمے کے ساتھ کلام کرنے میں اطاعت کرنے کا اظہار بھی ہے، اس طریقے سے کہ کہے کہ میں مسلمان ہوں یا تمھارے دین پر ہوں، اس لیے کہ آیت کے معنی استسلام (اطاعت کرنا) اور انقیاد (تابعداری کرنا) کے ہیں۔ وہ ہر قول و عمل سے حاصل ہوتا ہے، جیسے: کلمۂ شہادت کا کہنا یا کلمۂ تسلیم کا زبان پر لانا۔ پھر فرمایا: آخر تم بھی تو اسلام کے ابتدا میں اسی طرح کے کفار تھے۔ جب تم نے کلمۂ شہادت کہا، تب تمھارا مال اور جان بچا۔ اللہ پاک نے تم پر احسان کیا کہ کھل کر مسلمان ہو گئے۔ اختفا کے بعد تم کو چاہیے کہ کسی مومن کے قتل میں بلا تحقیق جلدی نہ کیا کرو۔[3]

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ
وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً

[1] تفسير الطبري (٩/ ٨٢_ ٨٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٤٢) [3] فتح البيان (٣/ ٢٠٧_ ٢٠٩)

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَي الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

کسی عذر کے بغیر (پیچھے) بیٹھ رہنے والے مومن اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے برابر نہیں ہوسکتے۔ اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو (پیچھے) بیٹھ رہنے والوں پر مرتبے میں فضیلت دی ہے۔ اور اللہ نے سب سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ نے مجاہدین کو (پیچھے) بیٹھ رہنے والوں کے مقابلے میں بہت بڑا اجر دیا ہے (95) ان کے لیے اللہ کی طرف سے درجے ہیں اور بخشش اور رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (96)

مجاہد اور پیچھے رہنے والے برابر نہیں:

بدن کے نقصان والے، یعنی اپاہج جہاد کے حکم سے معاف ہیں، باقی لوگوں میں لڑنے والوں کے بڑے درجے ہیں جو بیٹھنے والوں کے نہیں، اگرچہ بیٹھنے والے بھی جنتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں، یعنی کچھ جہاد کرتے رہیں تو نہ کرنے والے معاف ہیں اور اگر سب جہاد کرنا چھوڑ دیں تو سب گناہ گار ہیں۔ صحیح بخاری میں سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت اُتری، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو بلا کر یہ آیت لکھائی۔ سیدنا ابن مکتوم رضی اللہ عنہ آئے اور اپنی نابینائی کی شکایت لائے۔ اُس پر لفظ: ﴿غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ﴾ نازل ہوا۔ یہ حدیث کئی الفاظ اور طریقوں سے مختصراً اور مطولاً آئی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تمام طریقوں کا ذکر کیا ہے۔[1] اس آیت نے جائز عذر والوں کو اس حکم سے خارج کر دیا، جیسے: نابینائی، لنگڑے پن کی بیماری۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ مدینہ میں کچھ لوگ ہیں کہ نہ چلے تم کسی راہ میں اور نہ قطع کیا تم نے کوئی صحرا، مگر وہ تمھارے ساتھ تھے، وہاں کہا: باوجودیکہ وہ مدینہ میں رہے۔ فرمایا: ہاں اُن کو عذر نے روکا۔[2] (رواه البخاري وأحمد) شاعر نے اسی باب میں کہا ہے ؎

يَا رَاحِلِيْنَ إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ لَقَدْ سِرْتُمْ جُسُوْماً وَسِرْنَا أَرْوَاحَا

إِنَّا أَقَمْنَا عَلٰى عُذْرٍ وَعَنْ قَدَرٍ وَمَنْ قَامَ عَلٰى عُذْرٍ فَقَدْ رَاحَا

”اے بیت اللہ کی طرف جانے والو! تم جسمانی طور پر چلے اور ہم روحانی طور پر۔ ہم تقدیر اور عذر کی وجہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٧٦) تفسير ابن كثير (١/ ٧٠٦۔ ٧٠٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٦١) مسند أحمد (٣/ ١٠٣)

سے نہ جا سکے اور جو عذر کی بنا پر رُک کے وہ جانے والا ہی ہوتا ہے۔‘‘

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جزا کا وعدہ دونوں فریقوں سے کیا ہے، یعنی مجاہدین اور قاعدین سے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے نہ کہ فرضِ عین۔ لیکن اتنی بات ہے کہ مجاہدین کا اجر قاعدین پر عظیم ہے۔ جنت میں اُن کو بلند درجات ملیں گے، گناہوں کی بخشش ہوگی، رحمت اور برکات حاصل ہوں گی، یہ اُن کے لیے اللہ کا احسان اور عزت و تکریم ہے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے کہ جنت میں سو درجے ہیں، جن کو اللہ نے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے، جیسے آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے تیر چلایا، اُس کو ایک درجہ اجر ہے۔ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! درجہ کیا ہے؟ فرمایا: تیری ماں کے گھر کی چوکھٹ نہیں ہے، دو درجوں کے درمیان سو برس کا فرق ہے۔[2]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت میں قاعدین بلا عذر اور مال و جان کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے درجات کے درمیان فرق کا بیان ہے۔ یہ فرق اگرچہ سب کو معلوم ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو خوش کرنے اور بیٹھ رہنے والوں کو غیرت دلانے کے لیے بیان فرمایا اور اسی طرح اللہ کا فرمان ہے: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ۹] ’’کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟‘‘ اس میں علم کو طلب کرنے والے کے لیے تحریک ہے اور جہالت پر راضی رہنے والے کے لیے ملامت ہے۔

اہلِ عذر کا استثنا:

اہلِ ضرر سے مراد عذر والے ہیں۔ قرآن مجید کا ظاہر انداز یہ ہے کہ عذر والے کو مجاہد کے مثل اجر ملے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ مگر بغیر تضعیف کے مجاہد کو فضیلت ہوگی اُس عمل کی وجہ سے جو وہ کرتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس کی دلیل وہ صحیح حدیث ہے، جو اہلِ مدینہ کے بارے میں اوپر گزر چکی۔[3] یہ ویسی بات ہے کہ حدیث میں مروی ہے کہ جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت صحیح بخاری میں سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ صحیح مسلم میں سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٤٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ البتہ یہ الفاظ دوسرے صحابی سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہیں۔ دیکھیں: سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٤٤) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٤٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٦١)

کے لیے وہ عمل لکھو، جو وہ حالتِ صحت میں کرتا تھا، یہاں تک کہ اچھا ہو یا اُس کو قبض کرلوں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ اُولِي الضَّرَرِ ﴾ وہ ہیں، جو بدر میں نہیں گئے۔[2] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابن ام مکتوم کے حق میں اُتری ہے۔ میں نے اُن کو بعض معرکوں میں دیکھا کہ ان کے ہمراہ مسلمانوں کا جھنڈا تھا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اُس قوم کے حق میں آئی ہے، جس کو امراضِ اوجاع (درد کے امراض) نے روکا۔

درجات سے مراد منازل ہیں کہ بعض دوسروں سے اوپر ہوں گے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ درجات سات ہیں، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورت براءت میں کیا ہے۔ یعنی اللہ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَّغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ﴾ [التوبة: ١٢٠] ''یہ اس لیے کہ یہ بلاشبہہ وہ (لوگ) ہیں کہ انھیں اللہ کی راہ میں جو بھی پیاس اور تھکاوٹ اور بھوک (کی تکلیف) پہنچتی ہے، اور وہ جو بھی ایسی جگہ روندتے ہیں، جو کافروں کو سخت ناگوار ہو، اور وہ دشمن سے جو بھی کامیابی حاصل کرتے ہیں، اس کے بدلے میں ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے۔''[4]

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ یوں کہتے ہیں کہ اسلام ایک درجہ ہے۔ ہجرت اسلام کے بعد دوسرا درجہ ہے۔ جہاد ہجرت کے بعد تیسرا درجہ ہے، قتل ہونا جہاد میں چوتھا درجہ ہے۔[5] ابن محیریز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ درجات ستر ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان ستر برس کی راہ ہے۔[6] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ پاک کی طرف سے بتایا گیا کہ جو بندہ میرے بندوں میں سے اللہ کی راہ میں، میری مرضی کی تلاش میں جہاد کرنے کو نکلا تو میں اس کا ضامن ہوں کہ اگر اُسے واپس پھیروں تو اُس کو اجر یا غنیمت دے کر پھیروں اور اگر ماروں تو اُس پر بخشش اور رحمت کروں۔[7] (رواه النسائي)

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٠٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٣٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٣٢)

[3] سنن سعيد بن منصور (٤/ ١٣٦٠) الدر المنثور (٢/ ٦٤٢) اس کی سند میں ''علی بن زید'' ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير الطبري (٩/ ٩٧۔ ٩٨)

[5] ان الفاظ کے ساتھ یہ اثر ابن جریج رحمہ اللہ کے بجائے قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ البتہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''فتح القدیر'' میں اس اثر کو ابن جریج رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے اس کی نسبت ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی طرف کی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسير الطبري (٩/ ٩٧) الدر المنثور (٢/ ٦٤٤) فتح القدير (١/ ٨٠٠)

[6] تفسير الطبري (٩/ ٩٨)

[7] سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٢٦) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله ثقات'' (فتح الباري: ٦/ ٧) فتح البيان (٣/ ٢١٠۔ ٢١٤)

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ
كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ
اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِيْھَا ۭ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىھُمْ
جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿97﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿98﴾
فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْھُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا
غَفُوْرًا ﴿99﴾ وَمَنْ يُّھَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا
كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُھَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿100﴾

جن لوگوں کی اس حالت میں فرشتے جان قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہوں، تو فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم زمین میں کمزور تھے۔ تب فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ چناں چہ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے (97) مگر وہ مرد، عورتیں اور بچے جو واقعی بے بس ہوں اور وہ اس جگہ سے نکلنے کا کوئی وسیلہ اور کوئی راستہ نہیں پاتے (98) اس لیے ان لوگوں کے بارے میں اُمید ہے کہ اللہ انھیں معاف کر دے گا، اور اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے (99) اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور گنجایش پائے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے راستے میں موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا۔ اور اللہ نہایت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے (100)

ہجرت نہ کرنے اور کافروں کے درمیان رہنے کی ممانعت:

یہ بیان فرمایا ان لوگوں کا حال جو کافروں کے ملک میں رہتے ہیں اور دل سے مسلمان ہیں، لیکن کافروں کے ظلم سے ظاہر نہیں ہو سکتے تو اگر اپنی کمائی آپ کرتے ہیں اور سفر کی تدبیر سے واقف ہیں تو ان کا عذر قبول نہیں کہ دوسرے ملک میں جا کر رہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ ہے اور اگر ناچار ہیں دوسروں کے بس میں ہیں تو اُمید

ہے کہ معاف ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس ملک میں کھل کر نہ رہ سکے، وہاں سے ہجرت فرض ہے۔ روزی کا ڈر نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ بہت جگہ کشادگی سے روزی مل سکتی ہے اور یہ خوف بھی نہیں ہونا چاہیے کہ شاید راہ ہی میں مارے جائیں کہ اس میں ثواب پورا ہے اور موت اپنے وقت سے پہلے نہیں آتی۔ موضح القرآن کا بیان ختم ہوا۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت جوانانِ قریش کے حق میں اُتری ہے، جو مکہ میں کلمۂ اسلام کہتے تھے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں: علی بن امیہ بن خلف، ابوقیس بن ولید بن مغیرہ، ابو العاص بن حجاج اور حارث بن زمعہ۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقوں کے حق میں اُتری ہے، جو مکہ میں نبی مکرم ﷺ کے ساتھ سے ہٹ کر بدر کے دن مشرکوں کے ساتھ نکلے اور اُن کے ساتھ مارے گئے۔[1] یہ آیتِ کریمہ ہر اُس شخص کے لیے عام ہے، جو مشرکین کے درمیان بستا رہتا ہے، وہ ہجرت پر قادر ہے لیکن اقامتِ دین کے فریضے پر متمکن نہیں، تو ایسا شخص اس آیت کے حکم کے پیشِ نظر، اور اسی پر اجماع ہے۔ اپنی جان پر ظلم کرنے والا اور حرام کا ارتکاب کرنے والا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے ظالمِ نفس ہیں۔ فرشتے جب ان سے پوچھتے ہیں تم اس جگہ کیوں رہے، ہجرت کیوں نہ کی؟ تو کہتے ہیں کہ ہم شہر سے نکلنے اور سفر کرنے کے قابل نہیں تھے۔

سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَسَكَنَ مَعَهُ فَإِنَّهُ مِثْلُهُ»[2] (رواه أبو داود) ”جو مشرک کے ساتھ رہتا ہے، وہ اُسی کی طرح ہے۔“ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے جب عباس و عقیل و نوفل گرفتار ہو کر آئے تو نبی کریم ﷺ نے عباس سے فرمایا کہ اپنی جان اور اپنے بھتیجے کی جان کا فدیہ دے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم نے آپ کے قبلے کی طرف نماز نہیں پڑھی اور آپ کی گواہی کی طرح گواہی نہیں دی؟ فرمایا: اے عباس! تم نے خصومت کی (لڑائی کی) اس لیے تم سے خصومت کی گئی۔ پھر اُن پر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً ﴾[3] (رواه ابن أبي حاتم)

مستضعفین کا استثناء اللہ کی طرف سے ہجرت نہ کرنے کا عذر ہے، کیوں کہ انھیں مشرکین سے خلاصی پانے کی قدرت نہیں تھی اور اگر قدرت بھی ہوتی تو راہ کو نہیں پہچانتے تھے کہ کدھر جائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہ انھیں حیلہ و چارہ کرنے کی طاقت ہے اور نہ راہ یابی کی۔ قریب ہے کہ اللہ اُن سے در گزر کرے، ان کے ہجرت نہ کرنے پر۔ عسیٰ، اللہ کی طرف سے موجبہ ہوتا ہے۔

صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نمازِ عشا میں «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ» کے بعد سجدے سے پہلے یہ دعا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ أَنْجِ عَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيْعَةَ، اَللّٰهُمَّ أَنْجِ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ،

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٤٦) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٨٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٣٠)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٤٧) یہ روایت مرسل ہے۔

اَللّٰهُمَّ أَنجِ الْوَلِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ، اَللّٰهُمَّ أَنجِ الْمُسْتَضْعَفِينَ، اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِينَ كَسِنِي يُوسُفَ» [1] ''اے اللہ! عیاش بن ابو ربیعہ، سلمہ بن ہشام، ولید بن ولید اور کمزوروں کو نجات دے۔ اے اللہ! مضر پر اپنی پکڑ سخت کر دے اور ان کو قحطِ یوسفی میں مبتلا کر۔''

دوسری روایت یہ ہے کہ سلام کے بعد قبلہ رو ہو کر فرماتے تھے: «اَللّٰهُمَّ خَلِّصِ الْوَلِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ وَعَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيعَةَ وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ وَضُعَفَاءَ الْمُسْلِمِينَ الَّذِينَ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَّلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا مِّنْ أَيْدِي الْكُفَّارِ» (رواه ابن أبي حاتم) اس کو ابن جریر نے بھی روایت کیا ہے۔ [2] اس حدیث کا شاہد صحیح میں کئی وجہ سے مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''كُنْتُ أَنَا وَأُمِّي مِنَ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ'' [3] ''میں اور میری ماں کمزور عورتوں اور بچوں میں سے تھے۔'' بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «كُنْتُ أَنَا وَأُمِّي مِمَّنْ عَذَرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ» [4]

پھر اللہ تعالیٰ نے ہجرت پر تحریض فرمائی اور مشرکین کو چھوڑ دینے کی ترغیب دی۔ کہا: مومن جہاں کہیں جائے گا، اس کو جگہ اور تونگری ملے گی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''مُرَاغَم'' ایک زمین سے دوسری زمین کو بدلنا ہے۔ اسی طرح امام ضحاک، ربیع اور ثوری رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مُرٰغَمًا كَثِيْرًا﴾ یعنی ''مُتَزَحْزَحًا عَمَّا يَكْرَهُ'' سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ''بروحا''۔ [5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اَلظَّاهِرُ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ، أَنَّهُ الْمَنْعُ الَّذِي يَتَخَلَّصُ بِهِ وَيُرَاغِمُ بِهِ الْأَعْدَآءُ'' [6]

﴿سَعَةً﴾ سے مراد رزق ہے۔ یہی اکثر کا قول ہے۔ ان میں امام قتادہ رحمہ اللہ بھی ہیں۔ [7] پھر فرمایا کہ جو اپنے گھر سے ہجرت کی نیت سے نکلا اور راہ میں مر گیا تو اس کو اللہ کے نزدیک ہجرت کا ثواب حاصل ہو گیا، جس پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ» یہ حدیث صحاح و مسانید اور سنن میں آئی ہے، [8] اس کا حکم ہجرت میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٧١)

[2] تفسير الطبري (٩/ ١١٠) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٤٨) اس کی سند میں ''علی بن زید'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩١) تفسير الطبري (٩/ ١١٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣١٢)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٤٩)

[6] تفسير ابن كثير (١/ ٧١٠)

[7] تفسير الطبري (٩/ ١٢١)

[8] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧) مسند أحمد (١/ ٢٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٠١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٤٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٧)

جمیع اعمال میں عام ہے۔

دوسری حدیث اس شخص کے بارے میں ہے، جس نے ننانوے لوگ قتل کیے تھے۔ پھر ایک عابد کو مار کر پورے سو کیے، پھر ایک عالم سے پوچھا کہ اُس کی توبہ قبول ہے کہ نہیں، اُس نے کہا: ''وَمَنْ يَّحُوْلُ بَيْنَكَ وَبَيْنَ التَّوْبَةِ'' ''کون ہے جو تیرے اور تیری توبہ کے درمیان ہو جائے؟'' یعنی تیری توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ پھر اُس سے کہا کہ تو اس شہر سے دوسرے شہر کو چلا جا، جہاں اللہ کو پوجتے ہیں۔ تو جب وہ مہاجر ہو کر نکلا تو اُس کو راستے میں موت آ گئی، رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا ہوا۔ رحمت والوں نے کہا کہ وہ تائب ہو کر نکلا ہے۔ عذاب والوں نے کہا: وہ اب تک نہیں پہنچا، حکم ہوا کہ دونوں طرف کی زمین کو ناپو، جس زمین سے وہ زیادہ قریب ہو، اُس کا سمجھو۔ اللہ تعالیٰ نے حکم بھیجا کہ وہ زمین دور اور یہ زمین جس کی طرف ہجرت کر کے جا رہا تھا قریب ہو جائے۔ دیکھا تو اُس کو زمینِ ہجرت کے قریب پایا، چناں چہ رحمت کے فرشتوں نے اسے لے لیا۔[1] (رواہ الشیخان)

ایک روایت میں مروی ہے کہ جب اُس کو موت آئی تو اپنے سینے سے ہجرت کی زمین کی طرف سرکنے لگا۔[2]

زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ خالد بن حزام رضی اللہ عنہ نے ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، راہ میں ایک سانپ نے کاٹ لیا، وہ فوت ہو گئے، اس پر یہ آیت اُتری۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس اثر میں غرابت ہے۔ کیوں کہ یہ قصہ مکہ کا ہے اور آیت مدینہ میں اُتری ہے۔ شاید مراد یہ ہے کہ آیت کا حکم عام ہے ہر مہاجر کے لیے، گو اس کی مناسبت سببِ نزول سے نہ ہو۔ واللہ أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ضمرہ بن جندب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکلے، راہ میں مر گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[4] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «مَنْ خَرَجَ حَاجًّا فَمَاتَ كُتِبَ لَهُ أَجْرُ الْحَاجِّ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ خَرَجَ مُعْتَمِراً فَمَاتَ كُتِبَ لَهُ أَجْرُ الْمُعْتَمِرِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ خَرَجَ غَازِياً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمَاتَ كُتِبَ لَهُ أَجْرُ الْغَازِيْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ» (رواہ أبو یعلٰی) یعنی جو حاجی، معتمر یا غازی راہ میں مر جاتا ہے، اس کے لیے قیامت تک اُس کا عمل لکھا جاتا ہے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے۔[6]

---

1. صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۸۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۶٦)
2. صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۶٦)
3. تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۱۰۵۰) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۳۲۱۸)
4. تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۱۰۵۱) اس کی سند میں ''اشعث بن سوار'' ضعیف راوی ہے۔
5. مسند أبي یعلٰی (۱۱/ ۲۳۸) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۵۵۳)
6. تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۱۱، ۷۱۲)

عمومی تفسیر:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ آیت اُس شخص پر دلیل ہے، جو کسی شہر میں اقامتِ دین پر قادر نہ ہو، جس طرح واجب ہے، اس کی وجہ کوئی بھی ہو اور وہ جانتا ہے کہ کسی اور شہر میں وہ اقامتِ دین پر قدرت رکھتا ہے تو اس پر ہجرت کرنا ضروری ہے۔ رجال سے مراد "زمناء" (بہت بوڑھے) ہیں۔ وِلدان کا ذکر باوجود عدمِ تکلیف کے اس لیے کیا، تاکہ ہجرت کے معاملے میں مبالغہ ثابت ہو اور یہ بات سمجھی جائے کہ اگر غیر مکلّف بھی ہجرت کر سکتا تو اُس پر بھی واجب ہوتی، پھر مکلّف کا کیا ذکر ہے؟ اور یا ولدان سے مراد مُراہقین (وہ بچے جو بلوغت کو پہنچنے والے ہوں) اور غلام ہیں۔ لفظِ حیلہ خلاصی پانے کی ہر قسم کی کوشش کے لیے عام ہے۔ یعنی اُن کو نکلنے کا کوئی حیلہ ہاتھ نہیں آتا، فقیر ہیں، عاجز ہیں، نہ کوئی راستہ ملتا ہے۔

یہ آیت کہ، جو ہجرت کرے گا، اس کو جگہ اور رزق ملے گا، اس بات پر دلیل ہے کہ ہجرت میں نیت کا صحیح ہونا، جو دنیاداری کے شائبوں سے پاک ہو، بہت ضروری ہے۔ مراغم کے معنی یہ ہیں کہ مہاجر اپنی ناک خاک آلودہ ہونے پر اپنی قوم کی زمین میں جائے سکونت پائے گا۔ سعت سے مراد رزق ہے یا دین کا غلبہ یا خوف کا امن کے ساتھ تبدیل ہونا یا ہدایت۔ بلکہ لفظ سعت ان سب معانی کے لیے عام ہے۔

پھر فرمایا: مہاجر اگر راستے میں مر جائے گا تو اس کا اجر ثابت ہے، وہ کہیں نہیں جائے گا۔ یہ اجر کا واجب ہونا اس کے استحقاق کی وجہ سے نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے محض ازراہِ تفضّل اپنے نفسِ مقدس پر واجب کیا ہے۔ اس آیت سے اس بات پر دلیل لی ہے کہ ہر اُس شخص پر ہجرت واجب ہے، جو دارِ شرک میں ہو یا ایسی جگہ میں جہاں کھلم کھلا گناہ کیے جاتے ہیں، جب کہ وہ شخص ہجرت پر قادر بھی ہو اور مستضعفین میں سے نہ ہو، کیوں کہ آیتِ شریفہ عام ہے، اگرچہ سبب خاص ہو۔ مکان و مکان اور زمان و زمان میں کوئی فرق ظاہر نہیں۔ ہجرت کے بارے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں،[1] وہ حدیثیں کتاب "دلیل الطالب" میں یکجا موجود ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اکثر شہروں کی موجودہ حالت لائقِ ہجرت ہے۔ وہاں کے مسلمانوں پر ہجرت فرض ہے، اگر وہ ضعیفوں میں نہیں ہیں اور چارۂ کار رکھتے ہیں یا آسودہ حال ہیں، مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ مہجر (وہ جگہ جہاں ہجرت کی جائے) غالباً ہاتھ نہیں آتا، جس کسی جگہ کو مہجر خیال کیا جاتا ہے، وہاں امن نہیں ہے کہ اقامتِ دین ہو سکے۔ عدمِ اقامتِ دین میں یہ بلاد اور وہ بلاد دونوں برابر ہیں، فقط اتنی بات ہے کہ ظاہر میں حکومت کا فرق ہے، کسی جگہ نام کے مسلمان حاکم ہیں۔ جہاں کہیں اقامتِ دین کا حال سنا جاتا ہے، وہاں کوئی ذریعہ روزی کا نہیں یا اگر ہے تو

---

[1] فتح البیان (۳/ ۲۱۵۔ ۲۱۸)

مہاجرین کو اس ملک میں روزی حاصل کرنے کا سلیقہ حاصل نہیں ہے۔ یا مسافر غریب الدیار کو وہاں باوجود اتحادِ مذہب، امن حاصل نہیں ہے۔

ایسے سخت اور درشت اسباب درپیش ہیں کہ جن کی وجہ سے نہ ضعف کی وجہ سے ہجرت نہ کرنے پر معافی کا یقین ہوسکتا ہے اور ہجرت کرنے کی صورت میں نہ کوئی حیلہ اور راستہ ہاتھ لگتا ہے، بس ایمان کی شرم اللہ کے ہاتھ ہے۔ اے اللہ! تو ہی عمل کی توفیق اور حق کو سمجھنے کی توفیق دینے والا ہے۔ ہمارے ساتھ وہ معاملہ کر جو تیری مرضی کے موافق ہو، ہم سے وہ کام لے، جس میں ہماری نجات ہو، ہم کو راہِ حق سمجھا دے، اس مشتبہ مسئلے سے بچا دے۔ ہم باوجود قدرت اور تونگری رکھنے کے مستضعفین سے بھی زیادہ عاجز اور درماندہ ہو رہے ہیں۔ ہم کسی جگہ کا شکوہ نہیں کرتے، اپنی بدبختی پر افسوس کرتے ہیں۔

سوائے تیرے ہمارا نہ کوئی یار ہے نہ مددگار، تو ہی اگر ہم کو دنیا اور آخرت کی آفات سے بچا لے گا اور ہماری ناتوانی اور عاجزی اور ذلت پر رحم فرمائے گا تو کام نکلے گا۔ وگرنہ ہم سر سے پاؤں تک گناہ کی دلدل میں گرفتار ہیں۔ ہم پر اگر کوئی مسئلہ حق ظاہر ہوتا ہے تو ہم اُس پر عمل نہیں کرتے یا کر سکتے ہیں، لیکن اس سے گریز کا راستہ تلاش کرتے ہیں تو ہاتھ نہیں آتا۔ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ إِلَّا إِلَيْكَ، وَالْخَيْرُ كُلُّهُ بِيَدَيْكَ، اَللّٰهُمَّ غُفْرًا۔ ''تیرے سوا کوئی جائے پناہ نہیں، ساری خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ اے اللہ! بخش دے۔''

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز قصر کر لو، اگر تمھیں ڈر ہو کہ کافر (حملہ کر کے) تمھیں فتنے میں ڈال دیں گے، بے شک کافر تمھارے کھلے دشمن ہیں (101)

نمازِ قصر:

سفر جو تین منزل کا ہو، اُس میں چار رکعت فرض میں سے دو ہی پڑھنی چاہییں۔ کافروں کے ستانے کا ڈر اُس وقت تھا جب یہ حکم آیا۔ اُس تقریب سے ہر وقت معافی ملی اور پوری نہ پڑھنے کی اجازت ملی کہ اللہ کی عطا سے بے پروائی ہوتی ہے اور سنت کی پابندی سفر میں نہیں رہتی۔ تقصیرِ نماز سے یہ مراد ہے کہ چار رکعت کے بجائے دو رکعت پڑھے۔ جمہور نے اس آیت کا مطلب اسی طرح سمجھا ہے۔ سفر میں قصرِ صلاۃ پر استدلال کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ طاعت کا سفر ہے، جیسے: جہاد یا حج یا عمرہ یا طلبِ علم۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، امام عطا اور یحییٰ رحمہ اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔ کسی نے کہا کہ سفرِ قربت شرط نہیں ہے، بلکہ سفرِ مباح ہونا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ﴾ [المائدۃ: ۳] ''پس جو شخص بھوک سے بے بس ہو جائے، جب کہ وہ گناہ پر مائل ہونے والا نہ ہو'' ہاں سفر میں گناہ نہ کرے۔ امام شافعی اور احمد رحمہ اللہ وغیرہما کا قول یہی ہے۔

امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ایک سوداگر بحرین کو جاتا ہے، اُس کو حکم دیا کہ دو رکعت نماز پڑھے۔① یہ حدیث مرسل ہے، کسی نے کہا: مطلق سفر کافی ہے، خواہ وہ مباح ہو یا ممنوع ہو، یہاں تک کہ اگر راہزنی اور راستے میں خوف پیدا کرنے کے لیے نکلے تو بھی رخصت ہے، کیوں کہ مطلق سفر پایا گیا ہے۔ یہ آیت کے عموم کی دلیل سے امام ابوحنیفہ، ثوری اور داود رحمہ اللہ کا قول ہے۔ جمہور اُن کے مخالف ہیں۔② فتنۂ کفار کے خوف کی شرط خارج بخرج غالب ہے۔ آیت کے نزول کے وقت یہی حال تھا، کیوں کہ اسلام کے شروع میں ہجرت کے بعد زیادہ تر سفر خوف ناک تھے، بلکہ لوگ عام جنگ یا خاص جنگ کے سوا سفر نہیں کرتے تھے۔

باقی اوقات میں اہلِ اسلام ہی جنگ کی حالت میں ہوتے تھے۔ لہٰذا جب کوئی منطوق غالب مخرج کے ساتھ خارج ہوتا ہے تو اس کے لیے کوئی مفہوم (مفہومِ مخالف) نہیں ہوتا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ﴾ [النور: ۳۳] ''اور تمھاری لونڈیاں اگر پاک دامن رہنا چاہیں تو تم دنیاوی زندگی کا سامان تلاش کرنے کی خاطر انھیں بدکاری پر مجبور نہ کرو۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ﴾ [النساء: ۲۳] ''اور تمھاری وہ سوتیلی بیٹیاں جو تمھارے ہاں پرورش پائیں اور ان عورتوں کے پیٹ سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہو۔''

قصر کا حکم خوف کے ساتھ مشروط نہیں:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تھا کہ نماز قصر کرنے میں خوف کی قید لگی ہے؟ فرمایا: یہ ایک صدقہ ہے، جو اللہ نے تم پر کیا، تم اس کے صدقے کو قبول کرو۔ (رواہ مسلم وأھل السنن) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ علی بن المدینی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ''هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ مِّنْ حَدِيْثِ عُمَرَ وَلَا يُحْفَظُ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ وَرِجَالُهٗ مَعْرُوْفُوْنَ''③

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ مدینہ سے مکہ کی طرف نکلے، وہ نہیں ڈرتے تھے مگر

① مصنف ابن أبي شیبة (۲/ ۲۰٤) یہ روایت مرسل ہے۔ ② تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۱۲)

③ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۶۸۶) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۱۹۹) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۰۳٤) سنن النسائي، رقم الحدیث (۱٤۳۳) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۰۶۵) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۱۳)

رب العالمین سے۔ آپ نے دو رکعتیں پڑھیں۔[1] (رواه الترمذي وصححه) ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان دو رکعت نماز پڑھی اور ہم امن میں تھے، کوئی خوف نہیں تھا۔[2] (رواه أبو بكر بن أبي شيبة والنسائي) سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مدینہ سے مکہ کی طرف نکلے، ہم نماز دو رکعت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ مدینہ کو لوٹ کر آئے۔ یحییٰ بن اسحاق راوی نے کہا ہے کہ میں نے پوچھا کہ تم کچھ مکہ میں ٹھہرے تھے؟ کہا: ہاں، دس دن۔[3] (رواه البخاري، وهكذا أخرجه بقية الجماعة) حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ منیٰ میں ظہر اور عصر کی نماز دو دو رکعت پڑھی، جب لوگ خوب امن میں تھے۔[4] (رواه أحمد والجماعة سِوَى ابْنِ ماجه)

صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ آمَنَ مَا كَان بِمِنًى رَكْعَتَيْنِ»[5] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھی، دو رکعت اور سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ہمراہ ان کی امارت کے شروع میں، پھر اس کو پورا کیا، یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے۔[6] (رواه البخاري) صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ہمارے ساتھ منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھی۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ حال بیان کیا تو انھوں نے "إِنَّا لِلّٰهِ" پڑھا۔ پھر کہا: میں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ منیٰ میں دو رکعت نماز پڑھی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دو رکعت پڑھی اور عمر کے ساتھ دو رکعت پڑھی، کاش چار رکعت کے عوض میری دو رکعت ہی قبول ہوں۔[7] (رواه البخاري) یہ حدیثیں اس بات پر دلیل ہیں کہ قصر کے لیے خوف ہونا شرط نہیں ہے۔ اس لیے بعض علما نے کہا ہے کہ اس جگہ قصر سے مراد قصرِ کیفیت ہے نہ کہ کمیت۔ یہی امام مجاہد، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے۔[8] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ نماز سفر اور حضر میں دو دو رکعت فرض ہوئی، پھر سفر کی نماز اسی طرح مقرر رہی اور حضر کی نماز بڑھا دی گئی۔ (رواه مالك) اس حدیث کو شیخین اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔[9]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٤٧)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٢٠٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٣٦) امام البانی رحمہ اللہ نے ان دونوں روایتوں کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٣/ ٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٩٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٣٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٤٨) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٣٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٧)

[4] مسند أحمد (٤/ ٣٠٦) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٩٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٦٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٨٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٤٦)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٣٣) [6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٣٢)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٩٥) [8] تفسير ابن كثير (١/ ٧١٤)

[9] الموطأ (١/ ١٤٦) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٥) سنن النسائي (٤٥٥)

لٰہذا جب اصل نماز سفر میں دو رکعت ہے تو پھر قصر سے کس طرح قصرِ کمیت مراد ہو سکتا ہے۔ اصل کے حق میں اس طرح کیونکر کہہ سکتے ہیں: ﴿ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ﴾ (آیتِ باب) دلالت میں اس سے زیادہ صریح وہ حدیث ہے، جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نمازِ سفر دو رکعت ہے، نمازِ اضحیٰ (عید الاضحیٰ) دو رکعت ہے، نمازِ فطر (عید الفطر) دو رکعت ہے، نمازِ جمعہ دو رکعت ہے، یہ نمازیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر تمام ہیں، قصر نہیں۔[1] (رواه أحمد والنسائي وابن ماجه وابن حبان في صحيحه) یہ اسناد شرطِ مسلم پر ہے۔

صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ نے تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر نماز فرض کی، حضر میں چار رکعت، سفر میں دو رکعت، خوف میں ایک رکعت۔[2] دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضر اور سفر کی نماز فرض کی، جو (سنت) نماز جس طرح کہ حضر میں اُس (فرض نماز) سے پہلے اور بعد میں پڑھی جاتی ہے، اُسی طرح سفر میں پڑھی جاتی ہے۔[3] (و رواه ابن ماجه) یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کے، جو پہلے گزر چکی، خلاف نہیں ہے۔ کیوں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ خبر دی ہے کہ اصل نماز دو رکعت تھی، حضر میں زیادہ کر دی گئی۔

لٰہذا جب یہ بات ٹھہر چکی تو یہ کہنا صحیح ہے کہ فرض نماز حضر میں چار رکعت ہے، جس طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: واللّٰه أعلم. لیکن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث دونوں، اس پر متفق ہیں کہ سفر کی نماز دو رکعت اور وہ تمام غیر مقصور ہے (کم نہیں کی گئی) جس طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں صریحاً مروی ہے۔ اس صورت میں آیتِ شریفہ سے مراد قصرِ کیفیت ہے، جس طرح نمازِ خوف میں ہے، اس لیے خوف کو فتنۂ کفار کہا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ ﴾ [النساء: ١٠٢] ''اور (اے نبی!) جب آپ مومنوں کے درمیان ہوں، پھر انھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں۔''

قصر کے مقصد کو اس جگہ بیان کر دیا، اس کی صفت اور کیفیت کو ذکر کیا، اسی لیے امام بخاری نے جب کتاب صلاۃ الخوف منعقد کی تو اس کے شروع میں یہی آیت لکھی: ﴿ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ

[1] مسند أحمد (١/ ٣٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٦٤) صحيح ابن حبان (٧/ ٢٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٣/ ١٠٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٧)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٢)

اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴾[1] ''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز قصر کر لو، اگر تمھیں ڈر ہو کہ کافر (حملہ کر کے) تمھیں فتنے میں ڈال دیں گے، بے شک کافر تمھارے کھلے دشمن ہیں۔ اور (اے نبی!) جب آپ مومنوں کے درمیان ہوں، پھر انھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک گروہ اپنے ہتھیار لگائے ہوئے آپ کے ساتھ جماعت میں کھڑا ہو، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی، وہ آپ کے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ ساتھ لے اور اپنے ہتھیار (لگائے رکھے۔) کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر یکبارگی دھاوا بول دیں۔ اور اگر تمھیں بارش سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے ہتھیار (ایک طرف) رکھ دو، اور اپنا بچاؤ ساتھ لو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اسی طرح امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حکم جنگ کے وقت ہے کہ سوار دو تکبیر کہے، جس طرف اُس کا منہ ہو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب سفر میں دو رکعت نماز پڑھے تو یہ تمام تقصیر ہوئی۔ حلال نہیں ہے کہ کافروں سے ڈرے کہ وہ کہیں نماز میں فتنہ ڈالیں، لہٰذا تقصیر ایک رکعت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ عسفان میں تھے، مشرک ضجنان میں تھے، ایسا اتفاق ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب کے ساتھ چار رکعت نمازِ ظہر پڑھی، جس میں رکوع سجود اور قیام کیا، مشرکوں نے چاہا کہ مال و متاع اور اثقال (بوجھوں) پر غارت گری کریں۔ یہی امام سدی رحمہ اللہ، جابر اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، کیوں کہ اقوال کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے۔ وَهُوَ الصَّوَابُ.[2]

اُمیہ بن عبداللہ رحمہ اللہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ ہم اللہ کی کتاب میں خوف میں نماز کو قصر کرنا پاتے ہیں، مسافر کے لیے قصر نماز نہیں پاتے۔ کہا ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کرتے دیکھا تھا ویسا کیا۔[3] نمازِ خوف کا نام مقصورہ ٹھہرا، آیت اسی پر محمول ہے نہ کہ قصر نماز مسافر پر۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسی قول کو برقرار رکھا ہے۔ نمازِ سفر کو قصر کرنے کے لیے شارع علیہ السلام کے فعل سے حجت لی ہے نہ کہ قرآنی حکم سے۔ اس سے زیادہ صریح روایت سماک حنفی رحمہ اللہ کی ہے، جس میں کہا ہے کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سفر کی نماز کا حال پوچھا، کہا: دو رکعت ہیں، یہ تمام ہیں نہ کہ قصر۔ قصر خوف کی نماز میں ہے۔ میں نے کہا: وہ کیا نماز ہے، کہا: امام ایک گروہ کے ساتھ ایک رکعت

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٣١٨) [2] تفسير الطبري (٩/ ١٣٠۔ ١٤١) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ١٠٥٢)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٦٦) تفسير الطبري (٩/ ١٢٩) مستدرك الحاكم (١/ ٣٨٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

نماز پڑھے، وہ اپنی جگہ پر چلا جائے، پھر دوسرا گروہ آئے، وہ اس کے ساتھ ایک رکعت پڑھے۔ امام کی دو رکعتیں ہوئیں، ہر گروہ کی ایک ایک رکعت ہوئی۔[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں کہا ہے کہ آیت کے یہ معنی کہ جب تم سفر کرو تو چار رکعت کو دو رکعت کر دو، یعنی نمازِ ظہر و عصر و عشا میں۔ اصل قصر بمعنی تضییق (تنگ کرنا) ہے یا کسی شے کا اصل سے ملانا۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قصر بمعنی نقص ہے۔[2] لیکن کسی مفسر نے اس طرح نہیں کہا کہ مِن تبعیض (بعض کرنا) کے لیے ہے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ قصر واجب نہیں ہے۔ جمہور اسی طرف گئے ہیں۔ کم لوگوں نے کہا ہے کہ واجب ہے، جیسے: عمر بن عبدالعزیز، کوفیین، قاضی اسماعیل، حماد بن ابی سلیمان اور امام مالک رحمہم اللہ وغیرہ۔ ان کی دلیل وہی حدیثِ متقدم ہے، جو سیدہ عائشہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[3] ظاہر آیت یہ ہے کہ قصر سفر میں جائز نہیں ہے، مگر کفار کی طرف سے فتنے کے خوف کے وقت نہ کہ امن کے وقت۔

لیکن سنتِ مطہرہ سے حالتِ امن میں قصر ثابت ہو چکا ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خوف کے وقت قصر قرآنِ مجید سے ثابت ہے اور امن میں قصر سنتِ صحیحہ ہے، شرط کا مفہوم خبرِ متواتر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ داود ظاہری رحمہ اللہ نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ سفر میں قصر کرنے کا جواز اُس کے لیے ہے، جس کو دشمن کا خوف ہو اور جس کو امن ہے، اس کے لیے قصر نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿اِنْ خِفْتُمْ﴾ اس سے پہلے کے بیان سے متصل نہیں ہے۔ کلام الفاظ ﴿مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ پر مکمل ہوا، اب ﴿اِنْ خِفْتُمْ﴾ سے دوسرا جملہ شروع ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ خوف کا ذکر اس حدیث سے منسوخ ہے، جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے اوپر گزر چکی ہے۔[4]

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ
مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ
وَّرَآىِٕكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ
وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ
عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ

---

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۱۳٤) اس کی سند حسن ہے۔ [2] زاد المسیر (۲/ ۱۸۱)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳٤۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦۸٥، ٦۸٦) فتح القدیر (۱/ ۸۰٥)

[4] فتح البیان (۳/ ۲۲۰۔ ۲۲۳)

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿١٠٢﴾

اور (اے نبی!) جب آپ مومنوں کے درمیان ہوں، پھر انھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک گروہ اپنے ہتھیار لگائے ہوئے آپ کے ساتھ جماعت میں کھڑا ہو، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی، وہ آپ کے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ ساتھ لے اور اپنے ہتھیار (لگائے رکھے۔) کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر یکبارگی دھاوا بول دیں۔ اور اگر تمھیں بارش سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے ہتھیار (ایک طرف) رکھ دو، اور اپنا بچاؤ ساتھ لو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿١٠٢﴾

نمازِ خوف کی کیفیت:

یہ نمازِ خوف بیان فرمائی کہ اگر مقابلے کا وقت ہو تو فوج دو حصے ہو جائے، ہر جماعت آدھی نماز میں امام کی شریک ہو آدھی جدا پڑھے، جب تک دوسری جماعت دشمن کے مقابل رہے اور اُس وقت نماز میں آمد و رفت معاف ہے۔ ہتھیار یا زرہ یا سپر ساتھ رکھیں، اگر اس قدر بھی فرصت نہ ہو تو جماعت موقوف کریں تنہا پڑھ لیں، پیادہ ہوں یا سوار، اشارے سے پڑھ لیں، اگر اس کی بھی فرصت نہ ملے تو قضا کر لیں۔

نمازِ خوف کئی طرح پر آئی ہے، کیوں کہ دشمن کبھی سامنے قبلے کی طرف ہوتا ہے اور کبھی غیر قبلے کی طرف اور نماز کبھی چار رکعت کی ہوتی ہے، کبھی تین کی، جیسے: مغرب اور کبھی دو کی، جیسے: صبح اور نمازِ سفر۔ پھر کبھی جماعت سے ادا کرتے ہیں اور کبھی جنگ کے ہنگامے کی تیزی اور گرمی کی وجہ سے جماعت نہیں کر سکتے، بلکہ الگ الگ قبلہ رو ہو کر یا بغیر قبلہ کی طرف منہ کیے ہوئے سوار یا پیادہ یا چلتے پھرتے پڑھتے ہیں۔ اس کی دلیل سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی وہ حدیث ہے، جو پہلے گزر چکی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام منذری رحمہ اللہ نے حاشیے میں کہا ہے کہ یہی امام عطاء، جابر، حسن، مجاہد، حکم، قتادہ اور حماد رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اسی طرف طاؤس اور ضحاک رحمہما اللہ بھی گئے ہیں۔ محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خوف میں صبح کی نماز ایک ہی رکعت ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام ابن راہویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسابقت (دوڑ) کے وقت ایک ہی رکعت تجھ کو کفایت کرتی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ایک سجدہ کافی

ہے، کیوں کہ اللہ کا ذکر تو ہے۔ دوسروں نے کہا کہ ایک تکبیر ہی کافی ہے۔ شاید تکبیر سے مراد ایک رکعت ہے۔ یہی امام احمد رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عمر اور کعب رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ اسی کے قائل ہیں۔ اور سدی رحمہ اللہ نے جنھوں نے ایک تکبیر کو بیان کیا ہے، بظاہر اس کو کافی سمجھا ہے۔ عبدالوہاب بن بخت مکی رحمہ اللہ نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر تکبیر پر بھی قدرت نہ ہو تو جی میں ضرور کہہ لے، یعنی نیت کر لے۔

بعض علما نے جنگ اور مناجزت کے عذر سے نماز میں تاخیر کو جائز کہا ہے، جس طرح نبی اکرم ﷺ نے احزاب کے دن تاخیر فرمائی تھی۔[1] پھر ظہر اور عصر کو غروبِ آفتاب کے بعد پڑھا۔ پھر مغرب، پھر عشا پڑھی یا جس طرح اُس کے بعد جس دن بنو قریظہ کی طرف لشکر روانہ کیا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے، مگر بنی قریظہ میں۔ اُن کو نماز نے راستے میں پالیا۔ بعض نے کہا کہ تیز رفتاری مراد ہے نہ کہ نماز میں تاخیر۔ انھوں نے اپنی نماز راستے کے دوران عین وقت پر پڑھ لی۔ دوسروں نے بنی قریظہ میں پہنچ کر غروبِ آفتاب کے بعد پڑھی۔ نبی اکرم ﷺ نے دونوں فریق میں سے کسی ایک پر بھی ملامت نہ کی۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس مسئلے پر "كتاب السيرة" میں کلام کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ جن لوگوں نے نمازِ عصر عین وقت پر پڑھی، وہ نفس الامر میں اقرب الی اصابۃ الحق (حق سے زیادہ قریب تھے) اگرچہ دوسرے لوگ بھی معذور تھے۔ اس جگہ نماز میں تاخیر کرنے پر ان کی حجت اس بات میں ہے کہ وہ جہاد کے سبب سے یہود کے عہد شکن طائفہ ملعونہ کو محصور کرنے کے لیے جلدی کر رہے تھے۔[3]

باقی رہے جمہور، ان کا قول یہ ہے کہ نمازِ خوف کے ساتھ یہ سب منسوخ ہے، کیوں کہ وہ اس وقت تک نازل نہیں ہوئی تھی۔ جب نازل ہوئی تو تاخیرِ نماز کا حکم منسوخ ہوگیا۔ یہ بات ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے، جس کو امام شافعی اور اہلِ سنن نے روایت کیا ہے،[4] بخوبی واضح ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب الصلاة عند مناهضة الحصون ولقاء العدو" میں بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر فتح ہونے والی ہو اور نماز پر قدرت حاصل نہ ہو تو ہر شخص اشارے سے نماز پڑھے۔ اگر اشارہ بھی نہ کر سکے تو نماز میں تاخیر کرے، یہاں تک کہ لڑائی ہو چکے یا امن ملے، اُس وقت دو رکعت پڑھے۔ اگر امن نہ ہو تو ایک رکعت پڑھے دو سجدے کرے، یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر تکبیر ان کو کافی نہیں ہوگی۔ نماز کو موخر کریں، یہاں تک کہ لڑائی تھمے، امن ملے۔ یہی امام مکحول رحمہ اللہ کا قول ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٠) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٧١٥۔ ٧١٦)

[4] مسند الشافعي (١/ ٣٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٦١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ١/ ٢٥٧)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم تستر شہر کے قلعے پر دشمن کے مقابلے میں فجر کے طلوع ہونے کے وقت آئے، آتشِ جنگ گرم تھی۔ نماز پر قدرت نہ ہوئی، آخر سورج بلند ہونے کے بعد پڑھی، ہم ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ ہماری فتح ہوئی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے اس نماز کے بدلے میں دنیا وما فیہا اچھی نہیں لگتی۔[1] (انتھی ما ذکرہ البخاري) پھر اُس کے بعد احزاب کے دن نماز کی تاخیر کے بارے میں حدیث ذکر کی ہے۔ پھر بنی قریظہ میں نماز کی حدیث ذکر کی، گویا امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ واللّٰہ أعلم. جو اس طرف مائل ہے، وہ فتح تستر کے دن سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی حجت لا سکتا ہے، کیوں کہ یہ مشہور بات ہے، لیکن یہ واقعہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی امارت میں ہوا تھا۔ یہ منقول نہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر انکار کیا ہو یا کسی اور صحابی نے۔ واللّٰہ أعلم.

کہتے ہیں کہ نمازِ خوف خندق میں مشروع ہوئی، کیوں کہ غزوۂ ذات الرقاع خندق سے پہلے تھا، جیسا کہ جمہور علمائے سیرت وغزوات کا قول ہے۔ محمد بن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، واقدی، محمد بن سعد کاتب واقدی اور خلیفہ بن خیاط رحمہم اللہ وغیرہم نے اسی پر حکم لگایا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ذات الرقاع خندق کے بعد تھا، سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی دلیل سے، اور وہ نہ آئے، مگر خیبر کے بعد۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

بڑا تعجب ہے کہ مزنی و قاضی ابو یوسف و ابراہیم بن اسماعیل بن علیہ رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ نمازِ خوف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوۂ خندق کے دن نماز کو موخر کرنے کے سبب سے منسوخ ہے۔ یہ نہایت غریب قول ہے، کیوں کہ خندق کے بعد نمازِ خوف کے بارے میں احادیث ثابت ہیں اور اُس دن نماز کی تاخیر کو مکحول اور اوزاعی رحمہما اللہ کے قول پر محمول کرنا صحت کے زیادہ قریب اور دلیل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط ہے۔ واللّٰہ أعلم.[2] لہٰذا اللہ پاک کا قول کہ ''جب تم ان کو نمازِ خوف پڑھاؤ''، یہ حالت پہلی حالت کے علاوہ ہے، کیوں کہ اس میں ایک رکعت پر قصر کا ذکر ہے، جس طرح حدیث اس پر دلیل ہے کہ اکیلے اور پیادہ، سوار اور قبلہ رُو یا بغیر قبلہ رُو پڑھو۔

پھر اس حال کا ذکر کیا کہ مقتدی ایک امام کے پیچھے ہوں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس شخص کا کیا اچھا استدلال ہے، جو اس آیتِ کریمہ سے جماعت کے واجب ہونے کی طرف گیا ہے، کیوں کہ اس جماعت کے سبب بہت سے افعال بخش دیے گئے۔ اگر جماعت واجب نہ ہوتی تو کبھی یہ امر جائز نہ ہوتا اور جس نے اس آیت سے اس بات کی دلیل لی ہے کہ نمازِ خوف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منسوخ ہے اور دلیل کے لیے آیت: ﴿ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ ﴾ پیش کرتا ہے، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ صفت فوت ہے تو اس کا استدلال ضعیف ہے۔ یہ ویسا ہی استدلال ہے، جیسا مانعینِ زکات نے اس آیت سے کیا تھا: ﴿ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ [التوبة: ١٠٣] ''(اے نبی!) ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٣٢٠) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧١٦۔ ٧١٧)

(تاکہ) آپ اس کے ذریعے سے انھیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں اور ان کے لیے دعا کریں، بے شک آپ کی دعا ان کے لیے سکون (کا باعث) ہے، اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' کہا کہ اب ہم نبی اکرم ﷺ کے بعد کسی کو زکات نہ دیں گے نہ خود نکالیں گے، جس کو چاہیں گے دیں گے۔ آخر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی تردید کی، اس استدلال کو نہ مانا اور ان کو زکات دینے پر مجبور کیا، جس نے انکار کیا، اس سے لڑے۔

شانِ نزول:

آیتِ باب کے نزول کا سبب یہ ہے کہ بنی النجار کی قوم نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ ہم سفر کرتے ہیں، نماز کس طرح پڑھیں، اس پر یہ آیت اُتری: ﴿ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ... الخ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) پھر وحی رک گئی، ایک سال کے بعد نبی اکرم ﷺ جہاد کے لیے نکلے۔ ظہر پڑھی، مشرکوں نے کہا کہ محمد ﷺ اور اُن کے اصحاب نے تم کو اپنی پشتوں پر قدرت دی ہے، اب تم کس لیے حملہ نہیں کرتے؟ ان میں سے بعض نے کہا کہ ان کی ایک اور نماز ہے، اس کے پیچھے۔ اُس پر اللہ تعالیٰ نے دونوں نمازوں کے درمیان یہ آیت بھیجی: ﴿ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ ﴾ [النساء: ۱۰۱] اُس وقت یہ نمازِ خوف نازل ہوئی۔[1] (رواہ ابن جریر)

لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ حدیث کا یہ سیاق سخت غریب ہے۔ ہاں بعض کے لیے اس میں سے شاہد ہے۔ امام احمد و اہلِ سنن کے نزدیک نبی اکرم ﷺ نے نمازِ خوف دو بار پڑھی ہے۔ ایک بار عسفان میں، دوسری بار بنی سلیم کی زمین میں۔[2] (رواه أبو داود بإسناد صحيح) اس کے اور بہت سے شواہد ہیں۔

پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نمازِ خوف کی صفت کے بیان کا مقام کتبِ فروع بتلایا۔ صفاتِ ثابتہ میں سے جس صفت سے یہ نماز ثابت ہوگی، وہ کافی، شافی اور وافی ہے۔ ایک خاص صفت اور طریقے پر جم جانا مقلدین کا طریقہ ہے اور محققین کا یہ شیوہ نہیں۔ نمازِ خوف میں ہتھیار کا اُٹھانا ظاہر آیت کی بنا پر علما کے ایک گروہ کے نزدیک اس کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول یہی ہے۔ اسی پر یہ آیت دلیل ہے: ﴿ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى... الآية ﴾ (آیتِ باب) یعنی تم لڑنے بھڑنے کو تیار رہو، جس وقت حاجت ہو بلا کلفت اپنے ہتھیار پہن لو۔[3]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ قول کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد نمازِ خوف منسوخ ہے، مدفوع (مردود) ہے،

---

① تفسير الطبري (۹/ ۱۲۶) اس کی سند میں ''سیف بن عمر تمیمی'' ضعیف راوی ہے۔

② مسند أحمد (٤/ ٥٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٣٦) سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٥٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (صحيح أبي داود: ٤/ ٣٩٣۔ ٣٩٤)

③ تفسير ابن كثير (١/ ٧١٧۔ ٧١٩)

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی اقتدا کریں اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ»[1] صحابہ قرآنِ مجید کے معانی کو پہچانتے تھے، انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے بعد بارہا یہ نماز پڑھی ہے۔ یہ نماز سنتِ مطہرہ میں مختلف قسموں پر آئی ہے۔ اس کے متعدد طریقے ثابت ہیں، ہر صفت کافی ہے۔ جس نے اہلِ علم میں سے کسی ایک خاص صفت کو اختیار کیا، وہ صحیح طریقے سے دور جا پڑا۔ مذکورہ صفات کو صاحبِ مسک الختام (نواب صاحب کی شرح بلوغ المرام) نے بیان کر دیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت میں جو ہتھیار اتار رکھنے کا ذکر آیا ہے، وہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، وہ زخمی تھے۔[2] (رواه البخاري)

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ إِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَإِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے رہو، پھر جب تمھیں اطمینان ہو جائے تو (پوری) نماز پڑھو، بے شک مومنوں پر مقررہ وقتوں میں نماز فرض ہے (103) اور تم دشمن قوم کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو بے شک وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں جیسے تم تکلیف اُٹھاتے ہو۔ اور تم اللہ سے جس چیز کی امید رکھتے ہو، وہ اس کی امید نہیں رکھتے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، بہت حکمت والا ہے (104)

نمازِ خوف کے بعد کثرتِ ذکر کا حکم:

یعنی اگر خوف کے وقت نماز میں کوتاہی ہو تو نماز کے بعد ہر طرح اللہ کو یاد کرو۔ ایک نماز میں یہ قید ہے کہ وقت ہی پر ادا کرنی چاہیے اور اللہ کی یاد ہر حال میں درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا ہے کہ نمازِ خوف کے بعد اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ اگرچہ نمازِ غیر خوف کے بعد بھی اللہ کا ذکر مشروع اور مرغوب ہے، لیکن اس جگہ زیادہ تاکید ہے، کیوں کہ نمازِ مذکورہ کے ارکان میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ نماز میں آنا جانا جائز ٹھہرا، جو دوسری نمازوں میں نہیں ہوتا، جس طرح اللہ تعالیٰ نے حرمت والے مہینوں کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ ﴾ [التوبة: ٣٦] ''چناں چہ تم ان (مہینوں) میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔''

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠٥) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٢٣) فتح البیان (٣/ ٢٢٤۔ ٢٢٦)

حالاں کہ حرمت والے مہینوں کے علاوہ مہینوں میں بھی نفس پر ظلم کرنا منع ہے، لیکن اُن دنوں میں حرمت والے مہینوں کی بیان کردہ شدید حرمت کی وجہ سے ظلم نہ کرنے کی بہت زیادہ تاکید ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی سارے اوقات اور حالتوں میں۔ پھر جب امن ملے اور ڈر نہ رہے، اطمینان حاصل ہو تو نماز کو پورا کرو، اس کے تمام حدود، خشوع، رکوع، سجود اور تمام حالتوں کو ادا کرو۔

نماز مقرر وقت پر فرض ہے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ موقوت مفروض کے معنی میں ہے۔ یہ بھی کہا کہ نماز کے لیے ایک وقت ہوتا ہے، حج کے وقت کی طرح۔ یہی بات امام مجاہد، سالم بن عبداللہ، علی بن حسین، محمد بن علی، مقاتل، سدی اور عطیہ عوفی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "إِنَّ لِلصَّلَاةِ وَقْتًا كَوَقْتِ الْحَجِّ" زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موقوت بمعنی منجم ہے، جب ایک نجم گیا دوسرا آیا۔ نجم سے مراد وقت ہے۔[1]

دشمن کا پیچھا کرنے کا حکم:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دشمن کا پیچھا کرنے میں کمزور نہ ہو، بلکہ کوشش اور سعی کرو۔ اُن سے لڑو، ہر تاک کی جگہ میں بیٹھو، کیوں کہ جس طرح تمھیں زخم اور قتل پہنچتا ہے، اسی طرح وہ بھی زخمی اور مقتول ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ﴾ [آل عمران: ۱۴۰] "اگر تمھیں (احد میں) زخم لگے ہیں تو ایسے ہی زخم (بدر میں) کافروں کو بھی لگ چکے ہیں۔" بلکہ تم میں اتنی بات زیادہ ہے کہ زخموں اور تکالیف میں ان کے ساتھ برابری کے باوجود تم اللہ سے نصرت اور تائید اور ثواب کی اُمید رکھتے ہو، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور زبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تم سے اُس کا وعدہ کیا ہے اور وہ وعدہ حق اور خبر سچی ہے اور وہ اُس میں سے کسی ایک بات کی بھی اُمید نہیں رکھتے تو تم ان کی نسبت زیادہ بہتر ہو، تمھیں جہاد کے ساتھ زیادہ رغبت رکھنی چاہیے، تاکہ اللہ کا کلمہ قائم ہو اور بلند ہو۔ اللہ قضا و قدر اور احکامِ کونیہ اور شرعیہ جاری کرنے میں سب سے زیادہ جاننے والا اور اختیار والا ہے، وہ ہر حال میں تعریف کے لائق ہے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ تم اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یعنی سب حال میں، یہاں تک کہ حالتِ جنگ میں بھی یاد کرو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہر حالت میں اللہ کو یاد کرنا ہے، یعنی رات ہو یا دن، خشکی ہو یا تری، سفر ہو یا حضر، تونگری کی حالت ہو یا فقیری کی، بیماری ہو یا صحت، پوشیدہ اور علانیہ۔[2] جمہور نے کہا ہے کہ نمازِ خوف کے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٥٧) [2] تفسیر الطبري (٩/ ١٦٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٥٦) اس کی سند حسن ہے۔

بعد اس ذکر کا حکم دیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حالات کے تقاضے کے مطابق جب گھمسان کی جنگ ہو رہی ہو، اُس وقت اللہ کو یاد کرنا چاہیے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ [البقرة: ۲۳۹] ''پھر اگر تم خوف کی حالت میں ہو تو پیدل یا سوار ہی (نماز پڑھ لو)۔'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔[1] (أخرجه الشيخان)

معلوم ہوا کہ آیت کی عمومیت سبب کی خصوصیت سے زیادہ بہتر ہے۔ کتاب کے معنی ہیں: فرض۔ موقوت کے معنی ہیں: محدود اور معین۔ معلوم ہوا کہ نماز کو مقررہ اوقات سے باہر ادا کرنا جائز نہیں، خواہ خوف ہو یا امن۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ نماز واجب اور مقرر ہے حضر میں چار رکعت، سفر میں دو رکعت۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نماز کو شرعی عذر کے سوا بے وقت نہیں پڑھنا چاہیے۔ شرعی عذر میں نیند یا بھول یا اس جیسی اور وجوہ ہیں۔ پھر فرمایا کہ جو اجرِ جزیل اور جزائے عظیم کی اُمید تم کو ہے، وہ اُن کو نہیں ہے، کیوں کہ وہ کفر اور انکار کے مرتکب ہیں۔ لٰہذا تم صبر اور عدمِ ضعف کے ان کی نسبت زیادہ مستحق ہو، کیوں کہ تمھارے دل مضبوط ہیں، تم موت کو غنیمت سمجھتے ہو اور وہ موت کو عذاب سمجھتے ہیں۔[2]

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿١٠٥﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِـيْمًا ﴿١٠٧﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿١٠٨﴾ ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَاۗءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿١٠٩﴾

(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، تا کہ آپ کو اللہ نے جو سیدھی راہ دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنیں (105) اور اللہ سے بخشش مانگیں۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (106) اور آپ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١/ ٢٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٣)
[2] فتح البيان (٣/ ٢٢٧۔ ٢٢٩)

ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں۔ بے شک اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو خیانت کرنے والا، گناہ گار ہو ﴿107﴾ وہ لوگوں سے (تو اپنی حرکتیں) چھپا سکتے ہیں، مگر اللہ سے نہیں چھپا سکتے اور وہ اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو چھپ کر ایسا مشورہ کرتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں اور وہ جو بھی عمل کرتے ہیں اللہ اسے گھیرے ہوئے ہے ﴿108﴾ ہاں، تم لوگوں نے یہاں دنیا کی زندگی میں تو ان (مجرموں) کی طرف سے جھگڑا کرلیا، پھر قیامت کے دن اللہ کے ہاں ان کی طرف سے کون جھگڑے گا؟ یا (وہاں) کون ان کا وکیل ہوگا؟ ﴿109﴾

شانِ نزول:

آیت کے اول اور آخر میں ایک قصے کا ذکر ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے وقت میں ایک انصاری کی زرہ آٹے میں رکھی ہوئی تھی اور وہ گم ہوگئی، صبح کو تلاش کی تو آٹے کا نشان دیکھا جو ایک شخص کے گھر تک جاتا تھا، جس کا نام طعمہ بن ابیرق تھا، وہاں نہ پائی، وہ نشان آگے ایک یہودی کے گھر تک گیا، جس کا نام زید تھا، وہاں پائی تو اُس یہودی نے کہا کہ یہ طعمہ نے میرے سپرد کی۔ طعمہ نے کہا کہ میں بَری ہوں، چور وہی ہے۔ طعمہ کی قوم نے رات کو باہم مشورہ کیا کہ ہم سب مل کر نبی کریم ﷺ کے پاس گواہی دیں کہ طعمہ بَری ہے تو نبی اکرم ﷺ ہماری حمایت کریں گے اور یہودی چور ٹھہرے گا۔ صبح کو یہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں اور نبی اکرم ﷺ کو خبردار کردیا کہ فی الحقیقت چور وہی طعمہ تھا۔[1]

اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم:

اللہ پاک نے اس آیت میں اپنے رسول کو مخاطب فرما کر یہ کہا کہ یہ کتاب جو تم پر بھیجی ہے سچی ہے، اللہ کی طرف سے آئی ہے، خبر اور طلب میں حق کو شامل کرنے والی ہے۔ علمائے اصول نے لفظ "بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ" سے اس بات پر حجت لی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے لیے اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنا جائز تھا۔ اس کی دلیل یہ آیت اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی وہ حدیث ہے، جو صحیحین میں آئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے حجرے کے دروازے پر جھگڑے کی آواز سنی، باہر آئے، فرمایا: میں بشر ہوں، جیسا سنتا ہوں، ویسا حکم دیتا ہوں۔ شاید تم میں کوئی زیادہ زبان آور ہوتا ہے، اپنی حجت میں بعض سے، میں اسی کے مطابق حکم دے دیتا ہوں تو جس کے لیے میں کسی مسلمان کے حق کا حکم کروں تو وہ دوزخ کی آگ کا ٹکڑا ہے، اب چاہے وہ اُسے اُٹھائے یا چھوڑ دے۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث اس طرح تحریر کی ہے کہ دو انصاری مرد وراثت کے ایک

---

[1] تفسیر البغوي (٢/ ٢٨٣۔ ٢٨٤)
[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٣٢٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧١٣)

پرانے مقدمے کے سلسلے میں جھگڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، ان کے پاس کوئی دلیل یعنی گواہ وغیرہ نہیں تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس جھگڑا لائے ہو، میں بشر ہوں، شاید تم میں سے بعض اپنا مقدمہ پیش کرنے میں دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو۔ میں تمھارے درمیان جیسا سنتا ہوں، اُس کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔ تو جس کسی کو میں اُس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دلا دوں تو وہ اُس کو نہ لے، کیوں کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے، جو میں اُس کو دلاتا ہوں۔ وہ اُس آگ کے ٹکڑے کو گلے کا ہار بنا کر قیامت کے دن آئے گا۔ دونوں مرد روئے، ہر ایک نے کہا: میرا حق میرے بھائی کے لیے ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم ایسا کہتے ہو تو جاؤ آپس میں حق کو باہم تقسیم کرلو۔ قرعہ ڈالو، پھر ایک دوسرے سے معاف کرا لو۔ اس کو امام ابو داود رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا اور اتنا زیادہ کیا: «إِنِّي إِنَّمَا أَقْضِي بَيْنَكُمَا بِرَأْيِي فِيمَا لَمْ يُنْزَلْ عَلَيَّ فِيهِ» [1] ''میں اس معاملے میں اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں، جس کے بارے میں مجھ پر وحی نازل نہ ہوئی ہو۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کچھ انصاری نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ بعض جنگوں میں لڑے تھے، ان میں سے ایک کی زرہ چوری ہوگئی، ایک انصاری کے بارے میں گمان ہوا، زرہ کے مالک نے نبی اکرم ﷺ سے آ کر کہا کہ طعمہ بن ابیرق نے میری زرہ چرائی ہے۔ چور نے جب یہ دیکھا تو اس کو بری کے گھر میں ڈال دیا، اپنے کنبے کے لوگوں سے کہا کہ میں نے زرہ غائب کر کے فلاں شخص کے گھر میں ڈال دی ہے، اب اسی کے پاس سے نکلے گی، وہ سب رات کو نبی اکرم ﷺ کے پاس گئے، کہا: اے اللہ کے نبی! ہمارا ساتھی بَری ہے، زرہ فلاں شخص کے پاس ہے، ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی ہے۔ آپ ہمارے صاحب کو سب کے سامنے معذور کہیں اور اُس شخص سے مجادلہ کریں، اگر آپ کے سبب سے اللہ اُس کو نہ بچاتا تو وہ ہلاک ہوجاتا۔ نبی اکرم ﷺ نے کھڑے ہوکر اُس کو بَری کر دیا، سب کے سامنے اُس کے عذر کو قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر یہ آیتیں ان لوگوں کے بارے میں اُتاریں، جو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تھے۔ فرمایا کہ جھوٹ بول کر لوگوں سے چھپتے ہیں، اللہ سے تو نہیں چھپ سکتے۔ [2] (رواہ ابن مردویہ)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سیاق غریب ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدی اوز ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت بنی ابیرق کے چور کے بارے میں اُتری ہے۔ سیاق مختلف ہیں، لیکن ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس قصے کو محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے مطولاً روایت کیا ہے۔ یہ داستان جامع ترمذی میں بھی موجود ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اس کو اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ ابوالشیخ اصبہانی نے بھی اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے بھی مستدرک میں اس کا ذکر کر کے کہا ہے: ''هٰذَا حَدِيثٌ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ وَلَمْ

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٣٢٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٨٤۔ ٣٥٨٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٥/ ٢٥٢)

[2] تفسير الطبري (٩/ ١٨٣۔ ١٨٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

يُخْرِجَاه'' تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ میں ترمذی کی روایت سے سیدنا قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے مطولاً سارا قصہ مذکور ہے۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا تم نے اس دنیا کی زندگی میں حکام کے سامنے جھوٹ بول کر مدد کی۔ حکام تو ظاہر پر حکم کرتے ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ کل قیامت کے دن بھیدوں اور پوشیدہ چیزوں کو جاننے والے کے سامنے تمھاری کیا حالت ہوگی؟ وہاں اس دعوے کی ترویج کے لیے کون وکیل ہوگا؟

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ کتاب سے مراد قرآن ہے، حق سے مراد صدق ہے یا امر و نہی اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا۔ ﴿ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد وحی ہے یا جو قاعدہ وحی کے موافق ہو۔ یہاں آنکھ کا دیکھنا مراد نہیں ہے، بلکہ دل کا دیکھنا مقصود ہے، جو اللہ تعالیٰ نے سمجھایا اور دکھلایا۔ ارشاد کیا ہے علم یقینی کو رؤیت اس لیے کہتے ہیں کہ قوتِ ظہور میں رؤیت کے برابر ہوتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تم میں کوئی یہ بات نہ کہے کہ میں نے حکم کیا، جو مجھ کو اللہ نے سمجھایا، اس لیے کہ یہ سمجھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا۔ ہاں رائے قائم کرنے میں کوشش کرے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے صحیح ہوتی تھی، اللہ ان کو دکھا دیتا تھا۔ ہماری رائے ظن ہے، علم نہیں ہے۔[2]

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کرتے تھے وحیِ الٰہی کے موجب ہی کرتے تھے۔ نیز جھگڑا ختم کرنے کے لیے کسی کی رائے پر عمل کرنے کی ممانعت میں اس بات کی دلیل ہے کہ کسی کو کسی شخص کی طرف سے اس وقت تک جھگڑنا نہیں چاہیے، جب تک اس کو علم ہو کہ وہ حق پر ہے۔ آیت بنی الابیرق کے بارے میں اُتری ہے۔

یہ قصہ مختصراً اور مطولاً اہلِ سنن کے نزدیک تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔[3] پھر اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ تم جو خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا کرنے لگے، اُس سے استغفار کرو، اللہ غفور و رحیم ہے۔ یہ آیت اُس شخص کی دلیل ہے، جس کے نزدیک انبیاء سے گناہ کا صادر ہونا جائز ہے، کیوں کہ اگر گناہ واقع نہ ہوتا تو استغفار کا حکم نہ دیا جاتا۔ اس کے کئی جواب ہیں، جو تفسیر خازن میں مذکور ہیں۔[4]

پھر فرمایا کہ لوگوں سے چھپتے ہیں، اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ اس میں انسان کو گناہ کے ارتکاب سے بہت ڈانٹ ہے کہ جو ناجائز مشورہ وہ رات کے وقت کرتے ہیں، اللہ کو اُس کی خبر ہے۔ یہ آیت ان کی بے شرمی اور اللہ سے بے خوفی کو آڑے ہاتھوں لیتی ہے کہ باوجود کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھنے والا ہے، وہاں نہ کوئی پردہ اور نہ کوئی چیز اُس سے غائب ہے پھر بھی وہ بے دھڑک ایسے مشورے کرتے ہیں اور ایسے جھوٹ بناتے ہیں۔ مانا

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٢١۔ ٧٢٣) تفسیر الطبري (٩/ ١٧٧۔ ١٨١) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٠٣٦) مستدرك الحاكم (٤/ ٤٢٦)

[2] تفسیر الخازن (١/ ٥٩٣۔ ٥٩٤)   [3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٠٣٦)

[4] تفسیر الخازن (١/ ٥٩٤)

کہ اس دنیا کی زندگی میں یہ داؤ چل گیا، کہو آخرت میں اس مقدمے کی کون وکالت کرے گا؟ یہ استفہام انکار اور ڈانٹ کے لیے ہے۔[1]

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗــــَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗـــــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْھُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا (110) اور جو شخص کوئی گناہ کرتا ہے تو بے شک اس کی یہ کمائی اسی کے لیے وبال ہوگی، اور اللہ خوب جاننے والا، بہت حکمت والا ہے (111) اور جو شخص کوئی خطا یا گناہ کرتا ہے، پھر کسی بے گناہ پر اس کا الزام لگا دیتا ہے تو (ایسا کر کے) وہ ایک بڑے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اُٹھاتا ہے (112) اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو لوگوں کے ایک گروہ نے یقیناً ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آپ کو بہکا دے، اور وہ اپنے آپ کے سوا کسی کو نہیں بہکاتے، اور وہ آپ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے آپ پر یہ کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور آپ کو وہ کچھ سکھایا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اور آپ پر اللہ کا فضل بہت زیادہ ہے (113)

گناہ گار اور الزام تراش کو توبہ و استغفار کی ترغیب:

کبیرہ کو گناہ قرار دیا اور صغیرہ کو اپنا برا کہا۔ یہ ان لوگوں کو حکم ہے کہ توبہ کریں تو قبول ہو، قوم اپنے دل میں آپ شرمندہ نہ رہیں کہ ہم پر عیب لگا۔ آیندہ عیب لگنے کے خطرے سے اپنے ساتھیوں کی حمایت نہ کریں، جب تک تحقیق نہ ہو، کیوں کہ اللہ تو خبردار ہے، اُس کا حکم بھی یہی ہے کہ ایک کا گناہ دوسرے پر نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور بخشش سے یہ خبر دی کہ جو توبہ کرے گا، اُس کی توبہ قبول ہوگی، کوئی سا بھی گناہ

[1] فتح البیان (۳/ ۲۳۰۔ ۲۳۳)

ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں کو ازراہِ عفو و حِلم و کرم وسعتِ رحمت و مغفرت یہ خبر دی ہے کہ جس نے کوئی گناہ کیا چھوٹا یا بڑا، پھر اللہ سے بخشوایا تو وہ اللہ کو بخشنے والے مہربان پائے گا، گو اُس کے گناہ آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں سے زیادہ بڑے ہوں۔[1] (رواہ ابن جریر)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں جب کسی سے گناہ ہوتا تو صبح کو اُس کے گناہ کا کفارہ اُس کے دروازے پر لکھا ملتا، جب پیشاب کپڑے میں لگ جاتا تو قینچی سے کترتا۔ ایک آدمی نے کہا کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو خیر دی تھی۔ عبداللہ نے کہا: جو اللہ نے تم کو دیا ہے، وہ اُن سے بہتر ہے۔ پانی کو تمھارے لیے طہور کر دیا۔ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ﴾ [آل عمران: ١٣٥] ''اور وہ لوگ جب کوئی برا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنے آپ پر ظلم کر گزرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے، پھر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا ﴾ (آیتِ باب)[2] (رواہ ابن جریر)

حبیب بن ابی ثابت رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک عورت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہا کہ ایک عورت نے زنا کیا، اس کو حمل ہو گیا، جب بچہ جنا تو اُس کو مار ڈالا، کہا: وہ دوزخی ہے، وہ روتی ہوئی چلی، اُس کو بلا کر کہا: میں نہیں دیکھتا تیرے کام کو مگر ان دو اُمر میں سے ایک اُمر: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا ﴾ (آیتِ باب) وہ آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔[3] (رواہ ابن جریر)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں ہے کوئی مسلمان کہ گناہ ہو جائے اُس سے، پھر وہ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ کے اللہ تعالیٰ سے اُس گناہ کو بخشوائے، مگر اللہ بخش دیتا ہے۔ پھر یہ دونوں آیتیں پڑھیں: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا ... الخ ﴾ اور ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ﴾ [آل عمران: ١٣٥] (رواہ أحمد) اس حدیث کو اہلِ سنن نے بھی روایت کیا ہے۔[4] اس کی سند میں مقال ہے۔ ابن مردویہ نے اور سند سے روایت کیا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سنا اور وہ سچے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں ہے کوئی بندہ کہ اُس سے گناہ ہو گیا ہو، پھر اُس نے اُٹھ کر وضو کیا، پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھی، اللہ سے اپنا گناہ بخشوایا، مگر اللہ پر حق ہے کہ اُس کو بخش دے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا ... الخ ﴾[5] (آیتِ باب)

---

[1] تفسیر الطبري (٩/ ١٩٥-١٩٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٠١) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٩/ ١٩٥) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسیر الطبري (٩/ ١٩٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حبیب بن ابی ثابت رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[4] مسند أحمد (١/ ٨) سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٥٢١) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٤٠٦) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ١٠٩) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٣٩٥) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٧٣٨)

[5] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٢٤) اس کی سند میں ''عمر بن یزید'' ضعیف راوی ہے۔

پھر دوسرے طریق سے اس کے قریب قریب روایت کیا ہے، مگر وہ اسناد صحیح نہیں ہے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے اردگرد بیٹھتے، آپ کو کچھ کام ہوتا تو جا کر، کر آتے، جوتے یا کچھ اور اسی جگہ چھوڑ جاتے۔ ایک بار جوتے چھوڑ کر کھڑے ہوئے، میں پانی کا بدھنا لے کر پیچھے چلا، ایک ساعت کے بعد آئے قضائے حاجت نہ کی، فرمایا: میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا، اُس نے کہا: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ میں نے چاہا کہ اپنے یاروں کو بشارت دوں۔

سیدنا ابو الدرداء نے کہا کہ لوگوں پر اس سے پہلے کی آیت شاق گزری تھی: ﴿ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ﴾ [النساء: ١٢٣] ''بلکہ جو کوئی برا عمل کرے گا، اس کا اسے بدلہ دیا جائے گا۔'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اگرچہ زنا کیا ہو چوری کی ہو، پھر اللہ سے بخشوایا تو اس کو بخش دے گا؟ فرمایا: ہاں، پھر میں نے دوبارہ یہی کہا، فرمایا: ہاں۔ پھر تیسری بار کہا تو فرمایا: « وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ، ثُمَّ اسْتَغْفَرَ اللّٰهَ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ عَلٰى رَغْمِ أَنْفِ أَبِي الدَّرْدَاءِ » راوی نے کہا: میں نے ابو الدرداء کو دیکھا کہ انگلی سے اپنے ناک کو مارتے تھے۔ (رواہ ابن مردویہ) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ''هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ جِدًّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ بِهٰذَا السِّيَاقِ وَفِي إِسْنَادِهٖ ضُعْفٌ'' [1]

الزام تراشی کبیرہ گناہ ہے:

یہ آیت شریفہ: ﴿ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا ﴾ (آیتِ باب) اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [الأنعام: ١٦٤] یعنی کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، ہر نفس پر اُس کا عمل ہے، دوسرا اُس کو نہ اُٹھائے گا، اس لیے یہ کہا کہ اللہ علیم وحکیم ہے۔ یعنی یہ بات اس کے علم وحکمت، عدل ورحمت سے ہے۔ پھر ذکر کیا، کسی بَری کو گناہ لگانے کا، جس طرح بنو ابیرق نے کیا کہ اپنی قبیح حرکت کو اُس مرد صالح یعنی لبید بن سہل کے سر تھوپ دیا، جس کا ذکر حدیث میں مروی ہے یا زید بن سمین یہودی کے نام، جس طرح دوسروں نے کہا ہے۔ ان کی براءت کے باوجود زرہ کی چوری کا الزام لگایا، وہ لوگ بڑے ظالم اور خائن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مطلع کر دیا۔ یہ سختی اور ملامت اُن کے حق میں عام ہے اور اگر کوئی اور اُن جیسے کام کرے تو اُن کے حق میں بھی ہے۔ اُن کی سزا بھی ان کی سزا کے مثل ہے۔

امام قتادہ بن نعمان رحمہ اللہ نے کہا کہ بنی ابیرق کے قصے میں یہ آیت آئی ہے: ﴿ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ﴾ (آیتِ باب) مراد اُسید بن عروہ اور اُس کے ساتھی ہیں، [2] جنھوں نے بنی ابیرق کی تعریف کی اور قتادہ بن نعمان کو ملامت کی کہ اُس نے ان کو متہم کیا، حالاں کہ وہ صالح اور بَری ہیں، لیکن بات اس پر نہیں تھی، جو نبی اکرم ﷺ کو پہنچائی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے معاملے کا فیصلہ کر دیا، نبی کریم ﷺ پر معاملہ کھول دیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٢٣۔ ٧٢٤) اس کی سند میں ''تمام بن نجیح'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٦٤)

پھر یہ احسان رکھا کہ ہم تمام حالات میں تمھارے مددگار اور بچانے والے ہیں۔ ہم نے تم کو کتاب دی، یعنی قرآن، حکمت بخشی، یعنی سنت، جو تم نہیں جانتے تھے وہ تم کو سکھایا، یعنی کتاب کے نازل ہونے سے پہلے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴾ [الشوریٰ: ٥٢۔ ٥٣] ”اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے ذریعے سے ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ اس اللہ کے راستے کی طرف جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔ آگاہ رہو! اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹتے ہیں۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ يُّلْقٰۤى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ [القصص: ٨٦] ”اور آپ اُمید نہیں رکھتے تھے کہ آپ کی طرف (یہ) کتاب وحی کی جائے گی، مگر یہ آپ کے رب کی رحمت ہی سے (وحی کی گئی) ہے، لہٰذا آپ کافروں کے مددگار ہرگز نہ ہوں۔“ اسی لیے پھر یہ کہا کہ اللہ کا فضل تم پر بہت ہے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ﴾ (آیت زیرِ باب) میں سارق (چور) بنی اُبیرق کو ترغیب ہے کہ توبہ اور استغفار کرے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کے بارے میں اُتری ہے، اُس نے شرک کیا، حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا: کیا میرے لیے توبہ ہے؟ اُس پر یہ آیت آئی۔[1] بہر حال عمومیتِ لفظ کو اختیار کرنا چاہیے نہ کہ خصوصیتِ سبب کو۔ اس لیے یہ آیت اللہ کے بندوں میں سے ہر بندے کے لیے ہے، جس سے کوئی گناہ ہوا ہے، پھر اُس نے اللہ پاک سے استغفار چاہی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس نے سورت نساء کی ان دو آیات کو پڑھا، پھر اللہ سے استغفار کی تو اللہ تعالیٰ اُس کو بخش دیتا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا ...الخ﴾ اور ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا ...الخ﴾[2] توبہ کی قبولیت اور گناہوں کے مٹ جانے کے بارے میں سنتِ مطہرہ کی کتابوں میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ اس بارے میں رسالہ ”محو الحوبہ“ (از نواب صاحب) کافی وشافی و وافی ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبي (٥/ ٣٨٠) [2] الدر المنثور (٢/ ٦٧٨)

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ توبہ سارے گناہوں کی مقبول ہے، خواہ وہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ۔ یہ ایک حکم ہوا۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ صرف استغفار کافی ہے۔ بعض نے کہا کہ توبہ کے ساتھ مشروط ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خطیہ کبھی دیدہ دانستہ ہوتا ہے، کبھی نادانستہ۔ اثم (گناہ) جب ہوتا ہے دانستہ ہی ہوتا ہے۔[1] یا خطیہ سے مراد صغیرہ گناہ ہے اور اثم سے کبیرہ گناہ۔ یا خطیہ وہ گناہ ہے جو بندے اور رب کے درمیان ہو، اثم وہ ہے جو بندوں پر ظلم میں سے ہو۔ یا خطیہ وہ ہے جو فاعل کے ساتھ خاص ہو اور اثم وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ زیادتی ہو۔ بہتان وہ جھوٹ ہے، جو بَری پر لگایا گیا ہے، جس سے وہ بیچارا حیران و پریشان ہوگیا ہے۔

اس جگہ فضل و رحمت سے مراد ہے کہ بنی ابیرق کے مقدمے میں اللہ تعالیٰ نے حق سے آگاہ فرما دیا یا اس سے مراد نبوت اور پاک دامنی ہے۔ طائفہ سے مراد بنوظفر ہیں، جنھوں نے بنی اُبیرق کی مدد کی تھی، وہ چاہتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ انصاف کی راہ سے چوک جائیں اور مقدمے کے فیصلے میں دھوکا کھا جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: اس دھوکے کا وبال انھیں کی جان پر ہے، کیوں کہ انھوں نے گناہ پر معاونت کی، تمھارا کچھ نقصان نہیں ہے۔ تم پر تو ہم نے کتاب بھیجی اور حکمت اُتاری، جو تم نہیں جانتے تھے، وہ تم کو سکھا دیا۔ یہ تم پر ہمارا فضل ہے۔[2]

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١١٤﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿١١٥﴾

ان کی اکثر خفیہ سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی، مگر جو شخص صدقے یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے (تو یہ اچھی بات ہے) اور جو کوئی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے، تو ہم اسے جلد بہت بڑا اجر عطا کریں گے ﴿114﴾ اور جس شخص کے سامنے واضح شکل میں ہدایت آجائے اور اس کے بعد وہ رسول کی مخالفت کرے، اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی پیروی کرے، تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے، جس طرف وہ جانا چاہے اور ہم اسے جہنم میں ڈالیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ﴿115﴾

بھلائی کی سرگوشی:

منافق لوگ نبی اکرم ﷺ سے کان میں باتیں کرتے، تاکہ لوگوں میں اپنا اعتبار ٹھہرائیں اور مجلس میں بیٹھ کر

[1] تفسير الطبري (٩/ ١٩٧) [2] فتح البيان (٣/ ٢٣٣_ ٢٣٦)

آپس میں کان میں باتیں کرتے، کسی کا عیب کسی کا گلہ کرتے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اُن کی اکثر مشاورت بے خیر ہے۔ صاف بات کو چھپانے کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر اُس میں کچھ دغا ملی ہے اور چھپانا ہو تو خیرات کو چھپائے، تا کہ لینے والا شرمندہ نہ ہو یا مسئلۂ دین کی غلطی بتانے کو، تا کہ نادان لوگ خجل (شرمندہ) نہ ہوں، یا لڑے ہوؤں میں صلح کرانے کو، کیوں کہ غصے والا جوش میں صلح نہیں مانتا، پہلے آپس میں طے کر لیں، پھر اُس کو سنائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا ہاتھ ہے مسلمانوں کی جماعت پر، جس نے جدا راہ پکڑی، وہ دوزخ میں دور جا پڑا۔ پس جس بات پر امت کا اجماع ہوا ہے، وہی اللہ کی مرضی ہے اور جو منکر ہو سو وہ دوزخی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ جو اکثر لوگ کانا پھوسی کرتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں، اس میں کوئی بھلائی، خوبی اور بہتری نہیں ہے۔ مگر وہ مشورہ جس میں کوئی بہتر کام ہو، جن کا ذکر ہوا۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ابن آدم کا تمام کلام کی ذمے داری اس کے خلاف ہے نہ اس کے حق میں، صرف اللہ عزوجل کا ذکر یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کلام اس کے حق میں ہے۔ (رواہ ابن مردویہ)

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو نے نہیں سنا، اللہ نے کتاب میں فرمایا ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ﴾ (آیتِ باب) سو وہ بعینہٖ یہی ہے، یعنی جو اس حدیث میں مروی ہے۔ پھر کہا: تو نے نہیں سنا کہ اللہ نے کتاب میں کہا ہے: ﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ [النبأ: ٣٨] ''اس سے صرف وہی کلام کر سکے گا جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔'' (فهذا هو بعينه) اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے، مگر ثوری کا قول ذکر نہیں کیا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔[1]

ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ کذاب نہیں، جو لوگوں کے درمیان صلح کراتا ہے، اچھی بات سناتا اور کہتا ہے، پھر کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کی باتوں میں سے سوائے تین معاملوں کے رخصت نہیں دی: ایک لڑائی میں، دوسرے لوگوں کے درمیان صلح کرانے میں، تیسرا میاں سے بیوی کی بات چیت یا بیوی سے میاں کی بات چیت۔ ام کلثوم رضی اللہ عنہا ان مہاجرات میں سے تھیں، جنھوں نے نبی اکرم ﷺ سے بیعت کی تھی، اس حدیث کو سوائے ابن ماجہ کے جماعت نے روایت کیا ہے۔[2] ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ خبر نہ دوں تم کو میں اُس بات کی جو روزوں، نماز اور صدقہ سے افضل ہے؟ کہا: ہاں، فرمایا: دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانا، پھر کہا کہ آپس

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٧٤) شعب الإيمان (٤/ ٢٤٥) اس کی سند میں ''ام صالح'' مجہولہ راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣٦٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٠٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٣٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ١٩٣) مسند أحمد (٦/ ٤٠٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٤٥)

کا فساد (دین کو) مونڈنے والا ہے۔ (رواہ أحمد و أبو داود) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے کہا: میں تجھ کو ایک تجارت نہ بتاؤں، کہا ہاں، فرمایا: تو لوگوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کیا کر، جب کہ ان میں آپس میں فساد ہو اور ان میں ملاپ کرا جبکہ وہ الگ الگ ہوں۔[2] (رواہ البزار) اس کی سند میں ایک راوی لین ہے اور احادیث غیر متابع علیہا روایت کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو ایسا کام رضائے الٰہی کی اُمید سے کرے گا، اُس کو بڑا اجر ملے گا۔ بہت زیادہ اور وسیع ثواب حاصل ہوگا۔

رسول کی مخالفت کی سزا اور اجماع کی حجیت:

پھر فرمایا کہ جو کوئی شریعت کے راستے سے ہٹ کر، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، کسی اور راستے پر چلے گا، ایک حصے میں وہ ہوگا اور دوسرے حصے میں شرع، اور یہ بات اُس سے حق اور سیدھا راستہ ظاہر ہو جانے کے بعد دیدہ و دانستہ ہوگی تو اس کا انجام جہنم ہے۔ اس کی پہلی صفت غیر مومنین کے راستے پر ہمیشہ چلنا ہے، لیکن مخالفت کبھی تو شارع کے حکم کی ہوتی ہے اور کبھی ایسے امر کی جس پر تمام امت کا اجماع ہو اور اس میں امت کا اتفاق بہ خوبی ثابت ہو چکا ہے، کیوں کہ اجتماعِ امت میں امت کی بزرگی اور تعظیمِ نبوی کی وجہ سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اس بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: "ذَكَرْنَا مِنْهَا طَرَفاً صَالِحًا فِي كِتَابِ أَحَادِيثِ الْأُصُولِ"، بعض علما نے ان کے تواتر معنوی کا دعویٰ کیا ہے، اسی پر امام شافعی رحمہ اللہ نے حجت لینے کے لیے اعتماد کیا ہے، اجماع کے حجت ہونے پر۔ اور یہ کہا کہ اجماع کی مخالفت حرام ہے۔

اس آیتِ شریفہ میں غور و فکر کے بعد یہ بہت اچھا اور مضبوط استنباط ہے۔ اگرچہ بعض نے اس کو مشکل ٹھہرایا ہے اور اس مدعا پر دلیل لینے کو بعید ٹھہرایا ہے، اسی لیے اللہ نے اُس پر یہ وعید فرمائی ہے: ﴿ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى ... الخ ﴾ یعنی جب وہ اس پر چلے گا تو ہم اس کو اس کی جزا دیں گے۔ اُس کے سینے میں اس کام کو حسن و زینت بخشیں گے، یعنی بطورِ استدراج، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [القلم: ٤٤] "لہٰذا چھوڑ دیجیے مجھے اور اس کو جو اس حدیث (قرآن) کو جھٹلاتا ہے، ہم انھیں آہستہ آہستہ (تباہی کی طرف) لے جائیں گے، اس طرح کہ انھیں علم تک نہ ہوگا۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ [الصف: ٥] "پھر جب وہ ٹیڑھے ہوگئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔" اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١٠] "اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔"

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٤٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح الجامع (٢٥٩٥)

[2] مسند البزار (١٣/ ١٨٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عبد الرحمن بن عبد الله العمري وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٨/ ١٥٢)

اس کا انجام آخرت میں جہنم کی آگ رکھا ہے، کیوں کہ جو ہدایت سے باہر ہو، قیامت کے دن اس کا کوئی راستہ نہیں مگر آگ کی طرف۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ٢٢] ''(اے فرشتو!) اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا، اور ان کے جوڑوں کو اور (ان کو) جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴾ [الکھف: ٥٣] ''اور مجرم آگ کو دیکھیں گے تو یقین کریں گے کہ بے شک وہ اس میں گرنے والے ہیں، اور وہ اس سے پھرنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔''[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ نجویٰ سرگوشی کو کہتے ہیں، دو آدمی کریں یا جماعت۔ ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ صدقے سے مراد صدقۂ تطوع ہے (نفلی صدقہ) یا فرض، مگر پہلی قسم زیادہ صحیح ہے۔ لفظ معروف نیکی کی تمام قسموں اور کاموں کو شامل ہے۔ مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ معروف سے مراد فرض ہے، مگر پہلا زیادہ صحیح ہے۔[2] حدیث میں مروی ہے کہ ہر معروف صدقہ ہے، یہ بھی صدقہ ہے کہ تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملے۔[3] کسی نے کہا کہ معروف کسی ستم زدہ کی دادرسی کو پہنچنا ہے یا کسی محتاج کی اعانت کرنا، مگر لفظ ان سب سے زیادہ وسیع ہے، کیوں کہ اس کی عمومیت زیادہ بہتر ہے۔

اصلاح بین الناس کو خاص اور عام کی طرف پھیرا جا سکتا ہے۔ اصلاح عام ہے، خون، عزتوں اور مالوں میں، بلکہ ہر شے میں جس میں ایک دوسرے کے خلاف دعوے واقع ہوں۔ حدیثوں میں زبان کی آفتوں سے ڈرایا ہے۔ خاموشی اور زبان کی حفاظت میں ترغیب دی ہے۔ باہم صلح کرانے پر رغبت دلائی ہے۔ ابتغائے رضا (رضا مندی تلاش کرنا) اس لیے کہا کہ نیت خالص ہوگی تو اجر ملے گا اور اگر نہیں ہوگی تو نہیں ملے گا۔ اجرِ عظیم وہ ہے جس کی حد اور انتہا نہ ہو۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گنوار سے کہا: اے اعرابی! اللہ نے تیری بابت قرآن اُتارا ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (آیتِ باب) نیز فرمایا: اے اعرابی! اجرِ عظیم جنت ہے۔ اُس نے کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدَانَا لِلْإِسْلَامِ"[4] (رواه أبو النصر السجزي) مشاقت باہمی عداوت اور مخالفت کو کہتے ہیں۔

﴿ تَبَيَّنَ ﴾ سے مراد واضح ہو جانا اور ظاہر ہو جانا ہے۔ یعنی رسالت کی صحت ان دلیلوں سے، جو اس کی صحت پر ہیں، ظاہر اور روشن ہوگئی اور پھر مسلمانوں کی راہ چھوڑ کر کسی اور ہی راستے پر چلے، یعنی ان کی مخالفت کی اور ان کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٢٦۔ ٧٢٧) [2] تفسیر القرطبي (٥/ ٣٨٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٥٧) [4] الدر المنثور (٢/ ٦٨٥)

اعتقاد و عمل اور قول کے برعکس کام کیا تو وہی گمراہی ہے، جو ان کے پلے پڑے گی، جو انھوں نے اپنے لیے اختیار کی، دنیا میں اور آخرت میں انجام جہنم ہے۔ اس آیت سے بعض اہلِ علم نے حجیتِ اجماع پر استدلال کیا ہے، ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ (آیتِ باب) ہے۔

لیکن میرے نزدیک اس میں یہ حجت نہیں ہے، کیوں کہ اس جگہ ﴿ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ سے مراد دینِ اسلام سے غیر اسلام کی طرف خروج کرنا ہے، جس طرح کے قرآنی الفاظ سے سمجھا جاتا ہے اور اس کا سببِ نزول اس کا شاہد ہے۔[1] لہٰذا یہ بات علمائے ملتِ اسلامیہ میں سے کسی عالم پر صادق نہیں آ سکتی، جس کا بعض مسائل میں اجتہاد بعض مجتہدین معاصرین کے مخالف ہو، کیوں کہ اس نے تو مومنین کے راستے پر چلنے کا قصد کیا ہے، وہ ان کی راہ کے سوا کوئی اور راہ نہیں چلا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: «لَا يَجْمَعُ اللّٰهُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ عَلَى الضَّلَالَةِ أَبَداً وَيَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ فَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ»[2] (أخرجه الترمذي والبيهقي وأخرجاه أيضاً عن ابن عباس مرفوعاً) ''اللہ کبھی اس امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا، اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے، جو اس سے نکلا، وہ جہنم میں جائے گا۔''

احادیث میں لفظ جماعت سے مراد جماعت اہلِ سنت ہوتی ہے۔ سنت حدیث کو کہتے ہیں۔ اہلِ سنت سے مراد اہلِ حدیث، عاملِ حدیث اور متبع سنت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کا ہاتھ اہلِ حدیث پر ہے، جو ان سے علاحدہ ہوا، وہ مخالفِ رسول ہے، مخالفت کا انجام آیت باب اور اس حدیث مستطاب (خوش کرنے والی) میں جہنم اور نار بتلایا۔ یہ بھی حدیثِ مذکور سے ثابت ہوا ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ساری امت عمل بالحدیث کو ترک کرنے پر اتفاق کر لے۔ بلکہ اس امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر مخالفین سے غالب رہے گا، اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ علی بن المدینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ غالب گروہ انھیں اہلِ حدیث کا گروہ ہے۔[3] وللہ الحمد.

---

[1] نواب صاحب کا مطلب اگر اس سے یہ ہے کہ اس کے مصداق مدعیانِ اسلام میں سے کوئی نہیں ہو سکتا، تو یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ آیت میں ﴿ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ سے مراد صحابہ کرام ہیں اور ﴿ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ سے مراد وہ مسائل ہیں، جن پر صحابہ کا اجماع ہے، جیسے حدِ رجم، حیات و نزولِ مسیح وغیرہ۔ جن کی بابت صحابہ کے درمیان اختلاف منقول نہیں۔ ایسے اجماعی مسائل کے انکار کو علمائے اسلام نے کفر کے مترادف اور اس آیت میں بیان کردہ وعید کا مصداق قرار دیا ہے۔ اس لیے یہ آیت بلاشبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے منہج کے اتباع کی اور ان کے اجماعی موقف کی اہمیت کو واضح کرتی ہے، جس سے انحراف صریح زیغ و ضلال اور کفر و الحاد ہے۔ باقی رہا اجتہادی مسائل میں اختلاف تو وہ تو ناگزیر ہے، جیسا کہ نواب صاحب نے فرمایا ہے۔ اس اختلاف کا کوئی تعلق صحابہ کے اجماعی مسائل سے نہیں ہے نہ ان میں اجتہاد کی ضرورت ہی ہے۔ [ص۔ ي]

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٦۔ ٢١٦٧) الأسماء والصفات للبيهقي (٢/ ١٣٣۔ ١٣٦) اس کی سند میں ''سلیمان بن سفیان'' ضعیف راوی ہے۔ نیز سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو « فمن شذ...» کے الفاظ کے علاوہ صحیح کہا ہے۔ (صحيح الجامع، رقم الحديث: ١٨٤٨) فتح البيان (٣/ ٢٣٧۔ ٢٤٠)

[3] سنن الترمذي (٤/ ٥٠٤)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ
يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿116﴾ اِنْ
يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿117﴾
لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿118﴾
وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ
وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ
وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿119﴾ يَعِدُهُمْ
وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿120﴾ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿121﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ
اللّٰهِ قِيْلًا ﴿122﴾

بے شک اللہ یہ گناہ ہرگز نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے سوا جسے چاہے معاف کر دیتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے، تو وہ یقیناً بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے (116) وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو پکارتے ہیں اور دراصل وہ سرکش شیطان ہی کو پکارتے ہیں (117) اللہ نے اس پر لعنت کی ہے، اور اس نے کہا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ ضرور لے کر رہوں گا (118) اور میں انھیں گمراہ کروں گا اور انھیں امیدیں دلاؤں گا، اور میں انھیں حکم دوں گا تو وہ جانوروں کے کان چیر دیں گے، اور میں انھیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ میں ردو بدل کر دیں گے اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنا لے تو وہ یقیناً کھلے نقصان میں جا پڑا (119) شیطان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں امیدیں دلاتا ہے، مگر شیطان کے سارے وعدے فریب کے سوا کچھ نہیں (120) ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ اس سے چھٹکارے کی صورت نہ پائیں گے (121) اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم جلد انھیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کون قول و قرار میں سچا ہے؟ (122)

مشرک حقیقت میں شیطان کی پوجا کرتا ہے:

شرک کی بخشش نہیں اور اوپر منافقوں کا ذکر تھا، جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوں اور جدا راہ پر چلیں، یہ آیت بیان فرماتی ہے کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک، حکم میں شریک کرنے کو فرمایا، یعنی سوائے دینِ اسلام کے اور دین پسند کرے اور اُس پر چلے، پس اسلام کے سوا جو دین ہے، وہ سب شرک ہے، اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔[1] شیطان نے کہا: تیرے بندے اپنے مال میں میرا حصہ ٹھہرا رکھیں گے، جیسے دستور ہے کہ بتوں کی نیاز نکالتے ہیں۔ جانوروں کے کان چیریں گے، یہ کافروں کا دستور تھا، گائے یا بکری کا ایک بچہ بت کے نام کر دیا، اُس کے کان میں نشان ڈال دیتے اور صورت بدلنا یہ کہ لڑکے کے سر پر بت کے نام کی چوٹی رکھتے، مسلمان کو ان کاموں سے بچنا ضروری ہے۔ اپنے بزرگوں سے یہ معاملہ نہ کریں، کافر بھی جن کے ساتھ یہ کرتے تھے، انھیں بزرگ ہی جان کر کرتے تھے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیتِ کریمہ پر کلام پہلے گزر چکا ہے، جو حدیثیں اس سے متعلق تھیں، وہ بھی اس سورت میں پہلے مذکور ہو چکیں۔ ترمذی نے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: "مَا فِي الْقُرْآنِ آيَةٌ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ هٰذِهِ الْآيَةِ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ الآية" پھر کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس نے شرک کیا، وہ راہِ حق سے بہک گیا۔ صواب (درست راہ) سے دور جا پڑا، اپنی جان برباد کی۔ ﴿ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ﴾ [الحج: ۱۱] کا مصداق ہوا۔ سعادتِ دارین سے محروم رہا۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ عورتوں کا پکارنا یہ تھا کہ ہر بت کے ساتھ ایک چڑیل تھی۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اناث سے مراد اوثان (بت) ہیں۔ یہی ابو سلمہ، عروہ، مجاہد، ابو مالک، سدی اور مقاتل رحمہم اللہ کا قول ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکین ملائکہ کو اللہ کی لڑکیاں کہتے تھے، ان کی عبادت کو اللہ کی قربت کا ذریعہ بتاتے تھے، پھر ان کو رب ٹھہرا کر لونڈیوں کی طرح بنا کر زیور پہناتے۔ کہتے یہ اللہ کی بیٹیوں کی مثل اور مشابہ ہیں۔[4]

یہ تفسیر اس آیتِ کریمہ کے مشابہ ہے: ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴾ [النجم: ۱۹] "کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۱۹] "اور انھوں نے فرشتوں کو، جو رحمان کے بندے ہیں، (رحمان کی) بیٹیاں ٹھہرایا ہے۔ کیا وہ ان کی پیدایش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی شہادت ضرور لکھی جائے گی اور ان سے (اس چیز کی) پوچھ گچھ

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کے ماننے کے دعوے دار، اگر غیر اللہ کو پوجیں تو وہ شرک نہیں ہوگا، بلکہ وہ بھی شرک ہی ہے، لیکن چوں کہ غیر اللہ کی پوجا کے شرک ہونے میں تو کوئی ابہام ہی نہیں ہے، اس لیے نواب صاحب نے اس کا یہاں ذکر نہیں کیا۔ [ص۔ ی]

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۳۷) اس کی سند میں "ثویر بن ابی فاختہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٦٧) اس کی سند حسن ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٦٧۔ ١٠٦٨)

ہوگی۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ﴾ [الصافات: ۱۵۸] ''اور انھوں نے اس (اللہ) کے اور جنوں کے درمیان رشتہ ٹھہرایا۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اناث سے مراد مُردے ہیں[1] ، یعنی گور پرستی کرتے ہیں، مردوں کو پکارتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اناث ہر مردہ شے ہے، جس میں جان نہ ہو، خشک لکڑی یا سوکھا پتھر۔[2] اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ درحقیقت شیطان سرکش کو پکارتے ہیں، کیوں کہ اُسی نے اس کام کا اُن کو حکم دیا ہے، ان کی نظروں میں اس کو حسن اور زینت بخشی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ﴾ [یٰسٓ: ٦٠] ''اے بنی آدم! کیا میں نے تمھیں (اس بات کی) تاکید نہیں کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا۔'' اور فرشتوں کی زبان سے قیامت کے دن مشرکین کی طرف سے خبر دی ہے: ﴿ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [سبا: ٤١] ''بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے، ان کے اکثر انھی پر ایمان رکھتے تھے۔''

لعنت سے مراد رحمت اور عافیت سے دوری اور محرومی ہے اور اللہ کا اپنے فضل و کرم سے باہر نکال دینا ہے۔ نصیبِ مفروض سے مراد متعین حصہ اور مقررہ حصہ ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے آگ میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا۔[3] گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ راہِ حق سے باز رکھوں گا۔ توقع سے مراد ہے کہ ان کی نگاہ میں ترکِ توبہ کو اچھا کر کے دکھاؤں گا۔ طرح طرح کے وعدے بتاؤں گا۔ تاخیر کی طرف بلاؤں گا، ان کی جانوں سے اُن کو دھوکا دوں گا۔ وہ جانوروں کے کان چیریں گے، یہ بحیرہ و سائبہ اور وصیلہ کی علامت ہے۔ تغیر خلق اللہ سے مراد چوپایوں کا خصی کرنا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، انس رضی اللہ عنہم، سعید بن المسیب، عکرمہ، ابی عیاض، قتادہ، ابو صالح اور ثوری رحمہم اللہ کا قول یہی ہے۔[4] حدیث میں اس کام کی ممانعت آئی ہے۔[5] حسن بصری نے کہا ہے کہ مراد وشم ہے۔[6] صحیح مسلم میں وشم چہرہ سے منع فرمایا ہے۔ ایک روایت میں اس کام پر لعنت آئی ہے۔[7] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ اللہ لعنت کرے واشمات (گودنے والیوں) اور مستوشمات (گدوانے والیوں) اور نامصات و متنمصات (بھنویں بنانے اور بنوانے والیوں) اور متفلجات (دانتوں میں زینت کے لیے خلا بنوانے والیوں) پر، حُسن کے لیے، جو اللہ عزوجل کی خلقت کو بدلتی ہیں۔

پھر کہا: «وَمَالِيْ لَا أَلْعَنُ مَنْ لَّعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ يعني قوله: ﴿ وَمَآ

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۲۰۸) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۹/ ۲۰۸) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٦٩)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٦٩) [5] سنن البیهقي الكبریٰ (١٠/ ٢٤) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦٩٦٠)
[6] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٧٠) [7] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢١١٦۔ ٢١١٧)

اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ٧] ''اور میں ان پر لعنت کیوں نہ کروں جن پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہے اور وہ اللہ عز وجل کی کتاب میں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔'' [1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، نخعی، حسن، قتادہ، حکم، سدی، ضحاک اور عطا خراسانی رحمہم اللہ سے ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ خلق اللہ سے مراد اللہ عز وجل کا دین ہے[2] اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ﴾ [الروم: ٣٠] ''چنانچہ (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔'' کچھ نے کہا ہے کہ یہ حکم ہے، یعنی اللہ کی فطرت کو نہ بدلو۔ لوگوں کو ان کی فطرت پر چھوڑ دو۔

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اُس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔[3] صحیح مسلم میں عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ نے کہا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو حنیف پیدا کیا۔ پھر اُن کے پاس شیطان آئے، انھوں نے اُن کو اُن کے دین سے بھٹکا دیا اور ان پر اُس چیز کو حرام کر دیا، جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھی۔[4] شیطان کی دوستی میں کھلا خسارہ ہے، یعنی دنیا اور آخرت دونوں کا نقصان۔ یہ وہ خسارہ ہے، جس کی تلافی نہیں، یہ وہ ضیاع ہے، جس کا تدارک نہیں۔

پھر یہ کہا کہ شیطان کے سارے وعدے دھوکا ہیں۔ وہ بڑا جھوٹا اور مفتری ہے، جس طرح اللہ نے ابلیس کی زبان سے جزا کے دن نقل کیا ہے: ﴿ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [إبراهيم: ٢٢] ''اور جب (جنت یا جہنم کے) معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی میں نے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا، مگر یہ کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، چناں چہ تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا فریاد رس نہیں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ بلاشبہ میں تو اس کا انکار کرتا ہوں جو تم اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' پھر فرمایا کہ ان کا انجام جہنم ہے، اُن کو اُس سے گریز اور خلاصی کی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٦٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٨) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥)

نیک مومنوں کی جزا:

پھر نیک بختوں اور متقیوں کا ذکر اور اُن کی عزت و تکریم کا ذکر کیا کہ جن لوگوں کے دلوں نے تصدیق کی اور اُن کے جسم کے اعضا نے عمل کیا، خیرات بجا لائے اور منکرات سے بچے، ہم ان کو جنت میں داخل کریں گے، وہ اس میں بلا زوال و انتقال ہمیشہ کے لیے رہیں گے، یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اُس کا وعدہ ضروری واقع ہونا ہے، کیوں کہ اللہ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہے۔ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وَلَا رَبَّ سِوَاهُ. نبی اکرم ﷺ خطبے میں فرمایا کرتے تھے: «إِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ» حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا کلام ختم ہوا۔[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ آیت: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ اس بات پر نصِ صریح ہے کہ شرک بخشا نہیں جائے گا، جب کہ صاحبِ شرک اسی پر فوت ہوا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴾ [آل عمران: ١٢] ''کافروں سے کہہ دیجیے کہ تم عن قریب مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف جمع کیے جاؤ گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔'' جو گناہ شرک سے کم ہو، وہ اہلِ توحید میں سے جس کو اللہ چاہے بخش دے۔ یہ مشیت اُس کے حق میں ہے، جس نے توبہ نہیں کی ہے، لیکن جس نے شرک کیا ہے، وہ سب خیر سے محروم ہوا، کیوں کہ شرک گمراہی کی تمام قسموں سے بڑی ہے اور سیدھے راستے سے بہت ہی دور ہے، بلکہ افترا اور بہت بڑا گناہ ہے۔ اگلی آیت میں ﴿ فَقَدِ افْتَرٰٓى ﴾ فرمایا تھا۔ کیوں کہ وہ اہلِ کتاب کے حق میں تھی۔

یہ آیت ﴿ فَقَدْ ضَلَّ ﴾ قوم مشرکین کے حق میں ہے، جن کے پاس نہ کوئی کتاب ہے نہ علم، اس لیے ان کے حال کے مناسب یہی لفظ ضلال ہے۔ اس سورت میں اس آیت کا دوبارہ آنا تاکید کے لیے ہے یا بنی ابیرق کے قصے کی وجہ سے دوبارہ آئی ہے یا دوسرے قصے میں اُتری ہے، جس طرح ثعلبی اور قرطبی رحمہما اللہ نے لکھا ہے کہ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اعراب میں سے ایک بوڑھا آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں بوڑھا آدمی ہوں، گناہوں اور خطاؤں میں منہمک رہا، مگر میں نے اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کیا، جب سے اللہ کو پہچانا اور ایمان لایا، نہ اللہ کے سوا کسی کو ولی پکڑا اور نہ میں نے اللہ کی نافرمانیاں بطورِ جرأت کیں، نہ اللہ سے مکابرہ (بحث) کیا۔ میں نادم ہوتا ہوں اور توبہ استغفار کرتا ہوں، اللہ کے نزدیک میرا حال کیا ہوگا؟ اُس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔[2]

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٧٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٣٥٣) تفسير ابن كثير (١/ ٧٢٧_ ٧٢٩)

[2] تفسير القرطبي (٥/ ٣٨٦)

اِناث سے مراد بت ہیں، جن کے نام مؤنث رکھتے تھے، جیسے: لات، عزیٰ، منات۔ شیطان نے کہا: میں تیرے بندوں سے ایک حصہ لوں گا، یعنی ہزار میں سے ایک نجات پانے والا باقی سب ناری۔ حدیث میں مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ آدم علیہ السلام سے کہے گا: اپنی اولاد میں سے آگ کے لشکر کو نکال، وہ کہیں گے: اے رب لشکرِ نار کیا ہے؟ فرمائے گا: ہر ہزار سے نو سو ننانوے نکال، اُس وقت شدتِ خوف سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔[1] (أخرجه مسلم)

شیطان کا حصہ وہی ہیں، جو آگ میں جائیں گے، جس کام میں شیطان کی اطاعت کی گئی ہے، وہی اس کا حصہ ہے۔ ﴿ اَمَانِیَّ ﴾ سے مراد وسوسۂ شیطانی ہے، یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ نہ جنت ہے نہ نار، نہ دوبارہ اُٹھنا۔ یا یہ کہتا ہے کہ جنت گناہوں کے باوجود بھی مل سکتی ہے یا بقائے دنیا کا طول مراد ہے۔ مگر سب معانی سے انکار کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ تغیرِ خلق سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاند سورج پتھر آگ پانی وغیرہ مخلوقات بنائی۔ کفار نے ان کو معبود ٹھہرایا یا بڑھاپے کو سیاہ رنگ کر کے بدلا یا حرام کو حلال کر لیا یا مخنث بن گئے، یا آدمیوں کو خصی کیا۔ اس آیت کو ان سب معنوں پر یا ان کے علاوہ ان جیسے دوسرے معنوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں چوپائیوں اور گھوڑوں کو خصی کرنے کی ممانعت آئی ہے۔[2]

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا
يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٢٣﴾
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿١٢٤﴾
وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾
وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿١٢٦﴾

(انجام کا دارومدار) نہ تمھاری خواہشات پر ہے نہ اہلِ کتاب کی خواہشات پر، بلکہ جو کوئی برا عمل کرے گا، اس کا اسے بدلہ دیا جائے گا، اور وہ اللہ کے سوا کوئی دوست اور مددگار نہ پائے گا (123) اور جو کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا (124) اور دین میں اس شخص سے زیادہ اچھا کون ہے جس نے اپنا چہرہ اللہ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٢)

[2] سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ٢٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٩٦٠) فتح البيان (٣/ ٢٤١_ ٢٤٦)

کے سامنے جھکا دیا؟ اور وہ نیکی کرنے والا بھی ہو، اور ملتِ ابراہیم کی پیروی کرے، جو صرف حق پرست تھا۔ اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خاص دوست بنایا تھا(125) اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے(126)

نجات خواہشات پر نہیں عملِ صالح پر مبنی ہے:

کتاب والوں کو خیال تھا کہ ہم خالص بندے ہیں، جن گناہوں پر خلق پکڑی جائے گی، ہم نہیں پکڑے جائیں گے۔ پیغمبر ہماری حمایت کریں گے۔ نادان مسلمان اپنے بارے میں یہی خیال رکھتے ہیں۔ اسی لیے فرما دیا کہ جو بُرا کرے گا، وہ سزا پائے گا خواہ کوئی بھی ہو۔ کسی کی حمایت فائدہ نہیں دے گی۔ اللہ کا پکڑا ہوا وہی چھوڑے تو چھوٹے گا۔ دنیا کی مصیبت میں آدمی قیاس کر لے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم سے ذکر ہوا کہ مسلمان اور اہلِ کتاب نے باہم فخر کیا۔

اہلِ کتاب نے کہا کہ ہمارے نبی تمھارے نبی سے پہلے ہیں، ہماری کتاب تمھاری کتاب سے پہلے ہے۔ ہم تمھارے مقابلے میں اللہ کے زیادہ مقرب ہیں۔ مسلمانوں نے کہا ہم تم سے بھی زیادہ مقرب الی اللہ ہیں۔ ہمارے نبی خاتم النبیین ہیں، ہماری کتاب ساری پہلی کتابوں پر قاضی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری: ﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ... الخ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں ہی کی حجت کو دوسرے دین والوں پر روشن رکھا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت میں مختلف دین والوں کا آپس میں جھگڑا بیان کیا گیا ہے۔ اہلِ تورات نے کہا ہے کہ ہماری کتاب تمام کتابوں سے بہتر ہے اور ہمارے نبی تمام انبیا سے بہتر ہیں۔ اہلِ انجیل نے بھی اسی طرح کہا۔ اہلِ اسلام نے کہا کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہیں، ہماری کتاب ہر کتاب کی ناسخ ہے۔ ہمارے نبی خاتم النبیین ہیں، تم کو اور ہم سب کو یہ حکم ہے کہ تمھاری کتاب پر ایمان لائیں، اور اپنی کتاب پر عمل کریں۔ اللہ نے ان کے درمیان فیصلہ کیا، یہ آیت اُتاری، پھر دینِ اسلام کو سب سے بہتر بتایا۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب نے کہا کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے اور ہم کو عذاب بھی نہیں ہوگا۔ یہود و نصاریٰ نے کہا کہ جنت میں کوئی نہیں جائے گا، سوائے اُس شخص کے جو یہودی یا نصرانی ہو۔ ہم کو آگ نہ چھوئے گی، مگر گنتی کے دن۔[3]

آیت کے معنی یہ ہیں کہ دین کچھ آراستہ ہونے اور تمناؤں پر نہیں ہے، مگر وہ جو دل میں جاگزیں ہو اور اعمال اس کی تصدیق کریں، یہ بات نہیں ہے کہ جو کوئی کسی شے کا دعویٰ کرے، وہ صرف دعویٰ سے حاصل ہو جائے اور نہ یہ کہ جو کوئی یہ کہے کہ میں حق پر ہوں، اُس کی بات بھی صرف اُس کے کہنے سے مان لی جائے۔ جب تک کہ اللہ کی

---

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۲۲۹) [2] تفسیر الطبري (۹/ ۲۳۰) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [3] تفسیر الطبري (۹/ ۲۳۲)

طرف سے برہان نہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھاری اور اُن کی نجات محض تمنا پر نہیں ہوگی۔ اعتبار اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور انبیائے کرام کی شریعتوں کا اتباع کرنے کا ہے، اسی لیے یہ فرمایا: ہر برائی کی سزا ملے گی: ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ (آیتِ باب) جیسے اُس کا فرمان ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال: ۷۔ ۸] ”لہٰذا جس نے ذرہ بھر بھلائی کی، وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔“

دنیاوی مصیبتیں؛ برائیوں کی سزا ہیں:

مروی ہے کہ جب یہ آیت اُتری، اکثر صحابہ پر شاق گزری۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! اب اس آیت کے بعد فلاح کی کیا صورت ہے، ہم سے جو بُرا کام ہوا ہے، ہم کو اس کی سزا ملے گی؟ فرمایا: اے ابوبکر! اللہ تجھ کو بخشے، کیا تو بیمار نہیں ہوتا ہے؟ کیا تجھ کو تکلیف نہیں پہنچتی؟ کیا تجھ کو غم نہیں لگتا؟ کیا تجھ کو آفت نہیں لگتی؟ کہا: ہاں، فرمایا: «هُوَ مِمَّا تُجْزَوْنَ بِهٖ» یعنی یہی جزا ہے اس کی۔[1] (رواہ أحمد و سعید بن منصور والحاکم)

دوسری مرفوع روایت یہ ہے: «مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا»[2] (رواہ أحمد) ”جو برائی کرے گا، اس کو دنیا ہی میں سزا دے دی جائے گی۔“ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو مصلوب دیکھ کر کہا: واللہ! میں تم کو صوّام (روزہ رکھنے والا) قوّام (راتوں کو قیام کرنے والا) وصّالِ رحم (صلہ رحمی کرنے والا) جانتا ہوں، مجھ کو اُمید ہے کہ اس مصیبت کے بعد، پھر اللہ تم کو عذاب نہ کرے گا۔ پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پہلے بیان کردہ حدیث روایت کی۔[3] (أخرجه ابن مردویه) ایک روایت میں «فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ» بھی آیا ہے۔[4]

دوسری روایت یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر یہ آیت پڑھی تو انھوں نے کہا: ہم میں وہ کون ہے، جس نے برا کام نہیں کیا؟ ہم برائی پر جزا دیے جائیں گے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! تو اور تیرے یار مومن اسی دنیا میں جزا پالیں گے، جب تم اللہ سے ملو گے، کوئی گناہ نہ ہوگا۔ دوسروں کے لیے یہاں اور

---

[1] مسند أحمد (۱/ ۱۱) سنن سعید بن منصور (٤/ ۱۳۸۷، ۱۳۹۲) مستدرك الحاکم (۳/ ۷۸) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابوبکر بن ابی زہیر کا سماع سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۲۹۲٤) البتہ اس موضوع کی روایت صحیح مسلم (رقم الحدیث: ۲۵۷٤) میں مروی ہے۔

[2] مسند أحمد (۱/ ٦)

[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۳۰) اس روایت اور گزشتہ روایت کی سند میں ”علی بن زید“ اور ”زیاد جصاص“ ضعیف راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۱٤۹٤)

[4] مسند البزار (۳/ ۱۷۷) اس کی سند میں ”عبدالرحمٰن بن سلیم بن حیان“ مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۱٤۹٤)

وہاں دونوں جگہ جزا ملے گی۔[1] (رواہ ابن مردویہ) عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا کہ جب یہ آیت اتری تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ آیت تو پشت شکن (کمر توڑ دینے والی) آئی ہے۔ فرمایا: «إِنَّمَا هُوَ الْمُصِيبَاتُ فِي الدُّنْيَا»[2] (رواہ ابن جریر) ''یہ دنیا میں پہنچنے والی تکلیفیں ہیں۔''

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ کی روایت یہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ آیت تو بہت سخت ہے۔ فرمایا: دنیا کی مصیبتیں، غم اور بیماریاں اس کی جزا ہیں۔[3] دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ! ''کُلُّ مَا نَعْمَلُ نُؤَاخَذُ بِهِ؟ فَقَالَ: «يَا أَبَا بَكْرٍ: أَلَيْسَ يُصِيبُكَ كَذَا وَكَذَا؟ فَهُوَ كَفَّارَةٌ»[4] ''ہم جو کرتے ہیں، کیا اس سب کا مواخذہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ابوبکر! تجھ کو فلاں فلاں تکلیف نہیں پہنچی؟ یہ کفارہ ہے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک آدمی نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ جب ہم کو ہر عمل پر سزا ملی تو ہم ہلاک ہوں گے۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ کو پہنچی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ يُجْزَىٰ بِهِ الْمُؤْمِنُ فِي الدُّنْيَا فِي نَفْسِهِ فِي جَسَدِهِ فِيمَا يُؤْذِيهِ»[5] (رواہ سعید بن منصور) ''ہاں مومن کو دنیا میں پہنچنے والی جسمانی تکلیفوں کے ذریعے ان برائیوں کا بدلہ دیا جاتا ہے۔'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں قرآن کی سخت تر آیت کو جانتی ہوں۔ فرمایا کیا ہے؟ کہا: ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ فرمایا: «هُوَ مَا يُصِيبُ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ حَتَّىٰ النَّكْبَةِ يُنْكَبُهَا»[6] (رواه ابن أبي حاتم)

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: «إِنَّ الْمُؤْمِنَ يُؤْجَرُ فِي كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ فِي الْقَبْضِ عِنْدَ الْمَوْتِ»[7] امام مجاہد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جب بندے کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اور کوئی چیز اُن کو دور کرنے والی نہیں ہوتی تو اللہ اُس کو غم میں مبتلا کرتا ہے، تاکہ ان گناہوں کا کفارہ ہوجائے۔[8] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اُتری تو

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٣٩) تفسير ابن كثير (١/ ٧٣٠) اس کی سند میں ''مولیٰ ابن سباع'' مجہول اور ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (٩/ ٢٤٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[3] حلية الأولياء (٨/ ١١٩) اس کی سند میں ''محمد بن عامر'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير الطبري (٩/ ٢٤٠۔ ٢٤١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن زید رحمہ اللہ کا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[5] مسند أحمد (٦/ ٦٥) امام البانی رحمہ اللہ نے ''السلسلة الصحيحة'' (رقم الحديث: ٢٢٧٤) پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٧٢) اس کی سند میں ''ابو عامر خزاز'' متکلم فیہ راوی ہے۔

[7] تفسير ابن كثير (١/ ٧٣١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن زید رحمہ اللہ کا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[8] مسند أحمد (٦/ ١٥٧) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٦٩٥)

مسلمانوں پر شاق گزری، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «سَدِّدُوْ وَقَارِبُوْا فَإِنَّ فِيْ كُلِّ مَا يُصَابُ بِهِ الْمُسْلِمُ كَفَّارَةً حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا وَالنَّكْبَةِ يُنْكَبُهَا» (رواه سعيد بن منصور وأحمد و مسلم والترمذي والنسائي)[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب یہ آیت اتری، ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس آیت نے تو کچھ بھی باقی نہ چھوڑا، فرمایا: قسم ہے اللہ کی! آیت اسی طرح ہے، جیسے اتری، لیکن تم خوش رہو۔ ایک دوسرے کا قرب رکھو اور بات صحیح اور پکی کیا کرو، تم میں سے کسی ایک کو دنیا میں کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، مگر اُس کو اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں کا کفارہ کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کانٹا بھی کسی کے پاؤں میں چبھتا ہے، وہ بھی کفارہ ہو جاتا ہے۔[2] (رواه ابن جرير)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں ہے کہ مسلمان کو نہیں پہنچتی کوئی تکلیف مسلسل یا تھکاوٹ، بیماری یا غم، یہاں تک کہ پریشانی جو اس کو فکر مند کرتی ہے، لیکن اللہ اُس کو اس کی برائیوں کا کفارہ کر دیتا ہے۔[3] (اخرجاه) سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ آپ بتائیں یہ بیماریاں جو ہم کو ہوتی ہیں، ان میں ہمارا کیا فائدہ ہے؟ فرمایا: وہ کفارات ہیں۔[4] (رواه أحمد) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا: ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: ہاں جو کوئی ایک نیکی کرتا ہے، اس کی جزا دس گنا ہوتی ہے۔ ہلاک وہ ہوتا ہے، جس کی ایک نیکی دس پر غالب ہو جائے۔[5] (رواه ابن مردويه)

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿يُجْزَ بِهٖ﴾ سے مراد کافر ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ﴾ [سبا: ۱۷] ''اور ہم ناشکروں ہی کو سزا دیتے ہیں۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی اس جگہ ﴿سُوْٓءًا﴾ کی تفسیر شرک کی ہے۔ یہ جو فرمایا کہ وہ سوائے اللہ کے کوئی ولی اور نصیر نہ پائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اگر توبہ کر لے تو اللہ قبول کرے گا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ سب اعمال کے لیے ہے، اس کی دلیل وہ احادیث ہیں، جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[6]

نیکیوں کا صلہ:

پھر جب اللہ تعالیٰ نے برائیوں کی جزا کا ذکر کیا کہ مستحقِ سوء سے دنیا میں ضرور مواخذہ ہوگا اور یہی عمدہ بھی

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٤) مسند أحمد (٢/ ٢٤٨) سنن الترمذي (٣٠٣٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٢٨)

② تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٣٢) اس کی سند میں ''ابراہیم بن یزید خوزی'' ضعیف راوی ہے۔

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٣)

④ مسند أحمد (٣/ ٢٣) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ١٨٧)

⑤ تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٣٢) اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' ضعیف راوی ہے۔

⑥ تفسير الطبري (٩/ ٢٣٧۔ ٢٣٩)

ہے، یا آخرت میں، تو پھر اعمالِ صالحہ کی قبولیت کا ذکر فرمایا کہ بشرطِ ایمان اُن کو اجر ملے گا، وہ مرد ہو یا عورت۔ سو یہ اللہ کا احسان، کرم اور رحمت ہے۔ اپنا چہرہ اللہ کے سپرد کرنے سے اس جگہ اخلاص مراد ہے، یعنی ایمان و احتساب کے طور پر عمل کیا اور اُس عمل میں محسن تھا، یعنی متبع ہدیٰ و دینِ حق تھا، کیوں کہ ان دو شرطوں کے بغیر کسی عامل کا عمل صحیح نہیں ہوتا۔ عمل کا خالص اور صحیح ہونا ضروری ہے۔

خالص یہ کہ خالص اللہ کے لیے ہو، صحیح یہ کہ سنتِ مطہرہ کے مطابق ہو۔ تو ظاہر تو ایسے درست ہوا کہ اتباعِ شریعت کیا، باطن یوں درست ہوا کہ اخلاص سے عمل کیا، جس عمل میں ان میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگی، وہ فاسد ہو جائے گا۔ اخلاص کے نہ ہونے سے منافق ٹھہرے گا، کیوں کہ وہ لوگوں کو دکھانے اور سنانے کو عمل کرتا ہے۔ اتباعِ سنت کے نہ ہونے سے گمراہ، جاہل اور مبتدع ہوگا اور اگر دونوں شرطیں جمع ہوں تو وہ عمل پھر ان لوگوں کا سا ہوگا، جن کے اعمالِ حسنہ کو اللہ قبول کرتا ہے، ان کی سیئات سے درگزر فرماتا ہے۔

ابراہیم خلیل اللہ کی پیروی:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ملتِ ابراہیم حنیف کی پیروی کر۔ اُس ملت والے اب یہی محمد ﷺ اور قیامت تک ان کے متبعین ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٦٨] ''بے شک ابراہیم سے قریب تر وہی لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی، اور یہ نبی اور مومن لوگ۔ اور اللہ مومنوں کا دوست ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٣] ''(اے نبی!) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی اتباع کریں جو (اللہ کی طرف) یکسو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

حنیف وہ ہے جو شرک سے بے رغبت، یعنی اُس کا قصداً تارک ہو، حق پر بصیرت کے ساتھ متوجہ ہو۔ کوئی روکنے والا اُس کو حق سے نہ روک سکے، نہ کوئی پھیرنے والا اسے توحیدِ خالص سے پھیر سکے۔ یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دوست بنایا، اس میں اتباعِ ابراہیم کی ترغیب دی ہے۔ اس لیے کہ وہ امام و مقتدیٰ تھے۔ انتہا درجہ کی تقربِ عبادت کو پہنچ کر دوستی کے انتہائی درجۂ خِلّت کے حامل ہوگئے، جو محبت کا سب سے بلند مقام ہے۔

یہ رتبہ ان کو اس لیے ملا کہ انھوں نے اپنے رب کی کثرت سے اطاعت کی، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف فرمایا: ﴿ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴾ [النجم: ٣٧] ''اور ابراہیم جس نے (صحیفوں میں جو باتیں تھیں، انھیں) ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا؟'' بہت سے علمائے سلف نے کہا ہے، یعنی وہ مقاماتِ عبادت کے ہر مقام سے تمام احکام کے ساتھ قائم ہوئے، ان کو کسی چھوٹے سے چھوٹے حکم کو بجا لانے کے لیے کوئی بڑے سے بڑی مجبوری آڑے نہ آتی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ﴾ [البقرة: ١٢٤] ''اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند کلمات کے ساتھ آزمایا تو اس نے انھیں پورا کر دیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٠۔ ١٢٢] ''بلاشبہ ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا، اس (اللہ) نے اسے چن لیا اور اس کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دی۔ اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔''

اس کے بعد معاذ رضی اللہ عنہ جب یمن کو گئے، صبح کی نماز میں انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ قوم میں سے ایک آدمی نے کہا: ''لَقَدْ قَرَّتْ عَيْنُ أُمِّ إِبْرَاهِيمَ''۔[1] خلیل اس لیے لقب ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے نہایت درجہ محبت رکھتے تھے۔ اللہ کی دوستی ان کے رگ و پے میں گھس گئی تھی۔ اپنے رب کی ایسی اطاعت کی، جو اُس کو پسند آئی۔ صحیحین میں ہے کہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں فرمایا: اما بعد اے لوگو! اگر میں اہلِ زمین میں سے کسی کو اپنا خلیل ٹھہراتا تو ابوبکر بن ابی قحافہ کو خلیل پکڑتا، لیکن تمھارا صاحب خلیل اللہ ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا خلیل بنایا ہے، جس طرح ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تھا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کیا تم کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ خلیلی ابراہیم کے لیے، کلام موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہو اور رؤیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو۔[4] (رواه الحاكم) اسی طرح سے بہت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمۂ سلف رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔

عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام لوگوں کی مہمانی کرتے تھے، ایک دن باہر نکلے، تاکہ مہمان تلاش کریں، کسی کو نہ پایا، جس کو مہمان بناتے اور گھر میں لاتے۔ ایک آدمی کو کھڑا دیکھا، کہا: اے اللہ کے بندے! تم میرے گھر میں میری اجازت کے بغیر کس طرح آ گئے؟ کہا کہ گھر کے مالک کے اذن سے آیا ہوں، پوچھا: تم کون ہو؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٩١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢، ٢٣٨٣) حدیث کے آخری الفاظ صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢، ٢٣٨٣) صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ہم معنی روایت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ ان الفاظ کے ساتھ روایت صحیح مسلم میں سیدنا جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

[4] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٧٢) مستدرك الحاكم (١/ ١٣٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

کہا: میں ملک الموت ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنے ایک بندے کے پاس بھیجا ہے کہ میں اُس کو بشارت دوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنا خلیل بنایا ہے، کہا: وہ کون شخص ہے؟ اللہ کی قسم! اگر تم مجھے بتا دو اور وہ شخص بہت دور کسی شہر میں ہو تو میں اُس کے پاس جاؤں اور اس کا ہمسایہ بنوں، جب تک کہ موت ہمارے درمیان جدائی ڈالے۔ کہا وہ بندہ تو ہے۔ کہا: میں کہاں؟ کہا: ہاں۔ کہا: مجھ کو کس سبب سے خلیل بنایا ہے؟ کہا: اس لیے کہ تم لوگوں کو دیتے ہو، ان سے سوال نہیں کرتے۔ (رواه ابن أبي حاتم)

امام اسحاق بن یسار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تو ان کے دل میں ڈر بیٹھ گیا، یہاں تک کہ ان کے دل کا خفقان (دھڑکنا) دور سے سنائی دیتا تھا، جس طرح پرندوں کے اُڑنے کی آواز ہوا میں سنائی دیتی ہے۔[1] اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں آیا کہ سینۂ مبارک سے دیگ کے جوش مارنے کی طرح کی آواز سنائی دیتی تھی، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رونے کا غلبہ ہوتا تھا۔[2]

اللہ کی ملکیت کا معاملہ:

یہ ارشاد کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے، اللہ کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب چیز اُس کی ملکیت، غلام اور مخلوق ہے۔ سب پر اس کا تصرف (غلبہ) ہے۔ کوئی اس کے حکم کو پھیر نہیں سکتا نہ اس میں دیر لگا سکتا ہے۔ اُس کی وہ عظمت و قدرت وعدل وحکمت ولطف ورحمت ہے کہ اُس کے فعل کے بارے میں کوئی سوال نہیں کر سکتا۔ اُس کا علم ساری کائنات کو گھیرے ہوئے ہے۔ کوئی ذرہ یا اس سے بھی کم پوشیدہ چیز اس سے مخفی نہیں۔ آسمانوں اور زمین کا کوئی معاملہ اس کے علم سے غائب نہیں۔ اس کے ایک ایک پوشیدہ حصے کی اُس کو خبر ہے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں اس آیتِ باب کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ دخولِ جنت یا فضل وقربِ الٰہی یا کوئی سا بھی امر تمھاری تمنا سے ہوتا ہے نہ اہلِ کتاب کی تمنا سے، بلکہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ عملِ صالح سے ہوتا ہے، سو وہ بھی اللہ کے فضل وکرم سے نہ کہ عامل کے عمل سے۔ پھر عملِ صالح میں ایمان کی قید لگائی ہے کہ اگر وہ مومن ہے تو جنت ملے گی اور اگر نہیں ہے تو نہیں ملے گی۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ملتِ ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کرو۔ ابراہیم علیہ السلام کی خصوصیت اس لیے فرمائی کہ سارے یہود ونصاریٰ وغیرہما کا ان کی تعظیم پر اتفاق ہے۔ اللہ نے اُن کو اپنا خاص الخاص بندہ اور جانی دوست بنایا تھا تو ان کی راہ سب راہوں سے زیادہ بہتر ہے۔[3]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٧٥) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٠٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢١٤) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٣٠)

[3] فتح البيان (٣/ ٢٤٨۔ ٢٥١)

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝١٢٧

اور (اے نبی!) لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجیے: اللہ خود ان کے بارے میں حکم دے رہا ہے اور کتاب کی وہ آیتیں بھی، جو یتیم لڑکیوں کے بارے میں تمھیں (پڑھ کر) سنائی جاتی ہیں جنھیں ان کا مقرر حق تم نہیں دیتے اور تم چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو، اور (وہ) کمزور بچوں کے بارے میں (تمھیں حکم دے رہا ہے) اور یہ کہ تم یتیموں سے انصاف کرو اور تم جو بھی نیکی کرو، تو بے شک اللہ اس کا خوب علم رکھتا ہے ﴿127﴾

یتیم لڑکیوں کا حکم:

اس سورت کے شروع میں یتیم کے حق کا تقید تھا اور فرمایا تھا کہ یتیم لڑکی جس کا والی چچا کا بیٹا ہو اور وہ اگر جانے کہ میں اُس کا حق ادا نہ کروں گا تو اُس کو اپنے نکاح میں نہ لائے، بلکہ کسی اور کو دے کہ آپ اُس کا حمایتی رہے۔ تو مسلمانوں نے ایسی عورتوں کو نکاح میں لانا چھوڑ دیا، پھر دیکھا کہ بعض جگہ لڑکی کے حق میں بہتر ہے کہ اپنا والی ہی نکاح میں لائے، جو وہ اُس کی خاطر کرے گا، غیر نہیں کرے گا، نبی اکرم ﷺ سے رخصت مانگی، اُس پر یہ آیت اُتری، رخصت ملی اور فرمایا کہ وہ جو کتاب میں ممانعت دی گئی تھی، وہ اس صورت میں ہے کہ ان کا حق پورا نہ دو اور یتیم کے حق کی تاکید کی تھی اور اگر بھلائی کرنا چاہو تو رخصت ہے۔

بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ کسی شخص کے پاس یتیم لڑکی ہوتی، یہ اُس کا والی وارث ہوتا، وہ اس کو اپنے مال میں شریک کر لیتی، یہ اُس سے نکاح کرنا چاہتا، دوسرے سے نہ بیاہتا کہ وہ اُس کے مال میں شریک ہو جائے گا تو اس کو روکے رکھتا۔ ایسا ہی صحیح مسلم میں آیا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص کے پاس کوئی یتیم لڑکی ہو، اس کی طرف راغب بھی ہو تو اُس کو اس سے بیاہ کرنا درست ہے۔ اس صورت میں مہرِ مثل دے۔ اگر خود اُس سے بیاہ نہ کرے تو پھر کسی دوسری عورت سے اپنا بیاہ کر

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٢٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٠١٨)

لے۔ اللہ تعالیٰ نے وسعت دے رکھی ہے۔ یہ پہلی آیت کے معنی ہیں، جو سورت کے شروع میں گزر چکی ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُس کو اُس یتیم لڑکی میں رغبت نہیں ہوتی، اس لیے کہ خود اُس کو بُری لگتی ہے یا حقیقت میں بُری ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ممانعت فرمائی کہ ان کو اس خوف سے نکاح سے روکا جائے کہ اُس کا شوہر اُس مال میں، جو اُس کے اور اُس یتیم لڑکی کے درمیان ہے، شریک ہو جائے گا۔

جس طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ کسی مرد کے پاس یتیم لڑکی ہوتی، وہ اُس پر کپڑا ڈال دیتا، پھر کسی کا مقدور نہ ہوتا کہ اُس سے بیاہ کرے۔ اگر خوبصورت ہوتی اور اُس کو چاہتا تو آپ بیاہ کرتا، اُس کا مال کھاتا اور اگر بدصورت ہوتی تو ہمیشہ بے بیاہ رکھتا، یہاں تک کہ مرجائے۔ جب مرجاتی تو اُس کا وارث بنتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو حرام کیا اور اس سے منع فرمایا۔[1]

ولدان سے مراد ہے کہ جاہلیت میں چھوٹے بچوں اور بیٹیوں کو وارث نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس سے منع فرمایا۔ ہر حق دار کا حق مقرر فرمایا، مرد کا دوگنا حصہ ہے، بڑا ہو یا چھوٹا۔ قسط سے یہ مراد ہے کہ جس طرح خوبصورت مال دار سے تو نکاح کرتا ہے، اس طرح اگر خوبصورت اور مالدار نہ ہو، تب بھی اُس سے نکاح کر کہ یتیموں کے حق میں انصاف یہی ہے۔ اس کہنے میں کہ ''اللہ تعالیٰ جانتا ہے بھلائی کے کام کرنے اور حکم ماننے کے لیے'' برانگیختہ کرنا ہے، کیوں کہ جس کو علم ہو وہ ہر فعل کا بدلہ بھی پورا پورا دے گا۔ فتح البیان میں یہ ہے کہ استفتا بہ معنی فتویٰ طلب کرنے کے ہے، یعنی عالم سے کسی بات کا سوال کرنا۔ کتاب سے مراد قرآن یا لوحِ محفوظ ہے، غرض یہ کہ یتیموں کے حقوق میں انصاف کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے امور میں سے ہے۔ اس کا لحاظ کرنا واجب ہے۔ جو کوئی اس میں خلل ڈالتا ہے، وہ ظلم کرتا ہے۔ ﴿مَا كُتِبَ لَهُنَّ﴾ سے مراد وراثت ہے یا حق مہر۔[2]

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ
وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝١٢٨ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ
تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

[1] تفسیر الطبري (٩/ ٢٦٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٧٧) اس کی سند حسن ہے۔
[2] فتح البیان (٣/ ٢٥٢۔ ٢٥٣)

كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے ظلم و زیادتی یا نظر انداز کیے جانے کا اندیشہ ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں کسی طرح صلح کر لیں اور صلح ہی اچھی ہے، اور انسانی نفس میں بخیلی رکھی گئی ہے، اور اگر تم احسان کرو اور پرہیز گار بنو تو بے شک تم جو بھی عمل کرتے ہو، اللہ اس کی خوب خبر رکھتا ہے (128) اور تم سے یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تم اپنی بیویوں میں ہر طرح سے عدل کرو، خواہ تم اس کی کتنی خواہش رکھو، پھر تم کسی ایک کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو بیچ میں لٹکتی چھوڑ دو، اور اگر تم اصلاح کا رویہ اختیار کرو اور پرہیز گار بنو تو اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (129) اور اگر وہ دونوں (میاں بیوی) ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ اپنے فضل سے ہر ایک کو (دوسرے سے) بے نیاز کر دے گا۔ اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب حکمت والا ہے (130)

خاوند کی بے رغبتی کے احکام:

یعنی مرد کا دل پھرا دیکھے اور عورت اسے خوش کرنے کے لیے اپنا کچھ حق چھوڑ دے تو جائز ہے، کیوں کہ مال کی بچت ہر ایک کو اچھی لگتی ہے، البتہ اس میں مرد راضی ہو جائے گا۔ انسان کی طبیعت میں مال کی حرص ہے اور عورت پر زیادہ راغب ہونا، اس لیے چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے آپ کو بچاتا رہے۔ اس کے بعد اللہ بخشنے والا ہے۔ درمیان میں لٹکتی کا مطلب یہ ہے کہ نہ اُس کو آپ آرام سے رکھو نہ چھوڑو کہ کسی اور سے نکاح کر لے۔ اللہ پاک نے اس آیت میں میاں بیوی کے حال کی خبر دی ہے۔ کبھی مرد عورت سے نفرت کرتا ہے، کبھی اس سے متفق ہوتا ہے، کبھی عورت سے جدائی چاہتا ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ عورت شوہر کی نفرت اور بے رغبتی سے ڈرے، اس حالت میں وہ اپنا سارا یا بعض حق نان ونفقہ یا پہناوا اور شب باشی وغیرہ کا چھوڑ سکتی ہے۔ شوہر اس بات کو مان لے اس پر نہ عورت پر کچھ حرج ہے کہ اُس نے اپنا حق دے دیا اور نہ مرد پر کہ اُس نے اس بات کو قبول کر لیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان دونوں پر اس صلح میں کچھ گناہ نہیں۔ پھر صلح کو جدائی سے بہتر بتایا کہ صلح کرنا لالچ کی وجہ سے جدائی کرنے سے بہتر ہے۔ اس لیے جب سودہ رضی اللہ عنہا کی عمر زیادہ ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے ان کو جدا کرنا چاہا تو انھوں نے اس بات پر صلح کر لی کہ ان کو رہنے دیں، اپنا دن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔ نبی کریم ﷺ نے قبول کر کے ان کو رہنے دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ”خَشِيَتْ سَوْدَةُ رضی اللہ عنہا أَنْ يُّطَلِّقَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا

رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا تُطَلِّقْنِيْ وَاجْعَلْ يَوْمِيْ لِعَائِشَةَ رضی اللہ عنہا فَفَعَلَ وَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ: ﴿ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ... الخ﴾

(رواه أبو داود الطيالسي) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جس پر دونوں صلح کر لیں جائز ہے۔[1] (ورواه الترمذي وقال حسن غريب) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ وفات پائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نو بیویاں چھوڑ کر، آٹھ میں باریاں تقسیم کرتے تھے۔[2] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ «لَمَّا كَبُرَتْ سَوْدَةُ بِنْتُ زَمْعَةَ رضی اللہ عنہا وَهَبَتْ يَوْمَهَا لِعَائِشَةَ فَكَانَ النَّبِيُّ يَقْسِمُ لَهَا بِيَوْمِ سَوْدَةَ»[3] (رواه الشيخان)

امام عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت سودہ رضی اللہ عنہا اور اشباہِ سودہ (سودہ جیسے نظائر) کے حق میں اُتری۔ سودہ رضی اللہ عنہا جب عمر رسیدہ ہوگئیں، ڈریں کہ کہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو چھوڑ نہ دیں اور اپنے رُتبے پر بُخل کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے محبت اور ان کا مرتبہ معلوم تھا، اپنا دن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا۔ (رواه سعيد بن منصور) اس قصے کو بیہقی اور حاکم رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔ کہا کہ صحیح الاسناد ہے۔[4]

قاسم بن ابی بزہ رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق کہلوا بھیجی، وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی راہ میں بیٹھیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا کہ آپ کو قسم ہے اس کی جس نے تم پر کتاب بھیجی اور اپنی خلق پر آپ کو چن لیا کہ آپ مجھ سے رجوع کر لیں، میں بوڑھی ہوگئی، مجھ کو مرد کی حاجت نہیں رہی، لیکن میں چاہتی ہوں کہ قیامت کو آپ کی بیویوں میں اُٹھوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجوع کر لیا، کہا: میں نے اپنا دن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیا۔[5] (رواه أبو العباس محمد بن عبد الرحمن الدعولي فِيْ أَوَّلِ معجمه بسنده وهٰذا مرسل غريب) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ مرد کے پاس کوئی عورت مسنہ (زیادہ عمر کی) ہوجاتی ہے، وہ کچھ اس سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا، پھر اس کو جدا کرنا چاہتا ہے، وہ عورت اُس سے کہتی ہے: ”أَجْعَلُكَ مِنْ شَانِيْ فِيْ حِلٍّ“ یہ آیت اس بارے میں آئی ہے۔[6] (رواه البخاري)

روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ آیت اس عورت کے حق میں آئی ہے، جو مرد کے پاس ہو، وہ اُس سے مستکثر نہ ہو، نہ اُس سے اولاد ہو، فقط ساتھ ہو، وہ کہے تو مجھے طلاق نہ دے، تجھ کو میرے بارے میں اختیار ہے۔ (رواه ابن جرير)

---

[1] مسند الطيالسي (١/ ٣٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٤٠) اس کی سند میں ”سماک عن عکرمہ“ مضطرب راوی ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیحین میں ہے، جیسا کہ زیرِ تفسیر آیت میں آگے آئے گا۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٦٥) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٢٩٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٦٣)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣٥) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٢٩٧) مستدرك الحاكم (٢/ ٢٠٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٧٩)

[5] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٨/ ٥٤) یہ روایت مرسل ہے۔

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٨)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اُس مرد کا حال ہے، جس کے پاس دو عورتیں ہوں، ایک بوڑھی، دوسری دمیمہ (بدصورت)، وہ اُس سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتا، وہ کہے: "لَا تُطَلِّقْنِيْ وَأَنْتَ فِيْ حِلٍّ مِّنْ شَأْنِيْ" "تو مجھے طلاق نہ دے، تو میری ذمے داری سے آزاد ہے" یہ حدیث صحیحین میں بھی کئی وجہ سے آئی ہے۔[1]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مرد کے پاس عمر رسیدہ عورت ہو اور وہ جوان عورت سے نکاح کرے کہ اولاد ہو، جس پر وہ دونوں صلح کر لیں تو جائز ہے۔[2] (رواہ ابن جریر بطولہ) اسی طرح سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب مرد کسی عورت سے آنکھ پھیر لے، اُس کی دمامت (بدصورتی) یا بڑی عمر کے باعث یا سوئے خلق یا تہمت کے باعث اور وہ مرد کی جدائی نہ چاہے تو اُس کو چھوڑ دینا بعض اپنے مہر کا حلال ہے یا اپنا دن بخش دے، تب بھی کچھ حرج نہیں ہے۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عبیدہ سلمانی، مجاہد، شعبی، سعید بن جبیر، عطا، عطیہ عوفی، مکحول، حسن، حکم بن عتبہ، قتادہ اور بہت سلف اور ائمہ رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔ اس میں کسی کی مخالفت معلوم نہیں۔ آیت سے مراد یہی ہے۔ واللہ أعلم.[3]

امام ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے پاس تھی۔ ان کو ان کی کوئی بات مکروہ معلوم ہوئی، کبر سنی یا اور کچھ۔ انھوں نے چاہا کہ طلاق دے دیں، اُس نے کہا: "لَا تُطَلِّقْنِيْ وَاقْسِمْ لِيْ مَا بَدَا لَكَ" اُس پر یہ آیت اُتری۔[4] (رواہ الشافعي والحاکم) امام بیہقی رحمہ اللہ نے ابن مسیب وسلیمان بن یسار رحمہما اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ دونوں آیتیں میاں بیوی کے درمیان صلح کے لیے آئی ہیں کہ بدخوئی اور بے رغبتی کی صورت میں باہم صلح کر لیں، وہ درست ہے۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ صلح بہتر ہے، یعنی شوہر کو نکاح قائم رکھنے اور علاحدگی کا اختیار ہے۔[6]
حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاہر آیت یہ ہے کہ میاں بیوی کی صلح، بیوی کے اپنے بعض حق کو چھوڑ دینے پر اور شوہر کا اُس کو قبول کرنا، اس سے بہتر ہے کہ کلی طور پر جدائی کی جائے۔ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے سودہ رضی اللہ عنہا کو جدا نہ کیا اور اپنی باری کو ہبہ کر دینے پر صلح کر لی۔ یہ اس لیے کہ امت اس معاملے میں ان کی پیروی کرے کہ یہ افضل ہے

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۲۷۰۔ ۲۷۱) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۳۱۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۰۲۱)
[2] تفسیر الطبري (۹/ ۲۶۹) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن سیرین رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں "اشعث بن سوار" ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۳۷)
[4] مسند الشافعي (۱/ ۲٦۰) مستدرك الحاکم (۲/ ۳۳۸) یہ روایت مرسل ہے۔
[5] سنن البیهقي الکبریٰ (۷/ ۲۹٦) یہ روایت مرسل ہے۔
[6] تفسیر الطبري (۹/ ۲۷۲) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۰۸۱) اس کی سند حسن ہے۔

اور جب کہ اکٹھا رہنا علاحدگی سے زیادہ بہتر ہے اللہ کے نزدیک۔ تو اللہ نے فرمایا: ﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾. بلکہ طلاق اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض ہے۔ اسی سبب سے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث میں مروی ہے:
«أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ»[1] (رواه أبو داود)

صبر اور عدل سے کام لینے کا حکم:

پھر فرمایا کہ اگر تم مشقتِ صبر پر تحمل کرو، ان کی ناپسندیدہ چیزوں پر تکلیف اُٹھاؤ اور دستور کے مطابق برتاؤ رکھو تو اللہ تم کو اس کی بہت زیادہ جزا دے گا۔ تم سے یہ نہیں ہو سکے گا کہ تم سب بیویوں میں برابری کر سکو گے، اگرچہ بظاہری تقسیم واقع ہو، کیوں کہ محبت اور شہوت اور جماع میں فرق ضرور پڑے گا۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عبیدہ سلیمانی، مجاہد، حسن بصری اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول ہے۔

امام ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اُتری ہے: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ ... الخ﴾[2] (آیت زیرِ تفسیر) اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اور بیویوں سے زیادہ چاہتے تھے، جس طرح حدیث میں مروی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے درمیان عدل سے تقسیم کرتے تھے۔ پھر فرماتے: «اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي فِيْمَآ أَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِي فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَآ أَمْلِكُ يَعْنِي الْقَلْبَ»
(رواه أحمد وهذا لفظ أبي داود و إسناده صحيح) لیکن ترمذی نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ روایت مرسل ہے۔[3]

پھر فرمایا کہ جب ایک طرف جھکو تو بالکل نہ جھکو کہ اُس دوسری کو لٹکا رکھو کہ نہ خاوند والیوں میں ہے اور نہ مطلقہ ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، حسن، ضحاک، ربیع بن انس، سدی اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ کا قول ہے۔[4] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی کی دو عورتیں ہیں، وہ ایک کی طرف ڈھلتا ہے، وہ قیامت کو آئے گا کہ آدھا دھڑ اُس کا ساقط ہوگا۔[5] (رواه أحمد وأهل السنن) اللهم غفراً.

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٧٨) تفسير ابن كثير (١/ ٧٣٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کے مرفوع یا مرسل ہونے پر مفصل بحث کرتے ہوئے مرسل کو راجح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ١٠٦)

[2] تفسير الطبري (٩/ ٢٨٥ـ ٢٨٧)

[3] مسند أحمد (٦/ ١٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٤٠) اس روایت کا مرسل ہونا صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ٨١) البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم میں عدل کرنا کئی ایک صحیح احادیث میں مروی ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٨٤)

[5] مسند أحمد (٢/ ٢٩٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٤١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٤٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٦٩) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٩٩)

پھر فرمایا کہ اگر تم اپنے کام سنوار لو اور عدل سے تقسیم کرو، جس کے تم مالک ہو اور اللہ سے تمام حالات میں ڈرو تو اللہ تمھارے بعض کی طرف جھکنے اور ڈھلنے کو اور بعض کی طرف نہ جھکنے کو بخش دے گا۔ اَللّٰھُمَّ غُفْراً. پھر دوسری صورت کا ذکر کیا کہ وہ حالتِ فراق ہے۔ فرمایا کہ اگر جدا ہو جائیں گے تو اللہ دونوں کو غنی کر دے گا۔ مرد کو اُس عورت سے بہتر اور عورت کو اُس مرد سے بہتر عوض دے گا۔ اللہ کا فضل بہت بڑا ہے۔

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ بعل بمعنی شوہر وسید ہے۔ نشوز (بے رخی) سے مراد نشوز کی ہمیشگی ہے، یعنی شوہر ہم بستری چھوڑ دے یا نان نفقے میں کمی کر دے یا کسی اور عورت کی طرف نگاہ ڈالے یا کسی طرح کا اعراض کرے تو پھر باہم کسی قرار داد پر صلح کر لینا گناہ نہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نشوز اور اعراض میں یہ فرق ہے کہ نشوز ایک دوسرے سے دور ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ اعراض یہ ہے کہ بات نہ کرے مانوس نہ ہو۔[1] ظاہر آیت یہ ہے کہ نشوز اور اعراض کے خوف سے مصالحت کر لینا جائز ہے۔ کوئی سا نشوز اور کسی طرح کا اعراض کیوں نہ ہو، کیوں کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ صلح بھی عام ہے، کسی طرح سے ہو، خواہ اپنی باری کو چھوڑ دینا یا بعض نفقہ یا بعض مہر کو چھوڑ دینا۔ بہر حال صلح اس سے بہتر ہے کہ بالکل جدائی اختیار کی جائے یا لڑائی کی جائے یا بے رغبتی کی جائے یا بے رخی برتی جائے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ عورتوں کے درمیان عدل کا مطلب ہے کہ جماع میں عدل کیا جائے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حُب ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ بات چیت کرنا، پاس بیٹھنا، متمتع ہونا ہے۔ یہ نہ کرے کہ معلق چھوڑ دے، گویا نہ آسمان پر ہے نہ زمین میں، بیچ میں لٹکتی ہے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے یوں پڑھا ہے: ”كَالْمَسْجُوْنَةِ“[4] (قیدی کی طرح) یعنی نہ رہا ہے کہ دوسرا خاوند کرے نہ شوہر والی ہے کہ وہ اس سے حسنِ سلوک کرے۔ پھر دونوں کو تسلی دی کہ اگر یہی بات ٹھہری کہ جدائی ہو، حالاں کہ صلح بہتر تھی، تو اللہ دونوں کو بے نیاز کر دے گا۔[5]

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ
وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿١٣١﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٣٢﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا
النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿١٣٣﴾

[1] تفسير القرطبي (٥/ ٤٠٣) [2] الدر المنثور (٢/ ٧١٣) [3] تفسير الطبري (٩/ ٢٨٥)
[4] تفسير القرطبي (٥/ ٤٠٨) [5] فتح البيان (٣/ ٢٥٤_ ٢٥٩)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے اور ہم نے تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی، ان کو اور تمھیں بھی یہی حکم دیا کہ اللہ سے ڈرتے رہو، پھر اگر تم کفر کرو گے تو بے شک آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، اور اللہ بہت بے پروا، قابلِ تعریف ہے (131) اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے اور اللہ بطور کارساز کافی ہے (132) اے لوگو! اگر اللہ چاہے تو تمھیں ہٹا کر تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے اور اللہ اس بات کی پوری قدرت رکھتا ہے (133) جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہو تو اللہ کے پاس تو دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے، اور اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے (134)

اللہ کی عظمت، قدرت، ملکیت کا ذکر اور تقویٰ کی وصیتِ الٰہی:

تین بار بیان فرمایا کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ پہلی بار کشادگی کا بیان ہے۔ دوسری بار بے پروائی کا، اگر تم منکر ہو۔ تیسری بار کارسازی کا، اگر تم تقویٰ پکڑو۔ پھر سمجھایا کہ سب مل کر شریعت پر قائم رہو تو اللہ دنیا بھی دے گا اور آخرت بھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ہم آسمانوں اور زمین کے مالک ہیں، دونوں میں ہماری ہی حکومت ہے تم کو اور تم سے پہلے سب کو یہی وصیت کی گئی ہے کہ اللہ سے ڈرو، اسی ایک لا شریک لہ کو پوجو، اگر نہ مانو گے تو سمجھ لو کہ آسمان و زمین سب ہمارا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: ﴿ اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ [إبراھیم: ۸] ”اگر تم کفر کرو گے اور وہ سب لوگ بھی جو زمین میں ہیں تو بے شک اللہ بے پروا اور لائق تعریف ہے۔“[1]

یعنی وہ سب بندوں سے بے نیاز ہے، محمود ہے تمام مقدرات اور مشروعات میں۔ وکیل وہ ہے جو ہر نفس کے کے کام پر قائم ہو اور ہر شے کا نگہبان ہو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت بھی ہے کہ تم کو لے جائے اور تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد: ۳۸] ”اور اگر تم پھرو گے تو اللہ تمھارے سوا دوسرے لوگ بدل لائے گا، پھر وہ تم جیسے (نافرمان) نہ ہوں گے۔“ بعض سلف نے کہا ہے کہ بندے جب اللہ کا حکم ضائع کریں تو بہت ہی خوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴾ [الفاطر: ۱٦۔ ۱۷] ”اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے (فنا کر دے) اور (تمھاری جگہ) ایک نئی مخلوق لے آئے۔ اور اللہ کے لیے یہ (بات) کچھ مشکل نہیں۔“ یعنی بدل دینا کچھ مشکل نہیں ہے، اللہ پر بہت آسان اور سہل ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۳۹)

دنیا کے طلب گار کو دنیا اور آخرت کے طلب گار کو آخرت ملتی ہے:

جس کسی کو ہمت نہیں، مگر اسی دنیا کی تو اُس کو جان لینا چاہیے کہ اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب ہے، جب اللہ سے وہ مانگے گا تو وہ دونوں جگہ ثواب دے سکتا ہے۔ پھر صرف اس دنیا پر رہ جانا کس لیے ہے؟! جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۚ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [البقرة: ۲۰۰۔ ۲۰۲] ”چناں چہ کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں (سب کچھ) دے دے، ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ انھی لوگوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ﴾ [الشوریٰ: ۲۰] ”جس کا ارادہ آخرت کی کھیتی کا ہو، ہم اسے اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۸۔ ۲۱] ”جو کوئی جلدی والی (دنیا) چاہے تو ہم اسی (دنیا) میں جس کے لیے چاہیں جس قدر چاہیں جلد عطا کرتے ہیں، پھر اس کے لیے ہم جہنم ٹھہرا دیتے ہیں، وہ اس میں مذموم اور دھتکارا ہوا داخل ہوگا۔ اور جو آخرت چاہے اور اس کے لیے پوری پوری سعی کرے، جب کہ وہ مومن ہو، تو یہی لوگ ہیں جن کی سعی قابلِ قدر ہے۔ ہم ہر ایک کو آپ کے رب کی عطا سے نوازتے ہیں، اُن کو بھی اور اِن کو بھی، اور تیرے رب کی عطا (کسی سے) روکی ہوئی نہیں۔ دیکھیے! کس طرح ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی؟ اور یقیناً آخرت درجوں میں بڑھ کر ہے اور فضیلت دینے میں (بھی) بڑھ کر ہے۔“

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ منافقوں میں سے جو کوئی اظہارِ ایمان کرتا ہے، تاکہ دنیا ملے تو اللہ کے نزدیک دنیا کا ثواب موجود ہے، یعنی وہ غنیمت جو حاصل ہوتی ہے۔ رہی آخرت تو اُس کا ثواب اُن کے لیے وہ سزا ہے، جو جہنم کی آگ میں ذخیرہ کر رکھی ہے۔ گویا یہ آیت اس آیتِ شریفہ کے مثل ہے: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ

لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [هود: ١٥۔ ١٦] ''جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم انھیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ اسی (دنیا) میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں، اور برباد ہوگیا جو کچھ انھوں نے اس (دنیا) میں کیا تھا اور جو عمل وہ کرتے رہے، ضائع ہوگئے۔''[1]

اس میں شک نہیں کہ اس آیت کے معنی ظاہر ہیں۔ رہی پہلی آیت کی اس طرح پر تفسیر تو اس میں نظر ہے۔ اس لیے کہ لفظ ﴿ فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا ﴾. ظاہر ہے حصولِ خیر دنیا اور آخرت میں، یعنی اللہ کے ہاتھ یہ بھی ہے وہ بھی۔ اس لیے ارادے میں کوتاہی صرف دنیا کے اعمال میں ہی نہ کرے، بلکہ اس طرح چاہیے کہ ہمت اور کوشش دونوں جہانوں کے بلند مقاصد کے حصول کے لیے ہو، کیوں کہ ان سب کا مرجع اس کی طرف ہے، جس کے ہاتھ میں نفع اور ضرر ہے۔ وہ ذات اللہ پاک کی ہے، جس نے نیک بختی اور بدبختی کو لوگوں کے درمیان دنیا اور آخرت میں تقسیم کیا ہے، جس کو جس چیز کا مستحق سمجھا، وہ اُس کو دی، سب کے درمیان میں عدل و انصاف کیا۔ اسی لیے یہ کہا ہے کہ اللہ سمیع و بصیر ہے۔

فتح البیان میں ہے کہ پہلے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ اور پرانی کتابوں والے ہیں، اُن سب کو حکم تھا کہ تقویٰ اختیار کریں۔ گویا اللہ سے ڈرنا ایک پرانی شریعت ہے۔ تمام سابقہ اُمتوں کو ان کے رسولوں کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے یہی وصیت کی تھی دوسروں سے مراد یہ ہے کہ دوسرے لوگ تمھاری جگہ آئیں یا کوئی اور ہی مخلوق سوائے تمھارے یا بجائے تمھارے لائی جائے جو تم سے بہتر ہو، کیوں کہ اللہ کو تمام چیزوں پر قدرتِ کاملہ حاصل ہے، وہ ہمیشہ سے اس صفت کے ساتھ موصوف ہے۔ پھر جو کوئی اپنے عمل سے صرف دنیا کا طلب گار ہے، جیسے وہ مجاہد جو غنیمت حاصل کرنے کے لیے جہاد کرے نہ کہ اَجر کو طلب کرنے کے لیے تو وہ کم درجہ کے ثواب پر کیوں اکتفا کرتا ہے، کیوں اللہ سے دنیا اور آخرت دونوں کا اجر و ثواب نہیں مانگتا، جیسا کہ آیت کی عمومیت سے ظاہر ہے۔[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ
وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ
فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ
وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٣٥﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم انصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ وہ تمھارے اپنے خلاف یا تمھارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہو، معاملے کا فریق

---

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۳۰۰) [2] فتح البیان (۳/ ۲۵۹۔ ۲۶۱)

امیر ہو یا غریب، دونوں صورتوں میں تمھاری نسبت اللہ تم سے زیادہ ان کا حق دار ہے۔ پس تم نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو اور اگر تم نے توڑ مروڑ کر بات کی یا (گواہی دینے سے) منہ موڑا تو بے شک تم جو بھی عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے ﴿135﴾

انصاف پر قائم رہنے اور صرف اللہ کے لیے گواہی دینے کا حکم:

یعنی گواہی میں آسودہ حال کی خاطر نہ کرو، محتاج پر ترس نہ کھاؤ، قرابت نہ دیکھو، حق ہو، سو کہو، اگر سچ کہا، لیکن گول مول انداز میں کہ سننے والے کو شبہہ پڑا، یا سارا واقعہ نہ کہا، کچھ کام کی بات رکھ لی، یہ بھی گناہ میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا کہ انصاف اور عدل پر قائم رہیں۔ دائیں بائیں نہ جھکیں، اللہ کی راہ میں ملامت کا خوف نہ کریں، کوئی صارف ان کو نہ پھیرے، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے والے، معاون، ساتھی اور مددگار رہوں۔ گواہی سچی سچی اللہ کی رضا کے لیے دیں کہ ایسی شہادت صحیح اور حق پر مبنی اور تحریف، تبدیلی اور کتمان سے خالی ہوتی ہے۔ گو اُس کا نقصان اپنی ہی جان کو ہو، بات حق کہے، اگرچہ اس سے نقصان ہو، کیوں کہ جو کوئی اللہ کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اُس کے لیے کشادگی اور مخرج نکال دیتا ہے، تنگی کے حالات میں حق ہر کسی پر حاکم ہے۔ اگر سچی گواہی میں ماں باپ یا رشتہ دار کو ضرر پہنچتا ہے تو پہنچا کرے، شاہد کو حق بات ہی کہنی چاہیے۔ یہ نہ کرے کہ غنی کی رعایت کر جائے یا فقیر پر ترس کھا جائے، کیوں کہ اللہ ان دونوں کا والی ہے، وہی خوب جانتا ہے کہ ان کی اصلاح کس امر میں ہے۔ پھر فرمایا کہ کہیں خواہشِ نفس، عصبیت اور لوگوں کی دشمنی تم سے ایسا نکما کام نہ کرائے، بلکہ تم تو ہر حال میں عدل و انصاف ہی کو تھامے رہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ [المائدة: ٨] ”اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقوے کے زیادہ قریب ہے۔“

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر کے پاس بھیجا تھا، تاکہ ان کے پھل اور کھیتی کا اندازہ کریں، انھوں نے ان کو رشوت دینا چاہا، تاکہ نرمی کر جائیں۔ انھوں نے کہا: واللہ! میں تمھارے پاس ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں، جو مجھ کو ساری مخلوق سے زیادہ محبوب ہے اور تم مجھ کو بندر اور سؤر سے بھی زیادہ بُرے لگتے ہو، لہٰذا ان کی محبت اور تمھارا بغض دونوں مجھ کو اس بات پر اُکسا نہیں سکتے کہ میں تمھارے درمیان عدل نہ کروں، وہ کہنے لگے: ”بِهٰذَا قَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ“ یعنی سچ ہے کہ زمین و آسمان اسی عدل کی بدولت قائم ہیں۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ سلف نے کہا ہے کہ ”لَيّ“ کے معنی ہیں: تحریف اور جان بوجھ کر جھوٹ بولنا، یعنی زبان پھیر کر بات کو بگاڑ

[1] مسند أحمد (٣/ ٣٦٧) صحیح ابن حبان (١١/ ٦٠٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح“ (مجمع الزوائد: ٤/ ٢١٧)

دینا اور دوسری طرح کی گواہی ادا کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ ﴾ [آل عمران: ۷۸] ''اور بے شک ان میں سے ایک گروہ کتاب پڑھتے ہوئے زبان کو مروڑتا ہے۔''[1]

﴿ اِعْرَاضًا ﴾ سے مراد حق کو چھپانا اور شہادت کو ترک کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۳] ''اور جو شخص گواہی چھپائے گا تو بے شک اس کا دل گناہ گار ہے۔'' حدیث میں مروی ہے کہ بہترین گواہ وہ ہیں، جو سوال سے پہلے شہادت دیتے ہیں۔[2] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ وعید سنائی ہے کہ ہم کو تمھارے عمل کی خبر ہے، ہم تم کو سزا دیں گے۔

فتح البیان میں کہا ہے کہ قسط بہ معنی عدل ہے۔ عادل وہ ہے جو سب امور میں انصاف کرے۔ ایک دو بار عدل کرنے سے حقیقت میں قسط کو قائم کرنے والا نہیں ہوتا۔ ﴿ شُهَدَآءَ ﴾ ''شہید'' کی جمع ہے یا ''شاھد'' کی خلافِ قیاس۔ یہ آیت قاضی اور گواہ کو شامل ہے۔ گواہ کو شامل ہونا تو ظاہر ہے، قاضی کو اس طرح پر شامل ہے کہ وہ جھگڑنے والے ایک فریق سے لَیِّ لسان (زبان مروڑنا) یا اعراض (منہ موڑنا) کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ یہود کے ساتھ خاص ہے، مگر عمومیت زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا ہے کہ سچ بات بولیں، اگرچہ اس کا نقصان ان کے والدین یا قریبی رشتہ داروں کو ہو۔ کسی غنی کے غنا سے ڈر نہ کھائیں نہ کسی مسکین کی مسکینی پر رحم کریں۔[3]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ، اس کے رسول اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے پہلے نازل کی۔ اور جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کرے تو وہ یقیناً بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا (136)

ایمان کے بعد ایمان لانے کا حکم:

اُن کو ایمان والے فرمایا ہے جو ظاہر میں مسلمان ہیں، سو ان کو بندش ہے کہ جب تک دل سے ان سب

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۶۱) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۱۹)

[3] تفسیر الطبري (۹/ ۳۰۴) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۰۸٦۔ ۱۰۸۸) اس کی سند حسن ہے۔ فتح البیان (۳/ ۲٦۱۔ ۲٦۳)

چیزوں کا یقین نہ لائیں تب تک اللہ کے یہاں مسلمان نہیں۔ مومنوں کو حکم ہوا کہ وہ ایمان کی تمام شرائط میں داخل ہوں، ایمان کے جتنے درجے اور ارکان اور دعائم ہیں، سب کو سچے دل سے مانیں، یہ درجہ صرف اقرار کرنے سے نہیں ملتا، بلکہ ایمان کی جملہ شرائط کو مکمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہمیشہ ایمان کی سب شرائط پر قائم اور ثابت قدم رہے، جس طرح ہر مسلمان ہر نماز میں کہا کرتا ہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ [الفاتحة: ٦] ''ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دکھا'' یعنی ہم کو سیدھی راہ دکھا، ہدایت زیادہ کر، ثابت قدم رکھ، اسی طرح اس جگہ حکم کیا کہ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ ﴾ [الحديد: ٢٨] ''اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ''

کتاب سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ اگلی کتب سے مراد پہلی تمام کتابیں ہیں۔ قرآن کے حق میں ''نَزَّلَ'' باب تفعیل سے فرمایا۔ اس لیے کہ قرآنِ مجید علاحدہ علاحدہ اور پارہ پارہ بندوں کی اس دنیا کی اور آخرت کی ضرورتوں کے مطابق اترا ہے۔ پہلی کتابوں کے حق میں صیغہ ''أَنْزَلَ'' فرمایا۔ اس لیے کہ وہ ایک ہی بار اُتری ہیں۔ ﴿ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ راہِ ہدایت سے گمراہ ہوگیا اور حق سے بہت دور جا پڑا۔

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ آیت باب منافقوں کے حق میں اُتری ہے، اُن کو اخلاص کا حکم دیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مشرکوں کے حق میں اُتری ہے، یعنی تم جو لات اور عزیٰ پر ایمان لائے ہو، اب اللہ تعالیٰ اور رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ دونوں قول ضعیف ہیں۔ پھر فرمایا کہ جو کوئی اللہ و ملائکہ وغیرہم میں سے کسی ایک چیز کا کفر بھی کرے گا، وہ سخت گمراہ ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اہلِ کتاب ہیں، ان سے تورات اور انجیل میں عہد لیا گیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ اور قرآن پر ایمان لائیں، انھوں نے اس کا اقرار کر لیا تھا کہ ہاں ہم ایمان لائیں گے، مگر جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے اور قرآن اُترا تو کوئی تابع ہوا اور کوئی منکر رہا۔[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ
ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿١٣٧﴾
بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ﴿١٣٨﴾ اِلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ
الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي

[1] الدر المنثور (٢/ ٧١٦) فتح البیان (٣/ ٢٦٤_ ٢٦٥)

الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۝١٤٠

بے شک جو لوگ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا، پھر ایمان لے آئے، پھر کفر کیا، پھر کفر میں کہیں بڑھ گئے، اللہ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ انھیں ہدایت کا راستہ دکھائے گا (137) (اے نبی) منافقوں کو خبردار کر دیجیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے (138) جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کافروں کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں؟ پھر بے شک عزت تو ساری اللہ ہی کے لیے ہے (139) اور اس نے اس کتاب میں تمھارے لیے نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہو یا ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہو تو تم ان کی مجلس میں نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں، ورنہ تم بھی اس وقت یقیناً انھی جیسے ہو گے، بے شک اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے (140)

منافقوں کے حالات اور اُن کا انجام:

یعنی ظاہر میں مسلمان رہے اور دل سے بھٹکتے رہے، اگر اخیر میں بے یقین مرے تو کافر کے برابر ہیں ان کو بخشش نہیں اور ظاہر کی مسلمانی سے وہاں کامیابی نہیں ملے گی۔ جو شخص ایک مجلس میں اپنے دین کے عیب سنے، پھر اُن میں بیٹھے، اگرچہ خود اپنی زبان سے نہ کہے تو وہی منافق ہے۔ اللہ نے اس آیتِ پاک میں اُس شخص کا ذکر کیا، جو ایمان میں داخل ہوا، پھر نکل گیا، پھر ایمان لایا، پھر کفر کی طرف لوٹ گیا، پھر اسی گمراہی پر قائم رہا، یہاں تک کہ کم بخت مر گیا۔ موت کے بعد توبہ نہیں ہوتی، اللہ ایسے شخص کو بخشتا ہے نہ اُس کے لیے کشایش اور ہدایت کی راہ ہی نکالتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا" یعنی "تَمُّوْا عَلٰى كُفْرِهِمْ حَتّٰى مَاتُوْا" یہی امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مرتد سے تین بار توبہ طلب کریں، پھر یہ آیت پڑھی۔[2]

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی ایک یہ عادت بیان کی کہ وہ کافروں کے یار اور دوستدار ہوتے ہیں، مسلمانوں کے نہیں۔ یعنی حقیقت میں درپردہ اُن کے ساتھ ہیں۔ جب اُن سے اکیلے ملتے ہیں، کہتے ہیں ہم تو تمھارے ہمراہ ہیں، مسلمانوں سے ہنسی ٹھٹھا اور دل لگی کرتے ہیں۔ اظہارِ موافقت میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر اس چال ڈھال کا انکار کیا،

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٩١) اس کی سند میں "سماک عن عکرمہ" مضطرب اور "حفص بن جمیع" ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٩١) اس کی سند میں "جابر جعفی" ضعیف راوی ہے۔

فرمایا: ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ ساری عزت اللہ وحدہ لاشریک لہ کے پاس ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا تھا: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ﴾ [الفاطر: ١٠] ''جو شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی کی ساری عزت ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المنافقون: ٨] ''اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے، اور مومنوں کے لیے، لیکن منافق (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔'' اس سے مقصود اس بات پر برانگیختہ کرنا ہے کہ عزت جناب باری تعالیٰ سے طلب کرنی چاہیے، اُسی کی عبادت پر متوجہ ہو اور تمام مومن بندوں میں منتظم ہو۔ ابو ریحانہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنِ انْتَسَبَ إِلٰى تِسْعَةِ آبَاءٍ كُفَّارٍ يُّرِيْدُ بِهِمْ عِزًّا وَفَخْرًا فَهُوَ عَاشِرُهُمْ فِي النَّارِ)) (رواه أحمد وتفرد به) یعنی جس نے عزت وفخر کے لیے کفار کی نو پشت سے اپنا نسب ملایا تو وہ جہنم میں اُن کا دسواں ہے۔[1]

دین کی مخالفت پر مبنی مجالس میں شرکت سے اجتناب کا حکم:

پھر فرمایا: جو ایسی مجلس میں بیٹھا ہے، جہاں اللہ کی آیتوں پر ہنسی اور دل لگی ہوتی ہے تو وہ اُن کا شریک ہے، بلکہ گناہ میں اُن جیسا ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ اُس دستر خوان پر نہ بیٹھے، جس پر شراب کا دور ہوتا ہے۔[2] اور جس ممانعت کا حوالہ اس آیت میں ہے، وہ سورت انعام میں ہے: ﴿ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ﴾ [الأنعام: ٦٨] ''اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیتوں پر نکتہ چینی کر رہے ہوتے ہیں، تو آپ ان کے پاس سے ہٹ جائیں۔''

امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت کی ناسخ ہے: ﴿ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اللہ کے اس فرمان کے موجب: ﴿ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٦٩] ''ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمے داری ان لوگوں پر نہیں جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں، اور لیکن نصیحت کرنا (ان کا فرض) ہے، تاکہ وہ بھی پرہیزگاری اختیار کریں۔''[3]

پھر اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور کافروں کا جہنم میں جمع ہونا ذکر کیا، یعنی جس طرح وہ شرک وکفر میں شریک تھے، اسی طرح آگ میں ہمیشگی کے بھی شریک ہوں گے۔ عذاب وسزا، قید اور طوق کے گھر اور اُبلتا ہوا پانی اور زخموں کی پیپ کے پینے میں بھی ایک جگہ جمع کیے جائیں گے۔

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٣٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبادہ رحمہ اللہ نے ابو ریحانہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ دیکھیں: العلل المتناهية (٢/ ٧٧٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٠١) مسند أحمد (١/ ٢٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٩٣) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٧٤٢)

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں آیتِ باب کی تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ ایمان اور کفر کے بار بار ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ دین کے ساتھ کھیلتے ہیں، ایمان لانے کے لیے نہ اُن کی نیت صحیح ہے اور نہ ارادہ خالص ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد یہود ہیں۔ پہلے موسیٰ و تورات پر ایمان لائے، پھر گائے کے بچھڑے کی پوجا کر کے کافر ہوئے، پھر جب موسیٰ واپس آئے تو پھر مومن بنے، پھر عیسیٰ اور انجیل کا انکار کر کے کافر ہوئے۔ پھر محمد ﷺ کا انکار کیا۔ یہ کفر پر کفر ہوا۔ ازدیادِ کفر سے اس جگہ مراد استمرار (ہمیشگی) ہے، کیوں کہ کافر ایمان اور اخلاص کے بعد ہی راہ یاب ہوسکتا ہے۔ اسلام پہلے کے تمام گناہوں کو ختم کرنے والا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ ہیں، یہود تورات پر ایمان لا کر منکر ہوگئے، نصاریٰ انجیل پر ایمان لا کر پھر گئے، پھر کفر میں بڑھے، اس طرح کہ نبی اکرم ﷺ کا انکار کیا۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد منافقین ہیں، دو بار ایمان لائے، دو بار کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھ گئے کہ کفر ہی پر مرے۔[1] یہ اس لیے کہ جس شخص سے ایمان لانے کے بعد کفر اور ایمان بار بار ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے دل میں ایمان کی کچھ وقعت نہیں۔ ایسا مومن شخص بایمان کامل صحیح نہیں ہوتا۔ ازدیادِ کفر سے مراد ایمان کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل ہے۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایسے متلاعب (ایمان کے ساتھ کھیلنے والے) کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔[2] مگر اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ مقبول ہوتی ہے، مگر ظاہرِ قرآن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کے پاس عزت تلاش کرنے پر ڈانٹ ڈپٹ فرمائی ہے، کیوں کہ عزت کی تمام قسمیں اللہ کے ساتھ مختص ہیں اور یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ غیر اللہ کے پاس عزت تلاش کرنا باطل ہے۔ کفار کی عزت مومنین کی عزت کے مقابلے میں کسی قطار اور شمار میں نہیں، اس لیے کہ عزت والا وہی ہے جس کو اللہ عزت دے۔

مَنِ اعْتَزَّ بِمَوْلٰی فَذَاكَ جَلِيْلٌ وَمَنْ رَّامَ عِزاً مِنْ سِوَاهُ ذَلِيْلٌ
وَلَوْ أَنَّ نَفْسِيْ مُذْ بَرَأَهَا مَلِيْكُهَا مَضیٰ عُمْرُهَا فِيْ سَجْدَةٍ لَّقَلِيْلٌ

”جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ عزت حاصل کرتا ہے، وہ عظیم ہے، جو اس کے سوا کسی دوسرے سے عزت کا ارادہ کرتا ہے، وہ ذلیل ہے۔ اگر میری جان اس وقت سے، جب سے اس کے مالک نے اس کو پیدا کیا ہے، سجدے میں پڑی رہے تو یہ بھی قلیل ہے۔“

مکہ میں مسلمین کی ایک جماعت مشرکین و یہود کے پاس بیٹھتی تھی، جس وقت قرآنی آیات سے مسخرہ پن

[1] تفسیر الطبري (٩/ ٣١٥_٣١٦) [2] تفسیر البغوي (٢/ ٣٠٠)

کرتے، اللہ تعالیٰ نے اس حرکت سے اُن کو منع کیا، اسی طرح احبارِ یہود مدینہ میں کرتے، منافق ان کے پاس بیٹھ کر ان کے استہزا میں غور کرتے، اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے کہا کہ تم ان کے پاس مت بیٹھو، یہ آیت اپنی عمومیت کے اعتبار سے ہر ایسی جگہ سے بچنے کی دلیل ہے، جس جگہ شرعی احکام اور دلیلوں کی تنقیص ہو اور ان کا مذاق اُڑایا جائے۔

مقلدین کی روش:

وہ عوام جو تقلید کی رسی سے جکڑے ہوئے ہیں، جنھوں نے کتاب وسنت کے عوض آرائے رجال کو خرید لیا ہے اور ان کے ہاتھ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ امام نے یہ کہا، وہ کیا اور فلاں نے یہ لکھا، یہ فرمایا۔ ان کے نزدیک جس وقت کوئی شخص کسی مسئلے پر کسی آیتِ قرآنی یا حدیثِ نبوی کی دلیل پیش کرتا ہے تو اس سے مسخرہ پن سے پیش آتے ہیں اور استہزا کرتے ہیں، اُس کی بات سننے، اس دلیل پر کان رکھنے، اور اس حجت کو قبول کرنے کا کیا ذکر! یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ شخص ایک بری بات لایا ہے، ایسے لوگ جناب امام عالی مقام کے مخالف ہیں، جس کو انھوں نے معلم شرائع کے برابر ٹھہرا رکھا ہے، بلکہ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ اس امام کی صرف رائے اور اجتہاد کو، جو حق کے راستے سے دوسری طرف مائل اور صحیح راستے سے دور ہے، اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مستطاب پر مقدم رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان مذاہب نے اہلِ مذہب کے ساتھ کیا کام کیا، حالاں کہ وہ ائمۂ دین اور سلف مجتہدین جن کی طرف یہ مقلدین منسوب ہیں، وہ ان کے ان افعال سے بالکل بے زار اور بَری ہیں۔ انھوں نے ساری امت کو متنبہ کر دیا ہے کہ ہماری تقلید نہ کرو، نہ کسی اور شخص کے مقلد بنو، مگر ائمۂ مجتہدین کے سچے پیروکاروں کے سوا ان کی کون سنتا ہے؟ سچے مقلد اور مقتدی یہی لوگ ہیں۔[1] وللہ الحمد.

ائمہ اربعہ کی تقلید کی ممانعت کے بارے میں اقوال کتاب "جلب المنفعة" (نواب صاحب کی تالیف) میں مذکور ہیں۔ اس بنیاد پر جس طرح ہم لوگ حنیفی ہیں، اسی طرح بحمد اللہ حنفی بھی ہیں، شافعی بھی ہیں، حنبلی بھی ہیں اور مالکی بھی ہیں، جو لوگ اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ارشاد کے خلاف ان کی تقلید کرتے ہیں اور زبردستی اپنے مذہب کو، جس کی بنیاد صرف رائے یا اجتہاد یا خاص غور وخوص پر ہے، ان کے گلے باندھتے ہیں، وہ درحقیقت امام صاحب کے مقلد نہیں ہیں، بلکہ امام و ائمۂ کرام کے دشمن ہیں۔ بھلا کوئی شخص تو ان صریح احکام کا انکار کرے، جو ائمۂ اربعہ سے فقہ کی کتابوں میں منقول ہیں؟ اور بڑے پن کا ثبوت دے؟ اس لیے کہ جس طرح فروعی مسائل اُن سے ماثور (منقول) ہیں، اسی طرح یہ اقوال بھی ماثور ہیں اور اگر خالص تقلید کی ممانعت کے بارے میں

[1] فتح البیان (۳/ ۲۶۵۔ ۲۶۹)

ان کی تقلید نہیں ہے، جس کا مطلب ہے کہ "يُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّيَكْفُرُ بِبَعْضٍ" تو پھر ان لوگوں کو ملامت کیوں کی جاتی ہے، جو امام کی اس بات کی تقلید کرتے ہیں کہ تقلید کی ممانعت ہے اور وہ ان مسائل میں امام کی تقلید نہیں کرتے، جو نصِ کتاب اور سنتِ صریح کے مقابلے میں صرف ان کی رائے پر مبنی ہیں؟

ان دونوں فریق کا حال برابر ہے، بلکہ دوسرا فریق ان کی بعض باتوں کا انکار کر کے امن میں ہے، کیوں کہ امام نے کسی جگہ یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ تم ہمارے اجتہاد یا ہماری رائے خالص پر چلو، بلکہ یہ فرما کر کہ نہ ہماری تقلید کرو اور نہ کسی اور کی اس سے منع کیا ہے، بلکہ جہاں سے ہم نے لیا ہے، وہیں سے تم بھی لو۔ مگر جب تک توفیقِ الٰہی کسی کا ہاتھ نہ پکڑے، وہ ہرگز راہِ راست پر نہیں آ سکتا۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الْمُتَّبِعِيْنَ لِلْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَبَاعِدْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ آرَاءِ الرِّجَالِ" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "دَخَلَ فِيْ هٰذِهِ الْآيَةِ كُلُّ مُحْدِثٍ فِي الدِّيْنِ وَكُلُّ مُبْتَدِعٍ إِلىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ"[1] "قیامت تک آنے والا ہر بدعتی اس آیت میں داخل ہے۔"

﴿ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ یعنی اگر تم نے یہ کام کیا اور تم ان کے پاس بیٹھے اور باز نہ آئے تو پھر تم بھی کفر اور عذاب کے مستحق ہونے میں ان کی مثل ہو۔ یہ مماثلت ساری صفات میں نہیں ہے، لیکن الزامِ شبہ ہے۔ آیت کے ظاہر حکم کے مطابق سارے اہلِ علم اس آیت کو محکم کہتے ہیں۔ فقط ایک کلبی رحمہ اللہ نے منسوخ کہا ہے، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٦٩] "ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمے داری ان لوگوں پر نہیں جو پرہیز گاری اختیار کرتے ہیں، اور لیکن نصیحت کرنا (ان کا فرض) ہے، تاکہ وہ بھی پرہیز گاری اختیار کریں۔" سو ان کا یہ قول مردود ہے، کیوں کہ تقوے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ان لوگوں کی مجلسوں سے اجتناب کرنا بھی ہے، جو آیاتِ الٰہی کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کفر پر راضی ہو جانا کفر ہے اور جو کوئی کسی منکر کے ساتھ راضی ہو اور اہلِ منکر کے ساتھ خلط ملط رکھتا ہے، وہ گناہ میں ان کے برابر ہے، اگرچہ منکر کے ساتھ رہایش اختیار نہ کرے۔ ہاں اگر اُس جگہ آ کر پھنس گیا ہے اور دل سے ناخوش اور غصے سے یا خوف اور تقیے سے بیٹھا ہوا ہے تو البتہ یہ بات رضا مندی کے ساتھ مجلس کرنے سے زیادہ آسان ہے اور اگر بدعتی اور منکر کے ساتھ بیٹھا ہے اور اُس کی بدعت اور منکر میں شامل نہیں ہے تو یہ کراہت کے ساتھ بیٹھنا جائز ہو سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ کسی حال میں بھی جائز نہیں، لیکن پہلی صورت زیادہ بہتر ہے، خصوصاً جب خیر خواہی کی نیت ہو۔

[1] تفسیر البغوي (٢/ ٣٠١)

اِلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿١٤١﴾

وہ لوگ تمھارے انجام کا انتظار کرتے رہتے ہیں، پھر اگر تمھیں اللہ کی طرف سے فتح حاصل ہو تو وہ کہتے ہیں: کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ غلبہ ملے تو ان سے کہتے ہیں: کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور (کیا) ہم نے تمھیں مومنوں سے نہیں بچایا؟ پھر قیامت کے دن اللہ تمھارے درمیان فیصلہ کر دے گا، اور اللہ کافروں کو مومنوں کے خلاف ہرگز کوئی راستہ نہیں دے گا ﴿١٤١﴾

منافقوں کا مسلمان کی تاک میں رہنا:

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص راہِ حق میں ہو اور گمراہوں سے بھی بنائے رکھے یہ بھی نفاق ہے۔ اللہ نے اس آیت میں منافقوں کے حال سے خبر دی ہے کہ وہ اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ مومنین کی سلطنت کو زوال ہو اور کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ ہو اور ملتِ اسلام کی بربادی ہو۔ اگر مسلمانوں کی مدد و تائید اور کامیابی ہو اور مالِ غنیمت ملے تو ان سے دوستی جتانے لگتے ہیں اور اگر بعض اوقات میں اتفاقاً کافر غالب ہو گئے، جس طرح اُحد کے دن ہوا تھا، کیوں کہ رسولوں کی آزمایش کی جاتی ہے، لیکن پھر انجام انھیں کو ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو باطن میں تمھارے مددگار تھے، ہم تو مسلمانوں کو دھوکا دیتے تھے، دیکھو آخر تمھیں ہی فتح ہوئی۔

غرضیکہ دونوں فریق سے بنا کر رکھتے ہیں۔ یہ کام ضعفِ ایمان اور یقین کی کمی سے کرتے تھے۔ اللہ نے کہا کہ اس کرتوت کا فیصلہ ہم قیامت میں کریں گے۔ یہاں تو اظہارِ اسلام کی وجہ سے تمھیں دنیا میں چھوڑ دینا حکمت اور مصلحت کے تحت ہے، مگر آخرت کے دن تمام بھید کھل جائیں گے۔ جو سینوں میں ہے، وہ سامنے آجائے گا، اُس وقت یہاں کے ظاہری رویے کچھ کام نہیں آئیں گے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کافروں کو مسلمانوں پر راہ نہ ہو گی، یعنی قیامت کے دن۔ یہی امام ابو مالک رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ راہ سے مراد حجت ہے۔[1]

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مراد دنیا میں ہو، یعنی دنیا میں اہلِ ایمان پر کفار کو ایسا غلبہ نہ ہو گا کہ وہ ان کو بالکل جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیں، ان کا مکمل استیصال کر دیں۔ بعض اوقات بعض لوگوں پر کامیابی ہو سکتی ہے، مگر دنیا اور

---

[1] تفسیر الطبري (٩/ ٣٢٧۔ ٣٢٨)

آخرت میں عاقبت (انجام) متقین کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ [المؤمن: ٥١] ''بلاشبہ ہم اپنے رسول کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں۔''

اس صورت میں یہ آیت منافقوں کی اُس امید و رجا کی تردید کرتی ہے، جو ان کے دلوں میں مومنین کی حکومت کے زوال کے بارے میں ہے اور ان کے اس عزم کا رد کرتی ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ اپنے جان و مال کے خوف کی وجہ سے بھرپور تعاون کریں، تاکہ اگر وہ فتح پائیں گے تو ان کا استیصال کر دیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴾ [المائدة: ٥٢] ''(اے نبی!) پس آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں (منافقت کا) روگ ہے کہ وہ دوڑ کر ان (یہودیوں) میں جاتے ہیں اور (ان سے) کہتے ہیں: ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی مصیبت (نہ) پہنچے، پھر قریب ہے کہ اللہ (تمھیں) فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے، تو یہ لوگ (اپنی منافقت پر) پچھتائیں گے، جسے وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔''

اس آیت سے اکثر علما نے استدلال کیا ہے کہ مسلمان غلام کو کافر کے ہاتھ بیچنا منع ہے، کیوں کہ اگر یہ بیع صحیح ٹھہرے گی تو کافر کا مسلمان پر مسلط کرنا اور مسلمان کا ذلیل کرنا ثابت ہوگا اور جس نے یہ کہا کہ بیع صحیح ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آیتِ کریمہ موصوفہ کی دلیل سے فی الفور اس کی ملکیت کو زائل کر دینا چاہیے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب میں منافقوں کا حال بیان فرمایا ہے۔ أَبْعَدَهُمُ اللّٰهُ۔ یہی حال ان مسلمانوں کا ہے، جو ہر اُس گروہ کا ساتھ دینا شروع کر دیتے ہیں، جو دنیا کے مال و جاہ کا حامل ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ چاپلوسی، دوستی، عاجزی اور ذلت سے پیش آتے ہیں۔ جس کا غلبہ دیکھا، اُس کی طرف داری کرنے لگے، جس کی شکست دیکھی، اُس کے ساتھ درشتی، سختی اور بد خلقی کے ساتھ پیش آئے، عیب جوئی کرنے لگے، اور ہر ناپسندیدہ بات سامنے لانے لگے۔ قَبَّحَ اللّٰهُ أَخْلَاقَ أَهْلِ النِّفَاقِ وَأَبْعَدَها.

سبیل سے مراد اگر مدد اور غلبہ ہے تو مراد روزِ قیامت ہے اور اگر مراد حجت اور دلیل ہے تو مراد دنیا ہے، کیوں کہ دنیا میں مومنین کی حجت کافروں پر غالب ہے۔ کوئی ازراہِ دلیل ان پر غالب نہیں ہوسکتا۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سارے اہلِ تاویل کا یہی قول ہے کہ قیامت کا دن مراد ہے۔ امام ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ پھر اس خبر کا فائدہ کیا ہو۔ یہ وہم اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ آخر کلام کو اول کلام کی طرف راجع سمجھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)

بعض نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ جب تک مومنین عامل بحق اور غیر راضی بباطل اور نہی عن المنکر کرتے رہیں

گے، تب تک کفار کو ان پر غلبہ نہیں ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ﴾ [الشوریٰ: ۳۰] ''اور تمھیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمھارے اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے (پہنچتی ہے)۔'' امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات بہت نفیس ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ سبیل سے مراد شریعت ہے، یعنی کافروں کا کوئی دین نہیں ہے، اگر پایا بھی جائے گا تو وہ خلاف شرع ہوگا۔ شریعتِ اسلام ہمیشہ قیامت کے دن تک غالب رہے گی۔ اس آیت سے بہت سے مسائل نکلتے ہیں، جیسے یہ کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، یا کافر مسلمان کے مال پر غلبہ حاصل کر کے اُس مال کا مالک نہیں ہوسکتا، یا کافر کو غلام مسلمان کا خریدنا جائز نہیں، یا مسلمان ذمی کے عوض مقتول نہیں ہوسکتا اور اس کے علاوہ دیگر احکام۔[2]

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

بے شک منافقین اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں دل سے نہ چاہتے ہوئے، لوگوں کو دکھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اللہ کو بس تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں (142) وہ کفر اور ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں، نہ (پورے) اس طرف نہ (پورے) اس طرف، اور (اے نبی) جسے اللہ گمراہ کر دے، آپ اس کے لیے ہرگز کوئی راہ نہیں پائیں گے (143)

منافقوں کی دھوکا دہی، تذبذب اور نماز میں سستی:

سورت بقرہ کے شروع میں یوں گزر چکا ہے: ﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۹] ''وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں جو ایمان لائے مگر وہ اپنے آپ کے سوا کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور وہ شعور نہیں رکھتے۔'' اور یہاں یوں فرمایا۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ کسی کے دھوکے میں نہیں آتا، وہ تو پوشیدہ اور دل کی باتوں کو جاننے والا ہے، لیکن منافقین اپنی جہالت اور علم و عقل کی کمی سے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جیسے لوگوں کے سامنے ان کی بات چل جاتی اور رواج پا جاتی ہے اور ظاہر طور پر شریعت کے احکام اُن پر جاری ہوتے ہیں، ایسا ہی قیامت کے دن بھی ان پر اللہ کا حکم ہوگا کہ ان کے ظاہری اسلام پر کارروائی کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ

[1] فتح البیان (۳/ ۲۷۱۔ ۲۷۳) [2] تفسیر القرطبي (۵/ ۴۱۹)

کے نزدیک ان کی بات چل جائے گی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ قیامت کے دن قسمیں اٹھائیں گے کہ وہ دین پر اور سیدھی راہ پر قائم تھے اور اس بناوٹ کو اپنے لیے نفع بخش سمجھیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ [المجادلة: ١٨] ''جس دن اللہ ان سب کو دوبارہ اُٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے، جیسے تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ ایک شے (اچھی راہ) پر ہیں۔ خبردار! بے شک وہی جھوٹے ہیں۔''

یہ جو فرمایا کہ اللہ ہی ان کو دغا دے گا، اُس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اُن کو دنیا میں حق سے پھیر کر درجہ بہ درجہ سرکشی اور گمراہی اور شرمندگی میں ڈالے گا، جس طرح وہ یہاں حق تک نہ پہنچے، اسی طرح وہاں بھی محروم اور مخذول رہیں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ⑬ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ⑭ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ [الحديد: ١٣۔ ١٥] ''اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے، کہیں گے: تم ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمھارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ (ان سے) کہا جائے گا: اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ، پھر نور تلاش کرو۔ تب ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا، اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔ وہ (منافق) ان (مومنوں) کو پکاریں گے: کیا ہم (دنیا میں) تمھارے ساتھ نہیں تھے؟ وہ کہیں گے (ہاں) کیوں نہیں! لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈال لیا تھا، اور تم نے (اہلِ ایمان کی بابت گردشِ زمانہ کا) انتظار کیا، اور تم نے شک کیا۔ اور تمھیں (جھوٹی) خواہشوں نے فریب دیا، حتی کہ اللہ کا حکم آ پہنچا، اور تمھیں دھوکے باز (شیطان) نے اللہ کی بابت دھوکا دیا۔ لہٰذا آج تم سے کوئی فدیہ نہ لیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تمھارا ٹھکانا آگ ہے، یہی تمھارے لیے زیادہ موزوں ہے اور وہ لوٹ جانے کی بہت بری جگہ ہے۔''

حدیث میں مروی ہے: «مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ رَاءَى رَاءَى اللّٰهُ بِهٖ»[1] دوسری حدیث میں مروی ہے: «إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَبْدِ إِلَى الْجَنَّةِ فِيمَا يَبْدُو لِلنَّاسِ وَيَعْدِلُ بِهٖ إِلَى النَّارِ» یعنی کسی کو ظاہر میں لوگوں کے سامنے حکم بہشت کا دے گا اور اُس کو آگ میں بھیج دے گا،[2] جس طرح انھوں نے ریا اور سمعہ کیا تھا، وہی سزا ان کو بھی ملے گی۔ کردنی خویش آمدنی پیش۔ پھر منافقین کی ایک صفت یہ بیان فرمائی کہ اشرف اعمال، افضل افعال

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٦)

[2] صحیحین میں اس کے ہم معنی روایت مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٢)

اور خیر احوال، جس کو نماز کہتے ہیں، اس کے لیے نہایت سستی و کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں نہ اُس میں عبادت کی نیت ہے، نہ ایمان ہے نہ خشیتِ الٰہی ہے، نہ اُس کے معنی سمجھتے ہیں نہ اُس میں اُن کا جی ہی لگتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ مکروہ ہے کہ آدمی نماز کے لیے سست اور کاہل ہو کر کھڑا ہو، لیکن کشادہ اور پوری طرح رغبت کے ساتھ اور خوشی خوشی کھڑا ہو، کیوں کہ اللہ سے مناجات کرتا ہے، اللہ اُس کے سامنے ہے، وہ اُس کو بخشا ہے، اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ پھر آیتِ باب پڑھی۔[1]

یہ تو ان کی ظاہر صفت ہوئی کہ کسل مندی سے نماز پڑھتے ہیں۔ اب ایک صفت باطن کی یاد فرمائی کہ یہ کام لوگوں کے دکھانے کے لیے کرتے ہیں، نہ اخلاص ہے نہ اللہ سے معاملہ، بلکہ لوگوں کو اپنی نماز پر گواہ بناتے ہیں، تقیہ اور مصانعت کرتے ہیں، اسی لیے اکثر اوقات نماز میں پیچھے رہ جاتے ہیں غالباً نظر نہیں آتے۔ جیسے نمازِ عشا یا نمازِ صبح میں اندھیرے کے وقت۔ صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ منافقوں پر سب سے زیادہ ثقیل نماز صبح اور عشا کی نماز ہے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ اُن میں کیا ہے تو سینے کے بل چل کر آئیں۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ نماز کا حکم دوں، پھر اقامت کی جائے، پھر کسی کو حکم دوں کہ نماز پڑھائے لوگوں کو، میں لکڑیوں کا ایک گٹھ ساتھ لے کر جاؤں اور جو لوگ نماز میں حاضر نہیں ہوتے، اُن کے گھر آگ سے جلا دوں۔[2]

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر گھروں میں عورتیں بچے نہ ہوتے تو میں ان کے گھر آگ سے جلا دیتا۔[3]

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے اچھی طرح نماز پڑھی، جہاں لوگ اُس کو دیکھتے ہیں اور اکیلے میں بُری طرح پڑھی، تو یہ استہانت ہے۔ اُس نے اپنے رب عزوجل کی اہانت کی۔[4] (رواه أبو يعلىٰ)

ذکرِ قلیل سے مراد یہ ہے کہ خشوع نہیں کرتے نہ یہ جانتے ہیں کہ نماز میں کیا کہتے ہیں، بلکہ ساہی لاہی (سست اور بے رغبت) ہیں۔ جو خیر اُن سے مراد ہے، اُس سے روگردان ہیں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ منافق کی نماز ہے، تین بار فرمایا: بیٹھا بیٹھا سورج کو دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان میں ہوتا ہے تو کھڑے ہو کر چار چونچیں مارتا ہے، اس میں اللہ کا بہت تھوڑا ذکر کرتا ہے۔ (رواه مالك و كذا رواه مسلم والترمذي والنسائي) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[5]

پھر فرمایا کہ کافر تذبذب میں ہوتے ہیں، یعنی ایمان اور کفر کے درمیان حیران و پریشان ہوتے ہیں، نہ ظاہر و باطن میں مومنوں کے ساتھ ہیں اور نہ ظاہر و باطن میں کافروں کے ساتھ ہیں، بلکہ ظاہر میں مومنوں کے ساتھ اور

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٧٤٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥١)

[3] مسند أحمد (٢/ ٣٦٧) اس کی سند میں ''ابو معشر'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ٥٨)

[4] مسند أبي يعلىٰ (٩/ ٥٤) اس کی سند میں ''ابراہیم بن مسلم ہجری'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٥٣٧)

[5] الموطأ (١/ ٢٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٥١١)

باطن میں کافروں کے ساتھ ہیں۔ کچھ کو شک ہو جاتا ہے، کبھی اُدھر جھکتے ہیں، کبھی اِدھر: ﴿ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ﴾ [البقرۃ: ۲۰] ''جب بجلی ان پر چمکتی ہے تو وہ اس (کی روشنی) میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا ہوتا ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مذبذب ہیں۔ نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے ساتھ ہیں اور نہ یہود کے ساتھ۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے کہ منافق کی مثال اس بکری کی ہے، جو دو ریوڑوں کے درمیان میں ہے، کبھی اس طرف جھکتی ہے، کبھی اُس طرف۔ نہیں جانتی کہ کس کے ساتھ ہے۔[2] (رواہ ابن جریر و تفرد بہ مسلم و رواہ أحمد)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ مسلمان اور منافق و کافر کی مثال تین آدمیوں کی مثل ہے کہ ایک جگہ میں پہنچے ایک پار ہوگیا، دوسرا آدھے جنگل میں پہنچا تھا کہ اُس کو پکارا، اُس نے جو وادی کے کنارے پر تھا کہ تیری خرابی ہو، کہاں ہلاک ہونے کو جاتا ہے، پھر جا، جدھر سے آیا ہے۔ اُدھر سے اس نے پکارا جو پار ہوگیا تھا کہ اِدھر آ نجات کی طرف، وہ کبھی اِدھر کبھی اُدھر دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک سیلاب آیا، اُس نے ڈبو دیا، تو وہ شخص جو پار ہوگیا، وہ مومن ہے، جو ڈوب گیا، وہ منافق ہے، وہ درمیان میں مذبذب ہے، نہ اِدھر نہ اُدھر۔ اور جو کھڑا ہے وہ کافر ہے۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بیچ میں مذبذب ہیں، یعنی نہ مومنین مخلصین ہیں نہ مشرکین ہیں، صریح شرک کرنے والے۔[4] جس کو اللہ نے راہِ ہدایت سے گمراہ کیا، اُس کو راہ نہیں ملتی۔ منافق نجات کے طریقے سے گمراہ ہیں، ان کے لیے کوئی ہدایت دینے والا اور کوئی بچانے والا نہیں ہے، کیوں کہ اللہ کے حکم کو کون پیچھے ڈال سکتا ہے: ﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۲۳] ''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی۔''

عمومی تفسیر:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ان مکاروں کے ساتھ اللہ کا دغا یہ ہے کہ جو انھوں نے جھوٹ موٹ اسلام کا اظہار کر کے دنیا میں اپنا خون و مال بچا لیا، اللہ نے بھی اُن کو یہاں چھوڑ دیا، سزا کو آخرت کے گھر پر رکھا اور ان کے فریب کی سزا آگ کا نچلا حصہ مقرر کیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ قیامت کے دن اللہ ہر مومن اور منافق پر ایک نور ڈالے گا، جس کی روشنی میں چلیں گے، جب صراط تک پہنچیں گے تو منافقوں کا نور بجھ جائے گا، مومن اپنے نور میں چلے گا۔ یہ اللہ کا ان کے ساتھ دغا ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۳۳۵) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۸٤) مسند أحمد (۲/ ٤۷) تفسیر الطبري (۹/ ۳۳۳)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۰۹٦) اس کی سند صحیح ہے۔ [4] تفسیر الطبري (۹/ ۳۳٤)

اسی طرح امام سدی، مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے،[1] مگر معلوم نہیں کہ یہ تفسیر کہاں سے آئی ہے۔ ایسی تفسیر سوائے نبی اکرم ﷺ کے اور کسی سے نقل نہیں ہو سکتی۔ واللہ أعلم. کسلان سے مراد یہ ہے کہ نماز پڑھتے ہیں، بوجھل بن کر، نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں اور نہ عذاب کا خوف ہے۔ لوگوں کے دکھانے سنانے کو نمازی بنے ہیں، نہ کہ دین کے لیے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! اگر لوگ نہ ہوتے تو کوئی منافق نماز نہ پڑھتا۔[2]

ذکرِ قلیل سے مراد ہے کہ تھوڑی نماز پڑھتے ہیں۔ عدمِ اخلاص کے سبب سے یا وہ نماز مقبول نہیں یا سب کے سامنے پڑھتے ہیں، اکیلے میں نہیں پڑھتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قلیل اس لیے ہے کہ ریا وسمعہ کے لیے پڑھتے ہیں، اگر اس قلیل سے اللہ کی رضا مندی مراد ہوتی تو کثیر ہو جاتی۔[3] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن اُبی اور اُبی بن عامر بن نعمان کے بارے میں اُتری ہے۔[4] مذبذب ہیں کفر و ایمان کے درمیان۔ دو امر کے درمیان متردد کو مذبذب کہتے ہیں۔ ذبذبہ اضطراب کے معنی میں ہے۔[5]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُبِينًا ﴿١٤٤﴾ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ﴿١٤٥﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٤٦﴾ مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴿١٤٧﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف (کارروائی کے لیے) کھلی حجت دے دو؟ (144) بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے، اور وہاں آپ ان کے لیے ہرگز کوئی مددگار نہیں پائیں گے (145) سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور تھام لیا اللہ (کے دین) کو اور اپنا دین اللہ کے لیے خاص کر لیا تو ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ مومنوں کو جلد بہت بڑا اجر عطا کرے گا (146) اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟ اور اللہ بڑا قدردان، خوب جاننے والا ہے (147)

---

(1) تفسير الطبري (٩/ ٣٢٩_ ٣٣٠) الدر المنثور (٢/ ٧١٩) (2) تفسير الطبري (٩/ ٣٣١)
(3) تفسير البغوي (٢/ ٣٠٢) (4) تفسير الطبري (٩/ ٣٢٩) (5) فتح البيان (٣/ ٢٧٤_ ٢٧٦)

کافروں کی دوستی سے ممانعت:

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس بات سے منع کیا ہے کہ کافروں کے ساتھ مصاحبت، مصادقت، مناصحت، چھپی دوستی یا اہلِ ایمان کی خفیہ باتوں کا کافروں کے پاس افشا کریں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۚ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ [آل عمران: ۲۸] ''اہلِ ایمان، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ہرگز دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، الا یہ کہ تم ان (کافروں کے شر) سے بچنا چاہو اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور تمھیں اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' یعنی اللہ اپنی سزا سے ڈراتا ہے، اگر تم اس کی منع کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب کرو گے، اس لیے اس جگہ یوں کہا ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو عذاب کرنے کے لیے حجت دو؟ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قرآن میں ہر جگہ سلطان کے معنی حجت کے ہیں، اس قول کی اسناد صحیح ہیں۔ یہی امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، قرظی، ضحاک، سدی اور نضر بن عربی رحمہم اللہ کا قول ہے۔[1]

منافق جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوگا:

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ منافق قیامت کے دن جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے، اُن کے کفرِ غلیظ کی یہی سزا اور جزا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد اسفلِ نار ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ نار کے لیے درکات ہیں، جس طرح جنت کے درجات ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تابوت ہیں جن میں یہ ڈھکے ہوئے ہوں گے۔[3] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ان کے اوپر آگ کے تابوت بطورِ طبق کے ہیں جو اوپر اور نیچے سے سلگیں گے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تَوَابِيْتُ مِنْ نَّارٍ تُطْبَقُ عَلَيْهِمْ'' یعنی مغلق و مقفل ہیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ''تَوَابِيْتُ مِنْ حَدِيْدٍ مُبْهَمَةٌ عَلَيْهِمْ أَيْ مُغْلَقَةٌ مُّقَفَّلَةٌ لَّا يُهْتَدٰى مَكَانَ فَتْحِهَا'' [5] یعنی بند صندوق ہیں، جن کے کھولنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا، کوئی ان کا حامی نہ ہوگا، جو ان کو رہائی دلوائے اور اس عذابِ الیم سے چھڑائے۔

سچی توبہ نجات کا دروازہ ہے:

ہاں جس نے ریا سے توبہ کی اور اُس کو اخلاص سے بدلا، اُس کو عملِ صالح نفع دے گا، گو قلیل ہو۔ سیدنا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٩٧) [2] تفسير الطبري (٩/ ٣٣٩) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٩٨) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسير الطبري (٩/ ٣٣٩) اس کی سند میں ''سفیان بن وکیع'' ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٩٨) اس کی سند حسن ہے۔

[5] تفسير الطبري (٩/ ٣٣٨، ٣٣٩) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٠٩٨)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:« أَخْلِصْ دِيْنَكَ يَكْفِيْكَ الْقَلِيْلُ مِنَ الْعَمَلِ »[1] ''اپنا دین خالص کر، تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔'' ایسے لوگ البتہ زمرۂ مومنین میں ہوں گے۔ قیامت کے دن مومنوں کا اجر بڑا ہے۔

اللہ کی بے نیازی:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی بے نیازی کا ذکر کیا کہ اُس کو تمھارے عذاب کرنے کی کچھ پروا نہیں ہے، اگر تم اچھے کام کرو اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ شکر پذیر اور دانا ہے، وہ جانتا ہے کہ کون سچے دل سے ایمان لایا ہے اور کون نہیں لایا۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ درکِ اسفل وہ طبقہ ہے، جو جہنم کی جڑ میں ہے۔ آگ کے سات طبقے ہیں، بعض بعض کے اوپر، منافق نیچے کے طبقے میں ہوگا، کیوں کہ اُس کا کفر بہت غلیظ تھا۔ وہ طبقۂ ہاویہ ہے۔ جہنم کا ایک اعلیٰ طبقہ ہے، پھر لظیٰ، پھر حطمہ، پھر سعیر، پھر سقر، پھر جحیم، پھر ہاویہ۔ کبھی سب طبقات کو جہنم کہتے ہیں۔ منافق کا عذاب کافر سے زیادہ تر سخت اس لیے ہوا کہ وہ دنیا میں تلوار سے بچ گیا یا کفر کے ساتھ اس نے استہزا بالاسلام کو بھی ملایا ہے، مگر اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے والا اس حکم سے باہر ہے۔ اسی لیے کہا کہ تمھارے عذاب میں اللہ کا کیا فائدہ ہے، اگر تم ایمان لاؤ اور عملِ صالح کرو۔[2]

---

[1] شعب الإيمان (٥/ ٣٤٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عمرو بن مرہ رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢١٦٠)

[2] فتح البيان (٣/ ٢٧٨۔ ٢٨٠)

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿١٤٨﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿١٤٩﴾

اللہ اونچی آواز میں برائی کی بات کرنے کو پسند نہیں کرتا، مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو (اسے اجازت ہے) اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ﴿148﴾ اگر تم کھلے طور پر نیکی کرو یا چھپا کر کرو، یا برائی سے درگزر کر دو، تو اللہ بھی بہت معاف کرنے والا، بڑی قدرت والا ہے ﴿149﴾

مظلوم کے لیے ظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کی اجازت:

یعنی کسی میں دین یا دنیا کا کوئی عیب معلوم کرے تو اس کو مشہور نہ کرے، کیوں کہ اللہ سنتا جانتا ہے، وہ ہر کسی کی جزا دے گا۔ اِسی کو غیبت کہتے ہیں۔ اس آیت میں مظلوم کے لیے جائز ہے کہ ظالم کا ظلم بیان کرے، اسی طرح اور بھی کئی مقام میں غیبت کرنا جائز ہے۔ یہ حکم شاید اس پر فرمایا کہ منافق کا نام مشہور نہ کرے، جیسے نبی کریم ﷺ نے مشہور نہیں کیا، اس میں اُس کا دل زیادہ بگڑتا ہے۔ مبہم نصیحت کرے، منافق آپ سمجھ لے گا، اس میں شاید ہدایت پائے۔ منافق کو اگر چاہو کہ صادق کرو تو ظاہری طعن کرنے سے خفیہ طور پر سمجھانا بہتر ہے اور درگزر بہت خوب ہے، اللہ بھی جانتا بوجھتا ہے، بندوں سے درگزر کرتا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ کوئی کسی پر بد دعا نہ کرے، مگر یہ کہ مظلوم ہو۔ اُس کو رخصت دی ہے کہ وہ ظالم کو کوسے اور اگر صبر کرے تو بہتر ہے۔[1] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بد دعا نہ کرے۔ یوں کہے: «اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلَيْهِ وَاسْتَخْرِجْ حَقِّي مِنْهُ»[2] "اے اللہ! اس پر میری مدد فرما اور اس سے میرا حق وصول کروا دے۔" ایک روایت میں اس طرح ہے کہ ظالم پر بددعا کرنے کی رخصت ہے، مگر حد سے تجاوز نہ کرے۔ عبدالکریم جزری رحمہ اللہ نے اس آیت میں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اگر کوئی تجھ کو گالی دے تو تو بھی گالی دے، مگر تجھ پر افترا کرے تو اس پر افترا نہ کر، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ [الشوریٰ: ٤١] "اور البتہ جو شخص اپنے مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں پر کوئی (ملامت کی) راہ نہیں۔"[3]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: «اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِئِ مِنْهُمَا مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ»[4] (رواه أبو داود) "دو آپس میں گالی دینے والے جو کچھ کہیں تو گناہ ان دونوں میں سے پہل کرنے والے پر

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٤٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٠٠) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٩/ ٣٤٤)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٠١) [4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٨٧) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٨٩٤)

ہے، جب تک مظلوم ظلم نہ کرے۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی دوسرے کی مہمانی کرتا ہے۔ پھر ضیافت کا حق ادا نہیں کرتا، وہ باہر نکل کر کہتا ہے کہ میں فلاں کا مہمان تھا، اُس نے میرا حق ادا نہیں کیا ہے۔ یہ ہے ''جَهْر بِالسُّوْء'' یہاں تک کہ وہ دوسرا اُس کا حق ضیافت بجا لائے۔ دوسری روایت یہ ہے:« هُوَ الرَّجُلُ يَنْزِلُ بِالرَّجُلِ فَلَا يُحْسِنُ ضِيَافَتَهُ فَيَخْرُجُ فَيَقُوْلُ أَسَاءَ ضِيَافَتِي وَلَمْ يُحْسِنْ » روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں:« هُوَ الضَّيْفُ الْمُحَوَّلُ رَحْلَهُ فَإِنَّهُ يَجْهَرُ لِصَاحِبِهِ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ »[1]

حقِ مہمانی:

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ ہم نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہم کو بھیجتے ہیں، ہم جس قوم کے پاس جا کر اُترتے ہیں، وہ ہماری مہمانی نہیں کرتے، اس میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ کہا کہ جب تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ تمھارے لیے ضیافت کا حکم کریں تو تم قبول کرو اور اگر نہ کریں تو اُن سے حقِ مہمانی لو جو لائق ہو۔[2] (رواہ أهل السنن إلا النسائي) مقدام بن ابی کریمہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے، جس مسلمان نے کسی قوم کو مہمان کیا اور مہمان نے صبح محروم ہو کر کی تو ہر مسلمان پر حق ہے کہ اُس کی مدد کرے، یہاں تک کہ ایک رات کی ضیافت اُس کی کھیتی اور مال سے لے۔[3] (رواہ أحمد و تفرد به) روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ شب مہمان کی ہر مسلمان پر واجب ہے، اگر وہ اُس کے گھر میں محروم ہو کر صبح کرے گا تو اُس پر قرض رہا، چاہے دے یا چھوڑے۔[4] (رواہ أحمد عنه)

اسی قسم کی حدیثوں کے سبب سے امام احمد رحمہ اللہ ضیافت کے واجب ہونے کی طرف گئے ہیں۔ اسی قبیل سے وہ حدیث ہے جس کو بزار رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میرا ہمسایہ مجھ کو ایذا دیتا ہے۔ فرمایا تو اپنے گھر کا سامان نکال کر برسرِ راہ رکھ دے، اس نے یہی کیا، جو کوئی گزرتا کہتا تجھ کو کیا ہوا ہے؟ وہ کہتا: میرا ہمسایہ مجھے ایذا دیتا ہے، وہ کہتا: ''اَللّٰهُمَّ الْعَنْهُ، اَللّٰهُمَّ اخْزِهِ'' ''اے اللہ! اس پر لعنت فرما اور اس کو رسوا کر۔'' آخر اُس ہمسائے نے اُس شخص سے کہا: تو یہ سامان اپنے گھر میں رکھ، واللہ! میں کبھی تجھے ایذا نہ دوں گا۔[5] (و رواہ أبو داود أيضاً)

---

[1] تفسير الطبري (٩/ ٣٤٥_ ٣٤٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٢٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٥٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٧٦)

[3] مسند أحمد (٤/ ١٣١) اس کی سند میں ''سعید بن مہاجر'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٢٢٣٧) البتہ گذشتہ صحیحین کی روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔ [4] مسند أحمد (٤/ ١٣٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٤٧٠)

[5] مسند البزار (١٥/ ٨٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٥٣) تفسير ابن كثير (١/ ٧٤٧_ ٧٤٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٤٤_ ٣٤٥)

معاف کرنے کی ترغیب:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! تم کھل کر بھلائی کرو یا چھپا کر یا معاف کرو، اُس کو جس نے تم سے برائی کی ہے، یہ سب کام تمھارا تقرب الی اللہ ہے۔ وہ تم کو اُس کا بہت زیادہ اجر دے گا، کیوں کہ اللہ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ باوجود عذاب کی قدرت رکھنے کے اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ میں معاف کرنے والا اور قادر ہوں ع

در عفو لذتے ست کہ در انتقام نیست

''معاف کر دینے میں ایسی لذت ہے جو بدلہ لینے میں نہیں ہوتی۔''

اثر میں آیا ہے کہ حاملانِ عرش اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ بعض یوں کہتے ہیں: ''سُبْحَانَكَ عَلٰى حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ'' بعض یوں کہتے ہیں: ''سُبْحَانَكَ عَلٰى عَفْوِكَ بَعْدَ قُدْرَتِكَ'' صحیح حدیث میں مروی ہے: ((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَالٍ، وَّ مَا زَادَ اللّٰهُ عَبْداً بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَّمَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ))[1]

فتح البیان کا بیان:

اس جگہ فتح البیان کا بیان فاتح اس طرح ہے کہ محبت کی نفی دشمنی کا اشارہ ہے۔ ﴿ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ ﴾ بحقِ ظالم یہ ہے کہ کہے فلاں نے مجھ پر ظلم کیا ہے یا وہ ظالم ہے یا مثل اُس کے، یا کلمہ کفر پر اکراہ کیا جائے کہ یہ جائز ہے، اس صورت میں آیت اکراہ کے بارے میں ٹھہرے گی۔ ظاہرِ آیت یہ ہے کہ مظلوم کا ظالم کو برا کہنا جائز ہے۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ آسودہ کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، اس کی آبرو اور عقوبت کو حلال کرتا ہے۔[2] بعض نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ ظالم باوجود ظلم کرنے کے زبان سے بھی مظلوم کو بُرا کہتا، اس کی آبرو لیتا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مروی ہے کہ جس نے ظالم کو کوسا اُس نے اپنا بدلا لے لیا۔[3] (رواه ابن أبي شيبة والترمذي)

مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں اُتری ہے۔ ایک آدمی نے اُن کو برا بھلا کہا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سامنے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ چپکے سے سنتے رہے، کچھ جواب نہ دیا۔ جب بار بار اُس نے کہا تو آخر کو جواب دیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اُس نے مجھ کو گالی دی، آپ نے کچھ نہ فرمایا،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٢٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٤٨٧) یہ روایت گزشتہ مصادر اور ان کے علاوہ میں ''ظلم'' کے لفظ کے بغیر مروی ہے۔ البتہ حافظ ابن حجر اور امام البانی رحمہ اللہ نے ''ظلم'' کے لفظ کے ساتھ روایت نقل کی ہے۔ دیکھیں: تلخيص الحبير (٣/ ٣٩) إرواء الغليل (٥/ ٢٥٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٥٢) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٧٤) اس کی سند میں ''ابوحمزہ میمون اعور'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٥٩٣)

جب میں نے جواب دیا تو آپ کھڑے ہوگئے؟! فرمایا: ایک فرشتہ تیری طرف سے جواب دیتا تھا، جب تو نے اُسے جواب دیا، وہ چل دیا اور شیطان آ گیا، میں اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ [1]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور وہ کہتے ہیں: ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راہ اختیار کریں (150) وہی لوگ حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے (151) اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور انھوں نے ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی تفریق نہیں کی، وہی لوگ ہیں جنھیں اللہ جلد ان کا اجر دے گا۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے (152)

رسولوں پر ایمان لانے میں فرق کرنا خالص کفر ہے:

یہاں سے یہود کا ذکر ہے۔ قرآن میں اکثر یہودیوں اور منافقوں کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ اس جگہ یہ فرمایا کہ اللہ کا ماننا یہی ہے کہ زمانے کے پیغمبر کا حکم مانے، اس کے بغیر اللہ کا ماننا غلط ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے کافروں کو وعید سنائی، جو اللہ اور رسولوں کے منکر ہیں، جیسے: بعض یہود و نصاریٰ، اور وہ اُن کے درمیان فرق کرتے ہیں، بعض انبیا پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کے منکر ہیں، صرف اپنی خواہش اور عادت کے تحت، کیوں کہ اپنے آبا و اجداد کو اسی شکل پر پایا ہے۔ اس طرف جانے کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ یہ تفرقہ بلا دلیل صرف ان کی خواہش اور عصبیت کی وجہ سے تھا۔ یہود۔ علیہم لعائن اللہ۔ انبیا پر ایمان لائے، مگر عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانا۔ نصاریٰ بھی انبیا پر ایمان لائے، مگر خاتم و اشرف الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کیا۔ سامرہ یوشع۔ خلیفۂ موسیٰ علیہ السلام۔ کے بعد

[1] تفسیر الخازن (١/ ٦١٥) یہ واقعہ صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ اس میں نزولِ آیت کا ذکر نہیں ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد (٢/ ٤٣٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٣١) فتح البيان (٣/ ٢٨٠۔ ٢٨٢)

کسی نبی کے قائل نہیں ہیں۔ مجوس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اپنے نبی زردشت پر ایمان لائے تھے، مگر پھر اُس کی شریعت سے منکر ہوگئے، وہ شریعت اُن سے اُٹھ گئی۔ واللہ أعلم.

مقصود یہ ہے کہ جس نے ایک نبی کا انکار کیا، اُس نے سارے انبیا کا انکار کیا، کیوں کہ ہر نبی پر، جسے اللہ نے زمین والوں کی طرف بھیجا ہے، ایمان لانا واجب ہے۔ لہٰذا جو کوئی اس کی نبوت کو حسد یا اپنی خواہش یا عصبیت سے رد کرتا ہے تو ظاہر ہے، جس نبی پر وہ ایمان لایا ہے، اُس کا وہ ایمان شرعی نہیں ہے۔ غرض وہ ہویٰ وعصبیت کی راہ سے ہے، اس لیے اللہ نے اُن کا نام کافر باللہ ورسلہ رکھا ہے، کیوں کہ وہ اللہ اور رسولوں کے درمیان ایمان میں جدائی ڈالنا چاہتا ہے۔ کسی پر ایمان لاتا ہے اور کسی کا انکار کرتا ہے۔ چاہتا ہے کہ بیچ میں ایک راستہ نکالے، سو فرمایا کہ سچے کافر یہی ہیں۔ وہ جس پر ایمان لائے ہیں، ان سے اس کے ساتھ کفر کرنا ثابت ہوجاتا ہے، اس لیے کہ وہ ایمان شرعی نہیں ہے، کیوں کہ اگر اُس پر اللہ کا رسول سمجھ کر ایمان لائے ہوتے تو اُس جیسے دوسرے نبی پر بھی ایمان لاتے۔ خصوصاً اُس پر جو اگلے نبی سے واضح الدلیل اور قوی البرہان ہے یا اُس کی نبوت میں خوب غور سے نظر کرتے۔

لہٰذا جس طرح انھوں نے یہ کام نہیں کیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عذابِ مہین رکھا ہے۔ یہ ان کے عدمِ نظر اور منہ پھیرنے کی جزا ہے اور اس بات کی جزا ہے کہ وہ دنیا کی معمولی معمولی چیزوں کو اکٹھا کرنے میں لگے رہتے ہیں، جس کی انھیں قطعاً ضرورت نہ تھی یا نبوت معلوم کر لینے کے بعد اس کا انکار کرنے کی سزا ہے، جس طرح یہودیوں کے بہت سے احبار نبی مکرم ﷺ کے زمانے میں کرتے تھے کہ آپ کی نبوتِ عظیمہ دیکھ کر حسد سے پیش آتے تھے۔ ان کے مخالف اور دشمن بن کر آپ ﷺ کی تکذیب کرنے لگے۔ آپ سے قتال اور جدال سے مقابلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر دنیا اور آخرت کی ذلت مسلط کر دی: ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ٦١] ''اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے۔'' دنیا اور آخرت دونوں جگہ خوار و ذلیل حقیر وفقیر ہوگئے، دارین کی ہر خیر سے محروم رہے۔

مومن انبیا کے درمیان تفریق نہیں کرتے:

ہاں جو لوگ مومن ہیں اللہ اور رسول پر، اور کسی ایک کے درمیان تفریق نہیں کرتے، جیسے اُمتِ اسلام ہے، وہ اللہ کی ہر کتاب پر، اور ہر نبی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے، ایمان رکھتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ‌ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ‌ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا‌ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ﴾ [البقرة: ٢٨٥] ''رسول (ﷺ) اس

(ہدایت) پر ایمان لائے ہیں جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے اور سارے مومن بھی، سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں:) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے اور وہ کہتے ہیں: ہم نے (حکم) سنا اور اطاعت کی، اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔" لہٰذا ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جزائے جزیل، ثوابِ جلیل اور عطائے جمیل تیار کر رکھا ہے، اگر بعض سے گناہ ہوئے ہوں گے ان کو بھی معاف کر دے گا اور بخش دے گا۔[1]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ پاک نے اس آیت میں مشرکین اور منافقین کے ذکر کے بعد کفارِ اہلِ کتاب کا ذکر کیا ہے کہ اُن کا محمد ﷺ سے انکار کرنا ساری کتب اور انبیا کے انکار کے برابر ہے۔ چاہتے ہیں کہ ایک دینِ متوسط نکالیں، ایسے لوگ بے شک کافر ہیں، ان کے لیے عذاب ہے اور جو تمام کتابوں اور انبیا پر ایمان لائے ہیں، ان کے لیے اجر و ثواب ہے۔[2]

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ
السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا
اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى
سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝١٥٣ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ
ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا
مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝١٥٤

(اے نبی!) اہلِ کتاب آپ سے تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اُتار لائیں، چناں چہ ان لوگوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑا تقاضا کیا تھا، انھوں نے کہا تھا: (اے موسیٰ!) ہمیں اللہ بالکل آنکھوں کے سامنے دکھا، پھر ان کے ظلم کی وجہ سے کڑاکے کی بجلی ان پر آپڑی، پھر ان کے پاس کھلی نشانیاں آجانے کے بعد انھوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا، پھر اس پر بھی ہم نے انھیں معاف کر دیا۔ اور ہم نے موسیٰ کو کھلا غلبہ عطا کیا (153) اور ہم نے ان سے اقرار لینے کے لیے ان پر طور پہاڑ بلند کیا، اور ہم نے ان سے کہا: (شہر کے) دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ، اور ہم نے ان سے کہا: ہفتے کے دن میں زیادتی نہ کرو، اور ہم نے ان سے پختہ عہد لیا (154)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۴۹۔ ۷۵۰) [2] فتح البیان ۳/ ۲۸۳۔ ۲۸۴)

یہود کا تعصب وعناد:

امام قرطبی، سدی اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہود نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر لکھی ہوئی کتاب اتری تھی، ویسی ہی ایک کتاب ہم پر اُترے، فلاں فلاں کے پاس اللہ کے پاس سے صحیفہ مکتوبہ آجائے، جس میں آپ کی نبوت کی تصدیق ہو، تب ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔[1] ان کا یہ کہنا عیب جوئی، دشمنی اور کفر والحاد کے طور پر تھا، جس طرح کفارِ قریش نے ان سے پہلے اسی طرح کا سوال کیا تھا، جس کا ذکر سورۂ سبحان (بنی اسرائیل) میں ہے: ﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٠] ''اور وہ بولے: ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دے۔'' اسی لیے اللہ نے کہا کہ انھوں نے آپ سے یہ سوال کیا ہے، جب کہ موسیٰ سے تو اس سے بھی بڑھ کر سوال کیا تھا کہ ذرا اللہ کو ہمیں کھلم کھلا دکھا دو، جس پر ان کو بجلی نے پکڑ لیا، وہ سوال بھی سرکشی، بغاوت، حد سے تجاوز اور دشمنی کی وجہ سے تھا۔

اس آیت کی تفسیر سورت بقرہ کی اس آیت کے ساتھ گزر چکی ہے: ﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ [البقرة: ٥٥۔ ٥٦] ''اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کو سامنے (علانیہ) نہ دیکھ لیں تو تمھیں بجلی نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمھیں زندہ کیا تمھاری موت کے بعد تاکہ تم شکر کرو۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ ﴾ (آیتِ باب) یعنی کھلی نشانیاں اور زبردست دلیلیں دیکھنے کے بعد جو بلادِ مصر میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئیں، جیسے: فرعون کی ہلاکت، فرعون کے لشکر کا غرق ہونا، جب ایک قوم کے پاس سے گزرے جو بتوں پر اعتکاف کرتی تھی تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اُن سے سوال کیا کہ ہمارے لیے بھی ایک معبود مقرر کر دیں، جس طرح ان کے پاس ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بچھڑے کو معبود پکڑنے کا قصہ سورت اعراف اور سورت طٰہٰ میں مفصل ذکر فرمایا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے ساتھ مناجات کے لیے گئے تو لوگوں نے بچھڑے کو معبود ٹھہرا لیا، جب وہ پھر کر آئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی سزا مقرر فرمائی کہ جس نے اُس کو نہیں پوجا، وہ پوجنے والے کو قتل کرے۔ بعض نے بعض کو قتل کرنا شروع کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا اور فرمایا کہ ہم نے ان کا قصور معاف کیا۔ موسیٰ کو حجت ظاہر کر دی، پھر جب تورات کے احکام کو مستقل طور پر نافذ نہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام کا کہنا نہ مانا تو اللہ نے ان کے سر پر ایک پہاڑ لا کھڑا کیا اور کہا کہ حکم مانو، تب حکم مانا، سجدہ کیا، سجدے میں سر کے اوپر دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں پہاڑ اُن پر گر نہ پڑے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا

[1] تفسير الطبري (٩/ ٣٥٦۔ ٣٥٧)

مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۷۱] ’’اور جب ہم نے ان (کے سروں) پر پہاڑ اُٹھا کھڑا کیا گویا وہ ایک سائبان تھا اور انھوں نے خیال کیا کہ یقیناً وہ ان پر گرنے والا ہے۔ (ہم نے کہا:) اس (تورات) کو جو ہم نے تمھیں دی، قوت کے ساتھ پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو، تاکہ تم (برے کاموں سے) بچ جاؤ۔‘‘

پھر یہ حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔ اس حکم کو بھی نہ مانا اور انھوں نے قولاً اور فعلاً اس کی خلاف ورزی کی۔ ان سے کہا تھا کہ ’’حِطَّة‘‘ (معاف کر دے) کہو، انھوں نے ’’حِنْطَه‘‘ (دانۂ گندم) کہا۔ یہ وصیت کی تھی کہ سنیچر کے دن شکار نہ کرو، ایک مضبوط اقرار لیا تھا، انھوں نے خلاف ورزی کی اور نافرمانی کی۔ حرام کام کرنے کے لیے وہ حیلہ نکالا، جو سورت اعراف میں دیا گیا ہے: ﴿ وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ﴾ [الأعراف: ۱٦۳] ’’اور (اے نبی!) ان (یہودِ مدینہ) سے اس بستی (ایلہ) کے بارے میں پوچھیں جو سمندر کے ساحل پر واقع تھے۔‘‘ صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: « وَعَلَيْكُمْ خَاصَّةً يَهُوْدُ أَنْ لَّا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ »[1] ’’یہودیو! خاص طور پر تمھیں ہفتے کے دن تجاوز نہ کرنے کا حکم ہے۔‘‘

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ
حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝١٥٥ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا
عَظِيْمًا ۝١٥٦ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ
اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ
اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا
اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝١٥٧ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝١٥٨ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا
لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝١٥٩

پھر (ہم نے ان پر لعنت کی) اس لیے کہ انھوں نے اپنا عہد توڑا، اللہ کی آیتوں کا انکار کیا، نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے اور انھوں نے یہ کہا کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، چناں چہ وہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے ہی 155 اور (ہم نے ان پر لعنت کی) ان کے کفر کی وجہ سے، اور مریم پر بہت بڑا بہتان لگانے کی وجہ سے 156 اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۷۳۳) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٧٨) اس کی سند میں ’’عبداللہ بن سلمہ‘‘ متکلم فیہ راوی ہے۔

مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا، حالاں کہ انھوں نے نہ انھیں قتل کیا اور نہ انھیں سولی پر چڑھایا، بلکہ انھیں شبہے میں ڈال دیا گیا۔ اور بے شک جنھوں نے عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کیا، وہ ضرور ان کے متعلق شک میں ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ان کے بارے میں کوئی علم نہیں سوائے گمان کی پیروی کے، اور انھوں نے یقیناً انھیں قتل نہیں کیا (157) بلکہ اللہ نے انھیں اپنی طرف اُٹھا لیا اور اللہ بڑا زبردست، بہت حکمت والا ہے (158) اور اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہ بچے گا جو عیسیٰ پر ان کی موت سے پہلے ایمان نہ لے آئے، اور قیامت کے دن وہ ان سب پر گواہ ہوں گے (159)

عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے متعلق ان کے مزاعم:

یہود کہتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو مارا، وہ انھیں مسیح اور اللہ کا رسول نہیں کہتے۔ یہ اللہ نے ان کے خطاب ذکر فرمائے اور فرمایا کہ انھوں نے اُس کو بالکل نہیں مارا، اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک صورت بنا دی، اس صورت کو سولی پر چڑھایا۔ پھر فرمایا کہ نصاریٰ بھی اول سے یہی کہتے ہیں کہ مسیح کو مارا نہیں، وہ زندہ ہے، لیکن تحقیق نہیں سمجھتے۔ کئی باتیں کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے بدن کو مارا، ان کی روح اللہ کے پاس چڑھ گئی۔ بعضے کہتے ہیں: مارا تھا، پھر تین روز میں زندہ ہو کر بدن سے آسمان پر چڑھ گئے، ہر طرح وہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اُس کو نہیں مارا، یہ خبر اللہ کو ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی صورت کو مارا اور اُن کے پکڑتے وقت نصاریٰ سرک گئے تھے اور یہود بھی نہ پہنچے تھے۔ اُس آن کی خبر نہ اِن کو ہے نہ اُن کو۔ عیسیٰ علیہ السلام ابھی زندہ ہیں، جب یہود میں دجال پیدا ہوگا، تب اس جہاں میں آ کر اُس کو ماریں گے اور یہود و نصاریٰ اور سب اُن پر ایمان لائیں گے کہ وہ مرے نہیں تھے۔

یہود کے جرائم:

اس آیت میں ان گناہوں کا ذکر ہے، جن کے مرتکب یہود ہوئے اور اس وجہ سے ان پر لعنت ہوئی، وہ مردود اور دور کیے ہوئے ٹھہرے اور ہدایت سے دور ڈالے گئے۔ یعنی انھوں نے وہ عہد و پیمان توڑ ڈالے، جو ان سے لیے گئے تھے۔ انبیا علیہم السلام کے ذریعے جو حجتیں اور دلیلیں اور معجزے دیکھے تھے، ان کا انکار کیا، پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور ایک بڑی جماعت کو مار ڈالا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، سدی، قتادہ رحمہم اللہ اور کئی ایک نے کہا ہے کہ غلف کے معنی پردہ ہیں۔[1]

یہ مشرکین کا سا قول ہے: ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ ﴾ [حم السجدة: ٥] ”اور انھوں نے کہا: جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے، اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں۔“ بعض نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ ہمارے

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٠٨)

دل علم کے ظرف ہیں۔ مریم پر زنا کا بہتان لگایا تھا، بچے کو حرام کا بتایا تھا۔ یہی امام سدی، جبیر، محمد بن اسحاق ﷭ وغیرہم کا قول ہے۔[1] ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے مسیح کو مار ڈالا، تکبر اور استہزا کے لیے ہے، جس طرح مشرکوں نے کہا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ [الحجر: ٦] ''اے وہ شخص! جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے، یقیناً تو تو مجنون ہے۔''

یہود کی مخالفت اور عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا:

یہود کا حال سنو کہ جب عیسیٰ علیہ السلام معجزے اور ہدیٰ لے کر آئے، اُن کی نبوت اور معجزات پر حسد کیا، وہ اندھے اور برص والے کو اچھا کرتے اور مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ مٹی سے ایک پرندہ بنا کر روح پھونکتے تو اُس کا اُڑنا سب لوگ دیکھتے۔ اس کے سوا اور بہت سے معجزات تھے، اس کے باوجود وہ عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف ہوگئے، جہاں تک ہو سکا اُن کو ستایا، یہاں تک کہ شہر میں ان کا رہنا مشکل ہوگیا۔ اکثر وہ اور اُن کی ماں سیاحت کرتی پھرتیں، اس پر بھی قناعت نہ کی، جو اُس زمانے میں دمشق کا بادشاہ تھا، اُس سے چغلی کی۔

وہ ایک مشرک ستارہ پرست تھا، اُس کی ملت والوں کو اہلِ یونان کہتے ہیں، اس کو یہ خبر پہنچائی کہ بیت المقدس میں ایک آدمی لوگوں کو گمراہ کرتا اور فتنے میں ڈالتا ہے۔ رعایا کو بادشاہ پر بھڑکاتا ہے۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا، قدس میں اپنے نائب کو لکھا کہ اس آدمی کی احتیاط رکھو، بلکہ اس کو سولی پر چڑھا دو، اس کے سر پر کانٹے لگاؤ، لوگوں کو اس کی ایذا سے بچاؤ۔ جب وہ خط اس کے پاس پہنچا، وہ حکم بجا لایا اور یہود کے ایک گروہ کے ساتھ اُس گھر پر گیا، جس میں عیسیٰ علیہ السلام تھے، وہ بارہ یا تیرہ یا سترہ اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے، جمعے کا دن تھا، عصر کے بعد شبِ شنبہ کو محاصرہ کر لیا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یا وہ اندر گھسیں گے یا مجھ کو باہر نکلنا ہوگا۔

اپنے اصحاب سے کہا کہ تم میں سے کون ہے، جس پر میری صورت ڈالی جائے اور وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا؟ ان میں سے ایک جوان نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ اُس کی بات کو چھوٹا سمجھ کر پھر دوبارہ اور تیسری بار یوں ہی فرمایا، ہر بار وہی جوان اس کام کے لیے تیار ہو جاتا تھا، فرمایا: تو ہی ہے وہ۔ تب اللہ نے اس پر عیسیٰ علیہ السلام کا شِبہ ڈالا، گویا بعینہٖ عیسیٰ ہے۔ پھر گھر کی چھت میں ایک سوراخ کھل گیا، عیسیٰ علیہ السلام کو اونگھ آگئی، آسمان پر اُٹھا لیے گئے اور وہ اُسی اونگھ میں تھے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴾ [آل عمران: ٥٥] ''جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے پورا لے لوں گا اور اپنی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٠٩)

طرف اُٹھالوں گا اور ان کافروں سے تجھے پاک کر دوں گا، اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی، انھیں کافروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا، پھر تمھیں میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور میں تمھارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔''

جب وہ مرفوع ہوگئے (اوپر اٹھا لیے گئے) تو وہ لوگ گھر سے باہر نکلے، جب اُس نوجوان کو دیکھا، گمان کیا کہ عیسیٰ وہی ہے پکڑ کر رات کو ہی سولی پر کھینچ دیا، سر پر کانٹے رکھے۔ یہود نے ظاہر کیا کہ سولی دینے کی کوشش کرنے والے ہم ہیں۔ نصاریٰ کی جماعت نے اپنی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے اس بات کو مان لیا، سوائے ان لوگوں کے جو گھر کے اندر تھے اور جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اُٹھایا جانا دیکھا تھا، باقی نصاریٰ اسی گمان پر رہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا، جس طرح یہود نے گمان کیا، یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں کہ مریم علیہا السلام اس مصلوب کے نیچے بیٹھ کر روئیں اور اُس نے مریم سے باتیں کی۔ واللہ أعلم. یہ سب اللہ کا اپنے بندوں سے امتحان لینا ہے۔ اس میں کوئی حکمتِ بالغہ رکھی تھی۔

پھر اللہ نے حقیقتِ امر کو خوب کھول کر قرآن میں روشن کر دیا۔ فرمایا: ﴿ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ﴾ (آیتِ باب) یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ کو دیکھ کر گمان کیا کہ وہی عیسیٰ ہیں۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ﴾ (آیتِ باب) یعنی یہود و نصاریٰ دونوں شک میں پڑے، یہود کو دعویٰ قتل کا ہے، نصاریٰ نے اس دعوے کو قبول کر لیا ہے۔ غرضیکہ سب کے سب اسی حیرت و گمراہی اور شک و شبہے میں گرفتار ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی یقینِ کامل نہیں رکھتے۔ شک و توہم میں ہیں، بلکہ بات یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اُٹھا لیا۔ اللہ ہے عزیز، یعنی باز رکھنے والا، حکیم، یعنی صاحبِ حکمتِ بالغہ و حجتِ دامغہ و سلطانِ عظیم و امرِ قدیم۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھانا چاہا تو وہ باہر اپنے اصحاب کے پاس آئے، گھر میں حواریوں میں سے بارہ آدمی تھے، گھر میں ایک چشمہ تھا، اس میں سے نکلے، سر سے پانی ٹپکتا تھا، فرمایا: تم میں وہ آدمی ہے جو میرے ساتھ ایمان لانے کے بعد بارہ دفعہ کفر کرے گا۔ پھر کہا: تم میں کون ہے کہ اُس پر میرا شبہہ ڈالا جائے اور وہ میرے بجائے قتل ہو اور میرے درجے میں میرے ساتھ ہو؟ ایک نوعمر جوان جو سب میں کم عمر تھا کھڑا ہوگیا، فرمایا: بیٹھ جا، پھر وہی بات کہی، پھر وہی جوان کھڑا ہوگیا، کہا: بیٹھ جا، پھر اسی بات کا اعادہ کیا، وہی جوان کھڑا ہوگیا کہ میں ہوں۔ فرمایا: ''هُوَ أَنْتَ ذَاكَ'' اس پر عیسیٰ علیہ السلام کا شبہہ ڈالا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام گھر کے سوراخ میں سے آسمان کی طرف اُٹھا لیے گئے، اتنے میں یہود کے لوگ آئے، انھوں نے اس شبیہ کو پکڑ کر قتل کیا، پھر سولی پر چڑھایا۔ بعض نے اُن کے ساتھ بارہ دفعہ کفر کیا، اس کے بعد کہ وہ ایمان لا چکا تھا۔

پھر تین فرقے ہوگئے: ایک گروہ نے کہا کہ اللہ ہمارے درمیان تھا، جب تک اُس نے چاہا، پھر وہ آسمان پر

چڑھ گیا، اُن کو یعقوبیہ کہتے ہیں۔ دوسرے فرقے نے کہا کہ اللہ کا بیٹا ہمارے درمیان میں تھا، جب تک اُس نے چاہا، پھر اللہ نے اس کو اُٹھا لیا، ان کونسطوریہ کہتے ہیں۔ تیسرے گروہ نے کہا کہ اللہ کا بندہ اور رسول ہمارے بیچ میں تھا، جب تک اللہ نے چاہا، پھر اللہ نے اس کو اپنے پاس اُٹھا لیا، یہ لوگ مسلمان تھے، دونوں کافر فرقوں نے فرقہ مسلمہ پر چڑھائی کر کے مسلمہ کو قتل کیا، اس دن سے ہمیشہ اسلام پرانا پڑ گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو بھیجا۔ (رواہ ابن أبي حاتم) اس کی اسناد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تک صحیح ہے۔[1] (ورواہ النسائي بنحوہ)

اسی طرح بہت سے سلف نے ذکر کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا تھا: ''أَيُّكُمْ يُلْقَىٰ عَلَيْهِ شِبْهِي فَيُقْتَلُ مَكَانِي وَهُوَ رَفِيقِي فِي الْجَنَّةِ؟'' بعض روایات میں مروی ہے کہ وہ شخص جس پر عیسیٰ علیہ السلام کا شبہہ ڈالا گیا ہے، اُس کا نام سرجس تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک مرد کو عیسیٰ علیہ السلام کے شبہہ میں سولی دی، اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھا لیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے جس کو اختیار کیا، وہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا شبہہ سارے اصحاب پر ڈالا گیا تھا۔[2]

﴿لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ کی تفسیر:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت: ﴿لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ کے معنی میں اہلِ تاویل کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد عیسیٰ علیہ السلام کی موت ہے، یعنی سارے یہود ان کی تصدیق کریں گے، جب کہ وہ دجال کو قتل کرنے کے لیے اُتریں گے، اس وقت ساری ملتیں ایک ہو جائیں گی، یعنی ملتِ اسلام دینِ ابراہیم علیہ السلام ہوگی۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو کوئی اہلِ کتاب باقی نہ رہے گا کہ وہ اُن پر ایمان نہ لائے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد خاص یہودی ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نجاشی اور اس کے یار ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام اب تک اللہ کے پاس زندہ ہیں، جب اُتریں گے، سب لوگ ان پر ایمان لائیں گے۔ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ قیامت سے پہلے اُن پر ہر نیک و بد ایمان لائے گا۔[4] یہی امام قتادہ، عبدالرحمٰن بن زید اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ کا قول ہے۔ یہی قول حق ہے۔ اس کا بیان قطعی دلیل کے ساتھ عن قریب آئے گا۔ إن شاء اللّٰہ تعالیٰ.

دوسرا قول یہ ہے کہ کتابی کی موت ہے، یعنی ہر یہودی و نصرانی مرنے سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر مرے گا، اس لیے کہ جس کی موت آتی ہے، اُس کی جان نہیں نکلتی، یہاں تک کہ دین کا حق و باطل اس پر کھل جاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نہیں مرتا کوئی یہودی یہاں تک کہ ایمان لاتا ہے عیسیٰ علیہ السلام پر۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر صاحبِ کتاب اپنے مرنے سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا

---

[1] سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٤٨٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١١٠) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٩/ ٣٧٤)

[3] تفسیر الطبري (٩/ ٣٧٩۔ ٣٨٠) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١١٢۔ ١١١٣)

ہے کہ اگر اس کی گردن بھی ماری جائے، تب بھی اس کی جان نہ نکلے گی، جب تک کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے گا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ یہودی نہیں مرتا، یہاں تک کہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ عیسیٰ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، اگرچہ اس کو تہہ تیغ کیا جائے۔ تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ « قراءة أُبَيٍّ قَبْلَ مَوْتِهِمْ » ہے۔ کوئی یہودی نہ مرے گا، یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے کہا: بھلا اگر وہ چھت کے اوپر سے گر پڑے؟ کہا کہ ہوا میں اُس کے ساتھ کلام کریگا۔ کہا: بھلا اگر اس کی گردن ماریں؟ کہا: اس کی زبان حرکت کرے گی شہادت کے ساتھ۔

روایت کے چوتھے الفاظ یہ ہیں: « لَا يَمُوتُ يَهُودِيٌّ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِعِيسٰى وَإِنْ ضُرِبَ بِالسَّيْفِ تَكَلَّمَ بِهٖ، قَالَ: وَإِنْ هَوٰى تَكَلَّمَ بِهٖ وَهُوَ يَهْوِيْ » ان سب آثار کی سند سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تک صحیح ہے۔ اسی طرح یہ قول امام مجاہد، عکرمہ، ابن سیرین، ضحاک، جویبر، اور سدی رحمہم اللہ سے بھی صحت کو پہنچا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: "لَا يَمُوتُ أَحَدٌ مِّنْهُمْ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِعِيسٰى قَبْلَ أَنْ يَّمُوتَ" اس کے معنی دونوں طرح پر ہوتے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک تیسرا قول یہ ہے کہ "لَيُؤْمِنَنَّ بِمُحَمَّدٍ ﷺ قَبْلَ مَوْتِ الْكِتَابِيِّ" امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں مرتا کوئی نصرانی اور نہ یہودی جب تک کہ ایمان نہ لائے محمد ﷺ پر۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحت کے لحاظ سے ان اقوال میں سب سے بہتر پہلا قول ہے کہ نہ باقی رہے گا اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد، مگر وہ اُن پر موت سے پہلے ایمان لائے گا۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی، بے شک صحیح ہے، کیوں کہ آیات کی ترکیب کا مقصد یہی ہے کہ یہود کا دعویٰ کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا تھا اور نصاریٰ کا جہالت کی بنا پر اس کو تسلیم کرنا بالکل باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ بات یوں نہ تھی یہود کو شبہ لگا، اُس شبے کو اُنھوں نے قتل کیا، یہ راز اُن پر نہ کھلا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان (عیسیٰ علیہ السلام) کو اُٹھا لیا، وہ اب تک باقی اور زندہ ہیں اور عن قریب قیامت سے پہلے زمین پر اُتریں گے، جس طرح کہ حدیث متواتر سے ثابت ہے، جس کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔ لہٰذا وہ اتر کر ضلالت کو دور کریں گے، صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ نہ لیں گے، اسلام قبول کرائیں گے یا تلوار سے خون بہائیں گے۔

پس اس آیتِ کریمہ نے خبر دی ہے کہ اُس وقت سارے اہلِ کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے، کوئی ایک اہلِ کتاب بھی اُن کی تصدیق کرنے سے پیچھے نہیں رہے گا۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ... الخ ﴾ (آیتِ باب) لہٰذا یہ وہی مسیح ہوں گے جو یہود کے خیال اور نصاریٰ کے تسلیم کرنے کے مطابق مصلوب اور مقتول ہو چکے ہیں، قیامت میں اُن لوگوں کے اعمال کے گواہ ہوں گے، جن کو رفع سے پہلے اور نزول کے بعد مشاہدہ کیا ہے۔

[1] تفسير الطبري (٩/ ٣٨٢۔ ٣٨٦)

باقی رہا یہ قول کہ کتابی کی موت سے مراد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام یا محمد ﷺ پر ایمان لائے بغیر نہیں مرے گا۔ لہٰذا یہ بات صحیح اور واقع کے مطابق ہے، اس طرح پر کہ موت کے حاضر ہوجانے کے وقت ہر کسی پر وہ بات بھی کھل جاتی ہے، جس کو وہ نہیں جانتا تھا، اُس سے جاہل تھا، اس وقت اس امر کی تصدیق کرتا ہے، لیکن ایسا ایمان کچھ نفع نہیں دیتا، جب کہ فرشتے کو دیکھ لیا، جس طرح کہ اللہ نے اس سورت کے شروع میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ ﴾ [النساء: ١٨] ''اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برے کام کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے تو وہ کہتا ہے: بے شک اب میں نے توبہ کی۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ﴾ [المؤمن: ٨٤] ''چنانچہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے۔''

اس تقریر سے امام ابن جریر رحمہ اللہ کی جو حجت اس قول کے رد میں تھی، ضعیف ٹھہر گئی کہ اس ایمان سے کچھ وہ مسلمان نہیں ہوجاتا نہ اس حالت کا ایمان اُس کو کفر سے منتقل کرتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بہت غور وفکر کرنے اور گہری نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ واقعی بات یوں ہی ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیت سے یہی امر مراد ہو، بلکہ مراد وہی ہے، جو ہم نے ذکر کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قیامت سے پہلے زمین پر اُتریں گے، تاکہ یہود و نصاریٰ دونوں کو جھٹلا دیں، کیوں کہ مسیح علیہ السلام کے حق میں ان کے اقوال ایک دوسرے سے جدا ایک دوسرے سے متصادم، برعکس اور ایک دوسرے کو توڑنے والے اور حق اور صحت سے خالی ہیں۔ یہود نے وہاں تفریط کی اور نقص نکالے کہ ان کی والدہ ماجدہ پر تہمت لگائی۔ نصاریٰ نے وہاں تک افراط کی کہ جو بات اُن میں نہ تھی، اُس کا ان کے حق میں دعویٰ کیا۔ جتنا یہود نے اُن کو گھٹایا تھا، اتنا ہی نصاریٰ نے ان کو بڑھایا، مقامِ نبوت سے مقامِ ربوبیت تک پہنچا دیا۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ عُلُوًّا كَبِيْرًا وَتَنَزَّهَ وَتَقَدَّسَ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ.[1]

قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا:

عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت سے پہلے اس دنیا کے آخری زمانے میں زمین پر نازل ہونا، تاکہ لوگوں کو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی طرف دعوت دیں، احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب ذکر الانبیا میں اپنی صحیح جامع سے، جو عام لوگوں میں قبولیت کا درجہ رکھتی ہے، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: « وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ! لَيُوْشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيْكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا، فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ، وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ، وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ، وَيَفِيْضُ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ أَحَدٌ حَتّٰى يَكُوْنَ

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٥٦۔ ٧٥٧)

السَّجدَةُ خَيراً لَّهُ مِنَ الدُّنيَا وَمَا فِيهَا﴾ پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تمھارا جی چاہے تو تم یہ آیت پڑھو:
﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾[1] (وكذا رواه مسلم وأخرجاه أيضاً من طريق أخرى ورواه ابن مردويه بلفظ: ”يَقْتُلُ الدَّجَّالَ وَتَكُوْنُ السَّجْدَةُ وَاحِدَةً لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)[2]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عیسیٰ بن مریم روحا کی گھاٹی میں لوگوں کو حج یا عمرہ یا دونوں کا اہلال کریں گے (پکاریں گے)۔[3] (رواه أحمد وكذا مسلم) تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اُتریں گے اور سور کو قتل کریں گے، صلیب کو مٹا دیں گے، ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی۔ مال دیں گے، یہاں تک کہ کوئی نہ لے گا۔ جزیہ موقوف کر دیں گے۔ روحا میں اُتریں گے، وہاں سے حج کریں گے یا عمرہ یا دونوں جمع کریں گے۔ پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی۔

حنظلہ رحمہ اللہ نے خیال کیا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یوں کہا ہے: ”يُؤْمِنُ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِ عِيسٰى“ میں نہیں جانتا کہ یہ سب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سے ہے یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔[4] (رواه أحمد و ابن أبي حاتم) صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اس طرح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «كَيْفَ بِكُمْ إِذَا نَزَلَ فِيكُمُ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَإِمَامُكُمْ مِّنْكُمْ»[5] (وهكذا رواه أحمد)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح دیے ہیں کہ انبیا برادر علات ہیں، مائیں ان کی الگ الگ ہیں، دین ان کا ایک ہے اور میں لوگوں کا عیسیٰ بن مریم کے ساتھ سب سے قریبی ہوں کہ میرے اور اُن کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا اور وہ اُترنے والے ہیں، سو جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لو، وہ ایک میانہ قامت مرد ہیں، سرخ و سفید، ان پر دو گیروے کپڑے ہوں گے، گویا ان کا سر قطرہ ریز ہے، اگرچہ ان کو نمی نہیں پہنچی، وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ نہ لیں گے، لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں گے۔ ان کے زمانے میں اللہ ساری ملتوں کو ہلاک کرے گا، سوائے اسلام کے اور ہلاک کرے گا اللہ ان کے زمانے میں مسیح دجال کو۔

پھر زمین امن کا گہوارہ بن جائے گی، یہاں تک کہ شیر اونٹوں کے ساتھ چریں گے، چیتے گائیوں کے ساتھ،

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٥)

(2) مسند البزار (١٦/ ١١) الدر المنثور (٢/ ٧٣٥) اس کی سند حسن ہے۔

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٥٢) مسند أحمد (٢/ ٢٧٢)

(4) مسند أحمد (٢/ ٢٩٠) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١١٣) اس کی سند میں ”سفیان بن حسین عن الزہری“ ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ صحیحین کی روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦٥) مسند أحمد (٢/ ٣٣٦)

بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چریں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے اور وہ ان کو کچھ ضرر نہ پہنچائیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام چالیس برس ٹھہریں گے، پھر وفات پائیں گے، مسلمان اُن کا جنازہ پڑھیں گے۔ (وكذا رواه أبو داود) **ابن جریر** رحمہ اللہ نے اس حدیث کے سوا کوئی اور حدیث آیتِ باب کے تحت نہیں لکھی۔ پھر کہا کہ اُس دن لوگ اسلام کے لیے جنگ کریں گے۔[1] صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے **مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں:**«أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَالْأَنْبِيَاءُ أَوْلَادُ عَلَّاتٍ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ» روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ»[2]

صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی، یہاں تک کہ اتریں روم یعنی نصاریٰ، اعماق یا وابق میں، ان کی طرف ایک لشکر مدینے سے نکلے گا، وہ اس دن اہلِ زمین میں سے بہترین ہوں گے، جس وقت صف کشی ہوگی، روم کہیں گے: ہم کو اور ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دو کہ ہم اُن سے مقاتلہ کریں۔ مسلمان کہیں گے: نہیں اللہ کی قسم! ہم تم کو اور اپنے بھائیوں کو نہ چھوڑیں گے۔ پھر آپس میں جنگ ہوگی، ایک تہائی لشکر شکست کھائے گا، اللہ کبھی ان کی توبہ قبول نہ کرے گا، ایک تہائی لڑے گا، وہ افضل شہداء ہوں گے اللہ کے نزدیک، ایک تہائی فتح یاب ہوگا، وہ کبھی فتنے میں نہ پڑیں گے، قسطنطنیہ کو فتح کرلیں گے، اس دوران کہ وہ مالِ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے، اپنی تلواریں انھوں نے زیتون کے درخت سے لٹکائی ہوں گی کہ یکایک ان میں شیطان چلائے گا کہ مسیح، یعنی دجال تمھارے پیچھے اہل وعیال میں آ گیا ہے، وہ باہر نکل کھڑے ہوں گے، یہ خبر غلط ہوگی، جب شام میں آئیں گے تو اس وقت دجال نکلے گا، پھر اسی دوران کہ وہ لڑنے کے لیے دوڑتے ہوں گے اور صفیں برابر کرتے ہوں گے کہ نماز کی اقامت کہی جائے گی، عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اُتر کر ان کی امامت کریں گے، جب اللہ کا دشمن دجال ان کو دیکھے گا تو ایسے گھل جائے گا، جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے، اگر وہ اس کو چھوڑ دیں گے تو گھل کر ہلاک ہو جائے، لیکن اللہ اس کو ان کے ہاتھ پر قتل کرے گا، وہ اُس کا خون اپنے ہتھیار میں لے کر لوگوں کو دکھائیں گے۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ صحیحین وسنن ومسند احمد سے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور خروج وقتلِ دجال کے بارے میں احادیث اور دس آیات قیامِ قیامت کے متعلق ذکر کر کے کہا ہے کہ یہ حدیثیں متواتر ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے ان کو روایت کیا ہے، ان میں عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کا طریقہ اور جگہ کے تعین کی دلیل ہے کہ وہ شام، بلکہ دمشق ہے اور وہ مشرقی مینارے کے نزدیک اُتریں گے اور اُن کا یہ اُترنا فجر کی نماز کے وقت ہوگا۔ اس زمانے میں ۷۴۱ھ سن سات سو اکتالیس میں جامع اموی کا ایک منارہ جو سفید پتھر تراش کر بنایا گیا اور وہ اُس

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢٤) مسند أحمد (٢/ ٤٠٦) تفسير الطبري (٩/ ٣٨٨۔ ٣٨٩) السلسلة الصحيحة (٢١٨٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٨۔ ٣٢٥٩) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٩٧)

منارے کی جگہ ہے، جو نصاریٰ نے آگ لگا کر منہدم کر دیا تھا۔ عَلَيهِمْ لَعَائِنُ اللهِ الْمُتَتَابِعَةُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ.

اور اس کی اکثر عمارت انھیں کے اموال سے تیار ہوئی ہے۔ قوی گمان ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا نزول اسی منارے پر ہو اور وہ اتر کر خنزیر کو قتل کریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے، اسلام کے سوا کچھ قبول نہ فرمائیں گے، جیسے صحیحین کی روایت سے اوپر گزرا۔ یہ خبر مخبر صادق ﷺ کی ہے، یہ انھی کی اس بات پر تقریر و تشریع و تسویغ ہے کہ اُس زمانے میں جبکہ ساری علتیں دور ہو جائیں گی، سارے شبہے اُٹھ جائیں گے، سب کے سب دین اسلام میں داخل ہو کر عیسیٰ علیہ السلام کے متابع ہو جائیں گے، ان کے ہاتھ پر اسلام لائیں گے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ﴾ یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ﴾ [الزخرف: ٦١] ''اور بے شک وہ (عیسیٰ) قیامت کی ایک نشانی ہے۔'' اس کو ''لَعَلَمٌ'' بہ تحریک بھی پڑھا ہے، یعنی عیسیٰ قیامت کی نشانی ہیں اور قیامت کے نزدیک آنے کی دلیل ہیں۔ اس لیے کہ ان کا نزول مسیح دجال کے ظاہر ہو جانے کے بعد ہوگا، اللہ دجال کو ان کے ہاتھ پر قتل کرے گا۔

صحیح میں مروی ہے کہ اللہ ان کے زمانے میں یاجوج ماجوج کو اُٹھائے گا، پھر ان کو عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ہلاک کرے گا[1] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٦۔ ٩٧] ''حتی کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے تیزی سے (دوڑتے) آئیں گے۔ اور سچا وعدہ (یوم قیامت) قریب آ پہنچے گا، تب کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، (اور وہ کہیں گے:) ہائے ہماری کم بختی! ہم اس (وعدے) سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم ہی ظالم تھے۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا کلام ختم ہوا۔[2] اب سنہ تیرہ سو تین آ گئے،[3] مسیح علیہ السلام نے اب تک نزول نہیں فرمایا، اہل اسلام چشم درراہ، گوش بر آواز ہو رہے ہیں، اللہ کرے کہ جلد آ جائیں، یہ جھگڑا ختم ہو، کیوں کہ اسلام کا آفتاب اب بر لب بام رہ گیا ہے۔

اس جگہ پر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کی صفت کی احادیث لکھی ہیں،[4] ہم ان کا اس جگہ پر اس لیے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتے کہ اس سے کلام طویل ہو جائے گا۔ کتاب ''حجج الكرامة و إشاعة واقترب الساعة'' میں وہ احادیث، جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مذکور ہیں۔ اس قدر معلوم کرنا کافی ہے کہ وہ نازل ہونے کے بعد زمین میں چالیس برس رہیں گے۔ صحیح مسلم میں ایک روایت سات برس کی آئی ہے۔[5]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٣٧)
[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٥٧۔ ٧٦٤)
[3] یہ نواب صاحب رحمہ اللہ نے تفسیر لکھتے وقت لکھا تھا۔ اب اس پر مزید ١٣٥ سال گزر گئے ہیں۔ یہ حاشیہ ١٤٣٨ھ میں لکھا جا رہا ہے۔ [ص۔ ی]
[4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٦٤)
[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٤٠)

احتمال ہے کہ اس مدت سے ان کی کل اقامت یعنی بعد نزول اور قبل رفع الی السماء کے مراد ہو، اس لیے کہ رفع کے وقت ان کی عمر تینتیس (۳۳) سال تھی۔[1] جس طرح صحیح میں آیا ہے اور حدیث صفتِ اہلِ جنت میں وارد ہوا ہے کہ وہ صورتِ آدم علیہ السلام اور میلادِ عیسیٰ پر تینتیس (۳۳) سالہ ہوں گے۔[2] حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ بعض نے کہا کہ وہ ایک سو پچاس برس کی عمر پائیں گے، شاذ اور غریب بعید ہے۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے یہ بھی اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ بعض سلف نے کہا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دفن ہوں گے۔[3] واللہ أعلم.

عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی:

یہ جو فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان پر گواہ ہوں گے۔ سو قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انھوں نے اللہ کی رسالت ان کو پہنچا دی۔ عبودیت کا اقرار کریں گے[4] اور یہ سورۃ المائدہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ [المائدۃ: ۱۱۶] ''اور جب اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟ تو وہ کہیں گے: تو پاک ہے، میرے لیے (جائز) نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہو تو یقیناً تو اُسے جانتا ہے۔ تو اسے بھی جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا، جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔ بے شک تو ہی سب سے بڑھ کر غیب کو جاننے والا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ فرماتا ہے، جب انھوں نے عہد توڑا، اللہ کی آیتوں سے انکار کیا، پیغمبروں کو قتل کیا، اپنے دل کو غلاف میں بتایا تو اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، اب ان میں تھوڑے لوگ ایمان لاتے ہیں۔ پھر انھوں نے مسیح کا انکار کیا، مریم پر بہتان باندھا، عیسیٰ کے قتل کے قائل ہوئے، حالاں کہ ان کا مار ڈالنا بالکل غلط ہے، جس کو مارا، وہ شبیہ عیسیٰ تھا نہ کہ خود عیسیٰ۔ یہ قصہ کئی طریق سے مختلف الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔ عبد بن حمید و ابن جریر و ابن منذر رحمہ اللہ نے اُس کو انجیل کی ترتیب کے قریب ذکر کیا ہے۔ نصاریٰ اب تک اسی شبہے میں پڑے ہیں، کوئی کچھ

---

[1] تاریخ دمشق (٤٧/ ٤٨٤) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف ہے۔

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٩٥) صحیح الترغیب والترھیب (٣/ ٢٥٦) البتہ اس میں تینتیس سال کا تو ذکر ہے، لیکن میلادِ عیسیٰ کا ذکر نہیں ہے۔ نیز اہلِ جنت کا صورتِ آدم پر ہونا صحیح بخاری (۳۱۴۸) اور صحیح مسلم (۲۸۴۱) میں بھی مروی ہے۔

[3] تاریخ دمشق (٤٧/ ٥٢٣) اس موضوع میں کوئی بھی روایت صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ [4] تفسیر الطبري (٩/ ٣٩٠)

کہتا ہے، کوئی کچھ ہانکتا ہے۔ سو وہ شک محض ان کا خیالِ خام اور اتباعِ گمان ہے۔ ان کو تو اللہ نے آسمان پر بلا لیا۔ جامع صغیر میں تیسرا آسمان بتایا ہے۔ (1) بعض روایات میں دوسرا آسمان آیا ہے۔ (2)

﴿قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ میں مرجع ضمیر میں اختلاف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت مراد ہے یا موتِ کتابی یا دونوں ضمیر عیسیٰ کی طرف راجع ہیں، یعنی عیسیٰ علیہ السلام نہ مریں گے، یہاں تک کہ ہر کتابی جو اُن کے زمانے میں ہوگا، وہ ان پر ایمان لے آئے۔ یا پہلی ضمیر اللہ کی طرف ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے یوں ہی کہا ہے، (3) لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت سے پہلے ذکر نہیں ہوا کہ ضمیر آپ کی طرف پھرے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ مرجع ضمیر جناب مسیح علیہ السلام ہیں۔ (4) یہی ایک جماعت سلف کا قول ہے اور یہی ظاہر بھی ہے۔ یہ ایمان اُس وقت لائیں گے، جب ملک الموت کو دیکھ لیں گے، مگر کیا فائدہ۔ امام شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا کہ یہودی کو جب موت آتی ہے، فرشتے اس کے منہ اور پیٹھ کو مارتے ہیں، کہتے ہیں: اے اللہ کے دشمن! تیرے پاس عیسیٰ علیہ السلام نبی ہو کر آئے تھے تو نے اُن کو جھٹلایا اُس وقت وہ کہتا ہے کہ میں ایمان لایا کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اسی طرح نصرانی سے کہتے ہیں کہ عیسیٰ نبی ہو کر آئے تھے، تو نے گمان کیا کہ وہ اللہ اور اللہ کے بیٹے ہیں۔ وہ کہتا ہے: میں ایمان لایا کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، سو اس وقت اہلِ کتاب کا اس طرح ایمان لانا بے فائدہ ہوتا ہے (5) یا مراد آخر وقت میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ایمان لانا ہے، جس طرح احادیث میں مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو اتارے جانے کے وقت پالیں گے۔ (6) پھر اللہ نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام ان پر قیامت کے دن گواہ ہوں گے۔ یعنی یہودیوں کی تکذیب اور نصاریٰ کا غلو (حد سے بڑھ جانا) بیان کریں گے۔ (7)

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ
وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿١٦٠﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا
عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٦١﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

(1) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٧) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٤٨٥)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤)

(3) تفسير الطبري (٩/ ٣٨٦) (4) تفسير الطبري (٩/ ٣٨٦) (5) تفسير الكشاف (١/ ٦٢١)

(6) تفسير البطري (٩/ ٣٨١) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ (7) فتح البيان (٣/ ٢٨٧_ ٢٩٣)

وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

پھر جو لوگ یہودی ہوئے ان کے ظلم کی وجہ سے اور ان کے، اکثر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے ہم نے ان پر کچھ پاک چیزیں حرام کر دیں، جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں (160) اور اس وجہ سے بھی کہ وہ سود لیتے تھے، حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے۔ اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے (161) لیکن ان میں سے جو علم میں پختہ اور مومن ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا، اور وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، وہی لوگ ہیں جنھیں ہم جلد بہت بڑا اجر دیں گے (162)

یہود کے ظلم کی وجہ سے ان پر بعض طیبات کا حرام ہونا:

یعنی اوپر سے جو ان کی سب شرارتیں ذکر کیں، کچھ پہلے ہوئیں اور کچھ بعد میں، لیکن مجمل یہ کہ گناہ پر دلیر تھے، اس لیے ان کے واسطے شریعت سخت رکھی کہ سرکشی ٹوٹے۔ اللہ پاک نے اس آیت میں یہود کے ظلم کی خبر دی ہے کہ وہ بڑے بڑے گناہ کیا کرتے تھے، اس لیے ہم نے ان پر حلال کو حرام کر دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت یہ ہے: ”طَيِّبٰتٍ كَانَتْ اُحِلَّتْ لَهُمْ“ [1]

یہ تحریم یا تو قدری تھی، کتاب میں تحریف اور تبدیلی کر دی، جو چیزیں اس شریعت میں حلال تھیں، وہ ان کی اس تحریف اور تبدیلی کی وجہ سے حرام ہوگئیں۔ انھوں نے اپنی جان پر آپ ہی تشدید اور تنگی اور تنطع کیا۔ یا شرعی تھی کہ اللہ نے تورات میں ان پر حرام کر دی، جو پہلے حلال تھیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ﴾ [آل عمران: ۹۳] ”بنی اسرائیل کے لیے تمام کھانے حلال تھے سوائے ان چیزوں کے جنھیں تورات نازل ہونے سے پہلے یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔“ یعنی ان کے سوا جو اسرائیل نے تورات سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لی، جیسے: اونٹوں کا گوشت اور دودھ۔

پھر اللہ نے تورات میں بہت سی چیزیں حرام کر دیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۫ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٤٦] ”اور جو لوگ یہودی ہوئے ان پر ہم نے ہر ناخن والا (جانور) حرام کیا تھا، اور گائے اور بکری میں سے ان پر ان کی چربی حرام کی تھی، سوائے اس چربی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١١٤) اس کی سند صحیح ہے۔

کے جو ان کی پیٹھوں یا آنتوں کے ساتھ لگی ہو یا ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، یہ سزا ہم نے انھیں ان کی سرکشی کے باعث دی تھی اور بے شک ہم سچے ہیں۔'' یعنی ان چیزوں کو اس لیے ان پر حرام کیا کہ وہ بسبب سرکشی، بغاوت، رسولوں کی مخالفت اور باہمی اختلاف کے اس تحریم کے مستحق تھے، اس لیے اس جگہ یوں کہا کہ ان کے ظلم کی وجہ سے یہ ہوا۔ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور خود بھی حق کی اتباع سے باز رہتے تھے۔

یہ خصلت یہود کی پرانی عادت ہے، قدیم زمانے سے لے کر اب تک ان میں یہ صفت چلی آتی ہے، اسی لیے اللہ کے رسولوں کے دشمن بن گئے۔ انبیا میں سے ایک مخلوق کو مار ڈالا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا۔ نبی کریم ﷺ کی تکذیب کی۔ ان کو سود سے بھی منع کیا گیا تھا، لیکن خوب سود کھایا، لیا دیا۔ طرح طرح کے حیلے نکالے، شبہے پیدا کیے۔ لوگوں کا مال ناحق کھا گئے، ہاں جو لوگ ان میں راسخ العلم ہیں، وہ ایمان لائے ہیں، وہ لوگ اجر پائیں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے حق میں اُتری ہے، وہ اور ثعلبہ بن سعید و زید بن سعید و اسید بن عبید داخل اسلام ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کی تصدیق کی۔[1] سارے مصاحف میں مقیمین ہی ہے۔ مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ میں بھی اسی طرح ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مگر مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں "مُقِيمُونَ" ہے۔ پھر کہا ہے کہ صحیح قراءت جمیع ہے۔ پھر جس نے کہا ہے کہ وہ کاتب کی غلطی ہے، اس کی تردید کی ہے۔

پھر لوگوں کے اختلاف کا ذکر کیا۔ بعض نے کہا کہ "نصب على المدح" کلامِ عرب میں درست ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں آیا ہے: ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ [البقرۃ: ۱۷۷] ''اور (نیکی ان کی بھی ہے جو) جب عہد کرلیں تو اپنا عہد پورا کریں اور تنگ دستی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کریں۔'' دوسروں نے کہا: مجرور ہے، اس لیے کہ معطوف ہے۔ "بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" پر یعنی "وَبِالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةِ" گویا یوں کہا: "وَبِإِقَامَةِ الصَّلَاةِ" یعنی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وجوبِ نماز کے ساتھ "مُقِيمِينَ الصَّلَاةَ" سے مراد فرشتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے،[2] مگر اس میں نظر ہے۔ زکات سے مراد اموال یا نفوس کی یا دونوں کی زکات ہے۔ پھر فرمایا کہ موت کے بعد اُٹھائے جانے کی تصدیق کرتے ہیں، خواہ اعمال اچھے ہوں یا بُرے۔ سو ایسے لوگوں کو جنت ملے گی۔

فتح البیان کی تقریر سنو کہ طیبات سے مراد وہ اشیا ہیں، جو سورت انعام میں مذکور ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ تحریم کس طرح ہوئی اور کب ہوئی اور کس کی زبان پر حرام ہوئی اور اس کی وجہ کیا تھی، اس لیے اس کا ذکر چھوڑ دیا۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ نے اس بات میں انصاف کیا، یہ آیت نہایت مشکل ہے۔[3] اسی لیے رازی اور شوکانی رحمہ اللہ نے بھی ظلم کے معنی میں مفسرین کے اقوال کو چھوڑ دیا، مجملاً یہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١١٦) [2] تفسير الطبري (٩/ ٣٩٤۔ ٣٩٨) [3] تفسير الخازن (١/ ٦٢١)

کہہ دیا کہ جب وہ کسی معصیت کا ارتکاب کرتے تھے تو اللہ ان پر حلال کو حرام کرتا جاتا تھا، جو ان کے اسلاف پر درست تھا۔ یہ تحریم سزا کے طور پر تھی۔ (1)

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ وَإِسْحَـٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَـٰرُونَ وَسُلَيْمَـٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَـٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾

(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داود کو زبور عطا کی (163) اور ہم نے کئی رسول بھیجے، اس سے پہلے ہم ان کا حال آپ کے سامنے بیان کر چکے ہیں۔ اور کئی رسول ہیں کہ ان کا حال ہم نے آپ کے سامنے بیان نہیں کیا۔ اور اللہ نے موسیٰ سے (خاص طور پر) کلام کیا (164) اور خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھیجے، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کو الزام دینے کی کوئی گنجایش نہ رہے۔ اور اللہ بڑا زبردست، خوب حکمت والا ہے (165)

وحی کا تسلسل اور انبیا کی تعداد:

یعنی عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی معلوم ہوتی تو اس پر چلتے۔ یہ اللہ کی حکمت اور تدبیر ہے اور اگر زبردستی کرے تو اس کی حاجت نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سکین وعدی بن زید نے کہا: اے محمد! ہم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی بشر پر کچھ اُتارا ہو، اُس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔ (2) زبور اُس کتاب کا نام ہے، جس کی وحی داود علیہ السلام کو کی تھی۔

ان انبیا کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ سورت انبیا میں آئے گا، جن انبیا کا نام قرآن پاک میں آیا ہے، وہ یہ ہیں: آدم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، یوسف، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داود،

(1) فتح البیان (٣/ ٢٩٤) (2) تفسیر الطبري (٩/ ٤٠٠) اس کی سند حسن ہے۔

سلیمان، الیسع ، زکریا، ایوب، الیاس، عیسیٰ، یحییٰ اور ذوالکفل علیہم السلام۔ اکثر مفسرین کے نزدیک سب کے سردار محمد ﷺ ہیں۔ یہ سب نبی کریم ﷺ سمیت پچیس ہوئے۔ یہ وہ انبیا ہیں، جن کا قصہ بیان فرمایا۔ رہے وہ جن کا نام ونشان نہیں بتلایا، ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اسی لیے انبیا اور رسولوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس بارے میں مشہور وہ حدیث ہے، جس کو سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ابن مردویہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ اُس میں انبیا کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار آئی ہے۔ انھیں میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں۔

امام ابو حاتم ابن حبان لبستی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو کتاب الانواع والتقاسیم میں لاکر صحیح کی علامت لکھی ہے، مگر ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس کو موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ ابراہیم بن ہاشم پر وضع کرنے کی تہمت لگائی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ ائمہ جرح وتعدیل میں سے کئی ایک نے ابراہیم میں اس حدیث کی وجہ سے کلام کیا ہے،[1] یہ حدیث دوسرے صحابی سے ایک اور طرح آئی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اُس کو ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اس میں تین سو پندرہ جمِ غفیر بتائے ہیں، مگر اس کی سند میں معان بن رفاعہ سلامی وعلی بن یزید وقاسم بن عبدالرحمٰن ضعیف ہیں۔[2] تیسری حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ ہزار نبی بھیجے، چار ہزار بنی اسرائیل کی طرف اور چار ہزار باقی لوگوں کی طرف۔[3] (رواه أبو يعلىٰ)

اس کی سند میں ربذی ورقاشی دونوں ضعیف ہیں۔ یہ حدیث ابو یعلیٰ کے نزدیک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔ تیسرے طریق سے اس کو حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے لکھا ہے، اس میں بھی احمد بن طارق ضعیف ہے، اگرچہ اس کی سند کو "لا بأس به" کہا ہے۔ حدیث سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کو محمد بن حسین آجری رحمہ اللہ نے بھی سابق سے مطول تر روایت کیا ہے۔ اُس میں کتب کی تعداد ایک سو چار آئی ہے، ہر ایک نبی کے صحیفوں کی گنتی الگ الگ بتائی ہے۔ مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اُس پر جرحاً وتعدیلاً کچھ کلام نہیں کیا۔ امام احمد بھی سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ والی روایت کے راوی ہیں، مگر نہایت مختصر طور پر۔[4]

عبداللہ بن احمد رحمہ اللہ نے ابو سعید رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث دجال کے بارے میں روایت کی ہے، اُس میں یوں آیا ہے: «إِنِّي خَاتِمُ أَلْفِ نَبِيٍّ أَوْ أَكْثَرَ... الخ» ابو یعلیٰ کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: «إِنِّي أَخْتِمُ أَلْفَ أَلْفَ نَبِيٍّ أَوْ أَكْثَرَ»[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں لفظ الف مقحم ہوگا۔ والله أعلم. پھر کہا کہ امام احمد رحمہ اللہ

---

[1] صحیح ابن حبان (۲/ ۷۶) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۶۰۹۰) البتہ انبیا اور رسولوں کی تعداد صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۶۶۸)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (۴/ ۱۱۱۸) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۶۰۹۰)

[3] مسند أبي يعلىٰ (۷/ ۱۵۹) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۶۰۹۰)

[4] مسند أحمد (۵/ ۲۶۵) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۶۰۹۰)

[5] مسند أحمد (۳/ ۷۹) ان الفاظ کے ساتھ مسند ابی یعلیٰ میں روایت نہیں ملی ہے۔

کی ترکیب زیادہ ثابت اور صحت کے زیادہ قریب ہے۔ رجالِ اسناد اُس کے ”لَا بَأْسَ بِهِمْ“ ہیں۔ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اس طرح روایت کیا ہے: «إِنِّي لَخَاتِمُ أَلْفِ نَبِيٍّ أَوْ أَكْثَرَ»[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی سند پر بھی کچھ کلام نہیں کیا۔ واللہ أعلم.[2]

موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنا بطورِ عزت افزائی کے تھا، اس لیے ان کو کلیم کہتے ہیں۔ بعض معتزلہ نے بعض مشائخ پر یوں پڑھا: ”وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا“، انھوں نے کہا: اے حرام زادے! بھلا تو اس آیت میں کیا کرے گا: ﴿ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ﴾ [الأعراف: ١٤٣] ”اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت کے لیے آیا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا۔“ یعنی اس میں تو تحریف اور تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بات کی تھی، وہ ایک جبہ ایک کملی اور صوف کی ایک سراویل پہنے ہوئے تھے۔ ان کی پاپوش گدھے کے چمڑے کی تھی۔[3] (رواہ الحاکم وابن مردویہ)

موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی صفت کے بارے میں کئی حدیثیں مروی ہیں، مگر ان کی سند ضعیف ہے، بعض کعب احبار رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ”هُوَ يَحْكِي عَنْ كُتُبِ الْمُتَقَدِّمَةِ الْمُشْتَمِلَةِ عَلٰى أَخْبَارِ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَفِيهَا الْغَثُّ وَالسَّمِينُ“ ”وہ پہلی کتابوں سے لے کر بیان کرتے ہیں، جو بنو اسرائیل کی خبروں پر مشتمل ہیں، جن میں غث وسمین (صحیح وغلط) دونوں قسم کی چیزیں ہیں۔“ رسولوں کا کام یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے مطیع اور اللہ کی رضا کے متبع ہوتے ہیں، یہ اُن کو بھلائی کی خوشخبری سناتے ہیں اور جو لوگ اللہ کے احکام کے مخالف ہوتے ہیں اور رسول کی تکذیب کرنے والے ہوتے ہیں، یہ اُن کو سزا اور عذاب سے ڈراتے ہیں۔[4]

رسولوں اور کتابوں کی بعثت کا مقصد:

اللہ نے رسولوں اور کتابوں کو اسی لیے بھیجا ہے کہ کسی عذر کرنے والے کو عذر کی گنجایش باقی نہ رہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴾ [طٰهٰ: ١٣٤] ”اور اگر بلاشبہہ ہم انھیں اس (رسول) سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر

---

[1] كشف الأستار عن زوائد البزار (٤/ ١٣٥) اس اور گزشتہ روایت کی سند میں ”مجالد بن سعید“ ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٠٩٠)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٧٦٧۔ ٧٧٠)

[3] مستدرك الحاكم (١/ ٨١) اس کی سند میں ”حمید اعرج“ ضعیف راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، (١٢٤٠)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٧٧١)

دیتے تو وہ لوگ کہتے: اے ہمارے رب! تونے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری آیات کی پیروی کرتے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [القصص: ٤٧] ''اور اگر (یہ) نہ ہوتا کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اس کی وجہ سے انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے: اے ہمارے رب! تونے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا، پھر ہم تیری آیات کی اتباع کرتے اور ہم مومنوں میں سے ہو جاتے (تو ہم رسول نہ بھیجتے)۔''

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی اللہ سے زیادہ غیرت مند نہیں ہے، اسی لیے اُس نے فاحشات کو حرام کیا ہے، وہ کھلی ہوں یا چھپی اور اُس کو اللہ کی تعریف سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں، اسی لیے اُس نے اپنی تعریف خود کی ہے اور اُس سے زیادہ اُس کو دوست کوئی نہیں ہے، اُس سے جو اُس سے عذر کرے اور معافی مانگے، اسی لیے اُس نے انبیا کو خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ روایت کے دوسرے الفاظ اس طرح ہیں: «مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ أَرْسَلَ رُسُلَهُ وَأَنْزَلَ كُتُبَهُ»[1]

فتح البیان میں ہے کہ زبیر بن بکار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کسی نبی کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہے، سوائے نوح، ادریس، ہود، لوط اور صالح علیہم السلام کے اور عرب میں کل پانچ نبی ہوئے: ہود، صالح، اسماعیل، شعیب علیہم السلام اور محمد ﷺ۔ ان کو عرب اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے علاوہ اور کسی نے عربی میں بات چیت نہیں کی۔[2] (ذكره القرطبي)

اسباط اولادِ یعقوب کو کہتے ہیں، وہ بارہ شخص تھے، ان میں یوسف علیہ السلام تو بالاتفاق نبی ہیں باقی میں اختلاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان سب انبیا پر وحی بھیجی اور اے یہود! تم اعتراف کرتے ہو کہ وہ نبی تھے، مگر کسی ایک پر بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب پوری ایک بار میں نہیں اُتاری۔ سو جب یہ امر ان کی نبوت میں کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تو اگر قرآنِ مجید نبی اکرم ﷺ پر متفرق ہو کر اُترا تو یہ کیوں کر عیب ہو سکتا ہے، جس طرح ان سب پر وحی آتی تھی، اسی طرح خاتم انبیا پر بھی آئی۔ زبور میں ڈیڑھ سو سورتیں ہیں، ان میں نہ کوئی حکم ہے نہ حلال نہ حرام، یہی حکمتیں اور نصیحتیں ہیں۔

سورت سے مراد مزمور ہے، ہر مزمور ایک فصل ہے، جو کلامِ داود پر مشتمل ہے۔ اس میں اللہ سے اپنے دشمنوں کے خلاف فریاد کی ہے اور اُن پر بد دعا کی ہے اور مدد مانگی ہے۔ کبھی اس میں وعظ بھی کہہ دیا ہے۔ غالباً گرجے میں ان کو کہا کرتے تھے۔ تکلم کے وقت بعض آلات بھی ہوتے، جن کے نغمات اچھے معلوم ہوتے تھے۔ چناں چہ بہت سے مزمورات میں اس بات کی تصریح آئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کبھی تو دیکھتا مجھ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٠، ١٤٩٩) [2] تفسير القرطبي (١٦/٦)

کو آج کی رات اور میں تیرا پڑھنا سنتا تھا، تحقیق تو دیا گیا ہے مزامیر آلِ داود سے ایک مزمار۔[1] (أخرجه الشيخان) تکلیم سے یہ مراد ہے کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ کلام کیا۔ اس طرح کا کلام وحی کا انتہائی مرتبہ ہے۔[2] یہ خصوصیت انبیا میں آدم علیہ السلام کے بعد موسیٰ علیہ السلام ہی کو ملی ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝١٦٦ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝١٦٧ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝١٦٨
اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
يَسِيْرًا ۝١٦٩ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ
فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝١٧٠

لیکن اللہ نے آپ پر جو نازل کیا ہے، وہ اس کی بابت گواہی دیتا ہے کہ اس نے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ بطور گواہ کافی ہے (166) بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، یقیناً وہ دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں (167) بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کیا، اللہ کے شایان نہیں کہ وہ انھیں بخش دے اور نہ یہ شایان ہے کہ وہ انھیں سیدھی راہ دکھائے (168) مگر وہ انھیں جہنم کا راستہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے (169) اے لوگو! یقیناً یہ رسول تمھارے رب کی طرف سے حق لے کر تمھارے پاس آیا ہے، لہٰذا تم ایمان لاؤ، یہ تمھارے لیے بہتر ہوگا، اور اگر تم کفر کرو گے تو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ ہی کے لیے ہے، اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (170)

قرآن اللہ کا علم:

یعنی وحی ہر پیغمبر کو آتی رہی ہے، کچھ نیا کام نہیں ہے، پر اس کلام میں اللہ نے اپنا خاص علم اُتارا اور اللہ اس حق کو ظاہر کر دے گا۔ چناں چہ ظاہر ہوا کہ جس قدر ہدایت اس نبی سے ہوئی اور کسی سے نہ ہوئی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا: ہم خود گواہی دیتے ہیں کہ یہ ہمارا کلام ہے، جو ہم نے تم پر اُتارا ہے، گو تمھارے جھٹلانے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٣) [2] فتح البيان (٣/ ٢٩٨ـ ٣٠٠)

والے اور مخالف اس کا انکار کریں۔ اس کتاب میں اللہ کا علم ہے، بندوں کو مطلع کرنے کے لیے اس میں بیان اور ہدایت اور فرقان ہے۔ اللہ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کا ذکر ہے۔ ماضی اور مستقبل کی غیب کی باتوں کا حال ہے، اللہ کی صفتوں کا ذکر ہے، جس کو نہ کوئی نبی اور رسول جانتا تھا اور نہ ہی کوئی مقرب فرشتہ اس کا علم رکھتا تھا۔ سوائے اس کے جس کو اللہ نے سکھا دیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ”اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کو اپنے احاطے میں نہیں لا سکتے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴾ [طٰه: ١١٠] ”اور وہ (لوگ) اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔“

عطا بن سائب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھ کو ابوعبدالرحمٰن سلمی نے قرآنِ مجید پڑھایا، ان کی عادت تھی کہ جب کوئی ان سے قرآنِ مجید پڑھتا تو وہ یہ بات کہتے: ”قَدْ أَخَذْتَ عِلْمَ اللّٰهِ فَلَيْسَ أَحَدٌ الْيَوْمَ أَفْضَلَ مِنْكَ إِلَّا بِعَمَلٍ“ ”تو نے اللہ کا علم حاصل کیا ہے، پس آج تجھ سے زیادہ افضل کوئی نہیں، سوائے اس کے جو عمل کرنے والا ہو۔“ پھر یہ آیت پڑھتے: ﴿ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ وَكَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا ﴾[1] (آیتِ باب)۔

شہادتِ ملائکہ سے مراد یہ ہے کہ وہ تصدیق کرتے ہیں وحی کی جو تجھ پر اُتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہود کی ایک جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے کہا کہ واللہ! میں جانتا ہوں کہ تمھیں معلوم ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، انھوں نے کہا: ہم نہیں جانتے، اس پر یہ آیت اُتری۔[2] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے خود کفر کیا اور حق پر نہ چلے اور لوگوں کے گمراہ کرنے میں سعی کی، وہ سخت گمراہ ہیں، ان کو جہنم کی راہ کے سوا اور کوئی راہ نہ دی جائے گی۔ پھر کہا کہ اس حق پر جو تمھارے پاس آیا ہے، ایمان لاؤ، اگر نہ لاؤ گے تو اللہ کو کچھ پروا نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنْ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴾ [إبراهيم: ٨] ”اور موسیٰ نے کہا: اگر تم کفر کرو گے اور وہ سب لوگ بھی جو زمین میں ہیں تو بے شک اللہ بے پروا اور لائقِ تعریف ہے۔“[3]

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ ﴾ میں معتزلہ کے اس قول کی نفی ہے، جس میں انھوں نے اللہ کی صفات کا انکار کیا ہے۔ اس لیے کہ اس لفظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے علم کی صفت ثابت کی ہے۔ اللہ جب کسی بات کا شاہد ہوتا ہے تو فرشتے بھی اس کی شہادت دیتے ہیں، اگرچہ صرف اللہ ہی کی گواہی کافی ہے۔ اللہ کی شہادت یہی ہے کہ نبی کو معجزات بخشے، جن سے نبوت کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ ان معجزات کا وجود نبوت کے دعوے کی سچائی کا ثبوت ہے۔ ﴿ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ ﴾ سے مراد دینِ اسلام ہے یا قرآنِ کریم۔[4]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٢١)
[2] تفسیر الطبري (٩/ ٤٠٩) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٧٢۔ ٧٧٣)
[4] فتح البیان (٣/ ٣٠٤۔ ٣٠٦)

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ؗ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ۫ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۠ ﴿۱۷۱﴾

اے اہلِ کتاب! اپنے دین کے بارے میں حد سے نہ گزر جاؤ اور اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا کچھ نہ کہو۔ بے شک مسیح عیسیٰ ابن مریم تو اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہی ہے جسے اس نے مریم کی طرف ڈالا، اور وہ اس کی طرف سے ایک روح ہے، چناں چہ تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ معبود تین ہیں۔ اس سے باز آجاؤ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، بے شک اللہ ہی واحد معبود ہے، وہ اس (امر) سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور اللہ بطورِ کارساز کافی ہے ﴿۱۷۱﴾

عیسائیوں کو دین میں غلو اور عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھانے چڑھانے کی ممانعت:

یہ نصاریٰ کو خطاب ہے کہ اللہ کو تین جگہ بتاتے ہیں: باپ اور بیٹا اور روح القدس۔ فرمایا کہ دین کی بات میں مبالغہ عیب ہے، ایک شخص سے عقیدت ہو تو اس کی تعریف میں حد سے نہ بڑھے، جتنی بات حقیقت ہو وہی کہے اور فرمایا کہ فی الحقیقت بیٹا جنے، یہ اللہ کو لائق نہیں اور بیٹا کر لے تو اُس کو پیشکار کی حاجت نہیں، وہ بس ہے کام بنانے والا۔ اس آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کو حد سے بڑھنے کی ممانعت کی ہے۔

یہ بات نصاریٰ میں بہت ہے، کیوں کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں حد سے بڑھ گئے تھے۔ جو مرتبہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا، اس منزلت سے کہیں زیادہ ان کو اوپر چڑھا دیا۔ نبوت کے مقام سے منتقل کر کے الٰہ بنا دیا، پھر ان کو ایسا پوجا، جیسے اللہ کو پوجتے ہیں، بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کے اَتباع اور اشیاع (پیروکاروں) میں بھی یہاں تک غلو کیا کہ اُن کو معصوم سمجھ لیا، ہر بات میں ان کا اتباع کیا، خواہ وہ بات درست تھی یا باطل، گمراہی تھی یا صحیح، ہدایت تھی یا جھوٹ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ۳۱] ''انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور درویشوں کو (اپنا) رب بنا لیا۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: «لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ» (رواه أحمد) یعنی تم مجھ کو ویسا نہ بڑھاؤ، جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ کو

بڑھاپا، میں تو ایک بندہ ہوں، تم یہی کہو کہ اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔ علی بن المدینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح مسند ہے۔ (وهكذا رواه البخاري ولفظه: فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ)[1] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: "يَا مُحَمَّدُ، سَيِّدَنَا، وَابْنَ سَيِّدِنَا، وَخَيْرَنَا وَابْنَ خَيْرِنَا!" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَيُّهَا النَّاسُ، عَلَيْكُمْ بِقَوْلِكُمْ، وَلَا يَسْتَهْوِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ، أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ، وَاللّٰهِ، مَا أُحِبُّ أَنْ تَرْفَعُوْنِيْ فَوْقَ مَنْزِلَتِيَ الَّتِيْ أَنْزَلَنِيَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ»[2] (رواه أحمد وتفرد به)

عیسیٰ علیہ السلام مخلوق ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ پر افترا نہ کرو، اُس کے لیے جورو بیٹا نہ ٹھہراؤ، وہ اس سے پاک ہے، اپنی سیادت و کبریائی وعظمت میں اکیلا اور منفرد ہے۔ «لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ» اسی لیے یہ فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام تو مریم علیہا السلام کا بیٹا ہے، یعنی بندوں میں سے ایک بندہ ہے۔ ایک مخلوق ہے، جو لفظِ ﴿ كُنْ ﴾ سے موجود ہوگیا، ہاں رسول ہے، ایک کلمے سے، جس کو جبریل علیہ السلام مریم علیہا السلام کے پاس لائے تھے، پیدا ہوا ہے۔ مریم علیہا السلام کے اندر جبریل علیہ السلام نے اللہ کے اذن سے روح پھونک دی۔

سو عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے اذن سے ہوئے اور جبریل علیہ السلام کا نفخ مریم علیہا السلام کے پیرہن کی جیب میں تھا، وہ روح اتر کر فرج میں پہنچی، جیسے ماں باپ سے باردار ہوتی ہے اور یہ سب مخلوق ہے، اس لیے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ اور اس کی طرف کی روح کہتے ہیں، کیوں کہ ان کا کوئی باپ نہ تھا، جس سے وہ پیدا ہوئے، بلکہ ان کی نشو ونما اللہ کی بات سے ہوئی اور اُس روح سے جس کو جبریل علیہ السلام لائے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ﴾ [المائدة: ٧٥] "مسیح ابن مریم نہیں ہیں مگر ایک رسول ہی۔ بلاشبہہ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ (نہایت راستباز) تھی، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [آل عمران: ٥٩] "بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا، تو وہ ہوگیا۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩١] "اور اس عورت کو (یاد کریں) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تھی، پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی، اور اسے اور اس کے بیٹے (عیسیٰ) کو اہلِ عالم کے لیے (عظیم) نشانی بنا دیا۔"

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦١) مسند أحمد (١/ ٢٣)

[2] مسند أحمد (٣/ ١٥٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٩٧)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴾ [التحریم: ۱۲] ''(اور مثال بیان فرمائی) مریم بنت عمران کی، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس (کے گریبان) میں اپنی روح پھونکی، اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی۔'' وَقَالَ إِخْبَاراً عَنِ الْمَسِيْحِ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ.

کلمہ اور روح اللہ سے مراد:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمہ اور روح سے مراد قول ﴿ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ ہے۔ شاذ بن یحییٰ نے کہا ہے کہ کچھ کلمہ عیسیٰ نہیں ہوگیا، بلکہ عیسیٰ کلمے سے ہوئے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح بات یہی ہے کہ جبریل کلمہ لائے تھے، اسی کلمے سے عیسیٰ ہوئے نہ جیسا کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ "اَلْقَاهَا" کے معنی یہ ہیں: "أَعْلَمَهَا بِهَا"[2]

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے اس بات کی گواہی دی کہ «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَأَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ، وَكَلِمَتُهٗ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ، وَرُوْحٌ مِّنْهُ، وَأَنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ، أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ» (رواه البخاري) یعنی تو وہ جنت میں جائے گا۔ جنادہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے: «مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةِ يَدْخُلُ مِنْ أَيِّهَا شَآءَ»[3] (وكذا رواه مسلم)

سو آیت اور حدیث میں لفظ ''وَرُوْحٌ مِّنْهُ'' مثل اس آیت کے ہے: ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ [الجاثیة: ۱۳] ''اور اس نے اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب تمھارے تابع کر دیا۔'' یعنی سب اُس کے پیدا کرنے سے ہے اور اُس کے پاس سے ہے۔ یہ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کے لیے نہیں ہے، جس طرح نصاریٰ کہتے ہیں، بلکہ ابتدائے غایت کے لیے ہے، جس طرح دوسری آیت میں آیا ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''رُوْحٌ مِّنْهُ'' یعنی ''رَسُوْلٌ مِّنْهُ''[4] بعض نے کہا: 'مَحَبَّةٌ مِّنْهُ'' مگر اول ظاہر ہے۔ یعنی وہ مخلوق ہیں۔ روح مخلوقہ سے روح کی نسبت اللہ پاک کی طرف بطورِ شرف ہے، جس طرح کہ قرآنِ مجید، ناقہ اور بیت کی نسبت اللہ کی طرف آئی ہے: ﴿ نَاقَةُ اللّٰهِ ﴾ [الأعراف: ۷۳] ''یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔'' ﴿ وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ ﴾ [الحج: ۲۶] ''اور میرا گھر پاک رکھ۔'' یا جس طرح حدیث صحیح میں مروی ہے: «فَأَدْخُلُ عَلٰى رَبِّيْ فِيْ دَارِهٖ»[5] یہ نسبتیں شرف اور بزرگی کے لیے ایک ہی طرح کی ہیں اور ایک ہی مقام پر ہیں۔[6]

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٢٣) [2] تفسیر الطبري (٩/ ٤١٩)
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٥٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٢٣) [5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٧٠٠٢) [6] تفسیر ابن كثیر (١/ ٧٧٤)

اللہ اکیلا ہے، تین نہیں:

پھر فرمایا کہ ایمان لاؤ اللہ اور رسول پر، یعنی تصدیق کرو کہ اللہ ایک ہے نہ اُس کی اولاد ہے اور نہ بیوی، سوتم جان لو کہ عیسیٰ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، اس لیے فرمایا کہ تین الٰہ نہ کہو، عیسیٰ اور اُن کی ماں کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ وَتَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ یہ آیت سورت مائدہ کی اس آیت کی طرح ہے: ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ [المائدۃ: ۷۳] ”یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنھوں نے کہا: بے شک اللہ تین میں سے تیسرا ہے اور کوئی معبود نہیں سوائے ایک معبود کے۔“

نیز جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ کے آخر میں فرمایا: ﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [المائدۃ: ۱۱۶] ”اور جب اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟“ نیز اللہ تعالیٰ نے سورت مائدہ کے شروع میں فرمایا تھا: ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ﴾ [المائدۃ: ۱۷] ”یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ بے شک اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔“

عیسائیوں کا اختلاف اور اُن کی مختلف مجالس:

نصاریٰ کے پاس اپنی جہالت کی وجہ سے نہ کوئی ضابطہ ہے اور نہ ان کے کفر کی کوئی حد ہے، بلکہ ان کے اقوال اور گمراہیاں منتشر ہیں۔ کوئی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ اعتقاد کرتا ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک جانتا ہے، کوئی بیٹا سمجھتا ہے۔ اُن کے گروہ کثیر تعداد میں ہیں، ان کی آراء مختلف ہیں اور ان کے اقوال غیر موتلف (غیر پسندیدہ) ہیں۔ بعض متکلمین نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ اگر دس نصرانی جمع ہوں تو گیارہ قول کہہ اُٹھیں گے۔

نصاریٰ کے مشہور عالم سعید بن بطریق مقیم اسکندریہ نے سن چار سو ہجری کے لگ بھگ ذکر کیا تھا کہ اس امانت کبیرہ کے بارے میں جو اُن کے پاس تھی، ایک بہت بڑا مجمع منعقد ہوا، حالاں کہ وہ ایک خیانتِ حقیرہ وصغیرہ تھی، یہ مجمع ایامِ قسطنطین بانی شہر مشہور میں ہوا تھا، اُس پر ایک بڑا اختلاف کیا، جس کو تحریر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں دو ہزار سے زیادہ پادری جمع تھے، ان میں بہت سی جماعتیں مجتمع ہوئیں۔ پچاس کا ایک قول، بیس کا ایک قول، سو کا ایک قول، ستر کا ایک قول، کسی کا اس سے بھی زیادہ یا کم، جب ان میں سے ایک گروہ نے دیکھا کہ تین سو اٹھارہ تک تعداد ہوگئی اور اُن سب کا ایک قول ہے تو بادشاہ نے اسی ایک گروہ کی بات لے کر اس کی مدد اور تائید کی، وہ بادشاہ ایک بڑا فلسفی آفت روز گار تھا، باقی تمام اقوال کو اس نے مٹا دیا اور غائب کر دیا، ان تین سو اٹھارہ کا داؤ چل گیا، ان کے لیے گرجا گھر بنائے گئے، کتابیں تیار ہوئیں، قوانین ایجاد ہوئے، ان میں وہ امانت

رکھی گئی، جو چھوٹے بچوں کو تلقین کی جاتی ہے، تا کہ اس کے معتقد رہیں، اسی پر اعتماد کریں، اُس گروہ کے اتباع ملکانیہ کہلاتے ہیں۔ پھر انھوں نے ایک دوسرا اجتماع کیا، اس میں یعقوبیہ نام کا گروہ پیدا ہوا۔

پھر تیسرا مجمع کیا، اس میں نسطوریہ رونما ہوئے، یہ سارے فرقے اقانیم ثلثہ (تین الٰھوں کو ماننا) کے عقیدے پر ثابت قدم ہیں، مسیح کے بارے میں ان کا اختلاف فقط کیفیتِ لاہوت (الوہیت) اور ناسوت (دنیا) میں ہے، اُن کے زُعم پر کہ آیا لاہوت و ناسوت دونوں متحد ہو گئے ہیں یا نہیں، یا دونوں مل گئے ہیں یا لاہوت نے ناسوت میں حلول کیا ہے۔ یہ تین قول ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقے کو کافر کہتا ہے اور ہم تینوں فرقوں کو کافر کہتے ہیں اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم باز رہو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اللہ پاک ایک ہے، اس کے لیے کوئی اولاد نہیں۔ تَعَالٰی وَتَقَدَّسَ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيرًا.

اللہ اولاد سے پاک ہے:

جو کچھ سارے آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ سب اُسی کا ہے، سارا ملک اور مخلوق اسی کے زیرِ تدبیر اور تصرف ہے، سب اُس کے غلام ہیں، وہ ہر شے کا کارساز ہے، بھلا اُس کے لیے صاحبہ (بیوی) اور اولاد کیوں کر ہو سکتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ ﴾ [الأنعام: ۱۰۱] ”وہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کی اولاد کیسے ہو سکتی ہے؟“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿88﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿89﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿90﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿91﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿92﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿93﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿94﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿95﴾ ﴾ [مریم: ۸۸۔ ۹۵] ”اور انھوں نے کہا: رحمان اولاد رکھتا ہے۔ البتہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات (گناہ) تک آ پہنچے ہو۔ قریب ہیں کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ اس (بات) پر کہ انھوں نے رحمان کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا۔ اور رحمان کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، وہ سب رحمان کے پاس غلام بن کر آئیں گے۔ بلاشبہہ یقیناً اس (رحمان) نے ان کا شمار کر رکھا ہے اور انھیں خوب گن رکھا ہے۔ اور وہ سب یومِ قیامت اللہ کے پاس تنہا تنہا آئیں گے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ آیتِ باب نصاریٰ کے حق میں اُتری ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہود کے حق میں بھی ہے۔ غلو حق سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ آیت سے مراد افراط و تفریط سے نہی ہے۔ افراط یہ ہے کہ نصاریٰ نے عیسیٰ

کو رب ٹھہرایا، تفریط یہ ہے کہ یہود نے معاذ اللہ اُن کو غیر رُشد کا بتایا، شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

وَلَا تَغْلُ فِيْ شَيْئٍ مِنَ الْأَمْرِ وَاقْتَصِدْ كِلَا طَرَفَيْ قَصْدِ الْأُمُوْرِ ذَمِيْمٌ

''کسی معاملے میں مبالغہ نہ کرو اور میانہ روی اختیار کرو۔ میانہ روی کے دونوں اطراف قابلِ مذمت ہیں۔''

پھر اس بات سے منع کیا کہ اللہ کے بارے میں سوائے حق کے کوئی بات کہی جائے، یہ حق بات وہی ہے، جو اللہ نے خود فرما دی ہے یا اُس کے رسول نے اُس کی صفت بیان کی۔ ناحق بات یہود کا قول ہے کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں یا نصاریٰ کا قول ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ یا ابن اللہ ہیں یا مشرکین کا قول ہے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں یا مجوس کا قول ہے کہ نور کا خالق اللہ ہے اور اندھیروں کا خالق کوئی اور ہے یا ہندوؤں کا یہ قول ہے کہ چھتیس کروڑ معبود ہیں یا جہمیہ فرعونیہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی صفت نہیں ہے یا مقلدوں کا قول ہے کہ ائمہ مجتہدین واجب الاتباع ہیں یا شیعہ شنیعہ کا قول ہے کہ ائمہ اہلِ بیت معصوم ہیں یا خوارج نواصب کا قول ہے کہ حکم صرف قرآن کا ہے نہ کہ سنتِ مطہرہ کا۔

غرضیکہ جتنے اقوال ان گمراہ لوگوں کے ہیں، وہ خواہ اہلِ کتاب کے ہوں یا نام کے مسلمانوں کے، وہ سب ناحق اور بالکل باطل ہیں، اگرچہ اس جگہ مخاطب یہی اہلِ کتاب ہیں، بلکہ بالخصوص نصاریٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے رسول اُس کے کلمہ اور اُس کی طرف کی روح ہے۔

کلمہ سے مراد بشارت ہے، جو جبریل علیہ السلام کے ذریعے مریم علیہا السلام کو بھیجی گئی تھی: ﴿ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ﴾ [آل عمران: ٤٥] ''جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوش خبری دیتا ہے۔'' یا اس جگہ کلمے سے مراد نشانی ہے یا ایسی کوئی اور چیز: ﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا ﴾ [التحریم: ١٢] ''اور اس نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ﴾ [لقمان: ٢٧] ''تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں۔''

''اَلْقَا'' سے مراد ایصال ہے، یعنی وہ بات مریم کو پہنچا دی گئی۔ روح سے مراد ذو روح ہے۔ روح اس لیے کہا کہ ریح سے حاصل ہوئی ہے، یعنی جبریل علیہ السلام کے نفخ (پھونک مارنے) سے۔ اللہ نے جبریل علیہ السلام کو بھیجا۔ انھوں نے مریم کے پیراہن میں پھونک دیا، وہ اللہ کے اذن سے حاملہ ہوگئیں، یہ اضافت (نسبت) فضیلت کے لیے ہے، ورنہ ساری ارواح اللہ ہی نے پیدا کی ہیں۔ جس سے عجیب چیزوں کا اظہار ہوتا ہے، اس کو روح اللہ کہتے ہیں، یعنی وہ اس کی مخلوق سے ہے۔ جس طرح نعمت کے حق میں کہتے ہیں: ''إِنَّهَا مِنَ اللّٰهِ'' یا روح بمعنی رحمت یا برہان ہے۔ اس لیے کہ عیسیٰ ایک برہان اور اپنی قوم پر ایک حجت تھے۔ معنی یہ ہوئے کہ روح اللہ کی طرف سے تھی، اگرچہ اس کو پھونکنے والے جبریل تھے، اس لیے کہ جبریل کو اللہ ہی نے حکم دیا تھا۔ تم۔ اے نصاریٰ۔ یہ گمان کرتے ہو کہ وہ ابن اللہ ہیں یا اللہ ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں، سو یہ بات ٹھیک نہیں ہے، اس لیے کہ ذی روح مرکب ہوتا ہے۔ اللہ

اس بات سے پاک، مقدس اور بہت بلند ہے کہ وہ ذی روح کے اس مرکب میں بلحاظ ترکیب کے موجود ہو۔

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نجاشی نے جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ تمھارے صاحب، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ابن مریم کے حق میں کیا کہتے ہیں؟ کہا وہی کہتے ہیں، جو اللہ نے کہا ہے، یعنی اللہ کی روح اور کلمہ ہیں، ان کو بتول عذراء سے نکالا، جن کو کسی بشر نے نہ چھوا تھا۔ (نجاشی نے) ایک لکڑی زمین سے اٹھا کر کہا: اے قسیسین اور رہبان کے گروہ! یہ لوگ تمھاری بات سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں کہتے۔[1] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ۔ اَللّٰہُ أَحَدٌ، اَللّٰہُ الصَّمَدُ، لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ، وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا أَحَدٌ.

کہو رسول پر ایمان لاؤ اُس کو اللہ کا بندہ سمجھو۔ اللہ یا اللہ کا بیٹا یا ثالث ثلاثہ نہ کہو، تین سے مراد تین اقنوم (باپ، بیٹا اور ماں) ہیں۔ اللہ پاک کے وجود، حیات اور علم کو ایک جوہر ٹھہرا کر اس کے لیے یہ تین اقنوم بتاتے ہیں۔ پھر ان تینوں اقنوم کو باپ، بیٹا (ابن روح القدس) کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ "أَبٌ" سے مراد وجود ہے اور روح سے حیات اور ابن سے مسیح۔ بعض نے کہا کہ تین اِلٰہوں سے مراد اللہ و مریم و مسیح ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک.

اس بارے میں نصاریٰ کا خبط بہت طویل ہے۔ چاروں انجیلوں کو ہم نے دیکھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بڑا تضاد پایا، کبھی ابن الانسان کہا ہے، کہیں ابن اللہ کہا ہے، کبھی ابن الرب ٹھہرایا ہے۔ یہ تناقض دین کے ساتھ مذاق ہے۔ حق وہی ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خبر دی ہے۔ تورات و انجیل و زبور میں جو کچھ قرآن کے مخالف ہے، وہ تحریف کرنے والوں کی تحریف اور متلاعبین کا کھیل اور متہافتین کا اتہام ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اناجیلِ اربعہ میں سے ہر انجیل عیسیٰ علیہ السلام کے ایک صحابی کی طرف منسوب ہے۔ تمام اناجیل کا حاصل یہ ہے کہ ان اصحابِ اربعہ سے ہر ایک صحابی نے عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت کا بعثت سے لے کر رفع کے وقت تک ذکر کیا ہے اور جو معجزات ان سے ہوئے اور جو جوابات انھوں نے یہود کو دیے، وہ اُن میں لکھے ہیں، سو اگرچہ معانی متفق ہیں، لیکن الفاظ مختلف ہیں۔ بعض نے بعض سے کچھ زیادہ بھی لکھا ہے، مگر یہ ان کے حافظے اور تحریر کرنے کے تقاضے کے مطابق ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال کو لکھا یا جو کچھ عیسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا، وہ تحریر کیا ہے۔

اللہ پاک کے کلام میں سے اُن میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ عیسیٰ علیہ السلام پر کوئی کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی، بلکہ عیسیٰ علیہ السلام نے یہود پر تورات سے حجت قائم کی اور وہ فرماتے تھے کہ میں کوئی بات تورات کے خلاف نہیں لایا ہوں۔ یہی حال زبور کا ہے کہ از اول تا آخر داود علیہ السلام کا کلام ہے، لیکن جو اللہ کی بات ہے، وہ سچی اور اُس کی خبر درست ہے اور اللہ نے ہم کو یہ خبر دی ہے کہ ہم نے انجیل کو عیسیٰ علیہ السلام پر اُتارا ہے اور وہ ہماری کتاب ہے اور زبور داود کو دی ہے اور اُن پر ہم نے اُتاری ہے، اس لیے ہم اس خبر پر ایمان رکھتے ہیں، اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٣٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

پھر فرمایا کہ اللہ ایک ہے، اُس کے بچہ کہاں سے ہوسکتا ہے، کیوں کہ اولاد والد کا حصہ ہوتی ہے، اللہ اس بات سے پاک ہے کہ اُس کے اجزا ہوں اور وہ فنا اور امکان کی صفات کا حامل ہو۔ ﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [الزخرف: ١٥] ''اور انھوں نے اللہ کے بعض بندوں کو اس کا جز (اولاد) ٹھہرا دیا، بلاشبہہ انسان تو کھلم کھلا ناشکرا ہے۔''[1]

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿١٧٢﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٧٣﴾

مسیح (عیسیٰ ابن مریم) کو اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہے، اور جو کوئی اللہ کی عبادت کو عار خیال کرے اور تکبر کرے، تو اللہ جلد ان سب کو اپنی طرف جمع کرے گا (172) پھر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے تو اللہ انھیں ان کے پورے اجر دے گا اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ عطا کرے گا، اور جن لوگوں نے اللہ کی عبادت کو عار خیال کیا اور تکبر کیا تو وہ انھیں بہت دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے سوا اپنے لیے کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہیں پائیں گے (173)

انبیا اور فرشتے اللہ کے بندے ہونے سے گریزاں نہیں:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ استنکاف بمعنی استکبار ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ''لَنْ يَّحْتَشِمَ الْمَسِيْحُ''[2] بعض لوگ جو ملائکہ کو بشر پر فضیلت دیتے ہیں اس آیت سے استدلال کرتے ہیں، حالاں کہ اس میں یہ دلیل نہیں، کیوں کہ ملائکہ کا عطف لفظ مسیح پر ہے۔ استنکاف جب امتناع ٹھہرا تو ملائکہ مسیح سے زیادہ تر امتناع پر قادر ہیں، مگر ان کے اس زیادہ قدرت رکھنے سے ان کی افضلیت لازم نہیں آتی، اس جگہ ان کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ ٹھہرایا گیا، اسی طرح مشرکوں نے ملائکہ کو بھی اللہ ٹھہرایا۔ اس پر اللہ نے یہ خبر دی کہ وہ سب من جملہ عباد کے عبید ہیں اور من جملہ مخلوقات کے ایک مخلوق ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٦] ''اور انھوں نے کہا: رحمان نے اولاد بنائی ہے۔

[1] فتح البیان (٣/ ٣٠٨۔ ٣١١)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٢٤)

وہ (اس سے) پاک ہے، بلکہ وہ (فرشتے) تو (اللہ کے) معزز ومکرم بندے ہیں۔“

اسی لیے پھر یہ کہا کہ جو اللہ کی عبادت سے عار و انکار کرے گا، اس کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا، جہاں حکم میں کسی طرح کا ظلم و زیادتی نہیں ہوگی۔ پھر اسی لیے نیک عمل کرنے والوں کو ان کے اعمال کے مطابق اجر وثواب کا وعدہ فرما کر اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور وسیع رحمت اور احسان و اکرام کی بشارت سنائی۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ توفیہ اجر (پورا اجر دیا جانا) دخولِ جنت ہے اور زیادہ فضل اس کی شفاعت ہے، جس کے لیے آگ واجب ہوگئی۔ دنیا میں اُس نے اُس کے ساتھ نیکی کی تھی۔[1] (رواہ ابن مردویہ)

مگر اس کا موقوف ہونا صحیح ہے نہ کہ مرفوع ہونا۔ پھر جو یہ فرمایا کہ جو لوگ ہماری طاعت اور عبادت سے گریزاں ہیں اور تکبر کرنے والے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے، یہ اس آیتِ شریفہ کے مثل ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ”بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“ یعنی ہماری عبادت سے غرور و عار اور انکار کرنے والے ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے، جس طرح دنیا میں ہماری عبادت سے گریزاں، تکبر کرنے والے اور عار کرنے والے تھے۔

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ”یستنکف“ بہ معنی ”یانف“ (ناک چڑھانا)۔ یعنی مسیح جن کو تم اللہ سمجھتے ہو، ہماری بندگی سے ناک نہیں چڑھاتے یا اس کام کو عیب نہیں جانتے اور نہ ہی عرش کو اُٹھانے والے، جو مقرب فرشتے ہیں، جیسے جبریل علیہ السلام وغیرہ، ان کو اللہ کے بندے ہونے سے کچھ عار ہے۔[2]

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿١٧٤﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿١٧٥﴾

اے لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس ایک دلیل آ گئی ہے، اور ہم نے تمھاری طرف ایک واضح نور نازل کیا ہے (174) پھر جو لوگ اللہ پر ایمان لے آئے اور اس (کے دین) کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو وہ ضرور انھیں اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا، اور انھیں اپنی طرف (پہنچنے کے لیے) سیدھا راستہ دکھائے گا (175)

ہدایت کے اوصاف:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت پاک میں سارے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تمھارے پاس ہماری طرف سے

---

[1] المعجم الکبیر (۱۰/ ۲۰۱) اس کی سند میں ”اسماعیل بن عبداللہ کندی“ ضعیف راوی ہے۔ [2] فتح البیان (۳/ ۳۲۱)

برہانِ عظیم آئی ہے، یعنی ایسی دلیل جو قاطعِ عذر و حجت ہے اور جو شکوک و شبہات کو دور کرنے والی ہے۔ نور مبین سے وہ روشنی مراد ہے، جو حق کو واضح کرتی ہے۔ ابن جریج وغیرہ نے کہا ہے کہ اس جگہ برہان سے مراد قرآن ہے۔[1] سو جن لوگوں نے سب امور میں دونوں مقام کو جمع کیا، یعنی عبادت اور توکل علی اللہ کو اور قرآن کو پکڑا، وہ لوگ رحمت میں یعنی جنت میں داخل ہوں گے۔ ان کو ثواب کئی گنا دیا جائے گا، ان کے درجات بلند کیے جائیں گے، اُن کو ایسا سیدھا راستہ سُجھایا جائے گا، جس میں کسی طرح کی کجی نہیں ہوگی اور نہ انحراف۔ مومنوں کی دنیا اور آخرت میں یہ صفت ہے، دنیا میں اسلام کے کھلے راستے، استقامتِ دین اور سلامتی والے راستے پر ہیں، سارے اعتقادات اور اعمال میں صراطِ مستقیم پر ہوں گے، جو ان کو جنات کے باغات میں پہنچا دے گی۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ قرآن اللہ کی صراطِ مستقیم اور حبلِ متین ہے۔[2] الحدیث۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ برہان سے مراد آسمانی کتب اور رسول اور نبیوں کے معجزے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد بینہ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد حجت ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ محمد ﷺ مراد ہیں۔ نورِ مبین سے مراد قرآن مجید ہے۔ اُس کا نام نور اس لیے ہوا کہ وہ گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر حق کا راستہ دکھاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جنت کا نام رحمت رکھا۔[4] موقع اور محل کی مناسبت سے فضل سے دیدارِ الٰہی اور بہشت میں لے جانے والے امور مراد ہیں۔ صراطِ مستقیم سے مراد سارے ادیانِ باطلہ کو چھوڑ کر دینِ اسلام کو مضبوطی سے پکڑ لینا ہے۔[5]

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ
لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ
يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ
فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً
فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ١٧٦ؑ

(اے نبی!) لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: اللہ ''کلالہ'' کے بارے میں حکم دیتا ہے، اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اس کے لیے بھائی کے چھوڑے ہوئے مال کا

---

(1) تفسير الطبري (٩/ ٤٢٨)

(2) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٠٦) اس کی سند میں ''حارث اعور'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٦٣٩٣)

(3) تفسير الطبري (٩/ ٤٢٨) (4) تفسير الرازي (١١/ ٩٦) (5) فتح البيان (٣/ ٣١٤)

آدھا حصہ ہے۔ اور اگر بہن کی اولاد نہ ہو تو اس کا بھائی اس کا وارث ہوگا، پھر اگر بہنیں دو (یا دو سے زیادہ) ہوں تو ان کے لیے بھائی کے چھوڑے ہوئے مال کا دو تہائی ہے اور اگر کئی بھائی بہن، مرد اور عورتیں (وارث) ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا، اللہ تمھارے لیے وضاحت سے بیان کرتا ہے، تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (176)

کلالہ کا حکم اور آخر میں نازل ہونے والی آیت:

کلالہ کے معنی ہارا ہوا ضعیف ہے۔ یہاں فرمایا: اُس کو جس کے وارثوں میں باپ اور بیٹا نہیں کہ اصل وارث وہی تھے تو اس وقت سگے بہن بھائی کو بیٹا بیٹی کا حکم ہے۔ سگے نہ ہوں تو یہی حکم سوتیلوں کا ہے۔ صرف ایک بہن کو آدھا اور دو کو دو تہائی اور بہن بھائی ملے جلے ہوں تو مرد کو دوہرا حصہ اور عورت کو اکہرا حصہ ملے گا اور اگر صرف بھائی ہوں تو ان کو فرمایا کہ وہ بہن کے وارث ہیں یعنی حصے میں معین نہیں، وہ عصبہ ہیں۔ اگر بیٹی ہو اور بہن ہو تو حصہ بیٹی کو اور بہن عصبہ ہے۔ یعنی حصہ داروں سے بچے تو وہ لے۔ موضح القرآن کا کلام مکمل ہوا۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نازل ہونے میں آخری سورت براءت ہے اور نزول میں آخری آیت ﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ ... الخ﴾ ہے۔[1] (رواه البخاري) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میرے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور میں بیمار تھا، کچھ سمجھتا نہ تھا، یعنی بے ہوش تھے، وضو کیا، مجھ پر پانی چھڑکا یا فرمایا کہ پانی ڈالو، مجھ کو ہوش آیا، میں نے کہا کہ میرا کوئی وارث نہیں ہے، مگر کلالہ۔ میراث کیسے ہوگی؟ اُس پر اللہ نے آیتِ فرائض نازل کی۔ (رواه أحمد و أخرجاه و رواه الجماعة) بعض الفاظ میں اس طرح مروی ہے کہ آیتِ میراث: ﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ ... الخ﴾ نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت میرے بارے میں اُتری ہے۔[2]

کلالہ کے بارے میں کلام پہلے گزر چکا ہے۔ اکثر علما کا قول یہ ہے کہ کلالہ وہ ہے جو مر گیا اور اُس کا کوئی بیٹا یا پوتا نہیں ہے۔ بعض نے کہا: کلالہ وہ ہے جس کا بیٹا نہیں، جس طرح یہ آیت دلیل ہے اس بات پر: ﴿ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ ﴾۔ کلالہ کا حکم امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر نہایت مشکل ہوا، جس طرح کہ صحیحین میں مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تین چیزیں ہیں، میں چاہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں ہم سے کچھ عہد کر جاتے اور ہم اسی عہد پر رہتے، وہ تین چیزیں یہ ہیں: دادا، کلالہ اور ابوابِ ربا۔[3]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٢٩)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٦) مسند أحمد (٣/ ٢٩٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٨٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٩٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٢٨) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٢٦)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٣٢)

۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کا اتنا سوال نہیں کیا، جتنا سوال میں نے کلالہ کے بارے میں کیا، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے میرے سینے میں انگلی ماری اور فرمایا: «يَكْفِيْكَ آيَةُ الصَّيْفِ الَّتِيْ فِيْ آخِرِ سُوْرَةِ النِّسَآءِ»[1] (هكذا رواه مختصراً و أخرجه مسلم مطولًا أكثر من هذا) سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے آ کر نبی اکرم ﷺ سے کلالہ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «يَكْفِيْكَ آيَةُ الصَّيْفِ»[2] یہ اسناد جید ہے۔ (و رواه الترمذي) آیت صیف سے شاید یہ مراد ہے کہ موسمِ صیف، یعنی گرمی کے موسم میں اُتری ہے۔ واللہ أعلم.

نبی اکرم ﷺ نے تو آیت کے سمجھنے کی طرف ارشاد فرمایا اور کہا کہ اس میں کفایت ہے، لیکن سائل بھول گیا کہ نبی اکرم ﷺ سے آیت کے معنی نہ پوچھے، اس لیے یہ کہا کہ اگر میں آپ ﷺ سے اُس کے معنی بھی پوچھ لیتا تو وہ مجھے ''حُمُرِ نَعَمٌ'' (سرخ اونٹ) ملنے سے زیادہ بہتر ہوتا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خطبے میں کہا کہ سنو وہ آیت جو سورت نساء کے شروع میں شانِ فرائض میں اُتری ہے، وہ والد اور اولاد کے حق میں ہے اور دوسری آیت جو اُتری ہے، وہ خاوند اور بیوی اور بہن بھائیوں کے حق میں اُتری ہے، جو ایک ماں سے ہوں اور وہ آیت جس پر سورت نساء ختم ہوئی، وہ ان بہن اور بھائیوں کے حق میں اُتری ہے، جو ایک ماں باپ سے ہوں اور وہ آیت جس پر سورت انفال ختم ہوئی ہے، وہ اولی الارحام کے حق میں ہے، جس کو رحم نے کھینچا ہے، عصبہ سے مراد (باپ کی طرف کا) نر رشتہ دار۔[3] (رواه ابن جرير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جس طرح اس سورت کو اموال کے ذکر سے شروع کیا تھا، اسی طرح اس کو اموال کے ذکر پر ختم بھی فرمایا، تاکہ سورت کے ابتدا اور اختتام میں مشابہت پیدا ہو۔ اس سورت میں میراث کے بارے میں کل تین آیات ہیں۔ پہلی آیت وراثت کے اصول اور فروع کے بارے میں، دوسری آیت میاں بیوی اور ماں کی طرف سے بہن بھائیوں کی وراثت کے بارے میں۔ تیسری جو یہ آیت ہے اور آخری آیت ہے یہ حقیقی بہنوں اور بھائیوں کی وراثت کے بارے میں ہے، جو ایک باپ سے ہوں۔

رہے اولی الارحام سو ان کا ذکر سورۃ الانفال کے آخر میں آیا ہے، مسئلہ کلالہ میں فتویٰ پوچھنے والے جابر رضی اللہ عنہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٧) مسند أحمد (١/ ٢٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٤٢) اس کی سند میں ''ابو اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

[3] تفسير الطبري (٩/ ٤٣١)

تھے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کو کلالہ کے مسئلے نے مشکل میں ڈالا تھا، اس لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، اُس پر یہ آیت اُتری۔ کلالہ[1] کا لفظ وارث اور موروث دونوں پر بولا جاتا ہے، اگر وارث پر بولا گیا تو وہ والد اور اولاد کے سوا ہے اور اگر موروث پر بولا گیا تو وہ شخص ہے، جو مر گیا کہ اُس کے ماں باپ اور اولاد میں سے کوئی بھی اُس کے وارث نہیں۔ اس بارے میں پوری تقریر لغتاً وخلافاً اور استدلالاً وترجیحاً اس سورت کے شروع میں گزر چکی ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص مر گیا اور اس کے کوئی بچہ نہ تھا، صرف ایک بہن تھی، ماں باپ سے یا صرف باپ کی طرف سے نہ کہ ماں کی طرف سے، کیوں کہ اُس کا حصہ سدس (چھٹا) ہوتا ہے، تو اس کے لیے نصف ترکہ ہے۔ جمہور علما، صحابہ وتابعین اور ان کے بعد والے اس طرف گئے ہیں کہ سگی بہنیں ایک ماں باپ سے یا صرف باپ سے بیٹیوں کی عصبہ ہیں، اگرچہ ان کے ساتھ کوئی بھائی نہ ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب یہ ہے کہ بہنیں عصبہ بنات نہیں ہوتیں۔ اسی طرف داود ظاہری رحمہ اللہ اور علما کا ایک گروہ گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دختر کے ہوتے ہوئے بہن کے لیے کوئی میراث نہیں، خواہ وہ ایک ماں باپ سے ہو یا صرف باپ سے ہو۔ ان کی حجت ظاہر آیتِ باب ہے، کیوں کہ اولاد نہ ہونے کو، جو لڑکے اور لڑکی کو شامل ہے، بہن کی وراثت کی شرط ٹھہرایا ہے۔ اگر صحیح حدیث میں دختر کے ہوتے ہوئے بہن کی میراث ثابت نہ ہوتی تو یہ استدلال صحیح ہے۔

لیکن صحیح میں آیا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں حکم دیا بیٹی اور بہن کے بارے میں آدھا بیٹی کو دیا اور آدھا بہن کو۔[2] اسی طرح بیٹی، بھتیجی اور بہن کے بارے میں فیصلہ دیا بیٹی کو نصف، بھتیجی کو چھٹا حصہ اور باقی بہن کو دیا۔[3] اس لیے سنت یہ مقتضی ہوئی کہ ولد کی تفسیر بیٹا ہو نہ کہ بیٹی۔[4] اسی طرح بھائی بہن کے ساتھ ترکہ میں وارث ہے، اگر بہن کے اولاد نہ ہو۔ اگر ایک ماں سے بہن بھائی ہیں تو بھائی کا حصہ سدس (چھٹا) ہے، جیسے سورت کے شروع میں گزر چکا ہے۔

اس آیت میں مختصراً نفیِ ولد ذکر کیا، حالاں کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھائی ساقط ہوتا ہے، جس طرح کہ ولدِ ذکر کے ہوتے ہوئے بھی ساقط ہوتا ہے، یہ اس لیے کیا کہ یہاں ولد کے ہوتے ہوئے فقط بھائی کو ساقط کیا۔ رہا اُس کا سقوط باپ کے ہوتے ہوئے، سو یہ سنتِ مطہرہ سے ثابت ہے، صحیح میں آیا ہے: «أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَلِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ»[5] اور باپ اولیٰ تر ہے بھائی سے۔ پس اگر دو بہنیں ہوں یا زیادہ، کیوں کہ آیت جابر رضی اللہ عنہ

[1] تفسير الطبري (٩/ ٤٣١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٦٠)

[3] یہ فیصلہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥٥)

[4] فتح القدير (١/ ٨٥٥۔ ٨٥٦) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٥)

کے حق میں اُتری ہے اور وہ سات یا نو بہنیں چھوڑ کر مرے تھے تو اُن کو بھائی کے ترکے سے دو تہائی ملے گا، اگر اس کے کوئی اولاد نہیں ہے اور دو بہنوں سے زیادہ تو ان کو دو تہائی لینے کا زیادہ حق ہے اور اگر بھائی ہیں، بلکہ بہنیں بھی، یعنی مرد و عورت تو عصبہ ہونے کی وجہ سے مرد کا دوہرا حصہ ہے۔ کلالہ کا یہ حکم بلکہ تمام احکام اللہ تعالیٰ نے اس لیے بیان کر دیے کہ کہیں بھٹک نہ واقع ہو۔ اللہ کو بندوں کی تمام بہتریوں کا علم ہے، خواہ وہ اس دنیا کی ہوں یا آخرت کی۔

سورت نساء کی ابتدا عیب سے پاک اللہ تعالیٰ کی وسعتِ قدرت پر مشتمل ہے اور آخری حصہ کمالِ علم کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں اوصاف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت کو ثابت کرتے ہیں۔ یہی دونوں وصف اس بات کو واجب کرتے ہیں کہ بندہ تکالیف کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرے۔ سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ فرائض کے بارے میں آخری آیت یہی آیتِ باب ہے۔[1] (رواه الشيخان)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نزول کے لحاظ سے آخری آیت، آیتِ ربا ہے اور آخری سورت ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴾ [النصر: ١] ''(اے نبی!) جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے گی۔'' نبی اکرم ﷺ سورت نصر کے نازل ہونے کے بعد ایک سال زندہ رہے، اُس کے بعد براءت اُتری، وہ آخری سورت ہے، جو پوری اُتری، اُس کے بعد نبی اکرم ﷺ چھے ماہ زندہ رہے، پھر حجۃ الوداع کے راستے میں یہ آیت اُتری: ﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ ... الخ﴾ اس کا نام آیتِ صیف ہوا، اس لیے کہ موسمِ گرما میں نازل ہوئی۔

پھر جس وقت رسول اللہ ﷺ عرفے میں کھڑے تھے تو آیت: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ﴾ [المائدة: ٣] ''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا۔'' نازل ہوئی، اس کے بعد اکاسی دن زندہ رہے، پھر آیتِ ربا آئی، پھر یہ آیت اُتری: ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٢٨١] ''اور اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' اس کے بعد اکیس دن زندہ رہے۔ فتح البیان کا کلام تمام ہوا۔[2]

ابن کثیر کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس آیت کے معنی پر کلام کرنے کے بارے میں ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر کوئی مرد ہلاک ہوا، ہلاک سے مراد مرنا ہے، یعنی مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ [القصص: ٨٨] ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، سوائے اس کے چہرے کے۔'' جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ [الرحمٰن: ٢٦۔ ٢٧] ''ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے۔ اور آپ کے ربِ ذوالجلال والاکرام کا چہرہ باقی رہے گا۔''[3]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٨)

[2] تفسير البغوي (٢/ ٣١٧) فتح البيان (٣/ ٣١٥۔ ٣١٨) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٧٧٨)

ساقی فانی و بزم و ساغر فانی   با ہر کہ شدی درو ملاقی فانی
بردار دل از ہستی بے بود جہاں   اللہ بود باقی و باقی فانی

''پلانے والا فانی ہے اور مجلس اور پیالہ بھی ختم ہو جانے والے ہیں، جس کسی کے ساتھ تو نے محبت سے ملاقات کی، وہ بھی فنا ہو جانے والا ہے، دنیا کی بے بنیاد زندگی سے دل اُٹھا لے۔ اللہ کو ہمیشہ بقا ہے، باقی سب فنا ہو جانے والے ہیں۔''

اُس ہالک کے کوئی ولد نہیں ہے، اس سے تمسک کیا ہے، اُس شخص نے جو یہ کہتا ہے کہ کلالہ کی شرط یہ ہے کہ والد نہ ہو، بلکہ وجودِ کلالہ میں انتفاءِ ولد کا کافی ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بہ سند صحیح اسی طرح آیا ہے۔ لیکن یہاں جمہور کا قول قابلِ ترجیح ہے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بھی ہے کہ کلالہ وہ ہے، جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا،[1] اسی پر دلیل ہے: ﴿وَلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ اگر باپ موجود ہوگا تو بہن کسی چیز کی وارث نہ ہوگی، اس لیے کہ باپ بالاجماع اُس کا حاجب ہے۔ سو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ بنصِ قرآن کلالہ وہ ہے، جس کا بیٹا نہیں ہے اور نہ باپ ہے، بنصِ غور کرنے کے وقت، اس لیے کہ بہن کا حصہ نصف ہوتے ہوئے بھی باپ کی موجودگی میں نہیں ہوتا، بلکہ اُس کو بالکل میراث نہیں ملتی۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ زوج و اُخت ہے ایک ماں باپ سے، زوج کو آدھا دلایا، آدھا بہن کو دیا، جب اس بات میں گفتگو کی کہا، میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی حکم دیا۔[2] (رواه أحمد وتفرد به من هذا الوجه)

امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اُن کا قول اُس میت کے حق میں، جو ایک بیٹی اور ایک بہن چھوڑ کر مرا ہے، یہ تھا کہ آیتِ باب کی دلیل سے بہن کو کچھ نہ ملے گا۔[3] پھر اگر بیٹی چھوڑ کر مرا ہے تو گویا ولد چھوڑ کر مرا، اب بہن کو کچھ نہ ملے گا۔ جمہور ان دونوں کے خلاف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بیٹی کو نصف از روئے وراثت ملے گا اور آدھا بہن کو از روئے تعصیب ملے گا، ان کی دلیل اس آیت کے علاوہ ہے اور اس آیت نے اس صورت میں اُس کا حصہ نہیں رکھا۔

رہی اس کی وراثت از روئے تعصیب کے، اس لیے کہ صحیح بخاری میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ثابت ہے کہ انھوں نے عہدِ نبوی میں بیٹی اور بہن دونوں کو آدھا آدھا دلایا۔ سلیمان رحمہ اللہ (راوی) نے کہا

---

[1] تفسیر الطبري (٨/ ٥٤۔ ٥٥)

[2] مسند أحمد (٥/ ١٨٨) اس کی سند میں ''ابوبکر بن عبداللہ بن ابو مریم'' ضعیف راوی ہے۔ نیز مکحول، عطیہ، ضمرہ اور راشد رحمہم اللہ کا سماع سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ قرآنِ کریم کی اس آیت: ﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ﴾ اور ﴿إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ کے تحت یہ فتویٰ صحیح ہے۔

[3] تفسیر الطبري (٩/ ٤٤٣)

کہ الفاظ عہدِ رسول اللہ ﷺ ذکر نہیں کیے۔[1] یہ بھی صحیح بخاری میں ہے کہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایک بیٹی، ایک پوتی اور ایک بہن ہے، کہا: بیٹی کا آدھا اور بہن کا آدھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس جا، وہ ہمارے درمیان میں موجود ہیں، اُن سے پوچھا، انھوں نے کہا کہ اگر میں بھی یہی کہہ دوں تو گمراہ ہو جاؤں، ہدایت یافتہ لوگوں میں نہ ہوں۔ میں وہ حکم کرتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے حکم کیا تھا۔ نصف بیٹی کو، سدس پوتی کو دوثلث پورا کرنے کے لیے، جو بچے وہ بہن کو۔ جب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر یہ حال بیان کیا، کہا: تم مجھ سے نہ پوچھا کرو، جب تک کہ یہ عالم تمھارے پاس موجود ہے۔[2]

بھائی وارث ہے بہن کے سارے ترکہ کا، جب کہ وہ مر جائے اور اُس کا ولد نہ ہو، یعنی اور نہ والد، اس لیے کہ اگر باپ ہوگا تو بھائی کسی شے کا وارث نہ ہو سکے گا۔ پھر اگر فرض کریں کہ کوئی ذی فرض ہے (یعنی اصل وارث) تو وہ میراث اُس کو ملے گی، جیسے زوج یا بھائی ماں کی طرف سے، باقی بھائی کے ہاتھ آئے گی۔ اس لیے کہ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا... الخ»[3] اگر کلالہ کی دو بہنیں ہیں تو ان کو دو تہائی ملے گا، اسی طرح اگر دو سے زیادہ ہیں تو ان کا حکم بھی انہی کا حکم ہے۔ اسی جگہ سے جماعت نے دو بہنوں کا حکم لیا ہے، جس طرح کہ بہنوں کا حکم بیٹیوں سے لیا ہے اس آیتِ کریمہ سے: ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ [النساء: ۱۱] ”پھر اگر (دو یا) دو سے زیادہ عورتیں ہی ہوں تو ان کے لیے ترکے میں دو تہائی حصہ ہے۔“

پھر اگر بھائی بہنیں ہیں تو مرد کو دو عورتوں کے حصے کے برابر ملے گا۔ یہ حکم عصبات کا ہے، جیسے: بنین اور بنی بنین واخوہ، جبکہ مرد اور عورتیں ملے جلے ہوں تو اس وقت مرد کا دوہرا حصہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان فرائض اور حدود کو تمھارے لیے اس واسطے بیان کر دیا اور مقرر کیا کہ کہیں تم حق سے گمراہ نہ ہو جاؤ، اللہ کو امور کا انجام اور بندوں کی مصلحتوں کا بہ خوبی علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قریبی رشتہ داروں میں سے متوفی کا کون قریب اور کس قدر حصے کا مستحق اور حق دار ہے۔

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہا کہ راہ میں چلے جاتے تھے، حذیفہ رضی اللہ عنہ کی سواری کا سر رسول اللہ ﷺ کی سواری کے پیچھے تھا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی سواری کا سر حذیفہ رضی اللہ عنہ کی سواری کے پیچھے تھا کہ یہ آیت اُتری: ﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو سکھائی، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو، اس کے بعد ایک وقت میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے بارے میں سوال کیا، حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! تم احمق ہو، اگر تم کو یہ گمان ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو سکھائی ہے اور میں نے تم کو ویسی نہیں سکھائی، جیسے مجھ کو سکھائی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٦٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٥)

تھی۔ ''وَاللّٰهِ، لَا أَزِيْدُكَ عَلَيْهَا شَيْئًا أَبَدًا'' یعنی میں ہرگز اپنی طرف سے کچھ بھی بڑھا کر نہیں کہہ سکتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ بَيَّنْتَهَا لَهُ فَإِنَّهَا لَمْ تُبَيِّنْ لِيْ'' (رواه ابن جرير) یعنی اے اللہ! اگر اس آیت کا مطلب تو نے ان کو سمجھا دیا تھا، تو مجھ کو تو نہیں سمجھایا ہے۔ (1)

مگر امام ابن سیرین رحمہ اللہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اس کی سند منقطع ہے۔ ہاں ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے اس کو ابن سیرین سے بذریعہ ابی عبیدہ بن حذیفہ خود حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اس حدیث کو سوائے حذیفہ رضی اللہ عنہ کے کسی اور نے بھی روایت کیا ہو اور نہ کوئی اس کا طریق سوائے طریقِ حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہے۔ (2)

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کلالہ کیوں کر وارث ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ گویا نہ سمجھے۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ جب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش دیکھے تو اس آیت کا مطلب پوچھنا، انھوں نے خوش پا کر پوچھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے باپ نے تجھ سے ذکر کیا ہوگا۔ «مَآ أَرٰى أَبُوْكَ يَعْلَمُهَا» میں نہیں دیکھتا کہ تیرا باپ اس کو جانتا ہے۔ اُس دن سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''مَآ أُرَانِيْ أَعْلَمُهَا وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَا قَالَ''. ''میرا خیال ہے کہ میں اس کو نہیں جانتا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ فرمایا ہے، جو فرمایا ہے۔''

دوسرے الفاظ اس روایت کے یہ ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کلالہ کے بارے میں سوال کر اور یہ آیت ایک کتف پر لکھوا دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھ سے کس نے کہا، سیدنا عمر نے؟ ''مَآ أَرَاهُ يُقِيْمُهَا وَمَا تَكْفِيْهِ آيَةُ الصَّيْفِ''. آیتِ صیف سے یہی آیتِ سورتِ نساء مراد ہے: ﴿ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ ﴾ [النساء: ١٢] ''اور اگر وہ آدمی جس کا ورثہ تقسیم کیا جا رہا ہو، اس کا بیٹا ہو نہ باپ، یا ایسی ہی عورت ہو۔''

پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آیتِ خاتمۂ سورتِ نساء اُتری۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے کتف ڈال دیا۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ (3) (رواه ابن مردويه) طارق بن شہاب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک کتف لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو جمع کیا، کہا: کلالہ کے بارے میں ایک حکم دینا چاہیے، جس کو عورتیں اپنے پردوں میں بیٹھ کر

(1) تفسیر الطبري (٩/ ٤٣٥۔ ٤٣٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ کا سماع سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

(2) مسند البزار (٧/ ٣٦٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحيح غير أبي عبيدة بن حذيفة و وثقه ابن حبان'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٧٤)

(3) تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٧٩۔ ٧٨٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سعید بن میتب رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

یاد کریں۔ اتفاقاً گھر میں سے ایک سانپ نکلا، سب لوگ متفرق ہوگئے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "لَوْ أَرَادَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يُتِمَّ هٰذَا الْأَمْرَ لَأَتَمَّهٗ"[1] (رواه ابن جرير وهذا إسناد صحيح) ''اگر اللہ تعالیٰ اس معاملے کو پورا کرنا چاہتا تو یقیناً اس کو پورا کر دیتا۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین چیزیں ہیں، اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہمارے لیے بیان فرماتے تو دنیا وما فیہا سے زیادہ ترمحبوب تھیں: خلافت، کلالہ اور ربا۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت شرطِ شیخین پر صحیح ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آخرین مردم ہوں، میں نے اُن کو سنا، کہتے تھے: "اَلْقَوْلُ مَا قُلْتُ: قُلْتُ وَمَا قُلْتَ؟ قَالَ: قُلْتُ: اَلْكَلَالَةُ مَنْ لَّا وَلَدَ لَهٗ" اس کو بھی امام حاکم رحمہ اللہ نے علی شرطہما کہا ہے۔[2] امام ابن مردویہ کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "كُنْتُ آخِرَ النَّاسِ عَهْداً بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ، قَالَ: اخْتَلَفْتُ أَنَا وَأَبُوْبَكْرٍ فِي الْكَلَالَةِ، وَالْقَوْلُ مَا قُلْتُ" کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سگے بھائیوں کو اور ماں کی طرف کے بھائیوں کو ثلث میں شریک کیا، جب کہ وہ مجتمع ہوں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف کیا۔[3]

سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دادا اور کلالہ کے بارے میں ایک کتاب لکھی، پھر ٹھہر گئے، پھر استخارہ کیا، کہا: "اَللّٰهُمَّ إِنْ عَلِمْتَ فِيْهِ خَيْراً فَأَمْضِهٖ" جب زخمی ہوئے تو کتاب منگوا کر مٹا ڈالی، کسی کو معلوم نہ ہوا کہ اس میں کیا لکھا تھا، کہا: "إِنِّيْ قَدْ كُنْتُ كَتَبْتُ كِتَاباً فِي الْجَدِّ وَالْكَلَالَةِ وَكُنْتُ اسْتَخَرْتُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ فِيْهِ، فَرَأَيْتُ أَنْ أَتْرُكَكُمْ عَلٰى مَا كُنْتُمْ عَلَيْهِ" (رواه ابن جرير) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس مسئلے میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کروں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ یوں کہتے تھے: "هُوَ مَا عَدَ الْوَلَدِ وَالْوَالِدِ"[4]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات جو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہی ہے اسی پر جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین و ائمۂ زمانِ قدیم و حدیث ہیں۔ یہی ائمہ اربعہ اور سب کے سب فقہائے سبعہ کا مذہب ہے۔ قرآن پاک بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اُس کو بیان کر دیا۔ وصححه في قوله: ﴿ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ والله أعلم.[5] (آیت باب)

تفسیر کے بارے میں مولف کی کچھ وضاحت اور بارگاہِ الٰہی میں عفو و مغفرت کی دعا:

اس سورت مبارکہ کا، جس کا نام نساء ہے، لکھنا بتاریخ دو جمادی الآخرہ ۱۳۰۳ ہجری روز سہ شنبہ کو شروع کیا تھا،

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۴۳۹) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] مستدرك الحاكم (۲/ ۳۳۲۔ ۳۳۳) ان دونوں کو امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے صحیح کہا ہے۔

[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۸۰) [4] تفسیر الطبري (۹/ ۴۳۷۔ ۴۳۸) [5] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۸۰)

آج یہ تفسیر اس وقت روز شنبہ سنہ مذکور کو بتاریخ ستائیسویں ماہِ مذکور کے ستائیس دن میں وقت نمازِ عصر کے جب کہ تین بج کر پچیس منٹ گزرے تھے، تمام ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ماہِ محرم شروع سنہ مذکور سے اب تک آفات و آزمایشوں سے اس جانِ حزیں کو سانس لینے کی فرصت نہ تھی۔ اگر ظاہر و باطن کی بدحواسی کے تقاضے سے کوئی بھول چوک ہوئی ہو تو وہ مؤلف اور شیطان اور نفسِ امارہ کی طرف سے ہے نہ کہ اللہ اور رسول کی طرف سے، وہ اُس سے بَری ہیں۔ سورت بقرہ کے سوا کچھ ابتدائی حصوں کی تفسیر کے نظر ثانی کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف کرنے والا اور تمام غم و اندوہ کو دور کرنے والا ہے، کیوں کہ اس کے سوا کوئی نفع اور نقصان دینے والا نہیں ہے۔

قرآنِ کریم کی کتابت اور خدمت کی ایسی حالتِ پُر ملامت میں توفیق کا ملنا اسی کی رحمت اور مہربانی اور فضل و کرم اور رحم پر مبنی ہے، ورنہ ہم کیا اور ہماری ہستی کیا۔ اللہ پاک سے کچھ بعید نہیں کہ اس خدمتِ حقیرہ کی برکت سے ہم کو دنیا و آخرت کی تمام آفات سے بچا کر اپنے ہی کام میں اپنی پاک مرضی کے مطابق مصروف رکھے۔ ہم اُس کے امتحان اور عدل کے لائق نہیں ہیں، اپنے لیے اس کا فضل اور احسان چاہتے ہیں۔ پس یہ بات اُس پر کچھ مشکل اور دشوار نہیں ہے۔ اسی کی مدد، اعانت اور نگہبانی نے سب بندوں کو ہر زمانے میں بڑی بڑی آفتوں اور سختیوں سے بچا لیا ہے۔ نا اُمیدوں کو اُمید کے کنارے پر لگا دیا ہے، جس کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا اور شریر و فاسق و فاجر اس کو تکلیف اور نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں اور وہ صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اُس کا بیڑا پار کر دیتا ہے۔ ہمارے گناہ ان مصائب کا سبب اور وجہ بنے۔ لہٰذا ان گناہوں کے مطابق بھی ہم سے معاملہ نہ ہوا اور جن گناہوں سے درگزر ہوا ہے اور ہم ان کو جانتے اور پہچانتے ہیں، وہ تو بے شمار ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ ہم بھی باوجود ہزار معصیت کے تائب ہو کر اور بخشش طلب کر کے ہزار دل و جان سے امان مانگتے ہیں۔ اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں، اُمید ہے کہ ہماری موجودہ تکلیف اور حالت دور ہو کر اُس کی رحمتِ عامہ سے ہم کو باقی عمر میں ہر بلا سے تادمِ مرگ اطمینان حاصل ہوگا۔

اَللّٰهُمَّ آمِيۡنَ! وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡ بِنِعۡمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الۡكَائِنَاتِ، وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحۡبِهٖ أُوۡلِي الۡأَعۡمَالِ الصَّالِحَاتِ. فقط

سورة المائدة

اس سورت کی ایک سو بیس آیات ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت بالاجماع مدنی ہے۔[1] یہی امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[2] محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حجۃ الوداع میں مکے اور مدینے کے درمیان اُتری ہے۔[3] اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی قصباء کی باگ پکڑے ہوئے تھی کہ یہ ساری سورت نازل ہوئی۔ قریب تھا کہ اونٹنی کا بازو اس کے بوجھ سے ٹوٹ جائے۔[4] (رواہ أحمد) اُم عمرو کے چچا نے کہا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جا رہے تھے کہ سورت مائدہ اُتری۔ اُس کے بوجھ سے سواری کی گردن ٹوٹنے لگی۔[5] (رواہ ابن مردویہ)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سورت مائدہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتری اور وہ سواری پر سوار تھے۔ وہ سواری اس کی متحمل نہ ہو سکی، آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اُتر پڑے۔[6] (تفرد به أحمد) ترمذی کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے اس طرح مروی ہیں کہ آخری سورت جو نازل ہوئی، وہ سورت مائدہ تھی اور کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آخری سورت جو نازل ہوئی، وہ ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴾ [النصر] ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔[7] مگر جبیر بن نفیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حج کیا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا، انھوں نے مجھ سے کہا: اے جبیر! تو سورت مائدہ پڑھتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ کہا: یہ آخری سورت ہے، جو اُتری، سو تم اس میں جو حلال پاؤ، اس کو حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ، اُس کو حرام سمجھو۔[8] (رواه الحاكم وقال صحيح على شرط الشيخين)

ضمرہ بن حبیب وعطیہ بن قیس نے مرفوعاً کہا ہے: ''اَلْمَائِدَةُ مِنْ آخِرِ الْقُرْآنِ تَنْزِيْلًا، فَأَحِلُّوْا حَلَالَهَا، وَحَرِّمُوْا حَرَامَهَا'' (مائدہ نزول کے لحاظ سے آخر قرآن ہے، سو اس کے حلال کو حلال جانو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو)۔[9] (رواه أبو عبيد) عمرو بن شرحبیل نے کہا ہے کہ مائدہ میں سے کوئی چیز منسوخ نہیں ہوئی۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے

---

① تفسير القرطبي (٦/ ٣٠) ② تفسير الطبري (٩/ ٥٣١) ③ الدر المنثور (٣/ ٣ـ٤)

④ مسند أحمد (٦/ ٤٥٥) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔ ⑤ تفسير ابن كثير (٢/ ٥)

⑥ مسند أحمد (٢/ ١٧٦) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

⑦ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦٣) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٠) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ البتہ مستدرک الحاکم میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت موجود نہیں ہے۔ یہ روایت صحیح مسلم (٣٠٢٤) میں مروی ہے۔

⑧ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦٣) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

⑨ فضائل القرآن (١/ ٤٠٧) الدر المنثور (٣/ ٤) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز سند میں ''ابوبکر بن عبداللہ بن ابو مریم'' ضعیف راوی ہے۔

کہا ہے کہ مگر یہ آیت: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ ﴾ [المائدۃ: ۲] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور نہ حرمت والے مہینوں کی، نہ حرم میں قربان ہونے والے اور نہ پٹے پہنائے جانوروں کی۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اتنا اور زیادہ کیا: ﴿ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ﴾[2] [المائدۃ: ٤٢] ''تو آپ (کو اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں یا ان سے اعراض کریں۔'' میسرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اٹھارہ حکم اُتارے ہیں، جو قرآن کی کسی اور سورت میں نہیں اُتارے۔ وہ احکام یہ ہیں: ﴿ وَ الْمُنْخَنِقَةُ ﴾ سے لے کر ﴿ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ﴾ تک۔[3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ١ؕ۬ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ
اِلَّا مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ١ؕ اِنَّ اللّٰهَ
یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ۝۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا
الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ
الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا١ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ
فَاصْطَادُوْا١ؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا١ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى١۪ وَ لَا
تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ١۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ١ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ
الْعِقَابِ۝۲

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! معاہدے پورے کیا کرو، تمھارے لیے چوپائے مویشی حلال کیے گئے ہیں، سوائے ان کے جن کے نام تمھیں (ابھی) پڑھ کر سنائے جائیں گے، جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار کو حلال نہ جانو، بے شک اللہ جو چاہتا ہے، فیصلہ کرتا ہے ① اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور نہ حرمت والے مہینوں کی، نہ حرم میں قربان ہونے والے اور نہ پٹے

① الناسخ والمنسوخ للنحاس (۱/ ۳۵۷۔ ۳۵۸)

② تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ۱۱۳۵) مستدرك الحاكم (۲/ ۳٤۱) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

③ تفسير البغوي (۲/ ٥)

پہنائے جانوروں کی، اور نہ بیت الحرام کا قصد کرنے والوں کی وہ اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا تلاش کرتے ہیں اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کر سکتے ہو، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں صرف اس لیے ان سے زیادتی کرنے پر آمادہ نہ کرے کہ انھوں نے تمھیں مسجدِ حرام سے روک دیا تھا، اور تم نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ②

شعائر اللہ کی حرمت:

جب آدمی مسلمان ہوا تو اللہ کے تمام احکام قبول کرنے کا پابند ہوگیا۔ اب آگے حکم فرمائے کہ ان کو قبول کرو۔ مویشی وہ جانور ہیں، جن کو لوگ کھانے کے لیے پالتے ہیں، جیسے: گائے، بکری، پھر جنگل کے ہرن اور نیل گائے وغیرہ اسی میں داخل ہیں کہ ان کی جنس ایک ہے، ان کو احرام کے وقت اور اسی طرح حرم کے مکان میں حرام فرمایا، اس کے ساتھ حرم کے اداب اور بھی فرما دیے۔ حلال نہ سمجھو، یعنی اللہ کے نام کی چیزوں پر ہاتھ نہ ڈالو۔ یعنی اگر کافر بھی نیازِ کعبہ لائیں تو انھیں نہ لوٹو اور ماہِ حرام میں ان کو نہ مارو۔ پٹے پہنائے گئے بھی وہی قربانی کے جانور ہیں، جن کو نشان کر کے مکے کو لے جاتے ہیں اور فرمایا کہ کافروں نے تم کو مسجد سے روکا تھا، تم زیادتی نہ کرو، یعنی آنے سے نہ روکو، ہاں آیندہ کے لیے منع کر دو کہ کافر نہ آئے تو یہ صحیح ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کافر جس کام میں اللہ کی تعظیم کرے، اس کام کو فضیحت نہ کرے، مگر جو بت کی تعظیم کرے، اس کی البتہ توہین کرے۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا خطاب:

معن یا عوف نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے آ کر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھ سے کچھ عہد لو۔ انھوں نے کہا کہ جب تو سنے کہ اللہ فرماتا ہے: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ تو اس پر کان رکھ کہ وہ کوئی خیر ہے، جس کا حکم فرماتا ہے یا کوئی شر ہے، جس سے روکتا ہے۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم) امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اللہ کہے کہ اے ایمان والو! یوں کرو تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انھیں میں سے ہیں۔ خیثمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ آیا ہے، تورات میں وہاں "يَاَيُّهَا الْمَسٰكِيْنُ" فرمایا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قرآن میں جس جگہ ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ آیا ہے، سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس کے سید و شریف و امیر ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی ایسا نہیں، مگر اس پر قرآن میں عتاب نازل ہوا، سوائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے، ان کی کسی بات میں

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٦٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ معن یا عوف رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

② تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٦٩)

عتاب نہیں ہوا۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس اثر کو غریب اور منکر کہا ہے۔ اس کا مفصلاً رد کیا ہے۔[2] ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے کہا ہے کہ ہمارے پاس یہ کتاب ہے، جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھ کر دیا تھا، جب اُنھیں یمن کی طرف بھیجا تھا۔ اس کتاب میں اُنھیں اس بات کا حکم دیا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو سمجھاؤ، سنت کی تعلیم دو اور صدقات لو، وہ کتاب یہ تھی: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، هٰذَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ، عَهْدٌ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ حِيْنَ بَعَثَهٗ إِلَى الْيَمَنِ، آمَرَهٗ بِتَقْوَى اللّٰهِ فِيْ أَمْرِهٖ كُلِّهٖ، فَإِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ" "اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ یہ کتاب ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے، اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو، یہ عہد جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم سے لیا، جب اُسے یمن کی طرف بھیجا اور وہ یہ ہے کہ میں اُسے حکم کرتا ہوں کہ وہ اپنے ہر کام میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرے، بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے، جو تقویٰ اختیار کیے رکھتے ہیں اور جو لوگ نیکو کار ہوتے ہیں۔"[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ محمد بن مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط پڑھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو نجران کی طرف بھیجتے وقت اُسے لکھ کر دیا تھا اور وہ خط اُس کے پاس تھا، وہ خط یہ تھا: "هٰذَا بَيَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" اس میں چند آیات ﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ تک لکھی تھیں۔[4]

عقود کی تفسیر:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عقود سے مراد عہود ہیں۔ یہی مجاہد اور کئی ایک کا قول ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے،[5] پھر کہا ہے کہ عہود وہ ہیں، جن پر حلف وغیرہ لیتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عہود وہ ہیں، جو قرآنِ مجید میں حلال اور حرام کے احکام ہیں اور جو حدیں مقرر کی ہیں۔ تم غدر نہ کرو اور عہد نہ توڑو۔ پھر اس بارے میں سختی کی، فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ [الرعد: ٢٥] "اور جو لوگ اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور وہ چیز قطع کرتے ہیں جسے اللہ نے جوڑنے کا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٦٩) اس کی سند میں "عیسیٰ بن راشد" مجہول راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦)
[3] دلائل النبوة للبیہقي (٥/ ٤١٣) اس کی سند حسن ہے۔ [4] تفسیر الطبري (٩/ ٤٥٤) [5] تفسیر الطبري (٩/ ٤٤٩۔ ٤٥٠)

حکم دیا، اور وہ زمین میں فساد کرتے ہیں، انھی لوگوں کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے (آخرت کا) بہت برا گھر ہے۔“[1]

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عہود سے مراد حلال وحرام اور فرائض پر عہد لینا ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد چھے عہد ہیں: یعنی اللہ کے ساتھ عہد، قسم کا عہد، عقدِ شرکت، عقدِ بیع، عقدِ نکاح اور عقدِ یمین۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پانچ ہیں، من جملہ ان کے حلفِ جاہلیت اور شرکتِ مفاوضت (برابری) ہے۔[2]

خیارِ مجلس کا مسئلہ:

اس آیت میں اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مجلسِ بیع میں اختیار نہیں رہتا، کیوں کہ یہ عقد کے ثبوت اور لازم ہونے پر دلیل ہے اور اس کا مقصد اختیارِ مجلس کی نفی ہے۔ امام ابو حنیفہ و مالک رحمہما اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعی و احمد و جمہور اس کے برخلاف ہیں۔ ان کی حجت صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا» ”بیع کرنے والوں کو رد و بدل کا اختیار اُس وقت تک ہے، جب تک وہ ایک دوسرے سے علاحدہ نہ ہو جائیں۔“

بخاری کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «إِذَا تَبَايَعَ الرَّجُلَانِ فَكُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا» ”جب دو آدمی خرید وفروخت کا معاملہ کریں تو اُن میں سے ہر ایک کو رد و بدل کا اختیار رہتا ہے، جب تک وہ دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ نہ ہو جائیں۔“[3] اس سے اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ مجلس میں رد و بدل کا اختیار رہتا ہے اور یہ لزومِ عقد کے منافی نہیں ہے، بلکہ شریعت کے تقاضوں سے ہے۔ اس کا التزام عقد کو پورا کرنا ہی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس سورت کے شروع سے لے کر ”يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ“ تک وہ بلاغت ہے کہ انسانی عقل وشعور اور قوتیں اس کے سامنے بے کار اور کوتاہ ہیں۔ اس کے ساتھ عہود جن احکام پر شامل ہے، وہ ہیں جیسے مویشی چوپائیوں کے حلال کیے جانے کا حکم، صیدِ حلال کا استثناء اور احرام کی حالت میں شکار کی حرمت اور احرام کے بغیر شکار کی اجازت۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ فلسفی کندی کے یاروں اور ساتھیوں نے کہا کہ اے حکیم صاحب! ہمارے لیے اس قرآن کی طرح کچھ بنا دو، اس نے کہا: بنا دوں گا۔ پھر چند روز چپ رہے، پھر نکل کر کہا: اللہ کی قسم! مجھے قدرت نہیں، نہ ہی کسی اور کو یہ طاقت ہے۔ میں نے قرآن کو کھولا، سورت مائدہ نکلی، اس میں غور کیا۔ دیکھا تو عہد کو پورا کرنے کا

---

[1] تفسیر الطبري (٩/ ٤٥٢) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٠٠٣، ٢٠٠٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٣١)

حکم دینے والا اور عہد توڑنے سے منع کرنے والا ہے۔ پہلے تو حلال کے عام احکام دیے، پھر اس میں ایک کے بعد دوسرا استثناء کیا، پھر اپنی قدرت وحکمت کی خبر دی، یہ سب کام دو سطر میں کیا، بھلا کون اس کے مثل لا سکتا ہے؟![1]

عقود سے مراد وہ احکام ہیں، جو اللہ نے بندوں پر لازم کیے ہیں یا وہ معاملات اور امانتیں وغیرہ ہیں، جو بندوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آیت دونوں کو شامل ہے، کسی ایک قسم کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مگر عقد جس کو پورا کرنا واجب ہوتا ہے، وہ عقد ہوتا ہے، جو کتاب اللہ اور سنتِ مطہرہ کے موافق ہو، اگر ان دونوں کے مخالف ہے تو مردود ہے، اُس کا پورا کرنا ہرگز واجب وحلال نہیں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ خطاب اہلِ ایمان کو ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] کہ اہلِ کتاب کو ہے کہ تم سے جو عہدِ نبی ﷺ کے حق میں لیا گیا ہے، اُسے پورا کرو، مگر یہ قول بعید تر ہے۔[3]

﴿بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ کی تشریح اور حاملہ جانور کو ذبح کرنے کا مسئلہ:

امام حسن، قتادہ رحمہ اللہ اور کئی ایک نے کہا ہے کہ بہیمۃ الانعام اونٹ، گائے، بکری ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کے نزدیک بھی یوں ہی ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور کئی ایک نے اس آیت کو اس بات پر دلیل ٹھہرایا ہے کہ مادہ کو ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ میں جو بچہ مردہ ملے، وہ حلال ہے۔[5] اس بارے میں حدیث بھی آئی ہے۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اونٹ کو نحر کرتے ہیں یا گائے اور بکری کو ذبح کرتے ہیں، ان کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے، اُس کو ہم پھینک دیں یا کھائیں؟ فرمایا: تمھارا جی چاہے تو کھاؤ، اس کا ذبح کرنا وہی اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔[6]

سنن ابی داود میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: «ذَكَاةُ الْجَنِينِ ذَكَاةُ أُمِّهِ» ”جنین کا ذبح کرنا، اُس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔“[7] (تفرد به أبو داود) فتح البیان میں ہے کہ بہیمہ چوپائے جانور کو کہتے ہیں، لیکن عرفِ عام میں درندوں اور وحشیوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کے لیے مخصوص ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو جاندار بے تمیز ہے، وہ بہیمہ ہے۔[8]

انعام کی تفسیر:

انعام سے مراد اونٹ، گائے اور بکریاں ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہرن، نیل گائے، وحشی گدھے وغیرہا

---

[1] تفسير القرطبي (٦/ ٣١۔ ٣٢) [2] تفسير القرطبي (٦/ ٣٢) [3] فتح البيان (٣/ ٣٢١۔ ٣٢٢)

[4] تفسير الطبري (٩/ ٤٥٥۔ ٤٥٧) [5] تفسير الطبري (٩/ ٤٥٦)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٧٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٢٥٦)

[7] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٢٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٤٣١) [8] معاني القرآن للزجاج (٢/ ١٤١)

بھی اس میں داخل ہیں۔[1] اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی ایک قوم سے روایت کیا ہے۔ امام سدی، ربیع، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔[2] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول حسن ہے،[3] اس لیے کہ انعام وہی آٹھ ازواج ہیں، باقی حیوانات جو انعام کی طرف منسوب ہیں، ان کو انعام مجموعہ کہتے ہیں، رہے چیر پھاڑ کرنے والے جانور مثلاً: شیر، چیتا اور ہر ذی ناب، وہ اَنعام کی حد سے خارج ہیں، اسی طرح کُھر والے جانور تمام اہلِ لغت کے مطابق اَنعام میں داخل نہیں ہیں۔ اس لیے بھیمۃ الانعام وہ چوپائے ہیں جو چرتے ہیں یا وہ جن کو شکار نہیں جاتا ہے، اس لیے کہ صید کو وحشی کہتے ہیں نہ بھیمہ یا اجنہ جو ذبح کے وقت پیٹ سے نکلتے ہیں اور بغیر ذکات (ذبح کیے ہوئے) کھائے جاتے ہیں۔

اسی طرح جو شے حلال ہے اور بھیمہ انعام سے خارج ہے، مگر کسی نص میں وارد ہے، وہ ان کے ساتھ ملحق ہے، جیسے: ﴿ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الأنعام: ١٤٥] ”(اے نبی!) کہہ دیجیے: میری طرف جو وحی کی گئی ہے، میں اس میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر جو اسے کھائے، حرام ہو مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا سؤر کا گوشت، کیوں کہ وہ ناپاک ہے، یا وہ فسق ہو کہ (ذبح کرتے وقت) اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو، پھر جو شخص مجبور ہو جائے، (بشرطیکہ) وہ سرکشی کرنے والا اور حد سے گزرنے والا نہ ہو تو بے شک آپ کا رب بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

حلال وحرام جانوروں کا بیان:

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: «يَحْرُمُ كُلُّ ذِيْ نَابٍ مِّنَ السَّبُعِ وَمِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ»[4] ”ہر ذی ناب (کچلیوں والا) درندہ اور شکاری پنجے والا پرندہ حرام ہے۔“ کیوں کہ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ ان کے ماسوا حلال ہے، ایسے ہی تمام احکام ہیں، جن کا کسی خاص قسم کے تحت سنتِ مطہرہ کی کتابوں میں ذکر آیا ہے، مگر وہ جن کی حرمت قرآنِ مجید میں دی گئی ہے کہ وہ حلال نہیں ہیں۔

”مَتلُوّ“ وہ ہے، جس کی تحریم پر اللہ کا حکم ہے، وہ دس چیزیں ہیں۔ پہلی مردار اور پچھلی وہ جو کسی تھان (آستانے) پر ذبح کی جائے۔[5] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ ﴾ [المائدة: ٣] ”تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردہ جانور، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے سے مرجانے والا، چوٹ لگ کر مرنے والا، اوپر سے گر کر مر جانے والا، کسی کا سینگ لگ کر مرنے والا اور وہ

---

[1] تفسیر الخازن (٢/ ٣) [2] تفسیر الطبري (٩/ ٤٥٥۔ ٤٥٧) [3] تفسیر القرطبي (٦/ ٣٤)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٣٤) [5] فتح البیان (٣/ ٣٢٢۔ ٣٢٤)

جانور بھی جسے درندے کھا جائیں۔''

یہ اشیا اگرچہ انعام میں داخل ہیں، لیکن ان عوارض کے سبب سے حرام ہیں۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ﴾ [المائدۃ: ۳] ''سوائے اس کے جسے تم ذبح کرلو اور وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کیا جائے۔'' یعنی یہ ذبح کیا ہوا حرام ہے۔ اس کا استدراک و لحوق ممکن نہیں۔ اسی لیے کہا: ﴿ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی بعض بہیمۃ الانعام کی بعض حالات میں تحریم کا ذکر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ تو وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بہیمۃ الانعام میں سے حرام کیا ہے۔[1] اس سے ملحق وہ ہے، جس کو سنت نے کھول کر حرام کہہ دیا ہے۔

رہا استثناء سو یا تو اس سے مراد زمانۂ حال ہے یا استقبال۔ اگر استقبال ہوگا تو ضرورت کے وقت سے تاخیر بیان پر دلیل ہے یا وہ دونوں امر (حکم) پر محتمل ہیں۔ پھر حالتِ احرام میں شکار کرنے سے استثناء کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پہلا استثناء بہیمۃ الانعام سے تھا، کیوں کہ اس میں اونٹ، گائے، بکری، وحشی، جیسے: ہرن، نیل گائے سب داخل تھے، وحشی کو ان سے مستثنیٰ کیا۔ پھر دوسرا استثناء حالِ احرام میں وحشی کے شکار کا کیا۔ یا یہ مراد ہے کہ انعام تمام حالات میں تم کو حلال ہیں، سو تم حالتِ احرام میں شکار کرنے کو حرام جانو، کیوں کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے۔ وہ ہر امر و نہی میں حکمت والا ہے۔ اسی لیے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ﴾ (آیتِ باب)

شعائر اللہ سے مراد؛ حرمت والے مہینوں اور حرم کا احترام:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد مناسکِ حج ہیں۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے صفا مروہ، ہدی و بُدن (قربانی کے جانور اور اونٹ) ان شعائر میں ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ شعائر سے مراد محارم ہیں، یعنی جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے، تم اُن کو حلال نہ کرو۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴾ مراد مہینے کی حرمت ہے، یعنی اس کی تعظیم کا اقرار کرو، اس میں جنگ کی ابتدا نہ کرو۔ حرام کی ہوئی چیزوں سے اجتناب کی تاکید ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۷] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑائی کیسی ہے؟ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا ﴾ [التوبۃ: ۳۶] ''بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ مہینے ہی ہے۔'' صحیح بخاری میں ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع

---

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۴۵۸) الدر المنثور (۳/ ۶، ۷)

[2] تفسیر الطبري (۹/ ۴۶۳) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

[3] تفسیر الطبري (۹/ ۴۶۳)

میں فرمایا:« إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ، اَلسَّنَةُ اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا، مِّنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ثَلَاثٌ مُتَوَالِيَاتٌ: ذُوالْقَعْدَةِ، وَ ذُوالْحِجَّةِ، وَالْمُحَرَّمُ، وَرَجَبُ مُضَرَ الَّذِيْ بَيْنَ جُمَادٰى وَشَعْبَانَ» [1] ''زمانہ گھوم پھر کر اسی حالت پر آ گیا ہے، جس پر وہ اُس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں ان میں سے چار حرمت والے ہیں تین تو پے در پے آتے ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک رجبِ مضر ہے، جو جمادیٰ اور شعبان کے درمیان میں آتا ہے۔''

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ مہینے آخر وقت تک حرمت والے ہیں، جس طرح سلف کے ایک گروہ کا مذہب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ اس میں جنگ کرنے کو حرام سمجھو، حلال نہ جانو۔ یہی امام مقاتل بن حیان وعبدالکریم جزری رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ [2] جمہور کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے۔ حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ابتدا کرنا جائز ہے۔ ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو اور انھیں پکڑ لو۔'' مراد چار ماہِ سیر ہیں کسی حرمت والے مہینے کو دوسرے مہینے سے مستثنیٰ نہیں کیا۔

امام ابوجعفر رحمہ اللہ نے اہلِ شرک سے سال کے تمام مہینوں میں بشمول حرمت والے مہینوں کے جنگ کے حلال ہونے پر اجماع بیان کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ اسی طرح اس بات پر بھی اجماع ہے کہ اگر کوئی مشرک اپنے گلے یا بازو پر حرم شریف کے تمام درختوں کی چھال کا ہار بنا کر ڈال لے، تب بھی اس کام سے اُس کو قتل ہونے سے امان نہیں ملے گی، جب تک کہ پہلے سے اس نے مسلمانوں سے امان کا کوئی عہد و پیمان نہ کر لیا ہو، یا ذمی ہونے کا عقد نہ کر لیا ہو۔ [3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں ایک اور بحث ہے، اس بحث کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع کوئی اور جگہ ہے۔ [4]

حج اور قربانی کے جانوروں کی تعظیم:

پھر فرمایا کہ نہ ہدی اور نہ قلائد (قربانی کے جانور جن کے گلے میں پٹے پہنائے گئے ہوں) کو بیت الحرام کی طرف بھیجنا موقوف کرو کہ اس میں شعائرِ الٰہی کی تعظیم ہے اور نہ ان کے گلے میں قلادے کا ڈالنا ترک کرو، کیوں کہ اس میں وہ اور انعام سے ممتاز ہوتے ہیں۔ جب یہ معلوم ہوگا کہ یہ ہدی کعبے کو جاتی ہے تو جس کا ارادہ ہدی کرنے کا ہے، وہ اُس سے بچے گا اور دیکھنے والے کو حوصلہ ہوگا کہ وہ بھی اسی طرح کی ہدی بھیجے، کیوں کہ جو کوئی کسی کو ہدایت کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٥)

[2] تفسير الطبري (٩/ ٤٦٥) تفسير ابن كثير (٢/ ٨) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما والے اثر کی سند حسن ہے۔

[3] تفسير الطبري (٩/ ٤٧٩) [4] تفسير ابن كثير (٢/ ٨)

طرف بلاتا ہے، اس کو بھی متبع کے اجر کے برابر ملتا ہے اور متبع کے اجر میں سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس لیے جب نبی اکرم ﷺ نے حج کیا رات کو ذوالحلیفہ میں رہے، جس کو وادیِ عقیق کہتے ہیں۔ صبح کو ساری بیویوں کے پاس گئے، وہ نو تھیں، پھر نہائے، خوشبو ملی، دو رکعت نماز پڑھی، پھر اِشعار ہدی (قربانی کے جانور کے بال کاٹنا اور نشان لگانا) کیا۔ قلادہ ڈالا اور حج وعمرہ کی لبیک کہی۔ نبی اکرم ﷺ کے ہدی بہت سے اونٹ تھے، ساٹھ سے زیادہ نہایت خوش شکل وخوش رنگ، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ [الحج: ٣٢] ''اور جو شخص اللہ کی (عظمت کی) نشانیوں کی تعظیم کرے، تو بلاشبہ یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے۔''

بعض سلف نے کہا ہے کہ ہدی کی تعظیم یہ ہے کہ ہدی خوبصورت اور موٹی تازی ہو۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم کو نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ ہم جانور کی آنکھ کان وغیرہ دیکھیں۔[1] (رواہ أهل السنن) امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے: ﴿ وَلَا الْقَلَآئِدَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو حلال نہ سمجھو۔ اہلِ جاہلیت جب اپنے گھروں سے حرمت کے مہینوں کے علاوہ نکلتے، اپنے گلوں میں بالوں اور اُون کا پٹا ڈالتے۔ مشرکین حرم کے درختوں کی چھال کا قلادہ لگاتے، اس طرح امن میں رہتے۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس سورت میں دو آیات منسوخ ہیں، ایک آیتِ قلائد اور دوسری: ﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ﴾ [المائدة: ٤٢] ''تو آپ (کو اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں یا ان سے اعراض کریں۔''[3] امام ابن عوف رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے پوچھا، مائدہ میں کوئی شے منسوخ ہے؟ کہا: نہیں۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شجرِ حرم کا قلادہ ڈالتے اور امن پاتے۔ اللہ تعالیٰ نے حرم کے درخت کاٹنے سے منع کر دیا۔ یہی قول مطرف بن عبداللہ رحمہ اللہ کا ہے۔

حرم کا قصد کرنے والوں سے لڑائی نہ کرنا:

پھر فرمایا: بیت الحرام کی طرف قصد کر کے جانے والوں سے قتال حلال نہ سمجھو، کیوں کہ جو کوئی حرم میں آیا، وہ امن میں ہوا، جس نے اُس کا قصد کیا، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا طالب اور اُس کی رضا مندی کی طرف راغب ہوا، اس لیے اس کو روکنا اور منع کرنا نہ چاہیے، نہ ہی اُسے ہیجان میں ڈالنا چاہیے۔ امام عطا، ابو العالیہ، مطرف ابن عبید، ربیع، مقاتل بن حیان اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا کہ فضل سے مراد تجارت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٧٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٤٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٣٦١۔ ٣٦٤)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٨۔ ٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٣٥) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤١) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [البقرة: ۱۹۸] ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم (حج کے دوران میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رضوان سے مراد یہ ہے کہ حج کر کے اللہ کو راضی کرتے ہیں۔[2] امام عکرمہ، سدی اور ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت حطیم بن ہند بکری کے حق میں اُتری ہے۔ اُس نے مدینہ کی سرح (چراگاہ) پر غارتگری کی تھی، آیندہ سال میں عمرہ کیا، بعض صحابہ نے چاہا کہ کعبہ کے راستے میں اُس سے تعرض کریں۔ اس پر یہ آیت آئی: ﴿ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ﴾ (آیتِ باب)۔[3]

مسجدِ حرام میں مشرکوں کو روکنا:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ جب مشرک کے لیے امان نہ ہو تو اس کا قتل کرنا جائز ہے، اگر چہ وہ بیت الحرام یا بیت المقدس کا قصد کرتا ہو، کیوں کہ یہ حکم ان کے حق میں منسوخ ہے۔[4] واللہ أعلم. ہاں جو اس قصد سے آئے کہ وہاں کچھ الحاد کرے یا شرک یا کفر تو اس کو روکا جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مومن مشرک سب حج کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو منع کیا کہ تم کسی مومن کافر کو نہ روکو، پھر اس کے بعد یہ آیت بھیجی: ﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ﴾ [التوبة: ۲۸] ''بلاشبہ مشرک تو ہیں ہی پلید، لہٰذا وہ اپنے اس برس کے بعد مسجدِ حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ۱۷] ''مشرکین اس لائق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔''

پھر فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [التوبة: ۱۸] ''اللہ کی مسجدیں تو صرف وہ آباد کرتا ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا۔'' غرضیکہ مسجدِ حرام سے مشرکوں کو نکالا۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ اور اس کی ناسخ یہ آیت ہے: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ۵] ''تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو اور انھیں پکڑ لو۔''[6] امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ ﴿ وَلَا الْقَلَآئِدَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو کوئی قلادۂ حرم ڈالے، اس کو امن دو۔[7]

پھر فرمایا کہ جب تم احرام سے فارغ ہو کر حلال ہو جاؤ تو وہ شکار جو تم پر احرام کی حالت میں حرام تھا، وہ تم کو مباح ہے، یہ منع کے بعد حکم ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جب کوئی حکم لوٹایا جاتا ہے تو وہی کیفیت ہوتی ہے، جو ممانعت سے پہلے تھی۔ اگر واجب تھا تو حکم واجب کا ہوگا اور اگر مستحب یا مباح تھا تو حکم مستحب یا مباح کا ہوگا اور جو کوئی یہ کہتا ہے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۹) [2] تفسیر الطبري (۹/ ۴۸۱) [3] تفسیر الطبري (۹/ ۴۷۲۔ ۴۷۴)
[4] تفسیر الطبري (۹/ ۴۷۹) [5] تفسیر الطبري (۹/ ۴۷۷۔ ۴۷۸) اس کی سند حسن ہے۔
[6] تفسیر الطبري (۹/ ۴۷۶) [7] تفسیر الطبري (۹/ ۴۶۹۔ ۴۷۰)

کہ واجب ہی ہوگا تو اس پر بہت سی آیتوں کی مخالفت لازم آتی ہے اور جس نے کہا ہے کہ مباح ہوگا اس پر اور آیات وارد ہوتی ہیں اور وہ بات جس سے سب دلیلیں منتظم ہو جائیں، وہ یہی بات ہے جو ہم نے کہی ہے، اسی کو بعض علمائے اصول نے اختیار کیا ہے۔

پھر فرمایا کہ کسی قوم کی دشمنی تمھیں زیادتی پر آمادہ نہ کرے، یعنی حدیبیہ کے سال تمھیں مسجدِ حرام میں آنے سے روک دیا تھا، اب تم اس کا عوض ان سے ظلم اور زیادتی کر کے نہ لو، بلکہ جس عدل کا ہر ایک کے حق میں تم کو اللہ نے حکم دیا ہے، اسی کو مضبوط پکڑے رہو۔ یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ [المائدة: ٨] ”اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقوے کے زیادہ قریب ہے۔“ یعنی قوموں کا بغض عدل کو چھوڑ دینے کا باعث نہ بنے، کیوں کہ عدل ہر کسی پر ہر کسی کے حق میں واجب ہے، گو دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ زمین و آسمان کا قیام اسی عدل سے ہے۔

بعض سلف نے کہا ہے کہ ”مَا عَامَلْتَ مَنْ عَصَى اللّٰهَ فِيْكَ بِمِثْلِ أَنْ تُطِيْعَ اللّٰهَ فِيْهِ“ ”اگر کوئی تیرے معاملے میں ایسا کام کرتا ہے جو خدا کی نافرمانی پر مشتمل ہو تو اس کے معاملے میں اللہ کی فرماں برداری کر کے جو کام کرے گا، اس کے کیا کہنے!“ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام حدیبیہ میں تھے، جب ان کو مشرکوں نے روکا تھا، یہ بات صحابہ رضی اللہ عنہم پر سخت ناگوار گزری، کچھ لوگ اہلِ مشرق سے عمرہ کے ارادے سے آتے تھے، انھوں نے چاہا کہ جس طرح انھوں نے ہم کو روکا ہے، ہم ان کو روکیں، اس پر اللہ نے یہ آیت اُتاری[1] ؎

بدی را بدی سہل باشد جزا — اگر مردی اَحْسِن الی من اَسا

”برائی کا بدلہ برائی سے لینا آسان ہوتا ہے۔ اگر تو صاحبِ ہمت ہے تو برائی کرنے والے سے بہت عمدہ سلوک کر۔“

﴿ شَنَاٰنُ ﴾ بتحریک، بغض کے معنی میں ہے۔ بعض نے بغیر تحریک بھی پڑھا ہے ؎

وَمَا الْعَيْشُ إِلَّا مَا تُحِبُّ وَتَشْتَهِيْ — وَإِنْ لَامَ فِيْهِ ذُو الشَّنَآنِ وَفَنَدَا

”زندگی محبت اور شہوت کے سوا کچھ نہیں، چاہے کوئی کینہ پرور برا بھلا اور غلط ہی کہے۔“

نیکی پر تعاون اور گناہ سے روکنا:

پھر اللہ نے مومنوں کو حکم دیا کہ بھلائی کے کام پر جس کو بِرّ کہتے ہیں اور ترک منکرات پر جس کو تقویٰ کہتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرو، اس کا ساتھ دو۔ باطل کاموں پر اور گناہ اور حرام کی ہوئی باتوں پر ایک دوسرے کی مدد اور تعاون نہ کرو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اثم یہ ہے کہ جس کام کا اللہ نے حکم دیا ہے، اسے ترک کر دے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۰) یہ روایت مرسل ہے۔

عدوان یہ ہے کہ دین کے کام میں اللہ کی حد سے آگے بڑھ جائے یا جو بات کہ اللہ نے اُس پر یا اس کے غیر پر فرض کی ہے، اس سے تجاوز کرے۔[1]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کر، وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ کہا کہ مظلوم کی مدد تو ظاہر ہے، ظالم کی مدد کس طرح کی جائے؟ فرمایا: اُس کو ظلم سے روکو، یہی اس کی مدد ہے۔[2] (أخرجاه في الصحيحين و رواه أحمد) ایک صحابی کی مرفوع روایت اس طرح ہے کہ وہ مومن جو لوگوں سے ملتا ہے اور اُن کی ایذا پر صبر کرتا ہے، اُس کا اجر اُس مومن سے زیادہ بڑا ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی ایذا پر صبر نہیں کرتا۔ (رواه أحمد) ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ مومن اُس مومن سے بہتر ہے۔[3] (و رواه ابن ماجه أيضاً)

عبداللہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: «اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ» "بھلائی کی ترغیب دینے والا بھلائی کرنے والے کی طرح ہے۔"[4] (رواه البزار، وقال لا نعلمه يروىٰ إلا بهذا الإسناد) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: "قُلْتُ وَلَهٗ شَاهِدٌ فِي الصَّحِيْحِ: مَنْ دَعَا إِلَى الْهُدٰى كَانَ لَهٗ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ أُجُوْرِ مَنِ اتَّبَعَهٗ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ... الخ" "جس نے ہدایت کی طرف دعوت دی تو اس کے لیے قیامت تک اس ہدایت پر چلنے والوں کے اجر کے برابر اجر ہے۔"[5] نمران بن مخمر رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جو ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لیے چلا اور وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا۔[6] (رواه الطبراني)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مُحرم سے مراد مُحرِم حج یا عمرہ یا ہر دو ہے۔ مُحرم کو مُحرم اس لیے کہتے ہیں کہ اُس پر شکار، خوشبو اور عورتیں حرام ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تسمیہ حرم کی بحرمِ احرام ہے۔ لفظ ﴿يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ میں معتزلہ کا رد ہے، کیونکہ وہ مصلحت سے مراعات کے قائل ہیں اور آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی مخلوق اللہ کے حکم کو پیچھے ڈالنے والی نہیں ہے۔ نہ کوئی اعتراض اللہ پر ہوسکتا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٩/ ٤٩٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٤) مسند أحمد (٣/ ٢٠١) یہ روایت صحیح مسلم میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٣٢) مسند أحمد (٥/ ٣٦٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٣٩)

[4] مسند البزار (٥/ ١٥٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٦٠)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٤) تفسير ابن كثير (٢/ ١١)

[6] المعجم الكبير (١/ ٢٢٧) اس کی سند میں "اسحاق بن ابراہیم" ضعیف راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٧٥٨)

اِشعار ہدی یہ ہے کہ لوہے سے اونٹ کے کوہان کو کونچ دیں، اس سے خون نکلے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ جانور ہدی ہے۔ اشعار کرنا اونٹ اور گائے میں سنت ہے، بکری میں نہیں۔ صحیح احادیث اس پر دلیل ہیں۔ جس نے اشعار کو بدعت یا مکروہ کہا، اگر اُس کو حدیث نہیں پہنچی تو معذور ہے۔ شعائر سے مراد فرائض یا محارم یا دین اور شریعت کے احکام ہیں، بلکہ آیت ان سب معانی کی متحمل ہے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ کیوں کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے خصوصیتِ سبب کا نہیں۔

شہرِ حرام (حرمت والے مہینے) سے مراد جنس ہے، اس لیے اس میں تمام حرمت والے مہینے داخل ہیں۔ وہ چار ماہ ہیں: ذی قعدہ، ذی حجہ، محرم اور رجب۔ ہدی وہ ہے جس کو بیت اللہ کی طرف ہدیہ کریں؛ اونٹ ہو یا گائے یا بکری، سو کسی کی ہدی کو جو مکے جاتی ہو نہ روکیں اور نہ لوٹیں۔ قلادہ اس چیز کو کہتے ہیں جو ہدی کی گردن میں لٹکاتے ہیں، جوتا ہو یا اور کچھ۔ مطلب یہ کہ ہدی یا اصحابِ ہدی یا قلائد کو حلال نہ کرو، بلکہ ان کی عزت اور حرمت رکھو۔ جو کوئی مکہ حج یا عمرے کے لیے یا وہاں رہنے کے لیے جائے، اس کو مت روکو یا اس سے نہ لڑو۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کو آیتِ قتال کے ساتھ منسوخ کہا ہے۔ حدیث میں بھی مروی ہے کہ «لَا یَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ» ''کوئی مشرک اس سال کے بعد حج نہ کرے۔''[1]

ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ مائدہ میں کوئی شے منسوخ نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مگر قلائد کہ جاہلیت میں حرم کے درختوں کی چھال لے کر لٹکاتے تھے۔ ظاہر یہی ہے کہ آیت منسوخ ہے۔ اسی پر جمہور ہیں، کیوں کہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ اہلِ شرک سے حرمت کے مہینوں وغیرہ میں قتال کرنا حلال ہے۔ فضل سے مراد رزق ہے یا تجارت کا منافع۔ یعنی روزی کی تلاش کے ساتھ اللہ کی رضا مندی بھی چاہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کوئی حج تجارت کے لیے کرتا تھا اور کوئی اللہ کی رضوان کے لیے۔ آیت اگر مشرکین کے حق میں ہے تو رضوان کی طلب ان کے اعتقاد و ظن کے مطابق ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فضل سے مراد آخرت کا ثواب ہے نہ کہ تجارت کا منافع۔ پھر فرمایا کہ جب احرام سے باہر نکلو تو شکار کرو، یہ امر بطورِ اجازت کے ہے، کیوں کہ مُحرم پر احرام کی پابندیوں سے نکلنے کے بعد شکار کرنا واجب نہیں ہے کہ اس جگہ امر کو وجوب کے لیے سمجھا جائے۔

﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ﴾ میں دی گئی نہی پر غور و فکر کرنا چاہیے، کیوں کہ جن لوگوں نے مکہ میں داخل ہونے سے منع کیا تھا، وہ کفار حربی تھے، ان سے اُلجھنے اور جنگ کرنے سے کیوں منع فرمایا، ظاہر یہ ہے کہ یہ ممانعت منسوخ ہو یا یہ نہی صلح نامۂ حدیبیہ کی حیثیت سے ہو کہ اس صلح کی وجہ سے مومنین (امن والے) ہوگئے تو اب اُن سے اُلجھنا نہیں چاہیے، لیکن اس پر کسی مفسر نے متنبہ نہیں کیا۔ واللہ أعلم. ﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ﴾ کے معنی ہیں، ''لَا یَحْمِلَنَّکُمْ'' یا ''لَا یَکْسِبَنَّکُمْ''. ''اِعْتِدَاء'' سے مراد قتل کرنا اور مال چھین لینا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٨٠)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ برّ سے مراد امر اور تقوے سے مراد نہی ہے۔[1] امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ برّ میں لوگ خوش ہوتے ہیں اور تقوے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ جس نے دونوں کو جمع کیا، اس کی سعادت تمام ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ برّ کا اطلاق واجب اور مستحب دونوں پر ہوتا ہے۔ تقویٰ واجب کے ساتھ مختص ہے۔[2]

صحیح بات یہ ہے کہ جس امر پر لفظ برّ وتقویٰ صادق آتا ہے، وہ سب اس میں داخل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دونوں الفاظ کے ایک معنی ہیں۔ ان کو تاکید کے لیے دہرایا گیا ہے۔ ﴿اِثْم﴾ ہر وہ قول اور فعل ہے، جس کا قائل اور فاعل گناہ گار ٹھہرے۔ عدوان لوگوں پر ظلم سے زیادتی کرنا ہے۔ غرضیکہ اثم اور عدوان کا موجب کوئی یا کسی قسم کا عمل ہو، وہ اس نہی کے نیچے داخل ہے۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔ کسی قسم کو خاص کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وابصہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''برّ وہ ہے جس پر قلب اور نفس مطمئن ہو۔ اثم وہ ہے جو دل میں بنے تنے سینے میں آئے جائے، گو لوگ تجھ کو اس کا فتویٰ دیں۔''[3] (رواه أحمد و عبد بن حميد والبخاري في تاريخه)

سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: برّ و اِثم کیا ہے؟ فرمایا: برّ حسنِ خلق ہے، اثم وہ ہے، جو جی میں آئے جائے۔ تجھ کو اس کا لوگوں کو معلوم ہونا ناپسند ہو۔[4] (أخرجه أحمد والبخاري في الأدب و مسلم و الترمذي والحاكم والبيهقي) سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک آدمی نے پوچھا: ''اِثم'' کیا ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿مَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ فَدَعْهُ﴾ ''جو تیرے دل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دے۔'' کہا ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ﴿مَنْ سَآءَتْهُ سَيِّئَتُهٗ وَسَرَّتْهُ حَسَنَتُهٗ فَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ یعنی جو اپنی بدی سے ناخوش اور اپنی نیکی سے خوش ہو، وہ ایمان دار ہے۔[5] اس کہنے میں، کہ اللہ کا عذاب سخت ہے، بہت بڑی ڈانٹ اور سخت وعید ہے۔[6]

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ

[1] تفسير الطبري (٩/ ٤٩١) اس کی سند حسن ہے۔ [2] فتح القدير (٢/ ١١)
[3] مسند أحمد (٤/ ٢٢٧) التاريخ الكبير (١/ ١٤٤) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٥١)
[4] مسند أحمد (٤/ ١٨٢) الأدب المفرد (١/ ١١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٨٩)
[5] مسند أحمد (٥/ ٢٥٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٥٠) [6] فتح البيان (٣/ ٣٢٥_ ٣٣١)

لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣﴾

تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردہ جانور، خون، سوٗر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے سے مرجانے والا، چوٹ لگ کر مرنے والا، اوپر سے گر کر مر جانے والا، کسی کا سینگ لگ کر مرنے والا اور وہ جانور بھی جسے درندے کھا جائیں، سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو اور وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تم فال کے تیروں سے قسمت معلوم کرو، یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔ آج وہ لوگ نا امید ہو گئے جنھوں نے تمھارے دین کا انکار کیا، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھی سے ڈرو، آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے پسند کر لیا تمھارے لیے اسلام کو بطورِ دین کے، پس جو شخص بھوک سے بے بس ہو جائے، جب کہ وہ گناہ پر مائل ہونے والا نہ ہو، تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ③

کن جانوروں کو کھانا حرام ہے:

مویشیوں میں سے یہ چیزیں حرام فرمائیں: سور اور ہر چیز کا لہو اور آپ سے مرا ہوا یا کسی طرح بغیر ذبح کے مرا ہوا اور جو اللہ کے سوا کسی کے نام پر ذبح کیا گیا اور جو کسی مکان کی تعظیم پر ذبح کیا گیا، اللہ کے گھر کے سوا، مگر یہ چیزیں مضطر کو معاف ہیں اور پانسوں سے بانٹنا یہ کافروں کا ایک جوٗا تھا کہ شرط بدھ کر ایک جانور دس شخص نے خریدا اور ذبح کیا اور دس پانسے تھے، کسی پر لکھا آدھا کسی پر پاؤ کم زیادہ کوئی خالی پھر بانٹنے لگے تو ہر ایک کے نام پر جو پانسا آیا، وہی حصہ اُس کو ملا یا خالی نکل گیا۔ شرط بدھنی تمام حرام ہے، یہ بھی اسی میں داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح ہوا یا غیر اللہ کی تعظیم پر وہ مردار ہے۔

یہ جو فرمایا کہ آج تمھارے لیے دین کامل کر دیا، یہ آیت آخر میں اتری جب اللہ کے سب احکام نازل ہو چکے تھے، اس کے بعد تین مہینے تک نبی اکرم ﷺ زندہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ شریفہ میں ان محرمات کو پکڑنے سے منع فرمایا دیا۔ میتۃ سے مراد وہ مرا ہوا جانور ہے، جو ذبح یا شکار کے بغیر خود بہ خود مر گیا ہو۔ ایسا جانور دین اور بدن کے لیے خون کے رُک جانے کی وجہ سے نقصان دہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ نے اس کو حرام کر دیا۔ ہاں میتۃ سے مچھلی مستثنیٰ ہے، وہ حلال ہے، خواہ ذبح سے مرے یا اس کے بغیر۔ اس کی دلیل سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے آب دریا کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «هُوَ الطُّهُورُ مَآءُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ»

''اُس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔''[1] (رواه مالك والشافعي وأحمد وأهل السنن وابن خزيمة وابن حبان)

اسی طرح ٹڈی بھی مستثنیٰ ہے۔ خون سے مراد جاری خون ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا ﴾ [الأنعام: ١٤٥] یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ طحال یعنی تلی کا کیا حکم ہے؟ کہا: حلال ہے کھاؤ، کہا: وہ تو خون ہے، کہا: تم پر خونِ رواں حرام ہے۔ (رواه ابن أبي حاتم) اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ ممانعت نہیں ہے مگر دمِ سائح سے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ہمارے لیے دو مردار حلال ہیں اور دو خون: دو مردے: مچھلی وٹڈی اور دو خون: کلیجی اور تلی۔ (رواه الشافعي وأحمد وابن ماجة والدارقطني والبيهقي) مگر اس کی سند میں تین راوی ضعیف ہیں۔ امام ابو زرعہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ موقوف ہے۔[3]

خوک (سؤر) کا گوشت شامل ہے، خوک کے تمام اجزا کو حتیٰ کہ اس کی چربی کو بھی، خواہ وہ سؤر دیسی ہو یا جنگلی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں اس تکلف کی حاجت نہیں، جس پر ظاہریہ نے جمود کیا ہے اور بے راہ چلتے ہوئے الفاظ ﴿ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا ﴾ سے حجت لی ہے، جو اس آیتِ کریمہ میں وارد ہوئے ہیں: ﴿ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا ﴾ [الأنعام: ١٤٥] ''مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا سؤر کا گوشت، کیوں کہ وہ ناپاک ہے، یا وہ فسق ہو۔''

﴿ رِجْسٌ ﴾ کی ضمیر کو اپنی فہم کے مطابق خنزیر کی طرف پھیرا ہے، تاکہ سارے اجزا کو عام ہو، حالاں کہ لغت کی رُو سے یہ بات بعید ہے، اس لیے کہ ضمیر مضاف کی طرف پھرا کرتی ہے نہ کہ مضاف الیہ کی طرف۔ صاف ظاہر ہے کہ لحم عام ہے تمام اجزا کے لیے، جس طرح کہ لغتِ عرب اور عرفِ عام سے سمجھا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے نردشیر سے کھیل کود کیا، اُس نے گویا اپنا ہاتھ سؤر کے گوشت اور خون سے رنگا۔[4] سو جب صرف چھو لینے پر اتنی نفرت دلائی گئی ہے تو پھر اس ڈرانے اور دھمکانے کا کیا ذکر، جو کھانے اور غذا لینے پر آئی ہے؟ اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ لفظ لحم تمام اجزا، مثلاً: چربی وغیرہ کو یا

---

[1] الموطأ (١/ ٢٢) مسند الشافعي (١/ ٧) مسند أحمد (٢/ ٣٦١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٦) صحيح ابن خزيمة (١/ ٥٨) صحيح ابن حبان (٤/ ٤٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٤٨)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ١١)

[3] مسند الشافعي (١/ ٣٤٠) مسند أحمد (٢/ ٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣١٤) سنن الدارقطني (٤/ ٢٧١) سنن البيهقي الكبرىٰ (١/ ٢٥٤) تفسير ابن كثير (٢/ ١١۔ ١٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١١١٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦٠)

جو کچھ ہو، اُس کو شامل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ پر یہ اعتراض کہ ضمیر مضاف کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ مضاف الیہ کی طرف، جیسے کہ گزرا، نہیں ہے، اس لیے کہ یہ محاورہ کتاب اللہ میں بھی آیا ہے: ﴿ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾ [الجمعة: ٥] ''(ان لوگوں کی مثال) اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اُٹھاتا ہے۔''

پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب، مردار، سؤر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام کیا۔ کہا: اے اللہ کے رسول! مردار کی چربی کا کیا حکم ہے، اُس سے تو کشتیوں کو رنگ کرتے ہیں، چمڑوں کو مرغن کرتے ہیں اور لوگ چراغ جلاتے ہیں؟ فرمایا: نہیں، مردار کی چربی حرام ہے۔[1] بخاری میں مروی ہے کہ ابو سفیان نے ہرقل سے کہا کہ انھوں نے ہمیں مردار اور خون سے منع کیا ہے۔[2]

غیر اللہ کا نام لینا:

اِہلال لغیر اللہ کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا، وہ حرام ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات واجب کی ہے کہ اس کی مخلوقات اسی کے نامِ عظیم پر ذبح کی جائے۔ سو جب اس حکم کی نافرمانی کی اور کسی غیر کے نام کیا، وہ صنم ہو یا طاغوت یا بت یا باقی مخلوقات میں سے کوئی اور تو وہ ذبیحہ بالاجماع حرام ہے۔ علما کا اختلاف کسی کا نام لینے کو ترک کر دینے میں ہے کہ وہ عمداً ہو یا بھول کر۔ اس کا بیان سورت انعام میں آئے گا۔

ابو الطفیل رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام چار چیزوں کی تحریم لے کر اُترے: مردار، خون، سؤر کا گوشت اور ﴿ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ سو یہ چار چیزیں کبھی حلال نہ ہوئیں، ہمیشہ حرام رہیں، جب سے اللہ نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ جب بنی اسرائیل ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حلال طیبات کو حرام کر دیا۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام آئے تو وہی پہلے والا حکم لائے، جو آدم علیہ السلام لائے تھے۔ سوائے ان چار اشیا کے جن کا ذکر ہوا، سب کو حلال کر دیا۔ لوگوں نے ان کو جھٹلایا اور ان کا کہا نہ مانا۔ (رواه ابن أبي حاتم وهذا أثر غريب)

بنی رباح میں ایک آدمی ابن وائل نام کا تھا، وہ شاعر بھی تھا، اس کا اس پانی پر جو کوفہ سے پَرے تھا، اس پر جدِّ فرزدق سے کچھ جھگڑا ہو گیا، یہ بات ٹھہری کہ اگر اس کے اونٹ اس پانی پر آئیں تو وہ سو اونٹ عقر کرے (کھونچ کاٹے) وہ پانی پر آئے، یہ دونوں تلوار کھینچ کر عرقوب کھول کر سامنے ہوئے، لوگ گدھوں اور خچروں پر سوار ہو کر گوشت لینے کے لیے نکلے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کوفے میں تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر پر سوار ہو کر باہر آئے اور چلا کر کہا: اے لوگو! ان کا گوشت مت کھاؤ، ان پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨١)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ١٢۔ ١٣) صحیح بخاری میں ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ حدیثِ ہرقل میں نہیں ملے۔ [3] تفسير ابن كثير (٢/ ١٣)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اثر غریب ہے، مگر ابو داود میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت اس کی صحت کی شاہد ہے: "نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ مُعَاقَرَةِ الْأَعْرَابِ"[1] دوسری روایت جو عکرمہ رضی اللہ عنہ سے ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِيَيْنِ أَنْ يُّؤْكَلَ" "بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ نے مقابلہ بازی میں آکر کھلانے والوں کا کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے۔"[2]

میں کہتا ہوں: اہلال کے معنی ہیں: آواز بلند کرنا۔ یعنی جس چیز پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا، اور وہ چیز غیر اللہ کے لیے ٹھہرائی گئی تو صرف اس پکار کی وجہ سے اُس کا کھانا حرام ہو جاتا ہے، جب تک کہ اس نیت اور ارادے سے توبہ نہ کرے۔ خواہ ذبح کے وقت ایسے جانور پر غیر اللہ کا نام لے یا نہ لے یا اللہ پاک ہی کا نام کیوں نہ لے، اس لیے کہ حرف ﴿مَآ﴾ علمائے اصول وفقہ کے نزدیک تمام صیغوں میں عام تر ہے۔ ہر ذبیحہ اور غیر ذبیحہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ پھر کسی لغت کی کتاب میں اہلال کے معنی میں ذبح کی قید نہیں لگائی گئی۔

جمہور مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں جو قید غیر اللہ کے نام کے ذکر کی ذبح کے وقت لگائی ہے، اس کا سبب یہی تھا کہ اہلِ جاہلیت ذبح کے وقت بھی کسی صنم یا بت یا طاغوت کا نام لیتے تھے، جس کے لیے اس جانور کو اپنی نیت میں بطورِ نذر و نیاز ٹھہراتے تھے، اسی کا نام ذبح کے وقت بھی لیتے تھے، اس لیے شانِ نزول اور سببِ ورود پر اکثر مفسرین نے اہلال کی تفسیر کرتے وقت ذبح کی قید لگا دی ہے۔ یہ قید مخلوق کی طرف سے تھی نہ کہ خالق کی طرف سے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا جملہ اور لفظ ارشاد فرمایا، جو تمام اشیا کو شامل ہے اور بغیر ذبح کی قید کے ہے، بلکہ صرف آواز بلند کرنے ہی کا اعتبار رکھا کہ جب کسی شَے کو یہ کہیں کہ یہ شَے فلاں کے واسطے ہے اور فلاں کے نام کی ہے اور وہ فلاں غیر اللہ ہے تو وہ شَے صرف اس شہرت اور پکار کی وجہ سے کہ وہ دستورِ شریعت کے خلاف کسی غیر اللہ کے ساتھ اس کی تعظیم کے طور پر منسوب ہے، حرام ہو جائے گی، اگرچہ ذبح کرتے وقت یا اُسے کھاتے وقت اُس پر اللہ ہی کا نام لیں، جس طرح سؤر اور دوسرے حرام جانور اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے سے حلال نہیں ہو جاتے۔ مثلاً شیخ سدو کا بکرا، زین خان کا مرغا، سید احمد کی گائے جو اُن کے نام سے پکارے گئے، اس کو اگر "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ أَكْبَرُ" کہہ کر بھی ذبح کریں گے، جب کہ نیت میں وہ جانور اُن کی نیاز کا ہے تو اُس کا گوشت کھانا حرام ہوگا نہ کہ حلال۔

دیکھو اثر و خبرِ مرتضوی و مصطفوی جو اوپر گزری، اس بات پر دلیل ہے، کیوں کہ ابن وائل نے کچھ ان اونٹوں کو غیر اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا تھا کہ اُس پر سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے منع کیا، بلکہ صرف اہلال، یعنی ان کو غیر اللہ کے نام

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٢٠) امام البانی رحمہ اللہ نے صحیح ابی داود میں اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٥٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٩٦٥)

پر پکارنے کی وجہ سے ان پر تحریم (حرام ہونے) کا حکم لگا دیا۔ سو اس مسئلے میں یہی بات قرآن و حدیث ولغت و اصولِ فقہ و تحقیق علمائے راسخین کے موافق ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر فارسی میں ﴿ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ کی تفسیر میں اس مسئلے پر بہت خوب تقریر لکھی ہے، جس نے آیتِ مذکور کے معنی ان کے خلاف لکھے ہیں اور صرف اہلِ رائے کی قیل وقال اور اجتہاد سے معارضہ کیا ہے، وہ درست نہیں ہے۔ جس نے سید احمد کبیر یا شیخ سدو وغیرہ کے نام کی گائے کو اس بنیاد پر حلال کہا ہے کہ ذبح کے وقت اللہ پاک کے نام سے اُس کا گلا کاٹا گیا اور خون بہایا گیا ہے، سو ایسا شخص شریعت کے مدارک اور شرک کے مظان سے بالکل واقف نہیں ہے۔ نہ ہم ایسے شخص کو مخاطب صحیح سمجھتے ہیں، جس صورت میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلاک کیے گئے جانوروں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا اور ممانعت تحریم کے برابر ہوتی ہے، حالاں کہ اس طعام پر غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا نہ وہ طعام کوئی ذبیحہ ہے تو پھر وہ چیز یا جانور جو غیر اللہ کے لیے نامزد ہوا اور سب لوگوں نے اُس صاحبِ نیاز کے ساتھ جان لیا کہ وہ فلاں اور فلاں کے لیے ہے تو وہ اس نیت اور شہرت کے باوجود کھانے کے لیے کیسے حلال ہوسکتا ہے، باوجودیکہ اعمال کا اعتبار نیتوں سے ہوتا ہے، جب نیت میں شرک ہوا تو اب ذبح کے وقت بسم اللہ کیا فائدہ دے گی، پھر اگر باسم فلاں ذبح کیا ہے تو وہ بالاجماع حرام ہے، اس کی حرمت میں تو کسی معتمد عالم کو اختلاف ہی نہیں ہے۔

منخنقہ اور موقوذۃ:

﴿ اَلْمُنْخَنِقَةُ ﴾ وہ جانور ہے، جو گلا گھونٹنے سے مر گیا، خواہ قصداً ہو یا اتفاقاً، مثلاً: رسی وغیرہ میں پھنس کر دم نکل گیا، ایسا جانور حرام ہے۔ مرغ ہو یا بکری یا گائے یا اونٹ۔ ﴿ اَلْمَوْقُوْذَةُ ﴾ وہ جانور ہے، جو کسی ثقیل غیر محدّد چیز کی ضرب سے مر گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیر واحد نے کہا ہے کہ یہ وہ ہے، جس کو لکڑی سے مارا اور وہ چوٹ کھا کر مر گیا۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جاہلیت والے لاٹھی سے مارتے، جب مر جاتا تو اس کو کھاتے۔[2]

صحیح میں مروی ہے کہ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں معراض (تیر) سے شکار کرتا ہوں، وہ شکار ہوتا ہے؟ فرمایا: جب معراض پھاڑ دے تو کھا اور اگر اس کے عرض سے مرے تو وہ وقیذ ہے، یعنی ﴿ اَلْمَوْقُوْذَةُ ﴾۔ اس کو نہ کھا۔[3] غرضیکہ جس تیر نے چیرا پھاڑا ہے اپنی تیزی سے، اس کو حلال فرمایا اور جو فقط عرض کے صدمے (چوٹ) سے مرا ہے، اس سے منع کیا، دونوں میں فرق ٹھہرایا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فقہا کے نزدیک یہ مجمع علیہ ہے (اجماع ہے)۔

---

[1] تفسیر الطبري (۹/ ٤٩٦) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۹/ ٤٩٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥١٦٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٢٩)

اختلاف اس صورت میں ہے کہ جارحہ (شکار کا ہتھیار) شکار کو صدمے (چوٹ) سے قتل کرے اور زخمی نہ کرے۔ اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ حلال نہیں، جس طرح کہ تیر عرض میں لگے، کیوں کہ دونوں میت ہیں بغیر زخم کے تو وہ وقیذ ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حلال ہے، اس لیے کہ کتے کے شکار کو مباح کیا ہے۔ بغیر تفصیل اس سے اس کی اباحت ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ یہ عمومیت کا تقاضا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے اس مسئلے کے لیے ایک فصل مقرر کی ہے، وہ اس جگہ لکھی جاتی ہے، جو اس فقہی مسئلہ کی بابت شکارِ سگ وغیرہ کے متعلق ہے، اس کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فقہا کے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے، اُس کے ترجمے کی اس جگہ ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔[1]

متردیہ، نطیحہ اور درندے کا کھایا ہوا:

﴿ اَلْمُتَرَدِّيَةُ ﴾ وہ جانور ہے، جو کسی پہاڑ پر سے گرا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہے، جو کنویں میں گرا۔[2] ﴿ النَّطِيْحَةُ ﴾ وہ ہے، جس کو کسی اور کے سینگ نے مارا ہے، سو وہ حرام ہے، اگرچہ سینگ کے زخم نے اُس کے گلے سے خون بہایا ہو۔ ﴿ اَلسَّبُعُ ﴾ سے مراد شیر، چیتا، بھیڑیا اور کتا وغیرہ درندے ہیں، جنھوں نے کسی جانور کو کھایا اور وہ مر گیا، وہ بھی حرام ہے، اگرچہ خون اُس کے گلے سے بہا ہو۔ اس کے حلال نہ ہونے پر اجماع ہے۔

اہلِ جاہلیت ایسے جانور کو جسے کسی درندے نے کھا کر چھوڑ دیا ہے، کھاتے تھے۔ بکری ہو، خواہ اونٹ ہو، خواہ گائے یا اس جیسا کوئی اور جانور۔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیا کو مومنوں پر حرام کیا۔ پھر ان میں سے اس کو مستثنیٰ کیا، جس کو زندہ پا کر ذبح کر لیا ہے کہ اُس کا بعد زکات (ذبح) کے کھانا جائز ہے، کیوں کہ روح اور استقرارِ حیات کے سبب سے ذبح کرنے سے اس میں ہر قسم کے شبہے کا تدارک ہو گیا۔ یہی سعید بن جبیر، حسن اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایسا جانور اگر دُم ہلائے یا پاؤں پھیلائے یا آنکھ پھیرے تو اسے کھا۔[3] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اگر تو نے ﴿ اَلْمَوْقُوْذَةُ ﴾ یا ﴿ اَلْمُتَرَدِّيَةُ ﴾ یا ﴿ النَّطِيْحَةُ ﴾ کو پایا اور وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا ہو تو اس کو کھا۔[4]

ذبح کی ضروری شرط:

امام طاؤس، حسن، قتادہ، عبید بن عمیر اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ "مُذَکَّاۃ" ذبح کے بعد کوئی ایسی حرکت کرے، جو اس کی بقائے حیات کی دلیل ہو تو وہ حلال ہے۔[5] جمہور فقہا کا یہی مذہب ہے اور امام ابو حنیفہ، شافعی اور احمد رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے ان صورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے، جن میں حیوان کی حالت ایسی ہو کہ

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ١٤) [2] تفسير الطبري (٩/ ٤٩٨)

[3] تفسير الطبري (٩/ ٥٠٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد باقر رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

[4] تفسير الطبري (٩/ ٥٠٣) اس کی سند میں "حارث اعور" ضعیف راوی ہے۔ [5] تفسير الطبري (٩/ ٥٠٢۔ ٥٠٤)

اس کے بعد نہ بچے، مگر آیت عام ہے تو اگر اس کو کسی حالت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے تو اس کی دلیل کی حاجت ہوگی۔

صحیحین میں رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم کل دشمن سے ملیں گے، ہمارے پاس چھری چاقو کچھ نہیں، کیا ہم بانس (کی کھپچی) سے ذبح کریں؟ فرمایا: جو چیز خون بہا دے، اللہ کا نام اس پر لیا جائے، اس کو کھاؤ، سوائے دانت اور ناخن کے۔ میں تم کو اس کا سبب بتاتا ہوں۔ دانت تو ہڈی ہے اور ناخن حبشیوں کی چھری ہے۔[1] ابو العشراء دارمی نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کیا ذکاۃ (ذبح کر کے پاک کرنا) لبہ وحلق ہی میں ہوتی ہے؟ فرمایا کہ اگر تو ران میں زخم لگا دے تو بھی تجھ کو کافی ہے۔[2] (رواه أحمد و أهل السنن) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، لیکن یہ محمول ہے اس حیوان پر، جس کے حلق اور لبہ میں ذبح کی قدرت نہ ہو۔[3]

تھان:

امام مجاہد اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿اَلنُّصُبِ﴾ کعبے کے گرد کچھ پتھر تھے، یہ تین سو ساٹھ تھان تھے، جن کے پاس عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں جانور ذبح کرتے اور اُن کا خون بیت اللہ کے سامنے چھڑکتے اور اُن کا گوشت ان پتھروں پر ڈالتے تھے۔[4] اسی طرح اور بہت لوگوں نے کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس کام سے منع کیا اور اُن پر ذبح کیے ہوئے جانوروں کا کھانا حرام فرمایا۔ اگر ان ﴿اَلنُّصُبِ﴾ کے پاس ذبح کرتے وقت اللہ کا نام بھی ذکر کریں، تب بھی وہ ذبائح شرک کی وجہ سے حرام ہیں، جسے اللہ اور رسول نے حرام کیا ہے۔ اس آیت کو انہی معنی پر محمول کرنا چاہیے، اس لیے کہ ﴿مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کی تحریم اوپر بیان ہو چکی ہے۔

تیروں سے فال لینا:

﴿اَزْلَامِ﴾ جمع ہے: "زِلَمْ" کی، کبھی زا پر زبر بھی کہتے ہیں، عرب جاہلیت میں یہ کام کرتے تھے۔ ﴿اَزْلَامِ﴾ تین قداح، یعنی پانسے تھے، ایک پر لکھا تھا: "اِفْعَلْ" یعنی یہ کام کر۔ دوسرے پر لکھا تھا: "لَا تَفْعَلْ" یعنی نہ کر۔ تیسرے پر کچھ نہ ہوتا خالی ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک پر لکھا تھا: "أَمَرَنِيْ رَبِّي" دوسرے پر "نَهَانِيْ رَبِّيْ" اور تیسرا بے کار تھا، اس پر کچھ نہ ہوتا خالی ہوتا۔ جب وہ پانسے ڈالتے تو اگر وہ سہم (تیر) نکلتا، جس میں امر تھا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٦٨)

[2] مسند أحمد (٤/ ٣٣٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٢٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٨١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٠٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٨٤) اس کی سند میں "ابو العشراء" اور ان کے باپ مجہول راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٢٥١)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ١٨)

[4] تفسير الطبري (٩/ ٥٠٨)

تو اس کام کو کرتے اور اگر نہی نکلتی تو اس کام کو چھوڑ دیتے اور اگر خالی نکلتا تو پھر ڈالتے۔ ’’اِسْتِقْسَام‘‘ کے معنی ہیں: پانسے ڈال کر حصہ بانٹنا۔ اپنی اپنی قسمت کا حصہ لیتے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی بات کو مقرر رکھا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿اَزْلَامِ﴾ قداح (پانسے) تھے، جن سے تقسیم امور کرتے تھے۔ یہی امام مجاہد، نخعی، حسن اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ کا قول ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصنامِ قریش میں سب سے بڑا صنم وہ تھا، جس کو ہُبل کہتے تھے، جو کعبے کے کنویں کے اندر تھا، اس کے منہ پر اُس بت کو رکھا ہوا تھا۔ اس میں کعبے کے ہدیے اور مال رکھے جاتے تھے۔ اس کے نزدیک سات عدد ازلام تھے۔ ان پر وہ بات لکھی تھی، جس کا حکم چاہتے تھے، جب ان پر کچھ مشکل آتی، جو کچھ ان پانسوں سے نکلتا، اس کو مانتے، اس کی نافرمانی نہ کرتے۔[1]

صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کعبے میں داخل ہونے لگے تو داخل ہونے سے پہلے اس میں جو بت تھے، وہ نکلوائے۔ ان میں دو مورتیاں ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی بھی تھیں، ان کے ہاتھوں میں ازلام (پانسے) تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے کبھی استقسام نہیں کیا۔[2] یہ بھی صحیح میں مروی ہے کہ سراقہ بن مالک جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پکڑنے کے لیے نکلے اور وہ مدینے کو ہجرت کیے ہوئے جا رہے تھے تو سراقہ نے پانسے سے استقسام کیا کہ ان کو ضرر پہنچاؤں یا نہیں؟ ایسا پانسا نکلا، جو میں ناپسند کرتا تھا۔ سراقہ کہتے ہیں کہ بالآخر میں نے پانسے کا نکلنا نہ مانا اور اُن کے پیچھے گیا۔ پھر دوبارہ، سہ بارہ پانسے ڈالے، ہر بار وہی نکلا جو میں ناپسند کرتا تھا کہ ’’لَا تَضُرُّهُمْ‘‘ (تو انھیں ضرر نہ پہنچا)۔[3]

پھر اسی طرح ہوا۔ سراقہ اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے، اس کے بعد وہ مسلمان ہوگئے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَنْ يَّلِجَ الدَّرَجَاتِ مَنْ تَكَهَّنَ اَوِ اسْتَقْسَمَ اَوْ رَجَعَ مِنْ سَفَرٍ طَائِرًا» ’’وہ ہرگز درجات کو نہیں پہنچ سکتا، جو کہانت کرے یا پانسوں سے حصہ بانٹے یا کسی سفر سے بدشگونی کی وجہ سے لوٹ آئے۔‘‘[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿اَزْلَامِ﴾ سہامِ عرب (عرب کے تیر) اور فارس اور روم کے پانسوں کو کہتے ہیں، ان کے ساتھ قمار بازی کرتے تھے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجاہد کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانسے جوا کھیلنے کے تھے۔ اس میں نظر ہے۔ ہاں مگر یوں کہیں کہ کبھی ان کو استخارے میں اور کبھی جوئے میں استعمال کرتے تھے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ازلام اور قمار کے درمیان فرق کیا ہے۔ قمار کو ’’مَيْسِر‘‘ کہا ہے۔ پانسوں کو ازلام فرمایا ہے، آخر سورت میں ارشاد فرمایا ہے:

---

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۵۱۰۔ ۵۱٤) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۸) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۵۲٤)
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۶۹۳) [4] مسند الشامیین (۳/ ۲۱۰) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۱۶۱)
[5] تفسیر الطبري (۹/ ۵۱۲)

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ [المائدة: ۹۰۔ ۹۱] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک شراب اور جوا، آستانے اور فال نکالنے کے تیر، سب گندے کام ہیں اور شیطان کے عمل سے ہیں، پس تم ان سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ بے شک شیطان چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے سے دشمنی اور بغض ڈال دے، اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟'' اسی طرح اس جگہ فرمایا: ﴿ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ﴾ (آیتِ باب)

ازلام کا شرعی متبادل، استخارہ:

یعنی ازلام کا برتاؤ فسق، گمراہی، ضلالت، جہالت اور شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ جب اپنے امور میں متردد ہوں تو استخارہ اور عبادت کریں، پھر اللہ تعالیٰ سے اُس کام میں، جس کا ارادہ رکھتے ہیں، خیر مانگیں۔[1] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو سب امور میں استخارہ سکھاتے تھے، جس طرح کوئی سورت قرآن کی تعلیم فرماتے تھے۔ کہتے: جب کوئی تم میں کسی کام کا ارادہ کرے تو دو رکعت نماز فرض کے علاوہ پڑھے، پھر یوں کہے: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَآ أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ (وَيُسَمِّيْهِ بِاسْمِهِ) خَيْرٌ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ أَوْ قَالَ عَاجِلِ أَمْرِيْ وَآجِلِهِ فَاقْدُرْهُ لِيْ وَيَسِّرْهُ لِيْ ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّهُ شَرٌّ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ فَاصْرِفْنِيْ عَنْهُ وَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ رَضِّنِيْ بِهٖ »[2] (رواه أحمد وهذا لفظه والبخاري وأهل السنن، وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح غريب لا نعرفه إلا من حديث ابن أبي الموالي) ''اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعے تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں، تیری قدرت کے ساتھ تجھ سے قدرت طلب کرتا ہوں اور تیرے فضلِ عظیم کا تجھ سے سوال کرتا ہوں، کیوں کہ تو قدرت رکھتا ہے، میں قدرت نہیں رکھتا، تو جانتا ہے، میں نہیں جانتا اور تو تمام غیبوں کو جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ کام (یہاں اس کام کا نام لیتے) میرے دین، میرے معاش اور میرے کام کے انجام کے لحاظ سے میرے لیے بہتر ہے تو اُسے میرے لیے مقدر

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۸۔ ۱۹)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۱۰۹) مسند أحمد (۳/ ۳۴۴) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۵۳۸) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۴۸۰) سنن النسائي، رقم الحدیث (۳۲۵۳) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۳۸۳)

فرما دے اور اُس کو میرے لیے آسان کر دے، پھر اس میں میرے لیے برکت عطا فرما اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین، میرے معاش اور میرے کام کے انجام کے لحاظ سے میرے لیے بُرا ہے تو اس کو مجھ سے پھیر دے اور مجھ کو اس سے پھیر دے، پھر جہاں کہیں سے بھی ہو، میرے لیے خیر کو مقدر فرما دے، پھر مجھے اس سے راضی کر دے۔''

اسلام کی عظمت و کاملیت اور کفر کی مایوسی:

آج کافر تمھارے دین سے نا اُمید ہوگئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ''يَئِسُوْا أَنْ يُرَاجِعُوْا دِيْنَهُمْ'' ''وہ نا اُمید ہوگئے کہ وہ ان کے دین کی طرف لوٹیں۔'' یہی امام عطا بن ابی رباح، سدی اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ کا قول ہے۔[1] اسی معنی پر یہ حدیث وارد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں نمازی اس کو پوجیں، لیکن ان کے درمیان بھڑکانا۔[2] یا یہ مراد ہے کہ وہ مسلمین کی مشابہت سے نا اُمید ہیں، کیوں کہ مسلمان لوگ شرک کے مخالف صفات کی وجہ سے ان سے ممیز اور ممتاز ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کفار کی مخالفت میں صبر و استقلال رکھیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ فرمایا: ﴿ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ﴾ یعنی تم اپنی مخالفت میں اُن سے مت ڈرو، مجھ سے ڈرو، میں ان پر تمھاری مدد کروں گا اور اُن کو ہلاک کر دوں گا اور تمھیں ان پر کامیاب کروں گا اور تمھارے دلوں کو ان سے تشفی دوں گا اور تم کو ان پر دنیا و آخرت میں غالب رکھوں گا۔

یہ اس اُمت پر اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ اُن کا دین کامل کر دیا، اب وہ کسی دین کی طرف محتاج نہ رہے، نہ سوا اپنے کسی نبی کے حاجت مند ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیا کیا اور جنوں اور انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ اب نہیں کوئی حلال مگر وہ جس کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال کیا اور نہیں حرام، مگر وہی جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام بتایا اور نہیں کوئی دین مگر وہی جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت ٹھہرایا، غرض جس چیز کی خبر دی ہے، وہی حق اور سچی ہے، اس میں کوئی جھوٹ اور حق کے خلاف بات نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [الأنعام: ١١٥] ''اور آپ کے رب کی بات صدق اور عدل میں مکمل ہے۔'' یعنی خبر میں سچائی اور اوامر و نواہی میں انصافِ کامل ہے۔ سو جب ان کے لیے دین کو کامل کر دیا تو ان پر نعمت تمام ہوگئی، اسی لیے فرمایا کہ آج کے دن میں نے تمھارے لیے دین کو کامل اور نعمت کو تمام کر دیا۔

اسلام کو تمھارے لیے دین پسند کیا، اب تم بھی اپنے لیے اس دین کو پسند کر لو، کیوں کہ یہ وہ دین ہے، جس کو اللہ دوست رکھتا ہے۔ تمام رسولوں سے افضل رسول کو وہ دین دے کر بھیجا ہے اور تمام کتابوں سے اشرف کتاب کو اس

[1] تفسير الطبري (٩/ ٥١٦) تفسير ابن كثير (٢/ ١٩) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٢)

پر اُتارا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ دین سے مراد اسلام ہے، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کو خبر دی ہے کہ لو تمھارا دین ہم نے کامل کر دیا، اب تم کبھی بھی اس میں کسی قسم کے اضافے کے محتاج نہیں ہو گے، اللہ کا پورا کیا ہوا کبھی ناقص نہیں ہوتا، جس کو اللہ نے پسند کیا ہے، کبھی اس پر خفا نہیں ہو گا۔[1]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عرفے کے دن نازل ہوئی، اس کے بعد کوئی حلال حرام نہیں اُترا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس آ کر انتقال فرمایا۔ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج کیا، ہم چلے جاتے تھے کہ اچانک جبریل علیہ السلام ظاہر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر جھکے قرآن کے بوجھ کی وجہ سے، وہ بے طاقت ہوگئی۔ میں نے اُتر کر چادر تانی۔[2] امام ابن جریج رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یومِ عرفہ سے اکاسی (۸۱) دن بعد انتقال کیا۔[3] (رواهما ابن جرير)

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ﴾ شانِ نزول اور عظمت:

عنترہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ حجِ اکبر کے دن جب یہ آیت اُتری تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ روئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: کیوں روتے ہو، کہا: اس لیے روتا ہوں کہ ہم اپنے دین سے زیادتی میں تھے، سو جب دین کامل ہو گیا تو کوئی چیز جو کامل ہوتی ہے، وہ گھٹ جاتی ہے۔ فرمایا: سچ کہتے ہو۔[4] (رواه ابن جرير) حدیث: «إِنَّ الْإِسْلَامَ بَدَءَ غَرِيْباً وَّسَيَعُوْدُ غَرِيْباً فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَآءِ» ”بے شک اسلام ابتدا میں غریب تھا اور پھر غریب ہو جائے گا تو غریبوں کے لیے خوش خبری ہو۔“[5] اسی مطلب کی شاہد ہے۔

طارق بن شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک یہودی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، کہا: اے امیر المومنین! تم یہ آیت اپنی کتاب میں پڑھتے ہو، اگر ہم پر یہ آیت اُترتی تو ہم اس دن کو عید ٹھہراتے، کہا: کونسی آیت؟ کہا: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ... الخ ﴾ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! میں جانتا ہوں، اُس دن کو جس میں یہ آیت اُتری اور اُس گھڑی کو جس میں یہ نازل ہوئی۔ عرفے کی سہ پہر کو جمعے کے دن۔ (رواه أحمد والشيخان والترمذي والنسائي)

بخاری میں اتنا اور ہے کہ اللہ کی قسم! میں عرفے میں تھا، سفیان نے کہا: مجھے شک ہے کہ دن جمعے کا بھی کہا یا نہیں۔[6] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ شک اگر راویوں میں ہے تو پرہیز گاری ہے کہ شیخ نے اس بات کی خبر دی یا

---

[1] تفسير الطبري (۹/ ۵۱۸) اس کی سند حسن ہے۔
[2] تفسير الطبري (۹/ ۵۱۸) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسير الطبري (۹/ ۵۱۸۔ ۵۱۹)
[4] تفسير الطبري (۹/ ۵۱۹) یہ روایت مرسل ہے۔
[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۴۵)
[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۳۳۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۳۰۱۷) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۴۳) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۰۰۲) مسند أحمد (۱/ ۲۸)

نہیں اور اگر وقوف میں ہے کہ حجۃ الوداع کے دن جمعہ تھا یا نہیں تو میں خیال کرتا ہوں کہ ثوری رحمہ اللہ سے ایسی بات صادر نہ ہوگی، اس لیے کہ یہ ایک قطعی اور یقینی امر ہے۔ اس بات میں اصحابِ مغازی و سیر یا فقہا میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس بارے میں احادیثِ متواترہ آئی ہیں، جن کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ واللہ أعلم.[1]

یہ روایت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کئی طرح پر مروی ہے۔ کعب رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر یہ آیت کسی اور اُمت پر اُترتی وہ اس دن میں جس دن یہ نازل ہوئی ضرور غور کرتے اور اُس کو عید ٹھہراتے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کونسی آیت؟ کعب رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ... الخ﴾ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں جانتا ہوں جس دن اور جس جگہ یہ آیت اُتری ہے۔ جمعے کے دن عرفے میں اُتری، یہ دونوں دن بحمداللہ ہماری عید ہیں۔[2] (رواہ ابن جریر) عمار مولیٰ بنی ہاشم نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کو پڑھا، ایک یہودی نے کہا کہ یہ آیت اگر ہم پر اُترتی تو ہم اس دن کو عید ٹھہراتے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ تو دو عیدوں کے دن اُتری ہے، ایک عید عرفہ، دوسرے روزِ جمعہ۔[3] (رواہ ابن جریر) سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی اور آپ عرفہ کی سہ پہر کو کھڑے تھے۔[4] (رواہ ابن مردویہ) معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو منبر پر پڑھا، پھر کہا: "نَزَلَتْ فِيْ يَوْمِ عَرَفَةَ فِيْ يَوْمِ جُمُعَةَ"[5] (رواہ ابن جریر) سیدنا سمرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عرفے کے دن اُتری اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موقف میں کھڑے تھے۔[6] (رواہ ابن مردویہ)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ اثر کہ تمھارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے روز پیدا ہوئے، اور دوشنبہ کے روز مکہ سے نکلے اور دوشنبہ کے روز مدینہ میں داخل ہوئے [اور سورت مائدہ بھی دوشنبہ کے روز نازل ہوئی]۔ یہ اثر غریب ہے۔ اس کو ابن جریر، ابن مردویہ اور طبرانی رحمہ اللہ نے ابن لہیعہ کے طریق سے روایت کیا ہے۔[7] اور اس کی سند ضعیف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے روز پیدا ہوئے۔ دوشنبہ کے دن نبی ہوئے، مکے سے مدینے کو دوشنبہ کے دن ہجرت کی، دوشنبہ کے دن مدینے میں پہنچے، دوشنبہ کے دن

---

① تفسير ابن كثير (٢/ ٢٠) ② تفسير الطبري (٩/ ٥٢٦) اس کی سند حسن ہے۔

③ تفسير الطبري (٩/ ٥٢٥، ٥٢٦) اس کی سند حسن ہے۔

④ تفسير ابن كثير (٢/ ٢١) اس کی سند میں "اسماعیل بن سلیمان" اور "یحییٰ حمانی" ضعیف راوی ہیں۔

⑤ تفسير الطبري (٩/ ٥٢٦۔ ٥٢٩) المعجم الكبير (١٩/ ٣٩٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٧/ ٧٥)

⑥ المعجم الكبير (٧/ ٢٢٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عمر بن موسىٰ بن وجيه وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ٧٥)

⑦ تفسير الطبري (٩/ ٥٣٠) المعجم الكبير (١٢/ ٢٣٧) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

وفات پائی، حجر اسود گرا دوشنبہ کے دن۔[1] مگر یہ ذکر نہیں کیا کہ سورت مائدہ بھی دوشنبے کے دن اُتری۔ واللّٰہ أعلم.

شاید سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد یہ ہے کہ اس آیت کا نزول دو عیدوں کے دن ہوا ہے، جس طرح اوپر گزرا۔ راوی کو اشتباہ ہوا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ دن لوگوں کو معلوم نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں: ''لَيْسَ ذٰلِكَ بِيَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ عِنْدَ النَّاسِ'' ''لوگوں کو اس دن کے بارے میں معلوم نہیں۔''[2] کسی نے کہا ہے کہ حجۃ الوداع میں راہ چلتے اُتری۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غدیرِ خم کے دن اُتری، جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا: «مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ» ''جس کا میں مولا ہوں، علی اس کا مولا ہے۔''[3] (رواہ ابن مردویہ)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ذی الحجہ کے اٹھارویں دن اُتری، یعنی حجۃ الوداع سے واپس جانے کے وقت۔[4] مگر یہ اور وہ روایت دونوں صحیح نہیں ہیں۔ ٹھیک بات جس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہ ہو، وہی بات ہے کہ عرفے کے دن جمعے کے دن نازل ہوئی، جس طرح کہ عمر وعلی و اول ملوکِ اسلام معاویہ وترجمان القرآن سیدنا عبداللہ بن عباس وسمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے اور امام شعبی، قتادہ اور شہر بن حوشب رحمہم اللہ وغیرہ ائمہ وعلما نے ذکر کیا ہے۔ یہی قول امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سے تعجب ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں اس کے نزول کے زمانے کے بارے میں بہت طول دیا، مگر استنباط میں کچھ طول نہ دیا۔

اضطراری حالت میں ان محرمات کو کھانے کی رخصت اور حدود و قیود:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کوئی ان محرمات میں سے کسی شَے کے تناول کرنے کا محتاج ہو اور بھوک کی وجہ سے بے چین ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر کرے گا اور اُس کا یہ قصور بخش دے گا۔ مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے: «إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى رُخْصَةُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّؤْتٰى مَعْصِيَتُهُ» ''اللہ پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں کو لیا جائے، جیسے وہ ناپسند کرتا ہے کہ اُس کی معصیت کو لیا جائے۔''

---

[1] مسند أحمد (۱/ ۲۷۷) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، بعثت اور وفات کا سوموار کے دن ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳۲۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۶۲)

[2] تفسیر الطبري (۹/ ۵۳۱) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[3] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۱) اس کی سند میں ''ابو ہارون عبدی'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ۴۹۲۳) البتہ ''من کنت مولاہ...'' یہ الفاظ دیگر صحیح طرق سے مروی ہیں۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۷۱۳) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۲۱) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۱۷۵۰)

[4] تاریخ بغداد (۸/ ۲۹۰) الدر المنثور (۳/ ۱۹) اس کی سند میں ''مطر وراق'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۴۹۲۳)

[5] تفسیر الطبري (۹/ ۵۳۱) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۱)

یہ الفاظ صحیح ابن حبان میں ہیں۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ کی بیان کردہ روایت کے الفاظ یوں ہیں: «مَنْ لَّمْ یَقْبَلْ رُخْصَةَ اللّٰهِ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ جِبَالِ عَرَفَةَ»[2] ''جو شخص اللہ کی رخصت کو قبول نہیں کرتا، اس پر جبالِ عرفہ کے برابر گناہ ہوتا ہے۔'' اسی لیے فقہا نے کہا ہے کہ بعض اوقات مردار کا کھانا واجب ہوتا ہے، جب جان جانے کا ڈر ہو اور مردار کے سوا کچھ نہ ملے اور کبھی مستحب ہوتا ہے اور کبھی مباح حالات کے مطابق۔ پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ کتنا کھائے۔ بقدرِ سدِ رمق (جان بچانے کے لیے جتنا ضروری ہو) کھائے یا پیٹ بھر کر اور کچھ لے کر رکھ چھوڑے۔ یہ اقوال ہیں، جو کتاب الاحکام میں لکھے گئے ہیں۔

اسی طرح اس میں اختلاف ہے کہ مردار یا اور حرام کھانا یا شکار حالتِ احرام میں موجود پائے تو مردار کھائے یا وہ شکار اور جزا اس کی لازم آتی ہے یا وہ طعام اور اس کے بدل کا ضامن ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے مردار کھانے کے بارے میں دو قول ہیں۔ یہ شرط نہیں ہے کہ تین دن تک کھانا نہ پائے، تین فاقوں کے بعد کھائے، جس طرح کہ عام لوگوں وغیرہم کا وہم ہے، بلکہ جب اضطرار ہو جائز ہے۔ سیدنا ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "إِنَّهُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّا بِأَرْضٍ تُصِيْبُنَا بِهَا الْمَخْمَصَةُ فَمَتٰى تَحِلُّ لَنَا بِهَا الْمَيْتَةُ؟ فَقَالَ: إِذَا لَمْ تَصْطَبِحُوْا وَلَمْ تَغْبِقُوْا وَلَمْ تَحْتَفِئُوْا بَقْلًا فَشَأْنُكُمْ بِهَا" یعنی جب صبح کا کھانا پاس نہ ہو اور ساگ بھاجی بھی نہ ملے تو پھر تم جانو۔[3] (تفرد به أحمد من هذا الوجه، وهو إسناد صحيح على شرط الصحيحين و رواه ابن جرير أيضاً)

امام ابن عون رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے امام حسن رحمہ اللہ کے پاس سمرہ کی کتاب پائی، اس کو پڑھا، اس میں لکھا تھا: وَيُجْزِئُ مِنَ الْاِضْطِرَارِ غَبُوْقٌ أَوْ صَبُوْحٌ"[4] (رواه ابن جرير) امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "إِلٰى مَتٰى يَحِلُّ لِيَ الْحَرَامُ" فرمایا: "إِلٰى أَنْ يَرْوٰى أَهْلُكَ مِنَ اللَّبَنِ أَوْ تَجِيْءُ مِيْرَتُهُمْ"[5] (رواه ابن جرير)

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے اپنی دادی سے روایت کیا ہے کہ اعراب میں سے ایک مرد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، وہ اس چیز کے بارے میں فتویٰ چاہتا تھا، جو اللہ نے اُس پر حرام اور حلال کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: تجھ کو طیبات حلال ہیں اور خبائث حرام ہیں، مگر اس صورت میں کہ تو طعام کی طرف محتاج ہو تو اس میں سے اتنا کھا کہ مستغنی ہو

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٧١) صحيح ابن حبان (٦/ ٤٥١) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨٨٦)

[2] مسند أحمد (٢/ ٧١) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٩٤٩)

[3] مسند أحمد (٥/ ٢١٨) تفسير الطبري (٩/ ٥٣٨) المعجم الكبير (٣/ ٢٥١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٥/ ٧٠)

[4] تفسير الطبري (٩/ ٥٤١)

[5] تفسير الطبري (٩/ ٥٣٩) یہ روایت مرسل ہے۔

جائے تو اس نے کہا کہ وہ کیا فقر ہے، جو مجھ کو حلال ہے اور وہ کیا غنا ہے، جو مجھ کو اس طعام سے غنی کرے؟ فرمایا: جب تونے اپنے اہل کو غبوق (رات کا یا پچھلے پہر کا مشروب) سے سیراب کیا تو اب اس طعام سے جو اللہ نے تجھ پر حرام کیا ہے، بچ کہ وہ سب میسور (آسان) ہے، اس میں کچھ حرام نہیں ہے۔[1] (رواہ ابن جریر)

سیدنا فجیع عامری رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا کہ ہم کو مردار کتنا حلال ہے؟ فرمایا: تمھارا کھانا کیا ہے؟ کہا: صبح و شام ایک پیالا پینا۔ فرمایا: "ذَاكَ دَاءُ الْجُوعِ" (یہ بھوک کا علاج ہے)۔ پھر ان کے لیے مردار کو اس حال میں حلال کر دیا۔[2] (رواہ أبو داود) گویا وہ صبح شام اتنا پاتے تھے کہ کافی نہ تھا، اس لیے ان کی کفایت کے لیے مردار کو حلال کر دیا۔ جو شخص مردار کا پیٹ بھر کر کھانا جائز رکھتا ہے اور مقید بسد رمق (زندگی بچ جائے کی شرط) نہیں کرتا، یہ حدیث اس کی حجت ہے۔

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینے کے پہاڑ حرہ میں آ کر اُترا۔ اس سے ایک مرد نے کہا: میری اونٹنی کھو گئی ہے، اگر تجھ کو ملے تو اُسے پکڑے رکھنا، وہ اُس کو ملی، مگر مالک نہ ملا، وہ اونٹنی بیمار پڑی، اس کی عورت نے کہا کہ اس کو نحر کر، اس نے نہ مانا، وہ مر گئی، کہا: اس کی کھال اُدھیڑ ہم چربی لیں گے، گوشت کھائیں گے، اس نے کہا: نہیں۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لوں۔ آ کر پوچھا، فرمایا: تیرے پاس گزران کے لیے کچھ ہے؟ کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھا۔ اُس کا مالک آیا، اُس سے یہ حال کہا: اُس نے کہا: تو نے ذبح کیوں نہ کیا، کہا: تجھ سے شرمایا۔[3] (تفرد به أبو داود)

یہ حدیث اس شخص کی حجت ہے، جو زمانۂ حاجت تک مردار کا کھانا اور اُس سے پیٹ بھرنا اور اس کو ذخیرہ کرنا جائز کہتا ہے۔ واللہ أعلم. پھر یہ فرمایا کہ مردار کھانے میں اللہ کی معصیت کو حاصل کرنے والا نہ ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے لیے مباح کیا ہے اور دوسرے امر سے سکوت فرمایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے سورت بقرہ میں فرمایا: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ [البقرة: ۱۷۳] ''پھر جو شخص مجبور ہو جائے، جب کہ وہ سرکشی کرنے والا اور حد سے گزرنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' یہ آیت اس شخص کی دلیل ہے، جو کہتا ہے کہ عاصی کو اپنے سفر کی وجہ سے رخصت نہیں ہے، اس لیے کہ رخصت حاصل کرنا معصیت سے نہیں ہوتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں آیتِ باب کی تفسیر یوں لکھی ہے کہ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ ... الخ﴾ تفصیلِ محرمات کی ابتدا ہے،

---

[1] تفسیر الطبري (۹/ ۵۴۰۔ ۵۴۱) المعجم الكبير (۷/ ۲۵۷) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ۴/ ۳۱)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۸۱۷) اس کی سند میں ''وہب بن عقبہ عامری'' مستور راوی ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۸۱۶) اس کی سند حسن ہے۔

جس کو اجمالاً ﴿ إِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ﴾ میں لکھا تھا۔ ان سب کا حاصل گیارہ چیزیں ہیں، جو کھانے کی قسم سے ہیں سوائے آخری چیز کے یعنی پانسے ڈالنا۔ میتہ وہ جانور ہے، جو خود بہ خود مر جائے، اس کا اور جاری خون کا کھانا حرام ہے۔ سؤر سراپائے نجس ہے، اس کے گوشت کی تخصیص اس لیے ہے کہ بڑا مطلب یہی کھانا ہے۔

﴿ مَآ أُهِلَّ ﴾ وہ ہے کہ ذبح کرنے پر یا وقت ذبح کے غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ اہلال غیر اللہ کے نام پر پکارنے کو کہتے ہیں۔ جیسے "بِاسْمِ اللَّاتِ وَالْعُزّٰی وَنَحْوُ ذٰلِكَ" اس کو اللہ نے اس آیت میں حرام کر دیا: ﴿ وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ١٢١]. "اور تم اس (جانور) کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ پڑھا گیا ہو۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" میں جب اس آیت پر کلام کیا تو کہا کہ ظاہر آیت یہ ہے کہ جو چیز غیر اللہ کے لیے ذبح کی گئی، خواہ اس پر نام غیر اللہ کا لیا یا نہ لیا اور وہ لفظ کہا یا نہ کہا، وہ حرام ہے۔ اس کی تحریم اس ذبیحہ کی بھی تحریم سے ظاہر تر ہے، جس پر ذبح کے وقت مسیح یا کسی اور اُس جیسے کا نام لیا گیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ جو ذبح لغیر اللہ تقرب کے لیے کیا ہے، وہ حرام ہے، گو اس پر اللہ کا نام لیا جائے، جس طرح کہ اس اُمت کے منافق کرتے ہیں۔[1] مُنْخَنِقَه وہ ہے، جو دم گھٹنے سے مرے، خواہ اپنے فعل سے یا کسی آدمی وغیرہ کے فعل سے۔

مَیِّتَہ اور مُنْخَنِقَہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ مَیِّتَہ کسی سبب کے بغیر مرا ہے اور مُنْخَنِق دم گھٹنے کے سبب سے مرا ہے۔ مَوْقُوْذَہ وہ ہے، جو پتھر یا لاٹھی وغیرہ کی چوٹ سے بغیر ذبح کیے ہوئے مر جائے۔ وَقْذ چوٹ کی شدت کو کہتے ہیں، جس سے اعضا ڈھیلے ہو کر موت آ جائے۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندوق، پتھر اور تیر کے شکار میں اگلے پچھلے علما کا اختلاف ہے۔ بندوق سے مراد وہ گلولہ ہے، جو کمان میں رکھ کر چھوڑتے ہیں۔ معراض وہ تیر ہے، جس میں پَر نہیں یا وہ عصا، جس کے سر پر لوہا نہیں، جس نے اُس کو وقیذ کہا، وہ بغیر تذکیہ (ذبح کرنے) کے اس کو جائز نہیں کہتا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، امام مالک، ابو حنیفہ، ثوری اور شافعی رحمہم اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔ اہلِ شام اس میں مخالف ہیں۔ سیدنا ابو الدرداء، فضالہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، امام مکحول اور اوزاعی رحمہم اللہ معراض کے شکار کو "لَا بأس به" (کوئی حرج نہیں) کہتے تھے، خواہ وہ خرق ہو، یعنی آر پار ہو یا نہ ہو۔ اس بارے میں سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جو پہلے گزر چکی، اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرق (کٹ جانا) و عدمِ خرق کا اعتبار کیا ہے۔ سو حق یہی ہے کہ حلال نہیں، مگر وہی جو زخم سے مرا نہ وہ جو صدمے (چوٹ) سے مرا۔

اس کا تذکیہ (ذبح کرنا) پہلے ضروری ہے، ورنہ وقیذ ٹھہرے گا۔[2] امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لوہے کی یہ بندوقیں جن میں بارود اور قلعی بھر کر چلاتے ہیں، اُن پر اہلِ علم نے تاخر حدوث (نئی ایجاد) کی وجہ سے کچھ کلام نہیں

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم (١/ ٢٥٩)　[2] الاستذکار (٥/ ٢٦٦۔ ٢٦٨)

کیا۔ ان کا رواج دیارِ یمن میں دسویں صدی میں ہوا۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے مجھ سے پوچھا کہ بندوق کا مارا ہوا شکار، جب کہ شکاری نے اس کو حالتِ حیات میں ذبح نہیں کیا، حلال ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: مجھ کو تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حلال ہے، اس لیے کہ بندوق کی گولی یا چھرا پھاڑ کر ایک جانب سے دوسری جانب کو نکل جاتا ہے۔

سیدنا عدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « إِذَا رَمَيْتَ بِالْمِعْرَاضِ فَخَرَقَ فَكُلْهُ » ”جب تو تیر پھینکے اور وہ شکار کو پھاڑ دے تو تو اُسے کھا۔“ [1] سو شکار کے حلال ہونے کے لیے پھاڑے جانے کا اعتبار کیا۔ [2] بندوق کا خرق تیر، نیزے اور تلوار کے خرق سے بھی زیادہ ہوتا ہے، بلکہ اس کا عمل ہر آلے کے عمل پر فائق ہے تو پھر اس کی کوئی وجہ نہیں کہ بندوق کے شکار کو صدمے (چوٹ) سے مرا ہوا کہیں، نہ عقل میں اور نہ نقل میں، بلکہ عدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جو امام احمد رحمہ اللہ نے لکھی ہے، اس میں آیا ہے: « وَلَا تَأْكُلْ مِنَ الْبُنْدُقَةِ إِلَّا مَا ذَكَّيْتَ » ”بندقہ کا شکار جب تک تو اُسے ذبح نہ کر لے نہ کھا۔“ [3] اس جگہ بندقہ سے مراد کمان کا گلولہ ہے، جو خشک مٹی کا ہوتا ہے۔

صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ بندقہ کے مقتول کو موقوذہ کہتے تھے۔ سالم، قاسم، مجاہد، ابراہیم، عطا اور حسن رحمہم اللہ نے بھی اس کو مکروہ کہا ہے۔ [4] اسی طرح جس کو خذف (ٹھیکری) سے شکار کریں، وہ بھی درست نہیں ہے۔ صحیحین میں عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے آیا ہے: « نَهٰى عَنِ الْخَذْفِ وَقَالَ إِنَّهَا لَا تَصِيْدُ صَيْدًا » ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خذف سے منع فرمایا اور کہا کہ اُس کے ساتھ شکار کرنا شکار نہیں ہے۔“ [5] جو کسی ایسے پتھر سے مرا ہے، جو محدد (تیز دھار والا) نہیں اور اس نے شکار کو پھاڑا نہیں تو وہ وقیذ ہے۔ ہاں اگر اس سے جسم چیرا گیا ہے تو حلال ہے۔

﴿ اَلْمُتَرَدِّيَةُ ﴾ وہ ہے، جو کسی بلندی سے گر کر مرا ہے، سطح یا کوہ یا کسی گڑھے یا مدفن یا چاہ میں گر کر مرا ہے۔ ﴿ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ کسی درندے، مثلاً: شیر، تیندوا، بھیڑیا، چیتا، چرخ (لگڑ بگڑ) یا جیسے کسی درندے نے اُس میں سے کچھ کھا لیا ہو۔ درندہ وہ جانور ہے، جس کے دانت ہوں اور وہ آدمی پر چوٹ کرے، چوپایوں پر دوڑے، دانت سے چیر پھاڑ کرے۔ ہاں جن کو ان محرمات میں زندہ پا لیا اور ذبح کر لیا، وہ حلال ہے اور اگر مر چکا ہے تو حرام ہے۔ ذکاۃ ذبح کرنے کو کہتے ہیں، تذکیہ خون بہانے کو کہتے ہیں۔ مذبوح میں ذبح، منحور میں نحر اور غیر مقدور میں عقر ہوتا ہے، جبکہ اس کے ساتھ اللہ کا نام لیا جائے اور ارادہ اللہ کا قرب حاصل کرنا ہو۔ وہ آلہ جس سے ذبح کیا جائے، جمہور کے نزدیک ایسا ہونا چاہیے، جو گردن کی رگوں کو چیر پھاڑ کر خون بہائے۔ سوائے دانت اور ہڈی کے۔

﴿ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس کے ذبح کرنے سے مقصد کوئی خاص تھان اور جگہ ہو،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٩) [2] فتح القدير (٢/ ١٤)
[3] مسند أحمد (٤/ ٣٨٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔
[4] صحيح البخاري (٥/ ٢٠٨٦) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٥٤)

اگرچہ ذبح کرتے وقت اُس کا نام نہ لیں، بلکہ اس کی تعظیم مراد ہو۔ اس جگہ ”عَلیٰ“ بہ معنی لام ہے۔ یہ جملہ مکرر (دہرایا ہوا) نہیں ہے، کیوں کہ سابقہ جملے سے مراد ذبح کے وقت صنم کا نام لینا تھا اور اس سے مقصود صنم کا نام لیے بغیر اُس کی تعظیم ہے۔ ﴿ اَزْلَام ﴾ سے مراد جوئے کے پانسے ہیں۔ تین زلم تھے، ایک تھیلی میں بھر کر اس کے اندر ہاتھ ڈالتے، جو پانسا نکلتا کہ کر یا نہ کر، اس طرح کرتے۔ مہمل نکلتا تو بھی کیے جاتے، یہاں تک کہ امر یا نہی نکلے۔

اس فعل کو استقسام اس لیے کہتے تھے کہ رزق اور فعل کو اس سے تقسیم کرتے، استقسام گویا تقسیم طلب کرنا ٹھہرا۔ جس طرح استسقاء پانی طلب کرنا ہے۔ حکم قداح کا تھا۔ جوئے کے سب قداح دس ہوتے تھے، انھی سے قمار بازی کرتے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد نرد ہے۔ کسی نے کہا کہ شطرنج ہے۔ اللہ نے استقسام بالازلام کو حرام کیا، اس لیے کہ اس کام میں دعویٰ علم غیب ظاہر ہوتا ہے اور ایک طرح کی کہانت ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اور منجم کے قول میں کچھ فرق نہیں ہے، جو یہ کہتا ہے کہ تو فلاں ستارے کے سبب سے باہر نہ جا اور فلاں ستارے پر جا۔[1] شرح تاویلات میں اس کا انکار کیا ہے، مگر بے فائدہ ہے۔ رمال میں بھی پانسے ڈال کر سعادت ونحوست اور امر ونہی کا حکم نکالتے ہیں، وہ بھی اسی استقسام بالازلام میں داخل ہے۔ مگر مفسر نے اس کا ذکر اس جگہ اس لیے نہیں کیا کہ خود ظاہر ہے۔

﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ کا اشارہ یا تو استقسام بالازلام کی طرف ہے یا سارے محرماتِ مذکورہ کی طرف ہے۔ کچھ ہو اس کام کو فسق فرمایا، اس لیے کہ اگرچہ یہ قرعہ اندازی کے مشابہ ہے، لیکن یہ علمِ غیب میں داخل ہے اور وہ حرام ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کی رو سے: ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾ [لقمان: ٣٤] ”اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [النمل: ٦٥] ”کہہ دیجیے: آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب (کی بات) نہیں جانتا۔“

اس آیتِ شریفہ میں سخت وعید اور ڈانٹ ہے، کیوں کہ فسق شدید ترین کفر ہے۔ یہاں وہ فسق مراد نہیں، جو عام اصطلاح کے مطابق ایمان اور کفر کے بیچ میں ایک درجہ ہے۔ یہ آیت: ﴿ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ ... الخ ﴾ (آیتِ باب) فتح مکہ کے دن آٹھ رمضان سن ۹ ہجری میں اُتری یا سن آٹھ میں یا عرفے کے دن، یا مراد یومِ حاضر ہے نہ کوئی معین دن۔ اب کفار تمھارے دین کے معاملے میں ابطال سے مایوس و نامراد ہوگئے۔ ان کو یہ توقع باقی نہیں رہی کہ وہ تم کو اپنے دین کی طرف پھیر لیں، جس طرح پہلے گمان رکھتے تھے، سو تم ان کے غلبہ یا ابطالِ دین کا خوف نہ کرو، وہ خوف زائل ہوگیا دین ظاہر ہوگیا، تم ڈرو تو مجھ سے ڈرو کہ میں ہر چیز پر قادر ہوں، اگر تم کو فتح یاب کروں گا تو پھر تم پر کوئی بھی غالب نہیں ہوسکتا اور اگر میں تم کو بے یار و مددگار چھوڑ دوں گا تو میرے سوا تمھارا کوئی مددگار نہیں ہے۔

---

[1] معاني القرآن للزجاج (٢/ ١٤٧)

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ﴾ سے مراد جمعے کا روز عرفے کا دن بعد عصر سال حجۃ الوداع ہے۔ صحیح میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ثابت ہوا ہے۔[1] ''اَكْمَلْتُ'' سے مراد یہ ہے کہ میں نے اس دین کو کامل کر دیا، یہ اکمال کا محتاج نہیں ہے۔ سارے ادیان پر غالب ہے۔ اس کے حلال وحرام ومشتبہ وفرائض وسنن وحدود و آداب کے احکام سب محکم ہیں، جن پر کتاب وسنت متضمن اور شامل ہیں۔ لفظ ''لَكُمْ'' کو پہلے ذکر کرنے کا فائدہ پوشیدہ نہیں ہے۔ جمہور نے کہا ہے کہ اس جگہ اکمال سے مراد تمام فرائض اور حلال وحرام کا بیان ہے۔ اس کے بعد بہت قرآن اُترا، جیسے آیتِ ربا وآیتِ کلالہ اور اس جیسی اور آیات۔ بعض نے کہا ہے نہ حلال اُترا نہ فرائض۔

امام سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اکمال کے معنی یہ ہیں کہ تمھارے ساتھ کسی مشرک نے حج نہ کیا۔ نبی کریم ﷺ اور سب مسلمانوں کو موسم خالی ملا۔[2] بعض نے کہا ہے کہ اکمال یہ ہے کہ یہ دین نہ کبھی زائل ہوگا نہ منسوخ، بلکہ آخر زمانے تک باقی رہے گا۔ کسی نے کہا ہے یہ معنی ہیں کہ تم ہر زمانے کے نبی اور کتاب پر ایمان لائے ہو۔ یہ بات اس امت کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی آج کے دن ہم نے اسلام کی شریعت کو کامل کر دیا بغیر نقصان کے، جو اس سے پہلے تھا۔[3]

یہ سب اقوال ضعیف ہیں، اکمال کے معنی اس کے سوا نہیں کہ یہ ان احکام کے بیان میں جن کی ضرورت ہو یا وہ احکام جن کی ہر ہر فرد کو ضرورت پڑ سکتی ہے، جو کافی وافی ہے، اس میں مندرج ہیں۔ یہ آیتِ کریمہ اس کی تائید کرتی ہے: ﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ٣٨] ''ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)۔'' اور آیتِ کریمہ: ﴿ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو؟'' نبی کریم ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْوَاضِحَةِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا»[4] ''میں نے تمھیں واضح دین پر چھوڑا ہے، اس کی رات اس کے دن کی طرح ہے۔''

تقلید اور دین میں رائے کی مذمت:

کتابِ عزیز کی آیتیں دین کے مکمل ہونے پر نص ہیں اور اسی مطلب کو مفید ہیں، اسی دلالت کو صحیح جانتی ہیں، اسی دلیل کی تائید کرتی ہیں۔ یہ آیت رائے کو دفع کرنے کے لیے اور اس بات کو رد کرنے کے لیے کافی ہے کہ رائے دین نہیں ہے، کیوں کہ جب اللہ نے اپنا دین نبی اکرم ﷺ کو قبض کرنے سے پہلے کامل کر دیا تو یہ رائے جس

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥) [2] تفسیر الطبري (٩/ ٥٢٠) [3] تفسیر الخازن (٢/ ١٠)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٣) اس میں ''الواضحة'' کے بجائے ''البیضاء'' کے الفاظ ہیں۔ (السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث: ٩٣٧)

کو اہل الرائے نے نکالا ہے، دین کے مکمل ہونے کے بعد کیا چیز ہوگی؟ اس لیے کہ اگر اہل الرائے کے اعتقاد کے مطابق یہ رائے دین کا حصہ ہے تو دین ابھی تک غیر کامل ہے، جب تک کہ ان کی رائے اس میں شامل نہ ہو اور یہ قرآن کا رد ہے اور اگر دین میں سے نہیں تو پھر اس میں مشغول ہونے سے کیا فائدہ، کیوں کہ جو امر دین میں سے نہیں ہے، وہ سنتِ مطہرہ کے حکم کے مطابق مردود ہے، جس طرح صحیح میں ثابت ہو چکا ہے۔ یہ وہ حجتِ قاہرہ و دلیلِ روشن ہے، جس کو اہلِ رائے کسی طرح اُٹھا نہیں سکتے۔

اس آیتِ کریمہ سے اہلِ رائے کی تمام حجتوں اور وجوہ کو ناقابلِ اعتبار کر دینا چاہیے۔ اللہ نے ہم کو اپنی محکم کتاب میں خبر دی ہے کہ ہم نے دین کو کامل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وفات نہیں پائی، مگر اس خبر کے بعد جو اللہ نے ہم کو دی ہے۔ سو اب اگر کوئی شخص اپنے جی سے کچھ لا کر یہ کہے گا کہ یہ دین ہے تو ہم اُس سے یہ بات کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے زیادہ سچا ہے: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴾ [النساء: ۱۲۲] ''اور اللہ سے بڑھ کر کون قول و قرار میں سچا ہے؟'' تو جا ہم کو تیری رائے کی کچھ حاجت نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ مقلدین نے اس آیت کو اچھی طرح نہ سمجھا بوجھا، اگر سمجھ لیتے تو خود ہی راحت پاتے، ہم کو بھی راحت دیتے۔ ہم کو کتاب محکم میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ قرآن شریف ہر شے پر محیط ہے: ﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ۳۸] ''ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [النحل: ۸۹] ''ہم نے آپ پر ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی یہ کتاب نازل کی ہے، جو مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے۔''

پھر یہ حکم دیا کہ سب بندے کتاب کے حکم پر چلیں، فرمایا: ﴿ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ [المائدۃ: ۴۹] ''اور (اے نبی!) آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے (آپ پر) نازل کیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔'' نیز فرمایا: ﴿ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ﴾ [النساء: ۱۰۵] ''تاکہ آپ کو اللہ نے جو سیدھی راہ دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴾ [الأنعام: ۵۷] ''فیصلے کا (سارا) اختیار اللہ ہی کو ہے، وہ حق بات بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المائدۃ: ۴۴] ''جو لوگ نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔''

دوسری آیت میں ﴿ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ تیسری آیت میں ﴿ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ فرمایا ہے، پھر اسی کتاب محکم میں یہ بھی ارشاد کیا ہے کہ جو چیز رسول لائے ہیں، اس کی پیروی کرو: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ

عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ۷] ''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔'' یہ آیت سنتِ مطہرہ کو لازم پکڑنے کے بارے میں قرآنِ مجید کی آیات میں سے سب سے زیادہ عمومیت رکھنے والی اور تمام احکامات میں سے واضح ترین حکم رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ [النساء: ۵۹] ''تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔'' یہ آیت قرآنِ پاک میں کئی جگہ آئی ہے۔

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ﴾ [النور: ۵۱] ''بس مومنوں کی تو بات ہی یہ ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے، تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ [الأحزاب: ۲۱] ''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے۔'' اس جگہ پر اللہ اور رسول کی اطاعت واجب ہونے کے لیے بہت سی دلیلیں دینے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس بات میں کوئی مسلمان مخالف نہیں ہے۔ اگر کوئی اس بات کا منکر ہوگا تو پھر وہ اسلام کے گروہ سے خارج ہے۔

ان آیاتِ بینات کا اس جگہ لانا اسی مقصد کے لیے ہے کہ مقلدوں کے دل جو پتھر ہوگئے ہیں، وہ نرم پڑیں، اس لیے کہ اگرچہ ہر مسلمان کو یہ اطاعت واجب ہونے کا علم ہے، لیکن کبھی انسان ان قرآنی اعلانات اور محمدی تنبیہات سے غافل ہوجاتا ہے، پھر وہ بات کسی کے یاد دلانے سے یاد آجاتی ہے، خصوصاً وہ شخص جس کی نشو ونما تقلید پر ہوئی ہے اور اُس نے اپنے اسلاف کو اسی حالت پر ثابت قدم پایا ہے، اس کے دل میں یہی بات پڑتی ہے کہ دینِ اسلام یہی ہے، جس پر وہ قائم ہے اور اس کے سلف ثابت قدم تھے اور جو بات اس کے طریقے کے خلاف ہے، وہ اسلام نہیں ہے، مگر جب اپنے جی سے توجہ کرے گا تو رجوع کر سکتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ جب کوئی شخص ان مذاہب میں سے کسی ایک مذہب پر نشو ونما پاتا ہے، پھر اس سے قبل کہ وہ علم میں ماہر ہو اور لوگوں کی باتوں کو پہچاننے والا ہو، وہ اپنے پسندیدہ دین کے خلاف بات کا جلد انکار کر بیٹھتا ہے اور اُس کی طبیعت نفرت کرنے والی اور اُس کا دل منکر ہوجاتا ہے۔ اس طرح کے حالات ہم نے اس قدر دیکھے اور سنے ہیں، جن کا شمار ممکن نہیں، لیکن جب عقل مند آدمی کسی مذہبی مسئلے کے درمیان جس کو کسی مقلد نے روایت کیا ہے اور اُس کے پاس کوئی دلیل اور سند نہیں ہے، بلکہ دلیل سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے محض رائے سے بات کہی ہے اور اس مسئلے کے درمیان جو دلیل کے ساتھ مستند اور قرآن وسنت کی برہان کے ساتھ ہے، موازنہ کرتا ہے تو اس کی عقل اس کو سمجھا دیتی ہے کہ دونوں مذکورہ مسائل کے درمیان ایک بڑی مسافت ہے کہ اس کا طے کرنا مشکل ہے۔

ان دونوں کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں، جو ان کو اکٹھا کر سکے، اس لیے کہ جس شخص نے دلیل کو تھاما ہے، اُس نے وہ بات پکڑی ہے، جس کا پکڑنا اس پر اللہ نے واجب کیا تھا اور وہ شارع علیہ السلام کی راہ پر چلا، جس کو ساری

امت کے لیے شرع ٹھہرایا ہے، کیا اگلی امت کیا پچھلی اُمت، کیا زندہ، کیا مردہ، ایک عالم کے لیے کسی اور کی طرف رجوع کیے بغیر دلیل سے واقف ہونا ممکن ہے۔ جاہل یہ کر سکتا ہے کہ علمائے شریعت سے دلیل طلب کرے اور روایتِ نص چاہے۔ کہے کہ اس معاملے میں اللہ اور رسول کا حکم بتاؤ۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟ رسول اللہ کی حدیث میں اس مسئلے کے بارے میں کیا آیا ہے؟ وہ اُس کو نصِ قرآنی اور برہانِ سنت بتا سکتا ہے۔ اگر سائل عقل رکھتا ہے تو خود اس دلیل کو سن کر سمجھ لے گا اور اگر عاقل ماہر نہیں ہے تو عالم اُس کو آسان اور صاف زبان میں سمجھا سکتا ہے۔

سائل عامل بروایت ہوا نہ عامل برائے اور جس سے مسئلہ پوچھا گیا، وہ راویِ حجت ٹھہرا نہ صاحبِ رائے اور جو شخص مقلد ہے وہ عامل بالرائے ہے نہ عامل بالروایۃ، کیوں کہ وہ غیر کی بات کو دلیل طلب کیے بغیر قبول کرتا ہے اور یہ سائل طالبِ حجت نہ طالبِ رائے۔ اُس نے غیر کی روایت کو قبول کیا ہے نہ اُس کی رائے کو۔ یہ دونوں اس حیثیت سے ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اب تمھیں دیکھو کہ ان دونوں مراتب میں کتنا فرق اور تفاوت ہے، اس بحث پر اگر کلام کو طول دیا جائے تو ورق کے ورق بھر جائیں گے، یہ بحث بجائے خود کافی کشادہ اور لکھی ہوئی ہے۔ ع

در خانہ اگر کس ست یک حرف بس ست

''گھر میں اگر کوئی موجود ہے تو (خبردار کرنے کے لیے) ایک حرف کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔''

اس آیتِ شریفہ میں قیاس کے باطل ہونے پر بھی دلیل ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے صریحاً بیان فرمایا کہ اُس نے تمام معاملات میں اپنے احکام نازل کر دیے ہیں، اگر بعض واقعات غیر مبین رہ جاتے تو دین کامل نہ ہوتا، سو جب سارے وقائع میں نص حاصل ہوگئی تو پھر قیاس اگر اس نص کے موافق ہے تو فضول ہے اور اگر اس کے خلاف ہے تو باطل ہے، جو لوگ قیاس کو ثابت کرتے ہیں، اُنھوں نے اس بات کا بھی جواب دیا ہے، مگر ان کا جواب ناکافی اور غیر صحیح ہے۔ واللہ أعلم.

پھر یہ خبر دی کہ میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ یہ پورا کرنا اس طرح پر ہوا کہ دین کو کامل کر دیا، کسی کی رائے اور عقل کا محتاج نہیں رکھا۔ مکہ فتح ہوگیا، کفار مقہور ہوئے اور اہلِ اسلام پر غلبہ حاصل کرنے سے بالکل مایوس ہوگئے، جس طرح کہ وعدہ فرمایا تھا: ﴿ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ ﴾ [البقرة: ١٥٠] ''تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اتمامِ نعمت یہ ہے کہ ان کے لیے جنت میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ پھر کہا کہ جس دن یہ آیت اُتری، اس دن پانچ عیدیں تھیں: یومِ جمعہ، یومِ عرفہ، عیدِ یہود وعیدِ نصاریٰ، عیدِ مجوس۔ تمام ملتوں کی یہ عیدیں نہ کبھی پہلے اور نہ بعد میں ایک دن میں جمع ہوئیں۔[1] ﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ ﴾ یہ آیت اس جگہ

[1] تفسیر البغوي (٣/ ١٣) تفسیر الخازن (٢/ ٩۔ ١٠)

اور سورت بقرہ اور سورت انعام اور سورت نحل میں آئی ہے۔[1] شرط کا جواب صرف سورت بقرہ میں ذکر فرمایا، وہ ان سب جگہوں میں مقدر کرنا چاہیے، یعنی "فلا إثم علیه"۔ فتح البیان کا کلام مکمل ہوا۔[2]

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا
عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ
فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ④

(اے نبی!) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے (کھانے کی) کیا کیا چیزیں حلال کی گئی ہیں؟ کہہ دیجیے: تمھارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور ان شکاری جانوروں کا (کیا ہوا شکار حلال ہے) جنھیں تم سدھا لیتے ہو، اللہ نے تمھیں جو سکھایا ہے اس کے مطابق تم انھیں سکھاتے ہو، پس وہ جس شکار کو تمھارے لیے پکڑ رکھیں، اس پر اللہ کا نام پڑھو اور اس میں سے کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے ④

حلال کا بیان:

مویشیوں کا حکم تو فرمایا، پھر لوگوں نے اور چیزوں کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ پاک چیزیں تم کو حلال ہیں۔ سو نبی اکرم ﷺ نے جو چیزیں منع فرمائیں، معلوم ہوا کہ وہ پاک نہیں، مثلاً: پھاڑنے والا جانور، چوپایہ یا پرندہ، مثلاً: شیر یا چیتا یا باز یا چیل اور اسی میں سارے مردار خور داخل ہوئے، جیسے: کوا وغیرہا اور جیسے گدھا اور خچر اور جیسے زمین کے کیڑے، مثلاً: چوہا وغیرہ، پہلے حرام فرمایا اس کو جسے پھاڑنے والے نے کھایا، اب اُس میں سے شکاری سدھائے ہوئے جانور کا مارا ہوا حلال کیا، جب اس نے آدمی کی خُو سیکھی تو گویا آدمی نے ذبح کیا، لیکن سِدھنا شرط ہے، سدھا وہ کہ پکڑ کر رکھے، آپ نہ کھائے اور اللہ کا نام لینا شرط ہے دوڑانے کے وقت کہ اُس کے بغیر ذبح درست نہیں، مگر بھول جائے تو معاف ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبیث چیزوں کی تحریم کا ذکر کیا تھا، جو بدن یا دین یا دونوں کے لیے مضر ہیں، پھر ضرورت کے وقت استثناء فرمایا تھا، جیسے کہا: ﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ١١٩] ''حالاں کہ اللہ نے ان (سب جانوروں) کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہے جو اس نے تم پر حرام کیے ہیں، مگر جسے تم کھانے پر مجبور ہو جاؤ (تو وہ بھی حلال ہیں)۔''

---

[1] سورة البقرة، الآیة [آیت: ١٧٣] سورة الأنعام [آیت: ١٤٥] سورة النحل [آیت: ١١٥]
[2] فتح البیان (٣/ ٣٣٢۔ ٣٤٤)

اب پاک چیزوں کے حلال کرنے کا ذکر کیا۔ یہی صفت نبی اکرم ﷺ کی سورت اعراف میں آئی ہے: ﴿ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ﴾ [الأعراف: ١٥٧] ''اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔'' سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اور سیدنا زید بن مہلہل رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اللہ نے مردار حرام کیا، اب ہم کو حلال کیا ہے؟ اس پر یہ آیت اُتری۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ذبائح حلال طیب ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طیب سے مراد ہر حلال شے اور رزق ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ دوا کے لیے پیشاب کا پینا کیسا ہے؟ کہا کہ وہ طیبات میں سے نہیں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے کہا کہ مٹی کا بیچنا جس کو لوگ کھاتے ہیں، کیسا ہے؟ کہا: "لَيْسَ هُوَ مِنَ الطَّيِّبٰتِ" ''وہ طیبات میں سے نہیں ہے۔''[2]

سدھائے ہوئے شکاری کتے اور باز کا شکار:

پھر اللہ تعالیٰ نے سدھائے ہوئے کتے اور باز کا شکار حلال کیا۔ یہی جمہور صحابہ، تابعین اور ائمۂ دین کا مذہب ہے۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ "جَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ" سے سکھایا ہوا کتا اور باز اور ہر پرندہ، جس کو شکار کرنا سکھایا گیا، مراد ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ باز اور صقر (شکاری جانور) جوارح میں سے ہیں۔ اسی طرح علی بن حسین رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ مگر امام مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے لفظِ جوارح مکلبین کی دلیل سے صیدِ طیر کو مکروہ کہا ہے۔

جمہور کا مذہب یہ ہے کہ جیسے سکھائے ہوئے کتے کا شکار حلال ہے، اسی طرح پرندے کا شکار کیا ہوا بھی حلال ہے، کیوں کہ پرندہ اپنے پنجوں سے زخمی کرتا ہے، دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ یہی ائمہ اربعہ وغیرہم کا مذہب ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[3] اس کی دلیل سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے باز کے شکار کیے ہوئے کے بارے میں پوچھا، فرمایا: «مَا أَمْسَكَ عَلَيْكَ فَكُلْ»[4] ''جو وہ تیرے لیے روک کر رکھے، اُسے کھا۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے سیاہ رنگ کے کتے کے شکار کو مستثنیٰ کیا ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک اس کو قتل کرنا واجب ہے، اس کا پالنا حلال نہیں۔ مسلم میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ کالا کتا شیطان ہے۔[5] دوسری حدیث کے الفاظ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٣) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٣)

[3] تفسیر الطبري (٩/ ٥٤٨۔ ٥٥٠) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٤)

[4] تفسیر الطبري (٩/ ٥٠٠) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ عمومِ آیت جمہور کے موقف کی تائید میں ہے۔

[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥١٠)

یوں ہیں: «اُقْتُلُوْا مِنْهَا كُلَّ أَسْوَدَ بَهِيْمٍ»[1] ''ان میں سے ہر سیاہ رنگ والے کو قتل کر دو۔'' شکاری جانوروں کا نام ''جَوَارِح'' اس لیے رکھا ہے، کہ جرح کسب کو کہتے ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے: ''فُلَانٌ جَرَحَ أَهْلَهُ خَيْرًا، أَيْ كَسَبَهُمْ خَيْرًا، أَوْ فُلَانٌ لَا جَارِحَ لَهُ، أَيْ لَا كَاسِبَ لَهُ'' ''فلاں نے اپنے اہل کے لیے بہت اچھی کمائی کی یا فلاں کے لیے کمائی کرنے والا کوئی نہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ أَيْ مَا كَسَبْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ وَّ شَرٍّ''.

ابو رافع مولیٰ رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کتوں کے قتل کا حکم دیا۔ کتے مارے گئے، لوگوں نے آ کر کہا کہ ہم کو اس امت میں سے کیا حلال ہے؟ (یعنی کتوں میں سے) نبی کریم ﷺ نے سکوت فرمایا، اس پر یہ آیت اُتری۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِذَا أَرْسَلَ الرَّجُلُ كَلْبَهُ، وَسَمّٰى، فَأَمْسَكَ عَلَيْهِ، فَلْيَأْكُلْ مَا لَمْ يَأْكُلْ»[2] ''جب کوئی شخص اپنے کتے کو (شکار کے پیچھے) بھیجے اور اُس پر (اللہ کا) نام لے اور وہ اس کے لیے شکار روک کر رکھے تو وہ اس کو کھائے، اگر اُس (کتے) نے نہ کھایا ہو۔''

امام ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام آئے، اذن چاہا، نبی اکرم ﷺ نے اذن دیا، وہ اندر نہ آئے، کہا کہ ہم اس گھر میں نہیں جاتے، جس میں کتا ہوتا ہے، پھر ابو رافع کو حکم دیا کہ مدینے میں جتنے کتے ہیں، سب کو مار ڈالو، چناں چہ مار ڈالا گیا۔ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: ''مَا يَحِلُّ لَنَا مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ الَّتِيْ أَمَرْتَ بِقَتْلِهَا؟'' ''ہمارے لیے اس امت میں سے کیا حلال ہے، جس کے قتل کرنے کا آپ نے حکم دیا؟'' آپ ﷺ خاموش رہے، اُس پر یہ آیت آئی۔[3] (و رواه الحاكم وقال صحيح)

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے ابو رافع کو بھیجا کہ کتوں کو قتل کرو، جب وہ عوالی (مدینہ کے قریب کی بستیاں) تک پہنچے تو عاصم بن عدی، سعد بن خیثمہ، عویمر بن ساعدہ نے آ کر کہا: ''مَا ذَا أُحِلَّ لَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟!'' یعنی یہ تو حرام ہوئے ہمارے لیے حلال کیا ہے؟ اس وقت یہ آیت اُتری۔[4] (رواه الحاكم)

محمد بن قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت کتوں کے قتل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[5] لفظ جوارح اس بات پر دلیل ہے کہ جب شکار صدمہ یا چنگل یا ناخن سے مقتول ہو تو حلال نہیں۔ یہی امام شافعی رحمہ اللہ اور علما کے ایک گروہ کا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٨٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٨٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٠٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٢١)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٤) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير الطبري (٩/ ٥٤٥) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] مستدرک الحاکم میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ ''تفسير الطبري'' (٩/ ٥٤٦) میں یہ روایت موجود ہے۔ نیز یہ روایت مرسل ہے۔

[5] تفسير الطبري (٩/ ٥٤٦)

قول ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ تم ان کو سکھاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم کو سکھایا ہے۔ یعنی جب اُس کو بھیجیں تو جائے، جب اُس کو روکیں تو وہ رُک جائے۔ جب شکار پکڑے تو روک رکھے، آپ نہ کھائے، سو جب جارح معلَّم ہوگا اور شکار کو شکاری کے لیے روک رکھے گا اور ارسال کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا جائے گا تو وہ حلال ہے، گو وہ صید کو قتل کر دے۔ اس پر اجماع ہے۔ سنتِ صحیحہ میں بھی آیتِ باب کے مطابق آیا ہے۔

صحیحین میں عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا: کہ اے اللہ کے رسول! میں اللہ کا نام لے کر کلابِ معلّمہ (سدھائے ہوئے کتوں) کو چھوڑتا ہوں، فرمایا: جب تو اس طرح پر چھوڑے تو ان کے روکے ہوئے کو کھا، میں نے کہا: اگرچہ وہ اُس صید کو قتل کر دیں؟ فرمایا: جب تک کہ کوئی اور کتا شریک نہ ہو، اس لیے کہ تو نے اللہ کا نام اپنے کتے پر لیا ہے نہ کہ غیر کے کتے پر۔[1] الحدیث۔ یہی حدیث جمہور کی دلیل ہے۔ مذہبِ صحیح شافعی بھی یہی ہے۔ سلف کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ مطلقاً حرام نہیں۔

اس بارے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے آثار نقل کیے ہیں، جو سیدنا سلمان، سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ امام زہری اور مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ جس کو روکا، خواہ کھایا ہو یا نہ کھایا ہو، وہ حلال ہے۔[2] بلکہ ابو داود رحمہ اللہ کے نزدیک، عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی حدیث اور ابو ثعلبہ سے مروی حدیث میں باسناد جید آیا ہے: "فَكُلْ وَإِنْ أَكَلَ مِنْهُ" سو تو کھا، اگرچہ اس (کتے) نے اس میں سے کھایا ہو۔[3] سیدنا عدی رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: "قُلْتُ: وَإِنْ أَكَلَ؟ قَالَ: نَعَمْ" "میں نے کہا ہے کہ اگر اُس نے اُس میں سے کھایا ہو؟ فرمایا: ہاں۔"[4] (رواہ الثوري) یہ آثار و اخبار اس بات پر دلیل ہیں کہ گو کتا شکار میں سے کچھ کھالے، تب بھی اُس کا کھانا مغتفر (جائز) ہے۔

یہی آثار اُس شخص کی دلیل ہیں، جو اس بات کا قائل ہے کہ اگر کتا شکار میں سے کچھ کھالے تو وہ حرام نہیں ہو جاتا۔ ایک گروہ نے متوسط طریقہ اختیار کیا اور کہا کہ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کی رو سے اگر امساک کے بعد کھایا تو حرام ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: «فَإِنْ أَكَلَ فَلَا تَأْكُلْ، فَإِنِّي أَخَافُ أَنْ يَّكُوْنَ أَمْسَكَ عَلٰى نَفْسِهٖ»[5] "پھر اگر اُس نے کھایا تو تو نہ کھا، کیوں کہ میں ڈرتا ہوں کہ اُس نے اپنے نفس کے لیے روکا ہو۔" اور اگر روکنے کے بعد منتظر رہا اپنے مالک کا اور اُس کو دیر لگی اور کتے نے بھوک کے سبب کچھ کھا لیا تو وہ اس کے حرام

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٩)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٥۔ ٢٦)
[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٧) اس روایت میں یہ الفاظ "وإن أكل منه" منکر ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ضعيف أبي داود (٢/ ٣٨٦)
[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سماک بن حرب رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے کسی نے ذکر نہیں کیا ہے۔
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٩)

کرنے کے لیے موثر نہیں۔ ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو اسی پر محمول کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "هٰذَا تَفْرِيقٌ حَسَنٌ وَجَمْعٌ بَيْنَ الْحَدِيثَيْنِ صَحِيحٌ" "یہ اچھی تفریق ہے اور ان دونوں حدیثوں کو جمع کرنا صحیح ہے۔" استاد ابو المعالی جوینی نے کتاب نہایہ میں تمنا کی ہے کہ کوئی اس کی تمام تفصیل بیان کرتا، سو ان کی وہ تمنا اللہ نے پوری کر دی، ایک طائفہ نے اس تفریق کو مانا ہے۔ چوتھا قول کتے کے کھانے (عدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی دلیل سے) اور صقور (دوسرا شکاری جانور جو تعلیم کے قابل نہیں) کے کھانے میں فرق کرتا ہے کہ وہ حرام نہیں، اس لیے کہ وہ تعلیم کے قابل نہیں ہے۔ مگر ساتھ اکل کے، کیوں کہ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں یہ شرط آئی ہے کہ کتا نہ کھائے اور بازوں میں یہ شرط مذکور نہیں ہوئی۔ یہ تفرقہ پر دلیل ہے۔[1] واللہ أعلم.

پھر فرمایا کہ کھاؤ اس میں سے جو تمھارے لیے رکھ چھوڑیں اور اس پر اللہ کا نام لو، یعنی اس کو بھیجتے وقت جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عدی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: «إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ، وَذَكَرْتَ اسْمَ اللّٰهِ، فَكُلْ مَا أَمْسَكَ عَلَيْكَ»[2] اور ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے: «إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ، فَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ، وَإِذَا رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ»[3] "جب تو اپنے کتے کو چھوڑے اور تیر چلائے تو اللہ کا نام لے۔" (رواہ الشیخان) اسی لیے آیتِ باب اور حدیثِ مذکور کی دلیل سے امام احمد رحمہ اللہ نے نام لینے کی شرط عائد کی ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ مشہور ہے کہ اس آیت میں کتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لینے کا حکم دیا گیا ہے، جس طرح امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب تو اپنے جارح کو چھوڑے تو بسم اللہ کہہ اور اگر تو بھول گیا ہے تو کچھ حرج نہیں ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ تسمیہ سے مراد کھاتے وقت اللہ کا نام لینا ہے، جس طرح صحیحین میں عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ «سَمِّ اللّٰهَ، وَكُلْ بِيَمِينِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ»[5] "اللہ کا نام لے اور اپنے داہنے ہاتھ سے اور اپنے آگے سے کھا۔" صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایک قوم، جو تازہ تازہ اسلام میں داخل ہوئی ہے، ہمارے پاس گوشت لاتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ اس نے اس پر اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں؟ فرمایا: تم اللہ کا نام لو اور کھاؤ۔[6]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک مرفوعاً مروی ہے: «إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ، فَذَكَرَ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٧) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٧٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٢٩)
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥١٦١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٣٠) [4] تفسیر الطبري (٩/ ٥٧١)
[5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٠٦١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٠٢٢)
[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٩٦٣)

اسْمَ اللّٰهِ، فَإِنْ نَسِيَ اسْمَ اللّٰهِ فِيْ أَوَّلِهِ، فَلْيَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَ آخِرَهُ» [1] ''جب تم میں کوئی کھانا کھائے تو اللہ کا نام لے اور اگر بھول کر شروع میں اللہ کا نام نہ لے تو کہے: بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَ آخِرَهُ'' (رواه أبو داوٗد والنسائي) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس بارے میں اور بہت حدیثیں مروی ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں آیتِ باب کے تحت لکھا ہے کہ طیبات وہ ہیں، جن کا کھانا لذیذ معلوم ہو۔ سلیم الطبع لوگ اس کو پاکیزہ جانیں، خواہ وہ اس قسم سے ہو جس کو اللہ نے حلال کیا ہے، خواہ اس جنس سے ہو جس میں کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ ﷺ سے کوئی نص نہیں آئی اور نہ اس پر اجماع یا قیاس ہی ہوا ہو۔ یا ان سے مراد حلال چیز ہے یا وہ ذبیحہ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، لیکن یہ تخصیص عام ہے، کسی خاص کے لیے نہیں ہے۔ آیت کا سببِ نزول اور عبارت کا انداز دونوں اس مراد کو ظاہر نہیں کرتے۔ کسی کھانے کو پسند کرنے اور لذیذ سمجھنے میں عرب کے اہلِ مروت اور اُن کے اخلاقِ جمیلہ کا اعتبار ہے، کیوں کہ عرب لوگ سارے حیوانات کا کھانا پسند کرتے ہیں، اس آیت کی دلیل سے: ﴿ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ﴾ ''اور وہ (یعنی رسول اللہ ﷺ) گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔'' پس ان کا اعتبار نہیں۔ خبیث ہرگز پسندیدہ نہیں ہوتا۔ یہ آیتِ کریمہ کھانے کے حلال اور حرام ہونے کے لیے نص ہے۔

تکلیب تعلیم کو کہتے ہیں۔ تفسیر جلالین میں جو ارسال کے معنی میں کہا ہے، [2] یہ کہاں تک مستند ہے، قابلِ تحقیق ہے۔ مکلبین کی قید مبالغے کے لیے ہے، اس لیے کہ مکلب اسی کتے کو کہیں گے، جو اپنے علم میں بڑا زیرک اور بڑا ماہر ہوگا۔ دو حدیثیں جو اوپر گزری ہیں، ان کو جمع کرنا بہتر ہے۔ مگر اکثر اہلِ علم ترجیح کی طرف گئے ہیں، اس لیے کہ جمع مذکور میں ایک طرح کا بُعد ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس بحث کو شرح منتقی میں اچھی طرح پر لکھا ہے۔ [3]

اسی طرح تسمیہ سے مراد کھاتے وقت اللہ کا نام لینا بعید ہے، بلکہ تسمیہ سے مراد جارح کو بھیجتے وقت اللہ کا نام لینا ہے۔ اگرچہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو زیادہ ظاہر کہا ہے، [4] مگر بات یہ ہے کہ کتے کو چھوڑتے وقت یا تیر چلاتے وقت اللہ کا نام لینا ایک مسئلہ ہے اور کھانے کے وقت اللہ کا نام لینے کی مشروعیت دوسرا حکم ہے۔ پھر کسی نے تسمیہ کو شرط کہا ہے۔ کسی نے سنت بنایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ذاکر پر شرط ہے نہ بھولنے والے پر۔ یہی قول زیادہ قابلِ ترجیح اور زیادہ مضبوط ہے۔ [5]

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٢٠٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٦٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٥٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٧٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٢٣٧)

[2] تفسير الجلالين (١/ ١٣٤)

[3] نيل الأوطار (٩/ ٤۔ ٨)

[4] تفسير القرطبي (٦/ ٧٤)

[5] فتح البيان (٣/ ٣٤٦۔ ٣٥١)

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ
وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا
مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ
وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے، اور تمھارے لیے پاک دامن مسلمان عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں حلال ہیں، جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب کہ تم انھیں ان کے مہر دے دو، نیز انھیں نکاح کی قید میں لانے والے بنو نہ کہ بدکاری کرنے والے اور نہ چھپی آشنائی رکھنے والے اور جو ایمان سے انکار کرے گا تو اس کا عمل یقیناً برباد ہوگیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا ⑤

پاک چیزوں کی حلت اور اہلِ کتاب کے ذبیحے کا حکم:

فرمایا: آج تم کو پاکیزہ چیزیں حلال ہوئیں، یعنی ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں یہ سب حلال تھیں۔ جب تورات نازل ہوئی تو یہود کے لیے بطور سزا اکثر چیزیں منع ہوئیں اور انجیل میں حلال اور حرام بیان نہ ہوا۔ اب قرآن میں وہی دینِ ابراہیم کے مطابق سب حلال ہوئیں اور فرمایا کہ کتاب والوں کا کھانا حلال ہے، یعنی اُن کا ذبح کیا ہوا۔ اوپر جو ذبح کی شرط فرمائی کہ اللہ کا نام لیا جائے اور غیر کی تعظیم نہ ہو، یہاں اور شرطیں ذکر فرمائیں کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا اہلِ کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ۔ اور کسی دین اور مذہب والے کا ذبح حلال نہیں، اگرچہ وہ اللہ کا نام لے، اُس کا لینا معتبر نہیں اور فرمایا کہ اسی طرح مسلمان کو ان کی عورت سے نکاح کرنا حلال ہے اوروں کی نہیں۔

لٰہذا جن شرطوں سے آپس میں نکاح درست ہے، اسی طرح اُن کا درست ہے۔ پھر اہلِ کتاب کو کافروں سے دو حکم میں مخصوص کیا۔ یہ فقط دنیا میں ہے آخرت میں ہر کافر خراب ہے، اگر عمل نیک بھی کرے تو قبول نہیں۔ اللہ پاک نے پہلے خبائث محرمات کا ذکر کیا، پھر طیبات حلال کا کیا، اب ذکر اہلِ کتاب کے ذبائح کا کیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس، ابو امامہ رضی اللہ عنہم، امام سعید بن جبیر، عکرمہ، عطا، حسن، مکحول، ابراہیم نخعی، سدی، مقاتل بن حیان رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ طعام سے مراد یہود و نصاریٰ کے ذبائح ہیں۔[1] علما کے درمیان یہ امر مجمع علیہ

---

[1] تفسير الطبري (٩/ ٥٧٨۔ ٥٧٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٩)

ہے، یعنی سب اس پر جمع ہیں کہ اہلِ کتاب کے ذبیحے مسلمانوں کے لیے حلال ہیں، اس لیے کہ وہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے ذبح کرنا حرام ہے۔ اپنے ذبائح پر بھی وہ صرف اللہ کا نام لیتے ہیں، اگرچہ وہ اللہ کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھتے ہیں، جس سے اللہ تعالیٰ پاک اور منزہ ہے۔ صحیح میں عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ انھوں نے خیبر کے دن چربی کا ایک توشہ دان بغل میں دبا کر کہا کہ یہ میں کسی کو نہ دوں گا۔ پھر کر دیکھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے تھے۔[1]

فقہا نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس میں سے کسی محتاج کا لے کر کھا لینا جائز ہے۔ لہٰذا یہ استدلال بھی ظاہر ہے۔ اس کے سوا یہ استدلال بھی فقہائے حنفیہ و شافعیہ اور حنابلہ نے اصحابِ مالک پر کیا ہے کہ تم کس طرح اس چیز کے کھانے سے منع کرتے ہو، جس کو یہود اپنے ذبائح میں سے حرام خیال کرتے ہیں، جیسے: چربی وغیرہ جو ان پر حرام تھی، کیوں کہ مالکیہ مسلمانوں کے لیے اس کا کھانا جائز نہیں کہتے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ (آیتِ باب)۔ اس وجہ سے کہ یہ کچھ ان کا طعام نہیں ہے۔

ان کے خلاف جمہور کی دلیل یہی حدیث ہے، مگر اس میں نظر ہے، اس لیے کہ یہ آنکھ کا فیصلہ ہے۔ احتمال ہے کہ وہ چربی ایسی ہو، جس کو وہ حلال جانتے ہیں، جیسے: شحم ظہر وحوایا ونحوھا۔ واللہ أعلم. مگر اس سے زیادہ جید دلیل اُس حدیث میں ہے، جو صحیح میں آئی ہے کہ اہلِ خیبر نے ایک بھنی ہوئی دستی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفے میں بھیجی، وہ دستی زہر آلود تھی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گوشت پسند تھا، اس میں سے کچھ نوچ کر کھایا تھا کہ دستِ گوسفند (بکری کی دستی) نے خبر دی کہ مجھ میں زہر ہے، آپ نے اس کو پھینک دیا، اُس زہر کا اثر آپ کے دانتوں اور ابہر میں باقی رہا۔[2]

دلیل کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گوشت کے کھانے کا ارادہ کیا تھا، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اور یہ نہ پوچھا کہ جو چیز تمھارے اعتقاد میں حرام ہے، جیسے: چربی وہ تم نے اُس میں سے جدا کر لی ہے یا نہیں۔ دوسری حدیث میں مروی ہے کہ ایک یہودی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیافت کی، جو کی روٹی اور بُسا ہوا گوشت کھلایا۔[3] امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ۱۲۱] ''اور تم اس (جانور) کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ پڑھا گیا ہو۔''

پھر اللہ نے مسلمانوں پر رحم فرما کر یہ حکم منسوخ کیا۔ آیتِ باب اس کی ناسخ ہے۔ اہلِ کتاب کے کھانے کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۸۴) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۷۲)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۹۸) سنن أبي داود، رقم الحديث (۴۵۱۲)

[3] مسند أحمد (۳/ ۲۱۰، ۲۷۰) نیز دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۹۶۳، ۱۹۸۶) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۰۴۱)

حلال کر دیا۔[1] امام مکحول رحمہ اللہ کے اس قول میں نظر ہے۔ اس لیے کہ اہلِ کتاب کے کھانے کو مباح کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس جانور کا کھانا بھی مباح ہے، جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، کیوں کہ وہ تو اپنے ذبائح پر اللہ کا نام لیا کرتے تھے، برخلاف سامرہ و صابیہ و متمسکین دینِ ابراہیم و شیث وغیرہ انبیاء علیہم السلام کے۔ اہلِ علم کے ایک قول کے مطابق اور عرب کے نصاریٰ کے مطابق، جیسے: بنی تغلب و تنوخ و بہراد جذام و لخم و عاملہ اور ان جیسے اور، جمہور کے نزدیک ان کے ذبائح حلال نہیں ہیں۔

مجوس کے ذبیحے کا حکم:

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بنی تغلب کے ذبائح نہ کھاؤ، کیوں کہ ان کا نصرانیت کے ساتھ تعلق صرف اسی قدر ہے کہ یہ شراب پیتے ہیں۔[2] بہت سے سلف اور خلف کا یہی قول ہے۔ سعید بن مسیّب و حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی تغلب کا ذبیحہ کھانا "لَا بَأْسَ بِهٖ" ہے (یعنی کوئی حرج نہیں)۔[3] رہے مجوس تو اگر ان سے اس لیے جزیہ لیا جاتا ہے کہ وہ اہلِ کتاب کے تابع اور ان سے ملحق ہیں، لیکن ان کے ذبائح مسلمانوں کے لیے کھانا حلال نہیں اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا صحیح ہے۔ ابو ثور، ابراہیم بن خالد کلبی اور شافعی کے برخلاف۔ جب یہ بات ابو ثور سے مشتہر ہوئی تو فقہا نے انکار کیا، یہاں تک کہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: "أَبُوْ ثَوْرٍ كَاسْمِهٖ" یعنی اس مسئلے میں وہ گاؤ دم ہیں، گویا ان کا تمسک حدیث مرسل کی عمومیت سے ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «سُنُّوْا بِهِمْ سُنَّةَ أَهْلِ الْكِتَابِ»[4] "ان کے ساتھ اہلِ کتاب کے طریقے کے مطابق برتاؤ کرو۔" لیکن یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ ثابت نہیں ہوئی۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسِ ہجر سے جزیہ لیا ہے۔[5] اور اگر مان لیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو بھی اس آیت کے پیشِ نظر یہ عموم خاص نوعیت کا ہوگا: ﴿وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ﴾ (آیتِ باب) کیوں کہ اس آیتِ شریفہ کا مخالف مفہوم یہ ہے کہ غیر اہلِ کتاب کا کھانا حلال نہیں ہے، وہ کسی دین کے کیوں نہ ہوں۔[6]

اہلِ کتاب کے لیے مسلمان کا ذبیحہ:

پھر فرمایا کہ تمھارا طعام ان کو حلال ہے۔ طعام سے مراد ذبائح ہیں، یعنی اگر تم ان کو اپنا ذبیحہ کھلاؤ تو درست ہے۔ یہ اس حکم کی اطلاع نہیں ہے، جو ان کے پاس ہے، مگر یہ اس بات کی اطلاع ہے کہ اُن کو ہر طعام کے کھانے کا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٨، ١٣٧٩) [2] تفسير الطبري (٩/ ٥٧٥) اس کی سند صحیح ہے۔ [3] تفسير الطبري (٩/ ٥٧٤)

[4] الموطأ (١/ ٢٧٨) سنن البيهقي الكبرىٰ (٩/ ١٨٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد باقر رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٥/ ٨٨)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٨٧) [6] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٠)

حکم ہے، جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، خواہ ان کی ملت کے ہوں یا غیر ملت کے۔ لیکن پہلا قول معنی میں زیادہ ظاہر اور واضح ہے کہ اگر تم چاہو تو ان کو اپنا ذبیحہ کھلاؤ، جس طرح تم اُن کا ذبیحہ کھاتے ہو۔ یہ بات ایک طرح کی مکافات (برابر کرنا) و مجازات (بدلہ دینا) ٹھہری، جس طرح نبی اکرم ﷺ نے عبداللہ بن ابی بن سلول کو موت اور دفن کے وقت اپنا کپڑا مرحمت فرمایا، اس لیے کہ اس نے اپنا کپڑا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو اس وقت دیا تھا، جب وہ مدینہ میں آئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے اُس کا عوض اُس وقت دیا۔[1] ذٰلك بِذٰلِكَ. رہی حدیث کہ «لَا يَأْكُلُ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ»[2] ”نہ کھائے تمھارا کھانا مگر متقی“ سو یہ ندب و استحباب پر محمول ہے۔ والله أعلم.

پاک دامن کتابیہ سے نکاح کا حکم:

محصناتِ اہلِ کتاب سے مراد آزاد عورتیں ہیں نہ کہ کنیزیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ یوں ہی ہیں۔ یا حرہ سے مراد عفیفہ (پاک دامن) ہو، جس طرح ان کی روایت کے دوسرے الفاظ ہیں۔[3] یہی جمہور کا قول ہے اور یہی اصل مطلب کے زیادہ مشابہ ہے، تاکہ یہ بات نہ ہو کہ ذمیہ ہو کر غیر عفیفہ بھی ہو تو بالکل بات خراب ہوئی اور شوہر کی وہ مثال ہوئی کہ ”حَشَفاً وَ سُوْءَ كَيْلَةٍ“ ”چیز بھی خراب اور وزن میں بھی خیانت“ ظاہر آیت سے یہی مراد ہے کہ محصنات سے مراد عفائف ہیں، جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ﴾ [النساء: ٢٥] ”جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چوری چھپے آشنا بنانے والی ہوں۔“

پھر مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ لفظ ﴿ مُحْصَنٰتٍ ﴾ ہر کتابیہ عفیفہ کے لیے عام ہے، خواہ وہ آزاد ہو یا کنیز۔ سلف کا ایک گروہ، جو محصنہ کے معنی عفیفہ کہتا ہے، اسی طرف گیا ہے کہ یہ عام مطلب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اس جگہ اہلِ کتاب سے مراد اسرائیلیات ہیں۔ کسی نے کہا ہے مراد ذمیات (ذمی عورتیں) ہیں، جو حرائر (آزاد) نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق: ﴿ قٰتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [التوبة: ٢٩] ”ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔“

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نصرانیہ سے نکاح کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، کہتے تھے اس سے بڑھ کر اور کیا شرک ہوگا کہ وہ کہتی ہے کہ اُس کا رب عیسیٰ ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ﴾ [البقرة: ٢٢١] ”اور تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔“[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اُتری، لوگ رک گئے، پھر یہ آیت آئی: ﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ ... الخ ﴾ (آیتِ باب) اُس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢١٠، ٢٨٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٩٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٤١)

[3] تفسير الطبري (٩/ ٥٨٢۔ ٥٨٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨١)

وقت لوگوں نے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا شروع کیا۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے اسی آیتِ باب کی دلیل سے نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح کیا اور کچھ ڈر نہ مانا اور اس آیت کو سورت بقرہ کی آیت کا مخصص ٹھہرایا۔ یہ جب ہے کہ کتابیات کو آیت کی عمومیت میں داخل سمجھیں، ورنہ دونوں آیتوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، اس لیے کہ اہلِ کتاب کا ذکر کئی جگہ مشرکین سے علاحدہ آیا ہے، اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق: ﴿ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴾ [البينة: ١] ''اہلِ کتاب کے بعض کافر اور مشرکین (کفر سے) رکنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس واضح دلیل آ جائے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ﴾ [آل عمران: ٢٠] ''اور ان اہلِ کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے پوچھیں: کیا تم اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو وہ ہدایت پا گئے۔''

﴿ اُجُوْرَ ﴾ سے مراد مہر ہیں، یعنی جس طرح وہ محصنات عفائف ہیں، اسی طرح تم بھی ان کے مہر بہ خوشی دو۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما، عامر، شعبی، ابراہیم نخعی اور حسن بصری رحمہ اللہ نے اس بات کا فتویٰ دیا ہے، جب کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کرے اور وہ قبل دخول کے زنا کرے تو دونوں کے درمیان علاحدگی کرا دی جائے اور جو مہر دیا ہو، وہ پھروا دیا جائے۔[2] (رواه ابن جرير)

پاک دامنی مرد میں بھی شرط ہے:

اللہ پاک نے جس طرح احصان، یعنی زنا سے پاک دامنی، عورتوں کے لیے شرط رکھی تھی، اسی طرح مردوں میں بھی شرط کی ہے، یعنی یہ چاہیے کہ مرد بھی محصن عفیف ہو۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ ﴿ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ یعنی زانی نہ ہوں، جو کوئی ان کے پاس آئے، اس سے اپنی جان کو روکیں اور پوشیدہ عشقیات زنا نہ کریں، جس طرح سورت نساء میں گزر چکا ہے۔ اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ بغی عورت، یعنی زانیہ سے نکاح درست نہیں ہے، جب تک کہ زنا سے توبہ نہ کرے اور جب تک وہ بغی ہے، اس سے مرد عفیف کا نکاح کرنا درست نہیں۔ اسی طرح فاجر مرد کا عفیفہ عورت سے نکاح درست نہیں ہے، جب تک کہ تائب نہ ہو اور زنا کاری سے باز نہ آئے، اس کی دلیل آیتِ باب ہے اور یہ حدیث: «لَا يَنْكِحُ الزَّانِي الْمَجْلُودُ إِلَّا مِثْلَهُ»[3] ''زانی مجلود (جس کو کوڑے لگ چکے ہوں) نہیں نکاح کرتا، مگر اپنے جیسے کے ساتھ۔''

---

[1] المعجم الكبير (١٢/ ١٠٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٤/ ٥٠٤)

[2] تفسير الطبري (٩/ ٥٨٢) [3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٠٨)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ جس کسی نے اسلام میں فاحشہ کیا ہے، اس کو نہ چھوڑوں کہ وہ کسی محصنہ سے نکاح کرے۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین! شرک اس سے بھی بڑا ہے اور جب اس سے توبہ کی جاتی ہے تو قبول ہوتی ہے۔[1] اس مسئلے کا بیان آگے آئے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ یوں فرمایا ہے کہ جو کوئی ایمان سے منکر ہوا، اس کا عمل ضائع ہوا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ سے مراد وہ دن ہے، جس دن یہ آیت اُتری یا جس کا ذکر پہلے ہو چکا: ﴿ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ ﴾ اور ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ ﴾ یا کوئی دن معین مراد نہیں۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ تینوں دن سے ایک ہی دن مراد ہے، بار بار دُہرانا تاکید کے لیے اور واقعے کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے یہ تکرار اچھی ہے۔[2] لفظ ﴿ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ سے معلوم ہوا کہ جو تورات وانجیل کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ متمسک ہیں، مثلاً: صحفِ ابراہیم علیہ السلام، ان کے ذبیحے اہلِ اسلام کے لیے حلال نہیں ہیں۔

حاصل یہ کہ جس طرح اہلِ کتاب کی پاک دامن عورتوں کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے، اسی طرح ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے بھی اہلِ کتاب کا ذبیحہ ہونا شرط ہے۔ طعام وہ چیز ہے، جو کھانے میں آتی ہے۔ من جملہ اس کے ایک ذبائح بھی ہیں، اکثر اہلِ علم نے اس جگہ طعام کو ذبائح کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔[3] اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ اہلِ کتاب کے تمام کھانے بغیر کسی فرق کے کہ وہ گوشت ہو یا کوئی اور چیز مسلمانوں کے لیے حلال ہیں، اگرچہ اللہ کا نام ان ذبائح پر نہ لیا گیا ہو۔

یہ آیت اللہ تعالیٰ کے تین فرمانِ عام کو خاص کرتی ہے: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ١٢١] ظاہر قرآن یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے ذبائح حلال ہیں، اگرچہ یہودی ان پر عزیر علیہ السلام کا نام اور نصرانی مسیح علیہ السلام کا نام لیں۔ یہی سیدنا ابو الدردا، عبادہ بن صامت، ابن عباس رضی اللہ عنہم اور امام زہری، ربیعہ، شعبی اور مکحول رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔ سیدنا علی، سیدہ عائشہ اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ جب تو سنے کہ کتابی نے غیر اللہ کا نام لیا تو مت کھا۔ یہی امام طاؤس اور حسن رحمہ اللہ کا قول ہے، ان کی دلیل آیتِ مذکور کی عمومیت ہے۔ اس پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے: ﴿ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٧٣] ''جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا جائے۔''

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکروہ ہے، حرام نہیں ہے۔[4] شعبی اور عطا رحمہما اللہ نے حلال کہا ہے، اس لیے کہ اللہ نے

---

[1] تفسیر الطبري (٩/ ٥٨٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسير أبي السعود (٣/ ٩) [3] تفسير الخازن (٢/ ١٤) [4] تفسير القرطبي (٦/ ٧٦) فتح القدير (٢/ ٢١)

اہلِ کتاب کے ذبائح کو حلال کیا ہے اور اللہ جانتا ہے، جو وہ کہتے ہیں۔[1] یہ اختلاف اُس وقت ہے کہ ہم کو معلوم ہو کہ اہلِ کتاب نے غیر اللہ کا نام لیا ہے اور جب کہ یہ بات معلوم نہ ہو تو کیا۔ امام طبری اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کی حلت پر اجماع نقل کیا ہے۔[2] ان کی دلیل آیتِ باب اور وہ حدیث ہے، جو زہر لگی ہوئی بکری کا گوشت کھانے کے متعلق ہے۔[3]

اہلِ کتاب سے مراد:

اہلِ کتاب سے اس جگہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے: بلکہ ساری امتیں مراد ہیں، جو نبی اکرم ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے ان کے دین میں داخل ہوئیں۔ رہے وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد نصاریٰ ہو گئے اور عرب کے بنی تغلب، سو اُن کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ یہی سیدنا علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[4]

امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ جو شخص نزولِ قرآن کے بعد اہلِ کتاب کے دین میں داخل ہوا، اس کا ذبیحہ حلال نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے عرب کے نصاریٰ کے ذبائح کو "لَا بَأْسَ بِهَا" "ان میں کوئی حرج نہیں۔" کہا ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهٗ مِنْهُمْ ﴾ [المائدۃ: ۵۱] "تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔" یہی امام حسن، عطا بن ابی رباح، شعبی، عکرمہ اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[5]

جمہور کہتے ہیں کہ مجوس کے ذبائح کھانا اور اُن کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، اس لیے کہ یہ اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ اہلِ علم کے نزدیک اسی طرح پر مشہور ہے۔ یہی حال تمام اہلِ شرک کا ہے، وہ مشرکینِ عرب ہوں یا بت پرست یا جو کوئی کتاب نہیں رکھتا۔ امام ابو ثور رحمہ اللہ نے جب اس مسئلے میں خلاف کیا تو ان پر فقہا نے انکار کیا۔ جمہور اُمت کا قول یہ ہے کہ نصرانی کا ذبیحہ درست ہے، وہ بنی تغلب ہوں یا اور کوئی۔ اسی طرح یہود کا، باقی طعام بلا اختلاف جائز ہے۔ پھر مسلمانوں کو کہا کہ اگر تم اپنا ذبیحہ اہلِ کتاب کو کھلاؤ تو یہ بھی جائز ہے اور اس بات کی بھی دلیل ملتی ہے کہ مسلمان اُن سے طعام کے عوض جو کچھ لیں، وہ بھی حلال ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ لوگ شریعتِ اسلام کے مخاطب ہیں۔

تمام اقوال کے مطابق اہلِ کتاب کی پاک دامن عورت آیتِ باب میں داخل ہے، مگر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق صرف نصرانی عورت ہی داخل ہے۔ اُس کا جواب یہ ہے کہ آیت عام مشرکات سے تمام اہلِ کتاب کی عورتوں کو خاص کرتی ہے۔ عام کو خاص پر بنا کریں گے، اسی طرح غیر عفیفہ آزاد عورت اور کنیز پاک دامن بھی شامل ہے۔ اس آیتِ مذکور کے تحت اس شخص کے نزدیک شامل ہے، جو کہتا ہے کہ لفظ مشرک کا استعمال دونوں معنی میں جائز ہے اور جو اس کا قائل نہیں اور محصنات سے آزاد عورتیں مراد لیتا ہے، اس کے نزدیک کنیز سے نکاح جائز

---

[1] تفسیر الخازن (۲/ ۱۵)
[2] تفسیر الطبري (۹/ ۵۷۲۔ ۵۷۳) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۹)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] تفسیر الطبري (۹/ ۵۷۵)
[5] تفسیر الطبري (۹/ ۵۷۳۔ ۵۷٤)

نہیں، خواہ وہ عفیفہ ہو یا نہ ہو۔

بالفاظ دیگر وہ صرف آزاد عورت کے ساتھ نکاح کو جائز سمجھتا ہے، عفیفہ ہو یا نہ ہو اور اگر محصنات سے عفائف مراد لیں تو آزاد عفیفہ اور کنیز عفیفہ کے ساتھ نکاح جائز ہوگا نہ کہ غیر عفیفہ کا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کنیز اہل کتاب سے نکاح آیتِ باب کی عمومیت کے تحت جائز ہے۔ خدن چھپے یار کو کہتے ہیں۔ اخدان جمع ہے، مراد وہ لوگ ہیں، جو مخفی معشوقات نہیں رکھتے۔ آیتِ باب کے آخر سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اگر کتابیات سے نکاح کیا تو وہ کچھ اس سبب سے کفر سے خارج نہیں ہوتے۔[1]

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کر لو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک (دھو لو) اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کر لو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے (فارغ ہو کر) آیا ہو یا تم نے عورتوں سے ہم بستری کی ہو، پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمّم کر لو، پس اسے اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مَل لو، اللہ نہیں چاہتا کہ تمھیں تنگی میں ڈالے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کر دے، اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے، تاکہ تم شکر کرو (6)

نماز کے لیے وضو کی فرضیت اور اس کے ارکان:

بہت سے مفسروں نے یہ کہا ہے کہ نماز کی طرف اُٹھنے سے مراد ہے کہ تم بے وضو ہو۔ اوروں نے کہا ہے کہ نیند سے اُٹھو، دونوں معنی قریب ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کے معنی عام تر ہیں، یعنی آیت نماز کے لیے جاتے

[1] فتح البیان (۳/ ۳۵۲۔ ۳۵۷)

وقت وضو کا حکم کرتی ہے۔ لیکن مُحدِث کے لیے یہ وضو واجب ہے اور متطہر کے حق میں مستحب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہر نماز کے لیے وضو کرنا واجب تھا، پھر منسوخ ہو گیا۔

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے۔ جب فتح مکہ کا دن آیا، وضو کر کے دونوں موزوں پر مسح کیا اور ایک ہی وضو سے کئی نمازیں پڑھیں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آج آپ نے وہ کام کیا، جو پہلے کبھی نہیں کرتے تھے، فرمایا: میں نے جان بوجھ کر یہ کام کیا۔[1] (رواہ أحمد و مسلم و أهل السنن) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ فضل بن مبشر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب میں نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ کئی نمازیں ایک وضو سے پڑھتے تھے، جب بَول کرتے یا حدث (بے وضو) ہوتے تو وضو کرتے اور بچے ہوئے پانی سے موزوں پر مسح کرتے تھے۔ میں نے کہا: کیا تم یہ کام اپنی رائے سے کرتے ہو؟ کہا: نہیں۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے دیکھا، وہ اسی طرح کرتے تھے۔[2] (رواہ ابن جریر و ابن ماجه)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے، ان کو اس کام پر مرتے دم تک قوت تھی۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ دائمی فعل استحباب پر دلیل ہے۔ یہی جمہور کا مذہب بھی ہے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلفا ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرتے تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ آیتِ باب کو پڑھتے تھے۔ سیدنا علی اور عمر رضی اللہ عنہما نے ایک ہلکا وضو کیا، پھر کہا کہ یہ اس کا وضو ہے، جس کو حدث نہیں ہوا۔[4] اس کی سند صحیح ہے۔ امام ابن مسیّب رحمہ اللہ کا یہ قول کہ بغیر حدث وضو کرنا اعتداء (زیادتی) ہے،[5] قولِ غریب ہے، بلکہ اس بات پر محمول ہے کہ کوئی اس کے وجوب کا معتقد ہو۔

رہا یہ سوال کہ اس کا مستحب ہونا مشروع ہے تو اس کے لیے حدیث دلیل ہے۔ اس پر سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے۔ عمرو بن عامر انصاری رحمہ اللہ نے کہا ہے میں نے پوچھا: تم کیا کرتے تھے، کہا: ہم ساری نمازیں ایک وضو سے پڑھتے تھے، جب تک حدث نہ ہوتا۔[6] (رواہ أحمد و البخاري وأهل السنن)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جس نے طہر پر (وضو ہوتے ہوئے) وضو کیا، اس کے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧) مسند أحمد (٥/ ٣٥٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٠)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١١) تفسير الطبري (١٠/ ١١) اس کی سند میں ''فضل بن مبشر'' متکلم فیہ راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨) مسند أحمد (٥/ ٢٢٥) مستدرك الحاكم (١/ ٢٥٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٠/ ١٢۔ ١٣) [5] تفسير الطبري (١٠/ ١٠)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١١) مسند أحمد (٣/ ١٣٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣١)

لیے دس نیکیاں لکھی گئیں۔ (رواہ ابن جریر و أبو داود وابن ماجه) ترمذی نے کہا ہے کہ اس کی اسناد ضعیف ہے۔ [1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قوم کا یہ قول ہے کہ یہ آیت اللہ کی طرف سے اس لیے اُتری ہے کہ بتائے کہ وضو صرف نماز کے لیے اُٹھنے پر واجب ہے نہ کہ اور اعمال کے لیے، کیوں کہ جب نبی کریم ﷺ کو حدث ہوتا تو سارے اعمال سے رُک جاتے، یہاں تک کہ وضو کرتے۔ [2] سیدنا علقمہ بن وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب بَول کا ارادہ کرتے، ہم ان سے بات کہتے، وہ ہم سے بات نہ کرتے، ہم سلام کرتے، وہ ہم کو جواب نہ دیتے، یہاں تک کہ یہ آیت اُتری۔ [3] (رواہ ابن أبي حاتم وهو حديث غريب جداً)

اس کی سند میں جابر بن یزید جعفی ضعیف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ جائے ضرور سے آئے، آپ کے سامنے کھانا رکھا گیا، ہم نے کہا: وضو کا پانی لائیں؟ فرمایا: « إِنَّمَا أُمِرْتُ بِالْوُضُوْءِ إِذَا قُمْتُ إِلَى الصَّلَاةِ » "مجھے اس وقت وضو کا حکم دیا گیا، جب میں نماز کے لیے اُٹھوں۔" (رواہ أبو داود) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ [4] صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے پاس تھے، آپ ﷺ خلا کو جا کر آئے، کھانا لایا گیا، کہا: اے اللہ کے رسول! آپ وضو نہیں کرتے؟ فرمایا: « لِمَ، أَأُصَلِّيْ فَأَتَوَضَّأُ؟ » "میں نماز تو نہیں پڑھنے لگا کہ وضو کروں۔" [5]

وضو میں وجوبِ نیت اور طریقہ:

اہلِ علم کے ایک گروہ نے الفاظ ﴿ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ سے وضو میں وجوبِ نیت پر استدلال کیا ہے۔ صحیحین میں مروی ہے: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى » [6] "اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق اجر ملے گا۔" منہ دھونے سے پہلے اللہ کا نام لینا مستحب ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت سے مرفوعاً مروی ہے: « لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ » [7] "اُس کا وضو نہیں، جس نے اس پر اللہ کا نام نہ لیا۔"

برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے دونوں ہتھیلیوں کا دھونا مستحب ہے اور جب نیند سے اُٹھے تو دھونے کی بہت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٢) تفسير الطبري (١٠/ ٢٢)
اس کی سند میں "ابو غطیف" مجہول اور "عبدالرحمن بن زیاد افریقی" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٥٣٦)

[2] تفسير الطبري (١٠/ ٢٢)

[3] تفسير الطبري (١٠/ ٢٢) اس کی سند میں "جابر بن یزید جعفی" ضعیف راوی ہے۔ مزید علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کی تفسیر طبری پر تعلیق دیکھیں۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٦٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٤٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٣٧)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٤) [6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

[7] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٥٧٣)

تاکید آئی ہے۔ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب کوئی تم میں سے نیند سے جاگے تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے، جب تک اُنھیں دھو نہ لے، تم میں سے کسی کو کیا معلوم کہ اس کا ہاتھ کہاں سویا۔[1] فقہا کے نزدیک منہ کی حد لمبائی کے لحاظ سے سر پر بالوں کے اُگنے کی جگہ سے لے کر ڈاڑھی اور ٹھوڑی تک ہے، گنجے پن اور غمم (سر کا بالوں سے بھرا ہونا) کا اعتبار نہیں اور چوڑائی کے لحاظ سے کان سے کان تک ہے۔

ڈاڑھی کا خلال:

نزعتین (کن پٹیاں) میں اختلاف ہے کہ سر میں داخل ہیں یا چہرہ میں اور وہ ڈاڑھی جو فرض جگہ سے لٹکی ہوئی ہے، اس میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اس پر پانی کا پہنچانا واجب ہے، اس لیے کہ روبرو ہے اور ایک حدیث میں مروی ہے: «إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى رَجُلًا مُخَطِّياً لِحْيَتَهُ، فَقَالَ: اكْشِفْهَا، فَإِنَّ اللِّحْيَةَ مِنَ الْوَجْهِ»[2] ''نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا، جس نے اپنی ڈاڑھی کو ڈھانپ رکھا تھا، فرمایا: اس کو کھول دے، بے شک ڈاڑھی چہرے کا حصہ ہے۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هِيَ مِنَ الْوَجْهِ"[3] ''یہ چہرے میں سے ہے۔''

بچے کی جب ڈاڑھی نکلتی ہے تو عرب کہتے ہیں: "طَلَعَ وَجْهُهُ" ''اس کا چہرہ کھل گیا'' وضو کرنے والے کے لیے ڈاڑھی کا خِلال کرنا مستحب ہے، اگر وہ گاڑھی ہو۔ شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ نے دیکھا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی ڈاڑھی میں تین بار خلال کیا، پھر کہا: "رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَعَلَ الَّذِي رَأَيْتُمُونِي فَعَلْتُ" (رواه أحمد و ابن ماجه) ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا، جیسا تم نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس کو حسن کہا ہے۔[4]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب وضو کرتے ایک چلو پانی لے کر ٹھوڑی کے نیچے داخل کر کے ڈاڑھی کا خلال کرتے اور فرماتے: "هٰكَذَا أَمَرَنِي رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ"[5] ''اس طرح کرنے کے لیے مجھے میرے رب عز وجل نے حکم دیا ہے۔'' (تفرد به أبو داود) سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کئی طرح آئی ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ڈاڑھی کا خلال کرنے کے بارے میں سیدہ عمارہ، عائشہ، ام سلمہ اور سیدنا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٧٥٤)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٤)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠) مصنف عبد الرزاق (١/ ٤١) سنن البيهقي الكبرىٰ (١/ ٥٤) مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (۲/۳۴) میں اس کی نسبت امام احمد رحمہ اللہ کی طرف کی ہے۔

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٦٩٦)

علی رضی اللہ عنہم وغیرہ سے روایات آئی ہیں۔ اس کو چھوڑنے کی رخصت کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عمر، حسن بن علی رضی اللہ عنہم، امام ابراہیم نخعی اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت سے مروی ہے۔[1]

مضمضہ اور استنشاق کا حکم:

صحاح وغیرہ میں کئی طرق سے نبی کریم ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ وضو میں مضمضہ و استنشاق (کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا) کرتے تھے۔ ائمہ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں کام وضو اور غسل میں واجب ہیں یا مستحب۔ امام احمد رحمہ اللہ واجب ہونے کے قائل ہیں۔ امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ مستحب ہونے کے قائل ہیں، ان کی دلیل رفاعہ زرقی رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ نے مسیٔ (ناقص نماز پڑھنے والے) سے کہا: «تَوَضَّأْ كَمَا أَمَرَكَ اللّٰهُ»[2] (رواه أهل السنن وصححه ابن خزيمة) ''اس طرح وضو کر جیسے اللہ نے حکم دیا ہے۔''

پھر اس میں اختلاف ہے کہ غسل میں واجب ہیں نہ کہ وضو میں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ یا صرف ناک میں پانی ڈالنا واجب ہے، کلی کرنا نہیں۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت ہے، اس لیے صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے: «مَنْ تَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْشِقْ» ''جو وضو کرے، وہ ناک میں پانی ڈالے۔'' روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہے: «إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ فِيْ مَنْخِرَيْهِ مِنَ الْمَآءِ ثُمَّ لِيَنْتَثِرْ»[3] ''جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو اُسے چاہیے کہ اپنے دونوں نتھنوں میں پانی ڈالے، پھر ناک خوب اچھی طرح صاف کرے۔''

انتثار ناک میں پانی ڈالنے میں مبالغہ کرنے کو کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وضو کرنے کے لیے بیٹھے۔ منہ دھویا ایک چلو لے کر کلی کی، پھر ناک میں پانی ڈالا، پھر ایک چلو لے کر سیدھا ہاتھ دھویا، پھر ایک چلو سے بایاں ہاتھ دھویا، پھر سر پر مسح کیا، پھر ایک چلو لے کر سیدھے پاؤں پر چھڑکا، اس کو دھویا، پھر ایک چلو لے کر بایاں پاؤں دھویا، پھر کہا: ''هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ''[4] (رواه أحمد والبخاري) ''اسی طرح میں نے رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا۔''

کہنیوں تک دھونا:

یہ جو فرمایا کہ ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ، اس کا مطلب یہ ہے کہ کہنی بھی اس کے ساتھ دھوؤ، جیسے اللہ تعالیٰ

---

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (١/ ٥٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٢) سنن النسائي الكبرىٰ (١/ ٥٠٧) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٧٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٤٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٩۔ ١٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠) مسند أحمد (١/ ٢٦٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٤۔ ٣٥)

نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوٰلَهُمْ اِلٰٓى اَمْوٰلِكُمْ ﴾ [النساء: ۲] ’’اور تم ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔‘‘ یعنی حرفِ ’’إِلٰی‘‘ بہ معنی مع ہے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرتے تو کہنیوں پر پانی بہاتے۔[1] (رواہ الدارقطني والبیهقي) لیکن اس حدیث میں قاسم متروک ہے، اس کا دادا ضعیف ہے۔ واللہ أعلم. ہاں کہنی کا ہر دو بازو کے ساتھ دھونا مستحب ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اُس حدیث کی دلیل سے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت قیامت کے دن پکاری جائے گی، چمکتا ہوا چہرہ اور سفید ہاتھ پاؤں ہوں گے، جس کسی سے بنے وہ اپنی چمک کو بڑھائے۔[2] (رواہ البخاري و مسلم) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مومن کا زیور وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک وضو کا پانی پہنچتا ہے۔[3] حرف ’’با‘‘ جو اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ ﴾ میں ہے، اس میں اختلاف ہے کہ یہ اِلصاق (چپکانے) کے لیے ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے، یا تبعیض کے لیے اور اس میں دو اقوال ہیں۔ بعض اہلِ اصول نے کہا ہے، یہ مجمل ہے اس کا بیان سنت سے معلوم کرنا چاہیے۔

سر کے مسح کا حکم اور کیفیت:

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: «ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهٗ بِيَدَيْهِ، فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ، بَدَءَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهٖ، ثُمَّ ذَهَبَ بِهِمَا إِلٰى قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّٰى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِيْ بَدَءَ مِنْهُ» الخ ’’پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سَر کا مسح دونوں ہاتھوں سے کیا، ان دونوں کو آگے سے پیچھے کیا، اس طرح کہ اپنے سر کے اگلے حصے سے شروع کیا اور دونوں ہاتھوں کو اپنی گدی تک لے گئے، پھر ان کو واپس لوٹایا، یہاں تک کہ اُس جگہ پر پہنچ گئے، جہاں سے مسح شروع کیا تھا۔‘‘[4] یہی بات سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے وضو کے بارے میں حدیث میں مروی ہے۔[5] اسی کو امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا معاویہ اور مقداد رضی اللہ عنہما سے وضوئے نبوی کے بارے میں روایت کیا ہے۔[6]

یہ حدیثیں اس شخص کی دلیل ہیں، جو اس بات کا قائل ہے کہ پورے سَر کا مسح واجب ہے۔ امام مالک اور احمد رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ خصوصاً اس شخص کے قول پر جس کا خیال ہے کہ یہ حدیثیں قرآن کے اجمال کو بیان

---

[1] سنن الدارقطني (۱/ ۸۳) سنن البیهقي الکبریٰ (۱/ ۵۶) اس کی سند میں ’’قاسم بن محمد‘‘ ضعیف راوی ہے۔ البتہ امام البانی رحمہ اللہ نے مجموع طرق اور شواہد کی بنیاد پر اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۰۶۷)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۴۶) [3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۰)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۸۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۵)

[5] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۱۱) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۴۹) سنن النسائي، رقم الحدیث (۹۳) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۴۰۴)

[6] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۲۱، ۱۲۴)

کرنے کے لیے آئی ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ چوتھائی سر کا مسح واجب ہے۔ "وَهُوَ مِقْدَارُ النَّاصِيَةِ" (اور وہ پیشانی کی مقدار ہے)۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ اسی قدر واجب ہے، جس پر اسمِ مسح کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کی حد مقرر و معین نہیں کی جاسکتی، اگر سر کے بعض بالوں پر ہاتھ پھیر لیا تو کافی ہے۔ دونوں فریقوں کی حجت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں اس طرح مروی ہے: «وَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهٖ وَعَلَى الْعَمَامَةِ وَعَلٰى خُفَّيْهِ»[1] (الحديث رواه مسلم) "اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسح کیا، اپنی پیشانی پر اور اپنی پگڑی پر اور اپنے دونوں موزوں پر۔"

اصحابِ احمد نے کہا ہے کہ پیشانی پر اقتصارِ مسح اس لیے کیا کہ سر کا باقی مسح عمامہ پر پورا کیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم بھی اسی کے قائل ہیں اور یہ بات موقع کی ہے، کیوں کہ اس بارے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمامہ اور موزوں پر مسح کرتے تھے۔ تو یہی بات زیادہ صحیح ٹھہری۔ تمھاری اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ پیشانی پر بغیر تکمیلِ عمامہ کے اقتصارِ مسح کرنا جائز ہے۔[2] واللہ أعلم.

پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ مسح کو تین بار کرنا مستحب ہے، جس طرح کہ مذہبِ شافعی مشہور ہے۔ یا ایک بار جس طرح کہ مذہبِ احمد ہے۔ یہ دو قول ہوئے۔ حمران بن ابان رحمہ اللہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے وضو کو اس طرح بیان کیا ہے: «ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهٖ ثُمَّ غَسَلَ قَدَمَهٗ... الخ ثُمَّ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا»[3] (الحديث رواه عبد الرزاق والشيخان نحو هذا) "پھر انھوں نے اپنے سر کا مسح کیا، پھر پاؤں دھویا... الخ، پھر کہا: میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا۔"

ابو داود میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے وضو کے بارے میں اس طرح روایت آئی ہے: «وَمَسَحَ بِرَأْسِهٖ مَرَّةً وَّاحِدَةً» "اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے سر کا مسح کیا۔" اسی کی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[4] جس نے کہا: مسح کو بار بار کرنا مستحب ہے، اس کی دلیل صحیح مسلم کی اس حدیث کی عمومیت ہے، جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: «أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا»[5] "کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تین تین دفعہ۔" حمران رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کیا: «ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهٗ ثَلَاثاً إِلٰى قَوْلِهٖ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ هٰكَذَا» (تفرد به أبو داود) پھر امام ابو داود رحمہ اللہ نے کہا کہ صحاح میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث ایک بار مسح کرنے کے بارے میں دلیل ہیں۔[6]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥۔ ٣٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٨، ١١١) امام البانی رحمہ اللہ نے ان دونوں کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: صحيح أبي داود (١/ ١٨١، ١٨٩) [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٠)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٧۔ ١٠٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ مزید دیکھیں: صحيح أبي داود (١/ ١٧٩)

وضو میں ترتیب اور پاؤں کا دھونا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لفظ ﴿ وَاَرْجُلَكُمْ ﴾ کو نصب سے پڑھ کر کہا: "رَجَعَتْ إِلَى الْغَسْلِ" "پاؤں کا تعلق دھونے سے ہے۔" اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام عروہ، عطا، عکرمہ، حسن، مجاہد، ابراہیم، ضحاک، سدی، مقاتل بن حیان، زہری اور ابراہیم تیمی رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔[1] یہ قراءت وجوبِ غسل میں ظاہر ظہور ہے۔ یہی سلف کا قول ہے۔ اسی جگہ سے بعض اہلِ علم صرف وضو کی ترتیب کے وجوب کی طرف گئے ہیں، جس طرح کہ جمہور کا مذہب ہے۔ بخلاف ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے کہ وہ وضو میں ترتیب کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اگر پہلے پاؤں دھوئے، پھر سر کا مسح کرے، پھر ہاتھ دھوئے، پھر منہ تو ان کے نزدیک کافی ہے۔ اس لیے کہ آیت ان اعضا کے دھونے پر دلیل ہے اور واو ترتیب پر دلیل نہیں ہے، بلکہ صرف جمع کے لیے ہے۔

جمہور نے اس کا جواب کئی طریقے سے دیا ہے، ایک یہ کہ آیت نماز کے لیے قیام کے لیے چہرہ دھونے کے وجوب پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ اس کا حکم دیا گیا ہے، فاء تعقیب کے ساتھ، اور یہ فا ترتیب کے لیے ہے، حالاں کہ کسی نے یہ نہیں کہا کہ چہرے کو دھونا پہلے واجب ہے، پھر اس کے بعد ترتیب غیر واجب ہے، بلکہ دو طرح کے قائل ہیں: ایک ترتیب کو واجب کہتا ہے، جس طرح کہ آیت میں واقع ہوا ہے۔ دوسرا بالکل غیر واجب کہتا ہے، آیت اسی پر دلیل ہے کہ چہرے کا دھونا ابتداءً واجب ہے تو اس کے بعد ترتیب واجب ہوئی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم نہیں مانتے کہ واو ترتیب پر دلیل نہیں ہے، بلکہ اس پر دلیل ہے، جس طرح کہ نحویوں اور اہلِ لغت کے ایک گروہ اور بعض فقہا کا مذہب ہے۔ پھر اگر مان بھی لیں کہ ترتیب لغوی پر دلیل نہیں ہے تو شرعاً تو ترتیب پر دلیل ہے، ایسی چیز کے حق میں جس کی حالت یہ ہے کہ وہ اس حدیث کی دلیل سے مرتب ہو، جس میں یوں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کا طواف کر کے بابِ صفا سے باہر آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٥٨] "بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔"

پھر فرمایا: "أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهِ" "میں اس سے ابتدا کرتا ہوں، جس سے اللہ نے ابتدا کی۔" یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔[2] نسائی کے الفاظ یہ ہیں: "اِبْدَؤُا بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهِ"[3] "تم اس سے آغاز کرو، جس کے ساتھ اللہ نے آغاز کیا۔" یہ امر کا صیغہ ہے، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ یہ حدیث اس طرح ابتدا کرنے کے وجوب پر دلیل ہے، جس طرح اللہ نے ابتدا کی۔ یہی معنی ہیں اس بات کے کہ وہ ترتیب پر شرعی دلیل ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ جب

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٦) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢١٨)

[3] سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٩٦٢) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦٧٤٥)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ صفت اس ترتیب پر ذکر کی اور نظیر سے قطع نظر فرما کر مسح کرنے والے حصے کو دو ایسے اعضا کے درمیان ذکر فرمایا، جن کے غسل کا حکم دیا گیا تو یہ ارادۂ ترتیب پر دلیل ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ ابو داود نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک ایک بار وضو کر کے فرمایا کہ اللہ نہیں قبول کرتا، نماز کو مگر اس وضو سے۔[1] سو یہ وضو اگر مرتب (کسی ترتیب پر) تھا تو ترتیب واجب ہوئی یا غیر مرتب تھا تو عدمِ ترتیب واجب ٹھہرے گی، اس کا کوئی قائل نہیں تو پھر ترتیب بھی واجب ہوئی۔

پاؤں کے مسح کا مسئلہ:

دوسری قراءت ”أَرْجُلِكُمْ“ لام کی زیر کے ساتھ ہے۔ یہ قراءت شیعہ کی حجت ہے، جو دونوں پاؤں کے مسح کو واجب کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس لفظ کا عطف سر کے مسح پر ہے۔ سلف کے ایک گروہ سے بھی ایسی روایت آئی ہے، جس سے مسح کے قول کا وہم ہوتا ہے۔ ابو جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ جب دونوں پاؤں کا مسح کرتے تو ان کو تر کر لیتے۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن نازل ہوا ہے مسح کے ساتھ اور سنتِ غسل کے ساتھ۔ یہ اسناد بھی صحیح ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وضو دو غسل اور دو مسح ہیں۔ یہی امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ”أَرْجُلِكُمْ“ پڑھ کر کہا: ”هُوَ الْمَسْحُ“ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، علقمہ، محمد بن علی، حسن، جابر بن زید اور مجاہد رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔ ایوب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے عکرمہ رحمہ اللہ کو دیکھا کہ دونوں پاؤں پر مسح کرتے تھے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبریل مسح ہی لے کر اترے ہیں۔ پھر کہا تو نہیں دیکھتا کہ تیمم اُس چیز کا یہی مسح کرنا ہے، جو دھوئی جاتی ہے اور جس چیز کا مسح کیا جاتا ہے، وہ ملغی ہوتی ہے۔ اسماعیل نے عامر رحمہ اللہ سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں: ”إِنَّ جِبْرِيلَ نَزَلَ بِغَسْلِ الرِّجْلَيْنِ“ ”جبریل پاؤں دھونے کا حکم لے کر نازل ہوئے۔“ کہا: ہاں۔ ”نَزَلَ جِبْرِيلُ بِالْمَسْحِ“[2] ”جبریل مسح کا حکم لے کر نازل ہوئے۔“

یہ آثار نہایت غریب ہیں، اس بات پر محمول ہیں کہ مسح سے مراد ہلکا دھونا ہے۔ یہ زیر قراءت یا تو مجاورت (ہمسائیگی) کی بنیاد اور تناسبِ کلام پر آئی ہے، جیسے عرب کا یہ قول: ”جُحْرُ ضَبٍّ خَرِبٍ“ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ﴾ [الدهر: ٢١] ”ان (کے تن) پر باریک، سبز اور دبیز ریشم

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت سنن ابی داود کے بجائے سنن ابن ماجہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ دیکھیں: سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ معاویہ بن قرہ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ١٢٥)

[2] تفسیر الطبري (١٠/ ٥٧۔ ٦٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٧۔ ٣٨)

کے کپڑے (لباس) ہوں گے۔'' یہ محاورہ لغتِ عرب میں بہت مشہور اور خوشگوار ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دونوں پاؤں پر مسح کرنا یہ محمول ہے اس بات پر کہ ان کے اوپر موزے ہوں۔ (قاله الشافعي) بعض نے کہا ہے کہ یہ پاؤں پر مسح کرنے کی دلیل ہے، لیکن اس سے ان کو ہلکا دھونا مراد ہے، جس طرح سنت میں آیا ہے۔

بہر حال ہر حالت میں ہر شخص کے لیے آیت اور حدیثِ احسن کی دلیل سے پاؤں کا دھونا واجب ہے۔ اس بات کی دلیل کہ مسح سے مراد ہلکا دھونا ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ وہ نمازِ ظہر پڑھ کر لوگوں کے کام کے لیے صحنِ کوفہ میں بیٹھے، نمازِ عصر کا وقت آ گیا، پانی کا ایک کوزہ لائے، اُس میں سے ایک چلو پانی لیا اور منہ ہاتھ اور سر پاؤں کا مسح کیا۔[1] (رواه البيهقي و روى البخاري بعض معناه)

ہاں جو کوئی شیعہ میں سے دونوں پاؤں کے مسح کو موزوں کے مسح کی طرح پسند کرتا ہے، وہ گمراہ ہے اور لوگوں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو مسح کرنے اور دھونے دونوں کو جائز سمجھتا ہے، وہ خطا کار ہے اور جس نے ابن جریر سے یہ بات نقل کی ہے کہ وہ پاؤں دھونے کو احادیث کی رو سے واجب کہتے ہیں اور مسح کو آیت کی رو سے واجب بتاتے ہیں، اُس نے ابن جریر رحمہ اللہ کے مذہب کی تحقیق نہیں کی، کیوں کہ تفسیر میں ان کا کلام دلالت کرتا ہے کہ دونوں پاؤں کو خوب رگڑ کر دھونا واجب ہے نہ کہ تمام اعضائے وضو کو۔ اس لیے کہ پاؤں اکثر زمین اور مٹی سے لگے رہتے ہیں، اس لیے ان کا دلک (ملنا اور رگڑنا) واجب ہے، تا کہ جو کچھ ان میں لگا ہوا ہو، وہ ڈھل جائے، لیکن انھوں نے دلک کی تعبیر مسح کی ہے، اس لیے جس نے ان کے کلام میں غور نہیں کیا، وہ یہ سمجھا کہ ان کی مراد غسل اور مسح کو جمع کرنا ہے، پھر اس کو لوگوں نے بیان کیا، اس لیے بہت سے فقہا نے ان کے کلام کو مشکل ٹھہرایا، سو وہ معذور ہیں، اس لیے کہ غسل اور مسح کو جمع کرنے کے کچھ معنی نہیں ہوتے، خواہ مسح غسل سے پہلے ہو یا بعد میں، اس لیے کہ وہ تو اس کے اندر شامل ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کی مراد وہی ہے، جو ہم نے ذکر کی۔[2] والله أعلم. ان کے کلام میں دوبارہ غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا قصد دونوں قراءت کے درمیان جمع کرنا ہے۔ خفض (کسرہ) دلیل ہے مسح یعنی دلک پر، نصب (زبر) غسل پر، اس لیے انھوں نے دونوں کو واجب کہا۔ أَخْذًا بِالْجَمْعِ بَيْنَ هٰذِهٖ وَهٰذِهٖ.

پاؤں کے دھونے کی احادیث:

دونوں پاؤں دھونے کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں، ان کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے۔ سیدنا عثمان، علی، معاویہ، ابن زید اور مقداد رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث اوپر گزر چکی ہیں۔ ان میں مروی ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں دونوں پاؤں دھوئے، کبھی ایک دفعہ، کبھی دو دفعہ اور کبھی تین دفعہ۔'' عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٩٣) سنن البيهقي الكبرىٰ (١/ ٧٥) [2] تفسير الطبري (١٠/ ٦١۔ ٦٢)

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:«أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ، فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: هٰذَا وُضُوْءٌ، لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ الصَّلَاةَ إِلَّا بِهِ»[1] ”رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا تو اپنے دونوں قدموں کو دھویا، پھر فرمایا کہ یہ وضو ہے، جس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا۔“

صحیحین میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک سفر میں نبی کریم ﷺ ہم سے پیچھے رہ گئے، نمازِ عصر کا وقت آیا، ہم وضو میں پاؤں پر مسح کرنے لگے، اتنے میں نبی اکرم ﷺ آ گئے، چلا کر فرمایا:«أَسْبِغُوا الْوُضُوْءَ وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»[2] ”اچھی طرح سے وضو کرو، خشک ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔“ صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے انھی الفاظ کے ساتھ حدیث مروی ہے۔[3] عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے:«وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ وَبُطُوْنِ الْأَقْدَامِ مِنَ النَّارِ»[4] ”ایڑیوں اور قدموں کے تلوؤں کے لیے آگ کا عذاب ہے (یعنی اگر وضو میں خشک رہیں)۔“(رواه البيهقي والحاكم وهذا إسناد صحيح)

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں:«وَيْلٌ لِّلْعَرَاقِيْبِ مِنَ النَّارِ»[5] ”ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔“ (رواه أحمد) ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کے پاؤں میں ایک درہم کے برابر خشک جگہ دیکھی تو فرمایا:«وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»[6] ”ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔“ (روى ابن ماجه نحوه وابن جرير مثله) پھر کہا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک قوم کو دیکھا، وضو کرتے ہیں ان کی ایڑیوں کو پانی نہیں پہنچا، فرمایا:«وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ» یہی الفاظ معیقیب سے مروی مرفوع حدیث میں بھی آئے ہیں۔[7] (تفرد به أحمد)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب نبی کریم ﷺ نے یہ الفاظ دو دفعہ فرمائے تو مسجد میں کوئی شریف اور کمینہ ایسا نہیں رہا، جو پھر کر اپنے پاؤں کو نہ دیکھتا ہو کہ کہیں سوکھا تو نہیں رہ گیا۔[8] (رواه ابن جرير) ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: صحيح أبي داود (١/ ٢٢٢) نیز اس میں حدیث کے آخری الفاظ "ثم قال هذا..." مروی نہیں ہیں۔ البتہ ان کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠)

[4] مستدرك الحاكم (١/ ٢٦٧) سنن البيهقي الكبرىٰ (١/ ٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧١٣٣)

[5] مسند أحمد (٣/ ٣٦٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧١٣٤)

[6] مسند أحمد (٣/ ٣٩٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٥٤) تفسير الطبري (١٠/ ٦٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧١٣٤)

[7] مسند أحمد (٣/ ٣١٦، ٤٢٦)

[8] تفسير الطبري (١٠/ ٧٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ تفصیل کے لیے علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کی تفسیر طبری پر تعلیق دیکھیں۔

دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک قوم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، ان میں سے کسی ایک کی ایڑھی یا ٹخنے میں ایک درہم یا ناخن کے برابر جگہ پر پانی نہیں لگا تھا، فرمایا:« وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ » تب سے جب کوئی آدمی اپنی ایڑی خشک دیکھتا کہ اُس کو پانی نہیں لگا تو دوبارہ وضو کرتا۔[1] (رواہ ابن جریر)

ان حدیثوں سے دلالت کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر پاؤں پر مسح فرض یا جائز ہوتا تو نہ دھونے پر ایسی سخت وعید نہ آتی، کیوں کہ مسح سارے پاؤں کا نہیں ہوتا، بلکہ مسح خف کی طرح ہوتا ہے، یعنی ہلکا ہوتا ہے۔ (وهكذا وجه الدلالة على الشيعة ابن جرير) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے وضو کیا، اس کا قدم ایک ناخن برابر سوکھا رہ گیا، نبی اکرم ﷺ نے دیکھ کر فرمایا:« اِرْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوْءَكَ »[2] ''واپس جا اور اچھی طرح وضو کر'' (رواہ مسلم) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی انہی الفاظ سے مرفوع روایت آئی ہے۔[3] (رواہ البيهقي وأبو داود و ابن ماجه)

نبی اکرم ﷺ کے بعض اصحاب نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اس کے قدم کی پشت میں ایک درہم کے برابر خشک جگہ ہے، جس کو پانی نہیں پہنچا، فرمایا: پھر وضو کر۔ (رواہ أحمد) ابو داود نے اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ نماز کو بھی لوٹا۔[4] (هذا إسناد جيد قوي صحيح) والله أعلم. سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم ﷺ کے وضو کے متعلق مروی حدیث میں آیا ہے کہ پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خلال کیا۔[5] لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں وضو کا طریقہ بتائیں، فرمایا:« أَسْبِغِ الْوُضُوْءَ، وَخَلِّلْ بَيْنَ الْأَصَابِعِ، وَبَالِغْ فِي الْاِسْتِنْشَاقِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ صَائِمًا »[6] ''اچھی طرح وضو کر، انگلیوں کے درمیان خلال کر اور ناک میں مبالغہ کے ساتھ پانی ڈال، ہاں اگر تو روزے سے ہے تو مبالغہ سے پانی نہ ڈال۔'' (رواہ أهل السنن)

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے وضو کے بارے میں مروی طویل مرفوع حدیث کے الفاظ یوں ہیں:« ثُمَّ يَغْسِلُ

---

[1] تفسير الطبري (۱۰/ ۷۴) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔ [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۴۳)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱/ ۷۰) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٦٥) سنن البيهقي الكبرىٰ (۱/ ۷۰) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ۱/ ۱۲۷)

[4] مسند أحمد (۳/ ۴۲۴) سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۷۵) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (۱/ ۱۲۶۔ ۱۲۷)

[5] سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی وضو کے متعلق روایت میں ''پاؤں کی انگلیوں کے خلال'' والے الفاظ نہیں ملے۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (۲/ ۴۰) میں ان الفاظ کی نسبت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے۔ نیز سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی وضو کے متعلق روایت صحیحین اور دیگر کتب میں مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۵۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۲۶)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۴۲) سنن الترمذي، رقم الحديث (۷۸۸) سنن النسائي، رقم الحديث (۸۷، ۱۱۴) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۰۷۔ ۴۴۸) صحيح الجامع، رقم الحديث (۹۲۷)

قَدَمَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ كَمَا أَمَرَ اللّٰهُ»[1] ''پھر اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے، جیسے اللہ نے حکم دیا'' یہ اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن نے پاؤں دھونے کا حکم دیا ہے۔ حارث نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے کہ کہا: «اِغْسِلُوا الْقَدَمَيْنِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ كَمَا أُمِرْتُمْ»[2] ''اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھوؤ، جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا۔''

یہاں سے اس روایت کا مطلب بھی کھل گیا، جس میں یہ آیا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں قدموں پر پانی چھڑکا اور وہ جوتا پہنے ہوئے تھے، پھر ان کو ملا کہ اس چھڑکنے سے مراد جوتوں کے اندر ہلکا دھونا ہے، کیوں کہ اس بات سے کوئی امر مانع نہیں کہ پاؤں کو دھو لے، جب کہ پاؤں میں جوتا ہو، اس جگہ جوتے سے مراد چپل ہے۔ اس کے اندر پاؤں دھویا جا سکتا ہے۔ اس روایت میں متعمقین، متنطعین اور موسوسین کا رد ہے۔ یہی حال حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا ہے، جس میں اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قوم کے گھورے (کوڑے والی جگہ) پر آئے، پھر کھڑے ہو کر پیشاب کیا، پھر پانی منگوا کر وضو کیا، نعلین پر مسح کیا۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ روایتِ ثقات کے الفاظ ''مَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ''[3] ''اپنے موزوں پر مسح کیا'' ہیں۔ جمع ممکن ہے، اس طرح کہ پاؤں میں موزے ہوں اور موزوں پر نعلین ہوں۔ اوس بن ابی اوس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلٰى نَعْلَيْهِ ثُمَّ قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ» (رواہ أحمد) ''آپ ﷺ نے وضو کیا اور اپنی نعلین پر مسح کیا، پھر نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔'' ابو داود کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: «أَتٰى سَبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ وَتَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلٰى نَعْلَيْهِ وَقَدَمَيْهِ»[4] ''آپ ﷺ ایک قوم کے گھورے (کوڑے والی جگہ) پر آئے، پیشاب کیا اور وضو کیا اور اپنی نعلین پر اور قدموں پر مسح کیا۔'' (و رواہ ابن جریر) ''وَقَالَ هٰذَا مَحْمُولٌ عَلٰى أَنَّهُ تَوَضَّأَ كَذٰلِكَ وَهُوَ غَيْرُ مُحْدِثٍ'' ''اور کہا کہ اس بات کا احتمال ہے کہ آپ نے اس طرح وضو کیا اور آپ محدث (بے وضو) نہیں تھے۔'' کیوں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ کے فرائض اور رسول اللہ ﷺ کی سنتیں ایک دوسرے کے مخالف اور برعکس ہوں۔

نبی اکرم ﷺ سے وضو میں قدموں کے دھونے کے بارے میں عام حکم بفعلِ مستفیض ثابت ہو چکا ہے اور وہ اس شخص کے لیے عذرِ قاطع ہے، جس کو وہ حکم پہنچ چکا۔ جب بعض سلف نے دیکھا کہ قرآن میں پاؤں دھونے کا حکم

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١١٢) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٨٠٤)

[2] سنن البیهقي الکبریٰ (١/ ٧١) اس کی سند میں ''حارث اعور'' ضعیف راوی ہے۔ [3] تفسیر الطبري (١٠/ ٧٥۔ ٧٨)

[4] مسند أحمد (٤/ ٨) سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٦٠) تفسیر الطبري (١٠/ ٧٤۔ ٧٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحیح أبي داود (١/ ٢٨٢) مزید تفصیل کے لیے علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کی تفسیر طبری پر تعلیق دیکھیں۔

ہے، جس طرح کہ قراءتِ نصب ہے اور یہی واجب ہے کہ قراءتِ خفض (کسرے والی) کو اس پر محمول کریں تو یہ توہم کیا کہ یہ آیت موزوں پر مسح کرنے کی رخصت کو منسوخ کرنے والی ہے۔

موزوں پر مسح:

اس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے، مگر اس کی اسناد صحیح نہیں ہے، ان سے اس کے خلاف ثابت ہوا ہے، یہ زعم صحیح نہیں، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے نزول کے بعد موزوں پر مسح کرنا ثابت ہے۔ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نزولِ مائدہ کے بعد ایمان لایا اور میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم، میرے مسلمان ہونے کے بعد، مسح کرتے تھے۔ (تفرد به أحمد)

سیدنا جریر رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: "رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَالَ ثُمَّ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ" "میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب کیا، پھر وضو کیا اور اپنے موزوں پر مسح کیا۔" ابراہیم نے کہا: "كَانَ يُعْجِبُهُمْ هٰذَا الْحَدِيْثُ لِأَنَّ إِسْلَامَ جَرِيْرٍ كَانَ بَعْدَ نُزُوْلِ الْمَآئِدَةِ" هٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ "انھیں یہ حدیث بہت اچھی لگتی تھی، کیوں کہ جریر رضی اللہ عنہ مائدہ کے نازل ہونے کے بعد اسلام لائے تھے۔"[1] غرضیکہ موزوں پر مسح کرنے کی مشروعیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً وفعلاً تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روافض نے اس مسئلے میں اختلاف کیا، جو غیر مستند ہے، بلکہ جہالت اور گمراہی ہے، حالاں کہ صحیح مسلم میں جو امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوا ہے کہ جس طرح صحیحین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاحِ متعہ کی ممانعت آئی ہے،[2] مگر روافض اس کو مباح کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ آیتِ کریمہ اس بات پر دلیل ہے کہ وضو میں پاؤں کو دھونا واجب ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آیتِ مدلول کے مطابق پاؤں دھونے کا عمل متواتر ثابت ہو چکا ہے، مگر روافض اس کے مخالف ہیں، حالاں کہ ان کے پاس اس معاملے میں کوئی صحیح دلیل موجود نہیں ہے۔ فللّٰہ الحمد.

اسی طرح وہ ٹخنوں کے بارے میں جو قدموں میں ہوتے ہیں، آیت اور سلف کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک ٹخنے قدم کے پچھلے حصے میں ہیں۔ ہر پاؤں میں ایک ٹخنہ ہے۔ جمہور کے نزدیک کعبین وہ ہڈیاں ہیں، جو پنڈلی اور قدم کے جوڑ کے نزدیک اُبھرے ہوئے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص کعبین کے بارے میں مخالف ہو، جن کو کہ اللہ نے ہر قدم میں ذکر کیا ہے، جس طرح کہ لوگوں میں مشہور ہے اور اس پر سنت

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢) مسند أحمد (٤/ ٣٦٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٧)

دلیل ہے۔ صحیحین میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ﴿أَنَّهُ تَوَضَّأَ فَغَسَلَ رِجْلَيْهِ الْيُمْنٰى إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَالْيُسْرٰى مِثْلَ ذٰلِكَ﴾[1] ''انھوں نے وضو کیا، اپنا دایاں پاؤں گھٹنوں تک دھویا اور بایاں پاؤں بھی اسی طرح دھویا۔''

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف منہ کر کے فرمایا کہ تم صفوں کو برابر کرو، تین بار فرمایا: واللہ! تم صفوں کو سیدھا کرو، ورنہ اللہ تمھارے دلوں میں مخالفت پیدا کر دے گا۔ میں نے دیکھا کہ مرد اپنے ساتھی کے گھٹنے سے اور اپنے کندھے کو اپنے ساتھی کے کندھے سے چپکاتا ہے۔[2] (رواه البخاري تعليقاً مجزوماً به وأبو داود وهذا لفظ ابن خزيمة) اپنے ساتھی کے گھٹنے سے اپنا گھٹنا خود بہ خود نہیں ملتا، مگر یہ کہ اس سے مراد وہی ہڈی ہو، جو اُبھری ہوئی ہے، یہاں تک کہ دوسرے کے گھٹنے سے ملے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ کعبین وہی دو ہڈیاں ہیں، جو پنڈلی کے جوڑ کے نزدیک اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں، جس طرح کہ اہلِ سنت کا مذہب ہے۔ یحییٰ بن حارث تیمی نے کہا ہے کہ میں نے اصحابِ زید کے مقتولین میں نظر کی، دیکھا تو گھٹنوں کو پشتِ قدم کے اوپر پایا۔ جو شیعہ کو ان کے قتل کے بعد سزا ہوئی۔ یہ مخالفتِ حق کی سزا ہے، جو انھیں ملی۔[3]

تیمّم کا حکم:

بقیہ آیتِ باب میں تیمّم کا حکم فرمایا ہے۔ اس آیت پر کلام سورت نساء میں گزر چکا ہے۔ سببِ نزول بھی مذکور ہو چکا ہے، مگر امامِ بخاری رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک خاص حدیث اس آیتِ کریمہ سے متعلق روایت کی ہے، وہ یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میرا ہار بیداء میں گر گیا اور ہم مدینہ کو آ رہے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ بٹھا کر سواری سے اُتر کر اپنا سر میری گود میں رکھ کر آرام فرمایا، سو گئے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آ کر مجھ کو ایک سخت ٹھونسا مارا اور کہا: تو نے لوگوں کو ایک ہار کی خاطر روک رکھا ہے، میں نے اس وقت موت کی تمنا کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جگہ ٹھہرنے کے سبب سے، کیوں کہ مجھے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تکلیف پہنچائی۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جاگے صبح کا وقت ہوا، پانی ڈھونڈا تو نہ ملا، اُس پر یہ آیت اُتری: ﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ... الخ﴾ (آیتِ باب)۔

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کہا: "بَارَكَ اللّٰهُ لِلنَّاسِ فِيكُمْ يَآ آلَ أَبِي بَكْرٍ مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَرَكَةٌ لَهُمْ"[4] ''اے آلِ ابوبکر! اللہ نے لوگوں کے لیے تم میں برکت رکھی ہے۔ تم ان کے لیے صرف برکت ہو۔'' یہ جو فرمایا کہ اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی مشکل رکھے، اس کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں سہولت اور آسانی پیدا کر دی ہے اور کوئی دشواری اور سختی نہیں ہے۔ اسی لیے تیمّم کو بیماری کے وقت اور پانی دستیاب نہ ہونے کی صورت میں اپنی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦)

[2] صحيح البخاري (١/ ٢٥٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٨٢) السلسلة الصحيحة (٣٢)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٣٢)

رحمت اور وسعت کے طور پر مباح کر دیا۔ پاک مٹی کو پانی کے قائم مقام ٹھہرا دیا۔ اللہ کا ارادہ تو یہ ہے کہ تم کو صاف ستھرا کرے، شاید تم اس کی فراخی و نرمی و رحمت و سہولت اور آسانی کا کچھ شکریہ ادا کرو اور احسان مانو۔

وضو کے بعد کی دعا:

حدیث شریف میں وضو کے بعد دعا کرنے پر رغبت دی ہے کہ اللہ اس کو متطہرین میں سے کرے، من جملہ ممتثلین آیتِ کریمہ ٹھہرائے۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے ذمے اونٹ چرانا تھا، میری باری آئی، عشاء کے وقت میں انھیں چھوڑ کر آیا، دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کھڑے باتیں کرتے ہیں، اتنی بات میں نے بھی سنی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان اچھی طرح وضو کر کے کھڑے ہو کر دو رکعت نماز دل سے اور منہ سے متوجہ ہو کر پڑھتا ہے، جنت اس کے لیے واجب ہو جاتی ہے۔ میں نے کہا: "مَآ أَجْوَدَ هٰذَا" یعنی یہ کیا خوب بات ہے۔ ایک کہنے والے نے میرے روبرو کہا: "اَلَّتِيْ قَبْلَهَا أَجْوَدُ مِنْهَا" یعنی جو بات اس سے پہلے فرمائی تھی، وہ اس سے بہتر ہے۔ میں نے دیکھا تو وہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ مجھ سے کہا: تو ابھی آیا ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے یہ کہا تھا کہ نہیں پورا وضو کرتا تم میں، پھر کہتا ہے: "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" مگر کھل جاتے ہیں، اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کہ جس دروازے سے چاہے اندر جائے۔[1] (رواه أحمد وأهل السنن وهذا لفظ مسلم)

صحیح حدیثوں میں مروی ہے کہ وضو کرنے سے ہاتھ پاؤں منہ وغیرہ کی خطائیں قطروں کے ساتھ نکلنے سے وضو کرنے والا گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔[2] امام ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں طہور کو نصف ایمان ٹھہرایا گیا ہے۔[3] (رواه مسلم) قرآن پاک میں نماز کو ایمان کہا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ بغیر وضو کے نماز قبول نہیں ہوتی۔[4] (رواه مسلم) دوسری حدیث میں ہے کہ «إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ صَلَاةً مِنْ غَيْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةً مِنْ غُلُوْلٍ»[5] "اللہ تعالیٰ نماز وضو کے بغیر قبول نہیں کرتا اور نہ خیانت کے مال میں سے صدقہ قبول کرتا ہے۔" (رواه أحمد و أبو داود و النسائي و ابن ماجه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے بیانِ فاتح میں آیتِ باب ﴿ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ ﴾ کی تفسیر یوں ہے کہ وضو واجب نہیں ہے،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٩) مسند أحمد (٤/ ١٥٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٣)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤)

[5] مسند أحمد (٢/ ١٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٩) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧١) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨٥٥)

مگر محدث پر۔ جمہور اہلِ علم اسی کے قائل ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے خندق کے دن چار نمازیں ایک وضو سے پڑھیں۔[1]
اس میں اختلاف ہے کہ غسل میں ہاتھ سے ملنا بھی ہے یا صرف پانی بہانا کافی ہے۔اس کی تحقیق کا مرجع لغت ہے۔اگر لغت میں یہ بات ثابت ہو کہ دھونے میں ہاتھ سے ملنا داخل ہے تو اس بات کا اعتبار ہوگا اور اگر ثابت نہیں ہے تو پھر نہیں ہے۔

شمس العلوم میں کہا ہے کہ "غَسَلَ الشَّيْئَ غَسْلًا إِذَا أَجْرَى عَلَيْهِ الْمَآءَ وَدَلَكَهُ"[2] ''کسی چیز کو دھونے کا مطلب ہے کہ اس پر پانی ڈالا اور اُس کو مَلا یا رگڑا۔'' رہا مضمضہ اور استنشاق (کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا)، سو اگر "وجہ" کے لفظ میں منہ کا اندر کا حصہ اور ناک شامل نہیں ہے تو ان دونوں کا ثبوت سنتِ صحیحہ سے ہے۔ وجوب اور عدمِ وجوب میں اختلاف ہے۔ اول قابلِ ترجیح ہے۔غرضیکہ اس آیت کی رو سے وضو میں چار فرض ہیں: ایک منہ کا دھونا، دوسرے کہنی تک دونوں ہاتھوں کا دھونا، تیسرے سر کا مسح، چوتھا پاؤں کا دھونا۔

﴿ أَرْجُلَكُمْ ﴾ میں دو قراءت ہیں، حق یہ ہے کہ قرآن کی دلیل پاؤں کو دھونے اور مسح کرنے پر بھی ہے، اس لیے کہ دونوں قراءتیں بہ خوبی ثابت ہیں۔ دھونے کے قائل حضرات نے جو جر کو جوار پر حمل کیا ہے، یہ ان کی بے راہ روی ہے، اسی طرح مسح کے قائل حضرات نے جو حملِ نصب کا بطورِ عطف محل جار مجرور پر بتلایا ہے، یہ بھی بے راہ روی ہے، بلکہ قرآنی دلیل اس پر ہے کہ غسل اور مسح دونوں جدا جدا مشروع ہیں نہ بطورِ جمع۔قولِ جمع ضعیف ہے، اس لیے کہ شریعت میں جمع بین الامرین کسی جگہ نہیں آیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جو بات اُمت کو بتلائی، وہ یہی ہے کہ دونوں پاؤں دھوئیں نہ یہ کہ ان پر مسح کریں۔صحابہ نے جس جگہ نبی اکرم ﷺ کے وضو کو بیان کیا ہے، سب میں دھونے کی صراحت آئی ہے، کسی ایک جگہ بھی مسح کا ذکر نہیں آیا۔سوائے خفین (موزوں) پر۔ وہ احادیث متواتر ہیں۔لہٰذا اگر آیتِ کریمہ کو رجلین میں مجمل بھی کہیں، اس لیے کہ غسل اور مسح دونوں کا احتمال ہے تو بھی غسل ہی واجب ٹھہرے گا، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اس اجمال کا بیان کر دیا اور ساری عمر غسل پر (پاؤں دھونے) ہی پر استمرار فرمایا۔ اگر مسح کافی ہوتا تو ﴿ وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ ﴾[3] ''ایڑیوں پر آگ کا عذاب ہو۔'' نہ فرماتے۔

انگلیوں میں خلال کرنے کے حکم سے بھی یہی نکلتا ہے کہ دھونے کا حکم ہے، اس لیے کہ مسح میں خلال نہیں ہوتا۔
غرضیکہ اس معاملے میں صحیح مذہب جمہور کا ہے، یعنی دھونے کا واجب ہونا اور مسح کا کافی نہ ہونا۔عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا اجماع دونوں پاؤں کو دھونے پر ہے۔[4] رہا مسح موزوں پر سو احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے اور وہ غسل کا بدل ہے نہ کہ مسح کا۔ وضو کے فرائض میں ایک نیت اور تسمیہ (اللہ کا نام لینا) ہے، جن کا

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٦٦١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ١/ ٢٥٧)
[2] شمس العلوم (٨/ ٤٩٥١) [3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [4] الدر المنثور (٣/ ٢٩)

ذکر اس آیت میں نہیں ہوا، لیکن حدیث میں ان کا ذکر آیا ہے۔

اس جگہ جنابت سے مراد دخولِ حشفہ (مرد کے آلۂ تناسل کا عورت کی شرم گاہ میں داخل ہونا) یا منی کا نکلنا ہے۔ جنابت کی شرعی حیثیت یہی ہے، معلوم نہیں کہ اس حقیقت کو حیض اور نفاس میں کیوں شامل نہیں رکھا، حالاں کہ یہ مفید تر تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب غسلِ جنابت کرتے تو پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر سیدھے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے، پھر شرم گاہ دھوتے، پھر وضو کرتے نماز کا سا وضو، پھر انگلیاں پانی میں ڈال کر بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے، پھر سر پر تین لپ ڈالتے، دونوں ہاتھوں سے، پھر سارے بدن پر پانی بہاتے۔[1] (أخرجه الشیخان)

مسئلہ تیمّم کو دوبارہ اس لیے ذکر کیا کہ طہارت کی تمام قسموں کے بارے میں کلام مکمل ہو جائے، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ چہرے اور دونوں ہاتھوں کا مٹی کے ساتھ مسح واجب ہے۔ اللہ کا پانی اور مٹی سے اس طرح طہارت حاصل کرنے کے بارے حکم دے کر یہ ارادہ نہیں ہے کہ تم پر دین میں کوئی تنگی کرے اور جیسے اللہ کا قول ہے: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج: ٢٢] بلکہ ارادہ یہ ہے کہ تم کو گناہوں اور خطاؤں سے پاک کرے۔ اتمامِ نعمت یہ ہے کہ تم کو تیمّم کی رخصت دی یا دخولِ جنت۔ اس آیت میں سات حکم فرمائے ہیں۔ سب دو دو ہیں۔ دو طہارتیں ایک اصل دوسرے بدل، اصل دو ہیں: مستوعب و غیر مستوعب، فعل کے اعتبار سے غیر مستوعب دھونا اور مسح کرنا ہے اور مقام کے اعتبار سے محدود اور غیر محدود۔ پھر اُن کے آلات مائع اور جامد ہیں اور اُن کے موجب حدثِ اصغر یا حدثِ اکبر ہیں۔ ابوالسعود اور بیضاوی نے یوں ہی کہا ہے۔[2]

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ
اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ
شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ
اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣١٦)

[2] تفسير أبي السعود (٣/ ١١) تفسير البيضاوي (٢/ ٣٠٢) فتح البيان (٣/ ٣٥٩۔ ٣٦٨)

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور تم پر اللہ کی جو نعمت ہوئی اسے یاد رکھو اور وہ عہد بھی یاد رکھو جو اس نے تم سے معاہدہ کیا، جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے ⑦ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کے لیے (حق پر) قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ سے ڈرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے ⑧ اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ⑨ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہی لوگ دوزخی ہیں ⑩ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب ایک قوم نے ارادہ کیا تھا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے انھیں تم پر ہاتھ ڈالنے سے روک دیا اور اللہ سے ڈرو، اور ایمان والوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں ⑪

نعمتِ اسلام و رسالت کی یاد دہانی:

اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب کو یاد دلاتا ہے کہ میرے عہد پر قائم رہو۔ اسی طرح ہم کو پابند فرمایا کہ عہد یاد رکھو، وہ عہد یہ ہے کہ جب لوگ مسلمان ہوتے تو نبی کریم ﷺ سے بیعت کرتے، یعنی ہاتھ پکڑ کر بہت چیزیں کرنے کا اعتراف کرتے، جیسے: پانچ نمازیں، رمضان کا روزہ، زکات، حج اور ہر مسلمان کی خیر خواہی اور بہت چیزیں چھوڑنے کا، جیسے: خون اور زنا اور چوری اور بے گناہ کو تہمت لگانا اور سردار سے مخالفت کرنی۔ فرمایا کہ اسی عہد پر قائم رہو۔ اکثر کافروں نے مسلمانوں سے بڑی دشمنی کی تھی، بعد میں مسلمان ہوئے تو فرمایا کہ اُن سے وہ دشمنی نہ نکالو۔ ہر جگہ یہی حکم ہے کہ حق بات میں دوست اور دشمن برابر ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ اپنے مومن بندوں کو یاد دلاتا ہے کہ ہم نے جو یہ دینِ عظیم تمھارے لیے مقرر کیا ہے اور اس رسولِ کریم کو تمھاری طرف بھیجا ہے اور تم سے اس کی متابعت میں عہد و پیمان اور تابع داری اور ایک دوسرے کی مدد کرنے اور دین کے ساتھ قائم رہنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کا جو عہد لیا، یہ تم پر ہمارا احسان ہے۔[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ٤٤)

عہدِ سمع و طاعت:

﴿سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا﴾ سے مراد وہی بیعت ہے، جو اسلام لاتے وقت کرتے تھے، جس طرح صحابہ نے کہا ہے: "بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِيْ مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَأَثَرَةً عَلَيْنَا وَأَنْ لَّا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ"[1] ''ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی اس بات پر کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے، اپنی خوشی میں اور کراہت میں اور اُس وقت بھی جب ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی اور اس بات پر کہ ہم امارت کو اس کے اہل سے نہیں چھینیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمۡ لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ وَقَدۡ اَخَذَ مِيۡثَاقَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴾ [الحديد: ٨] ''اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے؟ حالاں کہ رسول تمھیں بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور یقیناً وہ تم سے پختہ وعدہ لے چکا ہے اگر تم مومن ہو؟'' بعض نے کہا کہ یہ یہود کے عہد و پیمان کا ذکر ہے، جو محمد ﷺ کی متابعت اور شرع محمدی کی تابعداری کرنے کے لیے ان سے لیا تھا۔ (قاله ابن عباس)

بعض نے کہا ہے کہ یہ اُس عہد کا ذکر ہے، جو اللہ نے آدم علیہ السلام کی اولاد سے لیا تھا، جب کہ اُن کو پشتِ آدم سے نکال کر ان کی جانوں کو اس بات کا گواہ ٹھہرایا: ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ﴾ [الأعراف: ١٧٢] ''کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟'' سب نے کہا: ﴿بَلٰى شَهِدۡنَا﴾ [الأعراف: ١٧٢] ''کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے ہیں۔'' یہ امام مجاہد اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا قول ہے۔ قولِ اول زیادہ ظاہر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام سدی رحمہ اللہ سے حکایت کیا گیا ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[2]

عدل اختیار کرنے کا حکم:

پھر فرمایا: اللہ سے ڈرو۔ یہ تاکید ہے اور اُکسانا ہے اس بات پر کہ ہمیشہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کیے رہنا۔ پھر یہ جتلا دیا کہ جو کچھ تمھارے جی میں بھید اور خواطر (خیالات) گزرتے، آتے جاتے ہیں، اللہ ان سب کو جانتا ہے۔ پھر فرمایا کہ تم اللہ کے لیے سچی گواہی دو، عدل سے نہ کہ لوگوں کو دکھانے سنانے کے لیے اور پاسِ خاطر کے لیے یا زبردستی سے۔

صحیحین میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ میرے باپ نے مجھے کچھ عطا کیا، میری ماں عمرہ بنتِ رواحہ نے کہا کہ میں راضی نہیں، جب تک کہ تم اس عطا پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے، تاکہ وہ اُس پر گواہ ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے سب اولاد کو اسی طرح دیا ہے؟ کہا: نہیں۔ کہا: «اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ» ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔'' پھر فرمایا: «وَإِنِّيْ لَا أَشْهَدُ عَلٰى

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)
[2] تفسير الطبري (١٠/ ٩٢۔ ٩٣)

جَوْرٍ» ''میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔'' میرے باپ پھر کر آئے، وہ صدقہ پھیر لیا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تمھارے لیے بعض قوم کی دشمنی کہیں عدل ترک کر دینے کا باعث نہ ہو، بلکہ تم عدل و انصاف کا استعمال ہر شخص کے حق میں کرو۔ دوست ہو یا دشمن، کیوں کہ عدل تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اس جگہ مبالغے کا صیغہ ''أَقْرَبُ'' ایسے محل میں ہوا ہے کہ اُس کی دوسری جانب میں کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسے اس کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾ [الفرقان: ٢٤] ''جنتی لوگ اس دن بہترین ٹھکانے اور بہت اچھی آرام گاہ میں ہوں گے۔'' یا جیسے بعض صحابیات کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہ قول ہے: «أَنْتَ أَفَظُّ وَ أَغْلَظُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»[2] ''آپ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سخت ہیں۔''

پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ کو تمھارے کام کی خبر ہے، یعنی وہ تم کو جزا تمھارے افعال کی دے گا۔ اچھے فعل کی اچھی، بُرے فعل کی بُری جزا۔ اسی لیے اس کے بعد یوں کہا کہ ایمان اور عملِ صالح کی جزا گناہوں کی بخشش اور اجرِ عظیم، یعنی جنت ہے۔ جنت اللہ کی ایک رحمت ہے، جس کو بندے اپنے اعمال سے حاصل نہیں کر سکتے، بلکہ اس کے فضل و کرم سے، اگرچہ اس کی رحمت وصول کرنے کا سبب ان کے وہی اعمال ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ نے اعمالِ حسنہ اور افعالِ صالحہ کو اللہ کی رحمت و فضل و معافی و رضا اور بخشش حاصل کرنے کا سبب ٹھہرایا ہے۔ فللّٰه الحمد والمنة. پھر فرمایا کہ کافروں اور جھٹلانے والوں کے لیے جہنم ہے، وہ لوگ دوزخ والے ہیں، یہ اللہ کا عدل و حکمت ہے ان کے حق میں۔

کفار کی ایذا رسانی سے حفاظت کرنا:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک منزل میں اُترے، لوگ متفرق ہوگئے درختوں کے سائے میں چلے گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی تلوار ایک درخت سے لٹکا دی۔ ایک اعرابی نے آ کر تلوار مذکور میان سے کھینچ کر نبی اکرم ﷺ کی طرف منہ کیا اور کہا: «مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ؟» ''تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟'' فرمایا: اللہ عزوجل۔ اعرابی نے یہ بات دو تین دفعہ کہی، ہر دفعہ آپ ﷺ نے یہی فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اعرابی سے تلوار ڈلوا دی۔ نبی اکرم ﷺ نے اصحاب کو بلا کر یہ حال بتایا اور وہ اعرابی ایک طرف بیٹھا تھا، اس کو کچھ سزا نہیں دی۔ (رواه عبد الرزاق)

معمر نے کہا ہے کہ امام قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی قسم کا ذکر کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ عرب کی ایک قوم نے چاہا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کو مار ڈالیں، اس لیے اعرابی کو بھیجا تھا، اس اعرابی کا نام غورث بن حارث ہے۔ یہ قصہ صحیح میں بھی مروی ہے۔ جب اعرابی کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی تو نبی کریم ﷺ نے تلوار اُٹھا کر کہا: «مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ؟»

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٦)

''اب تجھے کون مجھ سے بچائے گا؟'' اس نے کہا: ''کُنْ خَیْرَ آخِذٍ'' ''آپ بہترین پکڑنے والے بن جائیں۔'' پھر اس نے کلمۂ شہادت پڑھا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہود کی ایک قوم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کے صحابہ کے لیے کھانا تیار کیا، تا کہ ان کو قتل کریں، اللہ تعالیٰ نے اس حال کی وحی کی، وہ کھانا نہ آیا۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت کعب بن اشرف اور اس کے یاروں کے حق میں اُتری ہے۔ انھوں نے چاہا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ کعب کے گھر میں دغا کریں۔

امام محمد بن اسحاق، مجاہد اور عکرمہ رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ بنی النضیر کے حق میں اُتری ہے۔ انھوں نے چاہا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر چکی کا ایک پتھر ڈالیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس عامر کی دیت کے سلسلے میں مدد لینے کے لیے گئے تھے۔ عمرو بن جحاش نے کہا ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں آ کر دیوار کے نیچے آ کر بیٹھیں اور ہم سب ان کے پاس جمع ہوں تو تُو اوپر سے چکی ان کے سر پر چھوڑ دینا۔ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ارادے پر مطلع کر دیا، آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مدینے کو لوٹ آئے، اُس پر یہ آیت اُتری، جو کوئی اللہ پر بھروسا کرتا ہے، اللہ اس کو لوگوں کے شر اور غم واندوہ سے محفوظ و معصوم رکھتا ہے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ صبح جا کر ان کا محاصرہ کرو، یہاں تک کہ ان کو وہاں سے نکال دیا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جمہور مفسرین، کیا سلف کیا خلف، کے نزدیک میثاق سے مراد وہ عہدِ بیعت ہے، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''لَیْلَةُ الْعَقَبَة'' کو لیا تھا۔ ﴿لَا یَجْرِمَنَّكُمْ﴾ کا خطاب بعض کے نزدیک بالخصوص قریش کو ہے، لیکن قاضی اور کشاف کہتے ہیں کہ یہ عام خطاب ہے اور یہی حق ہے۔ اس لیے کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ ﴿اِعْدِلُوْا﴾ کا صیغہ امر کا ہے، اس میں قریب اور بعید دوست اور دشمن کے حق میں عدل کو واجب کرنے کی صراحت ہے۔ عدل کو چھوڑنے کی ممانعت تو التزاماً معلوم ہوئی۔ لفظِ اصحاب الجحیم اس بات پر نص قاطع ہے کہ آگ میں ہمیشگی کافروں کے لیے ہے، کیوں کہ مصاحبت کا تقاضا ہے کہ ہمیشہ کا ساتھ ہو۔[3]

---

[1] تفسير الصنعاني (١/ ١٨٥) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٤٣) مستدرك الحاكم (٣/ ٣١) البتہ اس اعرابی کا کلمہ شہادت پڑھنے کے الفاظ نہیں ملے۔

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥) [3] فتح البيان (٣/ ٣٦٩۔ ٣٧١)

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ
عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ
وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ
اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ
فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝12 فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ
لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ
عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ
عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝13 وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا
اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا
بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ
وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝14

اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے تھے، اور اللہ نے کہا: بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کرو گے، اور زکات ادا کرو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو اچھا قرض دو گے، تو میں ضرور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دوں گا اور ضرور تمھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، پھر اس کے بعد جس نے کفر کیا تو یقیناً وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا⑫ چناں چہ ان کے اپنا عہد توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلمات کو ان کے موقع و محل سے بدل ڈالتے ہیں، اور جس چیز کی انھیں تاکید کی گئی تھی اس کا ایک حصہ انھوں نے بھلا دیا اور آپ کو ان میں سے دوسروں کی خیانت کی اطلاع ملتی رہتی ہے، ان میں سے سوائے چند افراد کے، چناں چہ آپ انھیں معاف کر دیں اور ان سے درگزر کریں، بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے⑬ اور جن لوگوں نے کہا: بے شک ہم نصاریٰ ہیں، ان سے ہم نے عہد لیا تھا، پھر جس چیز کی انھیں تاکید کی گئی تھی، اس کا ایک

حصہ انھوں نے بھلا دیا، چناں چہ ہم نے روزِ قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دیا، اور وہ جو کچھ کرتے رہتے ہیں اللہ جلد انھیں اس سے آگاہ کرے گا⑭

میثاقِ بنی اسرائیل اور اس کی خلاف ورزی:

اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل سے عہد لینا بیان فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کی آخری عمر میں یہ اقرار لیے۔ یہ سورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں نازل ہوئی۔ شاید ہم کو اس لیے سنایا کہ ہم کو بھی یہی پابندی ہے۔ اُس امت سے ایک عہد یہ تھا کہ رسول جو بعد میں پیدا ہوں، ان کی مدد کرو۔ اس کے بدل ہم سے یہ عہد ہے کہ خلفا کی اطاعت کرو۔ بارہ سرداروں کا یہاں ذکر فرمایا۔ اس اشارے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ میری امت میں قومِ قریش سے بارہ خلیفہ ہوں گے اور فرمایا کہ جو خرابی پہلی امت میں ہوئی، وہ تم میں بھی ہوگی۔ جیسے وہ پیغمبروں کی مخالفت کر کے خراب ہوئے، یہ امت خلیفہ پر خروج کرنے سے خراب ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اللہ کے کلام سے اثر پکڑنا اور شریعت کے احکام پر محبت سے قائم رہنا چھوٹ جائے اور فقط مذہب کا جھگڑا اور حمیت رہ جائے تو راہ سے بہکے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ پاک نے مومنین کو ایفائے عہد اور شہادتِ عدل کو حق کے ساتھ قائم کرنے کا حکم دیا اور اپنی ظاہری اور پوشیدہ نعمتیں یاد دلائیں تو اب ان سے پہلے گزرے ہوئے اہلِ کتاب سے عہد و پیان لینے کی کیفیت کا بیان فرمایا اور یہ کہا کہ ہم نے ان کو عہد و پیان مذکورہ کے توڑنے پر لعنت کی اور اُنھیں اپنی جناب سے دور اور مردود کر دیا۔ کہیں وہ ہدایت و دینِ حق کو حاصل نہ کر لیں، ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا۔ علمِ نافع اور عملِ صالح سے محروم ہو گئے۔

نقبائے بنی اسرائیل اور نقبائے انصار:

"نُقَبَا" سے مراد صاحبِ معرفت ہیں، یعنی اقوام و قبائل کے چودھری اور سردار جن کے ذریعے سے اللہ، رسول اور اللہ کی کتاب کو سننے اور اطاعت کرنے کا عہد لینے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام جبابرہ سے لڑنے کو گئے تو ہر قبیلے پر ایک نقیب مقرر کر گئے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے نقبائے اسباط کا ذکر نام لے کر کیا ہے۔ میں نے تورات کے چوتھی دفعہ مطالعے کے دوران میں بنی اسرائیل کے اسباط پر مقرر کیے گئے نقیبوں کے نام پائے، جو امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کے ذکر کردہ ناموں سے مختلف تھے۔[1] ان اسباط کے نام کتاب "بداية القدماء و هداية الحكماء" ترجمہ تاریخِ یونان میں بھی لکھے ہیں، لیکن وہ تحریف اور تبدیلی سے خالی نہیں ہیں۔ نسخ و اصولِ صحیحہ سے دیکھ کر لکھنا چاہیے۔ بلکہ ان ناموں کو دریافت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔

① تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٦)

قرآنِ مجید میں اجمالاً ذکر کے مطابق یہ کافی ہے کہ بارہ قبیلوں پر بارہ نقیب تھے۔ نام معلوم ہوئے تو کیا، نہ معلوم ہوئے تو کیا۔ جب نبی اکرم ﷺ نے لیلۃ العقبہ میں صحابہ سے بیعت لی، ان میں بارہ نقیب تھے، تین قبیلۂ اوس سے، نو خزرج سے، ان کے نام سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے اشعار میں دیے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ لوگ اس رات کو نبی کریم ﷺ کے حکم کے مطابق اپنی قوم کے عرفاء تھے، انھوں نے اپنی اپنی قوم کی طرف سے عہد اور بیعت سمع و طاعت پر کی۔

خلفائے مسلمین:

امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے، وہ قرآن پڑھ رہے تھے۔ ایک آدمی نے ان سے کہا کہ کیا تم نے نبی اکرم ﷺ سے یہ بھی پوچھا تھا کہ اس امت میں کتنے خلیفہ ہوں گے؟ کہا: جب سے میں عراق میں آیا ہوں، تجھ سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں پوچھی۔ پھر کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا تھا، انھوں نے فرمایا کہ نقبائے بنی اسرائیل کی تعداد کی طرح بارہ خلیفہ ہوں گے۔[1] (رواه أحمد)

یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے۔ اس حدیث کی اصل صحیحین میں سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے آئی ہے، کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: «لَا يَزَالُ أَمْرُ النَّاسِ مَاضِياً مَا وَلِيَهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ رَجُلًا» ''مسلمانوں کی خلافت صحیح طور پر چلتی رہے گی، جب تک ان میں بارہ خلفا نہ ہوں۔'' پھر نبی اکرم ﷺ نے ایک بات کہی، جو مجھ پر مخفی رہی، میں نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ کہا: فرمایا: «كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ»[2] ''وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے۔'' (هٰذا لفظ مسلم)

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ بارہ صالح خلیفوں کے ہونے کی خبر دی ہے، یعنی بشارت۔ وہ خلفا حق کو قائم کریں گے، امت میں عدل فرمائیں گے، لیکن یہ کچھ لازمی نہیں ہے کہ برابر ہوں اور اُن کا زمانہ لگاتار ہو، بلکہ ان میں سے چار خلیفہ تو ایک نسق (ترتیب) پر ہوئے، یعنی خلفائے اربعہ سیدنا ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اور اُن میں سے ایک عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تھے، بلاشک نزدیک ائمہ کے اور بعض بنی عباس، قیامت نہ آئے گی، اس وقت تک جب تک کہ ان کی ولایت نہ ہو جائے۔

لامحالہ ظاہر یہ ہے کہ انہی بارہ میں سے ایک مہدی مبشر بھی ہوں گے، جن کا ذکر حدیثوں میں مروی ہے کہ ان کا نام نبی کریم ﷺ کے نام کے مطابق اور اُن کے باپ کا نام نبی کریم ﷺ کے باپ کے نام کے مطابق ہوگا، وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے، جس طرح کہ وہ جور و ظلم سے بھر گئی ہوگی۔ یہ وہ شخص منتظر نہیں ہے، جس کے

---

[1] مسند أحمد (۱/ ۳۹۸) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف راوی ہے۔ [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۲۱)

وجود کا رافضی توہّم کرتے ہیں اور سرداب سامرہ سے اُن کا ظاہر ہونا بتاتے ہیں، کیوں کہ اس بات کی بالکل کچھ حقیقت اور حیثیت نہیں ہے، وہ صرف کم عقلی کی ہوس اور ضعیف خیالات پر مبنی توہمات ہیں اور نہ ان بارہ خلفا سے وہ بارہ امام اہلِ بیت ہیں، جن کا رافضی اپنی جہالت اور عقل کی کمی کی وجہ سے اعتقاد کرتے ہیں۔ تورات میں جہاں اسماعیل علیہ السلام کی بشارت دی ہے، وہاں یہ بھی آیا ہے کہ ان کی پشت سے بارہ سردار قائم ہوں گے۔

وہ یہی بارہ سردار یا خلفا ہیں، جو سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آئے ہیں۔[1] ان یہودیوں میں سے جو اسلام لائے ہیں، بعض جاہل لوگ جب بعض شیعہ سے ملتے ہیں تو وہ ان کے وہم میں یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ وہ بارہ نقبا یہی ائمہ اثنا عشر ہیں، پھر یہ بات جہالت، بے وقوفی، کم عقلی اور تقوے کی کمی کی وجہ سے سنتِ صحیحہ نبویہ و احادیثِ صحیحہ کے ساتھ اشاعت پذیر اور مشہور ہو جاتی ہے۔

عہد توڑنے کی سزا:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمھاری حفاظت اور مدد کے لیے تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کرو گے، زکات ادا کرتے رہو گے، رسولوں پر ایمان لا کر حق کا ساتھ دیتے رہو گے اور قرضِ حسنہ دیتے رہو گے تو تم کو اس عہد کے پورا کرنے پر برائیوں کا کفارہ اور گناہوں کا مٹا دیا جانا اور جنت میں داخلہ نصیب ہوگا اور جو کوئی اس عہد کے بعد اس کے خلاف کرے گا تو پھر اس کو گمراہ سمجھو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد عہد توڑنے کی سزا کا ذکر کیا کہ دیکھو جب تم سے پہلے لوگوں نے قول و قرار قائم نہ رکھا، عہد و پیمان کرنے کے بعد اُنھیں توڑ ڈالا تو ان کو یہ سزا ملی، وہ حق سے بعید اور ہدایت سے دور کر دیے گئے، ان کے دل ایسے سخت پڑ گئے کہ انھیں کسی نصیحت کا اثر نہیں ہوتا، ان کے دل کی سختی اور سیاہی اور اُن کے فہم کا فساد اور اُن کی بُری دخل اندازی سے یہاں تک نوبت پہنچی کہ اللہ کی آیتوں کے اور ہی کچھ معنی لینے اور کہنے لگے، جو اللہ کی مراد نہ تھی۔ لفظوں کو بدلنے لگے اور تاویل خلافِ تنزیل کرنے لگے، جو بات اللہ نے نہیں کہی، وہ اللہ پر باندھ دی۔ عیاذاً باللّٰہ۔ جو نصیحت ان کو کی تھی، اُس سے فائدہ لینا بھول گئے۔ بے رغبت ہو کر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دین کی رسی ہاتھ سے چھوڑ دی۔ اللہ کے وظائف جن کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، ترک کر دیے۔[2] بعض نے کہا کہ عمل چھوڑ کر ایک ردی حالت پر ہو گئے۔ نہ ان کے دل قلبِ سلیم رہے اور نہ اُن کی فطرت فطرتِ مستقیمہ رہی اور نہ ہی ان کے اعمال مضبوط اور صحیح رہے۔

﴿خَآئِنَةٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ تجھ سے اور تیرے اصحاب کے ساتھ مکر و فریب اور دھوکا کرتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلکہ تجھ کو قتل کرنا چاہتے ہیں،[3] سو تو اُن سے معاف کر اور درگزر فرما کہ یہ کامیابی اور اللہ کی مدد کا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢١) مسند أحمد (١/ ٣٩٨) [2] تفسير الطبري (١٠/ ١٣٠) [3] تفسير الطبري (١٠/ ١٣١)

باعث ہے، جس طرح بعض سلف نے فرمایا ہے: ”مَا عَامَلْتَ مَنْ عَصَى اللّٰهَ فِيْكَ بِمِثْلِ أَنْ تُطِيْعَ لِلّٰهِ فِيْهِ“ ”اس سے بہتر کوئی معاملہ نہیں کہ جس نے تیرے حق میں اللہ کی نافرمانی کی ہے تو اس کے حق میں اللہ کی اطاعت کر“ یعنی بدی کے بدلے نیکی کر۔ اس ترکیب سے تالیف (اُلفت) اور جمع علی الحق حاصل ہوگی، شاید اللہ ان کو ہدایت کرے۔ اللہ محسنین کو جو بدی کے بدلے نیکی کرتے ہیں، دوست رکھتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عفو وصفح منسوخ ہے۔ اس آیت سے: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [التوبة: ٢٩] ”ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔“[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جو لوگ نصرانی ہونے اور مسیح علیہ السلام کی تابعداری کا دعویٰ کرتے ہیں اور حقیقت میں وہ نصاریٰ نہیں ہیں، ہم نے ان سے یہ عہدِ واثق لیا تھا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کرنا، ان کی مدد کرنا اور ان کی راہ پر چلنا اور ہر نبی پر، جس کو ہم نے زمین پر بھیجا ہے، ایمان لانا۔ سو انھوں نے یہود کی طرح کام کیا کہ عہد توڑ ڈالا، آخر اس قصور کی سزا ہم نے ان کو یہ دی کہ باہم ان کے قیامت تک دشمنی پڑ گئی، اسی طرح نصاریٰ کے مختلف فرقوں کا حال ہے کہ مختلف الاجناس ہیں۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کو کافر کہتا ہے۔ بعض بعض پر لعنت کرتے ہیں، باہم بغض اور عداوت رکھتے ہیں۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کو اپنے گرجا میں گھسنے نہیں دیتا۔ فرقۂ ملکیہ فرقۂ یعقوبیہ کو کافر کہتا ہے۔ اسی طرح نسطوریہ اور اریوسیہ دوسروں کو کافر کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا دوسرے کو کافر کہنا اس دنیا میں ہے۔ رہی قیامت، سو وہاں تو ہر فرقے کو اپنا کرتوت معلوم ہو جائے گا۔ اللہ ان کو خبردار کر دے گا کہ تم یہ کام کرتے تھے۔ ؎

بوقت صبح شود ہم چو روز معلومست　　　که با که باختهٔ عشق در شب دیجور

”صبح کے وقت روز روشن کی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اندھیری رات میں تو کس کی محبت میں ناکام ہوا ہے۔“

اس آیتِ شریفہ میں نصاریٰ کو سخت ڈانٹ اور وعید ہے، اس جھوٹ پر جو انھوں نے اللہ اور رسول پر باندھا ہے اور اس وحدہ لاشریک لہ کی طرف جورُو اور اولاد کی نسبت کی ہے۔ تَعَالٰی وَتَقَدَّسَ عَنْ قَوْلِهِمُ الْكَذِبَ عُلُوًّا كَبِيْرًا.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان ہے کہ نقباء کو بھیجنے سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بارہ سردار بھیجے کہ وہ جبارین کی قوت و طاقت کا اندازہ کریں۔ انھوں نے جا کر دیکھا تو معلوم کیا کہ وہ بڑی قوت اور شوکت رکھتے ہیں۔ سمجھے کہ ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ باہم یہ عہد وعقد کیا کہ بنی اسرائیل سے اس بات کو مخفی رکھیں گے، فقط موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیں گے، جب لوٹ کر آئے تو دس آدمیوں نے خیانت کی راہ سے اپنے رشتہ داروں سے سارا حال کہہ دیا، وہ خبر پھیل گئی، لڑائی کا کام باطل ہو گیا، کہنے لگے: ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ [المائدة: ٢٤] ”چناں چہ تو اور تیرا

[1] تفسير الطبري (١٠/ ١٣٤)

رب جائے، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔‘‘

بعض نے کہا کہ ان نقباء میں سے ہر ایک شخص اس بات کا کفیل ہوا تھا کہ ہمارا سبط (قبیلہ) ایمان لائے گا، اللہ سے ڈرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ جب نقبا جبارین کے حالات جاننے کے لیے گئے تو ان کو عوج بن عنق ملا، وہ ایسا اور ویسا تھا، اس قصے کو بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ محققین اہلِ حدیث کہتے ہیں کہ یہ قصہ بالکل بے اصل ہے نہ کوئی عوج اور نہ کوئی عنق۔

نقیب ضامن کو کہتے ہیں۔ (قاله ابن عباس) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نقیب قوم کے گواہ کو کہتے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ امین کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ کفیل کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ ہے جو قوم کے حالات سے بحث کرتا ہے۔ یہ تمام معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ قرضِ حسن سے مراد وہ قرض ہے، جو جی سے خوش ہو کر دے یا جس سے اللہ کی رضا مندی مقصود ہو اور وہ حلال مقاصد کے لیے دیا جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ تورات سے عہد لیا، انھوں نے اس کو توڑ ڈالا۔[2]

اللہ تعالیٰ نے اُن پر لعنت کی اور اپنی رحمت سے دور پھینک دیا۔ ان کے دل سخت کر دیے، کوئی اچھی بات ان کی عقل میں نہیں آتی۔ سخت اور خشک ہوگئے ہیں۔ ان میں ذرا سی برائے نام نرمی باقی نہیں رہی، کیوں کہ قسوت خلاف رقت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان خالص نہیں کفر و نفاق سے ملا ہوا ہے۔ اللہ نے ﴿ اِنَّا نَصٰرٰۤى ﴾ کہا، ”مِنَ النَّصَارٰی“ نہ فرمایا، اس میں اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ نصرانیت کے دعویٰ میں جھوٹے ہیں اور اُن کا یہ کہنا بھی جھوٹ ہے کہ ہم انصار اللہ ہیں۔ یہ نام خود انھوں نے بطورِ بدعت و ایجاد و احداث کے اختیار کیا ہے، اللہ نے اُن کا یہ نام نہیں رکھا۔[3]

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

اے اہلِ کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے، وہ تمھارے لیے اللہ کی کتاب کی بہت سی ایسی باتیں ظاہر کرتا ہے جنھیں تم چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔ یقیناً تمھارے پاس اللہ کی طرف

---

[1] تفسیر الخازن (۲/ ۲۵)

[2] تفسیر الطبري (۱۰/ ۱۲۶) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

[3] فتح البیان (۳/ ۳۷۳۔ ۳۷۷)

سے روشنی اور واضح کرنے والی کتاب آ گئی ہے⑮ جس کے ذریعے سے اللہ اس شخص کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے جو اللہ کی رضا کی پیروی کرنا چاہتا ہے اور انھیں اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے⑯

رسول اور قرآن کے ساتھ حق کا بیان:

اللہ پاک نے اپنے نفسِ کریمہ سے خبر دی کہ ہم نے محمد ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر سارے اہلِ عرب، کیا عرب کیا عجم، کیا امی اور کیا کاتب، کی طرف بھیجا، ان کو بینات کے ساتھ مبعوث کیا، وہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے ہیں، انھوں نے اللہ پر تبدیل و تحریف و افترا باندھنے کا حال کھول دیا اور بہت سی تبدیلیوں کو بیان کرنے سے خاموشی اختیار کی، اس کے بیان میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس نے رجم کا انکار کیا، اُس نے قرآن کا انکار کیا، جس کا گمان بھی نہ تھا۔ رجم من جملہ ان چیزوں کے ہے، جس کو انھوں نے مخفی رکھا تھا۔[1] (رواہ الحاکم وقال صحیح الإسناد)

پھر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عظیم سے خبر دی کہ ہم نے اس کو اپنے نبی پر اُتارا، وہ نجات و سلامتی کا راستہ اور استقامت کا راستہ ہے۔ اندھیرے سے اُجالے کی طرف نکالتا ہے۔ سیدھے راستے پر لگاتا ہے۔ ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچاتا ہے۔ واضح طریقوں کو بیان کرتا ہے۔ جن چیزوں سے ڈرنا چاہیے، ان سے پھیرتا ہے۔ زیادہ پسندیدہ امور کو حاصل کراتا ہے۔ ضلالت کی ممانعت کرتا ہے۔ زیادہ قائم اور مضبوط حالت کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں: ﴿ مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ ﴾ سے مراد آیتِ رجم اور اصحابِ سبت کا قصہ ہے، جو بندر ہوگئے تھے۔ کتاب سے مراد تورات و انجیل ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نور سے مراد نبی اکرم ﷺ[2] یا اسلام یا قرآن[3] ہیں۔ ﴿ سُبُلَ السَّلٰمِ ﴾ سے مراد عذاب سے سلامتی والا راستہ ہے یا اسلام۔ ﴿ اَلظُّلُمٰتِ ﴾ سے مراد کفر ہے۔ نور سے مراد اسلام ہے۔[4]

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ
قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ

[1] مستدرك الحاكم (٤/ ٤٠٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [2] معاني القرآن (٢/ ١٦١)

[3] نور اور کتابِ مبین سے ایک ہی چیز، یعنی قرآن مجید مراد ہے۔ یہاں واؤ مغایرت کے لیے نہیں، عطفِ تفسیری کے طور پر ہے۔ اس کی واضح دلیل اس سے اگلی آیت: ﴿ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ ہے۔ اگر نور اور کتابِ مبین الگ الگ دو چیزیں ہوتیں تو ﴿ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ (ضمیر واحد کے بجائے) "يهدي بهما الله" (ضمیر تثنیہ) کے ساتھ الفاظ ہوتے۔ [ص۔ ي]

[4] فتح البيان (٣/ ٣٧٨۔ ٣٧٩)

الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى
نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ
بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؗ وَاِلَيْهِ
الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ بے شک اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: پس کون ہے جو اللہ کے آگے کچھ اختیار رکھتا ہو، اگر اللہ مسیح ابن مریم کو اور ان کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرلے؟ اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے (17) اور یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے؟ (نہیں) بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں سے انسان ہو، وہ جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہے عذاب دیتا ہے اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (18)

عیسائیوں کا مشرک و کافر ہونا:

اللہ تعالیٰ کسی جگہ نبیوں کے حق میں ایسی بات فرماتا ہے، تاکہ ان کی اُمت اُن کو بندگی کی حد سے زیادہ نہ چڑھائے، وگرنہ نبی اس لائق کیونکر ہیں؟ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس آیت میں نصاریٰ کے کفر کی خبر دی ہے کہ وہ مسیح بن مریم کے بارے میں جو کہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے ہیں اور ایک مخلوق ہیں، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام اللہ ہیں۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ قَوْلِهِمْ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ [1] پھر اپنی قدرتِ کاملہ سے اشیا کے متعلق خبر دی کہ ساری اشیا قہر اور غلبۂ الٰہی کے تحت ہیں۔ تمام موجودات اور کائنات اس کی ملکیت ہیں اور مخلوق ہیں۔ وہ سب پر قادر ہے، جو چاہے سو کرے، کس کی مجال ہے کہ دم مار سکے یا اُس سے اس چیز کے بارے میں سوال کرے، جو وہ اپنی قدرت و سلطنت و عدل و عظمت سے کرتا ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۹)

یہود و نصاریٰ کے خدا کے بیٹے ہونے کی تردید:

پھر یہود و نصاریٰ پر رد کیا کہ وہ بڑے کذاب اور مفتری ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے دوست ٹھہرے۔ بمنزلۂ فرزند کے ہوئے۔ اپنی کتاب سے نقل کیا ہے کہ اللہ نے اپنے بندے اسرائیل سے کہا: ”أَنْتَ ابْنِيْ بِكْرِيْ“ اس عبارت کو غیر تاویل پر محمول کیا، تحریف کر ڈالا۔ اہلِ کتاب میں سے جو عقل مند لوگ مسلمان ہوگئے، انھوں نے اس کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس لفظ کا اطلاق ان کے نزدیک بطورِ بزرگی اور عزت ہوتا تھا، جس طرح نصاریٰ نے اپنی کتاب سے نقل کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”إِنِّيْ ذَاهِبٌ إِلٰى أَبِيْ وَأَبِيْكُمْ يَعْنِيْ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ“ یعنی یہ بات معلوم ہے کہ وہ اپنے لیے مدعی نبوت نہ تھے، جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں تھے، بلکہ اس عبارت سے ان کی مراد عیسیٰ علیہ السلام کے نزدیک اپنی عزت اور آبرو کا ہونا ہے۔ اسی لیے یہ کہا کہ ہم اللہ کے فرزند اور پیارے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی اور کہا کہ اگر یہ سچ ہے تو پھر اللہ اس کفر اور جھوٹ پر تم کو کیوں عذاب کرتا ہے؟ بعض شیوخ صوفیہ نے بعض فقہا سے کہا: قرآن میں یہ مضمون کس جگہ ہے کہ ”إِنَّ الْحَبِيْبَ لَا يُعَذِّبُ حَبِيْبَهٗ“ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ صوفی نے یہ آیت پڑھی: ﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ﴾ یہ بات جو اس صوفی نے کہی ہے، اچھی بات ہے، اس کا شاہد مسند احمد میں موجود ہے، جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ہے، کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چند اصحاب رضی اللہ عنہم کے ساتھ چلے جاتے تھے، راہ میں ایک بچہ تھا، اس کی ماں نے دیکھا کہ قوم آتی ہے، اُس کو ڈر ہوا کہ بچہ کہیں کچلا نہ جائے دوڑ کر ”اِبْنِيْ اِبْنِيْ“ کہہ کر اس کو اُٹھا لیا، قوم نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہ اپنے بچے کو بھلا کب آگ میں ڈالے گی؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو چپ کرا کے فرمایا: «لَا، وَاللّٰهِ! مَا يُلْقِيْ حَبِيْبَهٗ فِي النَّارِ»[1] ”نہیں اللہ کی قسم! اللہ اپنے دوست کو آگ میں نہیں ڈالے گا۔“ (تفرد به أحمد)

پھر اللہ نے فرمایا: تم ویسے ہی بشر ہو، جیسے اور بنی آدم ہیں، تم پر کیا سرخاب کا پَر لگا ہے، جو تم ایسی باتیں بڑھ بڑھ کر کرتے ہو۔ اللہ سارے بندوں کا حاکم ہے، جسے چاہے بخشے، جسے چاہے عذاب کرے۔ اس کے حکم کو بھلا کون پیچھے ڈال سکتا ہے، وہ تو جلد حساب لے گا، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، آخر وہ اسی کی ملکیت ہے، سب اسی کے زیرِ قہر و قبضہ ہیں۔ سب کا ٹھکانا اور مرجع وہی ہے، جو چاہے حکم دے، اس کے عدل میں ظلم نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نعمان بن آصا، بحر بن عمر، شاش بن عدی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، باہم بات چیت ہوئی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اللہ کی طرف بلایا۔ اللہ کے انتقام سے ڈرایا۔ انھوں نے کہا کہ تم ہم کو کیا ڈراتے ہو، ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، اس پر یہ آیت اُتری۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۱۰۴) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رواه أحمد والبزار و رجالهما رجال الصحيح“ (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۳۵۵)

[2] تفسير الطبري (۱۰/ ۱۵۰۔ ۱۵۱) اس کی سند حسن ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود کہتے ہیں کہ اللہ نے اسرائیل کو پیغام بھیجا کہ ’’إِنَّ وَلَدَكَ بِكْرِيْ مِنَ الْوَلَدِ، فَيُدْخِلُهُمُ النَّارَ، فَيَكُوْنُوْنَ فِيهَا أَرْبَعِينَ لَيْلَةً، حَتّٰى تُطَهِّرَهُمْ وَتَأْكُلَ خَطَايَاهُمْ، ثُمَّ يُنَادِيْ مُنَادٍ أَنْ أَخْرِجُوْا كُلَّ مَخْتُوْنٍ مِنْ وُلْدِ إِسْرَائِيْلَ فَأَخْرِجُوْهُمْ‘‘ ’’بے شک تیری اولاد میرے لیے پہلی اولاد ہے، پھر ان کو آگ میں داخل کرے گا، وہ اس میں چالیس راتیں رہیں گے، یہاں تک کہ وہ آگ اُنھیں پاک کر دے گی اور اُن کی خطاؤں کو کھا جائے گی، پھر ایک پکارنے والا پکارے گا کہ ہر ختنہ شدہ کو اسرائیل کی اولاد میں سے نکال دو، پھر وہ انھیں نکال دیں گے۔‘‘ یہ مطلب ہے ان کے قول کا: ﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ [آل عمران: ٢٤] ’’ہمیں آگ چند دنوں کے سوا ہرگز نہیں چھوئے گی۔‘‘ اس کو امام سدی رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر کے تحت لکھا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ نصاریٰ کے بعض گروہوں نے کہا تھا کہ مسیح اللہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد نجران کے نصاریٰ ہیں۔ یعقوبیہ اور ملکانیہ کا یہی مذہب ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ یہ قول کسی کا نہیں ہے، لیکن ان کے قول سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اللہ وہی مسیح ہے نہ کوئی اور۔ آخر سورت نساء میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ سو جب اللہ مسیح اور مریم کو ہلاک کرنے پر قادر ہے اور کسی کا مقدور نہیں کہ وہ اللہ کو اس ارادے سے روک سکے اگر وہ چاہے۔ تو معلوم ہوا کہ اللہ کوئی اور ہے نہ کہ مسیح علیہ السلام، اگر نصاریٰ کے زعم کے مطابق مسیح اللہ ہوتے تو کچھ اختیار رکھتے اور زیادہ نہیں تو اپنی جان ہی سے ہلاکت کو دور کر سکتے۔ پس جب کہ وہ اپنی جان سے موت کو دور نہیں کر سکتے تو دوسرے سے اُسے دور کرنے میں زیادہ عاجز ہوں گے۔

﴿ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ﴾ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ خالقِ خلق ہے بحسبِ مشیت۔ خود اُس پر کسی مخلوق کے بارے میں اعتراض نہیں پہنچتا۔ آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا۔ حوا کو بغیر ماں کے پیدا کیا، عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔ باقی مخلوق کو ماں باپ کے ذریعے پیدا کیا۔ یہ سب چار صورتیں ہیں۔ ہر صورت دلیل ہے قدرتِ کاملہ کی۔ اُس پر کوئی شے مشکل نہیں۔ یہود نے جس طرح عزیر علیہ السلام کو، نصاریٰ نے جس طرح مسیح کو ابن اللہ کہا تھا، اسی طرح اپنے آپ کو بھی اللہ کا بیٹا، اللہ کا حبیب ٹھہرایا۔ یہ صرف دعویٔ باطلہ اور بے کار کی آرزوئیں ہیں۔ اللہ نے جواب دیا کہ بھلا اگر تم ایسے ہوتے تو اللہ تم کو تمھارے گناہوں پر دنیا میں قتل اور مسخ سے اور آخرت میں آگ سے عذاب کیوں کرتا، جس طرح تم خود اقرار کرتے ہو کہ ہم کو چند روز آگ چھوئے گی۔ بیٹا تو باپ کی جنس سے ہوتا ہے، جو بات باپ پر محال ہے، وہ بیٹے سے کس طرح صادر ہو سکتی ہے۔ حالاں کہ تم سے گناہ صادر ہوتے ہیں اور دوست اپنے دوست کو دُکھ نہیں دیتا، حالاں کہ تم کو عذاب کیا جاتا ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ تم اس دعوے میں جھوٹے ہو۔ اہلِ جدل کے نزدیک اس برہان کو برہانِ خلف

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ١٥١) [2] تفسیر الخازن (٢/ ٢٨)

کہتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے: ''لَا، وَاللّٰهِ! لَا يُعَذِّبُ اللّٰهُ حَبِيبَهُ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَبْتَلِيهِ فِي الدُّنْيَا'' [1]
''اللہ کی قسم اللہ اپنے دوست کو عذاب نہیں کرے گا، لیکن وہ اسے دنیا میں آزماتا ہے۔'' (رواہ أحمد في الزهد)

پھر فرمایا کہ تم تو آدمی ہو، تمھارا حساب خیر وشر لیا جائے گا۔ ہر عامل کو اس کے عمل کی جزا سزا ملے گی، پھر جب آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا مالک اللہ ٹھہرا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں ہے، کیوں کہ یہ محال ہے کہ اس کے خلق اور مِلک میں کوئی شبیہ اس کے لیے ہو۔ دنیا سے آخرت کی طرف انتقال کے وقت بازگشت اُس کی طرف سے ہے۔ [2]

يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿19﴾

اے اہلِ کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے، جو رسولوں کے وقفے کے بعد تمھارے لیے باتیں کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس تو کوئی خوش خبری دینے والا اور کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ پس یقیناً تمھارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا ہے، اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿19﴾

خاتم النبیین کی بعثت:

عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی رسول نہ آیا تھا۔ لہٰذا فرمایا کہ تم افسوس کرتے کہ ہم رسولوں کے وقت میں نہ ہوئے کہ اُن کی تربیت حاصل کرتے۔ اب بعد مدت تم کو رسول کی صحبت میسر ہوئی۔ غنیمت جانو اللہ قادر ہے، اگر تم نہ قبول کرو گے تو وہ اور مخلوق تم سے بہتر پیدا کر دے گا۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جہاد کرنا قبول نہ کیا ان کی قوم نے، تو اللہ نے ان کو محروم کر دیا اور ملکِ شام دوسروں کے ہاتھوں فتح کروایا۔ اللہ پاک نے اس آیت میں یہود ونصاریٰ کو خطاب کیا ہے کہ ہم نے تمھاری طرف خاتم النبیین کو بھیجا، جس کے بعد اب کوئی نبی اور رسول نہ آئے گا، بلکہ سب کے بعد یہی آئے ہیں۔ اسی لیے یہ لفظ فرمایا: ﴿عَلٰى فَتْرَةٍ﴾ یعنی مدت دراز کے بعد جو عیسیٰ ومحمد علیہما السلام کے درمیان گزری۔ اس مدتِ فترت میں اختلاف ہے۔ ابوعثمان نہدی وقتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چھے سو برس ہیں۔ [3] اس کو بخاری رحمہ اللہ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔ [4]

امام قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ مدت پانچ سو ساٹھ برس ہے۔ معمر نے نقل کیا ہے کہ

---

[1] الزهد (١/ ٥٤) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] فتح البيان (٣/ ٣٧٩۔ ٣٨٢)
[3] تفسير الطبري (١٠/ ١٥٦) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٣٢)

پانچ سو چالیس برس ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ اوپر چار سو تیس سال ہیں۔[1] امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع مسیح سے ہجرت تک نو سو تینتیس سال گزرے تھے۔[2] مشہور وہی قول اول ہے یعنی چھے سو سال۔ پھر کسی نے چھے سو بیس بھی کہے ہیں۔ اس میں کچھ تضاد نہیں۔ چھے سو سال سے سال شمسی مراد ہیں، دوسرے قول سے سال قمری۔ ہر تین سو شمسی اور قمری سالوں میں تقریباً آٹھ سال کا فرق پڑتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قصہ اہلِ کہف میں فرمایا ہے کہ وہ اپنے کہف میں تین سو برس رہے نو برس زیادہ، یعنی قمری حساب سے، تاکہ تین سو سال شمسی جو اہلِ کتاب کو معلوم تھے، پورے ہو جائیں۔ پھر فترت بنی اسرائیل کے آخری نبی مسیح علیہ السلام اور ہمارے نبی اکرم ﷺ کی درمیانی مدت کو کہتے ہیں علی الاطلاق آدم علیہ السلام سے۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِابْنِ مَرْيَمَ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ»[3] ''میں تمام لوگوں سے زیادہ ابن مریم علیہ السلام کا حق دار ہوں، میرے اور اُن کے درمیان کوئی اور نبی نہیں ہے۔''

اس حدیث میں اس شخص پر رد ہے، جو یہ بات کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد خالد بن سنان نام کے ایک نبی آئے تھے، جس طرح کہ قضاعی وغیرہ نے حکایت کیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو اس حالت میں بھیجا کہ رسولوں کا آنا بند تھا، رستے مٹ گئے تھے، دین بدل گئے تھے، کثرت سے بت پرستی ہوتی تھی، آگ اور صلیب پوجے جاتے تھے۔ یہ آنا ایک پوری نعمت تھی۔ اس آنے کی حاجت عام طور پر پیش تھی، کیوں کہ فساد نے پورے جہان کو گھیر رکھا تھا۔ سرکشی اور جہالت کا زور شور تھا۔ دنیا کفر کے اندھیرے سے بھر گئی تھی، جس کو دیکھو بدکردار، بدچال، بد دین تھا، مگر مشتے از خروارے جو سابقہ انبیا اقدس علیہم السلام کے باقی ماندہ دین کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ جس طرح بعض احبار یہود اور عیسائیوں اور صابئین سے۔

سیدنا عیاض رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: «ثُمَّ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ نَظَرَ إِلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ، فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ إِلَّا بَقَايَا مِنْ بَنِي إِسْرَآئِيلَ» (الحديث رواه أحمد) **مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:** «مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ»[4] **حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:** وَكَانَ الدِّيْنُ قَدِ الْتَبَسَ عَلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ كُلِّهِمْ حَتّٰى بَعَثَ اللّٰهُ مُحَمَّداً فَهَدَى الْخَلَائِقَ وَأَخْرَجَهُمُ اللّٰهُ بِهِ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ... الخ»[5] بشیر ونذیر سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں۔ ان کا آنا اتمامِ حجت کے لیے ہوا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے پر قدرت سے مراد یہ ہے کہ جس کو نافرمانوں میں سے چاہوں عذاب کروں اور مطیعوں میں سے جس کو چاہوں ثواب دوں۔[6]

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ١٥٧) [2] تاريخ دمشق لابن عساكر (٤٧/ ٣٥٣۔ ٣٥٤)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٨) [4] مسند أحمد (٤/ ١٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥)
[5] تفسير ابن كثير (٢/ ٥١) [6] تفسير الطبري (١٠/ ١٥٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ فترت کے معنی سکون و انقطاع کے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے ایک مدت دراز سے پیغمبروں کا آنا جانا منقطع ہو گیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان ایک ہزار نو سو برس گزرے۔ اس میں فترت نہ تھی، ایک ہزار نبی خاص بنی اسرائیل میں آئے، سوا ان کے جو غیر بنی اسرائیل سے گزرے۔ عیسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان پانچ سو انہتر برس ہوئے، اس کے شروع میں تین نبی آئے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذْ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ ﴾ [یٰسٓ: ١٤] ''جب ہم نے ان کی طرف دو (رسول) بھیجے تو انھوں نے انھیں جھٹلایا، پھر ہم نے (انھیں) تیسرے کے ساتھ تقویت دی۔''

ثالث سے مراد شمعون ہیں، یہ حواریین میں سے تھے۔ وہ فترت جس میں کوئی رسول نہ اٹھا، چار سو چونتیس برس ہے۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فترتِ رسل کے وقت نبی ﷺ کی بعثت کا فائدہ یہ ہے کہ بہت زیادہ مدت اور طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے پہلی شریعتوں میں تحریف اور تبدیلی ان کے اندر گھس گئی تھی، حق باطل کے ساتھ خلط ملط ہو گیا تھا اور جھوٹ سچ کے ساتھ مل گیا تھا، ان لوگوں کے لیے یہ ایک ظاہر عذر تھا کہ وہ عبادات کو ترک کر دیں۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ اے ہمارے اللہ! تیری عبادت تو بے شک ضروری تھی، لیکن ہم نے نہ جانا کہ کس طرح عبادت کریں، اس لیے اُس وقت اللہ پاک نے محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ عذر دور کرنے کے لیے بھیجا، تاکہ ان کی حجت ختم کی جائے، وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے پاس کوئی خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔[2] اب جو اللہ نے بشیر اور نذیر کو بھیج دیا اور اس کی شریعت کو تا قیامت برقرار رکھا اور کتاب کی حفاظت کا خود ذمہ لیا اور سنت کو قرآن کے ساتھ حکمِ وحی میں قائم کیا، تو اب سارے عذر جاتے رہے، اب جو کتاب و سنت کے خلاف کوئی عبادت یا کام کرے گا تو وہ معذور نہ ہو گا، بلکہ عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔[3] نعوذ باللہ من غضب اللہ.

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ
يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝٢٠ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ
الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى
اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝٢١ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا

---

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد (١/ ٥٣) اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الرازي (١١/ ١٥٥) [3] فتح البیان (٣/ ٣٨٣۔ ٣٨٤)

قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ
يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ
غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا
يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ
اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ
اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ
فِى الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اللہ کی نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی، جب اس نے تم میں سے نبی بنائے اور تمھیں بادشاہ بنایا، اور تمھیں وہ کچھ دیا جو ساری دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا (20) اے میری قوم! مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ، جو اللہ نے تمھارے نام لکھ دی ہے اور تم اپنی پشت کے بل منہ نہ موڑو، پھر تم خسارہ اُٹھانے والے ہو جاؤ گے (21) انھوں نے جواب دیا: اے موسیٰ! بے شک اس زمین میں ایک بڑی زور آور قوم ہے۔ اور ہم ہرگز اس میں داخل نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ وہ لوگ اس میں سے نکل جائیں، پھر اگر وہ اس میں سے نکل گئے تو بے شک ہم داخل ہو جائیں گے (22) جو لوگ اللہ سے ڈرتے تھے، ان میں سے دو آدمی جن پر اللہ کا فضل تھا، وہ بولے: تم ان کے مقابلے کے لیے دروازے میں داخل ہو جاؤ، پھر جب تم دروازے میں داخل ہو گئے تو بے شک تم غالب آ جاؤ گے اور اگر تم مومن ہو تو تمھیں اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے (23) وہ کہنے لگے: اے موسیٰ! ہم ہرگز اس زمین میں داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، چناں چہ تو اور تیرا رب جائے، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں (24) موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! بے شک مجھے اپنے آپ اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں، چناں چہ تو ہمیں اس نافرمان قوم سے الگ کر دے (25) اللہ نے فرمایا: بے شک وہ (مقدس زمین) ان لوگوں پر چالیس برس تک حرام کر دی گئی ہے، وہ زمین میں چالیس برس تک اِدھر اُدھر بھٹکتے پھریں گے، چناں چہ آپ اس نافرمان قوم کا غم نہ کھائیں (25)

موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو اللہ کی نعمتیں یاد کروانا اور ارضِ مقدس میں داخل ہونے کا حکم:

ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کا وطن چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلے اور ملکِ شام میں آ کر ٹھہرے۔ مدت تک ان کے اولاد نہ ہوئی، تب اللہ نے ان کو بشارت دی کہ تیری اولاد بہت پھیلاؤں گا اور سرزمینِ شام ان کو دوں گا اور نبوت اور دین اور کتاب اور سلطنت ان میں رکھوں گا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں وہ وعدہ پورا کیا، بنی اسرائیل کو فرعون کی بیگار سے خلاصی دلائی اور اُس کو غرق کیا، ان کو فرمایا کہ تم جہاد کرو، عمالقہ سے ملکِ شام چھین لو، پھر ہمیشہ وہ ملکِ شام تمھارا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارہ شخص بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے سردار مقرر کیے، ان کو بھیجا کہ اُس ملک کی خبر لائیں۔ وہ خبر لائے تو ملکِ شام کی خوبیاں بہت بیان کیں، وہاں عمالقہ مسلط تھے، ان کی قوت اور طاقت بھی بیان کی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم قوم کے پاس ملک کی خوبی بیان کرو اور دشمن کی قوت کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ اُن میں سے دو شخص اس حکم پر رہے باقی دس نہ رہے۔ قوم نے سنا، وہ نامردی کرنے لگے اور چاہا کہ پھر لوٹ کر مصر کو جائیں، اس قصور سے ملکِ شام میں فتح کرنے میں چالیس برس دیر لگی۔ اتنی مدت جنگلوں میں پھرتے رہے۔ جب اُس قرن کے لوگ مر چکے، مگر وہ دو شخص بچ گئے، وہی موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ ہوئے، ان کے ہاتھ سے فتح ہوئی۔ اہلِ کتاب کو یہ قصہ سنایا، اس لیے کہ اگر تم پیغمبر کی رفاقت نہ کرو گے تو یہ نعمت اوروں کو نصیب ہوگی، آگے اسی پر قابیل اور ہابیل کا قصہ سنایا کہ حسد مت کرو، حسد والا مردود ہے۔

اللہ نے اس جگہ یہ خبر دی ہے کہ ہمارے بندے اور رسول اور کلیم موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے اپنی قوم کو یاد دلایا کہ دیکھو اللہ نے تم پر کیسا کچھ انعام کیا، دنیا اور آخرت کی بہتری اور بھلائی تمھارے لیے جمع کر دی، اب تو تم سیدھی راہ چلو۔ تم میں جب ایک نبی فوت ہوا تو دوسرا نبی بھیجا۔ ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے اس وقت تک یہی دستور رہا کہ ہمیشہ ایک کے بعد دوسرا پیغمبر آتا رہا، جو اللہ کی طرف بلاتا تھا اور اللہ کے انتقام سے ڈراتا تھا، یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام پر یہ سلسلہ ختم ہوگیا، بنی اسرائیل کے انبیا ختم ہوگئے۔ پھر اللہ نے محمد ﷺ کو، جو علی الاطلاق خاتمِ انبیا و رسل ہیں، اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے ہیں اور پہلے تمام انبیا سے اشرف و اکرم و اعلیٰ ہیں، وحی بھیجی۔

بادشاہ سے مراد:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ملوک سے مراد زن و خادم اور گھر ہے۔[1] بنی اسرائیل میں جس کے پاس خادم اور عورت ہوتی، وہ بادشاہ کہلاتا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے کہا کہ کیا میں فقرائے مہاجرین میں سے نہیں ہوں؟ کہا: تیرے پاس عورت ہے، جس کے پاس تو رات بسر کرتا ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: تیرے پاس گھر ہے جس میں تو رہتا بستا ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: تو غنی ہے۔ اُس نے کہا: میرے پاس ایک خادم بھی ہے، کہا: ”فَأَنْتَ مِنَ

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ١٦٢)

الْمُلُوْكِ» یعنی اب تو بادشاہ ہے۔[1] (رواہ ابن جریر)

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملک یہی مرکب (سواری) و خادم و خانہ ہے۔ اسی طرح امام حکم، مجاہد، منصور اور ثوری رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔ ابن شوذب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں جس کے پاس گھر اور خدمت گار ہوتا اور اس سے اذن چاہتے تو وہ بادشاہ کہلاتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سب سے پہلے انھیں نے خادم مقرر کیے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملوک ہونے سے مراد اپنے جان، مال اور اہل کا مالک ہونا ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں جس کے پاس خادم وسواری وعورت ہوتی، وہ بادشاہ لکھا جاتا۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم) زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا، مگر اتنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ كَانَ لَهُ بَيْتٌ وَّخَادِمٌ فَهُوَ مَلِكٌ»[4] ''جس شخص کے پاس گھر اور خادم ہے، وہ بادشاہ ہے۔'' (وھذا مرسل غریب رواہ ابن جریر) حدیث میں مروی ہے: «مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ مُعَافًى فِيْ جَسَدِهٖ، آمِنًا فِيْ سَرْبِهٖ، عِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ، فَكَأَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا»[5]

عالمین سے مراد:

﴿ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ سے مراد اس وقت کے اہلِ عالم ہیں، اس لیے کہ یونان و قبط اور بنی آدم کی تمام اصناف میں یہی زیادہ تر شریف تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الجاثیة: ١٦] ''اور یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت دی اور ہم نے انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے انھیں جہانوں پر فضیلت دی۔''

غرضیکہ بنی اسرائیل اپنے زمانے میں سب اہلِ زمان سے افضل تھے، ورنہ یہ امت اشرف اور افضل ہے اللہ کے نزدیک، شریعت میں اکمل ہے۔ منہاج میں سب سے زیادہ مضبوط ہے، رزق میں سب سے زیادہ تر ہے، اموال اور اولاد میں سب سے اکثر ہے، مملکت میں سب سے زیادہ وسیع ہے اور عزت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ [آل عمران: ١١٠] ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح)

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٧٩) تفسیر الطبري (١٠/ ١٦١)

[2] تفسیر الطبري (١٠/ ١٦١۔ ١٦٣) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٢)

[3] ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بجائے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٢) الدر المنثور (٣/ ٤٦) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' اور ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہیں۔

[4] تفسیر الطبري (١٠/ ١٦١) یہ روایت مرسل ہے۔

[5] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٣٤٦) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤١٤١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٣١٨)

کے لیے پیدا کی گئی ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ [البقرۃ: ١٤٣] ''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو۔''

جہاد کی ترغیب اور ارضِ مقدس میں جانے کا حکم:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو مالک اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خطاب ﴿ اٰتٰكُمْ ... الخ﴾ اس امت کو ہے،[1] مگر جمہور کہتے ہیں کہ قومِ موسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ مراد من سلویٰ کا نزول اور سایۂ ابر وغیرہ ہے اور وہ خوارق (عام عادت کو توڑنے والے) جو ان کے ساتھ مخصوص تھے۔ پھر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو جہاد کے لیے اُبھارنے کا ذکر کیا کہ انھوں نے کہا ہے کہ تم بیت المقدس میں داخل ہو۔ یہ جگہ یعقوب علیہ السلام کے زمانے میں انھیں میں تھی، مگر جب وہ اپنے فرزندان اور گھر والوں کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بلادِ مصر کو چلے آئے تو وہاں عمالقہ نے اپنا قبضہ کر لیا، مالک بن بیٹھے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم ان سے لڑو فتح یاب ہو گے، کامیابی تمھاری ہو گی، مگر وہ ہمت ہار گئے، کہنا نہ مانا، کہا کہ وہ نکلیں تو ہم گھسیں۔ اس قصور پر یہ عتاب ہوا کہ جنگل وصحرا اور دشت میں مارے مارے پھریں۔ حیران پریشان اور سرگرداں تھے، کچھ نہ جانتے تھے کہ کدھر جائیں، کیا کریں کس طرح مقصد پائیں، چالیس سال لگاتار ان کی یہی گت بنی رہی، یہ سزا ہے اس تفریط کی، جو انھوں نے اللہ کے حکم میں کی۔

''مُقَدَّس'' کہتے ہیں مطہر کو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد طور اور اُس کے اردگرد کا علاقہ ہے۔ یہی امام مجاہد وغیرہ کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اریحاء ہے۔[2] بہت سے مفسرین نے یوں ہی کہا ہے، مگر اس میں نظر ہے، اس لیے کہ فتح سے مقصود کچھ اریحا نہ تھا اور نہ وہ بیت المقدس کے راستے میں پڑتا تھا، وہ تو بلادِ مصر سے فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد چلا آتا تھا۔

قوم جبار سے مراد:

اگر اریحا سے مراد وہ مشہور شہر ہے، جو طور کی طرف بیت المقدس کے مشرق میں واقع ہے، تو اور بات ہے۔ قوم کو جبار کہا، یعنی ان کے اخلاق ہولناک اور ان کے قویٰ سخت تر ہیں، ہمیں ان کے سامنے کھڑے ہونے کی اور اُن پر حملہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، جب تک وہ اس شہر میں ہیں، ہم وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر وہ باہر نکل جائیں تو ہم وہاں جائیں، ورنہ ہمیں ان کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی لاٹھی کو ناپا، معلوم نہیں کتنے گز نکلی، پھر اس لاٹھی سے پچاس یا پچپن تک زمین ناپی، پھر کہا کہ عمالیق کا طول اتنا تھا۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ١٦٤) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٣) [2] تفسیر الطبري (١٠/ ١٦٧۔ ١٦٨) [3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٤)

عوج بن عنق کی حقیقت:

بہت سے مفسرین نے اس جگہ وضع بنی اسرائیل سے جبارین کی عظیم خِلقت کے بارے میں خبریں ذکر کی ہیں، کہا: ان میں سے ایک عوج بن عنق بنت آدم علیہ السلام تھا، اُس کا طول تین ہزار تین سو تینتیس گز تہائی ذراع تھا۔ ازروئے حساب یہ ایسی شے ہے، جس کا ذکر کرنے سے شرم آتی ہے۔ علاوہ اس کے صحیحین کی حدیث کے خلاف ہے، جس میں مرفوعاً اس طرح مروی ہے: «إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ، وَطُوْلُهُ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا، ثُمَّ لَمْ يَزَلِ الْخَلْقُ يَنْقُصُ حَتّٰى الْآنَ»[1] ''بے شک اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اُن کا طول ساٹھ ہاتھ تھا، پھر خلقت گھٹتی رہی، حتی کہ موجودہ لمبائی رہ گئی۔''

پھر کہا کہ وہ شخص کافر تھا ولد الزنا تھا۔ نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار نہ ہوا، طوفان اُس کے گھٹنوں تک نہ پہنچا۔ یہ سب زٹل قافیہ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نوح علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی: ﴿ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦] ''اور نوح نے کہا: (اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴾ [الشعرآء: ١١٩۔ ١٢٠] ''چناں چہ ہم نے اسے اور جو (لوگ) بھری کشتی میں اس کے ساتھ تھے ان کو نجات دی۔ پھر اس کے بعد ہم نے باقی سب غرق کر دیے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ﴾ [ھود: ٤٣] ''آج اللہ کے حکم (عذاب) سے کوئی بچانے والا نہیں، مگر جس پر اللہ رحم فرمائے۔'' لہٰذا جب خاص نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر ڈوب گیا۔ عوج بن عنق باوجود کافر ولد الزنا ہونے کے کیسے بچا؟! یہ بات نہ عقل میں ٹھیک بیٹھتی ہے نہ شرع میں، بلکہ ایسے شخص کے وجود میں جسے عوج بن عنق کہتے ہیں نظر ہے۔ ایسی کہانیاں اول جلول کہلاتی ہیں۔ شیخ چلیوں کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ واللّٰه أعلم.

دو آدمیوں سے مراد:

بارہ نقیبوں میں دو آدمی ایسے نکلے، جنھوں نے جنگ کے لیے اُبھارنے کا کام کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا تھے۔ یہی امام مجاہد، عکرمہ، عطیہ، سدی اور ربیع رحمہ اللہ اور بہت سے سلف اور خلف رحمہ اللہ کا قول ہے،[2] مگر بنی اسرائیل نے ہمت ہار دی، جہاد پر راضی نہ ہوئے، رسول کی مخالفت کی، دشمنوں سے جنگ سے ڈر کر مصر کا ارادہ کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے سرداروں کے سامنے سجدہ کیا، ان کے انکار کے خوف سے یوشع و کالب نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، قوم کو ملامت کی۔ کہتے ہیں کہ قوم نے ان دونوں کو پتھر مارے، ایک امرِ عظیم، خطرِ جلیل پیش آیا، ایک قوم کا تو یہ جواب تھا۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٤٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٤١)
[2] تفسیر الطبري (١٠/ ١٧٦۔ ١٧٨)

بدر کے موقع پر مسلمانوں کا جواب:

ایک جواب صحابہ کا بدر کے دن تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں سے لڑنے کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ چاہا، جو ابوسفیان کے ہمراہ قافلے کو روکنے کے لیے آئے تھے۔ وہ گنتی میں نو سو سے ہزار تک تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مہاجرین نے اچھا جواب دیا، نبی اکرم ﷺ یہی کہتے تھے: اے مسلمانو! مجھ کو مشورہ دو، صلاح دو۔ آپ ﷺ دراصل انصار کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتے تھے، اس لیے کہ زیادہ تر لوگ اُس دن وہی تھے۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: شاید آپ ہم سے تعریض (ہماری طرف اشارہ) فرماتے ہیں۔ واللہ! جس نے آپ کو سچ مچ بھیجا ہے، اگر آپ برک الغماد کے درمیان گھسیں گے، ہم آپ کے ساتھ کود پڑیں گے، ہم میں سے ایک بھی آپ سے پیچھے نہیں رہے گا۔ ہم کل کو آپ کے ساتھ مل کر دشمن سے ملنا ناپسند نہیں کرتے، ہم تو لڑائی میں ثابت قدم اور دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے میں سچے ہیں۔ شاید اللہ آپ کو ہم سے ایسی بات دکھائے، جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ لے چلیں ہم کو اللہ کی برکت پر۔ نبی کریم ﷺ سعد رضی اللہ عنہ کی اس بات سے حد درجہ خوش ہوئے۔[1]

سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ نے بدر کے دن نبی اکرم ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے وہ بات نہ کہیں گے، جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ﴾ (آیتِ باب) لیکن ہم یہ کہتے ہیں: "اِذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا مَعَكُمَا مُقَاتِلُوْنَ"[2] "آپ اور آپ کا پروردگار چلیں اور جنگ کریں، ہم بھی آپ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوں گے۔" (رواہ أحمد)

روایت کے دوسرے الفاظ اس طرح ہیں: سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: میں سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کے پاس ایسی جگہ حاضر ہوا کہ اگر میں اس کا ساتھی ہوتا تو وہ مجھے اچھا لگتا، وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے، آپ ﷺ مشرکین پر بددعا کر رہے تھے، کہا: اے اللہ کے رسول! ہم وہ بات نہ کہیں گے، جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ جا تو اور تیرا رب لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں، لیکن ہم لڑیں گے، آپ کے داہنے، بائیں، آگے اور پیچھے۔ میں نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ کا چہرہ ہشاش بشاش ہوگیا۔[3] (رواہ أحمد)

صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم ﷺ سے کہا: «لَا نَقُوْلُ لَكَ كَمَا قَالَتْ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ لِمُوْسٰى: اذْهَبْ... الخ وَلٰكِنْ اِمْضِ وَنَحْنُ مَعَكَ، فَكَأَنَّهٗ سُرِّيَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»[4] "ہم آپ سے اس طرح نہیں کہیں گے، جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تو اور تیرا رب جا کر لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، لیکن آپ چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں، گویا اس بات نے رسول اللہ ﷺ کو بہت

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٣/ ١٦٢) [2] مسند أحمد (٤/ ٣١٤) یہ روایت صحیح ہے۔
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٣٦) مسند أحمد (١/ ٣٨٩) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٣٣)

خوش کیا۔'' ایک روایت میں یوں ہے کہ سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ نے حدیبیہ کے دن یہ بات کہی تھی، جب کافروں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قربانی اور مناسک سے روک دیا تھا۔[1] لہٰذا اگر یہ روایت محفوظ ہے تو اس دن اور بدر کے دن بھی کہا ہو۔ اس کہنے میں سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کی کمال درجے کی دلاوری، بہادری اور فضیلت ثابت ہوئی۔

موسیٰ علیہ السلام کی بددعا اور چالیس سال تک بنی اسرائیل کا دربدر ٹھوکریں کھانا:

غرضیکہ جب بنی اسرائیل نے جبابرہ سے لڑائی کرنے سے انکار کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے غصے میں آکر ان پر بددعا کی، کہا: اے رب! میں اور میرا بھائی حاضر ہیں، ہمارے اور اس فاسق قوم کے درمیان جدائی کر دے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔[2] ایک الفاظ یہ ہیں کہ باہم ہمارے اور اُن کے درمیان جدائی ڈال، یعنی ''فَافْرُقْ'' کے معنی ہیں: ''اِقْضِ'' یا ''اِفْصِلْ'' جیسے شاعر نے کہا ؎

يَا رَبِّ فَافْرُقْ بَيْنَهٗ وَبَيْنِيْ أَشَدَّ مَا فَرَقْتَ بَيْنَ اثْنَيْنِ

''اے میرے رب! اس کے اور میرے درمیان اتنی جدائی ڈال دے، جتنی جدائی تو نے دو کے درمیان ڈالی۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے جبارین کے ساتھ جہاد سے انکار کرنے پر بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ چالیس سال تک اس شہر میں نہ جائیں، تیہ میں پڑے رہیں، مارے مارے پھرتے رہیں، اس بیابان سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ پائیں۔ وہاں پر عجیب وغریب اور عام فطرتی اصولوں کو توڑنے والے امور پیش آئے، جیسے: اَبر کا سایہ کرنا، اترنا من وسلویٰ کا، پانی کا ٹھوس پتھر سے جاری ہونا، اس کے سوا اور بہت معجزات ظاہر ہوئے۔ وہیں تورات بھی اُتری، احکام مشروع ہوئے، قبۂ عہد جس کو قبۂ زمان کہتے ہیں، وہیں بنایا گیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ چالیس سال تک ہر صبح چلتے، قرار نہ تھا، مگر راستہ نہ پاتے، وہیں ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوا، پھر ان سے تین برس بعد موسیٰ علیہ السلام نے وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ یوشع بن نون کو خلیفہ کیا، وہ نبی تھے۔ اس مدت میں اکثر بنی اسرائیل مر گئے۔ کہتے ہیں کہ سوائے یوشع وکالب کے کوئی باقی نہ رہا، جب چالیس سالہ مدت گزر گئی، یوشع علیہ السلام باقی بچے کھچوں اور سارے بنی اسرائیل کو لے کر جبلِ ثانی سے چل کر بیت المقدس میں آئے، شہر کا محاصرہ کیا، جمعہ کے دن عصر کے وقت فتح یاب ہوئے، سورج ڈوبنے کو تھا، خوف ہوا کہ کہیں روز شنبہ نہ آجائے۔ یوشع نے کہا: ''إِنَّكِ مَامُوْرَةٌ، وَأَنَا مَامُوْرٌ، اَللّٰهُمَّ احْبِسْهَا عَلَيَّ'' ''(اے سورج!) تو بھی حکم کا پابند ہے اور میں بھی حکم کا پابند ہوں، اے اللہ! اسے مجھ پر روک لے۔'' اللہ نے آفتاب کو روک لیا، یہاں تک کہ شہر کو فتح کر لیا۔[3]

پھر اللہ تعالیٰ نے یوشع علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ بیت المقدس میں سجدہ کرتے ہوئے اور

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ١٨٦) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسير الطبري (١٠/ ١٨٩) اس کی سند حسن ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٥٦)

﴿ حِطَّةٌ ﴾ کہتے ہوئے داخل ہوں، یعنی ہمارے گناہ جھاڑ دے۔ انھوں نے اللہ کے حکم کو بدل ڈالا، چوتڑ کے بل گھسٹتے ہوئے ''حَبَّةٌ فِيْ شَعْرَةٍ'' کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ یہ قصہ سورت بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ اللہ، جہالت اور گمراہی اس قوم کی کہ چالیس سالہ سزا بھگتنے کے بعد جب اُنھیں نعمت اور فتح حاصل ہوئی، وہ بدبخت اسی جاہلیت، حماقت اور سرکشی پر جمے رہے۔ اللہ کے احسانوں کا کچھ شکر نہ مانا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ چالیس سال سرگرداں رہے۔ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے وہیں تیہ میں وفات پائی۔ جس کی عمر چالیس سال سے زیادہ تھی، وہ بھی وہیں مرا۔

جب یہ مدت گزر گئی تو یوشع بن نون جو موسیٰ علیہ السلام کے قائم مقام تھے، وہ باقی رہے سبھوں کو لے کر نکلے، انھوں نے قدس کو فتح کیا، اُن سے کہا کہ آج جمعے کا دن ہے، انھوں نے فتح کا ارادہ کیا، سورج غروب ہونے کے قریب آیا، وہ ڈرے کہ کہیں شبِ شنبہ نہ آجائے کہ یہ لوگ روزِ شنبہ کو مانیں۔ آفتاب سے پکار کر کہا تو مامور ہے اور میں بھی مامور ہوں، وہ ٹھہر گیا، انھوں نے شہر فتح کر لیا، اتنا مال پایا کہ اس کے برابر کبھی دیکھا نہ گیا تھا۔ جمع کر کے رکھا آگ نہ آئی۔ کہا تم میں کسی نے خیانت کی ہے۔ تمام قبیلوں کے سرداروں کو بلایا، وہ بارہ شخص تھے، ان سے بیعت لی۔ ایک شخص کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چپک گیا، کہا: خیانت تیرے پاس ہے، نکال اُس نے سونے کا گائے کا سر نکالا، جس کی دو آنکھیں یاقوت کی اور دانت موتی کے تھے، جب اُس کو قربانی کے مال کے ساتھ رکھا، آگ آکر کھا گئی۔ اس روش کے لیے صحیح میں شاہد ہے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ'' کے یہی معنی ہیں کہ وہ چالیس سال تک جنگل میں پھرتے رہے، منزلِ مقصود نہ پاتے تھے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ نکل کر فتح کیا، پھر اس پر یہ حجت بیان کی ہے کہ علمائے اولین اور احبارِ متقدمین کے اجماع کے مطابق عوج بن عنق کے قاتل موسیٰ علیہ السلام ہیں، لہٰذا اگر ان کا عوج کو یہ قتل کرنا تیہ سے پہلے ہوتا تو بنی اسرائیل عمالقہ سے مقابلے اور جنگ سے سست نہ پڑتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُس کا قتل تیہ کے بعد تھا۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ بلعام بن باعوراء نے جبارین کی مدد کی اور موسیٰ علیہ السلام پر بددعا کی، سو یہ بھی تیہ کے بعد ہوا۔ اس لیے کہ جبابرہ تیہ سے پہلے موسیٰ اور اُن کی قوم سے ڈرتے نہ تھے۔ یہ تو بطورِ استدلال کہا ہے۔

پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا دس گز تھا اور وہ خود بھی دس گز کے تھے اور دس گز اُچک کر مارا تو عوج کی ایڑی کو لگا، وہ مقتول ہوا، ایک سال تک دریائے نیل کا پُل رہا،[2] لیکن اللہ جانے کہ یہ کیسی کہانی ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی کہ یہ فساق اسی سزا کے مستحق تھے، جو اُن کو ملی، تم ان

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۷)

[2] تفسیر الطبري (۱۰/ ۱۹۸۔ ۱۹۹) یہ روایت من گھڑت اور باطل ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: المنار المنیف لابن القیم (۱/ ۷٦۔ ۷۷)

پر کچھ افسوس اور رنج نہ کرو۔

یہ قصہ یہودیوں کی ان سختیوں اور ملامتوں اور اُن رسوائیوں کے بیان اور اس مخالفت کو شامل ہے جو انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اختیار کیں، جب اللہ اور رسول نے انھیں جہاد کا حکم دیا، وہ دم دبا گئے، دشمن کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے سے جان چرا گئے، ان کے ساتھ جنگ و جدل اور مقابلہ کرنے سے ہمت ہار بیٹھے، حالاں کہ ان کے درمیان اللہ کا رسول کلیم اللہ اور تمام مخلوق سے برگزیدہ اُس زمانے کا موجود تھا اور اُس نے اُن سے مدد اور کامیابی کا وعدہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرعون اور لشکرِ فرعون پر عذاب اور غرق ہونے کی سزا کو ملاحظہ کر چکے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود اہلِ بلد سے جنگ کرنے کے لیے جو مصریوں کی نسبت دسواں حصہ بھی نہیں تھے، نامردی کرنے لگے۔ آخر ان کی برائیاں اور اچھائیاں ہر خاص و عام پر کھل گئیں۔ ایسے رسوا ہوئے کہ جس کو نہ رات چھپائے نہ دامن۔ اپنی جہالت میں اندھے ہوگئے، اپنی گمراہی میں متردد رہے۔ اللہ تعالیٰ کے دشمن ٹھہر گئے، اس پر یہ دعویٰ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔ اللہ نے اُن کو سؤر اور بندر کر دیا، لعنت کر کے جہنم کا مستحق ٹھہرا دیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جتنے انبیا بنی اسرائیل میں ہوئے، اتنے عالی شان پیغمبر اور کسی امت میں نہیں ہوئے۔ پیغمبروں کے سوا بادشاہ بھی ہوئے، پہلے مملوکِ فرعون تھے، اب مالکِ زمین ہوئے یا ملوک سے مراد منازل ہیں کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی ان کے پاس حاضر نہیں ہوسکتا تھا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے گھروں میں نہریں جاری تھیں، بڑے بڑے وسیع گھر تھے، جس گھر میں پانی کی نہر بہتی، وہ بادشاہ ہوتا۔[1] ظاہر یہ ہے کہ مراد ملک حقیقی ہے، یعنی سچ مچ بادشاہِ وقت تھے، اگر اور کچھ معنی ہوتے، جیسے گھر، در، خادم مرکب تو کچھ امتنان (احسان) نہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اور قوموں میں بھی ملوک ہوئے ہیں، مگر اتنے نہیں کہ جتنے بنی اسرائیل میں ہوئے۔

ارضِ مقدسہ سے مراد زمینِ پاک اور خاکِ مبارک ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جبلِ لبنان پر چڑھے، ان سے کہا گیا، نظر کرو جہاں تک تمھاری نگاہ جائے گی، وہ مقدس ہے۔ تمھاری اولاد کی میراث ہے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارا شام ارضِ مقدس ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طور اور اُس کے اردگرد کا علاقہ ہے۔[3] سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: عریش سے فرات تک ہے۔[4] امام سدی رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہما نے کہا ہے کہ اریحا ہے۔[5] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دمشق و فلسطین اور اُردن کا بعض حصہ ہے۔[6] امام قتادہ رحمہ اللہ کے الفاظ ان تمام اقوال کو شامل ہیں۔

---

(1) تفسیر البغوي (٣/ ٣٥) (2) تفسیر البغوي (٣/ ٣٦) (3) تفسیر الطبري (١٠/ ١٦٧)
(4) تاریخ دمشق (١/ ١٤٩۔ ١٥٠) (5) تفسیر الطبري (١٠/ ١٦٨) (6) معاني القرآن (٢/ ١٦٢۔ ١٦٣)

لکھنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم یا لوحِ محفوظ میں یہ لکھ رکھا ہے کہ اگر تم ایمان لاؤ گے، اطاعت کرو گے تو یہ جگہ تمھارا مسکن ہوگی یا جس طرح اللہ نے تم کو نماز و روزہ اور زکات و حج کا حکم کیا ہے، اسی طرح یہ حکم دیا ہے کہ تم اس زمین پر رہو بسو، اگر تم حکم نہ مانو گے اور جبارین سے نہ لڑو گے تو نقصان میں پڑو گے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ نافرمانی کے بہ سبب چالیس برس تک بیت المقدس میں داخلہ ان پر حرام کر دیا گیا۔ جبار اُس آدمی کو کہتے ہیں، جو لوگوں سے اپنا ارادہ پورا کرائے یا دوسرے پر زبردستی کرے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ وہ ایک عظیم اور طویل قوم ہے۔

بعض نے کہا کہ قومِ عاد میں سے باقی بچے ہوئے لوگ تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اولادِ عیص بن اسحاق تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ روم تھے۔ عوج بن عنق کے بارے میں ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوئی کہ کلام کو طول دیا جائے۔ نہ یہ قصہ پہلا جھوٹ ہے جو لوگوں میں مشہور ہو رہا ہے۔ نہ ہم نے یہ ذمہ کیا ہے کہ لوگوں کے جھوٹ کو دفع کرتے رہیں۔ قصاص (داستان گوؤں) نے ایسے بہت قصے داستان بنائے ہیں، جن کو صحیح اور سقیم میں تمیز نہیں ہے، ان کے نزدیک ایسے قصے چل جاتے ہیں۔ تفسیروں کے دفتر اس قسم کے جھوٹے قصوں اور کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں، جو سب کے سب بے ہودہ باتیں ہیں، جس شخص کو فنِ روایت سے آشنائی نہ ہو، صحیح اور غلط کی پہچان نہ کر سکے، اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ کتاب اللہ کی تفسیر پیش کرنا شروع کر دے اور مفسر بنے۔ پھر ایسی احمقانہ باتیں اور ایسی کہانیاں، جن سے ہنسی آئے، کتبِ قصاص سے لا کر مناسب جگہوں میں رکھے۔ خازن وغیرہ میں بھی اس قسم کے باطل قصے کہانیاں بہت ہیں۔ عمالقہ کے جسموں وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ مبالغہ بیان کیا گیا ہے۔

غالب گمان ہے کہ وہ بہت زیادہ جھوٹے قصوں میں سے ہوگا، اس کے روایت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

انعام سے مراد ہے کہ آن کو اللہ کے وعدے، مدد اور کامیابی کا یقین تھا یا وہ راز کو افشا کرنے سے بچے رہے، اُن کی یہ صلاح تھی کہ شہر کے دروازے پر پہنچ کر عمالقہ کو باہر نکلنے سے روک دیں، تاکہ ان کو میدانِ جنگ ہاتھ نہ آئے، محصور ہو جائیں، مگر قوم نے نہ مانا، ڈر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے حسرت و غم سے کہا کہ اے رب! یہ تو لڑتے نہیں نامردی کرتے ہیں، میں اور میرا بھائی حاضر ہیں۔ کہتے ہیں وہ زمین جس میں وہ سرگرداں پھرتے رہے، وہ چھے فرسخ تھی، جہاں رات ہوتی، وہاں صبح کرتے، جہاں صبح ہوتی، وہاں رات گزارتے، غرضیکہ رات دن چلنے پھرنے میں رہتے۔ قرار و سکون نہ تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ چھے فرسخ بارہ فرسخ میں تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ نو فرسخ تیس فرسخ میں، قوم چھے لاکھ نفر تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہمراہ نہ تھے۔ اس لیے کہ تیہ سزا تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ ہمراہ تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر تیہ کو آسان کر دیا تھا، جس طرح آگ کو ابراہیم علیہ السلام پر بَرْد اور سَلام کر دیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تیہ میں نہ کپڑے پرانے ہوتے تھے نہ میلے۔[1]

---

[1] تفسیر الطبري (۲/ ۱۰۰۔ ۱۰۱) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ نیز سند میں ''حسین بن داود'' ضعیف راوی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام ایک سو بیس برس جیے، پھر ایک سال بعد ہارون مرے۔ شیخین نے ایک نبی کے واسطے سورج کے لوٹ آنے کا قصہ بیان کیا ہے۔[1] مگر یوشع علیہ السلام کا نام نہیں لیا۔ کسی نے کہا ہے کہ سورج پیچھے پھرا۔ کسی نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ ٹھہر گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ آہستہ چلا۔ یوشع ایک سو چھبیس برس زندہ رہ کر جبلِ افرائیم میں دفن ہوئے۔ بعض نے کہا کہ اریحا کو موسیٰ نے فتح کیا۔ یوشع علیہ السلام لشکر کے اگلے حصے میں تھے، یہی زیادہ صحیح ہے۔ اسی کو امام طبری اور قرطبی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2]

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ۚ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ۚۛ

اور (اے نبی!) آپ انھیں آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ ٹھیک ٹھیک سنائیں، جب ان دونوں نے قربانی کی تھی، پھر ان میں سے ایک کی قربانی تو قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہ کی گئی۔ دوسرا بولا: میں تجھے قتل کر دوں گا۔ پہلے نے جواب دیا: اللہ صرف پرہیز گاروں سے (قربانی) قبول کرتا ہے (27) اگر تو نے اپنا ہاتھ میری طرف (اس ارادے سے) بڑھایا کہ مجھے قتل کر دے تو بھی میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کر دوں۔ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سب جہانوں کا رب ہے (28) میں تو چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا گناہ اپنے سر لے لے اور دوزخیوں میں شامل ہو جائے۔ اور ظالموں کا یہی بدلہ ہے (29) پھر اس کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٧)

[2] تفسير الطبري (١٠/ ١٩٧) تفسير القرطبي (٦/ ١٣١) فتح البيان (٣/ ٣٨٥ـ ٣٩٤)

نفس نے اسے اپنے بھائی کے قتل کرنے پر اُکسایا، چناں چہ اس نے اسے قتل کر دیا اور وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگیا (30) پھر اللہ نے (وہاں) ایک کوا بھیجا، وہ (اپنے پنجوں سے) زمین کریدنے لگا، تاکہ اسے دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کیسے دفن کرے، وہ کہنے لگا: افسوس! میں اس کوے جیسا ہونے سے بھی عاجز رہا کہ اپنے بھائی کی لاش دفنا دیتا، چناں چہ وہ پچھتانے والوں میں سے ہوگیا (31)

آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعہ:

آدم علیہ السلام کے اولاد ہونے لگی، ایک حمل میں دو شخص بیٹا اور بیٹی۔ اس وقت میں ضرورت کے لیے بہن بھائی کا نکاح جائز تھا۔ پھر بھی آدم علیہ السلام احتیاط کرتے، ایک حمل کے بہن بھائی نہ ملاتے۔ ایک بیٹی آدم علیہ السلام ہابیل کو دینے لگے، اس کو قابیل مانگنے لگا، انھوں نے دونوں کی خاطر رکھی، کہا تم دونوں اللہ کے نام کی نیاز دو۔ ہابیل جو نبی کے حکم پر تھا، اُس کی نیاز کو آگ نے غیب سے آکر جلا دیا، یعنی قبول ہوئی۔ قابیل کی نیاز چھوڑ گئی۔ قابیل نے حسد سے چاہا کہ ہابیل کو مار ڈالے، آخر مار ڈالا، اب تک جہاں خونِ ناحق ہوتا ہے، اُس پر بھی ایک وبال چڑھتا ہے۔ اگر کوئی ناحق کسی کو مارنے لگے، اس کو رخصت ہے کہ ظالم کو مارے اور اگر صبر کرے تو شہادت کا درجہ ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ تو میرا اور اپنا گناہ حاصل کرے، یعنی تیرے عمر بھر کے گناہ تجھ پر ثابت رہیں اور میرے خون کا گناہ چڑھے اور میرے عمر بھر کے گناہ اُتریں۔ اس سے پہلے کوئی انسان مرا نہ تھا کہ معلوم ہو، مردے کے بدن کا کیا کرے۔ قابیل ہابیل کو مار کر ڈرا کہ اس کا بدن پڑا رہے گا تو لوگ دیکھ کر مجھ کو پکڑیں گے، اُس کو باندھ کر کئی روز تک لیے پھرا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا، اس نے زمین کو کریدا، اس کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ اس کے بدن کو دفن کرنا چاہیے۔ اور نقل میں یہ آیا ہے کہ ایک کوے نے زمین کرید کر دوسرے کوے مردہ کو دفن کیا۔ اُس نے دفن بھی دیکھا اور بھائی کی دوسرے بھائی کے حق میں خیر خواہی دیکھی اور اپنے فعل پر پشیمان ہوا۔

اس آیت میں اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کی اپنی پشت سے پیدا دو بیٹوں میں سرکشی، حسد، ظلم کا بدانجام اور اس کی جزا کا ذکر فرمایا ہے۔ یہی قولِ جمہور ہے اور اُن کا نام قابیل اور ہابیل تھا۔ یہ اس لیے بیان فرمایا کہ دیکھو، ایک نے دوسرے پر کس طرح حسد کر کے زیادتی کی اور دست درازی کی۔ یہ حسد اس لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو نعمت دی، اس کی نیاز قبول فرمائی، وہ نیاز اللہ کے لیے اخلاصِ دل سے تھی۔ مقتول گناہوں کے دور ہو جانے سے کامیاب ہو کر جنت میں داخل ہوا اور قاتل دونوں جہان میں خائب و خاسر ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان باغیوں، حاسدوں اور سوٴروں، بندروں کے بھائیوں، یعنی یہودیوں اور ان جیسے لوگوں کو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی خبر سناؤ۔

بہت سے سلف و خلف نے یہی کہا ہے کہ مراد قابیل و ہابیل ہیں۔ یہ خبر سچی اور صحیح ہے، اس میں کسی طرح کا

شک وشبہ، دھوکا، وہم، جھوٹ، تبدیلی اور کمی بیشی نہیں ہے۔ اسی لیے لفظ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ فرمایا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ﴾ [آل عمران: ٦٢] ''بے شک یہی بیان سچا ہے۔'' اور اُس کا فرمان ہے: ﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ [الكهف: ١٣] ''ہم ان کا حال ٹھیک ٹھیک آپ سے بیان کرتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴾ [مريم: ٣٤] ''یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، (یہی ہے) حق کی بات جس میں وہ لوگ شک کرتے ہیں۔''

اکثر سلف وخلف نے کہا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو یہ بات مشروع کی تھی کہ وہ اپنی بیٹیاں اپنے بیٹوں سے بیاہ دیا کریں۔ ضرورتِ حال کی وجہ سے ہر بطن میں ایک نر اور ایک مادہ پیدا ہوتا، اس بطن کے بیٹے کو دوسرے بطن کی بیٹی سے بیاہ دیتے۔ ہابیل کی بہن بدصورت تھی، قابیل کی بہن خوبصورت تھی۔ قابیل نے چاہا کہ وہ مجھ کو ملے بھائی کو نہ ملے۔ آدم علیہ السلام نے کہا کہ تم دونوں نیاز دو، جس کی نیاز قبول ہو، وہ اُس کو ملے گی۔ ہابیل کی نیاز قبول ہوئی، قابیل کی قبول نہ ہوئی، آخر اس حسد میں بھائی کو مار ڈالا۔ انجام وہ ہوا، جو اللہ نے قرآن میں فرمایا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ آدم کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ قابیل صاحبِ زرع تھا اور ہابیل صاحبِ ضرع، یعنی ایک کھیتی کرتا، دوسرا دودھ والے جانور رکھتا، قابیل بڑا تھا، اُس کی بہن ہابیل کی بہن سے زیادہ حسین تھی۔ ہابیل نے چاہا کہ اس سے نکاح کرے۔ قابیل نے کہا کہ وہ میری بہن ہے، میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور تیری بہن سے بہتر ہے، میں زیادہ حق دار ہوں اس بات کا کہ اُس سے نکاح کروں۔ باپ نے کہا کہ تو اس کا بیاہ ہابیل سے کر دے، وہ نہ مانا۔ دونوں نے نیاز دی، تاکہ دیکھیں کہ کون لڑکی کا زیادہ حق دار ہے۔ آدم علیہ السلام اس وقت غائب تھے، مکے کو گئے تھے۔ اللہ نے ان سے کہا تھا کہ تو جانتا ہے کہ زمین میں میرا گھر کہاں ہے، کہا: میں نہیں جانتا۔ فرمایا: میرا گھر مکے میں ہے تو وہاں جا۔ وہ اُس گھر کو دیکھنے کے لیے گئے تھے، آسمان سے کہہ گئے تھے کہ میری اولاد کو بامانت محفوظ رکھنا، اس نے انکار کیا۔ زمین سے کہا، اُس نے بھی انکار کیا۔ پہاڑوں سے کہا، انھوں نے بھی انکار کیا۔ قابیل سے کہا: اُس نے کہا: ہاں تم جاؤ، ہو آؤ، واپس آکر اپنے اہل کو خوش پاؤ گے۔ جب آدم علیہ السلام چلے گئے، دونوں نے نیاز مانی۔ قابیل کو یہ فخر تھا کہ میں اپنی بہن کا زیادہ حق دار ہوں، تجھ سے بڑا ہوں، باپ کا وصی ہوں۔ ہابیل نے ایک موٹی بکری لی اور نیاز دی۔ قابیل نے ایک گٹھ سنبل کا نیاز دیا۔ اُس میں ایک بڑا سنبلہ تھا، اُس کو چھیل کر کھایا۔ آگ آئی، وہ ہابیل کی قربانی کو کھا گئی اور قابیل کی قربانی کو چھوڑ گئی۔ قابیل نے غصے میں آکر کہا کہ میں تجھ کو مار ڈالوں گا، تاکہ تو میری بہن سے بیاہ نہ کر سکے۔ ہابیل نے کہا: سنو بھائی اللہ اس کی نیاز قبول کرتا ہے، جو پرہیز گار ہوتا ہے۔[1] (رواہ ابن جریر)

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٢٠٦۔ ٢٠٧)

یہ قصہ کئی طریق اور کئی الفاظ سے آیا ہے۔ بعض روایات میں صرف قربانی کا ذکر ہے، وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ قربانی کی تقریب کسی وجہ سے یا عورت کی وجہ سے نہ تھی۔ ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ قرآنِ مجید سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں نے نیاز پیش کی تھی، ایک کی قبول اور دوسرے کی رد ہوئی۔ جس کی رد ہوئی اُس نے دوسرے کو جس کی قبول ہوئی تھی، مار ڈالا۔ آیت کا انداز یہی بتا رہا ہے کہ یہ غضب اور قتل فقط اسی بات پر ہوا کہ قابیل کی نیاز قبول نہ ہوئی اور ہابیل کی قبول ہوئی۔

پھر جمہور کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ جس نے نیاز میں بکری دی تھی، وہ ہابیل تھا، جس نے طعام دیا، وہ قابیل تھا۔ ہابیل کی بکری قبول ہوئی، یہاں تک کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ جو بکری فدیہ ذبیح علیہ السلام میں آئی تھی اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ذبح کیا، یہ وہی بکری ہے، جو ہابیل کی نیاز تھی۔ یہ مناسب ہے۔ واللہ أعلم. بہت سے سلف و خلف نے اس پر نص کی ہے۔

یہی قول امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی مشہور ہے۔ لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ جس نے نیازِ زرع دی، وہ قابیل تھا، اس کی نیاز مقبول ہوئی، لیکن یہ نقل مشہور روایات کے خلاف ہے، شاید محفوظ نہ ہو۔[1] واللہ أعلم. اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں دونوں کا نام نہیں لیا۔ مطلب حالات کو دریافت کرنے سے ہے نہ کہ نام سے۔ اگرچہ جمہور اہلِ علم و سیرت یہی کہتے ہیں کہ قاتل کا نام قابیل تھا اور مقتول کا نام ہابیل تھا۔

تقویٰ کی فضیلت:

اللہ اُس کی نذر نیاز کو پذیرائی بخشتا ہے، جو اپنے افعال میں اللہ سے ڈرتا ہے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ لوگ ایک میدان میں روکے جائیں گے، ایک منادی ندا کرے گا کہ متقی کہاں ہیں؟ اہلِ تقویٰ رحمان کی طرف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اللہ ان سے پردہ نہ کرے گا نہ چھپے گا۔ ابوعفیف نے کہا ہے کہ میں نے پوچھا: متقی کون لوگ ہیں؟ کہا: وہ قوم ہے، جو شرک و بت پرستی سے بچتی ہے، عبادت خالص کرتی ہے، وہ جنت کی طرف آئے گی۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم) قرآن و حدیث تقوے کی فضیلت اور تقوے کی ترغیب سے بھرے پڑے ہیں۔ دینِ اسلام میں کسی کا رتبہ متقی سے بڑھ کر نہیں ہے۔ متقی کی تھوڑی عبادت اخلاص، حسنِ نیت اور صحیح عمل کی وجہ سے دوسروں کی بہت زیادہ عبادت سے بڑھ جاتی ہے۔ اللہ کو جس قدر اہلِ تقویٰ عزیز ہیں، اتنا کوئی عزیز نہیں۔

اصل تقویٰ یہ ہے کہ اعتقاد اور توحید کے بارے میں عقیدے کو درست کر کے گناہوں سے بچا جائے۔ اس لیے کہ نقصان دہ چیز کو ہٹانا نفع آور چیز کو حاصل کرنے پر مقدم ہے، یعنی اس کو پہلے ہٹانا چاہیے، جو لوگ عملِ صالح

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۶۱) [2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۶۱) اس کی سند میں ''میمون ابوحمزہ'' ضعیف راوی ہے۔

کے ساتھ ساتھ بُرے اعمال بھی کرتے ہیں، وہ متقی نہیں ہیں، اگرچہ وہ معافی اور درگزر کے لائق سمجھے جائیں۔ آیتِ باب ﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ گویا غیر متقین کے اعمال قبول نہ ہونے کے بارے میں نص ہے۔ یہ آیت جس طرح اہلِ تقویٰ کو اطاعتِ الٰہی کے اعمال کی قبولیت کی خوش خبری دیتی ہے، اسی طرح غیر متقین کے لیے ایک سخت قسم کی وعید ہے کہ ان کے عمل گناہوں میں مبتلا رہنے اور ان سے علاحدہ نہ ہونے کی وجہ سے اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتے۔

قتل کا وبال اور مذمت:

ہابیل نے قابیل سے کہا کہ میں تیرے بُرے کام کا تجھ سے مقابلہ نہ کروں گا، یعنی اگر تو مجھے مارے گا تو میں تجھ کو نہ ماروں گا، کیوں کہ پھر میں اور تو دونوں خطا میں برابر ہو جائیں گے، میں اپنے رب سے ڈرتا ہوں کہ تیرے ساتھ وہ کام کروں، جو تو مجھ سے کرنا چاہتا ہے، بلکہ میں صبر و احتساب کروں گا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: واللہ! ہابیل قابیل سے زیادہ شدید اور قوی تھا، لیکن تقویٰ اور تحرج نے اس کو روک دیا۔[1] اسی لیے صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے کہ جب دو مسلمان تلوار لے کر آمنے سامنے ہوتے ہیں تو قاتل و مقتول دونوں آگ میں جائیں گے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! بھلا قاتل تو گیا، سو گیا، مقتول کیوں جائے گا۔ فرمایا: وہ بھی اپنے ساتھی کے قتل پر حریص تھا۔[2]

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فتنۂ عثمان میں کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قریب ہے کہ فتنے اُٹھیں گے، بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہوئے شخص سے بہتر ہوگا۔ کھڑا ہوا بہتر ہوگا چلنے والے سے، اور چلنے والا بہتر ہوگا دوڑنے والے سے۔ کہا: بھلا اگر میرے گھر میں گھس کر مجھ پر ہاتھ چلائے، قتل کرنا چاہے، فرمایا: تو مثل ابن آدم کے ہو جا۔ (رواه أحمد وقال الترمذي حديث حسن) اس حدیث کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔[3] ایوب سختیانی نے کہا ہے کہ سب سے پہلے جس نے آیت ﴿ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ ﴾ کو اس اُمت میں سے اُخذ کیا، وہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔[4] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ حاصل کرے تو میرا گناہ اور اپنا، یعنی ایک گناہ میرے قتل کا، دوسرا وہ گناہ جو اس سے قبل تجھ پر ہوا۔ اوروں نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ حاصل کرے تو میرے گناہ کو، اس کا وبال تجھ پر پڑے اور اپنے گناہ کو جو تجھ پر میرے قتل کرنے سے ہوگا۔ اس قول کو امام مجاہد رحمہ اللہ سے پایا ہے، مگر ڈر ہے کہ غلط ہو، اس لیے کہ ان کی اپنی صحیح روایت اُس کے خلاف ہے،[5] یعنی مراد تیرے گناہ سے وہ ہے، جو اس قتل سے پہلے تھا۔ یہ حدیث کہ «مَا تَرَكَ الْقَاتِلُ عَلَى الْمَقْتُولِ مِنْ

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٢١٣) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٨)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٩٤) مسند أحمد (١/ ١٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٢٣)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٢) [5] تفسير الطبري (١٠/ ٢١٥۔ ٢١٦)

ذَنْبٍ»[1] ''قاتل مقتول کا کوئی گناہ نہیں چھوڑتا۔'' اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

امام بزار رحمہ اللہ نے اس کے مشابہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ مرفوع روایت یوں ہے: «قَتْلُ الصَّبْرِ لَا يَمُرُّ إِلَّا مَحَاهُ»[2] (انتھیٰ وھٰذا بِھٰذَا لَا يَصِحُّ) یہ حدیث اگر صحیح ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ اللہ مقتول سے قتل کی تکلیف کے بدلے اس کے ذنوب کا کفارہ کرتا ہے، نہ یہ کہ اس کے سارے گناہ قاتل پر لاد دیتا ہے، لیکن بعض اشخاص میں ایسا بھی اتفاق ہو جاتا ہے اور یہی غالب بھی ہے، کیوں کہ جب مقتول حشر کے وقت قاتل سے مطالبہ کرے گا تو بقدرِ ظلم اس کی نیکیاں اس کو ملیں گی، پھر اگر اس کے لیے نیکیاں باقی نہیں رہیں اور اُس کا حق بھی پورا نہیں ملا، تو مقتول کی سیئات لے کر قاتل پر ڈالی جائیں گی، اس وقت مقتول کی کوئی خطا باقی نہ رہے گی، مگر یہ کہ قاتل پر ڈال دی جائے گی۔

یہ بات نبی اکرم ﷺ سے سارے مظالم کے حق میں بہ خوبی ثابت ہو چکی ہے اور قتل سب ظلموں میں زیادہ بڑا اور شدید ظلم ہے۔ واللہ أعلم. امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ٹھیک بات یوں ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ تو اپنا گناہ میرے قتل کرنے کا لے کر پھرے، جس طرح اور اعمال میں اپنا گناہ لے کر پھرے گا۔ اس مطلب کو ہم نے صحیح اس لیے کہا ہے کہ سارے اہلِ تاویل کا اس پر اجماع ہے اور اللہ نے ہم کو خبر دی ہے کہ ہر عامل کے عمل کی جزا اس کے لیے ہے اور اس پر ہے۔ لہٰذا جب اللہ کا حکم اپنی مخلوق کے بارے میں یہ ہے تو یہ بات جائز نہ ہوگی کہ مقتول کے گناہوں پر قاتل کو پکڑا جائے۔ قاتل کا اگر مواخذہ ہوگا تو ایک محرم کو قتل کرنے پر ہوگا اور اُن گناہوں پر جو اس نے خود کیے ہوں گے نہ کہ مقتول کے گناہوں پر۔ یہ الفاظ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے ہیں۔

پھر یہ سوال وارد کیا ہے کہ ہابیل نے یہ بات کیوں کر کہی کہ اس کے بھائی قابیل پر اس کے قتل کا گناہ اور خود اس کا گناہ ہے، حالاں کہ قابیل کا ہابیل کو قتل کرنا حرام تھا۔ حاصل جواب یہ ہے کہ ہابیل نے اپنے نفس سے یہ خبر دی ہے کہ وہ بھائی کو نہیں مارے گا بھائی اس کو مارے۔ بلکہ اپنا ہاتھ اس سے روک لے گا، اگرچہ وہ قتل کیوں نہ کرے، تاکہ وہ قتل اس کے بھائی کی طرف سے ہو نہ اُس کی طرف سے۔[3] یہ کلام وعظ و نصیحت ہے، اگر کوئی نصیحت پکڑنے والا ہو، اور دھمکی ہے اُس کے لیے جو دھمکی کا اثر لینے والا ہو۔ اسی لیے یہ کہا: ﴿ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اُس کو آگ سے ڈرایا وہ باز نہ آیا اور نہ دھمکی کا اثر لیا۔[4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٣) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٨٧)

[2] مسند البزار (١٨/ ١٠٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠١٦)

[3] تفسير الطبري (١٠/ ٢١٦۔ ٢١٧) [4] تفسير الطبري (١٠/ ٢٢٢۔ ٢٢٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

اللہ پاک نے کہا ہے کہ اس کے جی نے اس کام کو اس کے لیے اچھا کر کے دکھایا۔ قتلِ برادر پر بہادر بنایا۔ ایک لوہے سے اس کو قتل کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا کہ پتھر سے اس کا سر کچل دیا، وہ مر گیا، اُس کو دشت میں چھوڑ دیا۔ پہلا قول امام باقر رحمہ اللہ کا تھا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض اہلِ کتاب سے نقل کیا ہے کہ گلا گھونٹ کر داب کر مار ڈالا، جس طرح درندے چیر پھاڑ ڈالتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: جب قتل کرنا چاہا، گردن مروڑنا شروع کیا۔ ابلیس نے ایک جاندار کا سر ایک پتھر پر رکھ کر دوسرا پتھر اُٹھا کر مارا، یہاں تک کہ وہ کچل کر مر گیا۔ قابیل اس حال کو دیکھتا تھا، اس نے بھی اپنے بھائی کے ساتھ ایسا ہی کیا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

غرضیکہ قتل کرنے کا طریقہ ابلیس سے اور دفن کرنے کا طرز کوے سے سیکھا۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سر پکڑ کر قتل کرنا چاہا، اُٹھا کر زمین پر گرا دیا، سر اور ہڈیوں کو دبانا شروع کیا، قتل کرنا نہ آتا تھا۔ ابلیس نے آ کر کہا: کیا تو اس کو قتل کرنا چاہتا ہے؟ کہا: ہاں، کہا: اس پتھر کو اُٹھا کر اس کے سر پر دے مار۔ ایسا ہی کیا، سر پھٹ گیا۔ ابلیس جلد حوا کے پاس آیا، کہا: حوا! قابیل نے ہابیل کو قتل کر ڈالا۔ انھوں نے کہا: کم بخت قتل کیا ہوتا ہے۔ کہا: پھر نہ کھائے نہ پیے نہ ہلے نہ ڈلے۔ کہا: یہ تو موت ہے، کہا: ہاں، وہ چلّانے لگیں، آدم علیہ السلام آئے۔ کہا: تمھیں کیا ہوا، کچھ بات نہ کی، دو بار آئے، یہی پوچھا، کچھ جواب نہ دیا، کہا: تجھ پر اور تیری بیٹیوں پر یہ چیخنا چلانا لازم ہے۔ میں اور میرے بیٹے اس سے بَری ہیں۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

ہر ناحق قتل پر قابیل کا حصہ:

خسران سے مراد خسرانِ دنیا و آخرت ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا خسران ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ قتل نہیں کیا جاتا کوئی نفس ظلم سے، مگر ہوتا ہے ابن آدم اول پر ایک حصہ اس کے خون کا۔ اس لیے کہ سب سے پہلے قتل کرنا اسی نے نکالا ہے۔[3] (رواه أحمد والجماعة سوا أبي داود) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہم نے ابن آدم قاتل کو پایا کہ اہلِ نار کی تقسیم صحیح کرتا ہے۔ عذاب میں جتنا ان سب کو عذاب ہے، اس کا آدھا عذاب اُس کے لیے ہے۔ دوسرے الفاظ اس روایت کے اس طرح ہیں کہ اہلِ نار میں سے بڑا شقی ابن آدم ہے، جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ نہیں گرایا جاتا زمین میں کوئی خون اُس دن سے قیامت کے دن تک مگر ایک شر اُس کو بھی لگتا ہے، اس لیے کہ سب سے پہلے خون ریزی کی راہ اُس نے نکالی ہے۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٢٢٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٣۔ ٦٤)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٤)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦١٦) مسند أحمد (١/ ٣٨٣)

شخص جب بھی مقتول ہوتا ہے تو پہلے ابن آدم اور شیطان پر اس قتل کا ایک حصہ ہوتا ہے۔[1]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لڑکا جب مر گیا، اُس کو صحرا میں چھوڑ دیا، دفن کرنا نہ جانا، اللہ تعالیٰ نے دو کوے بھیجے، وہ آپس میں لڑے، ایک نے دوسرے کو مار ڈالا، پھر گڑھا کھود کر دفن کیا، مٹی میں داب دیا، اس کو قابیل نے دیکھا۔ اسی کے لگ بھگ سیدنا علی اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے بھی کہا ہے۔[2] غرضیکہ سارے مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ دونوں آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے تھے۔ ظاہر قرآن بھی یہی ہے۔ اور حدیث میں بھی ایسے ہی ہے: ''إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا، لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ''[3] ''اس (قتل) کا آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے کو بھی حصہ ملتا ہے، کیوں کہ اُس نے قتل کرنے کی ابتدا کی تھی۔'' یہ ظاہر جلی ہے۔ لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ دونوں بنی اسرائیل میں سے تھے۔ آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے نہیں تھے۔ قربانی کی رسم بنی اسرائیل میں تھی، سب سے پہلے آدم مرے۔[4] یہ قول سخت غریب ہے، اس کی اسناد میں نظر ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے: ''إِنَّ ابْنَيْ آدَمَ ضُرِبَا لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ مَثَلًا، فَخُذُوْا بِالْخَيْرِ مِنْهُمَا''[5] ''آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں کی وجہ سے اس امت کے لیے کچھ مثالیں قائم ہوئیں تو تم ان میں سے بہتر مثال لے لو۔'' (رواہ عبدالرزاق) روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ''إِنَّ اللّٰهَ ضَرَبَ لَكُمُ ابْنَيْ آدَمَ مَثَلًا، فَخُذُوْا مِنْ خَيْرِهِمْ، وَدَعُوْا شَرَّهُمْ'' (رواہ ابن المبارک) ''اللہ نے تمھارے لیے آدم کے دو بیٹوں کی مثالیں بیان کی ہیں تو تم ان میں سے بہتر مثال کو لے لو اور بُری کو چھوڑ دو۔'' اس کو بکر مزنی رحمہ اللہ نے مرسلاً روایت کیا ہے۔[6]

سالم ابن ابی جعد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب ہابیل مارے گئے تو آدم سو برس تک غمگین رہے، ہنسنا چھوڑ دیا، آخر اُن سے یوں کہا گیا: «حَيَّاكَ اللّٰهُ وَبَيَّاكَ، أَيْ أَضْحَكَكَ»[7] (رواہ ابن جریر) ''اللہ تعالیٰ نے تجھے سلام بھیجا اور تجھے ہنسایا۔'' سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے رو کر یوں کہا: ''تَغَيَّرَتِ الْبِلَادُ وَمَنْ عَلَيْهَا''[8] ''دنیا اور جو کچھ اس پر ہے، سب بدل گیا۔'' لیکن صحتِ سند میں نظر ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ قابیل کو جلد ہی سزا ملی۔

امام مجاہد اور ابن جبیر رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ قتل کے دن قابیل کی پنڈلی ران کے ساتھ معلق ہوگئی، اللہ نے اس کا منہ سورج کی طرف کر دیا، جدھر سورج پھرتا، اُس کا منہ ہو جاتا۔[9] یہ ایک سزا اور تکلیف تھی اس کے لیے۔ حدیث میں

---

(1) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۱۸۔ ۲۱۹) (2) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۲۵۔ ۲۲۶)

(3) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۱۵۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۷۷)

(4) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۰۸) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کا رد بھی کیا ہے۔ دیکھیں: تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۱۹۔ ۲۲۰)

(5) تفسیر الصنعاني (۱/ ۱۸۷) یہ روایت مرسل ہے۔ (6) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۳۰) یہ روایت مرسل ہے۔

(7) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۰۹) اس کی سند میں ''حسام بن مصک'' ضعیف راوی ہے۔

(8) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۰۹) اس کی سند میں ''غیاث بن ابراہیم'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (9) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۱۸)

ہے کہ کوئی گناہ اس لائق نہیں کہ اللہ اس کی سزا جلد دنیا میں دے، اس کے علاوہ جو آخرت میں اس کے لیے مقرر کر رکھی ہے سرکشی اور قطع رحمی سے۔[1] قابیل کے فعل میں یہ دونوں گناہ جمع ہوگئے۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس قصے کا اس سے پہلے کی آیات سے ربط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تنبیہ کی، یہود کا ظلم اور عہد شکنی ابن آدم کے ظلم کی طرح ہے، جو اس نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا۔ سو یہ بیماری پرانی اور یہ شر اصیل ہے۔ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ وہ دونوں آدم علیہ السلام کے حقیقی بیٹے تھے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھے۔ امام عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کو دفن کا طریقہ معلوم نہ ہو اور ایک کوے کے پیرو بنیں۔[2] قربان کہتے ہیں اُس صدقہ و ذبیحہ اور قربانی کو جس سے اللہ کا تقرب مطلوب ہو۔ ہابیل نے عمدہ سے عمدہ بکری نیاز کی تھی۔ قابیل نے ایک گٹھہ سنبل کا نیاز کیا تھا، جو نہایت ردی اور خراب تھا، اس میں ایک دانہ اچھا تھا، وہ بھی نکال کر کھا لیا۔ آخر ہابیل کی نیاز قبول ہوئی اور اُس کی نہ ہوئی، اس حسد سے اُس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ اُس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ قبولِ اعمال میں تقویٰ شرط ہے تو مجھ کو مارے گا تو میں تجھ کو نہ ماروں گا، اپنی جان کو قتل کے لیے سونپ دیا۔

حدیث میں مروی ہے کہ جب فتنہ ہو تو ابن آدم کی طرح ہو جا،[3] یعنی مقتول بن، قاتل نہ بن۔ امام ابن جریج اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ان پر اس وقت یہی فرض تھا کہ کوئی تلوار نہ کھینچے اور قاتل کو منع نہ کرے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگرچہ اس کے ساتھ ورودِ تعبد جائز ہے، لیکن ہماری شریعت میں قاتل کو ہٹانا بالاجماع جائز ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ واجب ہے۔[4] لیکن سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کے خلاف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے ابو ذر! اگر بعض لوگ بعض کو قتل کریں تو پھر تو کیا کرے گا؟ کہا: اللہ اور رسول جانیں۔ فرمایا: بیٹھ رہ اپنے گھر میں اور اپنا دروازہ بند رکھ۔ کہا: اگر مجھ کو نہ چھوڑیں؟ فرمایا: جن کا تو ہے اُن کے پاس چلا جا، ان میں رہ۔ کہا: میں اپنا ہتھیار نہ اُٹھاؤں؟ فرمایا: اب تو ان کے کام میں شریک ہوگا، لیکن اگر تجھ کو تلوار کی چمک کا ڈر ہو تو چادر کا ایک گوشہ اپنے منہ پر ڈال لے، تاکہ وہ قاتل اپنا اور تیرا گناہ حاصل کرے۔[5]

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٧٠٤)

(2) فتح القدير (٢/ ٤٣) (3) تفسير القرطبي (٦/ ١٣٦)

(4) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٤٩)

(5) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٥٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨١٩) مسند أحمد (٥/ ١٤٩)

اس بارے میں ایک جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اَحادیث مروی ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ فتنے کی حالت میں قتال کے ساتھ ابتدا نہ کرے، بلکہ مقتول بنے۔ قتل کو دفع کرنا غیر فتنہ کی حالت میں ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم. قتل کی جگہ میں اختلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جبلِ نود پر،[1] یہ جبل سراندیپ میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عقبہ حراء پر۔ کسی نے کہا ہے کہ بصرے میں مسجدِ اعظم کے نزدیک۔ ہابیل کی عمر قتل والے دن بیس برس کی تھی۔ خسرانِ دنیا یہ ہوا کہ ماں باپ کو غصہ دلایا، رنج پہنچایا، بغیر بھائی کے رہ گیا۔

آخرت کا نقصان یہ ہوا کہ اللہ پاک کو غضب میں لایا۔ نارِ جہنم میں گیا۔ ندامت توبہ کی نہ تھی، بلکہ دفن کا طریقہ نہ جاننے پر تھی۔ قابیل سفید رنگ تھا، جب بھائی کو مارا، سارا بدن سیاہ ہوگیا۔ سوڈانی اسی کی اولاد ہیں۔ اسی لیے مثل ﴿ وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴾ [الفاطر: ٢٧] ''اور بہت گہری سیاہ (بھی)۔'' کے ہوتے ہیں۔ آدم علیہ السلام اس دن مکے میں تھے۔ درخت خاردار ہوگئے۔ کھانے کا مزہ بدل گیا، پھر بدذائقہ ہوگئے۔ آدم علیہ السلام نے کہا کہ زمین میں کوئی حادثہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں آئے، دیکھا قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا ہے۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا، کہتے ہیں کہ شعر مرثیہ پڑھے۔ یہ محض جھوٹ ہے۔ شعر ایک ملعون شے ہے۔ انبیا علیہم السلام شعر خوانی و شعر گوئی سے معصوم ہیں۔[2] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صاحبِ کشاف سچ کہتے ہیں، کیوں کہ وہ شعر جو آدم علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں، نہایت رکیک ہیں۔ وہ صرف احمق قسم کے شاگردوں ہی کے لائق ہیں۔ ان کی نسبت اس شخص کی طرف کس طرح ہوسکتی ہے، جس کے علم کو اللہ نے فرشتوں پر حجت ٹھہرایا؟![3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سے بڑا تعجب ہے کہ انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے آدم علیہ السلام کے شعروں کی روایت کر کے سکوت کیا اور سندِ مذکور کی صحت اور اثرِ مذکور کی سند کی کمزوری پر کچھ کلام نہ فرمایا۔ بعض نے کہا ہے کہ مرثیۂ آدم نثر تھا، اس کو یعرب بن قحطان نے نظم کیا۔ یہ بھی سہی، لیکن عبارت کی کمینگی اور اشاروں کے بنانے کا کیا جواب ہے۔ کیا یعرب کی عربی زبان ایسی خستہ اور خراب تھی، جیسے ابیات مذکورہ کے الفاظ کی ترکیب ہے، بلکہ اس سے بہتر تو موجود وقت کے عربی دان نظم کر سکتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت کی بلاغت و فصاحت تو مستند ہے، اُس وقت کی زبان کس طرح ایسی بے طور ہوسکتی ہے؟! شاعروں نے نظم کی نسبتِ اول آدم علیہ السلام کی طرف کی ہے، یہ صرف اُن کی خیال بندی ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا
بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ
وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا

[1] الكشف والبيان (٤/ ٥١) [2] الكشاف (١/ ٦٦٠) [3] تفسير الرازي (١١/ ١٦٥) فتح البيان (٣/ ٣٩٥۔ ٤٠١)

بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ
لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ
اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ
خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا
الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾

اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے، سوائے اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد کرنے والا ہو، تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو شخص کسی ایک جان کو (ناحق قتل ہونے سے) بچائے، تو گویا اس نے تمام لوگوں کی جان بچائی۔ اور ہمارے رسول واضح نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے، پھر بے شک اس کے بعد ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں حد سے نکل جانے والے ہیں (32) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں، ان کی سزا تو صرف یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے یا سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ دنیا میں ان کے لیے ذلت ہے اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے (33) سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پاؤ، توبہ کر لیں، پس تم جان لو کہ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے (34)

انسانی جان کا احترام:

یعنی اول روئے زمین میں بڑا گناہ یہی ہوا، اس سے آگے رسم پڑی۔ اسی سبب سے تورات میں اس طرح فرمایا کہ ایک کو مارا، جیسے سب کو مارا، یعنی ایک کے کرنے سے اور دلیر ہوتے ہیں تو سب کے گناہ میں وہ اول بھی شریک ہے اور جیسے ایک کو جلایا، سب کو جلایا، یعنی ظالم کے ہاتھ سے بچا دیا۔ اول فرمایا کہ خون کرنا گناہ ہے، مگر بدلے میں یا فساد کی سزا میں۔ اب اس کا بیان کیا کہ جو کوئی اللہ اور رسول سے لڑائی کرے، یعنی حاکم کے مخالف ہو کر ملک کو غارت کرے، وہ ہاتھ لگے تو سولی پر چڑھا کر مارے یا قتل کرے یا داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹے یا قید میں ڈال رکھے، جیسی خطا ویسی سزا، اگر ایک شخص سرِ راہ لوٹتا تھا، اب اس سے رک گیا اور اس کام کے اسباب کو دور کیا تو اُس پر حد نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم نے اپنے بھائی کو ظلم و زیادتی کی راہ سے قتل کیا، اس لیے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ شریعت مقرر کی کہ جو کوئی کسی کے قتل کو بغیر کسی سبب یا قصور کے حلال کرے گا، وہ گویا سارے لوگوں کا قاتل ہے، کیوں کہ ایک جان اور دوسری جان کے درمیان کچھ فرق نہیں ہے اور جس نے قتلِ نفس کو حرام جانا تو گویا سب لوگ اس کے ہاتھ سے سلامت رہے۔ اسی اعتبار سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں دن دار کے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا۔ میں نے کہا: میں تمھاری مدد کے لیے آیا ہوں، مارنا اچھا ہے، کہا: اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! کیا تجھے یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تو سب لوگوں کو مار ڈالے اور اس کے ساتھ مجھ کو بھی مار دے؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہا: بے شک تو اگر ایک آدمی کو مارے گا تو گویا تو نے سب لوگوں کو مارا۔ اب تو پھر جا، تجھ کو اجازت ہے، ماجور غیر مازور ہو کر۔ کہا: میں پھر آیا، میں نے قتال نہ کیا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سب کا زندہ کرنا یہ ہے کہ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے، تو اُس کو نہ مارے۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زندہ کرنا یہ ہے کہ قتل سے باز رہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ایک مسلمان کا خون حلال رکھا، اُس نے گویا سب لوگوں کا خون حلال کیا اور جس نے ایک مسلمان کا خون حرام جانا، اس نے گویا سب کا خون حرام جانا۔ یہ قول اظہر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس نے نبی کو یا امام عادل کو قتل کیا، گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جس نے نبی یا امام عادل کے بازو کو قوت دی، اُس نے گویا سب کو زندہ کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے جس نے ایک جان کو مارا، اس نے گویا سب کو مارا، اس لیے کہ ایک جان کے بدلے آگ ہے، اگر وہ سب کو مارتا تو بھی آگ میں جاتا۔

دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جس نے ایک مومن جان کو مارا، اُس کی جزا جہنم ہے، اللہ اُس پر غضب اور لعنت کرے گا، اس کے لیے عذابِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ اگر سب کو مارتا تو بھی اس عذاب سے زیادہ نہ ہوتا، جس نے کسی کو نہ مارا، اُس نے گویا سب کو جلایا۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ایک کو مارا، اس نے گویا سب کو مارا۔ اس لیے کہ اس پر قصاص واجب ہوا۔ واحد اور جماعت میں کچھ فرق نہیں، جس نے قاتل کو معاف کیا، اُس نے گویا سب کو جلایا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ایک کو جلایا، یعنی جلنے یا ڈوبنے یا ہلاکت سے بچایا، اُس نے گویا سب کو بچایا۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے: ”هٰذَا تَعْظِيْمٌ لِتَعَاطِي الْقَتْلِ، عَظِيْمٌ وَاللّٰهِ وِزْرُهَا، عَظِيْمٌ وَاللّٰهِ أَجْرُهَا“ ”اس میں قتل کرنے کی سنگینی کا ذکر ہے، اس کا بوجھ بہت زیادہ ہے اور اجر بھی بہت زیادہ ہے۔“

سلیمان بن علی ربعی نے امام حسن رحمہ اللہ سے پوچھا، یہ آیت کیا ہمارے لیے ہے، جیسے بنی اسرائیل کے لیے تھی؟ کہا: واللہ! قسم ہے اُس کی جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، جیسے بنی اسرائیل کے لیے تھی، ویسی ہی ہمارے لیے ہے۔

---

[1] الطبقات الکبریٰ (۳/ ۷۰) [2] تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۳۵) اس کی سند حسن ہے۔

بنی اسرائیل کے خون کچھ اللہ پر ہمارے خون سے زیادہ عزت والے نہیں۔[1] حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھ کو ایسی شئے پر مقرر کر دو کہ میں زندگی بسر کروں۔ فرمایا: اے حمزہ! بھلا تجھ کو یہ بات زیادہ محبوب تر ہے کہ ایک جان کو تو جلا دے یا اُس کو مار دے؟ کہا: جلانا بہتر ہے۔ فرمایا: ”عَلَيْكَ بِنَفْسِكَ“[2]

اسراف کرنے والوں کی مذمت:

بینات سے مراد حجتیں اور براہین اور دلائلِ واضحہ ہیں۔ مسرفین کہنے میں حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب کرنے پر دھمکی اور ملامت ہے کہ وہ جاننے کے بعد ان کے مرتکب ہوئے۔ بنو قریظہ و بنو نظیر وغیرہم جیسے بنی قینقاع وغیرہ یہود جو مدینہ کے گرد رہتے تھے، اوس اور خزرج سے لڑتے۔ جاہلیت میں ان کے درمیان باہم لڑائی ہوتی۔ لڑائی کے ختم ہونے کے بعد اسیروں کا فدیہ اور مقتولوں کی دیت دیتے، اللہ نے ان پر سورت بقرہ میں انکار فرمایا۔ جیسے اس آیت میں ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [البقرة: ٨٤۔ ٨٥] ”اور جب ہم نے تم سے پکا وعدہ لیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ گے اور نہ نکالو گے اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے اقرار کیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو۔ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک فریق کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو، تم ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کے ساتھ دوسروں کی مدد کرتے ہو۔ اور اگر وہ تمھارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو تم انھیں فدیہ دے کر چھڑاتے ہو، حالاں کہ تم پر ان کا نکال دینا ہی حرام کر دیا گیا تھا۔ کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو شخص یہ کام کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کوئی نہیں کہ رسوائی ہو دنیاوی زندگی میں اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔“

محاربہ کا مفہوم اور سزا:

لفظِ محاربہ کے اصل معنی باہمی ضد اور مخالفت کے ہیں، یہ بات کفر پر، راہزنی پر اور راہ میں خوف پھیلانے اور زمین میں فساد کرنے اور شرک کی دوسری قسموں پر صادق آتی ہے۔ یہاں تک کہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ اور بہت سے

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٢٣٢۔ ٢٣٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٦۔ ٦٧)

[2] مسند أحمد (٢/ ١٧٥) اس کی سند میں ”ابن لہیعہ“ ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢/ ٣٤)

سلف نے کہا ہے کہ قرض یعنی درہموں اور دیناروں کا کاٹنا بھی زمین میں فساد پھیلانے والی چیزوں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴾ [البقرة: ۲۰۵] ''اور جب وہ پلٹتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، کھیتوں اور نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''[1]

بعض نے کہا ہے کہ آیت باب مشرکین کے حق میں اُتری ہے۔ یہی امام عکرمہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت مسلمان کو حد سے نہیں بچاتی، اگر وہ قتل کرے یا زمین میں فساد ڈالے یا اللہ و رسول سے محاربہ کرے، پھر کفار سے قابو آنے سے پہلے جا ملے اور نہ ہی اقامتِ حد سے منع کرتی ہے۔[2] اسی کے لگ بھگ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قابو آنے سے پہلے توبہ کرنا حد قائم کرنے سے مانع نہیں ہے۔[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ کتاب کی ایک قوم کے درمیان عہد و پیمان تھا۔ انھوں نے عہد توڑ کر زمین میں فساد کرنا شروع کیا۔ اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ جو سزا چاہو دو، قتل یا اعضا کو کاٹنا وغیرہ۔[4] (رواہ ابن جریر) سعد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت حروریہ کے حق میں آئی ہے۔[5] (رواہ ابن مردویہ)

صحیح یہ ہے کہ آیت مشرکین وغیرہم کے حق میں عام ہے، جو ان افعال کے مرتکب ہوں، جس طرح صحیحین میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عکل کے کچھ لوگ (آٹھ آدمی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ہمارے چرواہے کے پاس جاؤ اور اونٹوں کا بول اور دودھ پیو۔ وہ گئے اور بول اور دودھ پی کر تندرست ہوگئے، پھر چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹ ہانک کر لے گئے۔ یہ خبر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے پیچھے آدمی دوڑائے، وہ ان کو پکڑ کر لائے، حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالو، ان کی آنکھوں میں سلائی پھیرو، پھر دھوپ میں ڈال دیے گئے، یہاں تک کہ مر گئے۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔[6]

دوسری روایت میں شیخین کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ لوگ عکل یا عرینہ سے تھے۔ تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ان کو پتھار پر ڈال دیا، وہ پانی مانگتے تھے، ان کو پلایا نہ جاتا تھا۔[7] صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ داغ دے کر اُن کا خون قطع نہیں کیا۔[8] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ ابو قلابہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے چوری کی، قتل

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ٦٧) [2] تفسیر الطبري (۱۰/ ۲٤٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٣٧٢) سنن النسائي، رقم الحدیث (٤٠٤٦) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ (تلخیص الحبیر: ٤/ ٧٢)

[4] تفسیر الطبري (۱۰/ ۲٤٣) اس کی سند حسن ہے۔ [5] تفسیر ابن کثیر (۲/ ٦٨)

[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۳۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٧١)

[7] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۳۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٧١) [8] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٧١)

کیا، ایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے، اللہ اور رسول کے ساتھ محاربہ کیا۔ یعنی مذکورہ سزا ان جرائم کے عوض دی گئی۔[1] (و رواه مسلم بنحوه) امام قتادہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ لوگ عکل و عرینہ کے تھے۔[2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں اس لیے سلائی پھروائی کہ انھوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں سلائی پھیری تھی۔[3] (رواه مسلم) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ کچھ لوگ عرینہ کے اسلام لائے، بیعت کی، مدینہ میں موم، یعنی عرض برسام واقع ہوا، پھر باقی حدیث ذکر کی، اتنا زیادہ کیا کہ تقریباً انصار کے بیس سوار ان کے پیچھے بھیجے، ایک قیافہ لگانے والا بھی بھیجا، جو نشانِ قدم بتائے۔ یہ سب الفاظ مسلم کے ہیں۔[4]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ عرینہ کے کچھ لوگ مدینے میں آئے، وہاں کی آب و ہوا انھیں موافق نہ آئی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صدقے کے اونٹوں میں بھیج کر انھیں حکم دیا کہ اونٹوں کا بول پئیں۔ وہ بول پی کر تندرست ہوگئے، اسلام سے پھر کر چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ ہانک کر لے گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے دوڑ بھیجی، وہ اُن کو پکڑ کر لائے۔ پھر ان کے مخالف سمت سے ہاتھ پاؤں کاٹ کر آنکھوں میں سلائی پھیر کر پتھار پر ڈال دیا۔ میں نے ان میں سے ایک کو دیکھا کہ پیاس کے مارے زمین کو منہ سے چاٹتا تھا، یہاں تک کہ وہ سب مر گئے۔ یہ آیت اُتری۔ (رواه أبو داود والترمذي والنسائي وابن مردويه وهذا لفظه) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[5]

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ کے نزدیک سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں اس طرح مروی ہے کہ میں کسی حدیث پر پشیمان نہ ہوا، جتنا اس حدیث پر۔ حجاج نے مجھ سے پوچھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سخت ترین سزا دی ہو، وہ بتاؤ۔ میں نے کہا: بحرین سے عرینہ کی قوم آئی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے پیٹ کی تکلیف کا شکوہ کیا، ان کے رنگ زرد ہوگئے تھے۔ پیٹ لگ گئے تھے۔ فرمایا: جاؤ صدقے کے اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیو، جب ان کے رنگ درست ہوگئے، پیٹ بھر گئے، انھوں نے اونٹوں کے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ ہانک کر لے چلے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے دوڑ بھیج کر پکڑوایا، سب کے ہاتھ پاؤں کاٹے، آنکھوں میں سلائی پھروائی، دھوپ میں گرم زمین پر ڈال دیا، وہ مر گئے۔ حجاج جب منبر پر چڑھتا، کہتا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر دھوپ میں ڈال دیا تھا، وہ مر گئے، اس حدیث سے لوگوں پر حجت قائم کرتا۔[6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٥٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧١) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧١)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٦٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٣٤) یہ روایت صحیح ہے۔

[6] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٩) اس کی سند میں ''سلام بن ابی الصہباء'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیحین میں ہے، جیسا کہ زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکا ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ عرینہ کے چار لوگ اور عکل کے تین تھے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے، داغ نہیں دیا، وہ پتھار پر پتھر کو کھاتے تھے، اُن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ عرینہ کا ایک گروہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، وہ بھوکے تھے، ان کے رنگ زرد ہوگئے تھے، پیٹ بڑھ گئے تھے، ان کو کہا کہ تم اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیو، جب ان کے رنگ صاف ہوئے اور پیٹ ہلکے ہوئے اور وہ صحت مند ہوگئے، انھوں نے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ ہانک کر لے گئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طلب میں لوگ بھیجے، وہ ان کو پکڑ لائے، کسی کو قتل کیا، کسی کی آنکھ میں سلائی پھیری، کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے، اس پر یہ آیت اُتری۔[2]

عبدالملک بن مروان نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اس آیت کا حال لکھو۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے ان کو خبر دی کہ یہ آیت عرنیین کے چند لوگوں کے حق میں اُتری ہے، وہ قبیلہ بجیلہ میں سے تھے، اسلام سے مرتد ہو کر چرواہے کو قتل کیا، اونٹ ہانک کر لے گئے، راہ کو خوف ناک کر دیا اور حرام فرج کو پہنچے۔[3] (رواہ ابن جریر) ابو داود اور نسائی کی روایت میں مرفوعاً مروی ہے کہ آیت کا نزول عرنیین کے محاربے کے قصے میں ہوا ہے۔[4] غرضیکہ یہ قصہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے، جیسے: سیدنا جابر، سیدہ عائشہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہم۔

حافظ جلیل ابن مردویہ رحمہ اللہ نے طرقِ حدیث کو وجوہِ کثیرہ سے جمع کیا ہے۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ۔ اُن کو جو لوگ پکڑ کر لائے تھے، وہ انصار کے بیس سوار تھے۔ ان کے امیر جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ تھے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں مروی ہے کہ ان کو قتل کرنے کے بعد آگ میں جلا دیا۔[5] بعض نے کہا ہے کہ وہ قبیلہ بنی سلیم سے تھے اور کچھ عرینہ کے اور کچھ بجیلہ کے۔ ائمہ کا ان میں اختلاف ہے کہ آیا یہ حکم ان کے حق میں منسوخ ہوا یا محکم ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیتِ باب سے منسوخ ہوگیا ہے۔ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ﴾ [التوبۃ: ٤٣] ''(اے نبی!) اللہ نے آپ کو معاف کر دیا، آپ نے ان (منافقین) کو اجازت کیوں دی؟'' بعض نے کہا ہے کہ اس حدیث سے منسوخ ہے، جس میں مثلہ کی نہی ہے۔ مگر اس قول میں نظر ہے۔ قائل کو چاہیے کہ تاخرِ ناسخ بیان کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ حکم حدود کا حکم اُترنے سے پہلے تھا، یہی محمد بن سیرین کا قول ہے،[6] مگر اس میں بھی نظر ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٢٥٠) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٩) اس کی سند میں ''ابو سعد البقال'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (١٠/ ٢٦٧) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٣٦٩) سنن النسائي، رقم الحدیث (٤٠٤١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغلیل (١/ ١٩٥)

[5] تفسیر الطبري (١٠/ ٢٤٥۔ ٢٤٦) اس روایت کی سند میں ''ابوحمزہ اعور'' ضعیف راوی ہے [6] تفسیر القرطبي (٦/ ١٤٩)

سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں تاخر پر مکمل دلیل ہے، اس لیے کہ وہ مائدہ کے نزول کے بعد اسلام لائے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ آنکھوں میں سلائی نہیں پھیری، فقط ارادہ کیا تھا، اتنے میں قرآن کا نزول ہوا، جس میں حکم محاربین بیان کیا گیا، مگر اس قول میں بھی نظر ہے، کیوں کہ متفق علیہ حدیث میں آچکا ہے: «إِنَّهُ سَمَلَ» وَفِي رِوَايَةٍ: «سَمَرَ أَعْيُنَهُمْ»[1] ''ان کی آنکھیں نکال دیں۔''

محمد بن عجلان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت بطورِ عتاب اُتری ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سزا کا طریقہ بتایا ہے کہ وہ قتل کرنا یا کاٹ دینا یا شہر بدر کرنا ہے۔ پھر اس کے بعد کسی کو آنکھوں سے اندھا نہیں کیا۔ مگر امام اوزاعی رحمہ اللہ نے عتاب کا انکار کیا ہے، یوں کہا ہے کہ یہ خاص ان کی سزا تھی، پھر جو ان کے سوا محارب ہوں، ان کی سزا وہ ہے، جو آیت میں مذکور ہے۔ سمل کا حکم ان سے مرفوع ہے۔[2] یہ آیت جمہور علما کی اس بات پر حجت ہے کہ شہروں اور راستوں میں محاربت برابر ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے پیشِ نظر: ﴿وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا﴾ (آیتِ باب) یہی امام مالک، اوزاعی، لیث بن سعد، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے یہاں تک کہا ہے کہ جو شخص کسی کو فریب دے کر گھر میں گھس کر قتل کر کے اُس کا مال لے لیتا ہے، وہ بھی محارب ہے، اُس کا خون سلطان کے ذمے ہے نہ ولیِ مقتول کے ذمے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محاربہ صرف راستوں میں ہوتا ہے۔ شہروں میں جو ہوتا ہے، اس کی استغاثے کے وقت فریاد رسی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس راستے میں محاربے کی صورت میں بہ سبب مغیث و معین کے دور ہونے کے استغاثہ نہیں ہوسکتا۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جس نے گروہِ اسلام میں ہتھیار کھینچا اور راستے میں لوگوں کو ڈرایا، پھر اُس پر کامیابی اور قدرت حاصل ہوئی تو امام مسلمین کو اختیار ہے، چاہے اُسے قتل کرے، چاہے سولی پر چڑھا دے یا ہاتھ پاؤں کاٹے۔ یہی امام سعید بن مسیب، مجاہد، عطا، حسن بصری، ابراہیم نخعی اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول بھی ہے۔[4] (روی ذلك كله ابن جرير) سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔ مستند اس قول کا ظاہر ہے۔

اختیار دینے کی مثالیں قرآن میں موجود ہیں، جیسا کہ شکار کی جزا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے: ﴿فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا﴾ [المائدة: ٩٥] ''تو جو جانور اس نے مارا ہو اسے اس کے برابر ایک جانور مویشیوں میں سے فدیہ دینا ہوگا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو انصاف والے کریں گے، یہ (فدیہ) بطور قربانی کعبہ پہنچایا جائے گا۔ یا اس کا کفارہ چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یا اس کے برابر روزے رکھنا ہے۔''

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٢٥٣)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٧١)
[3] تفسير الطبري (١٠/ ٢٦٢۔ ٢٦٣)
[4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان کفارۃ الترفہ میں ہے: ﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ﴾ [البقرة: ١٩٦] ''پھر اگر کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ سر منڈوالے) تو فدیے میں روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔'' اور قسم کے کفارے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ﴾ [المائدة: ٨٩] ''چناں چہ اس کا کفارہ دس مسکینوں کو درمیانے درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا انھیں کپڑے پہنانا ہے یا ایک گردن (غلام) آزاد کرنا ہے۔''

یہ سب امور اختیار پر ہیں، اسی طرح آیتِ باب ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ یہ آیت احوال پر اُتری ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راہزنوں کے بارے میں روایت کیا ہے کہ جب وہ جان سے مار کر مال لے لیں تو مارے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں اور جو قتل کریں اور مال نہ لیں تو قتل کیے جائیں، سولی نہ ہو اور جو مال لیں اور قتل نہ کریں تو ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں اور جب راستے میں ڈرائیں اور مال نہ لیں تو زمین سے نکال دیے جائیں۔[1] (وقد رواه ابن أبي شيبة عن ابن عباس بنحوه)[2]

اسی طرح امام ابومجلز، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، حسن، قتادہ، سدی اور عطا خراسانی رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ سلف و ائمہ میں سے کئی ایک اہلِ علم نے اسی طرح کہا ہے۔[3] پھر اختلاف ہے کہ زندہ سولی چڑھا کر چھوڑ دیں، کھانے پینے سے روک دیں، یہاں تک کہ مر جائے یا نیزہ یا اس جیسی کسی چیز سے قتل کریں یا پہلے قتل کر کے پھر سولی پر چڑھا دیں، تاکہ اور مفسدوں کے لیے سزا کی عبرت اور تشدید حاصل ہو۔ یا تین دن سولی پر چڑھا رکھیں، پھر اُتار لیں یا چھوڑ دیں۔

محارب کی سزائیں:

ان مختلف سزاؤں کا بیان اپنی اپنی جگہ پر مرقوم ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے نزدیک سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت عبدالملک بن مروان کے سوال میں اس تفصیل کی شاہد ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ محارب کا کیا حکم ہے؟ کہا کہ جس نے مال چرایا، راہ میں ڈرایا، اُس کا ہاتھ چوری کے عوض اور پاؤں راہ میں ڈرانے کے عوض کاٹو، جس نے قتل کیا، اُس کو قتل کرو۔ جس نے قتل کیا، راہ میں ڈرایا، حرام فرج کو حلال کیا، اس کو سولی دو۔[4]

---

[1] مسند الشافعي (١/ ٣٣٦) اس کی سند میں ''ابراہیم بن ابی یحییٰ اسلمی'' متروک راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ١٣٠)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٤) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢)   [4] تفسير الطبري (١٠/ ٢٦٧) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ محارب کو طلب کریں گے، اگر مل گیا تو اس پر حد جاری کریں گے یا دارالاسلام سے بھگایا جائے گا۔ یہ زمین سے نفی (جلا وطن) کرنے کے معنی ہیں۔ اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس، انس بن مالک رضی اللہ عنہم، امام سعید بن جبیر، ضحاک، ربیع، زہری، لیث اور مالک رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے۔ اوروں نے کہا ہے کہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو نکال دیں یا سلطان یا نائب سلطان اُس کو اپنی عمل داری سے خارج کر دیں۔[1]

بالکلیہ شعبی رحمہ اللہ یہی کرتے تھے کہ اپنے عمل سے باہر نکال دیتے۔ امام عطا خراسانی رحمہ اللہ ایک لشکر سے دوسرے لشکر کی طرف سالہا سال تک نفی کر دیتے، دارِ اسلام سے باہر نہ کرتے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ جلا وطنی سے مراد قید میں ڈالنا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اُن کے اصحاب اسی طرف گئے ہیں،[2] لیکن یہ تفسیر لغت اور ظاہرِ نظمِ قرآنی سے دور پڑتی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جلا وطنی سے اس جگہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف نکال دینا ہے، وہاں قید رہے۔[3] ان کے لیے یہ کام دنیا کی رسوائی کا ہے۔ آخرت کا عذابِ عظیم علاحدہ ہوگا۔ یہ آیت اس قول کی تائید کرتی ہے کہ آیتِ باب مشرکین کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

رہے اہلِ اسلام تو صحیح مسلم میں سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے عہد لیا، جس طرح کہ عورتوں سے لیا، اس بات پر کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور چوری، زنا اور قتلِ اولاد بھی نہ کریں، ہم میں سے بعض دوسروں کے نافرمان نہ ہوں۔

پھر فرمایا: جو کوئی تم میں سے اس اقرار کو پورا کرے گا، اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو کوئی کچھ کر بیٹھے گا، پھر وہ معاقب ہوگا (اسے سزا ہوگی) تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس کا اللہ تعالیٰ نے پردہ رکھا، وہ جانے اور اللہ جانے، اُس کو عذاب کرے، چاہے معاف فرما دے۔[4] سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے دنیا میں گناہ کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اُس کا پردہ رکھا اور معاف فرمایا تو اللہ تعالیٰ اس سے کریم تر ہے کہ اُس پر عود کرے (لوٹ آئے) ایسی چیز میں جس کو معاف فرما دیا تھا۔ (رواه أحمد وابن ماجه) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے پوچھا: یہ حدیث کیسی ہے؟ کہا: مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح پر آئی ہے۔ مرفوع ہونا صحیح ہے۔[5]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خزیِ دنیا گرفتاری، قید، رہائی ذلت وسزا ہے، دنیا میں آخرت سے پہلے اور اُن کے لیے آخرت میں عذابِ عظیم ہے، اگر اپنے فعل سے توبہ نہیں کی ہے اور مر گئے۔[6] رہے وہ لوگ جو قبل قدرت

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٢٦٨۔ ٢٧٠) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢)

[3] تفسير الطبري (١٠/ ٢٧٤) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)

[5] مسند أحمد (١/ ٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٢٦) العلل للدارقطني (٣/ ١٢٨) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٨٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [6] تفسير الطبري (١٠/ ٢٧٦)

(قابو پائے جانے سے پہلے) کے تائب ہو گئے ہیں، لہٰذا جس نے یہ کہا ہے کہ آیت اہلِ شرک کے حق میں ہے، اس کے قول پر آیت کے معنی ظاہر ہیں۔

پکڑے جانے سے پہلے توبہ کرنے والے مسلمان محارب کا حکم:

محاربین مسلمین جو قابو پائے جانے سے قبل توبہ کر لیں گے تو ان سے قتل وصلب وقطع رجل کا واجب ہونا ساقط ہو جائے گا۔ ہاتھ کاٹنے کے بارے میں علما کے دو قول ہیں۔ ظاہر آیت کا تقاضا ہے کہ اس پر سکوت اختیار کیا جائے، اسی پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل تھا۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جاریہ بن بدر تیمی، جو اہلِ بصرہ سے تھا، وہ زمین میں فساد کرتا تھا اور محارب تھا۔ اس نے اپنے متعلق چند قریش سے جیسے سیدنا حسن بن علی، سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم سے گفتگو کی، انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُس کو امن نہ دیا، وہ سعید بن قیس ہمدانی کے پاس گیا، وہ اس کو اپنے گھر میں چھوڑ کر سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، کہا: اے امیر المومنین! آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جس نے اللہ اور رسول سے محاربہ کیا ہے اور زمین میں فساد کے لیے دوڑا؟ انھوں نے آیتِ باب پڑھی، جب اس لفظ پر پہنچے: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ﴾ تو کہا: اس کے لیے امان لکھ دو۔[1] (رواه ابن أبي حاتم وكذا ابن جرير من غير وجه)

امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قبیلہ مراد کا ایک شخص ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، وہ امارتِ عثمان رضی اللہ عنہ میں کوفے پر حاکم تھے اور اس کے بعد کہ وہ فرض نماز پڑھ چکے تھے، کہا: اے ابو موسیٰ! "هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ النَّارِ" یعنی میں تم سے پناہ چاہتا ہوں، فلاں بن فلاں مرادی ہوں، میں نے اللہ اور رسول سے محاربہ کیا، زمین میں فساد کے لیے دوڑا، اب میں تمھارے قابو پانے سے پہلے توبہ کر کے آیا ہوں۔ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ یہ شخص فلاں بن فلاں ہے، جس نے اللہ اور رسول سے محاربہ کیا، زمین میں فساد کرنے کو دوڑا، اب اس نے ہمارے قابو پانے سے پہلے اس پر توبہ کر لی ہے، اب کوئی سوائے بھلائی کے اس سے تعرض نہ کرے، وہ اگر سچا ہے تو سچی راہ پر رہے گا اور اگر دروغ گو ہے تو اس کے گناہ اس کا تدارک کریں گے، وہ شخص جب تک اللہ نے چاہا ٹھہرا رہا، پھر نکل گیا، اللہ نے اس کے گناہوں کے عوض اس کو قتل کیا۔[2] (رواه ابن جرير)

موسیٰ مدنی نے کہا: علی اسدی نے محاربہ کیا۔ راہ کو ڈرایا، خون کیا، مال لوٹا، سردار اور عوام اس کی طلب میں تھے، وہ ہاتھ نہ آیا، اُس نے ایک آدمی کو سنا، یہ آیت پڑھتا ہے: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الزمر: ٥٣] ''آپ کہہ

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٢٨٠)　[2] تفسير الطبري (١٠/ ٢٨٢)

دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم وزیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' کھڑے ہو کر کہا کہ اے اللہ کے بندے! ذرا اس آیت کو پھر پڑھ۔ اس نے پھر پڑھا، اُس نے تلوار میان میں کی، تائب ہو کر مدینے میں آیا، صبح کو غسل کر کے مسجدِ نبوی میں آ کر صبح کی نماز پڑھی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں دب کر بیٹھا رہا، جب روشنی ہوئی، لوگوں نے پہچانا، پکڑنے کو کھڑے ہوئے، کہا: تم کو مجھ پر کوئی راہ نہیں پہنچتی، میں تمھارے قابو پانے سے پہلے تائب ہو کر آیا ہوں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: سچ کہتا ہے۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر مروان بن حکم کے پاس لائے، وہ امیرِ مدینہ تھے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا۔ کہا: یہ علی ہے، تائب ہو کر آیا ہے، اب اس پر تمھارا کچھ زور نہیں ہے اور نہ قتل، آخر وہ چھوڑ دیا گیا۔ پھر وہ جہاد کے لیے اللہ کے راستے میں دریا پر سوار ہوا، روم سے لڑائی ہوئی، دو کشتیاں باہم ہوئیں، سفینۂ روم پر حملہ کیا، وہ اور جانب کو بھاگے ان کی کشتی جھک گئی، یہ اور وہ سب کے سب غرق ہو گئے۔[1]

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس حکم کا بنی اسرائیل پر لاگو ہونے کا سبب آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہیں۔ جمہور مفسرین نے یوں ہی کہا ہے۔ بنی اسرائیل کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ سیاقِ عبارت میں انھی کے گناہوں کو شمار کیا گیا ہے۔ پہلی امت جس پر قتلِ نفس کے بارے میں وعید اور سختی واقع ہوئی وہی ہیں، کیوں کہ وہ کثرت سے خون ریزی اور انبیا کا قتل کرتے تھے۔ لیکن یہ مقرر کرنا مشکل ہے، کیوں کہ قابیل اور ہابیل کے واقعے اور بنی اسرائیل پر قصاص واجب کرنے کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہے۔

بعض نے کہا کہ الفاظ ﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ﴾ (آیتِ باب) تمام کلام ماقبل ہے۔ اس صورت میں کچھ اشکال نہ ہوگا، یعنی وہ اس وجہ سے نادم ہوا کہ اُس نے اپنے بھائی کو مار ڈالا، لیکن جمہور مفسرین اور اصحابِ معانی کا قول یہ ہے کہ مذکورہ الفاظ ابتدائے کلام ہیں، جن کا تعلق لفظِ ﴿ كَتَبْنَا ﴾ سے ہے۔ اس لیے اس پر وقف نہیں کرنا چاہیے۔ قتلِ نفس بغیر نفس سے قصاص خارج رہا، کیوں کہ وہ نفس کے عوض ہوتا ہے نہ کہ بے سبب۔

فسادِ ارض سے مراد ایمان کے بعد شرک و کفر ہے یا راہ زنی۔ ظاہرِ نظمِ قرآنی یہی ہے کہ جس پر فساد فی الارض صادق آئے، وہ اس لفظ میں داخل ہے۔ شرک زمین میں فساد ہے۔ راہزنی فساد فی الارض ہے۔ خون ریزی و ہتک عزت و غارت گریِ اموال زمین میں فساد ہے۔ یعنی اللہ کے بندوں پر ناحق فساد ہے۔ عمارتوں کو گرانا، درختوں کو کاٹنا، تغویرِ انہار، درہم و دینار کا کاٹنا زمین میں فساد ہے۔

غرضیکہ ان سب قسموں پر فساد فی الارض کے الفاظ صادق آتے ہیں۔ اسی طرح وہ فساد جس کا ذکر ﴿ وَيَسْعَوْنَ

---

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٢٨٤)

﴿ فِي الْاَرْضِ ﴾ (آیت باب) میں آیا ہے کہ وہ بھی فساد فی الارض کی تمام قسموں کو شامل ہے۔ بعض نے کہا کہ آیت اہلِ شرک کے حق میں ہے۔ بعض نے کہا کہ اہلِ اسلام کے حق میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آیت مشرک وغیرہ کو عام ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کا حکم اہلِ اسلام محاربین پر مرتب ہے۔ اگرچہ مرتدوں اور یہودیوں کے حق میں اُتری ہو۔[1]

لہٰذا جب آیت عام ٹھہری تو ہر محارب اور ہر فساد پر صادق آئے گی۔ خواہ مسلم ہو یا کافر، شہر میں ہو یا غیر شہر میں قلیل میں ہو یا کثیر میں۔ جلیل میں ہو یا حقیر میں، اللہ کا حکم اس بارے میں وہی ہے، جو آیت میں آیا ہے، یعنی قتل یا سولی یا اعضا کا کاٹنا یا زمین سے جلا وطنی۔ لیکن یہ حکم ہر گناہ کے کام کا نہیں ہے، بلکہ اس شخص کا ہے، جس کا گناہ لوگوں کے خون اور مال میں زیادتی کرنا ہو، سوائے اس کے جس کے بارے میں قرآن وسنت میں علاحدہ حکم آچکا ہے۔ جیسے: چوری یا جس میں قصاص آیا ہے، اس لیے کہ ہم کو معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں گناہ اور نافرمانیاں واقع ہوتی تھیں۔ اس آیت کا حکم ان پر جاری نہ کیا جاتا تھا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے جو تفسیر محاربہ بزنا اور سرقہ کی ہے،[2] وہ ضعیف ہے، اس لیے کہ زنا و چوری کا حکم محاربہ سے الگ آیا ہے۔ پھر علما نے محاربہ کے نام کے مستحق میں اختلاف کیا ہے۔ ان کی تفاصیل ذکر کی ہیں، جس طرح اوپر گزر چکا، لیکن کتاب وسنت میں اس تفصیل پر کوئی دلیل نہیں۔ مگر ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت میں جس میں عبد الملک نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تھا۔[3] لہٰذا اس میں شدید نکارت ہے، اس کی صحت کا حال معلوم نہیں۔

صیغۂ تفعیل ﴿ يُقَتَّلُوْٓا ﴾ تعلق کے اعتبار سے تکثیر کے واسطے ہے۔ یعنی ایک ایک کو ایک ایک کے بعد قتل کریں۔ ظاہر الفاظ یہ ہیں کہ زندہ کو پھانسی دیں، یہاں تک کہ مر جائیں، اللہ نے اس سزا کو اپنی کتاب میں مشروع کیا ہے۔ قتل کے بعد سولی دینے کی کچھ ضرورت نہیں، جس طرح بعض نے کہا ہے کہ ہاتھوں اور پاؤں کے کاٹنے میں اختلاف ہے۔ خواہ سیدھا ہاتھ بائیں پاؤں کے ساتھ ہو یا بایاں ہاتھ سیدھے پاؤں کے ساتھ کاٹا جائے۔

جلا وطنی سے مراد یہ ہے کہ جس جگہ اس سے محاربہ واقع ہوا ہے، وہاں سے نکال دیں، قید کرنا ضروری نہیں نہ یہاں نہ وہاں۔ ظاہرِ آیت یہی ہے۔ امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس امت میں سب سے پہلے جس نے قید میں بند کیا، وہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ کہا: جب تک کہ توبہ نہ کرے میں قید کروں گا، دوسرے شہر کی طرف نہیں نکالوں گا کہ وہاں کے لوگوں کو ایذا دے۔[4] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جلا وطنی قصر کی مسافت تک کافی ہے یا زیادہ، اس لیے کہ جلا وطنی کا مقصد اہل وعیال اور وطن سے وحشت اور دوری ہے۔ لہٰذا جب امام جلا وطنی کی ایک سمت مقرر کر دے تو

---

[1] تفسیر القرطبي (٦/ ١٥٠) [2] تفسیر الطبري (١٠/ ٢٥٦) اس کی سند میں "حسین بن داود" ضعیف راوی ہے۔

[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [4] تفسیر القرطبي (٦/ ١٥٣)

جلاوطن کیا گیا دوسری سمت طلب نہیں کرسکتا نہ ہی قید کرنا متعین ہوتا ہے۔ ذلت اور عذاب کی وعید کافر کے لیے ہے۔ مسلمان پر جب حد قائم ہوگئی تو آخرت کا عذاب ساقط ہوجاتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے قابو پالیے جانے سے پہلے توبہ کرنے والوں کو مستثنیٰ فرمایا ہے۔ قرآن کا ظاہر، خون اور مال کے نقصان اور دیگر گناہ جن کی سزا مقرر کردہ حدود ہیں، کے درمیان فرق نہیں کرتا۔ قابو پائے جانے سے پہلے توبہ کرنے والا کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل اسی پر تھا۔ بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ قصاص اور تمام حقوق العباد قابو پائے جانے سے پہلے توبہ کر لینے سے ساقط نہیں ہوجاتے۔ حق وہی پہلی بات ہے۔ ہاں قابو پائے جانے کے بعد کی توبہ مذکورہ آیت کی سزا کو ساقط نہیں کرتی۔

﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ﴾ کی قید اسی پر دلیل ہے۔ اہلِ علم نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ سلطان محارب کا ولی ہے۔ اگر محارب نے حالتِ محاربہ میں کسی کے بھائی یا باپ کو قتل کیا ہے تو خون کا بدلہ طلب کرنے والے کو کچھ اختیار نہیں ہے اور نہ ہی ولی کے لیے خون کو معاف کرنا جائز ہے۔[1]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا
فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۳۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا
بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ۝۳۶ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ
مِنْهَا ۫ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۝۳۷

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کا قرب تلاش کرو اور اس کے راستے میں جہاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ (35) بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو ساری زمین میں ہے اور اس کے برابر اور بھی ہوتا کہ وہ قیامت کے دن عذاب سے بچنے کے لیے فدیے میں دے دیں تو بھی وہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے بہت دردناک عذاب ہے (36) وہ آگ سے نکلنا چاہیں گے مگر وہ اس میں سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے (37)

تقویٰ، وسیلہ اور جہاد کا حکم:

یعنی رسول کی اطاعت میں جو نیکی کرو، وہ قبول ہے اور بغیر اس کے اپنی عقل سے کرو، وہ قبول نہیں۔ اللہ پاک

---

[1] فتح البیان (۳/ ۴۰۲۔ ۴۱۱)

نے اس آیت میں اپنے مومن بندوں کو حکم دیا ہے کہ تقویٰ اختیار کریں۔ یہ تقویٰ جب فرمانبرداری سے ملتا ہے تو اس سے مراد حرام کی گئی چیزوں سے باز رہنا اور جن چیزوں سے منع کر دیا گیا ہے، ان کو چھوڑ دینا ہے۔ اس کے بعد وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وسیلہ سے مراد قربت ہے۔ یہی امام مجاہد، ابو وائل، حسن بن زید رحمہ اللہ اور بہت سے لوگوں کا قول ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اطاعت کر کے اور اللہ کے پسندیدہ اعمال بجا لا کے اُس کا تقرب حاصل کرو۔ ابن زید رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٧] ''جنھیں یہ (مشرک) لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔'' ائمہ کے اس قول میں مفسرین کا اختلاف نہیں ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ شاعر کا یہ قول پڑھا ہے: ؎

إِذَا غَفَلَ الْوَاشُوْنَ عُدْنَا لِوَصْلِهَا وَعَادَ التَّصَادُ فِيْ بَيْنِنَا وَالْوَسَائِلُ[1]

وسیلہ سے مراد:

وسیلہ وہ چیز ہے جو مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہو۔ نیز وسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ مقام کا نام ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے۔ وہ جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر ہے اور وہ گھر سب مکانوں سے زیادہ عرش کے قریب ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو کوئی اذان سن کر یہ کلمے کہتا ہے، اس کے لیے قیامت کے دن شفاعت حلال ہو جاتی ہے: ''اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّآمَّةِ، وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ، آتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ''[2] ''اے اللہ اور اے اس اذان کامل اور صلاتِ قائمہ کے رب! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور اُن کو مقامِ محمود میں، جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے، مبعوث فرما۔''

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب تم اذان سنو تو جو کچھ موذن کہتا ہے تم بھی ویسا ہی کہو، پھر مجھ پر درود بھیجو، جو کوئی مجھ پر درود بھیجتا ہے، اللہ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلہ مانگو کہ وہ جنت میں ایک درجہ ہے، جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندے کے لائق ہے اور اللہ سے میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہی ہوں، جو کوئی میرے لیے وسیلہ مانگتا ہے، اس کے لیے شفاعت ہے۔[3]

مسند احمد میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب تم درود پڑھو تو میرے لیے وسیلہ مانگو۔ کہا: اے اللہ کے رسول! وسیلہ کیا ہے؟ فرمایا: جنت میں اعلیٰ درجہ ہے۔ نہ پائے گا اس کو مگر ایک مرد، میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ

---

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٢٩٠۔ ٢٩١) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٤)
[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٨٩)
[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٨٤)

ایک مرد میں ہی ہوں۔ (رواه الترمذي وقال غريب)[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ سے میرے لیے وسیلہ طلب کرو، جو شخص میرے لیے اللہ سے وسیلہ مانگتا ہے، میں اس کے لیے قیامت کے دن شفاعت کرنے والا اور گواہی دینے والا ہوں گا۔ (رواه الطبراني وابن مردويه بنحوه)[2] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ کے نزدیک ایک درجہ کا نام وسیلہ ہے، اُس سے بلند کوئی اور درجہ نہیں ہے۔ سوتم اللہ سے دعا مانگو کہ وہ وسیلہ مخلوقات پر مجھے ملے۔ (رواه ابن مردويه)[3]

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جنت میں ایک درجہ ہے، جس کو وسیلہ کہتے ہیں، سو جب تم اللہ سے مانگو تو وہ وسیلہ میرے لیے مانگو، کہا: اے اللہ کے رسول! وہاں آپ کے ساتھ کون رہے گا، فرمایا: علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ عنہم۔ (رواه ابن مردويه)[4] لیکن یہ حدیث غریب منکر ہے۔ اس وجہ سے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کوفے میں منبر پر کہا ہے کہ اے لوگو! جنت میں دو موتی ہیں: ایک سفید، دوسرا زرد جو زرد ہے، وہ باطنِ عرش تک ہے۔ مقامِ محمود سفید موتی کا ہے، اُس میں ستر ہزار غرفے ہیں، اس کا ہر گھر تین میل ہے، غرف اور دروازے اور پلنگ ہیں، گویا وہ سب ایک ہی رگ سے بنے ہیں، اس کا نام وسیلہ ہے، وہ نبی اکرم ﷺ کے لیے ہے اور ان کے اہل کے لیے۔ (رواه ابن أبي حاتم) یہ اثر غریب ہے۔[5]

مجاہد کی فضیلت:

حرام کردہ چیزوں کو ترک کرنے اور اطاعت گزاری کے کاموں کا حکم دے کر پھر دشمنوں سے جنگ کرنے کا حکم فرمایا کہ کفار و مشرکین سے لڑو، جو طریقِ مستقیم سے خارج ہیں اور سیدھے دین کے تارک ہیں، پھر اس کام میں رغبت دلائی اور کہا کہ ہم نے مجاہدوں کے لیے قیامت کے دن وہ کامیابی اور سعادت تیار کی ہے، جو بہت عظیم ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے جو نہ مٹے نہ بدلے اور نہ کم ہو اور ان کے لیے رہائش کے لیے ایسے بلند بالا خانے ہیں، جن میں بہت خوب صورت مناظر ہیں اور جو کوئی ان میں رہے گا اور بسے گا، وہ ہمیشہ چین پائے گا، کبھی تکلیف نہ اُٹھائے گا، زندہ رہے گا کبھی نہ مرے گا، نہ کپڑا پرانا ہوگا نہ جوانی فنا ہوگی۔

کافروں کا عذاب:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس عذاب اور سزا کی خبر دی ہے، جو قیامت کے دن کافروں کے لیے تیار کیا ہے اور فرمایا

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٦٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٣٦)

[2] المعجم الأوسط (١/ ١٩٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٣٧)

[3] المعجم الأوسط (٢/ ١٢٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٥٧١)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٥) اس روایت کی سند میں ''عبدالحمید بن بحر'' اور ''حارث اعور'' ضعیف راوی ہیں۔

[5] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٥) اس روایت کی سند میں ''سعد بن طریف'' سخت ضعیف راوی ہے۔

کہ اگر ساری دنیا یا اس سے دوگنا فدیہ دے کر رہائی چاہیں گے تو بھی اُنھیں نہ خلاصی نصیب ہوگی اور نہ بچنے کی کوئی جگہ اور نہ بھاگنے کی کوئی جگہ ملے گی۔ بلکہ دائمی عذاب رہے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ [السجدة: ٢٠] ''جب بھی وہ ارادہ کریں گے کہ وہ اس سے نکلیں تو انھیں اسی میں لوٹا دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ اس آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے۔'' وہ ہمیشہ یہ چاہیں گے کہ کسی طرح اس عذاب اور شدت اَلم و بلا سے باہر نکلیں، مگر کوئی راہ ہاتھ نہ آئے گی، جب جہنم کا شُعلہ اوپر کو پھینکے گا تو جہنم کے اوپر والے حصے میں جا پڑیں گے۔ جہنم کے فرشتے اُنھیں لوہے کے گرزوں سے مار مار کر جہنم کے نچلے حصے میں گرا دیں گے۔ مقیم سے مراد ہمیشہ کے لیے رہنا ہے، جس سے نہ نکلنا ہو اور نہ چھوٹنا۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ایک جہنمی کو آگ سے نکال کر لائیں گے، اُس سے پوچھا جائے گا: اے ابن آدم! تو نے اپنی جگہ اور بود و باش کو کیسا پایا؟ وہ کہے گا: بہت برا پایا۔ پھر کہیں گے کہ کیا تو زمین بھر کر سونا فدیے میں دے گا؟ وہ کہے گا: ہاں اے رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، میں نے تجھ سے اس سے بھی کم مانگا تھا، تو نے نہ دیا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو آگ میں لے جاؤ۔ (رواہ مسلم) اس کو شیخین نے دوسرے طریق سے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اور وجہ سے اس کو بہت وسیع ترکیب سے نقل کیا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ وسیلہ اُس قربت کو کہتے ہیں، جو لائقِ طلب ہے اور ایک درجے کا نام ہے جو رسول اللہ ﷺ کے لیے جنت میں مخصوص ہے۔ عطف اس بات کو مفید ہے کہ وسیلہ تقویٰ کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ بلکہ وہی تقویٰ ہے۔ اس لیے کہ تقویٰ تمام امورِ خیر کا گُر ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ پہلے جملے کا مفسر ہوگا۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ وسیلہ تقویٰ اور دوسری اچھی عادات کی قربت ہے، جن سے بندے اللہ کا قرب چاہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وسیلے سے مراد محبت ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

اس جگہ تقرب عام کے معنی زیادہ چسپاں ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ وسیلہ جو خاص نبی کریم ﷺ کا مقام ہے، اس کا ہر شخص کو طلب کرنا صحیح نہیں۔ بعض جہلا مشائخ نے اس جگہ لفظ وسیلہ کو پیری مریدی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ یہ تفسیر حقیقت سے انفرادی رائے ہے۔ سلف میں سے کسی نے اس لفظ کے یہ معنی نہیں کیے اور نہ کچھ اس کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ قرآن و حدیث میں بیعت کا حکم الگ سے آیا ہے۔

﴿ مَا فِي الْاَرْضِ ﴾ سے مراد مال و دولت کی تمام قسمیں اور ذخیرے اور منافع ہیں سب کے سب۔ یعنی کافر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٥) مسند أحمد (٣/ ٢٠٧)

اگر دنیا بھر کا مالک ہوجائے اور ایک دوسری دنیا اس دنیا کی طرح اس کو اور مل جائے اور وہ چاہے کہ عذاب کے بدلے اپنی جان کا فدیہ دے کر چھوٹ جائے تو یہ ممکن نہیں ہے، کیوں کہ اُس کا عذاب دائم و قائم ہے۔ اُس سے رہائی کا کوئی راستہ نہیں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ ایک بہت ہلکے پھلکے عذاب والے اہلِ نار سے کہے گا: بھلا اگر تیرے پاس ساری دنیا ہوتو کیا تو اس کو فدیے میں دے گا، وہ کہے گا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے تجھ سے اس سے بھی زیادہ آسان بات چاہی تھی، جب تو پشتِ آدم میں تھا کہ میرے ساتھ شرک نہ کرنا، میں تجھ کو آگ میں داخل نہیں کروں گا، بلکہ جنت میں لے جاؤں گا، تونے نہ مانا اور شرک کیا۔[1] یہ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ قیامت کے دن ایک کافر کو لائیں گے، اس سے کہا جائے گا کہ اگر تمھارے پاس زمین بھر کر سونا ہوتو کیا تو فدیہ دے گا؟ وہ کہے گا: ہاں۔ اس سے کہا جائے گا: تجھ سے تو اس سے بھی آسان بات کا سوال کیا گیا تھا کہ میرے ساتھ شرک نہ کرنا۔[2]

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک قوم آگ سے نکل کر جنت میں داخل ہوگی۔ یزید فقیر نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو یوں فرماتا ہے: ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ [البقرة: ١٦٧] ''اور وہ آگ کے عذاب سے نکلنے والے نہیں ہوں گے'' سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اول آیت پڑھ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا... الخ﴾ یعنی وہ جو نار سے نہ نکلیں گے، وہ کافر ہیں۔[3] (أخرجه مسلم وابن المنذر وابن أبي حاتم وابن مردويه)

نافع بن ارزق نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا ہے کہ تم کو یہ زعم ہے کہ ایک قوم آگ سے باہر آئے گی، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وہ آگ سے باہر نکلنے والے نہیں ہیں۔ کہا: ''وَيْحَكَ اِقْرَأْ مَا فَوْقَهَا هٰذِهٖ لِلْكُفَّارِ''[4] کشاف میں کہا ہے کہ اس کو مجبرہ نے گھڑا ہے۔[5] یعنی اہلِ سنت و الجماعت نے یہ بات بنائی ہے کہ موحدین گناہگار آگ سے نجات پائیں گے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شخص پر بڑا تعجب ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب صحیح اور جھوٹ تر بات کے درمیان کچھ تمیز نہیں ہے اور مزید برآں جس بات کو جانتا پہچانتا نہیں ہے، اس کے بارے میں کلام کرتا ہے۔ حالاں کہ احادیثِ متواترہ اس بارے میں آئی ہیں کہ موحد نافرمان آگ سے نکلیں گے۔ یہ احادیث عالمِ روایت پر، جس کو علمِ روایت سے ادنیٰ سا تعلق ہے، مخفی نہیں ہیں۔ اس کا منکر لائقِ مناظرہ نہیں ہے، کیوں کہ وہ شریعت کی ضروری باتوں کا منکر ہے۔[6]

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٥)
(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٧٣، ٣١٥٦)
(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٦)
(4) تفسير الطبري (١٠/ ٢٩٤)
(5) تفسير الكشاف (١/ ٦٦٣)
(6) فتح القدير (٢/ ٥٦) فتح البيان (٣/ ٤١٢۔ ٤١٥)

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا
نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ
ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

اور تم چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دیا کرو، یہ اللہ کی طرف سے اس گناہ کی عبرت ناک سزا ہے جو انھوں نے کیا، اور اللہ غالب، خوب حکمت والا ہے (38) پھر جو شخص اپنے گناہ کے بعد توبہ کر لے اور اپنی اصلاح کر لے تو بے شک اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے (39) کیا تمھیں علم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہے بخش دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھنے والا ہے (40)

چوری کی سزا:

یہ اس پر فرمایا کہ کوئی تعجب نہ کرے کہ چور کو تھوڑی خطا پر بڑی سزا فرمائی۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ''أَیْمَانَهُمَا'' ہے،[1] بجائے ﴿ اَيْدِيَهُمَا ﴾. یہ قراءت شاذ ہے۔ جمیع علما کے نزدیک نہ حکم اس کے مطابق ہے اور نہ اس کے ساتھ ہے، بلکہ وہ حکم دوسری دلیل سے لیا گیا ہے۔ ہاتھ کا کاٹنا جاہلیت میں بھی تھا، اسلام میں مقرر رہا۔ کچھ شرطیں زیادہ ہوگئیں، جس طرح کہ قسامت (قسم کھانا)، دیت، قراض وغیرہ اشیا جن کو شریعت نے مقرر رکھا ہے، وہ سب اسی طرح ہیں، کچھ اضافے جو ہوگئے ہیں، وہ سب مصلحتیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں سب سے پہلے چور کا ہاتھ قریش نے کاٹا۔ ایک شخص دویک نامی قومِ خزاعہ کے بنی ملیح بن عمر کا غلام تھا، اُس نے کعبے کا خزانہ چرایا تھا یا قوم نے چرا کر اُس کے پاس رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔

فقہائے اہلِ ظاہر کا مذہب یہ ہے کہ جب چور کچھ چرائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔ خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اس لیے کہ یہ آیت عام ہے، اس میں نصاب و حرز کا اعتبار نہیں، بلکہ صرف سرقہ کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا کہ یہ آیت خاص ہے یا عام؟ کہا: عام ہے۔[2] دوسری دلیل ان کی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ

(1) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۹۵) اس کی سند میں ''جابر جعفی'' اور ''سفیان بن وکیع'' ضعیف راوی ہیں۔
(2) تفسیر الطبري (۱۰/ ۲۹۶) اس کی سند میں ''نجدۃ حنفی'' مجہول راوی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَعَنَ اللّٰهُ السَّارِقَ يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ فَتُقْطَعُ يَدُهٗ وَيَسْرِقُ الْحَبْلَ فَتُقْطَعُ يَدُهٗ»[1] (رواه الشيخان) ''اللہ لعنت کرے چور پر جو ایک انڈا چراتا ہے اور اُس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور وہ ایک رسی چراتا ہے اور اُس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔''

چوری کا نصاب:

جمہور نے نصاب کا اعتبار کیا ہے، اگرچہ ان کے درمیان نصاب کی مقدار کے بارے میں اختلاف ہے۔ ائمہ اربعہ میں ہر امام نے ایک علاحدہ قول اختیار کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نصاب تین درہم مضروب خالص ہیں، جب ان کو یا ان کی ہم قیمت چیز کو چوری کرے گا تو ہاتھ کاٹنا واجب ہوگا۔ ان کی دلیل سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک سپر (ڈھال) میں جس کی قیمت تین درہم تھی، ہاتھ کاٹا۔[2] (رواه في الموطأ وأخرجاه في الصحيحين) امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ترنجبین میں جس کی قیمت تین درہم ٹھہری، ہاتھ کاٹ ڈالا۔ ''وَهُوَ أَحَبُّ مَا سَمِعْتُ وَهٰذَا الْأَثَرُ رَوَاهُ أَيْضًا مَالِكٌ''[3] ''اور یہ سب سے پسندیدہ بات ہے، جو میں نے سنی اور اس اثر کو امام مالک رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح روایت کیا۔''

اصحابِ مالک کہتے ہیں کہ یہ صنیع مشتہر ہوئی، کسی نے اس پر انکار نہ کیا۔ رہا تین درہم کا اعتبار، اس میں بھی حنفیہ مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں: دس درہم ہونا چاہیے۔ شافعیہ دینار کے چوتھائی حصے کا اعتبار کرتے ہیں۔ واللّٰه أعلم.
امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے ایک چوتھائی دینار کا اعتبار ہے یا اثمان یا عروض، یعنی سامان اُس کے ہم قیمت یا زیادہ ہو ربع دینار سے۔ ان کی حجت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ چور کا ہاتھ ربع دینار (چوتھائی دینار) میں اور زیادہ میں کاٹا جائے گا۔ (رواه الشيخان) صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، مگر ربع دینار پس زیادہ میں۔[4]

ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ یہ حدیث مسئلے میں فیصلہ کرنے والی ہے اور ربع دینار کے اعتبار میں نص ہے نہ اُس کے مساوی میں۔ وہ حدیث جو ڈھال مالیتی تین درہم پر ہاتھ کاٹنے کے بارے میں ہے، کچھ اس حدیث کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ اُس وقت میں دینار بارہ درہم کا ہوتا تھا، سو یہ تین درہم ربع دینار ہوئے۔ اس طرح سے جمع ممکن ہے۔ یہ مذہب سیدنا عمر بن خطاب، سیدنا عثمان بن عفان، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ عمر بن عبدالعزیز، لیث بن سعد، اوزاعی، شافعی، اصحابِ شافعی، ابن راہویہ، ابو ثور اور داود بن علی ظاہری رحمہم اللہ سب اسی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٨٧)

[2] الموطأ (٢/ ٨٣١) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٨٦)

[3] الموطأ (٢/ ٨٣٢) اس کی سند صحیح ہے۔ [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٨٤)

کے قائل ہیں۔ احمد اور ابن راہویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر ایک ربع دینار اور تین درہم سے مراد شرعی ہے، جس نے ان کو چرایا یا ان کے برابر کوئی چیز چرائی تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی حدیث پر عمل کرنے کے لیے ایک اور روایتِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یوں مروی ہے کہ چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹو اور اس سے کم میں نہ کاٹو۔[1] اس دن چوتھائی دینار تین درہم کے برابر تھا۔ دینار بارہ درہم کا تھا۔ نسائی کے الفاظ یہ ہیں کہ چور کا ہاتھ ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری پر نہیں کاٹا جاتا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ ڈھال کی قیمت کیا ہے؟ کہا: ربع دینار۔[2] یہ سب اس بات پر نصوص ہیں کہ دس درہم کی شرط کالعدم ہے۔ واللہ أعلم.

امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد، زفر اور سفیان ثوری رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ نصاب سرقہ دس درہم مضروب غیر مغشوش (غیر ملاوٹ شدہ) ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ ڈھال جس کی چوری پر عہدِ نبوت میں ہاتھ کاٹا گیا، اُس کی قیمت دس درہم تھی۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ چور کا ہاتھ ڈھال کی قیمت سے کم میں نہ کاٹا جائے اور ڈھال کی قیمت دس درہم تھی۔[3] (رواه أبو بكر بن أبي شيبة)

سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم ڈھال کی قیمت میں مخالف ہیں۔ اس لیے احتیاط یہ ہے کہ اکثر کا اعتبار کریں، کیوں کہ حدود شبہات میں دور ہٹا دی جاتی ہیں۔ بعض سلف جیسے سیدنا علی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما، امام ابراہیم نخعی اور امام باقر رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں کہ دس درہم یا ایک دینار یا ان دونوں کی ہم قیمت چیز میں ہاتھ کاٹنا چاہیے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پانچ دینار میں یا پچاس درہم میں قطع کیا جائے گا۔

جمہور نے حدیث کا، جس میں انڈے اور رسی کا ذکر ہے، ایک جواب یوں دیا ہے کہ حدیث مذکور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے منسوخ ہے، مگر اس میں نظر ہے، کیوں کہ تاریخ کا بیان کرنا ضروری ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ مراد بیضہ حدید (لوہے کا انڈا) وحبل سفینہ (کشتی کی رسی) ہے۔ (قاله الأعمش حكاه البخاري وغيره عنه) تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ ایک وسیلہ ہے، چوری میں تھوڑے سے زیادہ کی طرف بڑھنے کا جس میں ہاتھ کاٹا جاتا ہے یا خبر دی ہے کہ جاہلیت میں وہ قلیل اور کثیر میں ہاتھ کاٹتے تھے، اس لیے چور پر لعنت کی کہ حقیر سی چیزوں کے عوض میں اپنا قیمتی ہاتھ دیتا ہے۔

حکایت:

ابو العلاء معری بغداد میں آیا، مشہور ہوا کہ اس نے فقہا پر ربع دینار کے چوری کے نصاب کی بابت اشکال

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٨٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١١٨١) [2] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٣٥) یہ روایت صحیح ہے۔
[3] مصنف ابن أبي شيبة (٥/ ٤٧٦)

وارد کیا ہے۔ اس بارے میں شعر نظم کیے، جو اس کی جہالت اور کم عقلی پر دلالت کرتے ہیں ؎

يَدٌ بِخَمْسِ مِئِيْنَ عَسْجَدٍ وُّدِيَتْ مَا لَهَا قُطِّعَتْ فِيْ رُبْعِ دِيْنَارِ
تَنَاقُضٌ مَّا لَنَا إِلَّا السُّكُوْتُ لَهٗ وَأَنْ نَّعُوْذَ بِمَوْلَانَا مِنَ النَّارِ

یعنی ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار ہوں، وہ ربع دینار میں کاٹا جائے اس تناقض پر سوائے سکوت و نار سے پناہ مانگنے سے اور کیا علاج ہے؟ جب یہ اشعار مشتہر ہوئے تو فقہا نے اس کو تلاش کیا، وہ بھاگ گیا، لوگوں نے اس اشکال کا جواب دیا۔ قاضی عبدالوہاب مالکی رحمہ اللہ نے کہا: ”لَمَّا كَانَتْ أَمِيْنَةً كَانَتْ ثَمِيْنَةً، وَلَمَّا خَانَتْ هَانَتْ“ یعنی جب تک وہ ہاتھ امین تھا قیمتی تھا، جب اُس نے خیانت کی خوار ہوگیا۔ بعض نے کہا کہ یہ سب گناہ کرنے کے بارے میں شریعتِ عظیمہ کی حکمت و مصلحت اور اسرار ہیں۔ یہی مناسب ہے کہ جس مقدار پر ہاتھ کاٹا جائے، وہ ربع دینار ہو، تاکہ لوگ مال چرانے میں جلدی نہ کریں۔ یہ حکم تو اہلِ عقل کے نزدیک عین حکمت ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ ان کی سزا اللہ عزوجل کی طرف سے کمائی کی تنبیہ ہے۔ پھر فرمایا کہ جو کوئی چوری کے بعد توبہ کرے گا اور اللہ کی طرف رجوع کرے گا تو اللہ اس کی توبہ اپنے اور اس کے درمیان قبول فرمائے گا۔ رہے لوگوں کے مال تو جمہور کے نزدیک ان کا لوٹانا یا بدلہ دینا ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب ہاتھ کٹ چکا تو مال اس کے ہاتھ میں ضائع ہو چکا تو اب اس کا بدل نہ ہوگا۔[1]

چوری کی توبہ اور اس پر حد:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک چور کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، اُس نے ایک شملہ چرایا تھا۔ فرمایا: میں نہیں خیال کرتا ہوں کہ اس نے چرایا ہو۔ چور نے کہا: ہاں اے اللہ کے رسول! میں نے چرایا ہے۔ فرمایا: اس کو لے جاؤ، ہاتھ کاٹ دو، داغ دو، پھر میرے پاس لاؤ۔ غرضیکہ ہاتھ کاٹ کر لائے۔ فرمایا: اللہ سے توبہ کر۔ اُس نے کہا: میں نے اللہ کی طرف توبہ کی، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیری توبہ قبول کی۔[2] (رواہ الدارقطني) یہ حدیث مرسلاً بھی مروی ہے۔ علی بن مدینی اور ابن خزیمہ رحمہما اللہ نے ارسال کو قابلِ ترجیح کہا ہے۔

سیدنا عمر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے فلاں کا ایک اونٹ چرایا ہے، مجھے پاک کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا، انھوں نے کہا: ہمارا ایک اونٹ گم ہوگیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹو، وہ کہتا تھا: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ طَهَّرَنِيْ مِنْكِ أَرَدْتِّ أَنْ تُدْخِلَ

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۷۔ ۷۹)

[2] سنن الدارقطني (۳/ ۱۰۲۔ ۱۰۳) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغلیل (۸/ ۱۲۰)

جَسَدِي النَّارَ"[1] (رواہ ابن ماجہ) "تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جس نے مجھے تجھ سے پاک کر دیا (اے ہاتھ!) تو نے چاہا تھا کہ میرے جسم کو آگ میں داخل کر دے۔"

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک عورت نے زیور چرایا، جن کا وہ زیور تھا، وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! اُس عورت نے ہماری چوری کی ہے۔ فرمایا: اس کا دایاں ہاتھ کاٹو، اس نے کہا: کیا توبہ بھی ہے؟ فرمایا: آج کے دن تو اپنی خطا سے ایسی ہے، جیسے آج تجھے تیری ماں نے جنا ہو، اُس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری: ﴿ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ ... الخ﴾ (آیتِ باب) امام احمد رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ ذکر کیا ہے کہ اُس عورت کی قوم نے کہا کہ ہم فدیہ دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بلکہ ہاتھ کاٹو۔[2]

یہ عورت وہی مخزومیہ ہے، جس کے بارے میں صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ قریش کو نبی اکرم ﷺ کے عہد میں غزوۂ فتح میں اپنی ایک چور عورت کی حالت نے غمگین کیا۔ کہنے لگے کہ کون نبی اکرم ﷺ سے اس بارے میں گفتگو کرے۔ کس کو ان سے ایسی بات کرنے کی جرأت ہے سوائے حِبّ رسول ﷺ سیدنا اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے؟ جب اُس کو نبی اکرم ﷺ کے پاس لائے، اُسامہ رضی اللہ عنہ نے گفتگو کی تو چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، فرمایا: «أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ» "کیا تو اللہ کی حدوں میں سے ایک کے بارے میں سفارش کر رہا ہے؟" اُسامہ نے کہا: "اِسْتَغْفِرْ لِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" "اے اللہ کے رسول! آپ میرے لیے اللہ سے معافی طلب کریں۔"

جب تیسرا پہر ہوا تو آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ پڑھا۔ اللہ کی وہ حمد و ثنا کی جس کے وہ لائق تھا۔ پھر فرمایا: اَما بعد، جو لوگ تم سے پہلے تھے، وہ ہلاک نہ ہوئے مگر اسی سبب سے کہ جب اُن میں کوئی شریف (معزز آدمی) چوری کرتا، اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی ضعیف چور آتا تو اس پر حد قائم کرتے، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا محمد کی بیٹی چوری کرے تو میں اُس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں، پھر اس عورت کے لیے حکم دیا، اُس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ اس کے بعد اُس کی توبہ اچھی ہوئی اور اس نے نکاح کیا، وہ میرے پاس آتی تھی، میں اس کی حاجت نبی اکرم ﷺ تک پہنچا دیتی۔ (هذا لفظ مسلم)

صحیح مسلم کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مخزومیہ عورت کوئی چیز عاریتاً لے کر مکر جاتی، نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ اُس کا ہاتھ کاٹو۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مخزومیہ عورت ہمسایوں کے نام

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۵۸۸) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (۲/ ۱۷۷) تفسير الطبري (۱۰/ ۲۹۹) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱٦۸۸)

سے لوگوں سے چیز عاریتاً لے کر منکر ہو جاتی۔ نبی اکرم ﷺ نے اُس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔[1] (رواه أحمد و أبو داود والنسائي وهذا لفظه)

اس روایت کے دوسرے الفاظ یوں ہیں کہ ایک عورت لوگوں کا زیور مستعار لے کر رکھ چھوڑتی تھی، نبی اکرم ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اُٹھ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کاٹ ڈال۔[2] معلوم ہوا کہ عاریت لی ہوئی چیز کو واپس کرنے سے انکار کرنے پر چوری کی طرح حد لگائی جائے گی۔ چوری کے احکام کے بارے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں، جو کتاب الاحکام میں مذکور ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ ہم زمین و آسمان کے مالک ہیں، کوئی ہمارے حکم کو ٹال نہیں سکتا، ہم جو چاہیں سو کریں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کا بیان کیا، جو لوگوں کا مال کھلم کھلا لیتا ہے، یعنی محارب۔ پھر اس کا ذکر کیا، جو خفیہ طور پر لیتا ہے، یعنی سارق۔ سارقہ کا ذکر سارق کے ساتھ زیادتِ بیان کے لیے فرمایا۔ ورنہ قرآنِ مجید میں اکثر اقتصار سے کام لیا گیا ہے اور احکام کے سلسلے میں صرف مردوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سرقہ چوری کی چیز کو کہتے ہیں، مصدر سرق ہے، یعنی کسی چیز کا خفیہ طریقے سے آنکھ بچا کر لینا۔ قطع کے معنی ہیں: جدا کرنا، زائل کرنا۔ یہاں پہلے سارق (مرد) کا نام لیا۔ آیتِ زنا میں پہلے زانیہ (عورت) کا نام لیا تھا، اس لیے کہ مرد چوری کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں اور عورت زنا کی طرف زیادہ رجحان رکھتی ہے۔

ہاتھ کاٹنے کی جگہ:

"أَيْدِيَ" سے مراد دایاں ہاتھ ہے، یعنی پہنچے (کلائی) سے اُسے کاٹ ڈالیں۔ جمہور اہلِ لغت کے نزدیک انگلی کے سرے سے لے کر پہنچے (کلائی) تک کاٹنا چاہیے۔ سنتِ مطہرہ میں کاٹنے کی جگہ رُسغ (کلائی) آئی ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ کہنی سے کاٹیں۔ خوارج نے کہا ہے کہ منکب (کندھے) سے کاٹیں۔ سرقہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ چوتھائی دینار ہو اور محفوظ ہو۔ احادیثِ صحیحہ میں یوں ہی مروی ہے۔ جمہور بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب گھر کے کپڑے لتے جمع کیے تو ہاتھ کاٹا جائے۔[3] ائمہ فقہ اور حدیث کی تشریح کرنے والوں نے سرقہ کے باب میں بہت لمبی بحث کی ہے، جس میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہے۔

---

[1] مسند أحمد (٢/ ١٥١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٨٧) یہ روایت صحیح ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٩٠)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٨٩) اس کی سند صحیح ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٩٠)

[3] تفسير القرطبي (٦/ ١٦٢)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم ان کے لیے نہ گڑھو۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے دیا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ فاسقوں پر سختی کرو، ان کے پاؤں الگ الگ کر ڈالو۔[1] آخر اس آیت میں جس میں توبہ اور غفرانِ الٰہی کا ذکر ہے عطا اور ایک جماعت نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ہاتھ کاٹنے سے توبہ ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ جملہ شرطیہ مفید مجرد قبول توبہ ہے۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ توبہ کرنے والے کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔ زمانۂ نبوت میں وہ لوگ جن پر حد واجب ہوتی تھی، تائب ہو کر آتے تھے اور اپنی تطہیر حد سے چاہتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو حد لگاتے تھے۔

سنتِ مطہرہ میں اس پر دلیل ہے کہ حدود جب ائمہ تک پہنچ جائیں تو واجب ہو جاتے ہیں۔ ان کا ساقط کرنا ممنوع ہوتا ہے اور اگر پہنچنے سے پہلے معاف کر دیا ہے تو ہاتھ کاٹنا ساقط ہو جاتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی بات پر ہیں۔ ﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ ﴾ کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، مراد سب لوگ ہیں یا ہر ہر فرد کو ہے۔ سزا دینے کو معاف کر دینے پر اس لیے مقدم کیا ہے کہ یہ سرقے کے مقابلے میں ہے، جو توبہ پر مقدم ہے۔ یہ آیت قدریہ معتزلہ کی بدنامی کرتی ہے، کیوں کہ وہ مطیع کے لیے وجوبِ رحمت کے اور گناہگار کے لیے وجوبِ عذاب کے قائل ہیں۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ سزا اور رحمت دونوں اللہ کی مشیت پر منحصر ہیں اور وجوب اللہ کے اختیار کے منافی ہے۔[2]

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ
قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ
سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ
هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ
فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ
اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖۚ وَّلَهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ
لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ
تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ
بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ

[1] الدر المنثور (۳/ ۷۳) [2] فتح البیان (۳/ ۴۱۶۔ ۴۱۸)

وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا
هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا
وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا
عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا
بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

اے رسول! آپ ان لوگوں کا غم نہ کھائیں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے کچھ تو وہ ہیں جو اپنے منہ سے یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالاں کہ ان کے دل ایمان نہیں لاتے، اور کچھ ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے، وہ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں اور دوسری قوم کی جاسوسی کرنے والے ہیں جو (ابھی اطاعت کے لیے) آپ کے پاس نہیں آئی۔ وہ کلمات کا موقع ومحل ثابت ہونے کے بعد اسے بدل دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر تمھیں یہ حکم دیا جائے تو قبول کرلو اور اگر یہ حکم نہ دیا جائے تو ان سے الگ تھلگ ہو جاؤ۔ اور جسے اللہ فتنے میں ڈالنا چاہے تو آپ اللہ کی طرف سے اس کے بارے میں قطعاً کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے (41) وہ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں اور جی بھر کر حرام کھانے والے ہیں۔ پھر اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ (کو اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں یا ان سے اعراض کریں اور اگر آپ ان سے منہ موڑ لیں گے تو بھی وہ آپ کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور اگر آپ ان کے درمیان کوئی فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (42) اور وہ کیسے آپ سے فیصلے کرواتے ہیں جب کہ ان کے پاس تورات (موجود) ہے جس میں اللہ کا حکم ہے، پھر وہ اس (حکم) سے منہ موڑتے ہیں اور وہ ایمان لانے والے نہیں (43) بے شک ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے ذریعے سے فیصلے کرتے تھے انبیا جو اللہ کی اطاعت کرنے والے تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی تھے اور اللہ والے اور علما فیصلے کرتے تھے، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے نگران بنائے گئے تھے اور وہ اس پر گواہ تھے، چناں چہ تم لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اور میری آیتیں تھوڑی قیمت پر نہ بیچو اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں (44)

یہود و منافقین کے رویوں پر پریشان ہونے کا حکم:

بعض منافق تھے کہ دل میں یہود سے ملتے تھے اور بعض یہود تھے کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ جاسوسی کو آتے ہیں کہ تمھارے دین میں کچھ عیب چن کر لے جائیں، اپنے سرداروں کے پاس جو یہاں نہیں آتے اور فی الحقیقت عیب کہاں ہے؟! لیکن بات کو غلط بیان کر کے اچھی بات کو عیب بنا دیتے ہیں۔ یہود میں کئی قصے ہوئے کہ اپنے معاملات میں نبی کریم ﷺ سے فیصلہ کرانے کے لیے لاتے۔ یہودیوں کے سردار خود نہ آتے، بیچ والوں کے ہاتھ بھیجتے اور کہہ دیتے کہ ہمارے معمول کے مطابق فیصلہ کریں تو قبول کر لو نہیں تو نہ کرو۔ غرض یہ تھی کہ جو معمولات تورات کے حکم کے خلاف اختیار کر رکھے تھے، اگر ایک نبی اس کے مطابق حکم کر دے تو ہم کو اللہ کے ہاں سند ہو جائے اور جانتے تھے کہ ان کو تورات کی خبر نہیں، جو ہمارا معمول سنیں گے، اسی کے مطابق فیصلہ کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو خبردار کیا، تورات ہی کے مطابق حکم فرمایا، تورات سے ثابت کر کے ان کو قائل کیا۔ ایک رجم کا قصہ تھا کہ وہ اس سے منکر ہوئے تھے، پھر تورات سے قائل کیا۔ ایک قصاص کا تھا کہ وہ شرفا اور کم ذات کا فرق کرتے تھے، تورات میں اس قسم کا فرق نہیں تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے دل میں تردد تھا کہ ان کے مقدمے میں نہ بولوں تو یہ ناخوش ہوں گے اور اگر اپنے دین پر فیصلہ کروں تو قبول نہیں کریں گے اور اگر ان کا معمول جاری رکھوں تو اللہ کے نزدیک غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اختیار ہے یا تغافل کرو تو ان کی ناخوشی کا خطرہ نہیں یا حکم کرو تو اپنے دین کے مطابق کرو۔

یہود کے رجم کا حکم چھپانے کی کوشش:

پھر نبی اکرم ﷺ نے ان کو قائل کر کے وہی حکم فرمایا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیتیں ان کے حق میں اُتری ہیں، جو کفر میں جانے کی جلدی کرتے ہیں، اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے خارج ہوتے ہیں، اپنی رائے اور خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی شریعتوں پر مقدم رکھتے ہیں۔ منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، مگر ان کے دل ایمان نہیں لائے۔ وہ بالکل خراب اور ایمان سے خالی ہیں، یہ لوگ منافق ہیں۔ پھر یہود میں سے اسلام اور اہلِ اسلام کے دشمن ہیں، وہ سب جھوٹی باتیں سن کر قبول کرتے ہیں، جو لوگ نبی اکرم ﷺ کے پاس نہیں آتے، اُن کو یہ وہ باتیں لے جا کر سناتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ کلام کو بے ٹھکانے کر کے اس کا کچھ اور ہی مطلب نکال لیتے ہیں۔ تحریف کی یہ کارروائی جانتے بوجھتے کرتے ہیں۔

بعض نے کہا کہ یہ آیت یہود کی ایک قوم کے حق میں اُتری ہے، ایک آدمی کو انھوں نے مار ڈالا تھا، پھر کہا کہ چلو نبی اکرم ﷺ سے اس کا فیصلہ کرائیں۔ اگر وہ دیت کا فیصلہ کریں تو مان لو اور اگر قصاص کا حکم دیں تو مت سنو۔

صحیح یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ کا نزول دو یہودیوں کے حق میں ہوا ہے، جنھوں نے زنا کیا تھا، یہود نے اللہ کی کتاب تورات کو جو ان کے پاس تھی اور جس میں زانی محصن کے بارے میں رجم کا حکم موجود تھا، بدل ڈالا تھا۔ آپس میں یہ صلح کر لی تھی کہ سو کوڑے ماریں، منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کریں، منہ دُم کی طرف کر دیں۔

جب یہ واقعہ ہجرت کے بعد ہوا، آپس میں کہا کہ چلو نبی اکرم ﷺ سے فیصلہ کرائیں، اگر کوڑے مارنے اور منہ کالا کرنے کا حکم دیں تو تم مان لو اور اس فیصلے کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت ٹھہراؤ، کیوں کہ ایک نبی نے ایسا حکم دیا ہے۔ اور اگر دوسرا حکم دیں تو نہ مانو۔[1] اس بارے میں حدیثیں مروی ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہود نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ ان میں سے ایک مرد اور عورت نے حرام کام کیا ہے۔ فرمایا: تم تورات میں رجم کے بارے میں کیا لکھا ہوا پاتے ہو؟ کہا: ہم ان کو فضیحت (رسوا) کرتے ہیں، کوڑے مارتے ہیں۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم جھوٹے ہو، تورات میں رجم ہے، بھلا تورات کو تو لاؤ، وہ لائے، اس کو کھولا، ان میں سے ایک شخص نے آیتِ رجم پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، جو کچھ اس سے پہلے اور بعد میں تھا، اس کو پڑھا۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاتھ اُٹھا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھایا تو آیتِ رجم نکلی، کہنے لگے کہ محمد ﷺ سچے ہیں، تورات میں آیتِ رجم موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ رجم کرو، وہ دونوں رجم کیے گئے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے مرد کو دیکھا کہ وہ عورت پر جھکتا تھا، اس کو پتھر سے بچاتا تھا۔[2] (أخرجاه وهذا لفظ البخاري)

ایک روایت میں یوں مروی ہے کہ یہود سے کہا کہ تم کیا کرتے ہو، یعنی زانی اور زانیہ کے ساتھ؟ کہا: ہم منہ کالا کر کے مارتے ہیں۔ فرمایا: تورات لاؤ، اگر تم سچے ہو، وہ لائے اور ایک شخص اعور سے، جو ان کی پسند کا تھا، کہا: پڑھ، اُس نے پڑھا، جب ایک جگہ پر پہنچا، وہاں ہاتھ رکھ دیا، فرمایا: ہاتھ اُٹھا، ہاتھ اُٹھایا تو اس کے نیچے آیتِ رجم ظاہر ہوئی۔ کہنے لگے: اے محمد (ﷺ)! اس میں آیتِ رجم ہے، لیکن ہم اس کو آپس میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا، ان دونوں کو رجم کیا گیا۔[3]

صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک یہودی اور یہودیہ لائے گئے، ان دونوں نے زنا کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ یہود کے پاس گئے، کہا: تم تورات میں زانی کے لیے کیا سزا پاتے ہو؟ کہا: منہ کالا کر کے پھراتے ہیں۔ فرمایا: تورات لا کر پڑھو، اگر تم سچے ہو۔ لائے، پڑھا، جب آیتِ رجم پر گزر رہا تو پڑھنے والے نے اپنا ہاتھ اس پر رکھ دیا اور ہاتھ کے اِدھر اُدھر سے پڑھا۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ حکم دیں کہ یہ اپنا ہاتھ اٹھالے۔ اُٹھایا تو اس کے نیچے آیتِ رجم تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا، وہ دونوں رجم کیے گئے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں بھی ان کے رجم میں شریک تھا، میں نے مرد کو دیکھا کہ وہ اس عورت کو اپنی جان سامنے کر کے پتھر سے بچاتا تھا۔[4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٨١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١٠٤) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٩)

اس بارے میں بہت احادیث متعدد الفاظ وطرق سے مسند احمد وسنن میں آئی ہیں۔ یہ سب حدیثیں اس بات پر دلیل ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اس مقدمے میں تورات کے مطابق حکم دیا ہے، یہ کچھ اس لیے نہیں تھا کہ ان کے اعتقاد کے مطابق فیصلہ کیا جائے، کیوں کہ وہ شرع محمدی کے اتباع کے لیے مامور ہیں۔لیکن یہ حکم نبی کریم ﷺ نے خاص وحیِ الٰہی سے کیا تھا، جو اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی تھی۔ نبی کریم ﷺ کا ان سے پوچھنا، اس لیے نہ تھا کہ وہ ان کے عمل کو مقرر رہنے دیتے، یعنی تورات میں حکمِ الٰہی کو چھپانے کے عمل کو جاری رہنے دیتے، جس پر وہ سب باہم رضا مند تھے اور ایک زمانۂ دراز سے اُس حکم پر عمل ترک کر رکھا تھا۔ سو انھیں اس کتمان اور اخفا پر رہنے دیا ہو، بلکہ جب انھوں نے اس کا اقرار کیا اور ان کا عمل اُس کے خلاف ہوا تو ان کے دلوں کی کجی وعناد اور جھوٹ ظاہر ہوگیا اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو کتاب ان کے ہاتھ میں تھی اور اُس کو سچا سمجھتے تھے، وہ اسی کو جھٹلانے والے نکلے۔ ان کا نبی اکرم ﷺ سے فیصلہ کرانے کی خاطر عدول کرنا اپنی ہوائے نفس اور خواہشات کی پیروی کے طور سے تھا، تاکہ نبی اکرم ﷺ کا حکم ان کی رائے کے موافق پڑ جائے نہ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے حکم کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔

اسی لیے انھوں نے یہ بات کہی کہ اگر کوڑے مارنے اور تحمیم (منہ کالا کرنے) کا حکم دیں تو تم مان لو اور اگر نہ دیں تو تم ان کے حکم کو قبول کرنے اور ماننے سے بچو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کذب، یعنی باطل کو خوب سنتے ہیں۔ سُحت، یعنی مالِ حرام کو خوب پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سُحت سے مراد رشوت ہے،[1] یعنی جس کا یہ حال اور وصف ہو، بھلا اس کے دل کو اللہ تعالیٰ کیوں کر پاک کرے گا؟ اُس کی دعا کس طرح قبول ہوگی؟ پھر نبی مکرم ﷺ کو فرمایا کہ اگر تم ان کا فیصلہ نہ کرو گے تو تم پر کچھ الزام نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کا تم سے فیصلہ کرانے کا یہ مقصد نہیں کہ وہ اتباعِ حق کریں، بلکہ یہ ہے کہ تمھارا حکم ان کی رائے کے موافق پڑے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ، سدی، زید بن اسلم، عطا خراسانی، حسن رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے منسوخ ہے: ﴿وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ﴾[2] (آیتِ باب) قسط سے مراد حق وعدل ہے، اگرچہ وہ لوگ ظالم اور عدل کے راستے سے دور ہٹے ہوئے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو چاہتا ہے۔ پھر اللہ نے ان آرائے فاسدہ اور ٹیڑھے مقاصد، کہ جس کتاب کو سچا جانتے ہیں، اس کو چھوڑ کر جس بات کو حقیقتاً باطل خیال کرتے ہیں، اس پر عامل ہیں، پھر انکار کر کے یہ فرمایا کہ وہ کیوں کر تم سے فیصلہ چاہتے ہیں، حالاں کہ ان کے پاس تورات موجود ہے، اس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے، وہ اس حکم سے پھر گئے ہیں۔ اُن کو مومن نہ کہو۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۰/ ۳۱۹) [2] تفسیر الطبري (۱۰/ ۳۳۰۔ ۳۳۲) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۸٤)

یہود کی مذمت اور تورات کی تعریف:

پھر اللہ تعالیٰ نے توارت کی تعریف کی کہ دیکھو، جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، وہ اسی کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں، وہ اس میں تبدیلی اور تحریف کو جائز نہیں سمجھتے۔ یہی حال عام بندوں اور علما کا ہے کہ وہ کتاب کے احکام کو ظاہر کرتے ہیں، اس پر عامل ہیں، تم لوگوں سے کیوں ڈرتے ہو، ڈرو تو مجھ سے ڈرو۔ میری آیتوں کو تھوڑے داموں پر نہ بیچو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جو کوئی کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا، وہ کافر ہے۔

ایک دوسرا شانِ نزول:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیات یہود کے دو گروہوں کے حق میں اُتری ہیں۔ ایک دوسرے پر غالب ہوا۔ جاہلیت میں یہ صلاح ٹھہری کہ جس کو طائفۂ عزیزہ نے قتل کیا ہے، اس کی دیت پچاس وسق ہے اور جس کو طائفۂ ذلیلہ نے قتل کیا ہے، اس کی دیت ایک سو وسق ہے۔ وہ اسی دستور پر قائم تھے، یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں آئے، ذلیلہ نے عزیزہ کا ایک آدمی مار ڈالا، عزیزہ نے کہا کہ ایک سو وسق دیت دو۔ ذلیلہ نے کہا کہ دونوں قبیلوں کا دین ایک، نسب ایک اور شہر ایک ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ بعض کی دیت نصف ہے؟! ہم نے وہ دیت تمھارے ظلم کے سبب سے دی تھی تم سے ڈر کر۔ اب جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے ہیں تو ہم تم کو نہ دیں گے، قریب تھا کہ باہم جنگ ہو پڑے۔ پھر یہ بات ٹھہری کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچ میں ڈالیں۔

عزیزہ نے کہا کہ واللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز تم کو اس دیت سے جو ہم تمھیں دلواتے ہیں، دوگنا دیت نہیں دلوائیں گے اور ذلیلہ سچے ہیں کہ انھوں نے ہم کو ہمارے ظلم اور قہر کی وجہ سے اتنی دیت دی ہے۔ تم چپکے سے کسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجو کہ وہ خبر لائے کہ ان کی کیا رائے ہے۔ اگر تم کو تمھارے دستور کے مطابق دیں تو لو، ورنہ بچو اور اُن کو منصف نہ بناؤ۔ کچھ منافق لوگ خبر لانے کے لیے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبردار کر دیا اور آیاتِ باب ﴿إِلٰى قوله اَلْفٰسِقُوْنَ﴾ اتاریں۔ اس سببِ نزول کو امام احمد اور ابو داود رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ آیتیں بنونضیر اور بنو قریظہ کے بارے میں آئی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی دیت برابر کر دی۔[2]

روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ بنونضیر بنو قریظہ سے اشرف ہے۔[3] چوتھے الفاظ یہ ہیں کہ یہود کے دو

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٤٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٧٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٥٥٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٣٣) مستدرك الحاكم (٤/ ٤٠٧) تفسير الطبري (١٠/ ٣٢٧) اس کی سند حسن ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٩٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٣٢) مستدرك الحاكم (٤/ ٤٠٧) تفسير الطبري (١٠/ ٣٢٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

زانیوں کے بارے میں اُتری ہیں،[1] جس طرح اوپر گزر چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں سبب ایک وقت میں مجتمع ہو گئے ہوں اور آیات دونوں وجہ سے آئیں۔ واللہ أعلم. اس لیے اس کے بعد یوں فرمایا: ﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ [المائدة: ٤٥]

''اور ہم نے تورات میں ان کے لیے لکھ دیا تھا کہ بے شک جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا قصا ہے، پھر جو شخص اسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں۔''

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی جس نے عمداً اس کے ساتھ فیصلہ نہ کیا، جو ہم نے اُتارا ہے یا دیدہ دانستہ جان بوجھ کر ظلم کیا، وہ کافرین میں سے ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس نے ﴿ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ کا انکار کیا، وہ کافر ہوا اور جس نے اقرار کیا، مگر اس کے مطابق حکم نہ کیا، وہ ظالم و فاسق ہے۔[3] (رواہ ابن جریر)

امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ اس آیت سے مراد اہلِ کتاب ہیں یا وہ جو اللہ کی کتاب میں دیے گئے حکم کا انکار کرتا ہے۔[4] امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے لیے ہے، یعنی ﴿ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ اور ﴿ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ یہود کے حق میں ہے اور ﴿ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ نصاریٰ کے حق میں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ''﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ ... الخ ﴾ هِيَ بِهٖ كُفْرٌ''. ابن طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ویسا کفر نہیں ہے، جیسے کوئی اللہ و ملائکہ و کتب و رسل کا منکر ہو۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''كُفْرٌ دُوْنَ كُفْرٍ، وَظُلْمٌ دُوْنَ ظُلْمٍ، وَفِسْقٌ دُوْنَ فِسْقٍ'' (رواہ ابن جریر) ''کفر کے علاوہ کفر ہے، ظلم کے علاوہ ظلم ہے اور فسق کے علاوہ فسق ہے۔'' امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''لَيْسَ بِكُفْرٍ يُّنْقِلُ عَنِ الْمِلَّةِ'' ''ایسا کفر نہیں ہے، جو ملت سے خارج کر دے۔''[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''لَيْسَ بِالْكُفْرِ الَّذِيْ تَذْهَبُوْنَ إِلَيْهِ'' ''یہ وہ کفر نہیں، جس طرف تمھارا خیال جاتا ہے۔''[6] یہ اقوال اس بات پر محمول ہیں کہ حکم کو تو اقرار ہے انکار نہیں، مگر عمل کی توفیق ندارد۔ اور اگر سرے سے حکم ہی کا انکار ہے تو پھر کفر میں کیا تامل اور ایمان سے کیا سروکار، پھر تو منزل من اللہ سے علاوہ حکم کرنا کبھی کفر ہوتا ہے کبھی ظلم اور کبھی فسق۔ جیسا معاملہ ہو یا شرع میں جو اس کا درجہ ہو، ویسا لقب ملے گا۔ واللہ أعلم. یہ

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٣١٥) اس کی سند حسن ہے۔ البتہ یہی الفاظ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکے ہیں۔
[2] تفسیر الطبري (١٠/ ٣٥٧) [3] تفسیر الطبري (١٠/ ٣٥٧) اس کی سند حسن ہے۔ [4] تفسیر الطبري (١٠/ ٣٥٨)
[5] تفسیر الطبري (١٠/ ٣٥٤۔ ٣٥٦) [6] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٢) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

آیت ان اصحابِ رائے اور اہلِ رائے کے لیے، جن کو کتاب وسنت کے احکام کا علم حاصل ہے یا دوسروں نے ان کو ان احکام کے متعلق مطلع کر دیا ہے، ایک تازیانۂ پوست کند ہے، اگر وہ آیت کے مفہوم پر ذرا بھی غور کریں اور منطوقِ قرآن پاک کو اپنے گلے اُتاریں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ﴾ کا خطاب بزرگی، عزت اور تعظیم کے لیے ہے۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ﴾ کا خطاب بہت جگہ آیا ہے۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ﴾ کا خطاب دو جگہ ہے، ان میں ایک جگہ یہی ہے۔ منہ کے مسلمانوں سے، جن کا دل ایمان نہیں لایا ہے، مراد منافق ہیں۔ یہود کے دو وصف بیان کیے: ایک یہ کہ اپنے علما سے جھوٹ سن کر عوام سے نقل کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ سے حق بات سن کر اپنے علما سے جا کر کہہ دیتے ہیں، تاکہ وہ اس کو تحریف کر ڈالیں۔ اکثر علما کے نزدیک اہلِ کتاب نے تحریف لفظی و معنوی دونوں کی ہیں۔ اسی لیے بعض اہلِ علم نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ تورات اور انجیل میں شغل رکھنا اور ان کا دیکھنا اور لکھنا جائز نہیں ہے۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تورات کی ایک کتاب عربی میں لکھی۔ پھر نبی اکرم ﷺ کے پاس لاکر پڑھنے لگے، آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک متغیر ہوگیا۔ ایک انصاری نے کہا: اے ابن خطاب! تو نبی اکرم ﷺ کے چہرے کو نہیں دیکھتا؟! نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم اہلِ کتاب سے کوئی چیز نہ پوچھو، وہ تم کو ہدایت نہیں کریں گے، وہ تو خود گمراہ ہیں اور تم یا تو حق کو جھٹلاؤ گے یا باطل کی تصدیق کرو گے، واللہ! اگر موسیٰ علیہ السلام تمھارے درمیان موجود ہوتے تو انھیں درست نہ ہوتا، مگر میری اتباع کرنا۔[1] (رواه أحمد والبزار واللفظ له)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ کراہتِ تنزیہ ہے نہ کہ تحریم۔ اس مسئلے میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ راسخ فی العلم اگر ضرورت کے وقت اس کی تردید کے لیے تورات وغیرہ دیکھے تو جائز ہے۔ غیر راسخ کا دیکھنا جائز نہیں ہے۔ ائمہ نے قدیماً و حدیثاً تورات اور انجیل سے نقل کیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی تصدیق ان کتابوں سے نکال کر بتائی ہے، وہ اسی غرض کے لیے ہے۔ نبی کریم ﷺ کے غضب فرمانے سے تحریم پر دلیل اس لیے نہیں ہوسکتی کہ کبھی کسی مکروہ فعل پر بھی آپ غصہ فرماتے تھے، جس طرح سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ پر نماز میں لمبی قراءت کرنے پر غصہ کیا۔[2]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کا پاک کرنا نہ چاہا، اس پر دلیل ہے کہ اللہ نے کافر کے مسلمان ہونے کا ارادہ نہ کیا اور اس کے دل کو شک وشرک سے پاک نہ فرمایا، اگر ایسا کرتا تو وہ ایمان لے آتا۔ یہ آیت قدریہ

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٣٣٨) کشف الأستار عن زوائد البزار (١/ ٧٨۔ ٧٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٣٤)

[2] فتح الباري (١٣/ ٥٢٥۔ ٥٢٦)

پر نہایت سخت اور دشوار ہے۔ سُحت سے مراد مالِ حرام ہے، اُس میں رشوت بھی بدخول اولیٰ داخل ہے۔ سُحت کی تفسیر خاص طور پر حرام کرنے کی ضرورت نہیں، جس طرح ایک جماعت اہلِ علم نے کی ہے۔ اس کی تفسیر عمومیت کے ساتھ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَعَنَ اللّٰهُ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ فِي الْحُكْمِ»[1] ''اللہ تعالیٰ نے فیصلے میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی۔'' (أخرجه الترمذي)

﴿ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا ﴾ (آیتِ باب) میں اس بات پر دلیل ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیا موصوف بہ یہودیت ونصرانیت نہ تھے، بلکہ مسلمان تھے۔ مراد وہ انبیا ہیں، جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے۔ معلوم ہوا کہ پہلی شریعت ہمارے لیے بھی شرع ہے، جب تک کہ منسوخ نہ ہو یا نبیین سے مراد ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جمع کا لفظ تعظیم کے لیے ہے، مگر پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

﴿ الرَّبّٰنِيُّوْنَ ﴾ سے اولادِ ہارون علیہ السلام کے وہ علما وحکما مراد ہیں جو طریقۂ انبیا کو لازم پکڑے ہوئے تھے۔ دینِ یہود سے الگ تھلگ تھے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد فقہا ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ احبار سے اوپر ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ وہ پرہیزگار اور زاہد لوگ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مومنین ہیں اور احبار قراء ہیں۔[3] انبیا نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ تورات کو تغییر وتبدیل سے محفوظ رکھیں، گویا وہ انبیا کے خلفا ونواب تھے (نائب)۔

جملہ ﴿ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ ﴾ میں حرفِ ﴿ مَنْ ﴾ میں صیغۂ عموم ہے، یہ اس بات کو مفید ہے کہ یہ حکم کسی معین گروہ کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ ہر والیِ حکم کو شامل ہے اور یہی زیادہ مناسب بھی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت مطلقاً کفار کے حق میں ہے، اس لیے کہ مسلمان گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ تینوں آیتیں عام ہیں۔[4] یہود میں اور اس امت میں جو کوئی رشوت لے کر اللہ کے حکم کے بغیر فیصلہ کرے گا وہ کافر، ظالم اور فاسق ہوجائے گا۔ یہی زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔

ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیتیں اس پر محمول ہیں کہ منزل من اللہ کے بغیر کسی کے حق میں کمی کی جائے، کسی کے لیے کچھ حلال کیا جائے یا کسی کو حق دینے سے انکار کیا جائے۔ کفر کا ذکر اس جگہ مناسب ہے، کیوں کہ وہ ﴿ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ [البقرة: ٤١] ''اور تم میری آیتوں کو تھوڑی قیمت میں نہ بیچو۔'' کے بعد آیا ہے اور یہ کفر ہے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ان آیتوں کا ذکر آیا۔ ایک آدمی نے کہا کہ یہ بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''نِعْمَ الْإِخْوَةُ لَكُمْ بَنُوْ إِسْرَآئِيْلَ، إِنْ كَانَ لَكُمْ كُلُّ حُلْوَةٍ، وَلَهُمْ كُلُّ مُرَّةٍ وَاللّٰهِ!

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٣٦) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٢٦١) [2] تفسير الطبري (١٠/ ٣٤٣)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٣٩۔ ١١٤٠) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٠)

لَتَسْلُكُنَّ طَرِيْقَهُمْ قِدَادَ الشِّرَاكِ[1] ''بنی اسرائیل تمھارے لیے اچھے بھائی ہیں، اگر ہر میٹھی چیز تمھارے لیے ہو اور ہر کڑوی چیز ان کے لیے ہو، واللہ! تم ان کے طریقے (راستے) پر چلو گے، یہاں تک کہ جوتے کے تسمے کے معاملے میں بھی۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی کے لگ بھگ کہا ہے۔[2] حق یہ ہے کہ گویا آیتیں بنی اسرائیل کے حق میں ہوں، لیکن انھی کے ساتھ خاص نہیں ہیں، کیوں کہ عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہوتا ہے خصوصیتِ سبب کا نہیں۔ کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ شرط کے طور پر آیا ہے، اس لیے عوام کے لیے ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا اطلاق ہر اس شخص پر ہے، جو منزل من اللہ پر فیصلہ نہیں کرتا۔

تقلید اور مولویوں کی مذمت:

﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد کتاب وسنت ہے۔ مقلد یہ دعویٰ نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے کہ اُس نے ﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ کے مطابق حکم دیا ہے، بلکہ وہ اس بات کا اقراری ہے کہ میں نے فلاں امام یا عالم کے قول کے مطابق حکم دیا ہے۔ اُس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ حکم صرف رائے کا ہے یا کسی دلیل کا۔ پھر یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ استدلال صحیح ہے یا غلط، اس حکم کو کسی مضبوط دلیل سے اَخذ کیا گیا ہے یا کمزور دلیل سے۔ اب اے مسکین! تو ہی دیکھ کہ تو نے اپنی جان کے ساتھ کیا کیا۔ تیرا یہ جہل کچھ فقط تیرے ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ جہل اللہ کے بندوں پر بھی اثر انداز ہے۔

کتنے خون اس حکم نے بہا دیے، کتنی حدیں قائم کیں، کتنی حرمتیں ہتک کیں، خصوصاً جب کہ حکم دینے والے نے اس حکم کو اپنے لیے اور مسلمانوں کے لیے دین اور شریعت ٹھہرا لیا ہے کہ وہ بے شک طاغوت ہے، اگرچہ اس کو پردۂ باریک سے چھپایا ہے۔ اے مقلد! ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم کس قسم کے قاضی ہو؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یوں فرمایا ہے کہ قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک جنت میں، دو دوزخ میں، جنتی وہ ہے جس نے حق پہچانا، حق حکم دیا۔ دوسرا وہ ہے جس نے حق پہچانا مگر حکم میں ظلم کیا، وہ دوزخ میں ہے، تیسرا وہ ہے، جس نے لوگوں کو جاہلانہ حکم دیا، وہ بھی آگ میں ہے۔[3] (رواه أبو داود و ابن ماجه عن بريدة رضی اللہ عنہ)

اب تم کو قسم ہے اپنے ایمان سے کہو کہ تم نے حق حکم دیا اور تم اُس کو حق جانتے ہو، اگر کہو گے کہ ہاں تو اہلِ علم گواہی دیں گے کہ تم جھوٹے ہو، کیوں کہ تم کو خود اقرار ہے، کہ ہم عالمِ حق نہیں ہیں، اس گواہی میں مجتہد و مقلد سب برابر ہیں اور جو تم یہ کہو گے کہ ہم نے حکم موافق قولِ امام کے دیا ہے اور تمھیں معلوم نہیں کہ امام کا وہ قول حق ہے یا باطل؟ جس طرح کہ روئے زمین کے سارے مقلدین کا حال ہے تو اب تم باقرار خود ایک قاضی ٹھہرے من جملہ دو قضاۃِ نار کے۔

میں گمان کرتا ہوں کہ دو سبب سے اس امر میں کسی اہلِ فہم کو کچھ تردد نہ ہوگا: ایک یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قسم کے قاضی بتائے، ہر قاضی کا وصف بیان کیا، جس کو ہر شخص، وہ مقصر ہو یا کامل، عالم ہو یا جاہل، یکساں سمجھ بوجھ

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٣٥٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٢) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [2] الدر المنثور (٣/ ٨٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣١٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٤٤٦)

سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مقلد اس بات کا مدعی نہیں کہ وہ امام کے کلام میں حق و باطل کو جان سکے، بلکہ اس کا اقرار تو یہ ہے کہ قولِ غیر کو بغیر دلیل کے مطالبے کے قبول کرتا ہوں اور دلیل کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اُس نے ایسی چیز کا حکم دیا ہے، جس کو وہ جانتا پہچانتا نہیں۔ اگر اس کا وہ حکم حق کے مطابق پڑا تو بھی اس کو معلوم نہیں اور اگر موافق نہ پڑا تو وہ حکم بغیر حق ہوا۔ اسی قسم کے دونوں قاضی نار میں ہوں گے۔ غرضیکہ قاضی و مفتی مقلد بہر حال آگ میں داخل ہونے والے ہیں ؎

خُذَا بَطْنَ هَرْشَا أَوْ قَفَاهَا فَإِنَّمَا كِلَا جَانِبَيْ هَرْشَا لَهُنَّ طَرِيْقٌ[1]

بڑا خائب و خاسر وہی شخص ہے، جو کسی حال میں نار سے نجات نہیں پا سکتا۔ قاضی صاحب! مفتی صاحب! اللہ تعالیٰ تم کو اس ورطہ ہلاکت سے نجات دے، تم کس آفت و بلا میں پڑ گئے ہو۔ یہ عجیب عہدہ تم نے لیا ہے کہ اس نے تم کو ہر حال میں اہلِ نار میں سے ٹھہرا دیا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ. ہاں اگر توبہ کرو گے تو نجات کی اُمید ہے، تم سے تو گناہ گار اور باطل پرست باوجود بہت سے اختلافات کے اللہ کے زیادہ تر اُمیدوار ہیں اور اس سے ڈرنے والے ہیں، کیوں کہ وہ توبہ کا اور گناہوں سے رُک جانے کا عزم رکھتے ہیں اور اپنی جانوں کو اپنی تفریط (کوتاہی) پر ملامت کرتے ہیں، بخلاف ان قاضی صاحب اور مفتی صاحب کے، نمازِ پنج گانہ کے بعد خلوت میں دعائیں کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم کو اس عہدے پر ہمیشہ قائم رکھ اور زائل نہ کر، ہم اس مرتبے سے جدا نہ ہوں، کوئی ہم کو معزول نہ کر سکے۔ بلکہ اس کام کے لیے اپنے اچھے مال اور توانائیاں اپنے باطل مقام کو طول دینے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور جس کو اس کام میں دخل ہے، اس کو اپنے عہدے کو برقرار رکھنے کے لیے وہ مال دیتے ہیں۔ اس قسم کی کارروائیوں سے دنیا اور آخرت کا خسران لے لیتے ہیں۔ اس عہدے کے ذریعے سے نارِ حشر خریدتے ہیں، ایسے لوگ بہت کم ہیں جو ان اوصاف سے خارج ہوں۔[2]

اس جگہ قضا سے مراد وہ عہدہ ہے جس میں حکومت کا کام پڑتا ہے، جیسے: دیوانی، فوج داری، مال یا فتویٰ لیا جاتا ہے اور وہ فتویٰ کسی امام یا عالم یا مجتہد کا قول ہوتا ہے نہ کہ منزل من اللہ شریعت، اس میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ درجے کا حاکم سب داخل ہیں۔ ہاں وہ خدمات جن میں فیصلہ اور فتویٰ کا کام نہیں ہے، وہ اس وعید سے بچے ہوئے ہیں، مثلاً: میر امارت، میر آتش، میر باغات، میر کارخانہ جات، امرائے مصارف، مناصب وظائف مساجد و مدارس وغیرہم۔ ان کا گناہ اگر ہوتا ہے تو وہ یہی خیانت یا رشوت ستانی، غیر حکم میں یا مالک وغیرہ کی خیر خواہی نہ کرنا ہے۔ یہ امور اگرچہ کبیرہ گناہ ہیں اور بعض بعض سے سخت تر ہیں، لیکن قاضی صاحب و مفتی صاحب و نائب صاحب و صیغۂ ہائے مذکورہ کے مہتمم صاحب کے گناہوں سے کم درجے کے ہیں۔

---

[1] واديِ ہرشا کے درمیان سے نکلو یا اوپر سے، اس کے دونوں اطراف راستہ ہے۔ [2] فتح البیان (۳/ ۴۱۹۔ ۴۳۱)

گو اس کارروائی میں ظالم و فاسق ٹھہریں، مگر کفر سے بچے ہوئے ہیں، اگرچہ گناہ گار بھی کفر ہی کا قصد کرنے والے ہیں۔ خصوصاً اس وقت کہ انسان کی طبیعت یہ چاہے کہ عہدے پر دوام اور مستقل رہنے کی وجہ سے سب کی نظر میں ہوں، بلکہ عملی طور پر شرعی احکام کی حرمت کی کوئی وقعت نہ رہے۔ شعائر اللہ کی عظمت ساقط ہو جائے، دینِ حق محض لہو ولعب رہ جائے، نام کی مسلمانی ہو، دغا بازی، فریب دہی، دروغ گوئی، حرام خوری اور نفاق اختیار کرنا اوڑھنا بچھونا بن جائے۔ اللھم احفظنا۔ جس طرح آج کل اسلام کے دعوے داروں کا حال ہے۔ إِنَّا لِلّٰهِ. اس بارے میں آیاتِ بینات اور احادیثِ کریمات بہت ہیں۔ اگر کوئی بھی روکنے والی باتیں نہ ہوتیں تو فقط ایک یہی آیت اور ایک حدیث جو اوپر گزری کافی تھی۔

حاصل یہ کہ مقلد کا قاضی، حاکم، مفتی اور مہتمم ہونا صحیح نہیں ہے۔ قاضی وہ ہے جو مجتہد ہے، لوگوں کے مال کے بارے میں پرہیزگار ہے، فیصلہ کرنے میں عادل ہے، سب کے بارے میں یکساں حکم کرتا ہے۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ قضا پر حرص کرنا اور قضا کے منصب کا طلب کرنا حرام ہے، حلال نہیں۔ امام کسی ایسے شخص کو ہرگز والی نہ کرے، جو اس کا حریص و طالب ہو۔ پھر جو شخص واقعی منصبِ قضا کا اہل ہے اور اس کام کی قابلیت رکھتا ہے، وہ بھی بڑے خطرے میں پڑا ہوا ہے۔ اگر وہ صحیح فیصلہ کرتا ہے تو دو اجر اور اگر خطا کرتا ہے تو ایک اجر پائے گا، اگر اس نے فیصلے تک پہنچنے کے لیے خوب کوشش اور بحث کی ہے۔ اس پر رشوت اور اس عہدے کے سبب سے ہدیہ لینا حرام ہے۔ غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کرے۔ مدعی اور مدعا علیہ میں برابری رکھے، مگر اُس وقت کہ ایک کافر ہو۔ حکم اور فیصلے سے پہلے دونوں کی بات بہ خوبی سنے، جہاں تک ہو سکے اپنے پاس پہنچنے میں آسانی پیدا کرے، لوگوں کے آنے جانے کو نہ روکے، ہاں ضرورت کے وقت مددگار مقرر کرنا اور صلح کے لیے سفارش، استیعاب اور نصیحت کرنا قاضی اور حاکم کو جائز ہے۔

حکم فقط ظاہر میں چلتا ہے، اگر کسی کے لیے کسی شئے کا حکم دیا تو وہ درست نہیں ہے، مگر اسی وقت کہ وہ حکم درست ہو اور منزل من اللہ کے مطابق ہو۔ یہ کلام تو خاص قاضی صاحب کے بارے میں تھا۔ رہے مفتی صاحب مقلد، سو مفتی کے اوصاف اور فتویٰ دینے کی شرائط ارشاد الفحول، نیل الاوطار، اعلام الموقعین اور ذخر المحتی میں تفصیل کے ساتھ مرقوم ہیں۔ اس جگہ کلام کو طول دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ مفتی صاحب جو اہلِ سنت کو عمل بالسنّت سے روکتے ہیں اور تقلیدِ مذہب کو اپنے عہدے کی ترقی اور ماہوار تنخواہ میں اضافے کا موجب سمجھتے ہیں، ان سے ہماری گزارش اسی قدر ہے ؎

منعم مکن زعشق تو اے مفتی زماں معذور دارمت کہ تو آں را ندیدۂ

”اے زمانے کے مفتی! تو مجھے عشق و محبت سے منع نہ کر۔ اس معاملے میں مَیں تجھے معذور سمجھتا ہوں، کیوں کہ تو عشق و محبت سے ناآشنا ہے۔“

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۵

اور ہم نے تورات میں ان کے لیے لکھ دیا تھا کہ بے شک جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا قصاص ہے، پھر جو شخص اسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں (45)

یہود کے دین میں قصاص کی فرضیت:

یہ بھی یہود کو ایک جھڑکی اور ڈانٹ ہے کہ ان کے نزدیک تورات میں صریح حکم موجود ہے کہ جان کے عوض جان ہے اور وہ عمداً وعناداً اس کے خلاف حکم کرتے ہیں۔ نضری کو قرظی کے بدلے قصاص کرتے ہیں اور قرظی کا نضری کے بدلے قصاص نہیں کرتے، بلکہ دیت دیتے ہیں، جس طرح کہ محض زانی کے بارے میں حکمِ تورات کے خلاف رجم کو چھوڑ کر کوڑے مارنے اور منہ کالا کر کے تشہیر کرتے ہیں۔ اسی لیے پچھلی آیت میں ﴿ اَلْكٰفِرُوْنَ ﴾ فرمایا تھا، کیوں کہ حکم کا انکار عناداً وعمداً وقصداً کیا تھا۔

یہاں ﴿ اَلظّٰلِمُوْنَ ﴾ فرمایا، اس لیے کہ مظلوم کا ظالم سے انصاف نہ کیا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ سب میں عدل اور برابری کرو۔ سو اس حکم کے برخلاف انھوں نے ظلم اور زیادتی شروع کی، بعض بعض کو ستانے لگا۔ بہت سے اہلِ اصول اور فقہا کہتے ہیں کہ پہلی شریعت ہمارے لیے بھی شریعت ہے، جبکہ اس کو بیاناً مقرر رکھا گیا ہو اور وہ منسوخ نہ ہو چکی ہو۔ جمہور سے اسی طرح مشہور ہے، جس طرح اس کو اسفرائینی نے نصِ شافعی اور اکثر اصحاب سے بیان کیا ہے، کیوں کہ ہمارے گناہوں کے بارے میں سب ائمہ کے نزدیک حکم اسی آیت کے مطابق ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے: "هِيَ عَلَيْهِمْ وَعَلَى النَّاسِ عَامَّةً" "یہ احکام ان (یہود) پر ہیں اور عام لوگوں پر بھی ہیں۔" امام نووی رحمہ اللہ نے اس مسئلے میں تین وجوہ ذکر کیے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ابراہیمی شریعت حجت ہے نہ کسی اور کی شرع۔ پھر عدمِ حجیت کو صحیح کہا ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ کے مطابق صریح حکم یہ ہے کہ حجت ہے۔ جمہور اصحابِ شافعی نے اسی کو قابلِ ترجیح بتایا ہے۔ امام ابن الصباغ رحمہ اللہ نے کتاب شامل میں لکھا ہے کہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس آیت کی رو سے وہ حجت ہے۔[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۸۷)

مرد سے عورت کا قصاص لینا:

اس امر پر سب ائمہ نے حجت اس آیت سے لی ہے کہ عورت کے بدلے مرد قتل کیا جائے گا، اس آیت کی عمومیت کے پیشِ نظر۔ اسی طرح حدیث مرفوع میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو خط میں لکھا تھا: «إِنَّ الرَّجُلَ يُقْتَلُ بِالْمَرْأَةِ»[1] (رواہ النسائي) ''بے شک مرد عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔'' دوسری حدیث میں مروی ہے: «اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاءُ هُمْ»[2] ''مسلمانوں کے خون آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔'' یہی قول سوائے علی رضی اللہ عنہ، حسن اور عثمان بتی رحمہم اللہ کے جمہور علما کا ہے۔

اور احمد کی ایک روایت میں ہے کہ مرد عورت کے بدلے نہ مارا جائے گا، بلکہ دیت واجب ہوگی۔ ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس آیت کی عمومیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلم کافر و ذمی کے بدلے مقتول ہوگا اور آزاد غلام کے بدلے مارا جائے گا۔ جمہور ان دونوں امر میں مخالف ہیں۔ صحیحین میں سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ»[3] ''مسلم کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔''

رہا غلام، سو سلف سے اس بارے میں متعدد آثار آئے ہیں کہ وہ عبد کا قصاص آزاد سے نہ لیتے تھے اور نہ آزاد کو غلام کے بدلے قتل کرتے تھے۔ اس بارے میں احادیث بھی مروی ہیں، مگر صحیح نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے خلاف اجماع نقل کیا ہے، لیکن اُس سے ان کے قول کا باطل ہونا لازم نہیں آتا، مگر خاص دلیل کے ساتھ جو آیت کو خاص کر دے۔ ابن صباغ کے قول کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے، جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس کے مطابق ربیع انس کی پھوپھی نے ایک لڑکی کا دانت توڑ ڈالا تھا۔ قوم سے معافی چاہی، انھوں نے نہ دی۔ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، آپ ﷺ نے فرمایا: قصاص ہے۔ ان کے بھائی انس بن نضر نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا فلانہ کے دانت توڑے جائیں گے۔ فرمایا: اے انس! کتاب اللہ میں قصاص ہے۔ کہا: قسم ہے اُس کی جس نے سچ مچ آپ کو مبعوث کیا، اس کے دانت نہ توڑے جائیں گے۔ قوم راضی ہوگئی، معاف کر دیا، قصاص چھوڑ دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ» یعنی اللہ کے بندوں میں ایسے بھی ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسے پر قسم اُٹھا بیٹھیں تو اللہ ان کو سچا کر دے۔ (رواہ أحمد) یہ حدیث صحیحین میں بھی ہے۔[4]

دوسری حدیث میں اس طرح ہے کہ ربیع بنت نضر انس رضی اللہ عنہ کی پھوپھی نے ایک لڑکی کو طمانچہ مارا، اُس کے

---

[1] سنن النسائي، رقم الحدیث (٤٨٥٣) اس کی سند میں ''سلیمان بن ارقم'' ضعیف راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغلیل (٧/ ٢٦٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٧٥١) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦٧١٢) [3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١١١)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٥٥٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٧٥) مسند أحمد (٣/ ١٢٨)

سامنے کے دانت ٹوٹ گئے۔[1] الخ۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک شخص فقیروں کا غلام تھا، اس نے ایک امیروں کے غلام کا کان کاٹ لیا، وہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ کہا: ہم فقیر لوگ ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کچھ دیت نہ رکھی۔[2] (رواه أبو داود وكذا النسائي وهذا إسناد قوي رجالهم كلهم ثقات) یہ حدیث مشکل ہے مگر یوں کہیں کہ متعلقہ گناہگار بچہ قبل بلوغ تھا، اس لیے اس پر قصاص نہ ہوا اور شاید اُس نے فقراء سے اغنیاء کا دیت کے بارے میں نقصان معاف کرالیا یا برداشت کرالیا۔

زخموں کا قصاص:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جان بدلے جان کے قتل کی جاتی ہے۔ آنکھ بدلے آنکھ کے پھوڑی جاتی ہے، ناک عوض ناک کے کاٹی جاتی ہے، دانت عوض دانت کے اُکھاڑا جاتا ہے۔ زخم کا بدلہ زخم کے عوض کیا جاتا ہے، اس میں سارے آزاد مسلمان مرد عورت برابر ہیں، جب کہ نفس اور اس سے جو کم ہو اور عمداً ہو۔ پھر سارے غلام کیا مرد عورت برابر ہیں، جبکہ عمداً نفس یا اس سے کم میں ہو؟[3] (رواہ ابن جریر)

اہم قاعدہ:

زخم کبھی جوڑ میں ہوتا ہے، اس میں قصاص بالاجماع واجب ہے، جیسے: ہاتھ، پاؤں، پنجہ کو کاٹنا اور اسی طرح کے اور اعضا۔ اور اگر زخم جوڑ میں نہ ہو، بلکہ ہڈی میں ہو تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک قصاص ہے، مگر ران میں یا جو ران کے مشابہہ ہے، اس لیے کہ یہ جگہ خوف وخطرے کی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین نے کہا ہے کہ دانت کے سوا ہڈیوں میں سے کسی چیز میں قصاص نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہڈیوں میں بالکل قصاص نہیں ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام عطا، شعبی، حسن بصری، زہری، نخعی، عمر بن عبدالعزیز، ثوری، لیث اور احمد رحمہم اللہ سب اسی کے قائل ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی حجت ربیع بنت نضر رضی اللہ عنہا والی حدیث ہے کہ دانت کے سوا کسی ہڈی میں قصاص نہیں۔ مگر یہ حدیث حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ بلفظ ''كَسَرَتْ ثَنِيَّةَ جَارِيَةٍ'' آئی ہے، ہوسکتا ہے کہ دانت ٹوٹے بغیر گر جائیں، تب بھی قصاص واجب ہے باجماع باوجود اس حالت کے۔ اس دلالت کو اس طرح تمام کیا ہے کہ جاریہ بن ظفر حنفی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے بازو پر تلوار ماری، سوائے جوڑ کے اُس کا بازو کٹ گیا، اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی، آپ نے دیت کا حکم دیا، اُس نے کہا: میں قصاص چاہتا ہوں۔ فرمایا: « خُذْ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٩٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٥١) یہ روایت صحیح ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٠/ ٣٦١۔ ٣٦٢) اس کی سند حسن ہے۔

بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ » ”یہ لے لے! اللہ تیرے لیے برکت عطا کرے۔“ اور قصاص کا حکم نہ دیا۔[1] (رواہ ابن ماجه) مگر اس کی سند سخت ضعیف ہے۔

یہ بھی کہا ہے کہ زخم کا قصاص نہ کیا جائے، جب تک کہ زخمی کا زخم مندمل نہ ہوجائے، اگر مندمل ہونے سے پہلے بدلہ لے لیا، پھر زخم بڑھ گیا تو اب کچھ نہیں، اس پر عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی حدیث ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کے زانو میں سینگ کا ایک زخم لگایا، اُس نے نبی اکرم ﷺ سے آ کر کہا: میرا بدلہ لو، اُس کا بدلہ لیا، اُس نے کہا کہ میں تو لنگڑا ہوگیا، فرمایا: میں نے تجھے منع کیا تھا، تو نے میرا کہنا نہ مانا، اللہ تجھ کو دور ڈالے، تیرا لنگڑا ہونا رائیگاں و باطل ہوا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے منع فرما دیا کہ کسی زخم کا بدلہ نہ لیا جائے، یہاں تک کہ زخمی اچھا ہو۔[2] (تفرد به أحمد)

مسئلہ:

اگر مجنی علیہ (زیادتی سے متاثر) نے جانی (زیادتی کرنے والے) سے بدلہ لیا اور وہ مر گیا تو اُس پر کچھ الزام نہیں ہے۔ یہی امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ وغیرہم بھی اسی لیے قائل ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قصاص لینے والے کے مال سے دیت واجب ہوگی۔ امام شعبی، عطا، طاؤس، عمرو بن دینار، حارث، عکلی، حارث بن ابی لیلیٰ، حماد بن ابی سلیمان، زہری اور ثوری رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ دیت کا وجوب عاقلۂ مقتص (قصاص لینے والے) پر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، نخعی، حکم بن عتیبہ اور عثمان بتی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اُس جارحہ کے اندازے سے دیت ساقط ہے، یعنی مقتص سے، باقی اس کے مال میں واجب ہے۔[3]

معاف کرنا گناہوں کا کفارہ ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے معاف کیا اور صدقہ دیا، وہ کفارہ ہے، یعنی مطلوب کے لیے اور اجر ہے طالب کے لیے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس نے صدقہ کیا، وہ جارح کے لیے کفارہ ہے اور مجروح کے لیے اللہ تعالیٰ پر اجر ہے۔ خیثمہ، مجاہد، ابراہیم، شعبی، جابر بن زید رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کفارہ، یعنی مجروح کے لیے۔ امام حسن بصری، نخعی اور ابو اسحاق ہمدانی رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[4]

امام شعبی اور قتادہ رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بقدرِ تصدق گناہ منہدم ہوجاتے ہیں۔[5] امام شعبی رحمہ اللہ نے ایک انصاری سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس کا دانت ٹوٹا یا ہاتھ کٹا یا اور کوئی شے

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٣٦) اس کی سند میں ”نمران بن جاریہ“ مجہول اور ”دھثم بن قران“ ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ٢٩٥)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢١٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله ثقات“ (مجمع الزوائد: ٦/ ٢٦٢) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٨٨۔ ٨٩)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٨٩) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٤٦) [5] تفسير الطبري (١٠/ ٣٦٥)

یا بدن میں زخم لگا اور اس نے معاف کر دیا تو اسی قدر اُس کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ اگر ربع دیت ہے تو ربع خطایا اور اگر تہائی ہے ثلث خطایا اور پوری دیت ہے تو پورے گناہ مٹ جاتے ہیں۔[1] (رواہ ابن مردویہ)

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصَابُ بِشَيْئٍ مِنْ جَسَدِهٖ فَيَهَبُهٗ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهٖ دَرَجَةً، وَّحَطَّ عَنْهُ خَطِيْئَةً» (رواہ ابن جریر) ''اگر کسی مسلم کو اس کے جسم کے کسی حصے پر تکلیف پہنچائی جائے اور وہ اُس (تکلیف پہنچانے والے) کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس وجہ سے اُس کا ایک درجہ بلند کر دیتا ہے اور اُس کی خطائیں مٹا دیتا ہے۔'' مسند احمد کی روایت میں: «فَيَهَبُهٗ» کے بجائے «فَيَتَصَدَّقُ بِهٖ» ہے۔[2] (و رواه الترمذي وابن ماجه أيضاً) ایک صحابی نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَنْ تَصَدَّقَ بِدَمٍ فَمَا دُوْنَهٗ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ مِنْ يَّوْمِ وُّلِدَ إِلٰى يَوْمِ يَمُوْتُ»[3] (رواہ ابن مردویہ) ''جس شخص نے خون یا اُس سے کم نقصان معاف کر دیا تو وہ اُس کے لیے، اُس دن سے لے کر جب وہ پیدا ہوا تھا، اُس دن تک جب وہ مرے گا، کفارہ ہوگا۔''

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت اس طرح ہے کہ نہیں کوئی آدمی کہ زخم لگے اس کے بدن میں وہ تصدق کرے ساتھ اس کے، لیکن کفارہ کرتا ہے اللہ اس کے تصدق کے مثل۔[4] (رواه أحمد والنسائي) ایک صحابی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «مَنْ أُصِيْبَ بِشَيْئٍ مِنْ جَسَدِهٖ فَتَرَكَهٗ لِلّٰهِ كَانَ كَفَّارَةً لَّهٗ»[5] (رواه أحمد) ''جس کو اس کے جسم میں کوئی تکلیف پہنچی اور اُس نے اللہ کے لیے اسے چھوڑ دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہو جاتا ہے۔'' حسن رضی اللہ عنہ اور مرزا مظہر جان جاناں نے اپنا خون قاتل کو معاف کر دیا تھا۔ اس آیت میں ﴿هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ فرمایا ہے۔ امام طاؤس اور عطاء رحمہما اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ ''كُفْرٌ دُوْنَ كُفْرٍ، وَّظُلْمٌ دُوْنَ ظُلْمٍ، وَّفِسْقٌ دُوْنَ فِسْقٍ''[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا کہ ہم نے بنی اسرائیل پر قصاصِ نفس و اعضا

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٨٩) اس کی سند میں ''معلی بن ہلال'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٠/ ٣٦٤) مسند أحمد (٦/ ٤٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٩٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو السفر رحمہ اللہ کا سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٤٨٢)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٩٠) اس کی سند میں ''عمران بن ظبیان'' ضعیف راوی ہے۔

[4] مسند أحمد (٥/ ٣١٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٣٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٧٣)

[5] مسند أحمد (٥/ ٤١٢) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٥٥٢)

[6] تفسير الطبري (١٠/ ٣٥٥)

فرض کیا تھا۔ جمہور کہتے ہیں کہ پہلی شریعت اگر منسوخ نہ ہو تو ہم پر لازم ہے۔ یہی حق بات ہے اور ظاہرِ نظمِ قرآنی یہ ہے کہ جب آنکھ، ناک، کان بالکل بے کار ہو جائے تو تکلیف پہنچانے والے سے اس کے مثل بدلہ لیا جائے اور اگر تھوڑا نقصان پہنچا ہے تو آیت میں قصاص کی دلیل نہیں ہے۔ لفظِ ﴿ اَلسِّنَّ بِالسِّنِّ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب دانت برابر ہیں، خواہ وہ سامنے کے دانت ہوں یا ڈاڑھ۔ بعض کو بعض پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اکثر اہلِ علم اسی طرف گئے ہیں۔ (كما قال ابن المنذر)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس کے مخالف ہیں، لیکن اتنا چاہیے کہ تکلیف دینے والے سے قصاص لیتے وقت دانت کی مماثلت ضرور چاہیے۔ لفظ جروح اطراف کو شامل ہے، اگر قصاص ممکن ہے تو بہتر، وگرنہ عدل کے ساتھ فیصلہ ہونا چاہیے۔ خاص کرنے کے بعد یہ عمومیت ہے۔ اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ جن زخموں میں خود تلف ہونا ہے، ان میں قصاص نہیں اور نہ اس میں جس زخم کی گہرائی، لمبائی اور چوڑائی معلوم نہ ہو سکے۔[1] پھر جس نے زخم دینے والے پر صدقہ کر دیا اور اس کو معاف کر دیا، یہ اُس کے لیے کفارہ ہے۔ جب یہود نے اس بات پر صلح کی کہ کمینے کے عوض شریف اور عورت کے عوض مرد مقتول نہ ہو تو آیت ﴿ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ اُتری۔ اس جگہ ظلم کا ذکر اس لیے مناسب ہوا کہ قتل اور زخم کے ذکر کے بعد یہ ارشاد فرمایا، کیوں کہ ظلم بدلے کے منافی اور عدمِ مساوات ہے۔

اجتہاد کی فضیلت اور تقلید کی مذمت:

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اجتہاد کے لیے شرط ہے، کیوں کہ منزل من اللہ کے مطابق وہی فیصلہ کر سکتا ہے، جو اللہ کی طرف سے نازل شدہ احکامات کو اور ان کی تاویلات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ان کا امتحان لینے کے لیے پوچھا، تم کیوں کر حکم (فیصلہ) کرو گے، اگر کوئی قضیہ تمھارے سامنے آئے گا؟ کہا: میں کتاب اللہ سے حکم کروں گا، فرمایا: اگر کتاب میں حکم نہ پاؤ۔ کہا: تو پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم کروں گا۔ فرمایا: اگر سنت میں بھی نہ پاؤ۔ کہا: اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کسی طرح کی کوتاہی روا نہ رکھوں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لِمَا يَرْضىٰ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ»[2] (رواه الترمذي وأبو داود والدارمي) ''اللہ کی تعریف ہے، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کو اس بات کی توفیق دی، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسند کرتے ہیں۔'' یہ حدیث مشہور ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس کے طریق بیان کیے ہیں۔

---

[1] فتح القدير (٢/ ٦٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٢) سنن الدارمي (١/ ٧٢) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٨٨١)

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مقلد نہ کتاب کو پہچانتا ہے نہ سنت کو جانتا ہے نہ اس کی کچھ رائے ہے، بلکہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اُس کا حکم کتاب و سنت میں موجود ہے کہ اُس کے مطابق فیصلہ کرے یا موجود نہیں ہے کہ اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔ جب وہ یہ دعویٰ کرے گا کہ اُس نے فیصلہ اپنی رائے سے دیا ہے تو وہ اپنی جان پر جھوٹ بول رہا ہے، کیوں کہ وہ تو اعتراف کرتا ہے کہ اسے دین کے احکامات کی معرفت نہیں ہے۔ اس حکم میں وہ گویا اقراری ہے کہ اُس کا وہ فیصلہ طاغوتی ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ مقلد کا قاضی ہونا جائز ہے یا نہیں؟ جواب دیا کہ قرآن میں تو یہی حکم آیا ہے کہ حاکم عدل و انصاف کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی اُتاری ہوئی شریعت اور جو کچھ اسے اللہ سمجھائے اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ ہر عارف یہ بات جانتا ہے کہ ان امور کا عارف وہی شخص ہوسکتا ہے جو مجتہد ہوگا۔ مقلد تو غیر کے قول کو بغیر حجت کے ماننے والا ہوتا ہے، کسی شے کے حق یا انصاف کے مطابق ہونے کا علم وہی حجت اور دلیل ہے۔ مقلد حجت کو نہیں سمجھتا، پھر حجت سے کس طرح دلیل پکڑے گا؟ مزید برآں اُس کے پاس منزل من اللہ کا علم نہیں ہے۔ اس کا علم تو وہی اس شخص کا قول ہے، جس کی وہ تقلید کرتا ہے۔ اگر فرض کریں کہ وہ اگر اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت اور جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، اس کا عالم ہے تو پھر مقلد نہ ٹھہرے گا، مجتہد ہوگا۔

اسی طرح مقلد کے لیے نظر بھی نہیں ہے۔ وہ جب کسی شے کا حکم کرے گا تو اس کا وہ حکم اس کے مطابق نہیں ہوگا، جو اللہ نے اُس کو سُجھایا، بلکہ وہ "بِمَا أَرَاهُ إِمَامُهُ" "جو اُس کو اُس کے امام نے سجھایا" کے مطابق ہوگا۔ وہ نہیں جانتا کہ جو بات اس کے امام نے کہی ہے، وہ حق کے مطابق ہے یا نہیں۔ غرضیکہ قاضی دراصل وہ شخص ہوتا ہے، جو شارع کے مطابق حکم کرتا ہے۔ جس طرح سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزرا۔ یہ حدیث اگرچہ مقال سے خالی نہیں ہے، لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک جزو میں اس کے سب طُرق جمع کیے ہیں، جن سے اس کا حسن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ائمۂ اسلام نے قدیماً و حدیثاً اس پر اعتماد کیا ہے۔ اس کے راوی امام احمد، ابن عدی، طبرانی، بیہقی رحمہم اللہ وغیرہم ہیں۔

حق یہ ہے کہ حدیث مذکور حسن لغیرہ ہے۔ اسلام میں اس پر عمل ہے۔ اس بات پر دلیل ہے کہ قاضی اور حاکم فیصلہ کرتے وقت اور حکم دیتے وقت کتاب اللہ کو مقدم کرے، جب قرآن شریف میں نہ پائے تو سنتِ رسول اللہ ﷺ سے حکم دے، پھر اگر سنت میں بھی نہ پائے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔ مقلد میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق حکم کرے، اس لیے کہ وہ نہ استدلال کو پہچانتا ہے نہ کیفیتِ استدلال کو، اسی طرح وہ سنتِ رسول اللہ ﷺ کے مطابق بھی حکم نہیں کرسکتا، کیوں کہ اُس کو صحیح و موضوع و ضعیف و معلل کی تمیز نہیں اور نہ ہی اس کو اسبابِ جرح و تعدیل کی شناخت ہے اور نہ متقدم و متاخر و عام و خاص و مطلق و مقید و مجمل و مبین و ناسخ و منسوخ

کا شعور ہے، بلکہ وہ ان الفاظ کا مفہوم بھی نہیں جانتا نہ اُن کے معانی سمجھتا ہے، پھر اس کا ذکر ہی کیا ہے کہ دلیل کا کسی ایک شے کے ساتھ متصف ہونا سمجھ سکے۔

مقلد اگر یوں کہے گا کہ میرے نزدیک اس طرح پر ہے تو اس کا نزدیک کیا اور اگر یوں کہے گا کہ شرع میں یوں ہے تو بیچارہ شرع کو کیا جانے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ فلاں شخص کا قول ہے، حالاں کہ وہ نہیں جانتا کہ قولِ مذکور نفس الامر میں صحیح ہے یا نہیں۔ سو وہ بلاشک قضاۃِ نار میں سے ایک قاضی ہے۔ اس لیے کہ اس کا حکم حق کے موافق پڑا ہے تو اسے معلوم نہیں ہے کہ وہ حق ہے اور اگر باطل کے مطابق واقع ہوا ہے تو وہ اس کا باطل ہونا نہیں جانتا اور یہ دو شخص نار میں ہوں گے، جس طرح کہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے۔

رہا قاضی جو جنت میں جائے گا، تو وہ شخص ہے جو حق کے ساتھ حکم کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ فیصلہ حق ہے۔ اس میں شک نہیں، اور جس کو حق معلوم ہے، وہ مجتہد ہے نہ کہ مقلد۔ اس بات کو ہر عارف جانتا ہے۔ اگر مقلد یوں کہے گا کہ میں جانتا ہوں کہ جس قولِ امام پر میں نے حکم دیا ہے، وہ حق ہے، اس لیے کہ ہر مجتہد مصیب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس مسئلے میں مقلد ہے کہ مجتہد؟ اگر مقلد ہے جو بات نزاع کا باعث تھی، وہ اس کی دلیل تھی۔ یہ ایک مصادرۂ باطلہ (بہت بڑا باطل) ہوا، اس لیے کہ وہ کیا جانے کہ یہ قول درحقیقت حق ہے یا نہیں، زیادہ جاننے کا تو کیا ذکر۔

اور اگر مجتہد ہے تو پھر اس پر یہ بات کس طرح مخفی رہے گی کہ مصیب سے مراد راہِ راست ہے نہ کہ اصابت (درستی)، چناں چہ جو لوگ مجتہدین کی ہر بات کو درست سمجھتے ہیں، وہ اس کے اقراری ہیں، سو جب مصیب ہونا صواب سے ہوا نہ اِصابت سے، تو پھر وہ بات نہ ٹھہری جو اُس نے سمجھی تھی کہ اُس کے امام کا مذہب حق ہے، کیوں کہ وہ منافی خطا نہیں۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب حاکم نے حکم دیا اور اجتہاد کیا اور اُس کا حکم درست ہوا تو اس کے لیے دو اَجر ہیں اور جب حکم دیا اور خطا کی تو اس کو ایک اَجر ہے۔[1]

(أخرجه الشيخان عن أبي هريرة وابن عمرو رضی اللہ عنہم)

یہ بات ایسی ہے کہ سوائے اندھے کے کسی پر مخفی نہیں رہ سکتی اور اگر صواب اور اصابت کے درمیان فرق سمجھ میں آتا تو پھر خاموشی بہتر ہے۔ مباحثِ علمیہ میں کلام کرنے کی کچھ ضرورت نہیں، جس کو علم ہے اس سے اس فرق کو سیکھنا چاہیے، یہاں تک کہ علم کی چاشنی حاصل ہو۔ اس مسئلے کا اس جگہ یہ حاصل ہے، اگرچہ اس کا دامن بہت دراز ہے اور کتبِ اصول اور فروع میں اس بارے میں جو اختلاف ہے، وہ تدوین کیا گیا ہے، لیکن چوں کہ سائل نے یہ سوال اقوالِ رجال سے نہیں کیا تھا، بلکہ تحقیقِ حق کی غرض سے پوچھا تھا، اس لیے جو بات حق تھی، وہ صاف صاف کہہ دی گئی۔[2]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٨١)

[2] فتح البيان (٣/ ٤٣٢۔ ٤٣٨)

من آنچہ شرط بلاغ ست با تو می گویم — تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

''پہنچانے کی شرط ہونے کی بنا پر میں تجھے بتا رہا ہوں۔ اب تیری مرضی ہے کہ تو میری بات سے نصیحت حاصل کرے یا اس سے ناراض ہو۔''

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿46﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿47﴾

اور ہم نے ان (رسولوں) کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے نازل شدہ کتاب تورات کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے انھیں انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور وہ اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والی تھی اور پرہیز گاروں کے لیے (سراسر) ہدایت اور نصیحت تھی ﴿46﴾ اور اہل انجیل کو چاہیے کہ اللہ نے اس میں جو کچھ نازل کیا اس کے مطابق فیصلے کریں، اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں تو وہی نافرمان ہیں ﴿47﴾

عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر اور انجیل کی تعریف:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے انبیاے بنی اسرائیل کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا، وہ تورات پر ایمان لائے، اس کے موافق حکم کرتے تھے۔ انجیل میں حق کی طرف ہدایت ہے اور نور ہے، جس کی چمک سے شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور مشکلات کا حل ہوتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام تورات کی تصدیق کرنے والے تھے، اس کے مخالف نہ تھے، مگر تھوڑے حکموں میں جن میں یہود نے اختلاف کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ مسیح علیہ السلام نے یہود سے کہا: ﴿ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ﴾ [آل عمران: ۵۰] ''اور تاکہ میں تمھارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں۔'' اسی جگہ سے علما کا یہ قول مشہور ہے کہ انجیل بعض احکام تورات کی ناسخ ہے۔

پھر فرمایا کہ ہم نے انجیل کو ہدایت اور نصیحت بنایا ہے۔ یعنی وہ اہل تقویٰ کہ جو اللہ کی وعید اور عذاب سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے انجیل دھمکی دینے والی ہے، اگر وہ حرام کردہ چیزیں اور گناہوں کا ارتکاب کریں۔ انجیل اس لیے دی تھی کہ انجیل والے اپنے زمانے میں اس کے مطابق حکم کریں یا یہ مطلب کہ جو کچھ انجیل میں ہے، اُس سب پر ایمان لا کر اس کے احکام کو قائم رکھیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰى

﴿تُقِيمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ﴾ [المائدة: ٦٨] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! تم ہرگز اصل دین پر کاربند نہیں ہوسکتے، یہاں تک کہ تم تورات و انجیل اور جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے لگو۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيْلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ أُنْزِلَ مَعَهٗٓ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٥٧] ''(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، چناں چہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں۔'' اس لیے اس جگہ ان لوگوں کو، جو اطاعت سے خارج ہیں، باطل کی طرف مائل ہیں اور حق کے تارک ہیں، فاسق فرمایا ہے۔ یہ آیتِ نصاریٰ کے حق میں اُتری ہے، جس طرح کہ اس کا ظاہری انداز ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ تورات کے ذکر کے بعد اس جگہ نصاریٰ کا ذکر کیا، عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی تھی۔ نصاریٰ کو یہ حکم دیا کہ تم انجیل کے مطابق حکم دو، اس لیے کہ محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے وہ کتاب حق تھی اور بعثت کے بعد بہت جگہ یہ حکم فرمایا ہے کہ جو کتاب نبی کریم ﷺ پر اُتری ہے، یعنی قرآن، اس کے موافق عمل کرو۔ اس لیے کہ قرآن تمام منزلہ کتابوں کا ناسخ ہے۔ پھر فرمایا کہ جو کوئی ﴿بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کے مطابق حکم نہیں کرتا، وہ فاسق ہے۔ ﴿بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ سے مراد کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ٧] ''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔'' اور رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق: «أَلَا إِنِّي أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ»[1] (رواه أبو داود والدارمي وابن ماجه عن المقدام بن معديكرب رضي الله عنه) ''خبردار! مجھے قرآنِ مجید دیا گیا ہے اور اُس کی مثل اور بھی دیا گیا۔''

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٤) سنن الدارمي (١/ ١٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٦٤٣)

فسق طاعت سے باہر ہونے کو کہتے ہیں۔ اس جگہ فسق کا ذکر مناسب ہے، اس لیے کہ جو حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا، جب اُس سے باہر ہو گئے تو فاسق ٹھہرے، بے حکم ہوئے۔ اس آیت میں اور اس سے پہلی دونوں آیتوں میں اس قدر سخت وعید اور ڈانٹ ہے، جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آیات اگرچہ اہلِ کتاب کے بارے میں اُتری ہیں، لیکن یہ ان کے لیے ہی خاص نہیں ہیں، بلکہ یہ ہر اس حاکم کے لیے جو ایسی بات کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور حکم دیتا ہے، جو اللہ نے نازل نہیں کی، عام ہیں، کیوں کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ سبب بھی اس میں داخل ہے۔ اگر یہ عموم نہ ہو تو اکثر قرآن بغیر عمل کے باقی رہ جائے، حجیت سے گر جائے۔

اجتہاد کی دلیل اور تقلید کی مذمت:

یہ آیت اشتراطِ اجتہاد پر دلیل ہے اور ترکِ تقلید کی طرف مشورہ دینے والی ہے۔ اگر کسی شہر میں کوئی جھگڑا واقع ہو اور وہاں مجتہد موجود نہ ہو اور مقلد قاضی کی طرف اپنا جھگڑا لے جانا پڑے تو جب تک کسی مجتہد قاضی تک پہنچنا ممکن ہے، مقلد سے فیصلہ نہ کرائیں گے نہ ہی اُس مقلد کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ فیصلہ کرے، بلکہ اسے چاہیے کہ قاضی مجتہد کا پتا بتا دے کہ اُس کے پاس جا کر حکم طلب کرو، تا کہ وہ ﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ یا "مَا أَرَاهُ اللّٰهُ" (اللہ کی نازل کردہ شریعت یا اللہ نے جو اُس کو سجھایا ہو) کے مطابق حکم دے۔

پھر جب اُس مجتہد تک پہنچنے میں عذر ہو اور تکلیف ہو تو سخت مجبوری کے تحت مقلد قاضی متولی سے جھگڑے کا فیصلہ کروایا جا سکتا ہے، لیکن اُس پر یہ بات واجب ہے کہ جس علم کو وہ نہیں جانتا، اُس کا دعویٰ نہ کرے، یہ کہے کہ شرعاً صحیح اور غیر صحیح اس طرح پر ہے، بلکہ اتنا کہہ کر خاموش رہے کہ اُس کے امام کا قول اس مسئلے میں یوں ہے اور دونوں جھگڑنے والے فریقوں سے کہہ دے کہ میں نے جو حکم دیا ہے، وہ فلاں امام کا قول ہے، نصِ شرعی نہیں ہے، کیوں کہ ایسا قاضی حقیقت میں نہ محکم ہے نہ حاکم، یعنی نہ پنچ ہے نہ قاضی شرعی۔

اس شریعتِ حقہ میں تحکیم، یعنی پنچایت ثابت ہوئی ہے، جس طرح قرآنِ کریم میں میاں بیوی کے معاملے میں تحکیم کا حکم آیا ہے کہ ایک پنچ مرد کی طرف کا اور دوسرا عورت کا ہو اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں دیا گیا ہے: ﴿ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ [المائدۃ: ۹۵] ''جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں۔'' یا جس طرح نبی اکرم ﷺ کے زمانے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بہت سے فیصلوں میں پنچایت ہوئی ہے، کیوں کہ جس کو پانی نہ ملے، وہ مٹی سے تیمّم کرتا ہے۔ کانا ہونا اندھا ہونے سے بہر حال بہتر ہے۔

مقلدوں کا ایک ملمع یہ ہے کہ جس امام کی تقلید کرنے میں عوام الناس کے سامنے اُس کے فضائل کو نشر کرتے ہیں اور اس کے مناقب کی تعظیم میں نہایت درجے کا مبالغہ ظاہر کرتے ہیں اور جو شخص مقلدین کے زمانے میں درجۂ اجتہاد

کو پہنچ گیا ہے، اُس کا موازنہ اپنے ائمہ سے فرماتے ہیں، حالاں کہ یہ بات محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے اور ایک بڑا مغالطہ ہے، جو کہ عام لوگوں کے ذہنوں پر بہت جلد اثر انداز ہوتا ہے اور وہ اس ملمع کے دھوکے میں آ جاتے ہیں، کیوں کہ قصور عام لوگوں کے افہام کا ہے، جو حقیقتِ حال کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ان عوام کے نزدیک حق لوگوں سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ لوگ حق سے۔ ان کے دلوں میں فوت شدہ لوگوں کی جلالت اور بزرگی بے حد ہوتی ہے۔

مقلدین کی طبیعتیں بھی ان کی طبیعتوں جیسی ہوتی ہیں، اسی لیے وہ مردوں کے اقوال کو جلد قبول کر لیتے ہیں، ہم عصر علمائے مجتہدین کے اقوال کو اتنا قبول نہیں کرتے، کیوں کہ ان کے خیال میں وہ فوت شدہ بزرگ موجودہ مجتہدین سے گویا ایسے بلند مرتبہ اور درجہ والے ہیں کہ ذہن ان مراتب کے تصور سے تنگی کرتا ہے۔ مثلاً مقلد جب یوں کہتا ہے کہ میں شافعی مذہب کے مطابق کرتا ہوں اور وہ میرے اس ہم عصر مجتہد سے زیادہ عالم اور عارفِ حق تھے تو عوام جھٹ پٹ اس قول کی تصدیق کرنے لگتے ہیں اور اس حکم کو مان لیتے ہیں اور نشیب کی طرف بہنے والے سیلاب سے بھی زیادہ تیزی سے اُس کی طرف جاتے ہیں اور اس مقولے کا اثر ان کے ذہن میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

موجود مجتہد کا مقلد کو اس جگہ یہ جواب ہے کہ اصل جھگڑا اس بارے میں ہے کہ موازنہ تو میرے اور تیرے درمیان ہے نہ کہ میرے اور شافعی کے درمیان، کیوں کہ میں عارفِ عدل وحق اور ﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ ہوں اور جب کتاب وسنت میں صریح حکم نہیں پاتا ہوں تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں اور تو کچھ بھی نہیں جانتا پہچانتا، تجھ کو نہ تو اجتہاد کی قدرت ہے نہ تیری کچھ رائے اور عقل ہے، کیونکہ اجتہاد رائے سے یہ مراد ہے کہ حکم کو قیاس سے یا اجتہاد کے کسی اور طریقے سے کتاب وسنت کی طرف پھیرے اور تو سرے ہی سے کتاب وسنت کو نہیں جانتا۔

پھر رجوع الی اللہ والرسول کی کیفیت کا پہچاننا کہاں اور وہ بھی بوجوہ مقبولہ۔ موجودہ مجتہد کا یہ جواب اگرچہ حق، خالص، صحیح، انصاف، عدل اور سچ ہے، لیکن عام لوگوں کے فہم سے دور ہے، وہ کب اس جواب کو مانیں گے اور کیوں مانیں گے۔ اسی لیے اس زمانے میں جو کہ قیامت کے ہم دوش اور ہمعنان یعنی قریب ہے، یہ بات دیکھی اور سنی جاتی ہے کہ جس بات کو مقلد لوگ اپنے ائمہ سے نقل کرتے ہیں، اس بات کی جو وقعت عام لوگوں میں ہوتی ہے، وہ وقعت اس بات کی نہیں ہوتی، جس کو موجودہ زمانے کا مجتہد کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ سے نقل کرتا ہے، اگرچہ وہ سو صریح دلیلیں اور نصوصِ مرفوعہ کیوں نہ لائے۔

کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حرکات بے برکات قیامت کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں، بلکہ تماشا یہ ہے کہ اکثر مقلدین اپنا حکم وفتویٰ دوسرے مقلد سے نقل کرتے ہیں، جو مثل اسی مقلد کے تھا جو پہلے مر چکا ہے اور امام اس سے بَری ہیں۔ مگر یہ حاکم اور مفتی جلد بازی کرتے ہیں اور حملہ کرتے ہیں اور کمال جرأت کے ساتھ اُس حکم اور فتویٰ کو امام مذہب کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالاں کہ اس امام کے فرشتوں کو بھی اس مسئلے کی خبر نہ تھی اور نہ اُس نے اس

معاملے میں کوئی صریح فتویٰ دیا تھا، بلکہ یہ کارستانی اس کے رعایت کیے ہوئے قواعد پر ہو کر اُس حکم کی نسبت اُس کی طرف کی گئی ہے۔

پھر جو شخص اس مسئلے اور حکم کے خلاف کتاب وسنت سے حکم نقل کرتا ہے یا دلیل لاتا ہے تو اس غریب کو بدعتی کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص اہلِ علم کے مذہبِ مبائن کا مخالف ہے، حالاں کہ اس مقلد کا مرتبہ جہالت اور گمراہی کی اس پستی سے ذرا سا بھی بلند ہو جائے تو صاف سمجھ لے کہ خود وہی مقلد اپنے امام کا مخالف ہے اور موافق نہیں اور جو شخص اس درجے میں ہوگا، وہ جہلِ مرکب کا حامل ہے اور اس قابل نہیں کہ اس سے بات کی جائے، بلکہ ہر صاحبِ علم پر لازم ہے کہ اپنی جان کو ایسے شخص کے ساتھ اُلجھنے سے دور رکھے اور اس کے ساتھ باہم گفتگو کرنے سے اپنی جان کو بچائے، مگر اس صورت میں کہ وہ شخص اس شخص سے طالبِ علم ہو اور اس چیز کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں، جو اللہ نے اُسے سکھائی ہو۔[1]

إِنِّي بُلِيتُ بِأَهْلِ الْجَهْلِ فِي زَمَنٍ قَامُوا بِهِ وَرِجَالُ الْعِلْمِ قَدْ قَعَدُوا

''ایک زمانے میں میری آزمایش جاہل لوگوں کے ساتھ کی گئی۔ وہ اپنی جہالت کے ساتھ کھڑے رہے، حالاں کہ صاحبِ علم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔''

ردِ تقلید کا تانتا بہت بڑا ہے اور نہایت بُرا ہے۔ کہاں تک کوئی اس کے حالِ بد اور بُرے انجام سے متنبہ کرتا پھرے۔ جب قرآن وحدیث ہی تقلیدِ رجال کی مذمت اور اتباعِ قیل وقال سے بھرے پڑے ہیں تو اس بات کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تقلید کی مذمت کے لیے لوگوں کے اقوال نقل کیے جائیں۔ إِذَا جَآءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ.

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ
الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا
تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ
شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ
لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ ۴۸
وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ
اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ

[1] فتح البیان (۳/ ۴۳۹۔ ۴۴۲)

اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ
يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ
لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ
اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور (اے نبی!) ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، یہ تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے تھی اور اس پر نگہبان ہے، چناں چہ آپ ان کے درمیان اللہ کی نازل کی ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلے کریں اور آپ کے پاس جو حق آیا ہے اسے نظر انداز کر کے ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور طریقہ بنایا اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ضرور ایک امت بنا دیتا، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں اس (کتاب) کے بارے میں آزمائے جو اس نے تمھیں دی ہے، چناں چہ تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو، تم سب نے اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں (اصل حقیقت) بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے 48 اور (اے نبی!) آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے (آپ پر) نازل کیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور ان سے ہوشیار رہیں، کہیں وہ آپ کو کسی ایسے حکم سے اِدھر اُدھر نہ کر دیں جو اللہ نے آپ پر اتارا ہے، پھر اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو جان لیں کہ اللہ کا فقط یہی ارادہ ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے انھیں سزا دے اور بے شک ان لوگوں میں سے اکثر نافرمان ہیں 49 کیا پھر وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ اور جو قوم اللہ پر یقین رکھتی ہے، اس کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے؟ 50

قرآن کی تعریف اور اس کو اپنانے کا حکم:

اللہ پاک نے تورات وانجیل کے ذکر کے بعد اس آیتِ پاک میں قرآنِ عظیم کا ذکر کیا، جس کو اپنے مقبول بندے اور رسولِ کریم ﷺ پر اُتارا ہے۔ حق سے مراد صدق ہے، یعنی یہ کتاب سچی پکی ہے۔ اس میں کچھ شک وشبہ نہیں ہے۔ یقیناً اس کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے، وہ پہلی نازل شدہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ ان کتابوں میں قرآن کا ذکر اور تعریف تھی۔ یہ لکھا تھا کہ وہ کتاب عن قریب محمد ﷺ پر اُترنے والی ہے۔ لہٰذا جیسی خبر تھی، ویسی ہی اُتری، جو لوگ بصیرت والے، اللہ کے حکم کے فرماں بردار، اللہ کی شریعتوں کے تابعدار اور اللہ کے رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہیں، ان کے نزدیک اس کتاب کی سچائی زیادہ ہوگئی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ

﴿ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ۝ وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴾
[بني إسرائيل: ۱۰۷۔ ۱۰۸] ”بلاشبہ جنھیں اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔“ یعنی جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے پہلے رسولوں کی زبان سے محمد ﷺ کی تشریف آوری و رونق بخشی کے متعلق کیا تھا، وہ لامحالہ اور ضروری وقوع پذیر ہو چکا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ”مُؤْتَمِنًا عَلَيْهِ“ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مہیمن بمعنی امین ہے، یعنی قرآن ہر کتاب پر امین ہے، جو پہلے آئی ہے۔ یہی امام عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، محمد بن کعب، عطیہ، حسن، قتادہ، عطا خراسانی، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ کا قول ہے۔[1] امانت سے اس جگہ شمولیت مراد ہے۔ یعنی یہ پچھلی کتاب اگلی کتابوں کو شامل ہے، جو کچھ انواعِ علوم و ہدایت اور ارشادات میں سے ان سب کتابوں میں تھا، وہ سب اس کتاب میں بامانت و دیانت موجود ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن پہلی کتابوں پر امین ہے، سو جو کچھ ان میں سے قرآن کے موافق ہے، وہ حق ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے، وہ باطل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ ”مُهَيْمِن“ بمعنی شہید ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ”مُهَيْمِن“ یعنی پہلی کتابوں پر حاکم ہے۔[2] یہ سب اقوال ایک دوسرے کے قریب ہیں، کیوں کہ اسم ”مُهَيْمِن“ کا اطلاق تمام مذکورہ معنوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتابِ مقدس، عظیم القدر اور رفیع الشان کو سب کتابوں کے بعد نازل فرمایا اور اُسے خاتمۃ الکتاب ٹھہرایا، سب کتابوں سے بڑی اور اَحکم ٹھہرایا، اس لیے کہ پہلے کی تمام خوبیوں کو اس میں جمع کر دیا ہے، بلکہ ان سے بھی زیادہ کمالات اس میں موجود ہیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں تھے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو سب کا شاہد و امین و حاکم ٹھہرایا اور بہ نفسِ کریمہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ۹] ”بے شک ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“ امام عکرمہ، ابن جبیر اور مجاہد رحمہم اللہ سے جو یہ مروی ہے کہ ”مُهَيْمِن“ سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں، وہ قرآن پر امین ہیں۔[3] سو اگرچہ یہ معنی صحیح ہیں، لیکن اس معنی کے تفسیر ہونے میں نظر ہے اور عربی زبان کے لحاظ سے بھی درست نہیں ٹھہرتے، بلکہ صحیح وہ معنی ہیں، جو پہلے دیے گئے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”مُهَيْمِن“ کی یہ تاویل کلامِ عرب کے مفہوم سے بعید بلکہ خطا ہے، اس لیے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٥٠) [2] تفسیر الطبري (١٠/ ٣٧٧۔ ٣٧٩)
[3] تفسیر الطبري (١٠/ ٣٨٠۔ ٣٨١) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٥٠)

کہ ''مُهَيْمِن'' کا عطف ''مُصَدِّق'' پر ہے تو اسی چیز کی صفت ہوگا، جس کی صفت لفظ ''مُصَدِّق'' ہے۔ اگر مجاہد کا قول صحیح ہوتا تو ''مُهَيْمِن'' کا لفظ بغیر عطف کے آتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! تم لوگوں کے درمیان حکم کرو، کیا عرب و عجم، کیا امی و کتابی، قرآنِ مجید اور اگلے انبیا کے حکم کے مطابق جو تمھاری شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے بلکہ مقرر ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے انھی معنی کو پسندیدہ کہا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو اختیار دیا تھا کہ ان میں حکم کرو یا نہ کرو۔ اب یہ فرمایا کہ ان میں ہماری کتاب کے موافق حکم دو۔ ان کی خوشی کی پیروی نہ کرو، جس پر انھوں نے اپنی اصطلاح رکھی ہے اور ﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ کو ترک کر دیا ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ﴾[2] (آیتِ باب) یعنی ان جاہلوں بدبختوں کی خواہشات کے پیچھے لگ کے تم حق سے پھر نہ جانا، جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ شِرْعَةً ﴾ سے مراد راستہ ہے اور ﴿ مِنْهَاجًا ﴾ سے مراد سنت ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ، ضحاک، سدی اور ابو اسحاق سبیعی رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں، یعنی ''سَبِيْلًا وَّسُنَّةً''. امام عطا رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کے برعکس کہا ہے، یعنی ''سُنَّةً وَّسَبِيْلًا''[3] لیکن پہلے معانی زیادہ مناسب ہیں، اس لیے کہ ''شِرْعَة'' وہ ہے، جس میں کسی شے کی طرف ابتدا کریں۔ ''شَرَعَ فِيْ كَذَا'' کے معنی ہیں: ''اِبْتَدَأَ فِيْهِ'' اسی طرح شریعت وہ ہے، جس سے پانی کی طرف راستہ نکالیں۔ منہاج واضح آسان طریق کو کہتے ہیں۔ سنن طرائق کو کہتے ہیں۔ لہٰذا شرع و منہاج کی تفسیر سبیل و سنت سے مناسبت میں زیادہ ظاہر ہے بہ نسبت اس تفسیر کے جو اس کے برعکس کی گئی ہے۔ واللہ أعلم.

دین ایک ہی ہے صرف شریعتوں کا اختلاف ہے:

اللہ تعالیٰ نے مختلف شریعت رکھنے والی اُمتوں کی خبر دی ہے، ان مختلف احکام پر مشتمل شریعتوں کے اعتبار سے جن میں توحید کی متفقہ طور پر تعلیم دی گئی تھی، جن کو پہلے رسل کرام لائے تھے، جس طرح کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «نَحْنُ مَعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ دِيْنُنَا وَاحِدٌ»[4] یعنی ہم سب پیغمبر علاتی بھائی ہیں، ہم ایک دین رکھتے ہیں توحید جس کو ہر رسول لایا ہے اور ہر کتاب میں اُترا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

---

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٣٨١۔ ٣٨٢)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٥١) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٩٢) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٥١۔ ١١٥٢)
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٥٩)

''اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

رہیں شریعتیں، لہٰذا اوامر و نواہی میں ان کا اختلاف رہا ہے۔ کسی شریعت میں کوئی شے حرام ہوتی ہے۔ پھر دوسری شریعت میں حلال ہو جاتی ہے۔ کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ کبھی ایک ملت میں کوئی معاملہ ہلکا ہوتا ہے، دوسری ملت میں جا کر شدید ہو جاتا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ یہ اللہ کی حکمتِ بالغہ اور حجتِ دامغہ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے شرع و منہاج سے مراد سبیل اور سنت ہے۔ مختلف سنتیں تورات میں شریعت تھیں، انجیل میں بھی شریعت تھیں، قرآن میں بھی شریعت ہیں۔ اللہ جسے چاہے حلال کرے، جسے چاہے حرام کرے۔ فرماں بردار کو گناہ گار سے پہچاننا منظور ہے۔ وہ دین کہ جس کے سوا اللہ کو منظور نہیں ہے، وہ یہی توحید اور اخلاص ہے، جس کو اللہ کے سارے رسول لائے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب اس امت کو ہے، یعنی ہم نے قرآنِ کریم کو سب کے لیے ایک شرعہ اور منہاج مقرر کر دیا ہے، تم سب اس کی پیروی کرو، وہ مقاصدِ صحیحہ کی طرف لے جانے والا راستہ ہے اور طریق و مسلک ہے، جو نہایت واضح اور روشن ہے۔ اس مضمون کو ابن جریر رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔[1] مگر صحیح قول پہلا ہے، اس لیے کہ یہ فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک دین پر کرتا، پس اگر یہ خطاب اس امت کو ہوتا تو اس طرح فرمانا صحیح نہ ٹھہرتا، بلکہ یہ خطاب ہے ساری امتوں کو اور اس میں قدرتِ عظیمہ کی خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اگر چاہے سارے آدمیوں کو ایک دین اور ایک شریعت پر کر ڈالے، کوئی شے اُس میں سے منسوخ نہ ہو، لیکن اُس نے ہر رسول کے لیے ایک علاحدہ شریعت مقدر فرمائی، پھر اُس کو دوسری رسالت سے جو اُس کے بعد بھیجی منسوخ کر دیا۔ یا بعض کو منسوخ کیا یہاں تک کہ اپنے بندے رسول محمد ﷺ کو بھیج کر تمام شریعتوں کو منسوخ فرما دیا۔ ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست | کتب خانۂ چند ملت بشست

''ایسا بے بہرہ کہ جس نے ابھی تک قرآن ہی کو درست نہیں سیکھا، اس نے کتنی قوموں کے کتب خانے صاف کر دیے۔''

نبی کریم ﷺ کو تمام اہلِ ارض کی طرف مبعوث فرمایا اور خاتم الانبیاء اور آخری رسول ٹھہرایا ؎

پیغام خدا نخست آدم آورد | انجام بشارت ابن مریم آورد
با جملہ رسل نامہ بے خاتم بود | احمد بر ما نامہ و خاتم آورد

''سب سے پہلے اللہ کا پیغام آدم علیہ السلام لائے۔ آخر میں مریم کے بیٹے (آپ ﷺ) کی خوشخبری لائے۔ یا

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٣٨٥۔ ٣٧٦)

یہ سمجھ لیجیے کہ تمام رسولوں کا خط بغیر مہر کے تھا۔ احمد ﷺ ہمارے لیے خط اور مہر لائے۔'' یعنی آپ کے بعد نہ الہامی کتاب آئے گی اور نہ ہی نبی۔

اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ مختلف شریعتیں اس لیے مقرر فرمائی ہیں کہ لوگوں کا امتحان اور آزمایش کی جائے اور دیکھا جائے کہ کون ہماری شریعت پر قائم اور دائم رہتا ہے کہ ہم اس کو اطاعت کا ثواب دیں اور کون نافرمان ہوتا ہے کہ ہم اُس کو سزا دیں۔ پھر اُس کے بعد اللہ پاک نے خیرات کی طرف جلدی کرنے اور تیزی کرنے کی طرف بلایا۔ خیرات سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور شریعت کی اتباع ہے، جس کو پہلی شریعتوں کا ناسخ قرار دیا ہے۔ کتاب اللہ کی تصدیق بھی مراد ہے، جو اللہ کی آخری کتاب ہے اب اس کے بعد کوئی کتاب نہ آئے گی۔

پھر یہ فرمایا کہ تم سب کا مرجع اور لوٹنا اور چل کر آنا قیامت کے دن میری ہی طرف ہے۔ جس حق کے بارے میں تم باہم اختلاف کرتے ہو، میں تم کو اس کی خبر دوں گا، جو لوگ سچے ہیں، ان کو ان کی سچائی کی جزا ملے گی اور جو لوگ کافر ہیں، حق کا انکار کرنے والے اور اسے جھٹلانے والے ہیں، بلا دلیل حق سے پھر کر باطل کی طرف جانے والے ہیں، بلکہ قطعی دلائل اور حجتوں کے دشمن ہیں، ان کو ان کے افعال کی سزا دی جائے گی۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ سے مراد نبی اکرم ﷺ کی امت ہے۔[1] لیکن قولِ اول زیادہ ظاہر ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ تم قرآن کے مطابق حکم دو، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، اس سے بچتے رہو کہ کہیں یہود تم کو دھوکا دے کر حق کو تم سے پوشیدہ نہ کر دیں، وہ تم کو طرح طرح کی باتیں پہنچاتے ہیں، تم ان کے فریب اور دغا میں نہ آؤ، وہ بڑے کاذب، کافر اور خائن ہیں، اگر تمھارا حکم اپنے بارے میں نہ مانیں اور اس کے خلاف کریں تو تم سمجھ لو کہ اللہ کو ان کا ہدایت سے پھیرنا منظور ہے، یہ سب ان کے اگلے گناہوں کی وجہ ہے، جو اس بات کے مقتضی ہیں کہ انھیں گمراہ رکھا جائے اور انھیں سزا دی جائے۔

پھر یہ فرمایا کہ اکثر لوگ فاسق اور بے حکم ہیں، اطاعت سے باہر اور حق سے دور۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ۱۱۶] ''اور اگر آپ اہلِ زمین کی اکثریت کی اطاعت کریں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔''

جاہلیت کے رواجوں کی مذمت:

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ کیا وہ کفر کے وقت کا حکم چاہتے ہیں، جس کا نام جاہلیت ہے؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے

[1] تفسیر الطبري (۱۰/ ۳۹۱)

بڑھ کر کس کا حکم ہوسکتا ہے۔ اس ارشاد میں ان لوگوں پر انکار کیا ہے، جو اللہ کے حکم سے خارج ہوگئے ہیں۔ کونسا حکم؟ جو ہر چیز پر مشتمل ہے اور ہر شر سے روکتا ہے، لہٰذا اُس حکم کو تو چھوڑا اور خواہشاتِ نفس اور لوگوں کی گھڑی ہوئی اصطلاحات سے، جن کی شریعتِ الٰہی سے کوئی سند نہیں ہے، رشتہ جوڑا، جس طرح زمانۂ کفر اور جاہلیت کے لوگ گمراہیوں اور جہالت کے حکم جاری کرتے تھے، جو انھوں نے اپنی آرا اور خواہشات سے تراشے تھے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں یا جیسے سیاست کے وہ احکام جو تاتاری جاری کرتے ہیں، چنگیز خان سے ماخوذ ہیں، اس نے ان کے لیے ایک کتاب یاسق نامی بنا دی تھی، وہ کتاب مجموعۂ احکام تھی، چند شریعتوں سے ان کو چن کر جمع کر لیا تھا، کچھ یہودیت، کچھ نصرانیت، کچھ ملتِ اسلامیہ سے لیا تھا، اس کے سوا بہت سے احکام ایسے تھے، جو صرف اپنی رائے اور نظر سے اخذ کیے تھے، وہ کتاب اس کی اولاد میں ایک شرع متبع ٹھہری تھی، اُس کو کتاب وسنت پر مقدم رکھتے تھے۔ سو جو کوئی ان میں سے ایسا کام کرے، اس سے لڑنا واجب ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ اور ﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ کے سوا کسی معاملے میں وہ خواہ قلیل ہو یا کثیر کوئی حکم نہ دے۔

بھلا جو اللہ احکم الحاکمین، ارحم الراحمین، رب العالمین ہے اور اُس کا رحم ایک ماں کی اپنے بچے پر رحمت سے بھی زیادہ ہے، اُس کا حکم لوگوں کے حق میں بہتر اور زیادہ انصاف والا ہوگا یا کسی اور کا حکم، جس میں اس قسم کی کوئی صفت نہیں پائی جاتی۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، ہر شے پر عادل ہے اور ہر شے کا عالم ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے اللہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم دیا، وہ جاہلیت کا حکم ہے۔

امام طاؤس رحمہ اللہ سے جب کوئی کہتا کیا میں اپنی اولاد کو دینے میں زیادتی کروں؟ یعنی کسی کو کم کسی کو زیادہ دوں تو وہ یہ آیت پڑھتے: ﴿ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ﴾ [1] (آیتِ باب) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ «أَبْغَضُ النَّاسِ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مَنْ يَّبْتَغِيْ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ، وَطَالَبَ دَمَ امْرِءٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُرِيْقَ دَمَهٗ» [2] (رواه الطبراني والبخاري بزيادة) ''اللہ کو وہ شخص سب سے زیادہ ناپسند ہے جو اسلام میں جاہلیت کا رواج چلانا چاہتا ہے اور کسی کا ناحق خون بہانے کے لیے مطالبہ کرتا ہے۔''

فتح البیان کا واضح بیان یوں ہے کہ آیتِ باب میں نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے۔ کتاب سے مراد قرآن ہے۔ یہ کتاب سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، اس لیے کہ جس طرح پہلی کتابیں امر بخیر (بھلائی کا حکم دینے) اور نہی عن الشر (برائی سے روکنے) پر مشتمل تھیں، اسی طرح یہ کتاب بھی دعوت الی اللہ اور اوامر ونواہی پر باقی رہی۔ مختلف احکام کے بعض جزئیات کے ساتھ مخالفت، زمانے کے بدلنے کی وجہ سے ہے، سو یہ درحقیقت کچھ مخالفت نہیں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٥٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٨٨) المعجم الكبير (١٠/ ٣٠٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٩٤_ ٩٥)

ہے، بلکہ موافقت ہے، اس طرح پر کہ وہ سب احکامِ جزئیہ اُس زمانے کی نسبت سے حق ہیں اور حکمت کے ضامن تھے، جن پر پہلی شریعت کا دارومدار تھا۔ احکامِ منسوخہ پر ابدیت کی دلیل نہیں ہے کہ مخالف کو بعد والی شریعت کا ناسخ سمجھا جائے، بلکہ صرف اس کے مشروع ہونے پر دلالت ہے بغیر اس کے بقا اور زوال کے تعرض کے، بلکہ وہ ناطق بزوال ہے، اس لیے کہ نطق بصحت ناسخ گویا نطق بہ نسخ و زوال منسوخ ہے۔ "مُھَیمن" کتاب کا وصف ہے بہ معنی رقیب یا غالب مرتفع یا حافظ پھر نبی اکرم ﷺ کو اہلِ کتاب کی خواہشات کی اتباع سے منع فرمایا۔[1]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝51 فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝52 وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝53

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (51) (اے نبی!) پس آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں (منافقت کا) روگ ہے کہ وہ دوڑ کر ان (یہودیوں) میں جاتے ہیں اور (ان سے) کہتے ہیں: ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی مصیبت (نہ) پہنچے، پھر قریب ہے کہ اللہ (تمھیں) فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے، تو یہ لوگ (اپنی منافقت پر) پچھتائیں گے، جسے وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں (52) اور (اس وقت) وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، کہیں گے: کیا یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے بڑی شد و مد سے اللہ کی قسمیں کھائی تھیں کہ بے شک وہ تمھارے ساتھ ہیں؟ ان کے عمل برباد ہوگئے، چناں چہ وہ خسارہ اُٹھانے والوں میں ہوگئے (53)

یہود و نصاریٰ کو دوست بنانے سے ممانعت:

یعنی منافق کافروں سے دوستی لگائے جاتے ہیں کہ ہم پر گردش نہ آجائے۔ یعنی مسلمان مغلوب ہو جائیں تو

[1] فتح البیان (۳/ ۴۴۳۔ ۴۴۴)

ان کی دوستی ہمارے کام آئے، سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب قریب ہے کہ کافر ہلاک ہوں اور مسلمانوں کو ان پر فتح ہو یا کچھ اور حکم آئے، یعنی کافر ملک سے ویران ہوں، آخر یہود کو جلاوطن کرنے کا حکم فرمایا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے مومن بندوں کو یہود و نصاریٰ سے موالات یعنی دوستی سے روکتا ہے، کیوں کہ یہ اسلام اور اہلِ اسلام کے دشمن ہیں۔ ﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ﴾

پھر یہ خبر دی کہ اُن میں بعض دوست ہیں بعض کے۔ پھر وعید اور ڈانٹ فرمائی اس برتاؤ سے اور فرمایا کہ ان کا دوست انہی کے حکم میں ہے۔ عبداللہ بن عتبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں یہودی یا نصرانی نہ ہو جائے اور وہ نہ جانے۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے گمان کیا کہ ان کی مراد یہی آیت ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نصاریٰ کے ذبیحے کے بارے میں حکم پوچھا، کہا: اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾[2] (آیتِ باب)۔ ابو الزناد رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[3]

﴿مَّرَضٌ﴾ سے مراد منافقت کا شک وشبہہ ہے، یعنی ایسے لوگ ان سے یاری اور دوستی کرنے میں ظاہراً و باطناً جلدی کرتے ہیں، اس ڈر سے کہ کہیں کافر اہلِ اسلام پر غالب آ جائیں تو اس وقت ہماری اس دوستی کا خیال رکھیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتح سے مراد فتح مکہ ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ مراد قضا و فصل ہے۔ امر سے مراد یہود و نصاریٰ پر جزیہ ہے۔[5] (قاله السدي) پھر یہود و نصاریٰ کے دوست دار اپنی چھپی بات پر پشیمان ہوں اور اہلِ کتاب سے اُن کی وہ دوستی کچھ کارآمد نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کا حال اپنے مومن بندوں پر دنیا ہی میں ظاہر کر دیا، اس کے بعد کہ وہ چھپے حال والے تھے، کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان کی کیفیت کیا ہے۔ لہٰذا جب رسوائی کے اسباب منعقد ہو گئے تو مسلمانوں کو نہایت تعجب ہوا کہ یہ لوگ تو ایمان کا اظہار کیا کرتے تھے اور قسمیں کھاتے تھے اور باتیں بناتے تھے، مگر بڑے جھوٹے اور افترا باندھنے والے نکلے۔

شانِ نزول:

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو آدمی تھے، ایک نے دوسرے سے اُحد کے واقعے کے بعد کہا کہ میں تو فلاں یہودی کے پاس جاتا ہوں، اُس کے پاس رہوں گا، یہودی ہو جاؤں گا، شاید اگر کوئی امر واقع ہو یا کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ مجھ کو کچھ نفع دے۔ دوسرے نے کہا کہ میں فلاں نصرانی کے پاس جا کر نصرانی ہوتا ہوں، وہ شام میں ہے، اس کے پاس رہوں گا، اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے آیتِ باب اتاری۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابو لبابہ بن عبد المنذر کے حق میں اُتری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اُس کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا تھا۔ انھوں نے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٥٦)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٥٧) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٩٥)
[4] تفسير الطبري (١٠/ ٤٠٥)
[5] تفسير الطبري (١٠/ ٤٠٦)

پوچھا: وہ ہمارے ساتھ کیا کریں گے؟ انھوں نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا، یعنی تم کو ذبح کریں گے۔[1] (رواہ ابن جریر)
امام عطیہ بن سعد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بنی خزرج سے نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! یہود میں میرے بہت سے دوست ہیں، میں ان کی دوستی سے اللہ اور رسول کی طرف بیزاری ظاہر کرتا ہوں، اللہ و رسول کا دوست رہوں گا۔

عبداللہ بن ابی نے کہا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں کہ گردشِ روزگار سے ڈرتا ہوں، میں یہود کی دوستی سے بیزاری نہیں کرسکتا۔ نبی اکرم ﷺ نے اُس سے فرمایا: اے ابو الحباب! «مَا بَخِلْتَ بِهِ مِنْ وَّلَايَةِ الْيَهُوْدِ عَلٰى عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ فَهُوَ لَكَ دُوْنَهٗ». اس نے کہا کہ میں نے قبول کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ باب اُتاری۔[2]
امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اہلِ بدر کی شکست ہوئی، مسلمانوں نے یہود سے جو اُن کے دوست تھے۔ کہا: مسلمان ہو جاؤ، اس سے قبل کہ پھر بدر کے دن کے مثل کوئی دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر پڑے۔ مالک بن صیف نے کہا کہ تم اس دھوکے میں ہو کہ قریش کے ایک گروہ پر تم نے غلبہ پایا، جن کو لڑنا نہ آتا تھا، ہم اگر اپنا عزم مخفی رکھ کے تم پر حملہ کریں گے تو تم کو لڑے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے یہودی دوست بڑے سخت جان، کثیر اسلحہ والے اور بڑی شان و شوکت والے ہیں، میں ان کی دوستی سے اللہ اور رسول کی طرف بَری ہوتا ہوں، نہیں مولیٰ میرا مگر اللہ اور رسول۔ عبداللہ بن اُبی نے کہا: لیکن میں ان کی دوستی سے بَری نہیں ہوتا، میں ایک مرد ہوں کہ مجھے ان کا دوست ہونا ضرور مطلوب ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے ابو الحباب! «أَرَأَيْتَ الَّذِيْ نَفَسْتَ بِهٖ مِنْ وَّلَايَةِ يَهُوْدَ عَلٰى عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ فَهُوَ لَكَ» اس نے کہا: مجھے منظور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: إلى قوله: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾[3]

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ یہود کا پہلا قبیلہ تھا، جس نے نبی اکرم ﷺ سے عہد شکنی کی۔ پھر نبی اکرم ﷺ کے حکم پر راضی ہوئے۔ عبداللہ بن ابی نے، جب کہ نبی اکرم ﷺ ان پر قادر ہوئے، کہا: اے محمد! ہمارے دوستوں سے احسان کرو۔ وہ خزرج کے حلیف تھے، نبی اکرم ﷺ رُک گئے۔ اس نے پھر کہا: اے محمد! احسان کرو ہمارے موالی ہیں، نبی اکرم ﷺ نے نہ مانا۔ آخر اپنا ہاتھ نبی کریم ﷺ کی جیب میں ڈالا، یعنی آپ کا دامن پکڑا۔ نبی کریم ﷺ نے کہا: مجھ کو چھوڑ دے اور آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر غضب ظاہر ہوا۔ پھر فرمایا: « وَيْحَكَ

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٣٩٧۔ ٣٩٨)
[2] تفسير الطبري (١٠/ ٣٩٥۔ ٣٩٦) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز ''عطیہ بن سعد عوفی'' ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسير الطبري (١٠/ ٣٩٦) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز اس کی سند میں ''عثمان بن عبدالرحمٰن'' متروک راوی ہے۔

أَرْسِلْنِي» اس نے کہا: «لَا وَاللّٰهِ» میں تم کو نہ چھوڑوں گا، یہاں تک کہ احسان کرو تم میرے موالی سے۔ چار سو بغیر ہتھیار کے اور تین سو ہتھیار والے ہیں، جنھوں نے مجھ کو احمر اور اسود سے بچایا، تم ایک ہی وقت میں ہم کو کاٹے ڈالتے ہو۔ میں دوائر یعنی گردشِ زمانہ سے ڈرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «هُمْ لَكَ». عبادہ بن ولید رحمہ اللہ نے کہا کہ جب بنو قینقاع نبی اکرم ﷺ سے لڑے تو عبداللہ بن ابی نے ان کا ساتھ دیا۔

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے۔ بنو عوف کا ایک شخص جو خزرج میں سے تھا، ان کا حلیف تھا، جیسے اور لوگ عبداللہ بن ابی کے حلیف تھے۔ انھوں نے آ کر اس کے حلف سے اپنی بیزاری ظاہر کی، کہا: اے اللہ کے رسول! "أَبْرَأُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ مِنْ حَلْفِهِمْ وَأَتَوَلَّى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَأَبْرَءُ مِنْ حَلْفِ الْكُفَّارِ وَ وَلَايَتِهِمْ" پس آیتِ باب عبداللہ اور عبادہ رضی اللہ عنہما کے حق میں اُتری۔ إلیٰ قوله: ﴿هُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾.[1]

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ عبداللہ بن ابی کی عیادت کے لیے گیا۔ نبی کریم ﷺ نے کہا کہ میں تجھ کو یہودیوں کی محبت سے منع کرتا تھا، اس نے کہا کہ سعد بن زرارہ اُن کو دشمن رکھتے ہیں، پھر مر گیا۔[2] (رواه أحمد و أبو داود)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ آیتِ باب حقیقتاً تمام مومنین کو خطابِ عام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد منافق ہیں، ان کو مومن باعتبار ظاہر کے کہا، وہ یہود و نصاریٰ کے دوست دار تھے۔ زیادہ صحیح یہی ہے کہ خطاب ہر اس شخص کو ہے جو متصف بایمان ہے، خواہ ظاہر میں ہو یا باطن میں ہو، یا فقط ظاہر میں۔ پس مسلم و منافق دونوں اس میں داخل رہیں گے۔ ﴿فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ اسی کی تائید کرتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عبداللہ بن ابی مسلمان ہوا، پھر کہا کہ میرے اور قریظہ کے بیچ میں حلف ہے اور مجھ کو زمانے کا خوف ہے، پھر مرتد ہو گیا۔ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں قریظہ و نضیر کے حلف سے بَری ہوتا ہوں، اللہ اور رسول کا دوست ہوں۔[3]

دوستی سے انکار کا مطلب یہ ہے کہ اُن سے دوستوں کی طرح پر اپنی باہم دوستی، معاشرت اور ایک دوسرے کی مدد کا معاملہ نہ کرو۔ پھر فرمایا کہ بعض یہود بعض یہود کے اور بعض نصاریٰ بعض نصاریٰ کے دوست دار ہیں۔ یہ مراد نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ باہم دوست دار ہیں، اس لیے کہ ان کی آپس میں بڑی دشمنی اور عداوت ہے۔ یہود نے کہا ہے کہ نصاریٰ کچھ چیز نہیں۔ نصاریٰ نے کہا ہے کہ یہود کچھ چیز نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ کی باہمی دوستی

---

[1] سیرة ابن إسحاق (۳/ ۲۹۵۔ ۲۹۶) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔

[2] مسند أحمد (۵/ ۲۰۱) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۰۹۴) اس کی سند میں "محمد بن اسحاق" مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٥٩٨)

[3] الدر المنثور (۳/ ۹۸)

ہے کہ وہ دونوں نبی کریم ﷺ کی دشمنی پر ایک دوسرے کے حمایتی اور مددگار ہیں۔ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔

اس جملے کے ساتھ نہی کی علت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس قسم کی دوستی کفار ہی کی شان ہے نہ کہ مسلمین کی۔ تم ان کا سا کام نہ کرو کہ تم بھی اُن کی طرح ہو جاؤ، اسی لیے یہ فرمایا کہ جو کوئی تم میں سے اُن کا دوست دار ہوگا، وہ انھی کی گنتی وشمار میں ہے، کیوں کہ کوئی کسی کو دوست نہیں رکھتا، مگر جب کہ اُس سے راضی ہوتا ہے، جب راضی ہوگا تو اُس کے دین سے بھی راضی رہے گا تو پھر اُسی کے ملت والوں سے ہوا۔ یہ وعید شدید ہے۔ کفر کی موجب وہی نافرمانی ہے جو انتہا درجے کو پہنچ جائے۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں مومنوں کو دوستی کی صورت کا اظہار کرنے پر سخت ڈانٹ ہے، اگرچہ وہ حقیقت میں دوستی نہ ہو۔[1]

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ہے اور سخت ناراضی کا اظہار ہے اس بات پر کہ یہود و نصاریٰ اور ہر مخالفِ دینِ اسلام اور سنتِ خیر الانام کی طرف داری کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔ یہود و نصاریٰ کے دوست ظالم ہیں۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے پاس ایک نصرانی کاتب ہے۔ کہا: تجھ سے اور اُس سے کیا کام؟ اللہ تجھ کو مارے کسی حنیف، یعنی مسلمان کو کاتب بنایا ہوتا، تو نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان نہیں سنا؟ پھر یہ آیت پڑھی: ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اُس کا دین اُس کے لیے ہے، میری کتابت میرے لیے ہے۔ کہا: میں ان کا اِکرام نہ کروں گا، جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کی اہانت کی اور اُن کی عزت نہ کروں گا، جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کو ذلیل کیا۔ ان کو نزدیک نہ کروں گا، جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کو دور کیا۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بصرے کا کام اس کے بغیر نہیں چل سکتا، کہا: ”مَاتَ النَّصْرَانِيُّ وَالسَّلَامُ“، یعنی اگر وہ مر جائے گا تو پھر تو کیا کرے گا؟ سو جو کچھ اس کی موت کے بعد کرتا، وہ ابھی کر اور مسلمان مقرر کر کے اُس سے کام نہ رکھ۔[2]

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: تو دیکھتا ہے کہ جن کے دلوں میں نفاق اور شک کی بیماری ہے، وہ یہود و نصاریٰ کی دوستی اور ان کی خیر خواہی میں کیسے جلد باز ہیں۔ اس لیے کہ وہ اہلِ ثروت وسہولت اور مال دار تھے۔ یہ ان سے میل جول رکھتے تھے۔ یہ آیت ابن ابی اور اُس کے یاروں کے حق میں اُتری ہے، اس خیال سے کہ اگر ان پر کوئی آفت آئے گی تو وہ ان کا ساتھ دیں گے، جیسے لڑائی میں شکست اور قحط جیسے حوادثِ زمانہ۔ مکروہ امر کو ”دائرۃ“ کہتے ہیں اور محبوب امر کو دولت کہتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ اب تم کو کافروں پر فتح ہوتی ہے، جس طرح بنی قریظہ پر ہوئی کہ ان کے بال بچوں تک کو قید کر لیا۔ بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا۔ یا مراد بلادِ مشرکین کا مفتوح ہونا ہے مسلمانوں پر، یا فتح مکہ۔

---

[1] تفسیر أبي السعود (٣/ ٤٨) [2] تفسیر الرازي (١٢/ ١٥)

امر سے مراد منافقین کے معاملے کو ظاہر کر دینا ہے، جو بات ان کے دل میں پوشیدہ تھی، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ظاہر کر دی یا ان کی شان وشوکت اور حملہ کرنے کی صلاحیت کو توڑ دیا یا مسلمانوں کو فراخی اور وسعت دی، اب وہ منافق اپنی دوستی پر پچھتاتے ہیں، مسلمان تعجب کرتے ہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں، جو سخت قسمیں کھا کر ہم سے کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں اور دل میں یہود و نصاریٰ سے دوستی رکھتے تھے، اب ان کے اعمال اکارت گئے، یہ نقصان میں پڑے۔[1] آیتِ باب اس بات پر دلیل ہے کہ مسلمانوں کو سوائے ان مسلمانوں کے جو سچے دل سے اسلام پر قائم و دائم ہیں، کسی منافق بد دین و اہلِ کتاب سے دوستی نہیں رکھنی چاہیے اور جب اہلِ کتاب کی دوستی ممنوع ہوئی تو پھر دیگر کافروں اور مشرکوں کے ساتھ دوستی تو بدرجہ اولیٰ ممنوع ٹھہری۔ اس لیے کہ وہ تو اہلِ کتاب سے بدتر ہیں، جیسے مجوس اور ہنود وغیرہم۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٤﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے، تو پھر اللہ جلد ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرتا ہوگا، اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے، وہ مومنوں پر نرمی کرنے والے ہوں گے اور کافروں پر سختی کرنے والے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ (بڑی) وسعت والا، خوب جاننے والا ہے (54) تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں (55) اور جو کوئی اللہ سے اور اس کے رسول سے دوستی رکھتا ہے اور ان لوگوں سے دوستی رکھتا ہے جو ایمان لائے ہیں، تو (وہ اللہ کا گروہ ہیں اور) یقیناً اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے (56)

---

[1] فتح البیان (۳/ ٤٤٧۔ ٤٥٠)

مرتد ہونے کی صورت میں قوم کی تہدید:

جب نبی اکرم ﷺ کی وفات پر کچھ عرب دین سے پھرے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یمن سے مسلمان بلائے، ان سے جہاد کرایا کہ تمام عرب مسلمان ہوئے، یہ ان کے حق میں بشارت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ عظیمہ سے خبر دی کہ جو کوئی دین کی مدد اور شریعت کو قائم کرنے سے پشت پھیرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کے بدلے ایسے لوگ لائے گا، جو ان سے بہتر اور مقابلہ کرنے میں شدید تر اور سبیل میں زیادہ مضبوط ہوں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد: ٣٨] ”اور اگر تم پھرو گے تو اللہ تمھارے سوا دوسرے لوگ بدل لائے گا، پھر وہ تم جیسے (نافرمان) نہ ہوں گے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ﴾ [النساء: ١٣٣] ”اے لوگو! اگر اللہ چاہے تو تمھیں ہٹا کر تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿١٩﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴾ [إبراهيم: ١٩۔ ٢٠] ”کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔ اور اللہ کے لیے یہ (کام) کچھ بھی مشکل نہیں۔“ یعنی اسے کوئی روکنے والا نہیں اور نہ ہی یہ کوئی مشکل ہے۔[1]

شانِ نزول:

ارتداد سے یہاں مراد یہ ہے کہ حق سے باطل کی طرف لوٹ جائے۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قریش کے دوستوں کے حق میں اُتری ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مرتد ہو گئے تھے، ان کے حق میں اتری ہے۔ ابوبکر بن عیاش نے کہا ہے کہ قوم سے مراد اس جگہ اہلِ قادسیہ ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک قوم سبا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ مراد اہلِ یمن ہیں، پھر کندہ پھر سکون۔[2] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: وہ کون قوم ہے؟ فرمایا: «هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ مِّنْ أَهْلِ الْيَمَنِ، ثُمَّ مِنْ كِنْدَةَ، ثُمَّ مِنَ السُّكُوْنِ، ثُمَّ مِنْ تُجِيْبَ»[3] (وَهٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ جِدًّا) ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اُتری: ﴿ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ﴾ (آیتِ باب) تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «هُمْ قَوْمُ هٰذَا»[4] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير بنحوه)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٩٧) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٥٩۔ ١١٦١) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٩٨)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٦٠) المعجم الأوسط (٢/ ١٠٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ٧/ ٨٠)

[4] تفسیر الطبري (١٠/ ٤١٤۔ ٤١٥) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٦٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٦٨)

یہ جو فرمایا کہ نرم دل ہیں مومنین پر، زبردست ہیں کفار پر، سو یہ صفات مومنین کاملین کی ہیں کہ وہ اپنے بھائی مسلمانوں سے جھکتے ہیں، اپنے دشمن پر تعزز (سختی) کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح: ٢٩] ''وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت مہربان ہیں۔'' نبی اکرم ﷺ کی صفت میں آیا ہے: ''إِنَّهُ الضَّحُوْكُ الْقَتَّالُ''[1] یعنی اپنے اولیا سے خندہ پیشانی سے ملنے والے ہیں، اپنے دشمنوں سے قتال کرتے ہیں۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے، کسی عادل کے عدل سے چاہیں کہ اطاعتِ الٰہی، اقامتِ حدود، قتالِ اعداء، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے باز رہیں کیا ذکر ہے! ان کو ان کاموں سے کوئی روکنے والا روک نہیں سکتا اور کوئی پھیرنے والا پھیر نہیں سکتا، وہ اللہ کی راہ میں شیر مرد ہیں۔ ان کو سوائے اللہ کے کسی کا ڈر نہیں ہے۔

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھ کو میرے خلیل نے سات باتوں کا حکم کیا ہے: مجھے حکم کیا ہے مسکینوں سے محبت کرنے کا، ان کے پاس بیٹھنے کا، حکم کیا مجھ کو کہ میں اپنے سے کم مرتبے کی طرف نظر کروں اور اپنے سے عالی رتبے کی طرف نظر نہ کروں، حکم کیا مجھ کو کہ صلہ رحمی کروں، گو مجھ سے صلہ نہ کیا جائے اور نہ مانگوں کسی سے کچھ، حکم کیا مجھ کو کہ حق کہوں اگرچہ تلخ ہو اور حکم کیا مجھ کو کہ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈروں اور حکم کیا مجھ کو کہ «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» بہت کہوں کہ یہ زیرِ عرش ایک خزانہ ہے۔[2] (رواہ أحمد)

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مجھ سے محمد ﷺ نے پانچ بار بیعت لی اور سات چیزوں کا عہد لیا اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کو گواہ کیا سات بار۔ ایک یہ کہ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈروں، پھر مجھ کو بلا کر فرمایا تو بیعت کرنا چاہتا ہے؟ تیرے لیے جنت ہوگی۔ میں نے کہا: ہاں اور اپنا ہاتھ بڑھایا، فرمایا اور مجھ پر یہ شرط کی کہ لوگوں سے نہ مانگنا، میں نے کہا: بہتر۔ فرمایا: اگر تیرا کوڑا گر پڑے، تب بھی، یعنی اُتر کر اُٹھا لے۔[3] (رواہ أحمد)

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نہ روکے تجھ کو ڈر لوگوں کا حق بات کہنے سے، جب کہ اُس کو دیکھا ہو یا وہاں حاضر ہوا ہو۔ سچ بات یا بڑی بات نہ موت سے نزدیک کرتی ہے نہ رزق سے دور ڈالتی ہے۔[4] (تفرد به أحمد) سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ اس طرح ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں کوئی اپنی جان کو اس بات سے حقیر نہ کرے کہ وہ اللہ کا امر دیکھے اور کچھ نہ کہے۔ اُس سے قیامت کے دن کہیں گے کہ تجھ کو

---

[1] تاريخ الإسلام للذهبي (١/ ٤٨٧) [2] مسند أحمد (٥/ ١٥٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٦٦)

[3] مسند أحمد (٥/ ١٧٢) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٩٨)

[4] مسند أحمد (٣/ ٥٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٨)

کس نے منع کیا کہ تو فلاں فلاں امر میں بولتا؟ وہ کہے گا کہ لوگوں کے ڈر سے نہ بولا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائے گا کہ میں اس کا زیادہ مستحق تھا کہ تو مجھ سے ڈرتا۔[1] (رواہ أحمد)

ان کی روایت کے تیسرے الفاظ مرفوعاً اس طرح ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے سوال کرے گا، یہاں تک کہ یہ پوچھے گا: اے میرے بندے! تو نے منکر کو دیکھا، پھر اُس پر انکار نہ کیا۔ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تلقین حجت سے یوں کہے گا: اے رب! میں نے تجھ پر اعتماد کیا اور لوگوں سے ڈرا۔[2] (رواہ ابن ماجہ) صحیح میں مروی ہے کہ مومن کو لائق نہیں ہے کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، کہا: کس طرح؟ فرمایا: تحمل کرے ایسی بلا کا جس کی طاقت نہیں رکھتا۔[3] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے دے، یعنی جس میں یہ صفات ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی ہے اُس پر۔ اللہ تعالیٰ واسع الفضل ہے، مستحق کو محروم سے جانتا اور پہچانتا ہے۔

پھر فرمایا کہ یہود تمھارے دوست دار نہیں۔ تمھاری دوستی کے لائق اللہ اور رسول اور مومنین ہیں۔ کون مومن؟ وہ جو اکبر ارکانِ اسلام، یعنی نماز کو قائم دائم رکھتے ہیں۔ یہ نماز خاص اس وحدہ لاشریک لہ کے لیے ہے۔ زکات دیتے ہیں، یعنی مخلوق کا حق محتاجوں کی مساعدت اور ضعیفوں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہیں۔ ﴿ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴾ سے جو بعض لوگوں کو یہ وہم ہوا ہے کہ یہ جملہ موضع حال میں ہے اور اس سے مراد حالتِ رکوع میں زکات دینا ہے، ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو زکات کو حالتِ رکوع میں نکالنا زیادہ فضیلت والا کام ہوتا، اس کے مقابلے میں کہ رکوع کے علاوہ کی حالت میں زکات دی جائے، کیوں کہ اس فعل کی تعریف کی گئی ہے۔ حالاں کہ کسی ایک عالم کے نزدیک بھی ائمہ فتویٰ سے یہ بات منقول نہیں ہے۔

اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حق میں اُتری ہے۔ انھوں نے حالتِ رکوع میں اپنی مُہر دے دی تھی۔ عتبہ بن ابی حکیم نے کہا ہے کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد مومنین اور سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ ہیں۔ سلمہ بن کہیل کہتے ہیں: "تَصَدَّقَ عَلِيٌّ بِخَاتَمِهٖ وَهُوَ رَاكِعٌ فَنَزَلَتْ"[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نَزَلَتْ فِيْ عَلِيٍّ تَصَدَّقَ وَهُوَ رَاكِعٌ".[5]

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو البختری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٨٧٢)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨١٨)

[3] ان الفاظ کے ساتھ صحیحین میں روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ دیگر کتبِ حدیث میں روایت موجود ہے۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦١٣)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٦٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٩٩)

[5] تفسير الطبري (١٠/ ٤٢٦)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ”نَزَلَتْ فِي عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ“[1] مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ علی کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک سائل کا گزر ہوا، وہ رکوع میں تھے، اُس کو اپنی انگوٹھی دے دی، اُس پر یہ آیت اُتری۔[2] اس میں بھی ضعف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قصہ مرفوعاً مطولاً بھی مروی ہے۔[3] (رواه ابن مردويه) مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”هٰذَا إِسْنَادٌ لَا يُفْرَحُ بِهٖ“ پھر ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس کو خود علی و عمار بن یاسر و ابو رافع رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے، لیکن اس میں سے کوئی شے صحیح نہیں ہے بسببِ ضعفِ اسانید اور جہالتِ رجال کے۔ پھر باسناد خود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آیت کا نزول مومنین کے حق میں ہوا۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان میں اول ہیں۔[4]

عبدالملک نے کہا ہے کہ میں نے ابوجعفر سے پوچھا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کون ہیں؟ کہا: ”بَلَغَنَا أَنَّهَا نَزَلَتْ فِيْ عَلِيٍّ، قَالَ: عَلِيٌّ مِّنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا“ ”ہمیں خبر پہنچی ہے کہ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی اور کہا ہے کہ علی ان لوگوں سے ہیں، جو ایمان لائے۔“ (رواه ابن جرير) امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت تمام مومنین کے حق میں اُتری ہے۔ لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ایک سائل کا گزر ہوا، وہ مسجد میں رکوع کی حالت میں تھے، انھوں نے اپنی مُہر اُس کو دے دی۔[5] میں کہتا ہوں کہ اس جگہ رکوع سے مراد نماز کا رُکن نہیں ہے، بلکہ نفسِ نماز مراد ہے یا نماز میں خشوع مراد ہوسکتا ہے۔ واللہ أعلم. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جو مسلمان ہوا، وہ اللہ و رسول اور ایمان والوں کا دوست ہوا۔[6]

پہلی حدیثوں میں گزر چکا ہے کہ ان آیات کا نزول سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا ہے، جب کہ انھوں نے یہودیوں کے ساتھ اپنے حلفِ وفاداری اور دوستی سے بیزاری کا اعلان کیا اور اللہ اور رسول اور مومنین سے اپنی دوستی کا اعلان کیا، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے بعد یوں فرمایا ہے کہ جو کوئی دوست دار ہے اللہ اور رسول اور ایمان والوں کا، وہی غالب اور زبردست ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۱ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۹۹) اس کی سند میں ”عبدالوہاب بن مجاہد“ متروک راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۹۹۔ ۱۰۰) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۰۰) اس کی سند میں ”محمد بن سائب کلبی“ متروک راوی ہے۔

[4] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۰۰)

[5] تفسیر الطبري (۱۰/ ٤٢٥۔ ٤٢٦)

[6] تفسیر الطبري (۱۰/ ٤٢٥) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۱٦۲) اس کی سند حسن ہے۔

حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [المجادلة: ٢١۔ ٢٢] ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ قوی، بڑا زبردست ہے۔ (اے نبی!) آپ (ایسی) کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، کہ وہ ان سے دوستی کریں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں، اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کا کنبہ قبیلہ ہو۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور ان کی تائید کی ہے اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ، اور وہ انھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں، یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں، جان لو! بے شک (جو) اللہ کا گروہ ہے، وہی فلاح پانے والا ہے۔''

غرضیکہ جب کوئی اللہ اور رسول اور اللہ پر ایمان لانے والوں کی دوستی پر راضی ہے، وہی دنیا اور آخرت میں فلاح پانے والا اور مدد کیا ہوا ہے۔ اسی لیے اس جگہ ایسے فرمایا کہ جو کوئی اللہ اور رسول اور ایمان والوں کا دوست ہے، وہی غالب گروہ ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم. دوستی اور براءت کا مسئلہ اسی جگہ سے نکلا ہے۔ اصل ''تَولِّي'' یہ ہے کہ جو اللہ و رسول و صحابۂ مقبول و اہلِ بیت بتول کے سچے دوست دار ہیں، وہ مومن کامل ہیں۔ اصل تبرّا یہ ہے کہ جو اللہ اور رسول کا دشمن ہے، گو وہ اپنا کیسا ہی قریبی اور عزیز ہو، اُس کا آپ بھی دشمن رہے، جن میں یہ دونوں صفتیں ہوں، وہ اللہ کی طرف سے روح اللہ کے مؤید ہیں، جنت انھی کے لیے ہے، اللہ سے وہ راضی۔ اللہ اُن سے راضی۔ فلاح والا گروہ یہی گروہ ہے۔ خارجی و ناصبی و رافضی اس آیت کے مقصد اور مفہوم سے خارج ہیں اور اس آیت کے مصداق خاص اہلِ سنت ہیں، یعنی عاملینِ حدیث۔ وللّٰہِ الْحَمْد.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہوا ہے کہ جب یہ فرما دیا کہ مسلمان کی کافروں کے ساتھ دوستی کفر ہے تو اب مرتد لوگوں کے بارے میں احکام کا ذکر فرمایا۔ زمخشری نے کہا ہے کہ عرب کے گیارہ گروہ مرتد ہوئے تھے۔ تین نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں: ایک بنو مدلج جن کا رئیس ذوالحمار تھا۔ دوسرے بنو حنیفہ وہ مسیلمہ کذاب کی قوم تھی۔ تیسرے بنو اسد وہ طلحہ بن خویلد کی قوم تھے۔ سات گروہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مرتد ہوئے: ایک فزارہ عیینہ بن حصن فرازی کی قوم۔ دوسری غطفان، قرہ بن سلمہ قشیری کی قوم۔ تیسری بنو سلیم فجارہ بن عبد یالیل کی قوم۔ چوتھی بنو یربوع مالک بن بریدہ کی قوم۔ پانچویں بعض تمیم، سجاح بنت منذر کی قوم۔ چھٹی کندہ، اشعث بن قیس کندی کی قوم۔ ساتویں بنو بکر بن وائل، خطمی بن یزید کی قوم۔ اللہ تعالیٰ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ان کا کام تمام کیا۔ ایک فرقہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مرتد ہو گیا تھا: غسان جبلہ بن ایہم کی قوم۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ختم کیا۔[1]

---

[1] تفسیر الکشاف (١/ ٦٧٧۔ ٦٧٨)

اس قوم سے، جن کے لانے کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے وعدہ کیا تھا، ابوبکر مع صحابہ وتابعین کے لشکر کے مراد ہیں، جن کو وہ اپنے ہمراہ لے کر مرتد لوگوں سے لڑے، پھر وہ سب لوگ جو اُن کے بعد آئے اور تمام زمانوں میں مرتد لوگوں سے لڑے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ انبیا کے بعد ابوبکر صدیق سے زیادہ افضل کوئی پیدا نہ ہوا۔ مرتد لوگوں کے ساتھ لڑائی کرنے میں انبیا میں سے ایک نبی کے قائم مقام ہوئے۔ جب ابوبکر نے ان سے لڑنے کا ارادہ کیا تو بعض صحابہ کرام کو مکروہ معلوم ہوا۔

بعض نے کہا کہ وہ اہلِ قبلہ ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار لی اور اکیلے نکلے، آخر لوگوں سے سوائے اس کے کچھ نہ بنا کہ ان کے ہمراہ جائیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ”كَرِهْنَا ذٰلِكَ فِي الْاِبْتِدَاءِ ثُمَّ حَمِدْنَاهُ فِي الْاِنْتِهَاءِ“[1] ”ہم نے اس کو شروع میں مکروہ سمجھا، پھر آخر میں ہم نے اُس کی تعریف کی۔“ امام حاکم وبیہقی رحمہ اللہ نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ آیت پڑھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «قَوْمُكَ يَا أَبَا مُوسىٰ أَهْلُ الْيَمَنِ»[2] (وَفِي الْبَابِ رِوَايَاتٌ) ”اے ابوموسیٰ! تیری قوم اہلِ یمن ہیں۔“ (اور اس باب میں اور روایات ہیں) اس میں یمن والوں کی بڑی فضیلت ہے۔

گویا قرآن وحدیث دونوں سے اہلِ یمن کی تعریف ثابت ہوئی۔ وللّٰہ الحمد. یہ جگہ اہلِ یمن کے فضائل بیان کرنے کی نہیں ہے، ورنہ ہم اس مقام پر ان کی کچھ خوبیوں پر کلام کرتے، جس طرح دوسری جگہ کیا ہے اور کچھ نہ سہی، فقط یہ ایک آیت ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ﴾ اور یہ ایک حدیث صحیح مسلم کی: «اَلْإِيْمَانُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ وَالْفِقْهُ يَمَانٍ»[3] ”ایمان یمن میں ہے اور دانائی یمن کی اور فقہ یمن کی ہے۔“ اہلِ یمن کے ترجیحی ایمان اور اُن کی کتاب دانی اور سنت شناسی اور فقہ دانی کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک ہمیشہ سے مجتہد خیز رہا ہے، مقلد وہاں کم تر پیدا ہوئے، جو ہوئے وہ بھی غالباً متبع دلیل تھے اور تقلید پر جامد نہیں تھے۔ قرآن وحدیث کے علوم کی جو اشاعت اس مبارک کنارے، اس بابرکت خطے اور پاک سرزمین سے ہوئی، وہ کسی اور ملک اور شہر سے نہ دیکھی نہ سنی گئی۔

﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [البقرة: ١٠٥] اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک تعریف تو یہ فرمائی کہ اللہ ان کو دوست رکھتا ہے اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں اور ان کی دوسری صفت یہ بیان کی کہ وہ مومنین کے حق میں رحیم اور کریم ہیں اور دشمنوں پر سخت گیر اور قوی ہیں۔ (قاله عليٌّ) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تو دیکھتا ہے اُن کو کہ وہ اہلِ ایمان کے حق میں ایسے ہیں، جیسے بیٹا باپ کے لیے ہوتا ہے یا جیسے غلام اپنے آقا کے حق میں ہوتا ہے اور

[1] تفسير البغوي (٣/ ٦٩۔ ٧٠)

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٢) الدر المنثور (٣/ ١٠٢) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ فتح البيان (٣/ ٤٥١۔ ٤٥٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢)

کافروں پر سختی کے اعتبار سے ایسے ہیں، جیسے کوئی درندہ گھوڑے کے بچے پر جھپٹتا ہے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی اس بات پر تعریف کی ہے کہ جب وہ مومنوں سے ملتے ہیں تو تواضع اور انکساری کرتے ہیں اور جب کافروں سے ملتے ہیں تو سختی اور سرزنش سے پیش آتے ہیں۔[1]

"ذِلٌ" سے اس جگہ کچھ ذلت اور خواری مراد نہیں ہے، بلکہ شفقت اور رحمت مراد ہے۔ پھر تیسری صفت یہ فرمائی کہ ان میں دو خاصیتیں جمع ہیں، ایک اللہ کے راستے میں خوب کوشش کرنا اور دوسرے، دین میں کسی ملامت کا خوف نہ ہونا، بلکہ وہ ایسے پکے اور مضبوط ہیں کہ حق کے دشمنوں اور شیطان کے ساتھیوں کی ریشہ دوانیوں کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ وہ دشمن اپنے بغض سے دین کو عیب لگایا کریں، اس کی خوبیوں کو برائیاں کر کے دکھایا کریں، ان کی اچھائیوں کو برائیاں ٹھہرایا کریں، مگر ان کی نورانی پیشانی پر ان کی شیطانی کارستانی سے کوئی ذرا سا بھی اثر نہیں ہوتا۔ ان کے اندر اس قسم کی صفتوں کا پایا جانا، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور آیندہ بھی دیتا رہے گا، کیوں کہ وہ واسع الفضل کثیر العلم ہے۔ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

"یہ خوش قسمتی کسی کے بازوؤں کی طاقت، یعنی کوشش کا نتیجہ نہیں، جب تک عطا کرنے والا عطا نہ کرے۔" اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ.

رکوع سے اس جگہ مراد خشوع وخضوع ہے، یعنی وہ لوگ متکبر نہیں ہیں۔ زکات کو زکات کی جگہ میں خرچ کرتے ہیں۔ فقرا پر برتری نہیں جتاتے اور غرور نہیں کرتے۔ پھر فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حزب یعنی اس کے دین کے انصار جو اللہ اور رسول اور مومنین، یعنی مہاجرین اور انصار کے دوست ہیں اور جو ان کے بعد آئیں گے، وہی دلائل اور حجتوں کے ساتھ غالب ہیں نہ کہ دولت اور صولت کے ساتھ، ورنہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بارہا حزب اللہ حکمتِ بالغہ کے تقاضا کے تحت بارہا مغلوب بھی ہوا ہے۔ آیتِ شریفہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اس بات پر کہ اللہ اور رسول کے محبان اعدائے دین پر غالب رہیں گے، خواہ وہ اعدا اس ملت کے ہوں یا غیر ملت کے اور خواہ وہ غلبہ حجت اور دلیل سے ہو یا تلوار اور نیزوں سے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پہلے یوں پورا ہوا کہ مسلمان یہود پر غالب ہوئے، کسی کو گرفتار کیا، کسی کو قتل کیا، کسی کو جلا وطن کیا، کسی پر جزیہ لگایا، یہاں تک کہ وہ ۔لعنھم اللہ۔ ذلیل ترین کافروں کی جماعتیں ہوگئیں۔ ان کی شان وشوکت بالکل گھٹ گئی۔ مومنین کے کلکل کے نیچے آگئے۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں، ان کو پیٹتے ہیں اور خوار وذلیل کرتے ہیں، بعثتِ محمدیہ ﷺ سے اب تک اسلام کے ان شہروں میں جس پر مسلمان بادشاہ حکمران ہیں، یہی کیفیت باقی ہے۔ رہا دلیل

[1] تفسیر الخازن (٢/ ٦٦)

کے ساتھ غلبہ، سو باوجود ہزار ضعفِ ایمان اور غربتِ اسلام اور ملک و دولت کے فقدان اور حکومت و سلطنتِ اسلام نہ ہونے کے بحمدہٖ تعالیٰ روئے زمین کے ہر کنارے پر علمائے اسلام تمام کفریہ جماعتوں اور فرقوں پر حجت اور دلیل پر غالب ہیں۔ آج تک کسی جگہ دیکھا اور سنا نہیں گیا کہ زبانی یا تحریری مناظرے میں کوئی کتابی یا کسی دین و مذہب کا کوئی آدمی کسی مردِ اسلامی پر فتح یاب ہوا ہو، بلکہ ہمیشہ کامیابی کا جھنڈا اہلِ اسلام ہی کے ہاتھ رہا۔ وللہ الحمد.

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ
هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ
اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى
الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا
يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمھارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا لیا ہے، ان لوگوں میں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور جو کافر ہیں اور اللہ سے ڈرتے رہو، اگر تم مومن ہو (57) اور جب تم انھیں نماز کی طرف بلاتے ہو تو وہ اسے ہنسی اور کھیل بنا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بلاشبہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے (58)

کفار اور دین کو مذاق بنانے والے سے دوستی نہ کرنا:

بعض یہود اور بعض مشرک اذان کی آواز پر ہنستے، یہ ان کی بے عقلی تھی۔ اللہ کی بڑائی ہر دین میں بہتر ہے۔ آیتِ باب اسلام کے دشمنوں سے، خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرک، نفرت دلاتی ہے، کیوں کہ وہ تمام اعمال سے افضل عمل کو، یعنی اسلام کی شریعتِ مطہرہ ومحکمہ کو جو دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی بھلائی پر مشتمل ہے، کو ایک ہنسی کی بات ٹھہرا کر یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ وہ ان کی فسادی نظر اور منجمد فکر میں ایک طرح کا کھیل تماشا ہے، جیسے کسی کہنے والے نے کہا ہے

وَكَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلًا صَحِيْحًا   وَآفَتُهُ مِنَ الْفَهْمِ السَّقِيْمِ (1)

اس جگہ کفار سے مراد مشرکین ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں پڑھا ہے۔ "مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا" (2) یعنی اگر تم ایمان رکھتے ہو تو پھر ان دشمنانِ دین سے یارانہ نہ رکھو، دوستی کا برتاؤ نہ کرو، جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ [آلِ عمران: ۲۸]

(1) کتنے ایسے لوگ ہیں جو محض اپنی کج فہمی کی وجہ سے صحیح بات میں عیب نکالتے ہیں!

(2) تفسير الطبري (۱۰/ ۴۳۰)

"اہلِ ایمان، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ہرگز دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، الا یہ کہ تم ان (کافروں کے شر) سے بچنا چاہو اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور تمھیں اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

پھر فرمایا اسی طرح وہ ایک یہ کام بھی کرتے ہیں کہ جب تم نماز کے لیے اذان دیتے ہو، جو افضل اعمال ہے تو وہ اس پر بھی ہنسی کھیل کرتے ہیں۔ نہ معنی عبادت کے سمجھتے ہیں اور نہ شریعت کو بوجھتے ہیں۔ یہ اتباع شیطان کی صفات ہیں، اس لیے کہ شیطان بھی اذان سن کر پھر کر گوز کرتا ہوا چل دیتا ہے، تاکہ وہ یہ مبارک آواز نہ سنے، جب اذان ہو چکتی ہے، پھر آ موجود ہوتا ہے۔ جب اقامت ہوتی ہے، بھاگ جاتا ہے، جب ہو چکتی ہے تو آ کر آدمی اور اس کے دل کے درمیان وسوسے ڈالتا ہے، کہتا ہے کہ تو یہ بات وہ بات یاد کر جو اس کو یاد نہ تھی، یہاں تک کہ وہ بیچارہ نہیں جانتا کہ کتنی نماز پڑھی۔ سو جب تم میں کوئی شخص یہ حال پائے تو سلام سے پہلے دو سجدے کرے۔[1] (متفق علیه)

اذان کا ذکر:

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس آیت میں اذان کا ذکر کیا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدینے میں ایک نصرانی تھا، وہ جب اذان میں یہ سنتا: "أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ" وہ کہتا: "حَرَقَ الْكَذَّابُ" یعنی دروغ گو جل جائے۔ ایک رات خادمہ آگ لائی، وہ اور اُس کے گھر والے سو رہے تھے، ایک چنگاری آگ کی گر گئی، سارا گھر جل گیا، وہ اور اُس کے گھر والے سب خاک سیاہ ہو گئے۔[2] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم)

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں لکھا ہے کہ فتح مکہ کے سال جب نبی اکرم ﷺ کعبے میں داخل ہوئے، بلال ہمراہ تھے، فرمایا: اذان کہو، ابوسفیان، عتاب بن اُسید اور حارث بن ہشام صحنِ کعبہ میں بیٹھے تھے۔ عتاب نے کہا: اللہ نے اُسید کا اکرام کیا کہ اُس نے یہ اذان نہ سنی، وہ سنتا تو غصہ کرتا۔ حارث نے کہا: واللہ! اگر میں جانوں کہ وہ حق پر ہے تو میں اُس کی پیروی کروں۔ ابوسفیان نے کہا کہ میں کچھ نہیں کہتا۔ اگر کچھ بولتا ہوں تو یہ کنکریاں ابھی اس کو خبر کر دیں گی، اتنے میں نبی اکرم ﷺ آئے، فرمایا: مجھے معلوم ہے، جو تم نے کہا، پھر وہ ذکر کیا۔ حارث و عتاب نے کہا: "نَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔" یہ بات کوئی اور نہیں جانتا کہ ہم یہ کہیں کہ اُس نے آپ کو خبر دی ہے۔[3]

عبداللہ بن محیریز نے کہا کہ میں نے ابو محذورہ سے کہا: اے چچا! میں شام کی طرف جانے والا ہوں، مجھے ڈر ہے کہ کوئی مجھ سے تمھارے اذان دینے کے بارے میں پوچھے گا۔ سو تم مجھے بتا دو، کہا: اچھا! میں لوگوں کے ساتھ حنین

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٩)

[2] تفسير الطبري (١٠/ ٤٣٢) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٦٤) [3] السيرة النبوية لابن هشام (٥/ ٧٥)

کے بعض راستوں میں نکلا، وہاں نبی اکرم ﷺ کا قافلہ پڑا ہوا تھا، ہم نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، ان کے مؤذن نے نبی اکرم ﷺ کے پاس اذان دی، ہم نے وہ اذان سنی، ہم تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، ہنسی کے طور پر ہم بھی چلائے، نبی اکرم ﷺ نے سن لیا، آدمی بھیج کر ہم کو بلایا، ہم سامنے آ کر کھڑے ہوئے۔ فرمایا: تم میں سے کس کی آواز میں نے سنی کہ وہ چلاتا تھا، ساری قوم نے میرا نام لے دیا اور سچ بتایا، نبی اکرم ﷺ نے سب کو چھوڑ کر مجھے پکڑ رکھا اور فرمایا: اُٹھ اذان کہہ، میں کھڑا ہوگیا، نبی اکرم ﷺ سے زیادہ ناپسند مجھے اور کوئی چیز نہیں تھی اور نہ اُن کے اس حکم سے۔ میں آپ کے سامنے کھڑا ہوا، مجھ کو آپ نے خود اذان کہنا سکھلایا، فرمایا: کہہ ”اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ“ جب میں اذان کہہ چکا، مجھ کو بلا کر ایک تھیلی دی، جس میں کچھ چاندی تھی، پھر اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ کر منہ پر پھیرا، پھر سینے پر، پھر جگر پر، یہاں تک کہ دستِ مبارک میری ناف تک پہنچایا۔

پھر فرمایا: ”بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ وَبَارَكَ عَلَيْكَ“ ”اللہ تجھ میں برکت دے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے۔“ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ کو مکے میں اذان کہنے کا حکم دو، فرمایا: حکم دیا۔ مجھے جس قدر رسول اللہ ﷺ سے کراہت تھی، وہ سب جاتی رہی، اتنی ہی محبت آ گئی۔ پھر میں نبی اکرم ﷺ کے عامل عتاب بن اُسید کے پاس گیا، ان کے پاس رہ کر نبی اکرم ﷺ کے حکم سے اذان دیتا رہا۔ ابو محذورہ کا نام سمرہ بن مغیرہ بن لوذان ہے۔ یہ چار مؤذنوں میں سے ایک تھے، جو اہلِ مکہ کے لیے اذان دیتے تھے، ان کی عمر بہت ہوئی، رضی اللہ عنہ۔[1] (رواه أحمد)

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ان لوگوں سے دوستی نہ رکھنے کا حکم، جنھوں نے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، عام ہے۔ یعنی ہر اس شخص سے جو ایسا کام کرے، وہ خواہ مشرک ہو یا اہلِ کتاب ہو یا بدعتی مسلمان یا منافق ہو۔ اذان کا ذکر قرآن شریف میں اسی جگہ ہے۔ سورۃ الجمعہ میں جو ندا کا ذکر آیا ہے وہ جمعہ کی اذان کے ساتھ خاص ہے۔ اذان کے واجب یا غیر واجب ہونے اور اس کے الفاظ میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ اللہ نے اہلِ ہزو ولعب (ہنسی مذاق اور کھیل کود کرنے والے) کو بے وقوف، ہلکے اور طیش کے مستحق ٹھہرایا ہے، بے عقل وشعور بتایا ہے۔[2]

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۵۹
قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۳۷۹) مسند أحمد (۳/ ۴۰۹)
[2] فتح البيان (۳/ ۴۵۴۔ ۴۵۵)

لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ
وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ
السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ
وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ
السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ
الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! کیا تم ہم سے صرف اس وجہ سے ناراض ہوتے ہو کہ ہم اللہ پر اور جو (چیز) ہماری طرف نازل کی گئی اور (ہم سے) پہلے نازل کی گئی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور بے شک تم میں سے اکثر نافرمان ہیں 59 (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا میں تمھیں (اس شخص کے بارے میں) نہ بتا دوں جو جزا کے اعتبار سے، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بدتر ہے؟ یہ وہ شخص ہے کہ اللہ نے اس پر لعنت کی اور اس پر اپنا غضب نازل کیا، اور ان میں سے بعض کو بندر اور سؤر بنا دیا، اور اس شخص نے شیطان کی بندگی کی، وہی لوگ بدتر درجے میں ہیں اور سیدھی راہ سے وہ سب سے زیادہ گمراہ ہیں 60 اور جب وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ کفر کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ نکل گئے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں 61 اور آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ گناہ، زیادتی اور حرام کھانے میں جلدی کرتے ہیں، بہت برا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں 62 رب والے اور ان کے علما انھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ بہت برا ہے جو کچھ وہ (اپنے لیے) تیار کر رہے ہیں 63

ایمان کی وجہ سے اہلِ کتاب کا انتقام لینا:

اللہ پاک کہتا ہے کہ اے پیغمبر! تم ان ہنسی کھیل والوں سے کہہ دو کہ تم ہم پر یہی طعن وعیب لگاتے ہو، سو یہ کچھ عیب و مذمت کی بات نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ [البروج: 8] ”اور انھیں ان (مومنوں) کا یہی کام برا معلوم ہوا کہ وہ اللہ، غالب، قابلِ تعریف پر

ایمان لائے تھے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾
[التوبة: ٧٤] ''اور انھوں نے غصہ نہیں نکالا، مگر اس بات پر کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے انھیں غنی کر دیا۔''

متفق علیہ حدیث میں مروی ہے: «مَا يَنْقِمُ ابْنُ جَمِيْلٍ إِلَّا أَنْ كَانَ فَقِيْراً فَأَغْنَاهُ اللّٰهُ»[1] پھر فرمایا کہ تم میں اکثر آدمی سیدھے راستے سے خارج ہیں، جو جزا تم ہماری خیال کرتے ہو، ہم بتا دیں کہ اُس سے بھی بدتر جزا والے تم ہو، اللہ تعالیٰ نے تم پر لعنت کی، تم کو بندر سور بندۂ شیطان بنا دیا۔ جس طرح سورت بقرہ میں گزر چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا یہ بندر اور سؤر وہی ہیں، جن کی صورتیں مسخ کی گئی تھیں؟ فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی قوم کو ہلاک یا مسخ نہیں کیا اور پھر ان کی نسل یا عقب رکھی ہو۔ (یعنی ان کی نسل نہیں چلتی) بندر اور سؤر اُن سے پہلے بھی تھے۔[2] (رواہ مسلم)

روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کیا یہ بندر و سؤر وہی نسلِ یہود ہیں؟ فرمایا: نہیں اللہ نے کسی قوم پر لعنت نہیں کی، مسخ نہیں کیا، پھر ان کی نسل باقی ہو، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی پہلے سے ایک مخلوق ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہود پر غضب کیا، ان کو مسخ کر کے ان کے مثل کر دیا۔[3] (رواہ أبو داود الطیالسي و رواہ أحمد)
سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ سانپ مسخ شدہ جنات ہیں، جس طرح بندر و سؤر مسخ ہو گئے۔[4] (رواہ ابن مردویہ) یہ حدیث غریب ہے۔

﴿ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ﴾ ماضی کے صیغے اور اضافت کے ساتھ، دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ یعنی ان میں وہ تھے، جنھوں نے طاغوت کو پوجا، ان میں طاغوت کے خادم اور غلام ہیں۔ عابد الطاغوت بھی ایک قراءت ہے۔ ''عُبِدَ'' بصیغہ مجہول بھی پڑھا گیا ہے، یعنی تم میں طاغوت بھی پوجا گیا، یہ کام تمھیں نے کیا ہے۔ قراءت کوئی بھی ہو مطلب سب کا یہی ہے کہ اے کتاب والو! تم جو ہمارے دین میں طعن کرتے ہو، یعنی توحید اور صرف اللہ ہی کی عبادت پر، تم سے اس طعن کا صادر ہونا بہت دور کی بات ہے۔ اس لیے کہ تم میں ایسے لوگ تھے، جن کا ذکر ہوا، اس لیے یوں فرمایا کہ وہ جگہ اور ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر ہیں اور راہ کے لحاظ سے گمراہ تر ہیں، جس کا تم ہمارے ساتھ گمان کرتے ہو۔

پھر منافقوں کا حال بیان فرمایا کہ وہ ظاہر میں تو مومنوں سے میل رکھتے ہیں اور دل ان کے کفر پر جمے ہوئے ہیں، اسی لیے یہ کہا کہ اے رسول! جب یہ تمھارے پاس سے نکلتے ہیں تو وہی کفر لے کر نکلتے ہیں، جس طرح کہ کفر لے کر آئے تھے، اُن کو تمھارے علم و نصیحتوں اور سرزنشوں سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ سو وہ حق بات کو کتنا ہی کیوں نہ چھپائیں، اللہ کو اُن کے ضمیروں اور پوشیدہ باتوں کا پورا علم ہے۔ وہ ظاہر میں مومن بنا کریں، اس سے کیا ہوتا ہے؟

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣٩٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٨٣) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٣)
[3] مسند الطیالسي (١/ ٣٩) مسند أحمد (١/ ٣٩٥) اس کی سند میں ''ابو الاعین عبدی'' ضعیف راوی ہے۔
[4] المعجم الکبیر (١١/ ٣٤١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٨٢٤)

عالم غیب وشہادت پر اُن کا حال مخفی نہیں ہے۔ ان میں اکثر کا حال یہ ہے کہ حرام کاری اور گناہ کے کام بجالاتے ہیں، لوگوں پر دست درازی اور زبردستی کرتے ہیں، ان کا مال ناحق کھاتے ہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سستی پر مشائخ کی مذمت:

علما و مشائخ نے ان کو ان حرکات سے کیوں منع نہ کیا؟ اُن کا انھیں اس حالت پر چھوڑ دینا بہت برا کام ہے۔ ﴿ اَلرَّبّٰنِيُّوْنَ ﴾ سے علما، عمال اور ولی مراد ہیں اور ﴿ اَلْاَحْبَارُ ﴾ سے فقط علما مراد ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قرآن میں اس آیت سے زیادہ اور کوئی آیت ڈانٹ ڈپٹ والی نہیں ہے: ﴿ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ ﴾[1] (آیتِ باب) امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: "مَا فِي الْقُرْآنِ آيَةٌ أَخْوَفُ عِنْدِيْ مِنْهَا"[2] "میرے نزدیک قرآن میں اس سے زیادہ خوف دلانے والی کوئی آیت نہیں۔" سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی، پھر کہا: اے لوگو! تم سے اگلے لوگ جو ہلاک ہوگئے، وہ انھی گناہوں کی وجہ سے ہوئے۔ ان کو مشائخ وعلما نے منع نہ کیا، جب وہ بڑھ گئے تو اللہ کی سزا نے ان کو پکڑ لیا۔ سو تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، اس سے پہلے کہ جو آفت ان پر آئی تھی، وہ تم پر آئے اور جان لو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے نہ تو رزق کم ہوتا ہے اور نہ موت زیادہ قریب آتی ہے۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

سیدنا جریر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «مَا مِنْ قَوْمٍ يَكُوْنُ بَيْنَ أَظْهُرِهِمْ مَنْ يَّعْمَلُ بِالْمَعَاصِيْ هُمْ أَعَزُّ مِنْهُ وَأَمْنَعُ وَلَمْ يُغَيِّرُوْا إِلَّا أَصَابَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعَذَابٍ»[4] "کوئی قوم ایسی نہیں جن کے درمیان ایسے لوگ ہوں، جو گناہ کرتے ہوں اور وہ ان کے نزدیک باعزت ہوں اور وہ انھیں ان گناہوں سے منع نہ کریں، مگر اللہ ان پر عذاب لے آتا ہے۔" (رواہ أحمد و تفرد به) ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا جریر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کی ہے: «مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَّعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ أَنْ يُّغَيِّرُوْا عَلَيْهِ فَلَا يُغَيِّرُوْنَ إِلَّا أَصَابَهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ أَنْ يَّمُوْتُوْا» "اگر کسی قوم میں کوئی ایسا شخص ہے، جو معاصی کا ارتکاب کرتا ہے اور وہ قدرت رکھتے ہوئے بھی اُس کو باز نہیں رکھتے تو اللہ اُس قوم کو ان کی موت سے پہلے سزا دیتا ہے۔"[5] (و رواہ ابن ماجه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ تَنْقِمُوْنَ ﴾ بہ معنی "تَسْخَطُوْنَ" یا "تُنْكِرُوْنَ" یا "تَعِيْبُوْنَ" یا "تَكْرَهُوْنَ" یعنی تم کو ہماری یہ بات بری لگتی ہے کہ ہم اللہ اور اُس کی کتابوں پر ایمان لائے ہیں۔ سو یہ بات کچھ انکار کی نہیں

---

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٤٤٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ خالد بن دینار رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١٠/ ٤٤٩) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٦٦۔ ١١٦٧) اس کی سند میں "ثابت ابو سعید" مجہول راوی ہے۔

[4] مسند أحمد (٤/ ٣٦٣) یہ روایت حسن ہے۔

[5] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٣٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٠٠٩) صحیح الترغیب والترھیب (٢/ ٢٨٦)

ہے۔ تم آپ دیکھو کہ تم میں سے اکثر فاسق اور بے ایمان ہیں۔[1] عیب کی بات یہ ہے یا وہ جو ہم میں ہے؟! منافقین یہود جب نبی اکرم ﷺ کے پاس آتے، اپنا ایمان ظاہر کرتے، دل میں کفر بسا ہوتا اور جب جاتے تو دل سے اسی طرح کافر جاتے۔ نبی کریم ﷺ کو تو دھوکا دیتے ہیں، لیکن اللہ پر ان کی ہر چھپی بات ظاہر ہے۔ مسارعت کسی کام کی طرف شتابی کرنے کو کہتے ہیں۔

﴿ اَلْاِثْمِ ﴾ سے مراد جھوٹ ہے یا شرک یا حرام ہے۔ ﴿ اَلْعُدْوَانِ ﴾ سے مراد ظلم اور دوسروں کے ساتھ زیادتی کرنا یا گناہوں میں حد سے بڑھ جانا ہے۔ ﴿ اَلسُّحْتَ ﴾ سے مراد حرام ہے۔ اس میں رشوت اور ہر حرام کھانا شامل ہے۔ پھر مشائخ اور علما کو لتاڑا۔ ان پر لے دے کی کہ اے درویشو! مولویو! تم نے امر و نہی کرنا کیوں چھوڑ دیا؟ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلرَّبّٰنِيُّوْنَ ﴾ سے مراد نصاریٰ کے علما ہیں، یعنی پادری لوگ۔ ﴿ اَلْاَحْبَارُ ﴾ سے مراد علماے یہود ہیں۔[2] بعض نے کہا ہے کہ دونوں سے یہود ہی کے علما مراد ہیں۔ اس لیے کہ آیت انھی کے حق میں اُتری ہے۔ یہ کام ان درویشو اور مولویوں نے بہت برا کیا کہ امر و نہی کرنا چھوڑ دیا۔

لفظ ﴿ يَصْنَعُوْنَ ﴾ لفظ ﴿ يَعْمَلُوْنَ ﴾ سے بڑھ کر ہے کہ عمل صنع کے درجے کو جب ہی پہنچتا ہے کہ عامل خود بھی وہ کام کرے، عمل صرف کام کرنے کو کہتے ہیں اور صنع مکمل اور عمدہ کام کو کہتے ہیں۔ اللہ پاک نے علما کو ڈانٹا، ان پر بہ نسبت گناہ کے مرتکب لوگوں کے زیادہ سختی اور شدت کی۔ اب ذرا اہلِ علم اپنے کان اور آنکھ کھول کر اس آیت کے معنی سمجھیں، کیوں کہ اس آیتِ کریمہ میں اس بات کا مکمل بیان ہے کہ علما کا خود گناہوں سے باز رہنا اور گناہ گاروں کو ان کے گناہوں سے نہ روکنا، کچھ فائدہ مند نہیں ہے۔ بلکہ ان کا وبال ان گناہ گاروں کے وبال اور حال سے زیادہ سخت اور بڑھ کر ہے۔ اللہ اس عالم پر رحم کرے، جو اس فریضہ امر و نہی پر قائم ہے، کیوں کہ اُس کے ذمے بڑا واجب یہی کام ہے۔

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جو شخص گناہوں سے روکتا نہیں، وہ گناہ کرنے والے کے برابر ہوتا ہے، اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس آیت پاک میں فریقین کی مذمت کی ہے کہ اگر ہم منکرات کو بدلنے اور مٹانے کے لیے اپنا ہاتھ استعمال نہیں کرتے تو ہماری زبان و تحریر اور دل و قلب کو کس نے روکا ہے؟ آخر کسی سے حق بات منوانے کا تو ذمہ ہم پر نہیں ہے، ہمارا ذمہ تو بس پہنچا دینا ہے، خواہ کوئی مانے یا نہ مانے، ہم زبان و دل سے تو کوتاہی نہ کریں، شاید اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرے، ہمارے بے دست و پا ہونے پر کرم فرما دے ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر! | مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

---

[1] فتح البيان (٣/ ٤٥٥۔ ٤٥٦) [2] تفسير القرطبي (٦/ ٢٣٧)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ
وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ
يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ
رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ
وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ
اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ
الْمُفْسِدِيْنَ ۝64 وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا
عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝65 وَلَوْ اَنَّهُمْ
اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ
لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ
مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝66

اور یہودیوں نے کہا: ''اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔'' بندھ گئے انھی کے ہاتھ، اور لعنت پڑی ان پر ان کے اس قول (ان کی اس بکواس) کی وجہ سے، بلکہ اللہ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ جیسے چاہے خرچ کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں ضرور اضافے کا باعث بنے گا اور ہم نے قیامت کے دن تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔ جب کبھی وہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا 64 اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آئیں اور پرہیزگاری اختیار کرلیں تو یقیناً ہم ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں گے اور انھیں نعمت والے باغوں میں ضرور داخل کریں گے 65 اور اگر یقیناً وہ تورات اور انجیل اور اپنے رب کی طرف سے نازل کی گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک عمل کرتے تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (وافر رزق) کھاتے، ان میں سے ایک گروہ درمیانی راہ چلنے والا ہے۔ اور ان میں سے زیادہ تر لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ برا ہے 66

اللہ کے متعلق یہود کا عقیدہ:

یہود میں یہ بولنا رواج تھا کہ اللہ کا ہاتھ بند ہوا۔ یعنی ہم پر روزی تنگ ہوئی۔ یہ کفر کا لفظ ہے، فرمایا کہ اللہ کا

ہاتھ کبھی بند نہیں ہوتا، اُس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ قہر کا اور محبت کا۔ تم پر اب قہر کا ہاتھ کھلا اور اُن پر مہر و محبت کا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن میں اتفاق نہیں رکھا، جب آگ سلگاتے ہیں لڑائی کے لیے، یعنی فتنہ انگیزی کرتے ہیں کہ آپس میں سب کو ملا کر مسلمانوں سے لڑیں تو اللہ اُس آگ کو بجھا دیتا ہے۔ آپس میں پھوٹ جاتے ہیں۔ اوپر نیچے سے کھائیں، یعنی آسمان اور زمین سے ان کو فراخ رزق ملے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ پاک میں خبر دی ہے کہ یہود۔ علیہم لعائن اللہ۔ کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کو بخیل کہتے ہیں، جس طرح اپنے آپ کو اغنیا اور اس کو فقیر کہتے تھے۔ تَعَالیٰ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيراً. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ مَغْلُوْلَةٌ ﴾ "أَيْ بَخِيلَةٌ". دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مغلول ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ بندھا ہوا ہے، بلکہ یہ مراد ہے کہ بخل سے اپنا ہاتھ روک لیا ہے۔ یہی امام مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدی اور ضحاک رحمہ اللہ کا بھی قول ہے۔[1]

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٩] "اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا نہ رکھ اور نہ اسے پوری طرح کھول دے کہ پھر ملامت زدہ، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے۔" یعنی فضول خرچی اور تبذیر سے منع کیا ہے۔ تبذیر زیادہ اور بے محل خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ ہاتھ کا گلے سے باندھنا بخل سے عبارت ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت فنحاص یہودی کے بارے میں اُتری۔[2] عَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ۔ اسی ملعون نے یہ بھی کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے، ہم اغنیاء ہیں، اُس پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُس کو مارا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک یہودی تھا، اُس کو شاس بن قیس کہتے تھے، اُس نے کہا: "إِنَّ اللّٰهَ بَخِيلٌ لَّا يُنْفِقُ"، "اللہ بخیل ہے خرچ نہیں کرتا۔" اُس پر یہ آیتِ پاک اُتری۔[3]

یہود ہی بخیل ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں:

اللہ تعالیٰ نے اُس کی تردید کی ان کے جھوٹ، بہتان اور بناوٹ کی بات کا یہ جواب دیا کہ تمھارے ہی ہاتھ مربوط (بندھے ہوئے) ہیں، تم ہی ملعون ہو، کیوں کہ یہود بڑے بخیل، حاسد، بزدل اور ذلیل تھے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [النساء: ٥٣۔ ٥٤] "کیا (وہ سمجھتے ہیں کہ) انھیں بادشاہی کا کچھ حصہ ملا ہے؟ پھر تو وہ اس میں سے لوگوں کو تل برابر بھی نہیں دیں گے۔ کیا وہ اس پر لوگوں سے حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے؟" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ ﴾ [البقرة: ٦١] "اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔"

پھر فرمایا کہ اللہ وسیع فضل والا اور بہت عطا کرنے والا ہے، اس کے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں، جو نعمت

---

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٤٥٢۔ ٤٥٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٦٧) [2] تفسیر الطبري (١٠/ ٤٥٣)

[3] المعجم الکبیر (١٢/ ٦٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٧/ ٨١)

ہے، اُسی کی طرف سے ہے، اُس نے ہمارے لیے سب حاجت کی چیزیں رات دن، سفر میں اور حضر میں اور تمام حالات میں پیدا کی ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [إبراهيم: ٣٤] ''اور اس نے تمھیں ہر وہ چیز دی، جو تم نے اس سے مانگی، اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انھیں شمار نہ کرسکو گے۔ بے شک انسان بڑا ظالم، نہایت ناشکرا ہے۔'' اس بارے میں بہت سے آیتیں ہیں۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ پُر ہے، نہیں کم کرتا اُس کو خرچ کرنا رات دن۔ تم نے دیکھا کہ اُس نے جس دن سے آسمان و زمین بنائے ہیں، کتنا خرچ کیا، اور اُس کے ہاتھ میں جو تھا وہ کم نہ ہوا۔ اُس کا تخت پانی پر ہے، دوسرے ہاتھ میں فیض (فراخی کرنا) یا قبض (کم کرنا) ہے، اُٹھاتا ہے اور رکھتا ہے، فرماتا ہے تو خرچ کر تجھ کو ملے گا۔[1] (رواه أحمد والشيخان) پھر فرمایا کہ اے رسول! تمھاری نعمت تمھارے دشمنوں، یعنی یہود اور اُن جیسے اور لوگوں کے لیے نقمت (انتقام) ہے، جس طرح مومن تصدیق و عمل صالح اور علم نافع میں بڑھتے رہتے ہیں، اسی طرح کافر تمھارے لیے اور تمھاری اُمت کے لیے حسد، سرکشی اور کفر میں زیادہ ہوتے ہیں۔ طغیان حد سے آگے بڑھ جانے کو کہتے ہیں۔

کفر سے مراد تکذیب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ [حم السجدة: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔''

اہلِ کتاب کی آپس کی عداوت:

پھر فرمایا کہ ان کے دل ہرگز اکٹھے نہ ہوں گے، بلکہ ان کے فرقوں میں عداوت پڑی ہے، ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہتے ہیں، کیوں کہ وہ حق پر اکٹھے نہیں ہوتے اور وہ تمھارے مخالف اور جھٹلانے والے ہیں۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عداوت اور بغضاء سے مراد دین میں لڑائی جھگڑے ہیں،[2] جب وہ تمھارے لیے مکر و فریب کے اسباب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٩٣) مسند أحمد (٢/ ٣١٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٦٨)

جمع کر کے لڑائی کا ارادہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن اسباب و امور کو باطل اور ناکارہ کر دیتا ہے۔ اُن کا مکر و فریب پھر کر انھیں پر پڑتا ہے۔ زمین پر فساد کرنے کے لیے دوڑتے پھرتے ہیں۔ اللہ کو ان کی یہ خصلت پسند نہیں۔ اللہ ایسوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر فرمایا کہ اگر وہ لوگ گناہوں اور حرام کاری سے بچتے تو ہم ان کی برائیوں کا کفارہ کر کے ان کو جنت میں لے جاتے۔ محذور دور ہوتا اور مقصود ہاتھ آتا۔

﴿ مَآ اُنْزِلَ ﴾ سے مراد قرآنِ مجید ہے، یعنی اگر تورات اور انجیل کے ساتھ ساتھ قرآن پر بھی چلتے۔ تحریف، تبدیلی اور تغییر نہ کرتے، قرآن پر قائم ہوتے، اتباعِ حق کرتے، اسلام کے تقاضوں کو پورا کرتے اور اُن پر عمل کرتے، جس طرح کہ ان کی کتابیں نبی کریم ﷺ کی تصدیق سے بھری پڑی ہیں تو کثرت سے رزق پاتے۔ آسمان سے پانی برستا، زمین اپنی برکات ظاہر کرتی۔ یہ امام مجاہد، سعید بن جبیر، قتادہ اور سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1]

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الأعراف: ٩٦] ''اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور پرہیز گاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ ﴾ [الروم: ٤١] ''خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے فساد ظاہر ہو گیا ہے۔'' بعضوں نے کہا ہے کہ اوپر سے اور نیچے سے روزی پانے کا یہ مطلب ہے کہ بغیر محنت، جد و جہد، تکان، بدبختی اور سختی کے کھانے کو ملتا۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک خیر میں ہوتے، مگر یہ قول سلف کے اقوال کے خلاف ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے آیت: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴾ کے تحت جبیر بن نفیر سے مرفوعاً ذکر کیا ہے، قریب ہے کہ علم اُٹھ جائے۔ زیادہ بن لبید رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں کر اُٹھے گا؟ ہم نے قرآن پڑھا، اپنی اولاد کو سکھلایا، فرمایا: تجھ کو تیری ماں روئے، میں تو تجھ کو مدینہ کا بڑا سمجھ دار سمجھتا تھا، کیا یہود و نصاریٰ کے ہاتھ میں تورات و انجیل نہیں ہے؟ مگر جب انھوں نے اللہ کا حکم ترک کر دیا تو ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوْا... الخ ﴾[2] (آیتِ باب) اس کی سند اول میں معلق آخر میں مرسل ہے، مگر احمد رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے موصولاً روایت کیا ہے کہ زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شے کا ذکر کیا۔

پھر فرمایا کہ یہ اُس وقت ہو گی، جب علم جاتا رہے گا۔ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! علم کیوں کر جائے گا، ہم تو قرآن پڑھتے ہیں، اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں، پھر وہ اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں، قیامت تک یوں ہی سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔ فرمایا: تجھے تیری ماں روئے، میں تو تجھ کو اہلِ مدینہ میں سب سے زیادہ سمجھ دار جانتا تھا، کیا یہ یہود و نصاریٰ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٧١) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٧٠)

تورات انجیل نہیں پڑھتے؟ اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں، پھر اُس کی کسی چیز سے نفع نہیں لیتے۔[1] (وهكذا رواه ابن ماجه نحوه وهذا إسناد صحيح)

میانہ رو اُمت:

یہ جو فرمایا کہ ان میں ایک امت میانہ رو ہے، یہ اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٩] ''اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک گروہ (ایسا) ہے جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں اور اسی (حق) کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔'' اور عیسیٰ علیہ السلام کے اتباع کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ﴾ [الحديد: ٢٧] ''پھر ہم نے ان لوگوں کو جو اُن میں سے ایمان لائے، ان کا اجر دیا۔'' غرضیکہ میانہ روی کو اس امت کے اوسط درجات کے اعلیٰ مقامات ٹھہرایا۔ ان سے بڑھ کر سابقین کا رتبہ ہے، جیسے اللہ عزوجل کے اس فرمان میں ہے: ﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝32 جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴾ [الفاطر: ٣٢۔ ٣٣] ''پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا، پھر بعض تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں میانہ رو ہیں اور بعض ان میں اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں، یہی بہت بڑا فضل ہے۔ ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔''

صحیح یہ ہے کہ امت کے یہ تینوں قسم کے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت کے اکہتر فرقے ہو گئے، ان میں سے ستر ناری ہیں اور ایک جنتی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے بہتر فرقے ہوگئے، ان میں سے ایک جنتی ہے اور اکہتر دوزخی۔ میری امت ان دونوں امتوں سے بڑھ جائے گی، ایک فرقہ جنتی ہوگا، بہتر دوزخ میں جائیں گے۔ کہا: وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: «الجماعة، الجماعة» (رواه أبو بكر بن مردويه)

یعقوب بن یزید نے کہا ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جب اس حدیث کو روایت کرتے تو قرآن کی آیت: ﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝65 وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا

[1] مسند أحمد (٤/ ١٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٤٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سالم بن ابی الجعد رحمہ اللہ کا سماع سیدنا زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اس کے قوی شاہد موجود ہیں۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٩٩٠)

التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) پڑھتے اور یہ آیت پڑھتے: ﴿ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۸۱] ''اور جنھیں ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک گروہ (ان لوگوں کا) ہے جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔'' یعنی امتِ محمد ﷺ۔

یہ حدیث نہایت غریب ہے، اس وجہ سے اور اس انداز سے۔ رہی وہ حدیث جو امتوں کے ستر سے کچھ اوپر فرقوں میں بٹ جانے کے بارے میں ہے، سو وہ چند طریقوں سے مروی ہے، جس کو ہم نے دوسری جگہ ذکر کیا ہے۔[1] وللّٰه الحمد والمنة. فتح البیان کا بیان فاتح یہ ہے کہ ﴿ مَغْلُوْلَةٌ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں پے در پے اور لگا تار رزق عطا کرنے سے روکا گیا ہے۔ یہ بخل کا اشارہ ہوا۔ مَعَاذَ اللّٰهُ مِنْهُ.

صفتِ ید کا اثبات:

''یَدٌ'' کے معنی ہیں، قدرت رکھنے والا ہاتھ یا ملکیت والا ہاتھ۔ یہاں پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ''غَلٌ'' بخل والے ہاتھ پر بولتے ہیں۔ ''بَسْط'' سخاوت والے ہاتھ پر۔ اس جگہ مجازاً دو ہاتھ فرمائے۔ حدیث میں دونوں کو یمین کہا ہے۔[2] یہ اللہ کی ایک صفت ہے، جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، اس سے مراد جارحہ نہیں ہے، جس طرح کہ مجوسیوں اور یہودیوں نے کہا ہے۔ نہ نعمت و قدرت ہے، جس طرح معتزلہ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کو ان کے سوال کے مطابق جواب دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ سخاوت کرنے والا اور کرم کرنے والا ہے، تمھی بخیل اور کنجوس ہو۔

علما نے کہا ہے کہ جس طرح دھوپ سورج کو نہیں چھوڑتی، اسی طرح بخل یہود کو نہیں چھوڑتا، ہر دم ساتھ رہتا ہے۔ یہودی کے پاس کتنا ہی مال کیوں نہ ہو، وہ بڑا کنجوس مکھی چوس بنا رہتا ہے۔ یا مراد ﴿ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾ سے حقیقی معنی ہیں کہ دنیا میں قید اور آخرت میں گرفتارِ عذاب ہوں گے۔ مگر ظاہر یہی ہے کہ مراد پہلے معنی ہیں۔ ان پر اللہ نے بخل کے ساتھ بد دعا کی اور اُس گستاخی اور بے ادبی کے کلمے پر لعنت کی، جو انھوں نے اللہ پاک کے بارے میں اپنی ناپاک زبان سے نکالا۔ اُس لعنت کا اثر یہ ہوا کہ دنیا میں بندر اور سوَر بن گئے، ذلت اور محتاجی گلے پڑی، جزیہ لگا، آخرت میں آگ کا عذاب ہوگا۔

ایک قراءت میں ''بَلْ يَدَاهُ بَسِيْطَتَانِ'' بھی آیا ہے۔[3] یعنی دونوں ہاتھ کھلے پھیلے ہیں، یہ نہایت جود و کرم کی نشانی ہے اور انتہا درجے کی سخاوت و عطا کی دلیل ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت سمع و بصر و وجہ ہے، اسی طرح

---

[1] مسند أبي یعلیٰ (٦/ ٣٤٠) تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٠٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفیه أبو معشر نجیح وفیه ضعف'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٥١٠)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٢٧) [3] فتح القدیر (٢/ ٨٢)

ایک صفت ذات ید ہے۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم اس صفت پر ایمان لائیں، تسلیم کریں اور ثابت کریں، جس طرح کتاب وسنت میں آیا ہے۔ اسی طرح بولیں نہ کیف ہو نہ تشبیہ و تعطیل اور نہ تاویل بلکہ تفویض۔[1] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ [صٓ: ٧٥] ''جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا؟'' اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «كِلْتَا يَدَيْهِ يَمِينٌ»[2] ''اُس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔''

اللہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے، کسی کو زیادہ کسی کو کم دیتا ہے، یہ اُس کی حکمت اور مرضی ہے، اس میں اللہ پر کیا اعتراض اور کسی کی کیا اجارہ داری ہے؟ وہ قابض اور باسط ہے، اگر قبض کیا تو اس کی ظاہر حکمت سے ہے نہ کسی اور وجہ سے اور اگر بسط کیا تو وہ اُس کی مشیت عادلہ سے ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے، اُس کے ملک کے خزانے نہ فنا ہوں نہ ہلاک، اُس کی سخاوت و عطا کے سامان بے انتہا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ﴾ [الشوریٰ: ٢٧] ''اور اگر اللہ اپنے (تمام) بندوں کے لیے رزق فراخ کر دیتا تو وہ زمین میں ضرور سرکشی کرتے، لیکن وہ اس اندازے سے (رزق) نازل کرتا ہے جتنا چاہتا ہے۔''

نیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾ [الشوریٰ: ١٢] ''وہ جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور وہی (جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔'' متفق علیہ حدیث میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «بِيَدِهِ الْمِيزَانُ يَرْفَعُ وَيَخْفِضُ»[3] ''اُس کے ہاتھ میں میزان ہے، وہ بلند کرتا ہے اور نیچا کرتا ہے۔''

(أخرجه الشيخان)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور عرب کے ساتھ حسد نے ان کو اس پر اُکسایا کہ انھوں نے قرآن چھوڑا، نبی اکرم ﷺ سے کفر کیا اور دین کے منکر ہوئے، حالاں کہ نبی اکرم ﷺ کا حال ان کے پاس لکھا رکھا تھا۔[4] اللہ نے بھی ان کے درمیان عداوت ڈال دی، بعض جبریہ ہو گئے، بعض قدریہ، بعض مرجیہ، بعض مشبہہ۔ یا یہود و نصاریٰ کی دشمنی مراد ہے کہ باہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ملکانیہ، نسطوریہ، یعقوبیہ، ماروانیہ۔

رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے درمیان بھی بغض و عداوت ہوتا ہے، پھر اس کا عیب اگر ان پر ہے تو مسلمانوں پر کیوں نہیں؟! لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ ان بدعات اور افتراق میں سے کوئی چیز اسلام کے اول زمانے میں نہ تھی۔

---

[1] تفویض کا ایک مطلب ہے، اس کا معنی اللہ کے سپرد کر دینا کہ وہی جانتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ یہ عقیدہ ''مُفَوِّضَہ'' کا ہے جو باطل عقیدہ ہے۔ دوسرا مطلب ہے کہ معنی تو معلوم ہے، لیکن اس کی کیفیت اللہ کے سپرد ہے، کیوں کہ نہ کوئی جانتا ہے اور نہ جان ہی سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ہی ایسی ہیں کہ ان کو کسی کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے اور نہ ان کی کیفیت ہی بیان کی جا سکتی ہے۔ یہ عقیدہ سلف کا ہے اور یہی صحیح ہے۔ [ص۔ ی]

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٢٧) [3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٠٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٩٣)

[4] تفسیر الطبري (١٠/ ٤٥٧)

یہ بلا زمانۂ نبوت کے بعد پیدا ہوئی، سو یہود کے لیے درست یہ تھا کہ اس زمانے میں جس میں قرآن پاک رسول پاک پر اُترا، اس زمانے میں کوئی عیب لگاتے، پھر نبی اکرم ﷺ نے خود ہی خبر دی ہے کہ جو کام اہلِ کتاب نے کیا، وہ تم بھی کرو گے، بالشت برابر بالشت کے اور ہاتھ برابر ہاتھ کے۔

اب اس امت کا حال زوالِ سلطنت و دولتِ اسلام اور غربت و مسکینیٔ اسلام کی وجہ سے ویسا ہی ہوگیا ہے، جیسا یہود و نصاریٰ کا حال تھا۔ نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، کام کا مسلمان ہزار میں سے ایک بھی نہیں۔ ''مسلمانان درگور مسلمانی در کتاب'' (مسلمان قبروں میں چلے گئے ہیں اور مسلمانی صرف کتاب میں رہ گئی ہے)۔ اس مثل میں کتاب سے اگر قرآنِ مجید مراد لیا جائے تو ٹھیک ہے۔ ابو حیان نے کہا ہے کہ عداوت بغض کے ساتھ بہت خاص ہے، اس لیے کہ ہر دشمن بغض رکھتا ہے اور کبھی غیر دشمن بھی بغض رکھتا ہے۔[1] (قاله الكرخي) جب وہ لڑنے کے لیے جماؤ کرتے ہیں، سامان فراہم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی ہوا دور کر دیتا ہے، نہ فتح یاب ہوتے ہیں اور نہ کوئی فائدہ ہاتھ آتا ہے، جب دیکھو مغلوب ہی ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بخت نصر بابلی کو اُن پر مسلط کر دیا تھا۔ جب پھر فساد کیا تو طیطوس رومی اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر فساد کیا تو مجوس ان پر غالب ہوگئے، یعنی اہلِ فارس۔ پھر فساد کیا اور اللہ تعالیٰ کو بخیل بتایا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھیجا۔ ہمیشہ ذلت میں گرفتار رہتے ہیں، جب جنگ برپا کرتے ہیں ہار جاتے ہیں۔ سعی سے مراد کہ زمین میں فساد کے لیے تگ و دو کرتے ہیں، یعنی اسلام کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہلِ اسلام کو مکر و فریب میں لانا چاہتے ہیں۔ ''فَوْقَ وَ تَحْتَ'' کا ذکر مبالغے کے لیے ہے کہ ان کے لیے رزق کے حاصل کرنے کے ذرائع آسان ہوگئے اور کھانے کی انواع و اقسام بہت زیادہ ملیں۔

﴿أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ﴾ سے یہ مراد ہے کہ عدل کرنے والے ہیں نہ حد سے بڑھنے والے ہیں اور نہ ہی کمی کرنے والے ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور بعض نصاریٰ۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امتِ مسلمہ سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقتصد وہ لوگ ہیں، جنھوں نے نہ فسق کیا اور نہ دین میں غلو کیا۔ غلو رغبت کو کہتے ہیں۔ فسق تقصیر (گناہ) کو کہتے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقتصد سے مراد مومن ہے۔[2] اقتصاد عمل میں بغیر کمی بیشی کے اعتدال کرنے کو کہتے ہیں، جیسے فارسی میں میانہ روی اور بیچ کی چال ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کہ اکثر یہود کفر پر اڑے ہوئے ہیں، متمرد ہیں، نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کر کے ایمان نہیں لاتے۔ اسلام قبول نہیں کرتے، جیسے کعب بن اشرف جیسے رؤسائے یہود۔[3]

[1] اللباب في علوم الكتاب (٧/ ٤٣٣) [2] تفسير الطبري (١٠/ ٤٦٥۔ ٤٦٦) [3] فتح البيان (٤/ ١١۔ ١٧)

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا اور بلاشبہ اللہ کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا (67)

تبلیغ کا حکم اور حفاظت کا وعدہ:

یعنی یہ اگلی بات کہ اہلِ کتاب کو صاف گمراہ کہو، جب تک کہ یہ اللہ کا کلام قبول نہ کریں، اس میں اگرچہ وہ دشمن ہو جائیں، تم بے فکر پہنچاؤ، خطرہ نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ نبی اکرم ﷺ کو رسول کا خطاب دیا اور تمام رسالت پہنچانے کا حکم دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس حکم کی خوب بجا آوری کی، جیسا چاہیے تھا، ویسے ہی دینِ اسلام کا قیام کیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جو کوئی تجھ سے یہ بات کہے کہ جناب محمد ﷺ نے کسی نازل شدہ شے کو چھپایا ہے، وہ جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (آیتِ باب)۔[1] (هكذا رواه هٰهُنا مختصراً وقد أخرجه في مواضع من صحيحه مطولًا وكذا رواه مسلم في كتاب الإيمان والترمذي والنسائي في كتاب التفسير)

صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر نبی اکرم ﷺ قرآن میں سے کسی شے کو چھپاتے تو اس آیت کو چھپاتے: ﴿وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ﴾ [الأحزاب: ٣٧] ”اور آپ اپنے دل میں وہ بات (لے پالک کی مطلقہ سے نکاح) چھپاتے تھے، جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے، حالاں کہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔“[2] ایک آدمی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ لوگ آ کر ہم سے کہتے ہیں کہ تمھارے پاس کچھ ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے ظاہر نہیں کیا۔ کہا: کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ ... الخ﴾ اللہ کی قسم ہم کو نبی اکرم ﷺ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧) البتہ صحیح بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بجائے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

نے کسی سیاہ کا سفید میں سے وارث نہیں کیا۔[1] یہ اسناد جید ہے۔

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ ابو جحیفہ سوائی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تمھارے پاس وحیِ الٰہی میں سے کچھ ہے، جو قرآن میں نہ ہو؟ کہا: نہیں، قسم ہے اُس کی جس نے دانے کو پھاڑا اور جان کو پیدا کیا، مگر فہم جو اللہ کسی مرد کو قرآن میں دے اور جو اس صحیفے میں ہے۔ میں نے کہا: صحیفے میں کیا ہے؟ کہا: دیت، قیدی کا چھڑانا اور یہ کہ مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے امام زہری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ "مِنَ اللّٰهِ الرِّسَالَةُ، وَعَلَى الرَّسُوْلِ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا التَّسْلِيْمُ"[3] "اللہ پر احکام بھیجنا ہے اور رسول پر پہنچا دینا ہے اور ہم پر ان کو تسلیم کرنا ہے۔" امت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسالت پہنچا دینے اور امانت ادا کر دینے پر گواہی دی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے حجۃ الوداع کے سب سے عظیم اجتماع میں خطبے کے دوران یہ بات کہلوائی، وہاں تقریباً چالیس ہزار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس دن خطبے میں فرمایا: اے لوگو! تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا کہو گے۔ سب نے کہا: ہم یہ کہیں گے کہ آپ نے پہنچا دیا، حقِ رسالت ادا کر دیا، نصیحت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اُٹھا کر ہاتھ آسمان کی طرف کر کے نیچے لا کر کہا: «اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ، اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ»[4] "اے اللہ! یقیناً میں نے پہنچا دیا، اے اللہ! یقیناً میں نے پہنچا دیا" ہاتھ سے آسمان کی طرف ایک گروہِ عظیم کے سامنے اشارہ کرنا اللہ تعالیٰ کے بلند اور استواء علی العرش ہونے کی دلیل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن فرمایا کہ اے لوگو! آج کون سا دن ہے؟ کہا: یومِ حرام ہے۔ فرمایا: یہ کون سا شہر ہے؟ کہا: بلدِ حرام ہے۔ فرمایا: یہ کون سا مہینا ہے؟ کہا: شہرِ حرام ہے۔ فرمایا: بے شک تمھارے مال، تمھارے خون، تمھاری آبرو، تم پر اس طرح حرام ہیں، جس طرح اس شہر کی حرمت اور اس دن کی حرمت، اس شہر (مہینے) کی حرمت ہے۔ پھر اس بات کو بار بار کہا، اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا: «اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ» "اے اللہ! یقیناً میں نے پہنچا دیا ہے" یہ بھی کئی بار کہا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ رب عزوجل کی طرف سے وصیت تھی۔ پھر فرمایا: چاہیے کہ جو لوگ حاضر ہیں، وہ غائب کو پہنچا دیں۔ تم میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ بعض تمھارے بعض کی گردنیں ماریں۔[5] (رواه أحمد وقد روى البخاري عن ابن المديني نحوه)

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ اگر تم میرے پیغام لوگوں کو نہ پہنچاؤ گے تو تم نے کچھ کام نہ کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٧٢۔ ١١٧٣) اس کی سند حسن ہے۔
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٨٢)
[3] صحيح البخاري (٦/ ٢٧٣٧)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٥٢) مسند أحمد (١/ ٢٣٠)

نے کہا ہے، یعنی اگر ایک آیت بھی چھپائی تو گویا رسالت نہ پہنچائی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اُتری تو نبی اکرم ﷺ نے کہا: اے رب! میں کیا کروں میں تو اکیلا ہوں، لوگ میرے خلاف جمع ہوتے ہیں۔ تب یہ آیت اُتری: ﴿وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ... الخ﴾ (آیتِ باب)۔[1] یعنی تم تو رسالت کو پہنچانے کا کام کرو، میں تمھارا حافظ و ناصر ہوں، دشمنوں پر مدد کرنے والا ہوں۔ تم کو ان پر فتح یاب کروں گا، تم کچھ خوف اور غم نہ کرو۔ کوئی تم کو ایذا نہ پہنچا سکے گا۔

اس آیت کے اُترنے سے پہلے نبی اکرم ﷺ حراست کرتے تھے (اپنا پہرہ بٹھاتے تھے) جس طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک رات نبی کریم ﷺ جاگتے رہے، میں آپ کے پاس تھی۔ میں نے کہا: آپ کا کیا حال ہے؟ فرمایا: کاش! میرے اصحاب میں سے کوئی مردِ صالح آج کی رات میری حراست کرتا، اتنے میں ہتھیار کی آواز سنی۔ فرمایا: کون ہے؟ سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ہوں۔ فرمایا: کدھر آئے ہو؟ کہا: آپ کی حراست کے لیے۔ نبی اکرم ﷺ سو گئے، خراٹے لینے لگے۔[2] (رواہ أحمد)

صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب ہجرت کے بعد مدینہ میں آئے،[3] آپ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دخول کے بعد ایک رات جاگتے رہے اور یہ معاملہ سنہ دو ہجری میں ہوا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی حراست کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت اُتری: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (آیتِ باب) اس وقت سر قبے سے باہر نکالا، فرمایا: اے لوگو! جاؤ، اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کی ہے۔[4] (رواہ ابن أبي حاتم والترمذي وقال هذا حديث غريب و رواه ابن جرير و الحاكم وقال صحيح الإسناد ولم يخرجاه وكذا رواه سعيد بن منصور) یہ حدیث کئی طرح سے مروی ہے۔ عصمہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم رات کو نبی اکرم ﷺ کی حراست کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت اُتری۔ پھر حراست چھوڑ دی۔[5] (رواہ ابن مردويه)

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: عباس رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے چچا ان میں سے تھے، جو آپ ﷺ کی حراست کیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت اُتری تو نبی اکرم ﷺ نے حراست ترک کر دی۔[6] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٧٣)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٠) مسند أحمد (٦/ ١٤٠)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٠)

④ تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٧٣_ ١١٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٤٦) تفسير الطبري (١٠/ ٤٦٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٨٩)

⑤ تفسير ابن كثير (٢/ ١٠٩) اس کی سند میں "فضل بن مختار" سخت ضعیف راوی ہے۔

⑥ المعجم الأوسط (٤/ ٢١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عطية العوفي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ٨١)

کہ نبی کریم ﷺ جب باہر جاتے تو ابو طالب آپ کے ہمراہ نگہبان کر دیتے، جب یہ آیت آئی اور ابو طالب نے کسی کو آپ ﷺ کے ہمراہ بھیجنا چاہا، فرمایا کہ اے چچا! اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کی ہے۔ اب کسی کو میرے ساتھ بھیجنے کی کچھ حاجت نہیں ہے، [1] مگر یہ روایت منکر ہے، کیوں کہ آیت مدنی ہے اور قصے کا تقاضا یہ ہے کہ مکی ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ حراست کرتے تھے۔ ابو طالب ہر دن بنی ہاشم کے کچھ لوگ ان کی حفاظت کے لیے بھیجتے، جب یہ آیت آئی اور چچا نے چاہا کہ حارس (نگہبان) بھیجیں، فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ قَدْ يَعْصِمُنِي مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ» [2] ''بے شک اللہ تعالیٰ جنوں اور انسانوں سے میری حفاظت فرمائے گا۔'' اس کی سند بھی غریب ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت مدنی ہے، بلکہ مدینہ میں جو قرآن نازل ہوا، اس کے آخری حصے میں سے ہے۔ [3] واللہ أعلم.

لیکن اللہ تعالیٰ کی جملہ عصمت اور حفاظت میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو مکہ کے لوگوں، سرداروں، حاسدوں، دشمنوں اور صاحبِ ثروت لوگوں سے ان کی دشمنی اور بغض کی شدت اور لڑائی کے منصوبوں کے باوجود رات دن محفوظ رکھا۔ اپنی قدرتِ کاملہ وحکمتِ بالغہ سے حفاظت کے عظیم اسباب پیدا کیے۔ ابتدائے رسالت میں ابو طالب کو مہربان کر دیا، وہ قریش کے ایک بڑے رئیس تھے، جن کی اطاعت کی جاتی تھی۔ ان کے دل میں نبی اکرم ﷺ کی شرعی نہیں بلکہ طبعی محبت ڈال دی۔ اگر وہ اسلام لاتے تو سارے کفار، فجار اور کبار ان پر جرأت کرتے، لیکن قدرِ مشترک کفر کی وجہ سے جو ان کے اور ابو طالب کے درمیان تھی، کفار آپ ﷺ سے ہیبت کھاتے اور احترام کرتے تھے۔ جب ابو طالب مر گئے تو مشرکوں کی بن آئی، ایذا دینے لگے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انصار مقرر کر دیے، انھوں نے اسلام کی بیعت کی، آپ کو مدینہ میں لانا چاہا۔ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے، انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی ہر گورے اور کالے سے حفاظت کی۔ جب کسی مشرک یا اہلِ کتاب نے برا ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے اُس کا مکر اُسی پر پھیر دیا، جس طرح یہود نے جادو کیا تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بچا لیا۔ سورت معوذتین اس بیماری کی دوا بھیجی۔ جب گوشت کے دست میں زہر ملایا، اللہ نے خبر کر دی، محفوظ رکھا، اس طرح کے بہت سے نظائر اور اشباہ ہیں، جن کے ذکر میں طول ہے۔ امام قرطبی وغیرہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب کسی منزل میں اُترتے، اصحاب رضی اللہ عنہم آپ کے لیے سایہ دار درخت تلاش کرتے، اس کے نیچے آرام فرماتے۔ ایک گنوار نے آ کر تلوار کھینچ کر کہا، اب بتاؤ تم کو کون بچائے گا؟ فرمایا: اللہ عزوجل! اُس کا ہاتھ کانپا، تلوار گر پڑی، اُس

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٠٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راویوں کا ترجمہ نہیں ملا ہے۔

[2] المعجم الکبیر (١١/ ٢٥٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه النضر بن عبد الرحمن وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ٨١)

[3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٠٩۔ ١١٠)

کے سر کو درخت سے مارا، جس سے اُس کا دماغ پریشان ہوگیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[1]

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی انمار سے لڑائی کی، ذات الرقاع میں نخلستان کی بلندی پر اُترے، ایک کنویں میں پاؤں لٹکا کر بیٹھے تھے، وارث بنی النجار نے کہا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کروں گا، اس کے یاروں نے کہا کیوں کر؟ کہا: میں اُن سے کہوں گا کہ ذرا تم اپنی تلوار مجھ کو دو، جب وہ دیں گے اسی سے ان کو قتل کروں گا۔ پھر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا: اے محمد! اپنی تلوار مجھے دو، ذرا دیکھوں کیسی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دی، اُس کا ہاتھ کانپا، تلوار ہاتھ سے گر پڑی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تیرے اور تیرے ارادے کے درمیان حائل ہوگیا، اُس پر یہ آیت اُتری۔[2] (رواه ابن أبي حاتم وهذا حديث غريب من هذا الوجه)

غورث بن حارث کا قصہ صحیح میں مشہور ہے۔[3]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب ہم سفر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بڑا درخت چھوڑ دیتے، جس کا سایہ زیادہ ہوتا، وہ اس کے نیچے اُترتے، ایک دن ایک درخت کے نیچے اترے، اپنی تلوار درخت سے لٹکا دی۔ ایک آدمی نے آ کر تلوار لے کر کہا: اے محمد! "مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ؟" "مجھ سے تمھیں کون بچائے گا؟" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُ يَمْنَعُنِيْ مِنْكَ» "مجھے تم سے اللہ بچائے گا۔" تلوار رکھ دے۔ اُس نے رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[4] (رواه ابن مردويه و أبو حاتم بن حبان في صحيحه)

جعدہ جشمی نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موٹے آدمی کو دیکھ کر اُس کے پیٹ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا: «لَوْ كَانَ هٰذَا فِيْ غَيْرِ هٰذَا لَكَانَ خَيْراً لَّكَ» "اگر یہ اس کے بجائے کسی اور جگہ ہوتا تو تیرے لیے بہتر ہوتا۔" پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کو لائے اور کہا کہ یہ آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ فرمایا: «لَمْ تُرَعْ وَلَوْ أَرَدْتَّ ذٰلِكَ لَمْ تُسَلَّطْ عَلَيَّ»[5] "اگر تو چاہتا تو مجھ پر غالب نہ ہوسکتا۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ قومِ کفار کو ہدایت نہیں کرتا، یعنی تم تو ہمارا حکم پہنچا دو، کوئی مانے یا نہ مانے۔ ہدایت اور ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ

---

[1] تفسير الطبري (۱۰/ ٤٧٠) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز سند میں "ابو معشر نجیح" ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ۱۱۷۳) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبیدہ" ضعیف راوی ہے۔ البتہ نزولِ آیت کے ذکر کے علاوہ یہ واقعہ صحیح بخاری (رقم الحديث: ۳۹۰٦) اور صحیح مسلم (رقم الحديث: ۸٤۳) میں مروی ہے۔

[3] گذشتہ صحیحین کا حوالہ ملاحظہ کریں۔

[4] موارد الظمآن إلىٰ زوائد ابن حبان (۱/ ٤۳۰) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الصحيحة" (رقم الحديث: ۲٤۸۹) میں بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

[5] مسند أحمد (۳/ ٤٧١) اس کی سند میں "ابو اسرائیل" کو ابن حبان رحمہ اللہ کے علاوہ کسی نے ثقہ نہیں کہا ہے۔ نیز "جعدہ جشمی" کے صحابی ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۱۱۳۱، ٤۳۳٥)

یَّشَآءُ ﴾ [البقرۃ: ۲۷۲] ''(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمے داری نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ ﴾ [الرعد: ۴۰] ''آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہی ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ لفظ ﴿ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ ﴾ مفید عموم ہے، یعنی جو کچھ تم پر اُتارا ہے، وہ سب بے کم و کاست پہنچا دو، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے، جو ان پر نازل کیا گیا ہے، اس میں سے کوئی شے پوشیدہ نہیں رکھی۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا اور بارہا « هَلْ بَلَّغْتُ » ''یقیناً میں نے پہنچا دیا'' کہا اور سب نے گواہی دی کہ ہاں آپ نے بیان کر دیا۔[1] وحی کو چھپانا نبی کریم ﷺ کی شان سے بالکل بعید ہے۔ نقصان یا ضرر پہنچنے کے اندیشے سے بیان کو چھپانے کا گمان ہو سکتا تھا۔ اس لیے فرمایا کہ ہم تمھیں بچانے والے اور تمھارے محافظ ہیں۔ تم رسالت کو پہنچانے میں بالکل نہ ڈرو۔

الحمد للہ نبی اکرم ﷺ نے سب کچھ سنایا، پورا پورا بیان کر دیا، جس کسی نے اسلام میں داخل ہونے سے انکار کیا، اسے طوعاً و کرہاً اسلام میں داخل فرمایا۔ شرک کے سرداروں کو قتل کیا، اُن کی جماعتوں کو پریشان کیا، اُن کے جماؤ کو توڑ دیا، اللہ ہی کا بول بالا ہو گیا، جو لڑنے والے دشمن تھے اور تلوار سے بچ گئے، وہ آخر کو اسلام لے آئے۔ فتح مکہ کے دن قریش کے سرداروں اور مکہ کے اکابرین سے فرمایا: « مَا تَظُنُّوْنَ أَنِّيْ فَاعِلٌ بِكُمْ؟ » ''تم کیا خیال کرتے ہو کہ میں تمھارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟'' انھوں نے کہا: "أَخٌ كَرِيْمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيْمٍ" ''تو کرم کرنے والا بھائی ہے اور کریم بھائی کا بیٹا ہے۔'' فرمایا: جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا۔

اسی طرح علمائے امت میں جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کے عنایت ہوئی ہے، اللہ اُس کو لوگوں کے ہاتھ سے محفوظ اور سلامت رکھتا ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ کی حجتوں کو بیان کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی براہین کی وضاحت کرتے ہیں اور مخالفوں اور دشمنوں کے درمیان اچھی طرح بیان کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے درمیان جو اہلِ بدعت ہوتے ہیں اور شریعت کے حکم کو تسلیم نہیں کرتے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا: "وَقَدْ رَأَيْنَا فِيْ أَنْفُسِنَا، وَسَمِعْنَا مِنْهُ فِيْ غَيْرِنَا مَا يَزِيْدُ الْمُؤْمِنَ إِيْمَاناً وَّصَلَابَةً فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ، وَشِدَّةً شَكِيْمَةً فِي الْقِيَامِ بِحُجَّةِ اللّٰهِ" متزلزل الاقدام اور مضطرب قلب والوں کا یہ گمان کہ اگر ہم حق کی تبلیغ کریں گے تو ہمیں تکلیف پہنچے گی اور ہم پر محنت و آفت پڑے گی ایک خلل والا خیال اور باطل وہم ہے۔ محنت درحقیقت دنیا اور آخرت میں بھلائی ہی لاتی ہے۔[2]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٩) [2] فتح القدير (٢/ ٨٥)

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

’’ہر مصیبت کے بعد آخر کار راحت نصیب ہوتی ہے۔ غور کیجیے! مرد آخر ایک مبارک بندہ ہے۔‘‘

رہی یہ بات کہ نبی اکرم ﷺ کے سر کو چوٹ لگی اور اُحد کے دن دانت ٹوٹا اور طرح طرح کی ایذا پہنچی۔ لہٰذا عصمت سے مراد یہ ہے کہ کسی کو ان کے قتل پر قدرت نہ ہوگی۔ اللہ کافروں کو ان کی ضرر رسانی کا راستہ نہ دے گا۔ پھر وہ کیوں ڈریں، کسی کا خوف کیوں رکھیں؟ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ’’لَا يَرْشُدُ مَنْ كَذَّبَكَ وَأَعْرَضَ عَنْكَ،‘‘ [1] ’’جس نے آپ ﷺ کو جھٹلایا اور آپ ﷺ سے منہ موڑ لیا، وہ ہدایت نہیں پاتا۔‘‘ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو راہِ حق نہیں دِکھاتا، جو راہِ حق سے الگ ہو گیا اور درمیانی راستے سے دور جا پڑا۔ وہ قرآنِ مجید کا منکر ہے، فرض و واجب کا تارک ہے۔ [2]

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۶۸ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۹

(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! تم ہرگز اصل دین پر کاربند نہیں ہوسکتے، یہاں تک کہ تم تورات و انجیل اور جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے لگو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) جو آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے، ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں اضافے کا باعث بنے گا، اور آپ کافروں کی قوم کا غم نہ کھائیں (68) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور صابی (بے دین) اور نصاریٰ، ان میں سے جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (69)

اقامتِ تورات و انجیل اور قرآن پر ایمان نجات کے لیے ضروری ہے:

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ تم اہلِ کتاب سے کہہ دو کہ تم دین میں سے کسی بات پر بھی نہیں ہو،

[1] تفسیر الخازن (٢/ ٧٤) [2] تفسیر الطبري (١٠/ ٤٧٢) فتح البیان (٤/ ١٨۔ ٢٠)

جب تک کہ ان سب باتوں پر جو انبیا پر اُتری ہیں، ایمان نہ لاؤ اور عمل نہ کرو۔ ان کتابوں میں یہ حکم بھی تھا کہ پیغمبر آخر الزمان پر ایمان لانا، ان کی پیروی کرنا، اُن کی شریعت پر چلنا۔ اس لیے امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ ﴾ سے مراد قرآنِ عظیم ہے۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد مسلمان ہیں۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ هَادُوْا ﴾ سے حاملانِ تورات۔ ﴿ اَلصّٰبِئُوْنَ ﴾ نصاریٰ اور مجوس کا ایک گروہ، جو کوئی دین نہیں رکھتے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی "مِنَ الْيَهُوْدِ وَالْمَجُوْسِ". امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: "مِنَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارىٰ" امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: "إِنَّهُمْ كَالْمَجُوْسِ". امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک فرشتہ پرست قوم ہے، غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، زبور کے قاری ہیں۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی توحید کے عارف ہیں، مگر ان کے لیے کوئی شریعت نہیں، جس پر وہ عمل کریں۔ کفر بھی نہیں کرتے۔ ابو الزناد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ قوم عراق کے متصل رہتی ہے، ان کو بلوثا کہتے ہیں۔ سب انبیا پر ایمان رکھتے ہیں۔[1] نصاریٰ تو جانے پہچانے ہیں کہ یہ حاملانِ انجیل ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ کوئی بھی فرقہ کیوں نہ ہو، جب وہ اللہ پر اور یومِ آخرت پر، یعنی معاد و جزائے یوم الدین پر ایمان لایا، عملِ صالح کیا تو وہ بے خوف وحزن ہوگا۔ یہ بات نہیں ہوسکتی، مگر اسی وقت کہ وہ شریعتِ محمدیہ کے مطابق ہو اور رسول الثقلین ﷺ کے تابع ہو، پھر نہ اُن پر کچھ خوف ہے اور نہ ماضی پر وہ غمگین ہوں گے۔ فتح البیان کے الفاظ یوں ہیں کہ اے کتاب والو! تم دینِ پسندیدہ کی کسی شے پر نہیں ہو۔ یہ ان کے طریقے کی تحقیر و تقلیل ہے۔

اقامتِ تورات وانجیل سے یہ مراد ہے کہ ان کے اوامر ونواہی پر عمل کرو۔ ان احکام میں سے ایک حکم یہی نبی اکرم ﷺ کی اتباع کا اور ان کی مخالفت کی ممانعت کا ہے۔ پھر قرآن کا ذکر کیا، کیوں کہ ان دونوں کتابوں کو قرآنِ مجید کے قائم کرنے کے بغیر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ﴿ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ ﴾ سے مراد وہ ہو، جو سوائے ہر دو مذکور کتابوں کے انبیا کی زبان پر اُترا۔ پھر کہا کہ ﴿ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ سے اُن کو کچھ نہیں بڑھتا، مگر یہی کفر پر کفر اور طغیان پر طغیان۔ مراد اہلِ کتاب کے علما ہیں یا وہ جو اُن میں اسلام نہ لائے، کتابی بنے رہے، سو اُن پر افسوس کرنے سے منع فرمایا، اس لیے کہ ان کے فعل و عمل کا نقصان انھی کو ہے نہ کہ کسی اور کو۔ ہاں جو ان میں سے اور صابئین میں سے ایسے ہیں کہ اللہ پر ایمان خالص اس لیے لائے کہ یہ ہی مطلوب ہے اور آخرت کی تصدیق کرتے ہیں اور عملِ صالح کرتے ہیں تو ان پر البتہ نہ کچھ خوف ہے اور نہ ان کو کسی طرح کا غم ہوگا۔[2]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٧٥ ـ ١١٧٦)
[2] فتح البيان (٤/ ٢١ ـ ٢٢)

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ
كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا
كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝٧٠ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ
فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا
كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝٧١

یقیناً ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ہم نے ان کی طرف کئی رسول بھیجے۔ جب ان کے پاس کوئی رسول ایسی چیز لے کر آیا جسے ان کے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو بعض نبیوں کو انھوں نے جھٹلایا اور بعض کو وہ قتل ہی کر دیتے تھے (70) اور ان لوگوں کا خیال تھا کہ (ان کی) کوئی آزمایش نہ ہوگی، چناں چہ وہ اندھے اور بہرے ہوگئے، پھر اللہ ان پر مہربان ہوا، مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ پھر اندھے اور بہرے ہوگئے، اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں (71)

بنی اسرائیل کی مواثیق شکنی:

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ان عہود اور مواثیق کا ذکر کیا، جو بنی اسرائیل سے اللہ و رسول کی اطاعت پر لیے گئے تھے۔ انھوں نے اس قول و قرار اور عہد و پیمان کو توڑ ڈالا، اپنے آرا اور خواہشات کے فرمانبردار ہو کر ان کو شریعت کے احکام پر مقدم کیا۔ شریعت کی جو بات اپنے مطلب کی تھی، اس کو مان لیا اور جو اپنے نفس کے خلاف تھی، اس کو رد کر دیا۔ اس امت کے بدعتی بھی یہی کام کرتے ہیں کہ وہ بدعت کے قائل ہیں اور سنت کو مٹانے والے ہیں، اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا کہ جب کوئی رسول ان کے پاس اُن کی ہوائے نفس کے خلاف کوئی چیز لاتا تو کسی کو جھٹلاتے اور کسی کو قتل کر دیتے، جس طرح اب اس امت میں بھی بعض محدثین اور عامل بالحدیث جھٹلائے جاتے ہیں اور بعض کے قتل اور جلا وطنی کی تدبیر کی جاتی ہے ؎

لو حضرت دل سنو تازہ خبر اور ہوتا ہے وہاں مشورۂ قتل ہمارا

اللہ پاک کی حفاظت وعصمت ونصرت و اعانت نہ ہوتی تو اب تک اللہ جانے کیا کچھ نہ ہو جاتا، مگر وہ اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں کی حفاظت کرنے والا ہے۔ زبانِ ناتواں اس کا شکر کرنے اور احسان کا اظہار کرنے سے قاصر ہے۔ اہلِ کتاب کو یہ گمان تھا کہ انبیا کی تکذیب اور قتل اس لیے ہے کہ کوئی فتنہ نہ اُٹھے اور کسی شر کی آگ نہ بھڑکے، سو ان کا یہی فعل ان کے لیے شر اور فتنے کا باعث بن گیا کہ وہ حق بات کے دیکھنے اور سننے سے اندھے اور بہرے ہوگئے۔ نہ حق بات سنتے ہیں نہ حق کی طرف راہ پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کو دیکھو کہ اس خرابیِ حال پر

بھی ان کی توبہ قبول کر لی تھی، مگر پھر وہ اس کے بعد اسی چال پر لگ گئے، بدستور اندھے اور بہرے بنے رہے۔

پھر وہی زندگی ہماری ہے پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں

سو اللہ تبارک وتعالیٰ کو ان کے اس کرتوت پر اطلاع ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون ان میں ہدایت کے لائق اور کون گمراہی کے لائق ہے۔ معلوم ہوا کہ توبہ شکنی اہلِ کتاب کی قدیم عادت ہے۔ اس امت میں اب ان کی ساری خصلتیں آ گئی ہیں۔ إِنَّا لِلّٰهِ.

فتح البیان میں ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا کہ موحد بنے رہو، جو احکام اور شریعتیں تورات میں ہیں، ان پر چلو۔ رسول اس لیے بھیجے کہ ان کو شریعتوں کی تعلیم وتعریف وقتاً فوقتاً، عصراً بعد عصرٍ کرتے رہیں، مگر انھوں نے ایک نہ سنی سمجھی، جس نے ان کی خوشی کے خلاف کوئی بات کی، اس کو لے ڈالا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا۔ زکریا و یحییٰ علیہما السلام کو جان سے مار ڈالا۔ یہ کام عہد شکنی کے لیے اور جرأت کے طور سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کے لیے کیا۔

پھر یہ خیال کیا کہ اس عہد شکنی پر کوئی ابتلا یا کسی سختی کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں آئے گی، اس لیے کہ ہم اللہ کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔ ان کے ظنِ فاسد میں یہ اعتقاد تھا کہ جو رسول ان کی شریعت کے سوا کوئی اور شریعت لے کر آئے گا، ان پر اُس کا جھٹلانا اور قتل کرنا واجب ہے، تاکہ ان کے فعل سے کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔ یا ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کے آبا و اسلاف آخرت کے عذاب کو ان سے دور کر دیں گے، سو وہ تو کچھ نہ ہوا اور نہ ہوگا، لیکن یہ ہوا کہ وہ ہدایت اور حق بات کو دیکھنے اور سننے سے اندھے بہرے ہو گئے۔ یہ تورات کے احکام کی مخالفت وقتل شعیا کی طرف اشارہ ہے یا بچھڑے کی عبادت کی طرف۔

بچھڑے کی عبادت کی مثال صحیح نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اگرچہ وہ ایک بڑی معصیت تھی، لیکن موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں واقع ہوئی تھی، اس کا اس حال سے کچھ تعلق نہیں، جو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے رسولوں کے ساتھ افعال کیے تھے۔ پھر جب وہ فساد مذکورہ سے تائب ہوئے اور ان سے رجوع کر لیا، اس کے بعد کہ ایک زمانۂ دراز تک بخت نصر کے قہر وغضب کے تحت بابل میں قید وگرفتار ہو کر نہایت ذلت اور خواری میں پھنسے ہوئے تھے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کی اور ذلت اور قحط کو ان سے دور کیا، مگر اس توبہ کے بعد پھر وہی کیا کہ یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو قتل کر ڈالا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی فکر میں لگ گئے یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کرنا مراد ہے۔ اس توبہ شکنی سے پھر اسی طرح اندھے بہرے بن گئے۔ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ یہ انبیا کو تابڑ توڑ قتل کرتے ہیں، رسولوں کو جھٹلاتے ہیں، وہ ان کو اس کا بدلہ ان کے اعمال اور افعال کے مطابق دے گا۔[1]

---

[1] فتح البیان (٤/ ٢٣۔ ٢٤)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ
مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ
وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ
الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۷۲ لَقَدْ كَفَرَ
الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۳ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى
اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷۴ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ
مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ
صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ
نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۷۵

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا: بے شک اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔ اور مسیح نے کہا: اے بنی اسرائیل! تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا رب ہے، بے شک جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں (72) یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنھوں نے کہا: بے شک اللہ تین میں سے تیسرا ہے اور کوئی معبود نہیں سوائے ایک معبود کے۔ اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اگر اس سے باز نہ آئے تو ان میں جن لوگوں نے کفر کیا، انھیں ضرور دردناک عذاب ملے گا (73) پھر کیا وہ اللہ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (74) مسیح ابن مریم نہیں ہیں مگر ایک رسول ہی۔ بلاشبہ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ (نہایت راستباز) تھی، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھیں ہم ان کے لیے کیسی کیسی نشانیاں بیان کرتے ہیں، پھر دیکھیں وہ کدھر اُلٹے پھرے جاتے ہیں! (75)

عیسائیوں کا کفر و شرک اور مسیح علیہ السلام کی دعوتِ توحید:

نصاریٰ میں دو قول ہیں: بعضے کہتے ہیں کہ اللہ یہی تھا، جو مسیح کی صورت میں آیا اور بعضے کہتے ہیں کہ تین حصے ہو گیا، ایک اللہ، ایک روح القدس اور ایک مسیح۔ یہ دونوں صریح کفر ہیں، کاملوں کے حق میں یہی کہے، جو آگے فرمایا۔

اس سے زیادہ کیا نشانی کہ جو شخص کھانا کھائے، اسے بشری حاجت لگے، اللہ کی ذات پاک اس لائق کب ہے؟ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طوائفِ نصاریٰ پر کفر کا حکم لگایا، جو مسیح کو اللہ کہتے ہیں۔ اللہ پاک ان کے اس کہنے سے کہیں برتر ہے۔ مسیح تو اللہ کے ایک بندے اور رسول ہیں۔ پہلا کلمہ جو ان کے منہ سے بچپن میں نکلا تھا، وہ یہی تھا: "إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ" "میں اللہ کا بندہ ہوں۔" یہ نہیں کہا: "إِنِّي أَنَا اللّٰهُ" "میں ہی اللہ ہوں۔" اور نہ یہ کہا: "إِنِّيْ ابْنُ اللّٰهِ" "میں اللہ کا بیٹا ہوں۔" بلکہ یہ کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھ کو کتاب دی ہے، مجھے نبی بنایا ہے۔

پھر یہ کہا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ٥١] "بے شک اللہ میرا اور تمھارا رب ہے، چناں چہ اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔" سو جس طرح یہ کلمہ مہد میں کہا تھا، اسی طرح ادھیڑ عمری اور نبوت کی حالت میں بھی ان کو اکیلے اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کا حکم دیا۔ اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے کہ جو کوئی غیر کو پوجے گا، اس پر جنت حرام اور دوزخ حلال ہوگی، یعنی واجب ہوگی، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨] "بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٠] "اور دوزخ والے جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم کچھ پانی ہم پر انڈیل دو یا اس رزق میں سے، جو اللہ نے تمھیں دیا ہے، (کچھ ہمیں عطا کر دو) جنتی کہیں گے: بے شک اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر دی ہیں۔" صحیح میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک منادی کو بھیجا کہ لوگوں میں پکارے کہ داخل نہ ہوگا جنت میں مگر نفسِ مسلمہ اور ایک روایت میں آیا ہے مگر نفسِ مومنہ۔[1] سورت نساء زیرِ آیت: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ میں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث گزر چکی ہے کہ دیوان تین ہیں: ایک وہ دیوان ہے جو بخشا نہیں جاتا، وہ شرک ہے۔[2] (الحديث رواه أحمد) یہی بات مسیح علیہ السلام نے بھی بنی اسرائیل سے کہی کہ ظالموں کا اللہ کے نزدیک کوئی مددگار اور اعانت کرنے والا نہیں، جو ان کو آگ کے عذاب سے چھڑا دے۔ ابو صخر رحمہ اللہ نے تفسیر ثالث ثلاثہ میں کہا ہے کہ مراد قولِ یہود ہے کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور قولِ نصاریٰ کہ مسیح ابن اللہ ہیں۔ انھوں نے ایک اللہ کے تین کیے، لیکن یہ قول اس آیت کی تفسیر میں غریب ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١) صحيح ابن حبان (١١/ ١٨٥) تفسير ابن كثير (٢/ ١١٢)

[2] مسند أحمد (٦/ ٢٤٠) اس کی سند میں "صدقہ بن موسیٰ" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٣٠٢٢)

صحیح یہی ہے کہ یہ خاص قول نصاریٰ کا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] پھر کسی نے کہا ہے کہ مراد کفارِ نصاریٰ ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ تین اقنوم ہیں: اقنوم اب، اقنوم ابن، اقنوم کلمہ جو باپ سے بیٹے کی طرف آیا ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ۔ ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ نصاریٰ کے تین گروہ: ملکانیہ، یعقوبیہ اور نسطوریہ اقانیم ثلاثہ کے قائل ہیں۔[2] آپس میں اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور ہیں۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کو کافر کہتا ہے، حق یہ ہے کہ یہ تینوں کافر ہیں۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مسیح علیہ السلام اور اُن کی ماں کو اللہ کے ساتھ اللہ ٹھہرانے کے بارے میں ہے۔ انھوں نے اللہ کے تین اللہ ٹھہرائے۔ اس اعتبار سے، جس طرح آخر سورت میں فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۭ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ [المائدة: ١١٦] ''اور جب اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟ تو وہ کہیں گے: تو پاک ہے، میرے لیے (جائز) نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہو تو یقیناً تو اُسے جانتا ہے۔ تو اسے بھی جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا، جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔ بے شک تو ہی سب سے بڑھ کر غیب کو جاننے والا ہے۔''[3]

یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔ والله أعلم. حالاں کہ اللہ ایک ہے نہ کہ چند۔ ساری کائنات اور موجودات اسی وحدہ لاشریک لہ کی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ وعید اور ڈانٹ سنائی کہ اگر وہ اس بہتان طرازی اور جھوٹ سے باز نہیں آئیں گے تو آخرت میں ان کو دردناک عذاب ہوگا، یعنی وہ عذاب جس میں لوہے کے طوق اور سزا ہوگی۔ پھر فرمایا کہ وہ کیوں توبہ اور استغفار نہیں کرتے، اللہ تو غفور و رحیم ہے۔

یہ اللہ کا کمال درجے کا کرم، عطا، لطف اور رحمت ہے، مخلوق کے حال پر باوجود اس گناہِ عظیم یا بہتان اور جھوٹ کے ارتکاب کے بھی اللہ ان کو توبہ کی طرف بلاتا ہے، ان کی مغفرت کرنا چاہتا ہے۔ ''فَکُلُّ مَنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ'' (جو بھی توبہ کرتا ہے، اللہ اُس پر رحم فرماتا ہے)۔ مسیح علیہ السلام بھی ویسے ہی ایک رسول ہیں، جیسے ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، یعنی اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [الزخرف: ٥٩] ''وہ (عیسیٰ) تو صرف ایک بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنا دیا۔''

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٧٨_ ١١٧٩) [2] تفسير الطبري (١٠/ ٤٨١_ ٤٨٢) [3] تفسير الطبري (١٠/ ٤٨٣)

مریم صدیقہ کی فضیلت:

﴿ صِدِّيْقَةٌ ﴾ سے مراد مومنہ مصدقہ ہے۔ یہ حضرت مریم کا اعلیٰ مقام ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ نبیہ نہ تھیں، جس طرح کہ امام ابن حزم رحمہ اللہ وغیرہ کا مذہب ہے کہ سارہ والدۂ اسحاق، اُم موسیٰ اور اُم عیسیٰ نبیات تھیں، اس دلیل سے کہ ملائکہ نے سارہ اور مریم کو خطاب کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رُو سے: ﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ﴾ [القصص: ۷] ''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ تو اسے دودھ پلا۔'' نبوت کے یہی معنی ہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر مردوں میں سے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ [یوسف: ۱۰۹] ''اور آپ سے پہلے ہم نے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے (اور) وہ بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔''

شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے اس امر پر اجماع نقل کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ مسیح و مریم دونوں کھانا کھاتے اور براز کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں بندے تھے نہ کہ اللہ جس طرح نصاریٰ کا زعم ہے۔ عليهم لعائن الله المتتابعة إلى يوم القيامة. پھر فرمایا کہ دیکھ ہم نے ان کے لیے کس طرح نشانیاں ظاہر و واضح کر دیں۔ اس صاف بیان اور وضاحت کے بعد یہ کدھر جاتے ہیں، کس بات سے تمسک کرتے ہیں، کس گمراہی کے مذہب کو پکڑتے ہیں؟![1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جنھوں نے مسیح کو اللہ کہا، وہ کافر ہوئے، مسیح تو خود اپنے آپ کو بندہ کہتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے دلائل ان پر ظاہر ہیں، جو شرک پر مرتا ہے، اُس پر بہشت حرام ہوتی ہے، جہنم اس کا ٹھکانا ہے، اس کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قول عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ تین سے مراد اقنیم اب، اقنیم ابن اور اقنیم روح القدس ہے۔ اس بات کا باطل ہونا معلوم ہے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی بات شدید فساد کا باعث اور صاف طور پر باطل نہیں۔ حالاں کہ وجود میں ایسا کوئی اللہ نہیں، جس کا کوئی ثانی یا ثالث و شریک ہو اور نہ اس کی کوئی اولاد اور صاحبہ ہو مگر اللہ تعالیٰ۔ مسیح مرتبۂ رسالت سے تجاوز نہیں کرتے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں عصا میں جان پڑ گئی، آدم بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے، اگر عیسیٰ نے مردوں کو زندہ کیا اور بغیر باپ کے پیدا ہوئے تو اس سے وہ کوئی اللہ نہیں ہوسکتے ہیں۔ ان کی ماں ان کی رسالت کی تصدیق کرتی تھیں۔ اس سے مریم کا اللہ ہونا لازم نہیں آتا، جس طرح ساری عورتیں مومن مصدق ہوتی ہیں، ویسے ہی ایک وہ بھی

[1] تفسیر ابن كثير (۲/ ۱۱۳۔ ۱۱۴)

تھیں۔ عیسیٰ نبی تھے، وہ صحابیہ تھیں۔ ان کو صدیقہ کہا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ ﴾ [التحریم: ۱۲] ''اور اس (مریم) نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی۔''

جس طرح سارے لوگ کھاتے پیتے ہیں، اسی طرح مسیح علیہ السلام اور مریم علیہا السلام بھی کھاتے تھے، وہ عبد مربوب تھے نہ کہ رب معبود۔ اُن کو عورت نے جنا تھا، وہ رب کس طرح ہو سکتے ہیں؟! رہی یہ بات، کہ اُن کا کھانا، بنیادِ ناسوت (دنیا) پر تھا نہ لاہوت (عالم ذاتِ الٰہی) پر، سو بالکل باطل ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا غیر اللہ کے ساتھ اختلاط لازم آتا ہے، اگر ذاتِ قدیم کا اختلاط کسی فنا ہونے والی ذات سے جائز ٹھہرے گا تو پھر قدیم بھی فنا ہونے والی ذات ہونا چاہیے۔ پھر جب یہ بات عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں صحیح ہوگی تو پھر اور بندوں کے حق میں بھی جو عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ ہیں، صحیح ہوگی۔ [1]

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۷۶ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝۷۷

(اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمھارے لیے نقصان اور نفع کا کوئی اختیار نہیں رکھتی؟ اور اللہ ہی تو خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (76) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے ہیں، اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھی راہ سے بہک گئے (77)

شرک اور غلو سے ممانعت:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں پر انکار کیا ہے جو بتوں اور انداد و اوثان کو پوجتے ہیں۔ فرمایا: وہ کسی شئے کی اُلوہیت کے مستحق نہیں ہیں۔ اے نبی! آپ بنی آدم کے تمام فرقوں سے کہہ دیں، اس میں نصاریٰ وغیرہ بھی داخل ہیں، کہ کیا تم کسی ایسی ہستی کو پوجتے ہو، جس کو اس بات کی کوئی قدرت حاصل نہیں کہ تم سے کوئی تکلیف دور کر سکے یا تمھیں کوئی فائدہ پہنچا سکے؟! اللہ تعالیٰ بندوں کی باتوں کو سنتا ہے، ہر شے کو جانتا ہے، پھر تم نے کس لیے اللہ کو چھوڑ کر جماد کو پکڑا ہے، جو نہ سن سکے نہ دیکھ سکے اور نہ کچھ جان سکے، وہ نہ اپنے نفع نقصان کا مالک، نہ دوسرے کے نفع نقصان پر قادر۔

---

[1] فتح البیان (٤/ ٢٦۔ ٢٨)

پھر اہلِ کتاب کو غلو کرنے سے منع کیا کہ تم اتباعِ حق میں حد سے آگے نہ بڑھو، جس کی تعظیم کرنے کا حکم ہے، تم اُس کو نبوت سے نکال کر مقامِ اُلوہیت تک نہ پہنچاؤ۔ جس طرح کہ مسیح کے حق میں تم نے کیا ہے، حالاں کہ وہ تمام انبیا میں سے ایک نبی ہیں اور تمام بندوں میں سے اللہ کے ایک بندے ہیں۔ ان کو تم نے اللہ مقرر کیا، سوا وحدہ لا شریک لہ کے۔ اس میں تم اپنے پہلے بڑے بوڑھوں کے مقتدی ہوئے، جو قدیم سے گمراہ تھے اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کر گئے، وہ استقامت اور اعتدال کے راستے سے نکل کر گمراہی اور ضلالت کے راستے میں داخل ہو گئے۔

امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک شخص اہلِ کتاب میں سے کتاب و سنت پر قائم تھا، ایک زمانے تک ان پر چلتا رہا، شیطان نے آ کر کہا کہ تو وہ کام کرتا ہے، جس پر تجھ سے پہلے عمل کیا گیا، اس میں تیری کیا تعریف ہوگی؟ تو اپنی طرف سے کوئی نئی بات نکال، لوگوں کو اس طرف بلا، اُس پر چلا۔ اُس نے ایسا ہی کیا، ایک زمانے کے بعد اسے یاد آیا کہ میں نے یہ کام کیا، اُس نے چاہا کہ توبہ کرے، ملک و سلطنت کو چھوڑ کر عبادت اختیار کرے۔ مدت تک عبادت کرتا رہا، اُس کے پاس آ کر کہا گیا کہ اگر تو اس گناہ سے توبہ کرتا جو تیرے اور اللہ کے درمیان تھا تو تیری توبہ قبول ہوتی، لیکن فلاں فلاں تیری راہ میں گمراہ ہو گئے، دنیا کو چھوڑ کر اسی گمراہی پر مر گئے، اب تو ان کو کس طرح ہدایت کر سکتا ہے، تیرے لیے ہرگز توبہ نہیں ہے۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم نے سنا کہ یہ آیت اس شخص کے اور جو لوگ اس کی طرح ہوں، ان کے بارے میں اُتری ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ ... الخ﴾ سے اس جگہ مسیح مراد ہیں، یعنی وہ ایک بندۂ مامور ہیں، ان کے ہاتھ پر جو نفع و ضرر جاری ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہے، ورنہ وہ اپنی جان کے نفع و نقصان کے تو مالک نہیں ہیں، دوسرے کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچائیں گے۔ سو جس کا یہ حال ہو، بھلا اُس کو کون معبود بنائے۔ حرف "مَنْ" کے بجائے "مَا" اس لیے فرمایا کہ مسیح کا اُلوہیت سے گریزاں ہونا ثابت ہو، گویا ان اشیا کے سِلک (لڑی) میں منتظم ہیں، جن کو اصلاً کسی شے پر قدرت نہیں ہے۔

ضر کو نفع سے پہلے اس لیے بیان کیا کہ مفاسد کو دور کرنا مصالح کو حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ یہ اس بات پر دلیلِ قاطع ہے کہ مسیح کا حال رب اور الٰہ ہونے کی نفی کرتا ہے، اُن کو ضر اور نفع کی کچھ طاقت نہیں ہے۔ رب کی یہ صفت ہے کہ ہر شے پر قادر ہو، کوئی شے اس کی قدرت سے باہر نہ ہو۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس طرح ہے تو اور اولیا کا کیا ذکر ہے۔ پھر اہلِ کتاب کو دین میں غلو کرنے سے منع کیا۔ غلو کمی کرنے اور اضافہ کرنے دونوں

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٠۔ ١١٨١)

سے ہوتا ہے، جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہ اضافہ کیا کہ ان کو اللہ ٹھہرا دیا اور یہود نے ان کو ایسا گھٹایا کہ نبی بھی نہ کہا۔

﴿غَيْرَ الْحَقِّ﴾ کی قید سے ثابت ہوا کہ حق بات میں بحث اور استخراجِ حقائق میں کوشش کر کے غلو کرنا بری بات نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿لَا تَغْلُوْا﴾ کے معنی ہیں: "لَا تَبْتَدِعُوْا" "دین میں اپنی طرف سے اضافہ نہ کرو۔" امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک غلو یہ تھا کہ اللہ کے جورو اور بچے بتائے۔[1] ﴿اَهْوَآءَ﴾ "هَوٰی" کی جمع ہے۔ "هَوٰی" وہ ہے، جس کی طرف خواہشِ نفس بلائے۔ یہی امام شعبی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جہاں کہیں "هَوٰی" کا ذکر کیا ہے، اس کی مذمت کی ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے نہیں پایا ہویٰ کو مگر شر کے مقام میں۔[2] ان یہود و نصاریٰ کو خطاب ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، ان کو اپنے اسلاف کی بدعتوں اور گمراہیوں کی اتباع سے منع کیا۔ وہ بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اور بعد میں گمراہ ہوئے اور گمراہ کیا۔ بعثت سے پہلے انجیل سے بہک گئے اور بعثت کے بعد قرآن سے بہکے۔[3]

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ
دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا
يَعْتَدُوْنَ ۝78 كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝79 تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ
يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ
اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝80 وَلَوْ
كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ
اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝81

بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے ان پر داود اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے (78) وہ ایک دوسرے کو برے کام سے منع نہیں کرتے تھے، کیوں کہ انھوں نے وہ خود کیا ہوتا تھا، بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے (79) آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جنھوں نے کفر کیا۔ بہت برا ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا کہ اللہ ان سے ناراض ہوگیا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں (80)

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٠) [2] تفسير الرازي (١٢/ ٥٣) [3] فتح البيان (٤/ ٢٩۔ ٣١)

اور اگر ایسا ہوتا کہ وہ اللہ پر اور اس کے نبی پر اور اس پر ایمان لاتے جو اس کی طرف نازل کیا گیا، تو ان (کافروں) کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ نافرمان ہیں (81)

بنی اسرائیل کے کافروں پر اللہ کی لعنت:

اللہ پاک نے اس آیتِ پاک میں یہ خبر دی ہے کہ ہم نے ایک زمانۂ دراز سے بنی اسرائیل کے کافروں پر داود اور عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے ان کی نافرمانیوں اور اللہ کی مخلوق پر زیادتیوں کی وجہ سے لعنت کی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ تورات، انجیل، زبور اور فرقان میں ملعون ہوئے۔[1] پھر ان کا حال بیان کیا کہ وہ کسی کو کسی طرح گناہوں کے ارتکاب سے باز نہیں رکھتے تھے۔ ان کا یہ فعل بہت برا تھا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل اللہ کی نافرمانیوں میں گرفتار ہوئے، علما نے اُن کو منع کیا، انھوں نے نہ مانا اور باز نہ آئے تو علما ان کے ساتھ مجلسوں اور بازاروں میں بیٹھنے لگے، ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہوگئے۔ اللہ نے بعض کے دل بعض سے مارے، داود اور عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی، یہ اس لیے کہ وہ گناہگار تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے تھے، اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: «لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى تَطْرُوْهُمْ عَلَى الْحَقِّ إِطْرَاءً»[2] (رواہ أحمد) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلا نقصان جو بنی اسرائیل میں گھسا، یہ تھا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملتا۔ کہتا: اے شخص! اللہ سے ڈر، یہ کام جو تو کرتا ہے، چھوڑ دے، اس کا کرنا تجھ کو حلال نہیں ہے۔ پھر دوسرے دن جو اس سے ملتا منع نہ کرتا۔ اس کے ہم نوالہ ہم پیالہ ہم جلسہ ہونے سے وہ بھی یہ کام کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے بعض کے دل بعض سے مارے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ ... الخ﴾ پھر فرمایا: کوئی نہیں واللہ! تم امر کرو معروف کا، نہی کرو منکر سے، ہاتھ پکڑو ظالم کا اور مبالغہ کرو حق پر یا اُس کو پورا پورا بیان کرو۔[3] (رواہ أبو داود و ابن ماجة)

ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اس کو مرسلاً بھی روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی دوسری طویل حدیث کی روایت میں مرفوعاً یہ الفاظ ہیں کہ بنی اسرائیل میں جب کوئی اپنے بھائی کو کسی گناہ پر دیکھتا، اس سے روکتا منع کرتا، جب دوسرا دن ہوتا تو وہ اسے دیکھتا۔ اس کا اکیل، اس سے میل جول اور شرکت یا اس کا ہم مشرب ہونے سے مانع نہ ہوتا، جب اللہ تعالیٰ نے اُن کا یہ ڈھنگ دیکھا تو بعض کے دل بعض

---

(1) تفسیر الطبري (١٠/ ٤٨٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٢) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

(2) مسند أحمد (١/ ٣٩١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ٤٧٧٣)

(3) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٣٣٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٠٤٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٠٠٦)

سے مارے، ان کے نبی کی زبان پر داود و عیسیٰ علیہما السلام سے لعنت کی، اس نافرمانی اور حد سے تجاوز کے سبب سے۔ پھر فرمایا: قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، گناہگار کا ہاتھ پکڑ لو، حق کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرو، ورنہ اللہ مارے گا تمھارے بعض کے دل بعض سے یا تم کو بھی لعنت کرے گا، جس طرح ان کو لعنت کی۔[1] (رواه ابن أبي حاتم و أبو داود بنحوه)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی احادیث:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بہت حدیثیں مروی ہیں۔ سیدنا ابو بکر صدیق اور ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: واللہ! تم نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو، ورنہ لگتا ہے کہ اللہ تم پر اپنے پاس سے عذاب بھیجے گا، پھر دعا مانگو گے تو قبول نہ ہوگی۔[2] (رواه أحمد والترمذي وقال حسن) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مرفوع الفاظ یہ ہیں کہ حکم کرو معروف کا، نہی کرو منکر سے، اس سے پہلے کہ تم دعا مانگو اور قبول نہ ہو۔[3] (رواه ابن ماجة) مگر اس کی سند میں عاصم مجہول ہے۔ صحیح میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی تم میں سے منکر کو دیکھے تو چاہیے کہ اُس کو اپنے ہاتھ سے بگاڑ دے، اگر ہاتھ سے نہ بگاڑ سکے تو زبان سے بگاڑے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے بُرا جانے یہ کمزور ترین ایمان ہے۔[4] (رواه مسلم)

سیدنا عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو سنا، فرماتے تھے کہ اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے عمل کی وجہ سے عذاب نہیں کرتا، یہاں تک کہ وہ دیکھیں کہ ان کے درمیان منکر ہوتا ہے اور وہ اس بات پر قادر ہیں کہ اُس کا انکار کریں، پھر انکار نہیں کرتے، سو جب وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ عام اور خاص سب کو عذاب کرتا ہے۔[5] (رواه أحمد) ابن عمیرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب زمین میں کوئی گناہ کیا جاتا ہے تو جو شخص اس جگہ حاضر ہوتا ہے اور اُس گناہ کو مکروہ سمجھتا ہے یا اُس پر انکار کرتا ہے تو وہ اس شخص کی طرح ہے، جو وہاں حاضر اور موجود نہ تھا اور جو شخص اُس جگہ سے غائب ہے، لیکن اُس کام کو پسند کرتا ہے، وہ اس شخص کی طرح ہے، جو وہاں حاضر اور موجود تھا۔[6] (تفرد به أبو داود ثم رواه مرسلاً أيضاً)

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣٦۔ ٤٣٣٧) گزشتہ اور اس روایت کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١٠٥)

[2] مسند أحمد (٥/ ٣٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٧٠)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٨٦٨) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٩)

[5] مسند أحمد (٤/ ١٩٢) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣١١٠)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٤٥۔ ٤٣٤٦) صحيح [illegible] (٦٨٩)

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا، اس خطبے میں یہ بھی فرمایا کہ خبردار ہو! نہ روکے کسی شخص کو لوگوں کی ہیبت حق گوئی سے، جب کہ اس حق کو جان لیا ہے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے رو کر کہا: واللہ! ہم نے بہت چیزیں دیکھیں، مگر ڈر گئے۔[1] (رواه ابن ماجه) سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے مرفوع الفاظ یہ ہیں کہ افضل جہاد ظالم سلطان کے پاس کلمۂ حق کہنا ہے۔ (رواه أهل السنن إلا النسائي) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس وجہ سے حسن غریب ہے۔[2] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جمرۂ ثانیہ کے پاس ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا اور کچھ پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، جب رمیِ جمرۂ عقبہ کر چکے، پاؤں رکاب میں رکھا، فرمایا: سائل کہاں ہے؟ کہا: میں حاضر ہوں۔ فرمایا: کلمۂ حق جو ظالم بادشاہ سے کہا جائے۔[3] (تفرد به ابن ماجه)

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ تم میں کوئی اپنی جان کو حقیر نہ سمجھے۔ کہا: بھلا کون حقیر سمجھے گا؟ فرمایا: اللہ کا حکم دیکھے، پھر نہ کہے، اللہ اُس سے قیامت کے دن کہے گا: تجھ کو کس نے منع کیا تھا کہ تو فلاں فلاں امر میں کچھ کہتا؟ وہ کہے گا: میں لوگوں سے ڈر گیا، فرمائے گا: میں زیادہ مستحق تھا کہ تو مجھ سے ڈرتا۔[4] (تفرد به ابن ماجه) سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی دوسری مرفوع روایت یوں ہے کہ اللہ بندے سے سوال کرے گا قیامت کے دن، یہاں تک کہ یہی کہے گا کہ تجھ کو کس نے روکا، جب تو نے خلافِ شرع کام دیکھا اور انکار نہ کیا؟ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ بندے کو حجت تلقین کر دے گا تو وہ یوں کہے گا: "يَا رَبِّ رَجَوْتُكَ وَفَرِقْتُ النَّاسَ" یعنی اے رب! تجھ سے اُمید تھی، لوگوں کا ڈر تھا۔[5] (تفرد به ابن ماجه و إسناده لا بأس به)

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو نہ چاہیے کہ اپنی جان کو ذلیل کرے، کہا: کیوں کر؟ فرمایا: اُس بلا کے سامنے آئے، جس کی طاقت نہیں رکھتا۔ (رواه أحمد والترمذي وابن ماجه) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔[6] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کر دیا جائے؟ فرمایا: جب تم میں وہ ظاہر ہو، جو تم سے پہلی امتوں

---

① سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٨)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٤٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٩١)

③ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٢٨٤)

④ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو البختری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٨٧٢)

⑤ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨١٨)

⑥ مسند أحمد (٥/ ٤٠٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦١٣)

میں ظاہر ہوا تھا۔ پوچھا: وہ کیا تھا، جو اُن میں ظاہر ہوا تھا؟ فرمایا: « اَلْمُلْكُ فِيْ صِغَارِكُمْ، وَالْفَاحِشَةُ فِيْ كِبَارِكُمْ، وَالْعِلْمُ فِيْ رِذَالِكُمْ » یعنی جب چھوٹوں کی حکومت ہو، بڑوں میں زنا کاری پھیلے اور علم کمینوں میں ہو، زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی فاسقوں میں۔[1] (تفرد به ابن ماجه)

منافقوں کی مذمت:

یہ جو فرمایا کہ اُن میں بہت سے کافروں کے دوست ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں۔[2] اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ کام برا ہے، جو انھوں نے آگے بھیجا۔ اس سے مراد کافروں سے دوستی قائم کرنا اور مومنین سے دوستی ترک کرنا ہے، جس کا انجام یہ ہوا کہ دلوں میں نفاق پڑ گیا، اللہ کا غصہ قیامت تک قائم ہوگیا، پھر وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔

امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا کہ اے مسلمانوں کے گروہ! زنا سے بچو، زنا میں چھ نقصان ہیں، تین دنیا میں تین آخرت میں: دنیا میں یہ ہیں کہ صورت کی رونق جاتی رہتی ہے، محتاجی آتی ہے اور عمر گھٹتی ہے۔ آخرت میں یہ ہیں کہ رب ناراض ہوتا ہے، حساب بُری طرح لیا جاتا ہے اور آگ میں ہمیشہ رہنا پڑتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ ﴾ (آیت باب)۔[3] (هكذا ذكره ابن أبي حاتم و رواه ابن مردويه عن حذيفة عن النبي ﷺ فذكره) یہ حدیث بہرحال ضعیف ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اگر وہ سچے دل سے اللہ و رسول اور قرآن پر ایمان لاتے تو ہرگز کافروں کے ساتھ دوستی اور مومنین کے ساتھ دشمنی نہ کرتے، مگر بات تو یہ ہے کہ اکثر فاسق ہیں، اس لیے راہ پر نہیں آتے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ ابو مالک غفاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود زبانِ داود علیہ السلام پر ملعون ہوئے، وہ بندر بن گئے، وہ اصحابِ ایلہ تھے۔ نصاریٰ زبانِ عیسیٰ علیہ السلام پر ملعون ہوئے، وہ سور بن گئے۔ یہ اصحاب مائدہ تھے، پانچ ہزار شخص تھے، ان میں کوئی عورت اور بچہ نہ تھا۔ یہ دونوں فریق بنی اسرائیل تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[4] داود علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے۔ اس لعنت کی وجہ دو کام ہوئے۔ ایک نافرمانی اور دوسرے اعتداء

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٥) اس کی سند میں "مکحول" مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٧٠٣)

[2] تفسير القرطبي (٦/ ٢٥٤)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٣) تفسير ابن كثير (٢/ ١١٨) اس کی سند میں "مسلمہ بن علی" متروک راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٤١)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٢) تفسير الطبري (١٠/ ٤٩٠)

(حد سے تجاوز کرنا) اللہ نے ان دونوں کا بیان اس طرح کیا کہ لوگوں کو منکر، یعنی خلافِ شرع کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور منع نہ کرتے تھے، کیوں کہ برائی سے منع نہ کرنے والا، اس کے کرنے والے کی طرح ہوتا ہے اور حد سے تجاوز کرنے والا ٹھہرتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے اہم قواعد اور بڑے شرعی فرائض میں سے ہیں، اس لیے ان کا تارک گناہ کرنے والوں کا برابر کا شریک اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جس طرح سینچر والوں کا حال ہوا کہ جو لوگ ان کے شریک حال نہ تھے، وہ بھی مسخ ہو گئے، اس لیے کہ انھوں نے ان پر انکار نہ کیا، وہ اور معتدین سب کے سب بندر اور سور بنا دیے گئے۔ یہ بڑی عبرت کی جگہ ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ اُن کا منکر پر انکار یا اس سے روکنے کے عمل کو ترک کر دینا بہت برا فعل ہے۔ سیدنا ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے دن کے پہلے حصے میں تینتالیس نبی مار ڈالے، ایک سو بارہ عابدوں نے کھڑے ہو کر ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا، آخری حصے میں ان سب کو بھی قتل کر ڈالا۔

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ... الخ﴾ سے یہ لوگ مراد ہیں۔[1] یہود میں کفار کے دوست دار بہت تھے، جیسے کعب بن اشرف اور اُس کے اصحاب کہ مشرکین سے دوستی رکھتے تھے، حالاں کہ وہ کچھ ان کے دین پر نہ تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ کام انھوں نے برا کیا، جس سے ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا، وہ کفار سے اس دوستی کی وجہ سے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ اگر اللہ اور نبی اور قرآن پر ایمان لائے ہوتے تو کفار کو کبھی اپنا دوست نہ سمجھتے، لیکن ان میں اکثر فاسق ہیں، اس لیے کافروں کے یار بنے ہیں۔[2]

[1] الدر المنثور (٣/ ١٢٦)
[2] فتح البیان (٤/ ٣١۔ ٣٣)

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ
وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا
الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ
وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝٨٢ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ
اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ
الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝٨٣ وَمَا لَنَا
لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا
مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝٨٤ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ
الْمُحْسِنِيْنَ ۝٨٥ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝٨٦

(اے نبی!) یقیناً آپ لوگوں میں اہلِ ایمان سے عداوت رکھنے میں سخت ترین یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے، اور اہلِ ایمان سے دوستی رکھنے میں ضرور قریب ترین ان لوگوں کو پائیں گے جنھوں نے کہا: بے شک ہم نصاریٰ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بے شک ان میں کچھ عالم ہیں، کچھ دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے ہیں اور یہ کہ وہ غرور نہیں کرتے (82) اور جب وہ رسول پر نازل کیا گیا کلام سنتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، لہٰذا تو ہمارے نام (حق کی) گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے (83) اور ہمارے پاس کیا عذر ہے ہم اللہ پر اور جو حق ہم تک پہنچا ہے، اس پر ایمان نہ لائیں؟ اور ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کے گروہ میں داخل کرے گا (84) چناں چہ انھوں نے جو کہا اس کے عوض اللہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ نیکی کرنے والوں کی جزا ہے (85) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہی دوزخی ہیں (86)

شانِ نزول:

مکے میں کافروں نے جب مسلمانوں پر ظلم کیا تو نبی اکرم ﷺ نے اجازت دی کہ کسی اور ملک میں نکل جاؤ۔ اسّی (۸۰) کے قریب مسلمان، بعض تنہا اور بعض گھر والوں سمیت حبشہ کے ملک میں جا بسے، وہاں کا بادشاہ خوب

منصف تھا۔ پھر مکے کے کافروں نے اسے بہکایا کہ اس قوم کو یہاں نہ رہنے دو، یہ عیسیٰ کو غلام کہتے ہیں۔ تب بادشاہ نے مسلمانوں کو بلا کر پوچھا اور قرآن پڑھوا کر سنا، وہ اور اس کے علما بہت روئے اور کہا: عیسیٰ کی زبان سے ہم کو اسی کے مطابق پہنچا ہے اور ہم کو عیسیٰ نے خبر دی ہے کہ میرے بعد قیامت سے پہلے ایک نبی آئے گا، وہ بے شک یہی نبی ہے، وہ بادشاہ خفیہ مسلمان ہوا، ان کے بارے میں یہ آیتیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیات نجاشی اور اس کے اصحاب کے بارے میں اتری ہیں، جب کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حبشہ میں ان پر قرآن پڑھا، یہاں تک کہ ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں،[1] مگر اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ یہ آیت مدنی ہے اور جعفر کا نجاشی کے ساتھ ملاقات کا قصہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔

سعید بن جبیر اور سدی رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ یہ آیات نجاشی کے ایلچیوں کے بارے میں اتری ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنیں اور صفات دیکھیں۔ جب انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر قرآن پڑھا تو اسلام لے آئے، خشوع کیا، پھر نجاشی کے پاس جا کر سب حال سنایا۔ امام سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نجاشی نے ہجرت کی تھی مگر راستے میں مر گیا۔[2] یہ قول افرادِ سدی سے ہے، اس لیے کہ نجاشی جب مراوہ حبشہ کا بادشاہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن اُس پر نمازِ جنازہ پڑھی اور اصحاب کو خبر دی کہ وہ حبشہ کی زمین میں مر گیا۔[3]

نجاشی کے وفد کی گنتی میں اختلاف ہے، کسی نے کہا: بارہ آدمی تھے، سات قساوسہ، یعنی قسیس، مراد علما ہیں، پانچ رہبان، یعنی راہب، مراد درویش ہیں۔ بعض نے اس کے بالعکس کہا ہے، کسی نے کہا: ستر آدمی تھے۔ واللہ أعلم.

امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: وہ اہلِ حبشہ سے ایک قوم تھی، جو مسلمان مہاجرین کے حبشہ میں جانے پر مسلمان ہوئے تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ دینِ عیسیٰ علیہ السلام پر ایک قوم تھی، انھوں نے جب مسلمانوں کو دیکھا اور قرآن سنا تو مسلمان ہو گئے، دیر نہ کی۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے جو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیات ان اقوام کے بارے میں ہیں جو اس درجے کی ہوں، خواہ حبشہ کے ہوں یا کسی اور جگہ کے،[4] کیوں کہ یہود کا کفر، انکار، دشمنی، حق کو جھٹلانا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ان کی عادت تھی، اس لیے انھوں نے بہت سے پیغمبر بھی مار ڈالے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہا قتل کرنا چاہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا، زہر دیا اور مشرکوں کو ان پر بھڑکایا۔ عليهم لعائن الله المتتابعة إلى يوم القيامة.

یہودی سب سے بڑے دشمنِ اسلام نہیں:

امام ابن مردویہ نے اس آیت کی تفسیر میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: «مَا خَلَا يَهُودِيٌّ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۰/ ۴۹۹۔ ۵۰۰)
[2] تفسیر الطبري (۱۰/ ۴۹۹۔ ۵۰۱) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔
[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۵۳)
[4] تفسیر الطبري (۱۰/ ۵۰۱)

بِمُسْلِمٍ إِلَّا هَمَّ بِقَتْلِهِ» روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «إِلَّا حَدَّثَتْهُ نَفْسُهُ بِقَتْلِهِ» [1] ''جب کوئی یہودی کسی مسلمان کو اکیلا پاتا ہے تو یہی چاہتا ہے کہ اس کو قتل کر ڈالے یا اس کے جی میں آتا ہے کہ اس مسلمان کو جان سے مار دے۔'' پھر فرمایا کہ جن لوگوں کا زعم یہ ہے کہ وہ نصاریٰ ہیں، یعنی مسیح علیہ السلام کے متبع ہیں اور منہاج انجیل پر چلتے ہیں، ان میں اسلام اور مسلمان کی دوستی اور محبت ہے، یہ دراصل اس لیے کہ وہ دینِ مسیح پر تھے تو ان کے دلوں میں رقت اور نرمی تھی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا ﴾ [الحدید: ۲۷] ''پھر ہم نے ان کے پیچھے لگاتار اپنے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو (ان سب کے) پیچھے بھیجا، اور ہم نے اسے انجیل دی، اور ہم نے ان کے دلوں میں جنھوں نے اس کی پیروی کی، شفقت اور مہربانی رکھ دی، اور رہبانیت تو انھوں نے از خود ہی ایجاد کر لی تھی۔'' اور ان کی کتاب میں لکھا ہے کہ جو کوئی تیرے سیدھے گال پر مارے تو بایاں گال اس کی طرف پھیر دے، یعنی کہ اس پر بھی مار، ان کی ملت میں قتال مشروع نہیں ہے، اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ان میں پادری اور تارک الدنیا ہیں اور وہ غرور بھی نہیں کرتے۔

عیسائیوں کی نرم دلی:

قسیس اور قس نصاریٰ کے عالم اور خطیب کو کہتے ہیں، قسس قس کی جمع ہے اور قسیسین قسیس کی جمع ہے۔ رہبان راہب کی جمع ہے۔ راہب عابد کو کہتے ہیں، رہبت سے مشتق ہے بمعنی خوف۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ کبھی لفظ رہبان واحد کے طور پر بھی آتا ہے، اس کی جمع رہابین ہوتی ہے، جیسے: قربان اور قرابین۔ کبھی جمع میں رہابیہ بھی کہتے ہیں۔[2]

حاتمہ بن رباب نے کہا ہے کہ میں نے سلمان رضی اللہ عنہ سے آیتِ باب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: "دَعِ الْقِسِّيْسِيْنَ فِي الْبِيَعِ وَالْخَرَابِ، أَقْرَأَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ صِدِّيْقِيْنَ وَرُهْبَانًا" [3] (رواه أبو بكر البزار)

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے حامیہ بن رباب سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: میں نے سلمان رضی اللہ عنہ کو سنا وہ کہتے تھے: یہ وہ رہبان ہیں، جو گرجاؤں اور ویران جگہوں میں رہتے ہیں، ان کو اسی میں چھوڑ دو، پھر کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ پر یوں پڑھا: "ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ" آپ ﷺ نے مجھ کو یوں پڑھایا: «ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ صِدِّيْقِيْنَ وَرُهْبَانًا» تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ میں ایک جگہ حاتمہ، دوسری جگہ حامیہ آیا ہے۔ صحیح لفظ کا ضبط معلوم نہیں۔[4]

---

1. الدر المنثور (۳/ ۱۲۹) ان دونوں کی اسناد میں ''یحییٰ بن عبید اللہ'' سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۴۴۳۹)
2. تفسير الطبري (۱۰/ ۵۰۳)
3. مسند البزار (۶/ ۴۹۹)
4. تفسير ابن أبي حاتم (۴/ ۱۱۸۳) تفسير ابن كثير (۲/ ۱۱۹) اس کی سند میں ''نصیر بن زیاد'' اور ''یحییٰ حمانی'' ضعیف راوی ہیں۔

بہرحال آیتِ شریفہ اس بات کو شامل ہے کہ ان میں علم و عبادت اور تواضع ہے، پھر ان کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ حق کے فرماں بردار اور متبع ہیں اور خاموش ہیں، قرآن کو سن کر حق کو پہچان کر روتے ہیں۔ حق سے مراد محمد ﷺ کی بعثت کی بشارت ہے۔ صحتِ بشارت کی شہادت دیتے ہیں اور نبی اکرم ﷺ پر ایمان لاتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت نجاشی اور اس کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ لوگ کرابین، یعنی فلاحین تھے۔ جب حبشہ سے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ آئے تو نبی اکرم ﷺ نے ان کو قرآن پڑھ کر سنایا، وہ ایمان لائے اور روئے۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ شاید تم جب واپس اپنی زمین میں پہنچو گے تو پھر اپنے دین پر ہو جاؤ گے، انھوں نے کہا کہ ہم اپنے دین سے نقل نہ کریں گے، اس پر اللہ نے اُن کا قول نقل کیا۔[2] (رواه الطبراني) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ سے مراد نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی امت ہے، اس لیے کہ یہ امت اپنے نبی کے لیے گواہی دے گی کہ انھوں نے تبلیغِ رسالت کر دی اور گواہی دے گی دوسرے رسولوں کے بارے میں کہ انھوں نے اپنی امتوں کو پہنچا دیا۔[3] (رواه ابن أبي حاتم والحاكم وقال صحيح الإسناد)

پھر اللہ نے کہا: وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو کیا ہوا ہے، جو ہم حق پر ایمان نہ لائیں۔ ہم کو تو یہ لالچ ہے کہ اللہ ہمارا ساتھ صالح لوگوں کے ساتھ کرے۔ یہ نصاریٰ کی وہی قسم ہے جن کا ذکر دوسری آیت میں آیا ہے: ﴿وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ﴾ [آل عمران: ١٩٩] ”اور بے شک اہلِ کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ اُن کی طرف نازل کیا گیا، اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں۔“

انھی کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿52﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿53﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿54﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿55﴾﴾ [القصص: ٥٢-٥٥] ”وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب ان پر (قرآن) تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بلاشبہ ہم تو اس سے پہلے ہی

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٣٦) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] المعجم الكبير (١٢/ ٥٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وفيه العباس بن الفضل الأنصاري وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ٧/ ٨٢)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٥) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

مسلمان تھے۔ ان لوگوں کو ان کا دو بار اجر دیا جائے گا، کیوں کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب وہ بے ہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں، تمھیں سلام ہو، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔''

فتح البیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ آیتِ باب کے معنی یہ ہیں کہ مومنوں سے جو عداوت یہودیوں اور مشرکوں کو ہے وہ اور کسی شخص کو نہیں ہے۔ نصاریٰ کی طبیعت نرم ہوتی ہے، حق کو جلد قبول کر لیتے ہیں، یہود کا مذہب یہ ہے کہ جو کوئی ان کے دین کا مخالف ہو، اُس کو جس طرح ممکن ہو قتل و غارت گری، مکر و فریب اور حیلے بہانے وغیرہ سے ایذا دینا واجب ہے۔ نصاریٰ کا مذہب یہود کے مذہب کے خلاف ہے، ان کے مذہب میں ایذا رسانی حرام ہے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان یہ فرق ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہودیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کی بہت شدید حرص رکھتے ہیں اور ریاست اور حکومت کے طلب گار ہیں۔ جو کوئی ایسا ہو گا وہ دوسروں سے ضرور سخت دشمنی رکھے گا۔

نصاریٰ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو دنیا سے رخ پھیرنے والے اور ریاست کی طلب کو چھوڑنے والے ہیں، جو کوئی ایسا ہو گا وہ کسی پر حسد کرے گا اور نہ کسی سے دشمنی رکھے گا، بلکہ حق طلب کرنے میں نرم دل ہو گا۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں نصاریٰ کا ذکرِ خیر کیا ہے، اُس سے مراد نجاشی اور اُس کے اصحاب ہیں،[1] لیکن اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا۔ نصاریٰ کی مومنین کے ساتھ دوستی اور محبت کا سبب یہ ہے کہ اُن میں علما اور رؤسا ہوتے ہیں، عابد، زاہد اور تارک الدنیا ہوتے ہیں، قولِ حق سے تکبر نہیں کرتے، بلکہ عاجزی سے پیش آتے ہیں، بخلاف یہود کے کہ وہ اس عادت کے برخلاف ہیں۔

آیتِ کریمہ ایمان کی قید کے بارے میں خاموش ہے۔ یہ نصاریٰ کی یہودیوں کے مقابلے میں تعریف ہے، یہ کچھ ویسے تعریف نہیں ہے۔ پھر وہ نصاریٰ مراد ہوں گے جو فی الجملہ احکامِ انجیل کے معتقد ہوں گے، نہ وہ جو کہ نام کے نصرانی ہیں، کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ علم سب چیزوں سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہے، بھلائی کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے، گو قسیسین کا علم کیوں نہ ہو۔ اسی طرح علمِ آخرت کا حال ہے، اگرچہ راہب میں ہو۔ اسی طرح کبر سے براءت اور بے زاری ہے، اگرچہ کسی نصرانی میں کیوں نہ ہو۔ ﴿ اِذَا سَمِعُوْا ﴾ کی ضمیر نصاریٰ کی طرف پھرتی ہے۔ ﴿ مَآ اُنْزِلَ ﴾ سے مراد قرآن شریف ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ حق بات

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٣)

کو پہچان کر، قرآن پڑھ کر اور احاطہ سنت کر کے ان کو رونا آتا ہے۔ مراد اس سے رقتِ قلب ہے، یہ اثر اولیا کے لیے قبول ہے، اس کے بعد اعداء کا رد ہے۔ ﴿ اَلْجَحِیْمِ ﴾ تیز آگ کو کہتے ہیں۔[1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝٨٧ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝٨٨

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور تم حد سے نہ گزرو، بے شک اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (87) اور اللہ نے تمھیں جو حلال پاکیزہ رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو (88)

طیبات حرام کرنے کی ممانعت:

جو چیز شرع میں صاف حلال ہے اس سے پرہیز کرنا برا ہے، یہ دو طرح ہوتا ہے: ایک یہ کہ زہد کے سبب سے اپنے اوپر تنگی ڈالے، یہ رہبانیت ہمارے دین میں پسند نہیں، بلکہ تقویٰ کا تقاضا ہے جو منع ہو اس کے نزدیک نہ جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی کام پر قسم کھا بیٹھے، یہ بھی بہتر نہیں۔ جو کام شرع کے مطابق ہے، اس سے قسم نہ کھائے اور اگر کھا بیٹھا ہے تو اسے توڑے اور کفارہ دے، یہ آگے فرمایا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ایک گروہ کے بارے میں اتری ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہم اپنے آلاتِ تناسل کاٹ ڈالیں اور دنیا کی شہوات کو ترک کر دیں اور زمین میں سیاحت کرتے پھریں، جس طرح رہبان کرتے ہیں۔ یہ خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی، ان کو بلا کر دریافت کیا، انھوں نے کہا: ہاں، فرمایا: ”میں روزہ رکھتا ہوں، افطار کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، سوتا ہوں، عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، جس نے میری سنت پکڑی وہ مجھ سے ہے اور جس نے نہ پکڑی وہ مجھ سے نہیں۔“[2] (رواہ ابن أبي حاتم و ابن مردويه عنه نحو ذلك)

صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آیا ہے کہ کچھ لوگوں نے صحابہ میں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے پوچھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پوشیدہ عمل کیا کرتے ہیں۔ پھر بعض نے کہا کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا، بعض نے کہا: میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا، بعض نے کہا: میں فرش پر نہیں سوؤں گا، یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو فرمایا: لوگوں کا کیا حال ہے، کوئی یوں کہتا ہے، کوئی یوں کہتا ہے، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں، افطار کرتا ہوں، سوتا ہوں، جاگتا ہوں، گوشت کھاتا ہوں،

---

[1] فتح البیان (٤/ ٣٤۔ ٣٨)

[2] تفسیر الطبري (١٠/ ٥١٨) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٧) اس کی سند حسن ہے۔

عورتوں سے بیاہ کرتا ہوں، سو جو کوئی میری سنت سے بے رغبتی کرے گا، وہ مجھ سے نہیں ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر کہا: میں جب گوشت کھاتا ہوں، مجھ کو انتشار ہوتا ہے، اس لیے میں نے اپنے اوپر گوشت حرام کر لیا ہے، اس پر یہ آیت اتری۔[2] (رواه ابن أبي حاتم والترمذي وقال حسن غريب و ابن جرير)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کے لیے نکلے، ہمارے ساتھ عورتیں نہ تھیں، ہم نے کہا: کیا ہم خصی نہ ہو جائیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس کام سے منع کیا اور اجازت دی کہ کسی عورت سے کپڑے لتے کے عوض ایک معینہ مدت تک نکاح کر لیں، پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آیتِ باب پڑھی۔[3] (أخرجاه) یہ معاملہ نکاحِ متعہ کے حرام ہونے سے پہلے کا تھا۔ معقل بن مقرن نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے اپنے فراش کو حرام کر لیا ہے، انھوں نے آیتِ باب پڑھی۔[4] مسروق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس تھے، دودھ لایا گیا، ایک آدمی الگ جا بیٹھا، اس سے کہا کہ پاس آ جا، اس نے کہا کہ میں نے اس کا کھانا اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: قریب آ اور کھا اور قسم کا کفارہ دے، پھر یہ آیت پڑھی۔[5] (رواه ابن أبي حاتم والأخير الحاكم في المستدرك)

صحیح بخاری میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مہمانوں کے ساتھ قصہ آیا ہے،[6] وہ مذہب شافعی وغیرہ پر دلیل ہے کہ جس نے کسی کھانے یا پہننے یا کسی اور چیز کو سوائے عورتوں کے حرام کر لیا، اُس پر کفارہ نہیں ہے، بدلیل آیتِ باب اور اس دلیل سے کہ جس نے اپنے اوپر گوشت کا کھانا حرام کیا تھا، جس طرح حدیثِ متقدم میں گزر چکا ہے، اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارے کا حکم نہیں دیا۔ احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں کفارۂ یمین ہے، جس طرح کہ کسی کو چھوڑنے کی قسم کھا کر کفارہ لازم آتا ہے، اسی طرح صرف نفس پر کوئی چیز حرام کر لینے پر بوجہ لزوم ما التزم کفارہ لازم ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی فتویٰ دیا ہے اور جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ﴾ [التحریم: ۱] ''اے نبی! آپ حرام کیوں ٹھہراتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے؟ آپ اپنی بیویوں کی رضا مندی چاہتے ہیں۔ اور اللہ خوب بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا

---

(1) صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بجائے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

(2) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٥٤) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٦) تفسير الطبري (١٠/ ٥٢٠) اس کی سند میں ''عثمان بن سعد'' ضعیف راوی ہے۔

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٤)

(4) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٨٧) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٧)

(6) المعجم الكبير (٩/ ٣٤٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ورجال هذا وغيره رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد: ٦/ ٤٢٣)

ہے۔'' اور پھر فرمایا: ﴿ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴾ [التحریم: ۲] ''تحقیق اللہ نے تمھارے لیے تمھاری (ناجائز) قسمیں کھولنا (توڑنا) فرض کر دیا ہے، اور اللہ تمھارا مولا ہے، اور وہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔'' اُسی طرح اس جگہ حکم کے بعد تکفیرِ یمین کا ذکر کیا ہے۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ تحریم اقتضائے تکفیر میں بمنزلہ یمین کے ہے۔ واللہ أعلم.

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ تبتل کریں، یعنی خصی ہو جائیں، ٹاٹ پہنیں، ان میں سے ایک عثمان بن مظعون اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم تھے، یہ آیت آخر تک نازل ہوئی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علی، ابن مسعود، مقداد بن اسود اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے، انھوں نے گوشہ نشینی اور گوشہ گزینی اختیار کی، عورتوں سے کنارہ کش ہوئے، ٹاٹ پہنا، طعام ولباس حرام کر لیا، مگر اتنا جتنا اہلِ سیاحت بنی اسرائیل کھاتے پہنتے ہیں، خصی ہونے کا ارادہ کیا، قیام اللیل اور صیام نہار پر اجماع اور اتفاق کیا، اس پر یہ آیت اتری۔

یہ جو فرمایا ہے کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم رسولوں کی سنت کے خلاف نہ چلو۔ عورتوں کو حرام کرنے، لباس کو چھوڑ دینے، رات کو قیام کرنے، دن کو روزہ رکھنے اور خصی ہونے کا جو تم نے ارادہ کیا ہے، وہ نہ کرو۔ پس جب یہ آیت آئی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا کر فرمایا کہ سنو! تمھاری جان کا تم پر حق ہے، تمھاری آنکھ کا تم پر حق ہے، روزہ رکھو، افطار کرو، نماز پڑھو، سو رہو، وہ ہم میں سے نہیں، جس نے ہماری سنت کو ترک کیا۔ سب نے کہا: ''اَللّٰهُمَّ سَلَّمْنَا وَاتَّبَعْنَا مَا أَنْزَلْتَ'' [1] ''اے اللہ! ہم نے مان لیا اور ہم نے اس کی پیروی اختیار کی جو شریعت تو نے نازل کی۔'' اس قصے کو بہت سے تابعین نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اس کا شاہد صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں اوپر گزر چکا ہے۔ وللہ الحمد والمنة.

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت خوف کا وعظ کیا، پھر اٹھ کھڑے ہوئے، کچھ زیادہ نہ فرمایا۔ دس صحابہ نے، جن میں سیدنا علی اور عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہما بھی تھے، کہا: ہمارا کیا حق ہے؟ اگر ہم کچھ عمل نہ کریں، نصاریٰ کو دیکھو انھوں نے اپنی جانوں پر بہت کچھ حرام کر لیا، ہم بھی کچھ حرام کر لیں، بعض نے کہا کہ ہم گوشت اور چربی نہ کھائیں گے اور دن ہی کو کھائیں گے اور رات کو نہ کھائیں گے اور بعض نے سونا حرام کر لیا، بعض نے عورتوں کو۔ سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے عورتوں ہی کو حرام کیا، اپنی بیوی کے پاس نہ پھٹکتے اور نہ وہ اُن کے پاس جاتے، آخر وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، اس کا نام حولاء تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ ازواجِ مطہرات نے اس سے کہا: اے حولاء! تیرا کیا حال ہے، رنگ متغیر ہے، نہ کنگھی ہے نہ خوش بو؟ کہا: میں کیا کنگھی کروں، خوش بو ملوں، اتنے دنوں سے میرا شوہر مجھ سے خبر گیر نہیں ہوا، نہ کبھی اُس نے میرا کپڑا اُٹھایا۔ وہ سب بیبیاں اُس کی بات سے ہنسنے لگیں، اتنے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] تفسیر الطبري (۱۰/ ۵۱۹) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔

تشریف لائے، وہ ہنس رہی تھیں۔ فرمایا: تم کیوں ہنستی ہو؟ کہا: اے اللہ کے رسول! ہم نے حولاء سے اس کا حال پوچھا، وہ کہتی ہے: "مَا رَفَعَ عَنِّي زَوْجِي ثَوْبِي مُنْذُ كَذَا وَكَذَا" "میرے شوہر نے میرا کپڑا نہیں اُٹھایا، فلاں فلاں وقت سے۔"

نبی اکرم ﷺ نے آدمی بھیج کر عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تجھ کو کیا ہوا ہے؟ کہا: میں نے اس کو اللہ کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ عبادت کے لیے خالی ہوں، فرصت ملے۔ اپنا سارا قصہ کہا اور یہ ارادہ کیا تھا کہ خصی ہو جاؤں۔ فرمایا: میں تجھ کو قسم دیتا ہوں کہ تو حولاء سے رجوع کر اور وقاع، یعنی صحبت کر، اپنے اہل وعیال، یعنی بی بی سے کہا: میں روزے سے ہوں، فرمایا: افطار کر، انھوں نے افطار کیا، اپنی بی بی کے پاس گئے۔ حولاء رضی اللہ عنہا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، کنگھی کیے ہوئے، سرمہ لگائے ہوئے، خوش بو ملی ہوئی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہنس کر کہا: کیسی ہو حولاء؟ کہا: کل وہ آئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا حال ہے قوموں کا، عورتوں، کھانے اور نیند کو حرام کر لیا؟ سن لو! میں سوتا ہوں، جاگتا ہوں، افطار کرتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں، عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، جو میری سنت سے منہ پھیرے گا وہ مجھ سے نہیں۔ اُس وقت یہ آیت اتری۔[1]

﴿ لَا تَعْتَدُوْا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ عثمان وغیرہ سے کہو کہ تم خصی نہ ہو کہ اس کو اعتداء کہتے ہیں۔ پھر ان سب کو حکم دیا کہ قسم کا کفارہ دو اور فرمایا کہ نہیں پکڑتا تم کو اللہ یمینِ لغو (بے ارادہ قسموں) پر، بلکہ یمینِ عقد پر پکڑتا ہے۔ (ورواہ ابن جریر) یا ﴿ لَا تَعْتَدُوْا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ مباحات کو حرام کر کے اپنی جانوں پر بہت زیادہ تنگی نہ کرو، جس طرح سلف نے کہا ہے۔ یا یہ مراد ہو کہ حلال چیزوں کو لینے میں زیادتی نہ کرو، بقدرِ کفایت و حاجت کے لو، حد سے آگے نہ بڑھو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ﴾ [الأعراف: ٣١] "اور کھاؤ اور پیو، اور فضول خرچی نہ کرو۔" نیز فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٧] "اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی (بخیلی) ہی، اور ان کا خرچ اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے۔" اللہ کی شرع شریف میں عدل ہے غالی اور جافی کے درمیان۔ نہ زیادتی ہے نہ کمی، اس لیے پاکیزہ چیزوں کو حرام کرنے اور حد سے بڑھ جانے سے منع کیا۔ پھر فرمایا: حلال طیب رزق کھاؤ، سب امور میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اس کی اطاعت کرو، رضا مندی چاہو، حرام کی ہوئی چیزوں اور نافرمانی کو چھوڑ دو۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ طیبات لذیذ چیزوں کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے حلال کی ہیں۔ ان کو اس سے منع کیا کہ تم ان چیزوں کو اپنے پر حرام کرو، اس گمان پر کہ وہ حرام کرنا کچھ اللہ کی اطاعت اور تقریب یا زہد اور دنیا کی شہوات سے اپنے نفس کو توڑنا ہے یا اس ارادے سے کہ حلال کو اپنے اوپر حرام کر لو جس طرح کہ اکثر کہنے لگتے ہیں کہ مجھ پر یہ چیز حرام یا میں نے فلاں چیز کو اپنی جان پر حرام کر لیا ہے کہ اس قسم کے الفاظ نہیِ قرآنی میں

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٥١٧۔ ٥١٨) یہ روایت مرسل ہے۔

داخل ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ کسی مسلمان کو جائز نہیں ہے کہ اللہ کے حلال کو اپنے نفس پر حرام کرے، یعنی کھانے، پینے اور پہننے کی پاکیزہ چیزوں کو یا عورتوں کو حرام کرے۔ [1] اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے عثمان بن مظعون کو تبتیل سے منع فرمایا۔ [2]

اس سے ثابت ہوا کہ کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے میں کچھ فضیلت نہیں ہے۔ فضل اور نیکی اس میں ہے کہ جس طرف اللہ نے اپنے بندوں کو بلایا ہے اور جس چیز کو ان پر حلال کیا اور نبی اکرم ﷺ اس کے عامل تھے اور امت کے لیے اس کو مسنون فرما دیا ہے اور ائمہ راشدین اس رستے پر چلے، اس کو بجا لائے، کیوں کہ بہتر ہدایت نبی اکرم ﷺ کی ہدایت ہے۔ پس جب اصل بات یوں ٹھہر چکی ہے تو جس شخص نے کپڑا صوف کا اختیار کیا ہے، لباس پنبہ و کتان پر باوجود اس کے کہ وہ لباس مذکورہ کو حلال ذریعے سے حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور کھانے کے بجائے گھاس کو اختیار کیا ہے اور گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے، تاکہ عورت کی حاجت نہ ہو تو وہ خطا پر ہے۔ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ نہیں، بلکہ فضیلت اسی میں ہے کہ موٹا کھائے، موٹا پہنے، جان کو مشقت میں ڈالے جو بچے وہ اہلِ حاجت کو دے تو یہ گمان بالکل خطا ہے، اس لیے کہ انسان کے لیے یہ سب سے پہلا حق ہے کہ وہ اپنی جان کی اصلاح کرے۔ اللہ کی اطاعت گزاری کے لیے مرد چاہیے۔ بدن کے لیے ردی خوراک سے زیادہ کوئی چیز نقصان دہ نہیں ہے، کیوں کہ یہ عقل کو فاسد، ادوات اور آلات (یعنی جسم کے اعضا) کو ضعیف اور بے رونق کر دیتی ہے، جن کو اللہ نے اپنی اطاعت کے لیے سبب ٹھہرایا تھا۔ یہ کہنا کہ پاکیزہ چیزوں کو حرام کر دینے سے کفارہ لازم آتا ہے، آیت اور سنتِ صحیحہ کے خلاف ہے۔ لفظ ﴿ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ﴾ تمام رزق کی قسموں کو شامل ہے۔

اکل (کھانے) کی تخصیص اس لیے ہے کہ رزق سے زیادہ نفع یا فائدہ کھانے ہی سے ہوتا ہے۔ حلال طیب سے مراد یہ ہے کہ حرام نہ ہو، نہ ناپاک ہو۔ ابن المبارک رحمہ اللہ نے کہا کہ حلال وہ ہے جو جائز طور سے حاصل کیا گیا ہے، طیب وہ ہے جو غذا ہو، گوشت پوست بڑھائے، رہی وہ چیز جو جامد ہے، جیسے: خاک، مٹی یا جو غذا نہیں ہے وہ مکروہ ہوتی ہے، مگر بطورِ دوا۔ [3] آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ ہر ایک کے رزق کی کفالت کرتا ہے۔ [4]

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ

---

(1) تفسیر الطبري (١٠/ ٥١٣) (2) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٧٨٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٠٢)

(3) تفسیر البغوي (٣/ ٩٠) (4) فتح البیان (٤/ ٣٨_ ٤٠)

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

اللہ تمھاری بلا ارادہ قسموں پر تمھیں نہیں پکڑے گا، لیکن ان قسموں پر ضرور پکڑے گا جو تم نے مضبوط باندھ لیں، چناں چہ اس کا کفارہ دس مسکینوں کو درمیانے درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا انھیں کپڑے پہنانا ہے یا ایک گردن (غلام) آزاد کرنا ہے، پھر جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اللہ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے، تاکہ تم شکر کرو (89)

پختہ قسم توڑنے کا کفارہ:

جس بات پر قصد کر کے قسم کھائی، آیندہ کو پھر اس کے خلاف ہو تو تین باتوں میں سے ایک کر لے: جو چاہے وہ دس محتاجوں کو کھانا کھلا دے، یعنی ہر ایک کو اناج دینا، دو سیر گیہوں یا چار سیر جو، یا ان کو کپڑے دے جس میں بدن کم کھلا رہے یا ایک بردہ (غلام) آزاد کرے۔ ان تین میں سے کسی ایک کی بھی طاقت نہ ہو تو تین روزے رکھے، اور اپنی قسم کو تھامنا چاہیے، یعنی حتی المقدور قسم نہ کھائے اور زبان کو اس کا عادی نہ بنائے۔ لغو یمین کا بیان سورت بقرہ میں گزر چکا ہے، اس کے لوٹانے کی حاجت نہیں ہے۔ بلا قصد لَا وَاللّٰہِ، بَلٰی وَاللّٰہِ کہنا یمینِ لغو ہوتا ہے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ کسی نے کہا: مراد ہزل (بے ہودہ بات یا ہنسی) ہے، کسی نے کہا: معصیت ہے، کسی نے کہا: غلبہ ظن ہے۔ ابو حنیفہ اور احمد رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا: مراد غضب ہے، بعض نے کہا: نسیان ہے، کسی نے کہا: کھانے پینے اور لباس اور اس جیسی دوسری چیزوں پر حلف ہے بدلیل آیتِ کریمہ: ﴿ لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ [المائدۃ: ۸۷] ''وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں۔'' صحیح یہی ہے کہ مراد وہ قسم ہے جو بغیر قصد کے اٹھائی جائے، بدلیل آیتِ کریمہ: ﴿ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ ﴾ (آیتِ باب) عقد سے مراد صمیمِ قلب اور پکا ارادہ ہے، اس کا کفارہ یہی ہے کہ دس محتاج فقرا، کو جن کو بقدر کفایت میسر نہیں آتا، کھانا کھلائے۔ اوسط سے مراد ہے اَعدل (بہت انصاف والا)۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر، عکرمہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد امثل، یعنی افضل ہے۔ علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دودھ روٹی، یا گھی روٹی کھلائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کوئی اپنے گھر والوں کو ادنیٰ درجے کا کھانا دیتا، کوئی عمدہ دیتا، اللہ نے کہا: اوسط دو، یعنی روٹی تیل۔ دوسرا قول یہ

ہے کہ تنگی اور فراوانی کے بیچ کا دو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اوسط درجے کا دو، یعنی گوشت روٹی، یا دودھ روٹی، یا روٹی تیل، یا سرکہ روٹی، یا گھی روٹی، یا روٹی کھجور۔ پھر کہا: گوشت روٹی افضل طعام ہے، اسی کے لگ بھگ عبیدہ، اسود، شریح، ابن سیرین، حسن، ضحاک، مکحول، ابن رزین رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ مراد قلت و کثرت میں اوسط ہے۔[2] علما کا مقدارِ طعام میں اختلاف ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: صبح و شام کا کھانا دے۔ حسن و محمد بن سیرین رحمہما اللہ نے کہا کہ ایک بار روٹی گوشت کھلا دینا کافی ہے۔ اگر گوشت نہ ملے تو گھی دو، ورنہ تیل سرکہ روٹی پیٹ بھر کر کھلا دے۔ اوروں نے کہا: دس مساکین میں ہر ایک کو نصف صاع گندم دے۔ یا کھجور یا اس جیسا کچھ اور دے۔ یہی عمر، علی اور عائشہ رضی اللہ عنہم اور مجاہد، شعبی، سعید بن جبیر، نخعی، میمون بن مہران، ابو مالک، ضحاک، حکم، ابو قلابہ اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گندم نصف صاع دے اور اس کے علاوہ ایک صاع۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاع کھجور کا کفارہ دیا اور لوگوں کو اسی کا حکم دیا اور جو نہ پائے وہ نصف صاع گندم دے۔ (رواہ ابن مردویہ) اس کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے، لیکن اس کی سند میں عمر بن عبداللہ ہے جس کے ضعف پر اجماع ہے، حدیث کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ شراب پیتا تھا۔ دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا: متروک ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہر مسکین کو ایک مُد گیہوں سالن کے ساتھ دے۔ یہی عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم، امام سعید بن المسیب، عطا، عکرمہ، ابی الشعثاء، ابو القاسم، سالم، ابو سلمہ، سلیمان بن یسار، حسن، ابن سیرین اور زہری رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔[5]

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفارۂ یمین میں واجب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مُد سے ایک مد ہے کہ ہر مسکین کو دے، سالن کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ حجت ان کی یہ ہے کہ جس شخص نے رمضان میں جماع کیا تھا، اس کو حکم فرمایا: ساٹھ مسکینوں کو ایک مکتل طعام کھلائے، جس میں پندرہ صاع کی گنجایش ہو، ہر ایک کو ان میں سے ایک مُد ہوا۔ یہ بات دوسری حدیث میں صراحتاً آئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قسم کا کفارہ اگلے مُد جیسا ایک مُد گیہوں کا قائم کرتے تھے۔[6] (رواہ ابن مردویہ) مگر اس کی اسناد میں ضعف و جہالت ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے کہا کہ واجب یہ ہے کہ گیہوں سے ایک مُد اور غیر گندم سے دو مد ہیں۔ باقی رہی کسوت (کپڑا)

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٥٣١_ ٥٣٤) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٢_ ١١٩٣) [2] تفسير الطبري (١٠/ ٥٤٣)

[3] تفسير الطبري (١٠/ ٥٣٤_ ٥٣٨) تفسير ابن كثير (٢/ ١٢٤)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١١٢) تفسير ابن كثير (٢/ ١٢٤) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٢)

[6] تفسير ابن كثير (٢/ ١٢٥) اس کی سند میں ''عبداللہ عمری'' اور ''نضر بن زرارہ'' ضعیف راوی ہیں۔

سو امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس چیز پر کسوت کا نام صادق آتا ہے، جیسے: کرتا، پاجامہ، ازار، پگڑی، مقنعہ (اوڑھنی) وغیرہا، اس کا ہر ایک مسکین کو دینا کفایت کرتا ہے۔ ٹوپی میں اختلاف ہے، کسی نے کہا: جائز ہے، جیسے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ۔ کسی نے کہا: جائز نہیں ہے۔ اسی طرح موزے میں دو قول ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ کافی نہیں۔ مالک اور احمد رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ ہر ایک کو ایسی کسوت دے جس میں وہ نماز پڑھ سکے، مرد کو اس کے لائق، عورت کو اس کے لائق۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہر مسکین کو ایک عبا، یا شملہ دے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ادنیٰ کپڑا یا اعلیٰ جو چاہے سو دے۔ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ کفارۂ یمین میں ہر شے کافی ہے، مگر تبنان۔ حسن، باقر، عطا، طاؤس، نخعی، حماد بن ابی سلیمان اور ابو مالک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جامہ جامع ہو، جیسے لحاف و چادر۔ یہ لوگ پیرہن، کرتا اور اوڑھنی کو مباح نہیں سمجھتے۔ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمامہ ہو جو سر پر باندھے یا عبا جو بدن پر لپیٹے۔ ابو موسیٰ نے قسم کھائی تھی، پھر دو دو کپڑے بحرین کے بنے ہوئے دیے۔[1] عائشہ رضی اللہ عنہا نے مرفوعاً کہا ہے: «عِبَاءَةٌ لِّكُلِّ مِسْكِيْنٍ»[2] ''ہر مسکین کے لیے ایک عبا۔'' (رواه ابن مردويه، هذا حديث غريب)

یا بردہ (غلام) آزاد کرے۔ ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صرف بردہ کافی ہے، کافر ہو یا مومن۔ شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کہتے ہیں کہ مومن ہونا ضروری ہے۔ ایمان کی قید کفارۂ قتل سے لی ہے، کیوں کہ موجب متحد ہے، اگرچہ سبب مختلف ہو۔ معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ ان کے ذمے ایک گردن کا آزاد کرنا تھا، وہ ایک کالی لونڈی لائے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کنیز سے کہا کہ اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان میں ہے، کہا: میں کون ہوں؟ کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں، فرمایا: اس کو آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے۔[3] (الحديث بطوله رواه مالك و مسلم والشافعي)

غرض کہ قسم کے کفارے میں یہ تین چیزیں ہیں، جس کو کرے گا، بالاجماع کافی ہو گا۔ ان میں مشروع پہلے سب سے آسان چیز کو رکھا ہے، پھر اس سے مشکل، کیوں کہ کھلانا کپڑے دینے سے زیادہ آسان ہے، جس طرح پہنانا غلام آزاد کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی ہے، پھر اگر مکلّف ان تینوں میں سے کسی ایک چیز کی بھی قدرت نہیں رکھتا تو تین دن کے روزے رکھے۔

سعید بن جبیر و حسن بصری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جس کے پاس تین درہم ہیں، اس کو کھانا کھلانا لازم ہے، وگرنہ روزے رکھے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے کہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی اُس دن کے کھانے کی ضرورت سے زیادہ نہ ہو، تب کفارے میں روزہ رکھے۔[4] پھر اس میں اختلاف ہے کہ لگاتار رکھے یا کس طرح۔ امام شافعی و مالک رحمہما اللہ

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٥٤٥۔ ٥٥١) تفسير ابن كثير (٢/ ١٢٥)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ١٢٥) اس کی سند میں ''مقاتل بن سلیمان'' ضعیف راوی ہے۔

[3] الموطأ (٢/ ٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٧) الأم للشافعي (٥/ ٤٠٢)

[4] تفسير الطبري (١٠/ ٥٥٨۔ ٥٥٩)

نے کہا ہے کہ لگاتار روزے رکھنا کچھ واجب نہیں ہے، اس لیے کہ الفاظ: ﴿ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ﴾ اکٹھے یا علاحدہ علاحدہ دونوں پر صادق ہیں، جس طرح قضائے رمضان کے سلسلے میں آیا ہے: ﴿ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ [البقرة: ١٨٤] ''تو دوسرے دِنوں سے گنتی پوری کر لے۔''

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ واجب یہ ہے کہ لگاتار روزے رکھے، اس لیے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ یوں پڑھتے تھے: ''فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ مُّتَتَابِعَاتٍ'' یہی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی تھی۔ اعمش رحمہ اللہ نے کہا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب بھی اسی طرح پڑھتے تھے۔[1] سو اگر اس قراءت کا قرآن متواتر ہونا ثابت نہ ہوگا تو کم از کم یہ ایک خبرِ واحد یا تفسیرِ صحابہ ٹھہرے گی اور حکمِ مرفوع میں ہوگی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب آیتِ کفارات اتری، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! کیا ہم اختیار رکھتے ہیں؟ فرمایا: ہاں، تجھ کو اختیار ہے، چاہے آزاد کر، چاہے کپڑا پہنا، چاہے کھانا کھلا اور جو کوئی نہ پائے وہ تین روزے رکھے، پے در پے۔ (رواه ابن مردويه) یہ حدیث سخت غریب ہے۔[2] یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم اپنی قسموں کا خیال رکھو، ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قسموں کو بغیر کفارے کے نہ چھوڑو، اللہ نے تمھارے لیے ان احکام کا واضح بیان کر دیا کہ شاید تم شکر کرو۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ لغو قسموں پر مواخذہ نہ ہونے کے لیے اس بات میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ قسم اٹھانے والے کو لغو قسم پر نہیں پکڑتا، نہ ہی ایسی قسم میں کفارہ واجب ہوتا ہے، جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد والے اسی طرف گئے ہیں کہ بغیر مضبوط قسموں کے لا واللہ، بلی واللہ کہنا لغو ہوتا ہے، صحابہ کی یہی تفسیر ہے۔ وہ قرآن کے معانی خوب پہچانتے تھے۔ شافعی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایسا جھگڑنے، غصے اور جلد بازی کے وقت ہوتا ہے۔ ہاں اس قسم پر پکڑ ہے جو نیت و ارادے سے کھائی ہے کہ یہ کام کروں گا یا یہ نہ کروں گا۔ ایک یمینِ غموس ہوتی ہے جو مکر و فریب اور جھوٹ کے لیے کھاتے ہیں، ایسی قسم کھانے والا گناہ گار ہوتا ہے، وہ پکے ارادے سے کھائی جانے والی قسم نہیں ہے، نہ اس میں کفارہ ہے، جمہور اسی طرف گئے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ اس کو بھی معقودہ (پکی قسم) بتاتے ہیں، مگر قابلِ ترجیح پہلی بات ہے۔ جتنی حدیثیں قسموں کے

---

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٥٥٩۔ ٥٦١)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ١٢٦) اس کی سند میں انقطاع اور ضعف ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ نیز ''اسماعیل بن یحییٰ'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٠/ ٥٦٢۔ ٥٦٣)

کفارے کے بارے میں آئی ہیں، سب پکی قسم ہی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی یمینِ غموس پر کفارے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ غموس میں فقط وعید اور دھمکی آئی ہے اور اُس کو کبیرہ کہا ہے، بلکہ وہ اکبر کبائر ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ... ﴾ [آل عمران: ۷۷] ”بے شک جو لوگ اللہ کا عہد اور اپنی قسمیں تھوڑی قیمت کے بدلے بیچ ڈالتے ہیں۔“ اس کے بعد قسم کے کفارے کا ذکر کیا۔ اوسط سے مراد فضول خرچی اور کنجوسی کے درمیان ہے، اعلیٰ مراد نہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ ایک دفعہ دس محتاجوں کو پیٹ بھر کر کھلا دینا کافی ہے۔

﴿ تَحْرِيْرُ ﴾ غلامی سے نکالنے کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال قیدی آزاد کرنے، مشقت والے کو چھڑانے اور تکلیف کو دور کرنے پر بھی ہوتا ہے۔ اہلِ علم اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ کس قسم کے غلام کو آزاد کیا جائے۔ آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کا غلام ہو، اسے آزاد کرنا کافی ہے۔ ایمان کی شرط بطورِ قیاس کے ہے جو کفارۂ قتل سے لی گئی ہے۔ اس قیاس کا مقصد صرف دونوں دلیلوں کو ایک موقف پر جمع کرنا ہے۔ حرف ﴿ اَوْ ﴾ اختیار کے لیے ہے، یعنی ان تین کفاروں میں سے کوئی نہ کوئی کفارہ ادا کرنا، جس کی قدرت ہو، واجب ہے۔ پھر جو کوئی کچھ بھی نہ پائے تو وہ تین روزے رکھے۔ ظاہر یہ ہے کہ قتل کے سلسلے میں جو ایمان کی شرط رکھی گئی ہے، قسم کے کفارے کے سلسلے میں اس کی متابعت شرط نہیں ہے۔

پھر یہ حکم دیا کہ قسم کا خیال رکھا کرو، یعنی جلدی سے قسم نہ کھا بیٹھا کرو یا قسم توڑنے میں جلدی نہ کیا کرو۔ اس میں زیادہ قسمیں اٹھانے یا قسم توڑنے سے ممانعت ہے، جب تک کہ ایسا کرنا کسی اچھے کام یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی خاطر نہ ہو، جس طرح سورت بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں واللہ، ان شاء اللہ حلف نہیں کرتا کسی قسم پر، پھر دیکھتا ہوں کہ اس کام کے علاوہ کوئی اور کام بہتر ہے، مگر اپنی قسم کا کفارہ دیتا ہوں اور جو بات بہتر ہے وہ کرتا ہوں۔“[1] (أخرجه الشيخان)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝۹۱ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٩) فتح البيان (٤/ ٤١-٤٤)

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۹۲ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ
اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۹۳

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک شراب اور جوا، آستانے اور فال نکالنے کے تیر، سب گندے کام ہیں اور شیطان کے عمل سے ہیں، پس تم ان سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ (90) بے شک شیطان چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے سے دشمنی اور بغض ڈال دے، اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟ (91) اور تم اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور احتیاط کرو، پس اگر تم حق سے پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف کھول کر پہنچا دینا لازم ہے (92) جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرنے لگے، انھوں نے جو کچھ (پہلے) کھایا، اس پر انھیں کوئی گناہ نہیں جب کہ وہ (آیندہ) پرہیزگاری اختیار کریں اور ایمان پر قائم رہیں اور نیک عمل کریں، پھر وہ پرہیزگار ہی رہیں اور ایمان پر جمے رہیں، پھر وہ پرہیزگاری ہی اپنائیں اور نیکی کریں، اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (93)

شراب اور جوے کی حرمت:

جس چیز کا پانی سڑ کر نشہ لانے لگے وہ تھوڑا اور بہت حرام ہے اور نجس ہے، باقی جو چیز نشہ لائے اور سڑی نہ ہو وہ نجس نہیں، لیکن حرام ہے۔ جوا شرط لگانا ہے، کسی چیز پر جس میں جیت ہار ہو، وہ محض حرام ہے اور ایک طرف کی شرط حرام نہیں۔ باقی جو کھیل کہ ان میں شرط بدنی رواج ہے، اگر بغیر شرط کھیلے تو جوا نہ ہو، لیکن یہ برائی ہے کہ شیطان اُس بہانے سے اللہ پاک کی یاد سے اور نماز سے روکتا ہے۔ کفر کی حالت میں اگر حرام چیز کھائی تھی، پھر ڈر کر مسلمان ہوا اور اُس کی ممانعت پہنچی تو اس کو مانا، ڈر کر چھوڑ دیا، پھر آگے نیکی پر ڈر کر ایمان کے اعمال پر قائم رہا تو ان تین سبب کے آگے وہ گناہ نہ رہا۔ اللہ پاک نے اس آیتِ مقدس میں اپنے مومن بندوں کو شراب پینے سے اور جوا کھیلنے سے منع کیا۔ ﴿ اَلْمَيْسِرُ ﴾ قمار کو کہتے ہیں۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ شطرنج میسر (جوا) ہے۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

عطا، مجاہد اور طاؤس رحمہم اللہ نے یا ان میں سے دو شخصوں نے کہا ہے کہ قمار کی ہر شے جوا ہے، یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹ سے کھیلنا۔ راشد بن سعد وضمرہ بن حبیب رحمہما اللہ نے کہا: پانسہ، اخروٹ اور بیض (کنچے) جس سے لڑکے کھیلتے ہیں، میسر ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "اَلْمَيْسِرُ هُوَ الْقِمَارُ" "میسر جوا ہے۔"[3]

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن علی باقر رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔
(2) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٧) (3) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٧) اس کی سند حسن ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اتنا زیادہ کیا ہے کہ جاہلیت میں قمار بازی کرتے تھے، جب تک اسلام نہیں آیا تھا۔ اللہ نے ان اخلاقِ قبیحہ سے منع فرمایا۔[1] سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ جاہلیت کا میسر ایک یا دو بکری کے بدلے میں گوشت خرید کرنا تھا۔ اعرج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میسر مالوں اور پھلوں پر قداح کا مارنا تھا۔ قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو چیز اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل کر دے وہ میسر ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ تم ان کعاب (پانسوں) سے بچو، جن کا نام لیا گیا ہے اور جن سے سرزنش کی جاتی ہے کہ وہ میسر ہیں۔[3] (رواه ابن أبي حاتم) یہ حدیث غریب ہے۔ اس سے مراد نرد ہے جس کا ذکر صحیح مسلم کی حدیث میں بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے نردشیر کا کھیل کھیلا، اُس نے گویا اپنا ہاتھ سور کے گوشت اور خون میں رنگ لیا۔[4] ان سے دوسری مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: جس نے نرد سے کھیلا، وہ اللہ اور رسول کا گناہ گار ہوا۔[5] (رواه مالك و أحمد و أبو داود و ابن ماجه) یہ حدیث موقوفاً بھی مروی ہے۔ واللہ أعلم.

عبدالرحمان نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے، اُس شخص کی مثال جو نرد بازی کرتا ہے، پھر اُٹھ کر نماز پڑھتا ہے، اُس شخص کی طرح ہے جو پیپ اور سور کے لہو سے وضو کرتا ہے، پھر اُٹھ کر نماز ادا کرتا ہے۔[6] رہی شطرنج، سو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ نرد سے بھی بدتر ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے وہ جوا ہے۔ امام مالک، ابو حنیفہ اور احمد رحمہم اللہ حرام کہتے ہیں اور شافعی رحمہ اللہ مکروہ کہتے ہیں۔[7] بہر حال احتیاط زیادہ بہتر اور احوط ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مجاہد، عطا، سعید بن جبیر اور حسن رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ انصاب پتھر ہیں، جن کے پاس اپنی قربانیاں ذبح کرتے تھے۔ ازلام وہی پانسے ہیں جن سے چیز بانٹتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رجس ہے، یعنی سخط (باعثِ غضب) ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اثم (گناہ)۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: یعنی شر۔[8] ﴿ فَاجْتَنِبُوْهُ ﴾ کی ضمیر ﴿ رِجْسٌ ﴾ کی طرف پھرتی ہے۔ یہ ترغیب ہے، اس کے بعد تہدید و ترہیب

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٧) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ (2) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٧۔ ١١٩٨)

(3) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٦) اس کی سند میں ''علی بن یزید'' اور ''عثمان بن ابی العاتکہ عن علی بن یزید'' ضعیف راوی ہیں۔

(4) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦٠)

(5) الموطأ (٢/ ٩٥٨) مسند أحمد (٤/ ٣٩٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٣٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٦٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٤٢٦)

(6) مسند أحمد (٥/ ٣٧٠) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبدالرحمٰن خطمی'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، برقم (٦٥٣٥)

(7) تفسير ابن كثير (٢/ ١٢٧) (8) تفسير الطبري (١٠/ ٥٦٥) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٨)

فرمائی کہ شیطان تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈالنا چاہتا ہے، یعنی شراب نوشی اور قمار بازی سے آپس میں دشمنی اور کینہ پیدا ہوتا ہے۔

شراب کی حرمت کے تدریجی مراحل:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ شراب تین بار (مراحل میں) حرام ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ مدینے میں آئے، وہ لوگ شراب پیتے تھے، جوئے کا مال کھاتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تو یہ آیت آئی: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ [البقرة: ٢١٩] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ کہہ دیجیے: دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے (کچھ) فائدہ بھی ہے اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے۔'' لوگوں نے کہا: یہ ہم پر حرام نہیں ہوئی، فقط اتنا کہا ہے کہ اُن میں بڑا گناہ اور فائدہ ہے۔ پھر شراب پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک مہاجر مرد نے مغرب میں اپنے ساتھیوں کی امامت کی، قراءت میں خلط ملط ہو گیا، اللہ نے دوسری آیت زیادہ سخت بھیجی: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ [النساء: ٤٣] ''اے ایمان والو! جب تم نشے میں مست ہو تو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ، جب تک کہ اپنی بات کو سمجھنے نہ لگو۔''

اس پر بھی شراب پیتے رہے، یہاں تک کہ ان میں سے کوئی نماز کو آتا، صبح کی شراب پی کر۔ پھر تیسری اُس سے زیادہ سخت نازل ہوئی، یعنی یہ آیتِ باب۔ تب کہنے لگے: اے اللہ! ہم باز آئے۔ لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! کچھ اللہ کے راستے میں مارے گئے، اپنے حالِ سرف پر مرے، شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے، حالانکہ اللہ نے اس چیز کو رِجس اور شیطان کا کام ٹھہرایا ہے، تب یہ آیت آئی، یعنی گذشتہ راصلوات۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر ان پر یہ چیزیں حرام ہوتیں تو وہ بھی اسی طرح چھوڑ دیتے، جس طرح تم نے چھوڑی ہیں۔[1] (رواه أحمد وتفرده)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے، جب شراب کی حرمت اتری، کہا کہ اے اللہ! ہمارے لیے شراب کے بارے میں بیان شافی فرما۔ تب سورت بقرہ کی آیت اتری، عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر سنائی، انھوں نے پھر وہی کہا: ''اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيَاناً شَافِياً'' ''اے اللہ! شراب کے بارے میں ہمارے لیے بیان شافی فرما۔'' پھر آیتِ سورت نازل ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ کا موذن جب ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاة'' کہتا تو یہ بھی ندا کرتا: ''لَا يَقْرَبَنَّ الصَّلَاةَ سَكْرَانُ'' ''مدہوش آدمی نماز کے قریب نہ آئے۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر اُن پر یہ آیت پڑھی، انھوں نے کہا: اے اللہ! بیان کر ہمارے لیے شراب کے بارے میں کھول کر، تب یہ سورت مائدہ کی آیت آئی۔ عمر رضی اللہ عنہ کو پڑھ کر سنائی، جب اس لفظ

[1] مسند أحمد (٢/ ٣٥١) اس کی سند میں ''ابو وہب مولیٰ ابی ہریرہ'' مجہول اور ''ابو معشر نجیح'' ضعیف راوی ہے۔

تک پہنچے: ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ تو کہا: "اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا" یعنی اب ہم باز آئے، باز آئے۔ (وهكذا رواه أبو داود والنسائي) علی بن المدینی اور ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔[1]

صحیحین میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ انھوں نے منبرِ رسول اللہ ﷺ پر کہا: اے لوگو! شراب کی تحریم اتری اور یہ پانچ چیزوں سے بنتی ہے: انگور، کھجور، شہد، گیہوں اور جو۔ خمر وہ ہے جو عقل کو چھپائے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ شراب کی حرمت جب اتری اُس وقت مدینے میں پانچ شرابیں تھیں، ان میں انگور کی شراب نہ تھی۔[3] (رواه البخاري) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ شراب کے بارے میں تین آیتیں آئی ہیں، پہلے یہ آیت اتری: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ... الخ ﴾ [البقرة: ٢١٩] "(اے نبی!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟..." کہا گیا کہ شراب حرام ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ہم کو چھوڑ دو کہ ہم خمر سے فائدہ لیں، نبی اکرم ﷺ خاموش رہے، پھر دوسری آیت آئی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ... الخ ﴾ [النساء: ٤٣] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اس وقت نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشے میں ہو...." کہا گیا: شراب حرام ہوئی، نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ہم نماز کے وقت کے نزدیک نہیں پئیں گے، نبی اکرم ﷺ خاموش رہے۔ پھر تیسری آیتِ باب نازل ہوئی، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لو اب شراب حرام ہو گئی۔[4] (رواه أبو داود الطيالسي)

شراب کی تجارت کی حرمت:

عبدالرحمان بن وعلہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے شراب کی بیع کے بارے میں حکم پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ کا ایک دوست ثقیف یا دوس میں تھا، وہ فتح مکہ کے دن نبی اکرم ﷺ سے ملا اور ایک پکھال تحفہ میں لایا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے فلاں! تجھے معلوم نہیں کہ اللہ نے خمر کو حرام کیا ہے۔ اُس نے اپنے غلام سے کہا: اس کو لے جا کر بیچ ڈال، فرمایا: تو نے اس کو کیا حکم دیا: کہا: یہ حکم دیا کہ اس کو بیچ ڈال، فرمایا جس نے اس کا پینا حرام کیا ہے، اسی نے اس کا بیچنا بھی حرام کیا ہے۔ پھر وہ اس کے حکم سے بطحا میں بہا دی گئی۔[5] (رواه أحمد و مسلم والنسائي)

تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک پکھال خمر کی ہدیتاً بھیجی۔ وہ شراب حرام ہونے کے بعد اس کو لے کر آئے تھے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٥٤٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٥) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٣) صحيح مسلم، برقم (٣٠٣٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٠)

[4] مسند الطيالسي (١/ ٢٦٤) اس کی سند میں "محمد بن ابی حمید" ضعیف راوی ہے۔

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٧٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٦٤) مسند أحمد (١/ ٢٣٠)

نبی اکرم ﷺ دیکھ کر ہنسے اور فرمایا کہ وہ تمھارے بعد حرام ہوگئی۔ کہا: میں اس کو بیچ دوں، اس کی قیمت سے نفع اٹھاؤں؟ فرمایا: اللہ یہود پر لعنت کرے، ان پر گائے اور گوسفند کی چربی حرام ہوئی، انھوں نے اس کو گلا کر فروخت کیا۔ اللہ تعالیٰ نے شراب اور اس کی قیمت کو حرام کیا ہے۔[1] (رواه أبو يعلىٰ و أحمد)

نافع بن کیسان نے کہا کہ ان کے باپ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں شراب کی تجارت کرتے تھے، وہ شام سے آئے، ان کے ساتھ مشکوں میں شراب تھی، جو وہ تجارت کے ارادے سے لائے تھے، نبی اکرم ﷺ کے پاس لا کر کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں بہت اچھی شراب لایا ہوں، فرمایا: وہ تیرے بعد حرام ہوگئی، کہا: میں اس کو بیچ دوں، فرمایا: وہ حرام ہوئی، اس کی قیمت بھی حرام ہے، کیسان نے جا کر مشکوں کے منہ کھول دیے، سب بہا دی۔[2] (رواه أحمد)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ابوطلحہ کے نزدیک ابو عبیدہ بن جراح، ابی بن کعب اور سہیل بن بیضا رضی اللہ عنہم کا ساقی تھا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ان کو شراب کا نشہ پکڑ لے، اتنے میں ایک مسلمان نے آ کر کہا: تمھیں معلوم نہیں کہ شراب حرام ہو گئی ہے؟ انھوں نے کہا: اچھا ہم دریافت کریں گے اور انس رضی اللہ عنہ نے کہا: جو برتن میں ہے، بہا دو، واللہ پھر انھوں نے نہیں پی، وہ تمر اور بسر کی شراب تھی۔ (رواه أحمد) اس کا شیخین نے بھی کئی طرح سے اخراج کیا ہے۔[3] قیس بن سعد رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ میرے رب تبارک و تعالیٰ نے خمر، کوبہ اور قنین (شراب پینے کے گلاس و آبخورے) کو حرام کیا ہے، دور رہو تم غبیراء سے کہ وہ دنیا کی شراب کا تیسرا حصہ ہے۔[4] (رواه أحمد)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت پر خمر، مزر، کوبہ اور قنین کو حرام کیا ہے۔ یزید نے کہا: قنین برابط ہے۔[5] (تفرد أحمد) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خمر پر دس طرح کی لعنت کی گئی ہے: خود ملعون ہے، اس کا پینے والا، پلانے والا، بیچنے والا، خریدنے والا، کشید کرنے والا، جس کے لیے کشید کی جائے، اس کو اٹھانے والا، جس کی طرف اٹھا کر لے جائی جائے، اس کی قیمت کھانے والا۔[6] (رواه أبو داود و ابن ماجه)

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٢٧) مسند ابی یعلیٰ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "المطالب العالية" (٨/ ٦١٦) میں اس کی نسبت ابو یعلیٰ رحمہ اللہ کی طرف کی ہے اور حدیث کو حسن کہا ہے۔

[2] مسند أحمد (٤/ ٣٣٥) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٨٠) مسند أحمد (٣/ ١٨١)

[4] مسند أحمد (٣/ ٤٢٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عبيد الله بن زحر وثقه أبو زرعة والنسائي وضعفه الجمهور" (مجمع الزوائد: ٥/ ٧٨)

[5] مسند أحمد (٢/ ١٦٥) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الصحيحة" (رقم الحديث: ١٧٠٨) میں اس کی سند کے ضعف کو واضح کرتے ہوئے شواہد کی بنیاد پر روایت کو صحیح کہا ہے۔

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٨٠) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٢٩٧)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ مربد کی طرف گئے، میں آپ ﷺ کے ساتھ آپ کی داہنی طرف تھا، اتنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے، میں پیچھے ہٹ گیا، وہ دائیں طرف ہو گئے اور میں آپ ﷺ کے بائیں طرف ہو کر چلنے لگا، اتنے میں عمر رضی اللہ عنہ آئے، ان کے لیے بھی علاحدہ ہو گیا، وہ بائیں پر ہو گئے۔ مربد میں شراب کے مشکیزے تھے، مجھ کو فرمایا کہ مدیہ لاؤ، یعنی چھری۔ مدیہ کا لفظ اسی دن میرے علم میں آیا۔ پھر حکم دیا کہ مشکوں کو چیر ڈالوں اور فرمایا کہ ملعون ہے خمر اور اس کا پینے والا، پلانے والا، بیچنے والا، خریدنے والا، اٹھانے والا اور جس کی طرف اٹھا کر لے جائی جائے، کشید کرنے والا، کشید کروانے والا اور اس کی قیمت کھانے والا۔[1] (رواه أحمد)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: شراب اور اس کی قیمت حرام ہے، پھر کہا: اے معشرِ امتِ محمد! اگر کوئی کتاب تمھاری کتاب کے بعد اور کوئی نبی تمھارے نبی کے بعد ہوتا تو تمھارے حق میں وہی اترتا جو تم سے اگلے لوگوں کے حق میں اترا ہے، لیکن تمھارے معاملے کو قیامت کے دن تک مؤخر کر دیا گیا ہے۔ قسم ہے، میری جان کی کہ تم پر یہ تاخیر سخت تر ہے۔[2] (الحديث بطوله رواه البيهقي)

شانِ نزول:

سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: شراب کے بارے میں چار آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ پھر کہا کہ ایک انصاری نے کھانا پکایا، ہم کو بلایا، ہم نے شراب کی حرمت سے پہلے شراب پی، جب نشہ چڑھا تو فخر کرنے لگے۔ انصار نے کہا کہ ہم افضل ہیں۔ قریش نے کہا: ہم افضل ہیں۔ ایک انصاری نے اونٹ کا جبڑا لے کر سعد کی ناک پر مارا، ناک چھل گئی۔ آیتِ کریمہ: ﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ ... إلى قوله... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) نازل ہوئی۔[3] (رواه البيهقي و أخرجه مسلم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ شراب کی حرمت انصار کے دو قبیلوں کے حق میں اتری، انھوں نے شراب پی، مست ہوئے، بعض نے بعض کے ساتھ عبث کیا، جب ہوش آیا تو اس کا اثر منہ میں، سر میں اور ڈاڑھی میں دیکھا تو کہنے لگے: یہ کام ہمارے فلاں بھائی نے کیا، وہ سب بھائی تھے، ان کے دلوں میں کینہ نہ تھا، پھر کہا: واللہ! اگر ہم پر مہربان رحم فرمانہ ہوتا تو یہ کام نہ کرتا، آخر دلوں میں کینہ پڑا، اس پر آیتِ باب (زیرِ تفسیر) اتری۔

بعض متکلفین نے کہا: یہ نجس چیز فلاں کے جسم میں تھی اور وہ احد کے دن مارا گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ ان پر اس کا گناہ نہیں ہے۔[4] (رواه البيهقي والنسائي) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کچھ لوگوں نے احد کے دن صبح

---

① مسند أحمد (٢/ ٧١) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

② مستدرك الحاكم (٤/ ١٦٠) سنن البيهقي الكبرىٰ (٨/ ٢٨٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٨) سنن البيهقي الكبرىٰ (٨/ ٢٨٥)

④ سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٣٧) المعجم الكبير (١٢/ ٥٦) سنن البيهقي الكبرىٰ (٨/ ٢٨٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٧/ ٨٣)

کو شراب پی، اسی دن سب کے سب شہید ہوئے، ان کا یہ پینا شراب کے حرام ہونے سے پہلے تھا۔[1] (هكذا رواه البخاري)

امام بزار رحمہ اللہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے کچھ اصحاب نے شراب پی، صبح کے وقت، پھر احد کے دن شہید ہوئے۔ یہود نے کہا کہ بعض مرے اور ان کے پیٹ میں شراب ہے۔ اللہ نے یہ آیت بھیجی کہ ان پر اس کا کچھ گناہ نہیں۔ پھر بزار رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اسناد صحیح ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "وَهُوَ كَمَا قَالَ لٰكِنْ فِيْ سِيَاقِهِ غَرَابَةٌ"[2] سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ شراب کی حرمت نازل ہوئی، کہنے لگے: ان کا کیا حال ہوگا جو حرام ہونے سے پہلے اسے پیتے تھے، تب یہ آیت آئی۔[3] (رواه أبو داود الطيالسي والترمذي نحوه وقال حسن صحيح)

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک آدمی خیبر سے مدینے میں شراب لاتا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ بیچتا اور اس سے مال حاصل کرتا تھا، جب وہ مدینے آیا، ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی، کہا: اے فلاں! شراب حرام ہوگئی، اُس نے شراب کو اسی جگہ رکھا، ایک ٹیلے پر جہاں تک وہ آ چکے تھے اور اُس کو کمبل سے چھپا دیا، پھر نبی اکرم ﷺ کے پاس آ کر کہا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے خبر ملی ہے کہ شراب حرام ہوگئی ہے، فرمایا: ہاں، کہا: میں اُس کو پھیر دوں جس سے وہ خریدی ہے؟ فرمایا: پھیرنا ٹھیک نہیں، فرمایا: تحفے میں اس طرح دوں کہ جو چاہے مجھے اس کا عوض دے؟ فرمایا: نہیں، کہا: اس میں یتیموں کا مال ہے جو میری گود میں ہیں، فرمایا: جب بحرین کا مال آئے گا، ہم یتیموں کے مال کا بدلہ دیں گے، پھر مدینے میں دے دی گئی، ایک آدمی نے کہا: بھلا برتنوں سے ہم نفع لیں؟ فرمایا: ان کے بندھن کھول دو، وہ بہہ کر بطنِ وادی میں چلی گئی۔[4] (رواه أبو يعلىٰ هذا حديث غريب) ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری گود میں یتیم ہیں، ان کے ترکے میں شراب ہے، فرمایا: بہا دے، کہا: میں اُس کو سرکہ نہ بنا لوں؟ فرمایا: نہیں۔[5] (رواه مسلم و أبو داود و الترمذي نحوه)

شراب نوشی کا گناہ:

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ جو آیتِ قرآن میں ہے: ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ﴾ (آیتِ باب) سو تورات میں اس طرح ہے: "إِنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ الْحَقَّ، لِيُذْهِبَ بِهِ الْبَاطِلَ، وَيُبْطِلَ بِهِ اللَّعِبَ وَالْمَزَامِيرَ وَالزَّفْنَ وَالْكِبَارَاتِ، يَعْنِيْ الْبَرَابِطَ، وَالزَّمَّارَاتِ، يَعْنِيْ بِهِ الدُّفَّ، وَالطَّنَابِيْرَ وَالشِّعْرَ وَالْخَمْرَ، مَرَّةً لِّمَنْ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٢)

[2] مسند البزار میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے روایت کو ذکر کرتے ہوئے اس کی نسبت مسند البزار کی طرف کی ہے۔ دیکھیں: تفسير ابن كثير (٢/ ١٣٢۔ ١٣٣)

[3] مسند الطيالسي (١/ ٩٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٥١) اس کی سند صحیح ہے۔

[4] مسند أبي يعلى (٣/ ٤٠٤) اس کی سند میں "عیسیٰ بن جاریہ" متکلم فیہ راوی ہے۔

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٨٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٩٤)

طَعِمَهَا، أُقْسِمُ بِاللّٰهِ بِيَمِينِهِ وَعِزَّتِهِ، مَنْ شَرِبَهَا بَعْدَ مَا حَرَّمْتُهَا لَأُعْطِشَنَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ تَرَكَهَا بَعْدَ مَا حَرَّمْتُهَا إِلَّا سَقَيْتُهُ إِيَّاهَا فِي حَظِيرَةِ الْقُدُسِ" یہ اسناد صحیح ہے، اس کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس نے نشے سے چار بار نماز ترک کی، اللہ پر حق ہے کہ اُس کو طینۂ خبال پلائے، پوچھا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: اہلِ جہنم کا نچوڑ ہے۔[2] (رواہ أحمد) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ ہر تخمر خمر ہے اور ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے، جس نے کوئی نشہ کی چیز پی، اس کی چالیس صبح کی نمازیں ضائع ہوگئیں، پھر اگر توبہ کی تو اللہ قبول کرے گا، پھر اگر چوتھی بار پی تو اللہ پر حق ہے کہ اس کو طینۂ خبال پلائے، پوچھا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: آگ والوں کا زرد آب (پیپ) ہے اور جس نے شراب پلائی، کم عمر والے کو اور وہ حلال کو حرام سے نہیں پہچانتا تو اللہ پر حق ہے کہ اُس کو طینۂ خبال پلائے۔[3] (تفرد به أبو داود) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس نے دنیا میں شراب پی، پھر توبہ نہ کی تو وہ اُس سے آخرت میں محروم ہوگا۔[4] (رواہ الشیخان)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہر نشے والی چیز حرام ہے، جس نے شراب پی اور مر گیا اور وہ اس کو پیے جاتا تھا، اور اُس سے توبہ نہ کی، وہ آخرت میں شراب نہ پیے گا۔[5] (رواہ مسلم) یہ اُس کے جہنمی ہونے کا کنایہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ اللہ قیامت کے دن اُن کی طرف نظر نہ کرے گا: ایک ماں باپ کا نافرمان، دوسرا ہمیشہ شراب پینے والا، تیسرا دے کر احسان جتلانے والا۔[6] (رواہ النسائي) سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں: جنت میں داخل نہ ہوگا: احسان رکھنے والا، ماں باپ کا نافرمان اور ہمیشہ شراب پینے والا۔[7] (رواہ أحمد والنسائي) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اس روایت میں ولدِ زنیہ کا اضافہ کیا ہے۔[8] (رواہ النسائي)

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ شراب سے بچو، یہ ام الخبائث ہے، تم سے پہلے ایک عابد تھا، لوگوں سے الگ تھلگ رہا کرتا تھا، ایک عورت اس پر فریفتہ ہوئی، اپنی لونڈی بھیج کر اس کو گواہی کے لیے بلایا، وہ اُس کے ہمراہ آیا، جس دروازے سے داخل ہوتا، اس کو بند کرتی جاتی، یہاں تک کہ وہ ایک چمکتی ہوئی عورت تک پہنچا، اس کے پاس

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٩٦) اس کی سند صحیح ہے۔ [2] مسند أحمد (٢/ ١٧٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤١٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٣٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٣)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٣) [6] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٦٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٣٣)

[7] مسند أحمد (٣/ ٢٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ١٧٦) اس کی سند میں "یزید بن ابی زیاد" ضعیف راوی ہے۔ البتہ دیگر صحابہ سے یہ روایت صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٧٣۔ ٦٧٤)

[8] سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ١٧٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٧٣)

ایک لڑکا اور شراب کی بوتل تھی، اس عورت نے کہا: واللہ میں نے تجھ کو کسی گواہی کے لیے نہیں بلایا، لیکن اس لیے بلایا ہے کہ تو مجھ سے صحبت کر یا اس لڑکے کو قتل کر یا یہ شراب پی۔ غرض کہ اس کو ایک پیالہ شراب پلا ہی دیا، اس نے کہا: اور دو، دیر نہ لگی کہ اس نے صحبت کی اور غلام کو قتل کیا۔ سو تم شراب سے پرہیز کرتے رہو کہ یہ شراب اور ایمان کبھی جمع نہیں ہوتے، قریب ہے کہ ان دونوں میں سے ایک دوسرے کو نکال دے گا۔[1] (رواه البيهقي وهذا إسناده صحيح وقد رواه أبو بكر ابن أبي الدنيا في كتابه: ذم المسكِر مرفوعا والموقوف أصح، والله أعلم)

اس کا شاہد صحیحین میں اس طرح آیا ہے: «لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَسْرِقُ سَرَقَةً حِيْنَ يَسْرِقُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ»[2] ''کوئی شخص جو زنا کرتا ہے وہ زنا کرتے وقت مومن نہیں ہوتا، اور چور چوری کرتے وقت مومن نہیں رہتا اور شرابی شراب پیتے وقت مومن نہیں رہتا۔'' زنا، چوری اور شراب خوری کا انجام ایک ہے، جو ان کاموں میں مبتلا رہتا ہے، ایمان اُس سے جدا ہو جاتا ہے۔

اسما بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے شراب پی، اللہ اُس سے چالیس رات تک راضی نہیں ہوتا، اگر مر گیا تو کافر مرا، اگر توبہ کی تو قبول ہوئی، اگر پھر پی تو اللہ پر حق ہے کہ اسے طینۂ خبال پلا دے، میں نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: اہلِ نار کی پیپ۔[3] (رواه أحمد) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ تم دو کعب (پانسہ) سے بچو، جن سے زجر کرتے ہیں کہ یہ عجم کا جوا ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ رجس ہر بد کام کو کہتے ہیں، جس سے گھن آئے۔ ابن درید نے کہا ہے کہ رجس بمعنی شر ہے، رجز بمعنی عذاب، رکس بمعنی چرکیں و بدبو۔[5] عملِ شیطان سے یہ مراد ہے کہ شیطان نے ان چیزوں کو لوگوں میں اچھا کر دکھایا ہے یا اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، لوگ اس کے مقتدی ہو گئے۔ شراب کی تحریم اور جوئے کی تحریم پر بہت وجوہ سے تاکید کی ہے جن کا ذکر کشاف میں ہے۔[6] آیت شراب کی تحریم پر دلیل ہے، اس لیے کہ اس سے اجتناب کرنے کا حکم اس سے روکنے کو بھی شامل ہے اور شریعت میں قربان رجس کی تحریم مقرر ہے، چہ جائیکہ رجس کو نوشِ جان کرے۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ خمر کی تحریم بتدریج اور کثرت سے نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ وہ لوگ اس کے پینے کے

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٥٦٦٦) شعب الإيمان (٥/ ١٠) ذم المسكر (١/ ٥٠) اس کی سند میں ''عمر بن سعید بن سریج عن الزہری'' متکلم فیہ راوی ہے۔ البتہ موقوفاً صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧)

[3] مسند أحمد (٦/ ٤٦٠) نیز دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨٠)

[4] مسند أحمد (١/ ٤٤٦) اس کی سند میں ''ابراہیم ہجری'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ موقوفاً صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔

[5] روح المعاني (٧/ ١٦) [6] الكشاف (١/ ٧٠٧۔ ٧٠٨)

عادی تھے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں شراب کی محبت ڈال دی تھی۔

سارے مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ شراب نوشی کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اسی طرح اس بات پر بھی اجماع ہے کہ جب تک خمر ہے، اس کی خرید وفروخت اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، آیت جس طرح تحریم خمر پر دلیل ہے، اسی طرح جوئے، انصاب اور ازلام کی تحریم پر بھی دلیل ہے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا: اے اہلِ مکہ! میں نے سنا ہے کہ کچھ لوگ نرد شیر سے کھیلتے ہیں، حالانکہ اللہ نے کتاب میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) میں حلف کرتا ہوں کہ نہیں لایا جائے گا، میرے پاس کوئی شخص جو یہ کھیل کھیلتا ہے، مگر میں اُس کے گوشت پوست میں اسے سزا دوں گا اور اس کا سلب اس کے لانے والے کو دوں گا۔[1] مالک بن انس رحمہ اللہ نے کہا: شطرنج نرد ہے، ہم نے سنا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مالِ یتیم کے والی ہوئے، اس میں شطرنج نکلی، اس کو جلا دیا۔ ابوجعفر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ مجوسیت ہے، تم اس کو نہ کھیلو۔[2]

یحییٰ بن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم پر گزرے جو نرد بازی کر رہی تھی، فرمایا: «قُلُوْبٌ لَّاهِيَةٌ، وَأَيْدٍ عَامِلَةٌ، وَ أَلْسِنَةٌ لَاغِيَةٌ»[3] ''دل لہو ولعب میں مشغول ہیں، ہاتھ فضول کاموں میں مصروف ہیں اور زبانوں نے بے ہودہ باتوں کو پکڑ لیا ہے۔'' (رواه ابن أبي الدنيا) ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کھیل تماشے میں جوا یا چیخنا چلانا یا شر ہو وہ میسر یعنی جوا ہے۔[4]

پھر اللہ نے شراب اور جوئے کی برائیوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ تم باز رہو، اس میں سخت دھمکی، ملامت اور جھڑکی ہے، اسی لیے عمر رضی اللہ عنہ نے سن کر کہا: ہاں ہم باز آ گئے۔ ایمان وتقویٰ کو تین دفعہ دہرایا ہے۔ ایک اس کے اور اُس کے نفس کے درمیان، دوسرے اُس کے اور لوگوں کے درمیان اور تیسرے اُس کے اور اللہ کے درمیان یا تین مرتبوں کے اعتبار سے ہے۔ مبدا، وسط اور منتہیٰ، یا انسان کی پرہیز گاری کے اعتبار سے کہ وہ محرمات کو اس لیے ترک کرتا ہے کہ سزا سے بچے۔ شبہات کو اس لیے ترک کرتا ہے کہ کہیں حرام میں نہ جا پڑے اور بعض مباحات کو اس لیے ترک کرتا ہے کہ نفس کو کمینہ پن اور سفلہ پن سے بچائے۔ طبیعت کی بدخوئی سے مہذب بنا دے یا یہ تکرار صرف تاکید کے لیے ہے، جس طرح ﴿ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [التكاثر: ٣۔٤] ''ہرگز نہیں! جلد ہی تم جان لو گے۔ پھر ہرگز نہیں! جلد ہی تم جان لو گے۔'' پھر فرمایا کہ اللہ محسنوں کو دوست رکھتا ہے، مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان، عملِ صالح، تقویٰ اور احسان کے ساتھ اللہ کی طرف متقرب ہیں، یہ ان کی تعریف ہے، اس لیے کہ یہ مقامات اعلیٰ مراتب اور درجات کے ہیں۔[5]

---

[1] الأدب المفرد (١/ ٤٣٥) شعب الإيمان (٥/ ٢٣٩) اس کی سند حسن ہے۔
[2] الدر المنثور (٣/ ١٦٩)
[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ٢١٦) یہ روایت مرسل ہے۔
[4] الدر المنثور (٣/ ١٧٠)
[5] فتح البيان (٤/ ٤٥۔ ٤٩)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿94﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿95﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ ضرور تمھیں کچھ اس چیز کے شکار کے ذریعے سے آزمائے گا، جس تک تمھارے ہاتھ اور نیزے پہنچ سکتے ہوں، تا کہ اللہ جان لے کہ کون اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے، پھر اس کے بعد جو حد سے گزر گیا، اس کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿94﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارو اور تم میں سے جو کوئی جان بوجھ کر (اس حالت میں) شکار مارے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسے اس کے برابر ایک جانور مویشیوں میں سے فدیہ دینا ہوگا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو انصاف والے کریں گے، یہ (فدیہ) بطور قربانی کعبہ پہنچایا جائے گا۔ یا اس کا کفارہ چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یا اس کے برابر روزے رکھنا ہے، تا کہ وہ اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ جو کچھ اس سے پہلے ہو چکا وہ اللہ نے معاف کیا اور جو کوئی دوبارہ وہی حرکت کرے تو اللہ اس سے بدلہ لے گا اور اللہ غالب ہے، بدلہ لینے والا ہے ﴿95﴾

حرم اور حالتِ احرام میں شکار کی حرمت:

نیزے کا نام لیا، اس میں سب ہتھیار داخل ہوئے، پھر جو دو طریقے ذکر کیے کہ ہاتھ سے اور ہتھیار سے اس لیے کہ احرام کی حالت میں دونوں طرح شکار کو مارنا برابر ہے۔ دور سے ہتھیار مارا یا ہاتھ سے صحیح سلامت پکڑ لیا، پھر ذبح کیا اور ذبح کے طریقے میں ان دونوں کا فرق ہے۔ دور سے مارا تو جہاں زخم لگ کر مر گیا، حلال ہوا اور صحیح سالم پکڑ لیا تو مویشیوں کی طرح ذبح کرنا چاہیے۔ مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر احرام میں شکار پکڑے تو فرض ہے کہ اسے چھوڑ دے اور اگر مارے تو مواشی میں سے اُس قدر قیمت کا ایک جانور لے کر بکری یا گائے یا اونٹ وہ کعبہ تک پہنچا

کر ذبح کرے اور آپ نہ کھائے یا اُس قیمت کا اناج لے کر محتاجوں کو کھلا دے۔ ہر محتاج کو دو سیر گیہوں یا جتنے محتاجوں کو وہ اناج پہنچتا ہو، اس قدر روزے رکھے اور قیمت ٹھہرائیں دو معتبر مسلمان۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس جگہ شکار سے مراد ضعیف اور چھوٹا شکار ہے۔ اللہ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے، احرام میں یہاں تک کہ اگر چاہیں ہاتھ سے پکڑ لیں، مگر ان کو منع کیا کہ اُس کے پاس نہ پھٹکیں۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ "تَنَاوُلِ أَيْدِيْ" سے مراد چھوٹے شکار ہیں، "تَنَاوُلِ رِمَاحٍ" سے مراد بڑے شکار ہیں۔ مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت حدیبیہ کے عمرے میں اتری ہے۔ وحشی جانور اور پرندے اور چھوٹے شکار ان کے رحال (اترنے کی جگہ) میں آ پڑتے تھے کہ اس طرح کبھی دیکھا نہیں۔ اللہ نے اُن کے قتل سے منع کر دیا کہ تم احرام میں ہو، ان کا شکار نہ کرو۔[2] تاکہ اللہ کو یہ بات معلوم ہو کہ کون اللہ سے خفیہ طور پر اور ظاہر طور پر ڈرتا ہے اور اُس کے واضح حکم کی اطاعت کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴾ [الملك: ١٢] "بے شک جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔"

پھر فرمایا کہ جو کوئی اس خبر دینے اور ڈرانے کے بعد اور تقدم کے بعد پیش قدمی کرے گا اس کو عذابِ الیم ہو گا۔ پھر حالتِ احرام میں صید کو قتل کرنا حرام کیا۔ محرم کو شکار کھیلنے سے منع فرمایا، یہ حکم معنی کے لحاظ سے ایسے جانور کو شامل ہے جس کا گوشت کھایا جاتا ہے یا نہیں کھایا جاتا اور ایسے جانوروں کے متولد کو بھی شامل ہے۔ شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جو جنگلی جانور کھائے جاتے ہیں، ان کا قتل کرنا محرم کے لیے جائز ہے۔

وہ جانور جن کو حرم اور حالتِ احرام میں مارنا جائز ہے:

مگر جمہور ان کا مارنا بھی حرام بتلاتے ہیں، سوائے ایسے جانوروں کے جن کو عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین میں مروی مرفوع حدیث میں مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ وہ پانچ فاسق ہیں، جن کو ہر حالت میں، یعنی احرام کی حالت میں بھی یا اس کے علاوہ بھی قتل کرنے کا حکم ہے: کوا، چیل، بچھو، چوہا، کاٹنے والا کتا۔[3] مالک نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ پانچ جانور ہیں، جن کے قتل کرنے سے مُحرم پر کوئی گناہ نہیں۔[4] (و أخرجاه أيضاً)

ایوب نے نافع سے کہا: بھلا سانپ؟ کہا: سانپ کے قتل میں کیا شک ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ امام مالک و احمد رحمہما اللہ نے گرگ (بھیڑیا)، سبع (درندہ)، نمر (تیندوا) اور فہد (چیتا) کو کاٹنے والے کتے کے ساتھ شامل کیا ہے، اس لیے کہ ان کا ضرر اُس کے ضرر سے بھی سخت تر ہے۔ زید بن اسلم و سفیان بن عیینہ رحمہما اللہ نے کہا کہ کاٹنے

---

[1] تفسیر الطبري (١٠/ ٥٨٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٠٣) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٠٣۔ ١٢٠٤)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٧٣٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٩٨)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٧٣٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٩٩)

والا کتا ان تمام تیز رفتار درندوں کو شامل ہے۔ انھوں نے اس روایت سے استیناس کیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب پر بد دعا کی تو فرمایا: «اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبَكَ بِالشَّامِ» ''اے اللہ اس پر شام میں اپنا کتا مسلط کر دے۔'' اُس کو بمقام زرقا ایک درندے نے کھا لیا۔[1] ہاں ان کے سوا اگر کسی اور جانور کو مارے گا تو فدیہ دینا لازم آئے گا، جیسے: لگڑ بگڑ، لومڑی اور اس طرح کے جانور۔ ہاں، ان پانچ منصوص علیہ جانوروں کے بچے اور تیز رفتار درندوں کے چھوٹے بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مُحرم کے لیے ایسے جانور کو مارنا جائز ہے جس کا گوشت کھایا نہ جاتا ہو، بڑے چھوٹے میں کچھ فرق نہیں ہے۔ نہ کھائے جانے کو اس کا جامع سبب ٹھہرایا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محرم کاٹ کھانے والے کتے اور بھیڑیے کو مار سکتا ہے، اس لیے کہ بھیڑیا جنگلی کتا ہے، ان کے سوا جس کو مارے گا، فدیہ دینا پڑے گا، مگر کوئی درندہ ان دو کے سوا اگر اُس پر حملہ کرے تو البتہ اُس کو مارے تو فدیہ دینا لازم نہ ہوگا۔ یہی امام اوزاعی اور حسن بن صالح رحمہما اللہ کا قول ہے۔ زفر رحمہ اللہ نے کہا: فدیہ لازم آئے گا، اگرچہ وہ حملہ کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ غراب (کوے) سے مراد ابقع (کوا) ہے، جس کے پیٹ پیٹھ میں سفیدی ہو نہ کہ اورع (کوا) جو خالص سیاہ ہو یا سفید ہو، اس لیے کہ امام نسائی رحمہ اللہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً لفظ غراب ابقع روایت کیا ہے۔[2]

جمہور کہتے ہیں کہ مراد عام ہے، کیونکہ صحیحین والی حدیث میں لفظ غراب مطلقاً آیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مُحرم اس وقت کوے کو مارے جب وہ اس پر حملہ کرے یا ایذا دے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ قتل نہ کرے، رمی (تیر اندازی) کرے، اس لیے کہ ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ مُحرم کس کو قتل کرے؟ فرمایا: سانپ، بچھو، فویسقہ، غراب کو رمی کرے (تیر مارے) قتل نہ کرے، کاٹنے والا کتا، چیل، تیز رفتار درندہ۔[3] (رواه أبو داود والترمذي و ابن ماجه وقال الترمذي هذا حديث حسن)

حرم میں حالتِ احرام میں شکار کرنے والے کی جزا:

طاؤس نے کہا ہے کہ ذوی عدل سے فیصلہ کرانا اس کے لیے ہے جس نے جان بوجھ کر شکار کیا ہے نہ اُس پر جس نے بھول چوک سے کیا۔[4] طاؤس کا یہ مذہب غریب ہے، ظاہر آیت سے تمسک کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مُتَعَمِّدًا﴾ سے اس جگہ وہ شخص مراد ہے جو احرام کو بھول کر شکار کے قتل کا ارادہ رکھتا ہے۔[5] رہا وہ شخص جو

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٥٨٨) سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/ ٢١١) تفسير ابن كثير (٢/ ١٣٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٨٢٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٣٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٨٩) تفسير ابن كثير (٢/ ١٣٦) اس کی سند میں ''یزید بن ابی زیاد'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٢٢٤۔ ٢٢٦)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٠٥) [5] تفسير الطبري (١١/ ٨)

اپنے محرم ہونے سے پوری طرح آگاہ ہے اور پھر جان بوجھ کر شکار کرے تو اس کا جرم اعظم تر ہے۔ اگر وہ کفارہ ادا نہیں کرتا تو اُس کا احرام نہیں رہتا۔ یہ قول بھی غریب ہے، جمہور یہ کہتے ہیں کہ ارادتاً قتل کرنے یا بھول کر کرنے میں برابر کی جزا و سزا واجب ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ عمداً شکار کرنے والے کی جزا کے لیے قرآن میں دلیل ہے اور بھول کر کرنے والے کے لیے سنتِ مطہرہ جاری ہے۔ اس کے علاوہ شکار کو قتل کرنے میں ایک جان کا ضائع کرنا ہے اور ضائع کرنا جان بوجھ کر ہو یا بھول کر، دونوں صورتوں میں قتل کرنے والا ضامن ہوتا ہے، لیکن جان بوجھ کر قتل کرنے والے کو ملامت ہے اور خطا کار کو ملامت نہیں ہے۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے جو امام مالک، شافعی، احمد رحمہم اللہ اور جمہور کے مذہب کے مطابق ہے کہ اس کی جزا واجب ہے، اگر اس کا مثل حیوان انسی میں سے موجود ہو، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے، ان کے نزدیک قیمت ادا کرنا واجب ہے، خواہ شکار کیے ہوئے جانور کی مثل کوئی موجود ہو یا نہ ہو۔ پھر اُس کو اختیار ہے، خواہ قیمت صدقہ کرے یا اُس کے برابر ہدی خرید لے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو حکم مثلی میں دیا ہے، وہ اتباع کے زیادہ لائق ہے، کیوں کہ انھوں نے شتر مرغ میں قربانی کے اونٹ کا حکم دیا ہے اور جنگلی گائے میں گائے کا حکم دیا ہے اور ہرن میں بھیڑ کا حکم دیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فیصلے سند کے ساتھ کتاب الاحکام میں مذکور ہیں اور جب صید مثلی نہ ہو تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قیمت کا حکم دیا ہے کہ مکے لے جائے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ جزا کا فیصلہ، خواہ وہ بمثل ہو یا بقیمت غیر مثل میں ہو، دو مسلمان عادل مرد کریں۔[1] قاتل کے بارے میں علما کا اختلاف ہے کہ وہ ان دو منصفوں میں سے ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ اپنے آپ پر فیصلہ کرنے میں کبھی وہم کرے گا، یہ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہو سکتا ہے، اس لیے کہ آیت عام ہے، یہ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کا مذہب ہے۔

پہلے قول کی حجت یہ ہے کہ صورتِ واحدہ میں حاکم محکوم علیہ نہیں ہوتا ہے۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک اعرابی آیا، اُس نے کہا: میں نے ایک شکار کیا ہے اور میں مُحرم ہوں، بتاؤ اس کا بدلہ مجھ پر کیا ہے؟ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ! (وہ ان کے پاس بیٹھے تھے) بتاؤ اس بارے میں جو یہ اعرابی کہتا ہے! اُس نے کہا کہ میں آپ کے پاس آیا ہوں، آپ خلیفۃ الرسول ہیں، میں تم سے پوچھتا ہوں، تم غیر سے پوچھتے ہو، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو کیوں انکار کرتا ہے، اللہ نے تو یہ فرمایا ہے: ﴿ فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ (آیتِ باب) میں نے اپنے صاحب سے مشورہ لیا تو کیا برا کیا، ہم دونوں جس بات پر اتفاق کریں گے، اس کا تجھ کو حکم دیں گے۔[2] یہ اسناد اگرچہ جید ہے، لیکن میمون اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان منقطع ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ١٣٧)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٠٦۔ ١٢٠٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

اس گنوار کو جاہل دیکھ کر نرمی و سہولت سے جواب دیا، کیونکہ جہل کی دوا تعلیم ہے، اگر اعتراض کرنے والا علم کے ساتھ منسوب ہو تو اس کے بارے میں یہ واقعہ قابلِ غور ہے۔

قبیصہ بن جابر نے کہا کہ ہم حج کو نکلے، صبح کی نماز پڑھ کر اونٹ لاد پھاند کر، نکیل ہاتھ میں لے کر باتیں کرتے ہوئے چلے، ایک دن صبح کو ایک ہرن یا برح نکلا، ایک آدمی جو ہمارے ساتھ تھا، اُس نے پتھر مارا، وہ ٹھیک نشانے پر لگا، اسے مردہ چھوڑ کر سوار ہو کر چل دیا، ہم نے اُس کو کہا: تو نے عظیم حرکت کی، جب ہم مکے پہنچے، اُس کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس لے کر آئے اور اُن سے سارا قصہ بیان کیا، ان کے پاس ایک شخص بیٹھا تھا، اس کا منہ ایسا تھا، جیسے چاندی کا دل، یعنی عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر بات کی، پھر اس مرد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: تو نے عمداً مارا یا خطا سے، اُس نے کہا: پتھر تو عمداً مارا، لیکن ارادہ اس کے قتل کا نہیں کیا تھا۔ کہا: میں خیال کرتا ہوں تو نے عمد و خطا دونوں کو شریک کیا ہے، اچھا ایک بکری لے کر ذبح کر، اس کا گوشت تصدق کر دے، اس کے چمڑے سے تو نفع لے، ہم وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے، ہم نے اس شخص سے کہا: اے مرد تو شعائر اللہ کی تعظیم کر، امیر المومنین کو معلوم نہ ہوا کہ تجھ کو کیا فتویٰ دیں، یہاں تک کہ اپنے صاحب سے پوچھا تو تو ایک اونٹنی نحر کر، شاید تجھ کو کافی ہو۔ قبیصہ کہتے ہیں کہ مجھے اس وقت سورت مائدہ کی آیت: ﴿ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ ﴾ یاد نہ تھی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ میں نے یوں کہا، اچانک وہ درہ لیے ہوئے آئے اور میرے ساتھی، یعنی اس شخص کو مار کر کہا: "أَقَتَلْتَ فِي الْحَرَمِ وَسَفِهْتَ فِي الْحُكْمِ" "تو نے تو حرم میں جانور قتل کیا اور میں نے حکم میں بے وقوفی کی؟" پھر میری طرف متوجہ ہوئے، میں نے کہا: اے امیر المومنین! "لَا أُحِلُّ لَكَ الْيَوْمَ شَيْئًا يُحَرَّمُ عَلَيْكَ مِنِّي" "آج میں تیرے لیے کوئی چیز جائز نہیں کروں گا جو پہلے تجھ پر میری طرف سے ناجائز تھی۔" کہا: اے قبیصہ بن جابر! میں دیکھتا ہوں کہ تو جوان، کشادہ سینے والا اور روشن زبان ہے، جوان آدمی میں نو خلق اچھے ہوتے ہیں، ایک خلق بد ہوتا ہے۔ وہ خلقِ بد سارے اخلاقِ حسنہ کو تباہ کر دیتا ہے۔ "فَإِيَّاكَ وَعَثَرَاتِ الشَّبَابِ"[1] "سو تو جوانی کی ٹھوکروں سے دور رہ۔"

یہ قصہ کئی طرح سے مروی ہے، مرسلاً بھی آیا ہے۔ ابن جریر بجلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے ایک ہرن مارا اور میں مُحرم تھا، میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا: دو آدمی اپنے بھائیوں میں سے لاؤ، وہ تیرے بارے میں فیصلہ کریں گے، میں سیدنا عبدالرحمان اور سعد رضی اللہ عنہما کو لایا، انھوں نے کہا: ایک تیس اعفر دے، یعنی گوسفند۔

طارق رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک آدمی نے ہرن کو تیر سے قتل کیا، وہ احرام باندھے ہوئے تھا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کہ حکم دیں، عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ تو بھی میرے ساتھ حاکم بن، پھر دونوں نے

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٢٤ـ ٢٥) مستدرك الحاكم (٣/ ٣٥٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

حکم دیا، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾[1] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قاتل کا ان دو حاکموں میں سے ہونا جائز ہے، جس طرح شافعی اور احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ پھر اس میں اختلاف کیا کہ آیا نئے سرے سے فیصلہ کریں، ہر معاملے میں جس میں مُحرم ایسا کام کرے اور اُس میں دو عادل مسلمانوں کا فیصلہ کرنا واجب ہے، گو اس سے پہلے صحابہ حکم دے چکے ہوں۔ اس کے ساتھ کہ دو عادل مسلمانوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ امام مالک اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر معاملے میں فرداً فرداً فیصلہ دینا واجب ہے، اگرچہ اس جیسے معاملے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ ملے یا نہ ملے۔ اس کی دلیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان: ﴿ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ (آیتِ باب) ہے۔

یہ جو فرمایا کہ ہدی کعبے کو پہنچ جائے، یعنی حرم میں اس سے مراد یہ ہے کہ وہاں پہنچ کر ذبح کیا جائے، گوشت حرم کے مساکین میں بانٹ دیا جائے، یہ امر اس جگہ متفق علیہ ہے۔ پھر اگر محرم قتل کیے ہوئے شکار کے مثل کوئی جانور نہ پائے یا شکار ایسے جانور کا کیا ہو جس کی مثل کوئی نہ ہو یا اس میں ہم اس اختیار کے قائل ہوں کہ اس کی جزا کھانا کھلانے اور روزے رکھنے سے دی جائے گی، جس طرح امام مالک، ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کا قول ہے اور احمد رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے اور شافعی رحمہ اللہ کا بھی ایک قول آیت کے ظاہر کی بنا پر ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ معتبر ترتیب ہے تو مسئلہ کی صورت یہ ہوگی کہ قیمت کی طرف عدول کریں گے، یعنی امام مالک، ابوحنیفہ، اصحابِ ابوحنیفہ، حماد اور ابراہیم رحمہم اللہ کے نزدیک مقتول شکار کی قیمت دی جائے گی۔ اور شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس جانور کے مثل کسی دوسرے جانور کا اندازہ کریں گے، اگر موجود ہوگا، پھر اس سے طعام خرید کر صدقہ کر دیا جائے گا، ہر مسکین کو ایک مُد طعام دیں گے، یہ شافعی و مالک رحمہ اللہ اور حجاز کے فقہا کے نزدیک ہے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[2] امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا یہ قول ہے کہ ہر مسکین کو دو مُد طعام دیں گے۔ مجاہد رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک مُد گیہوں یا دو مُد اُس کے علاوہ۔ پھر اگر طعام نہ پائے یا ہم اختیار کے قائل ہوں تو پھر مسکین کے طعام کے بدلے ایک دن روزہ رکھے۔ اوروں نے کہا کہ بجائے ہر ایک صاع کے ایک دن روزہ رکھے، جس طرح حلق کرنے (بال منڈوانے) اور اُس جیسے دوسرے کاموں میں جزا کی سہولت دی گئی ہے۔ شارع علیہ السلام نے کعب بن عجرہ کو حکم دیا تھا کہ ایک فرق کو چھ مسکینوں کے درمیان بانٹے یا تین دن روزہ رکھے۔ فرق تین صاع ہوتا ہے۔ اب یہ بات کہ اس کھانے کو کھلانے کی جگہ کیا ہو کہ کہاں کھلائے، سو شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کھلانے کی جگہ حرم ہے۔ یہی عطا رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ کھلائے، جہاں شکار کیا تھا یا اُس جگہ جو شکار کی جگہ سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: خواہ وہ حرم میں کھلائے یا غیر حرم میں۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۲۷۔ ۲٦)
[2] تفسیر الطبري (۱۱/ ٤۲۔ ٤۳)
[3] تفسیر الطبري (۱۱/۳۳)
[4] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۳۸۔ ۱۳۹)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب مُحرم شکار کر بیٹھے تو اس پر جانور سے جزا ہے، اگر نہ پائے تو دیکھے کہ کیا قیمت ہے، پھر قیمت کا اندازہ طعام سے کر لے، بجائے ہر نصف صاع، ایک دن کا روزہ رکھے۔ طعام یا صیام سے مراد یہ ہے کہ جب طعام پایا، جزا پائی۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ اگر ہرن مارا ہے یا اس کے مثل تو ایک بکری مکے میں ذبح کرے، اگر نہ پائے تو چھے مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ بھی نہ پائے تو تین روزے رکھے اور جو اونٹ یا اس کے مثل مارا ہے تو ایک گائے ذبح کرے، اگر نہ پائے تو بیس مسکینوں کو کھانا کھلائے، ورنہ بیس دن روزے رکھے اور جو نعامہ (شتر مرغ) یا وحشی گدھا یا اس کے مثل مارے تو ایک اونٹ ذبح کرے، اگر نہ پائے تو تیس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا تیس روزے رکھے۔ پھر کہا کہ ایک مُد طعام پیٹ بھر دیتا ہے۔[2] امام شعبی، عطا، مجاہد، ضحاک اور نخعی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ایک مد طعام اس کے لیے ہے جو ہدی نہ پہنچائے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جزا ترتیب وار ہے۔

امام عطا، عکرمہ، مجاہد، ضحاک اور نخعی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اختیار ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[3] پھر اللہ نے فرمایا کہ یہ کفارہ ہم نے اس لیے واجب کیا ہے کہ اپنے کیے کی سزا پائے، ہاں جو زمانۂ جاہلیت میں ہوا، پھر اسلام میں احسان اور اتباع کیا، ارتکابِ معصیت سے بچا، اس کا قصور معاف ہے، مگر جو شخص تحریم کے بعد اور شریعت کا حکم معلوم ہو جانے کے بعد پھر اسلام میں ایسی حرکت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا انتقام لے گا۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے عطا رحمہ اللہ سے پوچھا کہ عود (لوٹنے) کی کوئی حد معلوم ہے؟ کہا نہیں، کہا: بھلا امام سزا دے؟ کہا: نہیں، یہ گناہ اس کے اور اللہ کے درمیان ہے، لیکن فدیہ دے۔[4] بعض نے کہا کہ انتقام سے مراد کفارہ ہے۔ یہی امام سعید بن جبیر اور عطا رحمہ اللہ کا قول ہے۔[5] جمہور سلف و خلف کہتے ہیں کہ شکار کے قتل سے مُحرم پر جزا واجب ہوتی ہے۔ پہلی دفعہ یا دوسری دفعہ میں کوئی فرق نہیں، اگرچہ بار بار ہو اس میں عمد و خطا برابر ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس مُحرم نے شکار کو خطا سے قتل کیا ہے، اُس پر حکم کیا جائے گا، ہر بار اور اگر عمداً کیا ہے تو ایک بار کیا جائے گا اور اگر دوبارہ عمداً کرے گا تو اس سے کہیں گے: "يَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْكَ كَمَا قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ" "تم سے اللہ ہی انتقام لے، جیسے اس کا فرمان ہے۔" یہی امام شریح، مجاہد، سعید بن جبیر، حسن بصری اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ کا قول ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلا قول اختیار کیا ہے۔[6] حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک مُحرم نے شکار کیا تھا، اس سے درگزر کی گئی، پھر دوبارہ شکار کیا، آسمان سے آگ اتری اور اس کو جلا دیا۔ یہ اس آیت کا مطلب ہے: ﴿ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ﴾ (آیتِ باب) اللہ عزیز ہے، یعنی اپنی سلطنت میں منیع (باز

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ١٥) [2] تفسير الطبري (١١/ ٣١) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٠٨) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسير الطبري (١١/ ٣٢۔ ٣٧) [4] تفسير الطبري (١١/ ٤٨) [5] تفسير الطبري (١١/ ٥٠)
[6] تفسير الطبري (١١/ ٥١۔ ٥٤) [7] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢١٠)

رکھنے والا) ہے، کسی قاہر کا مقہور نہیں، نہ کوئی اس کو انتقام لینے سے منع کر سکے، جس کو چاہے سزا دے، کس کی مجال ہے کہ اسے روکے۔ خلق اس کی خلق، حکم اس کا حکم ہے۔ عزت و منفعت سب اُسی کے لیے ہے، وہ انتقام لینے والا ہے، یعنی گناہ گار نافرمان کے لیے سزا دینے والا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ شکار عرب کا ایک ذریعہ معاش تھا۔ اللہ نے شکار کو اِحرام کی حالت میں منع کر کے اُن کا امتحان لیا، جس طرح بنی اسرائیل کا امتحان لیا تھا کہ ہفتے کے دن شکار نہ کریں۔ راجح یہ ہے کہ خطاب مُحل اور مُحرم دونوں کو ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: مُحل کو ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مُحرِم کو ہے،[1] اس قصر کی کچھ ضرورت نہیں۔ رماح (نیزے) کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ عرب کے نزدیک شکار کے بڑے آلات یہی نیزے تھے۔ یہ آزمایش چھٹے ہجری میں عمرۂ حدیبیہ میں ہوئی۔ عذابِ الیم سے مراد دنیا کا عذاب ہے کہ کپڑے لتے اتار کر پیٹ پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں یا دارین کا عذاب مراد ہے، شکار کی حالت احرام میں ممانعت کی، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ [المائدة: ١] "جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار کو حلال نہ جانو" یہ نہی ہر مرد و عورت کے لیے ہے کہ نہ احرام میں شکار کرے نہ حرم میں۔ اس نہی سے پانچ فواسق مستثنیٰ ہیں، جن کا ذکر ہو چکا۔

﴿مُتَعَمِّدًا﴾ وہ ہے جو باوجود علم کے کہ احرام میں شکار کرنا ممنوع ہے، اس کا ارادہ کرتا ہے۔ مخطی وہ ہے جس نے قصد کسی اور شے کا کیا تھا اور وہ صید کو جا لگا۔ ناسی (بھولنے والا) وہ ہے جس نے شکار کا قصد کیا اور احرام یاد نہ رہا۔ مراد مماثلت سے اس کی قیمت کی مقدار یا اس کی خلقت میں مثال ہے، صحیح دوسرا قول ہے۔ دو آدمی جنھیں چیزوں کے مشابہ ہونے کا پورا علم اور تمیز ہے اور عادل معتبر ہیں، وہ اس بارے میں فیصلہ کریں۔ ظاہر یہ ہے کہ اگر دو منصف بغیر مماثل حکم کریں تو وہ حکم لازم نہ ہوگا، اس لیے کہ اللہ نے ﴿يَحْكُمُ بِهِ﴾ فرمایا ہے، یعنی مماثل اور حق۔ انصاف بھی یہی ہے کہ بغیر مماثل حکم نہ کریں، مگر غلطی یا دھوکے سے۔ پھر اگر سلف میں کسی نے ایسا حکم کیا ہے تو وہ خلف پر لازم نہیں، بلکہ دو عادلوں کو فیصلے کا حق مقدمہ قتل کے ہر واقعے میں ثابت ہے۔

اب سمجھو کہ ظبی، یعنی ہرن کو بکری کے مشابہ کہنا نہ مشابہ تمیں مخالف مشاہد محسوس ہے۔ اس لیے کہ ہرن کی ذات و صفات میں تیس سے زیادہ بکری کے ساتھ مشابہت ہے۔ وہ مشابہت نہیں۔ پھر اس جزا کے ساتھ وہی کام کرنا چاہیے جو ہدی کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی مکے بھیجنا چاہیے۔ اِشعار، تقلید اور نحر اسی جگہ ہو۔ کعبے سے بعینہٖ کعبہ مراد نہیں، بلکہ سارا حرم مراد ہے۔ وہاں ذبح کر کے مساکین پر صدقہ کر دے۔ اسی جگہ، جہاں یہ واقع ہوا تھا، ذبح کرنا بلا خلاف جائز نہیں ہے۔ طعام سے مراد شہر کی غالب مقدارِ طعام ہے جو اس کی جزا کی قیمت کے برابر ہو۔ ہر مسکین کو ایک مُد

---

[1] تفسير القرطبي (٦/ ٣٠٠)

دے یا روزے رکھے۔ جانی (مجرم) کو ان قسموں سے کسی قسم کا اختیار ہے۔ بعض نے کہا کہ حرف ﴿ اَوْ ﴾ ترتیب کے لیے ہے۔ وبال عاقبت کی برائی کو کہتے ہیں، انتقام سزا میں مبالغہ کرنے کو کہتے ہیں۔[1]

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

تمھارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے، یہ تمھارے اور مسافروں کے فائدے کے لیے ہے اور جب تک تم احرام کی حالت میں ہو، تمھارے لیے خشکی کا شکار حرام کیا گیا ہے۔ اور تم اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے (96) اللہ نے حرمت والے گھر کعبہ کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے اور حرمت والے مہینے اور (حرم والی) قربانی اور پٹوں والے جانوروں کو بھی (حرمت دی ہے)، یہ اس لیے کہ تم جان لو کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور یہ کہ اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (97) جان لو! بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے، اور بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (98) رسول کے ذمے (اللہ کا پیغام) پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے اور جو تم چھپاتے ہو (99)

مُحرم کے لیے سمندری شکار کی حلت:

احرام میں دریا کا شکار، یعنی مچھلی حلال ہے اور دریا کا کھانا، یعنی جو مچھلی پانی سے جدا ہو کر مر گئی، اُس نے نہیں پکڑی، وہ بھی حلال ہے۔ فرمایا کہ یہ رخصت تمھارے فائدے کے لیے دی ہے، پھر کوئی یہ نہ سمجھے کہ حج کے طفیل سے حلال ہے۔ فرما دیا کہ اور سب مسافروں کے فائدے کے لیے مچھلی اگرچہ تالاب میں ہو، وہ بھی دریا کا شکار ہے۔

[1] فتح البیان (٤/ ٥٠۔ ٥٤)

شکار کا یہ حکم احرام کے اندر معلوم ہوا اور احرام میں مکے کا قصد ہے۔ اس شہرِ مکہ میں اور گرد و پیش میں تو شکار مارنا ہمیشہ کے لیے حرام ہے، بلکہ شکار کو ڈرانا اور بھگانا بھی حرام ہے۔ عرب کا ملک حاکم کے بغیر تھا، اس میں ہمیشہ جنگ اور فتنہ رہتا تھا، مگر کعبے کی بزرگی ان پر ثابت تھی۔ ماہِ حرام میں امن ہوتا، اُس میں ہر کوئی سفر کرتا اور اپنا مطلب حاصل کر کے لاتا اور قربانی کے ساتھ قافلہ گزر جاتا۔ اسی طرح گزران چلتی تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ابن مسیّب اور ابن جبیر رحمہ اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شکار دریا سے تر و تازہ کیا جائے اور جو طعام نمک وغیرہ لگا کر خشک کر کے کھایا جائے، وہ تمھارے لیے حلال ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ صیدِ بحر وہ ہے جو زندہ ہو، طعام وہ ہے جس کو دریا نے مار کر باہر ڈال دیا ہو۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، ابوسلمہ، ابراہیم نخعی اور حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: "طَعَامُهُ كُلُّ مَا فِيهِ" "جو کچھ اس میں ہے وہ طعام ہے۔" دوسرے الفاظ یہ ہیں: "طَعَامُهُ مَا قَذَفَ" جس کو اس نے پھینک دیا، وہ اس کا طعام ہے۔" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "طَعَامُهُ مَا لَفَظَ مِنْ مَيْتَةٍ" "جو اس نے مردہ چیز نکالی وہ اس کا طعام ہے۔" ابن المسیب رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "مَا لَفَظَهُ حَيًّا أَوْ حَسَرَ عَنْهُ فَمَاتَ" "جو اس نے زندہ نکالا یا وہ اس سے الگ ہو کر مر گیا۔" امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے کہ طعام سے مراد وہ ہے جو دریا میں مر گیا۔[1] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «طَعَامُهُ مَا لَفَظَهُ مَيْتاً»[2] "اُس کا طعام وہ ہے جس کو اس نے مار کر نکال دیا۔" بعض نے کہا ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔

"سَيَّارَه" سیّار کی جمع ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جو دریا میں ہو یا سفر میں۔[3] بعض نے کہا ہے کہ صید وہ ہے جس کو دریا سے شکار کیا، طعام وہ ہے جو دریا میں مر گیا اور اُس سے شکار کیا گیا۔ نمک لگا کر ان مسافرین کے لیے زادِ راہ ہوا جو دریا سے دور ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[4]

دریا کے مردار کے حلال ہونے کی دلیل:

جمہور نے دریا کے مردار کے حلال ہونے پر اسی آیت سے دلیل لی ہے اور اس حدیث سے بھی دلیل لی ہے جو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر ساحل کی طرف بھیجا، اُن پر ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا، وہ سب تین سو آدمی تھے، ان میں ایک میں بھی تھا۔ جب ہم نے کچھ فاصلہ طے کر لیا تو زادِ راہ نہ رہا۔ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سارے لشکر کا زاد جمع کرو، وہ جمع ہوا، سو وہ دو مزود ہو گئے۔ وہ ہر دن ہم کو تھوڑا تھوڑا دیتے، یہاں تک کہ وہ زاد بھی ختم ہو گیا۔ ہمیں صرف ایک ایک دانہ کھجور

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۵۷۔ ۷۰)
[2] تفسیر الطبري (۱۱/ ۷۰) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۱۱/ ۷۱)
[4] تفسیر الطبري (۱۱/ ۷۲۔ ۷۳)

کا ملنا، "فَقَالَ فَقَدُ وَجَدُنَا فَقَدَهَا حِينَ فَنِيتُ" پھر ہم دریا تک پہنچے، اچانک ایک مچھلی مثل ظرب (ٹیلہ) کے ملی، اٹھارہ دن تک سارے لشکر نے اُس کو کھایا، پھر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اُس کی پسلیاں کھڑی کریں، وہ کھڑی کی گئیں، ایک سواری کو کس کر اُس کے نیچے سے نکالا وہ اس کو نہ پہنچی۔ یہ حدیث صحیحین میں بھی کئی طریقوں سے آئی ہے۔[1]

صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اچانک دریا کے ساحل پر ایک بھاری ٹیلہ سا تھا، جب ہم اُس کے پاس آئے تو وہ ایک جانور تھا، جس کو عنبر کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ تو مردہ ہے، پھر کہا: نہیں، ہم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی ہیں اور تم کو ضرر پہنچا ہے، کھاؤ۔ ایک ماہ تک ہم نے قیام کیا، ہم تین سو آدمی تھے، موٹے ہو گئے، اُس کے حلقۂ چشم سے ہم گھڑے بھر بھر کر تیل لیتے۔ "وَنَقْتَطِعُ مِنْهُ الْفِدَرَ كَالثَّوْرِ" ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کے حلقۂ چشم میں تیرہ آدمیوں کو بٹھایا اور ایک پسلی لے کر کھڑی کی، پھر سب سے بڑا اونٹ کس کے اُس کے نیچے سے نکالا تو نکل گیا۔ اُس کے گوشت سے ہم نے وشائق بھر کر ساتھ لیے، جب مدینے میں آئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، فرمایا: وہ رزق ہے جو اللہ نے تمھارے لیے نکالا، تمھارے پاس کچھ اس کا گوشت ہو تو ہم کو بھی کھلاؤ۔ اس میں سے کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کھایا۔[2]

صحیح مسلم کی بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، جب اس مچھلی کو پایا۔[3] بعض نے کہا کہ یہ دوسرا واقعہ ہے، بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک ہی قضیہ ہے، لیکن پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ تھے، پھر ایک لشکر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیجا تھا، اُس لشکر نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ وہ مچھلی پائی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! ہم دریا میں سوار ہوتے ہیں، ہمارے پاس پانی کم ہوتا ہے، اگر وضو کریں تو پیاسے رہیں، کیا ہم دریا کے پانی سے وضو کریں؟ فرمایا: «هُوَ الطَّهُورُ مَاءُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ» "اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔" (رواہ مالك) اس حدیث کا امام شافعی، امام احمد اور اہل سنن اربعہ نے بھی اخراج کیا ہے۔ بخاری، ترمذی، ابن خزیمہ اور ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہم نے صحیح کہا ہے۔[4] اسی کے لگ بھگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، حج یا عمرے کے

---

[1] الموطأ (٢/ ٩٣٠) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣٥) [3] صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

[4] الموطأ (١/ ٢٢) مسند الشافعي (١/ ٧) مسند أحمد (٢/ ٣٦١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٦) صحيح ابن خزيمة (١/ ٥٨) صحيح ابن حبان (١٢/ ٦٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٤٨)

لیے، ایک ٹڈی دَل ہمارے سامنے آیا، ہم اُس کو لاٹھیوں سے مارنے لگے، وہ ہمارے سامنے گرنے لگیں، ہم نے کہا: ہم کیا کریں؟ ہم مُحرم ہیں، نبی اکرم ﷺ سے پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا:« لَا بَأْسَ بِصَيْدِ الْبَحْرِ » ''دریا کے شکار میں کوئی حرج نہیں۔''[1] (رواه أحمد والترمذي و ابن ماجه) اس کی سند میں ابو المہزم ضعیف ہے۔

سیدنا جابر اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ٹڈی پر یہ دعا کرتے:« اَللّٰهُمَّ أَهْلِكْ كِبَارَهُ، وَاقْتُلْ صِغَارَهُ، وَأَفْسِدْ بِيْضَهُ، وَاقْطَعْ دَابِرَهُ، وَخُذْ بِأَفْوَاهِهِ عَنْ مَعَايِشِنَا، وَارْزُقْنَا، إِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاءِ » ''اے اللہ! ان کے بڑوں کو ہلاک کر دے، ان کے چھوٹوں کو قتل کر دے، ان کے انڈوں کو خراب کر دے، ان کی جڑ کاٹ دے اور ان کے مونہوں سے ہماری معیشت چھین لے اور ہمیں رزق عطا فرما، بے شک تو دعا قبول کرنے والا ہے۔'' خالد نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر کی جڑ کاٹنے کی بددعا کرتے ہیں؟! فرمایا: ٹڈی دریا میں مچھلی کی چھینک ہے۔ زیاد نے کہا کہ ہم سے یہ بات اس نے کہی جس نے مچھلی کو دیکھا کہ وہ چھینکتی ہے اور ٹڈی نکلتی ہے۔[2] (تفرد به ابن ماجه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حرم میں ٹڈی کے شکار کا انکار کیا ہے۔[3] جو فقہا دریا کے جانوروں کو بغیر کسی استثنا کے کھانا جائز کہتے ہیں، ان کی حجت یہی آیتِ کریمہ ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جو کچھ دریا میں ہے وہ طعام ہے۔[4] بعض نے مینڈک کو مستثنیٰ کیا ہے، باقی کو مباح کہا ہے، سیدنا عبدالرحمان تیمی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی دلیل سے جس میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مینڈک کے قتل سے منع فرمایا ہے۔[5] (رواه أحمد والنسائي و أبو داود)

امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مینڈک کے قتل سے منع کیا ہے اور فرمایا کہ اُس کی نقیق تسبیح ہے۔[6] بعض نے کہا ہے کہ دریا کے شکار میں سے مچھلی کھائی جاتی ہے، مینڈک نہیں، باقی میں اختلاف کیا ہے۔ کسی نے کہا: سب کھایا جاتا ہے، کسی نے کہا: کچھ بھی نہیں کھایا جاتا، بعض نے کہا: جو خشکی میں ماکول ہے اس کے مشابہ دریا سے بھی ماکول ہے اور جو اس کے مثل نہیں وہ ماکول نہیں۔ یہ سب

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٣٠٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٢٢) اس کی سند میں ''ابو المہزم'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٢١٩)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٢١) اس کی سند میں ''موسیٰ بن محمد'' سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١٢)

[3] مسند الشافعي (١/ ١٣٦)

[4] تفسير الطبري (١١/ ٦٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عکرمہ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[5] مسند أحمد (٣/ ٤٥٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٥٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٩٧١)

[6] سنن نسائی میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ المعجم الأوسط (٤/ ١٠٤) اس کی سند میں ''مسیب بن واضح'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٧٨٨)

وجوہ مذہب شافعی میں ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو دریا میں مر جائے وہ ماکول نہیں، جس طرح خشکی کا مردار غیر ماکول ہے، ان کی دلیل وہ عمومی حکم ہے جو اس آیت میں ہے: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ﴾ [المائدة: ۳] ''تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردہ جانور۔'' ایک حدیث بھی اس کے لگ بھگ آئی ہے۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «مَا صِدْتُمُوْهُ وَهُوَ حَيٌّ فَمَاتَ فَكُلُوْهُ وَمَا أَلْقَى الْبَحْرُ مَيْتاً طَافِياً فَلَا تَأْكُلُوْهُ»[1] ''جو تم شکار کرو اور زندہ ہو، پھر مر جائے تو اس کو کھاؤ اور جو دریا میں ہو اور مردہ ہو اور تیر رہا ہو تو اس کو نہ کھاؤ۔'' (رواہ ابن مردویہ) لیکن یہ حدیث منکر ہے، جمہور اصحابِ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کی حجت وہی حدیثِ عنبر ہے اور حدیث «هُوَ الطَّهُوْرُ مَآؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ»[2] ''دریا کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے۔'' شافعی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ حلال ہوئے ہمارے لیے دو مردے اور دو خون: یعنی مچھلی اور ٹڈی، جگر اور تلی۔[3] (رواه أحمد، و ابن ماجه، والدارقطني والبيهقي وله شواهد وروي موقوفاً)

مُحرم کے لیے بری شکار کی حرمت:

پھر فرمایا: تم پر خشکی کا شکار حرام ہے، جب تک تم اِحرام میں ہو۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خشکی پر شکار کرنا حرام ہے۔ اگر کرے گا تو گناہ گار ہوگا اور تاوان دے گا، اور اگر خطا کرے گا تو تاوان دے گا، اُس کا کھانا اس کے لیے مردار کی طرح حرام ہوگا۔ اسی طرح اوروں کو بھی اس کا کھانا حلال نہیں، خواہ وہ احرام کی حالت میں ہوں یا نہ ہوں۔ عطا، قاسم، سالم، ابو یوسف اور محمد وغیرہم رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ پھر اگر اس کو کھا لیا تو جزا لازم ہوگی یا نہیں، اس میں علما کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ جزا لازم ہوگی۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ذبح کیا اور کھایا تو دوہرا کفارہ ہے۔[4] ایک گروہ کا یہی مذہب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر کچھ جزا نہیں۔

مالک بن انس رحمہ اللہ نے اسی پر نص کی ہے۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شہروں کے فقہا کے یہی مذہب ہیں، جمہور علما اسی طرف گئے ہیں۔ پھر اسی کو پسندیدہ ٹھہرایا ہے، اس دلیل سے کہ اگر وطی کرے، پھر وطی کرے اور حد سے پہلے پھر وطی کی تو اس پر ایک ہی حد ہے۔[5] امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اُس پر کھانے کی قیمت واجب ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨١٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٤٧) تفسير ابن كثير (٢/ ١٤٣) امام ابو داود امام بیہقی رحمہ اللہ اور دیگر محدثین نے اس روایت کے مرفوع ہونے کو ضعیف اور موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن البيهقي الكبرىٰ (٩/ ٢٥٥) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٠١٩)

[2] ان دونوں روایتوں کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[3] مسند أحمد (٢/ ٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣١٤) سنن الدارقطني (٤/ ٢٧١) سنن البيهقي الكبرىٰ ١٠/ ٢٥٤) تفسير ابن كثير (٢/ ١٤٢۔ ١٤٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١١١٨)

[4] مصنف عبد الرزاق (٤/ ٤٣٩)

[5] الاستذكار (٤/ ١٤٣)

ابو ثور رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب مُحرم نے صید کو قتل کیا تو اس پر جزا ہے، مگر اس شکار کا کھانا اسے حلال ہے، لیکن میں اس کے لیے اس کا کھانا مکروہ سمجھتا ہوں، اس کی دلیل وہ حدیث مرفوع ہے کہ خشکی کا شکار تم کو حلال ہے، جب تک تم خود شکار نہ کرو یا تمھارے لیے شکار نہ کیا جائے۔[1]

امام ابو ثور رحمہ اللہ کا یہ قول کہ قاتل کے لیے اس کا کھانا مباح ہے، غریب ہے۔ رہا غیر قاتل سو اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ غیر قاتل کو مباح ہے، وہ مُحرم ہو یا مُحل۔ دلیل ان کی یہی حدیث ہے۔[2] واللہ أعلم.
اور اگر کسی مُحل نے شکار کر کے مُحرم کو ہدیہ بھیجا ہے تو بعض نے کہا ہے کہ مطلقاً مباح ہے، یہ کچھ تفصیل نہیں کی کہ اُس کے لیے صید کیا ہے یا نہیں۔ یہ قول عمر، ابو ہریرہ، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم، کعب احبار، مجاہد، عطا اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ سے نقل کیا گیا ہے۔ کوفی بھی اسی کے قائل ہیں۔[3]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ شکار کا گوشت جس کو مُحل نے شکار کیا ہے، مُحرم کھائے یا نہیں؟ انھوں نے فتویٰ دیا کہ کھائے، پھر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مل کر یہ حال بیان کیا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر تو کچھ اور فتویٰ دیتا تو میں تیرے سر کو دُکھاتا۔[4] دوسروں نے کہا ہے کہ اس شکار کا مُحرم کو کھانا بالکل جائز نہیں ہے۔ اس سے بالکل منع کیا، آیتِ کریمہ کی عمومیت کی دلیل سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس شکار کا محرم کے لیے کھانا مکروہ رکھا ہے اور کہا کہ یہ آیت مبہم ہے، یعنی ﴿وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَادُمْتُمْ حُرُمًا﴾[5] (آیتِ باب)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ہر حال میں اس کو مکروہ جانتے تھے۔ طاؤس، جابر بن زید، ثوری، ابن راہویہ رحمہم اللہ، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، سعید بن المسیب رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[6] امام مالک، احمد، شافعی اور جمہور رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اگر حلال نے محرم کو دینے کے ارادے سے شکار کیا ہے تو جائز نہیں۔ ان کی دلیل صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ انھوں نے ایک جنگلی گدھا ابوا یا ودان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدیتاً بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صعب کے چہرے پر ناخوشی کے آثار دیکھے تو فرمایا کہ ہم نے صرف اس لیے لوٹایا ہے کہ ہم احرام میں ہیں۔ یہ حدیث صحیحین میں آئی ہے۔[7] اس کے بہت الفاظ ہیں۔

کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گمان کیا کہ شاید ان کے لیے شکار کیا ہے، اس لیے لوٹا دیا۔ ہاں اگر محرم کو

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٦٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٨٢٧) امام ترمذی رحمہ اللہ سند میں انقطاع بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مطلب رحمہ اللہ کا سماع سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث (٤٦٦٦)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ١٤٣) [3] الاستذكار (٤/ ١٣٨) [4] تفسير الطبري (١١/ ٧٩) اس کی سند صحیح ہے۔

[5] مصنف عبد الرزاق (٤/ ٤٢٨) اس کی سند صحیح ہے۔ [6] الاستذكار (٤/ ١٣٨)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩٣)

دینے کے ارادے سے شکار نہیں کیا تو محرم کو اس کا کھانا جائز ہے، ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی دلیل سے کہ جب انھوں نے وحشی گدھا شکار کیا اور وہ حلال تھے، محرم نہ تھے اور صحابہ محرم تھے تو اس کو کھانے میں توقف کیا، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، فرمایا: کسی نے تم میں سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے یا شکار کرنے میں مدد کی ہے؟ کہا: نہیں، فرمایا: کھاؤ اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس میں سے کھایا۔ یہ قصہ بھی بالفاظِ کثیرہ صحیحین میں آیا ہے۔[1]

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خشکی کا شکار کھانا تمھارے لیے حلال ہے، اس حالت میں کہ تم محرم ہو، جب تک کہ تم شکار نہ کرو یا تمھارے لیے شکار نہ کیا جائے۔ (رواه أحمد و أبو داود و الترمذي والنسائي) امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: "هٰذَا أَحْسَنُ حَدِيْثٍ رُوِيَ فِيْ هٰذَا الْبَابِ وَأَقْيَسُ"[2] ''یہ سب سے بہترین حدیث ہے جو اس بارے میں روایت کی گئی ہے اور سب سے زیادہ قیاس کی جانے والی۔'' امام ابن ربیعہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو عرج میں دیکھا، وہ محرم تھے، گرم دن میں ارجوان کی چادر سے منہ لپیٹے ہوئے، شکار کا گوشت آیا، لوگوں سے کہا: تم کھاؤ، انھوں نے کہا: آپ نہیں کھاتے؟ کہا: میں تمھاری طرح نہیں، یہ میرے لیے شکار کیا گیا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے: ﴿لَكُمْ﴾ کا خطاب ہر مسلمان کو ہے یا خاص مُحرمین کو۔ بحر سے مراد ہر صید بحری ہو، نہر کا ہو یا تالاب کا، غرض کہ ہر میٹھے کھارے پانی کا، دریا کا بھی یہی حکم ہے۔ طعام وہ چیز ہے جو کھانے میں آتی ہے۔ دریا کے سب حیوانات دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک مچھلی، دوسرے غیر مچھلی۔ سو سب قسم کی مچھلی حلال ہے، بدلیل: «اَلْحِلُّ مَيْتَتُهُ» خواہ کسی سبب سے مرے یا بے سبب، اہلِ حدیث و شافعی کا یہی مذہب ہے۔ مچھلی کے علاوہ جو حیوان ہیں وہ دو قسم ہیں: ایک وہ جو خشکی اور تری میں رہتے ہیں، جیسے: مینڈک اور سرطان، ان کا کھانا حلال نہیں ہے۔ سفیان رحمہ اللہ نے کہا: مجھے امید ہے کہ سرطان لا باس بہ ہو۔[4] ٹڈی کو بعض نے صیدِ بحر کہا ہے اور بعض نے صیدِ برّ۔ پہلے قول پر حلال ہے، دوسرے قول پر حلال نہیں۔ پانی کے پرندے بھی خشکی کے شکار میں شامل ہیں۔ احمد رحمہ اللہ نے کہا کہ سوائے مینڈک اور مگرمچھ کے سب صیدِ بحر ماکول ہے۔ ابن ابی لیلیٰ و مالک رحمہما اللہ نے کہا کہ بحر کی ہر چیز مباح ہے۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩٦)

[2] مسند أحمد (٣/ ٣٦٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٤٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٨٢٧) امام ترمذی رحمہ اللہ سند میں انقطاع بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مطلب رحمہ اللہ کا سماع سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٤٦٦٦)

[3] الموطأ (١/ ٣٥٤) اس کی سند صحیح ہے۔ [4] تفسير البغوي (٣/ ١٠١) [5] تفسير القرطبي (٦/ ٣١٩)

مذہب محدثین کی تائید حدیثِ عنبر، حدیثِ حل میتہ (سمندر کا مردار حلال ہونے والی)، حدیثِ حلت دو میتہ (دو مردار حلال ہونے والی) اور دو دَم (دو خون حلال ہونے والی) کرتی ہیں۔ اللہ نے صید اور طعامِ بحر کو متاع فرمایا ہے، پھر حالتِ احرام میں خشکی کے شکار سے منع کیا۔ آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ محرم کے لیے خشکی کا شکار کھانا حرام ہے، اگرچہ شکار کرنے والا محل ہو۔ جمہور اسی طرف گئے ہیں، اگر حلال نے محرم کے لیے شکار کیا ہو اور اگر اس کے لیے شکار نہیں کیا تو حلال ہے، یہی قول قابلِ ترجیح ہے، اسی سے احادیث کے درمیان جمع ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں محرم پر خشکی کا شکار حرام ہونے کے بارے میں تین جگہ ذکر کیا ہے: ایک اول سورت میں اور وہ اس کا فرمان ہے: ﴿ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ [المائدة: ۱] ''جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار کو حلال نہ جانو۔'' دوسری: ﴿ لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ [المائدة: ۹۵] ''جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارو۔'' اور تیسری آیتِ باب۔ یہ سب اس بات کی تاکید ہے کہ محرم پر شکار حرام ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرو، یعنی شکار کو حالتِ احرام میں یا حرم میں یا تمام جائزات و محرمات میں حلال نہ ٹھہراؤ۔ کعبہ کو کعبہ اس لیے کہتے ہیں کہ مربع ہے، تکعیب بمعنی تربیع۔ عرب کے اکثر گھر مدور (گول) ہوتے تھے نہ مربع، بیت اس لیے کہا کہ دیوار اور چھت رکھتا ہے، یہی گھر کی حقیقت ہے گو اس میں کوئی نہ رہتا ہو۔

حرام اس لیے کہا کہ اللہ نے اس کو حرمت، عزت اور عظمت والا ٹھہرایا ہے۔ لوگوں کی قیام گاہ اس لیے بنایا کہ وہاں رہ کر دین و دنیا کی اصلاح کرتے رہیں۔ خوف زدہ کو امن ملتا ہے، کمزور کو مدد دی جاتی ہے، تجارت میں نفع حاصل ہوتا ہے، عابد وہاں بیٹھ کر عبادت کرتا ہے، غرض کہ وہ مدارِ معاش اور حسنِ معاد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قیام ہی سے ان کو دین اور حج کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔[1] ابن شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جاہلیتِ اولیٰ میں وہاں کسی کو کسی کا خوف نہ تھا، سب کے لیے امن تھا، بیت اللہ کے نزدیک یا حرم کے اندر یا حرمت والے مہینے میں۔[2]

شہرِ حرام سے مراد ذوالحجہ ہے، اس ماہ کا خاص ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ مہینا حج کا ہے یا اسمِ جنس ہے، اس سے سارے حرمت والے مہینے مراد ہیں: ذیقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ وہ لوگ ان مہینوں میں نہ مطالبہ خون کرتے، نہ کسی کو دشمنوں میں سے قتل کرتے، نہ حرمت کی ہتک جائز سمجھتے، اس حیثیت سے گویا تمام لوگوں کی قیام گاہ تھا۔ قلائد سے مراد وہ اونٹ ہے، یعنی قربانی کا جانور جس کے گلے میں کچھ لٹکا دیں، اس کا ذکر اس لیے کیا کہ قربانی کا ثواب زیادہ اور حج کی رونق اس سے خوب ظاہر ہے، یا قلائد سے مراد خود وہی لوگ ہیں کہ جب مکے سے لوٹتے تو حرم کے درختوں کی چھال اپنے اوپر لٹکاتے، تاکہ دشمنوں کے ہاتھوں سے امن میں رہیں۔ یہ تشریع اللہ نے اس لیے کی کہ تم جان لو کہ اللہ کو آسمان و زمین کا سارا حال مفصلاً معلوم ہے، وہ تمھاری دینی اور دنیاوی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے، جو

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۹۲) تفسیر ابن أبي حاتم (۴/ ۱۲۱۴) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۴/ ۱۲۱۴)

کوئی اس کے محارم کا انتہاک (بے حرمتی) کرتا ہے، اس کے لیے سخت سزا ہے، توبہ کرنے والے اور رجوع کرنے والے کے لیے غفور ورحیم ہے، تم مانو یا نہ مانو، نفع ونقصان طاعت و نافرمانی کا تمھاری جان پر ہے، رسول کا کام تو فقط پہنچا دینا ہے، سو اس نے پہنچا دیا، بری الذمہ ہو گیا، تمھارا کھلا اور چھپا حال اللہ کو معلوم ہے۔[1]

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۗ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

(اے نبی) کہہ دیجیے: پاک اور ناپاک برابر نہیں ہو سکتے، اگرچہ ناپاک کی کثرت آپ کو حیرانی میں ڈال دے، پس اے عقل والو! تم اللہ سے ڈرو، تاکہ تم فلاح پاؤ (100) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایسی باتوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں اور اگر تم ان کے متعلق سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل کیا جا رہا ہو تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گے، اللہ نے (تمھاری) اس حرکت کو معاف کر دیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے (101) ان کے بارے میں تم سے پہلے بھی ایک قوم نے سوال کیا تھا، پھر ان (باتوں) کی وجہ سے وہ کافر ہو گئے (102)

بے مقصد سوال کی ممانعت:

یعنی شرع کے حکم کے مطابق جو ہاتھ لگے وہ پاک ہے، تھوڑا بھی بہتر اور خلافِ شرع جو ہاتھ لگے وہ ناپاک ہے، اس کی زیادتی پر نظر نہ کرے۔ بکری کا ایک سیر گوشت سور کے من بھر گوشت سے بہتر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نہ پوچھیں کہ یہ چیز روا ہے یا نہیں، یہ کام کریں یا نہ کریں، بلکہ جو فرمایا اس پر عمل کرو، جو نہ فرمایا اس کو معاف جانو، اس میں دین آسان رہے گا اور جو ہر بات کا جواب، سوال کرنے پر، آئے گا تو دین تنگ ہو جائے گا، پھر عمل نہ کر سکو گے، جیسے اگلے نہ کر سکے۔ پھر کفر کی رسمیں بتائیں کہ پوچھنے کی حاجت نہیں۔ جو اللہ نے نہ فرمایا وہ بے اصل ہے۔ اور اسی طرح بے فائدہ باتیں پوچھتے۔ کسی نے پوچھا: میرا باپ کون تھا، یا میری عورت گھر میں کس طرح ہے؟ اگر پیغمبر جواب دے تو شاید برا جواب آئے اور پشیمان ہو۔

[1] فتح البیان (٤/ ٥٥۔ ٥٩)

اللہ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا: تم کہہ دو کہ تھوڑا اور نفع دینے والا حلال زیادہ نفعے والے حرام سے بہتر ہے، جس طرح حدیث میں آیا ہے: «مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَأَلْهٰى»[1] ''تھوڑی چیز جو کفایت کرے وہ اُس زیادہ چیز سے بہتر ہے جو غافل کر دے۔'' ثعلبہ بن حاطب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اللہ سے دعا کریں کہ مجھے مال دے، فرمایا: تھوڑا مال جس کا تو شکر ادا کرے بہتر ہے، اس مال سے جس کے شکر کی تجھ کو طاقت نہ ہو۔[2] (رواه البغوي في معجمه) اولو الباب سے صحیح مستقیم عقل والے لوگ مراد ہیں، یعنی اے عقل والو! حرام سے بچو، حلال پر قناعت کرو، شاید تم کو دنیا اور آخرت میں فلاح ہے ؎

اے قناعت تونگرم گردان — کہ ورائے تو ہیچ نعمت نیست

''اے قناعت! تو مجھے مالا مال کر دے کہ تجھ سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔''

شانِ نزول:

پھر اللہ نے یہ ادب سکھایا کہ بے فائدہ سوال کرنا اور ہر بات کی کرید کرنا نہ چاہیے، شاید وہ امور ظاہر ہوں تو تم کو برے لگیں، تم پر شاق گزریں، جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ کوئی کسی کی بات مجھ تک نہ پہنچائے، میں چاہتا ہوں کہ تمھاری طرف سے میرا سینہ صاف ہو۔[3] انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسا خطبہ پڑھا کہ کبھی ویسا نہ سنا تھا، اس میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو اور بہت روؤ۔ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب نے منہ پر کپڑا ڈالا اور رونے لگے۔ ایک شخص نے کہا: میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: فلاں، اُس پر یہ آیت اتری۔[4] (رواه الشيخان وأحمد والترمذي والنسائي)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا، سوال میں مبالغہ کیا، آخر ایک دن باہر آ کر منبر پر جا کر فرمایا کہ نہ پوچھو گے تم مجھ سے آج کے دن کچھ بھی مگر میں اُس کو تم سے بیان کر دوں گا۔ صحابہ ڈرے کہ کہیں کوئی نیا حکم نہ آ گیا ہو، میں اپنے دائیں اور بائیں طرف توجہ کرتا، جس کو بھی دیکھا کپڑے میں اپنا سر دے کر روتا ہوا پایا، ایک شخص جو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب تھا، وہ کہنے لگا: اے اللہ کے نبی! میرا باپ کون

---

[1] مسند أحمد (٥/ ١٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٤٣)

[2] المعجم الكبير (٨/ ٢١٨) معجم الصحابة (١/ ٤١٩) اس کی سند میں ''علی بن یزید'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٦٠٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٦٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٩٦) اس کی سند میں ''ولید بن ابی ہشام'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦٣٢٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٩) مسند أحمد (٣/ ١٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٥٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٣٨)

ہے؟ فرمایا: تیرا باپ حذیفہ ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: ”رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِيناً وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا، عَائِذاً بِاللّٰهِ“ ہم اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہیں اور اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔“ یا یوں کہا: ”أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ الْفِتَنِ“ ”میں فتنوں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔“ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے آج کے دن کی طرح کبھی خیر اور شر نہیں دیکھی، میرے لیے جنت اور آگ مصور کی گئی، یہاں تک کہ میں نے ان دونوں کو اس دیوار کے پاس دیکھا۔[1] (رواہ ابن جریر و أخرجاہ بنحو ذلك أو قریباً منه)

امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کی ماں نے کہا: میں نے تجھ سے زیادہ کوئی بچہ نافرمان نہیں دیکھا، تجھ کو اس بات کا خیال تھا کہ تیری ماں نے وہ کام کیا جو اہلِ جاہلیت کرتے ہیں، جو تو نے اُس کو سب کے سامنے رسوا کر دیا، اس نے کہا: واللہ! اگر وہ مجھ کو کسی غلام سیاہ کے ساتھ ملا دیتے تو میں اسی کو اختیار کر لیتا۔[2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک سرخ چہرے کے ساتھ باہر آئے، منبر پر بیٹھے، ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: میں کہاں ہوں؟ فرمایا: نار میں، دوسرے نے کہا: میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: تیرا باپ حذافہ ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: ہم راضی ہیں، اللہ کے رب ہونے سے، اسلام کے دین ہونے سے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے سے اور قرآن کے امام ہونے سے۔ اے اللہ کے رسول! ہم عہدِ جاہلیت اور شرک سے ابھی تازے تازے نکلے ہیں، اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ہمارے باپ دادا کون ہیں؟ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ تھم گیا، آیتِ باب اتری۔[3] (رواہ ابن جریر و إسنادہ جید)

اس قصے کو بہت سے سلف نے مرسلاً ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک سُدی ہیں، انھوں نے کہا کہ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا، خطبہ پڑھنے کھڑے ہوئے، فرمایا: پوچھو مجھ سے، آج تم مجھ سے جو بھی پوچھو گے، میں بتاؤں گا، بنی سہم میں سے ایک قریشی شخص نے جس کو عبداللہ بن حذافہ کہتے تھے اور اس کی نسب میں طعن کی جاتی تھی، کہا: اے اللہ کے رسول! میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: فلاں، اُس کو اس کے باپ کے نام سے پکارا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کا بوسہ لے کر کہا: ”رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا، إِلٰى قَوْلِهٖ، إِمَاماً“ آپ معاف کریں، اللہ آپ کو معاف کرے، یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوئے۔ اس دن فرمایا: «اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ»[4] ”اولاد اُس کی ہے جس کے بستر پر ہو اور زانی کے لیے پتھر ہیں۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٩) تفسير الطبري (١١/ ١٠٠۔ ١٠١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٩) [3] تفسير الطبري (١١/ ١٠٣) اس کی سند میں ”عبدالعزیز بن ابان“ ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير الطبري (١١/ ١٠٢۔ ١٠٣) یہ روایت مرسل ہے۔ البتہ ان الفاظ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کا بوسہ لیا) کے علاوہ روایت کے شواہد موجود ہیں اور یہ الفاظ شاذ ہیں۔

نے کہا کہ ایک قوم مذاق کے طور پر نبی اکرم ﷺ سے سوالات کرتی تھی، کوئی کہتا: میرا باپ کون ہے؟ کسی کی اونٹنی کھو جاتی، وہ کہتا: میری اونٹنی کہاں ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔[1] (تفرد به البخاري)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: جب یہ آیت اتری: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ [آل عمران: ٩٧] ''اللہ نے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے جو اس کی طرف سفر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔'' لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ ﷺ خاموش رہے، پھر کہا: کیا ہر سال ہے؟ پھر سکوت فرمایا، پھر کہا: ''أَفِي كُلِّ عَامٍ؟'' فرمایا: نہیں، اگر ہاں کہوں گا تو واجب ہو جائے گا، جب واجب ہوگا تو تم سے نہ ہو سکے گا۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ﴾ (آیتِ باب)[2] (رواه أحمد والترمذي و ابن ماجه) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے، میں نے امام بخاری کو سنا، کہتے تھے: ابو البختری نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ اللہ نے تم پر حج لکھا ہے۔ ایک مرد نے کہا: کیا ہر سال؟ آپ ﷺ نے اُس سے اعراض کیا، یہاں تک کہ اس نے دو یا تین باریوں ہی کہا، فرمایا: سائل کون ہے؟ کہا: فلاں شخص ہے، فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) واجب ہو جاتا، واجب ہوتا تو تم کو طاقت نہ ہوتی اور تم ترک کرتے تو کافر ہو جاتے، اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی۔[3] (رواه ابن جرير) اس کی سند میں ابراہیم ہجری ضعیف ہیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ سائل عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ تھے۔[4] یہ اس بات پر دلیل ہے کہ حج کو استطاعتِ سبیل کے باوجود چھوڑ دینا کفر ہے۔ یہ حکم یکساں طور پر ان تمام فرائض کے لیے ہے، ان میں فرق کرنے کے لیے کوئی دلیل لائقِ تعویل (قابلِ اعتبار) موجود نہیں ہے۔ بہرحال آیت سے ظاہر ہے کہ ایسے سوال کرنے کی ممانعت ہے کہ جب سائل کو اس کا جواب معلوم ہو تو برا لگے، اس سے بہتر یہ ہے کہ سوال ہی نہ کرے، مسئلے سے اعراض کرے اور اسے چھوڑ دے۔

بلبلے کز ستم خار تحمل نکند بہتر آنست کہ دیگر سخن گل نکند

''وہ بلبل جو کانٹے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی، اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ پھول کا نام بھی زبان پر نہ لائے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٦)

[2] مسند أحمد (١/ ١١٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٨٤) تفسير ابن كثير (٢/ ١٤٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو البختری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسير الطبري (١١/ ١٠٥) اس کی سند میں ''ابراہیم ہجری'' ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير الطبري (١١/ ١٠٦) اس کی سند میں ''محمد بن ابی حمید رازی'' ضعیف راوی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث کیا خوب حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: «لَا يُبَلِّغُنِي أَحَدٌ عَنْ أَحَدٍ شَيْئًا فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَخْرُجَ إِلَيْكُمْ وَأَنَا سَلِيمُ الصَّدْرِ» ''تم میں سے کوئی مجھے کسی کے بارے میں قطعاً کچھ خبر نہ پہنچائے، کیوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں تمھارے پاس آؤں تو میرا سینہ صحیح سالم ہو۔'' (رواہ أحمد و أبو داود) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر تم ان اشیا کے بارے میں سوال کرو گے جن سے تمھیں منع کیا گیا، نزولِ وحی کے وقت تو وہ بیان کر دیے جائیں گے، یہ بیان کچھ اللہ پر مشکل نہیں آسان ہے۔ پھر فرمایا: جو کچھ ہو چکا وہ معاف ہے یا یہ مطلب ہے کہ ابتدائی سوال نہ کرو، تمھارے سوال کی وجہ سے کہیں کوئی سختی یا تنگی تمھارے گلے نہ بندھے، پھر تم چھینکتے پھرو۔ حدیث میں آیا ہے کہ مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی شے کے بارے میں سوال کیا جو حرام نہ تھی، پھر وہ اس کے سوال کرنے سے حرام ہو گئی۔[2] لیکن جب قرآنِ مجید مجمل نازل ہوا اور تم اس کا بیان چاہو تو اس وقت تم کو بیان کر دیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس کی ضرورت ہے۔

اللہ کا سکوت از راہِ رحمت ہے:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو بات کتاب میں مذکور نہیں ہوئی، وہ معاف ہے، تم اس کے ذکر سے خاموش رہو، جس طرح کہ کتاب خاموش رہی۔ صحیح میں مرفوعاً آیا ہے: چھوڑ دو مجھ کو جب تک کہ میں تم کو چھوڑ رکھوں۔ ہلاک نہیں ہوئے وہ لوگ جو تم سے پہلے تھے، مگر اسی کثرتِ سوال و اختلاف سے اپنے پیغمبروں سے۔[3] دوسری صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے فرائض فرض کیے تم ان کو ضائع نہ کرو، حدود مقرر فرمائے، تم ان سے آگے نہ بڑھو، جو کچھ چیزیں حرام کیں ان کی پردہ دری اور رسوائی نہ کرو، کچھ اشیا سے سکوت کیا، یہ از راہِ رحمت ہے نہ کہ بھول اور فراموشی کے طور پر ہے، تم ان کے بارے میں سوال نہ کرو۔[4] پھر اللہ نے کہا کہ تم سے قبل ایک قوم نے اسی قسم کے منع کیے گئے مسائل کے بارے میں سوال کیا تھا، جب جواب ملا ایمان نہ لائے تو کافر ہو گئے، کیوں کہ اُن کا وہ سوال ہدایت حاصل کرنے کے لیے نہیں تھا، بلکہ عناد اور مذاق کے طور پر تھا۔

---

[1] مسند أحمد (۱/ ۳۹۵) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٦٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۸۹٦) اس کی سند میں ''ولید بن ابی ہشام'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٣٢٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۳۵۸)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۳۳۷)

[4] مستدرك الحاكم (٤/ ۱۲۹) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام مکحول رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث (۱٥۹۷)

سوال کیا تھا؟

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں اعلان کیا کہ اے قوم! اللہ نے تم پر حج لکھا ہے، یعنی فرض کیا۔ ایک شخص نے، جو بنی اسد میں سے تھا، کہا: کیا ہر سال؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت غصہ آیا، فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر ہاں کہہ دوں گا تو واجب ہو جائے گا، جب واجب ہو گا تو تم نہ کرسکو گے، اس وقت تم کافر ہو جاؤ گے۔ سو تم مجھ کو چھوڑ دو، جب تک میں تم کو چھوڑے رہوں، جب میں تم کو کسی چیز کا حکم کروں تو بجا لاؤ، جب تم کو کسی سے منع کروں تو اس سے باز رہو۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری اور منع کیا کہ ویسا سوال نہ کرو، جیسا نصاریٰ نے کیا کہ مائدہ اتارو اور پھر کافر ہو گئے۔ سو اللہ نے اس سے منع فرمایا اور کہا ہے کہ اشیا کے بارے میں سوال نہ کرو، اگر قرآن میں حکم سخت آئے گا تو تم کو برا لگے گا، لیکن تم منتظر رہو، جب قرآن اترے گا تو جس چیز کا سوال کرو گے، اس کا بیان قرآن میں پاؤ گے۔[1] (رواہ ابن جریر)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب آیتِ حج اتری تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں یہ اعلان کیا: «يَأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللهَ قَدْ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَحُجُّوا» ''اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے، سو تم حج کرو۔'' لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ''عَاماً وَّاحِداً أَمْ كُلَّ عَامٍ؟'' ''کیا ایک سال میں یا ہر سال؟'' فرمایا: «لَا بَلْ عَاماً وَّاحِداً، وَّلَوْ قُلْتُ كُلَّ عَامٍ لَوَجَبَتْ، وَلَوْ وَجَبَتْ لَكَفَرْتُمْ» ''نہیں، بلکہ ایک سال اور اگر میں کہہ دیتا کہ ہر سال تو وہ ہر سال واجب ہو جاتا اور اگر واجب ہو جاتا تو تم کافر ہو جاتے۔'' پھر اللہ نے یہ آیت اتاری۔[2] (رواہ ابن جریر)

روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ مرادِ بَحِيرَه، وَصِيلَة، سَائِبَة اور حَام کے بارے میں سوال کیا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے اس کے بعد فرمایا ہے: ''مَا جَعَلَ اللهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا كَذَا وَلَا كَذَا'' ''نہیں کیا اللہ نے بحیرہ اور نہ فلاں اور نہ فلاں۔'' عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: اُن کا سوال آیات سے تھا، اس سے ان کو منع کیا گیا،[3] یعنی جس طرح قریش نے سوال کیا تھا کہ نہریں جاری ہوں، کوہِ صفا سونے کا ہو جائے وغیر ذلک یا جس طرح یہود نے سوال کیا تھا کہ اُن پر کوئی کتاب آسمان پر سے اترے، حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۚ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ''اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی، پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم تو صرف ڈرانے کے لیے نشانیاں بھیجتے ہیں۔''

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۱۰۸۔ ۱۱۱)

[2] تفسیر الطبري (۱۱/ ۱۰۹۔ ۱۱۰) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[3] تفسیر الطبري (۱۱/ ۱۱۰۔ ۱۱۱)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١٠﴾ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٠٩۔١١١] ”اور انھوں نے اللہ کے نام کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس (مخصوص) نشانی آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے، (اے نبی!) کہہ دیجیے: نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں، اور تمھیں یہ بات کون سمجھائے کہ بے شک جب وہ نشانی آجائے گی تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔ اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے، اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے، تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے: فرمایا کہ درجے اور رتبے میں خبیث اور طیب برابر نہیں، یعنی حلال اور حرام یا مومن و کافر یا نافرمان اور فرماں بردار یا ردی اور عمدہ۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے، اس میں مذکورہ چیزیں اور ہر صفت والی چیز خواہ وہ خبیث ہو یا طیب، داخل ہے۔ وہ اشخاص ہوں یا اعمال یا اقوال، غرض کہ خبیث کسی طرح کسی حال میں بھی طیب کے برابر نہیں ہو سکتا، گو خبیث کی کثرت اچھی لگے۔

مطلب یہ ہوا کہ اہلِ دنیا کو مال و اسباب اور دنیا کی زینت کی کثرت بہت اچھی لگتی ہے، مگر جو خیر اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ خیر تھوڑی ہوتی ہے اور شر زیادہ، سو تم اے عقل والو! اللہ سے ڈرو۔ پاکیزہ چیزوں کو خبیث چیزوں پر اختیار کرو، اگرچہ پاک کم اور ناپاک زیادہ کیوں نہ ہوں۔ شاید تم نجات پاؤ اور کامیاب ہو۔ پھر سوالِ اشیا سے منع کیا کہ سوال کرنے کی کیا حاجت ہے۔ تمھارا یہ سوال کرنا کچھ دینی معاملہ نہیں ہے، اگر اس سوال کا جواب ظاہر ہو گا تو تم کو برا لگے گا، اس لیے کہ اس میں مشقت ہو گی۔ ہاں جو سوالات آگے کر چکے ہو، وہ معاف ہیں، پھر ان کو نہ دہراؤ، جس طرح قومِ صالح نے اونٹنی مانگی، قومِ عیسیٰ نے مائدہ مانگا، قومِ موسیٰ نے کہا کہ اللہ کو کھلم کھلا دکھلا دو، پھر اس پر عمل نہ کیا اور کافر ہو گئے۔

یہ آیت مشروط ہے، اس آیت سے: ﴿ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٣] ”لہٰذا تم

اہلِ ذکر (اہلِ کتاب) سے پوچھ لو، اگر تم علم نہیں رکھتے۔'' یعنی جس امرِ دین و دنیا میں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہو، اس کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت ہے، حدیث میں مروی ہے: «قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَلَّا سَأَلُوْا فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ»[1] ''انھوں نے سوال کیوں نہیں کیا؟ جہالت کی شفا سوال میں ہے۔''

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اللہ نے نہیں بنایا کسی کو بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام اور لیکن یہ کافر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے (103) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور (آؤ) رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں: ہمیں وہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ کیا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہی ہوں (تو بھی وہ انھی کی پیروی کریں گے)؟ (104)

بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی تفسیر:

یہ کفر کی رسمیں تھیں کہ مویشیوں میں کوئی بچہ بت کی نیاز رکھتے اور اُس کا کان پھاڑ دیتے، تاکہ نشانی رہے۔ اسے بحیرہ کہتے۔ کوئی جانور بت کے نام پر آزاد کر دیتے، اُس کو اُس کے اختیار پر چھوڑ دیتے، وہ سائبہ کہلاتا۔ بعض نے یہ ٹھہرایا ہے کہ جو بچہ نر ہو، وہ بت کی نیاز کے طور پر ذبح کروں اور جو مادہ ہو وہ میں رکھوں، پھر اگر نر و مادہ ملے ہوتے تو نر بھی آپ رکھتا، مادہ کے ساتھ یہ وصیلہ تھا اور جس اونٹ کی پشت سے دس بچے پورے ہوتے اور سواری اور بار برداری کے قابل ہو جاتے تو اس کے باپ پر بوجھ لادنا چھوڑ دیتے اور چارے پانی پر سے نہ ہانکتے وہ حامی تھا۔ یہ سب غلط رسمیں ڈال کر اُس کو شرعی حکم سمجھتے تھے۔

پھر اللہ نے فرمایا کہ باپ کا حال معلوم ہو کہ وہ حق کا تابع تھا اور صاحبِ علم تھا تو اس کی راہ پکڑیے، وگرنہ عبث ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ بحیرہ وہ ہے جس کا دودھ لوگوں کو دوہنا منع

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣٦٣) فتح البيان (٤/ ٥٩۔ ٦٣)

تھا، وہ طاغوت، یعنی بت کی نیاز ہوتا تھا۔ سائبہ وہ تھا جس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، اس پر بوجھ نہ لادتے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ اپنی آنتیں آگ میں کھینچتا ہے، سب سے پہلے اسی نے سائبہ جانور چھوڑے۔ وصیلہ وہ اونٹنی ہے جو پہلی بار نر جنے، پھر دوسری بار مادہ جنے، اس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، اگر ایک دوسرے سے واصل ہوتا، ان کے بیچ میں کوئی نر نہ ہوتا۔ حام وہ اونٹ تھا جس نے کئی بار جفتی کی ہو، جب اس کی ضراب ہو چکتی تو اس کو بتوں کے لیے چھوڑ دیتے، بار برداری سے معاف رکھتے، اُس پر کوئی چیز نہ لادتے، اس کا نام حام ہوتا۔[1] (وكذا رواه مسلم والنسائي)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «رَأَيْتُ جَهَنَّمَ يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضاً، وَرَأَيْتُ عَمْراً يَجُرُّ قُصْبَهُ، وَهُوَ أَوَّلُ مَنْ سَيَّبَ السَّوَائِبَ»[2] (تفرد به البخاري) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اکثم بن جون رضی اللہ عنہ سے کہا: اے اکثم! میں نے دیکھا عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف کو کہ اپنی آنتیں آگ میں کھینچ رہا ہے۔ میں نے کسی اور کو تمھاری نسبت اس سے زیادہ مشابہ اور اسے تم سے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا۔ اکثم رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو اس کی مشابہت کچھ ضرر نہ دے، فرمایا: نہیں تو مومن ہے، وہ کافر تھا۔ سب سے پہلے جس نے دینِ ابراہیم علیہ السلام کو بدلا، بحیرہ، سائبہ اور حامی مقرر کیا، وہی ہے۔[3] (رواه ابن جرير ثم رواه بنحوه أو مثله بطريق أخرىٰ وليس هذان الطريقان من الكتب)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے جس نے سوائب چھوڑے، یعنی بتوں کو پوجا، وہ ابوخزاعہ عمرو بن عامر ہے۔ میں نے اُس کو دیکھا کہ اپنی انتڑیوں کو آگ میں کھینچتا ہے۔[4] (تفرد به أحمد من هذا الوجه) زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں اُس شخص کو پہچانتا ہوں جس نے سب سے پہلے سوائب چھوڑے، اور جس نے سب سے پہلے دینِ ابراہیم کو بدلا۔ کہا: وہ کون ہے اے اللہ کے رسول؟! کہا کہ وہ عمرو بن لحی برادر بنی کعب ہے، میں نے اس کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں آگ میں کھینچتا ہے، اُس کی بدبو اہلِ نار کو ایذا دیتی ہے اور میں اُس کو پہچانتا ہوں، جس نے سب سے پہلے بحیرہ مقرر کیا۔ کہا: وہ کون ہے؟ فرمایا کہ بنی مدلج کا ایک آدمی ہے، اُس کے پاس دو ناقے تھے، ان کے کان پھاڑے، ان کا دودھ حرام کیا، پھر

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٣٨)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٨)

③ تفسير الطبري (١١/ ١١٧۔ ١١٨) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الصحيحة" (رقم الحديث: ١٦٧٧) میں بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

④ مسند أحمد (١/ ٤٤٦) اس کی سند میں "ابراہیم ہجری" ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ صحیحین کی روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

اُس کے بعد ان کا دودھ پیا، میں نے اُس کو آگ میں دیکھا، وہ دونوں ناقے اپنے منہ میں اس کو کاٹتے تھے، اور اپنے کھروں سے اُس کو پامال کرتے تھے۔[1] (رواہ عبدالرزاق)

اس رسمِ بد کا موجد:

یہ عمرو وہی لحی بن قمعہ کا بیٹا ہے جو رؤسائے خزاعہ میں سے ایک رئیس تھا، جو جرہم کے بعد بیت اللہ کے ولی ہوئے تھے اور اُس نے سب سے پہلے دینِ ابراہیم کو بدل ڈالا تھا اور حجاز میں بتوں کو لایا اور عام لوگوں کو ان بتوں کو پوجنے اور ان سے تقرب حاصل کرنے کے لیے بلایا اور جانوروں میں جاہلیت کے طریقے جاری کیے، جن کا ذکر اللہ نے سورت انعام میں فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٣٦] ”اور انھوں نے اس میں سے اللہ کے لیے ایک حصہ ٹھہرایا جو اس نے کھیتی اور چوپایوں کی شکل میں پیدا کیا، پھر اپنے خیال کے مطابق کہنے لگے: یہ (حصہ) اللہ کے لیے ہے اور یہ ہمارے دیوتاؤں کے لیے ہے، پھر ان کے دیوتاؤں کا جو حصہ ہے وہ تو اللہ کے پاس نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا حصہ ہے، وہ ان کے دیوتاؤں کے پاس پہنچ جاتا ہے، کس قدر برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔“

دیگر تفسیری اقوال:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بحیرہ وہ ناقہ ہے جس نے پانچ بچے جنے، پانچویں میں نذر کرتے تھے، اگر نر ہوتا ذبح کرتے، مرد اس کو کھاتے اور عورتیں نہ کھاتیں، اگر مادہ ہوتا تو اس کے کان کاٹتے، کہتے: یہ بحیرہ ہے۔[2] امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اسی کے قریب قریب ذکر کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: سائبہ بحیرہ ہی کی طرح بکری ہوتی، لیکن اس میں چھے بچوں کا اعتبار تھا، ساتویں بچے کو دیکھتے۔ اگر ایک یا دو نر ہوتے تو اس کو ذبح کرتے اور اس کو مرد کھاتے، عورتیں نہ کھاتیں۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سائبہ وہ اونٹنی ہے کہ جس کے دس بچے ہوتے۔ سب کے سب مادہ ہوتے، ان میں کوئی نر نہ ہوتا تو اس کو سائبہ کیا جاتا، نہ اُس پر سواری ہوتی، نہ اس کا صوف کاٹا جاتا نہ دودھ دوہا جاتا، مگر مہمان کے لیے۔ ابوروق نے کہا: جب کوئی آدمی اپنے کام کو نکلتا تو وہ کام ہو جاتا تو اپنے مال میں سے ناقہ یا کوئی اور جانور بتوں کی نذر کرتا، اس کا جو بچہ ہوتا وہ بتوں کے لیے ہوتا۔ سدی کے الفاظ یہ ہیں کہ جس شخص کی حاجت پوری ہوتی یا مرض سے تندرست ہوتا یا اس کا مال بڑھتا، وہ اپنے مال سے کچھ بتوں کے لیے سائبہ کرتا، اس کو جو کوئی

---

[1] تفسير الصنعاني (١/ ١٩٧) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٠) اس کی سند حسن ہے۔

چھیڑتا تو اس کو سزا دیتے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وصیلہ وہ بکری ہے جس کے سات بچے ہوئے، ساتواں بچہ اگر نر ہوتا اور مردہ تو اس میں مرد شریک ہوتے اور عورتیں نہ ہوتیں اور اگر مادہ ہوتا تو اس کو زندہ رکھتے اور اگر ایک شکم میں نر اور مادہ دونوں ہوتے تو ان دونوں کو زندہ رکھتے اور کہتے: ”وَصَلَتْهُ أُخْتُهُ فَحَرَّمَتْهُ عَلَيْنَا“ یعنی اس کی بہن نے اس کو وصیلہ کر کے ہم پر حرام کر دیا۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کہا: وصیلہ وہ اونٹنی تھی جو پہلے پہل مادہ جنتی، پھر دوسری بار بھی مادہ جنتی، اس کا نام وصیلہ رکھتے تھے اور کہتے: ”وَصَلَتِ اثْنَتَيْنِ لَيْسَ بَيْنَهُمَا ذَكَرٌ“ یعنی اس نے دو مادہ جنیں، جن کے بیچ میں کوئی نر نہیں ہے، اس کے کان کترتے اور طاغوتوں کی نذر کرتے۔ (رواہ عبدالرزاق) اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[3]

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وصیلہ وہ بکری تھی جو دس مادہ بچے پانچ پیٹ میں توام (جڑواں) جنتی، اُس کا نام وصیلہ رکھتے، اس کو چھوڑ دیتے، پھر اُس کے بعد وہ نر یا مادہ جنتی تو وہ مردوں کے لیے ہوتی نہ کہ عورتوں کے لیے اور اگر مردہ جنتی تو مرد و عورت سب اس میں شریک ہوتے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب کسی شخص کا اونٹ دس حمل رکھواتا، اس کو چھوڑ دیتے اور حام کہتے۔[5] ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب کسی نر اونٹ کا پوتا پیدا ہوتا تو کہتے: اُس نے اپنی پیٹھ بچائی، پھر اس پر کچھ بوجھ نہ لادتے نہ اُس کا صوف کاٹتے، نہ اُس کو کسی چراگاہ یا حوض سے روکتے، گو وہ حوض کسی غیر کا ہوتا۔[6] امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: حام وہ اونٹ تھا کہ جب اس کی جفتیاں پوری ہو جاتیں، اُس پر مور کے پر لگا کر سائبہ کر دیتے۔[7] اس آیت کی تفسیر میں اس کے سوا اور بھی کہا گیا ہے۔

اس بارے میں ایک حدیث بھی مالک بن نضلہ رضی اللہ عنہ سے آئی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ فرمایا: تیرے پاس کچھ مال ہے؟ میں نے کہا: ہاں، پوچھا کس قسم کا مال ہے؟ کہا: ہر طرح کا، یعنی اونٹ، بکری، گھوڑے اور غلام۔ فرمایا: جب کہ اللہ نے تجھ کو مال دیا ہے تو اپنے اوپر خرچ کر، پھر فرمایا کہ کیا تیرے اونٹ ثابت کان کے بچے جنتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں، سب اونٹ اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ فرمایا: شاید تو موسی یعنی استرہ لے کر کچھ اونٹوں کے کان کاٹتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بحیرہ ہے اور چند اونٹوں کے کان پھاڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حرام ہیں؟ میں نے کہا: ہاں، فرمایا: یہ کام نہ کیا کر، اللہ نے جو کچھ دیا ہے، وہ سب حلال

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٠۔ ١٢٢٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٢۔ ١٢٢٣) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسير الصنعاني (١/ ١٩٦) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٣) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٣)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [6] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٣) اس کی سند حسن ہے۔

[7] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٤)

ہے، پھر کہا:﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيلَةٍ وَّلَا حَامٍ﴾ یعنی اللہ نے یہ کچھ مقرر نہیں کیا۔

بحیرہ وہ ناقہ ہے جس کے کان کاٹے گئے، اب اُس شخص کی بیوی بیٹیاں اور اُس کا کوئی گھر والا اس کے صوف، پیٹھ، بالوں اور دودھ سے فائدہ نہیں لیتا۔ جب وہ اونٹنی مر جاتی تو سب اُس میں شریک ہو جاتے۔ سائبہ وہ ہے جس کو اپنے آلہہ کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، آلہہ کے پاس پہنچ کر نیاز چڑھا دیتے ہیں، وہ شتر بے مہار پڑے پھرتے ہیں، وصیلہ وہ بکری ہے جس نے چھے پیٹ جنے، جب ساتواں بچہ ہوا تو اس کے سینگ کاٹے، کہنے لگے: اب یہ وصیلہ ہوگئی، پھر اس کو نہ ذبح کرتے نہ جفتی دلاتے، نہ جہاں کہیں وہ حوض پر جاتی اس کو روکتے۔[1] حدیث میں یہ تفسیر مدرجاً آئی ہے۔ دوسری طرح پر عوف بن مالک کا قول ہے یہی اس کے زیادہ مشابہ ہے۔ اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی مالک بن نضلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے،[2] مگر اس میں الفاظ کی یہ تفسیر نہیں ہے۔

مشرکوں کا مصدرِ شریعت باپ دادا:

پھر اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے ان چیزوں کو مشروع نہیں کیا اور نہ یہ اشیا اللہ کے نزدیک قربت ہیں، لیکن مشرکوں نے جھوٹ باندھا، اس کو شرع اور قربت ٹھہرایا، سو یہ مآل ان کو حاصل نہ ہوا الٹا وبال ہوگیا۔ ان مشرکوں کا حال یہ ہے کہ جب ان کو دین، شریعت اور واجب پر عمل کرنے اور حرام کردہ اشیا کو ترک کرنے کی طرف بلاؤ تو یوں کہتے ہیں کہ جس بات پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور جن طریقوں اور مسلکوں پر وہ چلتے تھے، وہی راہ و رسم ہم کو کافی ہے۔ اللہ نے کہا: بھلا اگر ان کے آبا کچھ علم نہ رکھتے ہوں، کوئی امرِ حق نہ جانتے بوجھتے ہوں، کوئی شے نہ پہچانتے ہوں، ان کو ہدایت کا کوئی رستہ معلوم نہ ہو تو بھی کیا، یہ انھی کی پیروی کریں گے، اسی ڈگر پر چلیں گے، حالانکہ ان کی حالت یہ ہے جو بیان کی گئی ہے۔ ان کی پیروی تو وہی شخص کرے گا جو ان سے بھی بڑھ کر جاہل، بے عقل، گمراہ اور گنوار کالٹھ ہوگا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ ﴿مَا جَعَلَ﴾ کے معنی ہیں کہ اللہ پاک نے کسی جانور کا نام بحیرہ وغیرہ نہیں رکھا، یا مشروع نہیں کیا، یا اس کا حکم نہیں دیا، یا بیان نہیں کیا، یا نہیں ٹھہرایا، یا وضع نہیں کیا، یا پیدا نہیں کیا۔ بحیرہ بحر سے مشتق ہے بہ معنی شقِ اذن، یعنی کان کا پھاڑنا۔ ابن سید الناس نے کہا: بحیرہ وہ ہے جو بغیر چرواہے کے چھوڑ دیا جائے، یعنی جیسے ہندوستان میں سانڈ، جن کو بت کے نام پر شتر بے مہار کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے سوا اور بہت قول ہیں۔ ان اقوال میں جمع اس طرح ہے کہ عرب بحیرہ میں مختلف کام کرتے تھے۔ مسیّب بمعنی مخلّٰی ہے۔

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٠۔ ١٢٢٢) اس کی سند حسن ہے۔ البتہ بحیرہ اور دیگر الفاظ کی تفسیر ابو الاحوص رحمہ اللہ کا کلام ہے، جیسا کہ "الدر المنثور" (٣/ ٢١١) میں واضح ہے۔

[2] مسند أحمد (٣/ ٤٧٣) مستدرك الحاكم (١/ ٧٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

اونٹنی ہوتی یا اونٹ مرض سے شفا پانے یا منزلِ مراد پانے کی غرض سے نیاز کے طور پر اُس کو چارہ و پانی وسواری سے آزاد کر دیتے یا اللہ کے نام پر سائبہ کرتے۔ کچھ قید نہ ہوتی نہ کوئی اس کا چرواہا ہوتا، اسی طرح غلام لونڈی کو بھی سائبہ کر دیتے، جہاں چاہے جائے، کسی کا قابو اس پر نہ ہوتا۔

وصیلہ وہ ناقہ ہے جو مادہ پر مادہ جنے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: حام وہ نر اونٹ ہے جس کو دس برس لاد پھاند کر چھوڑ دیا ہو[1] یا اس سے سات مادہ لگاتار پیدا ہو چکے ہوں۔ ان میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ان چیزوں میں عرب کے مذاہب اور اہلِ جاہلیت کی آرائے فاسدہ میں اختلاف موجود ہے۔ اللہ نے کہا: یہ سب جھوٹا بہتان ہے جو انھوں نے اللہ پر باندھا ہے، شریعت اور عقل دونوں سے دور ہیں۔ سبحان اللہ. ان کی عقلیں اتنی کمینی اور کمزور تھیں، یہ کام جو وہ کرتے تھے، محض رقاعت اور حماقت تھی، یہ ان کے علما و رؤسا اور بڑوں کا حال تھا، ان جہلا و رعایا اور عوام کے حال پر افسوس ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ اکثر یعنی اراذل وعوام جو ان کے پیرو ہیں، کچھ نہیں سمجھتے کہ یہ ان کے سرداروں کا جھوٹ اور بہتان ہے، اللہ پاک پر، بلکہ وہ ان کی تقلید میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ابتدا سے ان کی عقلوں کے قصور اور کمزوری کا بیان ہے۔

پھر فرمایا کہ جب ان اکثرین سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف آؤ، اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کو مانو تو کہتے ہیں کہ ہم کو تو وہی راہ بس ہے جس پر ہم نے آبا کو پایا ہے، حالانکہ ان کے آبا کے افعال اور طریقے یہی ہیں، جن کا ذکر ہوا۔ اللہ نے بطورِ انکار یا تعجب سچ فرمایا کہ اگرچہ ان کے آبا جاہل اور گمراہ ہوں اور کچھ نہ جانیں نہ رستہ پائیں، تب بھی کیا وہ انہی کی چال پر چلیں گے۔ اسی طرح کی ایک آیت سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔[2] یہاں لفظ ﴿ مَا وَجَدْنَا ﴾ کہا ہے، وہاں ﴿ مَآ اَلْفَيْنَا ﴾ فرمایا تھا۔ یہاں ﴿ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ فرمایا، وہاں ﴿ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ ارشاد کیا تھا۔ یہ تفننِ عبارت اور اسلوبِ اشارت ہے۔ اسی کو ابو حیان اور سمین رحمہما اللہ نے مستحسن کہا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کسی ہدایت یافتہ عالم کی پیروی صحیح ہوتی ہے، جس کا قول حجت و برہان و دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔ سو ان مشرکوں کے باپ دادا ایسے نہ تھے، پھر ان کی پیروی کیسی؟!

تقلید کی مذمّت:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جاہلیت کا یہی مقولہ اب مقلدین کا نصب العین ہو گیا ہے، جب کوئی داعی انھیں حق کی طرف بلاتا یا کوئی پکارنے والا کتاب وسنت کی طرف پکارتا ہے تو وہ اسی لاٹھی کو پکڑ کر چلتے ہیں۔ انھوں نے بھی ان لوگوں کو حجت پکڑا ہے جن کے وہ مقلد بنے ہیں اور وہ انہی کی طرح شرعِ الٰہی میں اپنے اقوال پر چلنے

[1] روح المعاني (٧/ ٤٣) [2] رقم الآية (١٧٠)

والے تھے، اگرچہ وہ کتاب و سنت کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ ان مقلدین کا طریقہ بھی ان مشرکین کے قول کی طرح ہے۔ اُن میں اور ان میں کچھ فرق نہیں، مگر صرف عبارت لفظی میں فرق ہے نہ کہ معنی میں، جس پر فائدہ دینے اور فائدہ حاصل کرنے کا دار و مدار ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ غُفْراً''[1]

ہم نے بہت سے گرفتارانِ تقلید کو جو حق کو لوگوں کے ذریعے سے پہچانتے ہیں نہ کہ استدلال سے، سنا ہے کہ جب کوئی ان سے یہ بات کہتا ہے کہ حق اس مسئلے میں یوں ہے، یا قابلِ ترجیح فلاں کا قول ہے تو یہ جواب دیتے ہیں کہ سنو صاحب تم کچھ فلاں سے زیادہ علم نہیں رکھتے ہو اور اُس فلاں شخص سے مراد وہ شخص ہوتا جس نے اس قولِ راجح کے خلاف کہا ہے۔ سو ہماری گزارش یہ ہے کہ ہاں صحیح ہے کہ ہم فلاں سے بڑھ کر عالم نہیں ہیں، لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ بھلا کیا اس کا اتباع اور اس کے قول کو لے لینا ہم پر واجب ہے؟ تو کہتے ہیں کہ نہیں، لیکن حق اس شخص سے فوت نہیں ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فقط بالخصوص اسی سے حق فوت نہیں ہوتا ہے یا اس سے اور جو کوئی علما میں اُس کے مشابہ و مانند ہے اور علم کے رتبے میں اسی درجے تک پہنچا ہے، اس سے بھی فوت نہیں ہوتا تو کہتے ہیں کہ ہاں اُس سے بھی فوت نہیں ہوتا اور اس کے اشباہ سے بھی فوت نہیں ہوتا، سو اب یہ کہنا چاہیے کہ سنو، اس فلاں کے اشباہ و نظائر علمائے سلف و خلف میں ہزاروں گزرے ہیں، بلکہ کئی تو ایسے ہیں جو اس فلاں سے بھی زیادہ فاضل ہیں اور ایک مسئلے میں ان کے اقوال کے مخالف اقوال رکھتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کسی مسئلے میں ان کے درمیان حلال اور حرام کا فرق ہو تو کیا اب وہ ایک شے حلال اور حرام دونوں طرح ہو گی، اس لیے کہ ان دونوں شخصوں میں سے حق کسی سے فوت نہیں ہوا، جس طرح تمھارا زعم ہے۔

اگر کہو گے: ہاں، ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک شے حلال بھی ہو اور حرام بھی ہو تو یہ بالکل باطل ہے، حالانکہ جس نے یہ کہا ہے کہ سب مجتہد مصیب ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک مجتہد کا قول صواب ہے نہ کہ اصابت اور ان دونوں معنوں میں فرق ہے۔ یا کوئی کہنے والا ان کے جواب میں یوں کہے کہ فلاں تجھ سے زیادہ حق کو پہچاننے والا ہے، اس لیے کہ وہ زیادہ عالم ہے، جب کہ حق پر چلنے والا زیادہ عالم ہوتا ہے، سو جو کوئی دوسرا اس سے زیادہ علم رکھتا ہوگا، پس وہ فلاں جس کو غیر اس سے زیادہ عالم سمجھتا ہے، حق پر زیادہ چلنے والا ہے۔ اس سے تو اب حق نہ اس کے ہاتھ میں رہا نہ اُس کے اتباع کے ہاتھ میں۔

ان محاورات کا محتاج وہی شخص ہے جو مقصرین کے محاوروں میں پھنسا ہوا ہے، جن کو حجتوں کا فہم نہیں، دلائل کے بھیدوں کی معرفت نہیں اور حقائق کو دریافت کرنے کی عقل نہیں۔ وہ بے چارہ غریب مسکین ان کی آزمایش میں پڑ

[1] فتح القدیر (۲/ ۱۱۷)

کر اس طرح کے محاورات کا محتاج ہوتا ہے جو کچھ ان کی طرف سے اس پر وارد ہوتے ہیں اور مناظرات، مجادلات اور مکابرات پیش آتے ہیں، ان میں گرفتار رہتا ہے۔ ورنہ جس کو شریعت کے حقیقی علم سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے اس کو ان محاورات اور مقاولات کی کچھ حاجت نہیں ہوتی، کیوں کہ ہر عارف یہ بات جانتا ہے کہ مجتہد کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے عالم کا قول قبول کرے جو اس سے بلند مرتبہ رکھنے میں مشہور ہے۔ بلکہ مجتہد کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس عالم کی دلیل کو قبول کرے۔

پھر جب دلیل ظاہر نہ ہوگی تو پھر مجتہد کو کسی اور کا قول جو اس کے علم میں دلیل سے خالی ہے، قبول کرنا کسی طرح حلال نہ ہوگا، اگرچہ واقعتاً اس کی کوئی حجت ہو، کیوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے پاس حجت ہوتی ہے مگر اس دوسرے عالم کو وہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس تجویز کا نتیجہ صرف اتنا ہے کہ اس عالم اول کے بارے میں حسنِ ظن کرے، اس کی بات کو سلامت پر محمول کرے نہ یہ کہ اس کے اس قول ہی کو پکڑ لے اور یہ کہے کہ اس کی بات کے ساتھ تمسک کرنا جائز ہے، اس لیے کہ اس کا قول حق ہے، جس طرح دلیل کے ساتھ تمسک کرنا جائز ہے، ایسی بات وہی شخص کرے گا جس کو علم و عقل سے کچھ حصہ حاصل نہیں ہوگا۔[1] واللہ أعلم

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر اپنی جانوں کی فکر لازم ہے، جو شخص گمراہ ہو، وہ تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا، جبکہ تم خود ہدایت پر ہو۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو (105)

اصلاحِ نفس کی دعوت:

یعنی ان مسئلوں کو تم نے جانا، تم ان پر عمل کرو اور جو کوئی اصل دین ہی کو نہیں مانتا، اس مسئلے کو بتانا کیا حاصل؟ اول دین سمجھایئے اگر وہ نہ مانے تب مسئلہ بتایئے۔ اللہ پاک نے اس آیت میں اپنے مومن بندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تم اپنے نفس کی اصلاح کرو، جہاں تک ہو سکے خیر بجا لاؤ، کوتاہی نہ کرو، تمھارا کام درست ہو گیا تو اور کا فساد تم کو کچھ نقصان نہ دے گا، خواہ قریب ہو یا بعید۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ فرماتا ہے: ”جب بندے نے حلال میں میرے حکم کی اطاعت کی اور حرام میں میری ممانعت کو مانا تو اب کسی گمراہ کی گمراہی اسے کوئی ضرر نہیں پہنچائے گی۔“ یہی مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[2]

---

[1] فتح البيان (٤/ ٦٣۔ ٦٨)

[2] تفسير الطبري (١١/ ١٤٧) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٨) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر والی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

پھر فرمایا: ہم تم کو تمھارے عمل کی خبر دیں گے، یعنی ہر عامل کو اس کے عمل کی جزا ملے گی، نیک کو نیک، بد کو بد۔

اس آیتِ کریمہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام چھوڑ دینے کی دلیل نہیں ہے، جبکہ اس کا بجا لانا ممکن ہو۔ قیس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا، حمد و ثنا کے بعد کہا: اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور جو جگہ اس کے رکھنے کی نہیں ہے، وہاں اس کو رکھتے ہو، میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''لوگ جب منکر، یعنی خلافِ شرع کام دیکھیں اور اُس کو نہ بگاڑیں تو قریب ہے کہ اللہ عزوجل سب کو سزا دے۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے لوگو! جھوٹ سے بچو، بے شک جھوٹ ایمان سے جدا ہے۔'' (رواه أحمد و أصحاب السنن الأربعة وابن حبان في صحيحه وغيرهم من طرق كثيرة عن جماعة كثيرة متصلا مرفوعاً فمنهم من رواه موقوفا على الصديق وقد رجح رفعه الدارقطني وغيره) امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کے طرق طویل کلام کے ساتھ ''مسند صدیق رضی اللہ عنہ'' میں ذکر کیے ہیں۔[1]

ابو اُمیہ شعبانی کہتے ہیں: میں ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، کہا: تم اس آیت میں کیا کرتے ہو، یعنی کیا کہتے ہو؟ کہا: واللہ میں نے اس آیت کا حال خبر رکھنے والے سے پوچھا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، فرمایا: « بَلِ ائْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ حَتّٰى إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُّطَاعاً وَّهَوىً مُّتَّبَعاً وَّدُنْيَا مُّؤْثَرَةً وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهِ فَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ، وَدَعِ الْعَوَامَّ فَإِنَّ مِنْ وَّرَآئِكُمْ أَيَّاماً، الصَّابِرُ فِيْهِنَّ مِثْلُ الْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ لِلْعَامِلِ فِيْهِنَّ مِثْلُ أَجْرِ خَمْسِيْنَ رَجُلًا يَعْمَلُوْنَ كَعَمَلِكُمْ » ''بلکہ نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو، حتی کہ جب تو دیکھے کہ بخل کی اطاعت کی جا رہی ہے، خواہش کی پیروی کی جا رہی ہے، دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے، ہر کوئی اپنی رائے پر خوش ہو رہا ہے تو اس وقت خاص اپنی ذات پر توجہ کر، عوام کو چھوڑ دے، تمھارے بعد ایسے دن آنے والے ہیں جن میں صبر کرنے والا آگ کے انگارے پر بیٹھنے والے کی طرح ہوگا، ان دِنوں میں عمل کرنے والے کو پچاس آدمیوں کا اجر ملے گا، وہ تمھارے عمل جیسے ہی عمل کریں گے۔''

امام ابن مبارک نے کہا: غیر عتبہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے: ''قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَجْرُ خَمْسِيْنَ رَجُلًا مِنَّا أَوْ مِنْهُمْ؟ قَالَ « لَا بَلْ أَجْرُ خَمْسِيْنَ مِنْكُمْ »''[2] (رواه الترمذي وقال هذا حديث حسن غريب صحيح وكذا رواه أبو داود و ابن ماجه و ابن جرير و أبو حاتم) ''پوچھا گیا: ہمارے پچاس آدمیوں کا اجر یا ان کے پچاس آدمیوں کا

[1] مسند أحمد (١/ ٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٣٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٥) تفسير ابن كثير (٢/ ١٥١) العلل للدارقطني (١/ ٢٤٩۔ ٢٥٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٦٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٥٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٤) تفسير الطبري (١١/ ١٤٥) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٥) اس کی سند میں ''عمرو بن جاریہ'' کی متقدمین میں سے کسی نے توثیق نہیں کی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٠٢٥)

اجر؟ فرمایا: ”نہیں، بلکہ تمھارے پچاس آدمیوں کا اجر۔“

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: ایک آدمی نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کا حال پوچھا، کہا: یہ زمانہ اس آیت کا نہیں ہے۔ وہ تو آج کے دن مقبول ہے، لیکن لگتا ہے کہ اس کا زمانہ آئے گا، جب تم امر کرو گے تو تمھارے ساتھ ایسا ایسا کیا جائے گا، یا تم سے قبول نہ کریں گے، اُس وقت تم کو اپنی جان کی اصلاح چاہیے، تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گا جو گمراہ ہوا۔[1] (رواہ عبدالرزاق) امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوگ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے، دو آدمیوں میں کچھ چخ چخ ہوئی، جس طرح لوگوں میں ہو جاتی ہے، ہر ایک دوسرے کی طرف کھڑا ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک ہم نشین نے کہا: کیا میں ان دونوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ کروں، دوسرے نے جو اس کے پہلو میں بیٹھا تھا، کہا: تو اپنی خبر لے، اللہ کہتا ہے: ﴿ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾ (آیتِ باب)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سن کر کہا: چپ رہ، ابھی تک اس آیت کی تاویل نہیں آئی ہے۔ قرآن جہاں اترا، وہاں اترا، اس کی کچھ آیتیں ایسی ہیں جن کی تاویل اترنے سے پہلے گزر چکی۔ کچھ ایسی ہیں جن کی تاویل حساب کے دن واقع ہو گی، جیسے: حساب، جنت اور نار۔ سو جب تک تمھارے دل ایک ہوں، تمھاری اہوا ایک ہوں، تم گروہ گروہ نہ ہو، تمھارے بعض تمھارے بعض کی تکلیف نہ چکھیں، تب تک امر و نہی کرتے رہو اور جب دل اور اہوا مختلف ہو جائیں، تم گروہ گروہ ہو جاؤ، تمھارے بعض تمھارے بعض کی تکلیف اور اذیت چکھیں تو پھر اپنی جان کا کام کر کہ اُس وقت اس آیت کی تاویل آ جائے گی۔[2] (رواہ ابن جریر)

سفیان بن عقال نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ کیا اچھا ہوتا، اگر تم ان دنوں میں بیٹھ رہتے نہ امر کرتے نہ نہی، کیوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾ (آیتِ باب) کہا: یہ آیت نہ میرے لیے ہے نہ میرے اصحاب کے لیے، اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «أَلَا، فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ» ”خبردار! جو حاضر ہیں انھیں چاہیے کہ یہ دین کے احکام ان کو پہنچا دیں جو غائب ہیں۔“ ہم شہود ہیں تم غیب ہو، لیکن یہ آیت ان اقوام کے لیے ہے جو ہمارے بعد آئیں گی، اگر وہ کچھ کہیں گے تو ان کی بات نہ مانی جائے گی۔[3] (رواہ ابن جریر)

ابو مازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مدینے کو گیا، مسلمانوں کی ایک قوم بیٹھی ہوئی تھی، اُن میں سے ایک شخص نے یہ آیت پڑھی: ﴿ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ ﴾ (آیتِ باب) اکثر قوم نے کہا کہ اس کی تاویل اب تک نہیں آئی۔[4] جبیر بن نفیر رحمہ اللہ نے کہا: میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک حلقے میں تھا، میں سب

---

[1] تفسیر الصنعاني (١/ ١٩٩) المعجم الكبير (٩/ ٢٢١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح إلا أن الحسن البصري لم يسمع من ابن مسعود“ (مجمع الزوائد: ٧/ ٨٥)

[2] تفسیر الطبري (١١/ ١٤٣۔ ١٤٤) [3] تفسیر الطبري (١١/ ١٣٩) [4] تفسیر الطبري (١١/ ١٤٠)

سے کم عمر تھا، انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا چرچا کیا، میں نے کہا: کیا اللہ نے کتاب میں نہیں کہا: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ... الخ﴾ (آیتِ باب) سب میری طرف ایک زبان ہو کر متوجہ ہوئے اور کہا تو قرآن سے ایک آیت کھینچتا ہے جس کو پہچانتا نہیں نہ اس کی تاویل جانتا ہے، میں نے تمنا کی کاش! میں نہ بولتا، پھر آپس میں باتیں کرنے لگے، جب اٹھنے کا وقت قریب آیا تو کہا: اے لڑکے! تو کم عمر ہے، تو نے ایک آیت کھینچ لی، تو جانتا نہیں کہ وہ کیا ہے، قریب ہے کہ تو وہ زمانہ پائے گا، جب تو دیکھے گا کہ بخل مطاع ہے، خواہشات کی پیروی کی جائے گی، ہر رائے والا اپنی رائے پر خوش ہوگا، اُس وقت تو اپنی جان کو پکڑ، کسی کا گمراہ ہونا تجھ کو ضرر نہ دے گا، جبکہ تو نے اپنی راہ پالی۔[1] (رواه ابن جرير)

ضمرہ بن ربیعہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسن رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی، پھر کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بِهَا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَيْهَا، مَا كَانَ مُؤْمِنٌ فِيْمَا مَضٰى وَلَا مُؤْمِنٌ فِيْمَا بَقِيَ إِلَّا وَإِلٰى جَنْبِهِ مُنَافِقٌ يَكْرَهُ عَمَلَهُ" (رواه ابن جرير)

سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے کہا کہ جب تو نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیا تو اب کسی کا گمراہ ہونا تجھ کو ضرر نہ دے گا، جب کہ تو راہ یاب ہو گیا۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[2] بہت سے سلف بھی اسی کے قائل ہیں۔ کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب مسجدِ دمشق کا کنیسا ڈھایا جائے اور عصبیت کا بہنا ظاہر ہو، اس وقت اس آیت کی تاویل ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے مطلب یہ ہے کہ تم اپنی جانوں کو لازم پکڑو اور گناہوں کی آمیزش اور معصیت کے کاموں پر ڈٹے رہنے سے ان کی حفاظت کرو اور نفس کی اصلاح پر قائم رہو تو تمھیں کسی گمراہ کی گمراہی نقصان نہیں پہنچائے گی، خواہ وہ گمراہ کوئی اہلِ کتاب ہو یا کوئی اور جب کہ تم نے اپنے لیے حق کی راہ پا لی۔ اس آیت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دینے کی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کو چھوڑنے والا ہدایت یافتہ نہیں، باوجود اس کے کہ وہ فرائض کو ادا کرنے والا ہو، حالانکہ اللہ نے کہا ہے: ﴿ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ﴾۔ آیاتِ قرآنی اور بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہے، یہ وجوب حتمی اور محدود ہے۔

اس صورت میں یہ آیت اس پر محمول ہے جس کو اتنی قدرت و استطاعت نہیں کہ وہ واجب امر و نہی بجا لائے۔ یا اسے یہ گمان ہے کہ اُس کا امر و نہی کسی حال میں بھی موثر نہیں ہوگا یا اسے اپنی جان پر اس قسم کے ضرر کا خوف ہو کہ اس کی وجہ سے امر و نہی کو چھوڑ دینا جائز ہو۔ اس بارے میں ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ ابو عامر اشعری نے کہا: ان میں سے ایک شخص اندھا تھا، اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا چھوڑ دیا، پھر آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] تفسير الطبري (١١/ ١٤٢_ ١٤٣) [2] تفسير الطبري (١١/ ١٤٨) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٧)

پوچھا: تم کو کس بات نے روکا؟ اس نے کہا: میں نے یہ آیت پڑھی: ﴿عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ... الخ﴾ فرمایا: «أَيْنَ ذَهَبْتُمْ إِنَّمَا هِيَ لَا يَضُرُّكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ»[1] (أخرجه أحمد و ابن أبي حاتم والطبراني و ابن مردويه)

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اس آیت کی تاویل آخر زمانے میں آئے گی۔[2] ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: اس آیت کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوا، فرمایا: ابھی اس کی تاویل نہیں آئی اور نہ آئے گی، یہاں تک کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اتریں۔[3] طبری رحمہ اللہ نے کہا: ہمارے پاس اس آیت کی تاویل میں سب سے صحیح قول اور واضح تاویل صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے، یعنی عمل کرنا اللہ کی اطاعت پر، ادا کرنا لازمی امر و نہی کا اور ظالم کا ہاتھ پکڑنا، واللہ کوئی آیت اس سے زیادہ سخت تر نہیں اتری۔[4] ابن مبارک رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت امر و نہی میں سب سے زیادہ تاکید والی آیت ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ﴾ مراد تم میں سے اہلِ دین ہیں کہ بعض وعظ کریں بعض کو، اور خیرات میں رغبت دلائیں اور قبیح اور مکروہ باتوں سے متنفر کریں۔[5]

امام مجاہد اور ابن جبیر رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں اتری ہے۔ ان کو جزیہ لے کر چھوڑ دو۔[6] ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: یہ تو ہم نہیں کہتے کہ اس آیت میں امر و نہی کو چھوڑ دینے کی رخصت ہے، باوجود استطاعت کے، کیوں کہ ہدایت یاب ہونے کی باتوں میں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ منکر کا انکار کرے، جہاں تک طاقت کام دے۔[7] اس بارے میں اقوال اور روایات بہت سی ہیں۔ ان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں دیگر آیات و احادیث کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ واللہ أعلم. پھر فرمایا کہ تم سب کا لوٹنا اللہ کی طرف ہے۔ وہ اطاعت گزار ہو یا نافرمان، گمراہ ہو یا ہدایت یاب۔ وہ تم کو تمھارے اعمال کی خبر دے گا اور جزا جاری کرے گا، اس میں دونوں فریق کو وعدہ و وعید ہے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ کسی کی پکڑ کسی دوسرے کے اعمال پر نہیں ہو گی۔[8]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ
الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ
أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ
فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلَاةِ
فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٢٩) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٦) المعجم الكبير (٢٢/ ٣١٧)
[2] تفسير الصنعاني (١/ ١٩٩) [3] الدر المنثور (٣/ ٢١٧) [4] تفسير الطبري (١١/ ١٥٢ـ ١٥٣)
[5] تفسير الخازن (٢/ ١٠٣) [6] تفسير البغوي (٣/ ١١٠) [7] تفسير أبي السعود (٣/ ٨٨)
[8] فتح البيان (٤/ ٦٩ـ ٧١)

ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ
مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ
بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا
لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى
وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے تو تمھارے درمیان گواہی ہونی چاہیے اور وصیت کے وقت اپنے (مسلمانوں) میں سے دو انصاف والے گواہ ہوں یا اگر تم زمین میں سفر پر نکلے ہو اور (راستے میں) موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر قوم کے دو گواہ بھی کافی ہوں گے، پھر اگر تمھیں کوئی شبہ ہو تو ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد (مسجد میں) روک لو، تو وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم اس گواہی کے بدلے کوئی قیمت نہیں لے رہے اور کوئی ہمارا رشتے دار بھی ہو (تو ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور ہم اللہ کی گواہی نہیں چھپاتے، اگر ہم ایسا کریں تو ہم گناہ گاروں میں شمار ہوں گے ﴿106﴾ پھر اگر پتا چل جائے کہ بے شک ان دونوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے، پھر ان دونوں کی جگہ دو قریبی رشتے دار (بطور) گواہ ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں، جو (میت کے ترکے کے) حق دار ہیں، تو وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان (پہلے) دونوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی، اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے ﴿107﴾ یہ (اسلوب) قریب تر ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے، یا (کم از کم اس بات ہی کا) خوف کریں گے کہ کہیں ان (ورثاء) کی قسموں کے بعد ان کی قسمیں رد نہ کر دی جائیں، اور تم اللہ سے ڈرو اور سنو، اور اللہ نافرمانی کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿108﴾

وصیت کرتے وقت دو عادل گواہ مقرر کرنا:

یعنی مسلمان مرتے وقت کسی کو اپنے مال کا کام حوالے کرے تو بہتر ہے کہ دو معتبر مسلمانوں کو منتخب کرے، پھر اگر وارثوں کو شبہہ پڑے کہ ان شخصوں نے کچھ مال چھپایا اور وارث دعویٰ کریں اور شاہد نہیں تو دونوں شخص قسم کھائیں کہ ہم نے نہیں چھپایا۔ اگر سفر میں مرنے لگا اور وہاں مسلمان موجود نہیں تو دو کافر بھی گواہ صحیح ہیں، اور نمازِ عصر کے بعد قسم دیں۔ اُس وقت کی اچھی اور بری دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ شاید ڈر کر جھوٹی قسم نہ کھائیں۔ وارثوں کو شبہہ پڑے

تو قسم دینے کا حکم دیا ہے، یہ اس لیے کہ قسم سے ڈر کر شروع ہی سے جھوٹ نہ ظاہر کریں، پھر اگر ان کی بات جھوٹی نکلی تو وارث قسم کھائیں، یہ اس لیے کہ وہ قسم میں دھوکا نہ کریں اور جان لیں کہ آخر ہماری قسم الٹی پڑے گی۔ اس جگہ اظہار کو شہادت فرمایا ہے، مدعی اظہار کرے یا مدعا علیہ، جیسے اقرار کو کہتے ہیں، اپنی جان پر شہادت دے۔

نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک مسلمان تجارت کے لیے گیا، وہ راستے میں مرنے لگا، قافلے میں سے دو نصرانیوں کو اپنا مال سپرد کیا کہ میرے وارثوں کو دینا، جب وہ لا کر دینے لگے تو وارثوں نے اُس میں ایک کٹورا نہ دیکھا، وہ سونے کا تھا، انھوں نے اس کا دعویٰ کیا، وہ دونوں قسم کھا گئے کہ ہم کو یہی دیا تھا، پھر وارثوں نے کٹورا سنار کے پاس پایا، پوچھا تو معلوم ہوا کہ چاندی کا تھا اور اس پر سونے کا ملمع تھا، اُن نصرانیوں نے بیچا تھا، ان پر ثابت کیا تو کہنے لگے: میت نے اپنی زندگی میں ہمارے ہاتھ بیچا تھا اور قیمت لے چکا تھا، پھر وارثوں میں سے دو شخص جو اس میت کے زیادہ قریب تھے، سب کی طرف سے قسم کھا گئے کہ ہم کو بیچنا معلوم نہیں اور اس مال میں سے میت کے ہاتھ کی فہرست بھی نکلی، اس میں کٹورا داخل تھا، آخر نصرانیوں سے بھر لیا۔ یہ آیتِ کریمہ قریبی عزیز کے حکم پر مشتمل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ منسوخ ہے، یہی ابراہیم رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[1] اکثر نے کہا: بلکہ محکم ہے، جس کو نسخ کا دعویٰ ہو وہ بیان کرے۔ جمہور اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مسلمانوں میں سے دو عادل مرد ہوں، یہی عبیدہ، سعید بن مسیب، حسن، مجاہد، یحییٰ، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔[2] اوروں نے کہا ہے کہ وہ دونوں وصیت کرنے والے کے اہل میں سے ہوں۔ امام عکرمہ اور عبیدہ رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿غَيْرِكُمْ﴾ سے مراد غیر مسلمین ہیں، یعنی اہلِ کتاب۔ یہی امام عبیدہ، شریح، ابن مسیّب، ابن سیرین، یحییٰ بن یعمر، عکرمہ، سعید بن جبیر، شعبی، ابراہیم نخعی، قتادہ، ابومجلز، سدی، مقاتل بن حیان، عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔[4]

کافروں کی گواہی کا مسئلہ:

امام عکرمہ و عبیدہ رحمہما اللہ کے قول پر کہ ﴿مِنْكُمْ﴾ سے وصیت کرنے والے کا قبیلہ مراد ہے۔ ﴿غَيْرِكُمْ﴾ سے وصیت کرنے والے کے قبیلے کے علاوہ کوئی اور قبیلہ مراد ہوگا۔ امام حسن اور زہری رحمہما اللہ سے بھی یوں ہی مروی ہے۔[5] پھر اللہ پاک نے دو مومن گواہوں کے نہ ہونے پر دو ذمی گواہوں کو مقرر کرنے کے جواز کے لیے دو شرطیں فرمائی ہیں: ایک سفر، دوسرے موت، جس طرح قاضی شریح رحمہ اللہ نے کہا کہ یہود و نصاریٰ کی گواہی جائز نہیں، مگر سفر میں اور سفر میں بھی صرف وصیت میں جائز ہے۔[6] امام احمد رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ یہ مسئلہ افرادِ امام احمد سے ہے، باقی

[1] تفسير الطبري (١١/ ٢٠٧) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر والی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٩) [3] تفسير الطبري (١١/ ١٥٦) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٩)
[5] تفسير الطبري (١١/ ١٦٦۔ ١٦٧) [6] تفسير الطبري (١١/ ١٦٣)

تینوں ائمہ ان کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اہلِ ذمہ کی گواہی مسلمانوں پر جائز نہیں، ہاں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ان کے آپس میں گواہی کو جائز کہا ہے، یعنی ذمی کی گواہی ذمی کے لیے درست ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ سنت جاری ہے کہ کافر کی شہادت حضر میں جائز نہیں اور نہ سفر میں، یہ تو مسلمانوں میں ہوتی ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت ایک مرد کے بارے میں اتری جو مر گیا اور اس کے پاس کوئی مسلمان نہ تھا۔ یہ واقعہ اول اسلام میں ہوا، جب کہ زمین حرب تھی اور لوگ کافر تھے۔ وصیت سے ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، پھر وصیت منسوخ ہوئی اور فرائض (وراثت کے حصے) فرض ہوئے، لوگ ان پر عمل کرنے لگے۔ (رواہ ابن جریر)[1] مگر اس میں نظر ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: اس آیت سے کیا مراد ہے کہ میت ان دونوں کو وصیت کرے یا گواہ ٹھہرائے، اس میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ وصیت کرے۔ یزید بن عبداللہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ کوئی شخص سفر کرے، اُس کے پاس مال ہو اور قدر، یعنی موت اُس کو پالے، سو وہ اگر دو مسلمان پائے تو اپنا ترکہ ان کے سپرد کر دے اور دو اور مسلمانوں کو اس پر گواہ ٹھہرا لے۔[2] اس کی سند منقطع ہے۔ دوسرا قول جو یہ تھا کہ ان کو شاہد بنا دے، سو آیت کا ظاہر انداز یہی ہے۔ پھر اگر کوئی تیسرا وصی نہیں ہے تو وصیت اور گواہی دونوں اُن میں جمع ہوں گی، جس طرح تمیم داری رضی اللہ عنہ اور عدی بن بداء کے قصے میں آیا ہے۔ مگر ابن جریر ان دونوں کا دو گواہ ہونا مشکل بتاتے ہیں، اس لیے کہ یہاں کوئی حکم نہیں ہے کہ اُس میں شاہد قسم اٹھائے اور یہ اُس حکم میں مانع نہیں جس کو آیتِ کریمہ شامل ہے، کیوں کہ وہ ایک محکم حکم ہے جو بنفسہ مستقل ہے۔ ضروری نہیں کہ تمام احکام قیاس پر جاری ہوں، حالانکہ یہ ایک خاص حکم ہے جو خاص شہادت اور ایک خاص مقام کے لیے دیا گیا ہے۔ اس حکم میں کئی امر معاف کیے گئے ہیں جو اور احکام میں معاف نہیں ہیں۔ پس قیام کے وقت میں وہ گواہ شک وشبہے کے پیدا ہونے کی صورت میں آیتِ کریمہ کی روشنی میں قسم اٹھائے گا۔[3]

نماز سے مراد:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس جگہ نماز سے مراد نمازِ عصر ہے۔ سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، قتادہ، عکرمہ اور ابن سیرین اسی کے قائل ہیں، مگر زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نمازِ مسلمین ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد ان کے اہلِ دین کی نماز ہے۔ یہی بات عبیدہ، ابراہیم، قتادہ وغیر واحد نے بھی کہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں گواہوں کو ایسی نماز کے بعد جس میں لوگ جمع ہوتے ہیں، ان کے روبرو

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ١٦٦)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٢٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ یزید بن عبداللہ رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ١٥٤۔ ١٥٥)

کھڑا کر کے قسم لیں گے۔[1] وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ اگر تم کو ان دو شخصوں کی طرف سے کچھ شبہہ ہے کہ انھوں نے خیانت یا غلول کیا ہے تو ہم اپنی سوگند (قسم) سے قلیل دنیائے فانی کے عوض زائد مول نہیں لیتے، اگر چہ جس کے اوپر گواہی دی ہے، وہ ہمارا کوئی قریبی ہی کیوں نہ ہو، ہم تب بھی اُس کا لحاظ کر کے اللہ کی گواہی کو مخفی نہ رکھیں گے۔ شہادت کی طرف اللہ کی نسبت معاملے کی تشریف اور تعظیم کے لیے ہے، اگر ہم ایسا کریں گے کہ شہادت کی تحریف یا تبدیلی یا تغیر کریں گے یا اُس کو بالکل چھپائیں گے تو گناہ گار اور مجرم ہو جائیں گے۔

گواہوں کی خیانت کی صورت:

پھر اللہ نے کہا کہ اگر یہ بات پھیل جائے یا ظاہر ہو اور ثابت ہو کہ ان دونوں گواہوں نے وصیت کیے ہوئے مال میں خیانت یا غلول کیا ہے تو ان میں سے دو شخص جو بہت قریبی ہیں، ان کے بجائے کھڑے ہو جائیں جن کا حق دبایا گیا ہے۔ یہ قراءت أَوْلَيَانِ کے معنی ہیں اور امام حسن رحمہ اللہ نے أَوَّلَانِ پڑھا ہے۔[2] قراءتِ جمہور کا مطلب یہ ہے کہ جب صحیح خبر سے یہ ثابت ہو جائے کہ ان دونوں نے خیانت کی ہے تو وارثوں میں سے دو شخص جو اس کے ترکے کے مستحق ہیں، کھڑے ہو جائیں اور وہ دونوں اس مال کے وارثوں میں سے ہوں، وہ یہ قسم کھائیں کہ واللہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے، یعنی ہمارا یہ کہنا کہ ان دونوں نے خیانت کی ہے، زیادہ حق، صحیح اور ثابت ہے۔ ہم نے ان کی پہلے دی گئی شہادت کے بارے میں جو اُن کو خائن قرار دیا ہے، اس کہنے میں ہم نے کوئی زیادہ بات نہیں کی، اگر ہم جھوٹ بولے ہوں گے تو پھر ہم ظالموں میں سے ہیں۔ وارثوں کا یہ قسم اٹھانا اور اس حالت میں ان کے قول کی طرف رجوع کرنا ویسی بات ہے کہ جس طرح مقتول کے اولیا قسم اٹھاتے ہیں، جبکہ قاتل کی طرف کوئی آلودگی ظاہر ہوتی ہے، اُس وقت مستحقین قاتل پر قسم کھاتے ہیں اور قاتل ان کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ كَمَا هُوَ مُقَرَّرٌ فِيْ بَابِ الْقَسَامَةِ مِنَ الْأَحْكَامِ۔ سنتِ مطہرہ بھی اسی آیتِ کریمہ کی دلیل کے مطابق آئی ہے۔

شانِ نزول:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ تمیم داری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اُس سے سب لوگ بری ہوئے سوائے میرے اور عدی کے۔ یہ اسلام لانے سے پہلے نصرانی تھے، شام کو تجارت کے لیے جایا کرتے تھے، ان کے پاس بنی سہم کا ایک غلام آیا، اس کو بدیل بن ابی مریم کہتے تھے، وہ بھی تجارت کو نکلا تھا، اس کے پاس چاندی کا ایک جام تھا، وہ بادشاہ کو دینا چاہتا تھا، اس کی بڑی تجارت یہی تھی۔ وہ بیمار ہوا، اُس نے تمیم داری اور عدی کو وصیت کی کہ تم میرا یہ ترکہ میرے گھر والوں کو پہنچا دینا۔ تمیم نے کہا کہ جب وہ مر گیا، ہم نے وہ جام لے کر ایک ہزار درہم پر فروخت کر دیا

---

[1] تفسیر الطبري (١١/ ١٧٤۔ ١٧٦) تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٥٥) [2] تفسیر الطبري (١١/ ١٩٤)

اور اپنے اور عدی کے درمیان تقسیم کر لیا۔ جب اس کے گھر والوں کے پاس آئے، ہمارے پاس جو اُس کا مال تھا، وہ سب ہم نے دے دیا، انھوں نے اُس جام کو نہ پایا تو اس کے بارے میں پوچھا، ہم نے کہا: اس کے سوا کچھ نہیں چھوڑا، جو ہمیں دیا تھا وہ ہم نے تمھیں سونپ دیا۔ تمیم کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے مدینے تشریف لانے کے بعد میں مسلمان ہوا تو اس حرکت کو میں نے گناہ جان کر اُس کے گھر والوں کے پاس جا کر حال بیان کیا اور پانچ سو درہم دے دیے اور کہہ دیا کہ اتنے ہی درہم میرے ساتھی کے پاس بھی ہیں۔ وہ اس پر برہم ہوئے کہ لاؤ، نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ عدی سے اس کے دین کے مطابق قسم لیں۔ اُس نے قسم اٹھائی، اس پر یہ آیت اتری۔ پانچ سو درہم عدی بن بداء سے لیے گئے۔[1] (رواه ابن أبي حاتم وهكذا رواه الترمذي و ابن جرير ثم قال هذا حديث غريب وليس إسناده بصحيح)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک مرد بنی سہم کا تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ سفر کو نکلا تھا، سہمی ایسی زمین میں مرا، جہاں کوئی مسلمان نہ تھا۔ جب وہ دونوں اُس کا ترکہ لے کر آئے، اس میں چاندی کا جام جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا، نہ پایا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں سے حلف لیا، وہ جام مکے میں ملا، کہا: ہم نے تمیم اور عدی سے خریدا ہے۔ سہمی کے ولیوں میں سے دو آدمیوں نے کھڑے ہو کر حلف کیا کہ ہماری گواہی ان دونوں پر، یعنی تمیم اور عدی کی گواہی سے اوپر ہے اور جام ہمارے ساتھی کا ہے۔ ان کے بارے میں یہ آیت اتری۔ (رواه ابن جرير و أبو داود) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔[2]

اس قصے کو بہت سے تابعین نے مرسلاً روایت کیا ہے، جیسے عکرمہ، ابن سیرین اور قتادہ رحمہم اللہ۔ یہ بھی کہا ہے کہ وہ قسم نمازِ عصر کے بعد اٹھائی گئی تھی۔[3] امام مجاہد، حسن اور ضحاک رحمہم اللہ نے بھی اس کو مرسلاً روایت کیا ہے۔[4] سلف میں اس قصے کے مشتہر ہونے کی یہ دلیل ہے اور اس کے صحیح ہونے پر شواہدِ صحیحہ موجود ہیں۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک مسلمان مرد کو دقوقاء (جگہ کا نام) میں وقت نماز آیا، اُس کی وفات ہوئی، کسی مسلمان کو نہ پایا کہ وہ اس کی وصیت پر گواہ ہو، مجبوراً دو اہلِ کتاب کو گواہ ٹھہرایا، وہ دونوں کوفے میں آئے، اس کا ترکہ لائے، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خبر دی، انھوں نے کہا، اس قسم کا معاملہ بعد نبی اکرم ﷺ کے زمانے سے اب تک نہیں تھا، پھر ان دونوں سے عصر کی نماز کے بعد اللہ کی قسم لی: "مَا خَانَا وَلَا كَذَبَا وَلَا بَدَّلَا وَلَا كَتَمَا وَلَا غَيَّرَا وَإِنَّهَا لَوَصِيَّةُ الرَّجُلِ وَتَرِكَتُهُ" "کہ انھوں نے کوئی خیانت نہیں کی اور نہ جھوٹ بولا اور نہ وصیت کو تبدیل کیا اور نہ اس کو چھپایا اور نہ اس میں تغیر کیا اور یہ اس آدمی کی

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٥٩) تفسير الطبري (١١/ ١٨٦۔ ١٨٧) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٣١) اس کی سند میں "ابو نضر محمد بن سائب کلبی" سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: ضعيف سنن الترمذي (١/ ٣٧١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٢٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٠٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦٠) تفسير الطبري (١١/ ١٨٥)

[3] تفسير الطبري (١١/ ١٨٨۔ ١٨٩) [4] تفسير الطبري (١١/ ١٩١۔ ١٩٢)

وصیت تھی اور یہ اس کا ترکہ ہے۔'' پھر ان کی شہادت نافذ کی۔ (رواہ ابن جریر) پھر دوسرے طریق میں کہا ہے کہ ''إِنَّ أَبَا مُوسىٰ قَضىٰ بِهِ''[1] ''ابوموسیٰ نے ان گواہیوں اور قسموں پر فیصلہ کیا۔'' یہ دونوں اسناد ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ تک صحیح ہیں۔

ان کا اس کہنے سے کہ اس طرح کا یہ معاملہ نبی اکرم ﷺ کے بعد اب تک نہ ہوا تھا، شاید یہ مطلب ہو کہ آپ ﷺ کے عہد میں تمیم و عدی کا قصہ ہوا تھا، پھر ویسا ماجرا نہ ہوا، اب پیش آیا۔ کہتے ہیں: تمیم داری ۹ ہجری میں اسلام لائے تھے، اس بنیاد پر یہ حکم بعد والا ہے۔ اس کے منسوخ ہونے کا قائل اس مقام میں کسی فیصلہ کن دلیل کا محتاج ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت موت کے وقت وصیت کے بارے میں ہے کہ وصیت کرے اور دو مسلمانوں کو اپنے مال اور ترکے پر گواہ کر لے، یہ حضر میں ہوتا ہے۔ سفر میں دو غیروں کو شاہد بنا دے، وہ یہود و نصاریٰ و مجوس میں سے ہوں، اگر مسلمان موجود نہ ہوں۔ انھی کو وصیت بھی کرے اور اپنی میراث بھی ان کے سپرد کر جائے، وہ اُس کو لے کر آئیں۔ پھر اگر اہلِ وصیت کو پہنچا دیں اور ترکہ بتا دیں تو ان کو چھوڑ دیں اور اگر شک کریں تو معاملہ سلطان (حاکم) کو پیش کیا جائے۔ یہ مطلب ہے اس فرمان کا: ﴿ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ... الخ﴾[2] اس بارے میں اور کئی روایتیں ہیں۔ ابراہیم، سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سب کا مطلب ایک دوسرے کے قریب ہے۔

حاصل یہ ہے کہ بہت سے ائمہ تابعین اور سلف نے اس حکم کو آیتِ کریمہ کا مقتضا قرار دیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ اس حکم کا مشروع ہونا اس پسندیدہ وجہ پر، یعنی دو دینی لوگوں کی گواہی اس کو قائم کرنے کے لیے زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ اس طرح کی شہادت اس لیے رکھی گئی ہے کہ اللہ کی قسم اٹھانا اور مراعات لینا اللہ کی جلالت کو ظاہر کرنے اور رسوائی کے خوف کی وجہ سے ہے۔ اگر قسم وارثوں پر پھیر دی جائے گی تو وہ قسم کھا کر اپنا دعویٰ حاصل کر لیں گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ مکی نے کتاب الکشف میں کہا ہے کہ یہ تینوں آیتیں اہلِ معانی کے نزدیک قرآن مجید کی مشکل ترین آیات ہیں۔ اعراب، معنی، حکم اور تفسیر کے لحاظ سے علما ہمیشہ ان کو مشکل سمجھتے رہے ہیں۔ ان آیات کے علوم تیس یا زیادہ اوراق میں آ سکتے ہیں، جس کو ہم نے ایک مستقل کتاب میں ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ کلام اس شخص کا ہے جس کو آیاتِ مذکورہ کی تفسیر سے کچھ نتیجہ ہاتھ نہیں آیا۔ چنانچہ کتابِ مکی سے ظاہر ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا جو مکی رحمہ اللہ نے کہا ہے، وہی ابو جعفر نحاس رحمہ اللہ نے بھی اس سے قبل کہا ہے۔ سعد الدین تفتازانی رحمہ اللہ کشاف کے حاشیے میں کہتے ہیں کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن میں یہ آیت نہایت مشکل ہے، اعراب و نظم و حکم کے لحاظ سے۔[3] امام سخاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے کسی عالم کو نہیں دیکھا کہ اُس کا کلام شروع سے

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۱٦٥) [2] تفسیر الطبري (۱۱/ ۱۷٥۔ ۱۷٦) [3] تفسیر القرطبي (٦/ ۳٤٦) فتح القدیر (۲/ ۱۲۲)

آخر تک خالص ہو۔ امام سمین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں توجیہ اعراب، اشتقاقِ مفردات، تصریفِ کلمات و قراءات اور تالیفِ قرآن کی معرفت بیان کرتا ہوں، باقی علوم میں بھی اللہ مددگار ہے۔[1]

حاصل مراد یہ ہے کہ موت کے حاضر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ موت کی علامات ظاہر ہوں، کیوں کہ جب مر چکا تو پھر کسی کو کیا گواہ کرے گا۔ دو عادل گواہ میت کے قریبی رشتے داروں سے ہوں، اس لیے کہ جو میت کے حالات انھیں معلوم ہوں گے، وہ دوسرے کو معلوم نہیں ہو سکتے اور جو خیر خواہی وہ کریں گے وہ کوئی دوسرا نہیں کرے گا۔ یا اجنبی لوگوں سے گواہ ہوں، امام زہری، حسن اور عکرمہ رحمہم اللہ نے یوں ہی کہا ہے۔[2] جمہور کہتے ہیں: ﴿مِنْكُمْ﴾ سے مراد اہلِ اسلام ہیں، ﴿مِنْ غَيْرِكُمْ﴾ سے مراد کفار ہیں۔ حق یہ ہے کہ آیت محکم ہے، اس لیے کہ اس کے منسوخ ہونے پر کوئی صحیح دلیل موجود نہیں۔ شہادت میں لوگوں اور زمانے اور حالات کے لحاظ سے عدل کی شرط عام ہے، مگر اس آیت میں سفر کی حالت میں اور وصیت کے وقت کے ساتھ خاص ہے اور دو مسلمان گواہوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے خاص اور عام میں کچھ ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ نماز کے بعد حَبس سے مراد نمازِ عصر ہے۔ اکثر کا قول یہی ہے، اس لیے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ جھوٹی قسم اٹھانے والے پر غضب کرتا ہے، جس طرح صحیح حدیث میں مروی ہے۔[3]

آیت میں اس کی تعیین اس لیے نہیں کی گئی کہ ان کے نزدیک قسم اٹھوانے کے لیے یہی وقت مقرر تھا، تمام دین والے اس وقت کو تعظیم والا جانتے ہیں اور اُس وقت میں جھوٹی قسم اٹھانے سے بچتے ہیں یا اس لیے کہ یہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ حکام فیصلے کرنے کے لیے اس وقت بیٹھتے ہیں یا اس وقت رات دن کے فرشتے ملتے ہیں۔ یا ان کے دین والوں کی نماز مراد ہے۔ یا ظہر کی نماز کا وقت، یہ حسن رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یا کوئی سی نماز، یہ قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4]

حَبس سے مراد ٹھہرانا ہے۔ اس وقت گواہوں کو قسم اٹھوانے کے لیے اس میں روک رکھنے کے عام معنی کی دلیل ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ قسم اٹھانے والوں کو وقت اور جگہ کا پابند کیا جا سکتا ہے۔ غرض کہ وہ دونوں وصیت کے گواہ یا جن کو وصیت کی گئی تھی، اللہ کی قسم کھائیں۔ ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے اس آیت سے صرف گواہوں کے حلف اٹھانے پر، جب کہ شہادت میں کسی قسم کا شک ہو، استدلال کیا ہے، لیکن اس میں نظر ہے، اس لیے کہ اس جگہ شاہد سے قسم اس لیے اٹھوائی جائے گی کہ اُس پر خیانت یا اسی قسم کی برائی کا دعویٰ کیا گیا ہے۔[5]

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا کہ خون، طلاق، عتاق اور جو مال دو سو درہم ہو، اس قسم کے معاملے میں قسم اٹھوانے کی سختی کی جاتی ہے کہ عصر کے بعد حلف لیا جائے۔ اگر مکے میں ہو تو حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان اور اگر مدینے میں ہو تو منبرِ رسول ﷺ کے پاس اور اگر بیت المقدس میں ہو تو صخرہ کے پاس اور دوسرے شہروں میں جو سب سے

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (٧/ ٥٦٣)
[2] تفسير الطبري (١١/ ١٦٦۔ ١٦٧)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠)
[4] تفسير القرطبي (٦/ ٣٥٣)
[5] فتح القدير (٢/ ١٢٤)

بڑی اور عظیم مسجد ہو، اس میں قسم لی جائے۔

رِیبَتْ سے مراد شک ہے، یعنی جب وارثوں کو گواہوں کے قول میں شک ہو تو ان سے حلف لیں۔ یہ اس وقت ہے کہ گواہ کافر ہوں اور اگر دونوں مسلمان ہیں تو ان پر قسم نہیں۔ اس لیے کہ مسلمان گواہ سے قسم لینا غیر مشروع ہے۔ وہ دونوں شاہد اس بات کی قسم اٹھائیں گے کہ ہم اس گواہی میں دنیا کی کوئی شے لینا نہیں چاہتے کہ جھوٹ بول کر مال حاصل کریں، اگر چہ جس کے لیے ہم گواہی دیتے ہیں، وہ ہمارا بھائی بند کیوں نہ ہو۔ ہم کیا جھوٹی گواہی دے کر گناہ گار ہوں گے۔ پھر اگر معلوم ہو کہ وہ دونوں جھوٹی گواہی دے کر یا خیانت کر کے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو پھر ان کے بجائے میت کے قریبی رشتے داروں میں سے دو گواہ یہ گواہی دیں کہ ہاں فلاں کا حق دب گیا، ہم قسم کھا کر سچ کہتے ہیں۔ یہ گواہی ادا کرنے کا طریقہ ہے۔ یا شاہدین کو اس بات کا ڈر ہو کہ ان کی گواہی میت کے رشتے داروں کی گواہی کے بعد مسترد ہو جائے گی۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ نظم، اعراب اور حکم کے لحاظ سے قرآنِ مجید کی مشکل ترین آیت ہے،[1] لیکن اللہ نے اس مشکل کو ہم پر آسان کر دیا ہے۔

حاصل مقام یہ ہے کہ جس کو موت آنے لگے، وہ اپنی وصیت پر دو مسلمانوں کو گواہ کر لے، اگر مسلمان نہ ملیں اور وہ شخص سفر میں ہو اور کافر موجود ہوں تو انھی میں سے دو لوگوں کو وصیت پر گواہ کر لے۔ اگر اس کے وارث ان کی گواہی میں کچھ شک وشبہہ کریں تو وہ دونوں کافر اس بات پر شاہد حلف کریں کہ انھوں نے سچی گواہی دی ہے اور کوئی چیز نہیں چھپائی اور نہ ترکے میں کسی طرح کی خیانت کی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی امر قسم کے خلاف ظاہر ہو کہ گواہی میں کوئی خرابی ہے یا میت کے ترکے میں سے کچھ خیانت کی گئی ہے اور وارث یہ سمجھیں کہ ان دونوں گواہوں کے پاس یا قبضے میں ترکے کی کوئی شے ہے تو وارثوں میں سے دو آدمی گواہی دیں کہ ہاں فلاں شے اس میں سے غائب ہے، پھر اس پر عمل کیا جائے گا۔[2] واللہ أعلم.

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿١٠٩﴾

اس دن (کو یاد کرو) جب اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر (ان سے) کہے گا کہ تمھیں کیا جواب دیا گیا تھا تو وہ کہیں گے: ہمیں کوئی علم نہیں، بے شک تو ہی غیب کی باتوں کو جاننے والا ہے (109)

انبیا سے ان کی اُمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا:

یہ اللہ پاک کافروں کو سنانے کو پوچھے گا کہ میں نے تم کو جن کی طرف بھیجا تھا، انھوں نے قبول کیا یا نہ کیا اور

[1] تفسیر الخازن (۲/ ۱۰۷) [2] فتح البیان (٤/ ٧٢۔ ٧٩)

پیغمبر اس کے جواب کو اللہ کے علم کے حوالے کریں گے کہ ہم کو دل کی خبر نہیں ظاہر کی ہے۔ یہ ان کو سنایا جو مغرور ہیں پیغمبروں کی شفاعت پر، تاکہ معلوم کریں کہ اللہ کے سامنے کوئی کسی کے دل پر گواہی نہیں دیتا اور کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرتا۔ اللہ نے خبر دی کہ ہم قیامت کے دن پیغمبروں سے یہ بات دریافت کریں گے کہ تمھاری امتوں نے تم کو رسالت کے پہنچانے پر کیا جواب دیا، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٦] ''چناں چہ ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم رسولوں سے بھی ضرور سوال کریں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿92﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الحجر: ٩٢۔ ٩٣] ''چنانچہ آپ کے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے۔ ان عملوں کی جو وہ کرتے تھے۔'' پیغمبر کہیں گے: ہم کو کچھ علم نہیں۔ امام مجاہد، حسن اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس دن کے ہول سے یہ بات کہیں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ''فَيَفْزَعُوْنَ فَيَقُوْلُوْنَ لَا عِلْمَ لَنَا'' ''وہ گھبرائیں گے اور کہیں گے: ہمیں کچھ علم نہیں۔''

امام حسن رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ''أَيْ مِنْ هَوْلِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ'' ''یعنی اُس دن کے ڈر اور خوف کی وجہ سے۔''

در آں دم کہ از فعل پرسند و قول اولو العزم را تن بلرزد زہول

''انسان کے اعمال اور اقوال کے متعلق جب سوال ہوگا تو اس وقت عالی ہمت لوگ بھی خوف کی وجہ سے تھرتھر کانپنے لگیں گے۔''

امام سدی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ''إِنَّهُمْ نَزَلُوْا مَنْزِلًا ذَهَلَتْ فِيْهِ الْعُقُوْلُ، فَلَمَّا سُئِلُوْا قَالُوْا: لَا عِلْمَ لَنَا، ثُمَّ نَزَلُوْا مَنْزِلًا آخَرَ، فَشَهِدُوْا عَلٰى قَوْمِهِمْ'' ''وہ ایک ایسے مقام پر اتریں گے جہاں ان کی عقلیں جواب دے جائیں گی، پھر جب ان سے پوچھا جائے گا تو وہ کہیں گے: ہمیں کچھ علم نہیں، پھر وہ ایک دوسرے مقام پر آئیں گے اور اپنی قوم پر گواہی دیں گے۔'' ابن جریج رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ''أَيْ: مَا ذَا عَمِلُوْا بَعْدَكُمْ، وَمَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكُمْ؟ قَالُوْا: لَا عِلْمَ لَنَا''[1] ''انھوں نے تمھارے بعد کیسے اعمال کیے اور کیا کیا نئی باتیں نکالیں؟ وہ کہیں گے: ہمیں کچھ علم نہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں: ''يَقُوْلُوْنَ لِلرَّبِّ عَزَّوَجَلَّ: لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا عِلْمٌ أَنْتَ أَعْلَمُ بِهٖ مِنَّا''[2] ''وہ رب ذوالجلال والاکرام سے کہیں گے: ہمیں کچھ علم نہیں، مگر اتنا علم ہے جس کو تو ہم سے زیادہ جانتا ہے۔'' اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے باقی تینوں اقوال پر ترجیح دی ہے اور اختیار کیا ہے۔[3] اس میں شک نہیں کہ یہ جواب رب جل جلالہ کے سامنے ادب کے طور پر دیا جائے گا، یعنی تیرے علم کے سامنے، جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے،

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٢١٠۔ ٢١١) [2] تفسیر الطبري (١١/ ٢١١) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٣٦) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسیر الطبري (١١/ ٢١١)

ہمارے علم کی کیا حیثیت ہے۔ اگرچہ ہم ان لوگوں کا جواب، جو انھوں نے دیا ہے، جانتے پہچانتے ہیں، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ظاہر کو ہم جانتے ہیں، باطن کا حال معلوم نہیں۔ تو ہر شے کا علیم، ہر شے پر مطلع ہے، سو ہمارا علم تیرے علم کے سامنے کچھ بھی نہیں، تجھے ہر چھپی بات کی خبر ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم اُس دن سے ڈرو جس دن اللہ تعالیٰ سب رسولوں کو جمع کر کے سوال کرے گا، وہ دن قیامت کا دن ہے یا جس دن ان سب کو جمع کرے گا، اس دن کیا حال ہو گا؟ سوال کا مضمون یہ ہے کہ جب تم نے ان کو ہماری توحید اور اطاعت کی طرف بلایا تھا تو انھوں نے تم کو کیا جواب دیا تھا۔ مانا، یا نہ مانا تھا؟ یہ سوال امتوں کو ملامت اور جھڑکی کی غرض سے ہو گا۔ وہ کہیں گے ہم کو کچھ خبر نہیں، حالاں کہ ان کو خبر ہو گی، مگر عاجزی کے اظہار اور کسی قسم کی قدرت نہ ہونے کے اقرار کے واسطے جواب کو اللہ تعالیٰ کے علم کے سپرد کریں گے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ ان کو معلوم ہو گا کہ یہ سوال ملامت کے طور پر ہے۔ اس لیے اللہ ہی پر اس کا جواب رکھنا حصولِ مطلب کے زیادہ قریب ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ رسولوں نے جب یہ بات جان لی کہ اللہ عالم ہے، اُس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے اور حلیم ہے، سفاہت نہیں کرتا، عادل ہے، ظلم روا نہیں رکھتا تو سمجھ گئے کہ ہمارا کچھ کہنا نہ بھلائی حاصل کرنے کے لیے مفید ہے نہ شر ہی کو دور کر سکتا ہے، اس لیے ادب کا تقاضا ہے کہ خاموشی اختیار کر کے معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ اس معاملے کو اس کے عدل پر چھوڑ دینا بہتر ہے، اس لیے ﴿ لَا عِلْمَ لَنَآ ﴾ کہیں گے۔[1] یا یہ مطلب کہ ہم کو نہیں معلوم کہ ہمارے بعد کیا کیا نکالا۔ یا ہم کو ان کے باطن کی خبر نہیں، یا ہم تیری طرح ان کے حال سے واقف نہیں، یا ہم کو اس سوال کی حکمت معلوم نہیں، یا ہم کو ان کے انجام کا علم نہیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا قول کہ ڈر سے ﴿ لَا عِلْمَ لَنَآ ﴾ کہیں گے،[2] ٹھیک نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ﴾ [الأنبياء: ١٠٣] ”بڑی گھبراہٹ انھیں غم ناک نہیں کرے گی۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مارے ڈر کے عقل جاتی رہے گی، پھر اللہ ان کو عقل دے گا، پھر وہ خود سوال کریں گے۔[3] علام الغیوب وہ ہے جو باطن کا حال جانتا ہے، اس پر کوئی شے مخفی نہیں رہ سکتی، ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا دیکھتے ہیں۔[4]

---

[1] تفسير الرازي (١٢/ ١٠٢) [2] تفسير الطبري (١١/ ٢١٠)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٣٥) الدر المنثور (٣/ ٢٢٧) اس کی سند میں ”بشر بن عمارة“ ضعیف راوی ہے۔

[4] فتح البيان (٤/ ٨٠۔ ٨١)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ
عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ
تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ
كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِيْ
وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ
وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾
وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

جب اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! تو خود پر اور اپنی ماں پر میری نعمت یاد کر، جب میں نے تجھے روح القدس (جبریل) کے ساتھ قوت دی، تو (ماں کی) گود میں اور پختہ عمر میں لوگوں سے کلام کرتا تھا اور جب میں نے تجھے کتاب وحکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی، اور جب تو میرے حکم سے گارے سے پرندے کی سی مورت بناتا تھا، پھر تو اس میں پھونک مارتا تھا تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور تو پیدائشی اندھے کو اور پھلبہری والے کو میرے حکم سے تندرست کرتا تھا اور جب تو مردوں کو میرے حکم سے (زندہ) نکالتا تھا اور جب میں نے تجھے بنی اسرائیل سے بچایا جب تو ان کے پاس واضح نشانیوں کے ساتھ آیا تھا۔ تب ان لوگوں میں سے جنھوں نے کفر کیا، انھوں نے کہا تھا: یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۱۰﴾ اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، تب انھوں نے کہا: ہم ایمان لائے ہیں اور تو گواہ رہ کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں ﴿۱۱۱﴾

عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی نعمتیں یاد کرانا:

بنی اسرائیل سے روکا، یعنی قتل نہ کرنے دیا۔ اللہ پاک نے اس آیتِ مقدسہ میں اپنے بندے اور رسول عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں پر اپنا احسان جتایا جو معجزات ظاہر اور عام عادات کو توڑنے والی کرامات ان کے ہاتھ پر جاری کیے تھے، وہ یاد دلائے کہ دیکھ ہم نے تجھ پر کیسی نعمت کی کہ تجھ کو بغیر باپ کے تیری ماں سے پیدا کیا، تجھ کو اپنی ایک

نشانی اور اپنی قدرت کی دلیلِ قاطع ٹھہرایا۔ ہم سب اشیا پر قادر ہیں۔ پھر تیری ماں پر یہ احسان کیا کہ تجھ کو اُس کی براءت کا ایک برہان ٹھہرایا۔ ظالموں جاہلوں نے جس فاحشہ کی طرف تیری ماں کو منسوب کیا تھا، اُس تہمت اور بہتان سے پاک اور صاف بتایا۔ جبرائیل علیہ السلام سے تیری تائید کی، تجھ کو نبی اور اللہ کی طرف دعوت دینے والا بنایا۔ چھوٹی عمر میں اور بڑی عمر میں تو گود میں بولا، ماں کی براءت پر تو نے گواہی دی۔ میری عبودیت کا اقرار کیا اور یہ خبر دی کہ تو میرا رسول ہے، میری عبادت کی طرف لوگوں کو بلایا۔

﴿ تُكَلِّمُ النَّاسَ ﴾ میں ''تَدْعُوْ النَّاسَ'' ''تو لوگوں کو دعوت دیتا تھا'' کے معنی شامل ہیں، اس لیے کہ صغر سنی میں بات کرنا عجیب بات نہیں۔ کتاب و حکمت سے مراد خط اور فہم ہے، یعنی تجھ کو لکھنا پڑھنا، سمجھنا اور بوجھنا سکھایا۔ تورات وہ کتاب ہے جو موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر اتری تھی، لفظ تورات کبھی حدیث میں آتا ہے۔ اُس سے مراد اعم (زیادہ عام) ہوتی ہے۔ انجیل خود وہ کتاب ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر اتری۔

﴿ تَخْلُقُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تو مٹی لے کر پرندے کی شکل بناتا، یہ کام میرے حکم سے ہوتا تھا، جب اس میں پھونکتا تو وہ جاندار ہو کر میرے حکم سے اڑنے لگتا۔ اَكْمَهَ أَبْرَصَ کا ذکر سورت آل عمران میں ہو چکا ہے۔[1]

اِخْرَاجِ مَوْتیٰ سے مراد یہ ہے کہ جب تو ان کو پکارتا، وہ اپنی قبروں سے ہمارے حکم سے باہر نکل آتے، یہ اللہ کی قدرت و ارادت و مشیت تھی۔ ابو الہذیل رحمہ اللہ نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام جب کسی مردے کو زندہ کرنا چاہتے، دو رکعت نماز پڑھتے، پہلی رکعت میں ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ دوسری رکعت میں ﴿ الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ﴾ پڑھتے۔ جب فارغ ہوتے تو اللہ کی حمد و ثنا کرتے، پھر یہ سات نام لے کر دعا کرتے: ''يَا قَدِيْمُ، يَا خَفِيُّ، يَا دَائِمُ، يَا فَرْدُ، يَا وِتْرُ، يَا أَحَدُ، يَا صَمَدُ'' اور جب ان کو کوئی سختی پہنچتی تو ان سات ناموں سے دعا مانگتے: ''يَا اَللّٰهُ، يَا رَحْمَانُ، يَا ذَالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ، يَا نُوْرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ يَا رَبِّ''[2] (رواه ابن أبي حاتم) امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''هٰذَا أَثَرٌ عَجِيْبٌ جِدًّا''[3]

سورت ملک اور سورت سجدہ سے مراد یہ ہے کہ ان کے مضمون کے مثل اپنی زبان سے پڑھتے، پھر فرمایا کہ میری نعمت یاد کر و اپنے اوپر کہ جب تو اللہ کی طرف سے براہینِ ساطعہ و حججِ قاطعہ اپنی نبوت اور رسالت پر لے کر ان کے پاس آیا تو انھوں نے تجھ کو جھٹلایا، تہمت لگائی کہ تو جادوگر ہے، تیرے قتل اور سولی چڑھانے کی کوشش کی، اس وقت ہم نے تجھ کو بچا لیا اور اپنی طرف اٹھا لیا۔ پلیدی سے تجھ کو پاک کر دیا، ان کے شر سے محفوظ رکھا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کا ان پر یہ احسان آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد تھا یا قیامت کے دن واقع ہوا۔ صیغہ ماضی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقع ہو چکا ہے۔ یہ غیب کے بھیدوں میں سے ایک بھید تھا، جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے

---

[1] رقم الآية (٤٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٤١) یہ روایت مقطوع ہے۔ [3] تفسير ابن كثير (٢/ ١٥٩)

اپنے نبی محمد ﷺ کو دی۔ حواریوں سے کہنا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، یہ بھی عیسیٰ علیہ السلام پر ایک احسان ہے کہ ان کے لیے کچھ لوگ اصحاب اور انصار مقرر کر دیے۔

اس وحی سے مراد وحیِ الہام ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ﴾ [القصص: ۷] ''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ تو اسے دودھ پلا۔'' وہ بغیر کسی اختلاف کے وحیِ الہام تھی اور جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴾ [النحل: ٦٨] ''اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ تو پہاڑوں میں گھر (چھتے) بنا اور درختوں میں اور ان میں، جو لوگ چھپر بناتے ہیں۔'' بعض سلف نے کہا: ''قَذَفَ فِي قُلُوْبِهِمْ ذٰلِكَ'' یعنی ان کے دل میں یہ بات ڈال دی یا ان کو ہم نے تیرے واسطے سے وحی بھیجی کہ تو نے ان کو ایمان باللہ و برسولہ کی طرف بلایا اور انھوں نے قبول کیا۔ تیرے متبع اور تابع فرمان ہو گئے، کہنے لگے: ہم مومن ہیں تو ہمارے اسلام کا گواہ رہ۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ خاص کر عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہود و نصاریٰ ان کے بارے میں افراطاً وتفریطاً اختلاف کرتے ہیں۔ ایک گروہ نے ان کو اللہ ٹھہرا دیا، دوسرے گروہ نے کاذب بتایا۔ اُن پر یہ نعمت کی کہ نبوت دی، ماں پر یہ نعمت کی کہ اچھی طرح پرورش کیا، پاک رکھا، جہان بھر کی عورتوں میں سے انھیں چن لیا، یہ انعام اگرچہ ان کو معلوم تھا، لیکن تم امتوں کو بھی جتلانا مقصود ہے، تاکہ منکرین جان لیں کہ وہ اللہ نہ تھے، بلکہ بندے تھے۔

روح القدس سے مراد یا تو روحِ طاہرہ اور مقدسہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص کیا تھا یا جبرائیل علیہ السلام ہیں جو ہر دم ان کے ساتھ رہتے اور واقع ہونے والے حادثات میں ان کی اعانت کرتے۔ انھیں معرفت کی باتیں اور علم الہام کرتے یا وہ کلام مراد ہے جس سے روحوں کو زندہ کرتے۔ قدس بمعنی (پاکیزگی) ہے، مطلب یہ ہے کہ جب تم بچے تھے، پھر جوان ہوئے تو دونوں حالتوں میں ایک ہی انوکھے طرز پر کلام کرتے تھے۔ وہ کلام کمال عقل و تدبیر سے صادر ہوتا تھا، حالانکہ ان حالات میں غیر کا کلام متفرق ہوتا ہے، یہ ایک بڑا معجزہ اور خاصۂ شریفہ تھا جو ان سے پہلے کسی کو نہ ملا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، وہ تیس سال کے تھے، تیس ماہ رسول رہے، پھر اللہ نے ان کو اٹھا لیا۔[1] پھر وہ ادھیڑ عمر میں آسمان سے زمین پر اتریں گے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن انبیا اپنی امتوں کے ساتھ بلائے جائیں گے، پھر اللہ عیسیٰ علیہ السلام کو بلا کر اپنی نعمت یاد دلا کر نزدیک کرے گا۔ فرمائے گا، اے عیسیٰ بن مریم! تو میری نعمت کو یاد کر کہ میں نے تجھ پر کیا کیا احسان

[1] تفسیر البغوي (۳/ ۱۱٦)

کیے، پھر کہے گا: تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو اللہ جانو سوائے اللہ کے، وہ اس کہنے سے انکار کریں گے، اس وقت نصاریٰ کو بلا کر پوچھا جائے گا، وہ کہیں گے: ہاں ہم کو انھی نے اس بات کا حکم دیا تھا، عیسیٰ علیہ السلام کے بال اتنے بڑھ جائیں گے کہ ہر فرشتہ ان کے سر اور بدن کا ایک ایک بال پکڑ لے گا، اس وقت نصاریٰ کو اللہ کے سامنے ایک ہزار سال کے برابر بٹھا کر اُن پر حجت واقع کریں گے اور صلیب لا کر ان کو دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ [1]

کتاب سے مراد جنسِ کتاب یا خط ہے۔ حکمت سے مراد فہم اور علوم کے بھیدوں سے واقفیت یا حکمت یا کلام محکم کا علم ہے۔ تورات کا ذکر اس لیے ہوا ہے کہ جیسے یہود پر خرابی کے وقت تورات سے حجت لاتے تھے، مٹی سے پرندے کی صورت بنا کر اس میں پھونکتے تو وہ جاندار پرندوں کی طرح اڑنے لگتے، وہ چمگادڑ کی صورت ہوتی، ان کی فرمائش سے یہ کام کیا تھا، اس طرح پرندے کا بنانا عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا، یہ کام اللہ کے حکم سے ہوتا تھا۔ اسی طرح اندھا اور کوڑھی اچھا ہو جاتا، مردے قبر سے زندہ ہو کر نکلتے، یہ ایک بڑی نشانی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک تو سام بن نوح کو زندہ کیا تھا اور دو مرد، ایک عورت اور ایک لونڈی کو۔ پس چار جگہ قید بِإِذْنِي فرمائی، تاکہ یہ بات معلوم رہے کہ یہ سب کار روائی اللہ کی طرف سے تھی، عیسیٰ علیہ السلام کا اس میں کچھ کمال نہ تھا، مگر صرف اللہ کا حکم بجا لانا تھا۔ آلِ عمران میں صرف دو جگہ ﴿ بِإِذْنِ اللهِ ﴾ کہا تھا، اس لے کہ وہ جگہ صرف خبر دینے کی تھی، وہاں اختصار مناسب معلوم ہوا۔

یہ جگہ نعمت کا ذکر کرنے کی ہے، یہاں اِسہاب (تفصیل) چاہیے۔ عیسیٰ علیہ السلام جب یہ نشانیاں لے کر آئے تو یہود نے چاہا کہ ان کو قتل کر ڈالیں، اللہ نے آسمان پر بلا لیا۔ حواریین خاص اور خالص اصحابِ عیسیٰ علیہ السلام تھے، وہ بے چارے ایمان لے آئے، اپنے ایمان و اسلام پر ان کو گواہ کیا۔ ایمان کا ذکر اسلام پر اس لیے مقدم کیا کہ ایمان اعمالِ قلوب سے ہے، اسلام ظاہری اطاعت و خشوع و خضوع ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ سچے دل سے مومن، ظاہر میں تابعدار ہو گئے۔ [2]

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ
أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝١١٢ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ
قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّٰهِدِينَ ۝١١٣
قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَآ أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٣٦۔ ١٢٣٧) تاریخ دمشق (٦٧/ ٣٩۔ ٤٠) اس کی سند میں ''ابو عبداللہ مولی عمر بن عبدالعزیز'' مجہول راوی ہے۔ نیز متن میں بھی نکارت ہے۔

[2] فتح البیان (٤/ ٨٢۔ ٨٥)

مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

(اور) جب حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تیرا رب یہ طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک دستر خوان نازل کر دے؟ انھوں نے جواب دیا: تم اللہ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو (112) وہ بولے: ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دلوں کو تسلی ہو جائے، اور ہم یہ جان لیں کہ تو نے ہم سے سچ کہا ہے۔ اور ہم اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہو جائیں (113) عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے اللہ! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے دستر خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے پہلوں اور ہمارے بعد والوں کے لیے عید (خوشی کا موقع) بن جائے اور وہ تیری طرف سے خاص نشانی ہو، اور تو ہمیں رزق دے اور تو بہترین رزق دینے والا ہے (114) اللہ نے فرمایا: بے شک میں وہ دستر خوان تم پر نازل کروں گا، پھر اس کے بعد تم میں سے جو شخص کفر کرے گا تو میں یقیناً اسے ایسا عذاب دوں گا کہ ویسا عذاب دنیا بھر میں کسی اور کو نہیں دوں گا (115)

حواریوں کا دستر خواں اتارنے کا مطالبہ:

ایسا کر سکتا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے لیے تمھاری دعا سے اس قدر خرقِ عادت کرے یا نہ کرے۔ فرمایا: اللہ سے ڈرو، یعنی بندے کو چاہیے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہنا مانتا ہے یا نہیں، اگرچہ اللہ تعالیٰ بہت مہربانی کرے۔ یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں اور معجزہ ہمیشہ مشہور ہے کچھ آزمانے کو نہیں کہتے۔ وہ خوان یکشنبہ کو اترا، وہ نصاریٰ کی عید کا روز ہے، جیسے ہمارے لیے جمعے کا دن ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ خوان چالیس روز تک اترا، پھر بعضوں نے ناشکری کی، یعنی حکم ہوا تھا کہ فقیر اور مریض کھائیں، محظوظ اور چنگے بھلے بھی کھانے لگے، پھر اسی (۸۰) آدمیوں کے قریب بندر اور سور ہو گئے۔ یہ عذاب پہلے یہود کو ہوا تھا، بعد میں کسی کو نہیں ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ نہ اترا۔

یہ دھمکی سن کر مانگنے والے ڈر گئے اور نہ مانگا، لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی امت پر مال کی آسودگی ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے، یعنی دل کے چین سے عبادت میں نہ لگے، بلکہ گناہ میں خرچ کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرقِ عادت کے طریقے سے نہ چاہے، پھر اس کی شکر گزاری بہت مشکل ہے، اسبابِ ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصے میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں کی جاتی۔

یہ مائدہ کا قصہ ہے، جس کی طرف سورت کو منسوب کر کے مائدہ کہتے ہیں۔ اللہ نے اپنے بندے اور رسول عیسیٰ علیہ السلام پر اس کا احسان رکھا ہے کہ ہم نے اس بارے میں ان کی دعا قبول کر لی۔ مائدہ کا اتارنا ایک کھلی نشانی اور حجتِ قطعی ہے۔ بعض ائمہ نے کہا کہ اس قصے کا ذکر انجیل میں نہیں ہے، نصاریٰ اس کو نہیں پہچانتے، مگر اہلِ اسلام کی زبان سے۔ واللہ أعلم. حواریین عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والوں کو کہتے ہیں۔ اکثر کی قراءت یَسْتَطِیْعُ ہے اور دوسروں کی تَسْتَطِیْعُ، یعنی تجھ سے یہ ہو سکتا ہے کہ تو ہمارے لیے اپنے رب سے مانگے کہ وہ دستر خوان آسمان سے اتارے۔ مائدہ خوان کو کہتے ہیں، جس میں طعام ہو۔ بعض نے کہا کہ یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ وہ حاجت مند اور فقیر تھے، انھوں نے چاہا کہ ہر روز ایک خوانِ طعام آ جایا کرے تو گزارہ ہو جائے اور عبادت کے لیے قوت حاصل ہو۔

مسیح علیہ السلام نے جواب دیا کہ اللہ سے ڈرو، ایسا سوال نہ کرو کہیں تمھارے لیے فتنہ نہ ہو جائے۔ طلبِ رزق میں اللہ پر بھروسا رکھو اگر تم ایمان لائے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم محتاج ہیں، کھانا چاہتے ہیں۔ جب ہم خوان اترتے دیکھیں گے کہ ہمارا رزق آسمان سے اترا تو ہمارے دلوں کو چین نصیب ہو گا اور تمھاری رسالت پر ہمارا ایمان اور علم زیادہ ہو جائے گا۔ ہم اس بات کے گواہ رہیں گے کہ یہ اللہ کی نشانی، دلیل اور حجت ہے، تمھاری نبوت پر تمھارے صدق پر اور تمھارے دعوے پر، عیسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے یہ کہا کہ جس دن خوان اترے گا، اس دن کو ہم اپنی عید ٹھہرائیں گے، ہم اور جو لوگ ہمارے بعد آئیں گے، اُس دن کی تعظیم کریں گے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اس دن نماز پڑھیں گے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مراد یہ ہے کہ ہمارے بعد ہماری نسلوں کے لیے بھی ہو۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: یعنی ہمارے لیے اور جو ہمارے بعد ہوں، ان کے لیے ایک وعظ و نصیحت ہو۔[1] کسی نے کہا: یعنی کافی ہو، ہمارے اول و آخر کے لیے۔

پھر فرمایا: نشانی ہو تیری طرف کی، یعنی چیزوں پر اللہ کی قدرت کی ایک دلیل ہو اور اس پر کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کی تو وہ میری تصدیق کریں گے، اُس بات میں جو میں ان کو تیری طرف سے پہنچاؤں گا۔ اور دے ہم کو اپنے پاس سے گوارا رزق جو بغیر تکلیف، تھکاوٹ اور مشقت کے حاصل ہو، تو بہتر روزی دینے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ! تیری امت میں سے پھر اگر کوئی اس مائدہ کو جھٹلائے گا اور اُس کو دشمن رکھے گا تو پھر یاد رکھ میں اُس کو ایسی سزا دوں گا جیسی سزا تیرے زمانے کے لوگوں میں سے کسی کو بھی نہ دی ہو گی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ [المؤمن: ٤٦] ”آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔“ اور اس کے فرمان کے مطابق: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ [النساء: ١٤٥] ”بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے۔“ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اور لوگوں کی نسبت قیامت کے دن تین آدمی بڑے سخت عذاب میں ہوں گے: ایک منافقین، دوسرے کفارِ اصحابِ مائدہ اور تیسرے آلِ فرعون۔[2]

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٤٨۔ ١٢٤٩) [2] تفسیر الطبري (١١/ ٢٣٣)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا تھا: بھلا تم تیس روزے اللہ کے لیے رکھو، پھر اس سے مانگو، وہ تم کو دے گا، کیوں کہ عامل کا اجر اُس پر ہے جس کا کام کیا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا، پھر کہا کہ اے معلم الخیر! تم نے کہا ہے کہ مزدور کی مزدوری اُس پر ہوتی ہے جس کا کام کیا ہے اور ہم کو حکم دیا کہ ہم تیس روزے رکھیں، سو ہم نے رکھے، ہم جس کا کام تیس دن کرتے وہ فارغ ہونے کے بعد ہم کو کھانا کھلاتا، سو تمھارے رب سے ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے لیے کھانے کا دستر خوان بھیجے۔ فرشتے آسمان پر سے کھانے کا دستر خوان لیے ہوئے اڑتے ہوئے آئے، اس میں سات مچھلیاں سات روٹیاں تھیں۔ انھوں نے وہ دستر خوان ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس کو پچھلے لوگوں نے ویسا ہی کھایا، جیسے اگلے لوگوں نے کھایا تھا۔ (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ ہم پر آسمان سے دستر خوان اترے، چناں چہ فرشتے دستر خوان لے کر آئے، اس میں سات مچھلیاں اور سات روٹیاں تھیں، سب نے کھائیں۔[1] (رواه ابن أبي حاتم) سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مائدہ آسمان سے اترا، اُس میں گوشت تھا اور روٹی تھی۔ یہ حکم ہوا کہ خیانت نہ کریں، کل کے لیے بچا کر نہ رکھیں۔ انھوں نے خیانت کی، جمع کر رکھا، سور بندر ہو گئے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير) سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مائدہ اترا، اُس میں جنت کے پھل تھے، حکم دیا گیا کہ خیانت نہ کریں، چھپا کر نہ رکھیں، ذخیرہ نہ کریں، قوم نے یہ سب کیا، اللہ نے انھیں مسخ کر کے سور بندر بنا دیا۔[3] (رواه ابن جرير)

بنو عجل کے ایک آدمی نے کہا کہ میں نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں نماز پڑھی، جب وہ فارغ ہوئے تو کہا کہ تو جانتا ہے کہ بنی اسرائیل کے مائدہ کا معاملہ کیا ہوا تھا؟ میں نے کہا: نہیں، کہا: انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ مائدہ آئے، اس میں ایسا کھانا ہو جس کو وہ کھایا کریں، کبھی ختم نہ ہو۔ اُن سے یہ بات کہی گئی کہ بہتر ہے، وہ تمھارے لیے قائم رہے گا، جب تک کہ تم اُس کو نہ چھپاؤ گے اور خیانت نہ کرو گے اور کل کے لیے ذخیرہ نہ کرو گے اور اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو عذاب بھی ایسا ہو گا جو کسی کو نہ ہوا ہو گا۔ ایک دن بھی نہ گزرا کہ انھوں نے کھانا چھپایا، ذخیرہ کیا اور چرایا۔ ان کو عذاب بھی ویسا ہوا۔ اے گروہِ عرب! تم اونٹ بکریوں کی دُموں کے پیچھے پھرا کرتے تھے، اللہ نے تمھارے ہی اندر سے تم میں رسول بھیجا، جس کے حسب و نسب کو تم پہچانتے ہو، اُس نے یہ خبر دی کہ تم عجم پر غالب ہو گے اور تم کو سونے چاندی کے گاڑنے سے منع کیا، مگر واللہ! نہ جائے گا دن رات، یہاں تک کہ تم ان کو جمع

[1] تفسير الطبري (١١/ ٢٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٤٤، ١٢٤٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦١) تفسير الطبري (١١/ ٢٢٨۔ ٢٢٩) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٤٥) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کا موقوف ہونا مرفوع ہونے سے زیادہ صحیح ہے۔

[3] تفسير الطبري (١١/ ٢٢٩) اس کی سند صحیح ہے۔

کرو گے اور اللہ تم کو سخت عذاب کرے گا۔[1] (رواہ ابن جریر)

اسحاق بن عبداللہ نے کہا کہ مائدہ عیسیٰ علیہ السلام پر اترا، اُس میں سات روٹیاں تھیں اور سات مچھلیاں تھیں، جب تک چاہتے سب کھاتے، بعض نے چوری کی، کہا: شاید کل نہ اترے، آخر وہ اٹھ گیا۔[2] (رواہ ابن جریر) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور حواریوں پر خوان اترا، اُس میں روٹی مچھلی تھی، جہاں کہیں اترتے، جتنا چاہتے کھاتے۔ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مائدہ مچھلی روٹی تھا۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ایک طعام تھا، جہاں اترتے، وہاں وہ بھی اترتا۔ سلمی رحمہ اللہ نے کہا: "نزلت المائدة خُبزاً وَّسَمَكاً"، عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: مائدہ ایک مچھلی تھی جس میں ہر شے کا مزہ تھا۔[4]

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا: اُس مائدے میں ہر دن جنت کے پھل آتے، جتنا چاہتے طرح طرح کے میوے کھاتے، چار ہزار آدمی کھانے کو بیٹھتے، جب کھا چکتے تو ان کی جگہ ان جیسے اور آ جاتے۔ جب تک اللہ نے چاہا، اسی طرح رہا۔[5] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جو کی روٹی اور مچھلی اتری تھی۔ اللہ نے اس میں ایسی برکت رکھی تھی کہ ایک قوم کھا جاتی، پھر دوسری آ کر کھاتی، سب کھاتے اور چھوڑ جاتے۔[6]

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: مائدے میں سب چیز اتری سوائے گوشت کے۔[7] میسرہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مائدہ بنی اسرائیل کے لیے بیاری تھا، ان کے ہاتھ ہر کھانے پر پڑتے، مگر گوشت پر نہ پڑتے۔[8] عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: مائدہ کی روٹی چاول کی تھی۔[9] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مائدہ کا قصہ بطریق وہب بن منبہ سلمان خیر رضی اللہ عنہ سے مائدہ کے اترنے اور بنی اسرائیل کی مائدہ کے بارے میں عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گفتگو کو پارہ پارہ کر کے کئی جگہوں پر لکھا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ اثر نہایت غریب ہے۔ ہم نے اس کو اس جگہ اکٹھا کر کے زیادہ پورے اور مکمل سیاق سے ذکر کیا ہے۔[10] واللہ أعلم

اثر مذکور کا ترجمہ اس جگہ لکھنا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ اسرائیلیات کی جنس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی حدیث مرفوع اور صحیح نہ ہو، تب تک دل کو چین، آنکھ کو ٹھنڈک نہیں ہوتی۔ بہر حال یہ آثار اس بات کی دلیل ہیں کہ بنی اسرائیل پر مائدہ کا نزول عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ان کی دعا سے ہوا۔ جس طرح قرآن مجید کے ظاہر اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ﴾ بعض نے کہا: "إِنَّهَا لَمْ تُنْزَلْ" امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مثال

---

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٢٢٨) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[2] تفسیر الطبري (١١/ ٢٢٨)
[3] تفسیر الطبري (١١/ ٢٢٧) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٤٦)
[4] تفسیر الطبري (١١/ ٢٢٦۔ ٢٢٧)
[5] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٤٨)
[6] تفسیر الطبري (١١/ ٢٢٧)
[7] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٤٨)
[8] تفسیر الطبري (١١/ ٢٣٠)
[9] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٤٦)
[10] تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٦٢۔ ١٦٤)

ہے جو اللہ نے بیان کی، کوئی چیز نہیں اتری۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ مراد مائدہ ہے جس پر طعام ہو۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جب انھوں نے سنا کہ ناشکری پر سخت عذاب ہوگا تو انکار کیا۔

امام حسن رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ مائدہ نہیں اترا۔ اُن کا دوسرا قول یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ اس کے نزول کے بعد اگر منکر ہو گے تو سخت عذاب ہوگا تو کہنے لگے کہ "لَا حَاجَةَ لَنَا" پھر وہ نہ اترا۔[1] ان آثار کی اسانید امام مجاہد وحسن رحمہما اللہ تک صحیح ہیں۔ اس کی تقویت یہ بھی ہے کہ مائدہ کی خبر کو نصاریٰ نہیں پہچانتے اور نہ یہ قصہ ان کی کتاب میں ہے۔ اگر مائدہ اترتا تو بہت سے واقعات منقول ہوتے اور کتبِ نصاریٰ میں بطورِ تواتر موجود اور مذکور ہوتا۔ بلکہ بطریقِ آحاد تو ضرور ہی مروی ہوتا۔ واللہ أعلم

لیکن جمہور اسی کے قائل ہیں کہ مائدہ اترا ہے۔ اسی کو ابن جریر نے بھی اختیار کیا ہے، اس دلیل سے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ﴾ (آیتِ باب) اور اللہ کا وعدہ و وعید صحیح اور سچا ہوتا ہے۔[2] یہ قول ایسا ہے کہ آثار اور سلف کی روایات وغیرہم اس پر دلیل ہیں۔ اہلِ تاریخ ذکر کرتے ہیں کہ موسیٰ بن نصیر نائب بنی امیہ نے بلادِ مغرب کی فتوحات میں مائدہ پایا تھا، جو طرح طرح کے زر و جواہر سے مرصع تھا، اُس کو ولید بن عبدالملک کے پاس بھیجا جو دمشق کی مسجد کا بانی تھا، وہ راستے ہی میں تھا کہ ولید مذکور مر گیا، اُس کو اس کے بھائی سلیمان بن عبدالملک کے پاس لے گئے جو ولید کے بعد خلیفہ ہوا تھا۔ لوگوں نے اُس کو دیکھ کر سخت تعجب کیا، اس لیے کہ اُس میں نفیس قسم کے یاقوت اور نادر جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں: وہ مائدہ سلیمان بن داود علیہما السلام کا تھا۔ واللہ أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم اپنے رب سے دعا کرو کہ کوہِ صفا کو ہمارے لیے سونے کا بنا دے، پھر تم پر ایمان لے آئیں گے۔ فرمایا: تم ایسا کرو گے، کہا: ہاں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی، جبرائیل علیہ السلام نے آکر کہا کہ تیرا رب تجھ کو سلام کہتا ہے اور یہ فرماتا ہے کہ اگر تو چاہے تو ان کے لیے صفا سونے کا ہو جائے، لیکن اگر پھر اگر کوئی ان میں اس کے بعد کافر رہے گا تو میں اس کو ایسا عذاب دوں گا جو جہان بھر میں کسی کو نہ کیا ہوگا اور اگر تو چاہے تو میں ان کے لیے توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دوں، کہا کہ یہی توبہ اور رحمت کا دروزاہ کھول دے۔[3] (رواہ أحمد و ابن مردویه والحاکم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان اس طرح ہے کہ بعض نے کہا کہ وہ سائلین مدعی ایمان و اسلام تھے، بطورِ دعویٰ باطل کے۔ مگر یہ قول مردود ہے، اس لیے کہ حواریین مخلص لوگ اور انصارِ عیسیٰ علیہ السلام تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ أَنْصَارِيٓ

---

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٢٣٠۔ ٢٣١) [2] تفسیر الطبري (١١/ ٢٣١۔ ٢٣٢)

[3] مسند أحمد (١/ ٢٤٢) مستدرك الحاكم (١/ ١١٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٨٨)

اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾ [الصف: ١٤] ''اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں۔'' اس سے ظاہر ہوا کہ زمخشری رحمہ اللہ کا قول کے وہ مومن نہ تھے، جید نہیں ہے، بلکہ اجماع کے خلاف ہے۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں ان کے مومن ہونے میں کسی کا اختلاف یاد نہیں رکھتا۔[1] کسی نے کہا کہ اُن کا یہ سوال اطمینان کے لیے تھا، جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا: ﴿ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ﴾ [البقرة: ٢٦٠] ''اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟'' معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس طرح پڑھایا ہے: ﴿هَلْ تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ﴾[2] (أخره الحاكم و صححه والطبراني وابن مردويه)

سیدنا عبداللہ بن عباس، علی، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی تاء فوقیہ ہی سے پڑھا ہے۔ مائدہ اُس خوان کو کہتے ہیں جس پر طعام ہو، اگر کھانا نہیں ہے تو وہ مائدہ نہیں کہلائے گا، مشہور اسی طرح ہے، مگر راغب رحمہ اللہ نے کہا: مائدہ وہ طبق ہے جس پر کھانا ہو اور خود طعام کو بھی مائدہ کہتے ہیں، مگر یہ اکثر اہلِ علم کے موقف کے مخالف بات ہے۔ لغت میں اس مسئلے کی مثالیں بہت ہیں، مثلاً: خوان کو مائدہ نہ کہیں گے، مگر جب اس پر طعام ہوگا، ورنہ وہ خوان ہے۔ کأس یعنی ساغر نہیں کہیں گے، مگر جب کہ اس میں شراب ہوگی، ورنہ پیالہ ہے۔ ذنوب و سجل نہ بولیں گے، مگر جب کہ اس میں پانی ہوگا، ورنہ دَلْو ہے۔ جراب نہیں کہیں گے مگر جب مدبوغ ہو، ورنہ اہاب ہے۔ قلم نہ بولیں گے مگر جب ہی کہ وہ تراشیدہ ہے، ورنہ انبوب ہے۔

بہرحال عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کو اس سوال سے منع کیا تو انھوں نے کہا: ہم بھوکے ہیں، کھانا چاہتے ہیں یا تبرک کے لیے کھانا مانگتے ہیں نہ حاجت سے، اس میں ہمارے جی کا اطمینان ہوگا، ہم تم کو سچا جانیں گے، گواہ رہیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی، جمہور نے کہا کہ مائدہ اترا تھا، یہی حق ہے، اس دلیل سے کہ ﴿ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ﴾ (آیتِ باب)۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: نہیں اترا۔[3]

مترجم کہتا ہے کہ لفظ ﴿ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا ﴾ نزولِ مائدہ میں نصِ صریح نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ نے درخواست کو قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہو، جس طرح کہ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے،[4] مگر جب شرط پوری نہ ہوئی تو مشروط بھی پایا نہ گیا، اگرچہ جماہیرِ امت اور مشاہیرِ ائمہ کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ مائدہ اترا، لیکن قرآن مجید کے نظم سے ہر دو قول کا احتمال ہے، وہ دونوں ایک معنی میں صاف اور واشگاف نہیں، آگے اللہ جانے۔ رہی عمار رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جس

---

[1] روح المعاني (٧/ ٥٨) اس کی سند میں ''محمد بن سعید قرشی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٢٦٠) المعجم الكبير (٢٠/ ٦٩) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی'' اور ''رشدین بن سعد'' ضعیف راوی ہیں۔

[3] تفسير الطبري (١١/ ٢٣١) [4] تفسير الطبري (١١/ ٢٣١)

میں مرفوعاً نزولِ مائدہ کا ذکر ہے سو ترمذی نے کہا کہ اُس کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے۔[1] ظاہر ہے کہ موقوف حدیث مستقل دلیل نہیں۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝۱۱۶ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۱۱۷ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۱۸

اور جب اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟ تو وہ کہیں گے: تو پاک ہے، میرے لیے (جائز) نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہو تو یقیناً تو اُسے جانتا ہے۔ تو اسے بھی جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا، جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔ بے شک تو ہی سب سے بڑھ کر غیب کو جاننے والا ہے (116) میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا سوائے اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا رب ہے، اور میں ان پر نگران تھا، جب تک میں ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اُٹھا لیا، تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر نگہبان ہے (117) اگر تو انھیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بے شک تو ہی غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے (118)

مسیح علیہ السلام توحید کا اقرار اور شرک سے براءت کا اظہار کرتے ہیں:

یہ دوسرا خطاب ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو قیامت کے دن ہوگا، یہ ان لوگوں کے سامنے ہوگا جنھوں نے اُن کو اور ان کی ماں کو اللہ پاک کے علاوہ دو معبود ٹھہرایا ہوگا کہ کیا تو نے اُن سے یہ کام کرنے کو کہا تھا؟ یہ ڈانٹ دراصل نصاریٰ کو

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦١) فتح البيان (٤/ ٨٥۔ ٩٠)

ہے کہ اس گواہی کے سر پر ان کو جھڑکی اور گھڑکی دی جائے گی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے اس کے بعد والی آیت کی دلیل سے جس میں کہا ہے: ﴿ هٰذَا يَوۡمُ يَنۡفَعُ الصّٰدِقِيۡنَ صِدۡقُهُمۡ ﴾ [المائدۃ: ۱۱۹] ''یہ ایسا دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا۔'' امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ خطاب اور جواب دنیا میں ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کی تصویب کی ہے (اس کو درست کہا ہے)۔ کہا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے، تب یہ سوال جواب ہوا تھا، اس دلیل سے کہ یہ کلام بلفظ ماضی ہے۔

دوسرے فرمایا ہے: ﴿ اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ ﴾ ﴿ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ ﴾ [1] ''اگر تو ان کو سزا دے''، اگر ''تو ان کو معاف فرما دے۔'' لیکن ان دونوں دلیلوں میں نظر ہے، اس لیے کہ قیامت کے بہت سے امور کو ماضی کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، تاکہ وہ اس امر کے واقع ہونے اور ثبوت پر دلیل ہوں۔ ﴿ اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ ﴾ کے معنی اُن سے تبری کرنا ہے اور مشیت کو اللہ کی طرف لوٹانا ہے، سو اس کا کسی شرط کے ساتھ مشروط کرنا مقتضی نہیں کہ وہ امر ضرور واقع ہو، جس طرح آیات کی دوسری مثالوں میں ہے۔ زیادہ واضح وہی قتادہ کا قول ہے۔ واللہ أعلم

یہ معاملہ قیامت کے دن ہوگا اور سب کے سامنے نصاریٰ کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے ہوگا۔ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا، انبیا کو ان کی امتوں کے ساتھ بلایا جائے گا... الحدیث۔ یہ حدیث زیرِ آیتِ کریمہ: ﴿ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ اذۡكُرۡ نِعۡمَتِيۡ ﴾ [المائدۃ: ۱۱۰] ''اے عیسیٰ ابن مریم! تو میری نعمت یاد کر'' گزر چکی ہے۔ اس کو ابن عساکر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ''هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ عَزِيزٌ'' [2] عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کا مجھے حق نہیں، کامل جواب میں ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہے۔ جس طرح ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو ایسی حجت سمجھا دے گا، وہ یہ بات کہیں گے۔ [3] (رواہ ابن أبي حاتم مرفوعا ورواہ الثوري بنحوہ عن طاؤس)

پھر عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ اگر یہ بات مجھ سے صادر ہوئی ہے تو اے رب! تجھ کو معلوم ہوگی، اس لیے کہ تجھ پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہوگا، یا ارادہ کیا ہوگا تو جانتا ہے، میں نے تو اُن سے یہی بات کہی تھی کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا رب ہے۔ ''أَيْ هَذَا هُوَ الَّذِيْ قُلْتُ لَهُمْ'' ''یہی بات ہے جو میں نے اُن سے کہی تھی۔'' میں جب تک ان میں موجود تھا، ان کے اعمال کا شاہد تھا، جب تو نے مجھ کو پورا پورا اٹھا لیا تو پھر تو ہی ان کے اعمال کا رقیب اور شاہد ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۲۳٤۔ ۲۳٦) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر سورۃ المائدہ [آیت نمبر: ۱۱۰] میں گزر چکی ہے۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۰٦۲) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۲۵۳) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲٤۵٤)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر ہم کو وعظ سنایا، کہا: اے لوگو! تم اللہ کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے، ننگے پاؤں، ننگے بدن، بے ختنہ، جس طرح ہم نے پہلی بار پیدا کیا تھا، اسی طرح پھر اعادہ کریں گے، مخلوق میں سب سے پہلے جسے کپڑا پہنایا جائے گا، وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ سن رکھو! قیامت کے دن میری امت کے کچھ لوگ لائے جائیں گے، ان کو بائیں طرف لے جائیں گے، میں کہوں گا: یہ تو میرے اصحاب ہیں، کہا جائے گا: تو نہیں جانتا کہ انھوں نے تیرے بعد کیا کچھ احداث کیا، یعنی بدعتی ہو گئے۔ اس وقت میں وہی بات کہوں گا جو بندۂ صالح نے کہی ہے: ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ إلی قوله الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (آیتِ باب) تب کہا جائے گا: "لَمْ يَزَالُوْا مُرْتَدِّيْنَ عَلٰى أَعْقَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ"[1] (رواہ البخاري) "وہ ہمیشہ اپنی ایڑیوں پر پھر جاتے رہے، جب سے تو ان سے الگ جدا ہوا۔"

اس کہنے میں کہ اگر تو ان کو عذاب کرے گا تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخشے گا تو تو عزیز حکیم ہے، اللہ کی مرضی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جو ارادہ کرے، اُس کو کر گزرنے والا ہے۔ اُس سے کون پوچھے، البتہ اُن سے پوچھا جائے گا۔ اس کلام میں نصاریٰ پر تبریٰ (سخت سست کہنا) ہے، جنھوں نے اللہ اور رسول پر جھوٹ باندھا، اللہ کے ہمسر ٹھہرایا، اللہ کے جورو اور بچے مقرر کیے۔ تَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا.

اس آیتِ شریفہ کی ایک بڑی شان اور عجیب خبر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک رات نبی اکرم ﷺ اس کو صبح تک بار بار پڑھتے رہے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک رات نبی اکرم ﷺ نے نماز پڑھی، صبح تک یہی آیت پڑھا کیے، اسی آیت پر رکوع اور سجدہ کرتے رہے، وہ آیت یہ تھی: ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (آیتِ باب) جب صبح ہوئی تو میں نے کہا: اے اللہ کے نبی! آپ صبح تک یہی آیت دہراتے رہے، اس آیت پر رکوع اور سجدہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب عزوجل سے اپنی امت کے لیے شفاعت مانگی، مجھ کو عطا کی گئی۔ یہ شفاعت اس کو پہنچنے والی ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔[2] (رواہ أحمد)

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ایک شب نبی اکرم ﷺ نے نمازِ عشا میں قیام کیا، لوگوں کو نماز پڑھائی، پھر چلے گئے، جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ ابھی مسجد ہی میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو آپ ﷺ اپنے گھر میں گئے، پھر جب دیکھا کہ سب لوگ چلے گئے اور جگہ خالی کر گئے ہیں تو اسی جگہ آئے، نماز پڑھی، میں آپ ﷺ کے پیچھے کھڑا ہو گیا، مجھے داہنے ہاتھ سے اشارہ کیا، میں داہنی طرف کھڑا ہو گیا، پھر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آئے، وہ میرے اور نبی اکرم ﷺ کے پیچھے کھڑے ہوئے، ان کو بائیں طرف اشارہ کیا، وہ بائیں طرف کھڑے ہو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٩)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (١٠١٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٥٠) مسند أحمد (٥/ ١٤٩) مستدرك الحاكم (١/ ٣٦٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

گئے، ہم تینوں اپنی اپنی نماز پڑھتے جتنا اللہ نے چاہا، قرآن کی تلاوت کرتے۔ نبی اکرم ﷺ ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے رہے، یہاں تک کہ صبح کی نماز پڑھی، جب صبح ہوئی تو ہم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا کہ تم اس کام کا مطلب پوچھو جو آپ ﷺ نے آج کی رات کیا ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ سے نہیں پوچھوں گا، وہی اگر چاہیں تو مجھ سے کہیں۔ آخر میں نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر فدا ہوں، آپ ﷺ ایک ہی آیت پڑھا کیے، حالانکہ آپ ﷺ کے پاس قرآن تھا، اگر ہم میں کوئی ایسا کام کرتا تو ہم اس پر غصہ کرتے، فرمایا: میں نے اپنی امت کے لیے دعا کی، میں نے کہا: پھر کیا جواب ملا؟ وہ دعا قبول ہوئی؟ فرمایا کہ ایسا جواب ملا کہ اگر بہت سے لوگوں کو اس کا پتا چل جائے تو نماز چھوڑ دیں۔ میں نے کہا: بھلا میں لوگوں کو بشارت نہ دوں، فرمایا: ہاں، میں تھوڑی دور گیا تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اگر لوگوں کو یہ بات کہلا بھیجیں گے تو وہ عبادت سے باز رہیں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے پکار کر فرمایا: لوٹ آ! میں لوٹ آیا، وہ آیت یہ تھی: ﴿اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ... الخ﴾[1] (رواه أحمد)

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے عیسیٰ علیہ السلام کا قول ﴿اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ... الخ﴾ پڑھا، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا: «اَللّٰهُمَّ أُمَّتِيْ» "اے اللہ! میری امت" اور روئے، اللہ نے کہا کہ اے جبرائیل! محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور تیرا رب دانا تر ہے، پوچھو: کیوں روتے ہو؟ جبرائیل علیہ السلام نے آ کر پوچھا، نبی اکرم ﷺ نے صورتِ حال بتلائی۔ اللہ نے فرمایا: اے جبرائیل! تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور کہو: "إِنَّا سَنُرْضِيْكَ فِيْ أُمَّتِكَ وَلَا نُسِيْئُكَ" (رواه ابن أبي حاتم) یعنی ہم تم کو تمھاری امت کے بارے میں خوش کر دیں گے، ناخوش نہیں کریں گے۔[2]

حذیفہ الیمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ ہم سے غائب ہو گئے، باہر نہ آئے، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آج نہ نکلیں گے، جب باہر آئے، ایک بڑا لمبا سجدہ کیا، جس سے ہم کو یہ گمان ہوا کہ شاید انتقال فرما گئے ہیں، پھر سر اٹھا کر کہا کہ اللہ عزوجل نے مجھ سے میری امت کے بارے میں مشورہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ میں کیا کروں، میں نے کہا: اے رب! جو تو چاہے کر وہ تیری خلق اور بندے ہیں، پھر دوبارہ مشورہ کیا، میں نے پھر وہی کہا، پھر فرمایا: "لَا أُحْزِنُكَ فِيْ أُمَّتِكَ يَا مُحَمَّدُ" "اے محمد! میں تجھ کو تیری امت کے بارے میں رنجیدہ نہ کروں گا" اور مجھ کو بشارت دی کہ سب سے پہلے جو جنت میں داخل ہوں گے وہ میری امت سے ستر ہزار ہیں، ہر ہزار کے ہمراہ ستر ہزار ہوں گے، اُن کا کچھ حساب و کتاب نہ ہوگا۔ پھر میرے پاس پیغام بھیجا کہ تو دعا کر قبول ہوگی، مانگ دیا جائے گا۔ میں نے قاصد سے کہا کہ کیا میرا رب مجھ کو سوال عطا کر دے گا؟ اُس نے کہا کہ مجھ کو تیرے پاس اسی لیے بھیجا ہے کہ تجھ کو دے۔ بے شک دیا مجھ کو میرے رب نے اور اُس کا کچھ فخر نہیں ہے اور بخش دیے مجھ کو میرے اگلے پچھلے گناہ۔ میں چلتا ہوں، زندہ صحیح سلامت، مجھ کو یہ دیا کہ میری امت بھوکی نہ رہے اور مغلوب نہ ہو، مجھ کو کوثر عطا کی، وہ

---

[1] مسند أحمد (٥/ ١٧٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو منکر کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، برقم (٦٠٣٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٥٤_ ١٢٥٥)

ایک نہر ہے، جنت میں جو میرے حوض میں بہتی ہے، مجھ کو عظمت، عزت اور نصرت دی جو میری امت کے آگے ایک ماہ کے رستے تک دوڑتا ہے، اور مجھ کو یہ بات دی کہ میں جنت میں تمام انبیا سے پہلے داخل ہوں گا اور میرے لیے اور میری امت کے لیے غنیمتیں حلال کر دیں اور ہمارے لیے وہ کچھ جائز کر دیا جو پہلی امتوں پر جائز نہیں تھا (یعنی ان پر سختی کی گئی تھی) اور ہم پر دین میں کچھ تنگی نہیں رکھی۔[1] (رواہ أحمد)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جمہور مفسرین کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کا عیسیٰ علیہ السلام سے یہ ارشاد قیامت کے دن ہوگا۔ اس میں نکتہ مسیح اور مریم علیہما السلام کی عبادت کرنے والی نصاریٰ کی قوم کو جھڑکنا ہے۔ امام سدی و قطرب رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے فرمائی تھی، جب کہ نصاریٰ نے ان کو معبود کہا تھا، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔[2] یا یہ کہنا اس لیے ہے کہ مسیح علیہ السلام کو جتلا دیا جائے کہ ان کی قوم نے ان کے بعد دین کو بدل ڈالا، ان کی طرف وہ بات منسوب کی جو انھوں نے نہیں کہی تھی، مسیح علیہ السلام اس بات سے اللہ کی پاکیزگی اور تقدیس کر کے ان لوگوں کے قول و فعل سے اپنی بے خبری ظاہر کریں گے اور کہیں گے: بھلا میں ایسی بات کہہ سکتا ہوں جو مجھ کو کہنا سزاوار نہیں! یہ انتہا درجے کا ادب اور اپنی مسکینی کا اظہار ہے، اللہ کی عظمت کے لیے اور معاملے کو اللہ کے علم کے سپرد کرنا ہے۔ اس بات میں لفظ نفس ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کہتے ہیں: پہلے وفات دی پھر ان کو اوپر اٹھایا۔

یہ قول کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ اس بارے میں خبریں مختلف ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں، بلکہ آسمان میں اسی حیاتِ دنیوی پر باقی ہیں، آخر زمانے میں پھر زمین پر آئیں گے، بلکہ ﴿ تَوَفَّيْتَنِیْ ﴾ سے مراد پوری طرح اٹھا لینا ہے۔ لفظِ وفات قرآن پاک میں تین معنوں پر آیا ہے: ایک موت جیسے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ [الزمر: ٤٢] "اللہ ہی موت کے وقت جانیں قبض کرتا ہے۔" دوسرے خواب، یعنی نیند، جیسے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ [الأنعام: ٦٠] "اور وہی ہے (اللہ) جو رات کو تمھیں فوت کرتا ہے۔" تیسرے جیسے: ﴿ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ ﴾ (آیتِ باب) اور ﴿ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ ﴾ [آل عمران: ٥٥] "جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے پورا لے لوں گا۔"

"توفی" کا استعمال کسی شے کے کامل وافی لینے میں آتا ہے۔ رقیب کے معنی ہیں: حافظ۔ شہید کے معنی ہیں: شاہد، یعنی حاضر۔ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ چاہے تو ان کو عذاب کرے کہ وہ تیرے بندے ہیں اور چاہے تو بخش دے، بطورِ مہربانی چاہنے کے ہے، جس طرح کوئی غلام اپنے مالک کی خوشامد کرتا ہے، اسی لیے یوں نہیں کہا کہ اگر تو ان کو عذاب کرے تو وہ تیرے گناہ گار ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ کہنا اللہ کے حکم کو تسلیم کرنے اور اطاعت کرنے کے طریق

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٣٩٣) [2] فتح القدير (٢/ ١٣٤)

سے ہے۔ اسی لیے غفور و رحیم کے لفظ کو چھوڑ کر لفظ عزیز و حکیم کو اختیار کیا ہے۔

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی تیرے بندے اپنے قول میں عذاب کے مستحق ہیں اور اگر تو ان کو چھوڑ دے اور میری عمر دراز کرے کہ میں آسمان سے زمین پر دجال کو قتل کرنے کے لیے آؤں تو وہ اس قول سے زائل ہو کر تیری توحید کو تسلیم کریں گے، کیوں کہ تو عزیز و حکیم ہے۔[1] لیکن معلوم نہیں کہ اس تفسیر کا ماخذ کیا ہے، اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کو اب تک اٹھارہ سو چھیاسی برس ہو چکے ہیں، اس مدتِ دراز میں کروڑوں نصرانی اسی بات پر گزر گئے اور معلوم نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول کتنی مدت کے بعد ہوگا۔ نزول کے بعد اگر اس زمانے کے موجود لوگوں نے توحید اختیار کی اور مسلمان ہو گئے تو وہ غائبین کی بنسبت غالباً بہت تھوڑے ہوں گے، ان کی توحید اگلوں کے کام نہ آئے گی، تو اس مہلت دینے اور دیر کرنے کا کچھ فائدہ ظاہر نہیں ہوا۔ اس لیے پہلے معنی کے بطور مہربانی کے وہ الفاظ کہے تھے یا معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا زیادہ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تیری عادت ہی سہی

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

اللہ فرمائے گا: یہ ایسا دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا، ان کے لیے ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے (119) آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے (120)

روزِ قیامت صرف سچ کام آئے گا:

اللہ پاک عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے جواب مذکور کے بعد یہ جواب دے گا، کیوں کہ وہ نصاریٰ سے بیزاری کا اظہار کر چکے۔ ملحدین اور کذابین سے الگ تھلگ ہو کر ان کو اللہ کی مشیت پر چھوڑ دیا جو سچی بات تھی وہ کہہ دی، یہ سچ بولنا

[1] الدر المنثور (۳/ ۲۴۱) فتح البیان (۴/ ۹۰۔ ۹۳)

کام آیا۔ اسی طرح سب سچوں کے کام آئے گا، ان شاء اللہ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی موحدوں کو توحید نفع دے گی،[1] وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے، انھیں وہاں سے نکالا نہیں جائے گا اور نہ ہی نعمتوں کا زوال ہوگا۔ اللہ اُن سے خوش اور وہ اللہ سے خوش، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [التوبة: ٧٢] ''اور اللہ کی رضا مندی سب سے بڑھ کر (نعمت) ہوگی۔'' سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت میں فرمایا کہ اللہ جل جلالہ ان کے لیے تجلی فرمائے گا اور کہے گا: ''سَلُوْنِيْ سَلُوْنِيْ'' یعنی مجھ سے مانگو میں تم کو دوں گا۔ وہ اللہ کی رضا مانگیں گے اور وہ ان کو گواہ کرلے گا کہ میں تم سے راضی ہوا۔[2]

یہ وہ بڑی کامیابی ہے کہ جس سے بڑھ کر کچھ نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴾ [الصافات: ٦١] ''عمل کرنے والوں کو تو ایسی ہی (کامیابی) کے لیے عمل کرنے چاہییں۔'' اور جیسے فرمایا: ﴿ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ ﴾ [المطففين: ٢٦] ''لہٰذا شائقین کو اسی کا شوق کرنا چاہیے۔'' پھر فرمایا کہ اُن پر قادر وہی ہے جو ساری اشیا کا خالق، مالک اور متصرف ہے۔ سب اسی کی ملک ہیں اور اسی کے قہر اور مشیت کے تابع ہیں۔ نہ اُس کا کوئی وزیر ہے نہ نظیر اور نہ عدیل، نہ اس کا باپ نہ اولاد نہ بی بی نہ کوئی اس کے سوا کوئی معبود ہے اور نہ کوئی رب۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سب سے آخر میں جو سورت اتری وہ سورت مائدہ ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ صادقین سے مراد نبی اور مومن ہیں، اس لیے کہ کافروں کو ان کا سچ بولنا قیامت کے دن کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اسی طرح ابلیس کو ''صَدَّقَ إِبْلِيْسُ'' ''ابلیس نے سچ کہا'' اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے پیشِ نظر: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ ﴾ [إبراهيم: ٢٢] ''بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا'' اس لیے کہ وہ دنیا میں جو دار العمل تھا، جھوٹ بولا تھا، آیت میں اشارہ فرمایا ہے، دائمی ثواب کی طرف جو منقطع اور ختم ہونے والا نہیں ہے جو انھیں حاصل ہوگا۔

اے اللہ! میرا بھی حشر سچوں کی تصدیق کرنے والوں کے ساتھ کر اور مجھے سچائی اور راست بازی کی توفیق عطا فرما۔ ''اَللّٰهُمَّ أَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ، وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِيْنَ'' اللہ ان سے راضی ہوا کہ انھوں نے کفر و بدعت اور ضلالت کو چھوڑ کر خالص اطاعتِ الٰہی کو اختیار کیا، وہ اللہ سے راضی ہوئے کہ اُن کو وہ چیز دی جس کا خیال تک ان کے دل پر نہ گزرتا تھا نہ ہی ان کی عقل اس کا تصور کر سکتی تھی۔ اللہ پاک کا راضی ہونا نعمتوں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٥٦) اس کی سند میں ''یحییٰ بن ابی روق'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٥٦۔ ١٢٥٧) اس کی سند میں ''عثمان بن عمیر'' اور ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہیں۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦٣) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

کا بلند ترین درجہ ہے اور عزت کا اعلیٰ مقام ہے۔

رضا اللہ کا ایک بڑا دروازہ ہے جو عبادت گزار لوگوں کی راحت کا سبب ہے۔ یہ جنت میں داخلہ، یہ اس میں ہمیشہ رہنا اور یہ رضائے الٰہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ جنت حاصل کرنے والے آگ سے نجات پا گئے، فوز کامیاب ہونے کو کہتے ہیں۔ بات کو مکمل کرنے کے لیے فرمایا: آسمان و زمین کا مالک صرف وہی اللہ ہے۔ یہ ملکیت نہ عیسیٰ کی ہے نہ اُس کی ماں کی اور نہ باقی تمام مخلوقات کی ہے۔

سورت کا ان الفاظ پر خاتمہ کرنا حق کا اظہار اور اقرار کرنے کے لیے اور نصاریٰ کے جھوٹ سے آگاہ کرنے کے لیے اور مسیح اور اس کی ماں کی الوہیت کے تصور کو مٹانے کے لیے ارشاد ہوا ہے یا یہ معنی ہیں کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں موجود ہے، یعنی عقلا وغیرہم ان میں متصرف اکیلا اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے، چاہے وہ کوئی چیز ایجاد کرے یا اس کو بالکل ختم اور فنا کر دے، مارے یا زندہ کرے، وہ امر کرے یا نہی کرے، کیا مجال ہے کہ ان اشیا سے کسی کو کچھ بھی دخل و تصرف ہو، کسی معاملے میں۔ فرماں برداروں کو جنت بخشنا اسی کا کام ہے نہ کہ کسی اور کا۔ "جَعَلَنَا اللّٰهُ تَعَالیٰ مِنهُمْ" "اللہ تعالیٰ تو ہمیں بھی ان سے کر دے" آمین۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ کسی چیز کو روکنا ہو یا عطا کرنا۔ ایجاد کرنا ہو یا فنا کرنا۔ "نَسْأَلُ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ أَنْ يُّوَفِّقَنَا لِمَرْضَاتِهٖ، وَيَجْعَلَنَا مِنَ الْفَآئِزِيْنَ بِجَنَّاتِهٖ" "ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی رضا مندی کے کام کرنے کی توفیق دے اور ہمیں اپنی جنتوں پر فائز کر دے۔"[1]

آج بروز جمعرات ۱۵ر شعبان ۱۳۰۳ھ کو اس سورتِ مبارکہ کی تفسیر صبح آٹھ بجے تمام ہوئی، جس اللہ کریم کی نعمت سے تمام اعمالِ صالحات تمام ہوتے ہیں، اسی کے لیے پورے جہان کی حمد و ثنا ہے۔ بروز ہفتہ مورخہ ۱۲ رجب سنہ مذکور اس سورت کی تفسیر کا لکھنا شروع کیا تھا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَشَفِيعِ الْأُمَّةِ، وَعلیٰ آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَصُلَحَاءِ أُمَّتِهٖ أَصْحَابِ النَّعِيمِ وَالْجَنَّةِ!

---

[1] فتح البیان (٤/ ٩٣۔ ٩٤)

سورة الانعام

سورت انعام کی فضیلت و زمانۂ نزول:

یہ سورت مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکے میں رات کو ایک بار میں اتری۔ اس کے اردگرد ستر ہزار فرشتے تسبیح کرتے تھے۔[1] اسما بنت یزید رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ سورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر راہ چلتے ملائکہ کے ایک جمگھٹ کے درمیان، جو آسمان و زمین کے درمیان تھا، نازل ہوئی۔[2] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ تھے۔[3] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب سورت انعام اتری تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ کہا اور فرمایا: اس سورت کے ساتھ ستر ہزار فرشتے آئے، جنھوں نے افق کو بھر لیا۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث شرطِ مسلم پر صحیح ہے۔[4]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جب یہ سورت آئی، اس کے ساتھ فرشتوں کا ایک سوار دستہ تھا، یعنی فرشتوں کی ایک بڑی جماعت تھی، جنھوں نے مشرق و مغرب یا شمال و جنوب کی درمیانی جگہ کو پُر کر دیا، ان کی تسبیح کا شور تھا، جس سے زمین گونج اٹھی تھی، وہ کہتے تھے: "سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ"[5] "پاک ہے اللہ اور عظمت والا ہے، پاک ہے اللہ اور عظمت والا ہے۔" (رواہ ابن مردویہ) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «نَزَلَتْ عَلَيَّ سُوْرَةُ الْأَنْعَامِ جُمْلَةً وَّاحِدَةً، وَّشَيَّعَهَا سَبْعُوْنَ أَلْفًا مِنَ الْمَلَائِكَةِ، لَهُمْ زَجَلٌ بِالتَّسْبِيْحِ وَالتَّحْمِيْدِ»[6] "مجھ پر سورت انعام ایک ہی دفعہ نازل ہوئی اور اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے بھی آئے، ان کی تسبیح اور حمد سے زمین گونج اٹھی۔" (رواہ ابن مردویہ)

فتح البیان میں ہے کہ اس سورت میں ایک سو پانچ یا چھے آیتیں ہیں، امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری سورت

---

[1] المعجم الکبیر (۱۲/ ۲۱۵) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۶۹) اس کی سند میں "لیث بن ابی سلیم" ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۶۹)
[4] مستدرك الحاكم (۲/ ۳۴٤)
[5] المعجم الأوسط (٦/ ۲۹۲) اس کی سند میں "احمد بن محمد سالمی" غیر معروف راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٦٢٧)
[6] المعجم الصغير (۱/ ۱٤٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه يوسف بن عطية الصفار وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۷/ ۸٦)

مکی ہے، مگر چھے آیتیں مدینے میں اتری ہیں: وہ یہ ہیں: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ ﴾ [الأنعام: ۹۱] سے لے کر تین آیات کے آخر تک اور ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ﴾ [الأنعام: ۱۵۱] سے لے کر آخر آیت تک۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی آیات محکمات ہیں، یعنی اس سورت میں۔ [1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو ہی آیتیں مدنی ہیں، باقی مکی۔ ایک ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ ﴾ [الأنعام: ۹۱] یہ مالک بن صیف اور کعب بن اشرف یہودی کے حق میں اتری اور دوسری ﴿ وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ ﴾ [الأنعام: ۱٤۱] یہ ثابت بن قیس کے بارے میں اتری۔ [2]

اس سورت کے فضائل میں تابعین کی ایک جماعت سے مرفوعہ اور غیر مرفوعہ روایات آئی ہیں، علما نے کہا ہے کہ یہ سورت اصل میں مشرکین وغیرہ اور مبتدعین، جو دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کے منکرین ہیں، ان کے ساتھ جھگڑے کے متعلق ہے۔ اس کے ایک ہی بار میں اترنے کی یہی وجہ ہے کہ ایک معنی حجت میں آئی ہے، اگرچہ بہت سی وجوہ سے اس میں تصرف ہو۔ متکلمین نے اصولِ دین کی بنیاد اسی سورت پر رکھی ہے۔ [3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ١ؕ۬ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ۠۝۱ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا١ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ۝۲ وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ١ؕ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ۝۳

تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا، پھر جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اپنے رب کے ساتھ (اوروں کو) برابر ٹھہراتے ہیں ① وہی اللہ ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اس نے (تمھارے لیے) ایک وقت مقرر کیا اور اس کے ہاں (قیامت کا) ایک مقرر وقت بھی ہے، پھر بھی تم شک کرتے ہو ② اور وہی اللہ ہے آسمانوں اور زمین میں وہ تمھاری چھپی اور ظاہر (سب) باتیں جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کماتے (یا کرتے) ہو ③

اللہ کی جلالتِ قدر و بلند شان اور ہر چیز کا خالق ہونا:

اندھیرا اور اجالا یہی رات دن ہے اور اشارے میں غلط راہ کو اندھیرا کہے اور صحیح راہ کو اجالا، سو یہ صحیح راستہ صرف ایک ہے اور اس کے سوا سب غلط ہیں اور وہ بہت ہیں۔ وعدے سے مراد فنا کا وقت ہے، سو ہر شخص کی ایک

[1] فتح القدير (۲/ ۱۳۷) [2] تفسير القرطبي (٦/ ۳۸۲) [3] فتح البيان (٤/ ٩٥)

اجل ہے، وہ نہیں جانتا، مگر فرشتے جانتے ہیں اور سب مخلوق کی ایک اجل ہے، جس کو کوئی نہیں جانتا۔ اس اجل سے قیاس کرے اُس اجل کو اور شک نہ کرے۔ اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ میں اپنے نفسِ کریم کی تعریف وحمد فرمائی ہے کہ ہم نے آسمان اور زمین کو بندوں کی قرار گاہ بنایا ہے، ان کے نفع کے لیے تاریکی اور روشنی بنائی، یعنی رات دن مقرر کیا۔ اندھیروں کو جمع کے لفظ کے ساتھ اور نور کو واحد کے لفظ کے ساتھ اظہار فرمایا، اس لیے کہ نور اشرف ہے، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴾ [المعارج: ٣٧] ''دائیں سے اور بائیں سے گروہ کے گروہ۔'' یا جس طرح اس سورت کے آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٥٣] ''اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو، اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔''

پھر فرمایا: اس کے ساتھ بعض گندے بندے کفر کرتے ہیں، اللہ کا شریک اور برابر ٹھہراتے ہیں، اس کے لیے جورُو بناتے ہیں، ''تَعَالٰی عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا'' ''اللہ تعالیٰ اس سے بہت ہی بلند اور بڑا ہے۔'' آدم کو، جو تمام بنی آدم کا اصل ہیں، مٹی سے بنایا، ان کی تمام نسل زمین کے چاروں طرف پھیل گئی۔ اجل سے مراد موت ہے۔ ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ سے مراد آخرت ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ، ضحاک، زید بن اسلم، عطیہ، سدی اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔[1]

امام حسن رحمہ اللہ کی ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ اجل سے مراد پیدا ہونے سے مرنے تک کا وقت ہے۔ ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ سے مراد اٹھنے تک کا زمانہ ہے۔[2] اس قول کا مرجع وہی قول ہے جو پہلے گزر چکا ہے، یعنی تقدیرِ اجلِ خاص کہ ہر انسان کی عمر ہے اور تقدیرِ اجلِ عام کہ دنیا کی عمر ہے۔ سو ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ انتہائے دنیا اور اس کی مدت کا پورا ہونا اور ختم ہونا اور آخرت کی طرف چلنا ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما و امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ قَضٰۤى اَجَلًا ﴾ سے مراد دنیا کی مدت ہے۔

﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ سے مراد انسان کی عمر ہے، اس کے مرنے تک۔ گویا یہ بعد والی آیت سے ماخوذ ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ﴾ [الأنعام: ٦٠] ''اور وہی ہے (اللہ) جو رات کو تمھیں فوت کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو۔''[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ قضائے اجل سے مراد نیند ہے، خواب میں روح قبض کر لی جاتی ہے، پھر جاگنے کے وقت دوبارہ آ جاتی ہے۔ اجل مسمیٰ سے مراد آدمی کا مرنا ہے۔[4] یہ قول غریب ہے۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٦١) [2] تفسیر الطبري (١١/ ٢٥٦) [3] تفسیر الطبري (١١/ ٢٥٨) تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٧٠)
[4] تفسیر الطبري (١١/ ٢٥٨۔ ٢٥٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٦١) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

﴿عِنْدَهٗ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی اس کو نہیں جانتا، نہ انبیا، نہ ملائکہ اور نہ اولیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الأعراف: ١٨٧] ''اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اسے اس کے وقت ہی پر ظاہر کرے گا۔'' اور اس کے فرمان کے مطابق کہ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا﴾ [النازعات: ٤٢۔ ٤٤] ''(اے نبی!) کافر آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب واقع ہوگی؟ آپ کو اس کے بیان کرنے سے کیا غرض؟ اس (کے علم) کی انتہا تو آپ کے رب ہی کے پاس ہے۔'' امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تم شک کرتے ہو، قیامت کے معاملے میں۔[1] جہمیہ اولین نے کہا تھا کہ اللہ ہر مکان میں ہے، ان کی دلیل یہی آیتِ باب تھی۔ مفسرین نے اس قول کا انکار کیا۔

انھوں نے بالاتفاق یہ کہا کہ سب سے صحیح یہ قول ہے کہ سب آسمانوں اور زمینوں میں جس کو پکارا جاتا ہے، وہ وہی اللہ ہے، یعنی زمین اور آسمانوں والے اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی کو پکارتے ہیں اور اسی کی توحید اور الوہیت کا اقرار کرتے ہیں، سب اس کو اللہ کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں، اسی کو خوشی اور ڈر سے پکارتے ہیں، سوائے کافر جنوں اور انسانوں کے۔ اس قول پر یہ آیت اس آیت شریفہ کی طرح ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ [الزخرف: ٨٤] ''اور وہی (اللہ) آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔'' یہ بات کوئی نہ سمجھے کہ آسمانوں کا معبود جدا اور زمین کا معبود جدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو آسمان و زمین میں فساد برپا ہو جاتا۔ ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبياء: ٢٢] ''اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ضرور یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔''

اس بنیاد پر یہ قول ﴿يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ﴾ (آیتِ باب) خبر یا حال ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ اللہ وہی ہے جو آسمان و زمین کے کھلے اور چھپے حال کو جانتا ہے۔ اس صورت میں لفظ ﴿يَعْلَمُ﴾ کا تعلق ﴿فِي السَّمٰوٰتِ ... الخ﴾ سے ہوگا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ﴾ پر وقف تام ہے اور ﴿وَفِي الْاَرْضِ﴾ سے دوسرا کلام شروع ہوا، اس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2] ﴿مَا تَكْسِبُوْنَ﴾ سے مراد سارے اعمالِ خیر و شر ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ اس بات پر دلیل ہے کہ سارے حمد اللہ ہی کو ہیں، گو کوئی اس کی حمد نہ کرے۔ اس میں لفظ اور معنی کی تعلیم ہے اور اللہ کی بے پروائی کی طرف متوجہ کرنا ہے اور ان پر حجت قائم کرنا ہے کہ کسی کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں، کیونکہ جس کو یہ قدرت ہے کہ اُس نے آسمان اور زمین کو ایجاد کیا اور پہلی دفعہ بنایا

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٢٦٠) [2] تفسیر الطبري (١١/ ٢٦١)

ہے، وہی تمام تعریفوں کا مستحق ہے اور اس لائق ہے کہ اس اکیلے کی حمد وثنا کی جائے نہ کہ کوئی اور۔

لفظ ﴿ اَلسَّمٰوٰتِ ﴾ کو جمع استعمال کیا، اس لیے کہ اس کے کئی طبق ہیں، ایک کے اوپر دوسرا۔ زمین سے پہلے ذکر کیا، اس لیے کہ آسمان کی بزرگی زیادہ ہے، وہ ملائکہ کی عبادت گاہ ہے، ان میں کوئی نافرمانی نہیں ہوتی، اگرچہ زمین بھی جمہور کے نزدیک سات طبق ہے، لیکن ایک پر دوسرا نہیں، بلکہ ایک لخت ہے، لوگوں کی نظروں میں ملی جلی ہے۔ آسمان و زمین سے بڑھ کر کوئی مخلوق نہیں ہے، اس لیے ان دونوں کا ذکر کیا۔ آسمان بغیر ستون کے کھڑا ہے، اس میں منافع اور عبرت کی چیزیں ہیں۔ زمین مخلوقات کا مسکن ہے، اس میں بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

کعب احبار نے کہا ہے کہ یہ آیت تورات کی پہلی آیت ہے اور اس کی آخری آیت یہ ہے: ﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۱۱] ''اور کہہ دیجیے: ساری حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے (اپنے لیے) کوئی اولاد نہیں بنائی۔'' ایک روایت اس طرح ہے کہ وہ سورت ہود کا آخری حصہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے خلق کو حمد سے شروع کیا اور حمد پر ختم فرمایا: ﴿ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الزمر: ۷۵] ''اور ان (لوگوں) کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا: سب تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔''[1]

پہلے اللہ پاک نے جواہر کا ذکر کیا، یعنی آسمانوں اور زمین کا پھر اعراض کا، یعنی ظلمات اور نور کا، کیونکہ جواہر اعراض سے بے نیاز نہیں ہوتے۔ کسی نے کہا: مراد رات کا اندھیرا اور دن کی روشنی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: مراد کفر اور ایمان ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ ظاہر سے خروج ہے۔[3] کسی نے کہا: مراد جہالت اور علم ہے۔ کسی نے کہا: جنت اور آگ ہے۔ ٹھیک بات یہ ہے کہ جس کو ظلمت اور نور بولیں وہ سب ان میں داخل ہیں۔

اس صوت میں ظلمت کفر اور نور ایمان میں بھی داخل رہے گا۔ ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ ﴾ [الأنعام: ۱۲۲] ''کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا، اور ہم نے اس کے لیے نور بنا دیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے، (کیا) وہ اس شخص جیسا (ہو سکتا) ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے۔''

نور کا لفظ ایک جنس ہے جو سب قسموں کو شامل ہے۔ ظلمات کے اسباب بہت ہیں اور اس کی قسمیں بے شمار، جیسے: ظلمتِ شب، ظلمتِ دریا اور ظلمتِ جائے تاریک۔ ہر جگہ کی ظلمت دوسری ظلمت کے خلاف ہے۔ نور ایک ہی رنگ پر ہے۔ ظلمات کو نور سے پہلے اس لیے ذکر کیا ہے کہ اصل ظلمت ہے، نور اُس پر ڈالا گیا ہے۔ اسی لیے دن رات سے نکلا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت زنادقہ کے بارے میں آئی ہے، جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ظلمت و خنافس

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۲۵۲) تفسیر البغوي (۳/ ۱۲۵) [2] تفسیر الطبري (۱۱/ ۲۵۰) [3] فتح القدیر (۲/ ۱۳۹)

(گوبر کا کیڑا) وعقارب (بچھو) اور کسی قبیح چیز کو پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ تو خالقِ نور ہے اور ہر شے حسن ہے۔[1] اس آیت میں ثنویہ کا رد بھی ہے، جو ظلمت اور نور کو قدیم بتلاتے ہیں، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ اللہ نے خلق کو اندھیرے میں بنایا، پھر اُس پر اپنا نور ڈالا، جس کو وہ نور پہنچا، اس نے ہدایت پائی اور جو کوئی چوک گیا وہ گمراہ رہا۔[2]

(رواه البغوي بغير سند)

لفظ ﴿ ثُمَّ ﴾ استبعاد (دوری چاہنا) کے لیے ہے، یعنی نہایت بعید ہے کہ جو خالقِ ارض وسما ہو اور اندھیروں اور نور کو ظاہر کرنے والا ہو وہ تو اس لائق ہے کہ اُس کی تعریف اور ثنا کی جائے، اسی پر ایمان لایا جائے نہ کہ اس لائق ہے کہ اُس کے ساتھ کفر کریں، کسی کو اس کا شریک اور ہمسر ٹھہرائیں جو کچھ بھی قدرت نہ رکھتا ہو۔ یہ انتہائی حماقت اور پرلے درجے کی بیوقوفی نہیں ہے تو پھر کیا ہے! اللہ تعالیٰ تو یہ نعمتیں عطا کرے اور کفار کفر کریں۔ علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں اتری ہے۔[3] قتادہ وسدی رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ شرک کے بارے میں اتری ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ يَعْدِلُوْنَ ﴾ بہ معنی ﴿ يُشْرِكُوْنَ ﴾ ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن خداؤں کو پوجتے ہیں، ان کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں، حالاں کہ نہ کوئی اس کا عدیل (برابری کرنے والا) ہے نہ ہمسر ہے، نہ اُس کے سوا کوئی اور الٰہ ہے، نہ اُس نے کوئی بی بی کی نہ بچہ ہوا۔[4] مٹی سے آدم علیہ السلام کو بنایا، خطاب سب کو کیا، اس لیے کہ سارے انسان انہی کی اولاد ہیں اور نسل میں سے ہیں یا مراد سارے بشر ہیں۔ اس اعتبار سے کہ جس نطفے سے وہ پیدا ہوئے ہیں، وہ مٹی سے بنایا گیا ہے۔

بنی آدم کا ذکر زمین اور آسمان کے تذکرے کے بعد کیا ہے، یہ اس لیے کہ عالمِ اصغر عالمِ اکبر کے تابع ہے۔ ان امور کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ کافروں کے دوبارہ اٹھنے اور اکٹھے ہونے سے انکار کو دفع کیا جائے اور ان کا رد کیا جائے کہ ان امور کو آنکھوں سے دیکھ کر بھی شک کرتے ہیں۔ سلف اور خلف کا دونوں اجلوں (اجل اور اجل مسمیٰ) میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلی اجل کسی کی مقررہ مدت اور بروج کی معرفت ہے اور دوسری اجل موت ہے یا پہلی موت ماضی اور دوسری موت باقی ہے یا پہلی حتمی اجل ہے اور دوسری نیکی اور صلہ رحمی کی بنا پر عمر میں اضافہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ﴾ [الفاطر: ١١] ''اور بڑی عمر والے کو عمر دی جاتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے (وہ) ایک کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے۔''

حدیث میں آیا ہے کہ صلہ رحمی کرنا عمر بڑھاتا ہے[5] اور جہاں وبا ہو وہاں جانا اسبابِ موت میں سے ہے۔[6]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٥٩) [2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٧٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٦٠) [4] تفسير الطبري (١١/ ٢٥٣_ ٢٥٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٧)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢١٨)

پھر باوجود اس ابتدا اور انتہا کے مشاہدہ کے خالق میں شک کرنا اور دوبارہ اٹھائے جانے اور اکٹھا کیے جانے کا انکار کرنا نہایت بعید ہے۔ جس نے تم کو مٹی سے بنایا، زندہ کیا، عقل دی، حواس و اطراف بخشے، پھر سب کو سلب کر کے مردہ کیا، پہلے کی طرح اکٹھا اور زندہ کر دیا، وہ تمھارے اٹھانے اور ان جسموں کو دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہے؟! کیا وہ روحوں کو جسموں میں دوبارہ نہیں لوٹا سکتا، بے شک وہی مالک اور غلبے والا یا معبود ہے سب آسمانوں اور زمین میں۔ جس طرح کہتے ہیں کہ زید مشرق و مغرب میں خلیفہ ہے، یعنی وہاں اس کا حکم اور غلبہ چلتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ﴾ [الزخرف: ٨٤] ''اور وہی (اللہ) آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔'' یعنی آسمان اور زمین میں معروف بہ الوہیت وہی ایک اکیلا رب ہے۔ اسی کو اللہ کہتے ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اس آیت میں بارہ وجوہ لکھی ہیں جن میں سے سلیمان جمل نے چار ذکر کیے ہیں۔[1]

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۠ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝

اور ان (لوگوں) کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں آئی جس سے انھوں نے منہ نہ موڑ لیا ہو ④ ان کے پاس جب حق آ گیا تو اسے بھی انھوں نے جھٹلا دیا، چناں چہ جلد ہی انھیں اس چیز کا پتا چل جائے گا جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے ⑤ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، جنھیں ہم نے زمین میں ایسی طاقت دی تھی جو تمھیں نہیں دی اور ہم نے ان پر موسلا دھار بارش نازل کی اور نہریں بنائیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری قومیں پیدا کیں ⑥

مشرکوں کا عناد اور ان کو ڈرانا دھمکانا:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت پاک میں مشرکین، مکذبین اور معاندین کے حال کا ذکر کیا کہ جب ان کے پاس اللہ

[1] فتح البیان (٤/ ٩٧۔ ١٠٢)

کی وحدانیت، رسل کرام کی راستی اور سچائی پر اللہ کی دلیلوں میں سے کوئی دلیل یا معجزہ بطور حجت کے آتی ہے تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھتے نہ ہی اس کی کچھ پروا کرتے ہیں، اس لیے یہ دھمکی اور وعید فرمائی کہ اس استہزا کا انجام جلد معلوم ہو جائے گا۔

سَتَعْلَمُ لَيْلَىٰ أَيَّ دَيْنٍ تَدَايَنَتْ وَأَيُّ غَرِيْمٍ فِيْ التَّقَاضِيْ غَرِيْمُهَا

جس کی تکذیب میں یہ ہیں، اُس کی خبر ان کو آئے گی، اس کا وبال چکھیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو وعظ فرمایا، ڈرایا کہ دیکھو کہیں تم پر بھی ویسا عذاب اور سزا نہ آ پڑے، جس طرح اس قسم کی حرکتوں پر پہلی امتوں پر پڑا تھا، حالانکہ وہ قوت میں تم سے زیادہ سخت تھے، جمعیت میں زیادہ تھے، مال و دولت و استقلال اور زمین کی عمارات وغیرہ میں بڑھ کر تھے۔ جو مال و اولاد اور عمارتیں اور وسیع جاہ وجلال اور لشکر ہم نے ان کو دیے تھے وہ تم کو نہیں دیے۔ ان کے لیے آسمان سے خوب پانی برستا تھا اور زمین میں چشمے جاری تھے۔

یہ ان کو آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف لے جانا تھا اور ہماری طرف سے ڈھیل تھی، جب انھوں نے خطائیں اور برائیاں کیں تو ہم نے ان کو تباہ و برباد کر دیا اور وہ ایسے گئے جیسے گزرا ہوا دن، فقط ایک حکایت رہ گئی۔ ان کے بعد ایک اور ہی گروہ امتحان کے لیے پیدا ہوا کہ دیکھیں یہ کیسا کام کرتے ہیں، جب انھوں نے بھی ویسے ہی کام کیے تو انھیں بھی ہلاک کر دیا۔ سو تم اب ڈر کے چلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھاری بھی وہی گت ہو جائے جو اُن کی ہوئی۔ اس لیے کہ اللہ پر تمھاری عزت کچھ ان سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ رسول جن کو تم نے جھٹلایا، اس کی بزرگی اللہ کے نزدیک ان کے رسول سے زیادہ ہے اس لیے تم زیادہ حقدار ہو کہ تم پر عذاب اور سزا جلد از جلد دی جائے، مگر تم اب تک صرف اللہ کے لطف و احسان کی وجہ سے بچے ہوئے ہو۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت کے مخاطب اہلِ مکہ ہیں۔ ان کے منہ موڑ لینے پر فرمایا کہ تعجب نہ کر، کیوں کہ یہ قرآن یا محمد ﷺ کو جھٹلانے والے ہیں۔ اب جلد اپنے اس استہزا کا انجام پہچان لیں گے۔ قرن ایک زمانے کے لوگوں کو کہتے ہیں، یعنی کیا انھوں نے اگلے لوگوں کی خبر نہیں سنی۔ یہ تو تجارت کے لیے گرمی کے موسم میں شام کی طرف اور سردی کے موسم میں یمن کی طرف ہمیشہ جاتے آتے رہتے ہیں۔ ان سے پہلے جو امتیں تھیں وہ ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں انبیا کو جھٹلانے ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں، جیسے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد اور ثمود۔ ہم نے جو قوت اور شان وشوکت اور حملہ کرنے کی صلاحیت اور حکومت اور طاقت اور بدن، کشادگی، جسم اور رزق کی وسعت دنیا میں ان کو دی تھی، وہ تم کو نہیں دی، اس پر بھی ان کو خاک میں ملا دیا، تم تو اُن سے کہیں کم تر ہو، اُن کے وقت میں

آسمان سے پانی بہت برستا تھا، جس سے طرح طرح کے میوے اور غلے پیدا ہوتے تھے، قحط نہ پڑتا تھا، وقت پر پانی ملتا تھا، زمین میں نہریں بہتی تھیں، درختوں کے نیچے گھروں کے اندر، مراد کثرت سے باغات ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُن پر بڑا انعام کیا تھا اور زمین کو اچھی طرح جمایا اور بسایا تھا کہ وہ شکر کریں گے اور شرک نہیں کریں گے، اطاعت بجا لائیں گے اور نافرمانی نہیں کریں گے، لیکن جب انھوں نے اُن نعمتوں کی ناشکری کی تو ہم نے ان کو اس حکومت اور قوت کے باوجود ان کے گناہوں کی وجہ سے مٹا دیا اور ان کی جگہ دوسرے لوگ آباد کیے تو پھر تم ان سے کم تر ہونے کے باوجود کس کی گنتی میں ہو۔ یہ بیان اللہ پاک کی کمال قوت، قدرت اور سلطنت کا ہے کہ جس کو چاہے اٹھائے مٹائے اور جسے چاہے بٹھائے اور جمائے۔ بہت سی امتوں کو ہلاک کرنے سے کچھ اُس کے ملک میں نقصان نہیں آیا۔ اگر ایک امت گئی تو اس کی جگہ دوسری امت آ گئی۔ یہ آیت بعد میں آنے والوں کے لیے اپنے سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے حالات میں عبرت اور نصیحت بیان کرتی ہے، کہتے ہیں کہ اگلے لوگ تین سو، چار سو، ہزار یا اس سے کم اور زیادہ سال تک جیتے تھے، اس بنیاد پر اس زمانے کی عمر کی اوسط مقدار ایک قرن ہے۔[1]

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

اور (اے نبی!) اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب آپ پر نازل کرتے، پھر وہ اپنے ہاتھوں سے اسے چھوتے تو جن لوگوں نے کفر کیا وہ ضرور کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے ⑦ اور ان (کافر) لوگوں نے کہا کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اُتارتے تو معاملے کا فیصلہ کر دیا جاتا، پھر ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی ⑧ اور اگر ہم اس (نبی) کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو بھی ہم اسے انسان ہی کی شکل میں بھیجتے اور (تب بھی) ہم انھیں اسی شبہے میں ڈالتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں ⑨ اور (اے نبی!) یقیناً آپ سے پہلے رسولوں

[1] فتح البیان (٤/ ١٠٢۔ ١٠٥)

سے بھی مذاق کیا گیا تھا، پھر ان میں سے جن لوگوں نے مذاق کیا تھا، انھیں اس عذاب نے آ گھیرا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے ⑩ (اے نبی!) کہہ دیجیے: تم زمین میں گھومو پھرو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ ⑪

معاندین کی مذمت اور ان کا رسول کے بشر ہونے سے انکار کرنا:

یعنی جس کی قسمت میں ہدایت نہیں، اس کا شک اور شبہہ بھی نہیں مٹتا۔ کہتے تھے کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے فرشتے اتریں، سو جب آدمی فرشتوں کو دیکھیں تو عالم غیب ظاہر ہو، پھر عمل کی خرابی غیب سے ظاہر میں آنے لگے۔ یہ حق سے مشرکین کی دشمنی کا بیان ہے کہ اگر لکھی ہوئی کتاب بھی آ جائے تو اس کو جادو کہہ دیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ ان کے بحث مباحثے کا محسوسات میں ذکر کیا ہے: ﴿ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴾ [الحجر: ١٤۔ ١٥] ''اور اگر ہم ان پر آسمان سے ایک دروازہ کھول دیں، پھر وہ اس پر چڑھنے لگیں۔ تب بھی وہ یہی کہیں گے کہ ہماری تو نظریں ہی بند کر دی گئی ہیں، بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴾ [الطور: ٤٤] ''اور اگر وہ آسمان سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا بھی دیکھیں تو وہ کہیں گے: (یہ) تہ بہ تہ بادل ہے۔''

پھر یہ فرمایش کہ فرشتہ کیوں نہ اترا جو ان کے ہمراہ رہتا۔ یہ نہ سمجھے کہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ کا عذاب جھٹ پٹ آ جاتا، مہلت بھی نہ ملتی۔ پھر اگر فرشتہ بھی آتا تو ضروری تھا کہ مرد کی شکل میں ہوتا، تاکہ بات چیت ہو سکتی، اس سے نفع حاصل کرتے، مگر اس پر بھی ان کا شبہہ دور نہ ہوتا، وہی شکوک جو بشر رسول میں نکالتے ہیں، اس فرشتے رسول میں بھی پیدا کرتے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٥] ''کہہ دیجیے: اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو یہاں مطمئن ہو کر چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے۔''

تو یہ اللہ کی رحمت ہے کہ مخلوق کی ہر صنف میں اسی صنف کا رسول بھیجا، تاکہ بعض بعض کو دعوت دیں اور بعض بعض سے فائدہ اٹھائیں، بات اور سوال و جواب میں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ [آل عمران: ١٦٤] ''بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے۔'' سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اگر فرشتہ آتا تو مرد کی صورت میں آتا، اس لیے کہ ان کو ملائکہ کی طرف ان کے نور کی وجہ سے نظر کرنے کی تاب نہ ہوتی۔[1] پھر بھی ان کو وہی شبہہ لگتا جواب لگتا ہے۔

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٢٦٨، ٢٦٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٦٦) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

پھر اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی کہ اگر تمھاری قوم تم کو جھٹلاتی ہے تو کچھ نئی بات نہیں ہے، پہلی قوموں نے بھی اپنے رسولوں کو جھٹلایا ہے، لیکن دنیا اور آخرت میں نصرت اور نیک انجام مومنوں ہی کے لیے ہے، کوئی پریشان ہونے اور گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ ذرا چل کر دیکھو تو اگلے لوگوں پر جو رسولوں کو جھٹلانے والے اور ان کے دشمن تھے، انھیں دنیا میں کیسا عذاب اور سزا ملی۔ آخرت کا دردناک عذاب اس کے علاوہ ہے جو ان کے لیے ذخیرہ کر کے رکھا گیا ہے۔ اللہ نے رسولوں اور مومنین کو بچا لیا جو بلا آئی وہ جھٹلانے والوں پر آئی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ وہ لوگ کفر میں ایسے سخت اور درشت ہیں کہ اگر لکھی ہوئی کتاب بھی اترتی اور اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ہاتھ سے چھوتے تو بھی اس کو جادو بتلاتے۔ قرطاس وہ ہے جس پر کچھ لکھا ہو، ورنہ قرطاس و کاغذ بولتے ہیں۔ پھر اگر ان کے خیال باطل کے مطابق فرشتہ آتا تو بھی ایمان نہ لاتے، جب نہ لاتے تو ہلاک ہو جاتے۔ کفار کے حق میں اللہ پاک کی عادت یہ ہے کہ جب نشانی کی فرمایش کرنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے تو عذاب کے مستحق ٹھہر کر مستاصل کر دیے جاتے ہیں، یعنی ان کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ پھر ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دی جاتی۔ ہر جنس کو اپنی جنس سے میل ہوتا ہے، اس لیے فرشتہ اپنی اصلی صورت پر نہیں آ سکتا، اگر آتا تو کسی مرد کی شکل میں ہوتا۔ جسم کثیف میں بھی ظہور کرتا تو یہ اُس وقت بھی شبہہ پیدا کرتے، اس کے رعب اور خوف سے بھاگتے، اس لیے مصلحت یہی ٹھہری کہ رسول جنسِ بشر سے ہو، یہی سبب ہے کہ فرشتے انبیا کے پاس انسان کی صورت میں آتے تھے، تاکہ وحشت و دہشت نہ ہو، جس طرح جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کے پاس دحیہ کلبی کی صورت میں آئے، یا داود علیہ السلام کے پاس دو فرشتے دو مردوں کی شکل میں آئے، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہما السلام کے پاس آئے تھے۔

اللہ نے لفظ رجل کا کہا، بشر نہیں کہا، اس لیے کہ یہ بطورِ تمثیل کے ہوتا، نہ بطورِ حقیقت کے۔ اس کے ساتھ وہ کہنے لگتے کہ یہ تو فرشتہ نہیں ہے، مرد ہے، پھر اپنے کفر پر جمے رہتے۔ اگر ان کو فرشتہ بتایا جاتا تو اس کو جھٹلاتے۔ اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی کہ جس طرح یہ آپ سے مذاق کرتے ہیں، اسی طرح اگلے رسولوں سے بھی مذاق کرتے تھے، مگر ان کا وہ مذاق کرنا انہی کے گلے کا ہار ہوا۔ تم ان سے کہہ دو کہ ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھیں کہ ان کا انجام کیا ہوا، ان کی سزا کے آثار کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں، گھر ویران پڑے ہیں، باغات اجڑے ہوئے ہیں، سو تم بھی استہزا اور کفر کرنے کی صورت میں انہی میں جا ملو گے، جیسے وہ برباد ہوئے، تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔[1]

---

[1] فتح البیان (٤/ ١٠٦۔ ١٠٩)

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ
عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا
رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٢
وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝١٣
قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ
اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١٤ قُلْ
اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝١٥ مَنْ
يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝١٦

ان سے پوچھیے: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ کس کے لیے ہے؟ کہہ دیجیے: اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس نے (مخلوق پر) مہربانی کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ وہ قیامت کے دن تمھیں ضرور جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں، جن لوگوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا ہے، تو وہ ایمان نہیں لاتے (12) رات (کے اندھیرے) اور دن (کے اُجالے) میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے، وہ اللہ ہی کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور خوب جانتا ہے (13) (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا میں اس اللہ کے سوا اور معبود بنا لوں؟ جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور اسے نہیں کھلایا جاتا، کہہ دیجیے: بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں وہ پہلا شخص ہو جاؤں جو اسلام لایا اور آپ ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو جائیں (14) کہہ دیجیے: بے شک اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو میں ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (15) اس دن جس شخص سے عذاب ہٹا لیا گیا تو یقیناً اس پر اللہ نے رحم کر دیا اور یہی ہے واضح کامیابی (16)

خالقِ رازق اور انعام کرنے والا ہی ہے، اس کے آگے جھکنا ضروری ہے:

اللہ نے خبر دی کہ اللہ زمین و مافیہا کا بادشاہ ہے۔ اُس نے اپنے نفسِ مقدس پر رحمت کو لکھ رکھا ہے۔ صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا خَلَقَ الْخَلْقَ كَتَبَ كِتَابًا عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِي تَغْلِبُ غَضَبِي» [1] ''تحقیق جب اللہ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا تو عرش پر اپنے پاس ایک کتاب میں یہ لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔'' پھر اپنے نفسِ کریم کی قسم کھا کر کہا کہ میں اپنے بندوں کو

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥١)

میقات یومِ معلوم میں جمع کروں گا، وہ میقات قیامت کا دن ہے، جس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں، یعنی مومن بندوں کے نزدیک۔ رہے جھگڑا کرنے والے اور جھٹلانے والے، سو وہ ہمیشہ اپنے شک اور تردد میں مبتلا رہیں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے، وہاں پانی بھی ہوگا؟ فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہاں پانی ہوگا۔ اللہ کے دوست انبیا کے حوض پر آئیں گے، اللہ ہزار فرشتے کھڑے کرے گا، ان کے ہاتھ میں آگ کے عصا ہوں گے، وہ کفار کو انبیا کے حوض سے دور ہانکیں گے۔[1] (رواه ابن مردويه وهذا حديث غريب) سنن ترمذی میں آیا ہے کہ ہر نبی کا ایک حوض ہوگا، میں امید کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ لوگ میرے حوض پر آئیں گے۔[2]

پھر فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنی جان کا نقصان کیا، قیامت کے دن وہ اللہ کی طرف لوٹ کر جانے کی تصدیق نہیں کرتے، نہ اُس دن کے شر سے ڈرتے ہیں، حالانکہ جو جاندار زمین و آسمان میں ہے، سب اُس کی مخلوق اور غلام ہے، اُس کے قہر وتصرف و تدبیر کے ماتحت ہے۔ لا إله إلا هو۔ وہ سب کے اقوال سنتا ہے، سب کے حرکات و دل کی باتیں اور بھید جانتا ہے۔ پھر اپنے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے، جن کو توحید عظیم اور مضبوط شریعت دے کر بھیجا گیا اور لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلانے کا حکم دیا ہے، یہ فرمایا کہ تو کہہ: کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی ٹھہرا لوں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٤] ”کہہ دیجیے: اے جاہلو! کیا تم مجھے غیر اللہ کے بارے میں حکم دیتے ہو کہ میں (ان کی) عبادت کروں؟“

مطلب یہ ہے کہ میں اللہ وحدہ لاشریک لہ کے سوا کسی اور کو اپنا مددگار نہ بناؤں گا، کیوں کہ آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی سابق نمونے کے پہلی دفعہ پیدا کرنے والا وہی اللہ ہے جو کھلاتا ہے اور وہ خود نہیں کھاتا، ساری مخلوق کو رزق دیتا ہے، اس کے باوجود مخلوق کا محتاج نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاريات: ٥٦] ”میں نے جنات اور انسانوں کو محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری ہی عبادت کریں۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ اہلِ قبا میں سے ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، کھانا کھلایا، ہم بھی ہمراہ گئے، جب کھانا کھا کر ہاتھ دھوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ، مَنَّ عَلَيْنَا، فَهَدَانَا وَأَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا مِنَ الشَّرَابِ، وَكُلُّ بَلَاءٍ حَسَنٍ أَبْلَانَا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ غَيْرَ مُوَدَّعٍ وَلَا مُكَافِيءٍ وَلَا مَكْفُوْرٍ وَّلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا مِنَ الطَّعَامِ، وَسَقَانَا مِنَ الشَّرَابِ، وَكَسَانَا مِنُ الْعُرىٰ، وَهَدَانَا مِنَ الضَّلَالِ، وَبَصَّرَنَا مِنَ الْعَمىٰ، وَفَضَّلَنَا عَلىٰ كَثِيْرٍ مِمَّنْ

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٧٢۔ ١٧٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول راوی ہیں۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٤٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٨٩)

خَلَقَ، تَفْضِيْلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ» [1]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ مجھ کو حکم ہے کہ میں اس امت میں سے اول مسلمان ہوں، مشرکوں میں سے نہ ہوں، قیامت کے عذاب سے ڈرتا ہوں، جس سے اُس دن عذاب دور کیا گیا، وہ رحم کیا گیا ہے، ظاہر مراد یہی ہے۔ اُس کے مطابق: ﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ﴾ [آل عمران: ۱۸۵] ''پس جو شخص آگ سے ہٹا دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، بے شک وہ کامیاب ہو گیا۔'' فوز نفعے کے حاصل ہو جانے اور خسارے سے بچ جانے کو کہتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت اُن پر ایک قطعی حجت اور زور دار دھمکی ہے۔ کیا قدرت ہے کہ اس سے رہائی پائیں؟ اس لیے کہ جس سے پوچھو گے کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ وہ چار و ناچار یہی جواب دے گا کہ اللہ ہے، جب یہ بات خود ان کے اقرار سے ثابت ہو چکی تو اب ان پر حجت قائم ہو گئی، اب اگر اللہ چاہے تو ان پر عذاب میں جلدی کرے، مگر اس نے اپنی ذات پاک پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کو ترغیب ہے جو اُس کی طرف توجہ کرنے سے منہ موڑتے ہیں اور ان لوگوں کو سکون دیا ہے کہ رحیم ہے، سزا میں جلدی نہیں کرتا اور توبہ اور رجوع الی اللہ کو قبول فرماتا ہے۔

اُس کی ایک رحمت یہ کیا کم ہے کہ رسول بھیجے، کتابیں نازل کیں اور توحید پر دلیلیں قائم کیں۔ سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ نے جس دن آسمان و زمین کو بنایا، اس دن سو رحمتیں پیدا کیں، ان میں سے ایک حصہ رحمت کی وجہ سے مخلوق ایک دوسرے پر رحم و شفقت کا معاملہ کرتی ہے، ننانوے رحمتیں قیامت کے دن کے لیے رکھ چھوڑی ہیں، جب قیامت ہو گی، اس رحمت سے ان کو پورا کرے گا۔ [2]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ كِتَاباً فَوَضَعَهُ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ أَنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ» ''جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تو ایک تحریر کو لکھ کر اپنے پاس عرش پر رکھ لیا کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔'' یہ حدیث صحیحین میں کئی طرق سے آئی ہے۔ [3] یہ فرمایا کہ تم کو اللہ قیامت کے دن جس میں شک نہیں ہے، جمع کرے گا، ڈراوا ہے، ترغیب کے بعد اور وعدے کے بعد وعید ہے، یعنی اگر اپنی رحمت سے تم کو مہلت دی ہے تو تم کو بلا کر جزا بھی دے گا، پھر تمام نافرمانوں میں سے جو کوئی سزا کا حق دار ہو گا، اُس کو سزا دے گا، جو خاسرینِ نفس ہیں، وہ ایمان نہیں لاتے، اس لیے کہ ان کی تقدیر میں

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٨٢) اس کی سند حسن ہے۔ [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥١)

خسران لکھ دیا گیا ہے اور وہ ان کے ایمان سے دور رہنے کا باعث ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس چیز پر سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے، وہ تمام رات دن کے ساکنوں میں سے ہے۔ ①
پس ﴿ مَا سَكَنَ ﴾ سے تمام چلنے والے حیوانات اور پرندے وغیرہ مراد ہیں، وہ خشکی میں ہوں یا تری میں۔ یہ آیت تمام مخلوقات کا احاطہ کرنے کا مفہوم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ سارے موجودات اللہ کی ملکیت ہیں، نہ کہ کسی غیر کے۔ ②

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۭ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿17﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿18﴾ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ڐ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰي ۭ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿19﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿20﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿21﴾

اور اگر اللہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اسے دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر وہ آپ کو کوئی بھلائی پہنچائے، تو وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ⑰ اور وہ اپنے بندوں پر زور آور و غالب ہے، اور وہ خوب حکمت والا، نہایت باخبر ہے ⑱ (اے نبی! ان سے) کہیے: گواہی کے طور پر کون سی چیز سب سے بڑھ کر ہے؟ کہہ دیجیے: اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔ کیا تم اس کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں؟ کہہ دیجیے: میں یہ گواہی نہیں دیتا۔ (او یہ بھی) کہہ دیجیے کہ صرف وہی ایک معبود ہے، اور بے شک میں اس سے بَری ہوں، جو تم شریک ٹھہراتے ہو ⑲ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، وہ اسے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے

① تفسیر الطبري (۱۱/ ۲۸۱) ② فتح البیان (٤/ ۱۱۰۔ ۱۱۲)

آپ کو خسارے میں ڈالا، تو وہ ایمان نہیں لاتے ⑳ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے؟ بے شک ظالم فلاح نہیں پائیں گے ㉑

نافع ضار اور زور آور اللہ ہی ہے:

یہ جو فرمایا کہ اگر نفع پہنچائے، اس سے معلوم ہوا کہ نفع پہنچانا چاہتا ہے۔ گواہی سے مراد قسم ہے، یعنی میں قسم کھاتا ہوں اللہ کی، اس سے زیادہ کون سی قسم ہوگی، کہ اگر میں نے جھوٹ باندھا مجھ سے بدتر کوئی نہیں اور اگر میں نے پہنچایا اور تم نے جھٹلا دیا تو تم سے زیادہ گناہ گار کوئی نہیں، پھر اپنی فکر کرو۔ اللہ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ نفع و نقصان کا مالک اور خلق میں اختیار رکھنے والا کہ جس طرح چاہے کرے، اللہ ہے، کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا، اُس کی قضا کو پھیر دینے والا نہیں، جیسے اس نے ارشاد فرمایا: ﴿ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ [الفاطر: ٢] ''اللہ لوگوں کے لیے (اپنی) رحمت سے جو کھول دے تو کوئی اسے بند کرنے والا نہیں، اور جسے وہ بند کر دے اس کے بعد کوئی اسے بھیجنے (کھولنے) والا نہیں۔''

صحیح میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کہا ہے: «اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»[1] ''اے اللہ! جو تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں، جو تو روک لے اسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی بزرگ کی بزرگی اُس کو تیرے ہاں فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔'' اسی لیے یہ فرمایا کہ اللہ بندوں پر زبردست ہے، یعنی گردنیں اُسی کے لیے جھکی ہیں، بڑے بڑے جابر اُس کے سامنے ذلیل ہیں، چہرے اُس کے سامنے جھکے اور دبے ہوئے ہیں، ہر شے مقہور ہے، ساری خلق مطیع ہے، سب اشیا اس کی عظمت اور جاہ وجلال، کبریائی، عظمت، بلندی اور قدرت کے سامنے عاجز ہیں، اللہ کے حکم اور فرمان کے تحت ہیں۔ وہ اپنے تمام کاموں میں حکیم ہے، تمام اشیا کی جگہوں اور منزلوں سے خبردار ہے۔ نہیں دیتا مگر مستحق کو، نہیں روکتا مگر غیر مستحق سے۔ اللہ کی قسم! اللہ جانتا ہے جو میں تمھارے پاس لایا ہوں اور جو کچھ تم کہتے ہو۔ یہ قرآن اس کے لیے ترہیب (ڈرانے والا) ہے جس کو پہنچا، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [ھود: ١٧] ''اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔''

﴿ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ کی تفسیر:

امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے ﴿ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ جس کو قرآن پہنچا، اُس نے گویا نبی اکرم ﷺ کو دیکھا۔ ابو خالد رحمہ اللہ نے کہا: بلکہ بات بھی کی۔ ابن کعب رحمہ اللہ کی روایت کا دوسرا لفظ یہ ہے: ''مَنْ بَلَغَهُ الْقُرْآنُ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٣)

فَقَدُ أَبْلَغَهُ مُحَمَّدٌ ﷺ»[1] ”جس کو قرآن پہنچا، گویا اس کو محمد ﷺ نے پہنچا دیا۔“ امام قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:« بَلِّغُوا عَنِ اللّٰهِ فَمَنْ بَلَغَتْهُ آيَةٌ مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَقَدْ بَلَغَهُ أَمْرُ اللّٰهِ»[2] ”اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچا دو، جس شخص کو اللہ کی کتاب سے ایک آیت پہنچی تو اسے اللہ کا حکم پہنچا۔“ (رواہ عبدالرزاق)

اس حدیث پر امت کے حافظوں اور قاریوں نے خوب عمل کیا۔ ایک آیت کیسی، سارا قرآن پہنچا دیا۔ پھر علمائے امت نے قرآن کے معنی پہنچا دیے، سیکڑوں تفسیریں لکھیں، ہر زبان میں، کیا عربی لغت، اور کیا عجمی کلام، قرآن مجید کا ترجمہ ہوا۔ قرآن کے الفاظ اور معانی کی تبلیغ کا جو حق تھا وہ ادا کر دیا گیا۔ اب اگر کوئی اس پر نہ چلے اور مبلغین کی تبلیغ کو نہ مانے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”حَقٌّ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يَّدْعُوَ كَالَّذِيْ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَأَنْ يُّنْذِرَ بِالَّذِيْ أَنْذَرَ“[3] یعنی ہر متبع رسول کا حق ہے کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے دعوت اور انذار کیا ہے، اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ کام اہلِ علم کا ہے، مگر اب کہاں!

اہلِ کتاب دینِ حق کو اپنی اولاد کی طرح پہچانتے ہیں:

پھر فرمایا کہ یہ اہلِ کتاب اس دینِ حق اور توحیدِ اسلام کی حقیقت ویسی ہی پہچانتے ہیں، جس طرح کہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو رسولوں کی دی ہوئی خبروں کا علم ہے کہ وہ سب نبی اکرم ﷺ کے وجودِ مسعود کی خبر و بشارت دے گئے ہیں۔ وہ محمد ﷺ کے مبعوث ہونے کی جگہ، آپ ﷺ کی صفات، آپ ﷺ کا شہر اور جس شہر کی طرف آپ ﷺ نے ہجرت کی اور آپ ﷺ کی امت کی صفات بیان کر گئے ہیں۔ اسی لیے جو لوگ خاسر نفس ہیں وہ اس واضح اور ظاہر معاملے پر جس کی پہلے بشارت دی گئی اور جس کے بارے میں پہلے انبیا نے بیان فرمایا، ایمان نہیں لاتے۔ اس لیے سب سے بڑا ظالم وہی شخص ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے یا اللہ کی حجتوں اور دلیلوں کو جھٹلاتا ہے، ایسے ظالموں کو کامیابی نصیب نہیں ہو گی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر اللہ تجھ پر کوئی ضرر اتارے، جیسے: تنگدستی یا بیماری یا سختی یا آزمایش تو کسی کو اس کے دور کرنے کی قدرت نہیں اور اگر وہ عیش و عشرت یا عافیت اور نعمت عطا کرے تو وہ دے سکتا ہے۔ خیر کا لفظ ہر قسم کی لذت، فرحت اور سرور، جو انسان کو ملے، اس کو شامل ہے۔ یہ خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ کو ہے مگر ہر کسی کے لیے عام ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دن میں نبی اکرم ﷺ کے پیچھے تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے لڑکے!

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٢٩١) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧١۔ ١٢٧٢) [2] تفسير الصنعاني (٢/ ٢٠٥) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٢)

میں تجھ کو کچھ باتیں سکھلاتا ہوں تو اللہ پر اپنی نظریں رکھ، وہ تجھ پر اپنی نظر رکھے گا، تو اللہ پر نگاہ رکھے گا تو اسے اپنے سامنے پائے گا، جب تو مانگے تو اللہ سے مانگ، جب مدد چاہے تو اللہ سے چاہ، تو جان لے کہ اگر ساری امت جمع ہو کر تجھ کو کچھ نفع پہنچائے تو نہیں پہنچا سکتی، مگر اتنا جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے اور اگر جمع ہو کر تجھے کچھ نقصان پہنچائے تو نہیں پہنچا سکتی مگر اسی قدر جو اللہ نے تجھ پر لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے، صحیفے خشک پڑ گئے۔ (أخرجه الترمذي)

امام رزین رحمہ اللہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے: تو فراخی میں اللہ کو پہچان، وہ تجھ کو سختی میں پہچانے گا۔ امام ابن اثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اسی کے لگ بھگ یا اسی طرح مطولاً مسند احمد میں بھی آیا ہے۔[1] قہر غلبے کو اور قاہر غالب کو کہتے ہیں۔ فوق، اللہ کی ایک صفت ہے، جس سے ساری مخلوق پر اُس کا استعلا (بلندی) ثابت ہوتی ہے۔ اللہ اس صفت کے ساتھ متفرد (اکیلا) ہے۔ "وَهُوَ عَلِيُّ الذَّاتِ سَمِيُّ الصِّفَاتِ" "وہ ذات بلند و بالا اور تمام صفات کی مالک ہے۔" لفظ شے کا اطلاق پرانی، ختم ہونے والی، ہو سکنے والی اور مشکل سب پر آتا ہے۔

مطلب یہ کہ اللہ ربوبیت اور توحید پر براہین کو قائم کرنے پر متفرد ہے۔ اس مدعا پر اُس کی شہادت سب سے بڑی اور بڑھ کر ہے۔ سو وہی ہمارے اور تمھارے درمیان گواہ ہے، اُسی نے یہ قرآن بھیجا ہے کہ میں تم کو ڈر سناؤں اور اُس کی مخالفت سے ڈراؤں۔ جس کے پاس یہ پہنچا، یا آئندہ پہنچے گا، اس لیے کہ قیامت تک کے لیے نذیر ہے، عرب ہو یا عجم، گورا ہو یا کالا، ساری امتوں کے لیے حجت ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن پاک کے احکام اور دلائل جس طرح ان لوگوں کے لیے تھے، جو زمانۂ نزول میں موجود تھے، اسی طرح موجودہ زمانے اور آئندہ آنے والے زمانے کے لوگوں کے لیے بھی ہیں۔ جب یہ بات ٹھہری تو اب ان عجیب باتوں اور خرافات کی ضرورت نہ رہی جو علمِ فروع اور علمِ کلام میں مذکور ہیں۔

یہ بات بھی دور ہو گئی کہ قرآن مجید کا سمجھنا صرف ائمہ مجتہدین پر منحصر تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ﴿ وَمَنۢ بَلَغَ ﴾ پر حجت نہ ٹھہرتا، حالانکہ قیامت تک جو مسلمان دنیا میں پیدا ہو گا اور جو مومن ماں کے پیٹ سے نکل کر باپ کے پاس آئے گا، یہ قرآن اُس کے لیے ویسا ہی نذیر و بشیر ہے، جیسا اس امت کے سلف کے لیے تھا، یعنی صحابہ کے لیے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب یہ آیت اتری، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور ہر جبار کو خط لکھا اور انھیں اللہ کی طرف بلایا۔[2] (أخرجه أبو الشيخ وابن مردويه)

اس جگہ نجاشی سے مراد حبشہ کا ہر بادشاہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٦) مسند أحمد (١/ ٣٠٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٥٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٤) المعجم الأوسط (٢/ ١٥٠) الدر المنثور (٣/ ٢٥٦) البتہ صحیح مسلم میں روایت آیت کے نزول کے ذکر کے بغیر مروی ہے۔

«مَنْ بَلَغَهُ الْقُرْآنُ فَكَأَنَّمَا شَافَهْتُهُ بِهِ» ثُمَّ قَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ (أخرجه أبو نعيم والخطيب وابن النجار) امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: ”مَنْ بَلَغَهُ الْقُرْآنُ حَتّٰى يَفْهَمَهُ وَيَعْقِلَهُ كَانَ كَمَنْ عَايَنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَكَلَّمَهُ“ [1] ”جس شخص کو قرآن پہنچا، یہاں تک کہ اُس نے اُس کو سمجھ لیا، وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ سے کلام کیا۔“

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لِأُنْذِرَكُمْ بِهٖ ﴾ سے مراد عرب ہیں اور ﴿ وَمَنْ بَلَغَ ﴾ سے مراد عجم ہیں۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: «بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً» ”جو کچھ تمھیں مجھ سے ملے وہ دوسروں کو پہنچا دو، اگرچہ ایک آیت ہی ہو۔“[3] (أخرجه البخاري) اس جگہ اس آیت سے مراد یا تو آیتِ کتاب ہے یا سننِ مطہرہ میں سے ایک سنت یا دونوں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سرسبز رکھے اللہ اُس مرد کو جس نے سنا ہم سے کچھ پھر اُس کو پہنچا دیا، جیسا سنا تھا، یعنی جوں کا توں۔ بہت سے پہنچائے ہوئے سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہیں۔[4] (أخرجه الترمذي)

”سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا“ قرآن و حدیث دونوں کو شامل ہے، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ سے قرآن بھی سنا اور حدیث بھی سنی، سو جو کچھ بھی سنا ہے، اُس سب سے سنے ہوئے کو پہنچانا چاہیے وہ کتاب ہو یا سنت۔ یہ حدیث محدثینِ امت کے حق میں دعا ہے، کیوں کہ سنت کی تبلیغ صرف اس گروہ باشکوہ کے ہاتھ سے ہوئی ہے پس بس۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”تَسْمَعُوْنَ وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ وَيُسْمَعُ مِمَّنْ يَّسْمَعُ مِنْكُمْ“ یعنی تم نے ہم سے سنا، تم سے اوروں نے سنا، ان سے پھر اوروں نے سنا۔[5] گویا یہ ایک سلسلۂ سماعت قائم ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت اور طلبائے علم ہمیشہ سے خَلَفاً عن سَلَفٍ سلسلۂ اسناد، سماعت، روایتِ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ اپنے درمیان قائم دائم اور باقی رکھتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ان شاء اللہ اس امت کے کسی نہ کسی گروہ میں اسی طرح جاری و ساری رہے گا۔ وللہ الحمد.

اہلِ حدیث کا گروہ اس سلسلۃ الذہب کے اصحاب ہیں، نبی اکرم ﷺ کی یہ دعا: «نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا»[6] انہی کے حق میں ہے۔ ”يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عَدُوْلُهُ ... الخ“[7] زبانِ محمد ﷺ پر انہی کی تعدیل ہے۔ اب اس سے زیادہ اور کیا شرف ہوگا، اس بزرگی اور فضیلت میں کوئی طائفۂ علم اس گروہ باصدق و صفا کا شریک نہیں ہے۔

---

(1) الدر المنثور (٣/ ٢٥٧) (2) تفسير الطبري (١١/ ٢٩١) (3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٤)

(4) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥٧) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٢١)

(5) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٥٩) مسند أحمد (١/ ٣٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٩٤٧)

(6) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥٧) صحيح الجامع، برقم (٦٧٦٤) (7) مسند البزار (١٦/ ٢٤٧) مسند الشاميين (١/ ٣٤٤)

پھر اللہ پاک نے دھمکی اور ملامت کے طور پر یہ سوال کیا ہے کہ کیا تم لوگ اللہ کے ساتھ اور اللہ بھی بناتے ہو، حالانکہ سارے جہان کا معبود ایک ہے، اُس میں کوئی تعدد نہیں۔ اس لیے میں تو ہرگز اس طرح نہ کہوں گا، بلکہ اس تعدد کا انکار کروں گا۔ میرا قول تو یہ ہے کہ اللہ ایک ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، میں تمھارے اس شرک سے بیزار ہوں، پھر فرمایا: جن کو ہم نے کتاب دی ہے، یعنی علماے یہود و نصاریٰ جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھے اور تورات اور انجیل پڑھتے پڑھاتے تھے، وہ نبی اکرم ﷺ کو یا قرآن پاک کو خوب ہی جانتے پہچانتے تھے، جیسے کوئی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے، صرف اتنی بات ہے کہ جنھوں نے اپنی جانوں کو ہلاک کیا، نقصان میں ڈالا، جہنم میں پھینکا، وہ نبی اکرم ﷺ کا انکار کرتے ہیں۔

جمہور مفسرین نے کہا کہ اس خسران کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے ہر انسان کے لیے ایک جگہ جنت میں اور ایک جگہ دوزخ میں مقرر کی ہے، جب قیامت کا دن ہوگا، اللہ مومنوں کو جنت میں اہلِ نار کی جگہ دے گا اور اہلِ نار کو دوزخ میں اہلِ جنت کی مخصوص جگہ عطا فرمائے گا۔ (ذكره الكرخي) سو ایسے خائب و خاسر لوگ عناد اور سرکشی کی وجہ سے قرآن پر ایمان نہیں لاتے، رسول کو نہیں مانتے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ تقلید میں ان کا انہماک اور ان کی غفلتِ نظر ان کو کفر پر ڈٹے رہنے اور ایمان سے دور رہنے کے لیے ان کے لیے ترغیب دینے والے ہوئے ہیں۔[1] بڑا ظالم وہ ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، مثلاً کہے کہ اُس کی مخلوق میں اُس کا کوئی شریک ہے، پھر اُس کو پوجے یا جو تورات اور انجیل میں نہیں ہے وہ کہے، جیسے: عزیر اور مسیح کو ابن اللہ کہے یا واضح معجزے کو جھٹلائے، جیسے قرآن پاک کی تکذیب کرے۔ نضر بن عبدالدار نے کہا تھا: جب قیامت ہوگی، لات اور عزیٰ ہماری شفاعت کریں گے، اُس پر یہ آیت آئی کہ ظالموں کے لیے فلاح نہیں،[2] وہاں جب لات اور جوتی پڑے گی تو لات کو یاد نہیں کریں گے، جب عزت اتر جائے گی تو عزیٰ کو بھول جائیں گے۔[3]

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾ انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا حَتَّىٰ

---

[1] تفسير البيضاوي (٢/ ٣٩٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٣) [3] فتح البيان (٤/ ١١٤۔ ١١٩)

اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے، پھر جو لوگ (اللہ کے ساتھ) شریک ٹھہراتے تھے، ان سے ہم کہیں گے: تمھارے وہ شریک کہاں ہیں جنھیں تم (اللہ کے ساتھ شریک) خیال کرتے تھے؟ 22 پھر اس (جواب طلبی) پر ان کی معذرت یہی ہوگی کہ وہ کہیں گے: اللہ، ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے 23 دیکھیں وہ اپنے آپ پر کیسا جھوٹ گھڑیں گے، اور جنھیں وہ جھوٹے معبود بنا لیتے تھے سب (وہاں) گم ہو جائیں گے 24 اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں جب کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اس کو سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (بہرہ پن) ہے اور اگر وہ ساری نشانیاں دیکھ لیں تو بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں (اور) آپ سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں 25 اور وہ دوسروں کو اس (ہدایت) سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں، اور وہ اپنے آپ ہی کو ہلاک کر رہے ہیں، اور وہ شعور نہیں رکھتے 26

مشرکوں سے ان کے شرک کے بارے میں پوچھا جائے گا:

اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ ہم قیامت میں سب مشرکین کو جمع کر کے ان بتوں اور شریکوں وغیرہ سے جن کو وہ پوجتے تھے، سوال کریں گے کہ اب وہ کہاں ہیں؟ ان کو بلاؤ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورت قصص میں فرمایا: ﴿ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴾ [القصص: ٦٢] ''پھر وہ کہے گا: میرے وہ شریک کہاں ہیں جنھیں تم میرا شریک سمجھتے تھے؟'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ فتنے سے مراد حجت ہے۔[1] عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مراد معذرت ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد قول ہے۔ عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آزمایش ہے۔[2]

ایک آدمی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ کہیں گے: واللہ ہم مشرک نہ تھے، کہا: انھوں نے جب دیکھا کہ جنت میں نہیں جاتے مگر نمازی، تو کہنے لگے: آؤ ہم انکار کریں اُس وقت انکار کرنے لگیں گے۔ اللہ اُن کے منہ پر مہر لگا دے گا، ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے، پھر کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے، بتا

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٣) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٣۔ ١٢٧٤)

اب بھی تیرے دل میں کچھ ہے؟ قرآن میں جو کچھ ہے اُس میں کچھ نہ کچھ اترا ہے، لیکن تم لوگ اس کی وجہ نہیں جانتے۔ ①

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں اتری ہے، ② مگر اس میں نظر ہے، اس لیے کہ یہ آیت مکی ہے اور منافق مدینے میں تھے۔ منافقوں کے حق میں جو آیت ہے وہ آیت سورت مجادلہ میں ہے: ﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ [المجادلة: ١٨] ''جس دن اللہ ان سب کو دوبارہ اُٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے، جیسے تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ ایک شے (اچھی راہ) پر ہیں۔ خبردار! بے شک وہی جھوٹے ہیں۔''

اسی طرح ان کے حق میں کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـــًٔا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٧٣۔ ٧٤] ''پھر ان سے کہا جائے گا: کہاں ہیں وہ جنھیں تم شریک ٹھہراتے تھے۔ اللہ کے سوا؟ وہ کہیں گے: وہ تو ہم سے گم ہوگئے، بلکہ ہم تو اس سے پہلے کسی کو بھی نہ پکارتے تھے۔ اللہ اسی طرح کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔'' پھر فرمایا کہ وہ تیرے پاس تیری قراءت سننے کو آتے ہیں، لیکن اس سے کیا کام چلتا ہے، اللہ نے تو ان کے دل پر پردے ڈال دیے ہیں، وہ کب قرآن کو سمجھیں گے؟ کان کو نفع دینے والی باتیں سننے سے بہرا کر دیا، وہ کب حق بات کو جی لگا کر رضامندی سے سنیں گے؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧١] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس (جانور) کو پکارتا ہے جو پکارنے اور چلانے کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے وہ عقل نہیں رکھتے۔'' سچ ہے:

ہر کہ او روئے بہ بہبود نداشت دیدنش روئے نبی سود نداشت

''ہر وہ شخص جو بھلائی کا ارادہ ہی نہیں رکھتا، اس کا کسی نبی کو دیکھ لینا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔''

وہ کتنی ہی آیات، دلائل، حجتیں، بینات اور براہین کیوں نہ دیکھیں، ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، کیوں کہ فہم و انصاف ان کے پاس ہو کر نہیں گیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٢٣] ''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنا دیتا، اور اگر وہ انھیں سنا دیتا تو بھی وہ ضرور پھرتے اور وہ اعراض کرنے والے ہیں۔'' پھر فرمایا جب وہ تیرے پاس مناظرے

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٤) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٣٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

② تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٤) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

مجادلے کو آتے ہیں تو قرآن کو پہلی کتابوں سے لیا ہوا اور نقل کیا ہوا بتاتے ہیں۔ ﴿ يَنْهَوْنَ عَنْهُ ﴾ اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کو اتباعِ حق، رسول کی تصدیق اور قرآن کی اطاعت سے منع کرتے ہیں، کسی کو چھوڑتے نہیں کہ وہ ان چیزوں سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے پھیرتے ہیں۔[1] محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے کہ کفارِ قریش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ آتے اور دوسروں کو بھی روکتے۔ یہی قتادہ، مجاہد اور ضحاک وغیرہ کا قول ہے، اسی کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے اظہر کہا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ آیت ابو طالب کے بارے میں اتری ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دہی سے لوگوں کو باز رکھتے۔ قاسم، حبیب اور عطا بن دینار رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔[2] سعید بن ابی ہلال رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت عمومۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اتری ہے۔ وہ دس شخص تھے، لوگوں میں سے سب سے سخت اور علانیہ دشمنی میں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ يَنْهَوْنَ النَّاسَ عَنْ قَتْلِهِ"[3] کچھ بھی ہو، اپنی ہی جان کو ہلاک کرتے ہیں، ان کے کیے کا وبال انھی پر پڑتا ہے۔

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ قیامت کے دن سب کو جمع کر کے مشرکوں سے پوچھے گا کہ اب وہ تمھارے شرکا کہاں ہیں جن کو تم معبود سمجھتے تھے؟ تو دوزخ میں ان کا جواب یا عذر یا حجت یہ ہوگی کہ واللہ ہم مشرک نہ تھے، یعنی باوجود اس علم کے اُس کے کہنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جھوٹی قسم کھائیں گے، نہایت حیرت و دہشت سے، وہاں یہ سارے جھوٹ اور بہتان غائب ہو جائیں گے، کسی کی کچھ بھی نہ چلے گی۔[4]

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ
بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٧﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَا كَانُوا
يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ
لَكَاذِبُونَ ﴿٢٨﴾ وَقَالُوا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ
بِمَبْعُوثِينَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ أَلَيْسَ
هَٰذَا بِالْحَقِّ ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٠﴾

اور اگر آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ آتش پر کھڑے کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: کاش! ایک بار

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٣١١) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٧) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسير الطبري (١١/ ٣١١۔ ٣١٥) تفسير ابن كثير (٢/ ١٧٥) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٧) [4] فتح البيان (٤/ ١١٩۔ ١٢٠)

ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور ہم اپنے رب کی آیات کو ہرگز نہ جھٹلائیں گے، اور ہم مومنوں میں سے ہوں گے (27) (نہیں!) بلکہ ان کے وہ کرتوت ظاہر ہو چکے ہوں گے جنھیں وہ پہلے چھپاتے تھے۔ اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں (28) اور وہ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری دنیا ہی کی زندگی ہے، اور ہمیں (دوبارہ) نہیں اُٹھایا جائے گا (29) اور اگر آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو وہ فرمائے گا: کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو وہ کہیں گے: کیوں نہیں! (یہ حق ہے) ہمارے رب کی قسم! تو اللہ فرمائے گا: پھر تم عذاب (کا مزہ) چکھو، اس وجہ سے کہ تم کفر کرتے تھے (30)

عذاب دیکھ لینے کے بعد آرزوئیں کام نہیں آئیں گی:

یعنی دوزخ کے کنارے پہنچ کر حکم ہوگا کہ ٹھہرو تو کافروں کو توقع ہونے لگے گی کہ شاید ہم کو پھر دنیا میں بھیجیں، تو اب کی بار کفر نہ کریں، ایمان لائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اس لیے ان کو نہیں ٹھہرایا، بلکہ اس تدبیر سے اُن کے منہ سے اقرار کروایا کہ ہم نے کفر کیا تھا، حالانکہ پہلے منکر ہوئے تھے کہ ہم شرک نہ کرتے تھے اور پھر ان کو بھیجنا بے فائدہ ہے۔

اللہ نے اس آیتِ پاک میں یہ خبر دی ہے کہ کفار جب آگ پر کھڑے ہو کر زنجیروں اور طوق کا مشاہدہ کریں گے، بڑے بڑے امور اور احوال نظر آئیں گے، تب دنیا میں لوٹ جانے کی تمنا کریں گے، تاکہ عملِ صالح بجا لائیں، مگر ایسا نہ ہوگا، بلکہ ان کا کفر اور دل سے ان کی تکذیب اور دشمنی کھل جائے گی، گو دنیا میں یا آخرت میں اس کے منکر تھے یا رسولوں کی تصدیق جو دنیا میں ان کے دل کے اندر تھی، مگر اپنے متبعین کے سامنے اس کے خلاف ظاہر کرتے تھے، وہ کھل جائے گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے بزبانِ موسیٰ علیہ السلام فرعون سے کہا: ﴿قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۲] ''اس (موسیٰ) نے کہا: تو یقیناً جان چکا ہے کہ یہ چیزیں آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے واضح دلائل بنا کر (غور کرنے کے لیے) نازل کی ہیں اور اے فرعون! میں تو تجھے ہلاک کیا ہوا سمجھتا ہوں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اُس کی قوم کا یہ طرزِ عمل بیان فرمایا ہے: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ﴾ [النمل: ۱۴] ''اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، جب کہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔ پھر دیکھیے فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟'' یا ان سے مراد منافقین ہیں جو ظاہر میں مومن، باطن میں کافر تھے۔ اللہ نے کافروں کے ایک گروہ کے کلام کی خبر دی کہ وہ یومِ قیامت یوں کہیں گے۔

یہ اس کے خلاف نہیں کہ یہ آیت مکی ہے اور نفاق بعض مدینے کے ان اعراب میں تھا جو مدینے کے اردگرد بستے تھے۔ اس لیے کہ اللہ نے نفاق کے وقوع کا ذکر مکی سورت میں بھی کیا ہے، سورت عنکبوت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ١١] اس بنیاد پر یہ قول منافقین ہی سے لیا گیا ہے کہ وہ یومِ آخرت میں عذاب کا معاینہ کر کے یوں کہیں گے، اُس وقت ان کا وہ کفر، نافرمانی اور نفاق کھل پڑے گا جس کو دنیا میں چھپاتے تھے، رہا ان کا دنیا میں دوبارہ لوٹ کر جانے کا طلب کرنا، وہ کچھ اس لیے نہیں ہو گا کہ ایمان میں رغبت کریں گے، بلکہ عذاب کے ڈر سے ہو گا۔ جب کہ اپنے کفر کی جزا دیکھیں گے، اسی لیے وہ صرف دنیا کی طرف لوٹ جانا چاہیں گے، تاکہ آگ کے عذاب سے رہائی پائیں، لیکن اگر ان کو پھیر بھی دیا جائے تب بھی وہی کام کریں گے جس سے منع کیے گئے ہیں، وہ اپنی اس دنیا کی طرف لوٹ جانے کی طلب میں جھوٹے ہیں، کیوں کہ وہ ایمان کی رغبت کے لیے نہیں ہے۔ ان کا قول تو یہ ہے کہ زندگی یہی دنیا کی حیات ہے، آخرت کی نہیں ہے، وہ اٹھائے نہیں جائیں گے، مگر اللہ کے سامنے جب ان سے کہا جائے گا کہ کیوں یہ لوٹایا جانا حق ہے یا نہیں؟ تو کہیں گے کہ ہاں حق ہے، حکم ہو گا کہ اب اپنے انکار اور کفر کا مزا چکھو۔ یہ سحر ہے یا تم کو سُجھائی نہیں دیتا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ جب آگ پر کھڑے ہوں گے تو دنیا میں پھر آنے کی تمنا کریں گے، اس حیلے سے کہ اب ہم آیات کو نہیں جھٹلائیں گے، بلکہ ایمان لائیں گے۔ یہ تمنا سچے دل سے نہیں ہو گی، نہ صدقِ نیت اور خلوصِ اعتقاد سے، بلکہ اس سبب سے کہ جس بات کا وہ انکار کرتے تھے، وہ ان کے سامنے آ گئی اور وہ سمجھ گئے کہ وہ شرک کی وجہ سے ہلاک ہوئے، اس لیے وہ آرزوؤں اور جھوٹے وعدوں کی طرف پھریں گے۔ یا ان کا وہ نفاق ان کے اعضا کی شہادت کی وجہ سے ظاہر ہو جائے گا یا ان کے برے اعمال کھل جائیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴾ [الزمر: ٤٧] ”اور ان کے لیے اللہ کی طرف سے وہ (عذاب) ظاہر ہو جائے گا جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتے تھے۔“

امام مبرد نے کہا کہ یعنی ان کے کفر کی جزا جس کو چھپاتے تھے، ظاہر ہو گی اور اگر ان کو ان کی تمنا کے مطابق دنیا میں پھیر بھی دیا جائے تو جن برے کاموں سے انھیں منع کیا گیا تھا، جن میں سب سے زیادہ شرک ہے، پھر وہی کام کرنے لگیں گے۔ جس طرح ابلیس نے اللہ کی آیات دیکھنے کے بعد عناد کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”إِنَّهُمْ لَوْ رُدُّوْا لَمْ يَقْدِرُوْا عَلَى الْهُدٰى“[1] ”اگر انھیں لوٹا دیا جائے تو پھر بھی وہ ہدایت نہیں پائیں گے۔“

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٧٩) اس کی سند حسن ہے۔

وہ ہر حال میں جھوٹے ہیں، گو عذاب دیکھ لیا ہے اور صدق اور ایمان کا وعدہ کرتے ہیں۔ وہ تو یہی کہتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں اور موت کے بعد اٹھنا نہیں ہے۔ مگر اللہ کے سامنے ڈانٹ اور دھمکی کے طور پر پوچھا جائے گا کہ اٹھایا جانا جس کے تم منکر تھے، اب موجود ہے یا نہیں اور یہ جزا حاضر ہے یا نہیں؟ تو بولیں گے کہ ہاں ہے۔ اُس وقت ان کو حکم ہو گا کہ اب اپنے کفر کا مزہ چکھو۔ لفظ ذوق اسی لیے کہا ہے کہ وہ ہر حال میں عذاب کا درد پائیں گے، جس طرح ذائق احساس میں شدت پاتا ہے۔[1]

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

بے شک وہ لوگ خسارے میں رہے جنھوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا، حتیٰ کہ جب ان کے پاس قیامت اچانک آجائے گی تو وہ کہیں گے: ہائے افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی کوتاہی ہوئی! اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھ پر اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ خبردار! بہت برا ہے وہ بوجھ جو وہ اُٹھائیں گے (31) اور دنیا کی زندگی بس کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے یقیناً بہتر ہے جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟ (32)

قیامت کے منکر خسارے میں ہیں:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ سے ملاقات کو جھٹلانے والے قیامت کے دن خائب و خاسر ہوں گے، جبکہ یکا یک ان کے سر پر قیامت آ کھڑی ہو گی، اُس وقت اپنے برے اعمال پر پشیمان و پریشان ہوں گے۔ ابو مرزوق رحمہ اللہ نے کہا کہ کافر یا فاجر جب قبر سے باہر نکلے گا، ایک نہایت بدصورت اور بدبودار کو اپنے سامنے دیکھے گا تو کہے گا: تو کون ہے؟ وہ کہے گا: تو مجھے نہیں پہچانتا؟ کہے گا: نہیں، ہاں مگر تیری صورت اللہ نے قبیح اور تیری بو بہت بری کر دی ہے، وہ کہے گا: میں تیرا خبیث عمل ہوں تو دنیا میں خبیث العمل اور منتن الفعل (بدبودار فعل والا) تھا، مدت تک تو مجھ پر سوار رہا، آب میں تجھ پر سوار ہوں۔ یہ اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھانے کا مطلب ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ داخل نہیں ہوتا کوئی ظالم مرد قبر میں مگر آتا ہے اس کے پاس ایک مرد بدصورت، سیاہ

---

[1] فتح البیان (٤/ ١٢٣۔ ١٢٦)

رنگ، بدبودار میلے کچیلے کپڑے پہنے، وہ اس کے ساتھ قبر میں جاتا ہے، یہ جب اُس کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے: تُو تو بہت بدصورت ہے، وہ کہتا ہے: تیرا عمل بھی ایسا ہی بدصورت تھا۔ یہ کہتا ہے: تیری بو بہت بری ہے۔ وہ کہتا ہے: تیرا کام بھی ایسا ہی بدبودار تھا، یہ کہتا ہے: تیرے کپڑے بہت چرکیں ہیں، وہ کہتا ہے: تیرا عمل بھی ایسا ہی میلا کچیلا تھا۔ یہ کہتا ہے: آخر تو کون ہے؟ وہ کہتا ہے: میں تیرا عمل ہوں، پھر وہ اُس کے ساتھ قیامت تک قبر میں رہتا ہے، کہتا ہے: دنیا میں میں نے تجھ کو اٹھایا ہوا تھا اور تو لذات وشہوات پر سوار تھا، اب تو مجھ کو اٹھا۔ پھر وہ عمل اُس کی پیٹھ پر سوار ہوتا ہے اور اسے ہانک کر آگ میں داخل کرتا ہے۔ یہ اپنے گناہوں کو اپنی پیٹھوں پر لادنے کے معنی ہیں۔[1] دنیا کی حیات کو لہو ولعب فرمایا، اس لیے کہ زیادہ تر اہلِ دنیا کا یہی حال ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یوں ہیں کہ اللہ سے ملاقات کو جھٹلانے سے مراد مر کر جی اٹھنے کی تکذیب ہے یا جزائے اول کی تکذیب ہے۔ خُسرَان سے مراد ثوابِ عظیم کا فوت ہونا دارِ نعیم مقیم میں اور دوزخ کے طبقوں میں دردناک عذاب کا حاصل ہونا ہے۔ قیامت کو ساعت اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں حساب بہت تیزی سے ہوگا اور وہ اچانک لوگوں کے سر پر آجائے گی یا ساعت سے مراد مقدماتِ موت کا وقت آنا ہے اور موت کے ہول آنا ہے، مگر پہلا مطلب زیادہ ظاہر ہے۔ اس وقت کفارِ قریش یا جو بھی ان کے کفریہ اور شرکیہ اعتقاد پر چلتا ہے، وہ حسرت کو پکاریں گے۔ حسرت کسی فوت اور ضائع ہو جانے والی چیز پر سخت ندامت، افسوس اور حسرت کو کہتے ہیں۔ تفریط کسی چیز میں قدرت کے باوجود کمی کرنے کو کہتے ہیں۔ ﴿فِيهَا﴾ کی ضمیر یا تو اس معاملے کی طرف پھرتی ہے یا دنیا کی زندگی کی طرف یا خود دنیا کی طرف۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ حسرت یہ ہوگی کہ دوزخ والے اپنے منازل جنت میں دیکھیں گے۔[2] (رواہ ابن جریر و ابن أبي حاتم و الطبراني وأبو الشیخ و ابن مردویہ والخطیب بسند صحیح)

﴿أَوْزَارَ﴾ وزر کی جمع ہے، وزر بوجھ کو کہتے ہیں، جتنا بوجھ پیٹھ پر لدتا ہے، اتنا کسی اور عضو سے نہیں اٹھتا، مثلاً: سر یا کندھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "بِئْسَ الْحِمْلُ حُمِّلُوا" یعنی بہت برا بوجھ اٹھایا۔[3]

دنیا لہو ولعب ہے:

نہیں زندگانی دنیا کی سوائے لہو ولعب کے۔ اس باطل اور دھوکے کی چیز کو کچھ بقا نہیں۔ لعب کھیل تماشے کو کہتے ہیں، لہو ہر وہ چیز ہے، جو غافل اور مشغول کر دے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد اہلِ شرک ونفاق کی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٨١)

[2] تفسیر الطبري (١١/ ٣٢٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٨٠) الدر المنثور (٣/ ٢٦٢)

[3] تفسیر البغوي (٣/ ١٣٩)

زندگی ہے۔① بعض نے کہا: بلکہ حیاتِ مومن اور کافر کو عام ہے۔ کسی نے کہا: دنیا کا سارا کام کاج لہو ولعب ہے۔ رہا بھلائی کا کام اور عملِ صالح، سو وہ افعالِ آخرت سے ہے، گو دنیا ہی میں کیوں نہ ہو۔ پہلا مطلب زیادہ صحیح ہے۔ یا لعب وہ ہے جو نفس کو فائدہ اٹھانے سے مشغول کرے۔ لہو وہ ہے جو جدوجہد کو بے ہودہ کام کی طرف پھیرے۔

دارِ آخرت سے مراد جنت ہے کہ وہ حیاتِ اخروی کا ٹھکانا ہے، سو وہ دنیا کی حیات سے کہیں بہتر ہے، کیونکہ اس کے منافع ضرر سے خالی ہیں، اُس کے لذات بغیر کسی تکلیف کے ہیں، بلکہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ سو جو لوگ شرک، کفر، لہو ولعب اور معصیت سے بچتے، بھاگتے اور جان چراتے ہیں، یہ حیاتِ جنت ان کو ملے گی، کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے ہو۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ اعمالِ متقین کے سوا جو اعمال ہیں وہ سب لہو ولعب ہیں۔②

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ
وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۳۳ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ
مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ
وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳۴
وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ
تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ
بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْجٰهِلِيْنَ ۝۳۵ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۭ وَالْمَوْتٰى
يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝۳۶

(اے نبی!) تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہیں جو وہ کہتے ہیں، پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے، بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ﴿33﴾ اور (اے نبی!) بے شک آپ سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے گئے، تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور تکلیف دیے جانے پر صبر کیا، حتی کہ ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی اور اللہ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور یقیناً آپ کے پاس رسولوں کی کچھ خبریں آ چکی ہیں ﴿34﴾ اور اگر ان لوگوں (کافروں) کا حق سے منہ موڑنا آپ کو ناگوار ہے تو اگر آپ میں یہ طاقت ہے کہ آپ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لیں، پھر آپ ان کے پاس کوئی نشانی لے آئیں (تو ایسا کر گزریں) اور اگر اللہ چاہتا تو انھیں ہدایت پر جمع کر دیتا، چناں چہ

① تفسير الرازي (١٢/ ١٦٥) ② فتح البيان (٤/ ١٢٧۔ ١٢٩)

آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیں ﴿35﴾ حق کو قبول تو صرف وہ کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں، اللہ انھیں اٹھائے گا، پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿36﴾

نبی اکرم ﷺ کو تسلی:

کافر مانگتے تھے کہ اگر یہ نبی ہے تو اس کے ساتھ ہمیشہ ایک نشانی رہے کہ ہر کوئی دیکھے اور یقین کرے۔ سو شاید نبی اکرم ﷺ کے دل نے چاہا ہوگا، اس لیے یہ تربیت فرمائی کہ اللہ کے تابع رہو، اُس کو منظور ہوتا تو بغیر نشانی کے سب کے دل ایمان پر پھیر لاتا، یعنی سب سے توقع نہ رکھو کہ مانیں، جن کے دل میں اللہ نے کان نہیں دیے وہ سنتے نہیں تو کس طرح مانیں، مگر یہ کافر کہ مردے کی مثال ہیں قیامت میں دیکھ کر یقین کریں گے۔

اس آیت میں اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم کو تمھاری قوم جھٹلاتی ہے، مخالفت کی راہ پر چلتی ہے، تم کو اس کا رنج ہوتا ہے، تم افسوس کرتے ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ﴾ [الفاطر: ٨] ”لہٰذا آپ کی جان ان پر افسوس کرتے ہوئے نہ جاتی رہے۔“ اور جیسے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٣] ”(اے نبی!) شاید اس (غم) سے کہ وہ لوگ ایمان نہیں لاتے، آپ خود کو ہلاک ہی کر لیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴾ [الكهف: ٦] ”پھر شاید آپ تو خود کو ان کے پیچھے غم سے ہلاک کرنے والے ہیں، اگر یہ (کافر) اس بات (قرآن) پر ایمان نہ لائیں۔“

پس حقیقت میں یہ آپ پر جھوٹ کی تہمت نہیں لگاتے ہیں، بلکہ ظالم خود اللہ کی نشانیوں کے منکر ہیں، حق کے دشمن ہیں۔ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابوجہل نے نبی اکرم ﷺ سے کہا تھا کہ ہم تم کو نہیں جھٹلاتے ہم تو جو تم لائے ہو اُس کو جھٹلاتے ہیں، اس پر یہ آیت آئی۔[1] (رواه الحاكم، قال: صحيح على شرط الشيخين) ابو یزید مدنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو ابوجہل ملا، اُس نے نبی اکرم ﷺ سے مصافحہ کیا، ایک آدمی نے کہا تو اس صابی سے مصافحہ کرتا ہے؟ کہا: واللہ میں جانتا ہوں کہ وہ نبی ہے، لیکن ہم کبھی بنی عبد مناف تابعدار نہیں رہے۔ پھر ابو یزید رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی۔[2]

ابو صالح اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: یعنی جانتے ہیں کہ تو رسول ہے، مگر انکار کرتے ہیں۔ سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ بدر کے دن اخنس بن شریق نے بنی زہرہ سے کہا کہ اے بنی زہرہ! محمد تمھارے بھانجے ہیں، اگر نبی ہیں تو تم ان سے لڑ نہ سکو گے اور اگر کاذب ہیں تو تم پر حق ہے کہ بھانجے کو نہ چھیڑو، ٹھہرو میں ابو الحکم سے ملوں، اگر محمد (ﷺ) مغلوب ہوئے تو تم سلامت پھرو گے اور اگر محمد (ﷺ) غالب ہوئے تو تمھاری قوم نے کچھ بھی نہ کیا، اُس دن اس کا نام

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٨٣) یہ روایت مرسل ہے۔

اخنس رکھا گیا، پہلے ابی نام تھا۔ جب ابوجہل سے ملا تو کہا: اے ابوالحکم! کہو محمد سچے ہیں یا جھوٹے؟ اس جگہ سوائے میرے تمھارے اور کوئی قریش نہیں ہے۔ ابوجہل نے کہا: واللہ بے شک محمد (ﷺ) سچے ہیں، محمد ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، لیکن جب کہ بنوقصی جھنڈا، حاجیوں کو پانی پلانا، بیت اللہ کی دربانی اور نبوت سب لے گئے تو اب باقی قریش کے لیے کیا رہ گیا؟ یہ اس آیت کا مطلب ہے: ﴿ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ ...الخ﴾ (آیتِ باب) سو اللہ کی آیات محمد ﷺ ہیں۔[1]

پھر اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی اور تعزیت فرمائی اور کہا کہ صبر کرو جس طرح اولوالعزم نے صبر کیا تھا۔ صبر سے کامیابی ہوگی، جس طرح انبیائے سابقین کو قوم کی تکذیب برداشت کرنے کے بعد دنیا میں فتح یابی حاصل ہوئی، اسی لیے یہ فرمایا کہ اللہ کے کلموں کا بدلنے والا کوئی نہیں ہے۔ اللہ نے مومنین کی مدد دنیا اور آخرت میں لکھ دی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾ ﴾ [الصافات: ۱۷۱۔ ۱۷۳] ''اور درحقیقت ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے ان بندوں کے لیے صادر ہو چکا ہے جو رسول ہیں کہ یقیناً انھی کی مدد کی جائے گی۔ اور بلاشبہ ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

نیز فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [المجادلة: ۲۱] ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ قوی، بڑا زبردست ہے۔'' اے نبی تم کو اگلے رسولوں کی خبر مل چکی ہے کہ اللہ نے کس طرح ان کی مدد اور تائید کی ہے، اُن کی قوم پر جنھوں نے ان کو جھٹلایا تھا۔ فَلَكَ فِيهِمْ أُسْوَةٌ وَبِهِمْ قُدْوَةٌ.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نفق: سرب، یعنی سرنگ کو کہتے ہیں۔[2] یعنی اگر تم کو ان کا منہ پھیر لینا شاق گزرتا ہے تو بہتر ہے کہ تم کسی سرنگ میں گھس کر یا کسی سیڑھی پر چڑھ کر کوئی نشانی لے آؤ جو اس نشانی سے افضل ہو۔ اللہ اگر چاہتا کہ وہ سب راہِ راست پر آ جائیں تو ایسا ہی کرتا، پھر تم نادان کیوں بنو، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ﴾ [یونس: ۹۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب، سارے ہی ایمان لے آتے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ اس بات پر حرص فرماتے تھے کہ سب لوگ ایمان لے آئیں اور ہدایت کے تابع ہوں۔ اللہ نے خبر دی کہ ایمان وہی لائے گا جس کے لیے پہلے سے سعادت مقرر ہو چکی ہے۔[3] پہلی دفعہ نصیحت کرنے سے تمھاری بات وہی شخص مانے گا جس کی آنکھ دیکھنے والی اور کان سننے والے ہیں، جیسے

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۳۳۲۔ ۳۳۳) [2] تفسیر الطبري (۱۱/ ۳۳۷۔ ۳۳۸) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۲۸٤۔ ۱۲۸۵) اس کی سند حسن ہے۔

اُس کا یہ فرمان ہے: ﴿ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۷۰] ''تاکہ وہ اسے ڈرائے جو زندہ ہے اور کافروں پر (اللہ کے عذاب کی) بات ثابت ہوجائے۔'' ﴿ اَلْمَوْتٰى ﴾ سے مراد کفار ہیں، اس لیے کہ ان کے دل مر گئے ہیں، مردہ جسموں کے مشابہ ہو گئے ہیں، یہ ان کے ساتھ گزری ہوئی بات پر افسوس کرنا یا مذاق کرنا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے اس آیت کو رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لیے بھیجا ہے کہ تم قوم کے جھٹلانے پر غم و رنج نہ کرو، یہ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ اگلے رسولوں کو جب جھٹلایا تھا تو انھوں نے صبر کیا تھا۔ عام آزمایش سے کسی قدر مشکل کام آسان ہو جاتا ہے، آخر ان کے صبر کا یہ انجام ہوا کہ وہ منصور ہوئے، اللہ کا وعدہ پورا ہوا، کون اُس کی بات بدل سکتا ہے؟ وَلِلّٰہِ الْحَمْد.

تم کو تو خبر ہے کہ قوموں نے اپنے انبیا کی تکذیب کے لیے ان پر کیا کیا جرأت نہیں کی، مگر بالآخر وہی کامیاب ہوئے۔ یہ جو تمھاری تکذیب کرتے ہیں، ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو پہلے رسولوں کو جھٹلانے والوں کا ہوا۔ یہ طوعاً و کرہاً دینِ اسلام میں داخل ہوں گے۔ اگر ان کا یہ منہ پھیر لینا تم پر گراں گزرتا ہے تو پھر زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان پر کوئی سیڑھی ڈھونڈ نکالو، وہاں جا کر ان کے لیے کوئی نشانی ڈھونڈ کر لے آؤ، تاکہ یہ سب راہِ راست پر آجائیں، لیکن جبکہ یہ کام تم سے نہیں ہوسکتا تو پھر تمھاری بلا رنج و غم کرے، تم اس صدمے سے اپنی جان کیوں کھو دو۔ تم کوئی اس کام کے ان پر داروغہ نہیں ہو۔

بعض نے کہا کہ یہ خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ کو ہے مگر مراد اُمت ہے، اس لیے کہ وہ کفر پر ان کی سرکشی اور ڈٹ جانے پر حد درجہ تنگ دل ہوتے تھے، یہ نہ جانتے تھے کہ اس میں اللہ کی کوئی حکمت ہے جو ان کی عقل میں نہیں آتی۔ اگر اللہ اپنے رسول کو ایسی نشانی دے جس سے وہ سب بے قرار ہو کر ایمان لے آئیں تو پھر تکلیف، یعنی آزمایش اور امتحان کے کیا معنی رہے، اگرچہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ تم جاہلوں میں نہ ہو، کیونکہ اللہ کے اذن سے پہلے کافروں کے دینِ حق کی تبلیغ سے منہ پھیر لینے پر سخت قسم کے غم اور حرص میں مبتلا ہو جانا جاہلوں کا کام ہے اور تم جاہل نہیں ہو تو تم تمام کام اللہ کے حوالے کرو جو عالمِ غیب و شہادت ہے، وہ اپنی مصلحت اور حکمت آپ ہی خوب جانتا ہے، تم کیا جانو اور کوئی کیا جانے۔

اپنا مطلب حاصل نہ ہونے پر رنج و غم نہ کرو، اگر وہ زبردستی ایمان لے بھی آئیں تو بجز اس کے اور کیا ہے کہ شریعت کی حکمت جس کی بنیاد اختیار پر ہے، خارج ہو گئی۔ تمھاری بات وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو سننے والے کان رکھتے ہیں، ورنہ جو مردہ دل ہیں وہ کب کسی کی بات مانتے ہیں؟ سو اللہ ان مردوں کو قیامت کے دن اٹھا کر کھڑا کرے گا، ان کے کیے کی ان کو سزا و جزا دے گا۔ اس کی حکمتِ بالغہ کا یہی تقاضا ہے۔[1]

[1] فتح البیان (٤/ ١٣٠۔ ١٣٣)

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ
عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۷ وَمَا مِنْ
دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا
فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝۳۸
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ
اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۹

اور انھوں نے کہا: اس (نبی) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی (بڑی) نشانی کیوں نہیں نازل کی گئی؟ کہہ دیجیے: بے شک اللہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ کوئی (بڑی) نشانی نازل فرما دے، لیکن لوگوں میں سے اکثر علم نہیں رکھتے (37) اور زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور اپنے دونوں پروں سے اُڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمھاری طرح (الگ) امت نہ ہو، ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)، پھر وہ سب اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے (38) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ اندھیروں میں بہرے اور گونگے ہیں، اللہ جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہے سیدھی راہ پر لے آتا ہے (39)

مشرکوں کا معجزے کا مطالبہ اور تاخیر میں حکمتِ الٰہی:

یعنی اللہ کی قدرت کی نشانیاں سب جہان میں ہیں، ہر قسم کے جانوروں کا کارخانہ ایک قاعدے پر باندھا ہے، انسان کا بھی ایک قاعدہ رکھا ہے۔ وہ پیغمبروں کی زبان سے ان کو سکھاتا ہے، اگر دھیان کریں تو پیغمبروں کے قول پر یہی نشانی کافی ہے، لیکن بہرا اور گونگا اندھیرے میں پڑا کیا دیکھے اور کیا سمجھے! اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے دفتر میں لکھنے سے کوئی چیز نہیں چھوڑی، یعنی لوحِ محفوظ میں۔ اللہ نے کہا یہ مشرک کسی خرقِ عادت چیز کا مطالبہ کرتے ہیں، جیسے ان کا قول نقل کیا ہے: ﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٠] ''ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دے۔''

سو ہم کو اگرچہ اس بات کی قدرت ہے، لیکن حکمت کا تقاضا ہے کہ تاخیر کی جائے۔ اگر ہم کوئی نشانی بھیجیں اور وہ ایمان نہ لائیں تو پھر فوری طور پر سزا موجود ہے، جس طرح کہ اگلی امتوں کا حال ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ''اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی، پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم تو صرف ڈرانے

کے لیے نشانیاں بھیجتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴾
[الشعراء: ٤] ''اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی اُتار دیں، پھر اس کے آگے ان کی گردنیں جھکی ہی رہ جائیں۔''

﴿ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ﴾ سے مراد اور ہر چیز کا اللہ کے احاطۂ علم میں ہونا:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ﴾ سے مراد اصنافِ مصنفہ، یعنی جن کے نام و نشان معلوم ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پرندے ایک امت ہیں، انسان ایک امت ہیں اور جن ایک امت ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک مخلوق ہے [1] تمھاری مثل، سب کا علم اللہ کو ہے، وہ کسی کے رزق اور تدبیر کو نہیں بھولتا، وہ مخلوق خشکی میں رہتی ہو یا دریاؤں میں اور سمندروں میں، جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [هود: ٦] ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے، اور وہ جانتا ہے اس کی قرار گاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے۔'' یعنی سب کے نام، نشان، پھرنے کی جگہ، گنتی اور حرکات و سکنات لکھے دھرے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ [العنكبوت: ٦٠] ''اور کتنے ہی (زمین پر) چلنے پھرنے والے ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے، اللہ انھیں اور تمھیں بھی رزق دیتا ہے اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک سال ٹڈی کم ہوئی، دریافت کیا تو کچھ حال معلوم نہ ہوا، عمر رضی اللہ عنہ مغموم ہوئے، ایک سوار شام کی طرف اور ایک عراق کی طرف بھیجا کہ خبر لاؤ کہیں ٹڈی نظر آئی کہ نہیں جو سوار یمن کی طرف گیا تھا وہ ایک مٹھی بھر ٹڈی لایا، سامنے لا کر ڈالا، عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس کو دیکھا تو تین بار ''الله أكبر'' کہا، پھر کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ نے ہزار امتیں پیدا کی ہیں، چھے سو دریا میں ہیں، چار سو خشکی میں، سب سے پہلے جو چیز ان امتوں میں سے ہلاک ہو گی، وہ ٹڈی ہے۔ جب ٹڈی ہلاک ہو جائے گی تو پھر لگاتار، کسی سلسلے کی طرح جس کی لڑی ٹوٹ جائے، باقی امتیں ہلاک ہو جائیں گی۔ [2] (رواه أبو يعلى) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مویشیوں کی موت ہی ان کا حشر ہے۔ یہی قول امام مجاہد و ضحاک رحمہما اللہ کا ہے۔ [3]

جانور کا حشر بھی قائم ہوگا:

دوسرا قول یہ ہے کہ حشر سے مراد قیامت کے دن اٹھنا ہے، جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا الْوُحُوْشُ

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٨٥_ ١٢٨٦)

(2) مسند ابی یعلیٰ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ امام ہیثمی رحمہ اللہ امام ابو یعلیٰ رحمہ اللہ کی مسند کبیر کی طرف اس کی نسبت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وفيه عبيد بن واقد القيسي وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٦٢٤)

(3) تفسير الطبري (١١/ ٣٤٦_ ٣٤٧) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٨٦)

حُشِرَتْ ﴾ [التكوير: ٥] ''اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے۔'' سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے دو بکریاں دیکھیں جو آپس میں سینگ سے لڑتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! کیا تو جانتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں سینگ سے کیوں لڑتی ہیں؟ کہا: نہیں، فرمایا: لیکن اللہ جانتا ہے اور قریب ہے کہ ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔[1] (رواه أحمد) ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس تھا کہ اتنے میں دو بکریاں سینگ سے لڑنے لگیں، فرمایا: تم جانتے ہو کہ کیوں لڑتی ہیں؟ کہا: نہیں، فرمایا: «لٰكِنَّ اللّٰهَ يَدْرِيْ وَسَيَقْضِيْ بَيْنَهُمَا»[2] (رواه عبدالرزاق و ابن جرير)

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مَا تَرَكَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَمَا يَقْلِبُ طَآئِرٌ جَنَاحَيْهِ فِيْ السَّمَاءِ إِلَّا ذَكَرَ لَنَا مِنْهُ عِلْماً''[3] یعنی آسمان پر کوئی پرندہ پر نہیں مارتا، مگر نبی اکرم ﷺ نے اس کا حال ہم سے بیان فرمایا۔ عثمان رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ بے سینگ کا جانور سینگ والے سے قیامت کے دن بدلہ لے گا۔[4] (رواه أحمد) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قیامت کے دن کو ساری خلق محشور ہوگی، جانور، مویشی، پرندے اور ہر شے۔ اللہ کا عدل وہاں تک پہنچے گا کہ بے سینگ والے کا بدلہ سینگ والے سے لیا جائے گا، پھر فرمائے گا: مٹی ہو جاؤ! اُس وقت کافر کہے گا: کاش! میں بھی مٹی ہو جاتا۔[5] (رواه عبد الرزاق)

کافر اندھے بہرے ہیں:

یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے جو صور کے ذکر میں آئی ہے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ جھٹلانے والے اندھے بہرے ہیں، اندھیرے میں پڑے ہیں، یعنی جہالت، کم علمی اور بے سمجھی میں ان کی مثال بہرے اندھے کی طرح ہے کہ نہ کچھ دیکھے اور نہ کچھ سنے، اس کے ساتھ ساتھ تاریکی میں پڑا ہوا ہو۔ سو ایسا آدمی بھلا کب راہ پر لگ سکتا ہے، اُس کو باہر نکلنے کا راستہ کہاں ہاتھ آ سکتا ہے؟ اللہ کے فرمان کے مطابق: ﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾ ﴾ [البقرة: ١٧۔ ١٨] ''ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب اس (آگ) نے اس کے اردگرد کو

---

[1] مسند أحمد (٥/ ١٦٢) امام البانی رحمہ اللہ ''السلسلة الصحيحة'' (رقم الحديث: ١٥٨٨) پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔

[2] تفسير الصنعاني (٢/ ٢٠٦) تفسير الطبري (١١/ ٣٤٧۔ ٣٤٨) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

[3] تفسير الطبري (١١/ ٣٤٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ منذر ثوری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[4] مسند أحمد (١/ ٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٥٩٧)

[5] تفسير الصنعاني (٢/ ٢٠٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٥) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

روشن کر دیا تو اللہ ان کی روشنی لے گیا اور انھیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، پس وہ دیکھ نہیں پاتے۔ (وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ (سیدھے راستے کی طرف) نہیں لوٹیں گے۔''

نیز جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ [النور: ٤٠]

''یا (کافروں کے اعمال) گہرے سمندر میں اندھیروں کی طرح ہیں، جسے ایک موج ڈھانپتی ہو، اس کے اوپر ایک اور موج ہو، اس کے اوپر بادل ہو، (غرض) اوپر تلے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہوں، جب وہ اپنا ہاتھ نکالے تو لگتا نہیں کہ اسے دیکھ سکے، اور جس کے لیے اللہ نے نور نہیں بنایا تو اس کے لیے (کہیں بھی) کوئی نور نہیں۔'' اسی لیے اللہ نے اس جگہ یوں فرمایا ہے کہ جسے وہ چاہے گمراہ کرے، جسے چاہے سیدھی راہ دکھائے، یعنی خلق میں اُس کا تصرف ہے۔ ''یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ'' ''وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم کرتا ہے جیسا ارادہ کرتا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یوں ہے کہ یہ کفار کا تعنت و مکابرہ ہے، یعنی ہٹ دھرمی اور بے شرمی کہ قرآن پاک جو ایک بڑی نشانی ہے، جس کے مقابلے سے بالکل عاجز ہو گئے ہیں، اُس کو تو شمار گنتی میں نہیں لاتے، یہ فرمائش کرتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور نشانی لاؤ۔ فرشتہ آئے یا پہاڑ سونے کا بن جائے۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم کو یہ قدرت ہے مگر اکثر جاہل ہیں، اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نشانیوں کا نزول اُن کو کوئی فائدہ نہیں دے گا، بلکہ اُن کے آزمایش اور ہلاکت کا سبب ہو جائے گا۔ ''کَمَا ھُوَ سُنَّةُ اللّٰهِ'' کیوں کہ یہ اللہ کا طریقہ ہے۔

پھر فرمایا کہ زمین میں جو چرند اور پرند چلتا اڑتا ہے، ان کے گروہ بھی تمھارے گروہوں کی طرح ہیں، یعنی وہ بھی مختلف قسم کی جماعتیں اور گروہ ہیں۔ ان کی ہر امت تم جیسی ہے۔ اللہ نے جس طرح تم کو بنایا ان کو بھی بنایا، جس طرح تم کو رزق دیتا ہے، اسی طرح اُن کو بھی روزی پہنچاتا ہے۔ وہ سب بھی اللہ کے علم، تقدیر اور ہر شے کے احاطے میں داخل ہیں، جس طرح تم داخل ہو۔ یا اللہ کے ذکر میں وہ تمھاری طرح ہیں اور بنانے والے کے وجود پر دلیل ہیں۔ یا محشور ہونے میں تمھاری طرح ہیں، یہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا: کوئی بھی قسم جانوروں اور پرندوں کی نہیں ہے مگر آدمی میں ان کی ایک شباہت اس کی ہے۔ آدمیوں میں کوئی شیر کی طرح حملہ آور ہے اور کوئی خنزیر کی طرح لالچی ہے۔ کوئی کتے کی طرح چلاتا ہے کوئی مور کی طرح بناؤ کرتا ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مثلیت یہ ہے کہ ان کے تمھاری طرح نام ہیں، جن سے وہ شناخت کیے جاتے ہیں۔[1]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ پیدایش، رزق، موت، اٹھائے جانے اور اقتصاص میں امثال ہیں۔[2] زیادہ

[1] تفسير القرطبي (٦/ ٤٢٠) [2] معاني القرآن (٢/ ٢٤٥) فتح القدير (٢/ ١٦٠)

بہتر ہے کہ مماثلت کو ہر اُس چیز پر محمول کریں، جس کے اندر شباہت پائی جائے، کچھ ہو کہیں ہو، اس بات پر کہ ہر قسم کے جانور ایک امت ہے۔ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی یہ مرفوع حدیث ہے: «لَوْ لَا أَنَّ الْكِلَابَ أُمَّةٌ مِّنَ الْأُمَمِ لَأَمَرْتُ بِقَتْلِهَا فَاقْتُلُوْا مِنْهَا كُلَّ أَسْوَدَ بَهِيْمٍ»[1] (أخرجه أبوداود والترمذي، والنسائي) ''اگر کتے امتوں کی طرح ایک امت نہ ہوتے تو میں ان کو قتل کرنے کا حکم دے دیتا۔ تو تم ان میں سے ہر سیاہ کتے کو قتل کر دیا کرو۔''

کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے جس میں اللہ نے سارے واقعات لکھ رکھے ہیں۔ اس بنیاد پر عموم ظاہر ہے اور کسی نے کہا کہ مراد قرآن ہے کہ اُس میں دین کا ہر معاملہ مفصلاً یا مجملاً موجود ہے اور اُس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [النحل: ۸۹] ''اور ہم نے آپ پر ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی یہ کتاب نازل کی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ [النحل: ٤٤] ''اور ہم نے آپ پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے بیان کریں، جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا۔''

نیز من جملہ اجمال کتابِ عزیز کے یہ آیت شریف ہے: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷] ''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو'' اس آیت میں اتباعِ سنت کا حکم دیا ہے۔ ہر حکم جو نبی نے اپنی امت کو دیا ہے اُس کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں اس آیت کو اتار کر فرما دیا جو کہ اللہ کے اس قول کے مطابق ہے: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ۳۱] ''آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

نیز اس قول کے مطابق: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب: ۲۱] ''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے۔'' غرض قرآن پاک میں حدیث شریف پر چلنے کا حکم آیا ہے اور حدیث شریف میں قرآن پر عمل کرنے کا حکم آیا ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ دونوں پر یکساں چلو، اسی لیے ان دونوں کو ثقلین فرمایا ہے: «تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ ﷺ» أَوْ كَمَا قَالَ[2] ''میں تم میں دو نفیس چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے جب تک ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے: اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت۔''

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۸٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱٤۸٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٤۲۸۰) صحيح الجامع، رقم الحديث (۵۳۲۱)

[2] المستدرك للحاكم (۱/ ۱۷۱)

پھر فرمایا کہ ان امتوں کا جو تمھاری طرح ہیں، جانور اور پرندے وغیرہ، ہماری طرح حشر ہو گا۔ اہلِ علم کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے کہ سبھی کا حشر ہو گا جس طرح بنی آدم کا ہو گا۔ ابوذر، ابوہریرہ رضی اللہ عنہما حسن وغیرہم اسی طرف گئے ہیں۔ ضحاک وغیرہ نے کہا ہے: "حَشْرُهَا مَوْتُهَا"[1] "اُن کا حشر ان کی موت ہے۔" پہلا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے آیتِ باب کی رو سے اور اس سنتِ مطہرہ کی رو سے جس میں کہا گیا ہے کہ بے سینگ والے کا بدلہ سینگ والے سے لیا جائے گا، بعض نے کہا کہ مراد کفار کا حشر ہے۔ بیچ کا کلام جملہ معترضہ ہے۔ حدیث سے مراد تمثیل ہے، بوجہ تعظیم امرِ حساب ہے، کیوں کہ حدیث کے بعض الفاظ میں پتھر اور لکڑی کا بھی ذکر آیا ہے۔

جمادات بے عقل ہوتے ہیں، ان کو کیا خطاب، ثواب اور عقاب ہو گا۔ صحیح مسلم میں آیا ہے: «لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوقَ إِلَىٰ أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ»[2] "تم قیامت کے دن ان کے اہل کو ضرور حقوق ادا کرو گے، یہاں تک کہ سینگ والی بکری سے بے سینگ والی بکری کا بدلہ لیا جائے گا۔" جو لوگ قرآن کو جھٹلانے والے ہیں، اندھے بہروں کی طرف کفر اور جہالت اور حیرت وعناد اور تقلید میں گرفتار ہیں، ان کا کیا ذکر کہ وہ اپنی اصلاح اور فلاح کی راہ پا سکیں، یہ کام اللہ ہی کا ہے کہ جسے چاہے گمراہ کر دے، جسے چاہے سیدھے راستے پر لگا دے۔ وہ رستہ دینِ اسلام ہے، جب اس پر چلو سیدھے منزلِ مقصود کو پہنچ جاؤ اور کہیں بھول بھٹک نہ ہو۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ گمراہ کرنے والا اور ہدایت دینے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے۔ یہ اُسی کا عدل ہے، کس کی مجال ہے کہ اُس سے کچھ سوال کر سکے، وہ جس سے چاہے باز پرس فرمائے۔[3]

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ
اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝40 بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا
تُشْرِكُوْنَ ۝41 وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ
بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝42 فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ
بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ
الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝43 فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٨٦) (2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٢)
(3) فتح البيان (٤/ ١٣٤۔ ١٣٨)

فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا
اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے یا تم پر قیامت آ جائے تو بتاؤ کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم سچے ہو؟ (40) بلکہ تم صرف اسی کو پکارو گے، پھر اگر وہ چاہے گا تو وہ تکلیف دور کر دے گا جس کے لیے تم اسے پکارو گے، اور تم انھیں بھول جاؤ گے جنھیں تم شریک ٹھہراتے تھے (41) اور تحقیق ہم نے آپ سے پہلی امتوں کی طرف رسول بھیجے، پھر ہم نے ان (امتوں) کو سختی اور تکلیف کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں (42) پھر جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو انھوں نے عاجزی کیوں نہ اختیار کی؟ لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور جو عمل وہ کرتے تھے (ان کو) شیطان نے ان کے لیے مزین (خوبصورت) بنا دیا (43) پھر جب انھوں نے وہ نصیحت بھلا دی جو انھیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، حتی کہ جب وہ ان چیزوں پر اِترانے لگے جو انھیں دی گئی تھیں، تو ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا، پھر وہ ناامید ہو کر رہ گئے (44) پھر اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے (45)

مصیبت کے وقت ایک اللہ کو پکارنے کے ساتھ مشرکوں پر حجت قائم کرنا:

یعنی گناہ گار کو اللہ تعالیٰ تھوڑا سا پکڑتا ہے اور اگر وہ گڑگڑایا، توبہ کی تو بچ گیا اور اگر اتنی پکڑ نہ مانے تو پھر بھلاوا دیا اور خوبی کے دروازے کھول دیے، جب خوب گناہ میں غرق ہوا تو بے خبر پکڑا گیا۔ یہ ارشاد ہے کہ آدمی کو گناہ پر تنبیہ پہنچے تو جلد توبہ کر لے، یہ راہ نہ دیکھے کہ اس سے زیادہ پہنچے تو یقین کروں۔ اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ خلق میں ہمارا ہی تصرف جاری ہے۔ کوئی ہمارے حکم کو پیچھے نہیں ڈال سکتا نہ کسی کو یہ قدرت ہے کہ حکم کو نہ مانے اور پھیر دے، بلکہ جب اللہ سے سوال کیا جاتا ہے تو جس کی دعا چاہتا ہے قبول فرماتا ہے۔ اسی لیے اگر عذاب یا قیامت آئے تو پھر تم کسی کو اللہ کے سوا نہ پکارو گے، کیوں کہ تمھیں معلوم ہے کہ اس کے سوا کسی کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ عذاب کو دفع کر سکے۔ اگر تم غیر اللہ کو الٰہ پکڑنے میں سچے ہو، بلکہ وقتِ ضرورت شرکا کو بھول کر صرف اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہو، اُس وقت نہ وہ اصنام و انداد تم کو یاد آتے ہیں، نہ اولیا و مشائخ و فقرا و مجذوبین و سالکین، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ''اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو

وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم جاتے ہیں، پھر جب وہ (اللہ) تمھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

﴿ بَاْسَآءِ ﴾ سے مراد فقر، روزی کی تنگی، تنگدستی، تہی دستی اور فاقہ کشی وغیرہ ہے۔ ﴿ اَلضَّرَّآءِ ﴾ سے مراد بیماریاں، کمزوریاں اور بیماریوں کی تکالیف ہیں، یہ اس لیے کہ شاید اللہ کو پکاریں، تضرع و زاری اور خشوع وخضوع کریں۔ سو جب ہم نے ان کو مبتلا کیا تو انھوں نے کس لیے تضرع نہ کیا؟! عاجزی اور مسکینی سے پیش نہ آئے، بلکہ ان کے دل سخت پڑ گئے، رقت اور خشوع جاتا رہا۔

شیطان نے شرک اور گناہ اور دشمنی کو ان کی نظروں میں خوب صورت کر کے دکھلا دیا۔ اس لیے جب ان کو ہماری وہ نصیحتیں یاد نہ رہیں اور منہ پھیر کر اُس نصیحت کو بھول گئے اور اسے پسِ پشت ڈال دیا تو ہم نے بھی ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیے کہ لو خوب سا کھاؤ، پیو، اڑاؤ اور کھیل تماشے میں مصروف رہو، حالانکہ یہ ہمارا ان کے ساتھ استدراج ہے کہ ہم نے ان کو مہلت دی (عياذاً باللّٰهِ من مُّكرِهٖ) کیوں کہ دشمن کو غافل کر کے مارتے ہیں، اسی لیے فرمایا کہ جب وہ خوش ہونے لگے اُس مال، اولاد اور رزق پر جو ان کو دیا گیا تھا تو ناگہاں یکا یک غفلت اور بے خبری کی حالت میں ان کو پکڑ لیا۔ اب وہ ہر چیز سے مایوس ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مُبْلِسُ بہ معنی آیِسُ یعنی ناامید ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: جس پر اللہ وسعت کرے اور وہ نہ سمجھے کہ یہ اس کے ساتھ مکر ہے تو جانو کہ وہ کچھ عقل نہیں رکھتا اور جس پر تنگی کرے اور وہ نہ سمجھے کہ اُس کو مہلت دی گئی ہے تو وہ بھی بے عقل ہے، پھر آیتِ باب پڑھی۔

اللہ کی پکڑ کے انداز:

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ ربِ کعبہ کی قسم ہے! قوم سے مکر کیا ہے، حاجت دے کر پکڑا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: قوم نے اللہ کے حکم سے بغاوت کی۔ اللہ کسی قوم کو نہیں پکڑتا مگر ان کی سکرت (مدہوشی)، غرت (دھوکے) اور نعمت کے وقت، سو تم اللہ سے دھوکا نہ کھاؤ، اللہ سے صرف فاسق قوم ہی دھوکا کھاتی ہے،[1] یعنی جب کسی قوم کی آنکھوں پر چربی چھا جاتی ہے، عیش و آرام، فسق و فجور میں غرقاب ہو جاتے ہیں تو اُس وقت اللہ ان کو پکڑ لیتا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: فتحِ ابواب سے مراد دنیا کی فراوانی اور آسانی ہے۔[2] عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تو دیکھے کہ اللہ بندے کو اس کے گناہوں کے باوجود جو وہ چاہتا ہے دیتا ہے تو نہیں ہے یہ مگر استدراج (ڈھیل)، پھر یہ آیتِ باب پڑھی۔[3] (رواه أحمد و ابن جرير)

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ کسی قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٩١۔ ١٢٩٢) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ١٨٢)

[3] مسند أحمد (٤/ ١٥٤) تفسير الطبري (١١/ ٣٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤١٣)

تو ان پر خیانت کا دروازہ کھول دیتا ہے، جب وہ اس پر خوش ہوتے ہیں تو اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے تو پھر وہ ناامید ہو کر رہ جاتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ ... الخ﴾ (آیتِ باب)[1] (رواہ أحمد وغیرہ)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں بیان کیا ہے کہ اللہ نے فرمایا: سچ کہو، اگر تم پر کوئی عذاب یا موت آ جائے تو تم غیر اللہ کو پکارو گے یا اللہ کو؟ ہاں اُس دن تو تم صرف اللہ ہی کو پکارو گے، غیر کو بالکل فراموش کر جاؤ گے۔ اگلی امتوں نے جب رسولوں کو جھٹلایا تو ان کو خوف اور تکلیف نے پکڑا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی بادشاہ کا خوف، گرانیِ نرخ، سختی،[2] گرسنگی، فقر، سخت مکروہ دہر بلا۔ بأسا، بؤس سے، ماخوذ ہے، بؤس شدت کو کہتے ہیں یا بأسا سے مراد مالوں کی مصیبت اور ضرّاء سے بدنوں کی مصیبت مراد ہے، اکثر نے یہی کہا ہے۔ یہ پکڑ اس لیے تھی کہ شاید وہ عاجزی اور ذلت کا اظہار کریں۔

یہ توقع بشری عقل کے مطابق ہے مگر انھوں نے ایسا نہ کیا۔ یہ ان پر ایک قسم کا عذاب ہے کہ ہر حال میں انھوں نے دعا کو چھوڑ رکھا ہے، یہاں تک کہ عذاب کے نزول کے وقت بھی اپنی سرکشی اور کفر کی زیادتی کی وجہ سے ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اللہ کو پکاریں۔ یا یہ مراد ہے کہ عذاب کے نزول کے وقت جو عاجزی اُن سے ظاہر ہوئی وہ عاجزی ضروری تھی، اس میں کچھ اخلاصِ نیت اور صحیح ارادہ نہیں تھا کہ اس عاجزی کرنے والے کو کچھ فائدہ ہوتا۔ مگر پہلا مفہوم زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یوں کہا ہے کہ لیکن ان کے دل سخت اور درشت ہو گئے، خضوع اور خشوع کچھ بھی انھوں نے نہ کیا بلکہ اسی سخت دلی پر جمے رہے۔ اُدھر شیطان نے ان کے عمل مزین کر کے دکھائے، انھیں کفر میں اور پکا کر دیا اور معاصی پر لگا دیا۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کے پاس عاجزی کو ترک کر دینے کا کوئی عذر نہیں، سوائے اس کے کہ ان کے دل کی سختی انھیں بہت اچھی لگتی تھی۔[3]

پس جب وہ اس وعظ کو بھول گئے اور وہ نصیحت جس کا ذکر کیا گیا اس سے منہ موڑ لیا تو ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے گئے، کیوں کہ اگر سچ مچ ان سے بھول ہوئی ہوتی تو پکڑ نہ ہوتی، کیونکہ وہ ان کا فعل نہ تھا۔ غرض کہ بجائے تنگی اور تکلیف کے انھیں عیش و عشرت اور رزق کی فراوانی دی۔ بجائے جسمانی تکلیف کے انھیں صحت، جسم اور بدن کی سلامتی بخشی۔ اس داد و دہش پر خوش ہوئے، اترائے اور گمان کیا کہ جس کفر پر وہ ہیں، وہی سچا اور صحیح ہے۔ جب ان کو یہ کچھ ملا، یہ خوشی، غرور اور گھمنڈ قارون کی خوشی کی طرح تھی تو پھر اچانک کسی اور علامت اور امارت کے بغیر ان کو پکڑ لیا، جس کا خیال بھی ان کو نہ تھا۔ محمد بن نصر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ بیس برس مہلت دی،[4] صحیح نہیں ہے، شارع سے نقل کا محتاج ہے۔

اہلِ معانی نے کہا ہے کہ وہ گھمنڈ اور سلامتی کی حالت میں پکڑے گئے، تاکہ ان کی عافیت اور طرح طرح کی

---

[1] مسند الشامیین (١/ ٣٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابراہیم بن ابی عبلہ رحمہ اللہ کا سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٦١٦٣)

[2] الدر المنثور (٣/ ٢٦٨) [3] الکشاف (٢/ ٢٣) [4] تفسیر الطبري (١١/ ٣٥٩۔ ٣٦٠)

لذتوں اور راحتوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کی حسرت سخت تر ہو۔ اچانک وہ اپنی جگہ یا اپنے وقت میں ہلاک ہو کر رہ گئے، یہ امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مُبلس بہ معنی مہلک ہے۔[1] مُبلس کے دوسرے معنی ہیں: حالِ بد کی شدت کی وجہ سے خیر سے قطعی ناامید اور حزین ہونا۔ اسی لبس سے ابلیس کا نام بھی نکالا گیا ہے، اس لیے کہ وہ مبلس یعنی ہر بہتری، خوبی و خیر سے ناامید ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ وہ کسی قسم کی خوشی سے محزون، متحیر اور ناامید ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ مبلس جس پر تکلیف اور مشقت ڈالی گئی ہو، اس کو کہتے ہیں، جس پر کوئی شر نازل ہوا ہے اور وہ اُس کو دور نہیں کر سکتا۔ مبلس کا لفظ مسکین سے زیادہ سخت ہے۔[2] مبلس نااُمید کو کہتے ہیں، جس سے تمام امیدیں منقطع ہو جائیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: نادم حزین کو کہتے ہیں۔[3]

پھر اللہ نے فرمایا کہ ظالموں کی جڑ کٹ گئی، کافر ہلاک ہوئے، رسولوں کو فتح ملی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اللہ نے اس بات پر اپنی تعریف کی کہ ظالموں کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا۔[4] اس میں اہلِ ایمان کو تعلیم ہے کہ جب اللہ کی کوئی نعمت نازل ہو، جیسے مفسدین کا ہلاک ہونا جن کا وجود اللہ کے بندوں پر سب بلاؤں سے زیادہ سخت تر ہے، تو اس وقت الحمد للہ کہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ابوجہل کے قتل پر سجدۂ شکر ادا کیا تھا، معلوم ہوا کہ دین کے دشمن کی ہلاکت پر سجدۂ شکر بجا لانا یا کلمۂ شکر ادا کرنا مسنون ہے: ’’اَللّٰهُمَّ أَرِحْ عِبَادَكَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ ظُلْمِ الظَّالِمِيْنَ، وَاقْطَعْ دَابِرَهُمْ، وَأَبْدِلْهُ بِالْعَدْلِ الشَّامِلِ لِجَمِيْعِهِمْ، آمين‘‘ ’’اے اللہ اپنے مومن بندوں کو ظالموں کے ظلم سے نجات دے کر راحت پہنچا اور ظالموں کی جڑ کاٹ دے اور اس ظلم کو سب کے لیے عدلِ عام میں تبدیل کر دے۔[5] آمین

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝46 قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝47 وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝48 وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝49

(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے: اگر اللہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں چھین لے اور تمھارے دلوں پر مہر

[1] تفسير الطبري (١١/ ٣٦٠_ ٣٦١) [2] تفسير الطبري (١١/ ٣٦١) [3] تفسير البغوي (٣/ ١٤٣_ ١٤٤)
[4] معاني القرآن (٢/ ٢٤٩) [5] فتح البيان (٤/ ١٣٨_ ١٤٣)

لگا دے تو بتاؤ اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھیں یہ (چیزیں) لا دے؟ دیکھیے کس طرح ہم آیتیں پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، پھر بھی وہ منہ موڑتے ہیں ﴿46﴾ کہیے: اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک یا کھلم کھلا آ جائے تو بتاؤ کیا ظالموں کے سوا کوئی اور لوگ بھی ہلاک کیے جائیں گے؟ ﴿47﴾ اور ہم نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جسے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا نہ بنایا ہو، پھر جو شخص ایمان لے آئے اور اپنی اصلاح کر لے تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿48﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، انھیں اس (نافرمانی کی) وجہ سے عذاب پہنچے گا جو نافرمانی وہ کرتے تھے ﴿49﴾

اچانک عذاب اور نعمتیں سلب کر لینے کی وعید اور اہلِ ایمان کے لیے استثنا:

یعنی توبہ کو دیر نہ کرے جو کان اور آنکھ اور جو دل اس وقت ہے شاید پھر نہ ملے اور شاید اس دیر میں عذاب پہنچ جائے تو اگر توبہ کر چکا ہو اس عذاب سے بچ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ تم ان مکذبین معاندین سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمھارے کان، آنکھیں سلب کر لے، جس طرح کہ تم کو دیے تھے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ﴾ [الملك: ٢٣] ”کہہ دیجیے: وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔“

نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ ﴾ [الأنفال: ٢٤] ”اور تم جان لو کہ یقیناً اللہ بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔“ تو پھر بھلا سوائے اللہ کے کوئی ایسا ہے جو تم کو پھیر دے۔ ہاں اللہ کے سوا کسی کو ایسی قدرت نہیں ہے، اسی لیے یہ فرمایا کہ تو دیکھ کہ ہم کس طرح آیات کا بیان، ان کی وضاحت اور تفسیر کرتے ہیں۔ یہ سب آیتیں اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو کچھ اس کے سوا پوجتے ہیں، وہ سب باطل اور گمراہی ہے۔

بعد از خدای ہر چہ پرستند خوب نیست — بے دولت آنکہ یکتا بغیر اختیار کرد

”اللہ کے علاوہ جس کسی کی بھی پرستش کی گئی، اچھی بات نہیں۔ جس کسی نے اس وحدہ لاشریک لہ کے علاوہ کسی کی بندگی اختیار کی وہ محروم ہی رہا۔“

لیکن وہ لوگ باوجود اس بیان اور وضاحت کے خود حق سے روگردان اور لوگوں کو صحیح بات کے اتباع سے باز رکھتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ يَصْدِفُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں: يَعْدِلُوْنَ۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ”يُعْرِضُوْنَ“ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا: ”يَصُدُّوْنَ“۔[2]

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٣٦٧) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٩٤) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسير الطبري (١١/ ٣٦٧_٣٦٨)

پھر اللہ نے فرمایا: بھلا اگر تم پر ناگہاں یا کھلم کھلا عذاب آئے تو وہی ظالم لوگ ہلاک ہوں گے، یعنی جو مشرک ہیں۔ عذاب انہی کو گھیرے گا۔ جو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرتے ہیں، وہ نجات پائیں گے، ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اللہ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۸۲] ”جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔“

اللہ کے بھیجے ہوئے مومنوں کے لیے بھلائیوں اور نعمتوں کی خوش خبری دینے والے اور کافروں کے لیے اللہ کے انتقام اور عذاب سے ڈرانے والے ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ جس کا دل ایمان لایا اور عمل اچھا ہوا تو آیندہ اُس کو نہ کچھ خوف ہے نہ گذشتہ پر غم و افسوس۔ اللہ ماضی اور مستقبل میں ان کا دوست دار اور کارساز ہے۔ ہاں جنھوں نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا، اللہ کے اوامر و اطاعت سے باہر ہو کر محارم و مناہی کا ارتکاب کیا اور حرمات میں منہمک رہے، ان کو ضرور عذاب پہنچے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ تو کہہ دے کہ اگر اللہ تمھارے کان، آنکھ لے کر دل پر مہر لگا دے تو کیا کوئی اور الٰہ بھی ہے جو پھر وہ چیزیں تم کو دے؟ یہ سوال سختی اور ملامت کے لیے ہے۔ ہماری یہ آیتوں کے واسطے پھیر پھار دیکھو اور ان کا منہ پھیر لینا دیکھو، یعنی تعجب کی جگہ ہے کہ آیات کا بیان اس طرح کھول کر کیا جائے، پھر بھی وہ ان کو قبول نہ کریں۔ عذاب کا اچانک آنا یہ ہے کہ رات کو آئے یا بغیر کسی تقدیم مقدمات کے آئے۔ اچانک آ جانا یہ ہے کہ دن کو آئے یا نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد آئے۔ ظالمین سے اس جگہ مشرکین مراد ہیں، یعنی عذاب اور غضب اور غصے سے انہی ناپاکوں کی ہلاکت ہوتی ہے۔ پیغمبر تو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ہیں۔ عظیم جزا کی خوش خبری سناتے ہیں اور عذاب الیم سے ڈراتے ہیں۔ مومن صالح، بے خوف اور بے غم رہتا ہے، عذاب فاسقوں ہی کو چھوتا ہے۔[1]

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ
اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰
وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ
مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۵۱ وَلَا تَطْرُدِ

[1] فتح البیان (۴/ ۱۴۳۔ ۱۴۵)

الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا
عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ
شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۲ وَكَذٰلِكَ
فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ
بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝۵۳ وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ
الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۴

(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا ہوں، اور
نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی
ہے۔ کہہ دیجیے: کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتا ہے؟ پھر کیا تم غور نہیں کرتے؟ (50) اور (اے نبی!) آپ اس
(قرآن) کے ذریعے سے ان لوگوں کو ڈرائیں جنھیں ڈر رہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کیے جائیں
گے، وہاں اس کے سوا ان کا کوئی دوست اور سفارشی نہ ہوگا، شاید کہ وہ پرہیز گاری اختیار کریں (51) اور ان لوگوں
کو اپنے سے مت دور کریں جو اپنے رب کو صبح اور شام پکارتے ہیں، وہ اپنے رب کا چہرہ (رضا مندی) چاہتے
ہیں، ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ آپ پر نہیں اور آپ کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ ان پر
نہیں، پھر (اگر) آپ ان کو اپنے سے دور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے (52) اور ہم نے
اسی طرح لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمایش میں ڈالا ہے، تاکہ وہ (انھیں دیکھ کر) کہیں:
کیا ہم میں سے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ (ہاں) کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو (ان سے)
زیادہ نہیں جانتا؟ (53) اور جب وہ لوگ آپ کے پاس آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو کہہ دیجیے:
تم پر سلام ہو، تمھارے رب نے مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ بے شک تم میں سے جو شخص جہالت سے برا
عمل کرے، پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو یقیناً وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (54)

رسول نہ خزانوں کا مالک ہے نہ عالم الغیب ہے:

پیغمبر آدمی کے سوا کچھ اور نہیں ہو جاتے کہ ان سے محال باتیں طلب کی جائیں۔ ایک اندھے اور دیکھتے کا
فرق ہے۔ پھر کہا کہ یہ سن کر گناہ سے بچتے رہیں۔ کافروں کے بعض سرداروں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تمھاری

بات سننے کو ہمارا دل چاہتا ہے، لیکن تمھارے پاس رذیل قسم کے لوگ بیٹھتے ہیں، ہم ان کے برابر نہیں بیٹھ سکتے، اس پر یہ آیت اتری، یعنی اللہ کے طالب اگرچہ غریب ہیں، انھی کی خاطر مقدم ہے۔ پھر دولت مندوں کو غریبوں سے آزمایا ہے کہ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ کیا یہ اللہ کے فضل کے لائق ہیں اور اللہ ان کے دل دیکھتا ہے کہ اللہ کا حق تسلیم کرتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ غریب مسلمانوں کا دل بڑھا اور انھیں خوش خبری سنا۔ اللہ پاک نے اپنے رسول مقبول ﷺ سے فرمایا کہ تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں کچھ اللہ کے خزانوں کا مالک یا ان پر بااختیار نہیں ہوں کہ جس کو چاہوں مالدار، متمول اور آسودہ حال کر دوں۔ یہ اختیار تو اللہ ہی کو ہے کہ جسے چاہے بہت دے، جسے چاہے کم دے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾ [الروم: ٣٧] ''اللہ جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ اگر کوئی یہ اعتقاد کرے کہ فلاں مرید کو فلاں پیر نے ایک خزانہ بخش دیا یا مال دار کر دیا تو یہ عقیدہ شرک ہے۔ پھر علمِ غیب کی نفی فرمائی کہ یہ بھی ان سب سے کہہ دو کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں، غیب کا عالم اللہ ہے، مجھ کو اتنا ہی معلوم ہے جس پر مجھ کو اطلاع دی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ انبیا کو علمِ غیب ہوتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ جب کہ سید الرسل ﷺ کو علمِ غیب نہ ہوا تو پھر کسی اور رسول کا کیا ذکر ہے! اور جب رسول غیب دان نہ ٹھہرے تو پھر کسی پیر، شہید، ولی، مجذوب، سالک، عابد اور عالم کی کیا اصل ہے؟!

پھر جب ان لوگوں کو جو اللہ کے دوست کہلاتے ہیں، یہ علم نہ ہوا تو پھر کاہن، نجومی، رمال وغیرہم باوجود اللہ کے دشمن ہونے کے کس قطار وشمار میں ہیں؟ پھر یہ بھی کہلوایا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں۔ میں تو تمام انسانوں میں سے ایک بشر ہوں۔ جو سارے نوع بشر کا حال ہے وہی میرا حال ہے، فقط اتنی بات ہے کہ میں وحی کا تابع ہوں۔ وحی بھیج کر مجھ کو شرف بخشا، مجھ پر انعام اور احسان کیا مگر ہرگز اتباعِ وحی کے دائرے سے ایک بالشت بھر باہر نہیں ہو سکتا نہ اس سے کم۔

بھلا کہیں اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتا ہے، تمھیں اتنی بھی سمجھ بوجھ اور فکر نہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۚ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ [الرعد: ١٩] ''کیا پھر وہ شخص جو جانتا ہے کہ یقیناً جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہی حق ہے، وہ اس شخص کے مانند (ہو سکتا) ہے جو اندھا ہے؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔''

غریب ومخلص صحابہ کو تبلیغ کرنے، ان کی عزت کرنے اور ان کو دور نہ کرنے کا حکم:

پھر فرمایا کہ اے پیغمبر! تم اس قرآن سے ان لوگوں کو ڈراؤ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، برے حساب کا

خوف رکھتے ہیں، قیامت کے دن اپنے رب کی طرف حشر کا فکر کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ اُس دن اللہ کے سوا ان کا کوئی ولی اور شفیع نہیں ہے جو عذاب سے بچائے۔ سو تم ان کو اُس دن سے ڈراؤ شاید وہ ڈر جائیں اور اس دارِ فانی میں وہ کام کریں جو اُس دن اُن کے کام آئے اور عذاب سے رہائی دے کر بڑا ثواب دلوائے۔ جو لوگ اس صفت کے ہیں ان کو تم دور نہ کرو، بلکہ اپنے پاس بٹھاؤ، اپنا خاص الخاص بناؤ، جیسے اُس کا فرمان ہے: ﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴾ [الكهف: ٢٨] ”اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں، جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں اور آپ کی آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں کہ دنیاوی زندگی کی زینت چاہنے لگیں اور اس شخص کی اطاعت نہ کریں، جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا، اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا، اور اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔“

یہ جو فرمایا کہ وہ صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس پکارنے سے مراد عبادت ہے۔ سعید بن مسیّب، مجاہد، حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد فرض نماز ہے[1] اور یہ اللہ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ”اور تمھارے رب نے کہا ہے: تم مجھے پکارو، میں تمھاری (دعائیں) قبول کروں گا۔“ یعنی تم عبادت کرو میں قبول کروں گا، دعا کرنا بھی عبادت ہے۔ اس دعا اور عبادت سے ان کا مقصد اللہ کو خوش کرنا ہے۔ وہ اپنی عبادات، دعاؤں اور طاعات میں مخلص ہیں۔ نہ اُن کا حساب رسول پر اور نہ رسول کا حساب ان پر، نوح علیہ السلام کے اس قول کی طرح: ﴿ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴾ [الشعراء: ١١٣] ”ان کا حساب تو میرے رب کے ذمے ہے، اگر تم کچھ شعور رکھتے ہو۔“

شانِ نزول:

کچھ لوگوں نے کہا تھا: کیا ہم تم پر ایمان لائیں، تمھارے تابعدار تو رذیل لوگ ہیں، اس پر نوح علیہ السلام نے کہا: مجھ کو ان کے عمل کا کچھ علم نہیں، اُن کا حساب مجھ پر نہیں، یعنی جس طرح میرا حساب اُن پر نہیں ہے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! اگر تو ان کو اپنے پاس سے نکال دے گا، دور کر دے گا تو ظالم ٹھہرے گا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ شرفائے قریش کا ایک گروہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا، آپ کے پاس خباب، صہیب، بلال اور عمار رضی اللہ عنہم تھے، کہا: اے محمد! کیا تم ان لوگوں کو پسند کرتے ہو؟ اُس پر یہ آیت ﴿ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴾ تک اتری۔[2] (رواه أحمد) امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ چاروں ضعیف (غریب) مسلمان نبی اکرم ﷺ کے پاس تھے۔ سردارانِ قریش نے کہا: کیا تم اپنی قوم

[1] تفسير الطبري (١١/ ٣٨٢) تفسير ابن كثير (٢/ ١٨٣)

[2] مسند أحمد (١/ ٤٢٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٩٧)

میں سے ان کے ساتھ راضی ہوئے؟ کیا ہم میں سے انھیں پر اللہ نے احسان کیا؟ کیا ہم ان کے تابع ہو کر رہیں گے؟ تم ان کو نکال دو، شاید ہم تمھارے تابع ہو جائیں، اُس پر یہ آیت آئی۔[1]

خباب رضی اللہ عنہ نے کہا: اقرع بن حابس تیمی اور عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ عنہما آئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چاروں کے پاس بیٹھا پایا جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ضعفائے مومنین میں سے تھے، ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد دیکھ کر حقیر سمجھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تخلیے میں کہا کہ ہم تمھارے پاس ایک ایسی نشست چاہتے ہیں جس سے عرب ہماری فضیلت پہچانیں۔ تمھارے پاس عرب کے وفود آتے ہیں، ہم کو شرم آتی ہے کہ ہم کو ان غلاموں کے پاس دیکھیں سو جب ہم تمھارے پاس آیا کریں تو تم ان کو اٹھا دیا کرو، جب ہم چلے جائیں تو پھر ان کے پاس بیٹھ جایا کرو، اگر تمھارا جی چاہے۔ فرمایا: بہتر، انھوں نے کہا اچھا ایک خط اسی مضمون کا ہمیں لکھ دو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ منگوایا، علی رضی اللہ عنہ کو بلایا کہ وہ خط لکھیں۔ ہم ایک کونے میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں جبریل علیہ السلام آئے، کہا: ﴿لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ ... الخ﴾ (آیتِ باب) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کاغذ اٹھا کر پھینک دیا، ہم کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا۔[2] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير)

یہ حدیث غریب ہے، اس لیے کہ یہ آیت مکی ہے۔ اقرع اور عیینہ ہجرت سے ایک مدت کے بعد اسلام لائے ہیں۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آیت چھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اتری ہے، ان میں سے ایک ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ ہم جلدی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھتے اور بات سنتے۔ قریش نے کہا کہ تم ہم کو چھوڑ کر ان کو پاس بٹھاتے ہو، اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[3] (رواه الحاكم على شرط الشيخين و ابن حبان في صحيحه)

اللہ نے کہا کہ ہم اسی طرح بعض کا بعض سے امتحان اور اختیار کرتے ہیں، تاکہ وہ کہیں کہ اللہ کے ممنون منت یہی لوگ ہیں، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ابتدائی ایام میں آپ کے زیادہ تر متبعین یہی کمزور مرد اور عورتیں اور غلام اور لونڈیاں تھیں، اشراف میں تھوڑے سے لوگ متبع ہوئے تھے، جس طرح کہ قومِ نوح نے نوح علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾ [هود: ٢٧] ''اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بس انھی لوگوں نے بے سوچے سمجھے تیری پیروی کی ہے جو ہمارے کمین ہیں۔'' یا جس طرح ہرقل ملک روم نے ابوسفیان سے پوچھا تھا کہ ان کے تابع اشراف ہوتے ہیں یا ضعیف لوگ؟ کہا: بلکہ ضعیف لوگ، کہا: یہ ضعیف لوگ ہی رسولوں کے متبع ہوا کرتے ہیں۔

غرض کہ مشرکینِ قریش ضعفائے مومنین سے مسخرا پن کرتے، جس پر قدرت پاتے اسے شدید تکلیف دیتے تھے، کہتے: کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔ یعنی اللہ ان کو راہِ خیر نہ دکھائے گا۔ جدھر یہ

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٣٧٤۔ ٣٧٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٩٧)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٢٩٧) تفسير الطبري (١١/ ٣٧٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٣) مستدرك الحاكم (٣/ ٣٦٠) صحيح ابن حبان (١٤/ ٥٣٥)

گئے ہیں اگر وہ اچھا کام ہوتا تو ہم کو کیوں چھوڑ دیتا! ان کا قول اللہ نے نقل کیا ہے: ﴿ لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ﴾ [الأحقاف: ١١] ''اگر وہ (دین) بہتر ہوتا تو وہ (عام لوگ) اس (کو قبول کرنے) میں ہم سے پہل نہ کرتے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق: ﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴾ [مریم: ٧٣] ''اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں: فریقین میں سے کس کا مقام بہتر اور کس کی مجلس زیادہ اچھی ہے؟''

اللہ نے ان کے جواب میں فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴾ [مریم: ٧٤] ''اور ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، وہ ان سے اثاثوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ میں کہیں بڑھ کر تھیں۔'' پھر ان کے جواب میں اللہ نے اس جگہ یوں کہا کہ کیا اللہ شاکرین کو نہیں جانتا، یعنی ان کے اقوال، افعال، ضمائر (دل کی باتیں) اور بھیدوں سے بہ خوبی واقف ہے۔ اُن کو ہدایت کے رستے بتاتا ہے، اندھیروں سے نکال کر اپنے حکم سے نور کی طرف لے جا کر سیدھے راستے پر لگاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ٦٩] ''اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں، ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھاتے ہیں اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نہ تمھاری صورتوں کو دیکھتا ہے نہ تمھارے رنگوں کو، لیکن وہ تمھارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، مطعم بن عدی، حارث بن نوفل، قرطہ بن عمر، بنی عبد مناف کے اشراف کافر ابو طالب کے پاس آئے اور کہا کہ اگر تمھارا بھتیجا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے غلاموں اور حلفا کو پھیر دے کہ وہ ہمارے غلام اور آزاد کردہ لوگ ہیں تو ہمارے دل میں بات بڑی نظر آئی کہ ہم ان کے زیادہ تر مطیع ہوں، ان کے لیے زیادہ بہتر اور قریب یہ ہے کہ وہ ہماری اتباع اور تصدیق کریں۔ ابو طالب نے یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی، اس پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ یہی کرو دیکھو وہ کیا چاہتے ہیں اور اپنی بات کا کیا انجام دکھاتے ہیں۔ اللہ نے یہ آیتِ باب ﴿ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴾ تک نازل فرمائی۔

بلال و عمار بن یاسر و سالم مولیٰ ابی حذیفہ و صبیح مولی اسید تھے، حلفا میں ابن مسعود، مقداد بن عمر، مسعود بن عاری واقد بن عبداللہ حنظلی، عمرو بن عبد عمرو ذوالشمالین، یزید بن ابی یزید حلیف حمزہ بن عبدالمطلب وغیرہ حلفا تھے رضی اللہ عنہم۔ تب ائمہ کفر قریش و موالی و حلفا کے بارے میں یہ آیت: ﴿ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ﴾ (آیتِ باب) آئی۔ اُس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر اپنی بات کا عذر کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) یعنی مومنین کی تم عزت کرو، سلام کا جواب دو، اُن کو یہ سنا دو کہ اللہ کی رحمتِ واسعہ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٦٤)

ان کے شاملِ حال ہے، اسی لیے فرمایا کہ تمھارت رب نے اپنے نفس پر رحمت کو براہِ تفضّل و احسان و امتنان واجب کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے کوئی برا کام نادانی سے کر لے گا، پھر توبہ کر لے گا تو اللہ بخش دے گا۔[1] (رواہ ابن جریر)

اللہ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے:

بعض سلف نے کہا ہے: ''كُلُّ مَنْ عَصَى اللّٰهَ فَهُوَ جَاهِلٌ'' ''ہر وہ شخص جو اللہ کی نافرمانی کرے وہ جاہل ہے۔'' امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ''اَلدُّنْيَا كُلُّهَا جَهَالَةٌ''[2] ''دنیا سب کی سب جاہل ہے۔'' پھر فرمایا: جس نے گناہوں سے رجوع کر لیا اور باز آیا اور عزم کیا کہ پھر وہ گناہ نہ کرے گا اور مستقبل میں اصلاحِ عمل کی، تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب اللہ نے خلق پر حکم دیا تو اپنی کتاب میں، جو اُس کے پاس عرش پر ہے، لکھا کہ میری رحمت غالب آئی غضب پر۔[3] اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ اپنی خلق کے درمیان قضا سے فارغ ہوا تو عرش کے نیچے سے ایک کتاب نکالی، اس میں تھا کہ میری رحمت سابق ہے میرے غضب پر، میں ارحم الراحمین ہوں۔ سو اللہ ایک یا دو مٹھی بھر کر ایک خلق کو آگ سے نکالے گا، جس نے کبھی کوئی خیر کا عمل نہ کیا ہو گا، ان کی آنکھوں کے بیچ میں لکھا ہو گا کہ وہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں۔[4] (رواہ ابن مردویہ)

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم تورات میں دو مہربانیاں پاتے ہیں، اللہ نے آسمان اور زمین کو بنایا، سو رحمتیں پیدا کیں، خلق کو پیدا کرنے سے پہلے، پھر خلق بنائی، اُن میں ایک رحمت رکھی، ننانوے رحمتیں اپنے پاس روک رکھیں۔ اسی ایک رحمت میں آپس میں رحم، مہربانی، بخشش، عطا، نرمی کرتے ہیں۔ اونٹنی، گائے، بکری، پرند اور مچھلیاں آپس میں محبت و نرمی کے جذبات رکھتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ ان رحمتوں کے ساتھ اس ایک رحمت کو جمع کرلے گا، جو اس کے پاس ہیں، سو اللہ کی رحمت افضل اور بہت وسیع ہے۔[5] (رواہ عبدالرزاق) یہ روایت دوسری طرح پر بھی مرفوعاً مروی ہے۔[6]

اس جیسی بہت سی حدیثیں آیتِ کریمہ: ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [الأعراف: ١٥٦] ''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔'' کی تفسیر میں آئیں گی۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: تو جانتا ہے کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اُس کی عبادت کریں، کسی شے کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں،

---

(1) تفسیر الطبري (١١/ ٣٧٩۔ ٣٨٠) یہ روایت مرسل ہے۔ (2) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٠١)

(3) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٠٢٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٥١)

(4) تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٨٦) (5) تفسیر الصنعاني (٢/ ٢٠٣۔ ٢٠٤) تفسیر الطبري (١١/ ٢٧٥) اس کی سند صحیح ہے۔

(6) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٥٣)

پھر فرمایا: تجھے معلوم ہے کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ جب وہ ایسا کریں تو پھر ان پر عذاب نہ کرے۔[1] (رواه أحمد عن أبي هريرة ﷺ)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب لوگوں کی طرف سے اللہ کی نشانیوں کے اترنے کے لیے فرمایش کثرت سے ہوئی تو اللہ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم ان سے کہہ دو کہ میرے پاس کچھ اللہ کے خزانے نہیں ہیں کہ جو تم کہو سو میں لے آیا کروں، خزانوں سے مراد ہر چیز پر قدرت ہے۔ خزانہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں کچھ جمع کریں، ذخیرہ رکھیں۔ نہ مجھ کو اللہ کے افعال کا علمِ غیب ہے کہ میں تم سے کہہ دوں کہ زمانۂ آیندہ میں یہ ہوگا۔ نہ میں کوئی فرشتہ ہوں کہ تم مجھ سے خرقِ عادت کے طور پر انسانی طاقت سے باہر کسی چیز کا مطالبہ کرو، جیسے: آسمان پر چڑھ جانا یا زمین کے اندر گھس جانا یا مجھ میں ان اوصاف کے نہ ہونے کو میرے لیے ایک عیب سمجھو اور جانو کہ میرا رسالت کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ میرا کام اتنا ہی ہے کہ میں اللہ کی وحی سیکھ لیتا ہوں اور اس کے مطابق کام کرتا ہوں۔ اس آیت سے کچھ فرشتوں کی بشر پر افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔

بعض اہلِ علم نے اس جگہ غیر ضروری طور پر اس مسئلے کو چھیڑا ہے جس سے کوئی دینی اور دنیوی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض علما نے یہ استدلال کیا ہے کہ انبیا کا اجتہاد کرنا ثابت نہیں ہے، کیوں کہ اس آیت میں اتباعِ وحی تک محدود کیا ہے۔ یہ بحث اصولِ فقہ میں مدون ہے اور اس کی دلیلیں وہاں مذکور ہیں، حدیث میں آیا ہے:
«أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ»[2] ''مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اس جیسی اور چیز بھی دی گئی ہے۔''

پھر استفہام انکاری سے یہ ثابت فرمایا کہ اندھے اور دیکھنے والے برابر نہیں ہیں، یعنی گمراہ اور راہ جاننے والا یا مسلم و کافر یا عالم و جاہل یا وحی کا اتباع کرنے والا اور اتباع نہ کرنے والا برابر نہیں ہوتے۔ کلام بطورِ تمثیل کے ہے اور ہر طرح کی بینائی اور نابینائی کو شامل ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اعمیٰ سے کافر ہے جو اللہ کے حق اور حکم اور نعمت سے نابینا ہو رہا ہے۔

بصیر سے مراد وہ مومن ہے جو نفع کی چیز کو دیکھتا ہے وہ موحد، مُطیعِ وحی اور اس وحی سے فائدہ اٹھانے والا ہے۔[3] تم اس عدمِ مساوات کو کیوں نہیں سوچتے؟ یہ تو ایک ایسی بات ہے کہ جس کو ذرا سی عقل، تھوڑی سی فکر اور ادنیٰ شعور ہو گا وہ بھی سمجھ لے گا کہ محقق اور مقلد برابر نہیں ہیں۔ پہلا بینا تو دوسرا اندھا ہے۔ پھر حکم دیا کہ جو لوگ اللہ کی طرف

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠) مسند أحمد (٢/ ٥٢٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٤) مسند أحمد (٤/ ١٣٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٦٤٣)

[3] تفسير الطبري (١١/ ٣٧٢)

لوٹائے جانے سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے ان کا کوئی دوست دار، مددگار اور سفارش کار نہیں ہے، ان کو تم اللہ یا وحی یا یومِ آخر سے ڈراؤ۔

اس آیت میں ان کفار پر رد ہے جو حشر کا اعتقاد تو رکھتے ہیں مگر یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کے باپ دادا، اہلِ کتاب یا بت ان کی شفاعت کریں گے یا مریدوں کو یہ اعتقاد ہے کہ مشائخ وفقرا، اولیا اور صوفیا ان کے شفیع ہوں گے، اللہ سے سفارش کر کے عذابِ آخرت سے بچا لیں گے، کیونکہ شفاعت اللہ عزوجل کی اجازت، حکم، اذن، رخصت اور مرضی کے بغیر ہرگز نہ ہوگی وہ کون شخص ہے جو اللہ کے پاس اُس کے حکم کے بغیر شفاعت کرے۔ پھر اللہ کی طرف پکارنے اور دعوت دینے والوں کو ہٹانے اور بھگانے سے منع فرمایا۔

یہاں دعا سے مراد مطلقاً عبادت ہے یا باجماعت نماز کی حفاظت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ فرض نماز مراد ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صبح اور عصر کی نماز مقصود ہے۔[2] سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اہلِ فقہ ہیں۔[3] یا اللہ سے نفع پانے اور نقصان کو دور کرنے کی دعا مانگنا مراد ہے۔ ﴿ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ سے عبادت یا پانچوں نمازوں پر ہیشگی کرنا مراد ہے یا یہ مقصد ہے کہ تم ان غریبوں کو ان کے ضعف اور فقر کی وجہ سے اپنی مجلس سے دور نہ کرو وہ تو اللہ کی رضا چاہتے ہیں نہ کہ کسی اور کی۔ اخلاص عزت افزائی کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے اور طرد (دور کرنا) ورَدّ و اِبعاد (دور ہٹانا) و اخراج (نکالنا) کی ضد ہے۔ جب کہ ان کا حساب تم پر اور تمھارا حساب ان پر نہ ہوا تو پھر ان کے ہٹانے اور بھگانے سے کیا غرض۔

یہ بھی اس صورت میں کہ وہ دین اور حسب نسب میں طعنے لینے والوں ہوں، ورنہ اللہ نے تو ان کو اپنی عبادت اور اخلاص کے ساتھ پاک کر دیا ہے، نسب کیا چیز ہے اور حسب کیا! انسان کا شرف ایمان اور عملِ صالح ہوتا ہے، کم نسبی اور کم حسبی دراصل برے کام کرنے کا نام ہے، جبکہ سارے آدمی غریب، فقیر، آسودہ، عالم اور جاہل آدم کی اولاد ہیں، آدم مٹی سے بنے ہیں، سب کے سب آپس میں ایک ماں باپ کی نسل سے اور باہم بہن بھائی ہیں تو بعض کی بعض پر افضلیت نسب میں کیا معنی رکھتی ہے۔ رہا حسب سو وہ علم وعملِ صالح سے حاصل ہوتا ہے۔ بڑا کمینہ وہ ہے جس کے افعال خلافِ شرع ہیں، گو نوح علیہ السلام کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ بڑا شریف وہ ہے جو خوش عقیدہ، خوش اخلاق، مخلص، موحد، باوفاق اور متبع کتاب وسنت ہے ؎

اعتبار شرف آدمیاں از حسب ست | بہر تحقیق نسب آدم و حوا کافی ست

''آدمیوں کے شرف وفضل کا اعتبار ہی دراصل حسب ہے۔ نسب کی تحقیق کے لیے آدم وحوا ہی کافی ہیں (کہ سب انسانوں کے ماں باپ وہی ہیں)۔''

---

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۳۸۱) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۱۱/ ۳۸۲) [3] فتح القدیر (۲/ ۱۷۱)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تو ان بے چاروں کو اپنے نزدیک سے دور کرے گا، ان کے آنے جانے کو عار سمجھے گا تو ظالموں میں سے ہو جائے گا۔ حاشا للہ! کہ نبی اکرم ﷺ سے ایسی بات ہو، بلکہ یہ کلام صرف دوسروں کو سمجھانے کے لیے ہے، تا کہ کوئی دوسرا مسلمان ایسا کام نہ کرے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق: ﴿ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ [الزمر: ٦٥] ''اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے اعمال ضرور ضائع ہو جائیں گے۔'' سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آیت چھے آدمیوں کے بارے میں آئی ہے: میں اور ابن مسعود، بلال اور ہذیل کا ایک مرد اور دو مرد اور جن کا نام نہیں لیتا۔ مشرکوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم ان کو اپنے پاس سے جدا کرو، یہ ہم پر جرأت نہ کریں۔ نبی اکرم ﷺ نے جی میں جو اللہ نے چاہا پڑا، اس پر یہ آیت اتری۔[1] (أخرجه مسلم والنسائي وابن ماجه وغيرهم)

ہم اسی طرح بعض لوگوں کا امتحان کرتے ہیں کہ غنی کو فقیر سے، فقیر کو غنی سے، شریف کو کمینے سے، کمینے کو شریف سے، ایک دوسرے کی ضد سے مبتلا کرتے ہیں، تا کہ بعض طرف بعض کے یہ اشارہ کریں کہ کیا یہی ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے احسان کیا ہے نہ کہ ہم پر۔ ان کا ایسا کہنا ہنسی مذاق کے طور سے ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگر اللہ کے نزدیک ان کی کچھ بزرگی ہوتی تو اس تکلیف کو کیوں پہنچتے۔[2] اللہ نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ کون شکر گزار ہے، یعنی اللہ کی نعمتوں کا حق دار وہی ہو سکتا ہے جو شکر گزار ہو۔ تمھارا اعتراض جہالت کی بنا پر ہے، تم ناحق ان کے فضل و اعتبار کا انکار کرتے ہو۔

پھر فرمایا کہ وہ ضعیف اور غریب لوگ جن کو اپنے پاس سے ہٹانے سے منع کیا ہے، جب تیرے پاس آئیں تو ان کو سلام علیکم کر، ان کے دل خوش کرنے کے لیے عزت سے پیش آ۔ سلام علیکم کے معنی ہیں: سَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ''اللہ تمھیں سلامت رکھے۔'' اس آیت کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ جب ان کو دیکھتے تو سلام کہنے میں پہل کرتے۔ بعض نے کہا کہ یہ سلام اللہ کی طرف سے ہے، یعنی تم ہمارا سلام ان کو پہنچا دو۔

ماہان رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک قوم نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی، کہا: ہم نے بڑے بڑے گناہ کیے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے کچھ جواب نہ دیا، وہ پھر کر چلے گئے، اللہ نے یہ آیت اتاری۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کو بلا کر سنائی۔[3] کسی نے کہا ہے کہ آیت کا اطلاق ہر مومن پر ہوتا ہے، اس لیے کہ عمومِ لفظ کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔ اللہ نے ازراہِ فضل و احسان اپنے ذمے رحمت کو واجب کر لیا ہے یا لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے، یہ بھی ان تمام امور میں شامل ہے جن کے ابلاغ (پہنچانے کا) کا حکم دیا ہے۔ غرض کہ اُس کی ذات پاک اکرم الاکرمین، ارحم الراحمین ہے، جب کسی سے جہالتً سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے اور وہ توبہ کر کے اصلاح کر کے آتا ہے تو اس کی بخشش فرما دیتا ہے۔[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٦٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٢٨)

[2] الدر المنثور (٣/ ٢٧٥) [3] تفسير الطبري (١١/ ٣٩١) یہ روایت مرسل ہے۔ [4] فتح البيان (٤/ ١٤٥۔ ١٥١)

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾
قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ
لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾
قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا
تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ
خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ
لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَهٗ
مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ
وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ
فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

اور ہم اسی طرح آیات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، تاکہ مجرموں کا راستہ بالکل واضح ہو جائے (55) (اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، کہہ دیجیے: میں تمھاری خواہشات کے پیچھے نہیں چلتا، اس صورت میں، میں گمراہ ہو جاؤں گا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا (56) کہہ دیجیے: بے شک میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں اور تم نے اس دلیل کو جھٹلایا ہے، میرے پاس وہ چیز نہیں ہے جسے تم جلدی طلب کر رہے ہو، فیصلے کا (سارا) اختیار اللہ ہی کو ہے، وہ حق بات بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (57) کہہ دیجیے: بے شک اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جسے تم جلدی طلب کر رہے ہو تو میرے اور تمھارے درمیان معاملہ کبھی کا چکا دیا گیا ہوتا اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے (58) اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (چھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو (59)

رسول کی دعوت بصیرت پر مبنی ہے اور نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے:

اللہ پاک کہتا ہے: جس طرح ہم نے رشد و ہدایت کے راستے اور باہم لڑائی اور دشمنی کی مذمت پر حجتیں اور دلائل بیان کیے، اسی طرح ہم ان آیتوں کو کھول کر سناتے ہیں، جن کی مخاطبین کو حاجت ہے، تاکہ مجرموں کی راہ جو

رسولوں کے مخالف ہے وہ واضح ہو جائے۔ میں اپنے رب کی طرف سے جس شریعت کو اس نے مجھ پر وحی کیا ہے، بصیرت پر ہوں، ہاں تم اس حق کو جو اللہ کے پاس سے میرے پاس آیا ہے، جھٹلاتے ہو، جس عذاب کے لیے تم جلدی کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں ہے، حکم اللہ کا ہے وہ چاہے تو تمھارے سوال کو جلد پورا کر دے یا تم کو اس کی مہلت دے۔ اس کی حکمتِ عظیمہ اسی کو معلوم ہے وہ اپنے بندوں کے درمیان اچھا فیصلہ کرنے والا، بہتر حکم کرنے والا ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو جس بات کے تم مستحق تھے، میں کر گزرتا، اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: بھلا آپ پر کوئی دن یومِ احد سے بھی زیادہ سخت آیا ہے؟ فرمایا: میں نے تیری قوم سے بہت کچھ سختی دیکھی۔ سب سے زیادہ سختی عقبہ کے دن پائی۔ میں نے اپنی جان کو ابن عبد یالیل بن عبد کلال (طائف) پر پیش کیا، اُس نے میری بات نہ مانی، میں مغموم اپنا منہ لے کر چلا آیا، مجھ کو ہوش نہ آیا مگر قرن الثعالب میں۔ میں نے سر اوپر اٹھایا، دیکھا کہ ایک بادل نے مجھ پر سایہ کیا ہوا ہے، نظر کی تو اس میں جبریل علیہ السلام تھے، مجھ کو پکار کر کہا کہ اللہ نے تیری قوم کی بات سنی، جو انھوں نے تجھ سے کہی اور جو تجھ کو جواب دیا۔ تیرے پاس پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا ہے کہ تو جو چاہے اس کو حکم دے۔ پھر ملک الجبال نے مجھے پکار کر کہا اور مجھ پر سلام کیا، اے محمد! اللہ نے تیری قوم کا قول سنا، تیرے رب نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے کہ تو مجھے حکم دے جو چاہے، اگر تو کہے تو میں ان دونوں پہاڑوں کو ان پر ملا دوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مجھے امید ہے کہ ان کی پشت سے وہ لوگ نکلیں گے جو اللہ کو پوجیں گے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گے۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے ان کا عذاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا اور اُن کا استیصال کرنا چاہا تھا مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر چاہی، دیر لگائی کہ شاید اللہ ان کی پشتوں سے غیر مشرک لوگ پیدا کرے۔ اس آیت اور حدیث کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ آیت کا مطلب ہے کہ اگر عذاب کو واقع کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوتا تو جس وقت انھوں نے طلب کیا تھا، اسی وقت ان پر عذاب کر ڈالتے، حدیث میں یہ نہیں ہے کہ انھوں نے عذاب مانگا ہو، بلکہ پہاڑوں کے فرشتے نے عرض کی کہ اگر کہو تو ہم مکے کے ان دونوں پہاڑوں کو ان پر یکساں کر دیں، جنوباً اور شمالاً کہ وہ پس کر مر جائیں، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی سے کام لیا اور تاخیر چاہی۔

غیب کی کنجیاں صرف اللہ کے پاس ہیں:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں، ان کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۹۵)

تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ [لقمان: ٣٤] ''بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے جو (ماؤں کے) پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ خوب جاننے والا، خوب باخبر ہے۔'' یعنی قیامت قائم ہونے کا وقت، بارش نازل ہونے کا وقت، ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ کل کیا کرے گا، کہاں مرے گا؟ یہ پانچوں چیزیں اللہ ہی کو معلوم ہیں۔ (رواہ البخاري) [1]

حدیثِ جبریل علیہ السلام میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: ((خَمْسٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ)) پھر آیتِ مذکور پڑھی، [2] پھر فرمایا کہ اُس کا اُس کے علم نے بر و بحر کی تمام موجودات کا احاطہ کر رکھا ہے، کوئی شے اُس پر مخفی نہیں، ذرہ برابر زمین میں ہو یا آسمان میں، وہ اُس کے علم میں ہے۔ صرصری نے کیا بات سرسری طور پر کہی ہے:

فَلَا يَخْفٰى عَلَيْهِ الذَّرُّ إِمَّا ... تَرَاءٰى لِلنَّوَاظِرِ أَوْ تَوَارٰى

پھر پتے جھڑنے کا ذکر کیا، یعنی جبکہ وہ نباتات کی حرکات کو جانتا ہے تو حیوانات کا کیا ذکر ہے۔ خصوصاً جو جن و انس مکلف ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴾ [المؤمن: ١٩] ''وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور اسے بھی جو سینے چھپاتے ہیں۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ بر و بحر میں کوئی درخت نہیں ہے، مگر اُس پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو پتا جھڑتا ہے اُس کو لکھتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ تیسری زمین کے نیچے چوتھی زمین کے اوپر جن ہیں کہ اگر وہ ظاہر ہو جائیں تو ان کے ہوتے ہوئے تمھیں کچھ روشنی نہ نظر آئے۔ زمین کے ہر کنارے پر اللہ کی مہروں میں سے ایک مہر ہے۔ اللہ ہر روز ہر مہر پر ایک فرشتہ بھیجتا ہے کہ جا اس کی حفاظت کر! عبداللہ بن حارث رحمہ اللہ نے کہا کہ زمین پر کوئی درخت یا سوئی گاڑنے کے برابر جگہ نہیں ہے مگر اس پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو اللہ کو خبر دیتا ہے، ہرے کی جب تک ہرا ہے، سوکھے کی جب سوکھ جاتا ہے۔ [3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ نے نون یعنی دوات کو پیدا کیا۔ الواح (تختیاں) بنائے، ان میں دنیا کا سارا حال لکھا، جب تک کہ دنیا منقضی ہو چکی جو کچھ کہ خلق سے پیدا ہو یا رزقِ حلال یا حرام یا عمل نیک یا بد ہو، پھر یہ آیت پڑھی۔ [4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥١) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨) مسند الطيالسي (١/ ٥)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٠٤۔ ١٣٠٥)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٠٥) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم ہر امرِ حق کے متعلق، جس کا انکار اہلِ باطل کرتے ہیں، تفصیل بیان کرتے ہیں۔ سبیلِ مجرمین کے بیان ہو جانے سے سبیلِ مومنین خود ظاہر اور بیّن ہو جاتی ہے۔ مجھے غیر اللہ کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے۔ اُسی طرح میں تمھاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ جو رستہ تمھارے دین کا ہے میں اُس پر نہیں چل سکتا، اگر چلوں تو گمراہ ہو جاؤں، راہ یابوں میں نہ رہوں۔ میں اپنے رب کی طرف سے حجت و برہان پر ہوں نہ کسی کی خواہشات پر یا شک پر۔ میں اللہ کی عبادت یقینی طور پر کرتا ہوں۔ میرے دین میں کچھ دھوکا نہیں ہے، تم البتہ بغیر برہان اور دلیل کے شکوکِ فاسدہ میں گرفتار ہو۔ تم رب کو یا عذاب کو یا قرآن کو یا برہان کو جھٹلاتے ہو۔ وہ لوگ اپنے فرطِ تکذیب سے استہزا کرتے، کبھی کہتے: ﴿ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا ﴾ [بني إسرائیل: ۹۲] ''یا تو آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے جیسے تو کہا کرتا ہے۔''

کبھی کہتے: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [الملك: ۲۵] ''اور وہ (کافر) کہتے ہیں: یہ (قیامت کا) وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟'' (تو بتاؤ؟) یا جن نشانیوں کی فرمایش کرتے تھے، ان کے لیے شتابی اور بے تابی ظاہر کرتے تھے یا قیامت کا آنا جلد چاہتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ﴾ [الشوریٰ: ۱۸] ''جو لوگ اس (قیامت) پر ایمان نہیں رکھتے، اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔'' سو حکم اللہ کا چلتا ہے کوئی اور حاکم نہیں جو تم کہو سو کر دکھائے۔ وہی اچھا فیصلہ کرنے والا ہے، میرے پاس اگر تمھاری شتابی کا کام ہوتا تو جھٹ پٹ میرا تمھارا فیصلہ ہو جاتا، لیکن بات یہ ہے کہ اللہ ظالموں کو خوب جانتا پہچانتا ہے، اُسے معلوم ہے کہ کس وقت ان پر عذاب نازل کرنا چاہیے۔

اللہ کی مشیت کا تقاضا یہی تھا کہ اُس میں تاخیر ہو اور استدراج ہو، اس میں کسی کا کیا زور اور اجارہ داری ہے؟! غیب کی کنجیاں یا غیب کے خزانے اسی کے پاس ہیں، وہی ان کو جانے اور کوئی کیا جانے؟! ساری خلق میں کسی ایک کو بھی تو غیب کے امور کا علم حاصل نہیں۔ یہ خاصہ اللہ ہی کا ہے۔ یہ آیتِ شریفہ کاہنوں، نجومیوں اور رمل کرنے والوں کے باطل کاموں کا رد کرتی ہے۔ علمِ غیب کا دعویٰ کرنے والے ایسے ہیں کہ جو بات نہ ان کی قدرت میں ہے نہ اُن کے لائق ہے نہ اُن کا علم اُس کو گھیرے ہوئے ہے، وہ اُس کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لا حول ولا قوة إلا باللہ.

افسوس ہے کہ اہلِ اسلام میں سے ایک قوم اس قسم کے گمراہ کرنے والے کاموں اور بدنامِ زمانہ کاموں میں مبتلا ہو گئی ہے، باوجود اس کے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو ان جھوٹی اور باطل چیزوں سے کچھ حاصل نہیں۔ صادق و مصدوق نے یہ بھی کہا ہے: «مَنْ أَتىٰ كَاهِناً أَوْ مُنَجِّماً فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلىٰ مُحَمَّدٍ»[1] ''جو کسی

[1] مسند أحمد (۲/ ۴۲۹) فتح القدیر (۲/ ۱۷۳) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۵۹۴۲)

کاہن یا نجومی کے پاس آیا، اس نے اس کے ساتھ کفر کیا جو محمد ﷺ پر اتارا گیا۔'' سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ''أُوتِيَ نَبِيُّكُمْ كُلَّ شَيْئٍ إِلَّا مَفَاتِيحَ الْغَيْبِ'' [1] یعنی تمھارے پیغمبر کو ہر چیز ملی سوائے غیب کی کنجیوں کے، یعنی غیب کا علم ان کو بھی نہ تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد اقدار اور ارزاق ہیں۔ [2]

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: خزائنِ ارض نزولِ عذاب کا علم ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ثواب اور عذاب۔ [3] کسی نے کہا کہ اَجلوں کے پورا ہونے کا علم اور احوالِ عباد کہ کون نیک بخت ہے اور کون بد بخت اور اعمال کے خاتمے کا علم۔ کسی نے کہا: علم مالم یکن ہے کہ اگر ہوتو کیوں کر ہو اور جو نہ ہو، وہ اگر ہوتا تو کس طرح ہوتا مگر لفظ وسیع تر ہے، یہ سب باتیں اس میں شامل ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم کہ قیامت کب ہوگی۔ [4]

خشکی اور تری کا ذکر اس لیے کیا کہ سب سے بڑی مخلوقات یہی ہیں۔ اُن میں جتنے حیوانات و جمادات ہیں، سب کا تفصیلی علم اللہ کو ہے، کوئی شے اللہ سے مخفی نہیں ہے۔ پہلا ذکر غائب چیزوں کے بارے میں تھا، یہ ذکر حاضر چیزوں کے بارے میں فرمایا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''بَرّ'' جنگل، دشت اور صحرا کو کہتے ہیں اور بحر گاؤں، شہر اور قصبات کو کہتے ہیں۔ یعنی بَرّ سے مراد ویران جگہ اور بحر سے مراد آباد جگہ ہے۔ اُن میں جو کچھ ہوتا رہتا ہے وہ اللہ کو معلوم رہتا ہے۔ [5] جمہور نے کہا کہ ساری زمین یا بَرّ ہے یا بحر۔ پھر بر اور بحر دونوں میں عجیب وغریب چیزیں ہیں جو اللہ کی عظیم قدرت اور وسعتِ علم کی دلیل ہے۔ اللہ کے لیے علم کی صفت تمام بڑی بڑی صفتوں کا سردار ہے، اگر کسی درخت کا ایک پتا جھڑتا ہے تو اُس کا زمان و مکان معلوم رہتا ہے۔ یا ورق سے مراد وہ ورقہ ہے جس میں اجل اور رزق لکھا ہے۔

امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے کہا سقوطِ ورقہ سے مراد اولادِ بنی آدم کا سقوط یعنی موت ہے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول طریقۂ رموز پر ہے، لائقِ توجہ نہیں۔ امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ سے اس کی صحت منقول نہیں ہوئی۔ [6] مکانِ تاریک یا زمین کے پیٹ میں اگر ایک دانہ اُگتا ہے تو اس کا علم بھی اللہ کو رہتا ہے، بلکہ اُگنے سے پہلے اُس کو جانتا ہے۔ کسی نے کہا: وہ دانہ مراد ہے جو زمین کے سب سے نچلے طبقے میں ہے۔ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ تری اور خشکی کی خاصیت تمام موجود چیزوں میں ہے، کسی خاص قسم کی چیز کے ساتھ اسے مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ [7]

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ

[1] مسند أحمد (١/ ٣٨٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواہ أحمد و أبو یعلیٰ و رجالهما رجال الصحیح'' (مجمع الزوائد: ٨/ ٤٧١)
[2] تفسیر الخازن (٢/ ١٤١) [3] تفسیر البغوي (٣/ ١٥٠) [4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٢٠)
[5] تفسیر البغوي (٣/ ١٥١) [6] تفسیر القرطبي (٧/ ٤) [7] فتح البیان (٤/ ١٥١۔ ١٥٦)

ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٦٠ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ
عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝٦١ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ
مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝٦٢

اور وہی ہے (اللہ) جو رات کو تمھیں فوت کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو، پھر (دوسرے) دن میں تمھیں اُٹھاتا ہے، تاکہ (زندگی کی) مقررہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو تم کرتے رہے ہو 60 اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر محافظ (فرشتے) بھیجتا ہے، حتی کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اسے فوت کرتے ہیں، اور وہ اس میں کوتاہی نہیں کرتے 61 پھر وہ اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں جو ان کا سچا مالک ہے۔ خبردار! فیصلے کا (سارا) اختیار اسی کو ہے، اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے 62

وفاتِ صغریٰ (نیند) و کبریٰ (موت) اللہ کے اختیار میں ہے:

یعنی ملائکۂ موت سوائے حکم کے کسی کی خاطر نہیں کرتے۔ سرعتِ حساب کا یہ مطلب ہوا کہ ایک لحظہ میں آدمی کی عمر بھر کی بھلائی برائی واضح کر دی۔ اللہ نے اس آیت میں کہا کہ ہم رات کو وفات دیتے ہیں، یہ وفاتِ اصغر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾ [آل عمران: ٥٥] ''جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے پورا پورا لے لوں گا اور اپنی طرف اُٹھا لوں گا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ [الزمر: ٤٢] ''اللہ ہی موت کے وقت جانیں قبض کرتا ہے اور جس کی موت نہیں آئی ہوتی، اسے اس کی نیند میں (قبض کرتا ہے) پھر وہ اس (روح) کو روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کر دیا ہو اور دوسری کو ایک مقرر وقت تک (واپس) بھیج دیتا ہے۔''

اس آیت میں دو وفات کا ذکر کیا: کبریٰ و صغریٰ۔ اسی طرح اس جگہ دو وفات صغریٰ و کبریٰ کا بیان فرمایا کہ تم کو رات کو وفات دیتا ہے جو دن کو کماتے ہو وہی جانتا ہے۔ یہ جملۂ معترضہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کے علم نے تمام مخلوق کو رات اور دن میں گھیر رکھا ہے، یعنی حالتِ سکون اور حالتِ حرکت میں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴾ [الرعد: ١٠] ''(اللہ کے نزدیک) مساوی ہے تم میں سے جو کوئی آہستہ بات کہے یا بلند آواز سے کہے، اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپنے والا

ہو یا دن (کی روشنی) میں چلنے والا ہو۔‘‘

نیز فرمایا: ﴿ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [القصص: ۷۳] ’’اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم اس (رات) میں آرام کرو اور تاکہ تم (دن میں) اس کا فضل تلاش کرو۔‘‘ یعنی رات کو سکون کرو اور دن میں فضل تلاش کرو، جیسے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴾ [النبا: ۱۰۔ ۱۱] ’’اور ہم نے رات کو تمھارے لیے لباس بنایا۔ اور ہم نے دن کو روزی کمانے کا وقت بنایا۔‘‘ اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے، وہی ہے جو تم کو رات کو وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو تم دن میں عمل کرتے ہو، پھر اٹھاتا ہے تم کو دن میں۔ (قاله مجاهد و قتادة و السدي)[1]

عبداللہ بن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی منام (نیند) میں۔[2] مگر پہلا زیادہ ظاہر ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اس کی جان لیتا ہے، پھر پھیر دیتا ہے۔ اگر اللہ نے حکم دیا کہ روح قبض کر تو قبض کرتا ہے ورنہ پھیر دیتا ہے۔ فذلك قوله ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ (آیتِ باب) یہ اس لیے تاکہ ہر انسان کی اَجل پوری ہو جائے۔[3] پھر قیامت کو تم کو تمھارے اعمال کی خبر دے گا، خیر کی جزا خیر اور شر کی جزا شر ہو گی۔

اللہ اپنے بندوں پر قاہر ہے اور فرشتے اس کے پابند ہیں:

بندوں پر قاہر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے اُس کے حکم کی مقہور ہے۔ اللہ کے جلال و عظمت اور بڑائی کے لیے خضوع اور خشوع کرنے والی ہے۔ اللہ فرشتوں کو انسان کی حفاظت کے لیے بھیجتا ہے، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [الرعد: ۱۱] ’’اور اس کے پیچھے سے باری باری آنے والے (فرشتے) ہیں، وہ اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔‘‘ یہ فرشتے محافظ ہیں اور اعمال کا حساب رکھنے والے ہیں، جیسے اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴾ [الانفطار: ۱۰] ’’حالاں کہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔‘‘ اور اس کا ارشاد ہے: ﴿ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ ﴾ [قٓ: ۱۷] ’’جب اَخذ کرتے (لکھتے) ہیں دو اَخذ کرنے (لکھنے) والے (فرشتے)۔‘‘

پھر جب کسی کی موت حاضر ہوتی ہے، اجل آتی ہے تو ملائکہ موکلین اس کو وفات دیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ ملک الموت کی مدد کرنے والے اور فرشتے ہیں جو روح کو بدن سے نکالتے ہیں، پھر ملک الموت اُن سے لے لیتا ہے جب کہ حلقوم تک پہنچتی ہے۔[4] آیتِ کریمہ: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٠٦) [2] تفسير الطبري (١١/ ٤٠٨)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ١٨٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

[4] تفسير الطبري (١١/ ٤١٠۔ ٤١١) تفسير ابن كثير ٢٠/ ١٨٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ ﴾ [إبراهيم: ٢٧] ''اللہ ایمان والوں کو قولِ ثابت (کلمۂ توحید) سے ثابت قدم رکھتا ہے۔'' کے تحت روح قبض کرنے کے متعلق احادیث آئیں گی۔ بہر حال یہ فرشتے روح کی حفاظت میں کوتاہی نہیں کرتے، بلکہ جہاں کہیں اللہ کا حکم ہوتا ہے وہاں چھوڑ کر حفاظت کیا کرتے ہیں۔ اگر ابرار میں سے ہے تو علیین میں اور اگر فجار میں سے ہے تو سجین میں، عیاذاً باللّٰه من ذلك. پھر اللہ کے پاس پہنچائے جائیں گے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ میت کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں، اگر نیک مرد ہے تو کہتے ہیں: نکل اے نفسِ مطمئنہ! تو پاک بدن میں تھا، نکل محمود ہو کر، بشارت لے روح اور ایمان کی اور ربِ غیر غضبان کی، اس سے یوں ہی کہتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ باہر آ جاتی ہے، پھر اُس کو آسمان پر لے جاتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں، سو کھول دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں ہے، مرحبا نفسِ طیبہ کو جو پاک جسم میں تھا، داخل ہو حمیدہ ہو کر اور خوش خبری حاصل کرنے والا ہو روح اور ریحان اور ربِ غیر غضبان کی۔ اسی طرح کہتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس آسمان میں جا پہنچتی ہے جس کے اوپر اللہ ہے۔ اور اگر بد مرد ہے تو کہتے ہیں: نکل اے نفسِ خبیث! تو خبیث جسم میں تھا، مذمت والا ہو کر بشارت لے حمیم و غساق کی (دوزخ اور پیپ کی) ﴿ وَاٰخَرُ مِنۡ شَكۡلِهٖۤ اَزۡوٰجٌ ﴾ [صٓ ٥٨] ''اور ان کے مانند کئی قسم کے دوسرے (عذاب) ہوں گے۔'' اس سے یوں ہی کہتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ باہر آ جاتی ہے، پھر اس کو آسمان پر لے جاتے ہیں، دروازہ کھلواتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کون ہے؟ کہتے ہیں: فلاں ہے، کہا جاتا ہے: ''لَا مَرْحَباً بِالنَّفْسِ الْخَبِيثَةِ'' یہ خبیث جسم میں تھی، پھر جا مذموم ہو کر، تیرے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، وہ آسمان سے چھوڑ دی جاتی ہے، قبر میں آتی ہے۔ مردِ صالح اٹھ بیٹھتا ہے، اُس سے وہی کہتے ہیں جو حدیثِ اول میں کہا گیا ہے۔ مردِ بد بیٹھتا ہے، اسے بھی وہی کہتے ہیں جو حدیثِ اول میں کہا گیا ہے۔[1] (رواه أحمد وهذا حديث غريب)

لوٹ کر اللہ کے پاس ہی آنا ہے:

﴿ رُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ ﴾ سے یا فرشتوں کا ردمراد ہے یا ساری مخلوق کا، قیامت کے دن ردمراد ہے جب سب اللہ کے سامنے آئیں گے۔ اللہ اُن میں عدل اور فیصلہ کرے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِيۡنَ وَالۡاٰخِرِيۡنَ ۝ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ اِلٰى مِيۡقَاتِ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴾ [الواقعة: ٤٩۔ ٥٠] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: بلاشبہ پہلے بھی اور پچھلے بھی۔ یقیناً ایک معلوم دن کے مقرر وقت پر (سب) جمع کیے جائیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَحَشَرۡنٰهُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡهُمۡ اَحَدًا ۝ وَعُرِضُوۡا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا كَمَا

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٤٣) مسند أحمد (٢/ ٣٦٤) صحيح الجامع (١٩٦٨)

خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ۝ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ
وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا
يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٧-٤٩] ''اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے، چناں چہ ہم ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور وہ آپ کے رب کے سامنے صف بستہ پیش کیے جائیں گے (کہا جائے گا:) یقیناً تم ہمارے پاس (ایسے) آئے ہو، جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ تم سمجھتے تھے کہ ہم تمھارے لیے وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے۔ اور (ہر ایک کا) اعمال نامہ (سامنے) رکھ دیا جائے گا، پھر آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ اس کے مندرجات (تحریر) سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی! کیسا ہے یہ اعمال نامہ جو نہیں چھوڑ رہا کسی چھوٹے اور نہ بڑے (عمل) کو مگر اس نے اسے شمار کر رکھا ہے۔ اور انھوں نے جو عمل کیے تھے حاضر پائیں گے۔ اور آپ کا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔'' اسی لیے یہ کہا کہ وہ مالک ہے ان کا بالتحقیق اور جلد حساب لینے والا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ رات کی وفات سے مراد سلانا ہے، یعنی رات کو تمھاری جانیں جن سے تم کو تمیز ہوتی ہے، قبض کر لی جاتی ہیں، یہ کچھ حقیقی موت نہیں ہے۔ توفی کہتے ہیں: کسی چیز کو بھرپور لینا۔ بدن میں دو روحیں ہوتی ہیں، ایک روحِ حیات جو موت کے بغیر نہیں نکلتی۔ دوسری روحِ تمیز جو سونے میں نکل جاتی ہے، عالم میں پھرتی ہے، خواب دیکھتی ہے، پھر جاگنے کے وقت بدن میں واپس آ جاتی ہے، اس کے سوا اور بھی کہا ہے، مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس بات کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ انسان رات کو سوتا ہے یہ سکون ہوا، دن کو بھلے یا برے عمل کرتا ہے، کیونکہ غالباً نیند رات کو اور کسب دن کو کیا جاتا ہے، پھر روح پھر کر دن کو جاگ اٹھتی ہے، اس کو بعث فرمایا، بطور ترشیح توفی۔ یا مراد قبور سے اٹھایا جانا ہے۔

مطلب یہ ٹھہرا کہ اللہ کا کفار کو مہلت دینا کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اللہ اُن کے کفر سے بے خبر اور غافل ہے، بلکہ اُسے معلوم ہے اور یہ امہال (مہلت) اس لیے ہے کہ جو اجل ہر فرد کے لیے مقرر ہے کہ اتنا وہ جیے گا اور اتنا رزق پائے گا، وہ پوری ہو جائے تو پھر موت آئے۔ موت کے بعد تو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ نیک اور گناہ گاروں کو ان کے نیک و بد عمل کی جزا دے گا۔ اُس کا بندوں پر قاہر ہونا ایک صفت ہے جو اللہ کی ذات کی بلندی کی دلیل ہے۔ سلفِ امت اور ائمۂ ملت کا یہی مذہب ہے کہ اُس صفت پر بغیر اس کی کیفیت جانے یا تاویل کیے یا اُس کو بیکار سمجھنے کے ایمان لانا واجب ہے۔

یہ فوقیت لائقِ حالِ فائق ہے۔ بعض نے کہا: فوقیت سے مراد قدرت و رتبہ ہے، جس طرح کہتے ہیں کہ بادشاہ فوقِ رعیت ہے، یعنی باعتبار قدرت کے، یعنی ان کے معاملات میں اُسی کا اختیار ہے نہ کہ کسی اور کا، جو چاہتا ہے کرتا

ہے، بنائے، بگاڑے، جلائے، مارے، ثواب دے اور سزا دے۔ پھر فرشتے بھیجتا ہے جو آفات سے بندوں کی حفاظت کرتے ہیں، ان کے اعمال کے نگران ہیں۔ پھر جب کسی کو موت آتی ہے تو اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کو وفات دیتے ہیں۔ مراد ملک الموت کے مددگار ہیں یا خود ملک الموت۔

جمع کا لفظ تعظیم کے لیے فرمایا ہے۔ وہ میت کی عزت کرنے یا ذلیل کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے جو حکم ہوتا ہے اُس کو جوں کا توں بجا لاتے ہیں۔ پھر اللہ کی طرف پھرنا ہوتا ہے، یعنی موت کے بعد۔ حدیث میں آیا ہے کہ مردوں کی روحوں کو ایک آسمان سے دوسرے آسمان پر پہنچاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں آسمان تک پہنچتی ہے یا اُس آسمان تک جہاں اللہ پاک ہے، پھر علیین یا سجین میں پھیر دی جاتی ہے۔[1] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ ملک الموت روح کو بدن سے نکال کر رحمت یا عذاب کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے، وہ اُس کو لے کر آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔[2] سچا سید و مولیٰ اللہ ہے۔ دنیا میں جھوٹے مالکوں کے نیچے تھے۔[3]

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: تمھیں خشکی اور تری کے اندھیروں سے کون نجات دیتا ہے؟ تم اسے عاجزی کرتے ہوئے اور راز داری سے پکارتے ہو (اور کہتے ہو) کہ اگر وہ ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دے دے تو ہم ضرور شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے (63) کہہ دیجیے: اللہ ہی تمھیں اس (مصیبت) سے اور ہر غم سے نجات دیتا ہے، پھر بھی تم اس کے ساتھ شرک کرتے ہو! (64) کہہ دیجیے: وہی اس پر قدرت رکھتا ہے کہ تمھارے اوپر سے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے تم پر عذاب بھیجے، یا تمھیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک (گروہ) کو دوسرے کی طاقت (کا مزہ) چکھائے۔ دیکھیے! ہم کس طرح آیتوں کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ سمجھیں؟ (65)

---

(1) مسند أحمد (٤/ ٢٨٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٧٦) (2) تفسير القرطبي (٧/ ٧) (3) فتح البيان (٤/ ١٥٧_ ١٥٩)

اللہ کے فضل و کرم اور پکڑ وقہر کا بیان:

قرآن شریف میں اکثر کافروں کو عذاب کا وعدہ دیا، یہاں کھول دیا کہ عذاب وہی ہے جو اگلی امتوں پر آسمان سے یا زمین سے آیا اور یہ بھی ہے کہ آدمیوں کو آپس میں لڑا دے اور بعض کو قتل یا قید یا ذلیل کرے۔ نبی اکرم ﷺ نے سمجھ لیا کہ عذاب اس امت پر بھی ہوگا۔ اکثر عذاب الیم، عذاب مہین، عذاب شدید اور عذاب عظیم ان ہی باتوں کو فرمایا ہے اور آخرت کا عذاب بھی ان پر جو کافر ہی مرے۔

اللہ پاک نے اپنے بندوں پر یہ احسان رکھا کہ ہم نے حالت اضطرار میں ان کو ظلمات بر و بحر سے نجات بخشی، جبکہ وہ کسی جنگل میں حیران و پریشان تھے یا دریاؤں کے منجدھار میں مخالف ہواؤں کی وجہ سے بے قرار اور پریشان تھے، فقط ہم سے دعا مانگتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ”اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم ہو جاتے ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴾ [يونس: ٢٢] ”وہی ہے (اللہ) جو تمھیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے، حتیٰ کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں (سواروں کو) پاکیزہ (موافق) ہوا کے ساتھ لیے چلتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں، تو اچانک ان (کشتیوں) پر طوفانی ہوا آ پہنچتی ہے اور لہریں ان پر ہر طرف سے امڈ آتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ (طوفان میں) گھیر لیے گئے ہیں (تو اس وقت) خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہوئے اسے پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس (طوفان) سے نجات دی تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [النمل: ٦٣] ”(کیا یہ بت بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو تمھیں خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ دکھاتا ہے اور جو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے بشارت والی ہوائیں بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ اللہ ان سے بلند و بالا ہے، جنھیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔“

نیز اس آیت میں یوں فرمایا کہ اگر تو ہم کو نجات دے گا اس تنگی سے۔ سو اُس کے بعد شاکر رہوں گے، سو اللہ کو یہ قدرت ہے کہ تم پر ہر طرف سے عذاب ڈالے، جیسے اس کا قول ہے: ﴿ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ

قَاصِفًا مِّنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُم بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا﴾ [بني إسرائيل: ٦٨ - ٦٩] ''کیا پھر تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمھیں خشکی کی جانب (زمین میں) دھنسا دے یا تم پر سنگریزوں والی سخت آندھی بھیج دے، پھر تم اپنے لیے کوئی کارساز نہ پا سکو۔ کیا تم بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمھیں دوبارہ اس (سمندر) میں لوٹا دے، پھر تم پر توڑ دینے والی طوفانی ہوا بھیجے، تو وہ تمھارے کفر کے سبب تمھیں غرق کر دے، پھر تم اپنے لیے ہمارے خلاف اس پر کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا بھی نہ پاؤ۔'' حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے لیے ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امت محمد ﷺ کے لیے ہے، لیکن ان سے معاف کیا۔[1]

امت محمدیہ پر عذاب کی شکلیں:

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب یہ آیت اتری: ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَى أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ﴾ (آیت باب) تو نبی اکرم ﷺ نے کہا: «أَعُوذُ بِوَجْهِكَ» ''میں تیرے چہرے کی پناہ مانگتا ہوں۔'' پھر ﴿أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ﴾، پھر کہا: «أَعُوذُ بِوَجْهِكَ» ''میں تیرے چہرے کی پناہ مانگتا ہوں۔'' پھر ﴿أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ﴾ پر فرمایا: «هَذَا أَهْوَنُ وَأَيْسَرُ»[2] ''یہ زیادہ آسان ہے۔'' (رواہ البخاري والنسائي والحميدي وابن حبان و ابن جرير و ابن مردويه و سعيد بن منصور)

دوسری روایت جو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ابن مردویہ میں ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا﴾ پر یوں کہا: «هَذَا أَيْسَرُ» اگر چاہتے تو پناہ مانگتے۔[3] اس آیت کے متعلق بہت ساری احادیث ہیں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں یہ عذاب ہونے والا ہے، مگر اب تک اس کی تاویل نہیں آئی۔[4] (رواه أحمد و أخرجه الترمذي وقال هذا حديث غريب)

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس مسجد بنی معاویہ پر گزرے، وہاں دو رکعت نماز پڑھی، دیر تک اللہ سے مناجات کی، پھر کہا: میں نے اپنے رب سے تین چیزیں مانگیں: ایک یہ کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کرے، یہ مجھ کو دی۔ دوسرے یہ کہ قحط سے نہ مٹا دے، یہ بھی دی اور تیسرے یہ کہ ان کے بیچ میں لڑائی بھڑائی نہ ہو، اس سے مجھ کو منع کیا۔[5] (تفرد مسلم و رواه أحمد أيضاً)

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٤١٢) مسند الحميدي (٢/ ٥٣٠) صحيح ابن حبان (١٦/ ٢٠٣) تفسير الطبري (١١/ ٤٢٢) سنن سعيد بن منصور (٥/ ٢٣)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ١٩٠ـ ١٩١)

[4] مسند أحمد (١/ ١٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦٦) اس کی سند میں ''ابوبکر بن عبداللہ غسانی'' ضعیف راوی ہے۔

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٩٠) مسند أحمد (١/ ١٧٥)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حرۂ بنی معاویہ انصار کے محلے سے آئے، سیدنا جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ سے کہا: تو جانتا ہے کہ اس مسجد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ نماز پڑھی؟ کہا: ہاں اور ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ کہا: تجھے معلوم ہے وہ تین چیزیں کیا ہیں، جن کی یہاں دعا کی؟ کہا: ہاں۔ کہا: مجھے بتا! کہا: ایک دعا یہ کی کہ ان پر ان کا کوئی دشمن غالب نہ ہو اور وہ قحط سالی سے ہلاک نہ ہوں، یہ دونوں باتیں دی گئیں۔ تیسری دعا یہ مانگی کہ ان کی آپس میں لڑائی نہ ہو، اس سے ان کو منع کر دیا گیا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: تو نے سچ کہا، سو قیامت تک ہرج، یعنی قتل و خون ریزی رہے گی۔[1]
(رواہ أحمد) یہ حدیث کسی کتابِ صحاح ستہ میں نہیں ہے، مگر اس کی اسناد جید و قوی ہے۔ وللہ الحمد والمنة.

سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنی معاویہ کے پہاڑ پر گیا، وہاں آٹھ رکعت نماز پڑھی، ان میں طول کیا، پھر مجھ سے متوجہ ہو کر فرمایا: میں نے تجھ کو کیوں روک رکھا ہے؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول دانا تر ہیں، فرمایا: میں نے اللہ سے تین سوال کیے، دو مجھ کو دیے اور ایک نہ دیا۔ میں نے یہ مانگا کہ میری امت پر کوئی غیر ان کا دشمن مسلط نہ ہو، یہ مجھ کو دیا۔ پھر یہ مانگا کہ وہ ڈوب کر تباہ نہ ہوں، یہ بھی مجھ کو دیا۔ پھر یہ سوال کیا کہ ان کی آپس میں جنگ نہ ہو، یہ نہ دیا۔[2] (رواہ ابن مردویہ)

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، مجھے کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی باہر گئے ہیں جو کوئی مجھ سے ملتا وہ یہی کہتا کہ آگے جاتے ہیں، یہاں تک کہ میں نے جا کر پایا کہ نماز پڑھ رہے ہیں، میں بھی پیچھے کھڑا ہو گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لمبی نماز پڑھی، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بڑی لمبی نماز پڑھی؟ فرمایا: میں نے رغبت اور ہیبت کی نماز پڑھی، اللہ سے تین چیزیں مانگیں، دو دے دیں اور ایک نہ دی: یہ مانگا کہ میری امت غرق ہونے سے ہلاک نہ ہو، یہ مجھ کو دی۔ یہ مانگا کہ ان پر کوئی ایسا دشمن جو ان میں سے نہ ہو ان پر غالب نہ ہو، یہ بھی دی۔ پھر یہ مانگا کہ ان کے آپس میں جنگ نہ ہو، اس سوال کو مجھ پر رد کر دیا۔[3] (رواہ أحمد و ابن ماجه و ابن مردویه بمثله أو نحوه)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو کئی طریق و الفاظ سے بروایت امام احمد و نسائی وغیرہما اس جگہ ذکر کیا ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اس امت میں چار چیزیں ہیں، دو ہو گئیں اور دو باقی ہیں۔ عذابِ فوق سے مراد رجم ہے اور عذابِ تحت سے مراد خسف ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ چار میں سے دو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پچیس برس بعد ہو

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٤٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله ثقات'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٤٥١)

[2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٩١) اس کی سند میں ''محمد بن اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے، البتہ گزشتہ صحیح روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

[3] مسند أحمد (٥/ ٢٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣٩٥١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٧٢٤)

گئیں: ایک کئی گروہ ہو جانا، دوسرے آپس کی لڑائی بھڑائی۔ دو باقی ہیں: ایک رجم، دوسرے خسف۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ عقوبت رد کی گئی، یہاں تک کہ گناہ کیا، جب گناہ کیا تو عقوبت بھیج دی گئی۔[2]

یہی امام مجاہد، سعید بن جبیر، ابو مالک، سدی، ابن زید اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ کا قول ہے کہ عذابِ فوق سے مراد رجم، عذابِ تحت سے مراد خسف ہے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[3] سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ مجلس میں یا منبر پر چلا کر کہتے تھے: اے لوگو! اللہ نے یہ آیت تم پر اتاری ہے، اگر آسمان سے کبھی عذاب آیا تو تم میں سے کوئی نہ بچے گا اور اگر خسف ہوا تو بھی کسی کے بچنے کا امکان نہیں ہے یا اگر تم فرقہ فرقہ ہو گئے تو بعض بعض کی لڑائی کا مزہ چکھیں گے، سن لو! تم پر تین میں سے بدتر کا نزول ہوا۔[4] (رواہ ابن جریر)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عذابِ فوق سے مراد ائمہ سُو ہیں، عذابِ تحت سے مراد خدامِ سُو ہیں، یعنی حکام اور غلام اور ماتحت۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول اگرچہ صحیح وجہ رکھتا ہے لیکن پہلا قول زیادہ مضبوط اور ظاہر ہے۔[5] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "هُوَ كَمَا قَالَ" "وہ ایسے ہی ہے، جیسے اس نے کہا" اس کی صحت کی شاہد وہ آیت ہے: ﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ﴾ [الملك: ١٦۔ ١٧] "کیا تم اس (اللہ) سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے تو ناگہاں وہ لرزنے لگے؟ یا تم اس (اللہ) سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیجے؟ پھر جلد تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟" یعنی عذابِ زیریں زمین میں دھنس جانا ہے، عذاب بالا پتھروں کا برسنا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اس امت میں قذف و خسف و مسخ ہوگا۔[6] اس کا ذکر مع قیامت کی نشانیوں اور شرطوں اور آیات کے ظہور کی مثالوں کے ساتھ بجائے خود آیا ہے۔[7]

فرقے بندی عذابِ الٰہی ہے:

﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم الگ الگ فرقے اور گروہ ہو جاؤ گے۔ کوئی خارجی ہو گا، کوئی رافضی ہو گا، کوئی مقلد ہو گا، کوئی متبع، کوئی جہمی فرعونی منکرِ صفات ہو گا، کوئی قدری جبری معتزلی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

① مسند أحمد (٥/ ١٣٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" مجمع الزوائد (٧/ ٨٩)

② تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٠٩)   ③ تفسير الطبري (١١/ ٤١٦۔ ٤١٨)

④ تفسير الطبري (١١/ ٤١٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالرحمن بن زید نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ نیز عبدالرحمن بن زید ضعیف راوی ہے۔

⑤ تفسير الطبري (١١/ ٤١٦۔ ٤١٨)

⑥ سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٨٧)

⑦ تفسير ابن كثير (٢/ ١٩٥)

نے کہا کہ مراد ہوائے متخالفہ ہیں۔ یہی امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔[1] حدیث شریف میں کئی طریق سے مرفوعاً ثابت ہو چکا ہے کہ یہ امت تہتر فرقے ہو جائے گی، سب کے سب آگ میں جائیں گے، مگر ایک گروہ۔[2] یعنی بہتر ناری اور ایک ناجی ہوگا۔ ناجی کی پہچان دوسری حدیث میں یہ فرمائی ہے کہ «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ» جو کوئی میرے طریقے اور میرے اصحاب کے طریقے پر ہوگا وہی نجات پائے گا۔[3] نبی اکرم ﷺ کا طریقہ کتاب کی اتباع تھا، سنت شارحِ کتاب ہے۔ اصحاب کا طریقہ اتباع کتاب و سنت تھا نہ کہ تقلیدِ آرائے رجال (لوگوں کی رائے) اور نہ تقییدِ قیل و قال۔

﴿ وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ بعض بعض پر قتل اور عذاب کے ساتھ مسلط ہوں۔[4] سو یہ تکلیف کا ذائقہ اس امت میں ہمیشہ موجود رہا کرتا ہے اور قیامت تک رہے گا۔ فإنا لله. اس کا سبب یہی مختلف فرقے اور شیعے بن جانا ہے۔ جب ایک دن میں کئی مذہب نکلے، پھر ایک مذہب میں کئی شاخیں پھوٹیں تو آپس میں لڑائی، ایک دوسرے سے بحث مباحثہ، مقابلہ شروع ہوا۔ ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو کافر، بدعتی اور فاسق کہنا شروع کیا، آخر نوبت باتوں سے بڑھ کر لاتوں کی آئی۔ لاٹھیاں پونگا چلنے لگیں، ہتھیار اٹھا لیے گئے، ہر فرقے نے اپنے مذہب کی حمایت پر کمر باندھ لی، حق و باطل میں تمیز نہ کی، فقط حمیتِ جاہلیت، تعصب اور نفسانیت پر دین و ملت کا دار و مدار آ ٹھہرا۔ آپس میں خون ریزی ہوئی۔ اللہ و رسول کا کہنا سامنے آیا۔ سچ ہے اللہ سے زیادہ کون بات کا سچا، پورا اور پکا ہے؟!

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّاراً، يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ» یعنی میرے بعد کہیں کافر ہو کر ایک دوسرے کی گردن مارنے نہ لگ جانا۔ کہا: ہم تو گواہی دیتے ہیں اس بات کی کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" فرمایا: ہاں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ بعض ہمارے بعض کو قتل کریں اور ہم مسلمان ہوں، اس پر یہ آیت آئی: ﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ﴾ (آیتِ باب) یعنی ذرا دیکھ تو کہ ہم نے ان نشانیوں کو کس طرح واضح اور روشن کر دکھایا ہے کہ شاید وہ کچھ سوچیں سمجھیں۔[5]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ظلماتِ بر و بحر سے ہولناک شدائد مراد ہیں، جن سے انسان کے حواس باطل اور عقل مدہوش ہو جاتی ہے۔ یا ظلمتِ بَرّ سے مراد رات کی اور بادل کی تاریکی ہے کہ اُس سے شدید خوف ہوتا ہے، کیونکہ پھر

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٤١٩۔ ٤٢٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٩٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٤٣)

[4] تفسير الطبري (١١/ ٤٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٢) اس کی سند حسن ہے۔

[5] تفسير الطبري (١١/ ٤٣٠) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٢) یہ روایت مرسل ہے۔

راہِ صواب نہیں ملتی۔ ظلمتِ بحر سے تیرگیِ شب، تیرگیِ ابر، تیرگیِ بادِ مخالف اور موجہائے ہائلہ مراد ہے کہ اُس سے ہلاکت کا ڈر ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان خوف ناک اسباب کے جمع ہو جانے پر انسان صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، کیونکہ تکالیف کو دور کرنے اور شدتوں کو زائل کرنے کی قدرت صرف اسی کو ہے نہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کو۔ زاری اور عاجزی سے ظاہری طور پر اور چھپ چھپ کر ان تکلیفوں سے خلاصی حاصل ہوئی۔ سو یہ سچ ہے کہ اللہ ہی ان کو ان ظلمات اور آفات سے بلکہ ہر تکلیف اور مصیبت سے نجات دیتا ہے، لیکن وہ اس نجات کے بعد شرک کرنے لگتے ہیں۔

کرب اُس غمِ شدید کو بولتے ہیں جس سے دم گھٹنے لگے، جی گھبرا جائے۔ اب دیکھو وعدہ تو یہ کیا تھا کہ شکر کریں گے، کام یہ کیا کہ شرک کرنے لگے، ان شرکا کو پوجنے لگے جن کو نہ نفع دینے کی کچھ طاقت ہے اور نہ ضرر دور کرنے کی یا کسی بلا کو ٹالنے کی یا کسی آزمایش سے رہائی بخشنے کی طاقت ہے۔ لا حول ولا قوة إلا باللہ. اسی لیے اللہ نے یہ فرمایا کہ تمھارے ان گناہوں پر اگر ہم اوپر نیچے سے عذاب اتاریں یا تم کو فرقہ فرقہ کر ڈالیں اور بعض کو بعض کی سختی کا مزہ چکھائیں تو ہم کو یہ قدرت ہے، یعنی جس نے تم کو ان شدائد سے بچایا وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ پھر تم کو سختی و محنت و تکلیف میں ڈال دے، تم کس خیال میں پڑے ہو، کس بھول میں مبتلا ہو۔ اوپر سے عذاب مینہ، بجلی، سنگ باری، ہوا اور طوفان آ سکتا ہے، نیچے سے خسف، رجف، زلزلہ اور غرق ہو سکتا ہے، تم کو اپنی خواہشات کا غلام، مختلف مذاہب کا پیروکار، متفرق آرا کا حامل اور جداگانہ مشارب والا کر سکتے ہیں۔

لفظ شیع شیعہ کی جمع ہے، بہ معنی فِرق، جمع فرقہ۔ ہر قوم جو کسی ایک امر پر اکٹھے ہوں، اُس کو شیعہ کہتے ہیں، لغت میں اشیاع سے مراد متبعین و مددگار اور اعانت کرنے والے ہوتے ہیں، اب یہ نام ایک خاص فرقے پر بولا جاتا ہے جو اپنے آپ کو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا دوست دار اور اہلِ بیت اطہار کا دوست کہتے ہیں، اگرچہ اس دعوے میں جھوٹے ہیں۔ اشارت النص سے اس جگہ شیعہ کی مذمت نکلتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مختلف خواہشات و خیالات ہیں،[1] یعنی وہ فتنے اور خیالات ہیں جو ان میں ہیں۔ بعض ان کے بعض کو قتل یا قید یا غارت کرتے ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: "هُوَالَّذِي فِيْهِ النَّاسُ الْيَوْمَ مِنَ الْاخْتِلَافِ وَالْاَهْوَاءِ وَسَفْكِ بَعْضِهِمْ دِمَاءَ بَعْضٍ"[2] "جس میں آج کل لوگ اختلاف اور خواہشات کے پیرو ہو گئے ہیں اور بعض بعض کا خون بھی بہاتے ہیں۔"

سبحان اللہ جب ابن زید رحمہ اللہ اپنے زمانے کو اس آیت کا مصداق بتا دیں تو ہمارے زمانے کا کیا ذکر ہے! اس وقت کے لوگ تو اس آیتِ شریفہ کے حقیقی معنی ہیں: "اَللّٰهُمَّ غَفْرًا" "اے اللہ ہمیں معاف فرما" جو فتنے اور مذاہب کا اختلاف آج کل کے زمانے میں موجود ہیں، کسی سچے پاک مسلمان پر مخفی نہیں۔ خارجیوں، ناصبیوں اور رافضیوں کے گروہوں کو تو جانے دو اب تو یہاں اپنے گھر ہی میں خانہ جنگی، دھینگا مشتی رہتی ہے۔ مقلدین تبعین کو

[1] تفسير الطبري (١١/ ٤١٩)
[2] تفسير الطبري (١١/ ٤١٩۔ ٤٢٠) فتح البيان (٤/ ١٦٠۔ ١٦٢)

کافر کہتے ہیں، جاہل لوگ ائمہ دین کو طعنوں کا نشانہ بناتے ہیں، مجتہدین کو برا کہنے لگتے ہیں، قربِ قیامت کی وجہ سے ایسی نشانیوں کا پیش آنا کچھ بعید نہیں۔

اس کے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر شیخ یاں ایسے تو ہنگامے رہا کرتے ہیں

اللہ پاک ہم غربا پر اپنا رحم و کرم اور فضل فرمائے، ہم کو ائمہ مجتہدین کی برائی، مسلمین کی تکفیر، متبعین کی تحقیر، بدعتیوں کی عزت و تکریم اور محبت اور محدثین کے انکار سے بچائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، سلف صالحین رحمہم اللہ، طریقہ خلفائے راشدین، سیرتِ ائمہ اور سنتِ مطہرہ پر قائم و دائم رکھے۔ اللھم آمین.

اہلِ سنت کے گروہ اہلِ حدیث کے سوا جتنے فرقے ملتِ اسلام میں حادث ہو کر مٹ گئے یا موجود ہیں یا آیندہ وجود میں آئیں بسببِ اختلاف اجناس و انواع وہ سب شیعہ ہیں اور سب قابلِ مذمت ہیں بموجب آیتِ باب، اور اس آیتِ کریمہ کے مصداق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیات کو اس لیے کھول کر بیان کیا کہ شاید یہ لوگ حقیقتِ حال کو سمجھ کر امرِ حق کی طرف لوٹ آئیں۔

لفظ ﴿ يَفْقَهُوْنَ ﴾ سے ثابت ہوا کہ اصل فقہ یہ ہے کہ حق و باطل میں امتیاز حاصل ہو نہ یہ کہ رائے اور اجتہاد کو قرآن مجید کے صریح حکم اور سنتِ مستطاب کی دلیل پر ترجیح دی جائے۔ اس لیے کہ اس برے کام کی وجہ سے یہ فرقہ بندی پیدا ہوئی ہے جس کو ہم تم سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اگر رائے اور خواہشات نہ ہوتیں تو دین میں یہ اختلاف کیوں ہوتا؟ اللہ ایک ہے، قرآن ایک، سنت ایک، رسول ایک، سیرتِ سلف ایک، پھر ادھر ادھر مارے مارے پھرنا بجز اس کے کہ مستحق عذابِ الٰہی بننا ہے اور کیا کہا جائے۔

کسانے کہ زین راہ برگشتہ اند برفتند و بسیار سرگشتہ اند

”وہ لوگ جو اس سیدھی راہ سے منہ موڑ گئے، وہ چلے گئے اور (اب بھی) بہت سے لوگ (راہِ حق سے) سرگشتہ ہیں۔“

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۭ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور اس (قرآن) کو آپ کی قوم نے جھٹلایا، حالاں کہ وہ حق ہے، کہہ دیجیے: میں تم پر نگران نہیں ہوں (66) ہر ایک خبر کا وقت مقرر ہے اور جلد ہی تم جان لو گے (67) اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیتوں

پر نکتہ چینی کر رہے ہوتے ہیں، تو آپ ان کے پاس سے ہٹ جائیں، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر شیطان آپ کو یہ بات بھلا دے تو یاد آنے پر (ان) ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھیں 68 ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمے داری ان لوگوں پر نہیں جو پرہیز گاری اختیار کرتے ہیں، اور لیکن نصیحت کرنا (ان کا فرض) ہے، تاکہ وہ بھی پرہیز گاری اختیار کریں 69

دین کو مذاق بنانے والوں کی مجلس میں بیٹھنا منع ہے:

یعنی جب جاہل دین پر عیب پکڑیں تو اس مجلس سے سرک جائے اور اگر یہ خطرہ ہو کہ باتوں میں مشغول ہو کر سرکنا بھول جائے تو سوائے نصیحت کے وقت کے ان میں بیٹھنا ہی چھوڑ دے۔ نہ بیٹھے تو اپنے اوپر ان کے ہمراہ رہنے کا کوئی گناہ نہیں، لیکن نصیحت کرنا بہتر ہے کہ شاید وہ ڈر جائیں اور نصیحت کرنے والا ثواب پائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا کہ تیری قوم قریش قرآن کو جھٹلانے والی ہے، حالانکہ اس حق کے سوا کوئی حق نہیں ہے، تو کچھ ان پر گماشتہ (داروغہ) نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۗ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ [الكهف: ٢٩] ''اور کہہ دیجیے: حق تو تمھارے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔'' یعنی مجھ پر پہنچا دینا اور تم پر سننا اور اطاعت کرنا ہے۔ جو میری پیروی کرے گا وہ دنیا اور آخرت میں نیک بخت ہے اور جو خلاف کرے گا وہ یہاں وہاں دونوں جگہ بد بخت ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ ہر خبر کے لیے ایک حقیقت ہے[1] یعنی وقوع، گو ایک زمانے کے بعد کیوں نہ ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴾ [صٓ: ٨٨] ''اور تم اس کی حقیقت کچھ مدت کے بعد ضرور جان لو گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴾ [الرعد: ٣٨] ''ہر مقررہ وقت کے لیے ایک کتاب (لکھا ہوا وقت) ہے۔'' یہ ایک بڑی دھمکی اور سخت وعید ہے۔ اسی لیے اس کے بعد یوں فرمایا ہے کہ اب تم جلد معلوم کر لو گے۔ پھر یہ حکم دیا کہ جو لوگ قرآن پاک سے استہزا اور مسخرہ پن کرتے ہیں، ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، اُن سے منہ پھیر لیں، تاکہ وہ اور ہی باتوں میں لگیں۔

خطاب تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد امتِ محمدیہ کا ہر فرد ہے کہ وہ ان مکذبین اور محرفینِ آیات کے پاس نہ بیٹھے، اگر بھولے بھٹکے سے بیٹھ گیا ہے تو اب نصیحت کے بعد ہرگز ان کے ساتھ نشست نہ کرے۔ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت سے خطا، بھول اور جس پر اس کا اکراہ (زبردستی) کیا گیا ہے، اُس کا مواخذہ نہیں ہے۔[2] ابو مالک اور

---

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٤٣٥) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٣) اس کی سند حسن ہے۔

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٣١)

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر شیطان نے بھلا دیا تو پھر جس وقت یاد آ جائے ان کے پاس نہ بیٹھے۔ یہی امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[1]

آیتِ شریفہ: ﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا﴾ [النساء: ١٤٠] ''اور اس نے اس کتاب میں تمھارے لیے نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہو یا ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہو تو تم ان کی مجلس میں نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں، ورنہ تم بھی اس وقت یقیناً انھی جیسے ہو گے، بے شک اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔'' اسی آیتِ باب کی طرف اشارہ ہے، یعنی جب تم ان کے پاس بیٹھے اور تم نے اُن کی بات کو مقرر رکھا (تردید نہ کی) تو تم اور وہ دونوں اس بات میں برابر ٹھہرے۔ اللہ کی آیات میں بڑے خائض (باتیں کرنے والے) یہی متکلمین اور مقلدین ہیں۔

ہر متبع مسلمان پر واجب ہے کہ ایسے مبتدعین کی صحبت سے بچے۔ اگر اتفاق سے پھنس جائے تو جان چھڑا کر بھاگے۔

نخست موعظتِ پیر دانش این سخن ست   کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

''بوڑھے دانش مند کی سب سے پہلی نصیحت یہ قول ہے کہ بے ادب اور اوچھے دوست سے بچو۔''

پھر فرمایا کہ متقی پر کچھ ان کا حساب نہیں، یعنی جب ان کے پاس نہ بیٹھا تو ان کے گناہ سے بچ گیا، اب وہ جانیں اور ان کا کام، اس کے ذمے ان کے اعمال کا کچھ محاسبہ نہیں۔ یہی سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول ہے: ''أَيُّ مَا عَلَيْكَ أَنْ يَخُوضُوا إِذَا اجْتَنَبْتَهُمْ وَأَعْرَضْتَ عَنْهُمْ''[2] ''یعنی تم پر کوئی پکڑ نہیں ہے، اس بات کی کہ وہ باتیں بنائیں اگر تو نے اُن سے اجتناب اور اعراض کیا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ تیری قوم نے قرآن کو یا اُس وعید کو جو ان آیتوں میں ہے یا خود تجھ کو جھٹلایا۔ پچھلا قول بعید ہے، حالانکہ یہ کتاب سچ مچ اللہ نے اتاری ہے تو کچھ ان پر موکل نہیں، ان کو جلد ہی دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ معلوم ہو جائے گا کہ یہی حق ہے، اس لیے کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدر کے دن دیکھ لیا کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا۔[3]

بدعتیوں کی مجلس میں بیٹھنے کی مذمت:

اللہ نے اُن مجلسوں کی نشست سے منع کیا، جہاں اللہ کے کلام کی اہانت ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس گفتگو

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٥۔ ١٣١٦) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٦) [3] تفسیر الطبري (١١/ ٤٣٥)

سے باز آ کر اور ہی باتوں میں لگیں۔ یہ آیت ان لوگوں کے لیے بڑی نصیحت ہے جو مبتدعین کی مجالس میں جا کر بیٹھتے اُٹھتے ہیں، جہاں کتاب و سنت کے ساتھ کھیلا جاتا ہے، آیات اور احادیث کے معنی اپنی گمراکن آرا، خواہشات تقلیداتِ فاسدہ کے مطابق تراشے جاتے ہیں، قرآن و حدیث کی تحریف کی جاتی ہے اور متبعین کی سوچ پر ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ سو جبکہ ایسی مجلسوں میں جانے والا اہلِ مجالس کو منع نہ کر سکے یا اُس سے منکر کو بدلا نہ جا سکے تو سب سے کم درجہ یہ ہے کہ اُن مجالس کو ترک کر دے۔ یہ تو اُس پر کچھ مشکل امر نہیں ہے، کیونکہ اُس کے وہاں جانے اور بیٹھنے سے عوام کو شبہہ ہو گا، یہ شبہہ صرف کسی منکر بات سے سننے کی نسبت زیادہ نقصان دہ ہے، ہم نے اس قسم کے بہت سے مجالسِ ملعونہ دیکھے اور سنے ہیں، جہاں تک طاقت پہنچی یا دسترس ہوئی، نصرتِ حق اور دفعِ باطل میں کوشش کی ہے۔

جو شخص اس شریعتِ مطہرہ سے بخوبی واقف ہے، وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ جو نقصانات گمراہ لوگوں اور بدعتی لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں ہیں وہ گناہ گاروں کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ خصوصاً جس کا قدم کتاب و سنت کے علم میں پکا نہیں ہے۔ اس پر اکثر ان لوگوں کے جھوٹ اور فریب چل جاتے ہیں، دل میں ایسی بات جم جاتی ہے کہ پھر اُس کا علاج مشکل پڑ جاتا ہے۔ اس سب سے زیادہ باطل اور سب سے زیادہ منکر بات کو حق سمجھ کر مدت تک اس پر عمل کرتا ہے، حالانکہ اُس کا باطل ہونا بہت زیادہ واضح ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ جماعت کو اختیار کریں۔ اختلاف سے منع کیا ہے، یہ خبر دی ہے کہ اگلے لوگ جو ہلاک ہوئے وہ دین کے اندر اسی قسم کے جھگڑے اور دشمنی سے ہوئے۔[1] محمد بن علی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خواہشات کے بندے وہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں میں باتیں بناتے ہیں۔[2] امام ابو جعفر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی لوگ اِس دین کے دشمن ہیں۔[3] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکے کے مشرک جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے قرآن سنتے تو طرح طرح کی باتیں اور مذاق کرتے، مسلمانوں نے کہا کہ ہم کو ان کے پاس بیٹھنا نہ چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کی بات سن کر بہک جائیں۔

امام سدی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ یہ آیت سیف سے منسوخ ہے[4] صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر شیطان بھلا کر ایسی محفل میں بٹھا دے تو یاد آتے ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہو، اُن ظالموں کے پاس نہ بیٹھا رہے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے تھے کہ یہ آیت خواہشات کے پیروکاروں، یعنی مبتدعین کے بارے میں اتری ہے۔[5] اس آیت میں ظاہر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے مگر مراد اُس کو امت پر پیش کرنا ہے، اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پاک ہیں کہ شیطان انھیں بھلا سکے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں کچھ وجہ نہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بھول ہو سکتی ہے، جس طرح احادیثِ صحیحہ میں آیا

---

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٤٣٨) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٤) اس کی سند حسن ہے۔ [2] الدر المنثور (٣/ ٢٩٢)
[3] تفسیر الطبري (١١/ ٤٣٧) [4] الدر المنثور (٣/ ٢٩٣) [5] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٤)

ہے: «إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أَنْسیٰ كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي» [1] ”میں صرف تمھاری طرح بشر ہوں، میں بھول جاتا ہوں جیسے تم بھول جاتے ہو، پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد کرا دیا کرو۔“

عرب کی مثال ہے کہ انسان بھولنے والی مخلوق ہے۔ اہلِ تقویٰ پر کافروں کے اعمال کا حساب نہیں یا متقیوں کو اضطراری کیفیت میں کفار کے ساتھ مجلس کرنے کی رخصت ہے مگر یہ رخصت ابتدائے اسلام میں تھی جو وقت بچاؤ کا تھا۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ ایک قوم پر آئے اور وہ شراب پر بیٹھی تھی، انھی میں ایک آدمی روزہ دار بھی تھا۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے اُس کو مارا اور کہا: ”لَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهٖ“ [2] بعض نے کہا ہے کہ اُن کی مجلس میں بیٹھنا جائز ہے، بشرطیکہ انھیں وعظ اور نہی عن المنکر کرے، اسی لیے اللہ نے کہا ہے لیکن یہ کافروں کے لیے نصیحت اور بیان ہے شاید کہ وہ اللہ پاک سے ڈریں۔ [3]

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

اور (اے نبی!) ان لوگوں کو چھوڑ دیجیے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا ہے اور دنیا کی زندگی نے انھیں دھوکے میں ڈال دیا ہے اور آپ اس (قرآن) کے ذریعے سے نصیحت کرتے رہیے، تاکہ کوئی شخص اپنے کرتوتوں کے وبال سے ہلاک نہ کیا جائے۔ اللہ کے سوا کوئی اس کا دوست اور سفارشی نہ ہوگا اور اگر وہ بدلے میں ہر طرح کا فدیہ دے تو وہ بھی اس سے نہیں لیا جائے گا، یہی وہ لوگ ہیں جو کچھ انھوں نے کمایا، اس کی وجہ سے انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ اور جو وہ کفر کرتے رہے ہیں اس کی وجہ سے انھیں دوزخ میں تیز گرم پانی پینے کو ملے گا اور دردناک عذاب ہوگا (70)

عذاب اپنے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے:

چھوڑ دے یعنی صحبت نہ رکھ ان سے مگر نصیحت کر دے کہ کوئی بے خبر نہ پکڑا جائے۔ اللہ پاک نے اس آیت پاک میں یہ حکم دیا ہے کہ جن کا دین یہی لہو و لعب ٹھہرا ہے، اُن سے اعراض کر، تھوڑا سا ان کو چھوڑ رکھ؛ وہ عذابِ عظیم

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٢)
[2] مصنف ابن أبي شيبة (٥/ ٦٩) [3] فتح البيان (٤/ ١٦٣۔ ١٦٧)

کی طرف جانے والے ہیں، اسی لیے یہ کہا کہ لوگوں کو اس قرآن سے وعظ سنا اور اللہ کے انتقام اور عذاب سے ڈرا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: ''تُبْسَلَ'' بہ معنی ''تُسَلَّمَ'' ہے یا بمعنی ''تُفْضَحَ''، امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی ''تُحْبَسَ'' امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی ''تُؤَاخَذَ'' اور امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے بہ معنی ''تُجْزٰی''۔[1]

یہ سب عبارتیں ایک دوسرے کے قریب ہیں، حاصل یہ کہ خیر کو چھوڑ کر ہلاکت کے سپرد ہوں اور درک مطلوب سے مرتہن رہیں، جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴾ [المدثر: ٣٨۔ ٣٩] ''ہر نفس نے جو کیا اس کے بدلے وہ گروی ہے۔ دائیں (ہاتھ) والوں کے سوا۔'' پھر فرمایا کہ کوئی اس کا قریبی اور سفارشی نہ ہو گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢٥٤] ''اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ سفارش ہی کام آئے گی اور کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں۔''

اگر چاہے کہ بدلے میں پورا جہان دے دے تب بھی قبول نہ ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا ﴾ [آل عمران: ٩١] ''بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور حالتِ کفر میں مرے ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ فدیے میں دینا چاہے۔'' اسی طرح اس جگہ فرمایا کہ جو گرفتار ہوئے، اپنے کیے پر، ان کے لیے گرم پانی اور دردناک عذاب ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان سنو! اللہ نے کہا ہے کہ جن لوگوں نے اپنا دین جس پر عمل کرنا اُن کو واجب تھا، چھوڑ کر اس کے ساتھ ٹھٹھا مذاق اختیار کیا ہے تو ان کو چھوڑ دے، اگرچہ تجھ کو حکم ہے کہ ان کو حجت پہنچا دے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت آیتِ قتال سے منسوخ ہے۔ یا اس کے یہ معنی ہیں کہ جس دین پر وہ ہیں اس کو انھوں نے لہو ولعب بنا لیا ہے، جس طرح جانوروں کے ساتھ جہالات اور ضلالات کرتے تھے جس کا ذکر اوپر گزر چکا۔ یا اس جگہ دین سے مراد عید ہے، یعنی اپنی عید کھیل کود مقرر کی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی کھانا پینا شراب ورقص وسرود میں دن بسر کرنا۔[2]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اپنے دین کی بنیاد شہوات پر رکھی ہے۔ ایسی شے کو دیانت ٹھہرایا ہے جس کا کوئی نفع یہاں ہے اور نہ وہاں۔ جیسے بت پرستی سائبہ اور بحیرہ کو حرام کرنا۔ ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ لہو ولعب ہی کو اپنا دین ٹھہرایا ہے یعنی جس طرح دین کے کام میں مصروف رہنا چاہیے، اسی طرح کھیل تماشے میں رہتے ہیں۔ یہی ان

---

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٤٤٣۔ ٤٤٤) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣١٨)

کی عبادت و دیانت ہے۔ اللہ نے کہا کہ تو اُن سے کچھ کام نہ رکھ۔ ان کے اقوال و افعال کی کچھ پروانہ کر۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا﴾ [المدثر: ١١] ''مجھے اور اس کو تنہا چھوڑ دیجیے جسے میں نے اکیلا ہی پیدا کیا۔''[2] یعنی یہ حکم بطور ڈانٹ ڈپٹ کے ہے۔ اس بنیاد پر آیت محکم ہے نہ کہ منسوخ۔ یہ دین کا لہو ولعب ٹھہرانا اس لیے ہے کہ دنیا کی زندگانی نے ان کو فریب دے رکھا ہے، آخرت کے معتقد نہیں ہیں: ﴿وَقَالُوْۤا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ﴾ [الأنعام: ٢٩] ''اور وہ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری دنیا ہی کی زندگی ہے، اور ہمیں (دوبارہ) نہیں اُٹھایا جائے گا۔''

اگر آخرت کا یقین ہوتا تو ضرور ہے کہ وہاں کے حالات اور خوف کا ڈر بھی ہوتا۔ یقینِ کامل نہیں ہے اسی لیے تو کھیل تماشے میں یہ بے باکی، چستی اور چالاکی ہے۔ صرف منہ سے کہہ دینا کہ ہاں ہم آخرت پر یقین رکھتے ہیں کچھ فائدہ بخش نہیں ہے جب تک کہ آخرت کے ڈر سے حتی الامکان لہو ولعب وغیرہا سے نہ بچے۔ آخر اس کی تصدیق کیا کہ آخرت کا یقین ہے اور قیامت پر ایمان ہے کیا فقط منہ سے کلمہ کہہ لینا بغیر عمل کے مومن کامل بنا دیتا ہے، آخرت کی باز پرس سے بچا لیتا ہے گو دین کو لہو ولعب ٹھہرا لیا ہو، اسلام سے مذاق اور مسخرا پن ہوتا ہو، کوئی نہیں، ہرگز ایسا نہیں ہوگا، بلکہ روزِ قیامت ہر نفس اپنے کیے میں گرفتار ہوگا نہ کوئی اُس کا شفیع ہوگا نہ مددگار، بلکہ اگر وہ خود کتنا ہی معاوضہ دینا چاہے تو بھی قبول نہیں۔ وہی گرم پانی پینا، وہی دکھ کی مار کھانا ہے۔

﴿حَمِيْمٍ﴾ کہتے ہیں کھولتے ہوئے پانی کو اور اس جیسے کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ﴾ [الحج: ١٩] ''ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی انڈیلا جائے گا۔'' یہ وہ پانی ہو گا جو انتڑیوں کو گلا کر نکال دے گا، اُس وقت اس کھیل تماشے کی حقیقت کھل جائے گی۔ ﴿بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ﴾ سے معلوم ہوا کہ دین کے ساتھ کھیل کود کرنا کفر ہے۔[3]

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ
عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ
فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا قُلْ
اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾
وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٧٢﴾
وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَيَوْمَ يَقُوْلُ

[1] تفسير البيضاوي (٢/ ٤١٩۔ ٤٢٠) [2] تفسير الطبري (١١/ ٤٤١) [3] فتح البيان (٤/ ١٦٨۔ ١٦٩)

كُنْ فَيَكُوْنُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿٧٣﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو ہمیں نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ اور جب اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اس کے بعد اُلٹے پاؤں پھر جائیں، اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا ہو، وہ زمین میں حیران پھرتا ہو، اس کے کچھ ساتھی ہوں جو اسے سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہوں کہ ہمارے پاس آجا؟ کہہ دیجیے: بے شک ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سب جہانوں کے رب کے فرماں بردار ہو جائیں ﴿71﴾ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس (اللہ) سے ڈرو، اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿72﴾ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن وہ کہے گا: ہو جا تو (حشر برپا) ہو جائے گا، قول اسی کا حق ہے اور اسی کی حکومت ہوگی، جس دن صور پھونکا جائے گا، وہ چھپی اور ظاہر (سب) باتوں کو جاننے والا ہے اور وہی حکمت والا، خبر رکھنے والا ہے ﴿73﴾

ایمان کے بعد کفر میں لوٹنے والے کی مثال:

اوپر جو فرمایا کہ مسلمان چاہے کافروں سے کہے کہ ہم دیوانے کی طرح بہکتے نہیں، اُس پر آگے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ فرمایا کہ جب اپنے نزدیک معبودِ برحق پا لیا پھر قوم کے بہکائے نہ بہکے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرک لوگ مسلمانوں سے کہتے تھے: ہمارے دین کی پیروی کرو، دینِ محمد ﷺ کو چھوڑ دو، اُس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی کہ کیا ہم ہدایت کے بعد پھر کفر میں آئیں تو ہماری وہی مثال ہو جس کو شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا ہو، اس کے ساتھی اسے بلائیں کہ تو اِدھر راہ پر آ! وہ کہے: میں نہیں آتا، یہی مثال اُس شخص کی ہے کہ جس نے نبی اکرم ﷺ کو پہچان کر پھر اُن کی پیروی اختیار کی۔ محمد ﷺ داعی ہیں طریق کی طرف، طریق اسلام ہے اور اسلام دینِ حق ہے۔[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ ایک کہاوت ہے جو اللہ نے بیان کی الٰہ اور اُس شخص کے لیے جو ان باطل الٰہوں کی طرف بلاتا ہے اور اُن کے لے جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ جیسے ایک آدمی حیران ہو کر راستہ بھول گیا، اُس کو کوئی پکارے: اے فلاں بن فلاں! ادھر راہ پر آجا اور اس کے یار کہیں: اے فلاں راستے پر آ!۔ سو اگر وہ اُس داعیِ اول کے کہنے پر گیا تو وہ اُس کو ہلاکت کی راہ میں لے جا کر ڈال دے گا اور اگر اُس کا کہنا مانا جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو راستے پر لگ گیا۔ یہ بلانے والا جنگل میں دوسرے غولوں کی طرح ایک غول ہے، یعنی اُس شخص کی مثال جو ان خداؤں کو پوجتا ہے، اللہ کو چھوڑ کر، ایسی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں کچھ کرتا ہوں، جب مرتا ہے تو ندامت اور ہلاکت سامنے آتی ہے۔

[1] تفسير الطبري (١١/ ٤٥٢۔ ٤٥٣)

شیاطین سے اس جگہ مراد غیلان ہے جو اُس کو باپ دادا کا نام لے کر بلاتے ہیں، وہ ان کے پیچھے لگتا ہے، جانتا ہے کہ میں ایک کام میں ہوں، وہ اُس کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں، بلکہ کبھی کھا لیتے ہیں یا گم شدہ راہ میں پھینک دیتے ہیں، وہ اُس میں پیاس کے مارے ہلاک ہو جاتا ہے، یہ اُس کی مثال ہے جس نے اللہ کے سوا کسی اور الٰہ کا کہا مانا۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک حیران شخص ہے، اُس کے ساتھی اسے راہ کی طرف بلاتے ہیں، یہ اُس کی مثال ہے جو ہدایت کے بعد گمراہ ہو گیا۔[2] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ وہ شخص ہے جو ہدایت کو قبول نہیں کرتا، شیطان کا مطیع، نافرمانی کے کام کرنے والا اور حق سے کنارہ کش ہے۔ اُس کے ساتھی جدھر اُس کو بلاتے ہیں، گمان کرتا ہے کہ وہی ہدایت ہے۔ اللہ ان لوگوں سے کہتا ہے کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے، گمراہی وہ ہے جدھر جن بلاتے ہیں۔[3]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مقتضی اس کو ہے کہ اُس کے ساتھی اسے گمراہی کی طرف بلاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت ہے، پھر کہا کہ یہ ظاہر آیت کے خلاف ہے، اس لیے کہ اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ اُس کو ہدایت کی طرف بلاتے ہیں تو پھر گمراہی ہونا جائز نہیں، کیونکہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہدایت ہے۔[4]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "هُوَ كَمَا قَالَ ابْنُ جُرِيْرٍ" اس لیے کہ سیاق اس بات کا مقتضی ہے کہ اُس کے لیے حیرت و گمراہی و جہالت کی راہ میں کچھ ساتھی ہیں، جو راہ پر چلتے ہیں، وہ اُس کو اپنی طرف پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ طریقۂ مثلی پر چل۔ تقدیر کا کلام یہ ہے کہ وہ اُن کا کہنا نہیں مانتا اور اُن کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اللہ اگر چاہتا تو اُس کو ہدایت کرتا اور سیدھی راہ پر لگا دیتا، اسی لیے یوں فرمایا ہے کہ تو کہہ دے کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ﴾ [الزمر: ٣٧] "اور جسے اللہ ہدایت دے تو اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔" نیز فرمایا: ﴿ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ [النحل: ٣٧] "(اے نبی!) خواہ آپ ان کی ہدایت کے لیے کتنی ہی حرص کریں تو بے شک اللہ جسے گمراہ کرے، اسے ہدایت نہیں دیتا، اور اُن (گمراہوں) کا مددگار کوئی بھی نہیں۔"[5]

صور پھونکنے کے دن بادشاہی اللہ ہی کی ہوگی:

یہ جو فرمایا کہ ہم کو حکم ہے کہ ہم رب العالمین کے پوری طرح مطیع ہو جائیں، یعنی عبادت خالص اُس کے لیے کریں جو اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے اور نماز پڑھیں اور ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہیں، قیامت کے دن اللہ کے پاس جمع ہونا ہے، اسی نے آسمان و زمین کو عدل سے بنایا ہے، وہی ان کا خالق، مالک اور مدبر ہے، قیامت کو کہے گا کہ ہو جا تو وہ ایک پلک جھپکنے میں ہو جائے گی، بلکہ اس سے بھی کم وقت میں قیامت قائم ہو جائے گی یا یہ مطلب کہ

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٤٥٢) [2] تفسیر الطبري (١١/ ٤٥٣)
[3] تفسیر الطبري (١١/ ٤٥٣۔ ٤٥٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [4] تفسیر الطبري (١١/ ٤٥٤) [5] تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٩٨)

اُس دن سے ڈرو جو ایک ”کُن“ کے کہنے سے موجود ہو جائے گا یا یہ مراد ہے کہ اس نے وہ دن پیدا کیا کہ جس دن ”کُن“ کہے گا، اس میں مخلوق کو پہلی دفعہ اور دوبارہ پیدا کرنے کا ذکر ہے، یہی مناسب ہے، اُسی کا ملک ہے جس دن کہ صور پھونکا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [المؤمن: ١٦] ”آج کس کی بادشاہی ہے؟ (پھر خود ہی فرمائے گا:) صرف اللہ واحد وقہار کی۔“

نیز اس کے فرمان کے مطابق: ﴿ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۚ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٦] ”اس دن حقیقی بادشاہی رحمان ہی کی ہوگی، اور وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔“ یہی مقصد کے زیادہ مشابہ ہے۔ مفسروں نے کہا ہے کہ مراد صور سے اس جگہ جمع صورت ہے، یعنی اُس دن صورتوں میں نفخ کریں گے وہ زندہ ہو جائیں گے، جس طرح صور بلد بولتے ہیں۔ یہ قول ابن جریر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ مراد صور سے وہ قرن ہے جس میں اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک صحیح بات وہ ہے جو حدیثوں میں آئی ہے کہ اسرافیل صور کو منہ میں لیے ہوئے ماتھا جھکائے منتظر ہیں کہ کب حکم ہو کہ اُس کو پھونکیں۔[1] سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک اعرابی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: صور کیا ہے؟ فرمایا: «قَرْنٌ يُنْفَخُ فِيهِ»[2] یعنی ایک نرسنگا ہے جس میں پھونکا جائے گا۔ (رواہ أحمد)

اس حدیث کو طبرانی رحمہ اللہ نے بھی بطولہ ذکر کیا ہے، پھر اس کو نہایت غریب کہا ہے، بعض الفاظ کے شواہد احادیثِ متفرقہ میں آئے ہیں، بعض الفاظ میں نکارت ہے (یعنی منکر ہیں)۔ اسماعیل بن رافع قاضیِ مدینہ میں ائمہ کا اختلاف ہے، کسی نے ثقہ کہا ہے، کسی نے ضعیف بتایا۔ احمد اور ابو حاتم رازی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے منکر ہونے کی وضاحت کی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی سند میں متروک ہے۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”أَحَادِيثُهُ كُلُّهَا فِيهَا نَظَرٌ“[3] ”اس سے مروی تمام احادیث میں نظر ہے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ سوال کہ کیا میں اس کو پکاروں جو نافع اور ضار نہیں، ڈانٹ کے طور پر ہے، یہ پکارنا گمراہی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ ہدایت یعنی اسلام اور توحید حاصل ہو جانے کے بعد۔ میری وہ مثل ہوگی کہ ایک شخص کو شیاطین آدمیوں کے درمیان میں سے اٹھا کر لے جائیں گے اور وہ دور کسی جگہ پر ڈال دیں، وہ حیران اور سراسیمہ رہ جائے، کچھ نہ سمجھے کہ کیا کروں، کدھر جاؤں، اس کے ساتھی اسے کہیں کہ ہمارے پاس آ، وہ ان کو کچھ جواب نہ دے نہ اُن کی راہ چلے، حیران پریشان ہو کر رہ جائے، سو اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ دے۔ اس کے سوا جو

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٤٦٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٤٨) مسند أحمد (٢/ ١٩٢) صحيح الجامع (٣٨٦٣)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ١٩٩۔ ٢٠٣)

کچھ ہے وہ باطل ہے۔ ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾ [آل عمران: ۸۵] ''اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔'' جس دن آسمان اور زمین سے کہے گا کہ ہو جا وہ اُسی دم ہو جائے گا، یعنی قیامت قائم ہو جائے گی۔

اللہ کی بات سچی ہے، صور پھونکے جانے کے دن اللہ ہی کی بادشاہی ہے، اگرچہ وہ ہر وقت دنیا اور آخرت کا بادشاہ ہے، مگر اُس دن کوئی منازع (جھگڑا کرنے والا) نہیں ہوگا، اسی لیے خاص کر قیامت کا نام لیا۔ یک بارگی صور میں فنا کے لیے پھونکا جائے گا، دوسری بار قبروں سے اٹھانے کے لیے پھونک ماری جائے گی۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے: صور قرن کو کہتے ہیں۔[1] یعنی قرنِ مستطیل کو، اس کے اندر روحیں ہیں، جتنی روحیں اتنے چھید، جب اس میں پھونکیں گے، ہر روح ایک سوراخ سے باہر نکلے گی اور اپنے بدن میں جا ملے گی، وہ زندہ ہو جائے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صور کی شکل بوق کے مثل ہے۔[2]

امام حسن اور مقاتل رحمہما اللہ نے صور کو جمع صورت کہا ہے، مگر ابو عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگرچہ اس بات کا احتمال ہے، لیکن کتاب وسنت اس کو رد کرتی ہے۔[3] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى ﴾ [الزمر: ٦٨] ''پھر اس میں دوسری بار پھونکا جائے گا۔'' اہلِ سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ صور ایک قرن ہے جس میں پھونک ماری جائے گی۔ صحیح حدیث میں ہے کہ سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً آیا ہے: نبی اکرم ﷺ سے صور کے بارے میں سوال کیا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ ایک قرن ہے جس میں پھونکا جائے گا۔''[4] (أخرجه أبو داود و الترمذي وحسنه و النسائي و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و ابن حبان و الحاكم و صححه و البيهقي و عبد بن حميد و ابن المبارك)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً
اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۷۴ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ
مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝۷۵
فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ
اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝۷۶ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ
هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ

[1] الصحاح للجوهري (٣/ ٢٧٩) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٥٠٢) [3] تفسير القرطبي (٧/ ٢٠-٢١)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٤٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٢) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٢٣) صحيح ابن حبان (١٦/ ٣٠٣) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٧٣) شعب الإيمان (١/ ٣٠٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٦٣) فتح البيان (٤/ ١٧٠-١٧٣)

مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا
رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود ٹھہراتے ہو؟ بے شک میں تمھیں اور تمھاری قوم کو کھلی گمراہی میں پڑے دیکھتا ہوں (74) اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھاتے تھے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے (75) چناں چہ جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا۔ ابراہیم نے کہا: یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہو گیا تو کہا: میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا (76) پھر جب اس نے چاند چمکتا ہوا دیکھا تو کہا: یہی میرا رب۔ پھر جب وہ غروب ہو گیا تو اس نے کہا: اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی تو یقیناً میں گمراہ قوم میں سے ہو جاؤں گا (77) پھر جب اس نے سورج کو جگمگاتا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اس نے کہا: اے میری قوم! بے شک جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سے بے زار ہوں (78) بے شک میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اسی (اللہ) کا پرستار ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں (79)

اللہ کے کلام میں تا (ت) کے ساتھ اور آتا ہے، یعنی اللہ کو ہر کام خود بھی مقصود ہے اور دوسرے کے واسطے بھی مقصود ہے یہ نہیں کہ واسطے کے بغیر کام کر نہ کر سکے۔ مثلاً بندہ تخم ڈالے اس کے بغیر درخت نہیں ہو سکتا، مگر اللہ چاہے تو اس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، لیکن درخت بھی مقصود ہے اور اس طرح اگانا بھی مقصود ہے، یہی معنی ہیں کہ اللہ کے فعل میں غرض نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام لڑکے تھے، قوم کو دیکھا کہ آسمان و زمین کا خالق اللہ کو کہتے ہیں اور اپنی حاجت کے لیے کوئی مورتیں پوجتا ہے، کوئی تارا، چاند اور سورج پوجتا ہے، چاہا کہ میں بھی ایک کو اپنا رب ٹھہرا لوں۔ مورتوں سے پہلے ہی ناخوش ہوئے، پھر کوئی تارا ٹھہرا لیا، پھر وہ غائب ہوا تو جانا کہ یہ ایک حال پر نہیں، اس پر حاکم کوئی اور ہے، آپ مستقل ہوتا تو اپنی اعلیٰ سے ادنیٰ حالت پر نہ آتا۔ پھر چاند اور سورج میں بھی عیب پایا، سب کو چھوڑ کر اسی ایک کو پکڑا جس کو سب مانتے ہیں کہ سب سے بڑا ہے اور عقلِ صحیح چاہیے کہ جب ایک کو مانا اس سے کون سا کام نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے کی ضرورت پڑے۔

ابراہیم کے باپ کے نام کی تحقیق:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر نہ تھا تارخ تھا۔[1] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ آزر سے مراد صنم ہے، یعنی بت۔ ماں کا نام مثانی تھا، بی بی کا نام سارہ تھا۔ اسماعیل کی ماں ہاجرہ کنیز ابراہیم علیہ السلام تھی۔[2] بہت سے علمائے نسب نے یہی بیان کیا ہے کہ باپ کا نام تارخ تھا۔ امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ آزر صنم کا نام ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شاید اس صنم کی بہت خدمت کے سبب سے ان کو بھی آزر کہنے لگے ہوں۔ واللہ أعلم

بعض نے کہا ہے کہ آزر ان کی زبان میں گالی یا عیب ہے بمعنی ٹیڑھا، لیکن ابن جریر رحمہ اللہ نے اس بات کے کہنے والے کا نام نہیں لیا۔[4] معتمر بن سلیمان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے باپ کہتے تھے کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ آزر بمعنی اعوج ہے، یہ ایک سخت کلمہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔[5] پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ان کے باپ کا نام آزر تھا، پھر نسابین کی بات کا جواب دیا ہے کہ شاید ان کے دو نام ہوں، ایک آزر اور دوسرا تارخ، جس طرح اکثر لوگوں کے دو نام ہوتے ہیں یا ایک نام ہو دوسرا لقب ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ جو کہا یہ جید قوی ہے۔[6] واللہ أعلم

ابراہیم کا اپنے باپ کو وعظ کرنا:

آزر عجمی نام ہے غیر منصرف (جس پر زیر اور تنوین نہ آتی ہو) اور اگر نعت (تعریف) کہیں تو بھی منصرف نہ ہوگا، جیسے احمر، اسود۔ بہرحال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو بتوں کی عبادت اور بت پرستی سے منع کرنے کے لیے وعظ کیا، لیکن وہ باز نہ آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمھاری قوم کھلی گمراہی میں ہو، تم کو ہدایت کا راستہ نہیں ملتا، جس بلا میں تم سب گرفتار ہو ہر صحیح عقل والا جانتا ہے کہ وہ بالکل حیرت و گمراہی اور واضح جہالت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٢٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں ''بشر بن عمارۃ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٢٤۔ ١٣٢٥) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسیر الطبري (١١/ ٤٦٦۔ ٤٦٧) [4] تفسیر الطبري (١١/ ٤٦٧)

[5] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٢٥) [6] تفسیر الطبري (١١/ ٤٦٧۔ ٤٦٩) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٠٢۔ ٢٠٤)

رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴾ [مریم: ٤١۔ ٤٨] ''اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجیے، بے شک وہ نہایت سچا (اور) نبی تھا۔ جب اس نے اپنے باپ سے کہا: اے میرے باپ! تو اس کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنے، نہ دیکھے اور نہ تیرے کچھ کام آئے؟ اے میرے باپ! بے شک میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، لہٰذا تو میری اتباع کر، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! تو شیطان کی عبادت نہ کر، بلاشبہ شیطان رحمان کا سخت نافرمان ہے۔ اے ابا جان! بے شک میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمان کی طرف سے عذاب آ پہنچے، پھر تو شیطان کا ساتھی ہو جائے۔ وہ (باپ آزر) کہنے لگا: اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے منہ پھیرے ہوئے ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور رجم کر دوں گا اور تو لمبا عرصہ مجھ سے دور چلا جا۔ ابراہیم نے کہا: تجھ پر سلامتی ہو، عن قریب میں تیرے لیے اپنے رب سے استغفار کروں گا، بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اور میں کنارہ کش ہوتا ہوں تم سے اور ان سے جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اور میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں، اُمید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا۔''

غرض کہ جب تک باپ جیتا رہا ابراہیم علیہ السلام اُس کے لیے دعا کرتے رہے، جب شرک پر مر گیا اور ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات کھل گئی کہ مشرک مرا ہے تو استغفار کرنا چھوڑ دیا اور بیزاری ظاہر کی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١١٤] ''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا بس ایک وعدے کے باعث تھا، جو وعدہ انھوں نے اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیم پر واضح ہوگیا کہ یقیناً وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے زار ہوگئے۔ بے شک ابراہیم بڑے نرم دل، بہت تحمل والے تھے۔''

صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے باپ سے ملیں گے، وہ کہے گا: اے بیٹے اب میں تیری نافرمانی نہ کروں گا، ابراہیم علیہ السلام کہیں گے: اے رب! کیا تو نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا ہے کہ تو مجھ کو قیامت کے دن رسوا نہ کرے گا، رحمت سے انتہائی دور میرے باپ کی رسوائی سے بڑھ کر اور کیا رسوائی ہوگی! اُس وقت ابراہیم علیہ السلام سے کہا جائے گا: ذرا پسِ پشت تو دیکھو، وہ دیکھیں گے تو ایک بجّو گرد آلود ہوگا، اس کو اس کے پاؤں سے پکڑ کر آگ میں ڈال دیں گے۔ [1]

ابراہیم پر توحید کے دلائل کا انکشاف:

پھر اللہ نے کہا ہے کہ اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمان کی سلطنت بتائی، یعنی وجہِ دلالت ظاہر کی جس سے زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کر کے اللہ کی وحدانیت اس کی بادشاہت اور مخلوق میں معلوم کی اور سمجھ لیا کہ اُس کے سوا کوئی معبود اور رب نہیں ہے، جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الأعراف: ١٨٥] ''کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی میں نظر نہیں ڈالی۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٧٢)

وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴾ [سبأ: ٩] ''کیا پھر انھوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین کی طرف نہیں دیکھا؟ اگر ہم چاہیں تو انھیں زمین میں دھنسا دیں یا ہم ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں، بلاشبہ اس میں ہر رجوع کرنے والے بندے کے لیے ضرور ایک نشانی ہے۔''

امام مجاہد، عطا اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے، مگر الفاظ مجاہد رحمہ اللہ کے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے، جو کچھ ان میں تھا وہ سب دیکھا، نظر عرش تک پہنچی، ساتوں زمینیں کشادہ کر دی گئیں، جو کچھ ان میں تھا وہ سب دیکھا۔ لوگوں کو گناہ کرتے دیکھا، ان پر بددعا کرنے لگے۔ اللہ نے کہا: مجھ کو اپنے بندوں پر تجھ سے زیادہ رحم ہے، شاید وہ توبہ کریں اور رجوع کر لیں۔[1] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس بارے میں دو حدیثیں مرفوع سیدنا معاذ اور علی رضی اللہ عنہما سے ذکر کی ہیں، مگر اسناد دونوں کی صحیح نہیں ہیں۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے اعمالِ خلائق سے کوئی شے مخفی نہیں رکھی، وہ گناہ گاروں پر لعنت کرنے لگے، اللہ نے کہا کہ تم سے نہ بنے گا، ان کو ویسا ہی کر دیا، جیسے پہلے تھے۔[3]

سو یہ کشف یا تو بصر سے تھا کہ آنکھ سے عیاناً دیکھا یا بصیرت سے تھا کہ دل کی نگاہ سے خوب تحقیق اور معرفت حاصل کر لی۔ جو کھلی حکمتیں اور قطعی دلیلیں تھیں وہ سب معلوم کر لیں۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ذکرِ خواب کے تحت مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: «أَتَانِي رَبِّي فِي أَحْسَنِ صُوْرَةٍ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلٰى؟ فَقُلْتُ لَآ أَدْرِي يَا رَبِّ! فَوَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ أَنَامِلِهِ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَتَجَلّٰى كُلُّ شَيْئٍ وَعَرَفْتُ ذٰلِكَ... الحديث» (رواه أحمد والترمذي وصححه) یعنی میرے پاس میرا رب بہت اچھی صورت میں آیا، کہا: اے محمد! ملأ اعلیٰ کس بات میں جھگڑتے ہیں؟ میں نے کہا: میں نہیں جانتا اے رب! رب نے اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے بیچ میں رکھ دیا، میں نے انگلیوں کی ٹھنڈک اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان پائی، ہر شے مجھ پر کھل گئی، میں نے سب کچھ پہچان لیا۔[4] یہ حدیث صفات والی احادیث میں سے ہے، اس میں ہتھیلی اور انگلیوں کا ذکر آیا ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے، تاویل کرنا جھٹلانے کی ایک شاخ ہے۔

﴿ وَلِيَكُوْنَ ﴾ میں حرف واؤ زاید ہے یا اپنے معنی پر۔ ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کا ملاحظہ اس لیے کرایا گیا، تاکہ وہ اچھی طرح علم اور یقین حاصل کر لیں۔ جب رات کا اندھیرا ہوا تو ایک تارے کو دیکھ کر کہا

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٤٧٢۔ ٤٧٣) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٠٤) الدر المنثور (٣/ ٣٠٢۔ ٣٠٣)

[3] تفسير الطبري (١١/ ٤٧٥) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٢٧) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[4] مسند أحمد (٥/ ٢٤٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٣٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣١٦٩)

کہ میرا رب یہی ہوگا، جب وہ ڈوب گیا، غائب ہوگیا تو کہنے لگے: میں غائب ہونے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معلوم کر لیا کہ رب تو ہمیشہ رہنے والا اور نہ غائب ہونے والا ہے اور یہ غروب ہونے والا اور چلا جانے والا ہے یہ کس طرح رب ہوسکتا ہے۔[1]

چاند کو دیکھ کر بھی یہی کہا تھا کہ یہ میرا رب ہوگا مگر جب غائب ہوگیا تو کہا کہ اگر اللہ مجھے راہ نہ دکھاتا تو میں گمراہ قوم میں ہوتا۔ پھر سورج کو دیکھ کر کہا کہ یہ رب ہوگا، اس لیے کہ تارے سے بڑا اور چاند سے زیادہ چمکتا دیکھا، مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اے قوم! میں تمھارے شرک سے بیزار ہوں، میں نے اپنا منہ اُس کی طرف کیا ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے، یعنی بغیر کسی سابق مثال کے میں خالص اُس کی عبادت کروں گا، شرک چھوڑ کر توحید پکڑوں گا، اسی لیے یہ کہا کہ میں مشرک نہیں۔

یہ مناظرہ تھا یا مقامِ غور؟

مفسرین کا اختلاف ہے کہ یہ غور و فکر کا مقام تھا یا قوم کے ساتھ مناظرے کا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس بات کا مقتضی ہے کہ یہ غور و فکر کا مقام تھا، اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، اللہ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ ﴾ (آیتِ باب) محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے اُس وقت کہی تھی جب تہ خانے سے نکلے، جس میں ان کی ماں نے اُن کو جنا تھا، نمرود بن کنعان کے خوف سے کہ اُس سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ ایک بچہ پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیرا ملک زائل ہو جائے گا، اُس نے حکم دیا کہ اس سال کے لڑکوں کو قتل کر ڈالو۔ جب ابراہیم علیہ السلام کی ماں حاملہ ہوئیں اور وضع کا وقت آیا تو ایک تہ خانے میں جو بظاہر بستی میں تھا، جا کر بچہ جنا اور وہیں اس کو چھوڑ دیا۔[2]

اس کے سوا ابن اسحاق رحمہ اللہ نے اور بہت سے خوارقِ عادات ذکر کیے ہیں جس طرح اگلے پچھلے مفسرین نے بھی ان کا ذکر کیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اس مقام میں اپنی قوم سے مناظرہ کرتے تھے، ان پر ہیکل اور بتوں کی عبادت کا بطلان بیان کرتے تھے۔ مقامِ اول میں اپنے باپ سے ان کی عبادات کی غلطی بیان اور ظاہر کی جو یہ تھی کہ وہ زمینی بتوں کی عبادت کرتے تھے جن کی شکلیں آسمانوں کے فرشتوں کی طرح بنائی تھیں اور اُن کو اللہ کے نزدیک اپنا سفارشی سمجھتے تھے اور اپنی جانوں کو اس بات سے بہت حقیر جانتے تھے کہ اللہ کو پوجیں اس لیے ان بتوں کو اللہ کی عبادت، شفاعت اور طلبِ رزق وغیرہ امور میں وسیلہ ٹھہرا لیا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام نے ان کو واضح کر کے بتا دیا کہ ان ہیکلوں کی عبادت کرنا جو سات سیارہ متحیرہ کی شکل میں تھے، سراسر خطا اور گمراہی ہے۔ ان سات ستاروں سے مراد: قمر، عطارد، زہرہ، شمس، مریخ، مشتری اور زحل ہیں۔ اُن میں

---

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٤٨٠)
[2] تفسیر الطبري (١١/ ٤٨٠۔ ٤٨١)

سے سب سے زیادہ نزدیک اور روشن اور چمکدار سورج تھا، پھر چاند، پھر زہرہ۔ ابراہیم علیہ السلام نے پہلے یہ بیان کیا کہ زہرہ الہیت کے لائق نہیں ہے، اس لیے کہ وہ مسخر ہے، اس کی چال معین ہے اس چال سے نہ دائیں چل سکتا ہے نہ بائیں، نہ اپنی جان کے لیے کوئی اختیار رکھتا ہے وہ دوسرے اجرامِ فلکی کی طرح ایک جرم (جسم) ہے جن کو اللہ نے روشنی دار بنایا ہے، ایک بڑی حکمت اس میں رکھی ہے کہ مشرق سے نکل کر مشرق و مغرب کے درمیان چلتا ہے، پھر آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے، پھر اگلی شب کو اسی منوال پر ظاہر ہوتا ہے، سو ایسا تارہ کب الٰہ بننے کے لائق ہو سکتا ہے؟

پھر چاند کا حال بیان کیا جس طرح کوکب مذکور کا حال بیان کیا۔ پھر سورج کی طرف متوجہ ہوئے، اُس کی کیفیت ظاہر فرمائی، جب ان تینوں اجرام کے الٰہ ہونے کی نفی کر چکے، کیونکہ دیکھنے میں یہی تینوں سب سے زیادہ روشن ہیں اور قطعی دلیل سے یہ نفی ثابت اور متحقق ہوگئی تو اپنی قوم سے کہا کہ میں ان کی عبادت اور پرستش سے بیزار ہوں۔ اگر یہ اللہ ہیں تو تم سب مل کر ان کے ذریعے سے مجھ کو فریب دو، مگر پھر تم کو مہلت نہ ملے گی۔ میں تو یکسو ہو کر صرف اسی کی طرف متوجہ ہوں جو آسمان و زمین کا خالق ہے اور میں مشرک نہیں ہوں۔

یعنی میں اُس کا عبادت گزار ہوں جو ان اشیا کا خالق، بنانے والا، تسخیر کرنے والا، تقدیر اور تدبیر کرنے والا ہے اور جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی ملکیت و بادشاہت ہے اور ہر شے کا وہی اکیلا خالق، مالک اور الٰہ ہے، اشیا کا (عبادت گزار) نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ”بے شک تمھارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے، اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کر دیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔“

یہ کیونکر روا ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اس مقام پر صرف ناظر ہوں اور مناظر نہ ہوں، حالانکہ اللہ پاک نے ان کے حق میں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝51 اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٥١۔ ٥٢] ”اور بلاشبہ اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی دانائی دی تھی اور ہم اسے خوب جاننے والے تھے۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ کیا مورتیاں ہیں جن کے لیے تم مجاور (بنے بیٹھے) ہو؟“

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝120 شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝121 وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝122 ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ

اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [النحل: ۱۲۰۔ ۱۲۳] ''بلاشبہ ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا، اس (اللہ) نے اسے چن لیا اور اس کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دی۔ اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔ (اے نبی!) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی اتباع کریں جو (اللہ کی طرف) یکسو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

ہر پیدا ہونے والا فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے:

صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ ہر بچہ فطرت پر مسلم پیدا ہوتا ہے۔[1] سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کہتا ہے: میں نے ہر بندے کو حنیف پیدا کیا ہے[2] اور قرآن میں کہا ہے: ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ﴾ [الروم: ۳۰] ''اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ [الأعراف: ۱۷۲] ''اور (اے نبی! یاد کرو) جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انھیں ان کی جانوں پر گواہ بنایا (اور پوچھا:) کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟'' سب نے جواب دیا: کیوں نہیں۔

ایک قول کے مطابق اس آیت کے وہی معنی ہیں: ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ﴾ [الروم: ۳۰] اس کا بیان آئے گا۔ سو جبکہ ساری خلق کے حق میں یہ خبر ہے تو پھر ابراہیم علیہ السلام جن کو اللہ نے امتِ قانت، حنیف اور غیر مشرک ٹھہرایا ہے کس طرح اس مقام میں ناظر ہوں گے، بلکہ وہ تو سب سے اعلیٰ ترین انسان ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بلاشک فطرتِ سلیمہ و سجیہ مستقیمہ کے حامل ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قرآن اسی پر دلیل ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام ہے، اگرچہ نسابین کے نزدیک اور تورات میں تارخ نام آیا ہے۔ سواد کوفہ میں ایک گاؤں کوثی نام کا تھا، یہ وہاں کے رہنے والے تھے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آزار فارسی میں پیرِ کہن سال کو کہتے ہیں۔[3] قرآن میں فارسی کے الفاظ بہت کم آئے ہیں۔ یا بت کا نام آزر تھا اور ان کا نام یازر تھا۔ صحیح یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر ہی تھا، اللہ پاک نے قرآن میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۲۹۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲٦٥۸)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸٦٥) [3] تفسير القرطبي (۷/ ۲۲)

اس کا یہی نام بتایا ہے۔ جمہور مفسرین اسی پر ہیں نسابین اور مورخین جو تاریخ بتاتے ہیں وہ اہلِ کتاب سے نقل کرتے ہیں، ان کی نقل کا اعتبار نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی اُن کا نام آزر ہی بتایا ہے،[1] اللہ اور رسول کے ہوتے ہوئے کسی اور کے قول کا اعتبار نہیں، خواہ کوئی ہو۔

صنم، تمثال اور وثن بت کو کہتے ہیں۔ وہ لکڑی یا پتھر یا لوہے یا سونے چاندی میں سے کسی سے انسان کی صورت پر بنائیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو جو اللہ نے آسمان اور زمین کی بادشاہت دکھائی، یہ دیکھنا ظاہری آنکھ سے تھا یا چشمِ بصیرت سے۔ ملکوت سے مراد آسمانوں اور زمین کے درمیان موجود مخلوق ہے یا عجائب و بدائع یا زمین و آسمان کی نشانیوں کو کہتے ہیں۔ عرش سے زمین کی تہ تک سب مکشوف (کھولا گیا) ہو گیا۔ یا ملکوت سے مراد وہ ہے جو اللہ نے اس آیت میں فرمایا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملکوت سے مراد سلطنت ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ ربوبیت و الہیت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملکوت سماوات، شمس و قمر اور نجوم ہیں۔ ملکوتِ ارض پہاڑ، درخت اور دریا و سمندر ہیں۔[3]

یقین اس علم کو کہتے ہیں جو شبہہ کے زوال کے بعد غور و فکر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ کوکب پتھر کے سوراخ سے دیکھا جو غار کے منہ پر رکھا تھا۔ وہ کوکب مشتری تھا یا زہرہ، اُس کو دیکھ کر کہا: یہ میرا رب ہے، یہ کہنا بچپن میں تھا جو غور و فکر کی ناپختگی کے سبب سے تھا یا بلوغت کے بعد تھا، محققین اسی پر ہیں۔ گویا قوم پر ان کے اعتقاد کے مطابق حجت قائم کی اور بطورِ الزام یہ بات فرمائی، پھر کہا: میں ایسے رب کو دوست نہیں رکھتا جو طلوع و غروب کرے، کیونکہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہونا کسی چیز کے حدوث (نیا پیدا ہونے) کی دلیل ہے۔

یہ جو کہا کہ اگر میرا رب مجھ کو ہدایت نہ کرتا تو میں گمراہ ہوتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہدایت پر ثابت نہ رکھتا تو ایسا ہوتا، کیوں کہ انبیا اول فطرت سے ہمیشہ ہدایت پر ہوتے ہیں۔ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ہدایت اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ہدایت کو اللہ کی طرف منسوب کیا اور افول (غائب ہو جانے) کو حدوث کی دلیل ٹھہرایا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ اشیا مخلوق ہیں، نفع دینے اور ضرر دینے والی نہیں ہیں، پھر اپنا خالقِ ارض و سما کی طرف متوجہ ہونا بیان کیا۔ حنیف اُس کو کہتے ہیں جو دینِ حق کی طرف مائل ہو اور دینِ باطل سے منہ موڑنے والا ہو۔ شمس سے مراد طلوع ہونے والا یا روشنی ہے اس لیے اس حرف کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا یا اس لیے کہ شمس کا مؤنث ہونا حقیقی نہیں ہے۔ شمس کی طرف جانے کا راستہ ایک سو بیس سال کا ہے، اس لیے اس کو اکبر کہا۔[4] واللہ أعلم. اس بات پر کہ ابراہیم علیہ السلام اس مقام میں شرک پر قوم سے مناظرہ کرنے والے تھے نہ کہ صرف ناظر تھے، یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٢)
[2] فتح القدير (٢/ ١٩١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٢٧)
[4] فتح البيان (٤/ ١٧٤۔ ١٧٨)

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَتِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۸۳﴾

اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا تو اس (ابراہیم) نے کہا: کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو، حالاں کہ اسی نے مجھے ہدایت دی ہے اور میں ان سے نہیں ڈرتا جنھیں تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو۔ ہاں، اگر میرا رب کچھ چاہے (تو وہ ضرور ہوسکتا ہے)، میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، کیا پھر تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ (80) اور میں ان سے کیوں ڈروں جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو، جب کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم ان کو اللہ کے شریک ٹھہراتے ہو، جن کی اس نے تم پر کوئی دلیل نازل نہیں کی؟ پس دونوں فریقوں میں سے کون امن کا زیادہ حق دار ہے؟ (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو (81) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں (82) اور یہ ہے ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی تھی۔ ہم جسے چاہیں اس کے درجے بلند کرتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب بہت حکمت والا، خوب جاننے والا ہے (83)

ابراہیم علیہ السلام سے قوم کا جھگڑنا اور ان کی جراَت مندانہ شرک کی تردید:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ جھگڑا اور توحیدِ الٰہی کے بارے میں مناظرے کا ذکر فرمایا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُس نے تو مجھ کو راہِ حق دکھائی، سچی بات سُجھائی، میں اس کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں۔ تمھارے اقوالِ فاسدہ اور کھوٹے شبہات کی طرف میں کیسے توجہ کروں، مجھ کو تمھارے شرکا کا کچھ ڈر نہیں، وہ میرا کیا کر سکتے ہیں جب تک اللہ

نہ چاہے۔ تمھارے قول کے باطل ہونے پر ایک دلیل یہ ہے کہ جن خداؤں کو تم پوجتے ہو وہ کچھ اثر نہیں رکھتے، میں ان سے کیا ڈروں، ان کی کیا پروا کروں۔ ہاں اگر ان کے پاس کوئی حیلہ یا تدبیر ہے تو پھر تم وہ حیلہ دکھاؤ، مجھ کو مہلت نہ دو، بلکہ جو کرنا ہے جلد وہ کر گزرو۔ اللہ کو ہر شے کا علم ہے، اُس کا علم سب کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی چھپی ہوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ہے۔

یہ جو میں نے کہا: تم اس میں غور نہیں کرتے کہ یہ باطل معبود لائقِ عبادت نہیں ہیں۔ یہ حجت ہود علیہ السلام کی حجت کی طرح ہے جو انھوں نے اپنی قوم پر قائم کی تھی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿53﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿54﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿55﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [هود: ٥٣- ٥٦]

''انھوں نے کہا: اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں لایا اور ہم (صرف) تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم تجھ پر ایمان لانے والے (بھی) نہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تجھے (دماغی) خرابی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہود نے کہا: بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ بے شک میں بَری ہوں ان سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ سوائے اللہ کے، چناں چہ تم سب مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی تدبیر کر لو، پھر تم مجھے مہلت نہ دو۔ بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا ہے جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے، (زمین پر) چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں، جسے اس نے اس کی پیشانی سے نہ پکڑ رکھا ہو، بے شک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔''

یہ بات جو قومِ ہود نے اپنے پیغمبر سے کہی تھی، وہی بات اب اس امت کے بدعتی، اہلِ توحید و متبعین سے کہتے ہیں، اگر کسی موحد کو کوئی تکلیف یا دنیاوی ذلت کسی دین و ایمان کے دشمن یا روپے پیسے کے پجاری سے پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ سزا ہے اُس کی جو تم نے مذہب حنفی کی تقلید کو رد کیا ہے اور امام صاحب کو ناراض کر دیا ہے۔ سو ان کا جواب بھی وہی جواب ہے جو ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو دیا کہ میں تمھارے شرک سے بری ہوں، تم کو جو کچھ مکر و فریب مجھ سے کرنا ہو وہ بلا تاخیر کر گزرو، دیر نہ کرو، مجھ کو اپنے اور تمھارے رب پر بھروسا ہے، ہر چوپائے اور جانور کی پیشانی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یا ان مقلدین کا جواب وہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے آیتِ باب میں دیا ہے کہ تم باوجود شرک کرنے کے ڈرتے ہی نہیں ہو، میں تمھارے بے سند شرک سے کیا ڈروں۔ تمھی کہو کہ امن کس کو ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ اس جگہ سلطان سے مراد حجت ہے،[1] یعنی تم تو بغیر کسی دلیلِ الٰہی کے شرک کرتے ہو اور پھر نہیں ڈرتے، میں باوجود دلیلِ توحید کے کس طرح ڈروں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٣٢) اس کی سند صحیح ہے۔

مطابق ہے: ﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوریٰ: ۲۱] ''کیا ان کے لیے (اللہ کے سوا) شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے وہ دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ﴾ [النجم: ۲۳] ''یہ تو محض چند نام ہی ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل و برہان نازل نہیں کی۔'' یہ دونوں آیتیں ردِ شرک و تقلید پر دلیل ہیں۔ ان سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ نے تقلید کے جواز پر کوئی حجت نہیں اتاری۔ یہ راہ و رسم اہلِ شرک کی نکالی ہوئی ہے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا کہ کہو کون فرقہ عذابِ قیامت سے امن کا زیادہ تر مستحق ہے، وہ جو اس رب کا عبادت گزار ہے جس کے ہاتھ میں بھلا برا ہے، یا وہ جو ایسی چیز کو بلا دلیل پوجتا ہے جو نہ برا کرے نہ بھلا کرے۔

شرک ظلمِ عظیم ہے:

پھر اللہ نے اُس کا یہ جواب فرمایا کہ جو لوگ عبادت میں مخلص ہیں، کسی سے کو اس وحدہ لا شریک لہ کی عبادت میں شریک نہیں کرتے، وہی اُس دن امن میں ہوں گے اور وہی راہ یاب ہیں دنیا اور آخرت میں۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ (آیتِ باب) تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ہم میں سے وہ کون ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا ہے؟! تب یہ آیت آئی: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳] ''بے شک شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔''[1] (رواہ البخاري) معلوم ہوا کہ ظلم سے مراد شرک ہے، خواہ یہ شرک توحیدِ رب العالمین میں ہو یا رسالتِ سید المرسلین میں۔ اس پچھلے شرک کا نام تقلید ہے۔

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب یہ آیت اتری، لوگوں پر سخت شاق گزری تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "أَيُّنَا لَا يَظْلِمُ نَفْسَهُ؟" ''ہم میں سے کس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا؟!'' فرمایا: جو تم سمجھتے ہو وہ مطلب نہیں ہے، تم نے نہیں سنا ہے کہ بندہ صالح نے کیا کہا تھا: ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ یعنی وہ ظلم یہی شرک ہے۔[2] (رواہ أحمد) روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام پر شاق گزری اور کہا: "أَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ؟"، تو فرمایا: «لَيْسَ كَمَا تَظُنُّوْنَ، إِنَّمَا قَالَ لِابْنِهِ: يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ، إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ»[3] ''اس طرح نہیں جس طرح تم گمان کرتے ہو، (لقمان) نے اپنے بیٹے سے یہ کہا تھا کہ اے میرے پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۲) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۶۵۳۸) مسند أحمد (۱/ ۳۷۸)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۶۵۳۸)

روایت کے چوتھے الفاظ یہ ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحابِ نبی پر شاق گزری تو پھر یہ آیت آئی: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [1] (رواه البخاري) روایت کے پانچویں الفاظ یوں ہیں کہ ''قَالُوْا: أَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ؟ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ «لَيْسَ بِالَّذِي تَعْنُوْنَ، أَلَمْ تَسْمَعُوْا مَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ[﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ إِنَّمَا هُوَ الشِّرْكُ» [2] (رواه البخاري) سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: «بِظُلْمٍ بِشِرْكٍ» (رواه ابن أبي حاتم) یہی قول ابوبکر، عمر، ابی بن کعب، سلمان، حذیفہ، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم، عمرو بن شرحبیل، ابوعبدالرحمان سلمی، مجاہد، عکرمہ، نخعی، ضحاک، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی مروی ہے۔ [3] سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «قِيلَ لِي أَنْتَ مِنْهُمْ» ''مجھے کہا گیا ہے کہ تم اُن میں سے ہو۔'' [4] (رواه ابن مردويه)

خالص ایمان والے ہی امن میں ہوں گے:

سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ نکلے، جب مدینے سے باہر ہوئے تو ایک سوار دیکھا کہ ہماری طرف آتا ہے، نبی اکرم ﷺ نے کہا: گویا یہ تمھارے پاس ہی آ رہا ہے، وہ مرد جب ہمارے پاس پہنچا، سلام کیا، ہم نے اُس کو سلام کا جواب دیا، نبی اکرم ﷺ نے اُس سے کہا: تو کہاں سے آیا ہے؟ کہا کہ اپنے اہل و اولاد اور قبیلے کے پاس سے، فرمایا: کیا چاہتا ہے؟ کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا ہوں، فرمایا: تو نے ان کو پا لیا، کہا: اے اللہ کے رسول! ایمان کیا ہے؟ مجھ کو سکھا دو، فرمایا: تو اس بات کی گواہی دے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور نماز پڑھ، زکات دے، روزہ رکھ اور بیت اللہ کا حج کر۔ اس نے کہا: میں نے اس کا اقرار کیا، پھر اس کے اونٹ کا ہاتھ موش کے ایک سوراخ میں گھس گیا، وہ اس کو نکالنا چاہتا تھا کہ سر کے بل گر پڑا، پھر مر گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ عمار بن یاسر اور حذیفہ رضی اللہ عنہما دوڑے، اُس کو اٹھا کر بٹھایا، کہا: اے اللہ کے رسول! یہ تو مر گیا ہے، نبی اکرم ﷺ نے اعراض کیا، پھر ان دونوں سے کہا: تم نے اس مرد سے میرا اعراض کرنا دیکھا، میں نے دو فرشتوں کو دیکھا کہ اُس کے منہ میں جنت کا پھل دیتے ہیں، میں نے جانا کہ وہ بھوکا مرا ہے، پھر فرمایا: « هَذَا مِنَ الَّذِيْنَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ ''یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں اللہ عزوجل نے فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔'' پھر کہا کہ اپنے بھائی کو لے جاؤ، ہم اس کو پانی پر لے گئے، نہلایا، حنوط کفن کیا، قبر میں اتارا، نبی اکرم ﷺ آ کر قبر کے کنارے پر بیٹھے، فرمایا: لحد بناؤ، شق نہ کرو، لحد ہمارے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٣٨)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٣٣) [4] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٠٨) اس کی سند میں ''محمد بن شداد مسمعی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

لیے ہے، شق ہمارے غیر کے لیے ہے۔[1] (رواہ أحمد)

مسند احمد کی دوسری روایت میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «هَذَا مِمَّنْ عَمِلَ قَلِيلًا وَأُجِرَ كَثِيرًا»[2] ''یہ ایسا شخص ہے جس نے عمل قلیل کیا مگر اجر زیادہ دیا گیا۔'' اس قصے کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی مطولاً سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ حدیث کا آخری حصہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «أَسَمِعْتُمْ بِالَّذِي عَمِلَ قَلِيلًا وَأُجِرَ كَثِيرًا؟ هَذَا مِنْهُمْ، أَسَمِعْتُمْ ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ... الآية ﴾ فَهَذَا مِنْهُمْ» ''کیا تم نے اس شخص کے بارے میں سنا جس نے عمل تھوڑا کیا اور اجر زیادہ دیا گیا، یہ انہی میں سے ہے، کیا تم نے ان لوگوں کے بارے میں سنا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں، یہ انہی میں سے ہے۔''[3]

ابراہیم علیہ السلام کی حجتیں اللہ نے دیں:

پھر اللہ نے فرمایا کہ جو اوپر گزرا، ﴿ كَيْفَ اَخَافُ ﴾ سے ﴿ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ تک ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دی ہے ہم جس کا چاہیں درجہ بلند کریں، تیرا رب حکیم ہے اپنے اقوال وافعال میں، اور راہ یاب اور گمراہ لوگوں کے حال سے خوب آگاہ ہے، گو اس پر قیامِ حجت و براہین کیوں نہ ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [يونس: ٩٦- ٩٧] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔'' اسی لیے اس جگہ ﴿ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴾ کہا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

آیتِ باب کی تفسیر میں فتح البیان کا بیانِ فاتح یوں ہے کہ ابراہیم وقومِ ابراہیم کے درمیان توحید میں بحث اور حجت ہوئی: قوم نے کہا کہ جن بتوں اور مورتیوں کو ہم پوجتے ہیں یہی ہمارے خدا ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں یہ حجت اور گفتگو کرتے ہو کہ میں بھی تمھاری گمراہی، جہالت اور عدمِ ہدایت میں ہو جاؤں۔

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٣٥٩) اس کی سند میں ''ابو جناب یحییٰ کلبی'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ١١٥٥)

[2] مسند أحمد (٤/ ٣٥٩) اس کی سند میں ''ثابت ابو حمزہ ثمالی'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٣٤) اس کی سند میں ''عبدالاعلیٰ بن عامر ثعلبی'' ضعیف راوی ہے۔

سو خیریت ہے میں تمھارے خداؤں سے نہیں ڈرتا، قوم نے ان کو یہ ڈراوا دیا تھا کہ ہمارے خدا تم سے خفا ہو کر تم کو تکلیف دیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: یہ تو ایک مخلوق ہیں نہ نفع دیں نہ نقصان، ان سے کیا ڈرنا! ڈر تو اس کا ہوتا ہے جس کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت ہے۔ ہاں اگر اللہ کی مرضی کا تقاضا ہو کہ مجھ کو میرے کسی گناہ کے سبب کوئی نقصان پہنچے تو اس کا اختیار اللہ کو ہے نہ کہ تمھارے معبودانِ باطل کو جو نہ برا کر سکیں نہ بھلا۔

میرے رب کا علم وسیع ہے چاہے خیر پہنچائے، چاہے شر، تم اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ بت جمادات ہیں، یہ کیا کسی کو نفع و ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ نافع اور ضار سوائے خالقِ ارض و سماوات کوئی نہیں ہے۔ پھر جس کے ہاتھ میں نہ نفع ہو، نہ ضرر، نہ رزق، نہ موت، نہ حیات، نہ وہ دیکھے، نہ سنے، نہ کسی چیز پر قادر ہو، اُس سے میں کیا ڈروں گا؟ یہ الزام کے طور پر کہا۔ حالانکہ تم باوجود شرک کے نہیں ڈرتے ہو وہ حجتِ الزامی ہے جس سے ان کی خلاصی نہیں ہو سکتی۔ اللہ نے کب حکم دیا ہے کہ تم کسی کو اس کا شریک کرو، لیکن اس بات پر حجت اور دلیل اتاری ہے۔

فریقین سے مراد مومنین مشرکین ہیں، یعنی جب یہ بات ٹھہری کہ میرا معبود اللہ ہے جس کی صفات نفع و ضرر، پیدا کرنا اور رزق دینا ہے۔ اور تمھارے معبود یہی جمادات اور مخلوقات ہیں تو تم کس طرح مجھ کو ڈراتے ہو اور میں کیونکر ان سے ڈروں؟! تم اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کرتے ہو اور نہیں ڈرتے، اب تم ہی انصاف سے کہو کہ قیامت میں عذابِ آخرت سے امن حاصل کرنے کے لائق کون شخص ہے؟ موحد یا مشرک؟ پھر اللہ نے دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ کر دیا، فرمایا کہ جس فریق نے اپنا ایمان ظلم سے خلط ملط نہیں کیا، وہی امن میں ہے۔

ظلم سے اس جگہ شرک مراد ہے۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے، لیکن جب کہ احادیث میں ظلم کی تفسیر شرک سے آ چکی ہے تو یہ تفسیر سب کے اقوال سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ معتزلہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ظلم سے معصیت مراد ہے نہ کہ شرک، یہ بالکل غلط ہے۔ جب صادق و مصدوق نے کہلایا کہ ظلم شرک ہے تو بے چارہ زمخشری وغیرہ کس قطار و شمار میں ہے۔ "إِذَا جَآءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ" آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کیے بغیر مرے گا، انجام اس کا عذابِ نار سے امن ہے۔ یہ حجتیں ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دیں، ہم جس کو چاہیں اسے ہدایت و علم و فہم و عقل و فضیلت و ارشاد الی الحق اور تلقینِ حجت وغیرہ کر کے اس کا درجہ بڑھا دیں۔ اس میں اصلح کے بارے میں معتزلہ کا قول ٹوٹ گیا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما کے لیے شہدا کے درجات کی طرح درجات ہیں۔[1] ﴿اِنَّ رَبَّكَ﴾ کا خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔[2] (قاله السّمين وأبو حيان)

---

[1] الدر المنثور (۳/ ۳۱۱) [2] فتح البيان (٤/ ۱۷۹۔ ۱۸۳)

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ
قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى
وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى
وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ
وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَمِنْ
اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا
هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ
اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾

اور ہم نے اس (ابراہیم) کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے، ہم نے سب کو ہدایت دی، اور اس سے پہلے ہم نے نوح کو ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں سے داود، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو (بھی ہدایت دی) اور اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں (84) اور (ہم نے) زکریا، یحیٰ، عیسیٰ اور الیاس کو (بھی ہدایت دی)، وہ سب نیک لوگوں میں سے تھے (85) اور (ہم نے) اسماعیل، الیسع، یونس، اور لوط کو (بھی ہدایت دی) اور ان سب کو ہم نے جہانوں پر فضیلت دی (86) اور کچھ کو ان کے باپ دادا، ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے اور ہم نے انھیں چن لیا اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت دی (87) یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو وہ عمل کرتے تھے برباد ہوجاتے (88) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے کتاب، حکمت اور نبوت دی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس (ہدایت کو ماننے) سے انکار کرتے ہیں تو بے شک ہم نے اس کے لیے ایسی قوم تیار کی ہے کہ وہ ان کا انکار کرنے والی نہیں (89) یہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، لہٰذا (اے نبی) آپ بھی ان کے طریقے کی پیروی کریں۔ کہہ دیجیے: میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، یہ تو تمام دنیا والوں کے لیے نصیحت ہے (90)

ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں اسحاق و یعقوب علیہما السلام کا ملنا:

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں اولاد دینے کا ذکر کیا، وہ اور ان کی بیوی دونوں اولاد پیدا ہونے سے مایوس ہو چکے تھے۔ کچھ فرشتے قومِ لوط کی طرف جاتے تھے،، وہ ان کو اسحاق کی بشارت دیتے گئے، بی بی نے تعجب سے کہا: کیا میں بڑھیا ہو کر بچہ جنوں گی؟! اور یہ میرا شوہر بوڑھا ہے یہ تو عجیب بات ہے۔ انھوں نے کہا: تو اللہ کے حکم سے کیا تعجب کرتی ہے؟ اے گھر والو! تم پر اللہ کی رحمت و برکت ہے۔ اللہ حمید مجید ہے۔ اس بشارت میں جو ابراہیم و سارہ علیہما السلام کو دی، یہ بھی تھا کہ وہ نبی ہوگا اس کی نسل و عقب چلے گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [الصافات: ۱۱۲] ''اور ہم نے اس (ابراہیم) کو اسحاق (بیٹے) کی بشارت دی، جو صالح لوگوں میں سے نبی ہوگا۔''

یہ پوری بشارت بڑی نعمت ہے اور فرمایا: ﴿ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴾ [ھود: ۷۱] ''پھر ہم نے اسے اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب (پوتے) کی۔'' یعنی اس بچے کا ایک اور بچہ ہوگا، تم دونوں کی زندگی میں تمھاری آنکھیں اُس کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوں گی، جس طرح کہ اُس کے باپ کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوئیں، کیونکہ اپنی عقب اور نسل کی بقا کی امید سے پوتے کے ہونے پر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بڈھے بڑھیا کو یہ وہم ہوتا ہے کہ اب ضعف کے سبب سے بچہ ہو چکا، نسل کاہے کو آگے چلے گی۔ اس لیے بیٹے اور پوتے دونوں کی بشارت دی۔

یعقوب عقب سے مشتق ہے، اولاد کا باقی رہنا جتلا دیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو یہ خبر اس بات پر ملی کہ وہ اپنی قوم سے کنارہ کش ہو کر ہجرت کر گئے اور کہا کہ اگر ہم اس جگہ اللہ کی عبادت نہیں کر سکتے تو کسی اور ہی زمین میں جا کر کریں گے۔ اللہ نے اُس قوم کے عوض ان کو نیک اولاد خود ان کی پشت سے ان کے دین پر ان کا دل خوش کرنے کو عطا فرمائی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴾ [مریم: ۴۹] ''پھر جب اس نے کنارہ کیا ان سے اور جنھیں وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے، تو ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب بخشے، اور ہم نے ہر ایک کو نبی بنایا۔''

نوح و ابراہیم علیہما السلام کی خصوصیت:

یہاں ﴿ كُلًّا هَدَيْنَا ﴾ فرمایا، پھر ذکر کیا کہ جس طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ہدایت کی، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام سے پہلے نوح علیہ السلام کو ہدایت کی تھی، نیک اولاد دی تھی، دونوں کی ایک خصوصیتِ عظیمہ ہے۔ نوح علیہ السلام کی خصوصیت یہ تھی کہ جب ساری زمین والے ڈوب گئے، سوائے ان مومنین کے جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے تو اللہ نے نوح علیہ السلام کی اولاد کو باقی رکھا، سارے آدمی انہی کی اولاد میں سے ہیں، اس لیے اُن کو آدم ثانی کہتے ہیں۔ خلیل علیہ السلام کی

خصوصیت یہ ہوئی کہ ان کے بعد جو نبی آیا وہ انھی کی اولاد سے اٹھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ ﴾ [العنکبوت: ۲۷] ''اور اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ﴾ [الحدید: ۲۶] ''اور یقیناً ہم نے نوح کو اور ابراہیم کو (رسول بنا کر) بھیجا اور ہم نے ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی۔'' مزید فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴾ [مریم: ۵۸] ''یہ وہ (انبیاء) ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا جو اولادِ آدم میں سے ہیں اور ان لوگوں (کی نسل) میں سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا، اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد سے اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا، جب ان پر رحمٰن کی آیات تلاوت کی جاتیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے۔''

اس آیتِ کریمہ میں جو یہ فرمایا ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ ﴾ یعنی ہم نے اس کی اولاد میں سے سلیمان اور داود علیہما السلام کو ہدایت کی، ضمیر نوح علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لیے اقرب مذکورین ہے۔ اس میں کچھ اشکال نہیں، یہی ظاہر ہے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] اور ابراہیم علیہ السلام کی طرف (ضمیر) کا لوٹنا اچھا ہے، اس لیے کہ سیاقِ کلام انھی کے حق میں ہے۔ لوط علیہ السلام کی طرف (ضمیر) کا لوٹنا موجبِ اشکال ہے، اس لیے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ وہ ماران بن آزر کے بیٹے تھے تو ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ٹھہرے۔ مگر یوں کہیں کہ تغلیباً ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں داخل ہوئے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ [البقرۃ: ۱۳۳] ''کیا جب یعقوب کو موت آئی اس وقت تم موجود تھے؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا: میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا: ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک معبود ہے۔'' کیونکہ اسماعیل علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے چچا ہیں، آبا میں تغلیباً داخل ہو گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر جو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں کیا یا نوح علیہ السلام کی اولاد میں دوسرے قول میں ذکر کیا، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ بیٹیوں کی اولاد بھی مرد کی اولاد میں داخل ہو سکتی ہے، اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نسب ابراہیم علیہ السلام تک مریم علیہا السلام کی طرف سے پہنچتا ہے کیونکہ وہ بغیر باپ کے تھے۔

ابوحرب بن الاسود نے کہا کہ حجاج نے یحییٰ بن یعمر کو کہلا بھیجا کہ میں نے سنا ہے کہ تجھ کو یہ زعم ہے کہ حسن و حسین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہیں، کیا تو نے اس بات کو کتاب اللہ میں پایا ہے، میں نے کتاب اللہ کو اول سے لے کر آخر

[1] تفسیر الطبري (۱۱/ ۵۰۷)

تک پڑھا ہے اور کسی جگہ بھی نہیں پایا، یحییٰ نے کہا کیا تو سورت انعام کو نہیں پڑھتا: ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ إلى قوله يَحْيٰى وَعِيْسٰى ﴾ (آیتِ باب) کہا: ہاں، کہا: کیا عیسیٰ علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہیں؟ ان کا تو باپ ہی نہیں تھا، کہا: سچ ہے۔[1] اسی لیے یہ مسئلہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی اولاد کے لیے وصیت کرے گا یا وقف یا ہبہ تو اس میں اُس کی اولادِ دختری بھی داخل رہے گی۔ ہاں اگر خاص بیٹوں کو وقف کرے گا تو اس میں صرف بیٹے پوتے ہی داخل ہوں گے جو خاص اُس کی پشت سے ہیں بدلیل قولِ شاعر عربی ع

بَنُوْنَا بَنُوْ أَبْنَائِنَا وَبَنَاتِنَا بَنُوْهُنَّ أَبْنَاءُ الرِّجَالِ الْأَبَاعِدِ

اوروں نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ ابنائے بنات (بیٹیوں کے بیٹے) بھی انہی میں سے ہیں، اس لیے کہ صحیح بخاری میں مرفوعاً آیا ہے کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے کہا: « إِنَّ ابْنِيْ هَذَا سَيِّدٌ ... الخ » چنانچہ اس فرمان میں کو بیٹا کہا۔[2] یہ دلیل ہے اس پر کہ وہ بیٹوں میں داخل ہیں۔ دوسروں نے کہا کہ یہ بطورِ مجاز فرمایا ہے، ظاہر یہ کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹوں کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹوں میں داخل ہونا بطورِ خصوصیت کے ہے، ساری امت اس حکم میں یکساں نہیں ہوسکتی۔ واللہ أعلم

شرک رسولوں تک کے اعمال ضائع کر دیتا ہے:

پھر فرمایا کہ ان کے آباء و اولاد اور بھائیوں میں سے یہ ذکر ہوا اصول و فروع و اہلِ طبقات کا، یعنی ہدایت اور اجتباء (پسند کرنا) اُن سب کو شامل ہے، پھر کہا کہ یہ بات ان کو اللہ کی توفیق و ہدایت سے حاصل ہوئی۔ اگر وہ شرک کرتے تو ان کے سارے اعمال اکارت جاتے۔ یہ شرک کے لیے سختی ہے اور شرک کے بارے میں درشتی ہے اور شرک کی ملاوٹ کی سنگینی کا بیان ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الزمر: ٦٥] ''اور بلاشبہ آپ کی طرف اور ان لوگوں (نبیوں) کی طرف، جو آپ سے پہلے ہوئے، (یہ) وحی کی گئی کہ اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے اعمال ضرور ضائع ہو جائیں گے۔'' یہ شرط ہے اور شرط کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ضرور واقع ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٨١] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اگر رحمان کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں ہی (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔''

نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٧] ''اگر ہم (یوں ہی) کھیل بنانا چاہتے تو اپنے پاس ہی سے اسے بنا لیتے، اگر ہم کرنے والے ہوتے۔'' اور اُس کے فرمان کے مطابق: ﴿ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ [الزمر: ٤] ''اگر اللہ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے ان میں سے جنھیں وہ پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا چن لیتا، لیکن وہ تو (ان

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٣٥)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٧)

باتوں سے) پاک ہے، وہ اللہ واحد ہے، بڑا زبردست۔“

پھر فرمایا کہ ہم نے ان کو کتاب وحکمت دی، یعنی ان پر یہ انعام کیا۔ خلق پر لطف وکرم فرمایا، اگر وہ یعنی اہلِ مکہ یا قریش ان باتوں کا انکار کریں گے یا مراد تمام اہلِ ارض ہیں، کیا عرب کیا عجم کیا کتابی وملّی تو ہم نے ایک قوم مہاجرین وانصار مقرر کی ہے اور جو قیامت تک ان کے اتباع ہیں وہ ان باتوں کا ہرگز انکار نہ کریں گے، ایک حرف رد نہ کریں گے، بلکہ سب پر ایمان لائیں گے۔ کیا محکم اور کیا متشابہ، جَعَلَنَا اللّٰهُ مِنهُم بِمَنِّهٖ وَكَرَمِهٖ.

سب انبیا علیہم السلام ہدایت یافتہ ہیں اور اُن کی پیروی کا حکم:

پھر اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو خطاب فرمایا کہ انبیائے مذکورین اپنے آباء واجداد، اولاد اور بھائیوں کے ہمراہ ہدایت یافتہ ہیں نہ کہ کوئی اور، سوتو انہی کی ہدایت پر چل۔ اخوان سے مراد اشباہ (مشابہ) ہیں جن کو اللہ نے ہدایت فرمائی، اس لفظ سے ہدایت یافتہ امت کے لیے اخوان کے لفظ کا استعمال صحیح ثابت ہوا۔ سو جب یہ حکم نبی اکرم ﷺ کو ہے تو امت آپ ﷺ کی تابع ہوئی، شریعت اور نبی کے امر ونہی میں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اقتدار اور چیز ہے اور تقلید وہویٰ ورائے اور چیز۔

اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ حکم حق کی پیروی کا فرمایا ہے کہ جس طرح وہ شرک سے بیزار اور توحید پر ثابت قدم تھے، اسی طرح تم بھی ان کے قدم بقدم چلو، یہ نہیں کہا کہ جو ان کی رائے اور ہویٰ تھی، اس کی پیروی کرو۔ پس جو بات ہدایت کی، یعنی اخلاص اور صواب کی کتاب وسنت کے مطابق ہمیں ائمہ دین اور مجتہدین سلف سے پہنچی، اُس میں ہم پر لازم ہے کہ ان کی اقتدا کریں اور جو بات انھوں نے اپنی رائے سے کہی ہے جس کی دلیل قرآن و حدیث میں نہیں ملتی، اس میں ان کی تقلید کرنا منع ہے۔ سلف میں جن لوگوں سے کسی حدیث پر عمل فوت ہو گیا یا ان کا کوئی قول حدیث کے مخالف پڑا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دلیل ان کو نہیں پہنچی، پھر جس کسی کو پہنچ گئی تو اس نے فوراً اپنے قول وعمل سے رجوع کر لیا، اس لیے ان پر کوئی عذاب یا خطاب وارد نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف خلف میں جن کو سنتِ مطہرہ کے جمع ہو جانے کے بعد سب دلیلیں پہنچ گئی ہیں، اب جو کوئی ان میں سے اس دلیل کو کسی بزرگ کے قول کے مقابلے میں نہیں مانتا، وہ معذور نہیں ہے بلکہ مازور ہے، یہی ہدایتِ سلف اور ضلالتِ خلف کے درمیان فرق ہے۔

کتاب ”جلب المنفعة“ (نواب صاحب، صاحبِ تفسیر کی تالیف) میں اس بحث کو بہت خوب لکھا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ مجاہد نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: کیا سورت ص میں سجدہ ہے؟ کہا: ہاں، پھر یہ آیت پڑھی، پھر کہا: هُوَ مِنهُم۔ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ”نَبِيُّكُمْ مِمَّنْ أُمِرَ أَنْ يَّقْتَدِيَ بِهِمْ“ [1] پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے پیغمبر تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں نے جو یہ قرآن تم کو پہنچایا ہے میں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٦)

اُس پر تم سے کسی اُجرت کا طالب نہیں ہوں، نہ کچھ تم سے لینا چاہتا ہوں۔ یہ تو ایک نصیحت اور تذکرہ ہے کہ اُس کو سمجھ کر وہ نابینائی سے ہدایت کی طرف، سرکشی سے رشد کی طرف اور کفر سے ایمان کی طرف راہ یاب ہوں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اسحاق علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں، یعقوب علیہ السلام اسحاق علیہ السلام کے بیٹے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے دین کے بارے میں حجتیں بیان کیں، اس بارے میں خوب جانکاہی کی، اُس کا یہ بدلہ ملا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ان نعمتوں پر آگاہ کیا، یہ بزرگی دینے کے لیے ہے، کیونکہ باپ کا شرف بیٹے میں سرایت کرتا ہے، تمام رسول جن کا اس آیت میں ذکر ہوا، اٹھارہ پیغمبر ہیں، باقی رہے سات: آدم، ادریس، شعیب، صالح، ہود، ذوالکفل اور محمد علیہم السلام، ان سب کو ملا کر سب پچیس ہوئے، ان سب پر تفصیلاً ایمان لانا واجب ہے۔ اللہ نے اسحاق اور یعقوب کو رشد و حق کا اور صحیح راستہ بتا دیا، وہ دونوں ابراہیم علیہ السلام کے مقتدی تھے۔ ان سے پہلے نوح علیہ السلام کو ہدایت کی تھی۔ آدم و نوح علیہما السلام کے درمیان گیارہ سو برس کا فاصلہ ہے، آدم نو سو ساٹھ برس جیے۔ نوح بیٹے ہیں لمک کے۔ ادریس اور نوح علیہما السلام کے درمیان ایک ہزار کا فاصلہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام آدم علیہ السلام سے دو ہزار برس کے اول میں پیدا ہوئے، ان کے اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن کا فاصلہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سو پچھتر برس ہوئی۔ اسماعیل علیہ السلام کی عمر ایک سو تیس برس۔ جب ابراہیم علیہ السلام کا انتقال ہوا تو اس وقت اسماعیل علیہ السلام نواسی برس کے تھے۔ اسحاق علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کے چار برس بعد پیدا ہوئے اور ایک سو اسی برس جیے۔ یعقوب بن اسحاق علیہما السلام ایک سو سینتالیس برس زندہ رہے۔ یوسف بن یعقوب علیہما السلام کی عمر ایک سو بیس برس ہوئی۔ ان کے اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان چار سو بیس برس کا فاصلہ ہے۔ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان پانچ سو پینسٹھ سال کا فرق ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس برس کی ہوئی۔ موسیٰ اور داود علیہما السلام کے درمیان پانچ سو انہتر سال کی مدت ہے۔ داود علیہ السلام سو برس زندہ رہے، ان کے بیٹے سلیمان پچاس برس سے کچھ زیادہ جیے، ان کے اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک ہزار سات سو برس کا فاصلہ ہے۔ ایوب علیہ السلام کی عمر تریسٹھ برس ہوئی، سات برس بلا میں مبتلا رہے۔ یونس علیہ السلام متّی کے بیٹے ہیں، متّی ان کی ماں کا نام ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے یہ سب مدتیں "التحبير في علم التفسير" میں ذکر کی ہیں۔[1] واللّٰه أعلم.

غرض کہ ابراہیم علیہ السلام سے دس قرن پہلے اللہ نے نوح علیہ السلام کو ارشاد الی الحق کیا اور سیدھا راستہ دکھایا، ہدایت فرمائی، ﴿ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ ﴾ کی ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے، اس لیے کہ انبیا کی ترتیب جو دی گئی ہے وہ ابراہیم علیہ السلام کی قدر و منزلت کے بیان کی خاطر ہے کہ ان کو حجت دی، درجہ بڑھایا اور اولاد دی جو پیغمبر ہوئے۔ ان کی نسل قیامت تک باقی رکھی، یہ سب اس لیے ہے کہ جو مشرکین اور یہود ان کی طرف منسوب ہیں، ان کو الزام دیا ہے۔

[1] مذکورہ کتاب نہیں ملی۔

امام ابن جریر، قشیری، ابن عطیہ اور جمہور مفسرین رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع نوح علیہ السلام ہیں،[1] اس لیے کہ عبارت میں ان کا ذکر قریب ترین ہے اور اس لیے کہ یونس اور لوط علیہما السلام ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ اگر ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی ہوتی تو اس آیت اور اس کے بعد والی آیت اور تیسری آیت میں جن کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے ساتھ مختص ہوتی۔ ان کا عطف نوح علیہ السلام پر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں قول جائز ہیں، کیونکہ دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔[2]

داود بیٹے ہیں ییشا کے، ان کو اللہ نے ملک و نبوت دونوں دیے تھے، ان کے بیٹے سلیمان علیہ السلام ہیں، ایوب بیٹے ہیں اموص بن رازخ بن روم بن عیص بن اسحاق بن ابراہیم علیہما السلام کے۔ یوسف علیہ السلام بیٹے ہیں یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کے۔ انھی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم فرمایا ہے، یعنی چار پشت سے لگاتار نبی ہوئے۔ اسی جگہ سے یہ بات نکالی گئی ہے کہ حسب کا اعتبار چار پشت تک ہے۔ موسیٰ بیٹے ہیں عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب کے، ان کے بھائی ہارون اُن سے ایک سال بڑے تھے۔ زکریا علیہ السلام بیٹے ہیں آذن بن برکیا کے، اُن کے بیٹے یحییٰ ہیں۔ عیسیٰ مریم بنت عمران کے بیٹے ہیں۔ الیاس ادریس کا نام ہے۔[3] (قاله ابن مسعود)

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الیاس بیٹے ہیں، سنا بن فنحاص بن عیزار بن ہارون بن عمران کے۔[4] یہی صحیح ہے، اس لیے کہ اہلِ انساب نے کہا ہے کہ ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام کے دادا ہیں۔ اللہ نے بھی اس آیت میں الیاس کو نوح کی طرف نسبت کیا ہے اور ان کی اولاد سے ٹھہرایا ہے۔ ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الیاس علیہ السلام اولادِ اسماعیل علیہ السلام سے ہیں۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سبط یوشع بن نون ہیں۔[5] محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خال (ماموں) والد ہے عم (چچا) والد ہے، اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے اخوال (ماموؤں) کی طرف منسوب کیا ہے۔ ﴿مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ﴾ فرمایا: پھر زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا نام لیا۔[6]

معلوم ہوا کہ باپ کا بھائی ماں کا بھائی بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے۔ ابو الشیخ، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ نے عبدالملک بن عمیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ یحییٰ بن یعمر حجاج کے پاس گئے، حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا، حجاج نے کہا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت سے نہ تھے، یحییٰ نے کہا: تو جھوٹا ہے، کہا: اچھا تم اس کی دلیل لاؤ، انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ إلى قوله عِيْسٰى﴾ پھر کہا: اللہ نے خبر دی ہے کہ عیسیٰ ماں کی طرف سے ذریتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں،[7] یہ قصہ اوپر گزر چکا ہے اور کئی الفاظ وطرق سے آیا ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ نسب ماں کی طرف سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو ذریتِ نوح ٹھہرایا ہے، وہ نوح سے نہیں ملتے مگر ماں کے ذریعے سے۔

---

[1] تفسير الطبري (١١/ ٥٠٧) [2] معاني القرآن (٢/ ٢٦٩) [3] تفسير القرطبي (١٥/ ١١٥)
[4] تفسير الخازن (٢/ ١٥٥) [5] تفسير القرطبي (٧/ ٣٢) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٣٦)
[7] مستدرك الحاكم (٣/ ١٨٠) سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ١٦٦)

بہر حال یہ سب انبیا جن کا ذکر اس جگہ ہوا ہے، اہلِ صلاح و فلاح تھے۔ اسماعیل علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں، ان کا ذکر سب سے بعد اس لیے ہوا ہے کہ پہلے اسحاق علیہ السلام کا ذکر کیا، پھر ان کی اولاد کا۔ ایک روش پر الیسع اخطوب بن العجوز کے بیٹے ہیں۔ ایک قوم نے یہ وہم کیا ہے کہ الیسع وہی الیاس علیہ السلام ہیں۔ اللہ نے دونوں کا ذکر الگ الگ کیا ہے وہب نے کہا ہے کہ الیسع صاحبِ الیاس ہیں، یہ دونوں یحیٰ، عیسیٰ اور زکریا علیہم السلام سے پہلے تھے۔ کسی نے کہا: الیسع خضر ہیں، اللہ نے ان سب کو سارے جہان پر فضیلت بخشی تھی۔ کسی نے کہا کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ انبیا فرشتوں سے افضل ہیں، اس لیے کہ جہان سارے موجودات کا نام ہے، سوائے اللہ کے، اس میں فرشتے بھی داخل ہیں۔ اللہ نے اٹھارہ پیغمبروں کا بغیر ترتیب کے ذکر کیا ہے۔ ان کا ذکر نہ زمانے کے لحاظ سے ہے اور نہ ہی فضیلت کے لحاظ سے ہے، کیونکہ حرف واؤ ترتیب کو ظاہر نہیں کرتا۔

پھر آبا اور اولاد اور بھائیوں کا ذکر کیا اور ان کے ساتھ بعض کا حرف اس لیے استعمال کیا کہ بعض اُن میں مسلمان نہ تھے اور عیسیٰ و یحیٰ کی اولاد نہ تھی اور بعض کی اولاد کافر ہوئی، جس طرح نوح علیہ السلام کا بیٹا۔ غرض کہ اللہ نے ان میں سے جس کو چاہا راہِ ہدایت پر لگایا۔ خدانخواستہ اگر یہ لوگ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک کرتے تو ان کی ساری طاعات باطل ہو جاتیں، اس لیے کہ شرک کے ساتھ کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، کیسا ہی اچھا کام کیوں نہ ہو۔ ان کو اللہ نے کتاب دی تھی، خواہ خود ان پر نازل ہوئی یا انھیں ورثے میں ملی اور حکم، یعنی علم دیا تھا اور نبوت، یعنی رسالت دی تھی۔ سو اگر کفارِ قریش ان کو نہیں مانتے تو نہ مانیں، اللہ نے ایک اور قوم لگا رکھی ہے جو ان پر ایمان لاتے ہیں اور وہ انصار اہلِ مدینہ اور مہاجرین ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ اٹھارہ پیغمبر مذکور ہیں۔[1] امام ابو رجا عطاردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ملائکہ ہیں۔[2] یہ بات بہت بعید ہے، اس لیے کہ قوم کا لفظ صرف آدمیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فرس ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے جو ان کا منکر نہیں ہے وہ انہی میں سے ہے، خواہ فرشتہ ہو یا نبی یا صحابی یا تابعی۔[3] زیادہ صحیح یہ ہے کہ مراد انبیا مذکورین ہیں، اس لیے کہ اس کے بعد یوں فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کو ہدایت دی، تو ان کی ہدایت پر چل۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو کہ تم مہاجرین اور انصار کی پیروی کرو۔ اقتدا (پیروی) سے یہ مراد ہے کہ ان کا سا صبر تم بھی کرو، یا توحید میں ان کی چال چلو، اگرچہ شریعتوں کی جزئیات مختلف ہیں یا ان کے سارے اخلاقِ حمیدہ اور افعالِ مرضیہ اور صفاتِ رفیعہ کاملہ میں ان کی اقتدا کرنے والے رہو۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے پابند ہیں کہ اگلے انبیا کی اس امر میں اقتدا کریں جس کے بارے میں انھیں کوئی صریح حکم نہیں ملا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورت ص کے سجدے کے بارے میں کہا کہ تمھارے پیغمبر کو اس بات کا حکم ہے کہ داود علیہ السلام

[1] تفسير الطبري (١١/ ٥١٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٣٩) [3] تفسير الرازي (١٣/ ٥٦)

کی اقتدا کریں۔[1] اہلِ علم نے اس آیت سے اس بات پر حجت پکڑی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سارے انبیا سے افضل ہیں، اس لیے کہ جو صفتیں ان سب میں تھیں وہ سب آپ میں مجتمع ہیں۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

وہ خوبیاں جو تمام دوسرے محبوب رکھتے ہیں وہ خوبیاں آپ اکیلے میں پائی جاتی ہیں۔''

پھر نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوا کہ تم کہہ دو کہ میں اس قرآن اور تبلیغِ دین پر کسی اجر کی خواہش نہیں رکھتا۔ یہ بھی ان انبیا کی جملہ ہدایت میں سے ہے جس کی اقتدا کا حکم ہے۔ یہ قرآن تمام موجودین کے لیے وعظ اور نصیحت ہے، وہ موجودین جو نزولِ قرآن کے وقت تھے یا جو آیندہ آئیں گے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہیں وہ خواہ انسان ہوں یا جن، آپ ﷺ کی دعوت تمام مخلوقات کے لیے قیامت تک کے لیے عام ہے۔[2]

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۹۱ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹۲

اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق ہے، جس وقت انھوں نے کہا: اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی، کہہ دیجیے: پھر وہ کتاب کس نے نازل کی تھی، جسے موسیٰ لائے تھے، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم متفرق اوراق میں نقل کرتے ہو۔ اس میں سے کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپا لیتے ہو۔ اور (اس کتاب کے ذریعے سے) تمھیں وہ علم دیا گیا تھا جو نہ تمھیں حاصل تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو۔ کہہ دیجیے: وہ اللہ نے (نازل کی تھی)، پھر انھیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے: وہ اپنی نکتہ چینیوں میں کھیلتے رہیں ۝۹۱ اور یہ کتاب (قرآنِ مجید)، ہم نے اسے نازل کیا ہے، یہ برکت والی، تصدیق کرنے والی ہے، اس کتاب کی جو اس سے پہلے آئی تھی، تاکہ آپ ام القریٰ (مکہ)

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٦) [2] فتح البيان (٤/ ١٨٤۔ ١٨٩)

اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرائیں۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس (قرآن) پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ﴿92﴾

رسول کا بشر ہونا اور اس پر کتاب اتارنا:

ام القریٰ مکہ کا نام ہے اس کے معنی بستیوں کی جڑ، یا اس لیے کہ تمام عرب کا مرجع تھا، یا کہتے ہیں کہ پانی میں سے سب سے پہلے یہی زمین کھلی تھی اور آس پاس سے مراد عرب ہے جب تک انہیں پر حکم تھا یا سارا جہان ہے۔ اللہ پاک نے کہا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی کچھ تعظیم نہ کی جبکہ رسولوں کو جھٹلایا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور عبد بن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قریش کے بارے میں اتری ہے، اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ یہود کے ایک گروہ کے بارے میں اتری ہے، کسی نے کہا ہے کہ فنحاص یا مالک بن صیف کے بارے میں ہے۔ پہلی بات صحیح ہے، اس لیے کہ آیت مکی ہے اور یہود آسمان سے کتاب کے نازل ہونے کے منکر نہ تھے، ہاں قریش اور سارے عرب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا انکار کرتے تھے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ ﴾ [یونس: ٢] ''کیا لوگوں کے لیے یہ تعجب (کی بات) ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ آپ لوگوں کو ڈرائیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿94﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٤۔ ٩٥] ''اور لوگوں کے پاس ہدایت آجانے کے بعد ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے بشر رسول بھیجا ہے؟ کہہ دیجیے: اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو یہاں مطمئن ہو کر چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے۔''

اور یہاں یوں کہا کہ اللہ کی قدر نہ کی جبکہ اس بات سے انکار کیا کہ کسی بشر پر کچھ اتارے۔ بھلا ان منکروں سے یہ تو پوچھو کہ تم تو سلبِ عام کے قائل ہو، ہم ایک قضیہ جزئیہ موجبہ بتاتے ہیں کہ تورات کس نے اتاری تھی، ہر کوئی جانتا ہے کہ اللہ نے اس کو موسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا، وہ کتاب مشکلات کے حل کے لیے ایک نور تھا، شبہات کے اندھیروں میں ایک ہدایت تھی، تم نے اُس کو الگ ورقوں میں لکھا، پھر اُس میں تحریف اور تاویل کی، پھر کہتے ہو کہ یہ اللہ کے پاس سے آئے ہیں، حالانکہ وہ اُس کے پاس سے نہیں آئے ہیں۔ پھر اللہ نے قرآن اتارا، اُس سے تم کو وہ معلوم ہوا کہ جو نہ تم جانتے تھے نہ تمھارے باپ دادا، کیونکہ قرآن میں پرانی خبریں بھی ہیں اور آیندہ کی خبریں بھی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عامہ:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مشرکینِ عرب ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٥٢٤)

لیے ہے۔[1] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا تو کہہ، اللہ یعنی اللہ نے اس قرآن کو اتارا۔[2] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول اس آیت شریفہ کی تفسیر میں متعین ہے اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ یہ امر کلمہ مفردہ غیر مرکب کے ساتھ ہے۔ لغت عرب میں کلمۂ مفردہ کا لانا کچھ فائدہ بخش نہیں ہوتا کہ اُس پر خاموشی اختیار کی جائے۔ پھر فرمایا کہ ان کو چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے جہل اور گمراہی میں پڑے کھیلتے رہیں، یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے ان کو یقین حاصل ہو۔ قریب ہے کہ وہ جان لیں گے کہ بہتر انجام ان کے لیے ہے یا متقین لوگوں کے لیے۔

ام القریٰ سے مراد مکہ ہے ماحول سے مراد قبائلِ عرب اور بنی آدم کے تمام گروہ ہیں، کیا عرب کیا عجم، جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ”کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔“ نیز فرمایا: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩] ”تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ١٧] ”اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔“

مزید فرمایا: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ [الفرقان: ١] ”وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا، تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ﴾ [آل عمران: ٢٠] ”اور ان اہلِ کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے پوچھیں: کیا تم اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا ہے۔“

صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں، پھر ان چیزوں میں سے ایک یہ چیز ذکر کی: «وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهِ، وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً»[3] ”نبی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔“ اسی لیے یہ فرمایا کہ جو کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان لایا ہے وہ اس کتاب مبارک پر جو اے محمد! ہم نے تجھ پر اتاری ہے، ایمان لاتا ہے۔ وہ کتاب قرآن کریم ہے اور یہی لوگ نماز کی بھی حفاظت کرتے ہیں، ہر نماز کو ہمیشہ اس کے وقت پر اور اس کے ارکان اور اذکار کو اعتدال پر رکھتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ اس میں کسی طرح کا خلل پیدا نہیں کرتے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ کی قدر نہ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ جیسا اللہ کو پہچاننا چاہیے تھا، ویسا اُس کو نہ پہچانا،

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٤٣) [2] تفسير الطبري (١١/ ٥٢٨) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٤٤) اس کی سند حسن ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

اگر پہچانتے تو رسولوں کے آنے کے اور کتابوں کے نازل ہونے کا انکار کیوں کرتے، یہ امام اخفش رحمہ اللہ کا قول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ کی نعمت کی قدر نہ جانی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ کفار ہیں، اللہ کی قدرت نہیں مانتے۔ جو ایمان لایا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، اُس نے اللہ کی قدر جانی اور جو ایمان نہ لایا وہ ناقدر رہا۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عرب کے مشرکین ہیں،[2] انھوں نے اللہ کی عظمت نہ سمجھی۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی تعریف نہ کی جیسے کرنی چاہیے تھی۔[3] یہ سب معانی صحیح ہیں۔ یہود نے کہا: اے محمد! کیا اللہ نے تم پر کوئی کتاب اتاری ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: اللہ نے آسمان سے کوئی کتاب نازل نہیں کی، اللہ نے اس بات کے جواب میں فرمایا کہ بھلا اگر اللہ کتاب نازل نہیں کرتا تو جو کتاب موسیٰ علیہ السلام لائے تھے، وہ کس نے نازل کی؟! اُس کو تو تم بھی مانتے ہو، یہ غایت درجے کی سرزنش اور ملامت ہوئی۔ ان کا انکار کرنا باطل ٹھہرا، ان کا فساد ظاہر ہو گیا۔ اور اگر مراد کفارِ قریش ہیں تو ان پر الزام اس طرح ہے کہ وہ تورات کے معترف تھے، ان کو یہود کے بتانے سے معلوم تھا کہ وہ اللہ کی کتاب ہے۔

پھر تورات کی تعریف فرمائی، اس کو نور اور ہدایت ٹھہرایا، یعنی گمراہی کے اندھیروں میں سے نکال کر ہدایت کے فروغ کی طرف لاتی ہے۔ حق و باطل میں فرق سمجھاتی ہے، یعنی تورات میں تغیر و تبدل سے قبل یہود نے اصل تورات کو چھوڑ کر اُس کی نقل الگ الگ اوراق پر لکھی تھی، تاکہ ان ورقوں میں تحریف اور تبدیلی کریں اور اس میں جو صفات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ہیں، انھیں چھپائیں، یہ ان کی مذمت ہے۔ چنانچہ آیتِ رجم کو چھپا رکھا تھا، حالانکہ اصل تورات میں یہ لکھی ہوئی تھی۔

﴿ عُلِّمْتُمْ ﴾ کا خطاب یہود کو ہے کہ جو بات ان کو معلوم نہ تھی وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے معلوم ہوئی، یا مشرکین کو خطاب ہے کہ قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم پایا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو جو علم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دیا، اس کو انھوں نے ضائع کیا، اُس سے کچھ فائدہ حاصل نہ کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ مسلمانوں کو خطاب ہے۔ اللہ نے اپنی نعمت یاد دلائی کہ ہم نے تم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر علم دیا۔[4] لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا یہود کو علم دیا تھا، انھوں نے اس کی پیروی کی نہ اس پر عمل کیا، اللہ نے اُن کے علم کی مذمت فرمائی۔[5] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو الزامی جواب سکھایا۔ تو کہہ دے کہ اللہ نے اُس کو اتارا تھا۔

﴿ يَلْعَبُوْنَ ﴾ سے معلوم ہوا کہ جیسے لڑکے کھیلتے کودتے ہیں ایسا کام وہ کرتے ہیں۔ یا یَسْخَرُوْنَ یا یَسْتَهْزِءُوْنَ کے معنی میں ہے۔ اس میں مشرکوں کو وعید اور ڈانٹ ہے۔ جس نے کہا کہ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے، اُس کا قول بعید ہے۔ پھر قرآن پاک کی مدح فرمائی کہ اگر اللہ کتاب نہیں اتارتا ہے تو اس نے یہ قرآن کس طرح اتارا جو کثیر

---

1. تفسیر الطبري (۱۱/ ۵۲٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۳٤۱) اس کی سند حسن ہے۔ 2. تفسیر الطبري (۱۱/ ۵۲٤)
3. تفسیر الخازن (۲/ ۱۵۷) 4. تفسیر البغوي (۳/ ۱٦۷) 5. تفسیر الطبري (۱۱/ ۵۲۳)

البرکۃ والخیر اور ہمیشہ کے لیے نفع دینے والا ہے۔ تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے، اللہ کی طرف دعوت دینے اور اللہ کی توحید بیان کرنے میں کتب مذکورہ کے مطابق ہے۔ گو بعض احکام میں مخالف کیوں نہ ہو۔

مکہ کا نام خاص کر اس لیے لیا کہ تمام بستیوں میں عظیم الشان اور جلیل القدر ہے۔ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے، اس امت کا قبلہ ہے، حج کی جگہ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ زمین مکہ ہی سے پھیلائی اور بچھائی گئی ہے۔[1] اس لیے اس کو ام القریٰ کہتے ہیں یا اس لیے کہ زمین کی ناف ہے۔ مکہ کے ڈرانے سے مراد اہل مکہ کا ڈرانا ہے، اس سے ساری زمین والوں کا ڈرانا بھی ثابت ہے۔ مَنْ حَوْلَ سے مراد شرقاً و غرباً سارے شہر اور بستیاں ہیں۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی عمومیت پر دلیل ہے کہ وہ تمام اہل زمین کے لیے ہے۔ وللہ الحمد.

جو شخص آخرت کے گھر کی تصدیق کرتا ہے، اس پر حق ہے کہ اس کتاب پر بھی ایمان لائے اور عمل کرے، کیونکہ آخرت کی تصدیق کرنا دعوت کو قبول کرنے کا باعث ہے، تاکہ آخرت کی بھلائی ہاتھ لگے۔ نماز کا ذکر اس لیے کیا کہ سارے واجبات میں یہ عبادت سب سے زیادہ شرف والی، بلکہ دین کا ستون ہے۔ جو شخص نماز کا محافظ ہوگا وہ ساری عبادات کی بھی حفاظت کرے گا۔ حفظ سے مراد ہمیشگی کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ حاصل یہ ٹھہرا کہ آخرت پر ایمان نبی اکرم ﷺ پر ایمان کا باعث ہے اور آپ ﷺ پر ایمان لانا نماز کی محافظت کا باعث ہے۔[2]

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے یا کہے کہ مجھ پر وحی نازل کی گئی ہے، حالاں کہ اس پر کوئی وحی نازل نہیں کی گئی، اور جس نے کہا کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر سکتا ہوں، جیسی اللہ نے

[1] تفسیر الطبري (١١/ ٥٣١) [2] فتح البیان (٤/ ١٩٠۔ ١٩٣)

نازل کی ہے۔ کاش! آپ ظالموں کو اس حال میں دیکھیں جب وہ موت کی سختیوں میں گرفتار ہوتے ہیں، اور فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں، آج تمھیں بدلے میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، کیوں کہ تم اللہ پر ناحق باتیں گھڑتے تھے اور اس کی آیتیں سن کر تکبر کرتے تھے (93) اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جس طرح کہ ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا، اور ہم نے تمھیں جو کچھ عطا کیا تھا وہ تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور اب ہمیں تمھارے ساتھ تمھارے وہ سفارشی نظر نہیں آتے، جن کے بارے میں تم دعویٰ کرتے تھے کہ بے شک وہ (تمھاری بندگی میں) اللہ کے شریک ہیں۔ ان سے تمھارا تعلق یقیناً ٹوٹ گیا ہے اور وہ تم سے کھو گئے ہیں، جنھیں تم (اپنے معبود) خیال کرتے تھے (94)

نزولِ وحی کا جھوٹا دعویدار سب سے بڑا ظالم ہے:

یعنی جو کوئی اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے، اللہ کے لیے شریک یا بیٹا ٹھہراتا ہے، یا کہتا ہے کہ مجھ کو اللہ نے لوگوں کی طرف بھیجا ہے، حالانکہ اس کو نہیں بھیجا، یا کہتا ہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، حالانکہ نہیں آئی، اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے۔ امام عکرمہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مسیلمہ کذاب کے بارے میں اتری ہے[1] اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ میں بھی اللہ کی طرح نازل کر سکتا ہوں، یعنی مثل وحی کے عبارت بنا لاتا ہوں اور قرآن کا مقابلہ اس گھڑے ہوئے قول سے کر سکتا ہوں تو وہ بڑا ہی ستم گار ہے۔ اللہ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ﴾ [الأنفال: ۳۱] ''اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں: یقیناً ہم نے سن لیں اگر ہم چاہیں تو اس طرح (کا کلام) ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔''

موت اور قیامت کے وقت ظالموں کا حال:

غمراتِ موت سے مراد سکرات اور کرباتِ (تکالیف) موت ہیں۔ فرشتے مارنے پیٹنے کو ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ ﴾ [المائدة: ۲۸] ''اگر تو نے اپنا ہاتھ میری طرف (اس ارادے سے) بڑھایا کہ مجھے قتل کر دے۔'' اور اس کا فرمان ہے: ﴿ وَيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ ﴾ [الممتحنة: ۲] ''اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تمھاری طرف دراز کریں، برائی (کی نیت) سے۔'' امام ضحاک اور ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا کہ ہاتھ بڑھائے ہوئے ہیں عذاب کے ساتھ۔[2] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴾ [الأنفال: ۵۰] ''اور کاش! آپ دیکھیں،

---

(1) تفسیر الطبري (۱۱/ ۵۳۵) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۱۳)
(2) تفسیر الطبري (۱۱/ ۵۳۹)

جب کہ فرشتے کافروں کو فوت کرتے ہیں، وہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہیں۔‘‘

اسی لیے یہ کہا کہ فرشتوں نے ان کو مارنے کے لیے ہاتھ کھولے ہیں، یہاں تک کہ ان کی جانیں ان کے بدنوں سے باہر نکلیں۔ لہٰذا کہتے ہیں کہ نکالو اپنی جان، کیونکہ جب کافر مرنے لگتا ہے تو فرشتے اس کو عذاب، سزا، طوق، بیڑیوں اور جہنم اور کھولتے ہوئے پانی اور اللہ کے غضب کی بشارت دیتے ہیں۔ اُس وقت اس کی روح اس کے بدن میں متفرق اور پریشان ہو کر باہر نکلنے سے انکار کرنے لگتی ہے، تب فرشتے ان کو مار کر جان باہر نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج تمھاری پوری توہین ہو گی، جس طرح تم اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے، اس کی آیتوں سے غرور کرتے تھے، رسولوں کے فرماں بردار نہ ہوتے تھے، مومن اور کافر کی موت کے وقت کیفیت کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں جو زیرِ آیت کریمہ: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ ﴾ [إبراهيم: ٢٧] ’’اللہ ایمان والوں کو قولِ ثابت (کلمۂ توحید) سے دنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔‘‘ بیان کی جائیں گی۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس جگہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک بڑی لمبی چوڑی حدیث مرفوعاً ذکر کی ہے۔[1]

پھر فرمایا: تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آئے جس طرح کہ پہلے ہم نے تم کو بنایا تھا۔ تم اس لوٹائے جانے کے منکر تھے اور حشر کو بعید جانتے تھے، اب دیکھو کہ یہ وہی دن ہے اٹھائے جانے کا۔ جو نعمتیں اور مال ہم نے تم کو دیے تھے اور تم نے دنیا میں اکٹھے کیے تھے، وہ سب کچھ وہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ صحیح میں مرفوعاً ثابت ہوا ہے کہ ابن آدم کہتا ہے: میرا مال! میرا مال! تیرا مال صرف وہی ہے جو تو نے کھا لیا، فنا کیا، پہن لیا، پرانا کیا یا صدقہ دیا، باقی رکھا اور اُس کے سوا جو کچھ ہے وہ سب جانے والا ہے، اس کو لوگوں کے لیے چھوڑ جائے گا۔[2] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن آدم کو قیامت کے دن لے کر آئیں گے، اللہ کہے گا: جو تو نے جمع کیا تھا وہ مال کہاں ہے؟ وہ کہے گا: اے رب! جمع کر کے چھوڑ آیا زیادہ سے زیادہ۔ اللہ فرمائے گا: تو نے اپنی جان کے لیے کیا آگے بھیجا؟ دیکھے گا تو کچھ بھی آگے نہیں بھیجا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى ﴾ (آیتِ باب)[3] (رواه ابن أبي حاتم)

فرمایا: آج ہم تمھارے سفارشی جن کو تم شریک سمجھتے تھے، نہیں دیکھتے وہ کدھر گئے؟ یہ فرمانا ملامت اور ڈانٹ کے طور پر ہوگا، اس بات پر کہ انھوں نے دنیا میں اصنام، انداد، اوثان، اولیا، مشائخ، صوفیہ، شیاطین، انبیا اور رسولوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا لیا تھا، اس خیال سے کہ وہ زندگی اور آخرت میں ان کو نفع دیں گے، اگر کبھی آخرت سچ ہوئی۔ مگر جب قیامت آئی تو وہ سارے اسباب منقطع ہو گئے، گمراہی چل دی، افترا بندی خاک میں مل گئی، اللہ تمام مخلوق کے مجمع میں ان کو پکار کر فرمائے گا کہ میرے شریک کہاں ہیں؟ وہ کدھر ہیں جن کو تم اپنے زعم میں سفارشی سمجھتے تھے؟

---

[1] الدر المنثور (٣/ ٣١٨۔ ٣٢١) امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٥٨۔ ٢٩٥٩) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٤٩)

اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے تھے وہ اب کدھر گئے؟ ان کو لاؤ یا وہ خود آئیں اور تمھارا بھلا کریں، مدد دیں یا اپنا ہی بھلا کریں اور منتصر ہوں۔

سب اسباب منقطع ہو جائیں گے اور متبوعین چھوڑ جائیں گے:

﴿ تَقَطَّعَ ﴾ سے مراد سارے اسباب، وسیلوں، وسائل اور ذرائع کا ٹوٹ جانا ہے، ان کو امید تھی کہ انداد و اصنام اور اولیائے کرام ان کے کچھ کام آئیں گے، وہ سارا زعم یہاں جاتا رہا: ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ "افسوس! بہت سی آرزوئیں پوری نہ ہوسکیں۔"

اب کوئی کسی کے کام نہیں آیا، بلکہ متبوعین تابعین سے ناراض وخفا ہو جائیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ [البقرة: ١٦٦۔ ١٦٧] "جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بے زار ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی تھی اور وہ عذاب دیکھیں گے اور ان کے تمام تعلقات کٹ جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے پیروی کی تھی، وہ کہیں گے: کاش کہ ہمارے لیے ایک بار (دنیا میں) واپسی ہوتو ہم بھی ان لوگوں سے اسی طرح بے زار ہو جائیں جس طرح وہ ہم سے بے زار ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو ناکام خواہش بنا کر ان کے سامنے دکھائے گا اور وہ آگ کے عذاب سے نکلنے والے نہیں ہوں گے۔"

نیز فرمایا: ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٠١] "پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان میں رشتے داریاں رہیں گی اور نہ وہ باہم سوال کریں گے۔" مزید فرمایا: ﴿ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ [العنكبوت: ٢٥] "اور ابراہیم نے کہا: تم نے اللہ کے سوا جن بتوں کو معبود ٹھہرا لیا ہے، تو یہ محض تمھاری آپس کی دنیا کی دوستی کی وجہ سے ہے، پھر روزِ قیامت تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور تم میں سے ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے، اور تمھارے لیے کوئی مدد کرنے والے نہ ہوں گے۔"

نیز فرمایا: ﴿ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴾ [القصص: ٦٤] "اور (ان سے) کہا جائے گا: تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، چناں چہ وہ انھیں پکاریں گے تو وہ انھیں جواب نہیں دیں گے، اور وہ (سب) عذاب دیکھ لیں گے، کاش! وہ ہدایت پر چلتے ہوتے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ

نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ اَشْرَكُوٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴾ [الأنعام: ٢٢] ''اور جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے، پھر جو لوگ (اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، ان سے ہم کہیں گے: تمھارے وہ شریک کہاں ہیں جنھیں تم (اللہ کے ساتھ شریک) خیال کرتے تھے؟'' اس بارے میں بہت سی آیات آئی ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ تم کیونکر یہ بات کہتے ہو کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نہیں اتارا، اس سے تو سارے انبیا کی تکذیب لازم آتی ہے، حالانکہ جو کوئی اللہ پر جھوٹ باندھے یا جھوٹ موٹ وحی کے آنے کا کہے، یا وحی کے ساتھ معارضہ (جھگڑے) کا دعویٰ کرے، اس سے بڑھ کر کوئی جفا کار، ظالم اور بد اطوار نہیں ہے۔

اللہ نے اپنے انبیا کو ہمیشہ ایسے جھوٹوں اور افتراؤں سے بچایا، یہ کام تو کذابین، دجالین، اکالین، بطالین اور گمراہوں کے سرداروں اور اماموں کا ہے، جیسے مسیلمہ کذاب تھا کہ اُس نے یمامۂ یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا یا جیسے اسود عنسی جو صنعا کا تھا یا سجاح متنبیہ تھی۔ شرحبیل بن سعد رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت عبداللہ بن ابی سرح کے بارے میں اتری ہے۔ نبی اکرم ﷺ جب مکہ میں آئے تو وہ اپنے رضاعی بھائی عثمان کے پاس بھاگ گیا، اُس نے اُس کو چھپا رکھا، یہاں تک کہ اہلِ مکہ مطمئن ہوئے، پھر اُس کے لیے امان لی۔[1] بعض نے کہا: مسیلمہ بن حبیب کے بارے میں اتری ہے وہ نجومی اور کاہن تھا، تک بندی کرتا تھا اور نبوت کا دعویٰ کرتا تھا۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جب سورت مرسلات نازل ہوئی تو نضر نے کہا: ''وَالطَّاحِنَاتِ طَحْناً، وَالْعَاجِنَاتِ عَجْناً''، اسی طرح سے بہت سی تک بندی کی، اُس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[2] پھر جنھوں نے یہ کہا تھا: ﴿ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ﴾ [الأنفال: ٣١] ''اگر ہم چاہیں تو اس طرح (کا کلام) ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔'' انھوں نے یہ کہا کہ ہم ﴿ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ نظم وجمع وتکلم کر سکتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ ابن ابی سرح کاتبِ وحی تھا، ایک دن نبی اکرم ﷺ نے اُس کو یہ آیت لکھوائی: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ﴾ [المؤمنون: ١٤] ''پھر ہم نے اسے ایک اور ہی صورت میں بنا دیا'' اس نے کہا: ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٤] نبی اکرم ﷺ نے کہا: یہ آیت اسی طرح پر اتری ہے، اُس وقت اس کو شک گزرا اور کہا کہ اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو مجھ کو ویسی ہی وحی آئی جیسے محمد ﷺ کو آئی اور اگر جھوٹے ہیں تو میں نے بھی ویسی ہی بات کہی جیسے محمد ﷺ نے کہی، پھر مرتد ہو کر مشرکوں میں جا ملا، پھر فتح مکہ کے دن اسلام لایا، جیسا کہ عام مشہور ہے۔

---

[1] مستدرك الحاكم (٣/ ٤٨) یہ روایت مرسل ہے۔ البتہ یہ واقعہ آیت کے نزول کے بغیر مرفوعاً ثابت ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٨٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٦٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٣٢)

[2] الدر المنثور (٣/ ٣١٨) یہ روایت مرسل ہے۔

اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس حکم میں ہر وہ شخص داخل ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھنے والا ہے، وہ اس زمانے میں ہو یا اس کے بعد ہو، قیامت تک۔ اس لیے کہ کسی سبب کی خصوصیت اس حکم کی عمومیت سے مانع نہیں ہوتی۔ ﴿ لَوْ تَرٰۤى ﴾ کا خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے یا ہر صالح خطاب کو۔ اس سے مراد ہر ظالم ہے، اُس میں وحی کا منکر یا نبوت کا جھوٹا مدعی بھی داخل ہے۔ حرف لَوْ کا جواب محذوف ہے، لیکن اس سے مراد واضح ہے کہ دخولِ جہنم ہے۔ یعنی "لَوْ رَأَيْتَ أَمْراً عَظِيماً"، غمرات جمع غمرہ بہ معنی شدت، مراد موت کی سختیاں ہیں۔ ملائکہ کا ہاتھ بڑھانا کفار کی روحوں کو قبض کرنے کے لیے تقاضا کرنے والے کی طرح ہے جس طرح کسی کا کسی پر حق ہو وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر مطالبہ اور تقاضا کرے اور حق کو طلب کرنے میں کوئی مہلت اور تاخیر نہ روا رکھے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ ملک الموت ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ عذاب کے فرشتے ہیں، ان کے ہاتھ میں لوہے کے ہتھوڑے ہیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴾ [الأنفال: ٥٠] "اور کاش! آپ دیکھیں، جب کہ فرشتے کافروں کو فوت کرتے ہیں، وہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہیں۔" وہ کفار سے ان کی جان نکالتے وقت سخت ڈانٹ اور سرزنش کے طور پر کہیں گے کہ تم اپنی جان نکالو، یعنی ان غمرات سے یا دنیا سے اور عذاب سے یا بدن سے اور آج کے دن ہم کو سونپ دو جس میں تمھاری روح قبض کی جاتی ہے یا اُس وقت جس میں تم کو عذاب ہوگا، جس کا آغاز عذابِ قبر ہے، تم ذلت وخواری میں پڑو گے، اس کے بعد تم کبر وعظمت میں تھے، اللہ پر ناحق باتیں بناتے تھے، اس کی آیتوں کی تصدیق یا ان پر عمل کرنے سے غرور اور تکبر کرتے تھے، یہ عذاب تمھارے پاس تمھارے انھی اعمال کی پوری پوری جزا ہے۔ اب تم ایک ایک فرداً فرداً اپنے اہل وعیال اور مال اور معبود غیر اللہ سے الگ ہو کر ہمارے پاس آئے ہو۔ نضر بن حارث نے کہا تھا: "تَشْفَعُ لِيَ اللَّاتُ وَالْعُزّٰى" یعنی لات وعزیٰ میری سفارش کریں گے، جس طرح آج کل کے جاہل مسلمان کہتے ہیں کہ پیر دستگیر ہم کو دوزخ کے عذاب سے اور حشر ونشر کے عذاب سے بچا لیں گے، اس پر یہ آیت اتری۔[2]

آج تم اُسی صفت پر آئے جس طرح پہلی بار ماں کے پیٹ سے نکلے تھے، برہنہ پا، برہنہ تن، بے ختنہ، کوئی شے تمھارے پاس نہ تھی اور جو مال واولاد اور خادم ہم نے تم کو دنیا میں عطا کیے تھے وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو، کچھ بھی تو اپنے ساتھ نہیں لائے، نہ اُس سے کچھ تمھارا فائدہ ہوا، ہم تمھارے ساتھ تمھارے سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم شریک جانتے تھے اور کہتے تھے: ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: ٣] "(وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔" قیامت کے دن اللہ مشرکوں کو یہ جھڑکی

[1] الدر المنثور (٣/ ٣٢١) [2] تفسير الطبري (١١/ ٥٤٧)

دے گا، پھر فرمائے گا: اب وہ تمھارے درمیانی اسباب سب کے سب ٹوٹ گئے جن کو تم دنیا میں میرا شریک خیال کرتے تھے، وہ تمھارے پاس سے کھو گئے۔[1]

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے، زندہ کو مردہ سے نکالتا اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ یہ ہے اللہ، چناں چہ تم کہاں بہکائے جاتے ہو! (95) وہ صبح کی سپیدی نکالتا ہے اور اس نے رات کو سکون کا باعث بنایا اور سورج اور چاند کو اپنے حساب سے چلنے والا (بنایا)، یہ سب بہت زبردست، خوب علم رکھنے والے کا اندازہ ہے (96) اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے، تاکہ تم ان کے ذریعے سے خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ پاؤ، تحقیق ہم نے اپنی آیتیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو علم رکھتے ہیں (97)

اللہ کا تعارف اور کچھ نشانیاں:

اللہ نے خبر دی ہے کہ میں فالق حَبّ و نویٰ ہوں، یعنی مٹی کے اندر گٹھلی کو چیر کر کھیتی، فصل اُگاتا ہوں، طرح طرح کے دانوں اور پھلوں سے مختلف رنگ، شکل اور ذائقے کی نباتات کو جو ایک زندہ چیز ہے، دانہ اور گٹھلی سے جو ایک مردہ ہے، جماد کی طرح نکالتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۳۳۔ ۳۶] ''اور ان کے لیے مردہ زمین ایک (عظیم) نشانی ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس سے (اناج کا) دانہ نکالا، پھر وہ اسی سے کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کیے اور ہم نے ان میں چشمے جاری کیے۔ تاکہ وہ اس کے پھلوں سے کھائیں اور وہ (پھل)

---

[1] فتح البیان (٤/ ١٩٤۔ ١٩٨)

ان کے ہاتھوں نے نہیں بنائے، پھر کیا وہ شکر نہیں کرتے؟ پاک ہے وہ ذات جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے، ان چیزوں کے بھی جنھیں زمین اُگاتی ہے اور خود ان (انسانوں) کے اپنے بھی اور اُن کے بھی جنھیں وہ نہیں جانتے۔''

آیتِ باب کی تعبیر بہت سی عبارتوں سے ہے، سب عبارتیں ایک دوسرے کے قریب معانی ادا کرتی ہیں۔ کسی نے کہا: مرغی سے انڈہ، انڈے سے مرغی نکالتا ہے، کسی نے کہا: مردِ صالح سے ولدِ فاجر اور فاجر سے صالح پیدا کرتا ہے، اس کے سوا اور بھی عبارتیں ہیں جن کو آیتِ شریفہ شامل ہے۔

پھر اللہ نے کہا: اللہ وہ ہے جو یہ کام کرتا ہے، وہ ایک وحدہ لا شریک لہ ہے، تم کدھر جاتے ہو، حق چھوڑ کر باطل کی طرف مائل ہوتے ہو۔ وہی اجالے اور اندھیرے کو پھاڑنے والا ہے۔ صبح اجالا ہے، رات اندھیرا ہے، جس طرح سورت کے شروع میں فرمایا تھا: ﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ [الأنعام: ١] ''اندھیروں اور روشنی کو بنایا۔'' اللہ ہی رات کے اندھیرے سے صبح کی روشنی کو نکال کر وجود کو روشنی اور افق کو تابانی بخشتا ہے۔ اندھیرا مضمحل ہو کر رات کی ساری سیاہی دور ہو جاتی ہے، چمکتا ہوا اور درخشاں دن آ جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے۔''

اللہ نے اپنی قدرت کا بیان مختلف اور ایک دوسرے سے متضاد چیزوں پر کیا۔ یہ اشیا اللہ کی عظیم سلطنت اور اُس کی عظمت کے کمال پر دلیل ہیں۔ ﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا ﴾ کہا، یعنی رات کی تاریکی میں سب اشیا ساکن اور آرام گیر ہو جاتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ﴾ [الضحیٰ: ١۔ ٢] ''دھوپ چڑھنے کے وقت کی قسم! اور رات کی جب وہ چھا جائے'' نیز فرمایا: ﴿ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ﴾ [اللیل: ١۔ ٢] ''قسم ہے رات کی جب چھا جائے! اور قسم ہے دن کی جب روشن ہو!''

نیز فرمایا: ﴿ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ﴾ [الشمس: ٣۔ ٤] ''اور دن کی جب وہ سورج کا جلوہ دکھاتا ہے۔ اور رات کی جب وہ اسے ڈھانپ لیتی ہے۔'' سیدنا صہیب رومی رضی اللہ عنہ کی بی بی نے ان پر عتاب کیا کہ تم رات کو بہت جاگتے ہو، کہا: اللہ نے رات کو آرام کے لیے بنایا ہے، مگر صہیب کے لیے۔ صہیب جب جنت کو یاد کرتا ہے تو شوق بڑھتا ہے اور جب نار کو یاد کرتا ہے تو نیند جاتی رہتی ہے۔ (رواہ ابن أبي حاتم)[1]

سورج چاند حساب سے چلتے پھرتے ہیں، ایک اندازہ مقرر و معین ہے نہ متغیر ہوں اور نہ مضطرب، بلکہ ہر ایک کے لیے گرمی، سردی میں منزلیں ہیں، انھی منزلوں پر رات دن کا لمبا اور چھوٹا ہونا ترتیب دیا گیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ ﴾ [یونس: ٥] ''وہی ہے (اللہ) جس نے سورج کو نہایت روشن بنایا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٥٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالعزیز بن ابو رواد رحمہ اللہ نے صہیب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۴۰] ''نہ سورج کے یہ لائق ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیرتا پھرتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کر دیے گئے ہیں۔''

غرض کہ یہ سب اللہ عزیز اور علیم کے اندازے کے مطابق جاری و ساری ہیں۔ کیا ذکر ہے کہ ایک ذرہ برابر زمین و آسمان میں اُس کے علم سے غائب ہو سکے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جہاں اللہ پاک روز و شب اور سورج اور چاند کی پیدائش کا ذکر فرماتا ہے تو اس کے کلام کا اختتام عزت اور علم پر فرماتا ہے، جس طرح اس آیت میں کیا ہے اور دوسری آیت میں کیا ہے: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [یٰسٓ: ۳۷۔ ۳۸] ''اور ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ نکالتے ہیں، پھر (دن ختم ہونے پر) یکایک وہ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور سورج اپنے ٹھکانے (پر پہنچنے) کے لیے رواں دواں رہتا ہے، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے (اللہ) کا اندازہ ہے۔''

پھر نجوم کو خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہنما ٹھہرایا۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ جس نے نجوم میں تین باتوں کے سوا اعتقاد کیا، اس نے خطا کی، اس نے اللہ پر جھوٹ بولا: ایک یہ کہ اللہ نے نجوم کو آسمان کی زینت بنایا، دوسرے یہ کہ یہ شیطانوں کے لیے آلۂ رجم ہیں اور تیسرے یہ کہ جنگل اور دریا کے اندھیروں میں اُن سے راستے کا پتا چلتا ہے۔ یہ بیان اور وضاحت ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل اور حق کی معرفت رکھتے ہیں اور باطل سے اجتناب کرتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یوں ہیں کہ اللہ نے اس آیت میں اپنی عجیب مصنوعات کا ذکر کیا ہے، جس کی ادنیٰ شے سے ان کے معبوداتِ باطلہ عاجز ہیں۔ فلق شق کو کہتے ہیں، یعنی پھاڑنے کو۔ گٹھلی سے درخت ہوا کی طرف چڑھتا ہے، گٹھلی پھاڑ کر باہر نکلتا ہے یا اصل شق خلقی مراد ہے جو گٹھلی میں ہوتا ہے۔ فالق بمعنی خالق آتا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور مقاتل کا یہی قول ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فالق بہ معنی فاطر ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے جائز کہا ہے۔[1] پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

حَبّ، یعنی دانہ، وہ ہے جس میں گٹھلی نہ ہو، جیسے گندم، جو، چاول۔ نویٰ گٹھلی کو کہتے ہیں جس میں عجم ہو، جیسے: کھجور، زرد آلو، شفتالو اور خوخ وغیرہ۔ مراد یہ ہے کہ جب دانہ یا گٹھلی تر زمین میں پڑتی ہے اور اُس پر ایک زمانہ گزر

[1] تفسير الطبري (١١/ ٥٥١۔ ٥٥٢) تفسير الخازن (٢/ ١٦٢)

جاتا ہے، اللہ اُس سے سبز رنگ کا پتا نکالتا ہے، پھر اس پتے سے بالی نکلتی ہے، اُس بالی میں دانہ ہوتا ہے۔ گٹھلی سے درخت پھوٹ کر بڑھتا ہے، اُس کی رگیں زمین میں گھستی ہیں۔ فتبارك الله أحسن الخالقين.

زندے کا مردے سے نکالنا، جیسے: نطفے سے بشر، انڈے سے مرغ یا جیسے گٹھلی سے کھجور کا درخت، دانے سے بالی۔ امام طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جانوروں اور نباتات میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مومن کافر سے اور کافر مومن سے نکلتا ہے، یہی امام حسن رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[1] یا جیسے گناہ گار سے اطاعت گزار اور اس کے برعکس۔ کوئی بات ان تمام معانی میں اختلاف کرنے کے متعلق نہیں ہوسکتی۔ بلکہ لفظ میں بہت زیادہ وسعت ہے، اس سے بھی بعض نے کہا ہے کہ زندہ سے مراد ہر حیوان اور نباتات، یعنی سبزی ہے، گو اُس میں روح نہ ہو، مردے سے مراد ہر غیر نامی ہے، جیسے: نطفہ یا حبہ، گو وہ کسی حیوان کی اصل ہو۔ اس عجیب صنعت کا بنانے والا وہی اللہ ہے جس کے اندر ہر قسم کا کمال ہے اور جو ہر قسم کی حمد اور بزرگی کا مستحق ہے۔ اب تم ایمان سے کدھر پھرے جاتے ہو، باوجودیکہ توحید کی دلیل قائم ہے۔ اس ابتدائی صنعت اور کمالِ قدرت کو دیکھ کر کہاں بھکتے ہو؟ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ تُؤْفَكُوْنَ ﴾ تَكْذِبُوْنَ کے معنی میں ہے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "تُصْرَفُوْنَ" کے معنی میں ہے۔[3]

اس آیت میں موت کے بعد زندہ ہونے کی صحت پر دلیل ہے، اس لیے کہ جو ذات نطفۂ بے حقیقت سے ایک بدن بنا کر نکال سکتا ہے، اُس کو زمین سے بدن کو حساب کتاب کے لیے نکالنے کی قدرت بھی حاصل ہے۔ صبح وہ ہے جو روشنی کے شروع ہونے کی جگہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ صباح سے اس جگہ مراد سورج کی روشنی ہے یا فجر کی روشنی۔ شب کو سکون حاصل کرنے کی جگہ ٹھہرایا، اس لیے کہ معاش کی بھاگ دوڑ سے اُس وقت استراحت حاصل ہوتی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات کو ہر پرند چرند آرام کرتا ہے۔[4]

سورج چاند حساب کے لیے مقرر ہیں، حساب سے بندوں کی بہتری مقصود ہے۔ ان کا چلنا پھرنا ایک اندازے اور مقدار پر مقرر ہے، نہ بڑھے نہ گھٹے، یہ اس لیے کہ اللہ کے بندے اس عظیم قدرت اور بدیع صنعت پر دلیل پکڑیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد دنوں، مہینوں اور سالوں کی گنتی ہے۔[5] یہ تدبیر اور عظیم تقدیر اللہ ہی نے کی ہے۔ اسی نے تاروں کو رہنما بنایا ہے کہ خشکی اور تری کے اندھیروں میں ان سے رستہ ملتا ہے، یہ ان کا ایک فائدہ ہے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ ہر شیطان سرکش سے حفاظت کرتے ہیں اور تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ آسمان کی آرائش ہیں،

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٣٠٦۔ ٣٠٩) تفسير الخازن (٢/ ١٦٢)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٥٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں "بشر بن عمارہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٥٣) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٥٤)

[5] تفسير الطبري (١١/ ٥٥٨) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٥٤) اس کی سند حسن ہے۔

اس کے علاوہ جو کوئی کچھ خیال کرے گا وہ اللہ پر جھوٹ باندھنے والا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دن کو سورج کی حرکت سے اور رات کو ستاروں کی حرکت سے قبلہ کو پہچانتے ہیں۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نجوم اسی قدر سیکھو کہ خشکی اور تری میں راہ پا لو، پھر رک جاؤ۔ اللہ کی قسم! وہ پیدا نہیں کیے گئے، مگر آسمان کی زینت اور رجم شیاطین اور علاماتِ بر و بحر کے لیے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مرفوع الفاظ یہ ہیں: «تَعَلَّمُوا مِنَ النُّجُومِ مَا تَهْتَدُوْنَ بِهِ فِيْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ثُمَّ انْتَهُوْا»[1] ''ستاروں کا بس اتنا علم سیکھو کہ اس سے رات کے اندھیروں میں تری اور خشکی میں راستہ تلاش کر سکو، پھر باز آ جاؤ (یعنی اس کے علاوہ اور نہ سیکھو)۔'' (رواه ابن مردويه والخطيب)

سورج اور چاند میں اللہ کے ذکر کی خاطر غور کرنا مستحب ہے، نہ کسی اور کام کے لیے، اس بارے میں حدیثیں آئی ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت اس طرح ہے: «أَحَبُّ عِبَادِ اللهِ إِلَى اللهِ الَّذِيْنَ يُرَاعُوْنَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لِذِكْرِ اللهِ»[2] ''اللہ کے بندوں میں سے سب سے زیادہ اللہ کو محبوب وہ ہیں جو سورج اور چاند میں اللہ کے ذکر کی خاطر غور و فکر کرتے ہیں۔'' (رواه الحاكم وصححه)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ تین آدمی ہیں جن کو اللہ اُس دن سایہ دے گا جس دن اُس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا: امانت دار تاجر، انصاف کرنے والا امام اور دن میں سورج کے بارے میں غور کرنے والا۔[3] (رواه الحاكم والديلمي بسند ضعيف) سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سات آدمی ہیں جو اُس دن سائے میں ہوں گے، ان میں سے ایک وہ ہے جو نماز کے اوقات کی خاطر سورج کی چال میں غور و فکر کرتا رہتا ہے۔[4] (رواه عبدالله بن أحمد في زوائد الزهد)

یہ سب احادیث اس بات کو خاص کرتی ہیں کہ سورج اور چاند میں غور و فکر اللہ کا ذکر اور نماز کی خاطر ہے نہ کہ کسی اور کام کے لیے۔ اللہ نے نمازِ فجر کا وقت ختم ہونے کے لیے سورج کا طلوع ہونا ٹھہرایا ہے۔ نمازِ ظہر کا اول وقت زوالِ آفتاب ہے، عصر کا وقت تب تک ہے جب تک سورج صاف چمکتا ہو، مغرب کا وقت غروبِ آفتاب ہے،

---

[1] الدر المنثور (٣/ ٣٢٨) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٤٠٧)

[2] مستدرك الحاكم (١/ ١١٥ـ ١١٦) میں ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مسند عبد بن حميد (١/ ٣٢٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٤٠)

[3] الدر المنثور (٣/ ٣٢٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی مجہول ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٤٥٤)

[4] الزهد لابن حنبل (١/ ١٥٠ـ ١٥١) الدر المنثور (٣/ ٣٢٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابراہیم تیمی رحمہ اللہ نے سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

نمازِ عشا کے بارے میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ تیسری رات کے چاند ڈوبنے کو عشا کا وقت ٹھہراتے تھے۔[1]

مہینوں کے شروع ہونے کا وقت، ان کے درمیان اور اُن کے اخیر، انھیں سورج چاند سے پہچانا جاتا ہے۔ ہلال (پہلی رات کا چاند) حج کے اوقات کو متعین کرتا ہے، اس لیے سورج اور چاند میں موذن اور حاجی وغیرہما کو ان کاموں کے لیے غور کرنا جائز یا مستحب ہے، اس کے سوا اُن سے کوئی مراد نہیں۔ اسی طرح تاروں کا حال ہے کہ تاروں میں غور وفکر اور نظر کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "نَهَانِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ النَّظْرِ فِيْ النُّجُوْمِ"[2] "نبی اکرم ﷺ نے مجھ کو ستاروں میں غور کرنے سے منع فرمایا۔" (رواہ ابن مردویه و الخطیب)

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِذَا ذُكِرَتِ النُّجُوْمُ فَأَمْسِكُوْا»[3] "جب ستاروں کا ذکر کیا جائے تو رک جاؤ۔" (رواہ الطبراني والخطیب) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: «مَنِ اقْتَبَسَ عِلْماً مِّنَ النُّجُوْمِ، اِقْتَبَسَ شُعْبَةً مِّنَ السِّحْرِ»[4] "جس نے ستاروں کا علم حاصل کیا، اُس نے جادو کا ایک شعبہ حاصل کیا۔" (رواہ ابن أبي شیبة و أبو داود و ابن مردویه)

یہ حدیثیں اس بات پر محمول ہیں کہ سوائے ان تین امور کے جن کا اوپر ذکر کیا گیا اور کسی معاملے کے لیے ستارے میں غور نہ کرے، اور ستاروں کے بارے میں غور وفکر کے جواز کے متعلق جو کچھ بھی آیا ہے وہ اسی اہتداء اور تفکر اور عبرت حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ صحیحین میں سورج اور چاند کے گرہن کے بارے میں آیا ہے کہ وہ نہ کسی کی موت کے لیے منکسف (گرہن) ہوتے ہیں اور نہ کسی کی حیات کے لیے، لیکن اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔[5] یہ آیات، جن کی تفصیل دی گئی ان لوگوں کے لیے جو علم وعقل اور شعور و دانش رکھتے ہیں، جو صانع مختار کے وجود پر، اس کے کمالِ قدرت پر، ابتدائے صنعت وآفرینش اور علم وحکمت پر دلیل ہیں۔[6]

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ
قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝۹۸ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا
نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤١٩) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٦٥) سنن النسائي، رقم الحدیث (٥٢٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحیح أبي داود (٢/ ٢٩٢)

[2] الدر المنثور (٣/ ٣٢٩) [3] المعجم الکبیر (١٠/ ١٩٨) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٣٤)

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٩٠٥) مصنف ابن أبي شیبة (٥/ ٢٣٩) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦٠٧٤)

[5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٠٠١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٠١) [6] فتح البیان (٤/ ١٩٨۔ ٢٠٣)

دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، پس ہر ایک کے لیے قرار پکڑنے کی ایک جگہ ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ، تحقیق ہم نے اپنی آیتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں (98) اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا، پس ہم نے اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات پیدا کیں، پھر ہم نے اس سے ہری بھری کھیتیاں اُگائیں جن سے ہم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں، اور کھجور کے شگوفے سے پھل کے گچھے پیدا کیے، جو بوجھ سے جھکے جاتے ہیں اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے، جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور (بعض) نہیں ملتے جلتے، یہ درخت جب پھل دینے لگتے ہیں تو ان کے پھل دینے اور ان کے پکنے کی حالت کو دیکھ کر غور کرو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں (99)

مستقر و مستودع کا مفہوم:

اول سپرد ہوتا ہے ماں کے پیٹ میں کہ آہستہ آہستہ دنیا کے اثر پیدا کرے۔ پھر آ کر ٹھہرتا ہے دنیا میں، پھر سپرد ہوگا قبر میں کہ آہستہ آہستہ آخرت کے اثر پیدا کرے، پھر جا ٹھہرے گا جنت یا دوزخ میں۔ ایک جان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ [النساء: ۱] ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر کے ان دونوں سے مرد اور عورتیں کثرت سے پھیلا دیے۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم آپس میں سوال کرتے ہو، اور رشتے توڑنے سے ڈرو، بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔''

مستقر اور مستودع کے کیا معنی ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ سیدنا ابن مسعود، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم، مجاہد، ابو عبدالرحمان سلمی قیس بن ابی حازم، ابراہیم نخعی، ضحاک، قتادہ، سدی، عطا اور خراسانی رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ مستقر ارحام ہیں اور مستودع اصلاب۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ایک گروہ نے اس کے برعکس کہا ہے۔ تیسرے گروہ نے کہا ہے: مستقر دنیا ہے اور مستودع وہ جہاں موت آئی۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مستقر ارحام و پشت زمین ہے

اور جس جگہ موت آئی۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مستقر وہ ہے جہاں مرا، اُس کا عمل وہاں ٹھہرا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مستقر دارِ آخرت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔[1] واللہ أعلم.

پانی ہر چیز کی تخلیق میں اصل ہے:

﴿ يَفْقَهُوْنَ ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کے کلام اور معنی کو یاد رکھتے ہیں۔ اللہ نے آسمان سے ایک اندازے پر پانی اتارا، بندوں کے رزق اور تمام مخلوق کی زندگی قائم رکھنے کے لیے۔ یہ مخلوق پر اس کی رحمت ہے، اس پانی سے ہر قسم کی روئیدگی نکالی، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ [الأنبياء: ٣٠] ''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ شے بنائی۔'' پھر اُس سے ہر قسم کا سبزہ اگایا، کیا زرع کیا درخت، پھر اس میں دانہ اور پھل لگایا، ایک پر ایک سوار جیسے بالیاں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ ﴾ سے مراد چھوٹے درخت کھجور کے ہیں، جن کے گوشے زمین کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔[2] پھر اس سے انگور کے باغ نکالے۔ یہ دونوں قسمیں پھلوں میں سے بہترین ہیں، اہلِ حجاز کے نزدیک، بلکہ کبھی دنیا میں بہترین پھل سمجھے جاتے ہیں، جس طرح کہ اللہ نے ان دونوں پھلوں کا اپنے بندوں پر احسان رکھا اور فرمایا: ﴿ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ﴾ (آیتِ باب) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ورق اور شکل میں متشابہ، ایک دوسرے کے قریب اور ذائقے اور تاثیر میں مختلف۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ، امام ضحاک، عطا، سدی، قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ ذرا خالق کی قدرت میں غور کرو جس نے عدم سے خوشبوئیں بنائیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ﴾ [الرعد: ٤] ''اور زمین میں باہم ملے ہوئے قطعات ہیں، اور انگوروں کے باغ اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت ہیں، ایک جڑ سے کئی تنوں والے اور ایک تنے والے، جو ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں اور ہم ان کے بعض کو بعض پر پھل میں فضیلت دیتے ہیں۔'' اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے کہ اس میں ان کے خالق کی قدرت، حکمت اور رحمت کے کمال کی دلیلیں ہیں، اس قوم کے لیے جو تصدیق کرنے والی اور رسولوں کی اتباع کرنے والی ہو۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ نفسِ واحدہ سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٥٥۔ ١٣٥٧) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢١٥)

[2] تفسیر الطبري (١١/ ٥٧٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٥٩) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢١٦)

ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے سامنے کھڑا کر کے بائیں بازو پر مارا، ان کی پشت سے ان کی اولاد نکلی، جس سے ساری زمین بھر گئی۔[1] (رواه ابن مردويه) یہ حدیث آیتِ باب کے معنی میں ہے۔ مستقر کے قاف کو کسر (زیر) و فتح (زبر) دونوں سے پڑھا ہے، مراد یہ ہے کہ تمھارا ٹھہراؤ زمین میں یا زمین کی پشت پر ہے۔ مستودع سے مراد رحم یا زمین کا اندرونی حصہ یا لوگوں اور جانوروں کی پشتیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رحمِ مادر مستقر ہے اور پشتِ پدر مستودع ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ ﴾ [الحج: ٥] ''اور ہم جس (نطفے) کے متعلق چاہیں اسے مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہراتے ہیں۔'' اس کے برعکس بھی ان سے مروی ہے، یعنی مستقر پشتِ پدر اور مستودع رحمِ مادر ہے۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مستقر رحمِ مادر ہے، یہاں تک کہ پیدا ہو، مستودع قبر ہے، یہاں تک کہ مبعوث ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جائے قرار پشتِ زمین ہے دنیا میں، اور جائے سپردگی آخرت میں اللہ کے پاس ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ مستقر سے مراد پیدا شدہ ہے، مستودع وہ جو پیدا نہیں ہوا۔ یا مستودع قبر ہے اور مستقر جنت یا دوزخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴾ [البقرة: ٣٦] ''اور تمھارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور تمھیں ایک (خاص) وقت تک اس سے فائدہ اُٹھانا ہے۔''

یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ مستقر سے مراد زمین پر رہنا ہے۔ آیات کی یہ تفصیل یعنی توحید کے دلائل اور واضح براہین اور نورانی حجتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو باریک اور لطیف نکتوں کو سمجھتے ہیں۔ پھر اللہ نے پانی کا ذکر کیا ہے کہ ہم نے اُس سے ہر طرح کی روئیدگی نکالی جو ہر شے کا رزق ہے، کیا انسان کیا حیوان اور پرندے اور جنگلی جانور۔

﴿ خَضِرًا ﴾ گیلے ساگ کو کہتے ہیں جو شاخوں سے پھوٹتا ہے، دانے سے باہر ہوتا ہے یا مراد گیہوں، جو، جوار اور چاول وغیرہ ہر قسم کے دانے اور تمام سبزیاں اور ساگ ہیں۔ دانے کو دیکھو تو ایک پر ایک چڑھا ہے۔ زرع کا جو نخل سے پہلے ذکر کیا، اس سے زرع کی افضلیت نکلتی ہے، کیوں کہ لوگوں کی نخل کی نسبت زرع کی حاجت زیادہ ہے۔ پسندیدہ روزی یہی کھیتی ہے۔ ''طَلْعِ'' وہ ہے جو نخل کے پھل سے سب سے پہلے ظاہر ہوتا ہے، کوزے کی طرح اس میں گچھا ہوتا ہے، جب وہ کوزے پھٹ جاتے ہیں تو اس کا نام عذق ہوتا ہے، اس کو قنو کہتے ہیں یا قنو سے مراد جمار اور عرجون (باریک دانے اور سوکھی ٹہنی) ہے۔

﴿ دَانِيَةٌ ﴾ کے معنی قریب، یعنی جس کو کھڑا یا بیٹھا ہوا لے سکے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''دانی'' کے معنی متدلی ہے، یعنی لٹکتا ہوا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: یعنی چھوٹے چھوٹے درخت زمین سے ملے ہوئے،[3] جس کی شاخیں

---

[1] الدر المنثور (٣/ ٣٣١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٥٥۔ ١٣٥٧) تفسير البغوي (٣/ ١٧١۔ ١٧٢)

[3] تفسير البغوي (٣/ ١٧٢)

لٹکی ہوئی ہوں، تاکہ میوہ چننے والا آسانی سے لے لے۔ پھر انگور، زیتون اور انار کے باغ ہیں، کچھ ملتے جلتے اور کچھ غیر متشابہ ہیں۔ اللہ نے اس آیت میں کھیتی کے بعد چار قسم کے درختوں کا ذکر کیا، کیونکہ کھیتی غذا ہے اور پھل اور درخت میوہ جات ہیں۔ غذا میوہ پر مقدم ہے۔ نخل کو اس لیے پہلے ذکر کیا کہ اُس کا پھل غذا کے برابر ہوتا ہے، جو فائدے اور خاصیتیں کھجور میں ہیں، وہ اور درختوں میں نہیں۔

انگور کا ذکر کھجور کے بعد اس لیے کیا کہ اُس کے بعد یہی پھل تمام میوہ جات سے افضل ہے۔ پھر زیتون کا نام لیا، اس لیے کہ اس میں بہت سے برکات اور منافع ہیں اور استعمال کے سارے وجوہ پائے جاتے ہیں۔ انار ایک فائدہ مند میوہ ہے۔ اللہ نے کہا: ذرا ان چیزوں کے پھلنے اور پکنے کو دیکھو کہ سخت درخت سے کس طرح کا لطیف پھل نکلتا ہے۔ اگر سمجھو تو یہ سب آیاتِ عظیمہ وکثیرہ قادر وحکیم کے وجود پر دلیل ہیں، کیوں کہ ان مختلف اجناس کا، جو کہ ایک دوسرے سے متضاد قسموں کی ہیں، ایک اصل سے پیدا ہونا اور پھر ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا اس وسیع دنیا میں جس میں سارے عقل مندوں کی عقل حیران ہے، کسی صانع متقن کے بغیر کسی اور سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔ وہی کاری گر اُن کی تفاصیل خوب جانتا ہے، اُسی کی حکمت ان وجوہِ ممکنہ کو ظاہر کرتی ہے نہ اُس کا کوئی نِدّ ہے نہ شریک۔ [1]

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ١٠٠

اور (اس پر بھی) لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا، حالاں کہ اسی نے تو انھیں پیدا کیا ہے اور انھوں نے بغیر کسی علم کے اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیے، وہ پاک ہے اور ان باتوں سے بلند ہے جو وہ بیان کرتے ہیں (100)

جن پرست مشرکوں کی تردید:

یہ مشرکوں کی تردید ہے جو اللہ کے ساتھ اوروں کو پوجتے ہیں، جن کو اس کی عبادت میں شریک کرتے ہیں، اللہ ان کے کفر وشرک سے برتر ہے۔ کوئی کہے کہ انھوں نے جن کو کب پوجا وہ تو بت پرست ہیں تو جواب یہ ہے کہ جن ہی کی بات مان کر تو بت پوجتے ہیں، انھوں نے ان کو یہ حکم دیا ہے، جیسے اللہ کے اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ١١٧ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ١١٨ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ١١٩ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ [النساء: ١١٧۔ ١٢٠] ''وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو پکارتے ہیں اور دراصل وہ سرکش شیطان

---

[1] فتح البیان (٤/ ٢٠٤۔ ٢٠٩)

ہی کو پکارتے ہیں۔ اللہ نے اس پر لعنت کی ہے، اور اس نے کہا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ ضرور لے کر رہوں گا۔ اور میں انھیں گمراہ کروں گا اور انھیں امیدیں دلاؤں گا، اور میں انھیں حکم دوں گا تو وہ جانوروں کے کان چیر دیں گے، اور میں انھیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ میں رد و بدل کر دیں گے اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنا لے تو وہ یقیناً کھلے نقصان میں جا پڑا۔ شیطان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں امیدیں دلاتا ہے، مگر شیطان کے سارے وعدے فریب کے سوا کچھ نہیں۔''

نیز اس کے اس فرمان کی طرح: ﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾ [الکھف: ۵۰] ''کیا پھر (بھی) تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو، جبکہ وہ تمھارے دشمن ہیں؟ وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے۔'' نیز اس کا یہ فرمان: ﴿ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴾ [مریم: ٤٤] ''اے میرے باپ! تو شیطان کی عبادت نہ کر، بلاشبہ شیطان رحمان کا سخت نافرمان ہے۔'' نیز اس کے اس فرمان کی طرح: ﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ [یٰس: ٦٠۔ ٦١] ''اے بنی آدم! کیا میں نے تمھیں (اس بات کی) تاکید نہیں کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، بلاشبہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ تم میری ہی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔''

فرشتے قیامت کے دن یوں کہیں گے: ﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [سبا: ٤١] ''وہ کہیں گے: تو پاک ہے، تو ہی ان کے ماسوا ہمارا کارساز ہے، بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے، ان کے اکثر انھی پر ایمان رکھتے تھے۔'' اسی لیے اللہ پاک نے اس جگہ یوں کہا ہے کہ جن کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو، اللہ نے تو خود ان کو پیدا کیا ہے۔ جب وہ ان کا خالق ہوا تو وہ کیونکر اس کے ساتھ معبود ہو سکتے ہیں؟! ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کی طرح: ﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الصافات: ۹۵۔ ٩٦] ''کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جنھیں تم خود تراشتے ہو؟ حالاں کہ اللہ ہی نے تمھیں اور تمھارے اعمال کو پیدا کیا ہے۔'' آیت کے معنی یہ ہیں کہ پیدا کرنے کا مستقل اور اصل کام اللہ کا ہے، اسی لیے اس وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرنی چاہیے نہ کسی اور مخلوق کی۔ پھر اللہ نے گمراہی کا ذکر کیا کہ دیکھو کہ اللہ کے اوصاف میں کس طرح گمراہ ہو رہے ہیں، اللہ کے لیے اولاد بتاتے ہیں، یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ٹھہرایا۔ مشرکین عرب نے ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں بنا دیا، ''لَعَنَهُمُ اللّٰهُ'' ''اللہ ان پر لعنت کرے۔'' اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک صاف ہے۔

﴿ خَرَقُوْا لَهٗ ﴾ کے معنی ہیں: اِخْتَلَقُوْا یا اِئْتَفَكُوْا یا كَذَبُوْا یا تَخَرَّصُوْا یا جَعَلُوْا یا وَضَعُوْا یا قَطَعُوْا۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ مشرکوں نے اللہ کی عبادت میں جن کو شریک کیا، حالانکہ اللہ جن کے پیدا کرنے میں بغیر کسی شریک اور معاون اور مددگار کے بالکل اکیلا ہے۔ پھر جہالت کے طور سے اللہ کے

بیٹا بیٹی ٹھہرائے، حالانکہ جو اللہ ہو اس کو کب لائق ہے کہ جورو اور بچے رکھے یا کسی مخلوق کو اپنا شریک ٹھہرائے۔ اللہ ان کی باتوں سے مقدس، پاک، بہت بڑا اور بہت بلند ہے۔ کہاں اولاد، شریک، مثل اور شرکا اور کہاں اللہ پاک۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے بتوں کی عبادت جنّات کے کہنے پر کی۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا جو شرک شیطان نے ان کو اچھا کر کے دکھایا، اُس کو انھوں نے مان لیا۔[2] بعض نے کہا کہ اس جگہ جن سے مراد ملائکہ ہیں، اس لیے کہ نظر نہیں آتے، اسی لیے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں ٹھہرایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول زنادقہ کے بارے میں ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ اور ابلیس دو بھائی ہیں۔ عیاذاً باللّٰه. اللہ نے انسانوں اور جانوروں کو بنایا، ابلیس نے سانپوں، درندوں اور بچھوؤں وغیرہ کو پیدا کیا۔ اسی کے قریب مجوس کا قول ہے کہ عالم کو بنانے والے دو ہیں: ایک رب سبحانہ، دوسرا شیطان۔

مانویہ کا قول یہ ہے کہ ہر بھلائی نور سے ہے اور ہر برائی اندھیروں سے ہے۔ اس کہنے سے کہ اللہ ہی نے ان کو بنایا ہے جن کو یہ شریک کرتے ہیں، بطورِ دلیل قطعی ثابت ہوا کہ مخلوق خالق کی شریک نہیں ہوسکتی۔ کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب حادث مخلوق ہے۔ حادث ملک قدیم کا شریک نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا کہ اللہ ان کے ان جھوٹوں اور خرافات سے، جو اس کے متعلق بناتے اور بتاتے ہیں، پاک ہے۔[3]

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

وہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں؟ اور اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہی ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۰۱﴾

اللہ کی بیوی نہیں تو اولاد کہاں سے؟

بدیع وہ ہے جو کسی سابق مثال کے بغیر کوئی چیز پیدا کرے۔[4] (قاله المجاهد والسدي) بدعت کو جو بدعت کہتے ہیں وہ بھی اسی لیے ہے کہ اُس کی پہلی کوئی مثال موجود نہیں ہوتی۔ بھلا اللہ کو کس طرح بیٹا ہو گا بی بی تو ہے نہیں؟! بیٹا جب ہوتا ہے کہ ماں باپ دونوں ہوں۔ اللہ سے کوئی چیز مشابہ اور مناسب نہیں، کیونکہ وہ ہر شے کا خالق ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ

[1] تفسير الخازن (٢/ ١٦٥)
[2] معاني القرآن (٢/ ٢٧٧)
[3] فتح البيان (٤/ ٢٠٩۔ ٢١٠)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٢)

الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾

[مریم: ۸۸۔ ۹۵] ''اور انھوں نے کہا: رحمان اولاد رکھتا ہے۔ البتہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات (گناہ) تک آپہنچے ہو۔ قریب ہیں کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ اس (بات) پر کہ انھوں نے رحمان کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا۔ اور رحمٰن کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، وہ سب رحمان کے پاس غلام بن کر آئیں گے۔ بلاشبہ یقیناً اس (رحمان) نے ان کا شمار کر رکھا ہے اور انھیں خوب گن رکھا ہے۔ اور وہ سب یومِ قیامت اللہ کے پاس تنہا تنہا آئیں گے۔'' سو جب اللہ نے ہر چیز بنائی اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے تو پھر اس کے لیے کہاں سے بی بی آسکتی ہے اس کی مخلوق میں سے، کیونکہ اللہ کا تو کوئی نظیر (اُس جیسا) نہیں ہے، نہ ہی اس کی اولاد ہے۔ اللہ اُس سے کہیں بلند تر ہے۔

﴿ بَدِيْعُ ﴾ کا مطلب:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ''إبداع'' کسی چیز کو بغیر کسی اگلے نمونے کے بنانا ہے۔ سوالیہ جملہ انکار اور دوری چاہنے کے لیے ہے، یعنی جس کا وصف یہ ہے کہ وہ زمین اور آسمانوں کا مبدع (موجد) ہے، بھلا اُس کے لیے بیٹا کہاں سے آئے گا۔ اگر بالفرضِ محال ہوگا تو مخلوق ہوگا، پھر خالق اپنی مخلوق کو کس طرح اپنا بیٹا بنا سکتا ہے، حالانکہ بی بی تو ہے نہیں۔ بغیر بی بی اولاد کا وجود محال ہے۔ جو ہر شے کا خالق ہوگا، محال ہے کہ وہ بعض مخلوقات کو اپنا بیٹا ٹھہرا دے۔ یہ آیت نصاریٰ کے قول کے غلط ہونے پر قطعی حجت ہے۔ اللہ پر کیا پوشیدہ ہے وہ تو ہر شے کا عالم ہے۔[1] وللّٰہ الحمد

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ
الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٠٣﴾

یہ ہے اللہ، تمھارا رب، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے، چناں چہ تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے ﴿102﴾ اس (کی حقیقت) کو نگاہیں نہیں پاسکتیں، اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے اور وہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے ﴿103﴾

اللہ وحدہ لاشریک ہی تمھارا رب ہے:

یعنی آنکھ میں یہ قوت نہیں کہ اس کو دیکھ سکے مگر جو وہ آپ کو دکھا دے، اس لیے کہ وہ باریک بین ہے۔ اس

[1] فتح البیان (٤/ ٢١١)

آیت میں حکم کیا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو، جو وحدہ لا شریک لہ ہے۔ اس کی وحدانیت کا اقرار کرو، اس بات کو مانو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا نہ کوئی بیٹا ہے نہ باپ، نہ عورت نہ ہی کوئی اس کی نظیر و عدیل ہے، ہر چیز کا حفیظ و نگہبان اور تدبیر کرنے والا اور رزق دینے والا وہی ہے، رات دن ان کا نگہبان ہے۔

دیدارِ الٰہی کا مسئلہ:

آیتِ باب کے بارے میں ائمہ سلف کے کئی قول ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں کوئی آنکھ اللہ کو نہیں دیکھ سکتی، اگرچہ آخرت میں اس کو دیکھے گی، جس طرح احادیث میں کئی طریق سے تواتر کے ساتھ آیا ہے۔ صحاح و مسانید اور سنن میں روزِ حشر کو اللہ کا دیدار ثابت ہوا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ جس نے یہ زعم کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں اپنے رب کو دیکھا ہے وہ جھوٹا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ﴾ (آیتِ باب) (رواه ابن أبي حاتم) یہ روایت کئی طرح پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح وغیرہ میں آئی ہے۔[1] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس قول میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف ہیں، وہ اطلاقِ رؤیت کے قائل ہیں۔ ان سے روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ دل کی آنکھوں سے دو بار دیکھا ہے۔[2] یہ مسئلہ اللہ نے چاہا تو سورت نجم کے شروع میں آئے گا۔[3]

امام ابن علیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت دنیا کے بارے میں ہے،[4] یعنی یہاں کوئی اللہ کو اس آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ بعض نے کہا: ساری آنکھیں اُس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ مخصص ہے اس بات کے ساتھ کہ مومنین اللہ کو آخرت میں دیکھ سکیں گے۔ معتزلہ نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ دنیا اور آخرت میں کہیں بھی اللہ کا دیدار نہ ہوگا، کوئی اس کو نہ یہاں دیکھے گا نہ وہاں۔ سو یہ قول اہلِ سنت و جماعت کے مذہب کے مخالف ہے۔ یہ لوگ کتاب و سنت کی دلیل سے جہالت کے مرتکب ہیں۔ اللہ کی کتاب کی تو دلیل یہ ہے: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ [القيامة: ٢٢۔ ٢٣] ''اس دن (کئی) چہرے تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔'' نیز کافروں کے حق میں فرمایا: ﴿ كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴾ [المطففين: ١٥] ''ہرگز نہیں! بے شک اس روز وہ (کافر) اپنے رب (کے دیدار) سے یقیناً پردے میں رکھے جائیں گے۔''

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٢۔ ١٣٦٣) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦)

[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف اطلاقِ رؤیت کا انتساب صحیح نہیں۔ جب ان کا دوسرا قول دل سے دیکھنے کا موجود ہے تو پھر ان کو مطلق رؤیت کا قائل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ باقی رہا دل سے دیکھنا تو اسے ﴿ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ﴾ کے مطابق اضافۂ یقین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ [ص۔ ي]

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٣)

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اس دن مومن اللہ کے دیدار سے محجوب نہیں ہوں گے۔ رہی سنت سو اخبارِ متواترہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت، جیسے سیدنا ابوسعید، ابو ہریرہ، انس، جریج، صہیب اور بلال رضی اللہ عنہم وغیرہم سے منقول ہیں کہ اہلِ ایمان اللہ کو دارِ آخرت، عرصات و جنات و روضات میں آنکھوں سے دیکھیں گے۔ "جَعَلَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ" "اللہ ہمیں ان میں سے کرے۔" یہ دیکھنا سب نعمتوں سے بڑھ کر ہوگا۔ سچ پوچھو تو عظیم کامیابی یہی ہے۔ یا ابصار سے اس جگہ مراد عقول ہیں۔ یہی یحییٰ بن حصین رحمہ اللہ قاری اہلِ مکہ کا قول ہے۔[1] مگر سخت غریب اور ظاہر آیت کے خلاف ہے۔ گویا یحییٰ نے یہ اعتقاد کیا کہ ادراک (پالینا) بمعنی رؤیت ہے۔ والله أعلم.

دوسروں نے کہا ہے کہ رؤیت کے ثابت ہونے اور ادراک کی نفی میں کوئی منافات نہیں۔ اس لیے کہ ادراک رؤیت سے خاص ہے اور نفیِ اخص سے اندھوں کا فائدہ اٹھانا لازم نہیں آتا۔ پھر اس ادراک منفی میں اختلاف ہے کہ وہ کیا چیز ہے۔ کسی نے کہا: حقیقت کی معرفت ہے، اس کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اگرچہ مومن اس کو دیکھیں گے، جس طرح چاند کو دیکھنے والا چاند کی حقیقت کو دریافت نہیں کر سکتا نہ اُس کی ماہیت کو جان سکتا ہے۔ سو اللہ عظیم اس امر کے ساتھ سب سے زیادہ قریب ہے کہ ﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ [النحل: ٦٠]۔ بعض نے کہا ہے کہ ادراک رؤیت کے ساتھ خاص ہے۔

ادراک احاطے کو کہتے ہیں، عدمِ احاطہ سے عدمِ رؤیت لازم نہیں آتا، جس طرح کہ عدمِ احاطہ سے عدمِ علم لازم نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾ [طٰہٰ: ١١٠] "اور وہ (لوگ) اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔" صحیح مسلم میں مروی ہے: «لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ»[2] اس سے عدمِ ثنا لازم نہیں آتا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کسی کی نگاہ ملک کا احاطہ نہیں کر سکتی۔[3] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے ایک شخص سے کہا تھا، تو آسمان کو نہیں دیکھتا ہے؟ کہا: ہاں، کہا: اسی طرح سب دکھائی دیتے ہیں۔[4]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ اس سے بہت بڑا ہے کہ آنکھیں اس کا ادراک کر سکیں۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی طرف نظر کریں گے، مگر آنکھیں کمال عظمتِ الٰہی کے سبب سے اس کا احاطہ نہیں کر سکیں گی، ہاں اللہ کی آنکھ ان سب کا احاطہ کرے گی۔[5] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں مرفوعاً کہا ہے کہ اگر سارے انسان، جن، شیاطین اور فرشتے جب سے کہ پیدا ہوئے ہیں اور جب تک کہ فنا ہوں، ایک صف باندھیں تو کبھی بھی اللہ کا احاطہ نہ کر سکیں۔[6] (رواه ابن أبي حاتم) لیکن یہ حدیث سخت غریب ہے۔ اصحابِ کتبِ ستہ میں سے کسی نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٦)
[3] تفسير الطبري (١٢/ ١٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٣) [5] تفسير الطبري (١٢/ ١٣۔ ١٤)
[6] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٣) اس کی سند میں "عطیہ عوفی" اور "بشر بن عمارہ" ضعیف راوی ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے پوچھا: کیا اللہ نے نہیں کہا ہے: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ﴾ (آیتِ باب)؟ کہا: "لَا أُمَّ لَكَ ذَاكَ نُورُهُ الَّذِي هُوَ نُورُهُ إِذَا تَجَلّٰى بِنُورِهِ لَا يُدْرِكُهُ شَيْئٌ" روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: "لَا يَقُومُ لَهُ شَيْئٌ" تیری ماں نہ ہو، وہ اس کا نور ہے، جب وہ اپنے نور سے تجلی فرماتا ہے تو اس کا احاطہ کوئی شے نہیں کر سکتی، یا اس کے آگے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی۔[1]
(رواه الترمذي و ابن أبي عاصم في كتاب السنة وابن أبي حاتم في تفسيره و ابن مردويه أيضاً والحاكم في مستدركه وقال صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه)

اس معنی میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث صحیحین میں آئی ہے۔ اللہ نہیں سوتا اور نہ اُس کو لائق ہے کہ سوئے۔ نیچا کرتا ہے، قسط (میزان کے پلڑوں) کو اور اونچا کرتا ہے۔ اس کی طرف دن کا کام اٹھ جاتا ہے، رات کے آنے سے پہلے اور رات کا کام دن کے آنے سے پہلے۔ اس کا پردہ نور ہے یا نار۔ اگر اس پردے کو کھول دے تو اس کے چہرے کی سُبحات (تجلیاں) جہاں تک اس کی نظر جائے اس کی مخلوق کو جلا دیں،[2] یعنی تا حدِ نظر جو کچھ سامنے پڑے وہ نورِ الٰہی کی تاب نہ لا کر جل کر خاکِ سیاہ ہو جائے۔

پہلی کتابوں میں آیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے دیدار کا سوال کیا تو فرمایا: اے موسیٰ! مجھے اگر کوئی زندہ دیکھتا ہے تو مر جاتا ہے اور اگر کسی خشک چیز پر میری تجلی پڑتی ہے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۴۳] "پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر (اپنا) جلوہ ڈالا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب وہ ہوش میں آئے تو انھوں نے عرض کی: (اے اللہ!) تو پاک ہے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا مومن ہوں۔" اس ادراکِ خاص کی نفی سے روزِ قیامت کی رؤیت کی نفی ثابت نہیں ہوتی، اس دن تو اللہ اپنے مومن بندوں کے لیے جلوہ آرا ہوگا، جس طرح چاہے گا۔

رہا اس کا جلال اور عظمت سو اُس کو کوئی آنکھ نہیں پا سکتی۔ اسی لیے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اسی آیتِ باب کی دلیل سے دارِ آخرت میں رؤیت کا اثبات اور دنیا میں اس کی نفی کرتی ہیں، سو جس کی نفی کی ہے وہ رؤیت عظمت و جلال کے معنی میں ادراک ہے۔ عَلٰى مَا هُوَ عَلَيْهِ کہ یہ کسی بشر کے لیے ممکن نہیں ہے بلکہ نہ کسی فرشتے کے لیے یا کسی اور چیز کے لیے ممکن ہے۔ مدرک ابصار اور ان کا محیط اور عالم وہی اللہ ہے۔ عَلٰى مَا هِيَ عَلَيْهِ کیونکہ وہ ان کا خالق ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ [الملك: ۱۴] "بھلا وہ نہ جانے گا

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۷۹) تفسير ابن أبي حاتم (۴/ ۱۳۶۳) مستدرك الحاكم (۲/ ۳۴۶)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۹)

جس نے (سب کو) پیدا کیا۔ اور وہی باریک بین، بہت باخبر ہے۔" یا مراد ابصار سے مبصرین ہیں، یعنی کوئی شے اس کو نہ دیکھ سکے گی، وہ سب کو دیکھتا ہے۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استخراج (نکالنے) میں لطیف ہے اور مکان سے خبیر ہے۔[1] یہ ویسی بات ہے جیسے لقمان علیہ السلام نے اپنے فرزندِ ارجمند سے ناصحانہ کہا تھا: ﴿ يٰبُنَيَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴾ [لقمان: ١٦] "اے میرے (پیارے) بیٹے! بے شک اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو اور وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں اور زمین کے اندر کہیں بھی ہو تو اللہ اسے نکال لائے گا، بلاشبہ اللہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ بصر حاسۂ نظر کو کہتے ہیں، یعنی دیکھنے کی صلاحیت کو، پھر کبھی آنکھ کو بھی بصر بولتے ہیں، اس لیے کہ وہ نظر کی جگہ ہے۔ ادراک کہتے ہیں: کسی شے تک پہنچ کر اس کا احاطہ کر لینا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی اس کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا، سو آنکھیں اس کو دیکھیں گی، اس کا احاطہ نہ کر سکیں گی۔[2] جس طرح کہ دل اللہ کو پہچانتے ہیں مگر محیط نہیں۔ ابن مسیب نے کہا: "لَا تُحِيْطُ بِهِ الْأَبْصَارُ" سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: "كَلَّتْ أَبْصَارُ الْمَخْلُوْقِيْنَ عَنِ الْإِحَاطَةِ بِهِ"[3] سو منفی یہ ادراک ہے نہ کہ صرف رؤیت، کیونکہ رؤیت احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے جن میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جو شخص رؤیت کا منکر ہے، علی الاطلاق اس کے پاس کوئی دلیل وتمسک نہیں ہے، اس کے علاوہ کہ علم بیان ومیزان میں یہ بات مقرر ہے کہ مکمل طور پر ثابت شدہ بات کا سلب جزوی طور پر ہوتا ہے۔ تو آیتِ شریفہ کے معنی یہ ٹھہرے کہ بعض آنکھیں مدرکِ پروردگار نہ ہوں گی اور وہ آنکھیں کفار کی ہیں، یہ بھی اس بنیاد پر کہ ادراک کی نفی سے مراد رؤیتِ خاصہ ہے اور آیتِ باب سلب عموم سے ہے نہ کہ بابِ عمومِ سلب سے۔ مطلب یہ ہوا کہ تمام آنکھیں اُس کی مدرک نہ ہوں گی، بلکہ بعض ابصار اور وہ ابصارِ مومنین ہیں، غرض کہ ایک دو وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کی طرف جانا ضروری ہے، کیونکہ آخرت میں رؤیت کا ہونا تواتر کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے۔

آیتِ کریمہ: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴾ [القيامة: ٢٢] اسی نظریے کی مددگار ہے، اہلِ بدعت میں سے ایک قوم جیسے: خوارج، معتزلہ اور مرجیہ نے اس آیت کو اپنی دستاویز ٹھہرایا ہے، حالانکہ یہ بات ناتمام ہے، کیونکہ آیت کا مورد تمدح (تعریف) ہے، وہ رؤیت کو ثابت کرتا ہے، اس لیے کہ ادراک مستحیل الرویۃ کی نفی کوئی مدح کی بات نہیں

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٤) [2] معاني القرآن (٢/ ٢٧٨۔ ٢٧٩) [3] تفسير الخازن (٢/ ١٦٦)

ہے۔ جو چیز دکھائی نہیں دیتی وہ مدرک بھی نہیں ہوتی۔ مدح اور تعریف تو جب ہے کہ رؤیت محقق ہو مگر ادراک نہ ہو سکے، اس صورت میں یہ آیت ہماری حجت ہے اُن پر نہ کہ ان کی ہم پر۔

اگر ذرا بھی بنظرِ غور دیکھتے تو اس آیت سے پیچھا چھڑانے کو غنیمت جانتے۔ رؤیت کا انکار کرنے والے کو لازم ہے کہ اللہ کے معلوم اور موجود ہونے کی بھی نفی کرے۔ اس مسئلے میں کلام بہت لمبا چوڑا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب "حادي الأرواح" میں منکرینِ رؤیت پر خوب رد کیا ہے۔[1] امام شوکانی رحمہ اللہ نے کتاب "البغية" میں اس مسئلے کی خوب چھان بین کی ہے، ایک آدھ جگہ ہم نے بھی کسی قدر تفصیل کی ہے۔

اے لطیف وخبیر! تو ہم کو بخش دے، اپنا دیدار ہمیں نصیب فرمانا، جو منکر ہیں، ان کو محجوب رکھ، وہ اسی قابل ہیں کہ تجھ کو نہ دیکھیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خلق ادراکِ ابصار نہیں کر سکتی، یعنی حقیقتِ بصر کی کیفیت نہیں پہچانتے، نہیں جانتے کہ وہ کیا شے ہے جس کے سبب سے انسان دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے نہ اور اعضا سے۔[2]

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَآ أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں آ چکی ہیں، چناں چہ جس نے بصیرت سے کام لیا تو اس کے اپنے فائدے کے لیے ہے اور جو اندھا بنا رہا اس کا (وبال) اسی پر ہے۔ اور (کہہ دیجیے) میں تم پر محافظ نہیں ہوں ﴿104﴾ اور ہم آیات کو اسی طرح پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ (کافر) یہ کہیں کہ تو نے (کسی سے) پڑھ لیا ہے اور جو لوگ علم رکھتے ہیں، ان پر ہم اس (حقیقت) کو واضح کر دیں ﴿105﴾

اللہ کے بصائر اور حجتیں قائم ہو چکی ہیں:

بصائر سے مراد وہ بینات اور حجتیں ہیں جن پر قرآن پاک مشتمل ہے اور رسول اللہ ﷺ ان کو لائے ہیں، سو جو کوئی ان کو سوجھا بوجھا وہ اپنے ہی فائدے کے لیے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا﴾ [بني إسرائيل: ۱۵] "جس نے ہدایت پائی تو بس وہ اپنے نفس کے لیے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو بس وہ اپنے نفس ہی پر گمراہ ہوتا ہے۔" اسی لیے یہ کہا کہ جو کوئی اندھا رہا تو اس کا وبال اسی کی جان پر ہے، اللہ کے قول کے مطابق: ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي

[1] حادي الأرواح (۱/ ۱۹۶۔ ۲۴۱) [2] معاني القرآن (۲/ ۲۷۸) فتح البيان (۴/ ۲۱۱۔ ۲۱۳)

الصُّدُوْرِ ﴾ [الحج: ٤٦] ''(ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

حفیظ بمعنی حافظ و رقیب (نگہبان) ہے، یعنی میں اللہ کی طرف سے رسالت کا حکم پہنچانے والا ہوں۔ ہدایت اور گمراہی اسی کی مرضی پر موقوف ہے، کچھ میرے بس میں نہیں ہے۔ سو جس طرح توحید کی آیات کو ہم نے اس سورت میں بیان کیا ہے، اسی طرح ہم جاہلوں کے لیے ہر جگہ وضاحت اور تفسیر کرتے ہیں، تاکہ کافر اور جھٹلانے والے کہنے لگیں کہ اے محمد! تم پہلے سے پڑھے لکھے ہو، تم نے اہلِ کتاب سے علم سیکھا ہے، یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ﴿ دَرَسْتَ ﴾ بہ معنی ''تَلَوْتَ، خَاصَمْتَ، جَادَلْتَ، قَرَأْتَ، تَعَلَّمْتَ''[2] ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے جس نے ان کے جھوٹ اور دشمنی کی خبر ان الفاظ میں دی ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا ﴾ [الفرقان: ٤۔ ٥] ''اور کافر لوگوں نے کہا: یہ (قرآن) تو نرا جھوٹ ہے، جسے وہ (نبی) خود گھڑ لایا ہے اور اس (کے گھڑنے) میں اور لوگوں نے اس کی مدد کی ہے۔ چنانچہ (اے نبی!) وہ ظلم و زیادتی اور جھوٹ پر اُتر آئے ہیں۔ اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں (جو) اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے ان چودھراہٹ والوں کو خبر دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴾ [المدثر: ١٨۔ ٢٥] ''بے شک اس نے غور و فکر کیا اور اندازہ لگایا۔ تو وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟ پھر وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟ پھر اس نے دیکھا۔ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔ پھر اس نے کہا: یہ (قرآن) تو صرف جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ تو صرف ایک بشر کا قول ہے۔''

قرآن صرف متقین کے لیے ہدایت ہے:

پھر فرمایا کہ یہ بیان ہم نے ان کے لیے کیا ہے جو حق کو جان کر اتباع کرتے ہیں، باطل کو پہچان کر اُس سے بچتے ہیں۔ اللہ ہی جانے اپنی حکمتِ بالغہ کو کہ ان کو گمراہ کرنے اور ہدایت میں کیا مصلحت ہے، جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾ [البقرة: ٢٦] ''اللہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔'' نیز اللہ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۝ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٢٧) [2] تفسير الطبري (١٢/ ٢٧) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٥)

فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الحج: ٥٣۔ ٥٤] ''تاکہ جو (وسوسہ) شیطان نے ڈالا ہے اللہ (اس کو) ان لوگوں کے لیے فتنہ بنا دے جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے اور ان کے دل سخت ہیں، اور بے شک ظالم تو دور کی مخالفت میں (پڑے) ہیں۔ اور تاکہ وہ لوگ جان لیں جنھیں علم دیا گیا ہے کہ بے شک یہ (قرآن) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، چناں چہ وہ اس پر ایمان لائیں، پھر ان کے دل اس (حق) کے لیے جھک جائیں، اور بے شک اللہ ایمان لانے والے لوگوں کو ضرور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دینے والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ ﴾ [المدثر: ٣١] ''اور ہم نے فرشتے ہی دوزخ کے نگران بنائے ہیں، اور ہم نے ان کی تعداد ہی کافروں کے لیے آزمایش بنا دی ہے، تاکہ اہلِ کتاب یقین کریں اور ایمان داروں کا ایمان زیادہ ہو، اور اہلِ کتاب اور مومن شک میں نہ پڑیں اور تاکہ دل کے روگی اور کافر کہیں: اس مثال سے اللہ کی کیا مراد ہے؟ اسی طرح اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور آپ کے رب کے لشکروں کو بس وہی جانتا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاۗءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴾ [حم السجدة: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔''

اس کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ نے قرآن پاک کو متقین کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔ جس کو چاہے اس سے ہدایت دے جسے چاہے گمراہ کرے، بعض نے ﴿ دَرَسْتَ ﴾ کے بجائے ''دَارَسْتَ'' پڑھا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ﴿ دَرَسْتَ ﴾ بمعنی قَرَأْتَ وَتَعَلَّمْتَ ہے۔ یہی امام مجاہد، سدی اور ضحاک، ابن زید رحمہ اللہ وغیرہم کا قول ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ معنی ''تَقَاوَمْتَ وَ أَنْمَحَتْ'' ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ہمارے لڑکے ''دَارَسْتَ'' پڑھتے ہیں، حالانکہ یہ لفظ ﴿ دَرَسْتَ ﴾ ہے۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی بغیر الف کے ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے: معنی یہ ہیں کہ یہ جو تم ہم پر تلاوت کرتے ہو، یہ تو مدت ہوئی ہم سن چکے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ دَرَسْتَ ﴾ بہ معنی قراءت ہے۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے "دَرَسَ" پڑھا ہے۔ مطلب یہ کہ نبی اکرم ﷺ قاری ہیں، یہ اثر غریب ہے۔[1] ابی رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت یہ ہے کہ "أَقْرَأَنِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَلِيَقُولُوا دَرُسَتَ" (رواه ابن مردويه والحاكم) یعنی بجزم سین ونصب تاء۔ پھر کہا "صحيح الإسناد ولم يخرجاه"[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بصائر بصیرت کی جمع ہے۔ بصیرت نورِ قلب کو کہتے ہیں جس سے جان دیکھتی ہے، جس طرح بصر اس نور کو کہتے ہیں جس سے آنکھ دیکھتی ہے۔ بصائر کا اطلاق اس جگہ حجتِ بینہ اور برہانِ واضح پر بطور مجاز کے ہے، جس طرح سبب پر مسبب کا نام لیتے ہیں۔ یہ کلام نبی اکرم ﷺ کا ہے کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصائر آئے ہیں، اسی لیے آیت کے اخیر میں یوں کہا ہے کہ میں کچھ تم پر نگہبان نہیں ہوں۔ سو جس کسی نے حجت کو سمجھا اور اُس کی طرف اطاعت کی، اس نے اپنی جان کو نفع دیا، کیونکہ اس ابصار کی بدولت آگ کے عذاب سے نجات پائی اور جو اندھا رہا، کچھ نہ سمجھا بوجھا، اس کا نقصان اسی کی جان پر ہے، کیونکہ وہ دنیا میں اللہ کے غضب کا سامنا کرے گا اور آخرت میں اہلِ نار میں سے ہوگا۔ میں کچھ تم پر نگہبان یا تمھارے اعمال کا حساب رکھنے والا نہیں ہوں، میں تو رسول اور اللہ کے پیغامات پہنچانے والا ہوں فقط۔ حفیظ تو اللہ ہی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قتال فرض ہونے سے پہلے اتری تھی۔[3]

پھر حکم ہوا کہ ان کو تلوار کے ساتھ بتوں کی پرستش سے روکو۔ دَرَسْتَ میں تین قراءتیں ہیں: ایک دَارَسْتَ بروزن فَاعَلْتَ، دوسرے دُرِسَتْ مثل فُرِجَتْ اور تیسرے بوزن ضَرَبْتَ۔ پہلی قراءت کے یہ معنی ہیں کہ تم نے اہلِ کتاب سے اور انھوں نے تم سے مذاکرہ علم کیا، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ ﴾ [الفرقان: ٤] یعنی یہود نے نبی اکرم ﷺ کی قرآن پر اعانت کی ہے۔ اور اسی طرح ان کا قول ہے: ﴿ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴾ [الفرقان: ٥] "یہ اگلوں کے افسانے ہیں (جو) اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں اور وہ صبح وشام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔" اور ان کا قول: ﴿ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ﴾ [النحل: ١٠٣]۔ دوسری قراءت کے یہ معنی ہوئے کہ یہ آیات پرانے ہوگئے، اب ان کا ذکر کرنا کیا؟! جیسے ان کا قول: ﴿ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴾۔ تیسری قراءت کے معنی وہی پہلے معنی ہیں، یعنی بہ معنی "دَارَسْتَ" مگر اس سے زیادہ بلیغ ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے ﴿ وَلِيَقُولُوا ﴾ کو لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ڈانٹ اور سرزنش کے معنی سے، یعنی جو چاہیں سو بکیں، حق ظاہر ہے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ﴿ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴾ سے مراد اللہ کے اولیا ہیں جن کو راہِ ارشاد پر لگایا

---

(1) تفسير الطبري (١٢/ ٢٦۔ ٣١) (2) مستدرك الحاكم (٢/ ٢٦٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

(3) معاني القرآن (٢/ ٢٧٩) (4) فتح القدير (٢/ ٢١١)

ہے۔[1] مطلب یہ کہ تصریفِ آیات اس لیے ہے کہ کوئی قوم سعید ہو کوئی شقی ہو۔ قبول کرنے والا سعید ہوتا ہے اور منہ پھیرنے والا شقی ہوتا ہے۔ جس نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: ''دَرَسْتَ'' وہ بد بخت ہوا، جس پر حق کھل گیا اور وہ معنی سمجھ گیا، اور اس نے عمل کیا وہ نیک بخت ہوا۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ نے آیتوں کا ہیر پھیر اس لیے رکھا ہے کہ وہ آیات ایک قوم کے لیے تو گمراہی اور بدبختی کا ذریعہ ہوتی ہیں اور دوسری قوم کے لیے نیک بختی اور ہدایت کا ذریعہ ٹھہرتی ہیں۔[2] اے اللہ! تو قرآن پاک کو مع حدیث نبی کریم ﷺ کے ہمارے لیے موجبِ ہدایت اور نیک بختی کا کر دے، ہم کو اپنا مطیع اور اپنے رسول کا مطیع بنا لے۔ اَللّٰھُمَّ آمِیْنَ.

اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ۚ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۱۰۷﴾

(اے نبی!) آپ اس وحی کی پیروی کریں جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے (نازل) کی جاتی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکین کی طرف دھیان نہ دیں (106) اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے، اور ہم نے آپ کو ان پر محافظ نہیں بنایا، اور آپ ان کے ذمے دار نہیں (107)

صرف وحی کے اتباع کا حکم:

اللہ نے اپنے رسول اور رسول کے تابعین کو وحی کی اتباع اور اللہ کے احکامات و نشانات کی اقتدا کا حکم دیا، کیونکہ جو حق اللہ کی طرف سے آیا ہے، اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ مشرکوں سے فی الحال درگزر کرنا چاہیے، جب تک کہ اللہ اپنی مدد اور کامیابی بھیجے۔ اللہ نے جو ان کو گمراہ کر رکھا ہے، اس میں بھی اس کی کوئی حکمت ہے، کیونکہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگ ہدایت پر آ جاتے، کوئی ایک بھی شرک اور کفر نہ کرتا، مگر ارادہ اور حکمت اللہ ہی کے لیے ہے، وہ مختار ہے جو چاہے سو کرے، کس کو اتنی مجال کہ وہ اُس سے پوچھ سکے! ہاں لوگوں سے پوچھا جائے گا۔

رسول کا کام تذکیر کرنا ہے:

پھر نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ہم نے کچھ تم کو ان کے اقوال و اعمال کا نگہبان یا ان کے معاملات اور رزق کا موکل مقرر نہیں کیا۔ تمھارا کام تو یہی ہے کہ تم اللہ کے احکام پہنچاؤ، سو یہ کام کرتے رہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ ۟ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ﴾ [الغاشیة: ۲۱۔ ۲۲] ''چنانچہ آپ نصیحت کیجیے، آپ تو صرف

[1] تفسیر البغوي (۳/ ۱۷۵) [2] فتح البیان (٤/ ۲۱٤۔ ۲۱٦)

نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر کوئی فوج دار نہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [الرعد: ٤٠] ''آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہی ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ وحی پر چلو، اپنے قصد و ارادے کو مشرکوں کے ساتھ مشغول نہ کرو، ان کے کہنے سننے اور بکواس کرنے کی کچھ پروا نہ کرو۔ ان کو بکواس کرنے دو، اس بنا پر کوئی حکم منسوخ نہ ہوگا، کیونکہ اس سے مراد فی الحال ہے نہ کہ ہمیشہ کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت جنگ کا حکم آنے سے پہلے اتری ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو منسوخ کرنے والی آیت یہ ہے: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو۔''[1] لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر میں چاہتا تو سب کے سب ہدایت پر ہوتے،[2] معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان مشیت ایزدی سے ہے، اسی طرح شرک بھی اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے، اس میں معتزلہ کے خلاف دلیل ہے۔[3]

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۸

اور مشرکین اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں، تم انھیں گالی مت دو، پھر وہ بھی جہالت میں حد سے گزرتے ہوئے اللہ کو گالی دیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کے عمل میں کشش پیدا کر دی ہے، پھر انھیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہتے تھے (108)

معبودانِ باطلہ کا برا بھلا نہ کہنے کا حکم:

اللہ نے نبی اکرم ﷺ اور مومنین کو مشرکین کے معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا، اگرچہ انھیں برا کہنے میں کچھ مصلحت بھی ہو مگر اس کے نتیجے میں کسی فساد کا اندیشہ ہو جو اس مصلحت سے بڑھ کر ہو، یعنی وہ اپنے معبودوں کو برا کہنے پر مومنین کے معبودوں کو جو اللہ پاک ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، برا کہنے لگیں تو یہ ایک بڑے فساد کا سبب ہو، بہ نسبت مصلحت کے، اس لیے تم ان کو برا نہ کہو۔

---

[1] الدر المنثور (٣/ ٣٣٨) [2] تفسير الطبري (١٢/ ٣٣) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٦) اس کی سند حسن ہے۔
[3] فتح البيان (٤/ ٢١٦۔ ٢١٧)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مشرکوں نے نبی اکرم ﷺ کو کہا کہ اے محمد (ﷺ)! تم ہمارے خداؤں کو برا کہنے سے باز رہو، ورنہ ہم تمھارے رب کی ہجو کہیں گے۔ اس پر اللہ نے مومنوں کو منع کر دیا کہ تم ان کے بتوں کو گالی گلوچ نہ کرو کہ وہ زیادتی کے طریقے سے غصے میں آ کر بے سوچے سمجھے اللہ کو برا کہنے لگیں اور گستاخی کرنے لگیں۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسلمان کافروں کے بتوں کو برا کہتے تھے، اس پر کفار بے ادبی سے بے سوچے سمجھے اللہ کو برا کہنے لگے، اس پر یہ آیت اتری۔[2]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے جب ابو طالب مرنے لگے تو قریش نے کہا کہ اس مرد کے پاس چلو اس سے کہیں کہ وہ اپنے بھتیجے کو منع کرے، کیوں کہ ہم کو تم سے شرم آتی ہے کہ ہم تمھاری موت کے بعد اس کو قتل کریں اور عرب کہیں کہ ابو طالب اس سے مانع تھا، جب وہ مر گیا تو اس کے بھتیجے کو مار ڈالا۔ پھر ابوسفیان، ابوجہل، نضر بن حارث، امیہ، ابی، عقبہ بن ابی معیط، عمرو بن العاص اور اسود البختری چلے اور مطلب نامی ایک شخص کو بھیجا کہ وہ ابو طالب سے ملاقات کی اجازت لے، اس نے آ کر کہا کہ یہ تمھاری قوم کے سردار آئے ہیں، تمھارے پاس آنا چاہتے ہیں، ابو طالب نے اجازت دی، سب نے آ کر کہا: سنو! تم ہمارے بڑے سردار ہو، محمد (ﷺ) نے ہم کو اور ہمارے خداؤں کو بہت ستایا۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اُن کو بلا کر منع کر دو کہ وہ ہمارے معبودوں کا ذکر نہ کرے، ہم ان کے اللہ کا ذکر نہیں کریں گے۔ ابو طالب نے نبی اکرم ﷺ کو بلایا، آپ ﷺ آئے، کہا: یہ تیری قوم اور بنی عم ہیں (چچا کی اولاد) فرمایا: کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہم کو اور ہمارے خداؤں کو چھوڑ دو، ہم تم کو اور تمھارے اللہ کو چھوڑ دیں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا: بھلا اگر میں ایسا کروں تو تم ایک ایسا کلمہ کہہ لو گے کہ جس سے عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ اور وہ تمھیں خراج دیں؟ ابوجہل نے کہا کہ تیرے باپ کی قسم! ہم ایسے دس کلمے کہہ لیں گے، وہ کلمہ کیا ہے؟ فرمایا: کہو! "لا إله إلا الله" انھوں نے نہ مانا، ناک منہ چڑھایا۔ ابو طالب نے کہا: اے بھتیجے! اس کے سوا کچھ اور کہو، تیری قوم اس کلمے سے گھبراتی ہے، کہا: اے چچا! میں وہ نہیں ہوں کہ اس کے سوا اور کچھ کہوں، یہاں تک کہ سورج کو لا کر میرے ہاتھ میں رکھ دیں، اگر لا کر رکھ بھی دیں گے، تب بھی یہی کہوں گا نہ کہ کچھ اور۔ وہ سب خفا ہو کر کہنے لگے کہ تو ہمارے خداؤں کو گالی دینے سے باز آ نہیں تو ہم تجھ کو اور جس نے تجھ کو یہ حکم دیا ہے، اس کو گالی دیں گے۔ یہ آیت باب کا مطلب ہے۔[3] (رواہ ابن جریر)

کسی فساد کے اندیشے کی وجہ سے مصلحت کو ترک کر دینا صحیح میں ترجیح کے طور پر آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ملعون ہے وہ شخص جو گالی دیتا ہے اپنے ماں باپ کو، کہا: کیونکر دے گا؟ فرمایا: وہ کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٣۔ ٣٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٦) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٥)
[3] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٤۔ ٣٥) یہ روایت مرسل ہے۔

وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔[1] أَوْ كَمَا قَالَ. بہر حال جس طرح ہم نے اس قوم کو بتوں کی محبت میں بھلائی دکھائی اور ان کی حمایت اور مدد کرنا انھیں اچھا لگا، اسی طرح ہم نے ہر گزری ہوئی امت کو ان کے اعمال میں، جن میں وہ گرفتار تھے، زینت دی، یعنی اپنی گمراہی کو وہ اچھا سمجھتے رہے۔ سچ ہے حجتِ نابغہ اور حکمتِ بازغہ اللہ ہی کی ہے وہ جو چاہے سو کرے، اسی کی طرف لوٹ کر اور چل کر جانا ہے، وہ ان کو ان کے عمل کی خبر دے گا۔ نیکی کی جزا نیک اور بدی کی سزا بد دے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب اس بات پر دلیل ہے کہ جب کوئی داعی الی الحق، یا باطل سے منع کرنے والا اس بات سے ڈرے کہ اس کے امر و نہی کرنے سے اس سے زیادہ سخت قسم کا امر ظاہر ہوگا، یعنی حرم شریف کی ہتک یا حق کی مخالفت یا وقوعِ باطل وغیرہ تو اس وقت امر و نہی کو چھوڑ دینا زیادہ بہتر بلکہ واجب ہے۔ یہ آیتِ شریفہ ان لوگوں کے لیے نہایت فائدہ بخش ہے جو اللہ کی حجتوں کے حامل کتاب و سنت کے دلائل کو لوگوں سے بیان کرنے کا کام کرتے ہیں کہ جب وہ کسی ایسی قوم میں گرفتار ہوں جو گونگے بہرے ہیں، جب ان کو امر بالمعروف کریں تو اس کو چھوڑ دیں، بلکہ معروف کے اور کاموں سے بھی دست بردار ہوں اور جب ان کو منکرات سے روکیں تو وہ اُن کو بجا لائیں، بلکہ اور منکرات کو بھی کرنے لگیں اور اس طرح سے حق کے ساتھ دشمنی اور حق کے پیروکاروں کے ساتھ بغض کا مظاہرہ کریں۔ ایسے لوگوں پر سوائے تلوار کے اور کوئی چیز اثر نہیں کرتی۔

شریعتِ مطہرہ کے دشمنوں کے لیے انصاف کا یہی تقاضا ہے، ان لوگوں نے اپنی عادت اور خصلت یہی اللہ کی مخالفت ٹھہرالی ہے۔ اہلِ بدعت کو دیکھو کہ جب ان کو حق کی طرف بلایا جاتا ہے تو اور زیادہ باطل میں پڑ جاتے ہیں۔ جب سنت کی طرف راہ دکھاؤ تو بدعت سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں، یہ لوگ دین کے ساتھ کھیلتے ہیں، شریعت کی توہین کرتے ہیں، یہ زندیقوں سے بھی بدتر ہیں، اس لیے کہ ان کی حجتیں سب باطل ہیں اور بدعت کی طرف منسوب ہیں، بے خوف و خطر بدعت کا پرچار کرتے ہیں، بخلاف زنادقہ کے کہ اسلام کی تلواریں ان کی لگام ہیں، اہلِ اسلام ان کے محامی ہیں، ان کا مکر و فریب اور باطل اور کفر شاذ و نادر کسی ضعیف مسلمان پر چل جاتا ہے، وہ بھی مخفی طور پر ڈرتے ڈرتے۔

جمہور اہلِ علم کا مذہب یہی ہے کہ یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہے، بلکہ اصل اصیل ہے، شبہے کے راستوں اور ذریعوں کو کاٹنے اور سدِ باب کے لیے۔ لفظ ﴿عَدْوًا﴾ کو زبر و پیش دونوں طرح پڑھا ہے۔ معنی ایک ہیں، یعنی ظلم و عدوان۔ اللہ نے کافروں کی ہر امت کو ان کے عمل اچھے کر کے دکھائے۔ یہ آیت قدریہ اور معتزلہ کا رد کرتی ہے، کیونکہ وہ یوں کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے کفر کو پیدا کرنا اور اس کی زینت کرنا ٹھیک نہیں اور یہ آیت اس بارے میں صریح ہے۔[2]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٦٢٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٠) صحیحین میں "ملعون" کے الفاظ کے بجائے "کبیرہ گناہ" کے الفاظ ہیں۔ البتہ "ملعون" کے الفاظ دیگر کتبِ حدیث میں مروی ہیں۔ دیکھیں: مسند أحمد (١/ ٢١٧) صحیح الجامع (٥٨٩١)

[2] فتح البیان (٤/ ٢١٧۔ ٢١٨)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۹ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۱۰

اور انھوں نے اللہ کے نام کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس (مخصوص) نشانی آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے، (اے نبی!) کہہ دیجیے: نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں، اور تمھیں یہ بات کون سمجھائے کہ بے شک جب وہ نشانی آجائے گی تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے (109) اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے (110)

معجزوں کے آنے پر ایمان لانے کی قسمیں کھانے والے:

یعنی جن کو اللہ ہدایت دیتا ہے اول ہی سے حق سن کر انصاف کے ساتھ اسے قبول کرتے ہیں اور جس نے پہلے ہی ضد کی، وہ اگر کوئی نشانی بھی دیکھے تو کچھ حیلہ بنالے، فرعون ان نشانیوں پر ایمان نہ لایا۔ اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ مشرکین بڑی بڑی قسمیں کھا کر یہ بات کہتے ہیں کہ اگر ہم کوئی معجزہ یا خرقِ عادت دیکھیں تو ایمان لائیں، ان کا اس طرح نشانیوں کا طلب کرنا عیب جوئی، کفر اور دشمنی کے لیے ہے، یہ ہدایت یا رشد حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے، اس لیے اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں کہ نشانیوں کا مرجع اللہ ہی کی طرف ہے، وہ چاہے تو نشانیاں لائے، چاہے تو چھوڑ دے۔

امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قریش سے گفتگو کی، انھوں نے کہا کہ اے محمد! تم ہم سے کہتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس عصا تھا، جس سے پتھر کو مارا تو بارہ چشمے نکلے تھے، عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، ثمود کے لیے اونٹنی نکلی تھی، سو تم بھی ہمارے پاس کچھ نشانیاں لاؤ، ہم تمھاری تصدیق کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم کیا چاہتے ہو کہ میں لاؤں؟ کہا: یہ صفا کا پہاڑ سونے کا ہو جائے، فرمایا: میں اگر ایسا کروں تو تم میری تصدیق کرو گے؟ بولے: ہاں، واللہ! اگر تو ایسا کرے گا تو ہم تیرے تابع ہو جائیں گے، نبی اکرم ﷺ کھڑے ہو کر دعا کرنے لگے، جبرائیل علیہ السلام نے آکر کہا: تم کیا چاہتے ہو؟ اگر یہ چاہتے ہو کہ صفا سونے کا ہو جائے تو اگر ایسی نشانی بھیجی جائے گی اور وہ تصدیق نہ کریں گے تو ان کو عذاب ہو گا اور اگر یہ چاہتے ہو کہ ان کو چھوڑ دو، یہاں تک کہ وہ توبہ کریں تو چھوڑ دو۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا: بلکہ یہی بہتر ہے کہ ان کے تائب توبہ کریں، اس پر یہ آیت اتری، إلی قولہ: ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [1] (اگلی آیت) یہ روایت مرسل ہے، اس کے شواہد بہت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۳۸۔ ۳۹) یہ روایت مرسل ہے۔

فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ''ہمیں نشانات (معجزات) کے نازل کرنے سے رکاوٹ صرف اسی کی ہے کہ اگلے لوگ انھیں جھٹلا چکے ہیں۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظ: ﴿ مَا يُشْعِرُكُمْ ﴾ کے مخاطب مشرک ہیں،[1] یعنی تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ تم سچے ہو، ان قسموں میں جو تم کھاتے ہو اور بعض نے کہا کہ مخاطب مومنین ہیں، یعنی تمھیں کہاں سے ثابت ہوا کہ مشرکین آیت دیکھ کر ایمان لائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب مشرکوں نے اس بات کا انکار کیا جو اللہ نے نشانی کے مقدمے کے طور پر اتاری تو پھر ان کے دل کسی شے پر ثابت نہ رہے، ہر بات سے پھر گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الٹنے سے مراد دل اور آنکھ کا ان کے اور ایمان کے درمیان حائل ہونا ہے، اگرچہ ان کے پاس نشانیاں آ جائیں، جیسے پہلی بار حیل و حجت ہوئی۔ یہی امام عکرمہ اور عبداللہ بن زید رحمہ اللہ کا قول ہے۔

طغیان سے مراد کفر ہے۔ یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے یا اس سے مراد گمراہی ہے، یہ امام ابو العالیہ، ربیع اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَعْمَهُوْنَ ﴾ بمعنی يَلْعَبُوْنَ ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بمعنی يَتَرَدَّدُوْنَ ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہے کہ قسم کھانے والے مطلق کفار تھے یا قریش۔ اللہ کو الٰہ اعظم اعتقاد کرتے تھے، اس لیے اللہ کی قسم کھاتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نشانی کی فرمایش اس غرض سے نہیں کی تھی کہ ایمان لائیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا تحکم مقصود تھا اور اللہ کی نشانیوں سے کھیل کود کرنا مقصد تھا۔ اس پر اللہ نے کہا کہ یہ کم بخت نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو قیامت کے دن شعلۂ آتش اور اخگر کی گرمی سے الٹ پلٹ دیں گے جس طرح پہلی بار دنیا میں ایسا ہی ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیا جب نشانیاں لائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزات صادر ہوئے تو ایمان نہ لائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اگر آخرت سے دنیا کی طرف پھیرے جائیں تو بھی ان کے دل اور آنکھیں ایمان سے پلٹی رہیں، کبھی نہ مانیں جس طرح مرنے سے پہلے بھی ایمان نہ لائے تھے۔[3]

حاصل یہ کہ جس طرح نشانی کے مشاہدے سے قبل ایمان نہیں لاتے، اسی طرح نشانی کو دیکھ لینے کے بعد بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ہم ان کو دنیا میں بغیر عذاب چھوڑ دیں گے کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران رہیں۔[4]



[1] تفسير الطبري (١٢/ ٤٠)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٦٨_ ١٣٧٠)
[3] تفسير البغوي (٣/ ١٧٨_ ١٧٩)
[4] فتح البيان (٤/ ٢١٩_ ٢٢٠)

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے، اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے، تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں ﴿۱۱۱﴾

فرشتے اتر آتے یا مُردے بول اُٹھتے پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے:

اللہ نے کہا ہے کہ اگر ہم ان کے سوال کو، جو وہ آیات دیکھ کر ایمان لانے کی قسمیں کھاتے ہیں، قبول بھی کر لیں اور فرشتوں کو بھیج دیں کہ وہ اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آئیں اور رسولوں کی تصدیق کی خبر دیں جس طرح یہ سوال کیا تھا: ﴿ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٢] ''یا اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے لے آ۔'' اور یہ سوال کیا تھا: ﴿ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ''تو وہ کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ ایسی ہی چیز خود ہمیں دی جائے جیسی رسولوں کو دی گئی۔'' اور یہ سوال کیا: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٢١] ''اور ان لوگوں نے کہا جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے: ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کیے گئے یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟ بلاشبہ انھوں نے اپنے نفسوں میں تکبر کیا اور بہت بڑی سرکشی کی۔''

یا مردے کہیں کہ جو کچھ رسول لائے ہیں وہ سب سچ ہے یا ہر چیز ان کے سامنے آ کھڑی ہو، تب بھی وہ اللہ کی مشیت کے بغیر ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے نہ کہ ان کے بس میں، وہ جس کو چاہے راہ یاب کرے، اُس سے کون پوچھ سکتا ہے کہ کیا کیا۔ علم، حکمت، حکومت، قہر اور غلبہ اسی کو ہے۔ ''قُبُل'' قاف کی زیر اور با کی زبر کے ساتھ مقابلے اور معاینے سے ماخوذ ہے اور دونوں پر پیش کے ساتھ بھی مقابلے کے معنی میں ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ کا قول ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قُبُلًا ﴾ بہ معنی ''أَفْوَاجاً'' ہے،[1] یعنی اگر ایک ایک امت دوسری امت کے بعد ان پر پیش کی جائے اور وہ سب خبر دیں کہ ہاں رسول سچے ہیں، تب بھی وہ نہ مانیں اور اس آیتِ کریمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے:

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٩۔ ٥٠)

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ٩٦۔ ٩٧] ”بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔“

حاصل یہ ٹھہرا کہ جو لوگ اللہ کے علم کے مطابق پہلے سے شقی اور بدبخت ٹھہر چکے ہیں، وہ کسی صورت سے بھی ایمان نہیں لاتے۔ جو اللہ کے علم میں نیک بخت ٹھہر چکے ہیں اور اللہ نے ان کا ایمان لانا چاہا ہے، وہی ایمان لاتے ہیں۔ ”مَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ“ ”جو اللہ نے چاہا ہو گیا اور جو اس نے نہ چاہا نہ ہوا۔“

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین، ہر نبی کے دشمن بنائے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے کان میں چکنی چپڑی باتیں ڈالتا رہتا ہے، تا کہ اسے دھوکے میں رکھے۔ اور (اے نبی!) اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے۔ چناں چہ آپ ان لوگوں کو، اور جو کچھ یہ جھوٹ گھڑ رہے ہیں، اس کو رہنے دیجیے (112) اور تا کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل اس جھوٹ کی طرف مائل ہو جائیں، اور وہ اس (جھوٹ) کو پسند کرتے رہیں اور وہ جو (برے کام) کر رہے ہیں وہ کرتے رہیں (113)

ہر نبی کے دشمن ہوتے ہیں:

یہ کئی آیتیں اس پر بات اتریں کہ کافر کہنے لگے کہ مسلمان اپنا مارا ہوا کھاتے ہیں، اللہ کا مارا ہوا نہیں کھاتے۔ فرمایا کہ ایسی فریب کی باتیں ملمع کر کے شیطان سکھاتے ہیں، مقصد انسانوں کو شبہے میں ڈالنا ہے۔ حکم عقل کا نہیں، بلکہ اللہ کا ہے۔ آگے کھول کر سمجھا دیا کہ مارنے والا سب کا اللہ ہے، لیکن اس کے نام کی برکت ہے جو اس کے نام پر ذبح ہوا وہ حلال ہے، جو اس کے بغیر مر گیا وہ مردار ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اے پیغمبر! جس طرح ہم نے تمھارے دشمن پیدا کر دیے ہیں کہ وہ تمھارے مخالف اور معاند ہیں، اسی طرح تم سے پہلے ہر نبی کے دشمن تھے سو تم اس بات پر کچھ غم اور رنج نہ کرو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٣٤] ”اور (اے نبی!) بے شک آپ سے

پہلے بہت سے رسول جھٹلائے گئے، تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور تکلیف دیے جانے پر صبر کیا، حتی کہ ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی اور اللہ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور یقیناً آپ کے پاس رسولوں کی کچھ خبریں آ چکی ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٣] ''آپ سے وہی کہا جاتا ہے جو آپ سے پہلے کے رسولوں سے بھی کہا گیا ہے، یقیناً آپ کا رب معافی والا اور دردناک عذاب والا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [الفرقان: ٣١] ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بعض گناہ گاروں کو بنا دیا ہے۔'' ورقہ بن نوفل نے نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ کوئی شخص اس کے مثل نہیں لایا جو تم لائے ہو، مگر اس کے ساتھ عداوت کی گئی۔[1] پھر فرمایا کہ شیاطین انسانوں اور جنوں دونوں میں ہوتے ہیں: ''قَبَّحَهُمُ اللّٰهُ وَلَعَنَهُمْ''

شیاطینِ انس اور شیاطین جن کا باہمی رابطہ:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن میں بھی شیطان ہیں اور انس میں بھی شیطان، بعض بعض کی طرف وحی کرتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ ایک دن ابوذر رضی اللہ عنہ نماز پڑھتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! شیاطینِ انس و جن سے پناہ مانگ! کہا: کیا انس میں بھی شیاطین ہوتے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ اس کی سند قتادہ رحمہ اللہ اور ابوذر رضی اللہ عنہ کے درمیان منقطع ہے۔[2] یہ روایت ابوذر رضی اللہ عنہ سے دوسری طرح سے بھی آئی ہے، لیکن وہ بھی منقطع ہے، اس کے الفاظ یوں ہیں: ''هُمْ شَرٌّ مِّنْ شَيَاطِيْنِ الْجِنِّ''[3] ''وہ انسانی شیاطین، شیاطینِ جن سے زیادہ برے ہوتے ہیں۔'' مگر امام احمد رحمہ اللہ نے اس کو متصلاً بطولہ روایت کیا ہے۔[4] (وكذا رواه ابن مردويه وابن أبي حاتم بطرق و الفاظ)[5]

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیاطینِ انس وہ ہیں جو انسانوں کو بہکاتے اور گمراہ کرتے ہیں، شیاطینِ جن وہ ہیں جو جنوں کو بہکاتے ہیں، جب دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو ہر ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ میں نے اپنے یار کو اس ڈھب اور اُس طریقے سے بہکایا تُو بھی اپنے یاروں کو یوں اور ووں بہکا۔ سو بعض بعض سے ایسے طریقے سیکھتا ہے جس سے گمراہ کیا جاتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ شیاطینِ انس انہی آدمیوں میں سے ہوتے ہیں۔ سو اس میں شک نہیں کہ امام عکرمہ رحمہ اللہ کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یوں ہیں کہ انسان میں شیطان نہیں ہوتے، لیکن شیاطینِ جن شیاطینِ انس کی طرف وحی کرتے ہیں۔[6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠) [2] تفسير الطبري (١٢/ ٥٤)

[3] تفسير الطبري (١٢/ ٥٣) اس کی سند ''ابن عائذ'' اور ''ابوذر رضی اللہ عنہ'' کے درمیان منقطع ہے۔

[4] مسند أحمد (٥/ ١٧٨) اس کی سند میں ''ابو عمر دمشقی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧١) اس کی سند میں ''علی بن یزید الالہانی'' ضعیف راوی ہے۔

[6] تفسير الطبري (١٢/ ٥٢۔ ٥٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٢٥)

بہر حال شیطان ہر شے کا وہ ہے جو اس میں سرکش، شریر، بدذات اور پاجی ہو، اس لیے صحیح مسلم میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کالا کتا شیطان ہے،[1] یعنی کتوں میں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفار جن شیاطین ہیں، شیاطینِ انس کی طرف وحی کرتے ہیں۔[2] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: میں مختار کے پاس گیا، میری خاطر داری کی مجھ کو اتارا، قریب تھا کہ رات کو خود میری خاطر داری کرے، مجھ سے کہا: باہر جا کر لوگوں سے باتیں کرو، وعظ کہو، میں باہر نکلا، ایک آدمی نے کہا: تو وحی کے بارے میں کیا کہتا ہے: میں نے کہا: وحی دو طرح پر ہوتی ہے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ﴾ [يوسف: ٣] ''(اے نبی!) ہم نے آپ کی طرف یہ قرآن وحی کر کے نازل کیا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ﴾ (آیتِ باب) امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے چاہا کہ مجھ کو پکڑیں، میں نے کہا: تم کو یہ بات نہ چاہیے، میں تمھارا مفتی اور مہمان ہوں، اُس پر انھوں نے مجھ کو چھوڑ دیا۔ عکرمہ نے یہ معاملہ مختار بن ابی عبید (قَبَّحَهُ اللّٰهُ) کے سامنے پیش کیا تھا، اس کو یہ گمان تھا کہ اس کے پاس وحی آتی ہے، مختار کی بہن سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بیوی تھی، صالحات میں سے تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب سنا کہ مختار کا یہ زعم ہے کہ اس کو وحی آتی ہے، کہا: سچ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ ﴾ [الأنعام: ١٢١] ''اور بے شک شیاطین اپنے دوستوں کے ذہنوں میں شبہے ڈالتے ہیں۔''[3] ﴿ زُخْرُفَ الْقَوْلِ ﴾ سے مراد وہ قول مزین ومزوق ہے جس کو جاہل سن کر دھوکا کھائے۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، کیونکہ یہ سب اللہ ہی کی قضا وقدر ومشیت وارادے سے ہے کہ ہر نبی کے لیے کچھ لوگ دشمن ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا تو ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دے، ان کی عداوت میں اللہ پر بھروسا کر، اللہ تجھ کو کافی اور تیرا مددگار ہے۔ ان کی باتوں کی طرف انہی کے دل، عقلیں اور کان جھکتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی کافروں کے دل وہی اس کو پسند کرتے ہیں۔[4] جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۝ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ١٦١۔ ١٦٣] ''(اے مشرکو!) بے شک تم اور (وہ) جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ تم (ان مخلص بندوں کو) اس (اللہ) کے خلاف بہکانے والے نہیں۔ مگر اسی کو جو جہنم میں جانے والا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴾ [الذاريات: ٨۔ ٩] ''بلاشبہہ تم (باہم) مختلف باتوں میں (پڑے) ہو۔ اس سے پھیرا جاتا ہے جو شخص (بھلائی سے)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥١٠) [2] تفسير الطبري (١٢/ ٥٥)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧١۔ ١٣٧٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٢٦) [4] تفسير الطبري (١٢/ ٥٨۔ ٥٩)

پھیرا گیا۔'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اقتراف بہ معنی اکتساب ہے۔[1] امام سدی اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی کیے جائیں وہ کام جو کر رہے ہیں۔[2]

فتح البیان میں ہے کہ آیت باب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے کہ کفار کا دشمن ہونا کچھ تمھارے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر زمانے کے کافر اپنے نبی کے دشمن تھے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شیاطین سے مراد سرکش جن وانس ہیں۔ شیاطینِ انس کا سرکش ہونا شیاطینِ جن سے زیادہ ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جن جانّ کو کہتے ہیں، وہ شیاطین نہیں ہیں، شیاطین تو ابلیس کی اولاد ہے جو نہیں مرتے مگر ابلیس کے ساتھ اور جن مرتے ہیں، ان میں مومن اور کافر ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ کاہن شیاطینِ انس ہیں۔[3] بعض نے کہا: بلکہ یہ سب ولدِ ابلیس ہیں۔ انس کی شیاطین کی طرف اضافت (نسبت) اس لیے ہے کہ شیاطین ہی انسانوں کو سرکش اور گمراہ بنانے والے ہیں۔ یہی امام عکرمہ، ضحاک، کلبی اور سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4] بعض ان کے بعض کو وسوسہ ڈالتے ہیں کہ یہ وسوسہ خفیہ طور پر ہوتا ہے اور ملمع ہے۔ اس لیے اس کو وحی کہا۔ زخرف باطل کو کہتے ہیں، مزخرف بمعنی مزین ہے۔ جس بات کو اچھے پیرائے میں لا کر کسی کو دھوکا دیں وہ زخرف القول ہے۔ ایسی بناوٹی باتوں پر انھی لوگوں کے دل مائل ہوتے ہیں جو آخرت کے منکر ہیں، اس بات کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ اب جو گناہ وہ کرتے ہیں، وہ کیے جائیں، پہلے دھوکے پر میلانِ طبع ہوتا ہے، پھر رضا مندی کے بعد فعل ہوتا ہے۔ یہ ترتیب نہایت فصیح ہے۔[5]

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

(کہہ دیجیے:) کیا پھر میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں؟ حالاں کہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف یہ کتاب تفصیل سے نازل کی اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، وہ جانتے ہیں کہ بے شک وہ آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے، لہٰذا آپ ہرگز شک کرنے والوں میں (شامل) نہ ہوں (114) اور آپ کے رب کی بات صدق اور عدل میں مکمل ہے، اس کی باتوں کو تبدیل کرنے والا کوئی نہیں، اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (115)

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٥٩) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسير الطبري (١٢/ ٦٠) [3] الدر المنثور (٣/ ٣٤٢)
[4] تفسير الخازن (٢/ ١٧٣) [5] فتح البيان (٤/ ٢٢٢_ ٢٢٤)

اہل کتاب کے ہاں قرآن کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے:

اللہ پاک نے اپنے پیغمبر پاک سے فرمایا کہ تم ان مشرکوں سے کہہ دو کہ کیا میں اپنے اور تمھارے درمیان کوئی اور منصف تلاش کروں، حالانکہ جو مفصل کتاب تم پر آئی ہے، وہ اسی کی اتاری ہوئی ہے اور یہود و نصاریٰ جن کو کتاب دی گئی ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس نبی آخر الزمان ﷺ کے بارے میں پہلے انبیا کی بشارتیں موجود ہیں۔ اب تجھ کو کچھ شک نہیں کرنا چاہیے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ١ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴾ [یونس: ۹٤] ''پھر اگر آپ (اس کتاب کے متعلق) شک میں ہوں جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھیے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں، یقیناً آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔''

یہ شرط ہے اور شرط سے یہ لازمی نہیں کہ وہ چیز واقع ہو جائے جس کے لیے شرط رکھی گئی ہو۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: «لَا أَشُكُّ وَلَا أَسْأَلُ»[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ قول صدق ہے اور حکم عدل ہے،[2] یعنی اخبار میں راست گو، حکم و طلب میں دادگر۔ جس بات کی خبر دی ہے اس میں کچھ شک و شبہہ نہیں ہے۔ جو حکم دیا ہے وہ سراسر انصاف ہے۔ اس کے سوا انصاف نہیں۔

جس چیز سے منع کیا ہے وہ باطل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جب نہی کرے گا تو مفسد ہی سے کرے گا، جیسے اس نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ١ٞ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ١ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ١ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱٥۷] ''(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، چناں چہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اس کے حکم کو پیچھے ڈالے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں، وہ سب کی بات سنے، سب کے حرکات و سکنات جانے، ہر عامل کو جزا اس کے عمل کی دے گا، نیک کو نیک، بد کو بد۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٦/ ١٢٥) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسير الطبري (١٢/ ٦٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٢٦)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اے محمد! تم منکرین مشرکین و کفار مکذبین سے کہہ دو کہ میں زخارفِ شیاطین (ملمع باتوں) کی طرف کس طرح جھکوں، اللہ سے بڑھ کر کون منصف ہے؟! ان کی مرضی یہ تھی کہ نبی اکرم ﷺ یہودیوں کے احبار یا نصاریٰ کے اساقفہ (مذہبی پیشواؤں) میں سے کسی شخص کو منصف قرار دیں، اُس پر یہ آیت آئی۔ فرمایا: جن کو تورات، انجیل اور زبور ملی ہے، وہ اگرچہ اظہارِ انکار، جھگڑا اور بحث و مباحثہ کریں، لیکن نزولِ قرآن کی حقیقت ان کو بخوبی معلوم ہے۔ اس لیے کہ ان کی کتابیں اس پر دلیل ہیں کہ نبی اکرم ﷺ خاتم الانبیا ہیں۔ اب نبی اکرم ﷺ کو اس بات میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ اہلِ کتاب قرآن کا اللہ کی طرف سے منزل ہونا جانتے ہیں، یہی امام زمخشری رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یا مطلق شک سے منع کیا ہے، گویا امت کو یہ بات پیش کی ہے کہ کوئی شخص اس میں شک وشبہہ نہ کرے۔ یا ہر مستحقِ خطاب کو خطاب ہے اگرچہ بظاہر مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں۔

کلمۂ رب سے مراد قرآن کی وہ عبارات ہیں جن میں وعدے اور وعید ہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا، وعید کو تمام کیا۔ حق ظاہر ہوا، باطل مٹا۔ یا مراد کلماتِ قرآن ہیں کہ کسی کو بھی یہ قدرت نہیں کہ ان کو بدل ڈالے، جس طرح کہ تورات، انجیل اور زبور میں تحریف کی گئی ہے۔ گویا اللہ اس کتاب کا حافظ اور ضامن ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اب اس نبی اور کتاب کے بعد کوئی اور نبی اور کتاب اس کو منسوخ کرنے والی نہیں آئے گی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ پورا ہو چکا۔

عامر بن عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ فتح مکہ کے دن مسجدِ حرام میں آئے، آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، ہر قوم کا ایک بت تھا، جس کو پوجتے تھے، ہر ایک بت کے پاس آ کر اُس کے سینے میں لکڑی مار کر خاک میں گرا دیا۔ جو بت اوندھا ہوتا، اس کے ٹکڑے کر کے مسجد کے باہر پھینک دیتے اور نبی اکرم ﷺ فرماتے: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [1] (آیتِ باب) یعنی گزرے ہوئے زمانے اور گزری ہوئی امتوں کی خبر دی ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے وہ سچ ہے اور جو امر و نہی، حلال و حرام اور دوسرے تمام احکام بیان کیے ہیں، وہ عدل ہے۔ کس کی مجال ہے کہ اُس کی بات کو بدل سکے۔ کسی چیز کے مکمل ہو جانے کی صفت یہی ہے کہ وہ کسی کمی بیشی اور تبدیلی کو قبول نہ کرے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: ”لَا تَبْدِيْلَ لِشَيْئٍ قَالَهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ یعنی جو بات اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں فرما دی اس کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔[2] یا جو بات منہ سے نکلی ہے وہ پتھر کی لکیر ہے نہ یہاں بدلے نہ وہاں۔ اللہ کے فرمان کے مطابق: ﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ... الآية ﴾ [قٓ: ۲۹] ”میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی۔“

---

[1] فتح القدير (۲/ ۲۱۹)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٤_ ١٣٧٥)

اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ نیک بدبخت نہیں ہوسکتا اور بدبخت نیک نہیں ہوسکتا، سعادت و شقاوت ازلی ہے۔
یہ بھی معلوم ہوا کہ سخن پروری (بات سننا اور قبول کرنا) اللہ کی صفت ہے، آدمی اگر ایسا دعویٰ یا ارادہ کرے تو گویا وہ الوہیت کا دعویٰ کرنے والا ہے (أستغفر اللّٰه)۔ اللہ ہر ایک کی بات کو سنتا ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے۔[1]

وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ يَّضِلُّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ‌ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۱۷﴾

اور اگر آپ اہلِ زمین کی اکثریت کی اطاعت کریں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے، وہ اپنے گمان کے سوا کسی بات کی پیروی نہیں کرتے، اور وہ اٹکل پچو باتیں ہی کرتے ہیں (116) بے شک آپ کا رب اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکتا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے (117)

اکثریت کی پیروی گمراہی کا باعث ہے:

اللہ پاک نے یہ خبر دی ہے کہ اکثر اہلِ ارض، یعنی بنی آدم گمراہ ہیں، جیسے اس نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَهُمۡ اَكۡثَرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴾ [الصافات: ۷۱] ''اور بلاشبہ ان سے پہلے بہت سے اگلے لوگ گمراہ ہوئے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔'' یہ لوگ اپنی گمراہی میں یقین پر نہیں بلکہ جھوٹے گمان اور غلط ظنوں میں گرفتار ہیں۔ اپنے خیالات کے تابع ہیں، اٹکل پچو پر چلتے ہیں، یہ سب اللہ کی تقدیر اور مشیت ہے۔ جس کو جان لیا ہے کہ وہ گمراہ ہے، اس کے لیے گمراہی کی راہ آسان کر دی ہے، جس کو معلوم کیا ہے کہ وہ راہ یاب ہے، اس کے لیے راہِ ہدایت سہل کر دی ہے۔ غرض کہ جو شخص جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، وہ کام اس کو میسر ہے (اس کے لیے اس میں آسانیاں کر دی جاتی ہیں)۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ نبی اکرم ﷺ چاہیں گے کہ اکثر لوگ اطاعت اختیار کریں۔ مگر دنیا کے لوگ ان کو راہ بھلا دیں گے، اس لیے کہ حق پر چلنے والے بہت قلیل ہوتے ہیں نہ کہ اکثر۔ یہ قلیل لوگ وہی گروہ ہے جو ہمیشہ حق پر رہے گا، کسی مخالف کی مخالفت اس کو نقصان نہ دے گی۔ جس طرح حدیث میں مروی ہے۔[2] یا اکثر سے مراد کفار ہیں اور زمین سے مکہ یعنی اکثر اہلِ مکہ۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے، سو جب اکثر اہلِ دنیا کا حال یہ ٹھہرا تو حقیقی علم اللہ ہی کو ہے۔[3]

[1] فتح البيان (٤/ ٢٢٥۔ ٢٢٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤٢) [3] فتح البيان (٤/ ٢٢٧)

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾
وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ
مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ
بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿١١٩﴾

چناں چہ تم اس (جانور) کا گوشت کھاؤ جس پر اللہ کا نام پڑھا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان لانے والے ہو ﴿118﴾ اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس (حلال جانور) کا گوشت نہ کھاؤ، جس پر اللہ کا نام پڑھا گیا ہو؟ حالاں کہ اللہ نے ان (سب جانوروں) کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہے جو اس نے تم پر حرام کیے ہیں، مگر جسے تم کھانے پر مجبور ہو جاؤ (تو وہ بھی حلال ہیں) اور بے شک اکثر لوگ اپنی خواہشات سے، بغیر علم کے دوسروں کو بہکاتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے ﴿119﴾

جس ذبیحے پر اللہ کا نام لیا جائے وہ حلال ہے:

اللہ نے اس آیت میں ان ذبیحوں کو جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، اپنے مومن بندوں کو مباح فرمایا۔ مفہوم یہ ہوا کہ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، وہ مباح نہیں، جس طرح کفار اور مشرکین مردار اور بتوں وغیرہ کا ذبیحہ کھانا مباح جانتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، اس کو کھاؤ، جو چیز حرام ہے وہ تم کو کھول کر بتا دی وہ نہ کھاؤ، مگر حالتِ اضطرار میں۔ اللہ نے اہلِ شرک کی جہالت، ان کی آرائے فاسدہ بیان کی کہ دیکھو مردار اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہے، اس کو تو کھاتے ہیں اور اللہ کے نام کا ذبیحہ نہیں کھاتے سو اللہ کو ان کا حد سے بڑھ جانا اور ان کا جھوٹ اور افترا پردازی معلوم ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم اپنا مارا ہوا کھاتے ہیں، اللہ کا مارا ہوا نہیں کھاتے، اس پر یہ آیت اتری۔[1] لیکن لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ سو جس ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، وہ حلال ہے، اگر وہ اصل میں مباح الاکل ہے، یعنی ویسے حرام نہیں اور جس پر عمداً نہیں لیا گیا یا غیر کا نام لیا گیا ہے، یا خود بخود مر گیا، وہ حرام ہے۔ یا جو کسی کے نام کا ہے اور اس کے نام سے مشہور ہو گیا ہے، گو ذبح کے وقت اس پر عادتاً و رسماً اللہ کا نام لیا گیا ہو تو وہ ذبیحہ بھی حرام ہے، جیسے شیخ سدو کا بکرا یا سید احمد کبیر کی گائے یا زین خان کا مرغا وغیرہ۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨١٩) اس میں ''یہود'' کا ذکر منکر ہے اور محفوظ ''مشرکین'' کا ذکر ہے۔ مزید تفصیل آیت نمبر ۱۲۱ میں آ رہی ہے۔

امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں حکم ہے کہ پانی پیتے وقت، ذبح کرتے وقت اور ہر کھانے پر اللہ کا نام لو۔[1] حرام کا بیان اس آیتِ کریمہ میں گزر چکا ہے: ﴿ قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الأنعام: ١٤٥] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میری طرف جو وحی کی گئی ہے، میں اس میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر جو اسے کھائے، حرام ہو مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا سؤر کا گوشت، کیوں کہ وہ ناپاک ہے، یا وہ فسق ہو کہ (ذبح کرتے وقت) اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو، پھر جو شخص مجبور ہو جائے، (بشرطیکہ) وہ سرکشی کرنے والا اور حد سے گزرنے والا نہ ہو تو بے شک آپ کا رب بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی آیت سورت مائدہ: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ﴾ [المائدة: ٣][2] ''تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردہ جانور۔'' مگر اس میں اشکال ہے، اس لیے کہ سورت انعام مکی ہے اور سورت مائدہ مدنی، اس لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ مراد ﴿ قُلْ لَّاۤ اَجِدُ ﴾ [الأنعام: ١٤٥] ہے۔ اگرچہ آیتِ باب کے بعد تھوڑے فاصلے پر مذکور ہے، کیونکہ اس قدر تاخر مراد سے مانع نہیں ہوسکتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ سورت مائدہ ترتیب میں سورت انعام سے پہلے آئے گی نہ کہ نزول میں۔ اس اعتبار سے مائدہ کا حوالہ بہتر ہے، یعنی اس ترتیب کے لحاظ سے پہلے رکھا جانا اگرچہ نزول کے لحاظ سے وہ اُس سے بعد میں ہو۔ پھر مضطر کے لیے حرام کو حلال کر دیا، اس کا بیان سورت بقرہ میں ہو چکا ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکینِ عرب ذبیحے کے بارے میں لوگوں کو بہکاتے تھے۔[3] بحیرہ اور سائبہ کو حرام ٹھہراتے اور نہ جانتے کہ یہ محض ان کی جہالت اور گمراہی ہے، کوئی علم کی بات نہیں۔ سو اللہ ایسے لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتے ہیں، یہی لوگ معتدین ہیں، یعنی حد سے تجاوز کرنے والے۔[4]

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور تم کھلے اور چھپے گناہ چھوڑ دو، بے شک جو لوگ گناہ کرتے ہیں ان کو ان (عملوں) کی جلد سزا ملے گی جو وہ کرتے رہے ہیں (120)

---

(1) فتح القدير (٢/ ٢٢٠)
(2) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٦)
(3) فتح البيان (٤/ ٢٢٨_ ٢٢٩)
(4) تفسير الجلالين (١/ ١٨٢)

ظاہری اور باطنی گناہ کو چھوڑ دو:

یعنی کافروں کے بہکاوے پر نہ ظاہر میں عمل کرو نہ دل میں شبہہ رکھو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی پوشیدہ اور ظاہر طور پر معصیت کو ترک کر دو۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد نیت کرنا اور عمل کرنا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی قلیل وکثیر، چھپا اور کھلا گناہ سب چھوڑ دو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر گناہ کرنا ایسا ہے جیسے کسبیوں کے ساتھ زنا کرنا جو گھروں پر نشان کھڑا کرتی ہیں۔ باطن گناہ چھپی آشنائی اور یاری ہے خلیلات، صدائق اور اخدان (چھپے ہوئے یار داشتائیں) سے خانگیوں کی طرح۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر گناہ محرموں سے نکاح کرنا ہے۔[1]

صحیح یہ ہے کہ آیت ان سب صورتوں کے لیے عام ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ [الأعراف: ٣٣] ''کہہ دیجیے: بے شک میرے رب نے بے حیائی کی باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے، چاہے وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی۔'' اسی لیے یہ فرمایا کہ جو لوگ کسبِ گناہ کرتے ہیں، ان کو ان کے کسب کی سزا ملے گی، یعنی خواہ وہ کسب ظاہر ہو یا خفیہ۔ نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اثم کیا چیز ہے؟ فرمایا: جو کھٹکے تیرے سینے میں اور تو لوگوں کا اس پر مطلع ہونا برا جانے۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ظاہر وہ گناہ ہے جو اعضا کا فعل ہو، باطن وہ ہے جو قلب کا فعل ہو یا علانیہ اور چھپا ہوا، یا ظاہر اور مخفی زنا یا ظاہر ماں بیٹی سے نکاح کرنا اور باطن حرام کاری کرنا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاہر وہ کسبیاں ہیں جو چکلے میں بیٹھتی ہیں، باطن خانگیاں ہیں جن سے مرد آشنائی اور مخفی دوستی رکھتے ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے: ﴿لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ﴾ [النساء: ٢٢] ''ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہے۔'' اور: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [النساء: ٢٣] ''تم پر حرام کی گئی ہیں تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور تمھاری بھتیجیاں اور تمھاری بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں، اور تمھاری

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٧٢۔ ٧٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٢٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٣) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٨)

بیویوں کی مائیں اور تمھاری وہ سوتیلی بیٹیاں جو تمھارے ہاں پرورش پائیں اور ان عورتوں کے پیٹ سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہو، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمھارے صُلبی بیٹوں کی بیویاں اور تمھارا دو بہنوں کو جمع کرنا (بھی حرام ہے) مگر جو پہلے گزر گیا سو گزر گیا۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔''

ان میں سے کسی عورت سے نکاح کرنا باطن زنا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ ظاہر اثم طواف میں برہنہ اور ننگا ہونا ہے اور باطن زنا ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ یہ ممانعت عام ہے تمام محرمات میں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے، کیونکہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ظاہر اور باطن کو اثم کے ساتھ اس لیے متعلق کیا ہے کہ گناہ کا سبب انہی دونوں میں سے ہوتا ہے۔ پھر جو لوگ اثم کے کاسِب (مرتکب) ہیں ان کو جزا اور سزا کی وعید سنائی کہ اللہ پر اس افترا پردازی کا بدلہ ملے گا، وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ بات آئی گئی ہوگئی۔[2]

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٢١﴾

اور تم اس (جانور) کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ پڑھا گیا ہو، کیوں کہ یہ (کھانا) یقیناً نافرمانی ہے، اور بے شک شیاطین اپنے دوستوں کے ذہنوں میں شبہے ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں، اور اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو بلاشبہ تم بھی ضرور مشرک ہوگے ﴿121﴾

جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اس کے کھانے کے متعلق فقہی آرا:

یعنی شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے اللہ کے پوجے، بلکہ یہ بھی شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔ جس کا یہ مذہب ہے کہ ذبیحہ حلال نہیں، جبکہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے گو ذبح کرنے والا مسلمان ہے، اس کی دلیل یہی آیت ہے، مگر ائمہ کے تین قول ہیں: ایک یہ کہ ذبیحہ بایں صفت حلال نہیں ہے، خواہ عمداً اللہ کا نام لینا چھوڑ دیا ہو یا بھول کر، یہی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما، نافع، شعبی اور ابن سیرین رحمہ اللہ کا قول ہے اور ایک روایت میں امام مالک اور احمد رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

متقدمین اور متاخرین کے ایک گروہ نے اسی قول کی تائید کی ہے۔ یہی امام ابوثور، داود ظاہری اور ابو الفتوح طائی شافعی رحمہ اللہ کا اپنی کتاب ''اربعین'' میں مختار ہے کہ اس مذہب پر ان کی حجت یہی آیت باب ہے۔ دوسری دلیل آیتِ صید ہے: ﴿فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ﴾ [المائدة: ٤] ''پس وہ جس شکار کو

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٧٣۔ ٧٤) [2] فتح البيان (٤/ ٢٣٠)

تمھارے لیے پکڑ رکھیں، اس پر اللہ کا نام پڑھو اور اس میں سے کھاؤ۔‘‘

پھر اس آیت میں ﴿ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ﴾ بطور تاکید ارشاد کیا ہے۔ ضمیر ’’اکل‘‘ کی طرف یا ذبح لغیر اللہ کی طرف پھرتی ہے۔ تیسری دلیل وہ حدیثیں ہیں جن میں تسمیہ کا حکم آیا ہے کہ ذبیحہ اور صید پر اللہ کا نام لو، عدی بن حاتم اور ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی مثل: ’’إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ وَذَكَرْتَ اسْمَ اللّٰهِ فَكُلْ مَآ أَمْسَكَ عَلَيْكَ‘‘ ’’جب تو اپنے سکھائے ہوئے کتے کو شکار کے پیچھے بھیجے اور تو نے اس پر اللہ کا نام ذکر کر لیا ہو تو جو وہ تمھارے لیے روک رکھے اسے کھا۔‘‘ یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن سے فرمایا: ((لَكُمْ كُلُّ عَظْمٍ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ))[2] ’’تمھارے لیے ہر وہ ہڈی ہے جس پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا۔‘‘ (رواہ مسلم) جندب بن سفیان بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا وہ اُس کے بجائے دوسرا جانور ذبح کرے اور جس نے ذبح نہ کیا، یہاں تک کہ ہم نے نماز پڑھی تو وہ اللہ کے نام پر ذبح کرے۔[3] (أخرجاہ) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس ایک قوم گوشت لاتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں، فرمایا: تم اس پر اللہ کا نام لو اور کھا لو۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ وہ کفر کے ساتھ تازہ عہد تھے۔[4] (رواہ البخاري)

وجۂ دلالت یہ ہے کہ صحابہ نے سمجھا کہ تسمیہ کہنا ضروری ہے اور ڈرے کہ انھوں نے اسلام میں نئے نئے داخل ہونے کے سبب سے نہ کہا ہو۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو احتیاط کی خاطر یہ حکم دیا کہ وہ کھانے کے وقت خود بسم اللہ کہہ لیں، تاکہ ذبح کے وقت اگر تسمیہ چھوڑ دیا گیا ہو تو اس کا بدل ہو جائے۔ اور ان کو حکم دیا کہ مسلمین کے احکام کو راستی کے طریقے پر جاری کریں۔ واللہ أعلم.

دوسرا مذہب:

اس مسئلے میں دوسرا مذہب یہ ہے کہ تسمیہ شرط نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے، اگر عمداً یا بھولے سے چھوٹ گیا ہے تو کچھ مضر نہیں۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ اور جمیع اصحابِ شافعی کا مذہب ہے۔ اور ایک روایت امام مالک، احمد رحمہ اللہ اور سیدنا ابن عباس، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ سے بھی حکایت کی گئی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق آیتِ باب کو ذبح لغیر اللہ پر محمول کیا ہے: ﴿ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٤٥] ’’یا وہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٣، ٥١٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٩۔ ١٩٣٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥٠) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٦٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٨٨)

فسق ہو کہ (ذبح کرتے وقت) اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔'' امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیتِ باب ان ذبیحوں کی ممانعت کرتی ہے جن کو قریش بتوں کے لیے ذبح کرتے تھے اور مجوس کے ذبیحوں کی ممانعت ہے۔[1]

یہ مسلک جس پر شافعی رحمہ اللہ چلے ہیں، قوی ہے۔ بعض متاخرین نے قصد کیا ہے کہ اس مسلک کی تقویت اس طرح کریں ﴿ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ﴾ میں حرف واؤ حالیہ ہے، یعنی مت کھاؤ، اس کو جس پر تسمیہ کا ذکر نہیں کیا گیا، درحالیکہ وہ فسق ہے اور فسق جب ہی ہو گا کہ ﴿ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ ہو۔ پھر یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ معنی متعین ہیں، اس لیے کہ اگر واؤ کو عاطفہ کہیں گے تو عطف جملہ اسمیہ خبریہ کا جملہ فعلیہ طلبیہ پر لازم آئے گا، لیکن اس دعوے پر یہ نقص وارد ہوتا ہے کہ آیتِ کریمہ: ﴿ إِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ إِلٰٓى أَوْلِيَآئِهِمْ ﴾ میں لامحالہ واؤ عاطفہ ہے۔ سو اگر واؤ حالیہ صحیح ٹھہرے گا تو اس کا عطف اس پر ممتنع ہو گا اور اگر طلبیہ پر معطوف ہو گا تو جو اعتراض اس کے غیر پر وارد ہوتا ہے، وہی اس پر بھی وارد ہو گا اور اگر واؤ حالیہ نہیں ہے تو سرے ہی سے قولِ مذکور باطل ہے۔ واللہ أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ غیر مذکور تسمیہ سے مراد مردار ہے۔[2] اس مذہب پر دلیل صلت سدوسی تابعی ثقہ سے مروی حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے، اس نے اگر اللہ کا نام ذکر کیا یا نہ کیا۔ وہ اگر نام لے گا تو اللہ ہی کا لے گا۔[3] (رواه أبو داود مرسلاً) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب مسلمان نے ذبح کیا اور اللہ کا نام نہ لیا تو کھائے، اس لیے کہ مسلمان میں اللہ کا ایک نام ہے۔[4] دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہلے گزر چکی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ « سَمُّوْا أَنْتُمْ وَكُلُوْا »[5] ''تم نام لے لو اور کھا لو۔'' سو اگر وجودِ تسمیہ شرط ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو رخصت نہ دیتے مگر تسمیہ کے حق کے ثابت ہو جانے پر۔ واللہ أعلم.

اس مذہب پر تیسرا مذہب یہ ہے کہ بھول کر تسمیہ کا چھوٹ جانا کچھ مضر نہیں اور اگر عمداً ترک کیا ہے تو ذبیحہ حلال نہیں، مشہور مذہب مالک، احمد، ابوحنیفہ، اصحابِ ابی حنیفہ اور ابن راہویہ کا یہی ہے۔ سیدنا علی، ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابن میسب، عطاء، طاؤس، حسن، ابو مالک، ابن ابی لیلیٰ، جعفر بن محمد اور ربیعہ رحمہم اللہ سے اسی طرح نقل کیا گیا ہے۔ امام ابو الحسن مرغینانی رحمہ اللہ نے کتاب ہدایہ میں شافعی رحمہ اللہ کے قبل اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ عمداً تسمیہ ترک کر دینے سے ذبیحہ حرام ہے۔ اسی لیے ابو یوسف اور مشائخ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اگر حاکم حکم دیں کہ اس کی بیع جائز ہے تو وہ حکم بسببِ مخالفتِ اجماع نافذ نہ ہو گا، یہ قول سخت غریب ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس نے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٨)

[3] المراسيل لأبي داود (١/ ٢٧٨) یہ روایت مرسل ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٢٥٣)

[4] سنن الدارقطني (٤/ ٢٩٥) اس کی سند صحیح ہے۔ مزید دیکھیں: فتح الباري (٦/ ٦٢٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٨٨)

ذبیحہ ناسی (بھول کر تسمیہ ترک کرنا) کو حرام کیا وہ قول جمیع حجت سے باہر ہوا اور حدیث کے مخالف۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ مسلمان کو اُس کا نام کافی ہے، اگر ذبح کے وقت بھول گیا ہے تو اب اللہ کا نام لے کر کھا لے۔[2] (رواہ البیهقي) لیکن اس حدیث کا مرفوع ہونا غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ موقوف ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس پر نص کی ہے، امام شعبی اور ابن سیرین رحمہ اللہ اس ذبیحہ کو مکروہ کہتے تھے جس پر بھول کر اللہ کا نام نہ لیا گیا۔ سلف کراہت کا اطلاق اکثر تحریم پر کرتے تھے۔ واللہ أعلم

امام ابن جریر رحمہ اللہ کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک یا دو کا قول معتبر نہیں، جب کہ وہ جمہور کے خلاف ہو۔ جمہور کے قول کو ابن جریر اجماع گنتے ہیں۔ "فَلْيُعْلَمْ هٰذَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ" امام حسن رحمہ اللہ سے ایک شخص نے کہا کہ میرے پاس کچھ پرندے آئے ہیں، کسی پر اللہ کا نام لیا گیا اور کسی پر فراموش ہو گیا، وہ ملے جلے ہیں۔ کہا: "کُلْهُ کُلَّهُ" "وہ سب کے سب کھا۔" امام ابن سیرین رحمہ اللہ سے پوچھا تو کہا: اللہ نے کہا ہے: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ "اور تم اس (جانور) کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ پڑھا گیا ہو۔"[3]

اس مذہب کی ایک حجت وہ حدیث ہے، جو سیدنا عبداللہ بن عباس، ابو ہریرہ، ابو ذر، عقبہ بن عامر اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے سنن ابن ماجہ میں مرفوعاً روایت کی ہے: «إِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ»[4] "بے شک اللہ نے میری اُمت سے خطا اور نسیان معاف کر دیا ہے اور یہ بھی کہ انھیں مجبور کر دیا جائے۔" مگر اس احتجاج میں نظر ہے۔ واللہ أعلم. سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے بتائیں کہ ایک آدمی ہم میں سے ذبح کرتا ہے اور بسم اللہ کہنا بھول جاتا ہے، فرمایا: اللہ کا نام ہر مسلمان پر ہے۔[5] (رواہ ابن عدي) لیکن اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس مسئلے کو علاحدہ لکھا ہے۔ ائمہ کے مذاہب اور ان کے ماخذ ذکر کیے ہیں۔ ان کے دلائل اور مناقضات اور معارضات کی وجوہات ذکر کی ہیں۔[6]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اہلِ علم کا اختلاف ہے کہ اس کا حکم منسوخ ہے یا نہیں۔ بعض

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٨٥)

[2] سنن البیهقي الکبریٰ (٩/ ٢٣٩) اس کی سند میں "محمد بن یزید" متکلم فیہ راوی ہے۔ البتہ اس روایت کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: نصب الرایة (٤/ ٢٤٧)

[3] تفسیر الطبري (١٢/ ٨٤)

[4] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (٢٠٤٥، ٢٠٤٤، ٢٠٤٣) سنن البیهقي الکبریٰ (٧/ ٣٥٧ـ ٦/ ٨٤) صحیح الجامع، رقم الحدیث (١٧٣١)

[5] الکامل لابن عدي (٦/ ٣٨٤) سنن الدارقطني (٤/ ٢٩٥) اس کی سند میں "مروان بن سالم" سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغلیل (٨/ ٢٥٣)

[6] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٢٨ـ ٢٣٠)

نے کہا ہے کہ اس میں سے کوئی شے منسوخ نہیں، بلکہ سب محکم ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وعامہ اہلِ علم کا یہی قول ہے۔ امام عکرمہ اور حسن بصری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأنعام: ١١٨] ''چناں چہ تم اس (جانور) کا گوشت کھاؤ جس پر اللہ کا نام پڑھا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان لانے والے ہو۔'' پھر فرمایا: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ﴾ (آیتِ باب) یہ نسخ ہوا۔ پھر اس سے استثنا کیا گیا: ﴿ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ﴾ [المائدۃ: ٥] ''اور اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔''[1]

امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے یہ آیت اتاری: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ﴾ (آیتِ باب) پھر اس کو منسوخ فرما کر مسلمانوں پر رحم کیا اور یوں فرمایا: ﴿ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ [المائدۃ: ٥] ''آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔'' سو اگلی آیت کو اس سے منسوخ کر دیا اور اہلِ کتاب کے طعام کو حلال ٹھہرایا۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے طعام کی حلت اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کی تحریم کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔[3] ان کا یہ قول صحیح ہے سلف میں جس نے اس جگہ پر منسوخ ہونے کا اطلاق کیا ہے، اُس کی مراد کسی خاص چیز سے ہے۔ واللّٰہ أعلم.

شیطان کی وحی:

ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ مختار کو یہ زعم ہے کہ اس کو وحی آتی ہے۔ کہا: سچ کہتا ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ ﴾ (آیتِ باب) ابو زمیل رحمہ اللہ نے کہا: میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا تھا کہ مختار بن ابی عبیدہ حج کو آیا، ایک آدمی نے کہا کہ اس کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اسے وحی آتی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سچ کہتا ہے، اُس آدمی نے کہا: کیا وہ سچ کہتا ہے: کہا: ''هُمَا وَحْيَانِ وَحْيُ اللّٰهِ وَ وَحْيُ الشَّيْطَانِ'' ''وحی دو قسم کی ہے، اللہ کی وحی اور شیطان کی وحی۔'' اللہ کی وحی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آئی، شیطان کی وحی اولیائے شیطان کو آتی ہے، پھر آیتِ باب پڑھی۔[4]

مجادلہ سے مراد:

مجادلہ سے یہ مراد ہے کہ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ ہم اپنا مارا کھاتے ہیں اللہ کا مارا نہیں کھاتے،

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٨٧)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٨۔ ١٣٧٩)
[3] تفسير الطبري (١٢/ ٨٨)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٩)

اس پر یہ آیت آئی۔[1] مگر اس میں نظر ہے۔ اس لیے کہ یہود مردار کو مباح نہیں کہتے کہ مجادلہ کریں۔ دوسرے یہ آیت مکی ہے، تیسرے حدیث مذکور مرسل ہے۔ ترمذی نے اس کو بلفظ مرفوع روایت کیا ہے مگر حسن غریب بتایا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ﴾ (آیتِ باب) فارس نے قریش کو کہلا بھیجا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاصمہ کرو اور یہ کہو کہ جس کو تم چھرے سے اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے ہو وہ حلال ہے اور جس کو اللہ نے شمشیرِ زر سے حلال کیا یعنی مردار، وہ حرام ہے، اُس پر یہ آیت اتری کہ شیطان اپنے رفیقوں کو وحی کرتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑا اور بحث کریں۔ شیاطین فارسی ٹھہرے اور ان کے اولیا قریش ہوئے۔[3] (رواه الطبراني)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کہتے ہیں کہ اللہ کا مارا ہوا مال نہ کھاؤ، جس کو تم ذبح کرو اس کو کھاؤ، اس پر یہ آیت آئی۔[4] (رواه أبو داود و ابن ماجه وهذا إسناده صحيح) اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی طرق سے روایت کیا ہے، مگر اس میں یہود کا ذکر نہیں ہے۔ محفوظ اسی طرح ہے، اس لیے کہ آیت مکی ہے اور یہود مردار کو پسند نہیں کرتے۔ بعض الفاظ میں یوں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”إِنَّ الَّذِيْ قَتَلْتُمْ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، وَإِنَّ الَّذِيْ مَاتَ لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ“ ”جس کو تم قتل کرتے ہو اس پر اللہ کا نام ذکر کیا جاتا ہے اور جو خود مر جاتا ہے اس پر اللہ کا نام ذکر نہیں کیا جاتا۔“

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکوں نے مسلمانوں سے یہ بات کہی کہ تم کو یہ زعم ہے کہ تم اللہ کی مرضی کے تابع ہو، سو تم اللہ کا مارا ہوا تو کھاتے نہیں اور جس کو تم حلال کرتے ہو وہ کھاتے ہو، اس پر اللہ نے فرمایا کہ اگر تم مردار کھانے میں ان کی اطاعت کرو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ یہی امام مجاہد و ضحاک رحمہما اللہ اور بہت سے علمائے سلف کا قول ہے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی جب تم نے اللہ کے حکم اور شریعت کی نافرمانی کی اور غیر کے قول کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر مقدم کیا تو یہی شرک ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ٣١] ”انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور درویشوں کو (اپنا) رب بنا لیا۔“ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا عَبَدُوْهُمْ“ ”اے اللہ کے رسول! انھوں نے ان کی عبادت نہیں کی تھی۔“ فرمایا: ﴿ إِنَّهُمْ أَحَلُّوْا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٧٨) [2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٦٩)

[3] المعجم الكبير (١١/ ٢٤١) اس کی سند میں ”موسیٰ بن عبدالعزیز“ متکلم فیہ راوی ہے۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨١٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٧٣) مستدرك الحاكم (٤/ ١٢٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [5] تفسير الطبري (١٢/ ٧٨۔ ٨٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٣١۔ ٢٣٢)

لَهُمُ الْحَرَامَ وَحَرَّمُوْا عَلَيْهِمُ الْحَلَالَ فَاتَّبَعُوْهُمْ»[1] ''انھوں نے ان کے لیے حرام کردہ چیز کو حلال کر دیا اور حلال کو حرام کر دیا اور انھوں نے ان کی بات مان لی، یہی ان کی عبادت تھی۔''

معلوم ہوا کہ کسی عالم اور درویش کا مقلد ہونا گو وہ کتنا ہی بڑا امام یا پیر کیوں نہ ہو، شرک ہے۔ جب غیر کی بات گلے اتری اور اللہ اور رسول کا قول اس کے مقابلے میں قابلِ قبول نہ سمجھا گیا گو کسی تاویلِ فاسد یا رائے کاسد (کھوٹی) ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہو تو اس مولوی، ملا، فقیر یا پیر کی پیروی شرک فی العبادت ہے۔ یہ مرتبہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے کلام ہی کا ہے کہ ان کی بات کے آگے دم مارنے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ باقی ساری مخلوق کا قول مقبول بھی ہوسکتا ہے اور مردود بھی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے اس ذبیحے کو کھانے سے منع کیا ہے جس پر اس کا نام نہیں لیا گیا۔ یہ دلیل ہے کہ جس پر ذبح کے وقت اللہ کا نام ذکر نہیں کیا گیا، اس کا کھانا حرام ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور فقہا کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ یہی داود ظاہری رحمہ اللہ کا قول بھی ہے کہ جس ذبیحے پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، اس کا کھانا حرام ہے، بغیر فرق کیے ہوئے کہ ایسا عمداً ہوا یا بھولے سے ہوا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ آیت کا اطلاق ذبح لغیر اللہ پر ہے، یہ آیت کو بغیر مخصص کے خاص کرنا ہے۔ ہاں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث اس بات پر مفید ہے کہ اگر یہ شبہہ ہو کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا تھا یا نہیں تو اس صورت میں کھاتے وقت اللہ کا نام لے لینا کافی ہے۔[2] پھر اللہ نے مشرکین کی اطاعت پر شرک کا حکم لگایا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے کوئی شے حلال کی جو اللہ نے حرام کی تھی یا حرام کی جو اللہ نے حلال کی تھی تو وہ مشرک ہے۔[3] اُس کا نام مشرک اس لیے رکھا کہ اُس نے اللہ کے سوا ایک اور حاکم ثابت کیا۔[4]

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا، اور ہم نے اس کے لیے نور بنا دیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے، (کیا) وہ اس شخص جیسا (ہوسکتا) ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں؟ اسی طرح کافروں کے لیے ان کاموں میں کشش رکھی گئی ہے جو وہ کرتے ہیں (122)

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٥) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ١١٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٣٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٩٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٨٨) [3] معاني القرآن (٢/ ٢٨٧) [4] فتح البيان (٤/ ٢٣٠_ ٢٣٢)

کافر اور مومن کی مثال:

اوپر مُردے کا ذکر تھا، یہاں کافر پر وہی مثال بیان فرمائی، یعنی اول جہالت میں سب مردے تھے، پھر جس کو ایمان ملا وہ زندہ ہوا اور روشنی پائی کہ اُس کے منہ پر سب لوگ ایمان کی روشنی دیکھتے ہیں اور جس کو ایمان نہ ملا وہ اندھیروں میں پڑا رہا۔ یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے اس شخص کی بیان کی جو مردہ تھا گمراہی میں ہلاک اور حیران تھا، اس کے دل کو ایمان اور ہدایت سے زندہ کیا، رسولوں کی اتباع کی توفیق بخشی، وہ راہ یاب ہوا، راستے پر چل نکلا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نور سے مراد قرآن ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: اسلام ہے،[1] دونوں قول درست ہیں۔ سو کہاں یہ مومن اور کہاں وہ شخص جو مختلف جہالتوں، خواہشات اور گمراہیوں میں پھنسا ہوا ہے، اس کو نہ کوئی نکلنے کی راہ ملتی ہے نہ کوئی راستہ، جدھر سے وہ نکل جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢٥٧] ''اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے دوست طاغوت ہیں، وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں، وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الملك: ٢٢] ''بھلا جو شخص اوندھا ہو کر اپنے چہرے کے بل چلتا ہو، وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے یا وہ جو بالکل سیدھا ہو کر صراطِ مستقیم پر چلتا ہو؟'' نیز فرمایا: ﴿ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [هود: ٢٤] ''دونوں فریقوں کی مثال ایسے ہے جیسے اندھا اور بہرا، اور دیکھنے والا اور سننے والا، کیا (اس) وصف میں دونوں برابر ہیں؟ کیا پھر تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿٢٢﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴾ [الفاطر: ١٩۔ ٢٣] ''اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں (ہو سکتے)۔ اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی۔ اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔ اور نہ زندے اور نہ مردے برابر ہو سکتے ہیں، بے شک اللہ جسے چاہے سنوا دیتا ہے اور آپ ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں۔ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں۔'' آیات اس بارے میں بہت ہیں، مناسبت کی وجہ نور و ظلمات ہیں، سورت کے شروع میں اللہ کے قول: ﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ [الأنعام: ١] کے تحت گزر چکی ہیں۔

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٩١)

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دو خاص مرد ہیں: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ میت تھے، اللہ نے اُن کو زندہ کر کے ایسا نور بخشا جس کو لوگوں میں لیے پھرتے تھے، یا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ شخص جو اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکا وہ ابو جہل عمرو بن ہشام ۔لعنہ اللہ۔ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آیت عام ہے ہر مومن اور کافر اس میں داخل ہے۔ کفار جس حالت وضلالت میں گرفتار ہیں، وہ اللہ کی تقدیر اور حکمتِ بالغہ کے تحت ان کی نظروں میں خوب چیز ہے۔

مسند احمد میں مرفوع حدیث ہے کہ اللہ نے خلق کو اندھیرے میں پیدا کیا، پھر ان پر اپنا نور چھڑکا جس کو وہ نور پہنچا اس نے راہ پائی جو چوک گیا وہ گمراہ ہوا،[1] جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۷] ''وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۝ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴾ [الفاطر: ۱۹۔ ۲۰] ''اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں (ہو سکتے)۔ اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی۔''

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اس جگہ میت سے مراد کافر ہے جس کو اسلام و ہدایت دے کر زندہ کیا۔ یا جب نطفہ تھا مردہ تھا، جب روح پھونکی تو زندہ ہوا۔ مگر پہلا مفہوم زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ سیاق مومنین کو مشرکین کی اتباع سے نفرت دلانا ہے۔ حیات کا استعارہ ہدایت اور علم کے لیے اور جہالت و کفر کے لیے موت کا استعارہ بہت آیا ہے۔ نور، ہدایت اور ایمان سے عبارت ہے، یا قرآن سے، یا حکمت سے، یا وہ نور مراد ہے جو ﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ ﴾ [التحریم: ۸] ''ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا۔'' میں ہے، یا یقین مراد ہے۔ سو کہاں یہ شخص منور اور کہاں وہ شخص جو کفر، جہالت اور عدمِ بصیرت کے اندھیروں میں گم ہے، کسی حال میں ان اندھیروں سے باہر نہیں آ سکتا؟!

بعض نے کہا ہے کہ مراد حمزہ رضی اللہ عنہ اور ابو جہل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ اور ابو جہل ہیں، یا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور ابو جہل ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی: «اَللّٰهُمَّ أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِأَبِيْ جَهْلٍ أَوْ بِعُمَرَ»[2] ''اے اللہ! اسلام کی مدد کر ابو جہل یا عمر کے ساتھ۔'' امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل ہیں۔ حق یہی ہے کہ آیت ہر مومن اور کافر کے حق میں عام ہے۔ حسن رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] پھر فرمایا کہ زینت دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ شیطان ہے۔ آیت اہلِ سنت کے مذہب کے موافق ہے۔[4] وللّٰہِ الْحَمْد

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٢) مسند أحمد (٢/ ١٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٧٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٣) اس کی سند میں ''نضر بن عبد الرحمٰن ابو عمر'' متروک راوی ہے۔ البتہ اسی موضوع کی دوسری روایت صحیح ہے۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٢٥)

[3] تفسير الخازن (٢/ ١٧٩)

[4] فتح البيان (٤/ ٢٣٣۔ ٢٣٤)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا
فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا
جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ
اللّٰهِ ؔؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ
اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا کہ وہ اس (بستی) میں اپنے مکر وفریب کا جال پھیلائیں، اور وہ اپنے آپ ہی سے مکر وفریب کرتے ہیں اور وہ شعور نہیں رکھتے (123) اور جب ان کے پاس نشانی آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ ایسی ہی چیز خود ہمیں دی جائے جیسی رسولوں کو دی گئی۔ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس کو سونپے۔ جن لوگوں نے جرم کیے انھیں جلد ہی اللہ کے ہاں ذلت ملے گی اور اس مکر وفریب کی وجہ سے شدید عذاب ہوگا جو وہ کرتے رہے (124)

اکابر مجرم اور ان کے حیلے، سازشیں:

یعنی ہمیشہ کافروں کے سردار حیلہ نکالتے ہیں، تاکہ عوام الناس پیغمبر کے مطیع نہ ہو جائیں، جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ جادو کے زور سے سلطنت لینا چاہتا ہے۔ اللہ نے فرمایا: اے پیغمبر! جس طرح تمھارے شہر میں بڑے بڑے مجرم اور رئیس ہیں جو کفر کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور تمھاری مخالفت اور عداوت پر آمادہ کرتے ہیں، اسی طرح تم سے پہلے انبیا اس بلا میں مبتلا ہوتے تھے، لیکن انجام انھی کے لیے تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٣١] ”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن مجرموں میں سے بنائے، اور آپ کا رب ہادی اور مددگار کافی ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٦] ”اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے متکبر امراء کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں نافرمانی کرنے لگتے ہیں، چناں چہ اس بستی پر (عذاب کی) بات ثابت ہو جاتی ہے، تب ہم اسے مکمل طور پر تباہ کر ڈالتے ہیں۔“ یعنی ہم نے ان کو طاعت کا حکم دیا، انھوں نے اُس کے خلاف کیا، ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا یا ان کو حکم دیا اندازے کا حکم، جس طرح کہ اس جگہ فرمایا: ﴿ لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ﴾۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہم نے ان میں سے برے لوگوں کو مسلط کیا، انھوں نے نافرمانی کی جب نافرمان ہوئے تو ہم نے ان کو عذاب سے تباہ و برباد کر دیا۔[1]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٨٣) اس کی سند حسن ہے۔

امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ اکابر سے مراد عظما (بڑے لوگ) ہیں[1] اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝۳۴ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ [سبا: ۳٤۔ ۳۵] ”اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا (رسول) بھیجا تو اس کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا: بلاشبہ جس چیز کے ساتھ تمھیں بھیجا گیا ہے ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور انھوں نے کہا: ہم (تم سے) مال اور اولاد میں زیادہ ہیں اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۲۳] ”اور اسی طرح آپ سے پہلے ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا، تو ان کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا: بلاشبہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا، اور ہم تو انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔“

اس جگہ مکر سے مراد اُن اکابر کا اپنے ملمع قول وفعل سے لوگوں کو ضلالت کی طرف بلانا ہے جس طرح اللہ نے قومِ نوح کے حال کی خبر دی ہے: ﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴾ [نوح: ۲۲] ”اور انھوں نے بڑے بڑے مکر کیے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ اِۨالْقَوْلَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ۝۳۱ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ۝۳۲ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ﴾ [سبا: ۳۱۔ ۳۳] ”اور (اے نبی!) کاش آپ دیکھیں! جب ظالم لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، جبکہ ان کا بعض بعض کی بات رد کر رہا ہوگا تو جو لوگ (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے، وہ ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: اگر تم نہ ہوتے تو یقیناً ہم مومن ہوتے۔ وہ لوگ جو تکبر کرتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو کمزور سمجھے جاتے تھے: کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا جب وہ تمھارے پاس آ گئی تھی؟ بلکہ تم (خود ہی) مجرم تھے۔ اور وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: (نہیں) بلکہ (تمھاری) رات اور دن کی چالوں ہی نے (ہمیں روکا تھا) جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں۔“

سفیان نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں مکر آیا ہے وہ عمل ہے۔[2] اللہ نے کہا ہے کہ اس مکر اور اضلال کا

---

[1] تفسير الطبري (۱۲/ ۹٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ۱۳۸۳)

وبال انہی مکاروں کی جان پر پڑتا ہے، گو وہ نہ جانیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ [العنکبوت: ۱۳] ''اور یقیناً وہ اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ ضرور اُٹھائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴾ [النحل: ۲۵] ''اور کچھ ان کے بوجھ بھی (اٹھائیں)، جنھیں وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، جان لو! برا بوجھ ہے جو وہ اُٹھاتے ہیں۔''

رسالت کا انتخاب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے:

یہ وہ مکار ہیں کہ جب ان کے پاس کوئی آیت و برہان و حجتِ قاطعہ آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان نہیں لاتے، جب تک فرشتے رسالت لے کر ہمارے پاس نہ آئیں، جس طرح رسولوں کے پاس آتے ہیں۔ اللہ جل جلالہ کے اس قول کے مطابق: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ﴾ [الفرقان: ۲۱] ''اور ان لوگوں نے کہا: جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے: ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کیے گئے یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟'' اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کس جگہ رسالت رکھی جائے اور خلق میں سے کون شخص رسول بنانے کے لائق ہے۔ اللہ کے قول کے مطابق: ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾ [الزخرف: ۳۱۔ ۳۲] ''اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟ کیا وہ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟'' مطلب یہ کہ قرآن اترا تھا تو کسی بڑے آدمی، کبیر جلیل جو لوگوں کی نظروں میں معظم و مکرم ہوتا اس پر اترتا۔

﴿ اَلْقَرْيَتَيْنِ ﴾ سے مراد مکہ و طائف ہے۔ یہ ان کم بختوں نے اس لیے کہا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کو بغاوت، حسد، دشمنی اور تکبر کے طور پر حقارت سے دیکھتے تھے (قبحهم الله) جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے: ﴿ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ [الأنبیاء: ۳۶] ''اور جب کافر آپ کو دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو مذاق ہی کا نشانہ بناتے ہیں (کہتے ہیں:) کیا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر (اہانت سے) کرتا ہے؟ جبکہ وہ خود رحمان کے ذکر کے منکر ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴾ [الفرقان: ۴۱] ''اور (اے نبی!) جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو ہنسی مذاق کا نشانہ بناتے ہیں (اور کہتے ہیں:) کیا یہی ہے وہ جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [الأنبیاء: ۴۱] ''اور (اے نبی!) بلاشبہ آپ سے پہلے بھی رسولوں سے استہزا کیا گیا، پھر جن لوگوں نے ان (رسولوں) سے تمسخر کیا، انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔''

رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ نسب کا اعتراف:

اس کے ساتھ ان کو اس بات کا اقرار تھا کہ نبی اکرم ﷺ فضیلت اور بزرگی والے، نسب اور خاندان کی شرافت کے لحاظ سے بلند مرتبے والے ہیں، یہاں تک کہ وحی نازل ہونے سے پہلے آپ کو امین کہتے تھے۔ کافروں کے سردار ابوسفیان نے ہرقل بادشاہِ روم کے سامنے اس امر کا اعتراف کیا تھا، جب اس نے کہا: "كَيْفَ نَسَبُهُ فِيكُمْ" اس کا نسب تم میں کیسا ہے؟'' تو جواب دیا: "هُوَ فِينَا ذُو نَسَبٍ" ''وہ ہم میں نسب والا ہے۔'' اس نے پوچھا: بھلا تم اس کے دعوائے نبوت سے پہلے اس پر جھوٹ کا الزام بھی لگاتے تھے؟ کہا: نہیں .... الحدیث۔[1] انہی سوالات اور جوابات کی وجہ سے روم کے بادشاہ نے نبی اکرم ﷺ کی طہارت اور نبوت کی سچائی اور رسالت کی حقانیت پر استدلال کیا۔

واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو چن لیا، پھر بنی اسماعیل سے بنی کنانہ کو، پھر ان سے قریش کو، پھر قریش سے بنی ہاشم کو، پھر مجھ کو بنی ہاشم میں سے چن لیا۔[2] (انفرد به مسلم) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ میں بنی آدم سے قرناً بعد قرنٍ بہترین قرون میں سے مبعوث ہوا ہوں، یہاں تک کہ میں اس قرن سے اٹھا جس میں ہوں۔[3]

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بعض باتیں جو لوگ کہتے تھے، وہ نبی اکرم ﷺ کو پہنچیں، آپ ﷺ نے منبر پر چڑھ کر فرمایا کہ میں کون ہوں؟ سب نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں۔ کہا: میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں۔ اللہ نے خلق بنائی، مجھ کو بہترین خلق میں کیا، پھر خلق کو دو فریق ٹھہرایا، مجھ کو بہتر فرقے میں کیا، پھر قبائل پیدا کیے، مجھ کو بہتر قبیلے میں کیا۔ ان قبائل کو بیوت (گھر) ٹھہرایا، یعنی کئی خاندان بنائے، مجھ کو بہتر خاندان میں کیا۔ سو میں خاندان اور ذات کی راہ سے تم سب سے بہتر ہوں۔[4] (رواه أحمد) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مرفوعاً کہتی ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ میں نے زمین کے سارے مشارق اور مغارب کو الٹا پلٹا کسی باپ کی اولاد کو بنی ہاشم سے افضل تر نہیں پایا۔[5] (رواه الحاكم والبيهقي)

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ نے بندوں کے دلوں میں نظر کی۔ محمد ﷺ کے دل کو بندوں کے دلوں میں سے بہترین پایا، اپنے نفسِ مبارک کے لیے چن لیا اور رسول بنا کر بھیجا۔ پھر محمد ﷺ کے بعد بندوں کے دلوں میں نظر کی تو اصحاب کے دلوں کو بندوں کے دلوں میں سے بہترین پایا، ان کو اپنے نبی کا وزیر ٹھہرایا، وہ دینِ پیغمبر پر لڑتے ہیں، سو جس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٦) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦٤)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٣٢) مسند أحمد (١/ ٢١٠) اس کی سند میں ''یزید بن ابی زیاد'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٠٧٣)

[5] دلائل النبوة للبيهقي (١/ ١٧٦) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٠٤٦)

چیز کو مسلمان اچھا دیکھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جس چیز کو برا دیکھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے۔[1] (رواہ أحمد)

اس اثر میں مسلمانوں سے مراد صحابہ ہیں، نہ کہ نام کے مسلمان جو قیامت تک ہونے والے ہیں۔ صحابہ اسی چیز کو اچھا جانتے تھے جو سنتِ مطہرہ کے مطابق ہوتی تھی اور جو بات سیرتِ ہدی اور نبی اکرم ﷺ کے دل کے خلاف ہوتی وہ ان کو بری لگتی، اس کو بدعت اور گمراہی جانتے۔ ابن ابی حسین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو مسجد کے دروازے میں جاتے ہوئے دیکھا، رعب میں آیا، کہا: یہ کون شخص ہیں؟ لوگوں نے کہا: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹے ہیں۔ اس نے کہا: ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ (آیتِ باب)۔[2]

مجرموں کی سزا ذلت و رسوائی:

اس کے بعد اللہ نے یہ وعید شدید اور سخت ڈانٹ فرمائی کہ جن لوگوں نے جرم کیے ہیں، ان کو ذلت کی مار ہو گی، اس لیے کہ وہ رسولوں کی اتباع اور فرماں برداری سے تکبر کرتے تے، اس غرور کا بدلہ یہی ہے کہ ذلیل و خوار ہوں۔ ان کے لیے یہ ذلت ہمیشہ کی ہو گی، جس طرح دنیا میں زندگی بھر تکبر کرتے رہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' یعنی ذلیل، حقیر اور بے وقعت ہو کر۔ مکر خفیہ طور پر ہوتا ہے، اس لیے کہ حیلوں بہانوں اور دھوکے بازی میں باریکی کی جاتی ہے، لہٰذا مکر کا عذاب بھی سخت قرار پایا ہے، تاکہ جزا پوری طرح ملے۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، جیسے اس نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴾ [الطارق: ٩] ''جس دن راز ظاہر کر دیے جائیں گے۔''

صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے: «يُنْصَبُ لِكُلِّ غَادِرٍ عِنْدَ اسْتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ هَذَا غَدْرَةُ فُلَانِ ابْنِ فُلَانٍ»[3] ''قیامت کے دن ہر دھوکے باز کی پیٹھ پر ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ فلاں بن فلاں کی بے وفائی اور عہد شکنی ہے۔'' اس میں حکمت یہ ہے کہ غدر ایک مخفی چیز ہے جس کی لوگوں کو اطلاع نہیں، اس لیے قیامت کے دن عہد شکن کے فعل کو ظاہر کرنے کے لیے ایک نشان کھڑا کریں گے، یہ اس کے فعل کی پوری سزا ہو گی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یوں ہیں: اکابر اکبر کی جمع ہے، اکبر سردار اور عظیم کو کہتے ہیں۔ اکابر کا ذکر بالخصوص اس لیے کیا کہ فساد، عہد شکنی اور باطل کی ترویج پر جو قدرت ان کو ہوتی ہے وہ کسی اور کو نہیں ہوتی۔ سرداری اس قدرت کا

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٧٩) یہ روایت موقوف ہے۔ نیز اس کی سند حسن ہے۔ (مجمع الزوائد: ١/ ٤٢٨)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٨٣۔ ١٣٨٤) [3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٨٢٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٣٨)

سبب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عادتِ شریفہ اس طرح جاری ہے کہ ہر بستی میں رسولوں کے پیروکار کمزور لوگ ہوتے ہیں۔ فاسق اور لوگوں کو ہانکنے والے یہ بڑے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ مجرمین کو اکابر کہا، کیوں کہ ان کی سعت اور فراخی مکر و کفر کو پسند کرنے والوں تک ہوتی ہے۔ مکر کہتے ہیں: دھوکا، حیلہ، فجور، فریب، دغا بازی، بے ایمانی، بد دیانتی، بے امانتی، خیانت، غیبت، چغل خوری، جھوٹی قسمیں، باطل کو رواج دینا اور جھوٹی گواہی دینا وغیرہ۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مکر سے مراد جھوٹ ہے۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت مذاق کرنے والوں کے بارے میں اتری ہے۔[2] بعض نے کہا کہ معنی یہی ہیں کہ لوگوں پر جبر کریں، معاصی بجا لائیں۔ اس کی دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ [الشوریٰ: ٢٧] ''اور اگر اللہ اپنے (تمام) بندوں کے لیے رزق فراغ کر دیتا تو وہ زمین میں ضرور سرکشی کرتے۔'' لیکن مکر کا وبال مکار ہی پر پڑتا ہے، اگرچہ وہ نہ سمجھے۔ پھر جب کوئی حجتِ بینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر کوئی واضح دلیل آتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم اس کو نہیں مانتے، ہمارے پاس بھی کوئی ایسی نشانی آئے جیسی رسولوں کے پاس آئی ہے، تب ہم مانیں۔ ان کا یہ کہنا بطور حسد تھا یا یہ مطلب کہ ہم اس وقت قرآن کو سچا کہیں گے اور تمھاری پیروی کریں گے کہ جب جبریل ہم سے آ کر کہہ جائیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور یہ کتاب اللہ کا کلام ہے۔ مطلب یہ کہ جب تک ہم خود انبیائے متبوعین نہ بنیں نہ کہ تابعین، تب تک ہم تمھاری بات نہ مانیں گے۔ یہ ان کی جہالت اور اکھڑپن کی ایک عجیب وغریب قسم ہے۔ اس کی مثال یہ آیت ہے: ﴿ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴾ [المدثر: ٥٢] ''بلکہ ان میں سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ اسے کھلے صحیفے دیے جائیں۔''

بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ ان دونوں اسمِ مبارک یعنی جلالتین کے درمیان وقف کرنا مسنون ہے، دعا قبول ہوتی ہے۔ شاید یہ بات تجربے سے معلوم ہوئی ہو گی۔ ورنہ ماثورات میں کہیں اس کا اتا پتا نہیں۔ مستحقِ رسالت کون ہے، یہ اللہ ہی کو معلوم ہے، جس کو امانت دار دیکھا، سچا، پاک صاف رسالت کے قابل اور نبوت کا مستحق پایا اس کو اختیار کیا۔ اس میں کسی مخلوق کا کیا عمل دخل ہے کہ فلاں کیوں رسول ہوا اور فلاں کیوں نہ ہوا یا ہم کیوں نہ ہوئے۔ اللہ جسے چاہے چن لے، پسند کر لے، اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اس کام کے لیے موزوں پایا اور حبیب ٹھہرایا، پھر اس کا جھگڑا کیا؟! امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی طرف بلایا، کہنے لگے کہ اگر یہ حق ہے تو ہم میں اس سے زیادہ تر مستحق لوگ ہیں۔[3] وہ کیوں رسول نہ ہوا اور یہ ہوا؟! اللہ نے کہا: ٹھہرو مجرموں کو اس مکر کے عوض سخت عذاب ہو گا۔[4]

---

[1] تفسیر الخازن (٢/ ١٧٩) [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٩٤) [3] الدر المنثور (٣/ ٣٥٣) [4] فتح البیان (٤/ ٢٣٤۔ ٢٣٦)

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

چناں چہ اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا سینہ بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے وہ آسمان میں چڑھ رہا ہو، اسی طرح اللہ ان لوگوں پر پلیدی (مسلط) کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے ﴿125﴾

ہدایت و گمراہی اللہ کی طرف سے ہے:

پہلے فرمایا تھا کہ کافر قسمیں کھاتے ہیں کہ ایک آیت دیکھیں تو البتہ یقین لائیں اور آپ فرمایا تھا کہ اگر ہم ایمان نہ دیں گے تو کیسے لائیں گے؟ درمیان میں مردہ حلال کرنے کے حیلے نقل کیے، اب اس بات کا جواب فرمایا کہ جس کی عقل اس طرف چلی کہ اپنی بات نہ چھوڑے، جو دلیل دیکھے کچھ حیلہ بنا لے وہ گمراہی کا نشان ہے۔ اور جس کی عقل انصاف اور حکم برداری پر چلی وہ ہدایت کا نشان ہے۔ ان لوگوں میں گمراہی کے نشان ہیں، ان کو کوئی آیت اثر نہ کرے گی۔ شرح صدر سے یہ مراد ہے کہ اسلام پر نشاط کے ساتھ چلنا آسان ہو جاتا ہے، یہ خیر کی علامات ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلٰمِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ [الزمر: ٢٢] ”کیا پھر جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہے۔“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمٰنَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴾ [الحجرات: ٧] ”لیکن اللہ نے ایمان کو تمھارا محبوب بنا دیا ہے اور اس نے اسے تمھارے دلوں میں آراستہ پیراستہ کر دیا ہے اور اس نے تمھارے لیے کفر و فسق اور نافرمانی کو ناپسند بنا دیا ہے (اور) یہی لوگ رُشد و ہدایت والے ہیں۔“

شرح صدور کا مفہوم:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی اللہ توحید اور ایمان کے لیے اُس کا دل وسیع کر دیتا ہے۔ یہی ہے ابو مالک اور غیر واحد کا قول[1] اور یہی ظاہر ہے۔ ابو جعفر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: مومنوں میں کون بڑا عقل مند ہے؟ فرمایا: جو موت کو بہت یاد کرتا ہے یا موت کے بعد کی تیاری بہت کرتا ہے۔ پھر اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ شرح صدر کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: ایک نور ہے جو سینے کے اندر ڈال دیا جاتا ہے، اس سے سینہ کشادہ اور فراخ ہو جاتا ہے، کہا: اس کی کچھ نشانی ہے؟ یعنی پہچان جس سے معلوم ہو۔ فرمایا: دارِ خلود (آخرت) کی طرف رجوع کرنا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٨٤ـ ١٣٨٥)

دارِغرور (دنیا) سے کنارہ کش ہونا اور موت کے لیے تیار ہونا موت سے ملاقات سے پہلے۔ (رواہ عبد الرزاق)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ابو جعفر مدائن میں رہتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے ابو جعفر مذکور کی روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے آیتِ باب پڑھ کر فرمایا کہ جب ایمان دل میں داخل ہوتا ہے تو اس کے لیے دل کھل جاتا ہے اور کشادہ ہو جاتا ہے، کہا: اے اللہ کے رسول! اس کے لیے کوئی علامت ہے؟ فرمایا: ہاں: «اَلْإِنَابَةُ إِلىٰ دَارِ الْخُلُوْدِ، وَالتَّجَافِيُ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ، وَالْإِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ الْمَوْتِ» ''دار الخلود کی طرف رجوع اور دارِغرور سے کنارہ کشی اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنا۔'' (رواہ ابن جریر)

''عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً بلفظ قَالَ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰذِهِ الْاٰيَةَ: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! مَا هٰذَا الشَّرْحُ؟ قَالَ: نُوْرٌ يُّقْذَفُ فِي الْقَلْبِ، قَالُوْا: فَهَلْ لِّذٰلِكَ مِنْ إِمَارَةٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالُوْا: وَمَا هِيَ؟ قَالَ الْإِنَابَة ......الخ''[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا دَخَلَ النُّوْرُ الْقَلْبَ اِنْفَسَحَ وَانْشَرَحَ، قَالُوْا: فَهَلْ لِّذٰلِكَ مِنْ عَلَامَةٍ يُّعْرَفُ بِهَا؟ قَالَ: الْإِنَابَةُ إِلىٰ دَارِ الْخُلُوْدِ، وَالتَّنَحِّي عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ، وَالْإِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ الْمَوْتِ''[2]

اس کو بھی ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور دوسری وجہ سے متصل مرفوع ہے، اس لفظ سے: ''قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! وَكَيْفَ يُشْرَحُ صَدْرُهٗ؟ قَالَ: يَدْخُلُ فِيْهِ النُّوْرُ فَيَنْفَسِحُ. قَالُوْا: وَهَلْ لِّذٰلِكَ عَلَامَةٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟! قَالَ: اَلتَّجَافِيُ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ، وَالْإِنَابَةُ إِلىٰ دَارِ الْخُلُوْدِ، وَالْإِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ أَنْ يَّنْزِلَ الْمَوْتُ''[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''فهذه طرق لهذه الحديث مرسلة ومتصلة يشد بعضها بعضا. والله أعلم''[4] ان الفاظ کا ترجمہ وہی ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔

تنگیِ سینہ:

ضیق صدر یہ ہے کہ سینہ ہدایت کے لیے کشادہ نہ ہو۔ ایمان میں سے کوئی شے اس کی طرف نہ جائے اور اس

---

[1] تفسیر الصنعاني (٢/ ٢١٧۔ ٢١٨) تفسیر الطبري (١٢/ ٩٨۔ ١٠٠) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٨٤) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز اس کی سند میں ''ابو جعفر عبداللہ بن مسور'' سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ مذکورہ روایت پر تفسیر طبری میں کلام دیکھیں۔

[2] تفسیر الطبري (١٢/ ١٠٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا اپنے باپ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ نیز ''سعید بن عبد الملک'' ضعیف راوی ہے۔

[3] مستدرك الحاكم (٤/ ٣٤٦) شعب الإيمان (٧/ ٣٥٢) اس کی سند میں ''عدی بن فضل'' متروک راوی ہے۔

[4] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٣٥۔ ٢٣٦) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہ بات محلِ نظر ہے۔

میں نفوذ نہ کرے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک جنگل کے گنوار سے، جو قبیلہ مدلج کا تھا، پوچھا: حرج کیا ہے؟ کہا: وہ درخت جو اشجار کے درمیان ہو، کوئی چرنے والا یا وحشی جانور اس تک نہ پہنچ سکے نہ کوئی اور شے پہنچ سکے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہی منافق کے دل کا حال ہے کہ خیر میں سے کوئی شے اس تک نہیں پہنچ سکتی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ اسلام کو اس پر تنگ کر دیتا ہے، حالانکہ اسلام واسع ہے: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج: ۷۸] ''اور اس نے دین میں تمھارے لیے کوئی تنگی نہیں رکھی۔'' ''أَيْ فِي الْإِسْلَامِ مِنْ ضِيْقٍ''[2]

امام مجاہد اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ''ضیقاً حرجاً'' سے مراد خاردار ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: یعنی خیر کے لیے اس میں کوئی منفذ (گزرنے کی جگہ) نہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: تنگ ہے، یعنی لا إله إلا الله کہنے سے یہ کلمہ اس کے دل میں نہیں جا سکتا، گویا اس کی شدت سے آسمان پر چڑھتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی مسلک (راستہ) اور مصعد (چڑھنے کی جگہ) نہیں پاتا۔[3] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: گویا ضیق صدر سے آسمان پر چڑھتا ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: اس کی مثل ویسی ہے کہ آسمان پر چڑھ نہ سکے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: جس طرح آدمی آسمان پر نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح توحید اور ایمان اُس کے دل میں داخل نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ اللہ ہی اس کے دل میں ڈالے۔[5] امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کے سینے کو اللہ نے مردہ کیا اس سے کب بن سکتا ہے کہ مسلمان ہو۔[6]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے اس کافر کے دل کی بیان کی ہے کہ وہ سختی اور تنگی کی وجہ سے ایمان کو جذب نہیں کر سکتا۔ سو اس کی مثال ایمان کو قبول کرنے کے بارے میں اس کے دل کی تنگی گویا اسے ایمان لانے سے منع کرتی ہے، یعنی جس طرح وہ آسمان کی طرف بلند ہونے سے عاجز ہے، اسی طرح ایمان قبول کرنے سے بھی عاجز ہے۔ یہ معاملہ اس کی وسعت اور طاقت میں نہیں ہے۔ سو جس طرح اللہ جس کسی کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے، اسی طرح شیطان کو اس پر اور اس جیسوں پر جو اللہ اور رسول پر ایمان نہیں لاتے، مسلط فرما دیتا ہے۔ وہ شیطان اُس کو اغوا (گمراہ) کرتا ہے اور اللہ کے راستے سے روکتا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رجس شیطان ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ رجس ہر وہ چیز ہے جس میں کچھ خیر نہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رجس عذاب ہے۔[7]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ شرح شق کو کہتے ہیں۔ اصل میں بمعنی توسع (وسیع) ہے۔ شرح سے مراد بیان کرنا اور واضح کرنا ہے، یعنی اللہ پاک جس کو حق کی ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ کھول دیتا ہے، وہ حق کو کشادہ دل کے

(1) تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۰٤) اس کی سند میں ''عبداللہ بن عمار'' مجہول راوی ہے۔
(2) تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۰٤۔ ۱۰۵) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۳۸۵) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
(3) تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۰۵۔ ۱۰٦) (4) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۳۸٦)
(5) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۳۸٦) اس کی سند میں ''حفص بن عمر'' ضعیف راوی ہے۔
(6) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۳۸٦) (7) تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۰۹۔ ۱۱۱)

ساتھ قبول کرتا ہے۔ اس بارے میں ابو جعفر رحمہ اللہ سے مروی حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ یہ ابو جعفر مدائنی بنی ہاشم میں سے ایک شخص ہیں، محمد بن علی نہیں ہیں۔ یہ حدیث کئی طرق سے آئی ہے، اس کے بعض طرق بعض کو تقویت دیتے ہیں، طریق متصل طریق مرسل کو قوت دیتا ہے۔ اس تفسیر ہی کی طرف اس کا مطلب جاتا ہے، یعنی شرح صدر سے اصل مراد یہی ہے کہ دل دنیا سے بیزار، آخرت کے لیے بے قرار اور مرنے کو تیار ہو۔ ورنہ جو دل حق قبول کرنے سے بعید ہے اس میں ایمان نہیں جاسکتا۔ یہ وہی دل ہے جس کے گمراہ کرنے کا اللہ نے ارادہ کیا ہے۔ حرج تنگی کی شدت کو کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرج تمام تنگیوں سے زیادہ تنگی ہے۔[1] کلبی نے کہا: یعنی اس میں خیر گزرنے کی جگہ نہیں۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی جب اللہ کا ذکر سنتا ہے تو دل ہٹ جاتا ہے، جب بتوں کا ذکر سنتا ہے تو جی خوش ہو جاتا ہے۔[2] آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ساری اشیا اللہ کی مشیت اور ارادے سے ہوتی ہیں، یہاں تک کہ مومن کا ایمان اور کافر کا کفر۔ کافر کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کو کسی ایسی چیز کی تکلیف دی جاتی ہے، جس کی اسے طاقت نہیں، یعنی ایمان اُس کے دل پر ایسا گراں ہے جیسے آسمان پر چڑھنا مشکل ہے۔ رجس لغت میں بدبو کے معنی میں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے رجس دنیا میں لعنت کے معنی میں آخرت میں بہ معنی عذاب،[3] یعنی جو لوگ ایمان نہیں لاتے، اللہ ان پر لعنت کرتا ہے، یا عذاب نازل فرماتا ہے، یا شیطان مسلط کر دیتا ہے، یا ان پر کفر کی نجاست اور بدبو ڈالتا ہے، یہ سب رجس کے معنی ہیں اور سب غیر مومن پر صادق آتے ہیں۔[4]

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۲۶ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۲۷

اور یہ آپ کے رب کا سیدھا راستہ ہے، ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں (126) انھی کے لیے ان کے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کاموں کی وجہ سے ان کا دوست ہے جو وہ کرتے رہے (127)

قرآن صراطِ مستقیم ہے اور اس کے پیروان کا صلہ جنت ہے:

یعنی حکم برداری اور عقل کو دخل نہ دینا سیدھی راہ ہے۔ اللہ نے جب گمراہوں اور اللہ کے راستے سے روکنے والوں کا بیان کر دیا تو اب ہدایت اور دینِ حق، جو رسالت کا سب سے اشرف مقصد ہے، کی تنبیہ فرمائی۔ کہا کہ یہ دین جس کو اے پیغمبر! ہم نے تیرے لیے مشروع کیا اور یہ قرآن اتارا، اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ یہی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ

---

[1] معاني القرآن (٢/ ٢٩٠) [2] تفسير البغوي (٣/ ١٨٦)
[3] معاني القرآن (٢/ ٢٩٠) [4] فتح البيان (٤/ ٢٣٦_ ٢٣٧)

سے مروی حدیث میں قرآن کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: "هُوَ صِرَاطُ اللّٰهِ الْمُسْتَقِيمُ، وَحَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِينُ، وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ" یہ اللہ کا سیدھا راستہ، اللہ کی مضبوط رسی اور وہ حکمت والا ذکر ہے۔" (رواه أحمد والترمذي بطوله)[1]

تفصیلِ آیات سے مراد ان کی وضاحت کرنا، بیان کرنا اور فہم اور عقل رکھنے والے لوگوں کے لیے اس کی تفسیر کرنا ہے۔ ایسے لوگ جو اللہ اور رسول کی بات سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قیامت میں سلامتی کا گھر ہے، یعنی جنت۔ بہشت کو دار السلام اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا میں جس راہِ راست پر چلتے تھے، رسولوں اور انبیا کے آثار اور طریقوں کے پیرو تھے، وہ سلامتی کا راستہ تھا۔ سو جس طرح یہاں یعنی دنیا میں کجروی کی آفات سے بچے رہے، اسی طرح اب سلامتی کے گھر میں پہنچے۔ اللہ کا نام سلام ہے، وہ اُن کا ولی ہے، یعنی محافظ اور مددگار۔ یہ گھر ان کو ان کے اعمالِ صالحہ کے بدلے میں ملا ہے۔ اللہ نے متولی ہو کر ثواب میں ان کو جنت عطا کی۔ وللّٰه الحمد

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ صراط سے اس جگہ مراد قرآن ہے، اس لیے کہ وہ اپنے تابع اور عامل کو سیدھی اور صاف راہ پر لگا دیتا ہے۔ قومِ ذاکر سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین بالاحسان رحمہم اللہ ہیں، یعنی جب تک وہ اس (احسان) میں رہیں۔ جنت ہر مکروہ چیز سے سلامتی والا گھر ہے۔ جمہور مفسرین کا یہی قول ہے۔ یا سلام کے نام کا گھر ہے جو اُن کے رب نے ان کے لیے ذخیرہ کر رکھا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دار السلام جنت ہے۔ سیدنا جابر بن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلام اللہ کا نام ہے۔[2] امام سدی اور حسن رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اللہ سلام ہے، اُس کا گھر جنت ہے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ سلام سے مراد تحیت (السلام علیکم کہنا) ہے، یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اللہ اُن کو خیر پہنچانے میں ان کا متولی ہے، جو ان اعمال کے سبب انھیں ملے گی، جن سے وہ دنیا میں اللہ کا تقرب حاصل کرتے تھے۔[4]

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُم مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٨﴾

اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا (تو فرمائے گا:) اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں میں سے بہت زیادہ (گمراہ) کیے تھے، اور انسانوں میں سے ان کے دوست کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٠٦) اس کی سند میں "حارث اعور" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٣٩٣)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٨٧) [3] تفسير الخازن (٢/ ١٨٢) [4] فتح البيان (٤/ ٢٣٨)

ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھایا، اور ہم اس میعاد کو پہنچے جو تونے ہمارے لیے مقرر فرمائی تھی، اللہ فرمائے گا: آگ ہی تمھارا ٹھکانا ہے، تم اس میں ہمیشہ رہو گے، ہاں اگر اللہ چاہے (تو دوسری بات ہے)، بے شک آپ کا رب بڑا حکمت والا، خوب جاننے والا ہے ﴿128﴾

شیطانوں کے پجاری جہنمی ہیں:

دنیا میں انسان بت پوجتے ہیں، وہ حقیقت میں جن ہیں، اس خیال پر کہ وہ ہماری حاجت پوری کر دیں گے، ان کو نیازیں چڑھاتے ہیں، جب آخرت میں وہ جن اور انسان برابر پکڑے جائیں گے، تب یوں عذر کریں گے کہ ہم نے پوجا نہیں، لیکن آپس کی کارروائی کر لی۔ اور یہ جو فرمایا کہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے مگر جو اللہ چاہے، یہ اس واسطے کہ اگر دوزخ کا عذاب دائمی ہے تو اسی کے چاہنے سے ہے، وہ چاہے تو موقوف کرے، لیکن ایک چیز چاہ چکا ہے۔ اللہ نے نبی مکرم ﷺ سے کہا: تم ان مشرکوں سے جو باتیں کہتے رہتے ہو ان میں ایک یہ بات بھی ان کو سنا دو کہ قیامت میں حشر انسانوں اور جنوں، دونوں کا ہو گا۔

عابد اور ان کے معبودانِ باطل دونوں یکجا جمع ہوں گے، انسانوں نے جن جنّوں کو دنیا میں پوجا ہے یا ان کی اطاعت کی ہے۔ بعض نے بعض کو وحی زخرف القول (ملمع کی ہوئی باتیں) کی ہے، یہ سب ایک جگہ ہوں گے۔ ہم جنوں سے کہیں گے کہ تم نے بہت سے انسانوں کو اغوا (پھسلا کر) کر کے بہکا دیا، جیسے اس آیت میں ہے: ﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿60﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿61﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴾ [يٰسٓ: ٦٠۔ ٦٢] ''اے بنی آدم! کیا میں نے تمھیں (اس بات کی) تاکید نہیں کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، بلاشبہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ تم میری ہی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ اور بلاشبہ اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے؟''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ استکثارِ اِنس سے مراد یہی ہے کہ بہت سے بے شمار آدمیوں کو جنّوں نے گمراہ کر دیا۔ یہی مجاہد، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول ہے۔[1] اِنس نے جواب دیا کہ ہاں، ہمارے بعض نے بعض سے فائدہ حاصل کیا، یعنی دنیا میں جو حکم جنوں نے دیا وہ آدمیوں نے کیا۔ ضلالت کو انسانوں نے جنوں سے سیکھا۔ ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جاہلیت میں جب کوئی شخص کسی زمین پر اترتا، اُس وادی کے کبیر سے پناہ مانگتا، یہ ان کا استمتاع تھا۔ وہ کہتا: ''أَعُوذُ بِكَبِيرِ هٰذَا الْوَادِيْ'' ''میں اس وادی کے کبیر سے پناہ مانگتا ہوں۔'' سو یہی عذر قیامت کے دن کریں گے۔[2] جن کا انسانوں سے استمتاع یہ تھا کہ انسانوں سے اپنی تعظیم کراتے، یہ (انسان) جنوں سے مدد مانگتے، خود

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ١١٥۔ ١١٦) [2] تفسیر الطبري (١٢/ ١١٦)

مکرم و معظم بنتے، ان کو حقیر و ذلیل ٹھہراتے۔ حالانکہ انسان تمام مخلوقات سے اشرف ہے، کیا جن اور کیا جن۔

اجل سے مراد موت ہے، یعنی یہاں تک کہ آپس میں ایک دوسرے سے کارروائی کی کہ موت آ گئی۔ اس عذر کا یہ جواب ملے گا کہ تمھارا اور ان کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے، اب ہمیشہ اس میں رہو، مگر جو اللہ چاہے۔ بعض نے کہا کہ یہ استثنا برزخ کا ہے یا دنیا کی مدت کو لوٹانا، یعنی خلودِ نار میں یہ مدت مستثنیٰ ہے، باقی سارا زمانہ جہنم میں رہنے کا ہو گا۔ اس کے سوا اور بھی اقوال ہیں جن کا ذکر سورت ہود میں آئے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ ایک ایسی آیت ہے کہ کسی کو لائق نہیں کہ اللہ پر اُس کی مخلوق کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے اور انھیں جنتی یا دوزخی بنا دے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ معشر جماعت کو کہتے ہیں، معاشر جمع ہے۔ جن سے اس جگہ مراد شیاطین ہیں، یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ شیطانوں سے کہے گا کہ تم نے خوب ہی انسانوں سے فائدہ اٹھایا، یعنی ان سے اپنی فرماں برداری لی یا ان کو ایسا گمراہ کیا کہ وہ تمھارے تابع داروں میں ہو گئے۔ مراد ان کو ڈانٹنا ڈپٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴾ [الجن: ٦] ''اور بے شک انسانوں کے کچھ مرد جنوں کے کچھ مردوں کی پناہ پکڑتے تھے، تو انھوں نے ان کو سرکشی میں بڑھایا'' سفر میں جب کسی آدمی کا گزر کسی جنگل میں ہوتا تو وہ کہتا: ''أَعُوْذُ بِرَبِّ هٰذَا الْوَادِيْ مِنْ جَمِيْعِ مَا أَحْذَرُ'' ''میں اس وادی کے رب کی پناہ چاہتا ہوں، ان تمام چیزوں سے جن کا مجھے ڈر ہے۔''

رب سے اُس وادی کا جن مراد ہوتا۔ یا انسانوں کا جنوں سے فائدہ حاصل کرنا اس طرح ہوتا کہ جو جھوٹی باتیں اور ڈرانے والی باتیں اور جادو جن ان پر القا کرتے، اُس سے وہ لذت حاصل کرتے اور کچھ کمائی بھی کر لیتے، جس طرح کاہن لوگ کیا کرتے۔ اجل کے پہنچ جانے سے مراد قیامت کا دن ہے، یعنی اب وہ وقت سامنے آ گیا جو ہمارے لیے مقرر تھا اور ہم اس کو جھٹلاتے تھے۔ امام حسن اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اجل موت ہے۔[2] کسی نے کہا دوبارہ جی اٹھنے اور حساب کا وقت ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ہمارا وہ ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کرنا ایک مدت معین تک تھا، پھر جاتا رہا، اپنے حال پر حسرت اور افسوس کے لیے ہوگا۔ حسرت و ندامت باقی رہے گی۔ اللہ فرمائے گا کہ تمھارا مقام اور ٹھہرنے کی جگہ، منزل اور ٹھکانا یہی آگ ہے، اب ہمیشہ اس میں مقیم رہو۔

اِلا ما شاء اللہ کا مطلب سیوطی نے یہ کیا ہے کہ کل اوقات میں آگ میں ہمیشہ رہیں گے مگر اتنے وقت میں کہ اللہ ان کو آگ سے باہر یا دور رکھنا چاہے۔[3] امام محلی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ١١٨) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٨٨) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسير الخازن (٢/ ١٨٣) [3] تفسير الجلالين (١/ ١٨٤)

مخالف ہے: ﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ﴾ [المائدة: ٣٧] ''وہ آگ سے نکلنا چاہیں گے مگر وہ اس میں سے نہیں نکل سکیں گے۔'' اس جگہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے اور تفسیر در منثور میں سلف سے یہ نقل کیا ہے کہ کفار ہر گز آگ سے باہر نہیں نکلیں گے۔[1]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: استثنا سے مراد قیامت کا دن ہے، یعنی قبروں سے حشر ہونے سے لے کر حساب کتاب کے بعد آگ کے داخل ہونے تک کی مدت میں مخلد نہ ہوں گے۔[2] یہ قول بھی ٹھیک نہیں، اس لیے کہ استثنا خلودِ دائم سے ہے۔ سو ہنوز آگ میں داخل نہیں ہوا ہے، اس پر یہ صادق نہیں آتا۔ کسی نے کہا: مستثنیٰ نار ہے، یعنی بعض اوقات میں دوسری طرح کا عذاب ہوگا نہ کہ نار کا، جیسے: زمہریر وغیرہ۔ امام نسفی اور شہاب رحمہما اللہ اسی طرف گئے ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ حرف مَا بجائے مَنْ ہے، یعنی مستثنیٰ اہلِ ایمان ہیں۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما و جمہور و کرخی رحمہم اللہ نے کہا ہے: یعنی اللہ نے جس کا مومن ہونا چاہا ہے وہ آگ میں داخل نہ ہوگا۔[4] یا مستثنیٰ وہ مدت ہے جو دنیا میں بغیر عذاب کے گزری، یہ سب تاویلات تکلف ہیں۔ کافروں کے آگ میں ہمیشہ رہنے کے متعلق آیات اور احادیث آئی ہیں، سو عام اور خاص کے درمیان کچھ تعارض نہیں ہوتا، خصوصاً جبکہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہو۔ اس استثنا کی تفصیل سورت ہود میں اس آیتِ کریمہ کے ذیل میں آئے گی: ﴿ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ﴾ [هود: ١٠٧] ''وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین (باقی) رہیں گے، مگر یہ کہ آپ کا رب (کچھ اور) چاہے۔''[5]

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝١٢٩

اور اسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض پر ان کاموں کی وجہ سے مسلط کر دیتے ہیں جو وہ کرتے رہے ﴿129﴾

ظالموں کا ایک دوسرے پر مسلط ہونا:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ لوگوں کا میل ان کے اعمال سے ملائے گا۔ مومن ولی ہے مومن کا، کہیں ہو۔ کافر ولی ہے کافر کا، کوئی ہو، کہیں ہو۔ ایمان محض آرزوؤں اور آراستہ ہونے سے ہاتھ نہیں آتا، اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ بعض ظالموں کو بعض کا والی کر دے گا، دوزخ کی آگ میں ایک کے پیچھے دوسرا جائے گا۔[6] مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے زبور میں پڑھا ہے کہ میں منافقوں کا منافقوں سے انتقام لیتا ہوں، پھر سارے منافقوں سے انتقام لوں گا۔ یہ بات اللہ کی کتاب میں ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ

[1] الدر المنثور (٣/ ٧١۔ ٧٢) [2] معاني القرآن (٢/ ٢٩١۔ ٢٩٢)
[3] تفسير النسفي (١/ ٣٤٥) حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤)
[4] تفسير القرطبي (٧/ ٨٤) تفسير الخازن (٢/ ١٨٣) [5] فتح البيان (٤/ ٢٣٨۔ ٢٤٠) [6] تفسير الطبري (١٢/ ١١٩۔ ١٢٠)

﴿بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (آیتِ باب) ظالمین سے مراد ظالمینِ اِنس اور ظالمینِ جن ہیں۔[1]

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "ظَالِمِي الْإِنْسِ وَظَالِمِي الْجِنِّ" پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴾ [الزخرف: ٣٦] "اور جو رحمان کے ذکر سے اندھا (غافل) ہو جائے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔" پھر کہا: "نُسَلِّطُ ظَلَمَةَ الْجِنِّ عَلٰى ظَلَمَةِ الْإِنْسِ"[2] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ أَعَانَ ظَالِماً سَلَّطَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ»[3] "جس نے ظالم کی اعانت کی اللہ اُسی کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔" (وهذا حديث غريب) بعض شعرا نے کہا ہے:

وَمَا مِنْ يَدٍ إِلَّا يَدُ اللّٰهِ فَوْقَهَا   وَمَا مِنْ ظَالِمٍ إِلَّا سَيُبْلٰى بِظَالِمِ

"ہر ایک ہاتھ سے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے اور ہر کسی ظالم کا دوسرے ظالم سے پالا پڑتا ہے۔"

آیتِ کریمہ کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح خاسرینِ اِنس پر ہم نے اُس گروہِ جنّ کو والی کیا جس نے ان کو بہکایا، اسی طرح کا برتاؤ ہم ظالموں کے ساتھ بھی کرتے ہیں کہ بعض کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں، کسی کو کسی کے ہاتھ سے ہلاک کرا دیتے ہیں، کسی کا انتقام کسی سے لے لیتے ہیں۔ یہ ان کے ظلم اور سرکشی کا بدلہ ہوتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ جیسا معاملہ ہم نے انسانوں اور جنوں کے درمیان رکھا تھا، ویسا ہی ہم بعض ظالموں کو متولی کر دیتے ہیں کہ بعض ظالم بعض کے دوست دار ہو جاتے ہیں، پھر بعض بعض سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض ظالموں کو بعض ظالموں پر مسلط کر کے ہلاک وخوار کر دیتے ہیں،[4] اس بنا پر آیت میں ظالموں کو ڈانٹ ہے کہ جو کوئی اپنے ظلم سے باز نہ آئے گا تو اللہ کسی دوسرے ظالم کو اس پر مسلط کر دے گا۔ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تو دیکھے کہ کوئی ظالم کسی ظالم سے انتقام لیتا ہے تو ٹھہر کر تعجب کی نظر سے ذرا دیکھ لے۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ جب کسی قوم سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس پر نیک لوگوں کو والی کرتا ہے اور جب کسی قوم سے شر کا ارادہ کرتا ہے تو شریروں کو ان پر والی کرتا ہے۔[6] یہ سزا و جزا ان کے گناہوں کی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ دنیا میں بعض ظالموں کو بعض کا والی کرتا ہے اور اسی دوستی کی وجہ سے کسی کو کسی کا آگ میں پیرو کرتا ہے۔[7] امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے ان کو یعنی سلف کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب زمانہ فاسد ہو جائے گا تو شرار ان پر امیر ہوں گے۔[8]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٨٩) [2] تفسير الطبري (١٢/ ١١٩)

[3] تاريخ دمشق (٣٤/ ٤) اس کی سند میں "حسن بن علی بن زکریا" سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٩٣٧)

[4] تفسير الطبري (١٢/ ١١٩) [5] تفسير القرطبي (٧/ ٨٥) [6] تفسير البغوي (٣/ ١٨٩)

[7] تفسير البغوي (٣/ ١٨٩) [8] الدر المنثور (٣/ ٣٥٨) فتح البيان (٤/ ٢٤١)

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمھارے پاس تمھی میں سے رسول نہیں آئے تھے؟ وہ تم سے میری آیات بیان کرتے تھے اور تمھیں تمھاری اس آج کے دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے۔ (تب) وہ کہیں گے: ہم اپنے آپ پر گواہی دیتے ہیں۔ اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا، اور وہ اپنے آپ پر گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کفر کرنے والے تھے (130)

جن وانس کا رسولوں کے بھیجے جانے کا اعتراف کرنا:

اس سورت میں اوپر مذکور ہوا ہے کہ پہلے کافر اپنے کفر کا انکار کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ تدبیر سے ان کو قائل کرے گا۔ یہ کفارِ جن وانس کے لیے قیامت کے دن اللہ کی طرف سے ایک ڈانٹ ہے کہ اُن سے سوال کیا جائے گا، باوجود اس کے کہ اللہ کو اس بات کا علم ہوگا کہ رسولوں کے پیغامات ان جنوں اور انسانوں کو باقاعدگی سے پہنچ چکے تھے۔ یہ سوال بطور تقریر کے ہوگا، یعنی ان کے اقرار پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کی غرض سے۔

کیا جنوں میں بھی رسول مبعوث ہوئے؟

﴿ مِنْكُمْ ﴾ کے معنی میں ''مِنْ جُمْلَتِكُمْ'' ''تم سب سے'' اس لیے کہ رسول صرف انسان ہوئے ہیں نہ کہ جن۔ امام مجاہد، ابن جریج رحمہ اللہ اور بہت سے ائمہ سلف وخلف نے اس پر نص کی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسل بنی آدم سے ہوئے اور جن نُذُر (ڈرانے والے) ہوئے ہیں۔[1] ہاں ضحاک رحمہ اللہ نے یہ زعم کیا ہے کہ جنوں میں بھی رسل تھے۔[2] یہی آیت حجت ہے مگر اس میں نظر ہے، اس لیے کہ آیتِ کریمہ سے احتمال ہے صریح حکم نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمٰن: ۱۹۔ ۲۲] ''رحمان نے دو سمندر جاری کیے جو باہم ملتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے، وہ دونوں (اس سے) تجاوز نہیں کرتے۔ پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ان دونوں سمندروں سے موتی اور مرجان (مونگے) نکلتے ہیں۔'' حالانکہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ

---

[1] تفسير ابن كثير (۲/ ۲۳۹) [2] تفسير الطبري (۱۲/ ۱۲۱)

موتی اور مونگا دریائے شور سے نکلتا ہے نہ کہ شیریں سے اور یہ امر واضح ہے۔ وللّٰہ الحمد۔ یہی جواب بعینہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔[1]

اس بات پر کہ رسل صرف انسانوں سے ہوئے یہ آیت دلیل ہے: ﴿ اِنَّاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ كَمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ ۚ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ‌ ۚ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۝ وَرُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ‌ ۚ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ‌ؕ ﴾ [النساء: ۱۶۳۔ ۱۶۵] ''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داود کو زبور عطا کی۔ اور ہم نے کئی رسول بھیجے، اس سے پہلے ہم ان کا حال آپ کے سامنے بیان کر چکے ہیں اور کئی رسول ایسے ہیں کہ ان کا حال ہم نے آپ کے سامنے بیان نہیں کیا۔ اور اللہ نے موسیٰ سے (خاص طور پر) کلام کیا۔ اور خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھیجے، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کو الزام دینے کی کوئی گنجایش نہ رہے۔'' اور ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَجَعَلۡنَا فِىۡ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالۡكِتٰبَ ﴾ [العنکبوت: ۲۷] ''اور ہم نے اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔''

اس میں نبوت اور کتاب کو ابراہیم علیہ السلام کے بعد ذریتِ ابراہیم میں رکھا ہے۔ کسی شخص نے یہ نہیں کہا کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جن میں بھی نبوت تھی اور ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد منقطع ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمۡ لَيَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَيَمۡشُوۡنَ فِى الۡاَسۡوَاقِ‌ ؕ ﴾ [الفرقان: ۲۰] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، بلاشبہ وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى‌ ؕ ﴾ [یوسف: ۱۰۹] ''اور آپ سے پہلے ہم نے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے (اور) وہ بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔''

یہ بات معلوم ہے کہ جن اسباب میں انسانوں کے تابع ہیں، اسی لیے اللہ نے ان کے بارے میں یوں خبر دی ہے: ﴿ وَاِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَيۡكَ نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ‌ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوۡهُ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا‌ ۚ فَلَمَّا قُضِىَ وَلَّوۡا اِلٰى قَوۡمِهِمۡ مُّنۡذِرِيۡنَ ۝ قَالُوۡا يٰقَوۡمَنَاۤ اِنَّا سَمِعۡنَا كِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ يَهۡدِىۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ وَاِلٰى طَرِيۡقٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝ يٰقَوۡمَنَاۤ اَجِيۡبُوۡا دَاعِىَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوۡا بِهٖ يَغۡفِرۡ لَـكُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِكُمۡ وَيُجِرۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝ وَمَنۡ لَّا يُجِبۡ دَاعِىَ اللّٰهِ فَلَيۡسَ بِمُعۡجِزٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَيۡسَ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءُ‌ ؕ اُولٰٓـئِكَ فِىۡ

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۲۱۔ ۱۲۲)

﴿ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الأحقاف: ٢٩۔ ٣٢] ''اور (یاد کیجیے) جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا، جب کہ وہ قرآن سنتے تھے، پھر جب وہ اس (کی تلاوت سننے) کو حاضر ہوئے، تو (ایک دوسرے سے) کہا: خاموش رہو، چناں چہ جب (تلاوت) ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر پھرے۔ انھوں نے کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، وہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں، وہ حق کی طرف اور صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی بات کو قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمھارے لیے تمھارے (کچھ) گناہ بخش دے گا اور وہ تمھیں نہایت دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔ اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات قبول نہیں کرے گا تو وہ زمین میں (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکے گا اور اللہ کے سوا اس کا کوئی حمایتی نہیں ہوگا، یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔''

حدیثِ ترمذی وغیرہ میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان پر سورت رحمان پڑھی،[1] اس میں یہ بھی ہے: ﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ [الرحمٰن: ٣١۔ ٣٢] ''اے دو بھاری گروہو! (جن وانس) عن قریب ہم تمھارے (حساب کے) لیے فارغ ہوں گے۔ پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟'' اس جگہ یوں کہا کہ جن بولے: ہاں ہم نے اپنی جانوں پر اقرار کیا کہ رسولوں نے ہم کو رسالت پہنچا دی، اس دن کے سامنے آنے سے ڈرایا، یہ دن لامحالہ ہونے والا ہے، لیکن دنیا کی زندگانی نے ان کو دھوکا دیا۔ رسولوں کی تکذیب اور معجزوں کی مخالفت کر کے ہلاک ہوئے۔ دنیا کی زیب و زینت ملمع سازی اور خواہشاتِ نفسانی سے فریب کھا کر برباد ہوئے۔ قیامت میں اپنے کفر پر آپ گواہی دیں گے کہ ہاں وہ دنیا میں منکر تھے اور رسولوں کو نہیں مانتے تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اصل میں یہ خطاب انسانوں کو ہے گو اس کا اطلاق جنوں پر بھی ہوا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا﴾ [نوح: ١٦] ''اور اس نے ان میں چاند کو روشن بنایا۔'' حالانکہ چاند ایک ہی آسمان میں ہے نہ کہ سب آسمانوں میں۔ قَاص کہتے ہیں قصہ گو کو۔ اس جگہ قصے سے مراد کتابوں کی قراءت کرنا ہے جو توحیدِ الٰہی اور تصدیقِ رسالت پناہی پر دلیل ہیں۔ اس دن کفارِ انس و جن دو گواہی دیں گے: ایک یہ کہ رسولوں نے رسالت پہنچا دی، دوسرے یہ کہ ہم نے ان کو نہ مانا۔ رہا ان کا یہ کہنا: ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔'' سو وہ اس بات پر محمول ہے کہ قیامت کی بعض جگہوں پر وہ اقرار کریں گے اور بعض جگہ پر وہ انکار کریں گے، کیونکہ قیامت کا دن بہت لمبا چوڑا ہوگا، اس دن دلوں کا اضطراب، عقلوں کا طیش میں آنا، فہموں کا پھٹ جانا اور تبلّدِ اذہان انتہا درجے کو پہنچ جائے گا۔[2]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٥٠)
[2] فتح البيان (٤/ ٢٤٢۔ ٢٤٣)

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

یہ (رسول) اس لیے (بھیجے گئے) کہ آپ کا رب بستیوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے ہلاک کرنے والا نہیں، جب کہ ان کے باشندے غافل ہوں (131) اور ہر ایک کے لیے ان اعمال کی وجہ سے درجے ہیں جو انھوں نے کیے، اور آپ کا رب اس سے غافل نہیں جو وہ کرتے ہیں (132)

اللہ حجت قائم کیے بغیر تباہ نہیں کرتا:

اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ثقلین کا عذر رسول بھیج کر اور کتاب اتار کر قطع کر دیا، تاکہ کوئی فردِ بشر دعوت پہنچنے کے بغیر اپنے ظلم پر پکڑا نہ جائے، گرفتار نہ کیا جائے۔ کسی کو یہ کہنے کی گنجایش نہ رہے کہ ہم بغیر پیغمبر تھے یا ہم کو بغیر ہوشیار کرنے کے پکڑ لیا، نہیں بلکہ ساری امتوں سے عذر کر لیا، کسی ایک کو بھی عذاب نہیں کیا مگر رسول بھیجنے کے بعد، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾ [الفاطر: ٢٤] ''اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا (آیا) ہو۔'' خواہ رسول ہو یا خلیفۂ رسول اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

معلوم ہوا کہ نہ کوئی بستی نذیر سے اور نہ کوئی امت رسول سے بچی، بلکہ ساری خلق پر توحید کی حجت تبلیغِ رسالت اور نذرات سے قائم و دائم ہو چکی ہے۔ وللّٰه الحمد. اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥] ''اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ﴾ [الملك: ٨۔ ٩] ''جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے: کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! یقیناً ڈرانے والا ہمارے پاس آیا تھا'' اس بارے میں بہت سی آیات آئی ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیتِ باب کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ عذاب میں جلدی نہیں کرتا، یہاں تک کہ کسی کو بھیج کر اللہ کی حجتوں اور دلائل کے بارے میں متنبہ نہ کر دے اور قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرا نہ دے۔ یہ نہیں کہ غفلت میں ان کو پکڑ لے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تنبیہ کیے بغیر اور اپنے رسولوں اور آیات کے

ذریعے لوگوں کو نصیحت اور عبرت دلائے بغیر ازراہِ ظلم ہلاک نہیں کرتا، کیونکہ اللہ ظالم نہیں ہے۔ پھر پہلے معانی کو قابلِ ترجیح کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے معنی زیادہ قوی ہیں۔[1] واللہ أعلم

عامل کے عمل کے مطابق اس کا درجہ ہے:

پھر اللہ نے فرمایا کہ ہر عامل کے لیے خواہ مطیع ہو یا گناہ گار اس کے عمل کے مطابق مرتبہ اور منزل ہے، جس کو وہ حاصل کرے گا، نیک کے لیے نیک اور بد کے لیے بد۔ یا یہ معنی ہیں کہ کافر جنوں اور انسانوں کے لیے ان کے کفر کے حساب سے آگ میں درجات ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ ضِعْفٌ ﴾ [الأعراف: ۳۸] ''ہر ایک کے لیے دوگنا (عذاب) ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴾ [النحل: ۸۸] ''جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے۔'' یہ سب اے محمد! ان کی کرتوتوں اور عملوں کا نتیجہ ہے جن کو اللہ جانتا ہے۔ جس وقت وہ لوگ اللہ سے ملیں گے، وہ ان کے عمل کی جزا ان کو دے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ ان کا اپنی جانوں پر گواہی دینا یا ہمارا ان کے پاس رسولوں کو بھیجنا اس لیے ہے کہ اللہ کسی کو بغیر إعذار و إنذار (عذر دور کرنے اور ڈرانے) کے اور رسولوں کو بھیجنے اور کتابوں کو نازل کرنے کے بغیر ہلاک نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی غفلت کے بڑھ جانے کے بعد ہلاک کرتا ہے۔ یا کسی کو ظلم سے برباد نہیں کرتا، بلکہ وہ جب سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں اور ان کی غفلت بہت بڑھ جاتی ہے تب ہلاک کرتا ہے۔ یا اگر بعض ظالم ہیں اور بعض غافل تو بھی ہلاک نہیں کرتا، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [الفاطر: ۱۸] ''اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔''

جن ہو یا انسان ہر ایک کے لیے درجے مقرر ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ۱۹] ''اور ہر ایک کے لیے اس کے اعمال کے مطابق درجے ہیں، تاکہ وہ (اللہ) انھیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ فرماں بردار جن جنت میں اور ان کے نافرمان آگ میں ہوں گے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن جنت میں داخل ہوں گے اور کھائیں پئیں گے۔ لیث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسلمان جن نہ جنت میں جائیں گے اور نہ دوزخ میں، اس لیے کہ اللہ نے ان کو جنت سے باہر نکالا ہے، اب وہ اور ان کی اولاد وہاں نہ جائیں گے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۲٤)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک خلق بالکل جنت میں ہوگی، وہ فرشتے ہیں۔ دوسری خلق بالکل آگ میں ہوگی، وہ شیاطین ہیں اور تیسری خلقت کچھ جنت میں اور کچھ آگ میں جائے گی، وہ جن اور انسان ہیں۔ ثواب اور عذاب انہی کے لیے ہوگا۔[1] اللہ پاک ان کے اعمالِ خیر وشر سے غافل نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکم کفر اور معاصی کے ساتھ خاص ہے، اس میں ان کو وعید اور ڈانٹ ہے مگر زیادہ بہتر یہ ہے کہ آیت مکمل تفاصیل کی وجہ سے تمام معلومات کو شامل ہے۔[2]

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿١٣٣﴾ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿١٣٥﴾

اور آپ کا رب بے نیاز ہے رحمت والا، اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے، اور تمھارے بعد جنھیں چاہے جانشین بنا دے، جیسے اس نے تمھیں دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا (133) بے شک جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، وہ ضرور آنے والی ہے اور تم عاجز کرنے والے نہیں (134) (اے نبی!) کہہ دیجیے: اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک میں بھی (اپنی جگہ) عمل کرنے والا ہوں، چناں چہ جلد ہی تم جان لو گے کہ کس شخص کے لیے آخرت کا (اچھا) انجام ہے۔ اور بے شک ظالم فلاح نہیں پائیں گے (135)

نافرمانی کی صورت میں نئے لوگوں کے آنے کی وعید:

اللہ نے کہا ہے کہ میں ساری مخلوق سے سب طرح سے بے پروا ہوں۔ خلق ہی اپنے سارے احوال میں میری محتاج اور فقیر ہے۔ اس کے ساتھ میں ان سے نرمی سے پیش آنے والا اور رحم کرنے والا ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ [البقرة: ١٤٣] ''بے شک اللہ لوگوں پر بہت نرمی کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔'' جب تم میرے حکم کے خلاف کرو گے میں تم کو باقی نہ رکھوں گا۔ تمھاری جگہ اوروں کو لاؤں گا جو طاعت کریں گے۔ جس طرح تم کو ایک اور ہی قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ میں اس کام پر قادر ہوں، میرے لیے یہ کام سہل اور آسان ہے۔ دیکھو جس طرح اگلا زمانہ گیا، دوسرا آیا، اسی طرح یہ زمانہ جا کر دوسرا آ سکتا ہے، یہ کوئی مشکل بات نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا ﴾ [النساء: ١٣٣]

---

[1] الدر المنثور (٣/ ٣٦٠) [2] فتح البیان (٤/ ٢٤٣۔ ٢٤٤)

''اگر اللہ چاہے تو تمھیں ہٹا کر تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے اور اللہ اس بات کی پوری قدرت رکھتا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿15﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿16﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴾ [الفاطر: ۱۵۔ ۱۷] ''اے لوگو! تم (سب) اللہ ہی کے محتاج ہو اور اللہ ہی بالکل بے نیاز، قابلِ تعریف ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے (فنا کر دے) اور (تمھاری جگہ) ایک نئی مخلوق لے آئے۔ اور اللہ کے لیے یہ (بات) کچھ مشکل نہیں۔'' ابان بن عثمان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذریت اصل اور نسل دونوں کو کہتے ہیں۔[1]

قیامت لامحالہ رونما ہونے والی ہے:

پھر اللہ نے فرمایا کہ امرِ معاد جس کا تم سے وعدہ ہے، وہ لامحالہ ہونے والا ہے، تمھاری کیا ہستی ہے کہ تم اللہ کو عاجز کر دو، بلکہ اللہ تمھارے لوٹانے پر قادر ہے، گو تم خاک ہو جاؤ، تمھاری ہڈیاں گل جائیں اور مٹی ہو جائیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں مروی ہے: ''اے بنی آدم! اگر تم عقل رکھتے ہو تو اپنی جانوں کو مردوں میں گنو۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جس دن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور آئے گا، تم اسے عاجز نہیں کر سکتے۔''[2]

پھر سخت ڈانٹ اور وعید فرمائی کہ تم اپنی چال پر رہو، ہم اپنے راہ پر، کیونکہ تم کو یہ گمان ہے کہ تم ہدایت کے راستے پر ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿121﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴾ [هود: ۱۲۱۔ ۱۲۲] ''اور آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے جو ایمان نہیں لاتے: تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک ہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔ اور تم انتظار کرو، بے شک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔'' اب جلد تم جان لو گے کہ پچھلا گھر ہم کو ملتا ہے یا تم کو، ظالموں کو کبھی فلاح نہیں۔

اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنا جو وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ بلاد پر تمکین دی (شہروں پر اختیار اور قبضہ دیا) بندں پر حکم عطا کیا، مکے کو فتح کر دیا، قوم پر، جو جھٹلانے والے اور دشمن تھے، غلبہ بخشا، تمام جزیرۂ عرب پر استقرار فرمایا، یمن اور بحرین وغیرہما سب آپ کے زمانۂ حیات میں مفتوح ہوا، پھر اور جگہوں، سلطنتوں اور مقاموں پر آپ کے بعد زمانۂ خلفائے راشدین میں فتح یابی حاصل ہوئی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [المجادلة: ۲۱] ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٩٠)

[2] شعب الإيمان (٧/ ٣٥٥) حلية الأولياء (٦/ ٩١) اس کی سند میں ''ابوبکر بن ابی مریم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٩٧٧)

میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ قوی، بڑا زبردست ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ [المؤمن: ۵۱۔ ۵۲] ''بلاشبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہیں دے گی اور ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی خبر دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴾ [ابراهيم: ۱۳۔ ۱۴] ''چناں چہ ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے۔ اور ان کے بعد ہم ضرور تمھیں (اس) سرزمین میں آباد کریں گے، یہ (انعام) اس کے لیے ہے کہ جو میرے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اور میری وعید سے ڈرا۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [النور: ۵۵] ''جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی، اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین محکم و پائیدار کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چنا اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ ضرور انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔'' وَقَدْ فَعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ بِهٰذِهِ الْأُمَّةِ وَلَهُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ أَوَّلاً وَّ آخِراً وَّ ظَاهِراً وَّ بَاطِناً.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تیرا رب خلق سے بے نیاز ہے، خلق کا محتاج نہیں، نہ ہی ان کی عبادت کی حاجت رکھتا ہے نہ ان کا ایمان لانا اللہ کو کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ ان کا کفر اسے کچھ نقصان دہ ہے۔ اس کے ساتھ وہ ان پر رحیم اور مہربان ہے۔ اس کی بے پروائی اسے ان پر رحمت کرنے سے روکتی نہیں۔ یہ کلام ربانی کس قدر اچھا، بلیغ اور قوی ہے۔ غنا اور رحمت کو اس جگہ اکٹھا کیا ہے کہ باوجود غنی ہونے کے رحیم ہے، اس سے زیادہ اور کیا نیکی اور احسان ہوگا۔ من جملہ رحمت کے ایک یہ بات ہے کہ رسول بھیجے، ہلاک کر کے نیست و نابود نہ کیا، بلکہ باقی رکھا، حجت تمام کی، یہ صفت پہلے اور پچھلے کلام کے مطابق اور مناسب ہے۔ اے گناہ گار بندو! اگر وہ چاہے تو تم کو ایک دم سے ہلاک کر دے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۴۱)

بعض نے کہا ہے کہ یہ اہلِ مکہ کو خطاب ہے، اس میں ان کے لیے وعید اور ڈانٹ ہے، مگر آیت کی عمومیت زیادہ صحیح ہے، اہلِ مکہ بھی اس میں داخل ہیں۔ تمھارے ہلاک کے بعد اگر چاہے اور خلق لے آئے جو زیادہ اطاعت گزار اور حکم ماننے میں زیادہ تیزی دکھانے والی ہو، جس طرح تم کو ایک دوسری قوم کی نسل سے جو تمھاری طرح نہ تھے، بلکہ اطاعت گزار اور فرماں بردار تھے، پیدا کیا ہے۔ کہا کہ اہلِ سفینۂ نوح اور ان کی اولاد قرناً بعد قرنٍ تمھارے زمانے تک مراد ہے۔ امام واحدی اور زمخشری رحمہما اللہ نے کہا: مگر اللہ نے ایسا نہ چاہا، اس لیے ان کو ہلاک کر کے ان کی جگہ اوروں کو نہ لایا، یہ ان کے حال پر اس کی رحمت، لطف و کرم اور مہربانی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا: مرادخلقِ سوم یا چہارم ہے، پھر اختلاف کیا کہ مراد خلقِ آخر ہے، جن وانس میں سے۔[1] قاضی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی وجہ زیادہ قریب ہے، گویا اس بات پر تنبیہ کی کہ اللہ کی قدرت صرف ایک جنس پر ہی مقصور نہیں ہے کہ دوسری جنس نہ لا سکے۔[2] تم سے قیامت اور مر کر اٹھائے جانے اور سزا اور جزا کا وعدہ ہے وہ لامحالہ عنقریب پورا ہونے والا ہے۔ اللہ کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا، جو بات ہونے والی ہے، اُس سے تم بچ نہیں سکتے، وہ ضرور تم پر واقع ہو گی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴾ بہ معنی سابقین ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی ”هاربين منه“ یعنی اس سے بھاگنے والے، مگر وہ ہر حالت میں ان کو پکڑے گا۔ یہاں انتفائے اعجاز کے دوام کا بیان مراد ہے۔ انتفائے دوامِ اعجاز کا بیان نہیں، کیوں کہ جملہ اسمیہ جس طرح دوامِ ثبوت پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح جب اس پر حرفِ نفی داخل ہو تو وہ بمعونتِ مقام دوامِ انتفا پر دلالت کرتا ہے، انتفائے دوام پر نہیں۔ اے قومِ قریش! اے قومِ کفار! تم اپنے طریقے پر جس پر تم ہو، ثابت رہو، مجھ کو تمھاری یا تمھارے کفر کی کچھ پروا نہیں ہے۔ میں اپنا کام کرتا ہوں، اب جلد تم کو عذاب کے نزول کے وقت یا قیامت کے دن معلوم ہو جائے گا کہ نیک انجام کس کے لیے ہے، دنیا میں کون منصور ہوتا ہے، زمین کا وارث کون بنتا ہے، آخرت کس کو ملتی ہے، حق پر کون ہے، باطل پر کون ہے، تم یا ہم؟ کفر پر سخت وعید اور مزید ڈانٹ ڈپٹ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٠] ”تم جو چاہو عمل کرو۔“ اس ڈرانے میں ان کے وثوق پر، جن کو ڈرایا گیا، کمال مرتبے کا انصاف اور تنبیہ ہے۔[4] بے شک جو کوئی ظلم کی صفت کا حامل ہے اُس کو رہائی نہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جو کافر و مشرک ہوا، وہ نیک بخت نہیں۔[5]

---

[1] تفسير الرازي (١٣/ ١٦٥) [2] تفسير الخازن (٢/ ١٨٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١٣٩٠) اس کی سند میں ”بشر بن عمارة“ ضعیف راوی ہے۔

[4] فتح البيان (٤/ ٢٤٤۔ ٢٤٦) [5] تفسير البغوي (٣/ ١٩٢)

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿136﴾

اور انھوں نے اس میں سے اللہ کے لیے ایک حصہ ٹھہرایا جو اس نے کھیتی اور چوپایوں کی شکل میں پیدا کیا، پھر اپنے خیال کے مطابق کہنے لگے: یہ (حصہ) اللہ کے لیے ہے اور یہ ہمارے دیوتاؤں کے لیے ہے، پھر ان کے دیوتاؤں کا جو حصہ ہے وہ تو اللہ کے پاس نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا حصہ ہے، وہ ان کے دیوتاؤں کے پاس پہنچ جاتا ہے، کس قدر برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ﴿136﴾

کافروں کے کچھ شرکیہ کاموں کا بیان:

کافر اپنی کھیتی اور مویشی کے بچوں میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے۔ پھر اگر کوئی جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھتے تو بتوں کی طرف بدل دیتے، بتوں کی طرف کا اللہ کی طرف نہ کرتے، اُس سے زیادہ ڈرتے۔ سو اللہ کی نیاز دینی یہ کہ اس کی راہ میں جن کو دلوا دے ان کو دینے سے اُس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس کی حکم برداری ہے۔ ہاں چیز سے فقیر کو فائدہ اور ثواب سے دینے والے کو فائدہ ہوتا ہے۔ پھر جو کسی بزرگ کے لیے کچھ دے اگر اسی وضع پر دے تو شرک ہے جس پر اللہ نے الزام دیا، مگر اس بزرگ کو اپنی جگہ ٹھہرا دے کہ اس کی طرف سے اللہ کی راہ میں جن کو کہا ہے، ان کو دے تو یہ حکم برداری اللہ کی اور چیز فقیر کو اور ثواب اس شخص کے بدلے اس بزرگ کو دیا۔ یا اُس کو فقیر کی جگہ ٹھہرا دے کہ چیز اس کی کر دے، پھر اس کی چیز لوگوں کے کام آئے تو اس کو ثواب ہوا، یہ صورت مشکوک ہے، پہلی صورت بے شک ہے۔ انتہیٰ[1]

اللہ نے اس آیت پاک میں مشرکوں کی مذمت کی ہے اور انھیں ڈانٹ ڈپٹ کی ہے کہ انھوں نے طرح طرح کی کفر و شرک کی بدعات اور رسوم نکالی ہیں۔ اللہ کا شریک اوروں کو ٹھہرایا ہے۔ خلق کا ایک حصہ اللہ کے لیے مقرر کر رکھا ہے یہ ان کا زعم ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ کے دشمن جب کھیتی باڑی کرتے یا ان کے باغ میں پھل لگتے تو ایک حصہ اللہ کا اور ایک حصہ بتوں کا ٹھہراتے۔ جو حصہ بتوں کا ہوتا اس کی بڑی حفاظت رکھتے، اس کو گنتے رہتے اگر اس میں سے ساقط ہو جاتا تو جو اللہ کے نام فرضی طور پر ہوتا اس کو بتوں کے حصے میں لگا دیتے اور اگر کسی معاملے میں سبقت کرتا تو ان میں سے پہلے پانی اُس کو پلاتا جس کو بت کے لیے ٹھہرایا تھا، پھر اس کو پلاتا جس کو اللہ کے لیے ٹھہرایا تھا۔ اسی طرح کھیتی اور پھل میں جو اللہ کے نام پر رکھتے اس میں سے کچھ گر کر بتوں کے حصے میں جا ملتا

تو کہتے یہ فقیر ہے، اس کو اللہ کے حصے میں نہ لگاتے اور اگر سبقت کرتا ان سے پانی جس کو اللہ کے لیے ٹھہرایا تھا، پھر اس نے پلایا، اس چیز کو جو بت کے لیے ٹھہرائی گئی تھی تو اس کو بت کے واسطے ٹھہراتے۔

مالوں میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کو حرام کرتے، بتوں کے نام پر رکھتے اس خیال پر کہ ان کا حرام ہونا اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے ہے۔ یہی امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذبیحہ میں سے جو شے اللہ کے نام پر مقرر کرتے، اس کو بتوں کا نام لیے بغیر ہرگز نہ کھاتے اور جو بتوں کے نام پر ہوتا اس کو اللہ کا نام ذکر کیے بغیر کھاتے۔[1] یہ تقسیم کیا بری ہے۔ سرے ہی سے اُس میں خطا ہوئی ہے، اس لیے کہ اللہ تو ہر شے کا رب اور مالک اور خالق ہے، ملک اُس کا، ہر شے اُس کی ہے، اسی کا تصرف ہر چیز میں ہے، ہر شے اس کی قدر اور مشیت کے نیچے ہے، نہ اُس کے سوا کوئی معبود نہ کوئی رب محمود، پھر اس بری تقسیم کی حفاظت بھی نہ کرتے، بلکہ ظلم کی راہ پر چلتے، جیسے اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے: ﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴾ [النحل: ۵۷]
''اور وہ اللہ کی بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ (اولاد سے) پاک ہے، اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہیں (یعنی بیٹے)۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [الزخرف: ۱۵] ''اور انھوں نے اللہ کے بعض بندوں کو اس کا جز (اولاد) ٹھہرا دیا، بلاشبہ انسان تو کھلم کھلا ناشکرا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴾ [النجم: ۲۱] ''کیا تمھارے لیے بیٹے ہیں اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟'' نیز فرمایا: ﴿ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ [النجم: ۲۳] ''یہ تو پھر بڑی ہی بے انصافی کی تقسیم ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ ان کے کفر اور جہالت کا ایک دوسرا بیان ہے کہ اپنے بتوں کو اللہ پر مقدم رکھتے تھے۔ کھیتی اونٹ، بکری اور گائے میں اللہ اور بتوں کا حصہ لگاتے۔ پجاریوں کو، جو بتوں اور معبودوں کے خدام ہوتے، ان کو وہ حصہ دیتے جس طرح اب اس امت کے مشرک نام کے مومن خانقاہوں کے خادموں کو قبور کی نذر و نیاز دیتے ہیں، پھر اگر بتوں کے حصے میں سے کچھ خرچ ہو جاتا تو اللہ کے حصے میں سے ان کا عوض لے لیتے اور کہتے کہ اللہ غنی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں کہ پھل اور پانی میں اللہ کا حصہ اور شیطان کا حصہ مقرر کرتے، پھر اگر اللہ کا حصہ اس پھل میں سے شیطان کے حصے میں چلا جاتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر شیطان کے حصے میں سے کچھ اللہ کے حصے میں مل جاتا تو شیطان کا حصہ اللہ کے حصے میں سے نکال لیتے۔ اسی طرح اگر اللہ کے حصے کا پانی شیطان کے حصے میں جاری ہو جاتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر شیطان کے حصے کا پانی اللہ کے حصے میں چلا جاتا تو اس

[1] تفسير الطبري (۱۲/ ۱۳۱۔ ۱۳٤)

کو کھینچ لیتے، یہ کھیتی اور پانی میں ان کی تقسیم تھی۔

رہے جانور سو اس سے مراد بحیرہ وغیرہ ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر ہوا سے اللہ کے نام کی کوئی چیز اڑ کر بتوں کے حصے میں چلی جاتی تو اس کو پھر نہ لیتے اور اگر بتوں کے نام کی کوئی چیز اللہ کے حصے میں آ جاتی تو اس کو نکال لیتے۔ اللہ کو غنی ٹھہراتے، بتوں کو فقیر سمجھ کر ان کے حصے میں کمی نہ کرتے۔ جانوروں میں بحیرہ سائبہ مقرر کرتے۔[1] اللہ نے ان کی اس کارروائی کو بلفظ زعم بمعنی کِذب بیان فرمایا ہے، کیونکہ ہر شے اللہ کی ہے۔ اس تقسیم کا کب اس نے ان کو حکم دیا تھا؟ یہ تو محض ان کی اختراع اور بدعت ہے، یہ بہت برا انصاف ہوا کہ بتوں کی جانب کو اللہ کی جانب پر ترجیح دی۔ یہ سراسر ان کا فہم، حماقت اور جہالت ہے۔[2]

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے دیوتاؤں نے ان کی اولاد کا قتل پسندیدہ بنا رکھا ہے، تاکہ وہ انھیں ہلاک کر دیں اور ان کے لیے ان کا دین مشکوک بنا دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے، چناں چہ انھیں اور ان کے جھوٹ کو (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے جو وہ گھڑتے ہیں (137)

شیاطین کے کہنے پر مشرکوں کا اپنی اولاد کو قتل کرنا:

اللہ نے فرمایا کہ جس طرح شیطانوں نے ان کو یہ بات اچھی کر دکھائی کہ کھیتی اور جانوروں میں (ان کا) حصہ لگائیں، اسی طرح ان کو سمجھا دیا کہ وہ افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کرتے۔ لڑکیوں کو عار کے ڈر سے زندہ گاڑ دیتے۔ اس کام کو بہت اچھا سمجھتے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کے شریکوں نے بہت سے مشرکوں میں اس کام کو رونق دی تھی۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شرکا سے مراد شیاطین ہیں، وہ مشرکوں کو حکم دیتے تھے کہ تم اپنی اولاد کو زندہ درگور کر دیا کرو، ورنہ تم محتاج اور مفلس ہو جاؤ گے، تمھارے ساتھ اور کھانے، پہننے اور اڑانے والے پیدا ہو جائیں گے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیاطین نے ان کو حکم دیا کہ لڑکیوں کو قتل کرو، یہ اس لیے کہ وہ ہلاک ہو جائیں، ان کی جڑ کٹ جائے یا اس لیے کہ وہ اپنے دین میں دھوکا کھائیں، خلط ملط میں پڑ جائیں۔ اسی کے لگ بھگ ابن زید اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[4] اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۳۲۔ ۱۳۳) [2] فتح البیان (٤/ ۲٤۷۔ ۲٤۸)

[3] تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۳٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٤/ ۱۳۹۲) اس کی سند حسن ہے۔ [4] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲٤۲۔ ۲٤۳)

وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [النحل: ۵۸۔ ۵۹] ”اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم و غصے سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ اس عار کے باعث لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، جس کی اسے بشارت دی گئی ہے، (سوچتا ہے) کیا (اپنی) توہین کے باوجود اسے باقی رکھے یا اسے مٹی میں دبا دے؟ آگاہ رہو! بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔“ نیز اللہ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿۸﴾ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴾ [التکویر: ۸۔ ۹] ”اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا: کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی گئی؟“ یہ بھی تھا کہ اولاد کو فقر کے خوف اور مال کے تلف ہونے کے ڈر سے مار ڈالتے تھے، اس لیے ان کو منع کیا۔

یہ سب شیطان کی تزئین اور شرکا کی شریعت سازی تھی، اللہ پاک نے فرمایا کہ اس کا وقوع ہمارے ارادے اور مشیت سے ہوا۔ ہم اگر چاہتے کہ ایسا نہ ہو تو وہ ہرگز ایسا نہ کر سکتے۔ اس میں کوئی حکمتِ تامہ رکھی گئی تھی۔ اللہ سے کون پوچھ سکتا ہے کہ ایسا کیوں کیا؟ ہاں وہ جس سے چاہے پوچھے، تو اے پیغمبر! ان سے قطع نظر کر ان کو اور ان کی افترا پردازی کو چھوڑ دے، وہ جانیں اور ان کا کام جانے، تجھے کیا کام۔ اللہ تیرے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اس جگہ شرکا سے مراد بتوں کے خدام ہیں، یا بہکانے والے لوگ یا شیاطین۔ قتل سے مراد زندہ درگور کرنا ہے، اس ڈر سے کہ کہیں قید نہ ہوں، محتاج نہ ہوں۔ بعض آدمی قسم کھاتے تھے کہ اگر اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا تو وہ اس کو ذبح کرے گا، جس طرح عبدالمطلب نے کیا تھا۔ ﴿ شُرَكَآؤُهُمْ ﴾ میں چار قراءتیں ہیں۔ شرکا کا مطلب یہ تھا کہ مشرکین ہلاک ہو جائیں یا ان کو اپنے دین میں شک و شبہہ لگ جائے، کیونکہ وہ پہلے دینِ اسماعیل پر تھے، اب تلبیسِ شیطان سے پھر گئے، مشرک بن گئے۔ اللہ کی حکمت نے اسی امر کا تقاضا کیا، جو اس نے چاہا وہ ہوا جو نہ چاہا، نہ ہوا۔[1]

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور اپنے (جھوٹے) خیال کے مطابق انھوں نے کہا: یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع ہیں، انھیں بس وہی کھا سکتا ہے جسے ہم چاہیں، اور بعض چوپائے ہیں جن کی پشت (پر سواری) حرام کر دی گئی، اور بعض چوپائے ہیں

[1] فتح البیان (۴/ ۲۴۹۔ ۲۵۰)

جن پر وہ اللہ کا نام نہیں پڑھتے، یہ سب وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہوئے کرتے ہیں، وہ جلد ہی انھیں اس جھوٹ کی سزا دے گا جو وہ گھڑتے رہے ہیں (138)

چوپائیوں میں مشرکوں کی حرام سازی:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حجر سے مراد حرام ہے، جس طرح وصیلہ وغیرہا کو حرام کر رکھا تھا۔ یہی مجاہد، ضحاک، سدی، ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اموال میں جو حصہ شیاطین کا مقرر کیا تھا اس کو حرام ٹھہرایا تھا کہ کوئی نہ کھائے مگر جس کو وہ چاہیں۔ یہ سختی اور تشدید اللہ کی طرف سے نہیں تھی۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روک ٹوک بتوں کے لیے تھی۔[1] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴾ [یونس: ٥٩] ”کہہ دیجیے: بھلا دیکھو تو، اللہ نے تمھارے لیے جو رزق نازل کیا، پھر تم نے اس میں سے کچھ حرام اور کچھ حلال ٹھہرا لیا۔ کہہ دیجیے: کیا اللہ نے تمھیں (یہ) حکم دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو؟“ اور اللہ کے اس قول کی طرح: ﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآىِٕبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ [المائدۃ: ١٠٣] ”اللہ نے نہیں بنایا کسی کو بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام اور لیکن یہ کافر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔“

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جانور جن کی پشت حرام تھی یہی بحیرہ، سائبہ اور حام تھے اور وہ جانور جن پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا وہ تھے کہ جب ان کے بچے ہوتے تو ان کو نحر و ذبح نہ کرتے۔ امام ابو وائل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بحیرہ پر حج نہ کرتے، یعنی ان پر سواری کرنا حرام جانتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قسم کے اونٹ مقرر کیے تھے کہ ان کی کسی بات میں اللہ کا نام نہ لیا جاتا، نہ اُن پر سوار ہوتے، نہ اُن کا دودھ دوہتے، نہ اُن پر لادتے اور نہ اُن سے کچھ کام لیتے۔[2] یہ سب اللہ پر افترا تھا، اس کو اللہ کا دین اور شرع کہتے، حالانکہ نہ اللہ نے اس کام کا حکم دیا تھا نہ اس فعل سے راضی تھا اب اس افترا کی سزا جزا ملے گی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ حجر بمعنی محجور ہے، مثل ذبح بہ معنی مذبوح، یعنی وہ جانور اور کھیتی ممنوع ہے۔ ان کے بتوں کے نام پر ہوتی، کوئی اس کو نہ چھوتا اور نہ کھاتا مگر بتوں کے پجاری، یا مرد نہ کہ عورت، غرض کہ خداؤں کا حصہ تین قسم کا ٹھہرا تھا: ایک یہ کہ اچھوتا، دوسرا وہ جس کی پشت پر سوار ہونا حرام ٹھہرایا تھا، جیسے: بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام اور تیسرا وہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، یعنی ذبح کے وقت، بلکہ اس کو بتوں کے نام ذبح کرتے۔ یہ سب اللہ پر جھوٹ باندھا تھا۔[3]

---

[1] تفسیر الطبری (١٢/ ١٤٣) [2] تفسیر الطبری (١٢/ ١٤٥) [3] فتح البیان (٤/ ٢٥٠۔ ٢٥١)

وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

اور انھوں نے کہا: ان (حرام کیے ہوئے) چوپایوں کے پیٹ میں جو بچہ ہو وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے، اور اگر وہ مردہ ہو تو (مرد اور عورتیں) سب اس میں شریک ہیں۔ جلد ہی اللہ انھیں اس طرح (خود ہی حلال اور حرام) طے کرنے کی سزا دے گا، بے شک وہ بڑا حکمت والا، خوب جاننے والا ہے (139)

اگر جانور زندہ بچہ جنے تو مردوں کے لیے، اگر مردہ ہو تو سب کے لیے:

یہ بھی ایک مسئلہ بنایا تھا کہ جانور ذبح کیا، اس کے پیٹ میں سے بچہ نکلا، اگر زندہ نکلے تو مرد کھائیں، عورتیں نہ کھائیں۔ مردہ نکلے تو سب کھائیں۔ بے سند مسئلہ بنانا سخت گناہ ہے، اس پر ان کو الزام دیا۔ ہمارے دین میں مرد عورت کا کچھ فرق نہیں۔ اگر زندہ نکلے تو ذبح کر کے حلال ہے، بغیر ذبح مردار۔ اور اگر مردہ نکلے اور معلوم ہو کہ جان پڑی تھی تو امامِ اعظم کے نزدیک حلال نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ مَا فِيْ بُطُوْنِ ﴾ سے مراد دودھ ہے، عورتوں پر حرام مردوں پر حلال ٹھہرایا تھا۔ بکری کا بچہ اگر نر ہوتا تو مرد کھاتے، عورتیں نہ کھاتیں، اور اگر مادہ ہوتا تو چھوڑ دیتے، ذبح نہ کرتے، اگر مردہ پیدا ہوتا تو سب مل کر کھاتے۔ اللہ نے اس کام سے منع فرمایا۔ یہی امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بحیرہ کا دودھ صرف مرد کھاتے، اگر مر جاتا تو مرد عورت سب کھاتے۔ یہی بات امام عکرمہ، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے بھی کہی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَا فِيْ بُطُوْنِ ﴾ سے مراد سائبہ اور بحیرہ ہے۔[1]

امام ابو العالیہ، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ وصف سے مراد کذب ہے،[2] اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رو سے: ﴿ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴾ [النحل: ۱۱۶] ''اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بیان کرنے کی وجہ سے مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھو۔ بے شک وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔'' اللہ تعالیٰ اپنے افعال، اقوال اور شرع و تقدیر میں حکیم ہے، اپنے بندوں کے اعمال و خیر و شر کا علیم ہے۔ ہر عمل کی پوری پوری سزا اور جزا اس کے عامل کو دے گا۔

(1) تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۴۶۔ ۱۴۸) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۴۳۔ ۲۴۴) (2) تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۵۲)

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ مَا فِيْ بُطُوْنِ ﴾ سے مراد بحیرہ اور سائبہ کے بچے یا ان کا دودھ ہے۔ ازواج میں بیٹیاں اور بہنیں بھی داخل ہیں، یعنی کوئی عورت بھی اس کو نہ کھائے۔[1]

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۠ ۝۱۴۰

بے شک وہ لوگ خسارے میں رہے جنھوں نے اپنی اولاد کو علم کے بغیر بے وقوفی سے قتل کیا، اور اللہ نے انھیں جو رزق دیا اللہ پر جھوٹ باندھ کر اسے حرام ٹھہرایا، تحقیق وہ گمراہ ہوگئے، اور وہ ہدایت یافتہ نہ ہوئے ۝۱۴۰

اولاد کے قاتل اور اللہ کا رزق حرام کرنے والے خسارے میں ہیں:

بیٹیوں کا مارنا روا رکھتے تھے اور یہ سخت وبال ہے۔ اللہ نے کہا کہ ان کاموں کے کرنے والے دنیا اور آخرت میں خراب ہیں، دنیا میں یوں کہ خود اپنے جی سے اپنی اولاد کو مارا اور بعض اموال کو اپنے اوپر حرام کر کے تنگی لی۔ آخرت میں اللہ پر دروغ بافی اور افترا کی وجہ سے بری سے بری جگہ میں جائیں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝۱۱۶ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النحل: ١١٦۔ ١١٧] ”بے شک وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ (ان کے لیے) تھوڑا سا فائدہ ہے اور (آخرت میں) ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اگر تیرا جی چاہے کہ تو عرب کی جہالت کو معلوم کرے تو سورت انعام کی ایک سو تیس کے بعد والی آیات پڑھ: ﴿ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ ... ﴾ (آیتِ باب) اس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے منفرداً کتاب مناقبِ قریش میں روایت کیا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قتلِ اولاد سے مراد لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا ہے۔ یہ کام از راہِ حماقت وطیش وخفت کرتے تھے نہ کہ کسی حجتِ عقلیہ ودلیلِ شرعیہ سے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مضر اور ربیعہ کے بارے میں اتری ہے، ان میں زندہ درگور کرنے کی رسم تھی۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اہلِ جاہلیت کا کام ہے، ان میں سے بعض اپنی بیٹی کو گرفتاری اور فاقہ کشی کے خوف سے قتل کر کے کتوں کو کھلا دیتے تھے۔[4] اللہ نے جو رزق دیا تھا جن کا نام بحائر اور سوائب رکھا ہے، اُس کو حرام ٹھہرا دیا تھا، ان کاموں کی وجہ سے سیدھے اور ہدایت کے راستے سے بھٹک گئے، راہ یاب نہ ہوئے۔[5]

---

① فتح البيان (٤/ ٢٥٢) ② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٣٤) ③ الدر المنثور (٣/ ٣٦٦)
④ تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٣٩٦) ⑤ فتح البيان (٤/ ٢٥٢)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ
وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ
مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا
حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾
وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ
وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

اور وہی ہے جس نے باغات پیدا کیے، ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے، اور کھجور اور فصلیں (پیدا کیں) ان کے پھل (مزے میں) مختلف ہیں اور زیتون اور انار (پیدا کیے)، ملتے جلتے بھی اور نہ ملتے جلتے بھی، ان کا پھل کھاؤ جب وہ پھل لائیں اور ان کی کٹائی اور چنائی کے دن اس (اللہ) کا حق دے دیا کرو، اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ﴿141﴾ اور (پیدا کیے) اس نے چوپایوں میں سے بوجھ اُٹھانے والے اور زمین سے لگے (پست قد)، اللہ نے تمھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿142﴾

کھیتی کی زکات:

اس کا حق دو جس دن کٹے، یعنی زکات۔ مال کی زکات سال کے بعد ہے، جبکہ اس کی زکات اسی دن ہے جس دن یہ ہاتھ لگے۔ جو زمین اپنی ملکیت ہو اور اس میں خراج نہ آتا ہو اس کے محصول میں اللہ کا حق ہے، اگر پانی دیے سے ہو تو بیسواں حصہ اور اگر بغیر پانی دیے ہو تو دسواں حصہ۔ اسی طرح لادنے والے اونٹ اور بیل، بکری اور بھیڑ پر بھی زکات ہے۔

پھل دانوں اور چوپائیوں کا خالق اللہ ہی ہے:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر شے کا خالق اللہ ہے، کھیتی ہو یا مواشی۔ مشرکوں نے اپنی آرائے فاسدہ سے تقسیم اور تجزیہ کر کے بعض کو حرام اور بعض کو حلال ٹھہرایا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ معروشات سے مراد مسموکات ہیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ معروشات وہ ہے جو چھپر باندھا جائے، غیر معروشات وہ ہے جو جنگل اور پہاڑ میں پیدا ہو یا پہلی قسم انگور ہے اور دوسری غیر انگور، یہی امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دیکھنے میں ملتا جلتا اور مزے میں جدا جدا۔

محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کھاؤ، جب پھل لائے یعنی تر اور خشک۔[1] بعض نے کہا ہے کہ حق دینے سے

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۵۶۔ ۱۵۷)

مراد فرض زکات ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس دن تو لیں اُس دن اُس کی زکات دیں، ابن مسیب بھی اسی کے قائل ہیں۔ لوگ جب کھیتی کاٹتے تو اس میں سے کچھ نہ دیتے، اللہ نے کہا: حق دو، یعنی وزن کر لو، ہر دہائی سے ایک پیمانہ دو اور وہ جو اس کے بال سے لوگ نوچ لیں۔[1] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ ہر دس وسق کھجور میں ایک قنو کا حکم دیا کہ مسجد میں مسجد کے مساکین کے لیے لٹکا دیں۔[2]

(رواه أحمد وإسناده جيد قوي)

امام طاؤس ابو الشعثاء، قتادہ، حسن، ضحاک اور ابن جریج رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ مراد زکات ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دانے اور پھل کا صدقہ ہے۔ یہی بات زید بن اسلم رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سوائے زکات کے ایک اور ہی حق ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سوائے زکات کے یہ حق دیا کرتے تھے۔ امام عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کاٹنے کے دن جو حاضر ہو اس کو بقدر تیسر کچھ دے، یہ زکات نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تیرے پاس مساکین آئیں تو کچھ ان کے لیے ڈال دے، انہی کا دوسرا قول یہ ہے کہ کھیتی میں سے ایک مٹھی وقتِ زرع کے ایک مٹھی وقتِ قطع کے اور گرے پڑے دانے وہ اٹھالیں۔

امام ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک پُولا چارہ جانور کا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مسکینوں کے لیے زکات فرض ہونے سے پہلے تھا۔[3] سعید رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ وہ جو بال جھڑ پڑے۔[4] (رواه ابن مردويه) اوروں نے کہا: یہ کہ ایک واجب شے تھی۔ پھر اللہ نے اُس کو منسوخ کر دیا عشر اور نصف سے۔ اس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ابن حنیفہ، ابراہیم نخعی، حسن، سدی، عطیہ عوفی وغیرہم سے حکایت کر کے خود بھی اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے نسخ نام رکھنے میں نظر ہے، اس لیے کہ یہ ایک شے واجب تھی، پھر اس کی مقدار مخرج اور کمیت بیان کر دی گئی۔ یہ معاملہ دو ہجری میں واقع ہوا۔[5] والله أعلم.

بہر حال اللہ نے ان کی مذمت کی جو کھیتی اور پھل کاٹتے ہیں اور صدقہ نہیں دیتے، جس طرح باغ والوں کا قصہ سورت ن میں فرمایا ہے: ﴿ إِنَّا بَلَوْنَٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا۟ لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ﴿17﴾ وَلَا يَسْتَثْنُونَ ﴿18﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُونَ ﴿19﴾ فَأَصْبَحَتْ كَٱلصَّرِيمِ ﴿20﴾ فَتَنَادَوْا۟ مُصْبِحِينَ ﴿21﴾ أَنِ ٱغْدُوا۟ عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَٰرِمِينَ ﴿22﴾ فَٱنطَلَقُوا۟ وَهُمْ يَتَخَٰفَتُونَ ﴿23﴾ أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا ٱلْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ ﴿24﴾

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ١٥٨_ ١٦٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٦٢) مسند أحمد (٣/ ٣٥٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٥/ ٣٥٩)

[3] تفسير الطبري (١٢/ ١٥٨_ ١٦٨)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٤٥) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' اور ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہیں۔

[5] تفسير الطبري (١٢/ ١٦٨_ ١٧٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٤٥)

وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ۝25 فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝26 بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝27 قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝28 قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝29 فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝30 قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝31 عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝32 كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [القلم: ۱۷۔ ۳۳] ”بے شک ہم نے انھیں آزمایا، جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا، جب انھوں نے قسم کھائی کہ البتہ صبح ہوتے ہی اس کے پھل کو ضرور توڑ لیں گے۔ اور وہ ”ان شاء اللہ“ نہیں کہہ رہے تھے۔ تو آپ کے رب کی طرف سے کوئی پھرنے والا (عذاب) اس (باغ) پر پھر گیا، جب کہ وہ سو رہے تھے۔ پھر وہ (باغ) کٹی کھیتی کی طرح ہوگیا۔ پھر صبح ہوتے ہی انھوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔ کہ تم اپنی کھیتی پر صبح سویرے چلو، اگر تمھیں پھل توڑنا ہے۔ چناں چہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔ کہ آج تمھارے پاس باغ میں کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے۔ اور وہ صبح سویرے (یہ سوچ کر) لپکتے گئے کہ وہ (مسکینوں کو) روکنے پر قادر ہیں۔ پھر جب انھوں نے باغ دیکھا تو کہا: یقیناً ہم (راہ) بھول گئے ہیں۔ (نہیں) بلکہ ہم تو محروم کر دیے گئے ہیں۔ ان کا بہترین کہنے لگا: کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے کہا: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہم ہی ظالم تھے۔ پھر وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے ملامت کرنے لگے۔ (اور) کہنے لگے: ہائے ہم پر افسوس! بے شک ہم ہی سرکش تھے۔ شاید ہمارا رب بدلے میں اس سے بہتر ہمیں دے، بے شک ہم اپنے رب کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ اسی طرح ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب تو سب سے بڑا ہے۔ کاش! وہ جان لیتے۔“

﴿ كَالصَّرِيْمِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اندھیری کالی گرم رات کی طرح ہوگئی۔ ﴿ حَرْدٍ ﴾ سے مراد قوت، جلد اور ہمت ہے۔ پھر اسراف سے منع کیا، یعنی دینے میں اسراف نہ کرو کہ مقدارِ معروف سے زیادہ دو۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: کھیتی کٹنے کے دن کچھ ذرا سا دیتے تھے، پھر بہت سا دینے لگے، اس پر اللہ نے اسراف سے روکا۔

اسراف سے ممانعت:

ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری ہے۔ انھوں نے اپنی کھجور کاٹی تھی، کہا: آج کے دن جو کوئی آئے گا اس کو کھلاؤں گا، اتنا کھلایا کہ شام کو ایک کھجور بھی نہ بچی، اس پر یہ آیت آئی: ﴿ لَا تُسْرِفُوْا... الخ ﴾ (آیتِ باب) امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے میں فضول خرچی سے منع کیے گئے۔ ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو تم نے اللہ کے حکم سے تجاوز کیا وہ سرف (فضول خرچی ہے)۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم اپنا مال دے کر فقیر ہو کر مت بیٹھو۔ امام ابن مسیّب اور محمد بن کعب رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مت روکو صدقے کو کہ تم اپنے رب کے نافرمان بنو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عطا کے قول کو اختیار کیا ہے کہ یہ ہر شے میں اسراف سے ممانعت ہے۔[1]

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۱۷۴۔ ۱۷۶)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں رہا کہ یہ بات صحیح ہے، لیکن ۔واللہ أعلم۔ سیاقِ آیت سے یہی مراد ہے کہ کھانے میں اسراف نہ کرو، کیونکہ اس میں عقل اور بدن کا نقصان ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ﴾ [الأعراف: ٣١] ”اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو۔“ صحیح بخاری میں تعلیقاً آیا ہے: «كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَالْبَسُوْا مِنْ غَيْرِ إِسْرَافٍ وَّلَا مَخِيْلَةٍ» سو یہ اسراف کھانے میں اسی بارے میں ہے کہ کھاؤ پیو اور پہنو مگر زیادتی نہ کرو، اِتراؤ نہیں،[1] کیونکہ ﴿ لَا تُسْرِفُوْا... الخ ﴾ ﴿ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ... الخ ﴾ کے بعد آیا ہے۔ اس سے کھانے میں اسراف کی ممانعت ظاہر ہوتی ہے، آگے اللہ جانے۔[2]

چوپائیوں کے فوائد:

﴿ حَمُوْلَةً ﴾ سے وہ مویشی مراد ہیں جن پر بوجھ لادا جاتا ہے، جیسے: اونٹ، گھوڑا، خچر اور بیل وغیرہ۔ فَرْش سے وہ مراد ہیں جو ان سے چھوٹے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یعنی کم سن اونٹ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ حَمُوْلَةً ﴾ بڑے اور ﴿ فَرْشًا ﴾ چھوٹے اونٹ ہیں۔[3] یہی امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ حَمُوْلَةً ﴾ سے مراد اونٹ، گھوڑا، خچر، گدھا اور ہر وہ شے ہے جس پر وزن لادا جاتا ہے۔ فَرْش سے مراد بکری ہے۔[5] اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ فَرْش اس لیے کہتے ہیں کہ زمین سے نزدیک ہے۔

امام ربیع، حسن، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ حَمُوْلَةً ﴾ اونٹ اور گائے اور فَرْش بکری ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَمُوْلَةً ﴾ اونٹ ہے، فَرْش فصلان، عجاجیل اور بکری ہے، جس پر کچھ بوجھ لادیں، وہی ﴿ حَمُوْلَةً ﴾ ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَمُوْلَةً ﴾ وہ ہے جس پر تم سوار ہو، فَرْش وہ ہے جو تم کھاؤ اور دودھ دوؤھو، جیسے بکری کہ اُس کا گوشت کھاتے ہو، اس کے بالوں کا لحاف اور فرش بناتے ہو۔[6] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں یہ قول بہت اچھا ہے۔

دوسری آیت اس کی شاہد ہے: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٧١۔ ٧٢] ”کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جو چیزیں بنائیں، ان میں یقیناً ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے؟ پھر وہ ان کے مالک (بن گئے) ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥/ ٢١٨٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٥٩) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٤٦)
[3] مستدرك الحاكم (٣/ ٣٤٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[4] تفسير الطبري (١٢/ ١٧٨) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر والی سند میں ”ابوبکر ہذلی“ متروک راوی ہے۔
[5] تفسير الطبري (١٢/ ١٨٠) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٠٠۔ ١٤٠١) اس کی سند حسن ہے۔ [6] تفسير الطبري (١٢/ ١٨٠۔ ١٨١)

اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا، چناں چہ ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں، اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ إلى قوله وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴾ [النحل: ٦٦۔ ٨٠] ''اور بے شک تمھارے لیے چوپایوں میں بھی عبرت (غور وفکر کا سامان) ہے۔ ہم تمھیں پلاتے ہیں اس سے جو ان کے پیٹوں میں ہے، گوبر اور لہو کے بیچ سے خالص دودھ، پینے والوں کے لیے آسانی سے (حلق میں) اُتر جانے والا ہے..... اور ان (بھیڑوں) کی اون سے اور ان (اونٹوں) کی پشم سے اور ان (بکریوں) کے بالوں سے (گھریلو) اثاثے اور ایک مدت تک برتنے کی چیزیں (بنائیں)۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٧٩۔ ٨١] ''اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے چوپائے بنائے، تاکہ تم ان میں سے بعض پر سواری کرو اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ اور تمھارے لیے ان میں (اور بھی) بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ تم ان پر (سوار ہو کر اپنی) اس حاجت (منزلِ مقصود) کو پہنچو جو تمھارے دلوں میں ہو اور تم ان پر اور کشتیوں پر (بھی) سوار کیے جاتے ہو۔ اور اللہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، پھر تم اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے؟''[1]

شیطان سے بچنے کا حکم:

پھر اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے رزق سے کھاؤ، یعنی پھل اور کھیتی و مواشی سے۔ یہ سب اللہ نے تمھارے لیے رزق مقرر کیا ہے۔ شیطان کی راہ پر اور اس کے حکموں پر نہ چلو، جس طرح مشرکین شیاطین کے تابع ہو گئے ہیں، جنھوں نے شیطان کے کہنے سے اللہ کے بعض رزق کو حرام ٹھہرا لیا ہے، پھلوں، کھیتی اور چارپایوں میں سے۔ یہ اللہ پر ان کی افترا ہے۔ اے لوگو! شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴾ [الفاطر: ٦] ''بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے، لہٰذا تم اسے دشمن ہی جانو، بس وہ تو اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں سے ہو جائیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ﴾ [الأعراف: ٢٧] ''اے بنی آدم! کہیں شیطان تمھیں فتنے میں نہ ڈال دے، جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا جب اس نے ان دونوں کا لباس اُتروایا تھا، تاکہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھا دے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾ [الكهف: ٥٠]

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٤٦۔ ٢٤٧)

''کیا پھر (بھی) تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو، جبکہ وہ تمھارے دشمن ہیں؟! وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے۔'' قرآن پاک میں اس طرح کی آیتیں بہت سی ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

''بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تو روزی حاصل کرلے اور غفلت میں نہ کھائے۔ یہ تمام اشیا صرف تیری خاطر پریشان ہیں اور حکم بجا لا رہی ہیں۔ یہ انصاف کی بات نہ ہوگی کہ تو فرماں برداری نہ کرے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿جَنّٰتٍ﴾ سے مراد بساتین ہیں، یعنی باغات۔ اللہ نے اس آیت میں اپنی ایک بدیع قدرت یاد دلائی اور ایک عظیم صنعت بتائی کہ بعض باغ اونچی بلند کھموں پر ہوتے ہیں، جیسے: انگور کے تختے اور بعض نیچے۔ یا معروش سے مراد وہ ہیں جو زمین پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، جیسے: کدو، خربوزہ اور تربوز وغیرہ۔ غیر معروش وہ ہیں جو ساق (تنے) پر قائم ہوتے ہیں، جیسے: کھجور، زرع اور تمام درخت۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انگور میں دونوں صورتیں ہوتی ہیں، بعض معروش اور بعض غیر معروش،[1] کیونکہ وہ زمین ہی پر منبسط چلتا ہے یا جس کو آدمی لگاتے ہیں وہ معروش اور جو جنگل اور پہاڑوں میں پیدا ہوتا ہے وہ غیر معروش ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے معروش وہ ہے جس کو عیدان و قصب (لکڑیوں اور کانوں) پر کھڑا کریں اور غیر معروش وہ ہے جو ضاحی ہو۔[2] لغت میں عرش چھت والی چیز کو بولتے ہیں جس پر چھپر چھتری کریں، جیسے: انگور۔ نخل اور زرع سے مراد سارے حبوب (دانے) ہیں جو قوت اور ذخیرہ ہوتے ہیں۔ حبات کی پیداوار میں یہ دونوں افضل ہیں، اس لیے ان کا ذکر بالخصوص علاحدہ علاحدہ کیا، پھر ان میں کوئی اعلیٰ اور کوئی رڈی ہوتا ہے، سب کا مزہ الگ الگ ہے۔

''اُکُلُ'' سے مراد ماکول ہے، یعنی شکل اور ذائقے میں جدا جدا ہیں۔ پھر زیتون اور رمان کو دیکھو کہ پتوں میں متشابہ اور مزے میں غیر متشابہ ہوتے ہیں۔ یہ حکم کہ جب پھل لگے تو کھاؤ، اباحت کا حکم ہے، یعنی خواہ پکنے اور کاٹنے سے پہلے یا حصاد کے وقت۔ پھر جب حصاد کا وقت آیا تو اب اس پیداوار کا حق ادا کرو، کسی نے کہا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے، بعض نے کہا ہے ندب (استحباب) پر محمول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ محکم ہے۔ ہر طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت گئی ہے۔ جمہور اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور زکات مدینے میں سن دو ہجری میں فرض

[1] تفسير البغوي (٣/ ١٩٥) [2] الدر المنثور (٣/ ٣٦٧)

ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ آیتِ زکات نے ہر صدقے کو جو قرآن میں آیا ہے منسوخ کر دیا۔[1] امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مال میں سوائے زکات کے حق ہے۔[2] صحابہ زکات کے علاوہ بھی کچھ دیا کرتے تھے۔ امام واحدی اور رازی رحمہما اللہ اسی پر راضی ہیں۔

پھر فرمایا کہ صدقے اور بخشش وعطیہ دینے میں اسراف نہ کرو کہ سب دے کر محتاج ہو جاؤ۔ اسراف مال زیادہ خرچ کرنے اور اڑانے کو کہتے ہیں۔ لغت میں خطا کے معنی میں ہے۔ امام سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کچھ غیر طاعتِ الٰہی میں خرچ ہوتا ہے، وہی اسراف ہے۔ اگرچہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔[3] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر انسان سارا مال دے دے، صلۂ عیال نہ کرے (اہلِ خانہ کا خیال نہ رکھے) تو وہ مسرف ہے، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے: ((اِبْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ))[4] ''اپنے قریب والوں سے شروع کرو۔'' امام ابن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صدقے کو منع کرنے والا اور روکنے والا نہ ہو۔[5] یعنی بخل اور روک لینے میں حد سے نہ بڑھو، یہاں تک کہ واجب صدقہ بھی نہ دو۔

غرض کہ دونوں قولوں پر اسراف سے مراد حد سے تجاوز کرنا ہے۔ پہلے قول کے مطابق دینے میں اور دوسرے قول کے مطابق بخل اور روک لینے میں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ بتوں کو کھیتی اور چوپایوں میں شریک نہ کرو۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معصیتِ الٰہی پر خرچ نہ کرو۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ولاۃ (والیوں) کو خطاب ہے کہ مال دار سے اپنے حق سے زیادہ نہ لو۔[6] بعض نے کہا ہے کہ ناحق لے کر ناحق جگہ میں خرچ نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہ ہر چیز میں اسراف کرنے پر وعید اور ڈانٹ ہے، اس لیے کہ جو اللہ کا محبوب نہیں وہ اہلِ دوزخ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تو اللہ کی فرماں برداری میں (جبلِ) ابوقبیس کے برابر خرچ کرے گا تو یہ اسراف نہ ہوگا اور اگر اللہ کی معصیت میں ایک صاع خرچ کرے گا تو یہ اسراف ہوگا۔[7] اس بارے میں سلف کے طویل اقوال موجود ہیں۔

اس کے بعد اللہ نے مویشی کا ذکر کیا ہے کہ ان میں کوئی حمولہ ہے، کوئی فرش ہے۔ جو بار بردار ہے، وہ حمولہ ہے۔ جس کی وبر وصوف اور بالوں سے نفع لیتے ہیں، وہ فرش ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرش بھیڑ بکری ہے،[8] اس لیے کہ اس کو لٹا کر ذبح کرتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ لغت کا اجماع ہے کہ فرش چھوٹے اونٹ کو کہتے ہیں۔[9] پھر حمولہ اور فرش کا اس طرح بیان فرمایا:[10]

---

[1] الدر المنثور (٢/ ٧٨) [2] الدر المنثور (٣/ ٣٦٩) [3] تفسير الخازن (٢/ ١٩١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٤) معاني القرآن (٢/ ٢٩٧)

[5] تفسير الطبري (١٢/ ١٧٥) [6] تفسير البغوي (٣/ ١٩٦) [7] تفسير الطبري (١٩/ ٢٩٩)

[8] الدر المنثور (٣/ ٣٧١) [9] معاني القرآن (٢/ ٢٩٨) [10] فتح البيان (٤/ ٢٥٣۔ ٢٥٨)

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ
ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ
نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٤٣﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ
وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا
اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ
اللّٰهُ بِھٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا
لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٤﴾ۧ

یہ آٹھ قسمیں (پیدا کی) ہیں دو بھیڑ میں سے اور دو بکری میں سے، (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا اس (اللہ) نے دونوں کے نر حرام کیے ہیں یا دونوں کی مادائیں یا وہ بچے جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہوں؟ (ٹھیک ٹھیک) علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو ﴿143﴾ اور دو اونٹوں میں سے اور دو گایوں میں سے۔ کہہ دیجیے: کیا اللہ نے دونوں کے نر حرام کیے ہیں یا دونوں کی مادائیں یا وہ بچے جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہوں؟ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے تمھیں یہ تاکیدی حکم دیا تھا؟ پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا، تاکہ وہ بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کرے۔ بے شک اللہ (ایسے) ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿144﴾

جانوروں کو حرام کرنے میں اہلِ عرب کی جہالت کا بیان:

یہ عرب کی جہالت کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے انھوں نے مویشی کی قسمیں اور اجزا مقرر کر کے بعض کو حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ کوئی بحیرہ تھا، کوئی وصیلہ، کوئی سائبہ، کوئی حام اور اس کے سوا جانوروں میں اور بھی قسمیں ایجاد اور ابتداع کی تھیں۔ اسی طرح کھیتیوں میں اور پھلوں میں بھی بہت قسمیں بنا رکھی تھیں۔ اللہ نے جانوروں کی قسموں کو بیان کر دیا، فرمایا کہ سفید بھیڑ ہے، سیاہ بکری ہے، پھر ان میں کوئی نر ہے، کوئی مادہ ہے۔ یہی حال اونٹ اور گائے کا ہے، سو اللہ نے تو ان آٹھ قسموں میں سے کسی شے کو حرام نہیں کیا نہ ان کی اولاد کو، بلکہ سب کو بنی آدم کے لیے پیدا کیا کہ ان کو کھائیں، ان پر سوار ہوں، ان کا دودھ پئیں، اور طرح طرح کے منافع حاصل کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾ یہ جو فرمایا کہ جس پر ان کے پیٹ لپٹ رہے ہیں، یہ مشرکین کے اس قول کا رد ہے جو اوپر گزرا: ﴿ مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓي اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَاۗءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴾ [الأنعام: ١٣٩] ”ان (حرام کیے ہوئے) چوپایوں کے پیٹ میں جو بچہ ہو وہ خالص

ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے، اور اگر وہ مردہ ہو تو (مرد اور عورتیں) سب اس میں شریک ہیں۔ جلد ہی اللہ انھیں اس طرح (خود ہی حلال اور حرام) طے کرنے کی سزا دے گا، بے شک وہ بڑا حکمت والا، خوب جاننے والا ہے۔'' یعنی پیٹ کے اندر جو بچے ہیں وہ مردوں کو حلال عورتوں پر حرام ہیں۔ سو مجھے یقین سے خبر دو کہ ان کو اللہ نے تم پر کس طرح حرام کیا؟ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی تحریم کا زعم تم کو کہاں سے حاصل ہوا؟

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ سب انواع حلال ہیں۔[1] اللہ نے ان کی بدعت پر بطور تحکم فرمایا کہ کیا تم اس وقت حاضر تھے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان مویشی کو تمھارے خیالِ مختل اور زعمِ باطل کے مطابق حرام کیا تھا۔ یہ تو اللہ پر محض تمھارا افترا ہے جو تم نے ان جانوروں کو حرام کر رکھا ہے۔ بھلا اس سے بھی زیادہ کوئی ظالم ہوگا جو بغیر علم وتحقیق کے لوگوں کو اللہ کی راہ سے گمراہ کرے، اللہ راہ نہیں دکھاتا ظالموں کو۔ اس آیت میں جو سب سے پہلے داخل ہے وہ عمرو بن لحی بن قمعہ ہے جس نے سب سے پہلے دینِ انبیا کو بدل ڈالا۔ سائبہ، وصیلہ اور حام نکالا، جس طرح کہ صحیح میں آ چکا ہے۔[2] غرض کہ سب سے پہلے توحید کو توڑنے والا یہی قمعہ کا پوتا تھا جو شرک کے لیے جاگتا اور ہوشیار تھا اور جس نے ایمان سے اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ زوج فرد کے خلاف کو کہتے ہیں۔ فرد اکیلا ہوا، زوج جوڑا ہوا۔ مراد آٹھ فرد ہیں۔ فرد کو اس آیت میں زوج اس لیے کہا ہے کہ نر و مادہ میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے زوج ہے، اس کے علاوہ لفظ زوج فرد پر بھی بولتے ہیں، جیسے: ''هُمَا زَوْجٌ وَهُوَ زَوْجٌ'' ضان صوف والی بکری کو کہتے ہیں، یعنی بھیڑ۔ ﴿ اِثْنَيْنِ ﴾ سے مراد نر و مادہ ہیں، یعنی کبش ونعجہ (مینڈھا و دنبی) ﴿ اَلْمَعْزِ اثْنَيْنِ ﴾ سے مراد تیس وعنز ہے، یعنی بکرا بکری۔ تیس نر ہوا، عنز مادہ ہوئی، جبکہ اُس پر ایک برس گزر چکا ہو اور معز غنم سے ضان کے خلاف ہے، اس کی دم چھوٹی اور بال لمبے ہوتے ہیں۔ اللہ نے اس جگہ مویشیوں کی قسمیں واضح کیں۔ بندوں پر احسان کیا۔

جاہلیت کے وہ خیالات وعقائد جو بعض قسموں کے حلال اور حرام ہونے کے بارے میں تھے، ان کو دور کیا کہ وہ محض ان کی اللہ پر دروغ بافی ہے، اللہ نے تو ان سب اقسام کو حلال کیا ہے، انھوں نے اپنے جی سے بعض کو حرام ٹھہرا لیا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آٹھ ازواج یہی اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری ہیں۔[3] امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بیہقی اور ابن جریر رحمہ اللہ نے جو یہ قول نقل کیا، اس کا کچھ فائدہ ظاہر نہ ہوا، اس لیے کہ ان آٹھوں کی تصریح خود آیتِ شریفہ میں موجود ہے، تفسیر کی کیا حاجت تھی۔[4]

پھر اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم ان لوگوں سے، جو کبھی نر اور کبھی مادہ کو حرام ٹھہرا کر اللہ کی طرف منسوب

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ١٨٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٦)

[3] تفسير الطبري (١٢/ ١٨٧) سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/ ٢٢٨) [4] فتح القدير (٢/ ٢٤٠)

کرتے ہیں، یہ کہہ دو کہ ان میں حرام دو نر ہیں، یعنی کبش وتیس یا دو مادہ یعنی نعجہ وعنز؟ یہ بحیرہ وغیرہ کے سلسلے میں مشرکین کا انکار ہوا۔ مطلب یہ کہ اگر نر حرام ہے تو چاہیے کہ ہر نر حرام ہو اور اگر مادہ حرام ہے تو ہر مادہ حرام ہونی چاہیے اور اگر پیٹ کے اندر کا حرام ہے، بھیڑ ہو یا بکری تو ہر مولود کا حرام ہونا مناسب ہے، خواہ نر ہو یا مادہ، کیونکہ یہ سب مولود ہیں، تو اب سب مویشی حرام ٹھہریں گے، سوتم ان مویشیوں کے حرام ہونے کی کیفیت، جہالت کو چھوڑ کر ذرا علم کے طریقے سے بیان کرو اور ہم کو سمجھا دو کہ اس طرح پر یہ حرام ہوئے ہیں۔

یہ ارشاد ان کو ڈانٹنے، عاجز کرنے اور حجت قائم کرنے کے لیے ہے، اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ ان کو ان کے حرمت کے بارے میں عقائد کی وجوہات کا کچھ علم نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے زعم میں سچے ہیں تو خبر دیں گے۔ سو جس طرح یہ سوال بھیڑ بکری کے بارے میں پوچھا، اسی طرح اس کے بعد اونٹ اور گائے کے بارے میں پوچھنے کا حکم دیا۔ بھیڑ اور بکری کو اونٹ اور گائے سے پہلے ذکر کرنا باوجود اس بات کے کہ اونٹ اور گائے نفع کے اور جسمانی لحاظ سے بھیڑ اور بکری سے بڑھ کر ہیں، قابلِ غور ہے۔ لیث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جاموس (بھینس) اور بختی (اونٹ) ان آٹھ اقسام میں سے ہیں۔[1]

یہ دونوں آیتیں ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کے طور پر ہیں، یعنی اہلِ جاہلیت کو ان بعض جانوروں کے حرام کرنے پر اللہ کی طرف سے ڈانٹا گیا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اس جگہ اپنی طرف سے دو اور وجہیں بیان کی ہیں: ایک یہ کہ یہ آیت کچھ مشرکین کے قول کے باطل قرار دینے کے لیے استدلال کے طور پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سوال ہے کہ تم نبوت اور شریعت کو تو تسلیم نہیں کرتے تو پھر کس طرح کہتے ہو کہ یہ حلال، وہ حرام ہے۔ دوسرے تم نے صرف اونٹ میں بحیرہ، وصیلہ، سائبہ اور حام کو حرام ٹھہرایا، باقی مویشیوں میں اس قسم کی کوئی تقسیم نہیں کی، اس تخصیص کی کیا وجہ ہے، حالانکہ مویشی باعتبار نر و مادہ کے آٹھ قسم کے ہیں، کیا اللہ نے جب ان کو حرام کیا تھا تو تم موجود تھے؟ بڑا ستم گر اور جفا کار وہی ہے جو اللہ پر افترا باندھ کر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس وعید میں وہ سب لوگ داخل ہیں جو ان کے طریقے پر چلتے ہیں۔ جس چیز کا حکم اللہ اور رسول نے نہیں دیا، اس کو ابتداع کر کے اللہ یا رسول ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیوں کہ لفظ عام ہے، تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دینِ مبین اور شرعِ متین میں جو کوئی نئی بات داخل کرے گا جو اُس ملتِ حقہ میں موجود نہیں ہے، وہ بے شبہہ اس وعید میں داخل ہے۔[2] یہی وجہ ہے کہ اللہ بدعتیوں کو راہِ حق نہیں دکھاتا۔ وہ ہمیشہ بدعت کے اندھیروں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ بدعات، محدثات نکال کر اور رواج دے کر لوگوں کو بغیر علم کے جہالت اور افترا پردازی کے ذریعے گمراہ کیا کرتے ہیں۔ اللهم احفظنا منهم.

ان سے کوئی پوچھے کہ جس وقت وہ بدعت اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک حسنہ ٹھہرائی گئی تھی، تو کیا تم اس

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٠٣) [2] فتح البيان (٤/ ٢٥٨_ ٢٦١)

وقت وہاں موجود تھے یا یہ تمھارا اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر افترا ہے؟ حالانکہ قرآن و حدیث دونوں میں بدعت کی مذمت آئی ہے، پھر جو شے مذموم ٹھہری، اس میں حسن کہاں سے آیا اور کس نے وہ حسن بخشا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ﴾ [الحديد: ۲۷] ''اور رہبانیت تو انھوں نے از خود ہی ایجاد کر لی تھی، ہم نے تو ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا۔'' اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))[1] ''ہر بدعت گمراہی ہے۔'' آیتِ باب سے یہ بھی نکلتا ہے کہ بعض بدعت حدِ کفر کو پہنچ جاتی ہے، جس طرح بعض مویشیوں کی تحریم موجبِ شرک و کفر ہو گئی۔ اس حکم میں یہ بات بھی داخل ہو سکتی ہے کہ ترکِ حیوانات کسی کام کے لیے کرے گو وہ تحریم چند روز ہی کے لیے کیوں نہ ہو، اس لیے کہ جس چیز کو اللہ نے حلال کیا ہے، اس کو کوئی آدمی اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتا۔ واللہ أعلم

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴۵

(اے نبی!) کہہ دیجیے: میری طرف جو وحی کی گئی ہے، میں اس میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر، جو اسے کھائے، حرام ہو مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا سؤر کا گوشت، کیوں کہ وہ ناپاک ہے، یا وہ فسق ہو کہ (ذبح کرتے وقت) اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو، پھر جو شخص مجبور ہو جائے، (بشرطیکہ) وہ سرکشی کرنے والا اور حد سے گزرنے والا نہ ہو تو بے شک آپ کا رب بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (145)

حرام اشیا کا بیان:

یعنی جو جانور کھائے جاتے ہیں، ان میں سے یہی چیزیں حرام ہیں۔ اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم ان لوگوں سے، جنھوں نے اللہ کے رزق کو بطورِ افترا حرام کیا ہے، یہ بات کہہ دو کہ جس کو تم حرام کہتے ہو اس کو میں حرام نہیں پاتا، سوا ان چیزوں کے، یا حیوانات میں ان کی حرمت کا اس کے سوا کوئی سبب معلوم نہیں۔ اس بنیاد پر جو اس کے بعد سورت مائدہ اور احادیث میں محرمات آئی ہیں، وہ اسی آیت کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہیں۔ بعض لوگ اس کا نام نسخ رکھتے ہیں، مگر اکثر متاخرین منسوخ نہیں کہتے، بلکہ یوں کہتے ہیں کہ یہ بات رفع مباح الاصل سے ہے۔ واللہ أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بہتا ہوا خون وہ ہے جو زمین پر گرایا گیا۔[2] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو لوگ رگوں میں سے خون نکال کر کھا جاتے، جس طرح یہود نے کیا تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۸۶۷) [2] تفسير الطبري (۱۲/ ۱۹٤) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ۱٤۰٦) اس کی سند حسن ہے۔

کہ خون وہی ہے جو مسفوح ہو، یعنی رواں و ریختہ۔ رہا وہ خون جو گوشت میں لپٹا ہو، اس کا کچھ ڈر نہیں۔[1] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جاہلیت والے بعض چیزیں کھاتے اور بعض کو گھِن کر کے چھوڑ دیتے۔ اللہ جل شانہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، کتاب اتاری، حلال و حرام بیان کر دیا، سو جس کو حلال ٹھہرایا وہ حلال ہے اور جو حرام ٹھہرایا وہ حرام ہے اور جس سے سکوت کیا وہ معاف ہے، پھر یہ آیتِ باب پڑھی۔[2] (رواه الحاكم وقال صحيح الإسناد، واللفظ لابن مردويه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کی بکری مر گئی، کہا: اے اللہ کے رسول! بکری مر گئی! فرمایا: تم نے اس کا چمڑا کیوں نہ اتار لیا؟ کہا: مردار کا چمڑہ لے سکتے ہیں؟ فرمایا: اللہ نے کہا ہے: ﴿ قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا ﴾ (آیتِ باب) سو تم کچھ اس کو کھاتے نہیں، چمڑا نکال کر فائدہ اٹھاتے۔ سودہ رضی اللہ عنہا نے اس کا چمڑا نکلوا کر ایک مشک بنائی، یہاں تک کہ وہ پرانی ہو کر پھٹ پھٹا گئی۔[3] (رواه أحمد والبخاري والنسائي) نمیلہ فزاری کہتے ہیں کہ میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھا، کسی نے ان سے پوچھا کہ قنفذ کا کھانا کیسا ہے؟ انھوں نے آیتِ باب پڑھی، ایک بوڑھا آدمی ان کے پاس بیٹھا تھا، اس نے کہا میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قنفذ کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «خَبِیْثٌ مِّنَ الْخَبَائِثِ» سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے تو اسی طرح ہے۔[4] (رواه سعيد بن منصور و أبو داود)

پھر اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کو کھانے کے لیے مضطر (مجبور) ہو جائے جس کو اس آیت میں حرام کہا ہے اور وہ بغاوت کرنے والا یا عادی نہ ہو تو اللہ اُس کو بخش دے گا۔ اس آیت کی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔ غرض کہ اس آیتِ کریمہ کی ترکیب اور اندازِ بیان سے مشرکین کی تردید ہے جو اپنی آرائے فاسدہ سے تحریمِ محرمات کی بدعات کو جاری کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلا دیا کہ جس کو تم حرام کہتے ہو، جیسے: وصائل، سوائب، بحائر اور حام وغیرہا، وہ کچھ حرام نہیں۔ حرام یہی ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں، یعنی مردار، رواں خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہے، جیسے شیخ سدو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، زین خان کا مرغا، شاہ عبدالحق کا توشہ، بی بی فاطمہ کی صحنک، فلاں پیر فقیر کی نذر و نیاز، زندہ ہو یا مردہ، یہ سب حرام ہے، جب غیر اللہ کا نام کسی کھانے والی چیز پر لگا تو اس کا کھانا حلال نہ رہا۔

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ١٩٣_ ١٩٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٠٠) مستدرك الحاكم (٤/ ١٢٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] مسند أحمد (١/ ٣٢٧) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٠٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٤٠)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٩٩) اس کی سند میں ''عیسیٰ بن نمیلہ'' اور ''نمیلہ فزاری'' مجہول راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٢٠٣)

غیر حق ہر چہ دلت را بربود سد راہ تو ہماں خواہد بود

''ناحق جس قدر تیرے دل کو اچک لے جائے گا، یعنی پسند ہو گا تو تیری راہ میں وہی رکاوٹ بن جائے گا۔''

اس کے سوا جو کچھ ہے جس کو حرام نہیں فرمایا یا اس سے خاموشی اختیار کی، اس کا کھانا حلال اور معاف ہے۔ تم کس طرح کہتے ہو کہ وہ حرام ہے؟ اللہ نے تو اس کو حرام نہیں کیا، تم کہاں سے کس دلیل سے حرام بتاتے ہو؟ اس بنا پر اب دوسری اشیا کی تحریم جو اس آیت کے بعد آئی ہے، جیسے: دیسی گدھوں کا گوشت اور درندوں اور پنجہ بردار پرندوں کا گوشت، مشہور علما کے مذاہب پر باقی نہ رہے گی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ مفتوح یوں ہے کہ اس جگہ وحی سے مراد قرآن پاک ہے۔ اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ حلال اور حرام کرنے کا دار و مدار نقل ہے (یعنی جو کچھ قرآن و حدیث میں ہے اُس کو نقل کرنا) نہ کہ محض عقل۔ طاعم سے مراد مرد و عورت سب ہیں۔ اس میں مشرکوں کی تردید ہے جو مافی البطون کو عورتوں کے لیے حرام بتاتے تھے۔ کسی نے امام شعبی رحمہ اللہ سے ہاتھی اور شیر کے گوشت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے آیتِ باب پڑھ دی۔[1]

بہر حال اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں سے یہ بات کہہ دیں کہ وحی میں سوائے ان چیزوں کے جن کا ذکر کیا گیا، اور کچھ حرام نہیں ہے۔ یہ دلیل ہے کہ ان محرمات پر انحصار کیا جائے جن کا ذکر کیا گیا، گو یہ آیت مکی نہ ہوتی لیکن اس کے بعد مدینے میں سورت مائدہ آئی۔ اس میں ان محرمات میں منخنقہ، موقوذہ، متردیہ اور نطیحہ کو زیادہ کیا اور نبی اکرم ﷺ سے ہر ناخن والے درندے اور ہر پرند جو پنجوں والا ہو اور گھریلو گدھے اور کتے اور اس جیسے دوسرے جانوروں کی تحریم ثابت ہوئی۔

غرضیکہ یہ عمومیت اگر ان حیوانوں کی نسبت سے ہے جنھیں کھایا جاتا ہے جس طرح کہ آیت کی ترکیب اس پر دلیل ہے اور استثنا سے یہ فائدہ معلوم ہوتا ہے تو جو کچھ اس کے بعد کتاب و سنت میں جس حیوان کی تحریم آئی ہے، وہ اس آیت کے ساتھ منضم (ملا ہوا) ہے اور اگر عموم حیوانوں میں سے ہر اس شے کی نسبت سے ہے جو محرم ہے تو اس کے بعد جس چیز کی تحریم آئی ہے وہ اس سے منضم ہو گی۔ ہاں سیدنا ابن عباس، ابن عمر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ کچھ حرام نہیں مگر جو اس آیت میں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ سو یہ قول ساقط ہے اور یہ مذہب نہایت ضعیف ہے، اس لیے کہ اس سے قرآن و حدیث کا اِہمال (یوں ہی چھوڑ دینا) جو اس کے بعد نازل اور ثابت ہوا ہے، لازم آتا ہے۔ حالانکہ کوئی ایسی وجہ اور سبب نہیں ہے جو اس اہمال کا مقتضی ہو اور نہ کوئی ایسی بات ہے جو اس ترکِ عمل کا موجب ہو۔[2]

---

[1] الدر المنثور (۳/ ۳۷٤) [2] فتح القدیر (۲/ ۲٤۱)

امام بخاری، ابو داود اور ابن منذر رحمہ اللہ نے عمرو بن دینار رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے پوچھا: لوگ خیال کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے زمانۂ خیبر میں حمرِ اہلیہ (گھریلو گدھے) کے گوشت سے منع فرمایا ہے۔ کہا: حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ بصرے میں اسی طرح کہتے تھے اور نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے تھے، لیکن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس بات سے انکار کیا اور آیتِ باب پڑھی۔[1]

میں کہتا ہوں کہ گو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے انکار کیا، لیکن نبی اکرم ﷺ سے تو ثابت ہوا ہے، قول نبی ﷺ کے مقابلے میں صحابی کے قول کو لے لینا اختیارِ سُوء اور عدمِ انصاف ہے۔ اس جگہ سے مراد وہ ہے جو خود بخود مر گیا ہو۔ حدیث، جس میں سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کی بکری کی موت کا ذکر ہے،[2] اوپر گزر چکی ہے کہ اُس کے چمڑے سے نفع لینے کا حکم دیا۔ اسی کے مثل ایک حدیث میمونہ رضی اللہ عنہا کی بکری کے بارے میں بھی ہے۔[3] اسی طرح پر یہ حدیث ہے کہ «إِنَّمَا حُرِّمَ مِنَ الْمَيْتَةِ أَكْلُهَا»[4] یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔

دمِ مسفوح سے مراد خونِ جاری، سائل اور ریختہ ہے، جو مسفوح نہیں وہ معاف ہے۔ جیسے وہ خون جو ذبح کے بعد رگوں میں باقی رہ جاتا ہے، منجملہ اس کے جگر اور تلی ہے۔ اسی طرح وہ خون جو گوشت سے لپٹا اور چمٹا ہوتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔[5] جاہلیت والے ذبح کر کے خون لیتے اور اس کو کھاتے، وہ دمِ مسفوح ہوتا۔ خنزیر کے گوشت کی تخصیص سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ گوشت کے سوا سور سے اور فائدہ لینا حرام نہیں ہے۔ ضمیر خنزیر یا لحم کی طرف راجع ہے، اگرچہ باقی اجزا بھی حرام ہونے میں زیادہ قریب ہیں۔ رجس بمعنی نجس ہے۔ اہلال سے مراد بتوں پر ذبح کرنا یا غیر اللہ کے نام کی آواز بلند کرنا ہے جو فسق میں توغل ہے (کمال درجے کو پہنچا ہوا فسق ہے) اس لیے اس کا نام فسق رکھا۔ ہاں مضطر شخص کو ضرورت پوری کرنے کے وقت ان محرمات کا کھانا معاف ہے، بشرطیکہ وہ باغی (اللہ کے احکام سے سرتابی کرنے والا) نہ ہو اور حد سے زیادہ تناول نہ کرے۔[6]

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٠٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٠٨)

② اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢١) سنن الدارقطني (١/ ٤٢)

⑤ تفسير القرطبي (٧/ ١٢٤) ⑥ فتح البيان (٤/ ٢٦٢_ ٢٦٥)

اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ؗۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۱۴۶

اور جو لوگ یہودی ہوئے ان پر ہم نے ہر ناخن والا (جانور) حرام کیا تھا، اور گائے اور بکری میں سے ان پر ان کی چربی حرام کی تھی، سوائے اس چربی کے جو ان کی پیٹھوں یا آنتوں کے ساتھ لگی ہو یا ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، یہ سزا ہم نے انھیں ان کی سرکشی کے باعث دی تھی اور بے شک ہم سچے ہیں ۝۱۴۶

یہود کی سرکشی کی وجہ سے ان پر حرام کردہ اشیا:

مویشیوں میں ناخن دار اونٹ ان پر حرام تھا، سو ان کی بے حکمیوں سے ان کو سخت پکڑا تھا، اصل میں یہ چیزیں حرام نہیں ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ناخن والے جانوروں سے مراد وحشی جانور اور پرندے ہیں جو کھلی ہوئی انگلیوں والے نہ ہوں، مثلاً: اونٹ، شتر مرغ اور بطخ۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی اونٹ اور شتر مرغ۔ یہی مجاہد اور سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جو کشادہ انگلیوں والے نہیں ہیں۔

دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد ہر وہ جانور ہے جس کی انگلیاں علاحدہ ہوں، ان میں سے ایک مرغ ہے۔ قتادہ نے کہا: کہتے ہیں کہ اونٹ، شتر مرغ اور کچھ پرندے اور مچھلی حرام تھی۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اونٹ اور شتر مرغ اور پرندوں میں سے بطخ اور اس سے ملتی جلتی اور ہر وہ چیز جس کی انگلیاں کشادہ نہ ہوں، حرام تھی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''اَلنُّعَامَةُ وَالْبَعِيْرُ شَقًّا شَقًّا'' قاسم بن ابی بزہ سے پوچھا: شَقًّا شَقًّا کیا ہے؟ کہا: ''كُلُّ مَا لَمْ يَنْفَرِجْ بَيْنَ قَوَائِمِ الْبَهَائِمِ'' ''ہر جانور جس کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں کشادہ نہ ہوں۔'' پھر کہا: جو منفرج ہو وہ کھاؤ، مویشیوں اور چڑیوں کے ہاتھ پاؤں منفرج ہیں۔ یہود ان کو کھاتے اور جس اونٹ اور شتر مرغ کے قوائم منفرج نہیں ہیں، اس کو یہود نہیں کھاتے ہیں اور نہ وحشی گدھوں کو کھاتے ہیں۔[1]

گائے اور بکریوں کی چربی کے حرام ہونے سے مراد ثرب و شحم کلیتین ہیں۔ یہود کہتے تھے کہ ان چیزوں کو اسرائیل نے حرام کیا تھا، اس لیے ہم بھی اس کو حرام جانتے ہیں، یہی ابن زید رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: مراد ہر ثرب اور شحم ہے جو ہڈی پر نہ ہو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی جو شحم پشت سے لگا ہوا ہے، وہ حلال تھا۔ امام سدی اور ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: الیہ (چوتڑ) اسی جنس سے ہے۔

حوایا حاویہ کی جمع ہے یا حویہ کی، یعنی وہ شے جس کو بطن حاوی ہے اور مجتمع و مستدیر ہے۔ مراد حوایا سے بنات لبن و مباعر ہیں، جن کو مرابض بھی کہتے ہیں۔ ان میں امعا یعنی آنتیں ہوتی ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حوایا مبعر

[1] تفسير الطبري (١٢/ ١٩٨۔ ٢٠٠)

ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: مربض ہے۔ سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ، ابو مالک، سدی، ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا: حوایا وہ مرابض ہیں جن میں امعا ہوتے ہیں۔ یہ اس کے وسط ہیں، یہی بنات اللبن ہیں۔ کلامِ عرب میں ان کو مرابض کہتے ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: شحم إلیہ (چوتڑ) عصص سے مختلط ہے، اس لیے حلال ہے۔ ہر شے قوائم، جنب، راس اور ان جیسے اعضا سے اور جو ہڈی کے ساتھ ہو وہ حلال ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ کا اسی کی مثل قول ہے: یہ تنگی ہم نے ان کی سرکشی اور مخالفت کے بدلے ان پر سزا کے طور پر لازم کی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے بتلایا: ﴿ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴾ [النساء: ١٦٠] ''پھر جو لوگ یہودی ہوئے ان کے ظلم کی وجہ سے اور ان کے اکثر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے ہم نے ان پر کچھ پاک چیزیں حرام کر دیں، جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔'' پھر فرمایا: ہم سچے ہیں، یعنی یہ سزا و جزا دینے میں عادل و منصف ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ہم اس خبر میں صادق ہیں جو ہم نے تمھارے رسول کو دی ہے کہ ہم نے ان اشیا کو ان پر حرام کر دیا تھا نہ کہ جس طرح وہ خیال کرتے ہیں کہ اسرائیل نے ان کو اپنی جان پر حرام کر لیا تھا۔[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خبر لگی کہ سمرہ نے شراب فروخت کی، کہا: ''أَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ حُرِّمَتْ عَلَيْهِمُ الشُّحُوْمُ فَجَمَلُوْهَا فَبَاعُوْهَا'' [2] أَخْرَجَاهُ ''کیا اسے معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے یہود پر لعنت کی، اس لیے کہ ان پر چربی حرام کی گئی تھی، مگر انھوں نے اس کو پگھلایا اور اس کی خرید و فروخت کی۔''

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فتح کے دن کہا: اللہ اور رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کر دی ہے۔ پوچھا: مردار کی چربی کا کیا حکم ہے، وہ چمڑوں کو ملتے ہیں، کشتیوں میں لگاتے ہیں اور لوگ چراغ جلاتے ہیں؟ فرمایا: یہ حرام ہے، پھر فرمایا کہ اللہ یہود کو قتل کرے، اللہ نے جب ان پر چربی کو حرام کیا تو اس کو صاف کر کے بیچ کھایا۔[3] (رواه الجماعة) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ حُرِّمَتْ عَلَيْهِمُ الشُّحُوْمُ فَبَاعُوْهَا وَأَكَلُوْا ثَمَنَهَا»[4] (رواه الشيخان) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ مقامِ ابراہیم کے پیچھے بیٹھے تھے، آنکھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: «لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ ثَلَاثًا

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٢٠١_ ٢٠٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٥٠) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٨٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٩٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٦٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨٣)

إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْهِمُ الشُّحُومَ فَبَاعُوهَا وَأَكَلُوا ثَمَنَهَا، وَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحَرِّمْ عَلٰى قَوْمٍ أَكْلَ شَيْئٍ إِلَّا حَرَّمَ عَلَيْهِمْ ثَمَنَهُ» (رواہ ابن مردویہ) [1] ''اللہ یہود پر لعنت کرے، تین دفعہ کہا، پھر کہا کہ اللہ نے ان پر چربی کو حرام کیا مگر انھوں نے اس کو فروخت کر دیا اور اس کی قیمت کھا لی اور اللہ نے ہر کسی قوم پر کوئی چیز حرام نہیں کی، مگر ان پر اس کی قیمت لینا بھی حرام کر دیا۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ اس طرح روایت کیے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں حجرِ اسود کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے، آسمان کی طرف نظر کر کے ہنسے، پھر کہا: ''اللہ یہود پر لعنت کرے! ان پر چربی حرام کی گئی، انھوں نے اس کو بیچ کر اس کی قیمت کھائی، اللہ جب کسی شے کو کسی قوم پر حرام کرتا ہے تو اس کی قیمت بھی ان پر حرام کرتا ہے۔'' [2] (رواہ أبو داود)

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیادت کی، دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عدنی چادر سے منہ چھپائے ہوئے سوتے تھے۔ پھر منہ کھول کر فرمایا: ''اللہ لعنت کرے یہود پر! حرام کہتے ہیں بکری کی چربی کو پھر اس کی قیمت کھاتے ہیں۔'' [3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «إِنَّ اللّٰهَ إِذَا حَرَّمَ عَلٰى قَوْمٍ أَكْلَ شَيْئٍ حَرَّمَ عَلَيْهِمْ ثَمَنَهَا» (رواہ أبو داود) [4] ''اللہ نے جس قوم پر کسی چیز کو کھانا حرام کیا تو ان پر اس کی قیمت لینا بھی حرام کر دیا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یوں ہیں کہ فعل سے پہلے ظرف کو رکھنے سے یہ نکلا کہ ہر ناخن والے جانور کی تحریم یہود کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کا اطلاق غیرِ یہود پر نہیں ہوتا۔ ناخن والا وہ جانور یا پرندہ ہے جو انگلیاں رکھتا ہے، اس میں گھوڑے کا سُم، اونٹ اور پنجے دار شکاری جانور داخل ہے۔ اس لیے لفظ میں اونٹ، گائے، بکری، شتر مرغ، بطخ اور ہر پنجے والا پرندہ اور ہر سُم والا جانور ہوگا۔ سُم اور اونٹ کے پاؤں کو ناخن کہنا بطور مجاز ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ناخن کا اطلاق اس پر کرنا چاہیے جس پر عرب کی لغت میں یہ لفظ صحیح بولا جاتا ہو، کیونکہ یہ عمومیت قابلِ قبول نہیں۔ ظفر (ناخن) میں پانچ لغت ہیں۔ زیادہ اعلیٰ عام قراءت ہے جس میں ''ظ'' اور ''ف'' پر پیش ہے۔ شحوم میں ثروب اور تمام چربی داخل ہے، ثرب پتلی چربی کو کہتے ہیں جو اوجھڑی اور انتڑیوں پر ہوتی ہے، [5] جیسا کہ قاموس میں ہے۔

اس جگہ وہ چربی مراد ہے جو صرف اوجھڑی پر ہو، جس طرح امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ اس کا مطلب انتڑیوں

---

[1] سنن البیهقي الکبریٰ (٦/ ١٣) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] مسند أحمد (١/ ٢٤٧) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٤٨٨) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥١٠٧)

[3] مستدرك الحاکم (٤/ ٢١٥) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٤٨٨) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥١٠٧)

[5] القاموس المحیط (١/ ٨٠)

کی چربی لینا لغوی طور پر ہے، مگر وہ چربی جو پشت کے ساتھ معلق ہو اور پیٹ کے اندر پہلو کے ساتھ ہو، اس چربی کو اللہ نے حرام چربی سے مستغنی کیا تھا کہ یہ ان پر حرام نہ تھی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو اِلْیَہ (چوتڑ) کو اس میں داخل کر رکھا ہے، سو اِلْیَہ خاص بکری میں ہوتا ہے نہ گائے میں۔ حوایا سے مراد امعاء ہیں، یعنی مباعر جن میں مینگنی جمع ہوتی ہے، جس کو ہندی میں اوجھڑی کہتے ہیں جو چربی اس پر لگی ہو، وہ ان پر حرام نہ تھی۔ یہی جمہور مفسرین کا قول ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ حوایا خزائن لبن ہیں جو امعا سے متصل ہوتے ہیں، یعنی گھیرے ہوئے یا خود وہ امعا مراد ہیں جن پر چربی ہوتی ہے، اسی طرح جو چربی ہڈی سے ملی ہوئی ہے وہ بھی حرام نہ تھی، خواہ پہلو کی ہڈی سے ملی ہوئی ہو یا سر یا آنکھ سے۔ اس میں الیہ بھی داخل ہے، اس لیے کہ ہڈیاں دم سے ملی ہوئی ہیں۔ الیہ کہتے ہیں دنبے کی چکتی کو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ الیہ کی چربی جو عصص سے ملی ہو حلال ہے۔ اسی طرح تمام ہاتھ پاؤں کی چربی اور پہلو اور سر اور آنکھ اور کان مختلط بعظم ہوتی ہے۔ یہ سب حلال ہیں۔ حرام صرف ثرب وشحم کلیہ تھا۔ یہ تحریم ان کی سرکشی اور ظلم کی سزا تھی۔ یہود جب کوئی معصیت کرتے تو ان پر سزا کے طور پر کوئی نہ کوئی حلال چیز حرام کر دی جاتی۔ وہ یہ کہتے کہ یہ سب چیزیں پہلی تمام امتوں پر ہمیشہ سے حرام چلی آتی ہیں۔ ہم نے یہ سچی خبر دی ہے۔[2]

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

پھر اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: تمھارا رب وسیع رحمت والا ہے، اور اس کا عذاب مجرم قوم سے ٹالا نہیں جاتا ﴿147﴾

رسول کی تکذیب سے وعید:

یعنی اللہ کی رحمت سے اب تک تم بچے ہو لیکن یہ نہ سمجھنا کہ عذاب پھر گیا۔ یہ بات اللہ نے مشرکین اور یہود کی تکذیب اور مخالفت کے مقابلے میں ارشاد فرمائی ہے۔ اس میں ترغیب دی ہے کہ اللہ کی وسیع رحمت اور اُس کی رضا مندی کو تلاش کریں اور رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی مخالفت سے ڈرایا ہے۔ قرآن پاک میں اکثر ترغیب اور ترہیب کو اکٹھے ذکر کیا گیا ہے جس طرح اس سورت کے آخر میں فرمایا: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الأنعام: ١٦٥] ”بے شک آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے۔ اور بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [الرعد: ٦] ”اور بے شک آپ کا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود البتہ انھیں بخشنے والا ہے، اور یقیناً آپ کا رب البتہ سخت سزا دینے

[1] تفسیر الخازن (٢/ ١٩٦) [2] فتح البیان (٤/ ٢٦٦۔ ٢٦٨)

والا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴾ [الحجر: ۴۹۔ ۵۰]

''(اے نبی!) میرے بندوں کو خبر سنا دیجیے کہ یقیناً میں خوب بخشنے والا (اور) خوب رحم کرنے والا ہوں۔ اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ... الآیة ﴾ [المؤمن: ۳] ''گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا (دینے) والا...'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۝ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴾ [البروج: ۱۲۔ ۱۴] ''بے شک آپ کے رب کی پکڑ نہایت سخت ہے۔ بے شک وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اور وہ بڑا بخشنے والا، بہت محبت کرنے والا ہے۔'' اس بارے میں آیات بہت ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تم ان جھٹلانے والوں سے کہہ دو کہ تمھارا رب وسیع رحمت والا ہے، اپنے فرماں برداروں پر رحم فرماتا ہے، دنیا میں سزا کی جلدی نہیں کرتا، تم اس دھوکے میں نہ رہو کہ یہ اہمال ہے، یعنی یوں ہی چھوڑ دیا ہے، بلکہ یہ امہال، یعنی مہلت دینا ہے۔ اُس کا عذاب مجرموں سے پھر نہیں سکتا، یعنی دنیا میں جب نازل ہوتا ہے یا آخرت میں، یہاں مراد عذابِ دنیا ہے۔ دیکھو دنیا میں ان پر پاکیزہ چیزوں کو آخر حرام ہی کر دیا تھا، مجرموں سے مراد یہود و کفار اور مشرکین ہیں۔[1]

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ
اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ
فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
تَخْرُصُوْنَ ۝۱۴۸ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ
اَجْمَعِيْنَ ۝۱۴۹ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ
حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ
اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ
بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۵۰

جن لوگوں نے شرک کیا وہ جلد ہی کہیں گے: اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے (حق کو) جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے

[1] فتح البیان (۴/ ۲۶۸)

ہمارا عذاب چکھ لیا۔ کہہ دیجیے: کیا تمھارے پاس کچھ علم ہے تو اسے ہمارے سامنے پیش کرو؟ تم تو گمان ہی کی پیروی کرتے ہو اور تم اٹکل پچو ہی سے کام لیتے ہو (148) کہہ دیجیے: پھر مضبوط دلیل تو اللہ ہی کی ہے، لہٰذا اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا (149) کہہ دیجیے: تم اپنے گواہ لے آؤ جو اس بات کی گواہی دیں کہ بے شک اللہ نے ان (چیزوں) کو حرام کیا ہے، پھر اگر وہ گواہی دیں تو بھی آپ ان کے ساتھ گواہی نہ دیں، اور آپ ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں جنھوں نے ہماری آیات جھٹلائیں اور (نہ) ان لوگوں کی (پیروی کریں) جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور وہ دوسروں کو اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں (150)

ایک مغالطہ اور اس کا جواب:

کافروں کا شبہہ ہے کہ اگر ہمارے کام اللہ کو پسند نہ ہوتے تو ہم کو کرنے نہ دیتا، اس کا جواب فرمایا کہ اگلوں کو گناہ پر کیوں پکڑا؟! معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک مدت ناپسندیدہ کام کرتے تھے اور اللہ نہیں پکڑتا تھا، آخر پکڑا۔ یہ تمھاری غلطی ثابت ہو چکی کہ دلیل نہیں رکھتے، پھر بھی نہیں مانتے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمھاری قسمت میں ہدایت نہیں رکھی گئی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک مناظرہ ہے جس کا ذکر اللہ پاک نے کیا۔ ایک شبہہ ہے جو مشرک اپنے شرک پر اور چیزوں کو حرام کرنے پر لاتے ہیں۔ اللہ کو ان کے شرک اور تحریم پر اطلاع ہے، وہ اس کو بدلنے پر قادر ہے، اس طرح کہ ہم کو الہامِ ایمان کرے یا ہمارے اور کفر کے درمیان حائل ہو جائے۔ سو جب اللہ نے تغیر نہ کی تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ہمارا یہ کفر و شرک اس کے ارادے اور مشیت سے ہے، وہ ہم سے اس کام پر راضی ہے۔ اسی لیے یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، نہ کسی چیز کو ہم حرام ٹھہراتے، جیسے اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں خبر دی ہے: ﴿ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ﴾ [الزخرف: ٢٠] ''اور انھوں نے کہا: اگر رحمان چاہتا تو ہم ان (جھوٹے معبودوں) کی عبادت نہ کرتے۔'' اسی طرح وہ آیت جو اس کے مثل سورت نحل میں ہے۔[1]

اللہ نے کہا کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی اسی شبہے پر گمراہ ہو گئے، یہ ایک ان کی بودی اور باطل حجت ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو ہرگز اللہ ان کو اپنے عذاب کا مزہ نہ چکھاتا، نہ ان کو ہلاک کرتا اور نہ اپنے رسولوں کو ان پر غلبہ دیتا، نہ مشرکوں کو انتقامِ الیم پہنچاتا۔ تمھارے پاس اگر اس بات کا کچھ علم ہے کہ اللہ تمھارے اعمال و اقوال و موجودہ حالات سے راضی وخوش ہے تو اس علم کو ہم پر ظاہر کرو، ہمیں بھی سمجھا دو۔ تم تو نرے وہم وخیال کے پابند ہو۔ اس جگہ ظن سے مراد اعتقادِ فاسد ہے۔ یہ فقط تمھاری اٹکل پچو باتیں ہیں جو تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔ اللہ اگر چاہتا سب

[1] رقم الآیة (٣٥)

کو ہدایت پر جمع کرتا، کوئی مشرک نہ ہوتا، لیکن اس کی حکمتِ تامہ اور حجتِ بالغہ ہی اس بات کی متقاضی ہے کہ ہدایت پانے والوں کو ہدایت نصیب ہو اور گمراہ رہنے والوں کو گمراہی۔ یہ سب اُس کی قدرت و مشیت و اختیار سے ہوا ہے اور ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی اور کافروں کا دشمن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ﴾ [یونس: ۹۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب، سارے ہی ایمان لے آتے۔'' نیز اُس کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ھود: ۱۱۸۔ ۱۱۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو یقیناً تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ ہمیشہ (باہم) اختلاف کرتے رہیں گے۔ سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے رب نے رحم کیا، اور اسی لیے اس نے انھیں پیدا کیا، اور آپ کے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا۔''

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی عاصی کو اللہ پر حجت نہیں ہے، بلکہ اللہ کی حجت اس کے بندوں پر ہے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ ان سے گواہ مانگ، اگر لے آئیں تو بھی تم ان کے ساتھ گواہ مت ہو، کیونکہ وہ اس حالت میں جھوٹی گواہی دیں گے، وہ تو اللہ کے برابر اوروں کو ٹھہراتے ہیں، ان کی خواہش کی پیروی نہ کر۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس جگہ مشرکین سے مراد کفارِ قریش ہیں یا سارے مشرکین۔ اللہ نے خبر دی کہ وہ یہ بات کہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا، جس طرح سورت نحل میں آیا ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [النحل: ۳۵] ''اور مشرک لوگوں نے کہا: اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے۔'' ان کو یہ خیال ہوا کہ یہ بات ان کو اس حجت سے، جس کا الزام نبی اکرم ﷺ نے ان کو دیا ہے، خلاص کر دے گی اور جو کام وہ کرتے ہیں۔ حق ہے، اگر حق نہ ہوتا تو ان کے باپ دادوں کے پاس جو شرک پر مرے ہیں اور جنھوں نے اللہ کے حلال کو مثلاً حرام کیا تھا، رسول آتے، شرک سے ان کو روکتے۔ اللہ نے کہا ہے کہ اگلے مشرکوں اور گزری ہوئی امتوں کے کافر لوگوں نے بھی اپنے پیغمبروں سے ایسی گفتگو کی تھی جس پر عذاب آیا۔ یہ آیت قدریہ اور معتزلہ کی دلیل ہے، لیکن اس میں جبر اور اعتزال کے مذہب پر کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اللہ کا امر اللہ کی مشیت و ارادے سے الگ تھلگ ہے۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ مشیت سے دعوتِ انبیا کو دفع کرنا لازم نہیں آتا، ہاں تمھارے پاس اگر کوئی ایسی صحیح

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۵۱۔ ۲۵۲)

دلیل ہو جو علمِ نافع پر مبنی ہو یا کتاب میں سے کوئی قوی حجت ہو جس پر یقین کیا جا سکے کہ اللہ تمھارے اس شرک وکفر اور تحریم پر راضی ہے تو پیش کرو کہ ہم بھی اس کو سمجھیں بوجھیں۔ اس جواب کا مقصد ان کی سرزنش ہے، اس لیے کہ ان کے پاس علم کا نہ ہونا معلوم ہے، اسی لیے یہ کہا کہ وہ ظن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، جو خطا اور جہالت کا مقام ہے نہ کہ علمِ صالح اور حجت کی پیروی ہے۔ وہ تو نرے توہّم پر چلتے ہیں، اللہ پر اٹکل سے جو چاہتے ہیں بکتے ہیں۔ اے رسول! تم کہہ دو کہ حجتِ بالغہ اللہ ہی کو ہے، اُس کی حجت کے سامنے تمام عذر منقطع اور سارے شبہات وگمان وتوہمات باطل ہیں۔ اس حجت سے مراد نازل شدہ کتابیں، اللہ کے رسول اور نبیوں کے معجزے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حجت بمعنی سلطان ہے۔[1] وہ چاہتا تو تم سب کو حجتِ بالغہ کی راہ پر لگا دیتا مگر اس نے ایسا نہ چاہا، اس لیے تم گمراہ رہے، اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا﴾ [الأنعام: ١٠٦]، ﴿مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [الأنعام: ١١١]، اس جیسی بہت سی آیتیں ہیں۔ غرضیکہ خارج میں منفی مشیتِ ہدایتِ کل ہے، ورنہ بعض نے ہدایت بھی پائی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ شر تقدیر سے ہے، کہا کہ ہمارے اور اہلِ قدر کے درمیان یہ آیت ہے، عجز اور کَیس (عاجزی اور دانائی) سب تقدیر سے ہوتا ہے۔[2] علی بن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے قدریہ کی حجت منقطع ہو گئی: ﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (آیتِ باب)[3] پھر ایک دوسری سرزنش فرمائی کہ اچھا تم اپنے گواہ بلاؤ کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے، حالانکہ اللہ کو معلوم ہے کہ ان کے پاس اس بات کے گواہ نہیں ہیں، سو یہ اس لیے کیا کہ ان پر حجت کا الزام ہو، ان کی گمراہی ظاہر ہو جائے۔ یہ بات ثابت ہو کہ ان کے پاس سوائے تقلید کے اور کوئی دلیل نہیں۔ پھر اگر وہ بطور تعصب ومجازفت، بغیر علم، ازراہِ جہالت گواہی دینے کو تیار بھی ہوں اور جھوٹے شہود لائیں تو تم ان کی تصدیق نہ کرو اور نہ وہ جھوٹی گواہی مانو وہ تو جھوٹوں اور جھٹلانے والوں کے سردار ہیں، ان کی خواہشات کی پیروی نہیں کرنی چاہیے اور نہ ان کا اتباع کرنا چاہیے جو آخرت کے منکر اور اللہ کے برابر اور مخلوقات کو ٹھہرانے والے ہیں۔ اللہ کا عدیل وشریک مقرر کرتے ہیں۔[4]

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا
بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ
نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ

---

[1] الدر المنثور (٣/ ٣٨٠) [2] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[3] الدر المنثور (٣/ ٣٨٠) [4] فتح البيان (٤/ ٢٦٩۔ ٢٧١)

مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۵۱

کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں، اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں، اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو، ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے، تاکہ تم عقل سے کام لو ۝۱۵۱

رسول اللہ ﷺ کی دس وصیتیں:

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جو کوئی یہ چاہے کہ نبی اکرم ﷺ کی وصیت دیکھے، جس پر آپ ﷺ کی مہر لگی ہے تو وہ ان آیتوں کو ﴿ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ تک پڑھے۔[1] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سورۃ الانعام میں آیاتِ محکمات ہیں، وہ ام الکتاب ہیں، پھر ان آیتوں کو پڑھا۔[2] سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کون مجھ سے تین باتوں پر بیعت کرتا ہے؟'' پھر یہ آیت پڑھی، جب فارغ ہوئے تو فرمایا: ''جس نے بیعت کو پورا کیا، اس کا اجر اللہ پر ہے اور جس نے کم کیا کچھ ان میں سے اور پالیا اس کو اللہ نے دنیا میں وہ عقوبت ہے اور جس کو تاخیر دی، آخرت تک اُس کا کام اللہ کے اختیار میں ہے، چاہے عذاب کرے، چاہے معاف کرے۔[3] (رواه الحاكم وقال صحيح الإسناد) ہاں شیخین نے عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ: «بَايِعُوْنِيْ عَلٰى أَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا... الحديث» سے اتفاق کیا ہے۔[4] سفیان بن حسین ان دونوں حدیثوں کے راوی ہیں، کوئی شخص جمع بین الحدیثین کے وقت کسی ایک کے بارے میں وہم نہ کرے۔ واللہ أعلم

شرک سے ممانعت:

رہی اس آیت کی تفسیر سو اللہ نے اپنے رسول سے فرمایا کہ تم ان مشرکوں سے جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، جو اللہ نے دیا اس میں سے حرام کرتے ہیں، اولاد کے قاتل ہیں اور یہ کام اپنی فاسد رائے اور شیطانی تسویل (جھوٹی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤١٤) اس کی سند میں ''داود بن یزید اودی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٨) اس کی سند میں ''سفیان بن حسین عن الزہری'' ضعیف راوی ہے۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)

باتوں) سے کرتے ہیں، یہ بات کہہ دو کہ آؤ ہم تو اس چیز کی، جو اللہ نے حرام کی ہے، سچی خبر دیں، محض گمان اور اٹکل پچو سے نہیں، بلکہ وحی اور اللہ کے علم اور حکم سے۔ وہ حرام چیز اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے، یعنی اللہ نے تم کو وصیت کی ہے کہ تم کسی شے کو باری تعالیٰ کا شریک نہ کرو، جس طرح آیت کے اخیر میں فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾

صحیحین میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آ کر مجھے بشارت دی کہ تیری امت میں سے جو کوئی مرا اور وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا تھا، وہ بہشت میں جائے گا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے کہا: گو اس نے چوری کی ہو یا زنا؟ کہا: گو سارق (چور) اور زانی ہو۔ میں نے کہا: "وَإِنْ زَنیٰ وَإِنْ سَرَقَ" فرمایا: «وَإِنْ زَنیٰ وَإِنْ سَرَقَ» میں نے کہا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہے یا چوری؟ فرمایا: اگرچہ اس نے زنا کیا یا چوری کی یا شراب پی ہو۔[1] بعض روایات میں یہ ہے کہ تیسری بار میں یوں فرمایا: «وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ» یعنی گو ابو ذر کی ناک خاک آلود ہو۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ پوری حدیث بیان کرنے کے بعد کہتے: «وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ»[2]

بعض مسانید و سنن میں ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ کہتا ہے: "اے ابن آدم! جب تک تو مجھ کو پکارے گا اور مجھ سے امید رکھے گا میں تجھ کو بخشتا رہوں گا، جو کچھ تجھ سے ہوا ہو، میں اس کی کچھ پروا نہیں کرتا اور اگر تو میرے پاس زمین بھر خطائیں لے کر آئے گا میں تیرے پاس زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا، جب تک کہ تو نے میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کیا ہے۔ اور اگر خطا کی ہے تو نے اور وہ خطائیں آسمان کی چوٹی تک پہنچیں، پھر تو مجھ سے بخشش چاہے تو میں تجھ کو بخش دوں گا۔"[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کا شاہد قرآن میں ہے: ﴿ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨۔ ١١٦] "اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے۔"[4] صحیح مسلم میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیا ہے: «مَنْ مَّاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ»[5] "جو شخص اس حالت میں مرا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا تھا، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔" اس بارے میں آیات اور احادیث بہت ہیں۔

سیدنا ابو الدرداء اور عبادہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے: «لَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ وَإِنْ قُطِّعْتُمْ أَوْ صُلِّبْتُمْ أَوْ حُرِّقْتُمْ»[6] "اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا اگرچہ تمھیں کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیا جائے یا جلا دیا جائے۔" (رواہ ابن مردویہ) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ نبی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤)

[3] مسند أحمد (٥/ ١٦٧) سنن الدارمي (٢/ ٤١٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٧) [4] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٥٣)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢) [6] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٥٣)

اکرم ﷺ نے سات خصلتوں کی وصیت کی، ایک یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اگرچہ تم جلائے جاؤ یا ٹکڑے کیے جاؤ، یا سولی چڑھائے جاؤ۔[1]

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم:

پھر یہ وصیت کی کہ ماں باپ سے احسان کرو۔ بعض نے یوں پڑھا ہے: ﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ”اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین سے اچھا سلوک کرو۔“ یعنی والدین سے احسان کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور والدین کے ساتھ نیکی کو قرآن میں اکثر اکٹھا ذکر کیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [لقمان: ١٤۔ ١٥] ”(اور) یہ کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر کر (بالآخر) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے، جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کرنا اور دنیا میں بھلے طریقے سے ان دونوں سے اچھا سلوک کر اور اس شخص کے طریقے کی اتباع کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے، پھر میری ہی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر میں تمھیں بتاؤں گا جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے۔“

غرضیکہ یہ حکم دیا کہ ماں باپ سے ان کے حال کے مطابق احسان کرتے رہو، گو وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں۔ نیز فرمایا: ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ [البقرة: ٨٣] ”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پکا وعدہ لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین، رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں سے نیک سلوک کرنا اور تم لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز قائم کرنا، اور زکات دینا، پھر تم اس (وعدے) سے پھر گئے، مگر تم میں سے تھوڑے (اس کے پابند رہے) اور تم تو پھر جانے والے ہی ہو۔“ اس بارے میں آیات بہت سی ہیں۔

صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: ”وقت پر نماز پڑھنا۔“ میں نے کہا: پھر کون سا عمل؟ فرمایا: ”ماں باپ سے نیکی کرنا۔“ میں نے کہا: پھر کون سا عمل؟

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤١٤) اس کی سند میں ”سلمہ بن شریح“ اور ”یزید بن قوذر“ مجہول راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٩٩١)

فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔'' سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے یہ باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں اور اگر میں زیادہ پوچھتا تو زیادہ کہتے۔[1] معلوم ہوا کہ والدین کے ساتھ نیکی نماز کے بعد اور جہاد سے پہلے ہے۔ سیدنا ابو الدرداء اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مجھ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی کہ اپنے والدین کی اطاعت کر اور اگر وہ تجھ کو حکم دیں کہ تو ان کے لیے دنیا سے نکل جا تو ایسا ہی کر۔ (رواہ ابن مردویہ) لیکن اس کی اسناد میں ضعف ہے۔[2]

مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے سے ممانعت:

پھر اللہ پاک نے والدین اور دادا کے ذکر کے بعد بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ احسان کرنا ذکر کیا۔ فرمایا کہ ان کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، یہ اس لیے کہ صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا: یہ کہ تو اللہ کے برابر کسی کو ٹھہرائے، حالانکہ اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ میں نے کہا: پھر کون سا گناہ؟ فرمایا: یہ کہ تو اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کرے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے، میں نے پوچھا کہ پھر کون سا؟ فرمایا: یہ کہ تو ہمسائے کی عورت سے زنا کرے، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٨] ''اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اور وہ کسی نفس کو بھی جسے (مارنا) اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ناحق قتل نہیں کرتے اور وہ زنا نہیں کرتے، اور جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ گناہ کی سزا پائے گا۔''[3]

قتلِ نفس اور زنا کو شرک باللہ کے برابر ٹھہرایا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ املاق فقر ہے،[4] یعنی فقیری آنے پر اولاد کو جان سے نہ مارو۔ سورت بنی اسرائیل میں اس طرح آیا ہے: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ﴾ [بني إسرائيل: ٣١] ''اور تم اپنی اولاد کو غریبی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔'' یعنی فقیری آنے کے خوف سے ان کو قتل نہ کرو۔ اس لیے اس جگہ یوں کہا ہے کہ تم کو اور ان کو رزق ہم دیتے ہیں۔ پہلے ان کے رزق کا ذکر کیا کہ اس کے مہتمم ہم ہیں، تم ان کو اپنی محتاجی اور مفلسی کے سبب سے، جو اُن کے رزق کی وجہ سے خیال کرتے ہو، مت مارو کہ یہ رزق اللہ کے ذمے ہے اور یہاں جو فقر حاصل تھا، اس لیے ﴿ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ﴾ [بني إسرائيل: ٣١] فرمایا۔ اس لیے کہ اہم یہی کام ہے۔ واللہ أعلم.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٥٤) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٩٩١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٨٣)

[4] تفسير الطبري (١٢/ ٢١٧)

برائیوں سے ممانعت:

پھر فاحشات کے قریب جانے سے، ظاہر ہوں یا باطن، منع کیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٣] ''کہہ دیجیے: بے شک میرے رب نے بے حیائی کی باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے، چاہے وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی اور گناہ کو اور ناحق ظلم کو بھی اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم اللہ کے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اُتاری، اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہو جو تم نہیں جانتے۔'' اس کی تفسیر اس آیتِ کریمہ کے تحت گزر چکی ہے: ﴿ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ﴾ [الأنعام: ١٢٠] ''اور تم کھلے اور چھپے گناہ چھوڑ دو۔'' فواحش، بغی اور اثم کو شرک کے ساتھ ذکر کیا، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ کام کبیرہ گناہوں میں سے ہیں، شرک کی طرح گناہ ہیں۔

صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی اللہ سے زیادہ غیرت مند نہیں ہے، اسی لیے اس نے فواحش کو حرام کیا ہے، ظاہر ہوں یا باطن۔''[1] سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اگر میں اپنی بیوی کو کسی مرد کے ساتھ دیکھوں تو اس کو تلوار سے ماروں، ہرگز نہ چھوڑوں، یہ بات نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی، فرمایا: ''تم سعد کی غیرت پر کیا تعجب کرتے ہو؟ اللہ کی قسم ہے! میں سعد سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت رکھتا ہے، اس لیے فواحش کو حرام کیا ہے، کھلے ہوں یا چھپے۔''[2] (أخرجاه)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: ہم غیرت کرتے ہیں، فرمایا: ''واللہ! میں بھی غیرت کرتا ہوں اور اللہ مجھ سے بھی زیادہ غیرت رکھتا ہے۔ اللہ کی یہ غیرت ہے کہ اس نے فواحش سے منع کیا۔''[3] (رواہ ابن مردویہ) اس کو اصحابِ ستہ میں سے کسی نے روایت کیا، مگر شرطِ ترمذی پر ہے، اس لیے کہ ایسی سند سے ترمذی نے دوسری حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے: «أَعْمَارُ أُمَّتِي مَا بَيْنَ سِتِّيْنَ إِلَى السَّبْعِيْنَ»[4] ''میری امت کی عمریں ساٹھ سے ستر سال کے درمیان ہیں۔''

ناحق قتل کی حرمت:

پھر اللہ نے سوائے حق کے قتلِ نفس کو حرام کیا۔ یہ نہی پر تاکیداً نص ہے، ورنہ قتلِ نفس نہیِ فواحش میں داخل ہے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٩٩)

[3] مسند أحمد (٢/ ٣٢٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله ثقات'' (مجمع الزوائد: ٦/ ٣٨٧)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠٧٣)

اس لیے کہ صحیح میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، مگر تین طرح پر: شادی شدہ زانی اور جان عوض جان کے اور تارکِ دین و مفارقِ جماعت، یعنی مرتد۔ مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ قسم ہے اُس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، مسلمان مرد کا خون حلال نہیں...الخ۔[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی مثل مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان شخص کا خون حلال نہیں، مگر کسی ایک خصلت پر ان تین خصلتوں میں سے: ایک شادی شدہ زانی، دوسرا وہ شخص جس نے قتلِ عمد کیا ہو کہ وہ اس کے بدلے میں مارا جاتا ہے، تیسرا وہ شخص جو اسلام سے نکل گیا، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرتا ہے، وہ قتل کیا جائے گا یا سولی دیا جائے گا یا ملک بدر کیا جائے گا۔[2] (رواه أبو داود واللفظ للنسائي)

امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ محصور تھے، کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ کسی شخص کا خون حلال نہیں مگر تین سبب سے: ایک وہ شخص جو اسلام لانے کے بعد کافر ہو گیا یا شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کیا یا قتل کیا کسی نفس کو۔ سو قسم ہے اللہ کی کہ میں نے نہ جاہلیت میں نہ اسلام میں زنا کیا اور نہ یہ تمنا کی کہ میرے دین کے بدلے میں کوئی اور دین اختیار کروں اس کے بعد کہ اللہ نے مجھ کو ہدایت دی اور نہ میں نے کسی نفس کو قتل کیا، پھر تم کس لیے مجھ کو قتل کرتے ہو؟ (رواه أحمد والترمذي والنسائي وابن ماجة)

ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔[3] اسی طرح قتلِ معاہد (جس سے معاہدہ ہو، یعنی اہلِ حرب میں سے جس نے امان حاصل کی ہو) کی ممانعت اور اس پر سخت ڈانٹ اور وعید آئی ہے۔ سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے معاہد کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی راہ سے پائی جاتی ہے۔[4] (رواه البخاري) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ جس نے معاہد کو قتل کیا، جس کے لیے اللہ اور رسول کا ذمہ ہے، اس نے اللہ کا ذمہ توڑا، وہ جنت کی ہوا نہ پائے گا، حالانکہ اس کی ہوا ستر سال کی راہ سے پائی جاتی ہے۔ (رواه ابن ماجه) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[5] یہ اللہ نے تم کو وصیت کی ہے شاید تم اس کے امر و نہی کو سمجھو بوجھو۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٥٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٤٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٤٢)

[3] مسند أحمد (١/ ٦٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٣٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ٢٥٤۔ ٢٥٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٩٥)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٠٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٨٧) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٨٩)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کعب احبار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تورات میں اول جو دس آیتیں اتریں وہ یہی ہیں جو سورت انعام کے آخر میں آئی ہیں: ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ ... إِلىٰ آخِرِهَا ﴾[1] کعب احبار رحمہ اللہ نے ایک آدمی کو سنا وہ ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ ... الخ ﴾ پڑھتا ہے، کہا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں کعب کی جان ہے کہ یہ تورات کی پہلی آیت ہے: ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ ... إِلىٰ آخِرِ الْآيَات ﴾[2] میں کہتا ہوں کہ یہ تورات کی وہی دس وصیتیں ہیں جن کا اول یہ ہے: ''أَنَا الرَّبُّ إِلٰهُكَ الَّذِيْ أَخْرَجَكَ مِنْ أَرْضِ مِصْرَ مِنْ بَيْتِ الْعُبُوْدِيَةِ لَا يَكُنْ لَّكَ إِلٰهٌ غَيْرِيْ'' من جملہ یہ ہے: ''أَكْرِمْ أَبَاكَ وَأُمَّكَ لِيَطُوْلَ عُمْرُكَ فِيْ الْأَرْضِ الَّتِيْ يُعْطِيْكَ الرَّبُّ إِلٰهَكَ لَا تَقْتُلْ لَا تَزْنِ لَا تَسْرِقْ لَا تَشْهَدْ عَلىٰ قَرِيْبِكَ شَهَادَةَ زُوْرٍ وَلَا تَشْتَهِ بِنْتَ قَرِيْبِكَ وَلَا تَشْتَهِ امْرَأَةَ قَرِيْبِكَ وَلَا عَبْدَهُ وَلَا أَمَتَهُ وَلَا ثَوْرَهُ وَلَا حِمَارَهُ وَلَا شَيْئًا مِمَّا لِقَرِيْبِكَ'' ''میں رب تیرا معبود ہوں، جس نے تجھ کو سرزمین مصر اور خانوادۂ غلامی سے نکالا، میرے علاوہ تیرا کوئی معبود نہ ہو، اپنے باپ اور ماں کی عزت کرتا کہ تیری عمر دراز ہو، قتل نہ کر، زنا نہ کر، چوری نہ کر، اپنے کسی عزیز کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دے، اپنے عزیز کی بیٹی، بیوی، غلام، لونڈی، بیل، گدھے اور کسی بھی چیز میں رغبت نہ رکھ۔''

شاید مراد کعب احبار رحمہ اللہ کی یہی وصیتیں ہیں۔ یہود کو ان وصیتوں کا بڑا لحاظ اور خیال ہے۔ اہلِ زبور نے ان کو زبور کے آخر میں اور اہلِ انجیل نے اول انجیل میں لکھا ہے۔ یہ وصیتیں دو تختیوں میں لکھی ہوئی ہیں، جو سبت کے متعلق ہے، اس کو ہم نے چھوڑ دیا۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دس احکام ایسے ہیں کہ امتوں اور زمانوں کے مختلف ہونے سے یہ مختلف یا تبدیل نہیں ہوتے۔ ماں باپ سے احسان کرنا یوں ہے کہ ان کے امر و نہی کو بجا لائے۔ اس احسان پر عمل کرنا یہ ہے کہ ترکِ احسان کو حرام جانے، یعنی والدین کے ساتھ ہر وقت حسنِ سلوک رکھے، اسی لیے اس کا محرمات میں ذکر کیا۔

اس کے بعد کے احکامات کا بھی یہی حکم ہے۔ مؤرج نے کہا ہے کہ املاق لغتِ لخم میں بمعنی گرسنگی ہے۔ بلوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معنی انفاق (خرچ کرنا) کے ہے۔ کسی نے کہا: بمعنی اسراف ہے۔ شمر نے کہا ہے کہ یہ معنی افساد ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے یعنی فاقہ و حاجت۔[4] ائمہ لغت و تفسیر نے اس کو اسی معنی پر لیا ہے۔ یہاں صرف املاق کہا، جب کہ سورت بنی اسرائیل میں ﴿ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ﴾ [الإسراء: ٣١] کہا، اس لیے کہ یہاں دربارۂ فقرِ ناجز احتیاج حاضر ہے، یعنی یہ آبائے فقرا کو خطاب ہے اور وہاں خطاب اغنیا کو متوقع اندیشۂ فقر پر ہے۔ شاید ان کے فقرا

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٢٥٨)
[2] تفسير الطبري (١٢/ ٢٢٧)
[3] تفسير القرطبي (٧/ ١٣٢) اللباب في علوم الكتاب (٨/ ٥٠٩)
[4] تفسير الطبري (١٢/ ٢١٧)

اور اغنیا دونوں اولاد کو قتل کرتے تھے۔ فقرا خوفِ حال سے اور اغنیا آنے والے وقت کے اندیشے سے یا یہ تفنن ہے بلاغت میں۔ مگر پہلا مطلب زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ افادۂ جدید بہتر ہے نری تاکید سے۔ ظاہر ترکیب آیت کا تقاضا یہی تھا کہ ﴿ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَإِيَّاكُمۡ ﴾ فرمایا جاتا جس طرح آیت سورت بنی اسرائیل میں ہے، کیونکہ کلام اولاد کے بارے میں ہے، لیکن یہاں خطاب آبا کو پہلے کیا، تاکہ مابعد پر دلیل کے مثل ہو۔

﴿ اَلۡفَوَٰحِشَ ﴾ سے مراد معاصی ہیں اور ان میں یہ ہے: ﴿ وَلَا تَقۡرَبُواْ ٱلزِّنَىٰٓۖ إِنَّهُۥ كَانَ فَٰحِشَةٗ وَسَآءَ سَبِيلٗا ﴾ [بني إسرائيل: ٣٢] ''اور تم زنا کے قریب مت جاؤ، یقیناً وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔'' لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ لفظ ﴿ اَلۡفَوَٰحِشَ ﴾ کا تمام محرمات اور ممنوع چیزوں کی عمومیت پر اطلاق کریں، اس میں زنا وغیرہ بھی داخل رہیں گے۔ کسی فاحشہ قسم کے گناہ کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ گو سبب خاص کیوں نہ ہو، اس لیے کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ ظاہر وہ جو کھلم کھلا بے حیائی ہو، لوگ اس پر مطلع ہوں۔ باطن وہ جس پر سوائے اللہ کے کسی اور کو اطلاع نہ ہو، مراد اعلانیہ و مخفی ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جاہلیت میں مخفی زنا کو برا نہ جانتے تھے، علانیہ کو برا سمجھتے تھے۔ اللہ نے دونوں طرح کے زنا سے منع کیا،[1] کسبی سے ہو یا خانگی سے۔ پھر قتلِ نفس کی ہر حال میں، کوئی حال کیوں نہ ہو، نہی فرمائی، مگر حالتِ حق میں یعنی بصورتِ قصاص یا شادی شدہ زانی کو رجم کرنا یا ارتداد وغیرہ پر جس کا حکم شریعت میں آیا ہے۔ قتل کو علاحدہ کر کے اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ اعظم فواحش اور اکبر کبائر ہے۔ ان سب کاموں کی تم کو وصیت کی ہے، کمال لطف و رحمت سے اور نرمی سے تم کو اپنا اوصیا ٹھہرایا ہے، یہ احسان کچھ تھوڑا نہیں ہے۔ عقل کے لیے یہ بلند چیز ہے، اس لیے یہ کہا کہ شاید تم ان کے فوائد کو سمجھو بوجھو اور دین اور دنیا میں نافع جان کر ان پر عمل کرو۔[2]

وَلَا تَقۡرَبُواْ مَالَ ٱلۡيَتِيمِ إِلَّا بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ حَتَّىٰ
يَبۡلُغَ أَشُدَّهُۥۚ وَأَوۡفُواْ ٱلۡكَيۡلَ وَٱلۡمِيزَانَ بِٱلۡقِسۡطِۖ لَا نُكَلِّفُ
نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَاۖ وَإِذَا قُلۡتُمۡ فَٱعۡدِلُواْ وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبَىٰۖ
وَبِعَهۡدِ ٱللَّهِ أَوۡفُواْۚ ذَٰلِكُمۡ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُونَ ١٥٢

اور تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ پختگی کی عمر کو پہنچ جائے اور تم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا دو، ہم کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتے۔ اور جب تم کوئی بات کہو تو انصاف سے کام لو اگرچہ (معاملہ تمھارے) قریبی رشتے دار (کا) ہو، اور تم اللہ کا عہد پورا کرو۔ ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو (152)

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٢١٩) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤١٦) اس کی سند حسن ہے۔ [2] فتح البيان (٤/ ٢٧٣۔ ٢٧٦)

یتیم کا مال کھانے کی حرمت:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری اور وہ آیت اتری: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ [النساء: ١٠] ''بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ جلد دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔'' تو جس کسی کے پاس کوئی یتیم تھا، اس نے اپنا کھانا پینا اس کے کھانے پینے سے جدا کر لیا، جو چیز بچتی وہ رکھی رہتی، یہاں تک کہ یتیم اس کو کھاتا یا وہ خراب ہو جاتی، یہ بات صحابہ پر مشکل پڑی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر ہوا، اس پر یہ آیت آئی: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٢٠] ''اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: ان کی اصلاح کرنا ان کے لیے بہت بہتر ہے اور اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہن سہن اکٹھا رکھو تو وہ تمھارے بھائی ہی ہیں۔''[1] امام شعبی اور مالک رحمہ اللہ وغیرہ سلف نے کہا ہے: مراد ﴿ اَشُدَّ ﴾ سے احتلام ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تیس برس کو پہنچنا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے: چالیس سال، کسی نے کہا ہے: ساٹھ سال، مگر یہ سب اقوال بعید ہیں۔

لین دین میں عدل قائم کرنے کا حکم:

پھر لین دین اخذ اور عطا میں عدل کو قائم کرنے کا حکم دیا، جس طرح اس کو چھوڑنے پر وعید فرمائی: ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [المطففين: ١۔ ٦] ''ڈنڈی مارنے والوں کے لیے تباہی ہے۔ وہ کہ جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیتے ہیں۔ اور جب وہ انھیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ یقین نہیں رکھتے کہ بے شک وہ (قبروں سے) اُٹھائے جائیں گے۔ ایک عظیم دن کے لیے۔ جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

اللہ نے ایک امت کو اسی کم ناپ تول پر ہلاک کر دیا تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپ تول کرنے والوں سے فرمایا: ''تم ایسے کام پر ہو جس میں اگلی امتیں تم سے پہلے برباد ہو گئیں۔'' (رواہ الترمذي) اس کی سند میں حسین بن قیس ضعیف ہے، ہاں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے باسناد صحیح موقوفاً آئی ہے۔[3] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے مرفوعاً سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ''اے گروہِ موالی! اللہ نے تم کو دو خصلتوں کی بشارت دی ہے جن کے سبب سے پہلے زمانے کے لوگ ہلاک ہو گئے: مکیال اور میزان۔'' یعنی ماپ اور تول۔[4] کسی نفس کو وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٧١) مستدرك الحاكم (٢/ ١١٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٢/ ٢٢٣) [3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢١٧) [4] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٥٦)

سو جس نے حق ادا کرنے میں اور حق لینے میں کوشش کی، پھر اگر فارغ ہونے کے بعد لینے یا دینے میں اس سے کچھ بھول چوک ہوگئی یا سہو و خطا ہوگئی تو کچھ حرج نہیں۔ ابن مسیب رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس نے اپنے ہاتھ پر ماپ تول پورا کیا اور اللہ اُس کی نیت اور اچھائی اور اُس کو پورا کرنے کو جانتا ہے، ان دونوں میں وہ ماخوذ نہ ہوگا، یہ تاویل ہے وسع کی۔ [1] (هذا مرسل غريب)

بات میں انصاف کا حکم:

یہ ارشاد کہ بات میں انصاف کرو، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ ﴾ [النساء: ١٣٥] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم انصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ۔'' اسی طرح کی آیت سورت نسا میں ہے۔ اللہ نے ہر کسی کو حکم دیا ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں عدل و انصاف کرے جور و ظلم سے بچے، گو اپنا رشتے دار بھائی بند کیوں نہ ہو، انصاف میں برابری چاہیے نہ کہ قرابت داری کا لحاظ۔ ایفائے عہد سے یہ مراد ہے کہ جو وصیت اللہ کی ہے اس پر قائم و دائم رہو، اس کے مطیع اور فرماں بردار رہو، اللہ کے امر و نہی کی اطاعت کرو، کتاب و سنت پر چلو، یہی اللہ کے عہد کو پورا کرنا ہے، شاید نصیحت ہو۔

فتح البیان کا حکم:

فتح البیان میں کہا ہے کہ مالِ یتیم کے قریب نہ جانے سے مراد اس کو اپنے اوپر پیش نہ کرو، کسی وجہ سے کیوں نہ ہو مگر اسی طرح پر کہ اس میں مصلحت ہو، یعنی مال کی حفاظت، اس کی نشوونما، یا بڑھانا ہو تجارت کر کے، نفع کمانا ہو جس وجہ سے ہو سکے، جیسے: تجارت اور مضاربت وغیرہ، یہاں تک کہ یتیم جب بالغ اور جوان ہو جائے تب وہ مال اس کے سپرد کر دیا جائے۔ اشد سے مراد استحکامِ قوتِ شباب و سن ہے، یعنی عمر کے لحاظ سے پختہ ہو کر حدِ رجال کو پہنچ جائے۔ اہلِ مدینہ کہتے ہیں بلوغ سے مراد سنِ رشد ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی بالغ ہونا۔ [2] کسی نے کہا ہے کہ انتہائے کہولت، یعنی ادھیڑ عمر تک۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ مقصود سنِ تکلیف کو پہنچنا اور برے بھلے کی پہچان ہو جانا ہے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ مال کے خرچ کرنے میں عقل مندی کا مظاہرہ کرنے والا ہو نہ کہ بیوقوفوں اور فضول خرچوں کی راہ پر چلنے والا۔

اسی طرح پر وہ آیت دلیل ہے جو سورت نسا میں آئی ہے: ﴿ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ﴾ [النساء: ٦] ''اور تم یتیموں کی جانچ پرکھ کرو، یہاں تک کہ وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم انھیں سمجھ دار پاؤ تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو۔'' نکاح کو پہنچنے کو جو دراصل بلوغِ سنِ تکلیف ہے، اس کو حسنِ تدبیر کے حامل ہونے کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ امام شعبی اور امام مالک رحمہما اللہ نے کہا ہے:

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٥٦) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز اس کی سند میں ''مبشر بن عبید'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٢/ ٢٢٣)

''اَلْأَشَدُّ، اَلْحُلُمُ'' (احتلام کو پہنچنا) ہے جب کہ حسنات اور سیئات لکھے جاتے ہیں۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد عقل اور اجتماع قوت ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پچیس برس۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اٹھارہ برس سے تیس برس تک۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بیس برس۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تینتیس برس۔[1] پھر کسی نے چالیس سے ساٹھ سال تک بتائے ہیں۔ یہ سب اقوال جوانی کی انتہا ہیں نہ کہ ابتدا۔ اختیار کرنے کے لائق تو پہلا ہی قول ہے۔

﴿ اَلْكَيْلَ ﴾ وہ پیمانہ ہے جس سے ماپتے ہیں۔ میزان ترازو ہے جس سے تولتے ہیں۔ قسط بمعنی عدل ہے، یعنی خرید و فروخت اور لینے اور دینے کے وقت بخس یعنی کمی نہ کرو۔ یہ تکلیف تمھاری وسعت میں داخل ہے۔ جہاں تک ہو سکے پورا پورا ماپ تول کرو۔ خطا پر مواخذہ نہیں جس طرح حدیث میں آیا ہے، لیکن ضامنی ہے جس طرح کتب فروع میں ذکر کیا ہے۔ پھر ہر بات میں، خبر ہو یا شہادت جرح ہو یا تعدیل، اچھے کام کی جستجو میں رہو۔ عدل و انصاف سے چلو، کسی قریب بعید کے لیے تعصب نہ کرو، کسی دوست دشمن کی طرف نہ جھکو، بلکہ سب لوگوں میں برابری کرو کہ اللہ نے تم کو اسی عدل کا حکم دیا ہے۔ آسمان و زمین اسی عدل سے قائم ہیں اور اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [النساء: ١٣٥] ''خواہ وہ تمھارے اپنے خلاف یا تمھارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہو۔''

پھر اللہ کے ہر عہد کو پورا کرو جس میں وہ عہد بھی داخل ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔ یا مراد خالق و مخلوق کے درمیان ہر عہد ہے۔ کیونکہ قرآنی آیات میں خلق کے ساتھ کیے گئے عہد کو پورا کرنے کا حکم بھی آیا ہے۔ ان پانچوں باتوں کی تم کو وصیت کی ہے، شاید تم نصیحت پکڑو۔ پانچ امر یہ ہوئے اور پانچ اس سے پہلے گزرے، جن کے بعد ﴿ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ کہا تھا، وہ ظاہر تھے، اس لیے ان کے لیے عقل اور فہم کو استعمال کرنا واجب ٹھہرا۔ یہ خفیہ اور گہری سوچ کے متقاضی ہیں، اس لیے ان میں کوشش اور ذکر کی حاجت ہے۔[2]

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٥٣﴾

اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو، اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔ اللہ نے تمھیں اس کی تاکید کی ہے، تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو (153)

صراطِ مستقیم پر چلنے اور دیگر راستوں سے گریز کا حکم:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت مین اور اس جیسی دوسری آیات کے بارے میں بشمول اس آیت

---

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢٠٤) [2] فتح البيان (٤/ ٢٧٦۔ ٢٧٨)

کے: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ [الشوریٰ: ۱۳] ''تم اس دین کو قائم رکھو اور تم اس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ۔'' کہا ہے کہ اللہ نے مومنوں کو جماعت کا حکم دیا ہے اور اختلاف اور فرقے بندی سے منع کیا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ اگلے لوگ اللہ کے دین میں اسی جھگڑے اور لڑائیوں کی وجہ سے ہلاک و برباد ہو گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ایک لکیر کھینچی، پھر کہا کہ یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں اور لکیریں کھینچیں اور کہا کہ یہ سُبل ہیں، ان میں کوئی بھی سبیل یعنی راہ نہیں، مگر اس پر ایک شیطان ہے جو اس کی طرف بلاتا ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا ... الخ﴾[2] (آیتِ باب) (رواہ أحمد والحاکم وقال صحیح ولم یخرجاہ) اس حدیث کو اہلِ علم کی ایک جماعت نے اپنے اپنے سند وطریق سے روایت کیا ہے: جیسے ابو جعفر رازی، یزید بن ہارون، مسدد، نسائی، ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہم اللہ وغیرہم۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کا شاہد وہ حدیث ہے جس کو امام احمد نے طریقِ شعبی سے، اس نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ کہا: ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچا، کہا کہ یہ اللہ کی راہ ہے، پھر دو خط دائیں اور بائیں کھینچے اور کہا: یہ شیطان کی راہ ہے، پھر اپنا ہاتھ درمیانی خط پر رکھ کر یہ آیت پڑھی: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا ... الخ﴾[3] (آیتِ باب) (رواہ ابن ماجه و البزار)

امام ابن مردویہ کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچا، پھر اس کے داہنی طرف اور ایک خط بائیں طرف کھینچا اور اپنا ہاتھ خطِ اوسط پر رکھا اور یہ آیت پڑھی۔[4] لیکن اس کا اعتماد اس حدیث پر ہے جو سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، باوجود اس اختلاف کے جو اس میں ہے، اگر موثر ہو اور ان پر موقوف بھی مروی ہے۔ ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے؟ کہا: '' تَرَكَنَا مُحَمَّدٌ فِيْ أَدْنَاهُ، وَطَرَفُهُ فِي الْجَنَّةِ، وَعَنْ يَمِيْنِهِ جَوَادٌّ وَعَنْ يَّسَارِهِ جَوَادٌّ وَ ثَمَّ رِجَالٌ يَّدْعُوْنَ مَنْ مَّرَّ بِهِمْ، فَمَنْ أَخَذَ فِيْ تِلْكَ الْجَوَادِّ انْتَهَتْ بِهِ إِلَى النَّارِ، وَمَنْ أَخَذَ عَلَى الصِّرَاطِ انْتَهٰى بِهِ إِلَى الْجَنَّةِ، ثُمَّ قَرَأَ ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا ... الخ﴾'' (رواہ ابن جریر و ابن مردویه) یعنی چھوڑا ہم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک راہ پر جس کی

---

① تفسیر الطبري (۱۲/ ۲۲۹۔ ۲۳۰)

② مسند أحمد (۱/ ٤٦٥) مستدرك الحاکم (۲/ ۲٦۱) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ۳٤۳) تفسیر الطبري (۱۲/ ۲۳۰) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

③ مسند أحمد (۳/ ۳۹۷) مستدرك الحاکم (۲/ ۳٤۸) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۱) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: ضلال الجنة (۱/ ۸)

④ تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۵۷)

طرف جنت میں ہے، اس کے دائیں طرف اور رستے ہیں اور بائیں طرف بھی، اور کچھ لوگ بلا رہے ہیں، اُس کو جو کوئی ان پر گزرتا ہے، جو کوئی ان راہوں پر لگا اس کو آگ میں پہنچا دیا اور جس نے سیدھا ہاتھ پکڑا اس کو جنت تک پہنچا دیا، پھر آیتِ باب پڑھی۔[1]

نواس بن سمعان نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کہا ہے کہ اللہ نے صراطِ مستقیم کی مثال بیان کی، اس کے دونوں جانب دو دیواریں ہیں، ان میں دروازے ہیں کھلے ہوئے، دروازوں پر پردے لٹکتے ہیں، صراط کے در پر ایک پکارنے والا کہتا ہے: لوگو! ادھر آؤ، تم سب سیدھے راستے پر لگو، جدا جدا نہ چلو اور ایک پکارنے والا صراط کے اندر سے پکارتا ہے، انسان جب چاہتا ہے کہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولے تو وہ کہتا ہے: افسوس ہو تجھ پر تو اس در کو نہ کھول تو اگر اس کو کھولے گا تو اس کے اندر چلا جائے گا۔ سو صراط یعنی سیدھا راستہ اسلام ہے، دو سُور یعنی فصیل اللہ کے حدود ہیں، کھلے ہوئے دروازے محارم ہیں۔ اللہ کے داعی صراط کے سر پر کتاب اللہ ہے، داعی فوق صراط سے مراد اللہ کا واعظ ہے جو مسلمان کے دل میں ہے۔[2] (رواه أحمد والترمذي والنسائي) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

سبیل کو بلفظِ واحد ذکر کیا، اس لیے کہ حق ایک ہوتا ہے نہ کہ چند، اسی لیے مقامِ تفرق وتشعب (فرقہ بندی و انتشار) میں سُبُل فرمایا بلفظ جمع جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢٥٧] ''اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے دوست طاغوت ہیں، وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں، وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «أَيُّكُمْ يُبَايِعُنِي عَلٰى هٰؤُلَاءِ الثَّلٰثِ ثُمَّ تَلَا: ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ ... الخ﴾ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ ثَلَاثِ الْآيَاتِ، ثُمَّ قَالَ: وَمَنْ وَفّٰى بِهِنَّ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ وَمَنِ انْتَقَصَ مِنْهُنَّ شَيْئًا فَأَدْرَكَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا كَانَتْ عُقُوْبَتُهُ وَمَنْ أَخَّرَهُ إِلَى الْآخِرَةِ كَانَ أَمْرُهُ إِلَى اللّٰهِ إِنْ شَاءَ أَخَذَ وَإِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ»[3] آیاتِ مذکورہ کے شروع میں اس حدیث کا ترجمہ گزر چکا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ هٰذَا صِرَاطِيْ ﴾ ان اوامر ونواہی کی طرف اشارہ ہے جو ان آیات میں مذکور ہیں۔

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٢٣٠۔ ٢٣١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ نیز ''ابان بن ابی عیاش'' متروک راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (٤/ ١٨٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٥٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٦١) صحيح الجامع، رقم (٣٨٨٧)

[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

یہی مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یا ساری سورت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس پوری سورت میں اثباتِ توحید و نبوت اور شریعت ہی کا بیان ہے۔ مصحفِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں یہ الفاظ ہیں: "هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكُمْ" "یہ تمھارے رب کا راستہ ہے۔" مصحفِ ابی رضی اللہ عنہ میں "رَبِّكَ" "تیرے رب" کے الفاظ ہیں۔[1] صراط طریق (راستے) کو کہتے ہیں، طریقِ دین یعنی اسلام مراد ہے۔ مستقیم سے مراد مستوی ہے، یعنی برابر راہ جس میں کجی نہ ہو اور اس میں سے پگڈنڈی راہیں نکلی ہوں کہ جو ادھر جائے وہ راستے سے نکل کر دوزخ میں جا پڑے اور جو سیدھی راہ پر چلے وہ نجات پائے۔ جملتاً وتفصیلاً اس صراط کے اتباع کا حکم دیا ہے، باقی سارے سُبل پر چلنے سے منع کیا ہے، مراد مختلف دین اور مختلف بدعات ہیں جن کے طریقے ایک دوسرے سے مختلف، جن کے آرا و اہوا مضل (گمراہ کن) ہیں، ان پر جو کوئی چلے گا وہ راہِ حق اور سیدھے راستے سے بہک جائے گا، یعنی دینِ اسلام سے گمراہ ہوگا۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سبل یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور تمام ملتوں اور اہلِ بدعت و ضلالات اور اہلِ اہوا اور شذوذ کو فروعات وغیرہ میں اور اہلِ تعمق کو جدال (لڑائی جھگڑا) کرنے اور خوضِ کلام میں شامل ہیں، کیونکہ یہ سب زلل ولغزش کے مظنے میں سوئے معتقد کی علامتیں ہیں۔[2] قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جان لو کہ راہ ایک ہی راہ ہے، ہدایت والی جماعت کی جس کا انجام بہشت ہے۔ ابلیس نے سبلِ متفرقہ ایجاد کیے، وہ جماعتِ ضلالت ہے، اس کا انجام آگ ہے۔[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سب سبل سے مراد ضلالات ہیں۔[4] پھر کہا ہے کہ جمیع کتاب میں یہ آیات محکمات ہیں، ان میں سے کوئی شے منسوخ نہیں ہوئی۔ یہ سب بنی آدم پر محرمات ہیں۔ یہ ام الکتاب ہیں، ان پر عمل کرنے والا جنت میں داخل ہوگا، ان کا تارک جہنم میں جائے گا۔[5] اللہ نے ان کی وصیت کی ہے کہ شاید تم لوگ ان مختلف طریقوں اور گمراہ کن راستوں سے بچتے رہو۔[6]

میں کہتا ہوں کہ جس طرح یہ آیتِ پاک ادیانِ باطلہ کی ممانعت پر دلیل ہے، اسی طرح دینِ اسلام میں فرقہ بندی کی ممانعت پر بھی دلیل ہے۔ پس جو راہ کتاب وسنت کی راہ کے سوا ہے، جس پر تین خیر القرون جن کی شہادت دی گئی ہے، گزرے ہیں، وہ ان سبل میں داخل ہے، جن سے منع کیا گیا ہے، خواہ تقلید مذاہبِ ائمہ ہو یا تدبیج مشاربِ بدعیہ، خواہ وہ بدعتیں قدیم ہوں، جیسے: قدر، جبر اور اعتزال وغیرہ یا جدید ہوں، جیسے: نیچریت، صلح کل اور مداہنتِ مذہب۔ بہرحال من جملہ وصایائے الٰہی کے جو اس جگہ ذکر فرمائے ہیں، ایک وصیت یہ بھی ہے کہ تم متفرق راہوں پر نہ چلو، اللہ کے بندے رسول کی امت ہو کر کسی اور پیر، شہید، امام، عالم، درویش کے بندے اور امت نہ بنو کہ وہ سب سبل کی تعریف میں آتے ہیں۔ حالانکہ خود ائمہ دین اور سارے مجتہدین سلف و خلف نے یہی وصیت کی ہے کہ کوئی ان کی

---

[1] فتح القدير (٢/ ٢٤٩) [2] تفسير القرطبي (٧/ ١٣٨) [3] الدر المنثور (٣/ ٣٨٥)
[4] تفسير الطبري (١٢/ ٢٣٠) [5] تفسير البغوي (٣/ ٢٠٤) [6] فتح البيان (٤/ ٢٧٨۔ ٢٧٩)

تقلید نہ کرے۔ سب کے سب اتباع کتاب وسنت کریں۔ یہ وصیت اہلِ حدیث سے پوری ہوئی، باقی سارے مسلمان کچھ نہ کچھ بھول چوک گئے۔ ان کا ذکر نہیں ہے جن کو حدیث نہیں پہنچی، وہ تو سرے سے معذور ہیں، نہ ان کا ذکر ہے جن کو حدیث پہنچی مگر کسی قوی عذر سے مجبور ہیں، نہ ان کا ذکر ہے جن کو حدیث ملی مگر فہم معنی میں خطا کی، بوجہ تاویل عمل سے باز رہ گئے۔ ان کا ذکر ہے جن کے ہاتھ میں ہر شش کتاب علم حدیث یا ان کے تراجم یا کتب فقہ، عربی، فارسی اور اردو زبان میں موجود ہیں اور وہ اس سبیلِ واحد کو چھوڑ کر سبیلِ زید وعمر پر یمیناً وشمالاً چل رہے ہیں۔ اللّٰھم غفراً

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٤﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٥٥﴾

پھر ہم نے موسیٰ کو اس لیے کتاب دی کہ جو شخص اچھے کام کرے اس پر ہماری نعمتیں پوری ہوں، اور ہر چیز کی تفصیل بیان کرنے کے لیے اور یہ ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہے، تاکہ وہ اپنے رب سے ملاقات پر ایمان لے آئیں ﴿154﴾ اور یہ (قرآن) ایک عظیم کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا ہے، (یہ) برکت والی ہے، پھر تم اس کی پیروی کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿155﴾

تورات وقرآن کی تعریف:

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے حکم ہمیشہ سے جاری رہے، پیچھے تورات اتری تو شرح اور مفصل ہوئی۔ اللہ پاک نے اس جگہ قرآن وتورات کا ذکر کیا اور اکثر دونوں کتابوں کو ذکر فرماتا ہے، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا ﴾ [الأحقاف: ١٢] ''اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی اور یہ (قرآن) عربی زبان میں تصدیق کرنے والی کتاب ہے۔''

اسی طرح اس سورت کے شروع میں کہا تھا: ﴿ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ﴾ [الأنعام: ٩١] ''کہہ دیجیے: پھر وہ کتاب کس نے نازل کی تھی، جسے موسیٰ لائے تھے، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم متفرق اوراق میں نقل کرتے ہو۔ اس میں سے کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپا لیتے ہو۔'' پھر یوں فرمایا تھا: ﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ [الأنعام: ٩٢] ''اور یہ کتاب (قرآنِ مجید)، ہم نے اسے نازل کیا ہے، یہ برکت والی، تصدیق کرنے والی ہے، اس کتاب کی جو اس سے پہلے آئی تھی، تاکہ آپ ام القریٰ (مکہ)

اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرائیں۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا قول نقل فرمایا ہے: ﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ﴾ [القصص: ٤٨] ’’لہٰذا جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق (قرآن) آ گیا تو وہ کہنے لگے: اسے ویسے معجزے کیوں نہیں دیے گئے، جیسے موسیٰ کو دیے گئے تھے؟‘‘ اور جنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ انھوں نے کہا: ﴿ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الأحقاف: ٣٠] ’’انھوں نے کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، وہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں، وہ حق کی طرف اور صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔‘‘

تمام سے مراد یہ ہے کہ کامل ہے اور اس میں ہر اس چیز کی، جس کی احتیاج ہے، اور امرِ دین اور شریعت کی مکمل تشریح ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ [الأعراف: ١٤٥] ’’اور ہم نے اس (موسیٰ) کے لیے (تورات کی) تختیوں میں (زندگی کے) ہر معاملے کے بارے میں نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق تفصیل لکھ کر دے دی ہے۔‘‘ یہ کتاب احسان کی تمام جزا ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے عملِ حسن کیا، ہماری طاعت و امر پر قائم رہے ویسے ہی ہم نے اس کو جزائے کامل دی، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾ [الرحمٰن: ٦٠] ’’احسان کی جزا تو احسان ہی ہے۔‘‘

نیز جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ [البقرة: ١٢٤] ’’اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند کلمات کے ساتھ آزمایا تو اس نے انھیں پورا کر دیا۔ اللہ نے کہا: بے شک میں تجھے سب لوگوں کے لیے امام بنانے والا ہوں۔‘‘ نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ [السجدة: ٢٤] ’’اور جب انھوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں کچھ ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہنمائی کرتے تھے اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔‘‘

امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ”أَحْسَنَ فِيمَا أَعْطَاهُ اللّٰهُ“ ’’جو کچھ اللہ نے اسے عطا کیا اُس میں اس نے احسان کیا۔‘‘ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ”مَنْ أَحْسَنَ فِي الدُّنْيَا تُمِّمَ لَهُ ذٰلِكَ فِي الْآخِرَةِ“ ’’جس نے دنیا میں اچھا کیا اُس کو آخرت میں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔‘‘ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے: ”تَمَامًا عَلَى الَّذِينَ أَحْسَنُوا“ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد محسنین و مومنین ہیں۔[1] یہی امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محسنون انبیا ہیں اور مومنون۔[2] یعنی ہم نے ان پر موسیٰ کا فضل ظاہر کیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٢٣٤ـ ٢٣٥) [2] تفسير البغوي (٣/ ٢٠٥)

فرمان ہے: ﴿ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ ﴾ [الأعراف: ١٤٤] ”اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ! بے شک میں نے اپنے پیغامات پہنچانے اور اپنی ہم کلامی کے لیے لوگوں میں سے تجھے چن لیا ہے۔“ مگر ان سے کچھ ان کا امتیاز ہمارے نبی خاتم الانبیا اور ابراہیم خلیل علیہما السلام پر لازم نہیں آتا۔

دوسری دلیلوں سے ناس سے مراد اُس وقت کے لوگ ہیں نہ کہ قیامت تک کے لوگ۔ سو بے شک موسیٰ اپنے زمانے میں تمام لوگوں سے افضل اور تمام مخلوق سے زیادہ عزت والے تھے۔ بعض نے کہا معنی یہ ہیں کہ ”تَمَامًا عَلٰى إِحْسَانِ اللّٰهِ إِلَيْهِ“ ”وہ اپنے اوپر اللہ کے احسان کو تمام کرنے والے تھے۔“ اس کو امام ابن جریر اور بغوی رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے۔[1] یہ قول اول کے مخالف نہیں ہے۔ وللہ الحمد

پھر تورات کی تعریف کرنے کے بعد اتباعِ قرآن کی طرف بلایا۔ اس پر غور و فکر اور عمل کرنے کا حکم دیا۔ اس کو متبع و عامل کے لیے دنیا اور آخرت میں مبارک ٹھہرایا، اس لیے کہ قرآن اللہ پاک کی ایک مضبوط رسی ہے، جس نے اس کو پکڑا وہ ہدایت کی راہ پر لگ گیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یوں ہیں کہ تورات ہر اس شے کی تفصیل تھی، جو ہدایت اور ضلالت کے زمرے میں آتی ہے اور اُن پر باعثِ رحمت تھی، اس لیے کہ بنی اسرائیل مر کر جی اٹھنے پر ایمان لائیں، ثواب اور عذاب کی تصدیق کریں۔ پھر قرآن کو کثیر البرکہ، یعنی زیادہ برکت والا کہا ہے، اس لیے کہ دینی اور دنیاوی منافع پر مشتمل ہے، سوائے اہلِ مکہ! تم اس پر عمل کرو اور اس کی مخالفت اور تکذیب سے بچو، شاید تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ یہ خطاب اگرچہ خاص ہے، مگر اس سے مراد عموم ہے، کیونکہ قرآن کا اتباع ساری امت پر فرض، واجب اور حتمی ہے۔[2]

اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِی الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

تاکہ تم یہ نہ کہو کہ صرف ہم سے پہلے دو گروہوں (یہود و نصاریٰ) پر کتاب نازل کی گئی تھی اور بے شک ہم

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٢٣٦) تفسير البغوي (٣/ ٢٠٥۔ ٢٠٦) [2] فتح البيان (٤/ ٢٨٠۔ ٢٨١)

تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے (156) یا تم (یہ نہ) کہو کہ اگر بے شک ہم پر کتاب نازل کی جاتی تو ہم ضرور ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، چنانچہ یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح کتاب اور ہدایت اور رحمت آ گئی ہے، پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، اور ان سے منہ موڑا؟ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں جلد ہم سخت عذاب کی شکل میں سزا دیں گے، اس لیے کہ وہ حق سے منہ موڑتے ہیں (157)

قرآن لوگوں پر اللہ کی حجت ہے:

یعنی یہ کتاب اتاری کہ تم کو عذر کی جگہ نہ رہے۔ پہلی امتوں کا حال سن کر شاید تم کو ہوش آتا، سو تم کو بھی ویسی کتاب ملی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ عذر کو دور کرنے کے لیے یہ کتاب آئی ہے،[1] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ لَاۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [القصص: ٤٧] ''اور اگر (یہ) نہ ہوتا کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اس کی وجہ سے انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے: اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا، پھر ہم تیری آیات کی اتباع کرتے اور ہم مومنوں میں سے ہو جاتے (تو ہم رسول نہ بھیجتے)۔'' طائفتین سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ اور کئی ایک اہل علم کا قول ہے۔[2]

پڑھنے پڑھانے سے غفلت کا یہ مطلب ہوا کہ ہم ان کی بات نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ وہ ہماری زبان میں نہیں تھی، ہم اس کتاب سے غافل و مشغول رہے، اس میں ہمارا کیا قصور ہے! سو اللہ نے کتاب مبارک قرآن مجید بھیج کر ان کے اعتراض کو دور کر دیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴾ [الفاطر: ٤٢] ''اور انھوں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ ضرور ہر ایک امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے، پھر جب ان کے پاس ڈرانے والا آیا تو اس (کی آمد) نے ان کو (حق سے) نفرت ہی میں زیادہ کیا۔''

اسی طرح اس جگہ کہا کہ تمھارے پاس بینہ آیا، یعنی اللہ کی طرف سے زبان محمد ﷺ پر قرآن عظیم عربی زبان میں اترا۔ اس کے اندر حلال حرام کا بیان اور دلوں کے لیے ہدایت اور ان بندوں پر رحمت ہے جو قرآن کریم کی اتباع کرتے ہیں اور اُس کے پیچھے لگنے والے ہیں۔ بڑا ظالم وہ ہے جو اللہ کی آیات کو جھٹلانے والا اور اللہ کی مخلوق کو اس کی راہ سے ہٹانے والا ہے، وہ نہ اس شریعت سے فائدہ اٹھاتا ہے جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اور نہ ہی اس کی اتباع

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٢٤٠) [2] تفسير الطبري (١٢/ ٢٤٠_ ٢٤١)

کرتا ہے اور نہ اس نے اس کے علاوہ دوسرے طریقوں کو چھوڑا، بلکہ لوگوں کو آیاتِ الٰہی سے پھیرتا رہا، یہی امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ صَدَفَ ﴾ بہ معنی ''اَعْرَضَ'' ہے۔[1]

اس جگہ قولِ سدی میں قوت ہے، جس طرح سورت کے شروع میں گزر چکا ہے: ﴿ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ ﴾ [الأنعام: ٢٦] ''اور وہ دوسروں کو اس (ہدایت) سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں، اور وہ اپنے آپ ہی کو ہلاک کر رہے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَصَدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ زِدْنَٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ ٱلْعَذَابِ ﴾ [النحل: ٨٨] ''جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے۔'' اور یہاں یوں کہا کہ ہم آیات سے کترانے والوں کو برا عذاب دیں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے: ﴿ صَدَفَ عَنْهَا ﴾ کے معنی یہ ہیں: ''لَا آمَنَ بِهَا وَلَا عَمِلَ بِهَا'' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ ﴿٣١﴾ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴾ [القيامة: ٣١۔ ٣٢] ''نہ تو اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ بلکہ اس نے (حق کو) جھٹلایا اور منہ موڑا'' وغیرہ آیات جو اس بات پر دلیل ہیں کہ کافر دل سے تکذیب کرنے والا اور اپنے اعضا کے ساتھ عمل کا تارک ہے، لیکن امام سدی رحمہ اللہ کا قول زیادہ قوی اور ظاہر ہے۔ واللہ أعلم. کیونکہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جس نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور لوگوں کو ان سے پھیرا اور باز رکھا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَصَدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ زِدْنَٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ ٱلْعَذَابِ بِمَا كَانُوا۟ يُفْسِدُونَ ﴾ [النحل: ٨٨] ''جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے۔''[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تورات اور انجیل کے نازل کرنے کا خصوصی طور پر ذکر اس لیے ہے کہ سب آسمانی کتابوں میں سے ان میں درج احکام کی وجہ سے یہی دونوں زیادہ مشہور ہیں۔ معلوم ہوا کہ مجوس اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ اگر کتاب والے ہوتے تو تین گروہ ٹھہرتے۔ دِرَاسَت اپنی بولی میں تلاوتِ کتب کو کہتے ہیں۔ یہ ان کا عذر تھا کہ ہم دونوں کتابوں کے اتباع سے اس لیے معذور رہے کہ ان کے معانی کی سمجھ نہیں رکھتے تھے۔ اگر ہم پر کوئی کتاب اترتی تو ہم ان سے بڑھ کر ہدایت یاب ہوتے۔ پس کفارِ عرب کا یہ عذر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور نزولِ قرآن سے دور ہو گیا۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھارے پاس بینہ آ چکا، یعنی کتاب عربی زبانِ مبین میں، جبکہ تم یہود و نصاریٰ

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٢٤٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٦٠)

کی کتابوں کو نہ سمجھ پانے والے ٹھہرے۔ اب یہ کتاب نبی عربی اُمی پر اتری ہے، تمھاری زبان میں آئی ہے، اب تمھارا یہ عذرِ باطل اور تمھاری یہ علت ساقط ہے۔ آنکھ والے کے لیے صبح روشن ہوگئی، پھر قرآن کو تورات کی طرح ہدایت اور رحمت فرمایا، اب جو کوئی اس کی تکذیب کرے گا وہی بڑا ظالم ہے، اپنے کیے کی سزا ضرور پائے گا۔[1]

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

کیا وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا آپ کا رب آئے، یا آپ کے رب کی بعض نشانیاں آئیں؟ جس دن آپ کے رب کی بعض نشانیاں آجائیں گی تو کسی ایسے شخص کا ایمان لانا اسے فائدہ نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا، یا اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا۔ کہہ دیجیے: تم انتظار کرو، بے شک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں (158)

ایمان قبول کرنے اور توبہ کرنے میں ٹال مٹول کرنے والے کو تہدید اور قیامت کی نشانیاں:

یعنی اللہ کی طرف سے جو ہدایت کی حد تھی، یعنی شریعت اور کتاب، وہ آچکی ہے، تب بھی نہیں مانتے تو اب منتظر ہیں کہ اللہ خود آئے یا قیامت کی نشانیاں دیکھیں، تب یقین کریں۔ سو جب قیامت کی نشانی آئے گی، یعنی سورج مغرب سے نکلے گا، تب کافر کا ایمان اور گناہ گار کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ اللہ پاک نے اس آیت میں کافروں، مخالفوں، جھٹلانے والوں اور لوگوں کو اللہ کے راستے اور آیات سے روکنے والوں کو وعید سنائی ہے کہ تم جو فرشتوں کی یا رب کی آمد یا رب کی بعض نشانیوں کے منتظر ہو تو جب کوئی آیت اور نشانی قیامت اور ساعت کی، جو ضرور وقوع پذیر ہونے والی ہے، ظاہر ہو پڑے گی اور سر پر آجائے گی تو پھر اس وقت ایمان لانا یا گناہوں سے توبہ کرنا کچھ کام نہ آئے گا، تم اگر اب ایمان لاؤ، یعنی قیامت سے پہلے تو کچھ فائدہ بھی حاصل ہو۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: « لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَّغْرِبِهَا فَإِذَا رَآهَا النَّاسُ آمَنَ مَنْ عَلَيْهَا فَذٰلِكَ حِيْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ » سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ''قائم نہ ہوگی ساعت، یہاں تک کہ نکلے سورج مغرب سے، پھر جب وہ نکلے گا اور لوگ اس کو دیکھیں گے تو سب ایمان لائیں گے، اس وقت کسی

---

[1] فتح البیان (٤/ ٢٨١ـ ٢٨٢)

جان کو ایمان لانا فائدہ نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا تھا۔'' پھر یہ آیت پڑھی۔ یہ حدیث دو طرح پر آئی ہے: پہلی طرح کو بقیہ جماعت نے سوائے ترمذی کے روایت کیا ہے۔ دوسرے طریق کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[1] یہ حدیث کئی طریق سے آئی ہے، مسلم اس کے ساتھ منفرد ہیں۔[2]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں ہیں، جب نکلیں گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان جو پہلے سے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان میں کوئی خیر نہ کمائی تھی، نفع نہ دے گا: ایک سورج کا نکلنا، دوسرے دجال کا ظاہر ہونا اور تیسرے دابۃ الارض کا نکلنا۔[3] (رواہ ابن جریر وأحمد والترمذي) اس کی سند میں اسحاق فروی ضعیف ہیں، اس لیے اصحابِ کتب نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ نہ قائم ہوگی قیامت جب تک کہ نہ نکلے سورج مغرب سے۔ جب نکلے گا تو سب لوگ ایمان لائیں گے، لیکن اس وقت ایمان کیا نفع دے گا، جب کہ پہلے سے نہ لائے تھے۔[4] (رواہ ابن جریر) ان سب طرق کا اخراج ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں کیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا قُبِلَ مِنْهُ»[5] ''جس شخص نے توبہ کی اس سے پہلے کہ سورج مغرب سے طلوع ہو اس کو قبول کیا جائے گا۔'' (رواہ ابن جریر ولم یخرجه أحد من أصحاب الكتب الستة)

سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''تو جانتا ہے کہ سورج جب ڈوبتا ہے تو کدھر جاتا ہے؟'' میں نے کہا: میں نہیں جانتا، فرمایا: ''وہ عرش کے اس طرف پہنچ کر سجدے میں گرتا ہے، پھر کھڑا ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس سے کہا جاتا ہے کہ لوٹ جا۔ اے ابو ذر! قریب ہے کہ اس سے کہیں پھر جا جدھر سے تو آیا ہے۔ یہ اُس وقت ہوگا جب کسی نفس کو اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا، جو پہلے سے ایمان نہ لایا تھا۔''[6] (رواہ الشیخان)

حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کو نبی اکرم ﷺ نے کھڑکی میں سے جھانکا اور ہم قیامت کا ذکر کرتے تھے۔ فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی، جب تک کہ تم دس نشانیوں کو نہ دیکھ لو گے: سورج کا مغرب سے نکلنا اور دھواں اور دابۃ الارض کا نکلنا اور یاجوج ماجوج کا نکلنا اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول اور دجال کا نکلنا اور تین خسوف کا واقع ہونا: ایک خسف مشرق میں، ایک مغرب میں اور ایک جزیرۂ عرب میں اور نکلنا آگ کا عدن سے، وہ لوگوں کو ہانکے گی یا حشر کرے گی، جہاں وہ رات رہیں گے وہیں وہ رات رہے گی، ان کے ساتھ قیلولہ کرے گی جہاں وہ دن کو

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٩، ٤٣٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣١٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٤٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٦٨)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٧)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨) تفسير الطبري (١٢/ ٢٦٥) مسند أحمد (٢/ ٤٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٢)

(4) تفسير الطبري (١٢/ ٢٥٥۔ ٢٥٦) (5) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٣) تفسير الطبري (١٢/ ٢٥٦)

(6) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩)

قیلولہ کریں گے۔[1] (رواه أحمد وهكذا مسلم و أهل السنن الأربعة)

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ سورج کے مغرب سے نکلنے کی نشانی کیا ہوگی؟ فرمایا: وہ رات طویل ہوگی، دو رات کے برابر، لوگ اس میں نماز پڑھیں گے اور کام کریں گے، جیسے اس کے پہلے کام کرتے تھے، ستارے نظر نہ آئیں گے، اپنی جگہ چھوڑ دیں گے، لوگ پھر سو رہیں گے، پھر اٹھ کر کام کریں گے، جس طرح کرتے تھے، پھر سوئیں گے، پھر اٹھیں گے، پھر کام کریں گے، یہاں تک کہ رات کی لمبائی سے گھبرا جائیں گے، صبح نہ ہوگی، اس دوران میں وہ سورج طلوع ہونے کے منتظر ہوں گے کہ اچانک سورج مغرب سے نکلے گا، لوگ اس کو دیکھ کر ایمان لانے لگیں گے، سو وہ ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔[2] (رواه ابن مردويه وليس هو في شيئ من الكتب الستة من هذا الوجه، والله أعلم)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ﴿ بَعْضُ اٰيٰتِ ﴾ کی تفسیر میں یوں کہتے ہیں کہ وہ آیت سورج کا مغرب سے نکلنا ہے۔[3] (رواه أحمد والترمذي وقال غريب ورواه بعضهم ولم يرفعه) سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ اول آیات سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔[4] سیدنا صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے توبہ کے لیے مغرب کی طرف ایک دروازہ کھولا ہے جس کا عرض ستر برس کی راہ ہے۔ وہ اس وقت تک بند نہ ہوگا، یہاں تک کہ سورج اس طرف سے نکلے۔[5] (رواه الترمذي وصححه النسائي وابن ماجه في حديث طويل)

عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ لوگوں پر ایک رات آئے گی جو تمھاری تین راتوں کے برابر ہوگی، جب وہ رات آئے تو نفل پڑھنے والے اس کو پہچان لیں گے، کوئی اٹھ کر اپنا وظیفہ ورد پڑھے گا، پھر سو رہے گا، پھر اٹھے گا پھر حزب پڑھے گا، پھر سو رہے گا، اس اثنا میں بعض لوگ بعض کو پکاریں گے، کہیں گے: یہ کیا حال ہے لوگ گھبرا کر مسجدوں کی طرف جائیں گے، اچانک سورج نکلے گا جب آسمان کے وسط

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٠١) مسند أحمد (٤/ ٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣١١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٨٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٥٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٤)

[2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٦١۔ ٢٦٢) اللآلي المصنوعة للسيوطي (١/ ٥٨۔ ٥٩) اس کی سند میں ''محمد بن یوسف رازی'' سخت ضعیف راوی ہے۔ نیز ''ادریس بن علی رازی'' کا ترجمہ نہیں ملا ہے۔

[3] مسند أحمد (٣/ ٣١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧١) مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٥٠٦) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس موضوع میں صحیح روایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیر تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[4] المعجم الكبير (٨/ ٢٦٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٠٥)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٣٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٤٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢٢٩)

میں پہنچے گا پھر کر جہاں سے نکلتا تھا، وہیں سے نکلا کرے گا، اس وقت کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا۔[1] (رواه ابن مردویه وهذا حديث غريب من هذا الوجه وليس هو في شيئ من الكتب الستة)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد کیا ہے کہ فرماتے تھے: ''قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے اور دابہ کا دن چڑھے نکلنا ہے۔ ان میں سے جونسی نشانی اپنے صاحب سے پہلے ہوگی تو دوسری اس کے پیچھے ہی آئے گی۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: اور وہ کتب پڑھتے تھے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ پہلے سورج ہی مغرب سے برآمد ہوگا، اس لیے کہ وہ غروب ہو کر عرش کے نیچے آ کر سجدہ کر کے لوٹ جانے کی اجازت چاہتا ہے، اُس کو رجوع کا حکم ملتا ہے، یہاں تک کہ جب اللہ اُس کا مغرب سے طلوع ہونا چاہے گا تو سورج وہی کام کرے گا جو کام کرتا تھا، یعنی عرش کے نیچے آ کر سجدے میں گر کر رجوع کی اجازت مانگے گا تب اُس کو کچھ جواب نہ ملے گا، پھر اذن مانگے گا پھر کچھ جواب نہ ملے گا، یہاں تک کہ کسی قدر رات، جتنی اللہ چاہے گا، گزر جائے گی، سورج جان لے گا کہ اگر اب رجوع کی اجازت مل بھی گئی تو مشرق کو نہیں پا سکتا، عرض کرے گا: «أَيْ رَبِّ! مَا أَبْعَدَ الْمَشْرِقَ!» ''اے رب! مشرق بہت دور ہے۔'' «مَنْ لِّي بِالنَّاسِ» ''کون ہے میرے لیے واسطے لوگوں کے۔'' یہاں تک کہ جب افق طوق کی طرح ہو جائے گا تو سورج لوٹ جانے کا حکم مانگے گا، اس سے کہیں گے: اسی جگہ سے نکل۔ وہ لوگوں پر مغرب سے نکلے گا۔ پھر ابن عمرو رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: ﴿لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا ... الخ﴾[2] (رواه أحمد و مسلم و أبو داود و ابن ماجه)

سیدنا عبد الرحمان بن عوف اور ابن عمرو رضی اللہ عنہم مرفوعاً کہتے ہیں کہ ہجرت دو خصلتیں ہیں: ایک یہ کہ سیئات کو چھوڑ دے، دوسرے یہ کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرے، یہ ہجرت منقطع نہ ہوگی، جب تک کہ توبہ قبول ہوتی ہے اور توبہ ہمیشہ مقبول ہوگی، یہاں تک کہ سورج مغرب سے نکلے، جب ادھر سے نکلے گا مہر لگائی جائے گی، ہر دل پر جو کچھ اس کے اندر ہے اس پر اور کافی ہوگا لوگوں کو عمل۔[3] (رواه أحمد وهذا الحديث حسن الإسناد ولم يخرجه أحد من أصحاب الكتب الستة، والله أعلم)

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جن آیات کا ذکر ہوا، وہ سب گزر گئیں، سوا چار آیتوں کے: سورج کا مغرب سے برآمد ہونا، دابۃ الارض کا نکلنا اور یاجوج ماجوج کا نکلنا۔ وہ نشانی جس پر اعمال کا خاتمہ ہوگا، وہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ﴾[4] (آیتِ باب)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۶۲) اس کی سند میں ''سلیمان بن زید محاربی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۹٤۱) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤۳۱۰) سنن ابن ماجه (٤۰٦۹) مسند أحمد (۲/ ۲۰۱)

[3] مسند أحمد (۱/ ۱۹۲) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٥/ ۲۲۔ ۳٤)

[4] تفسير الطبري (۱۲/ ۲٦۰) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس دن سورج اور چاند ملے جلے نکلیں گے، نصف آسمان تک پہنچ کر واپس جائیں گے، پھر بدستور خود نکلتے رہیں گے۔[1] (رواہ ابن مردویہ) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ جس دن پہلی نشانی ظاہر ہو گی، حفظ (نگہبان) روک دیے جائیں گے، اجساد اعمال پر گواہی دیں گے۔[2] (رواہ ابن جریر)

ایمان کے نفع نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن اگر کوئی کافر ایمان لانا چاہے گا تو مقبول نہ ہوگا، کافر کا کافر ہی بنا رہے گا۔ ہاں جو پہلے سے مومن تھا، اگر عمل صالح کرتا تھا تو خیرِ عظیم میں رہا، اگر مصلح عمل نہ تھا، اب توبہ کرنا چاہے گا تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ پہلے بیان کی گئی احادیث اسی پر دلیل ہیں، اسی پر یہ آیت محمول ہے: ﴿ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی کسبِ عملِ صالح، جبکہ پہلے سے اس پر عامل نہ تھا، قبول نہ ہوگا۔ پھر یہ فرمایا کہ تم راہ دیکھو ہم بھی منتظر ہیں۔ یہ کفار کو سخت ڈراوا ہے، مسوف ایمان (ایمان لانے میں ٹال مٹول کرنے والے) کے لیے وعید شدید ہے اور توبہ کی تاخیر کرنے والے کے لیے تنبیہ مزید ہے جو ان کاموں میں تاخیر سے کام لیتے ہیں، کیوں کہ اس وقت ایمان لانا اور توبہ کرنا کچھ فائدہ نہ دے گا۔

یہ حکم اس وقت کے بارے میں ہے جبکہ سورج مغرب کی طرف سے نکلے گا، ساعت قریب ہوگی، اشراط ظاہر ہونے لگیں گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴾ [محمد: ١٨] ''چناں چہ یہ لوگ تو بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ ان کے پاس اچانک آ جائے، یقیناً اس کی نشانیاں آ چکی ہیں، تو جب قیامت ان کے پاس آ پہنچے گی تو ان کے لیے کہاں ہوگا نصیحت حاصل کرنا۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۚ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٨٤۔ ٨٥] ''چناں چہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ پھر، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو انھیں ان کے ایمان (لانے) نے کوئی نفع نہ دیا، یہی اللہ کا طریقہ ہے، جو اس کے بندوں میں گزرا اور اس (عذاب کے) موقع پر کافروں نے خسارہ اُٹھایا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جبکہ ہم نے ان پر حجت قائم کر دی، کتاب اتاری، رسول بھیج دیا، اس سے ان کو نفع نہ ہوا اور وہ اپنی گمراہی سے باز نہ آئے تو اب اس کے بعد اور کچھ باقی نہیں مگر یہی کہ فرشتے آئیں اور جان نکالیں یا ملائکہ عذاب آئیں یا خود اللہ پاک آئے جس طرح کہا تھا: ﴿ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ﴾ [الفرقان: ٢١]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٦٣) اس کی سند میں ''ادریس بن سنان'' اور ''عبدالمنعم بن ادریس'' ضعیف راوی ہیں۔

[2] تفسیر الطبري (١٢/ ٢٦٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عامر شعبی رحمہ اللہ کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔

''ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کیے گئے یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟'' اللہ کے آنے سے مراد قیامت کے دن لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے اللہ کا آنا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ [الفجر: ۲۲] ''اور آپ کا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے۔'' یہی سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ، امام قتادہ اور مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے۔

اللہ پاک اس دن ابر کے سائے میں آئے گا۔ آنے کی کیفیت متشابہ ہے، اللہ کے سوا اس کیفیت کو کون جانے، ہم کو اس پر بغیر تاویل اور تعطیل کے ایمان لانا واجب ہے۔ بعض آیات جو قیامت کے قائم ہونے پر دلالت کرتی ہیں، جمہور مفسرین کے نزدیک سورج کا مغرب سے نکلنا مراد ہے یا قیامت کی وہ علامات مراد ہیں جن کا ذکر احادیث میں آیا ہے، مگر زیادہ صحیح وہی ہے جس کا پہلے بیان ہوا۔ قیامت کی علامات دو طرح پر ہیں: صغریٰ اور کبریٰ۔ صغریٰ بے شمار ہیں اور گزر گئی ہیں اور گزر رہی ہیں۔ رہی کبریٰ سو وہ دس امارتیں (علامات) ہیں جن کا ذکر ابھی اوپر ہو چکا۔ ''رسالہ اذاعة، کتاب حجج الكرامة، رسالہ اقتراب الساعة'' جامع جملہ اشراط ساعت ہے (یہ تینوں کتابیں نواب صاحب کی تحریر کردہ ہیں، جن میں علاماتِ قیامت کا بیان ہے)۔ وللہ الحمد.

مطلب یہ ٹھہرا کہ ان آیات کے ظاہر ہونے کے وقت جو شخص مومن نہ تھا یا تھا مگر خیر کے کام نہیں کرتا تھا، اس کو اس وقت ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فائدہ صرف بعض آیاتِ قیامت کے آنے سے پہلے اور حالتِ ایمان میں بھلائی کے کام کرنے کے درمیانی عرصے میں ہوگا۔ سو جو کوئی پہلے سے صرف ایمان لا چکا ہے مگر خیر کا کوئی کام نہیں کیا یا بھلائی کے کام کرتا تھا مگر ایمان نہیں لایا تھا تو یہ بات اس کے کچھ کام نہ آئے گی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ تصدیق کرنے والا تھا، مگر اس نے خیر کا کام کوئی نہیں کیا اور جس نے نشان دیکھنے کے بعد کیا تو وہ قبول نہیں ہوگا اور اگر نشان دیکھنے سے پہلے کیا اور دیکھنے کے بعد بھی کیا تو وہ خیر اس سے مقبول ہوگا۔[1] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وہ مسلمان ہے جس نے مومن ہو کر کوئی نیک کام نہ کیا، بلکہ قبل نشانی کے ظاہر ہونے کے کبیرہ گناہوں پر قائم تھا۔[2]

اس آیت میں یہ اشکال ہے کہ پہلے سے ایمان کا نہ ہونا اس بات کو لازم ٹھہراتا ہے کہ اس حالت میں کوئی بھلائی کا کام بلاشک وشبہہ کچھ خیر نہیں۔ اس بنیاد پر اس کا ذکر تکرار ٹھہرے گا۔ اشکال اور جوابات کی پوری تقریر حرفِ تخییر کی بنیاد پر ہے جو فتح البیان میں تحریر ہے۔ ساتواں جواب یہ ہے کہ آیتِ باب اس بات کی مقتضی ہے کہ صرف ایمان لے آنا کتاب وسنت سے ثابت شدہ صحیح دلیلوں کی روشنی میں فائدہ نہیں دے سکتا، مگر عمل کے ساتھ۔ یہ جواب سارے تکلفات سے دور ہے۔ محققین مفسرین پر تعجب ہے کہ انھوں نے ایسے وسیع اشکال پر مختصر کلام کیا ہے، یہاں تک کہ رازی رحمہ اللہ نے باوجود اس لمبی تفسیر کے جو غالب آیات میں ہے اس آیت کی تفسیر میں صرف اسی قدر کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کی نشانیاں ظاہر ہوں گی، تکلیف کا زمانہ جاتا رہے گا، کسی جان کو ایمان لانا جو پہلے

[1] تفسير الطبري (۱۲/ ۲٦۷) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ۱٤۲۹)

سے مومن اور خیر کے کام کرنے والا نہیں ہے، نفع بخش نہ ہوگا۔[1]

ذرا اس اقتصار کو دیکھنا چاہیے۔ اسی طرح کا اختصار زمخشری نے بھی کیا ہے،[2] جس سے بھوک جائے اور نہ موٹاپا آئے۔ پھر اللہ نے بطورِ تہدید فرمایا کہ اچھا تم آیاتِ قیامت کے آنے کا انتظار کرو، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٠] ''تم جو چاہو عمل کرو۔'' حالانکہ وہ ہرگز اس کا انتظار نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہ مر کر جی اٹھنے اور اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے، اس کے منکر ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جو مشرک خاتم النبیین ﷺ کے منکر ہیں، ان میں سے جو کوئی اس آخر وقت میں موجود ہوگا، اس وقت تک وہ ان آیات کا انتظار کرے گا، یعنی مشرکوں کی مہلت کی انتہا اس دنیا کی مدت تک ہے، یا اس کو موت آئے، یا قیامت کی نشانیاں ظاہر ہوں تو اس وقت ایمان لانا کچھ کام نہیں آئے گا، عقوبتِ لازمہ بہرحال نازل ہوگی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد قتال سے باز رہنا ہے، اس قول پر یہ آیت منسوخ ٹھہرے گی، قتال کے بارے میں پہلے قول کے مطابق محکم ہوگی۔[3]

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ١٥٩

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ بازی کی، اور وہ گروہوں میں بٹ گئے، آپ کا اُن سے کوئی تعلق نہیں، بے شک ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، پھر وہ انھیں ان کاموں سے آگاہ کرے گا جو وہ کرتے رہے تھے (159)

فرقہ پرستی کی مذمت:

یعنی تورات والوں نے کئی راہیں نکالیں تو ان میں تحقیقات نہ کر صحیح کون اور غلط کون، اپنی صحیح راہ پر قائم رہ۔ دین میں جو باتیں یقین لاتی ہیں ان میں فرقے نہیں بنانا چاہیے اور جو کرتے ہیں اس کے طریقے کئی ہوں تو برا نہیں۔ امام مجاہد، قتادہ، ضحاک اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں اتری ہے۔[4] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے مختلف ہو کر متفرق ہو گئے تھے۔ جب نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو اللہ نے یہ آیت اتاری۔[5]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا ہے: «هُمْ أَهْلُ الْبِدَعِ وَأَهْلُ الشُّبُهَاتِ وَأَهْلُ الضَّلَالَةِ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ»[6] ''وہ اس امت میں سے اہلِ بدعت، اہلِ شبہات، اہلِ ضلالہ

---

[1] تفسیر الرازي (١٤/ ٧) [2] الکشاف (٢/ ٧٨) [3] فتح البیان (٤/ ٢٨٣۔ ٢٨٧)

[4] تفسیر الطبري (١٢/ ٢٦٩۔ ٢٧٠) [5] تفسیر الطبري (١٢/ ٢٦٩۔ ٢٧٠) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[6] تفسیر الطبري (١٢/ ٢٧٠۔ ٢٧١) اس کی سند میں ''عباد بن کثیر'' متروک راوی ہے۔

ہیں۔'' لیکن اس کے مرفوع ہونے میں وہم ہے، کیونکہ طاؤس نے کہا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ''نَزَلَتْ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ'' [1] ''یہ اس امت کے بارے میں نازل ہوئی۔'' سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: شِیَعًا سے مراد خارجی ہیں۔ [2] اس کا مرفوع ہونا بھی صحیح نہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: « هُمْ أَصْحَابُ الْبِدَعِ » [3] ''وہ اصحاب بدعت ہیں۔'' (رواه ابن مردويه وهو غريب لا يصح رفعه) ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ آیت دین میں تفرقہ ڈالنے والوں کے بارے میں، جو دین کے مخالف ہیں، عام ہے، کیونکہ اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر مبعوث کیا، تاکہ اس دین کو سب دینوں پر ظاہر اور غالب کرے، سو اس دین کی شریعت ایک ہے، اس میں نہ اختلاف ہے اور نہ افتراق۔ اب جو کوئی اس میں اختلاف کر کے کئی فرقے ہو جائے گا تو وہ اس آیت کا مصداق اور اہل ہوگا۔

دوسری اُمتوں کے لوگوں اور ضلالت اور اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والوں کی طرح ہوگا۔ اللہ نے تو اپنے رسول کو اس چیز سے، جس میں یہ مبتلا ہیں، بری کر دیا ہے، یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ [الشورىٰ: ١٣] ''اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی!) آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا (تاکیدی) حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم اس دین کو قائم رکھو اور تم اس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ۔ یہی بات تو مشرکین پر گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ انھیں بلاتے ہیں، اللہ جسے چاہے اپنے لیے چن لیتا ہے اور ہدایت اسے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔''

حدیث میں آیا ہے کہ ہم گروہِ انبیا اولاد علات ہیں۔ ہمارا دین ایک ہے۔ [4] پس سیدھی راہ یہی ہے جو اللہ کے رسول لائے ہیں کہ فقط اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرو، شریعتِ رسولِ متاخر (آخر) کو چمٹے رہو۔ جو اس کے خلاف ہے وہ جہالات ضلالات و آرا و اہوا ہیں، رسول اس سے بَری ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ﴾ (آیتِ باب) پھر جو یہ فرمایا کہ ان کا کام اللہ کے حوالے ہے وہ ان کے افعال پر ان کو خبردار کرے گا، یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اِنَّ

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٢٧٠) احمد شاکر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٢٩) اس کی سند میں ''ابو غالب'' متکلم فیہ راوی ہے۔

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٦٤) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف راوی ہے۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٦٥)

اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ﴾ [الحج: ١٧] ”بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور صابی (بے دین) اور نصاریٰ اور مجوسی اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، بے شک اللہ ان کے مابین یوم قیامت فیصلہ کرے گا۔“ [1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تفریقِ دین سے مراد یہ ہے کہ بعض کو پکڑ لیا اور بعض کو ترک کر دیا۔ مراد اہلِ کتاب ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ ﴾ [البینة: ٤] ”اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی، ان میں تفرقہ ان کے پاس واضح دلیل آ جانے کے بعد پڑا۔“ بعض نے کہا ہے کہ مراد مشرکین ہیں، بعض نے بتوں، بعض نے ملائکہ کو اور بعض نے ستاروں کو پوجا، یہ ان کے دین کی تفریق ہوئی۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ آیت سارے کفار اور تمام اہلِ بدعت کے حق میں ہے، یہی قول صحیح ہے۔ اس لیے کہ لفظ عمومیت کے لیے مفید ہیں، اس میں تمام گروہ خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین کے یا اہلِ اسلام کے بدعتیوں کے، وغیرہم سب شامل ہیں۔

بہرحال اس آیت سے مقصد یہ ہے کہ اس بات کی رغبت دلائی جائے کہ مسلمین کا کلمہ ایک ہو، دین میں تفرقہ نہ کریں، بدعت مضلہ نہ نکالیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا: سن لو! تم سے پہلے جو اہلِ کتاب تھے وہ بہتر (٧٢) ملت پر متفرق ہو گئے اور یہ امت تہتر (٧٣) فرقوں پر متفرق ہو گی، بہتر (٧٢) دوزخ میں جائیں گے اور ایک بہشت میں اور وہ جماعت (صحابہ اور ان کے منہج پر چلنے والا گروہ) ہے۔ [2] (رواه أبو داود والترمذي)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا کہنا یہ ہے کہ بنی اسرائیل بہتر ملت پر متفرق ہوئے اور یہ ملت جلد تہتر ملت پر متفرق ہو گی، یہ سب آگ میں ہیں، مگر ایک ملت۔ کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کون سی ملت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ کَانَ عَلٰی مَآ أَنَا عَلَیْهِ وَأَصْحَابِيْ» [3] (أخرجه الترمذي)

شیع سے مراد فرقے اور گروہ ہیں۔ یہ لفظ ہر اس قوم پر صادق ہے جن کا معاملہ دین میں واحد مجتمع تھا، پھر ان میں سے ہر ایک جماعت نے اپنے بڑوں میں سے کسی ایک بڑے کی رائے کا اتباع کیا، وہ رائے جو صحیح راستے کے مخالف اور حق کے مقابل ہے۔ سو اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم کو ان کی فرقہ بندی سے یا فرقوں کے وجود میں آنے کا سبب معلوم کرنے سے یا موجبِ تفرق سے بحث کرنے سے کچھ مطلب اور غرض نہیں ہے۔ وہ جانیں اور ان کا کام جانے، تم پر فرض تھا کہ اللہ کی شریعت کو پہنچا دو، سو تم نے وہ پہنچا دی۔ یہ آیت اس حدیث کی طرح ہے: «مَنْ

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٦٤) [2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٥٩٧) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٠٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٦٤١) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٣٤٣)

غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا» أَيْ: نَحْنُ بُرَآءُ مِنْهُ.[1] ’’جس نے دھوکا کیا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔‘‘ یعنی ہم اس سے بری ہیں۔ امام فراء نے کہا: یعنی ان کا عقاب تم پر نہیں ہے، تم پر فقط ڈرا دینا فرض ہے، سو تم ڈراتے رہو، ان کی جزا اور مکافات اللہ کے حوالے ہے، اس میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو فرمایا کہ ہم ان کو قیامت کے دن اُن کے فعل پر آگاہ کریں گے، یعنی عمل کا بدلہ دیں گے، اس فرقہ بندی اور گروہ بندی کا مزا چکھائیں گے۔[2]

معلوم ہوا کہ دین میں تفرقہ ڈال کر گروہ گروہ ہو جانا خواہ اصولِ دین ہو یا فروع، شرع مبین میں ایسی بے برکت حرکت ہے جس سے نبی اکرم ﷺ اور سارے رسول بَری اور بے زار ہیں۔ یہ فرقہ بندی کی بدعت اصل میں اہلِ کتاب نے نکالی تھی۔ ان میں فرقے کے فرقے ظاہر ہو گئے جس طرح ملتِ اسلام میں خوارج، قدریہ، مرجیہ، معتزلہ، رافضہ اور شیعہ پیدا ہو گئے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ اہلِ سنت و جماعت میں بہت سے فرقے نکلے، جیسے: حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور ظاہری۔ یہ فروع کی تفریق ہے۔ اصول میں ماتریدی، اشعری حنبلی ہیں، یہ فرقہ بندی ایمان و اسلام کے درمیان ہوئی۔

رہا احسان تو اس میں بھی بہت سے نام ونشان نکلے، جیسے: سہروردی، قادری، چشتی اور نقشبندی وغیرہ۔ حالانکہ امتِ اسلام کی کتاب ایک ہے، ملتِ ایمان کا معبود ایک ہے اور رسولِ محمود ﷺ ایک ہے۔ کتاب وسنت میں کہیں اختلاف نہیں، اتفاق در اتفاق ہے، جس طریقۂ مرضیہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین و تبع تابعین گزرے ہیں، وہ ایک ہی سبیلِ مستوی صراطِ مستقیم ہے، اس میں نہ اس وقت ان کی حیات میں کچھ تفرقہ تھا، نہ جب سے اب تک کچھ تفرقہ ہے۔ دیکھو کتبِ صحاح وسنن ومسانید علمِ حدیث کو اور ان پر وہ کتابیں پیش کرو جن میں ہر فقیہ کی رائے اور اجتہاد موجود ہو تو بہت جلد بہ آسانی یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ایک کتاب مسائل اور فروعات میں دوسری کتاب کے موافق نہیں ہے، نہ ایک فقیہ کی رائے دوسرے فقیہ کی رائے سے ملتی ہے، بخلاف ان کتابوں کے جن میں سنتِ مطہرہ کو پیش کیا گیا ہو کہ جس طرح یہ کتب اللہ کی کتاب کی شرح اور تفسیر ہیں۔

اسی طرح ہر کتاب جس میں صحیح احادیث اور سنتیں دی گئی ہیں، وہ ایک دوسرے کے موافق ہیں، کسی کو کسی سے نہ اختلاف ہے نہ دوری۔ بہر حال اللہ پاک نے اس آیتِ پاک میں اپنے رسول کی براءت بخوبی ظاہر کر دی کہ ان بدعتی فرقوں، ان متقارب گروہوں، ان مجتمع جماعتوں، ان نئے نئے نکالے گئے رستوں اور مختلف گروہوں سے میرے رسول کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ گویا امتِ اسلام کو ہدایت ہے کہ تم ایسے کام نہ کرو۔ سو ساری امت نے یہ نکما کام کیا، سوائے موحدین مخلصین کے جو سننِ مطہرہ کے متبعین ہیں، وہ باوجود اپنی کم تعداد ہونے اور پرزور مخالفت کے، اب تک اسی سیرتِ سلف پر قائم و دائم ہیں، گو وہ زمین کے کناروں میں اور دور دراز علاقوں میں منتشر کیوں نہ ہوں۔ وللہ الحمد. اس بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اپنے حکمِ عدل کا ذکر فرمایا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۱)

[2] فتح البیان (٤/ ٢٨٨۔ ٢٩٠)

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

جوشخص (وہاں) ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے دس گنا (ثواب) ہوگا، اور جوشخص ایک برائی لے کر آئے گا تو اسے بس اس کے برابر ہی سزا دی جائے گی۔ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا﴿160﴾

نیکی کا بدلہ دس گنا اور برائی کا بدلہ اس کے برابر:

یہ آیتِ کریمہ اس آیتِ اجمال کی تفصیل ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا﴾ [النمل: ۸۹] ''جوشخص نیکی لائے گا، تو اس کے لیے اس سے زیادہ بہتر (بدلہ) ہوگا۔'' اس آیت کے مطابق بہت حدیثیں آئی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھارا رب عزوجل رحیم ہے، جس نے کسی نیکی کا قصد کیا، پھر وہ نیکی نہ کی تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی گئی، پھر اگر وہ نیکی کی تو دس سے سات سو تک، بلکہ کئی گنا تک لکھی جاتی ہے اور جس نے بدی کا قصد کیا، پھر بدی نہ کی تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے، پھر اگر وہ بدی کی تو ایک ہی بدی لکھی جاتی ہے، یا اس بدی کو اللہ محو کر دیتا ہے اور نہیں ہلاک ہوتا اللہ پر مگر جو خود اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالے۔[1]

(رواه أحمد والشيخان والنسائي)

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جس نے ایک حسنہ کیا، اس کے لیے اس کا دس گنا ہے اور زیادہ۔ اور جس نے ایک سیء کیا اُس کا بدلہ اس کے مثل ہے یا بخش دیتا ہوں اور جس نے زمین بھر کر خطا کی، پھر وہ مجھ سے اس حال میں ملا کہ مجھ سے کسی شے کو شریک نہ کرتا تھا میں اُس کو اسی کے برابر مغفرت دوں گا اور جو کوئی مجھ سے ایک بالشت قریب ہوا میں اُس سے ایک گز قریب ہوتا ہوں اور جو مجھ سے ایک گز قریب ہوتا ہے میں اُس سے ایک باع قریب ہوتا ہوں اور جو کوئی میرے پاس چل کر آتا ہے میں اُس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔[2] (رواه أحمد والنسائي و ابن ماجه) اُنس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: جس نے نیکی کا ارادہ کیا اور وہ نیکی نہ کی تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی گئی، پھر اگر اس نیکی کو بجا لایا تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔[3] (رواه أبو يعلى)

تارکِ سیء جو بدی نہیں کرتا وہ تین طرح پر ہے: ایک وہ جو اللہ کے لیے برائی کو ترک کرتا ہے، اُس کے اُس

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣١) مسند أحمد (١/ ٢٧٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٣٩٦)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٢١) مسند أحمد (٥/ ١٥٣)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢) مسند أبي يعلىٰ (٦/ ١٧٠)

باز رہنے پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ یہ عمل اور نیت ہوئی، اس لیے آیا ہے کہ اس کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ "كَمَا جَآءَ فِي بَعْضِ أَلْفَاظِ الصَّحِيْحِ «وَإِنَّمَا تَرَكَهَا مِنْ جَرَّائِيْ أَيْ مِنْ أَجْلِيْ»[1] "جیسا کہ صحیح کے بعض الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اُس کو میری خاطر چھوڑا ہے۔" اور کبھی برائی کو چھوڑنا بھول اور غفلت سے ہوتا ہے، سو اس چھوڑنے سے نہ کچھ فائدہ ہوا نہ نقصان، اس لیے کہ اس تارک نے کسی خیر کی نیت کی نہ کوئی برائی بجا لایا اور کبھی اس برائی کو عاجزی اور سستی کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے، اگرچہ اس نے اس کے لیے کوشش بھی کی تھی اور اس کے لیے اس میں ہر طرح کی کشش اور ترغیب موجود تھی۔

پس یہ تارک بمنزلہ فاعل کے ہے: "كَمَا جَآءَ فِي الْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ «إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ» قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ؟ قَالَ: «إِنَّهُ كَانَ حَرِيْصاً عَلٰى قَتْلِ صَاحِبِهِ»[2] "جیسا کہ صحیح کی حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان اپنی اپنی تلوار لے کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آ جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ تو قاتل ہے، مگر مقتول کیوں آگ میں جائے گا؟ فرمایا: وہ بھی اپنے ساتھی کے قتل کا حریص تھا۔"

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ لَهُ عَشْرٌ، وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ لَمْ تُكْتَبْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَعْمَلَهَا، فَإِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ عَلَيْهِ سَيِّئَةٌ، فَإِنْ تَرَكَهَا كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَةٌ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: إِنَّمَا تَرَكَهَا مِنْ مَخَافَتِيْ»[3] (رواه أبو يعلى) خریم اسدی رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ لوگ چار طرح کے ہیں اور عمل چھ طرح پر: ایک وہ آدمی جو دنیا و آخرت میں موسع (فراخی والا) ہے، دوسرا وہ جو دنیا میں موسع لہ، آخرت میں مقتور علیہ (تنگ دست) ہے۔ تیسرا وہ جو دنیا میں مقتور علیہ اور آخرت میں موسع لہ (آسودہ حال) ہے۔ چوتھا وہ جو دنیا و آخرت میں شقی ہے۔

رہے اعمال سو ایک تو وہ جو موجبتان (واجب کرنے والے) ہیں۔ دوسرے وہ جو مثل بمثل ہیں۔ تیسرے وہ جو دس گنے ہیں۔ چوتھے وہ جو سات سو گنے ہیں۔ موجبتان (دو واجب کرنے والے) وہ ہیں کہ جو کوئی شخص مسلمان مومن رہ کر مرا، اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کیا، اس کے لیے جنت واجب ہے اور جو کافر رہ کر مرا، اس کے لیے آگ واجب ہے۔ اور جس نے نیکی کا قصد کیا مگر نہ کر پایا مگر اللہ نے جان لیا کہ اس کے دل کو خبر ہے اور حریص ہے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٨)

[3] مسند أبي يعلىٰ (٦/ ١٧٠) المطالب العالية (١٣/ ٧٣١) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبیدہ" ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیح مسلم میں موجود ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔

اس نیکی پر تو اس کے لیے ایک حسنہ لکھا جاتا ہے اور جس نے سیئہ کا قصد کیا تو وہ اس پر نہیں لکھی جاتی اور کر بیٹھا تو ایک ہی سیئہ لکھی جاتی ہے، دوچند نہیں ہوتی اور جس نے کوئی نیکی کی وہ اُس پر دس گنی ہوتی ہے اور جس نے اللہ کے راستے میں خرچ کیا، وہ سات سو گنا ہوتا ہے۔[1] (رواه أحمد والترمذي والنسائي)

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ جمعہ میں تین شخص حاضر ہوتے ہیں: ایک وہ جو حاضر ہو کر خاموش اور ساکت رہتا ہے، کسی مسلمان کی گردن کو پامال نہیں کرتا، نہ کسی کو ستاتا ہے، یہ اس کے لیے دوسرے جمعے تک کے لیے کفارہ ہے اور تین دن زیادہ، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (آیتِ باب)[2] (رواه ابن أبي حاتم) سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں: یہ جمعہ آیندہ جمعے تک کے لیے اور مزید تین دن کے لیے کفارہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (آیتِ باب)[3] (رواه الطبراني)

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھا، اُس نے سارے دہر (پوری عمر) کا روزہ رکھا۔ (رواه أحمد و هذا لفظه والنسائي و ابن ماجه) ترمذی نے اتنا زیادہ کیا: "فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَ ذٰلِكَ فِيْ كِتَابِهٖ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ﴾ ... الخ" "اللہ نے اس کی تصدیق اپنی کتاب میں نازل فرمائی: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ﴾ ...الخ" پھر کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔[4]

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں حسنہ سے مراد لا إله إلا الله کہنا اور سیئہ سے مراد شرک کرنا ہے۔ ایک جماعت سلف نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[5] اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے۔ والله أعلم. صحیح یہ ہے کہ نہیں، لیکن میں نے اُس کو بوجہ ثابت نہیں پایا۔ اس بارے میں احادیث اور آثار بہت کثرت سے ہیں۔ وَمَا ذُكِرَ كِفَايَةٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَبِهِ الثِّقَةُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ اس طرح ہیں کہ حسنہ حسنات کی واحد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٣٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٢٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٨٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٠٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١١١٣) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٣٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٠٤٥)

[3] المعجم الكبير (٣/ ٢٩٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ شریح بن عبید کا سماع سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ آیت کے ذکر کے بغیر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صحیح مسلم (رقم الحديث: ٨٥٧) میں مروی ہے۔

[4] مسند أحمد (٥/ ١٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٦٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٠٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٠٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٣٢٤)

[5] تفسير الطبري (١٢/ ٢٧٦) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٣١۔ ١٤٣٢) اس کی سند صحیح ہے۔

کہا ہے کہ مراد ”لا إله إلا الله“ ہے۔[1] سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ”لا إله إلا الله“ حسنہ ہے؟ فرمایا: ہاں افضل حسنات ہے۔[2] (أخرجه عبد بن حميد وهذا مرسل لا ندري كيف إسناده إلى سعيد) ایک حسنہ کا دس گنا ہونا احادیثِ کثیرہ میں ثابت ہوا ہے۔ یہ نیکی کرنے والے کے استحقاق کی قلیل ترین مقدار ہے، اس سے زیادہ بھی عموماً وخصوصاً وارد ہوا ہے۔ قرآن میں آیا ہے:

﴿ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرة: ٢٦١] ”اس کی مثال اس دانے کی سی ہے، جس میں سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہے (اجر) بڑھا دیتا ہے۔“

معلوم ہوا کہ ایک نیکی کا اجر سات سو گنا سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے جس کے لیے اللہ چاہے اور بعض نیکی کرنے والوں کی جزا بغیر حساب آئی ہے، جس طرح اس آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر: ١٠] ”بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔“ سنتِ مطہرہ میں جزا کی بڑھوتری ستر اور سات سو گنا تک اور ہزاروں اور لاکھوں گنا تک وارد ہوئی ہے۔ اللہ کا فضل بہت واسع اور اس کی عطا کثیر ہے۔ یہ بحث اس تفسیر میں دو جگہ گزر چکی ہے۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

سیئہ سے مراد اعمالِ سیئات ہیں، ان کی جزا عمل کے برابر ہے نہ کہ زیادہ، یعنی اگر جزا کی نوبت آئے تو خفت اور عظمت میں وہ جزا صرف اس برائی کے برابر ہی ہو گی۔ مثلاً مشرک کو جزائے سیئہ آگ میں ہمیشہ رہنا ہو گی۔ مسلمانوں میں جو برائی کرتا ہے اس کو برائی کے برابر بدلہ دیا جاتا ہے۔ سزاؤں کی مقدار وارد ہو چکی ہے، اس بارے میں بہت سی احادیث آئی ہیں کہ جو کوئی ایسا کام کرے گا اس کی سزا ایسی ہو گی۔

رسالہ ”بشارة الفساق“ میں اس بارے میں احادیث درج کی گئی ہیں۔ جس کی سزا کی مقدار نہیں آئی، وہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان گناہوں کا بدلہ مثل بمثل سے ہو گا، اگرچہ ہم کو اُس کی جزا کی حقیقت کے بارے میں واقفیت نہیں ہے۔ یہ اُس وقت ہے کہ گناہ سے توبہ نہ کرے اور اگر توبہ کر لی ہے یا برائیوں سے نیکیاں بڑھ گئی ہیں یا اللہ نے ان کو اپنے پردۂ رحمت میں چھپا لیا ہے اور اس کے حال پر بخشش کے ساتھ اپنا فضل فرمایا ہے تو پھر ان کی کوئی جزا نہیں ہے۔ کتاب وسنت کی دلیلوں میں اس کی تصریح اس طرح آئی ہے کہ پھر کسی کو شک وشبہے کی گنجایش نہیں رہتی۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ نیکی کرنے والوں اور برائی کرنے والوں پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا، یعنی نہ ان کے اجر وثواب میں کسی قسم کی کمی کی جائے گی اور نہ ان کی سزا میں زیادتی کی جائے گی۔ اس آیت میں یہ ہے کہ لفظ ہر حسنہ اور سیئہ کو

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٣١)
[2] تفسير الطبري (١٢/ ٢٧٦) یہ روایت مرسل ہے۔

شامل ہے جو بندہ کرتا ہے۔ نیکی کرنے والے کو ثواب دینا اللہ کا فضل ہے اور بدی کا بدلہ اس کے برابر دینا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عدل ہے۔[1] اے اللہ! تو ہم پر اپنا فضل وکرم کرنا نہ کہ عدل۔ آمین

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے، صحیح اعلیٰ اقدار کے حامل دین کی، ایک رب کے پرستار ابراہیم کے طریقے کی، اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا (161) کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، (سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے (162) اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھے اس (بات یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں (163)

ابراہیم علیہ السلام کا دین صراطِ مستقیم ہے جو اسلام ہے:

اللہ پاک نے اپنے نبی سید المرسلین کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو خبر کر دیں کہ اللہ نے ان پر انعام کیا کہ ان کو سیدھی راہ دکھائی، جس میں کچھ ٹیڑھ نہیں ہے نہ کسی طرح کا انحراف ہے، وہ راہِ راست، وہ دینِ قیم ہے جو ابراہیم حنیف علیہ السلام کی ملتِ ثابتہ ہے۔ وہ مشرک نہ تھے، بلکہ سارے موحدین کے پیشوا، سردار اور امامِ اعظم تھے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ﴾ [البقرة: ۱۳۰] ”اور کون ہے رغبتی کر سکتا ہے ملتِ ابراہیم سے سوائے اس کے جس نے اپنے نفس کو احمق بنا لیا۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ﴾ [الحج: ۷۸] ”اور تم اللہ کی راہ میں (اس طرح) جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تمھیں (اپنے دین کے لیے) چن لیا ہے اور اس نے دین میں تمھارے لیے کوئی تنگی نہیں رکھی، اپنے باپ ابراہیم کے دین کی (اتباع کرو)۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ [النحل: ۱۲۰۔ ۱۲۳] ”بلاشبہ ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ

[1] فتح البیان (۴/ ۲۹۰۔ ۲۹۱)

تھا۔ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا، اس (اللہ) نے اسے چن لیا اور اس کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دی۔ اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔ (اے نبی!) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی اتباع کریں جو (اللہ کی طرف) یکسو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

اس حکم سے کہ ملتِ ابراہیم کی اتباع کرو یہ بات لازم نہیں آتی کہ ابراہیم علیہ السلام محمد رسول اللہ ﷺ سے اکمل اور افضل ہوں، اس لیے کہ ملتِ حنیفیہ کے ساتھ جو قیام نبی اکرم ﷺ نے کیا وہ قیامِ عظیم تھا، جو تکمیل اس کی آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک سے ہوئی وہ تکمیل مکمل تھی کہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے کوئی اس کمال اور تکمیل میں آگے نہیں بڑھا۔ چنانچہ اسی لیے فرمایا کہ میں خاتم الانبیا، سید ولد آدم ہوں، یعنی علی الاطلاق اور صاحبِ مقامِ محمود ہوں جس کی رغبت ساری خلق کرے گی، حتیٰ کہ خلیل جلیل علیہ السلام بھی۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے عبدالرحمٰن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب صبح کو اٹھتے تو کہتے: «أَصْبَحْنَا عَلٰى مِلَّةِ الْإِسْلَامِ وَعَلٰى كَلِمَةِ الْإِخْلَاصِ وَدِيْنِ نَبِيِّنَا وَمِلَّةِ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ»[1] ''ہم نے صبح کی ملتِ اسلام پر اور کلمۂ توحید پر اور اپنے نبی کے دین اور ابراہیم حنیف کی ملت پر اور وہ مشرک نہیں تھے۔'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ کون سا دین اللہ کو محبوب تر ہے؟ فرمایا: حنیفیہ سمحہ۔[2] (رواہ أحمد) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: یہود جان لیں کہ ہمارے دین میں فراخی ہے، میں حنیفیہ سمحہ کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ (رواہ أحمد) اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے۔[3] اس میں زیادتی کے شواہد کئی طریق سے آئے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں ان طرق کو جمع کیا ہے۔ وللّٰہ الحمد والمنة.

عبادت میں اخلاص کا حکم:

پھر اللہ نے یہ حکم دیا کہ مشرکوں کو جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں، کہہ دو کہ ہم اس کام میں تمھارے مخالف ہیں۔ ہماری عبادت اور ہمارا ذبیحہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے نام پر ہو رہا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ظاہر ہے: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ [الکوثر: ۲] ''تو آپ اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔'' کیونکہ مشرک بتوں کو پوجتے، ان کے لیے جانور ذبح کرتے تھے، اللہ نے ان کی مخالفت کرنے اور ان سے انحراف کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ کسی کام کے قصد و نیت و عزم کو پیش کرنے کے لیے ان کا اللہ کے لیے خالص ہونا ضروری ہے۔

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣) مسند أحمد (٣/ ٤٠٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٦٧٤)

[2] مسند أحمد (١/ ٢٣٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٨١)

[3] مسند أحمد (٦/ ١١٦) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٢)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''نُسُك'' حج وعمرہ میں ذبح کرنا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ''نُسُك'' ذبح ہے۔ امام سدی اور ضحاک رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[1] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الاضحیٰ کے دن دو بکریاں قربان کیں، جب ان کو ذبح کرنے لگے تو فرمایا: «إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ ... الخ» (رواه ابن أبي حاتم)[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، يعني مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ.[3]

تمام انبیا کا دین اسلام ہے:

یہ بات درست ہے کہ سارے کے سارے انبیا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے، سب کے سب اسی اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے، اسلام کی اصل یہ ہے کہ عبادت نہ کرے مگر اللہ وحدہ لا شریک لہ کی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ''اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔'' اللہ نے ہم کو خبر دی ہے کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: ﴿ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [يونس: ٧٢] ''پھر اگر تم (حق سے) پھر جاؤ، تو میں نے تم سے کسی اجر کا سوال نہیں کیا، میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہو جاؤں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿130﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿131﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٣٠۔ ١٣٢] ''اور کون بے رغبتی کر سکتا ہے ملتِ ابراہیم سے سوائے اس کے جس نے اپنے نفس کو احمق بنا لیا اور بے شک ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چن لیا اور یقیناً وہ آخرت میں ضرور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔ اور جب ابراہیم سے اس کے رب نے کہا: فرمانبردار ہو جا! تو اس نے کہا: میں رب العالمین کا فرماں بردار ہوگیا۔ ابراہیم نے اور یعقوب نے بھی اپنے بیٹوں کو اسی (کلمۂ حق) کی وصیت کی: اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمھارے لیے یہ دین چن لیا ہے، پس تمھیں ہرگز موت نہ آئے، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔''

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٢٨٤۔ ٢٨٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٣٤)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٣٥)

یوسف علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۱] ”اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ حکومت دی ہے اور مجھے باتوں (خوابوں) کی تعبیر سکھائی ہے، اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے، تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔“

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ﴿ یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴾ [یونس: ۸۴۔ ۸۶] ”اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو، اگر تم فرماں بردار ہو۔ چناں چہ انھوں نے کہا: ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا ہے۔ اے ہمارے رب! تو ہمیں ظالم قوم کے ہاتھوں آزمایش میں نہ ڈال۔ اور تو ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ کافر قوم سے نجات دے۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المائدة: ۴۴] ”بے شک ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے ذریعے سے فیصلے کرتے تھے انبیا جو اللہ کی اطاعت کرنے والے تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی تھے اور اللہ والے اور علما فیصلے کرتے تھے، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے نگران بنائے گئے تھے اور وہ اس پر گواہ تھے، چناں چہ تم لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اور میری آیتیں تھوڑی قیمت پر نہ بیچو اور جو لوگ نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴾ [المائدة: ۱۱۱] ”اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، تب انھوں نے کہا: ہم ایمان لائے ہیں اور تو گواہ رہ کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں۔“ غرض کہ اللہ پاک نے خبر دی ہے کہ رسولوں کی بعثت اسی اسلام کے لیے تھی، اگرچہ بعض شریعتیں خاص ضرورت کے تحت بعض کو منسوخ کرنے والی ہیں اور ایک دوسرے سے متفرق ہیں، یہاں تک کہ شریعتِ حقہ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام سے پہلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں، اب یہی دین ہمیشہ قائم و دائم، منصور و مظفر رہے گا، منسوخ نہ ہوگا، اس کے نشان اور پرچم قیامت کے قائم ہونے تک منشور رہیں گے۔ وللہ الحمد

اس لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہم نبیوں کی جماعت، اولادِ علات ہیں، ہمارا دین ایک ہے،[1]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۵۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۶۵)

کیوں کہ اولاد علات دو بھائی ہوتے ہیں جو ایک باپ سے ہوں، مائیں جدا ہوں، سو دین واحد وہی اکیلے اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت ہے تو شریعتیں مختلف ماؤں کی طرح ہوں، جس طرح کہ برادر اخیاف اس کے برعکس ہوتے ہیں، یعنی ایک ماں کے بیٹے جدا جدا باپ سے۔ اور برادر اعیان و اشقاء وہ ہوتے ہیں جو ایک باپ اور ایک ماں سے ہوں۔ واللہ أعلم

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر کہتے، استفتاح کرتے تو فرماتے: «وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ ... الخ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ رَبِّيْ وَأَنَا عَبْدُكَ، ظَلَمْتُ نَفْسِيْ، وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ، فَاغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعاً، لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ، وَاهْدِنِيْ لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ، لَا يَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، واصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا، لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ» پھر ساری حدیث ذکر کی، اس میں یہ ذکر بھی ہے کہ رکوع، سجدے اور تشہد میں یہ کہتے۔[1] (رواہ أحمد و مسلم في صحیحه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں اس آیت کی تفسیر کے بارے میں لکھا ہے کہ قاموس میں کہا ہے کہ حنیف بروزن امیر وہ ہے جو اسلام کی طرف صحیح المیل (اچھی میلانِ طبع رکھتا ہو) اور اس پر ثابت قدم ہو اور ہر حاجی یا وہ جو دینِ ابراہیم پر ہو۔[2] اس آیت میں مشرکین پر رد ہے۔ ان کو یہ زعم تھا کہ وہ دینِ ابراہیم پر ہیں، اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تو بت پرست نہیں تھے، تم تو بتوں کو پوجتے ہو، پھر کس طرح تم ان کے دینِ حق پر ٹھہرے؟! لفظِ صلات جنسِ نماز کو شامل ہے، اس میں ساری نمازیں داخل ہیں۔

نسک نسکہ کی جمع ہے، بمعنی ذبیحہ، مراد حج و عمرے کے ذبائح ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نسک سے مراد عبادت ہے۔ ناسک عابد کو کہتے ہیں۔ اہلِ علم کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے۔ حیات میں اعمالِ خیر ہوتے ہیں۔ ممات میں وصیت، صدقات اور انواعِ قربات کیے جاتے ہیں۔ یا مراد نفسِ حیات و نفسِ ممات ہے، یہ سب کام اللہ رب العالمین لا شریک لہ کے لیے خالصتاً ہیں۔ عبادت، حکم، پیدایش، فیصلہ، تقدیر اور دوسرے تمام کاموں میں کوئی مخلوق باری تعالیٰ کی شریک نہیں، مجھ کو اسی توحیدِ الوہیت و ربوبیت کا حکم ملا ہے، میں اس امت میں پہلا مسلمان ہوں۔

عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے فاطمہ اٹھ! اپنی قربانی کے پاس حاضر ہو، تیرے گناہ کی جو تو نے کیا ہے، مغفرت ہوگی، پہلے قطرۂ خون پر جو ٹپکے گا اور یہ کہہ: ﴿ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ ...إلی قوله... وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾۔" میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ خاص آپ کے لیے ہے اور آپ کے اہلِ بیت کے لیے ہے؟

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۷۱) مسند أحمد (۱/ ۹٤)
[2] القاموس المحیط (۱/ ۱۰۳٦)

کیا صرف آپ ہی اس کے اہل ہیں یا یہ عام مسلمانوں کے لیے ہے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ سب مسلمانوں کے لیے ہے۔ [1]

(رواه الحاكم و صححه ابن مردويه والبيهقي)

قُلۡ اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِىۡ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىۡءٍ‌ ؕ وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَيۡهَا‌ ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى‌ ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

کہہ دیجیے: کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی اور رب تلاش کروں؟ جب کہ وہی ہر چیز کا رب ہے، اور کوئی شخص ایسا (گناہ) نہیں کماتا جس کا وبال اسی پر نہ ہو، اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ پھر اپنے رب ہی کی طرف تمھیں لوٹنا ہے، چناں چہ وہ تمھیں ان باتوں سے آگاہ کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے تھے (164)

خالص اللہ پر توکل کا حکم:

اللہ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم ان مشرکوں سے، جو اخلاصِ عبادت اور توکل علی اللہ میں شرک کرتے ہیں، کہہ دو کہ کیا میں اب سوائے اللہ پاک کے کوئی اور رب تلاش کروں؟! حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے، میری پرورش، حفاظت، نگہبانی اور تدبیرِ امر کرتا ہے، میں تو اسی پر بھروسا کروں گا، اسی کی طرف رجوع لاؤں گا، امر و خلق سب اسی کا ہے، وہی ہر چیز کا شہنشاہ اور پروردگار ہے۔ اس آیت میں اخلاص کے ساتھ عبادت اور توکل علی اللہ کرنے کا حکم ہے، جس طرح پہلی آیت میں اخلاصِ توحید کا حکم تھا۔ یہ معنی اکثر دوسرے معنی کے قریب آتے ہیں، جس طرح اللہ نے اپنے بندوں کو ارشاد فرمایا ہے کہ یوں کہا کریں: ﴿ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ﴾ [الفاتحة: ٥] ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاعۡبُدۡهُ وَتَوَكَّلۡ عَلَيۡهِ ﴾ [هود: ١٢٣] ''چناں چہ آپ اسی کی عبادت کریں اور اسی پر توکل کریں۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلۡ هُوَ الرَّحۡمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيۡهِ تَوَكَّلۡنَا ﴾ [الملك: ٢٩] ''کہہ دیجیے: وہ رحمان ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر ہم نے توکل کیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا ﴾ [المزمل: ٩] ''(وہ) مشرق و مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو کارساز بنا لیجیے۔'' اس سے مشابہ بہت سی آیات ہیں۔

[1] مستدرك الحاكم (٤/ ٤٢٧) سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/ ٢٣٨) اس کی سند میں ''ابوحمزہ الثمالی'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٢٨)

کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی:

پھر قیامت کے دن کے حالات کی خبر دی کہ اس دن اللہ کا حکم اور عدل اور جزا اس بات کا مقتضی ہوگا کہ تمام لوگوں کو ان کے اعمال کی پوری پوری جزا دی جائے، خیر کی خیر اور شر کی شر۔ کسی شخص کی خطا دوسرے شخص پر نہ لگائی جائے، یہ اللہ پاک کا عدل ہے، جیسے اُس نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ﴾ [الفاطر: ۱۸] ''اور اگر کوئی بوجھ لدا شخص اپنا بوجھ اُٹھانے کو بلائے گا تو اس (کے بوجھ میں) سے کچھ بھی اُٹھایا نہ جائے گا، اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۱۲] ''وہ نہ ظلم وزیادتی (بے انصافی) کا خوف کھائے گا اور نہ حق تلفی کا۔''

علمائے تفسیر فرماتے ہیں کہ غیر مظلوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ غیر کی برائیاں اس پر نہیں لادی جائیں گی۔ ''ھضم'' کے معنی ہیں کہ اُس کی نیکیوں میں سے کچھ کم نہ کیا جائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴾ [المدثر: ۳۸] ''ہر نفس نے جو کیا اس کے بدلے وہ گروی ہے۔'' یعنی ہر شخص اپنے عملِ بد میں گرفتار ہوگا، مگر دائیں ہاتھ والے کہ ان کے اعمالِ صالحہ کی برکت، ان کی اولاد پر عائد ہوگی، جس طرح فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ [الطور: ۲۱] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی، تو ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) ان سے ملا دیں گے۔'' یعنی اولاد جنت کے بلند مقام میں اپنے صالحین آبا کے ساتھ مل جائے گی، اگرچہ اعمال میں ان کے برابر نہ تھی، یعنی ان کی طرح نیک کام ان سے نہ بنے تھے، بلکہ اصل ایمان میں ان کے شریک تھے۔ ہم ان بلند مرتبہ والے سادات کے اعمال میں سے ان کی اولاد کے ملنے کی وجہ سے کچھ کم نہیں کریں گے، تاکہ وہ ان ناقص عمل والوں کے برابر ہوں، بلکہ اولاد کو ان کے آبا کے اعمال کی برکت سے آبا کے بلند مقام تک لے جائیں گے۔ یہ اللہ کا فضل و کرم اور احسان ہے۔

پھر فرمایا کہ ہر نفس اپنی کمائی کا رہین ہے۔ جو شر اس نے کمایا ہے وہ اس کے وبال میں گرفتار ہوگا۔ تم سب کا لوٹنا تمھارے رب کی طرف ہے، وہ تم کو تمھارے اختلاف پر خبردار کرے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ تم اور ہم سب اس پر پیش کیے جائیں گے، وہ تم کو تمھارے اور ہم کو ہمارے اعمال کی سزا جزا دے گا۔ دنیا میں جو اختلاف تمھارے درمیان ہے، اس کا جھگڑا چکا دے گا، جیسے اس کا قول ہے: ﴿ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾ [سبا: ۲۵۔ ۲۶] ''کہہ دیجیے: جو ہم نے جرم کیا تم سے اس کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا اور نہ ہم سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا جو تم عمل کرتے ہو۔ کہہ دیجیے: ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا، پھر وہ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ سوال انکار کے لیے ہے۔ مشرک جو غیر اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے ہیں، ان کے بلانے کا جواب یہ ہے کہ میں اللہ کو چھوڑ کر کس طرح غیر اللہ کو اپنا رب ٹھہراؤں، کیونکہ جب وہ ہر شے کا رب ہوا تو جو شے اس کے سوا ہے، وہ میری طرح اس کی مخلوق ہے اور اسی کی ربوبیت میں ہے، نہ اسے نفع دینے کی قدرت ہے اور نہ نقصان کی طاقت، پھر ایسا مملوک مالک کا شریک کس طرح ہو سکے گا، اس کلام میں نہایت درجے کی ڈانٹ اور سرزنش ہے۔

اہلِ شرک اور الحاد کو پھر فرمایا کہ کوئی نفس کسی غیر کے گناہ اور معصیت پر نہیں پکڑا جاتا، بلکہ ہر نفس کی برائی خاص اس کی اپنی جان پر ہے، کسی اور کی طرف اس برائی کا اثر نہیں جاتا اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ﴾ [البقرة: ٢٨٦] ”کسی شخص نے جو نیکی کمائی اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو اس نے برائی کی اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔“ نیز اسی کا قول ہے: ﴿ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴾ [طٰہٰ: ١٥] ”تا کہ ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے۔“ یہ بات نہیں ہے کہ کوئی جان کسی دوسری جان کا گناہ اپنے اوپر اٹھائے، اُس بوجھ کو اپنے نفس پر لادے۔

”وزر“ اصل میں بمعنی بوجھ ہے، اس جگہ مراد گناہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کوئی کسی غیر کے گناہ میں گرفتار نہیں ہوتا، وہ لوگ اپنے بوجھ خود اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے۔ اس میں جاہلیت کی تردید ہے کہ وہ قریب کو گناہِ قریب میں پکڑتے تھے۔ قصور کسی کا ہوتا، پکڑتے دوسرے کو۔ بعض نے کہا: اس آیت سے مراد مواخذۂ آخرت ہے، اسی طرح اس سے پہلے والی آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق: ﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ﴾ [الأنفال: ٢٥] ”اور اس فتنے سے ڈرو جو تم میں سے خاص طور پر (صرف) ان لوگوں کو نہیں پہنچے گا جنھوں نے ظلم کیا، (بلکہ سب اس کی زد میں آسکتے ہیں)۔“ اسی کی طرح زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ ”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ؟ قَالَ: « نَعَمْ، إِذَا كَثُرَ الْخُبُثُ »[1] ”اے اللہ کے رسول! کیا ہم ہلاک کیے جائیں گے جب کہ ہم میں صالح لوگ بھی ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، جب خبیث لوگوں کی کثرت ہو جائے گی۔“

زیادہ بہتر یہ ہے کہ آیت ظاہر پر محمول ہو، یعنی اس سے عمومیت مراد لی جائے اور اس جگہ غیر کے گناہ پر مواخذہ آیا ہے، جیسے دیت کہ عاقلہ پر ہوتی ہے اور اس کے مثل وہ اس عمومیت کی مخصص ٹھہرے گی اور اپنی جگہ پر برقرار رہے گی۔ رہی آیت: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ [العنكبوت: ١٣] ”اور یقیناً وہ اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ ضرور اُٹھائیں گے۔“ سو ﴿ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ سے ان لوگوں کے بوجھ مراد ہیں جن کو یہ گمراہ کرتے ہیں جس طرح کہ دوسری آیت میں آیا ہے: ﴿ لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٠)

﴿ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ﴾ [النحل: ٢٥] ''تاکہ یومِ قیامت وہ اپنے کامل بوجھ اُٹھائیں اور کچھ ان کے بوجھ بھی، جنھیں وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں۔''

پھر جب قیامت کا دن ہو گا تو جن ادیان، ملل، نحل، مذاہب، مشارب، آرا اور اہوا میں دنیا کے اندر اختلاف وافتراق کیا کرتے تھے، اس کی خبر اللہ ان کو دے گا، یعنی جزائے اعمال کو پہنچائے گا۔ اس وقت حق پر چلنے والوں کا حق اور جھٹلانے والوں کا جھوٹ کھل جائے گا۔[1] ہر شخص جان لے گا کہ وہ حق پر تھا یا اس کا غیر۔ اہلِ کتاب، مجوس اور مشرکین کو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان سچے تھے یا وہ سچے ہیں۔

اسی طرح بدعتوں اور محدثات پر چلنے والے جان لیں گے کہ وہ حق پر تھے یا اہلِ سنت و حدیث۔ مقلدین کی بابت بھی ثابت ہو جائے گا کہ متبعین حق پر تھے یا وہ۔ غرض کہ ہر قسم کا حق و باطل، خواہ وہ اصولِ ملت سے متعلق ہو یا فروعِ ملت سے، واضح ہو جائے گا۔ ہر عامل اپنے عمل کی، ہر قائل اپنے قول کی، ہر فاعل اپنے فعل کی، ہر زاعم اپنے زعم کی سزا یا جزا پائے گا۔ خیر کی خیر جزا پائے گا، شر کی شر، حسنہ کی حسنہ، سیئہ کی سیئہ۔ اے رب! تو ہم کو اتباعِ کتاب و سنت کی توفیق عطا فرما اور ہر بدعت اور رائے سے بچا۔ قرآن و حدیث پر چلا، زمرۂ موحدین، متبعین میں اٹھا، سلف صالحین، رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا۔ یہ امر تجھ پر کچھ مشکل نہیں ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ
دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ
وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿١٦٥﴾

اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض پر اونچے درجے عطا کیے، تاکہ وہ تمھیں ان نعمتوں میں آزمائے جو اس نے تمھیں دیں۔ بے شک آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے۔ اور بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (165)

زمین میں جانشینی اور درجات میں تفاوت ایک آزمائش:

خلیفۂ زمین کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو ایک قوم کے بعد دوسری قوم، ایک زمانے کے بعد دوسرا زمانہ اور خلفاً بعد سلفٍ زمین کو آباد کرنے والا ٹھہرایا۔ ابن زید رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ[2] یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓىِٕكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٦٠] ''اور اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتے بنا دیتے جو زمین میں (تمھارے) جانشین ہوتے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٩] ''امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے

[1] فتح البیان (٤/ ٢٩٣۔ ٢٩٤)
[2] تفسیر ابن أبی حاتم (٥/ ١٤٣٥)

دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمھیں زمین میں جانشین بنا دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

پھر فرمایا کہ بعض کے بعض پر درجے بڑھائے، یعنی رزق، اخلاق، خوبیوں، برائیوں، مناظر، شکلوں اور رنگوں میں ایک دوسرے سے مختلف بنایا۔ اللہ ہی اس حکمتِ بالغہ کو جانے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَیۡنَہُمۡ مَّعِیۡشَتَہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ رَفَعۡنَا بَعۡضَہُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعۡضُہُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِیًّا ﴾ [الزخرف: ٣٢] ''ہمی نے دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کی روزی تقسیم کی ہے اور ہمی نے درجات میں انھیں ایک دوسرے پر برتری دی ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے کو خدمت گار بنا لیں۔''

نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ وَ لَلۡاٰخِرَۃُ اَکۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَکۡبَرُ تَفۡضِیۡلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢١] ''دیکھیے! کس طرح ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی؟ اور یقیناً آخرت درجوں میں بڑھ کر ہے اور فضیلت دینے میں (بھی) بڑھ کر ہے۔'' مرتبوں میں فرق اور درجات کی بلندی اس لیے ہے کہ تم کو آزمائے کہ جو تم پر نعمت کی ہے تم اس میں کیسا کام کرتے ہو، کس طرح کا برتاؤ رکھتے ہو۔ غنی کا امتحان شکر اور بے نیازی میں کرے، فقیر کا امتحان سوالِ صبر میں فرمائے۔

صحیح مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ دنیا شیریں اور سرسبز ہے، اللہ تم کو اس میں خلیفہ کرنے والا ہے، پھر دیکھے گا کہ تم کیا کام کرتے ہو۔ سو بچو تم دنیا سے اور بچو تم عورتوں سے۔ بنی اسرائیل کا پہلا فتنہ انھیں عورتوں میں تھا۔[1] اللہ کا سریع العقاب اور غفور الرحیم ہونا ترغیب اور ترہیب پر دلیل ہے کہ اللہ کا حساب اور عذاب ان گناہ گاروں کے لیے بہت جلد ہے جو رسولوں کے مخالف ہیں۔ اُس کی بخشش و رحمت رسولوں کے متبعین کے لیے ہے۔ خیر اور طلبِ خیر کا عوض مقرر ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: ''لِيَرْحَمَ الْعِبَادَ عَلٰى مَا فِيهِمْ''[2] ''تاکہ اپنے بندوں پر وہ جس حالت میں ہیں، رحم فرمائے۔''

اللہ پاک کی عادتِ شریفہ ہے کہ ان دونوں صفتوں کے درمیان اکثر قرآن فرماتا ہے، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَذُوۡ مَغۡفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلۡمِہِمۡ ۚ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَشَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴾ [الرعد: ٦] ''اور بے شک آپ کا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود البتہ انھیں بخشنے والا ہے، اور یقیناً آپ کا رب البتہ سخت سزا دینے والا ہے۔'' اور اس کا فرمان ہے: ﴿ نَبِّیٴۡ عِبَادِیۡۤ اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِیۡ ہُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِیۡمُ ﴾ [الحجر: ٤٩۔ ٥٠] ''(اے نبی!) میرے بندوں کو خبر سنا دیجیے کہ یقیناً میں خوب بخشنے والا (اور) خوب رحم کرنے والا ہوں۔ اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔''

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جو ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہیں۔ کبھی اپنے بندوں کو ترغیب دے کر

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٣٦)

جنت اور جنت کی نعمتوں کی طرف بلاتا ہے، کبھی ترہیب فرما کر ناروا سزا اور عذابِ نار سے ڈراتا ہے، کبھی قیامت اور قیامت کی ہولناکیوں سے خوف دلاتا ہے، کبھی بخشش اور رضوان کی خوش خبریاں دے کر اطمینان بخشتا ہے۔ کبھی ترغیب اور ترہیب کا اکٹھے ذکر کرتا ہے، تاکہ وہ ہر ایک کو اس کے حال کے مطابق یا اس کے حوصلے اور وقت کے تقاضے کے مطابق موثر، فائدہ بخش، سود مند، نافع اور ناجع ہو۔ جَعَلَنَا اللّٰهُ مِمَّنْ أَطَاعَهُ فِيمَا أَمَرَ، وَ تَرَكَ مَا عَنْهُ نَهٰى وَزَجَرَ، وَصَدَّقَهُ فِيمَا أَخْبَرَ، إِنَّهُ قَرِيبٌ مُّجِيبٌ، سَمِيعُ الدُّعَاءِ جَوَّادٌ كَرِيمٌ وَّهَّابٌ.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اگر مومن جان لے جو اللہ کے پاس سزائیں ہیں تو اس کی جنت کی کوئی شخص طمع نہ کرے اور اگر کافر جان لے کہ اللہ کے پاس جو کچھ رحمتیں ہیں تو کوئی آدمی جنت سے ناامید نہ ہو۔ اللہ نے سو رحمتیں پیدا کی ہیں، پھر ایک رحمت کو اپنی مخلوق میں رکھا، جس کی وجہ سے سب لوگ آپس میں شفقت و رحم کرتے ہیں۔ اللہ کے پاس ننانوے رحمتیں ہیں۔[1] (رواه أحمد والترمذي وقال حسن و رواه مسلم)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو کتاب میں لکھا جو اُس کے پاس عرش کے اوپر ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب آئی۔[2] ان کی روایت کے مرفوعاً تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے رحمت کے ایک سو حصے کیے، اپنے پاس ننانوے روک لیے اور ایک حصہ زمین پر اتارا، اسی حصے کی وجہ سے تمام مخلوق آپس میں رحم کرتی ہے، یہاں تک کہ جانور اپنے کھر کو اپنے بچے سے اٹھا لیتا ہے، یعنی بچا لیتا ہے، اس ڈر سے کہ کہیں اُس کو نہ لگ جائے۔[3] (رواه مسلم) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"آخِرُ تَفْسِيرِ سُورَةِ الْأَنْعَامِ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ"[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مختصراً اس جگہ یوں ہے کہ خلائف خلیفہ کی جمع ہے، یعنی تم کو ہم نے پہلی امتوں اور زمانوں کا خلیفہ کیا ہے یا مراد یہ ہے کہ بعض بعض کے خلیفہ ہوتے ہیں، یعنی ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔

یکے همی رود و دیگرے همی آید

"ایک جا رہا ہے اور دوسرا آ رہا ہے۔"

یا یہ مطلب ہے کہ نوعِ انسانی اللہ کی زمین میں اس کے خلفا ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرونِ اولیٰ ہلاک ہو کر ہم ان کی جگہ خلیفہ ہوئے، بعض کا رتبہ بعض پر رزق، قوت، ضعف، علم، عقل، جہالت، حسن، بدصورتی،

---

1. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٤٢) مسند أحمد (٢/ ٣٣٤)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥١)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٢)
4. تفسير ابن كثير (٢/ ٢٧٠)

تونگری، فقیری، بزرگی اور صورت میں بڑھایا۔ خلق کے درمیان درجات کا یہ فرق کچھ ان کی عاجزی، جہالت یا بخل کی وجہ سے نہیں ہے، کیونکہ اللہ نفسانی صفات اور تمام رذالتوں، نقائص اور عیوب سے پاک ہے، صاف و مقدس و منزہ ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ تمھاری آزمایش کرے کہ تم ان امور میں کیسا معاملہ کرتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے حالات سے بخوبی آگاہ ہے۔ یا تمھارے بعض کی بعض سے آزمایش کرے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ﴾ [الفرقان: ٢٠] ''اور ہم نے تمھیں ایک دوسرے کے لیے آزمایش بنایا۔''

بے شبہہ ہے فقیر سے عزت امیر کی   پستی اگر نہ ہو تو شرف کیا بلند کا

پھر عقاب (سزا) کی تعریف سرعت کے ساتھ کی۔ اگر دشمنوں کو اس دنیا میں ہلاک کرنا مراد ہے تو عقاب کی جلدی ظاہر ہے اور اگر مقصود عذابِ آخرت ہے تو بھی ظاہر ہے کہ ہر آنے والی چیز قریب ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ﴾ [النحل: ٧٧] ''اور قیامت کا معاملہ تو بس آنکھ جھپکنے کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی قریب تر۔'' پھر مسلمین کو ترغیب دی، فرمایا کہ اللہ کثیر الغفران عظیم الرحمہ ہے، اپنے اولیا اور تمام مخلوق کے لیے۔[1]

خاتمہ: انیسویں شعبان ۱۳۰۳ھ روز دوشنبہ کو اس سورت مبارکہ کی تفسیر کو لکھنا شروع کیا تھا، رمضان شریف میں آٹھ روزوں کے بعد علالتِ طبع کی وجہ سے چھے روزے قضا ہوئے، لکھنا بھی بند رہا، آج سولھویں رمضان مبارک سنہ مذکورہ یک شنبہ کے روز اس سورت کی کتابت مع تفسیر اردو وقت نواخت پانچ منٹ کم گیارہ بجے دن کے تمام ہوئی۔ نصف پارہ ہشتم بھی اس سورت کے آخر پر ختم ہوا، اس کے بعد ان شاء اللہ تفسیر سورت اعراف شروع ہو گی۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.



[1] فتح البیان (٤/ ٢٩٥)

ہماری دیگر مطبوعات

سلسلۂ مطبوعات (1-15)

مجموعہ رسائلِ عقیدہ

تالیف
نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
(۱۸۳۲ء — ۱۸۹۰ء)

تسہیل و تخریج
حافظ عبداللہ سلیم
حافظ شاہد محمود

3 مجلد // صفحات: 1800

سلسلۂ مطبوعات (16-19)

مجموعہ علومِ قرآن

تالیف
نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
(۱۸۳۲ء — ۱۸۹۰ء)

تسہیل و تخریج
حافظ عبداللہ سلیم
حافظ شاہد محمود

مجلد // صفحات: 912

سلسلۂ مطبوعات (20)

تفسیر ترجمان القرآن
بلطائف البیان

تالیف: نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
(۱۸۳۲ء — ۱۸۹۰ء)

تصحیح، تنقیح، نظرثانی
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

تسہیل
جناب محمد یحییٰ قریشی

تخریج
حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 1024

سلسلۂ مطبوعات (21-27)

مجموعہ مقالات و فتاویٰ

علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ

ترتیب و تحقیق
فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس حفظہ اللہ
فاضل مدینہ یونیورسٹی

تخریج
حافظ شاہد محمود
فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 712